یادداشتیں

قریۂ جاوداں

محمد داؤد طاہر

احمدی احباب کی تعلیم و تربیت کے لیے

قریۂ جاوداں

محمد داؤد طاہر

سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی رحمہُ اللہ تعالیٰ

کے نام

جن کی دُور رَس نگاہوں نے

جماعتی مرکز کے قیام کے لیے سرزمینِ ربوہ کا انتخاب کیا

ٹھیک ہے وقت کے تیزی سے گذرتے لمحات
عہدِ رفتہ کا ہر اک نقش مٹا دیتے ہیں
پھر بھی لیکن مرے گذرے ہوئے سجدوں کے نقوش
تیرے چہرے کے تقدس کو ضیا دیتے ہیں
میں نے راہوں پہ تری گیت جو گائے تھے کبھی
آج بھی وہ انہی راہوں پہ صدا دیتے ہیں

فہرست

نصرت گرلز ہائی سکول

تعلیم الاسلام ہائی سکول

تعلیم الاسلام کالج

ربوہ: کچھ یادیں

لاہور

ربوہ: کچھ اور یادیں

گھٹیالیاں

جنرل اختر حسین ملک کا سفرِ آخرت

گھٹیالیاں

لاہور

پشاور

کیوں کر ہو حمد تیری کب طاقتِ قلم ہے

راقم الحروف ۱۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کو قادیان کی مقدس بستی میں پیدا ہوا تاہم قیامِ پاکستان کے بعد برصغیر کے ـ کھوں خاندانوں کی طرح ہمیں بھی ہندوستان سے ہجرت کرنا پڑی اور ہمارا قیام لاہور میں رہا جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے صدر انجمن احمدیہ کا ہیڈکوارٹر قائم کر دیا تھا۔ جب ربوہ کی بنیاد رکھی گئی تو ہمارا خاندان اُن ابتدائی خاندانوں میں سے تھا جو یہاں آباد ہوئے۔

یہی وہ شہر ہے جہاں میرا بچپن گذرا، جہاں میں رنگ برنگی تتلیوں کے پیچھے بھاگتا اور سرخ مخملیں بیربہوٹیوں کو پکڑتا رہا اور یہیں میں نے ایک خوبصورت مستقبل کے خواب بُنے۔

جب میں سکول میں داخلے کی عمر کو پہنچا تو تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں تھا اور چوتھی یا پانچویں تک بچے بھی ربوہ کے نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ مجھے اس سکول کی پہلی جماعت میں داخل کرایا گیا جسے اُس زمانے میں ''پکّی جماعت'' کہا جاتا تھا۔ مجھے ۱۹۵۱ء کا وہ دن آج بھی یاد ہے جب میں امی کے ساتھ تیز تیز قدم چلتا ہوا اس سکول میں داخلے کے لیے گیا تھا۔ میری پہلی استاد استانی مومنہ تھیں جو حضرت خدابخش مومن جی کی صاحبزادی تھیں اور نوجوانی کے عالم میں وفات پا گئی تھیں۔

ہمارے دوسری جماعت کے پہنچنے تک تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ منتقل ہو چکا تھا چنانچہ میرے اگلے نو برس اسی سکول میں گذرے۔ یہاں مجھے بہت سے معروف اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا جن میں میاں محمد ابراہیم ہیڈ ماسٹر، چوہدری عبدالرحمٰن سیکنڈ ماسٹر، ماسٹر عبدالرحمٰن خان بنگالی، ماسٹر سعداللہ خان، ماسٹر محمد ابراہیم بھامبڑی اور بعض دیگر اہم نام شامل ہیں۔

۱۹۶۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں داخلہ لیا جس کے پرنسپل حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد تھے۔ اگرچہ مجھے کالج کے زمانہ میں ان سے براہِ راست اکتسابِ فیض کا موقع تو نہیں ملا تاہم میں ان کی شفقت سے محروم نہیں رہا اور اس کا کچھ ذکر اس کتاب میں بھی موجود ہے۔

میں نے بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اس نتیجے کی بنیاد پر مجھے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دو طلائی تمغے عطا ہوئے تاہم ابتداءً یونیورسٹی کی غلطی سے یہ تمغے ایک اور طالبہ کو دے دیئے گئے۔ پھر یہ تمغے مجھ تک کیسے پہنچے؟ یہ ایک طویل داستان ہے جو شاملِ کتاب ہے۔ مجھے کالج کا اکیڈیمک رول آف آنر عطا ہوا جو میرے لیے ہمیشہ باعثِ فخر رہا ہے۔

ایم اے سیاسیات کا امتحان میں نے ۱۹۶۷ء میں پاس کیا۔ اس کے بعد میں کم وبیش ایک سال ربوہ میں

مقیم رہا اور پھر تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں میں لیکچرر کے طور پر پڑھانے لگا۔ یہ ملازمت ختم ہوئی تو الیکشن کمیشن آف پاکستان میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ ان دونوں جگہوں پر میری ملازمت کا عرصہ دو سال بنتا ہے۔

یہ دونوں ملازمتیں بظاہر معمولی تھیں لیکن اس دوران مجھ پر عملی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو منکشف ہوئے جن سے میں پہلے بے خبر تھا۔ گھٹیالیاں شہری مراکز سے دُور ایک دیہاتی علاقہ تھا جہاں جدید دور کی سہولتیں ابھی نہ پہنچی تھیں۔ وہاں سے نزدیک ترین ریلوے سٹیشن سات آٹھ میل دُور تھا اور پختہ سڑک کا فاصلہ بھی کم وبیش اتنا ہی تھا۔ وہاں بجلی تھی نہ پانی اور نہ ہی ٹیلیفون کی سہولت۔ وہاں کے لوگ ایک ایسے ماحول کے پرُوردہ تھے جس کا میں عادی نہ تھا لیکن میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ گھٹیالیاں میں قیام نے مجھے ایک ایسا اعتماد بخشا جو مجھے شاید کسی اور جگہ حاصل نہ ہوسکتا تھا۔ میں ہوسٹل کے باہر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان کے امتحان کی تیاری کیا کرتا تھا اور اس وقت سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے عملی زندگی میں کس قابلِ رشک کامیابی سے نوازنے والا ہے۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کا ایک ماتحت دفتر لاہور میں ہوا کرتا تھا جس کے انچارج ریجنل الیکشن کمشنر برائے مغربی پاکستان تھے۔ جب میں گھٹیالیاں سے فارغ ہوا تو اتفاقاً اس دفتر میں اسسٹنٹ کی ایک آسامی خالی تھی۔ میں اہل تو نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اس جگہ تقرری کے اسباب پیدا فرما دیئے۔ اس جگہ میری تنخواہ گھٹیالیاں سے بہت بہتر تھی اور میں دیہاتی زندگی کو خیر باد کہہ کر ایک ایسے شہری مرکز میں آ گیا تھا جسے اس زمانے میں مغربی پاکستان کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں رہ کر مجھے بہتر ملازمت کے بعض اور مواقع سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا لیکن یہاں میں اختصار کے ساتھ صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ ۱۹۶۹ء وہ سال تھا جب میں نے سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان کا امتحان دیا۔ اس امتحان کا نتیجہ آنے اور تقرری ہونے میں نومبر ۱۹۷۰ء آ گیا۔ اس تقرری تک ربوہ سے میرا رابطہ بدستور رہا۔ ہاں! اس ملازمت میں آ جانے کے بعد میرا ربوہ آنا جانا قدرے کم ہوگیا۔

میں تکمیلِ ملازمت کے بعد ۱۸ دسمبر ۲۰۰۴ء کو ریٹائر ہوا۔ اس وقت میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ گنہگار پر ایک اور بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ابتدائی طور پر مرکزی حکومت کا ارادہ تھا کہ میرا تقرر نیپرا میں بطور ممبر (پنجاب) کیا جائے لیکن اس راستے میں غیر متوقع طور پر کچھ دشواریاں حائل ہوگئیں جس پر میرا تقرر بطور ممبر، پنجاب پبلک سروس کمیشن ہوگیا جہاں میں نے ۱۸ دسمبر ۲۰۰۹ء تک کام کیا۔ یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا لیکن خدا کے فضل وکرم سے مجھے یہاں پر جس قومی خدمت کا اعزاز حاصل ہوا میں اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

میں پچھلے کئی سالوں سے سوچ رہا تھا کہ ملازمت سے فراغت کے بعد اپنی سوانح عمری لکھوں گا لیکن جب میں نے اپنی اس خواہش کے حسن وقبح پر غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر زیادہ حق تو اُس ماحول کا ہے جہاں میں نے آنکھیں کھولیں، جس نے مجھے اخلاقیات کی بنیادی تربیت دی، جس نے مجھے پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ میں معاشرے کا مفید رکن بن سکوں۔ یوں بھی گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ وہ نسل جس نے ربوہ کو بنتے ہوئے

یَھا تھا اللہ کو پیاری ہوتی جا رہی ہے اور اُس زمانے کے چشم دِید حالات بیان کرنے والے لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے میں ربوہ میں اپنے گذرے ہوئے وقت کی داستان بیان کروں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے یہ کام مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ارادہ ہے کہ اس کے بعد اگر زندگی نے مہلت دی تو سرکاری ملازمت میں آ جانے کے بعد کے حالات ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

میں نے اس کتاب میں ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کے حالات قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں ربوہ کے اُس ماحول کی عکاسی کرنے کی سعی کی ہے جو اَب خواب ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے اساتذہ کرام اور سکول کے بعض ملازمین کے علاوہ اپنے بعض ہم جماعتوں کا قدرے تفصیلی ذکر کیا ہے جو میرے نزدیک ضروری تھا۔

ابتدائے ربوہ میں یہاں کے باسیوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُس کا کچھ اندازہ اِس کتاب سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ اس کتاب میں شہری سہولتوں کے مکمل فقدان سے لے کر ربوہ میں بجلی، پانی اور سوئی گیس کی آمد کی کہانی بھی ملاحظہ فرما سکیں گے جب کہ یہیں آپ کو ربوہ میں طبی سہولتوں کی تدریجی ترقی کا کچھ ذکر بھی ملے گا۔

میں نے تاریخِ ربوہ سے تعلق رکھنے والے بعض بظاہر غیر اہم واقعات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہاں کے شب و روز کیسے تھے، لوگ کس طرح نمازِ پنجوقتہ اور نمازِ جمعہ کے لیے جوق در جوق بیوتُ الذکر جایا کرتے تھے، جماعت کی ذیلی تنظیموں کے اجتماعات پر کیسی رونق ہوتی تھی اور جلسہ سالانہ کا کس طرح انتظار کیا جاتا تھا، اس کتاب میں آپ کو یہ سب کچھ بھی ملے گا۔

اس دور میں انجمن کوارٹرز کے مکینان میں حضرت مسیح موعود کے بعض رفقا کے علاوہ سلسلہ کے کچھ معروف بزرگان اور خاموش کارکنان بھی شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے ان میں سے بہتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس کتاب کا ایک باب ان کے بارے میں میرے تاثرات کا احاطہ کرتا ہے۔

میں نے سکول و کالج کے اپنے بعض زندہ اور مرحوم ہم جماعتوں کے علاوہ دنیائے ادب و صحافت کے دو درخشندہ ستاروں یعنی قمر اجنالوی اور شبلی بی کام کا ذکر بھی کیا ہے جو ربوہ میں دفن ہیں۔ کچھ ابواب ربوہ کے بعض اہم معاہدیں، ربوہ کے تجارت پیشہ احباب اور ربوہ کی بعض منفرد شخصیات کا احاطہ بھی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارے خاندان کے بعض افراد کو سلسلہ کی منفرد خدمت کا موقع ملا ہے اور میں نے ایک باب میں ان خدمات کا طائرانہ جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

میں نے ربوہ کی جن شخصیات کا ذکر کیا ہے مجھے ان سے تعارف کا موقع ۱۹۷۰ء سے پہلے ملا تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب میں ان تمام شخصیات کا ذکر آ گیا ہے جو اس عرصہ میں میرے حلقہ احباب میں شامل ہوئیں البتہ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ ان میں سے بہتوں کا ذکر کتابِ ہٰذا میں آ گیا ہے خواہ یہ سرسری ہی کیوں نہ ہو۔

کتاب میں درج ذاتی محرومیاں دراصل اس دور کی اجتماعی محرومیاں تھیں جس سے یہاں کا ہر رہنے والا دوچار تھا۔ سہولتیں جو آج عام ہو چکی ہیں اُس زمانے میں ناپید تھیں اور یہی وہ مشکل حالات تھے جن میں یہاں

رہنے والوں کو گذارا کرنا پڑتا تھا۔

میں نے اس کتاب میں تمام حالات بلا کم و کاست بیان کر دیئے ہیں اور کوئی چیز چھپانے کی ارادی کوشش نہیں کی۔ اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ تاریخ کو درست طور پر محفوظ کیا جا سکے۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، میں اس کا فیصلہ قارئین پہ چھوڑتا ہوں۔

قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس کتاب کے تمام ابواب کے عناوین مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے کچھ مصرعے حضرت مسیح موعود کی کتاب ''درثمین'' میں سے لیے گئے ہیں جب کہ بعض ''کلامِ طاہر'' میں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ دو مصرعوں کے علاوہ جو احسان دانش کی نظم ''ربوہ'' میں سے لیے گئے ہیں باقی تمام مصرعے احمدی شعراء کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ ان شعراء میں حضرت قاضی ظہور الدین اکمل، حضرت حافظ سید مختار احمد شاہجہانپوری، استاذی المکرّم چوہدری محمد علی مضطر، ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی، عبدالسّلام اختر، عبدالمنان ناہید، ثاقب زیروی، عبیداللہ علیم، عبدالرشید تبسّم، نسیم سیفی، سلیم شاہجہانپوری، صدیق امرتسری، عبدالعلی ملک، ادریس احمد عاجز عظیم آبادی، میر اللہ بخش تسنیم، عبدالسّلام اسلام، منیرہ بخاری اور بعض دوسرے اہم نام شامل ہیں۔

اس کتاب کو موجودہ شکل میں لانے کے لیے مجھے جن دوستوں کا خصوصی تعاون حاصل رہا اُن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ سب سے پہلے تو میں محمد صادق، لائبریرین خلافت لائبریری کا شکر گذار ہوں جنہوں نے میری فرمائش پر مجھے کسی کتاب کے اجرا میں تأمل ظاہر نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۰ء تک کے الفضل کے فائل بھی فراہم کئے جس کے لیے میں اُن کا از حد ممنون ہوں۔

حوالہ جات کی تلاش ایک مشکل کام ہے جسے صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں اس کام سے سابقہ پڑا ہو۔ یہ کام میری بھانجی عزیزہ امۃ الشافی نے بہت خوش دلی سے سرانجام دیا اور اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود میری ہر فرمائش کم سے کم وقت میں پوری کی۔ میں لاہور سے فون پر انہیں اپنی ضرورت لکھوا دیتا اور وہ اگلے ایک دو روز میں خلافت لائبریری میں بیٹھ کر متعلقہ حوالہ تلاش کر کے مجھے بذریعہ ڈاک بھجوا دیتیں۔ شافی قریشی سعید احمد اظہر مربی سلسلہ کی بیٹی ہیں اور میرے ایک بھانجے زبیر احمد خالد سے بیاہی ہوئی ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں ان کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

ڈرافٹ سٹیج پر اس کتاب کی جزوی یا کلّی نظر ثانی میں وقتاً فوقتاً بہت سے لوگ شامل رہے جن میں سے سب سے پہلے میں صاحبزادہ مرزا خورشید احمد، ناظرِ اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں اس کتاب کا وہ حصہ جس کا تعلق تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ سے ہے نظر ثانی کے لیے دیا اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا اور انتہائی قلیل وقت میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اسی حوالے سے چوہدری محمد علی، وکیل التصنیف تحریک جدید انجمن احمدیہ اور چوہدری حمید اللہ، وکیل الاعلیٰ تحریک جدید انجمن احمدیہ کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے ازراہِ شفقت اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ اس کتاب کے بعض حصوں کی نظر ثانی کے لیے وقف کیا۔

دوسرے دوست جنہوں نے اس حوالے سے ناچیز پر بہت شفقت فرمائی چوہدری اللہ بخش صادق،

یں التعلیم تحریک جدید انجمن احمدیہ اور اسفندیار منیب، انچارج شعبہ تاریخ احمدیت، صدر انجمن احمدیہ ہیں۔
نہوں نے اس کتاب کا معتد بہ حصہ دیکھا اور مفید مشوروں سے نوازا۔

مرزا خلیل احمد قمر، ایڈیٹر مصباح؛ عزیز احمد طاہر، سابق پروفیسر تعلیم الاسلام کالج؛ مبارک احمد عابد، سابق
فیسر تعلیم الاسلام کالج؛ ڈاکٹر شمیم احمد ساکن عسکری فائیو، لاہور؛ شیخ ناصر احمد خالد ساکن ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن،
ہور؛ ملک طاہر احمد آف حبیب بنک لمیٹڈ، لاہور؛ عبدالعزیز منگلا ساکن واپڈا ٹاؤن، لاہور؛ جاوید باجوہ ساکن
ونی، لاہور اور ربوہ میں مقیم میرے تایا زاد بھائی، محمد جمیل نے بھی میری درخواست پر اس کتاب یا اس کتاب کے
حصوں پر نظر ثانی کی اور بہت سی اغلاط کی نشاندہی کی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دوستوں کے مفید مشوروں
بغیر اس کتاب میں بہت سی خامیاں رہ جاتیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کو ان کی اس نیکی کی جزائے خیر دے۔

میں اپنی اہلیہ، راشدہ طاہر کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے اپنی خانگی مصروفیات اور کمزوریٔ صحت کے
جود پورے مسودے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، کئی اغلاط کی نشاندہی کی اور کتاب کی بہتری کے لیے بہت سی تجاویز
یں۔ خدا اُنہیں اُن کی اِس نیکی کی احسن جزا عطا فرمائے۔

یہ تو تھا ان احباب کا تذکرہ جنہوں نے اس کتاب کو موجودہ شکل تک لانے میں میرے ساتھ بے حد تعاون کیا۔
میں سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کا تہِ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے
ذرہ نوازی میری درخواست پر مسوّدے کے مطالعہ کے بعد اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمانا منظور کیا۔ یہ ایک
نے آقا سے ایک ایسی فرمائش تھی جس کا بظاہر کوئی جواز بھی نہ تھا مگر آپ نے اباجی مرحوم کی خدماتِ سلسلہ
پیش نظر میری خواہش کا احترام کیا اور وہ نوٹ لکھ کر ارسال فرمایا جو اس کتاب کی زینت بن چکا ہے۔ حضور کے
ت میرے لیے اور میری آنے والی نسلوں کے لیے سرمایۂ صد افتخار ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور کو
صحت و عافیت کے ساتھ رکھے اور آپ کو اپنی مہماتِ دینیہ میں بڑھ چڑھ کر کامیابیاں عطا فرمائے۔

میں استاذی المکرّم چوہدری محمد علی، وکیل التصنیف تحریک جدید انجمن احمدیہ اور ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی
مندار ہوں جنہوں نے میری درخواست پر اس کتاب کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہا فرمایا۔ ان
رگان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ چوہدری محمد علی تعلیم الاسلام کالج میں میرے ابتدائی
میں سے تھے۔ پرویز پروازی ابتدائے ربوہ میں ہمارے پڑوسی تھے۔ مجھے ان سے سکول اور کالج میں
موقع ملا ہے اور میں نے ان کی شفقت سے بھی ہمیشہ وافر حصہ پایا ہے۔ ان دونوں بزرگان کی مہربانی ہے
ہوں نے کمزوریٔ صحت اور اپنی علمی مصروفیات کے باوجود اس ہیچمدان کی یہ درخواست قبول کی۔ خدا اُن کی
عمر میں غیر معمولی برکت ڈالے۔

میں ملک خالد مسعود، ناظر اشاعت، صدر انجمن احمدیہ کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے اپنی گونا گوں
یات کے باوجود اس کتاب کے مطالعے کے لیے وقت نکالا اور یہ اہتمام فرمایا کہ نظارت کی طرف سے اس
مت کے لیے منظوری میں غیر ضروری تاخیر نہ ہو۔

''قریہء جاوداں'' کا مسودہ کئی ہفتے سے حتمی شکل اختیار کر چکا تھا تاہم اس کی طباعت میں بعض وجوہ کی بنا پر تاخیر ہوتی گئی۔ میرے جن احباب کو اس کتاب کا شدت سے انتظار تھا ان میں میری سب سے بڑی ہمشیرہ، عزیزہ ثناء اللہ (جنہیں ہم بھائی بہن ''آپا'' کہا کرتے تھے) سرفہرست تھیں جو ہر لمحے اس کتاب کی تکمیل کے لئے دعا گو رہتی تھیں۔ جب میں نے اس کتاب کا مسودہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمتِ اقدس میں ارسال کیا تو وہ بار بار اس خواہش کا اظہار کرتی تھیں کہ بفضلہ تعالیٰ حضور اسے بنظر استحسان دیکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مجھے حضور کا خط موصول ہوا اور میں نے یہ خط آپا کو لاہور سے فون پر پڑھ کر سنایا تو وہ بے حد خوش ہوئیں اور اپنی سعادت پر اتراتی رہیں۔ افسوس! وہ یہ کتاب پریس میں جانے سے دو روز پہلے مورخہ ۲۴ فروری ۲۰۱۵ء کو چند روزہ علالت کے بعد وفات پا گئیں۔ موصیہ اور انتہائی مخلص، دعا گو احمدی تھیں، خلفائے احمدیت سے والہانہ عشق رکھتی تھیں، تازہ الفضل کی بے چینی کی سے منتظر رہتیں اور ماسوا ایم ٹی اے کے کوئی اور ٹی وی چینل دیکھنا پسند نہ کرتیں۔

مجھے ان کے جانے کا غم ہے لیکن انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہوئے ان کی مغفرت کے لئے دعا گو ہوں۔ آپ بھی انہیں اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

اس کتاب کی اشاعت کثیر اخراجات کی متقاضی تھی جو مجھ ایسے شخص کے لیے اکیلے برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ جب اس حوالے سے میری بات اپنی منجھلی ہمشیرہ، صالحہ اہلیہ محمد ہادی مونس مقیم کینیڈا اور ان کے شوہر سے ہوئی تو انہوں نے اس کتاب کی کچھ جلدوں کی خریداری کا یقین دلایا۔ میری بھانجی عزیزہ بشریٰ اہلیہ ڈاکٹر عبدالقدوس مقیم امریکہ کو میری اس کاوش کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی پیچھے نہ رہیں اور انہوں نے بھی مجھ سے ایسا ہی وعدہ کیا ہے۔ میری مرحومہ بہن، عزیزہ ثناء اللہ اور میرے چچا، پروفیسر محمد ابراہیم ناصر کے صاحبزادے، ونگ کمانڈر (ر) محمد زکریا داؤد مقیم کینیڈا اور ان کی صاحبزادیوں، رضیہ احمد مقیم انگلینڈ اور صالحہ مسعود مقیم کینیڈا نے بھی اس معاملہ میں اسی طرح کی معاونت کی ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے بھانجے عمران اظہر مقیم کینیڈا اور خالد سعید مقیم امریکہ کی طرف سے حاصل ہونے والے تعاون کا ذکر نہ کروں۔ میرے ان عزیزوں کے علاوہ میرے بعض دیرینہ دوستوں بشمول یوسف مبشر مقیم اسلام آباد، ہدایت اللہ ہادی، کریم طاہر، ملک نصر اللہ خان اور قاضی مبارک احمد مقیمان کینیڈا، مبشر خان مقیم جرمنی؛ عبدالماجد مقیم فرانس؛ ڈاکٹر اسلم ناصر مقیم آسٹریلیا؛ فہیم احمد، ڈاکٹر کریم اللہ زیروی اور صفی اللہ چوہدری مقیمان امریکہ اور نصیر الدین عبید اللہ مقیم انگلستان نے بھی اس سلسلہ بہت مہربانی فرمائی اور یوں میں اس قابل ہو سکا کہ یہ کتاب آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ میں ان دوستوں کے اس نیک اور فیاضانہ جذبے کو سراہتے ہوئے ان کی صحت و عافیت اور ان کے رزق میں کشائش کے لیے دعا گو ہوں۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کے ذوقِ مطالعہ پر پوری اترے گی۔

محمد داؤد طاہر

۲۶ فروری ۲۰۱۵ء

۵۲ سی ۶، سرور روڈ، لاہور کینٹ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی عَبْدِهِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھوالنــاصر

لندن

14/11/23-Z

مکرم داؤد احمد طاہر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

☆ آپ کی طرف سے آپ کی یادوں پر مشتمل ربوہ کی تاریخ کا مسودہ بہ عنوان ''میرا بچپن جہاں گزرا'' ملا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

اسے جستہ جستہ میں نے پڑھا ہے۔ البتہ پارٹیشن کے وقت کے واقعات اور آپ کی ہمشیرہ کے حوالے سے یادیں خاص طور پر پڑھی ہیں۔ ماشاءاللہ دلچسپ یادیں آپ نے جمع کی ہیں۔

ربوہ کی بستی کی بہت سی یادیں ابھر کر سامنے آگئیں۔ میری تو پیدائش بھی ربوہ کی ہے اور جہاں تک میرا علم ہے اپنے خاندان میں میں پہلا لڑکا تھا جو ربوہ میں پیدا ہوا۔ اور پھر تمام عمر ربوہ میں گزاری۔ فیصل آباد یونیورسٹی میں جب پڑھتا تھا تو وہ تین سال کا عرصہ ربوہ سے باہر گزرا لیکن اس وقت بھی ہر ہفتہ دو دن کے لئے ربوہ آجایا کرتا تھا کہ اس کے بغیر طبیعت بے چین ہوتی تھی۔ پھر 2003ء تک صرف آٹھ سال ربوہ سے باہر گھانا مغربی افریقہ میں گزارے۔ اس سے ربوہ کی بستی سے میرے تعلق اور وہاں کے رہنے والوں سے میرے پیار کا آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔ تفصیل میں نہیں جاتا کہ جذبات کا زیادہ اظہار نہ ہو جائے۔ میری طبیعت کچھ ایسی ہے کہ ان کو قابو میں ہی رکھنا چاہتا ہوں۔

بہرحال آپ کی کتاب پڑھ کر ربوہ کے گلی کوچے اور پرانے لوگ ہنستے مسکراتے، قانع، پیار کرنے والے، عبادت کا حق ادا کرنے والے، ذکر الٰہی سے زبانوں کو تر رکھنے والے بزرگ نظروں کے سامنے آگئے۔ ان میں ایک آپ کے والد محترم مولانا محمد یعقوب طاہر صاحب تھے۔ لباس سادہ، چہرے پر مسکراہٹ۔ ہم بچے تھے ہم سے ہمیشہ مسکرا کر اور بڑے پیار سے بات کرتے اور یوں لگتا کہ دل سے یہ پیار پھوٹ رہا ہے۔ شاید اس لئے بھی زیادہ اظہار ہوتا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ خونی رشتہ بھی ہے۔ بہرحال مولانا [illegible] صاحب ایک مصروف شخصیت لیکن کوئی بے چینی نہیں۔

☆ اس کتاب کا نام ''میرا بچپن جہاں گزرا'' تجویز ہوا تھا جسے بعد میں بدل کر ''قریۂ جاوداں'' رکھ دیا گیا۔

حضرت مصلح موعود کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں تھا لیکن خوب نبھایا۔ محنت محنت اور محنت ان کا شیوہ لیکن میں نے اس کے باوجود کبھی ان کے چہرے پر سختی اور خشکی نہیں دیکھی۔ ہمیشہ خوبصورت مسکراتا پیار کرنے والا چہرہ میرے سامنے ان کا آجاتا ہے۔ اسی طرح ابراہیم ناصر صاحب حساب کے استاد ہونے کے باوجود مسکرانے والے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ ایسے خاندان کی نسل میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

بہر حال باتیں تو لمبی ہوتی چلی جارہی ہیں اور ہوتی چلی جائیں گی کہ ان لوگوں اور اس بستی کی یادیں ہی ایسی ہیں۔ اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس کوشش میں برکت ڈالے۔ ربوہ جو اب دنیا میں جانا جاتا ہے۔ چاہے اس کا نام حکومتی آمر جو مرضی رکھ دیں۔ اس کے ابتدائی لوگوں کے حالات اور اس کی تاریخ کا بھی لوگوں کو پتہ لگنا چاہئے کہ کس پیار، قناعت اور آپس کے تعلق کو نبھاتے ہوئے ربوہ کے ابتدائی باسیوں نے اپنی زندگیاں گزاریں تا کہ نئی نسلیں بھی اپنی حالتوں کے جائزے لیتی رہیں اور بزرگوں کو دعائیں دیتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلیں۔ آمین

اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء دے کہ بہت سے پرانے لوگوں کی یادیں آپ نے تازہ کروادیں۔

والسلام

خاکسار

مرزا مسرور احمد

خليفة المسيح الخامس

(مس) ١/٢/ [illegible]
[illegible] ربوہ

نقل دفتر PS لندن

حرفِ چند

میں عزیزم محمد داؤد طاہر کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب انہوں نے تعلیم الاسلام کالج میں نیا نیا داخلہ لیا تھ۔ اِن کے اختیاری مضامین میں سے ایک منطق تھا اور یہ مضمون انہیں میں پڑھایا کرتا تھا۔ میں نے چند ہی روز میں محسوس کرلیا کہ داؤد اپنے باقی ساتھی طلبہ سے قدرے مختلف ہیں اور پڑھائی میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ منطق پر ن کی گرفت اچھی خاصی تھی اور وہ کلاس ٹیسٹوں میں بالعموم فرسٹ آیا کرتے تھے۔ میں سنتا رہتا تھا کہ باقی مضامین میں بھی ان کی کارکردگی قابلِ تعریف رہتی ہے لہٰذا میں سمجھتا تھا کہ ان میں وہ جوہر موجود ہے جو سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان ایگزامینیشن میں ان کی کامیابی کی ضمانت بن سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے نہیں اُسی زمانے سے اِس امتحان میں شمولیت کا مشورہ دینا شروع کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سول سروس کے متحان کے لیے تیاری کریں تو اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ براہِ راست میری شاگردی میں یَک ہی سال رہے اور یوں ہمارا میل جول قدرے کم ہوگیا لیکن وہ جب بھی ملتے بہت سعادت مندی کے ساتھ۔

میں جانتا تھا کہ ان کے والدِ بزرگوار سلسلہ کے دیرینہ خدّام میں سے ہیں اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے خطبات اور تقاریر کو محفوظ کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ کچھ اُن کی وجہ سے، کچھ اِن کے چچا پروفیسر محمد ابراہیم ناصر کی وجہ سے جو ہمارے رفیقِ کار تھے اور لمبا عرصہ صدر شعبۂ ریاضی رہے اور کچھ ان کی اپنی وجہ سے میرے دل میں ن کے لیے ہمیشہ بے حد محبت رہی۔ ان کا بھی یہ کمال ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ ہمیشہ رابطہ برقرار رکھا اور میری صحت اور بیماری کے ہر دور میں انہوں نے مجھے یاد رکھا۔

انہیں کالج کے زمانے سے لکھنے کا شوق تھا اور ان کے بعض مضامین المنار اور الفضل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہ مضامین میری نظر سے گذرتے رہتے تھے اور ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق مجھے نظر آ رہا تھا کہ گر ان کا یہ ذوق وشوق اسی طرح برقرار رہا تو وہ ان شاء اللہ وقت آنے پر ایک اچھے ادیب بن کر ابھریں گے۔ حمد للہ میرا یہ خیال درست ثابت ہوا چنانچہ ۱۹۹۵ء میں جب ان کی پہلی کتاب ''شوق ہمسفر میرا'' آئی تو بفضلہٖ تعالیٰ سے قارئین کے ایک بڑے طبقے نے پسند کیا۔ یہ کتاب فیروز سنز جیسے معروف طباعتی ادارے نے شائع کی تھی اس یے جلد ہی کتابوں کی ہر بڑی دکان اور ہر اچھی لائبریری میں پہنچ گئی۔ الفضل کے ایڈیٹر نسیم سیفی کو بھی یہ کتاب خوب پسند آئی اور انہوں نے کئی بار الفضل میں اس کا ذکر کیا جس کی وجہ سے یہ کتاب جماعتی حلقوں میں بھی مقبول ہوئی۔

اس کے بعد ان کی کئی اور کتابیں جن کا تعلق بعض غیر ممالک کی سیاحت اور پنجاب کی تاریخ اور کلچر سے تھا چھپیں لیکن حال ہی میں انہوں نے ربوہ کی تاریخ کے حوالے سے جو کتاب لکھی ہے میرے نزدیک اس موضوع

پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں تاریخ ربوہ کے بعض ایسے پہلو اجاگر کئے گئے ہیں جو عام لوگوں بلکہ بعض محققین کی نظروں سے بھی چھپے ہوئے تھے۔

عزیزم محمد داؤد طاہر نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اس کتاب کا دیباچہ لکھوں۔ میں نے ان سے بہت معذرت کی تھی کہ میری صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی مگر اُن کا اصرار غالب رہا اور وہ مسودہ میرے پاس چھوڑ گئے۔

میں نے یہ مسودہ جستہ جستہ دیکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسے جہاں سے بھی پڑھنا شروع کیا، میں اس میں مگن ہو کر رہ گیا اور جب تک تھک نہیں گیا اسے پڑھتا رہا۔ ان کا حافظہ اللہ کے فضل سے بہت اچھا اور اندازِ بیان بہت شستہ اور رواں ہے۔ جب ربوہ کی بنیاد رکھی گئی تو داؤد پانچ سال کے بچے تھے لیکن انہیں اس دور کی بھی بعض باتیں انتہائی تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ اس حافظے اور ان کے اندازِ بیان نے مل کر ایک ایسی خوبصورت کتاب کو جنم دیا ہے جسے انشاء اللہ بے حد پسند کیا جائے گا اور بکثرت پڑھا جائے گا۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب جماعتی لٹریچر میں ایک عمدہ اضافہ ثابت ہوگی۔ وہ لوگ جنہوں نے ربوہ کو بنتے دیکھا ہے اس سے اور رنگ میں محظوظ ہوں گے اور وہ لوگ جن کی پیدائش اُس دور کے بعد کی ہے یہ کتاب پڑھ کر ربوہ کے اُس ماحول کا اندازہ لگا سکیں گے جس پر ہم ہمیشہ ناز کرتے رہے ہیں۔ وہ ماحول جو اَب خواب و خیال ہو چکا ہے اس کتاب کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میں نے اس کتاب کا وہ حصہ جس کا تعلق تعلیم الاسلام کالج اور اس کے اساتذہ سے ہے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے۔ میرے بہت سے رفقائے کار جو اَب وفات پا چکے ہیں کو اس کتاب نے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد، پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان، پروفیسر حبیب اللہ خان، پروفیسر شیخ محبوب عالم خالد، پروفیسر صوفی بشارت الرحمٰن، پروفیسر چوہدری محمد شریف خالد، پروفیسر چوہدری عطاء اللہ، مولانا ابوالعطا جالندھری، مولانا غلام احمد بدوملہوی، مولانا محمد الدین، پروفیسر چوہدری انور حسن، مکرم جنید ہاشمی صاحب اور شادی......غرض بہت سی ایسی شخصیات جن کے بغیر تعلیم الاسلام کالج کا تصور بھی محال تھا آپ اس کتاب میں چلتی پھرتی دیکھ سکتے ہیں۔ خدا ان سب سے مغفرت کا سلوک فرمائے۔

اگرچہ اس کتاب کا کوئی باب حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے لیے مختص نہیں کیا گیا لیکن اُن کا ذکر اس کتاب کے صفحات پر جا بجا پھیلا ہوا ہے۔ حضور کے بارے میں ان باتوں نے مجھے ان کی شفقت اور محبت کے کئی اور واقعات یاد دلا دیئے ہیں لیکن یہ موقع اُن کی تفصیل میں جانے کا نہیں ہے۔ خدا آپ کے مرقدِ مبارک پر انوار کی بارش کرے۔

میں اپنے نوٹ کو اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عزیزم محمد داؤد طاہر کے اس شوق کو مزید جلا بخشے اور وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مزید کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار رہوں۔

والسلام

چوہدری محمد علی

وکیل التصنیف تحریک جدید انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ

۱۵ نومبر ۲۰۱۴ء

شہرِ بے مثال کے مکیں

محمد داؤد طاہر نے اپنا ادبی سفر سفرنامہ نگاری سے شروع کیا۔ ان کے پہلے سفرنامے ''شوق ہمسفر میرا'' نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے اور ادبی آسمان پر ان کا نام درخشندہ ستارے کی طرح [illegible]۔ مستزاد یہ کہ ان کی کتاب فیروز سنز جیسے قدیم، مستند اور محکم علمی شہرت والے پبلشر نے شائع کی۔ اس [illegible] یہ کتاب وقیع علمی حلقوں اور لوگوں اور کتب خانوں میں پہنچ گئی۔ جیّد ادبی رسائل نے اس پر تبصرے کئے اور [illegible] و ادبا نے اس کتاب کو پذیرائی دی۔ اردو دان طبقوں کے مختلف، متنوّع اور بعض اوقات آپس میں [illegible] طور سے متصادم حلقوں کی جانب سے مختلف شہروں میں اس کتاب کی پذیرائی کے لیے تقریبات منعقد ہوئیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

اس پذیرائی نے ان کے شوق کو مہمیز کیا اور ان کا ادبی سفر تیز گامی سے جاری رہا۔ ان کے دو اور سفرنامے ''سفر زندگی ہے'' اور ''اک سفر اور سہی'' اور پنجاب کی تاریخ، کلچر اور ثقافت پر چار کتابیں (''منزل نہ کر قبول'' ''منزلیں ہیں پکارتی'' ''اک جہاں اور'' اور ''ارمغانِ ملتان'') منصۂ شہود پر آ کر اہلِ علم سے خراج حاصل کر چکی ہیں۔

اب اعلیٰ سرکاری ملازمت (ممبر سنٹرل بورڈ آف ریونیو اور ممبر پنجاب پبلک سروس کمیشن) کی گراں باری سے سبکدوش ہونے کے بعد محمد داؤد طاہر نے اپنے شہر اور شہر کے لوگوں کے حالات اپنے مخصوص تحقیقی اور تجزیاتی [illegible] میں قلمبند کئے ہیں اور یہی کتاب ہے جس پر دیباچہ لکھنے کی ذمہ داری انہوں نے مجھ پر ڈالی ہے کہ ہم دونوں [illegible] شہر میں پیدا ہوئے اور ایک ہی شہر میں اور پڑوس میں پروان چڑھے ہیں۔ اتفاقِ حسنہ سے ایک ہی سکول [illegible] میں تعلیم حاصل کی۔ یہ الگ بات ہے مجھے اس سکول اور کالج میں تدریس کا شرف بھی حاصل رہا اور [illegible] طاہر عمر میں چھوٹے ہونے کے باعث سکول اور کالج دونوں جگہ میرے شاگرد بھی رہے۔ اس لیے [illegible] شہر کے گلی کوچے، ہمارے شہر کے لوگ سب ہمارے دیکھے بھالے ہیں۔ ہم نے اس وادیٔ غیر ذی زرع کو [illegible] سبز و شاداب شہر میں بدلتے اور خود کو اور اپنے ہم عمر بچوں کو بڑھتے، جوان ہوتے اور بوڑھا ہوتے ساتھ ہی [illegible] ہے اور دیدِ باہمی نے ہی شاید اس کتاب کی دیباچہ نگاری کے لیے ان کی توجہ میری طرف مبذول کی ہے [illegible] اردو کا کوئی بھی بڑے سے بڑا ادیب ان کی کتاب کا دیباچہ لکھنے میں مسرت محسوس کرتا۔ ہم دونوں نے برسوں [illegible] خاک کو خاکِ شفا سمجھ کر پھانکا ہے اور زندگی نے جو کچھ ہمیں دیا ہے اسی کا ثمرہ ہے۔

سوانحی ادب میں احوالُ الرّجال یعنی دوسروں کی شخصیت کو دیکھنا، پرکھنا اور بیان کرنا ایک خاص اسلوب کا

متقاضی ہوتا ہے کیونکہ دوسروں کی شخصیت کو بیان کرنا دراصل دوسروں کو اپنی شخصیت کے آئینہ میں دیکھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ آئینہ دُھندلا ہے تو تصویر دُھندلی رہے گی، آئینہ صاف ہے تو تصویر صاف ہوگی اس لیے احوال الرّجال کا حق صرف اسے پہنچتا ہے جس کا اپنا آئینہ صاف ہو اور وہ دیانت داری کے ساتھ تصویر کو منعکس کر سکے۔ افراد کو گننا آسان ہوتا ہے مگر افراد کی شخصیت کو جاننا، پہچاننا مشکل بلکہ بہت حد تک ناممکن، اسی لیے سوانحی ادب میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کون ہے جس نے اپنے اردگرد بسنے والے افراد کے انبوہ سے کتنی شخصیتوں کو جانا اور پہچانا ہے۔ یہی حال شہروں کے احوال کا ہے۔ شہر صرف مکانوں اور گلیوں، کوچوں کا نام نہیں ہوتا۔ ہر شہر کی اپنی پہچان اور شخصیت ہوتی ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بنتی، بگڑتی اور قائم رہتی ہے۔ شہروں کا احوال لکھنے کی بات چلے تو بات میر انیس تک جا پہنچتی ہے

یہ بے سبب نہیں سُونے گھروں کے سنّاٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

سفرنامہ میں بھی مکانوں کے ساتھ مکین زیرِ بحث آتے چلے جاتے ہیں مگر شہر کی بات ہو تو مکانوں کے مکین مکین نہیں رہتے، جیتا جاگتا وجود بن جاتے ہیں جن سے مکان کی دیواروں میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ ہم جن کچے مکانوں میں رہتے تھے وہ مکان تو کب کے پیوندِ خاک ہو چکے مگر ان کچی دیواروں کے ساتھ جو یادیں وابستہ تھیں وہ اسی طرح زندہ اور چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور لکھنے والا ان کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہو ہو جاتا ہے۔ میں اس کتاب کا مسودہ پڑھتے ہوئے کئی بار رک رک جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ ہمارے شہر کے لوگ کہاں جا بسے ہیں۔ کچھ تو سڑک کے پار جا سوئے ہیں

پڑے ہیں خاک میں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی حسینوں کو

اور کچھ ہم جیسے بدنصیب ملک چھوڑ کر در بہ در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ محمد داؤد طاہر نے اس شہرِ بے مثال کی خاک یاد کروادی ہے۔

کچھ سال پہلے میرے ایک عزیز شاگرد جو اِن ہی کی طرح بہت بڑے سرکاری افسر ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں سرکاری دورہ پر یہاں ٹورنٹو میں وارد ہوئے۔ میں بیمار تھا اس لیے میری عیادت کو بھی آئے۔ ملتے ہوئے میں نے ان کے کوٹ کو چوما۔ بعد کو میرا بیٹا کہنے لگا: آپ مہمان کے کوٹ کو کیوں چوم رہے تھے؟ میں نے کہا بیٹا میں اپنے شہر کی خاک کو چوم رہا تھا جو شاید اس کوٹ کے ساتھ اڑ کر یہاں آ گئی ہو!

محمد داؤد طاہر کا لکھنے کا خاص اسلوب ہے۔ وہ ہر چیز کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد قبول کرتے ہیں۔ کئی بار آپ نے مجھ سے بعض باتوں کے باب میں استفسار کیا مگر اس وقت تک اس بات کو قبول نہیں کیا جب تک دوسرے ذرائع سے بھی اس کا معیّن ثبوت نہیں مل گیا۔ یہ ان کی ملازمت کی تربیت کا فیضان ہے۔ اس کتاب میں بھی ان کی یہ تحقیقی روش قائم ہے اور اس تحقیقی روش کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے سلسلہ کے پرانے پرچوں کو

حتا ہے اور جب تک کسی بات کی توثیق نہیں ہوگئی اسے درج نہیں کیا۔ کچھ دنوں کی بات ہے میں نے ان کا
بھیجا ہوا مسوّدہ پڑھنے کے بعد ایک بزرگ کے مرتبہ کے بارے میں انہیں توجہ دلائی۔ ان کا جواب آیا کہ ان کی
ت پر ان کے بارے میں جو مضمون برسوں قبل چھپا تھا اس میں وہ بات اسی طرح لکھی ہوئی ہے جس طرح میں
ے کتاب میں درج کی ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس تو اس بات کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے محمد داؤد طاہر
بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ انہوں نے بنیادی حوالوں سے استفادہ کیا ہے۔ پھر وہ پاکستان میں موجود
۔ گرچہ اُس زمانہ کے بزرگوں کے باب میں جاننے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں مگر محمد داؤد طاہر کی ہمت کی
ینا چاہئے کہ وہ اپنی بات کی تصدیق کے لیے دور دراز کے احباب سے فون، خط یا فیکس یا ملاقات کے ذریعہ
بات کی تصدیق چاہتے ہیں تب اسے قبول کرتے ہیں۔ اتنے جنجال میں کون پڑتا ہے؟ وہی جسے اپنی بات کو
بنانے کا خیال ہو۔ اپنے سکول اور کالج کے ہم جماعت دوستوں کے بارے میں جاننے کے لیے تو
داؤد طاہر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جس کے بارے میں کہیں سے ذرا سی بھی بھنک پڑی اس دوست کو
ڈھونڈنے پر مستعد ہو گئے اور جب تک اسے ڈھونڈ نہیں نکالا چین سے نہیں بیٹھے۔ اور تو اور

اب یادِ رفتگان کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

بات بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہوئی۔ فوت شدہ ہستیوں کے بارے میں لکھنے سے قبل محمد داؤد طاہر نے
ستانوں میں جا جا کر کتبے تک پڑھے اور رفتگان سے بھی اپنی باتوں کی تصدیق چاہی ہے۔

اس کتاب میں اس شہرِ بے مثال کے چھوٹے، بڑے، عالم، غیر عالم (جاہل اس لیے نہیں لکھا کہ اس شہر
میں کوئی نہیں تھا) مرد، عورت، دکاندار، پیشہ ور، پڑھے لکھے، اَن پڑھ، خدمتگار، مخدوم، طالب علم، استاد، اور
شہر کی مشہور مصنوعات، ادویات، ڈاکٹر، حکیم، مریض، عاقل اور غیر عاقل کوئی بھی ان کی نگاہِ باریک بیں سے
نہیں رہ پایا۔

ہر شے کو تاریخ کا حصہ بنا دینے کی لگن اور دھن میں لکھی گئی یہ کتاب اپنے شہر اور شہر کے مکینوں کی مستند
بن گئی ہے جس میں محمد داؤد طاہر کے شگفتہ اور رواں دواں اسلوب نے عجیب چاشنی پیدا کر دی ہے۔
اس کتاب کے مسوّدہ کو پڑھتے ہوئے اردگرد سے بالکل بے نیاز ہو جاتا تھا کہ مجھے اس شہر اور شہر کے
سے واقفیت اور لگاؤ بھی ہے مگر مجھے یقینِ واثق ہے کہ دوسرے قارئین بھی اسی دلجمعی کے ساتھ اس
کتاب کا مطالعہ کر سکیں گے۔ لطف خواندگی ہی اس کتاب کا جوہر ہے اور یہی جوہر ہے جو اَب نایاب
ب تر ہوتا جا رہا ہے۔

(ڈاکٹر) پرویز پروازی
ٹورنٹو کینیڈا

اکتوبر ۲۰۱۴ء

اُس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے

بھیرہ سے قریباً تیرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ریلوے سٹیشن میانی سے ملحق گھوگھیاٹ نامی ایک گاؤں ہے۔ میرے پردادا، حضرت میاں قطب الدین اسی گاؤں کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ موصوف بہت ہی نیک، صوم وصلوٰۃ کے پابند، تہجد گذار اور قرآن کریم کے عاشقِ صادق تھے۔ میرے والد محترم، مولانا محمد یعقوب طاہر، انچارج صیغہ زودنویسی، صدر انجمن احمدیہ، ربوہ (جن کا اس کتاب میں ذکر ''ابا جی'' کے طور پر کیا جائے گا) کے بیان کے مطابق ''گاؤں کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض آپ ہی سرانجام دیتے۔ آپ کے حلقۂ درس میں گاؤں کے سب لڑکے لڑکیاں شامل ہوتیں اور آپ سے قرآنِ پاک کی تعلیم حاصل کرتیں۔ آپ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل اور آپ کے خاندان سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ مولوی غلام احمد جو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے بڑے بھائی تھے اور بھیرہ سے نقلِ مکانی کر کے میانی میں ہی آباد ہو گئے تھے اور وہیں ''قبرستانِ مخدوماں'' میں ان کا مزار ہے ان کے ساتھ گہرے مراسم دوستانہ تھے۔ زمانہ کی تاریکی دیکھتے ہوئے امام مہدی کی آمد کی پیشگوئی اکثر ان کی زبان پر جاری رہتی تھی۔ دعائیں بھی فرماتے کہ الٰہی آسمان سے نور نازل فرما تا کہ دین کو تاریکیوں سے نجات ملے۔ آخر خدا نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے ذریعہ آپ کے کانوں میں پہلی مرتبہ یہ آواز پہنچائی کہ امامِ موعود کا ظہور قادیان کی مبارک سرزمین میں ہو گیا ہے۔ پھر کیا تھا آپ نے اپنے مقصود کو پا لیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل ایسا عالم، عارف اور مقدس انسان خبر دینے والا اور خبر بھی وہ جس کا خود بھی مدتوں سے انتظار ہو تو پھر مخالفت کا کیا سوال تھا، فوراً بیعت کر لی۔''

ان کے ایک صاحبزادے اور میرے دادا حضرت مولوی فخر الدین (جن کا اس کتاب میں ذکر ''دادا جی'' کے طور پر کیا جائے گا) کے ایک مضمون کے مطابق جو چودہ اپریل ۱۹۳۴ء کے الحکم میں شائع ہو چکا ہے وہ ۱۸۹۴ء یا ۱۸۹۵ء میں قادیان حاضر ہو کر حضرت مسیح موعود کی دستی بیعت سے مشرف ہوئے تھے اور انہوں نے ۲۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو وفات پائی۔

جہاں تک دادا جی کا تعلق ہے آپ کا زمانہ تولد ۱۸۷۸ء کے قریب ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم میانی اور پھر بھیرہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے زیرِ سایہ حاصل کی۔ تعلیمی اخراجات کے علاوہ آپ کے خورونوش کے خراجات بھی حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل ہی ادا فرماتے تھے۔ ماسٹر عبدالرحمٰن جالندھری (سابق مہر سنگھ) ان دنوں آپ کے ہم سبق تھے۔ ۱۸۹۶ء میں آپ حضرت مسیح موعود کے حلقہ غلامی میں شامل ہوئے لیکن دستی بیعت کا شرف اس کے بعد ۱۸۹۸ء میں حاصل ہوا۔ ۱۸۹۹ء کے آخر میں آپ حضرت مسیح موعود کی اجازت سے تلاشِ روزگار کے سلسلہ میں مشرقی افریقہ تشریف لے گئے جہاں سے واپسی جولائی ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے گورنمنٹ

سروس اختیار کر لی۔ بیس سال تک کیمل کور ۵۴ لاہور چھاؤنی میں ہیڈ کلرک کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد نوشہرہ، رسالپور، پشاور، کوئٹہ اور کوہاٹ بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ ۱۹۳۲ء میں پنشن پر قادیان آ گئے اور صدر انجمن احمدیہ کے مختلف دفاتر میں مختلف حیثیتوں سے آنریری خدمات سرانجام دیتے رہے۔

''تاریخ احمدیت'' جلد سوم میں یہ ذکر موجود ہے کہ ''حضرت اقدس کے متعدد نشانات دیکھنے کا انہیں موقع نصیب ہوا مثلاً ۱۹۰۳ء میں ان کے چھوٹے بھائی اور اہلیہ طاعون میں خطرناک طور پر مبتلا ہو گئے۔ حضرت اقدس کی خدمت میں درخواستِ دعا لکھی تو حضور کا جواب آیا کہ اللہ تعالیٰ صحت دے گا چنانچہ وہ خارق عادت طور پر صحتیاب ہو گئے۔''

آپ نے ۱۰ نومبر ۱۹۴۰ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ قادیان کے قطعہ خاص میں دفن ہوئے۔ قبر پر لگے ہوئے کتبہ کے مطابق ''مرحوم نہایت مخلص احمدی تھے۔ متوکّل، مستجابُ الدّعوات، صاحبِ کشف والہامات اور زاہدِ شب زندہ دار تھے۔ عوام سے نیک سلوک کرنے کے عادی، مجسمۂ اخلاق، حد درجہ نیک طبیعت، سادہ وضع اور نمونۂ سلف تھے۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے حضرت مسیح موعود کی غلامی اختیار کی۔ پنشن لینے کے بعد کچھ عرصہ نظارت دعوت و...... میں اور پھر ایک لمبا عرصہ نظارت بیت المال میں پرنسپل اسسٹنٹ کے طور پر آنریری خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آخر میں امانت فنڈ تحریک جدید کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔

افسوس! چمنستانِ زندگی کی صرف ۵۹ بہاریں دیکھ کر محفلِ احمدیت کی یہ شمع دس گیارہ نومبر ۱۹۴۰ء کی درمیانی شب ہمیشہ کے لیے گُل ہو گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔''

اللہ تعالیٰ نے دادا جی کو پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ بیٹوں کے نام علی الترتیب محمد اسحٰق، محمد یعقوب، محمد اسماعیل، محمد ابراہیم اور محمد یوسف تھے جب کہ بیٹیوں کے نام رضیہ اور ناصرہ تھے۔ اس اعتبار سے ابا جی اپنے بھائی بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔

ابا جی ۲۷ جنوری ۱۹۰۸ء کو اپنے ننہیال موضع گڑھی کالا ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم لاہور اور میانی میں حاصل کی جس کے بعد آپ کو مدرسہ احمدیہ قادیان میں داخل کرا دیا گیا۔ آپ نے ۱۹۲۹ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اس سے اگلے سال یعنی ۱۹۳۰ء میں الفضل کے ایڈیٹوریل سٹاف میں شامل ہو گئے۔

آپ جماعت کے ایک معروف صحافی اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے لیکن آپ کی اصل وجہ شہرت آپ کی وہ خدمت ہے جو آپ نے بطور انچارج صیغہ زود نویسی سرانجام دی۔ ابا جی کی اسی خداداد صلاحیت کی بدولت حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے لاتعداد خطبات، تقاریر، ملفوظات اور دروس القرآن آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز ہی ایک اخبار نویس کی حیثیت سے کیا تھا چنانچہ آپ بارہ سال الفضل کے نائب ایڈیٹر اور تقریباً سات سال تک ماہنامہ مصباح کے مدیر رہے۔

الفضل کے ادارہ تحریر میں شمولیت کے دوران آپ کی خدمات خدا کے فضل سے بہت مقبول ہوئیں چنانچہ

ب ابا جی ادارہ الفضل سے تبدیل ہو کر صیغہ زودنویسی میں چلے گئے تو سید زین العابدین ولی اللہ شاہ نے آپ کی ... بک میں ازراہِ خوشنودی لکھا کہ: ''مولوی محمد یعقوب صاحب فاضل نے ساڑھے پانچ سال میرے ... رت میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر ادارہ الفضل میں کام کیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب ان کے کام سے خوش رہے ہیں ... میں بھی ان کے مضامین کا بغور مطالعہ کرتا رہا ہوں اور یہ اثر حاصل کیا ہے کہ وہ اپنے مضامین کو کافی محنت سے ... تے ہیں اور ان کی یہ جدوجہد معلوم ہوتی ہے کہ انہیں پبلک کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنایا جائے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے لیے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں گے۔''

ابا جی مصباح کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے کہ آپ نے صدر انجمن احمدیہ کے ایک فیصلہ کے ... دسمبر ۱۹۳۰ء سے مصباح کو ماہوار شائع کرنا شروع کر دیا۔ اُس وقت مصباح کی مالی حالت سخت کمزور تھی مگر ... نے آپ کی مساعی میں برکت ڈالی اور اپنے فضل و کرم سے ایسے سامان پیدا فرما دیئے کہ یہ رسالہ نہ صرف ... شائع ہونے لگا بلکہ اسے مضامین کے اعتبار سے بھی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ خود ... خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے اس کے مضامین کی تعریف فرمائی چنانچہ ۳ فروری ۱۹۳۹ء کے خطبہ جمعہ میں حضور نے ... لڑکیوں کی دینی تعلیم بہت حد تک ترقی کر گئی ہے بلکہ بعض دفعہ لڑکیوں کے مضامین دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ... ہے کہ وہ بہت سے لڑکوں کے مضامین سے بھی اچھے ہوتے ہیں۔''

مجلسِ مشاورت ۱۹۴۰ء کے موقع پر تو حضور نے یہاں تک فرمایا کہ ''مدرسہ احمدیہ بلکہ جامعہ احمدیہ کے ... سے ہماری لڑکیاں دینی معلومات میں زیادہ ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کے لکھے ہوئے مضامین دیکھے ... تو مستند کے اچھے مصنفین کے پایہ کے ہوتے ہیں۔''

ابا جی اپنی ایک ڈائری میں لکھتے ہیں: ''حضور کے ان ارشادات پر میں جس قدر بھی شکر بجا لاؤں کم ہے ... گو اس میں میری نہیں بلکہ جماعت احمدیہ کی لڑکیوں کی تعریف کی گئی ہے مگر مجھے خوشی ہے کہ حضور نے اس ... کے مضامین کی تعریف فرمائی جسے میں مرتب کیا کرتا تھا اور یہ بات حقیقت کے خلاف نہیں ہے کہ ان ... کے حصول میں میری دن رات کی سعی اور کوشش کا دخل ہے جو کسی مادی معاوضہ کی خواہش یا دنیوی نفع کی ... بغیر میں نے کی اور جس کے اجر کی توقع میں اللہ تعالیٰ سے ہی رکھتا ہوں۔''

آپ کی ان مساعی کا اعتراف صدر انجمن احمدیہ کی سالانہ رپورٹ بابت ۳۹-۱۹۳۸ء میں ان الفاظ میں ... ہے: ''مصباح کے ادارتی اور ایک حد تک انتظامی فرائض مولوی محمد یعقوب صاحب مولوی فاضل ... ایڈیٹر الفضل کے سپرد ہیں جو بہت شوق اور دلچسپی سے یہ فرائض آنریری طور پر سرانجام دے رہے ہیں ... سعی بہت مفید ثابت ہو رہی ہے۔''

جہاں تک ابا جی کی شاعری کا تعلق ہے، اس کا آغاز بائیس سال کی عمر میں ہوا جب آپ کی زبان پر خود ... اشعار جاری ہو گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک آپ غزلیں کہتے رہے اور اپنے حلقہ احباب میں ... ہے مگر وہ کسی اخبار یا رسالہ میں شائع نہیں ہوئیں۔ آپ بتایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ آپ کے دل میں

بڑے زور سے یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگوں کے اخلاقی بگاڑ میں کسی حد تک اس شعروشاعری کا بھی دخل ہے جس میں اظہارِ عشق کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور جس کے نتیجہ میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دل میں شیطانی وسوسے انگڑائی لینے لگتے ہیں چنانچہ آپ نے اپنی یہ تمام غزلیں ضائع کر دیں اور فیصلہ کر لیا کہ آپ کا صرف وہی کلام لوگوں کے سامنے رہنا چاہیئے جو دینی جذبات پر مشتمل ہو۔ آپ نے اپنی وہ نظمیں جو سلسلہ کے اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکی تھیں اور بعض غیر مطبوعہ نظمیں ایک نوٹ بک میں ''جذباتِ طاہر'' کے نام سے محفوظ کر رکھی تھیں لیکن افسوس قادیان سے ہجرت کے وقت یہ کلام ضائع ہو گیا۔

سلسلہ کے اخبارات و جرائد میں آپ کی بعض نظمیں مل جاتی ہیں۔ ان نظموں پر دینی اور اصلاحی یا قومی رنگ غالب ہے۔ چوہدری ظہور احمد ناظر دیوان اپنی کتاب ''کشمیر کی کہانی'' میں رقمطراز ہیں کہ حضرت مصلح موعود کی کشمیر کمیٹی کی صدارت کے زمانہ میں ابا جی کی یہ نظم مسلمانانِ کشمیر میں بے حد مقبول ہوئی اور حاضرین کا لہو گرمانے کے لیے اکثر جلسوں میں پڑھی جاتی تھی:

الحذر! اے مسلمِ صیدِ حوادث!! الحذر!!
دیکھ برقِ اُقْتُلُوْا چمکی خدارا کر نظر
دامنِ کشمیر پر دھبے پڑے ہیں خون کے
اور تُو سویا پڑا ہے اُف تری غیرت کدھر
تیری قوت سے تو مرحب بھی ہوا تھا سرنگوں
تیرے بازو سے تو تھا ٹکڑے ہوا خیبر کا دَر
تیری ہیبت سے تھے لرزاں مالکانِ تخت و تاج
تیرے دم سے قیصر و کسریٰ ہوئے زیر و زَبر
آج کیوں تیری رگوں کے خون میں حدّت نہیں
صولتِ فاروقِ اعظم کس لیے ہے مُستَتَر
دشمنانِ بدگہر کی شانِ نمرودی تو دیکھ
گولیوں سے چھید ڈالے سینہ و قلب و جگر
ظالمانِ ہند نے توڑے ہیں ستم وہ اَلاماں
گُرگ بھی دانتوں تلے انگلی دبائیں دیکھ کر
رقصِ بِسمل منظرِ خونیں تماشا کر دیا
ظالموں کے ظلم نے دل پارا پارا کر دیا
اے اسیر حلقۂ زنجیر غم، صیدِ ملال
تُو نے گر جینا ہے دِکھلا اپنی قوت کے کمال

توڑ دے زنداں کا در اور سانس حُرّیت کا لے
کاٹ دے تیغِ محبت سے عداوت کا نہال
ساحروں کی شکل میں گر سامنے آئیں عنید
مُوسوی سونٹا چلا ٹکڑے ہو تا دامِ جہال
پرچمِ خاقانی و فغفور کر پیوندِ خاک!
پھر بٹھا عالم پر اپنی چار سُو مردانہ دھاک

یہاں شاید اس امر کا ذکر بے جا نہ ہو آپ نے نظارت تصنیف و تالیف کی ہدایت پر ثاقب زیروی کی منظوم تصنیف ''شاہنامہ احمدیت'' پر نظر ثانی بھی کی۔ یاد رہے کہ بعد میں اس کتاب کے بعض حصے ابتداءً ''...کامل'' کے نام سے اور پھر ''دورِ خسروی'' کے نام سے شائع ہوئے۔

اور اب کچھ ذکر زودنویس کے طور پر آپ کی خدمات کا!

زودنویسی کے علیحدہ صیغہ کا قیام تو فروری ۱۹۴۵ء میں عمل میں آیا تھا لیکن آپ نے زودنویسی کا کام اس سے بہت عرصہ قبل اس دن شروع کر دیا تھا جس دن آپ کو الفضل کے ادارہ تحریر میں شامل کیا گیا چنانچہ آپ خود ہی تحریر کرتے ہیں ''۲۵ مئی ۱۹۳۰ء میری زودنویسی کا یوم آغاز ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ میری زودنویسی کا آغاز بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے درس القرآن سے ہوا اور درس القرآن بھی وہ جو ...ق کا تھا چنانچہ پہلا درس جو میں نے لکھا وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ سے شروع ہوتا ہے۔ ...نو آموز اور ناتجربہ کار ہونے کے یہ درس خدا تعالیٰ کے فضل سے ایسا اچھا لکھا گیا کہ خواجہ غلام نبی صاحب ...نے اس کو اخبار میں شائع کیا اور پھر بعد میں مستقل طور پر درس لکھنے کا کام میرے ہی سپرد کر دیا گیا۔''

اس عرصہ میں دروس القرآن کے علاوہ حضور کے خطبات، ملفوظات اور تقاریر وغیرہ کو ضبطِ تحریر میں لانے کا ...بھی آپ کے سپرد ہی رہا چنانچہ آپ کی قلم کا لکھا ہوا پہلا خطبہ ۲۷ فروری ۱۹۳۱ء کا ہے جو الفضل ۵ مارچ ۱۹۳۱ء ...ئع ہوا، پہلی تقریر ۲۸ فروری ۱۹۳۱ء کی ہے جو الفضل ۱۰ مارچ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اور پہلے ملفوظات ۲۵ ...۱۹۳ء کے ہیں جو الفضل ۱۷ مارچ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد سے حضور کی تقاریر، خطبات، ...قرآن، ملفوظات اور رؤیا و کشوف کا زیادہ حصہ آپ ہی کی محنت کے طفیل ہمارے سامنے موجود ہے۔

بحیثیت زودنویس حضور کی طرف سے دیگر مفوضہ فرائض کی ادائی بھی ابا جی ہی کو کرنا ہوتی تھی چنانچہ بعض ...خطوط جن کا جواب تحقیق طلب ہوتا حضور کے ارشاد پر ابا جی ہی تحریر فرمایا کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد تو ...اپنے اکثر مضامین اور پیغامات وغیرہ ابا جی کو ہی لکھوانے لگے تھے۔

آپ کو حضور کی بعض کتب کے مسودات تحریر کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

تفسیر صغیر سے متعلق یہ امر خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جب یہ کام مکمل ہو چکا اور تفسیر چھپ کر تیار ہو گئی تو ...سلسلہ میں خاص کام کرنے والوں کو حضور نے جلسہ سالانہ ۱۹۵۷ء کے موقع پر اظہارِ خوشنودی کے طور پر کچھ رقم بطور

انعام عطا فرمائی۔ ان خوش نصیب اصحاب میں سے ایک ابا جی بھی تھے جن کے ہاتھوں نے حضور کے دستِ مبارک سے ڈیڑھ صد روپیہ کی تھیلی وصول کی۔

حضور نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل سنت تو یہ ہے کہ اچھا کام کرنے والوں کو خطابات دیئے جائیں چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو ''سَیفٌ مِّنْ سَیُوْفُ اللہِ'' کا خطاب عطا فرمایا تھا لیکن چونکہ خطابات کا کام غور وفکر چاہتا ہے اور میں نے اس پر ابھی غور نہیں کیا اس لیے فی الحال میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ اس سال جماعت کی طرف سے کسی قدر، کام کرنے والوں کی دلجوئی اور ان کے کام کی خوشنودی کے طور پر کچھ رقم انعام کے طور پر تقسیم کر دی جائے۔''

بحیثیت زودنویس ابا جی صیغہ زودنویسی کے قیام سے لے کر اپنی وفات تک حضور کے اکثر سفروں میں آپ کے ہمرکاب رہے۔

حضور آپ کے کام سے مطمئن رہے اور کئی دفعہ آپ کے متعلق تعریفی کلمات ادا فرمائے چنانچہ ایک دفعہ جب آپ نے ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء کا خطبہ جمعہ صاف کر کے حضور کی خدمت میں پیش کیا تو حضور نے نظر ثانی کے بعد اس کے سرورق پر اپنے قلم سے یہ نوٹ تحریر فرمایا:

''جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ خوب لکھا ہے۔ اخبار میں خاص طور پر نوٹ دے دیا جائے کہ اس خطبہ کو تمام جماعتیں پڑھ کر سنائیں۔ جو لوگ جمعہ میں نہ آسکیں ان کے گھروں پر جا کر انہیں پڑھوائیں یا سنائیں اور بار بار پڑھا جائے۔''

صیغہ زودنویسی کے قیام پر مجلس مشاورت ۱۹۴۵ء میں اس صیغہ کا ذکر کرتے ہوئے حضور نے فرمایا ''عملی طور پر صرف مولوی محمد یعقوب صاحب ہی اس وقت سب کام کر رہے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے قدرتی طور پر زودنویسی کا ملکہ عطا کیا ہوا ہے اور جو اکثر خطبات اور ڈائریاں وغیرہ نہایت صحیح لکھتے ہیں...... ان کے لکھے ہوئے مضمون کے متعلق میرا ذہن یہ تو تسلیم کر سکتا تھا کہ کسی بات کے بیان کرنے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہو مگر میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ انہوں نے کسی بات کو غلط طور پر تحریر کیا ہے۔''

ددھیال کے ذکرِ خیر کے بعد اب کچھ ذکر اپنے ننھیال کا!

میرے ننھیال کا تعلق ضلع گجرات کے موضع بُلانی سے تھا۔ حضرت مرزا جلال الدین جن کا نام حضرت مسیح موعود نے اپنے ۳۱۳ رفقائے کبار میں سرِ فہرست رکھا ہے امی کے دادا تھے۔ اگرچہ وہ تو حضور کے دعویٰ سے بھی پہلے آپ کی غلامی میں آنے کے لیے بیتاب تھے تاہم حضور ان کی اس درخواست کی قبولیت مؤخر فرماتے رہے تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اس امر کی اجازت نہ حاصل ہو جائے اور یوں انہیں حضور کے اوّلین بیعت کنندگان میں شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت مسیح موعود کے ۳۱۳ رفقا کے بارے میں نصر اللہ خان ناصر اور عاصم جمالی کی تحقیق کے مطابق ''حضرت منشی جلال الدین ...... مغل برلاس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد قندھار...... سے ہجرت کر کے صوبہ پنجاب کے علاقہ گجرات میں آئے تھے۔ آپ کے والد کا نام مرزا غلام قادر صاحب

تھے جواس علاقہ میں طبیب تھے۔ آپ ۱۸۳۰ء کو موضع بلانی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر سات سال تھی کہ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا چنانچہ آپ کے ماموں مرزا زین العابدین نے آپ کے لیے گھر پر اساتذہ رکھ کر آپ کو تعلیم دلائی۔ آپ فارسی اور عربی کے معروف عالم تھے۔ چودہ برس کی عمر میں آپ کی شادی ہو گئی اور اسی عمر میں آپ کو سرکاری ملازمت مل گئی۔ ۱۸۶۴ء تک ملازمت کرتے رہے۔ بعد ازاں میر منشی کے طور پر فوج میں بھرتی ہو گئے اور ۱۸۹۵ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے۔

۱۸۷۸ء میں اخبار ''منشور محمدی'' بنگلور میں آپ کی نظر سے حضرت اقدس مسیح موعود کا ایک مضمون گذرا۔ مضمون پڑھتے ہی دل نے گواہی دی کہ یہ مضمون کسی عام آدمی کا نہیں ہو سکتا۔ یہ یقیناً وہی شخص ہے جس کی آمد کے بارے میں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں ہیں چنانچہ آپ قادیان کے لیے روانہ ہو گئے مگر کسی روک کے باعث آپ واپس لوٹ آئے۔

ایک دفعہ حضرت اقدس مسیح موعود کی خواب میں زیارت ہوئی تو دل کی بے قراریاں اور بڑھ گئیں۔ دوبارہ جب حضرت اقدس کی زیارت خواب میں ہوئی تو آپ نے حضور کا دامن پکڑ لیا اور عرض کیا: حضور! آپ مجھے اپنے جائے قیام سے مطلع فرمائیں تو حضرت نے آپ کو نام ور ہائش بتادی۔

جب آپ کی رجمنٹ جھانسی چلی گئی تو ۱۸۸۲ء یا ۱۸۸۳ء میں آپ نے چند ماہ کی رخصت لی اور قادیان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ یکّے والا حضرت اقدس کے علاوہ کسی اور کے پاس آپ کو لے گیا تو آپ نے کہا کہ یہ وہ شخص نہیں۔ اس پر یکّے والا حضرت اقدس کے پاس لے گیا۔ حضورِ پُر نور کو دیکھتے ہی آپ نے پہچان لیا اور بیعت کی درخواست کی لیکن حضرت اقدس نے فرمایا کہ ابھی بیعت لینے کا حکم نہیں ملا۔''

اس پہلی ملاقات کے قدرے تفصیلی حالات آپ کے صاحبزادے، حضرت مرزا محمد اشرف نے اپنے مضمون بعنوان ''حضرت منشی محمد جلال الدین صاحب مرحوم کے مختصر سوانح حیات'' مطبوعہ الفضل ۲ نومبر ۱۹۳۷ء میں یوں بیان کئے ہیں:

''۱۸۸۲ء یا ۱۸۸۳ء میں آپ کو جنگ کے انعام میں چند ماہ کی رخصت ملی۔ رخصت ملنے پر آپ گھر نہ گئے بلکہ سیدھے قادیان تشریف لائے اور حضرت مسیح موعود کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضور نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ وہی منشی جلال الدین ہیں جن کی خط و کتابت کابل سے جہلم میں پکڑی گئی تھی۔ آپ نے عرض کیا کہ وہی ہوں (اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرے دادا صاحب مرحوم چار بھائی تھے۔ ان میں سے دو بھائی جنگ میں کابل گئے۔ ایک تو ان میں سے واپس آ گئے اور ایک وہیں رہ گئے جن کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دشمنوں کی پٹرول میں آ گئے۔ اس وقت وہ اپنی جان بچانے کے لیے جھٹ ایک کابلی مردہ کا لباس اپنے لباس سے بدل کر دشمنوں کی گرفت سے پہلے ہی فارسی بان بن گئے۔ ان کا نام مرزا نور اللہ بیگ تھا جو رفتہ رفتہ وہ وہاں اچھے عہدے پر پہنچ گئے چنانچہ ان کا خط والد مرحوم کے نام ایک پٹھان لایا تو جہلم میں پولیس نے پکڑ لیا۔ اتفاقِ حسنہ سے والدِ مرحوم کی پھوپھی کا بیٹا وہاں کورٹ انسپکٹر تھا۔ اس نے کپتان پولیس سے

سب ماجرا بیان کیا اور خط کو میرے والد صاحب تک پہنچا دیا۔) اس خط و کتابت کا حضرت مسیح موعود نے والدِ مرحوم سے عند الملاقات ذکر فرمایا جس کا نہ معلوم آپ کو کس طرح پتا لگ گیا۔ حضرت مسیح موعود نے ایک دو اور بھی ایسے ارشادات فرمائے جو دافع الوساوس تھے اور جنہوں نے آپ کے ایمان کو قوی کر دیا۔ اسی ملاقات میں والدِ مرحوم و مغفور نے حضرت مسیح موعود سے درخواست کی کہ حضور میری بیعت قبول فرمائیں۔ حضرت مسیح موعود نے فرمایا: مجھے بیعت لینے کا کوئی حکم نہیں ملا۔ آسمان پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس منصب کو کون شخص سنبھالے گا۔ اس کے بعد آپ گھر تشریف لائے اور پھر اپنی ملازمت پر چلے گئے مگر جب بھی ان کو تھوڑی بہت رخصت ملتی تو گھر نہ جاتے بلکہ براہ راست قادیان آیا کرتے اور بال بچوں کے ملنے سے حضرت مسیح موعود کی زیارت ہمیشہ مقدم رکھتے۔ حضرت مسیح موعود کو بھی آپ سے بڑی محبت تھی جسے بعض پرانے اصحاب بخوبی جانتے ہیں۔''

بتایا جاتا ہے کہ جب حضرت اقدس نے بیعت کا اعلان فرمایا تو آپ نے فوراً بیعت کر لی۔ رجسٹر بیعت میں آپ کی بیعت ۹۳ نمبر پر درج ہے۔ بیعت کے بعد ایک نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی کہ آپ کی عبادات میں اس قدر رقّت اور خشیت تھی کہ آنسوؤں سے آپ کا چہرہ تر ہو کر کرتہ بھی بھیگ جایا کرتا۔

۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں آپ نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت اقدس نے آپ کا نکاح ایک کنواری لڑکی سے کر دیا ہے۔ خواب عرض کرنے پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ آپ کوئی دینی خدمت سر انجام دیں گے چنانچہ آپ نے کتاب ''ثوابتِ قرآنی غلام احمد قادیانی'' بڑی جانفشانی سے لکھنا شروع کی مگر وہ مکمل نہ ہو سکی۔ آپ کی مساعی سے سردار سُندر سنگھ دفعدار اور سردار جگت سنگھ لیس دفعدار مشرف بہ احمدیت ہوئے۔ یہی دوست بعد میں سردار فضل حق اور شیخ عبدالرحمٰن کے ناموں سے معروف ہوئے۔

آپ نے جلسہ مذاہبِ عالم کے انعقاد میں خدمت کا اعزاز حاصل کیا۔ حضرت بھائی عبدالرحمٰن قادیانی اپنے ایک مضمون ۲۰ جولائی ۱۹۴۶ء میں لکھتے ہیں:

''جلسہ اعظم مذاہب لاہور کے انعقاد سے قبل سوامی شوگن چندر رسالہ فوجی میں ہیڈ کلرک تھے اور منشی جلال الدین صاحب کے ہم نشین اور ہم صحبت تھے۔ حضرت اقدس مسیح موعود کے جلسہ مذاہب اعظم لاہور میں شہرۂ آفاق مضمون ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' میں حضرت منشی صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ حضرت صاحب نے منشی صاحب کو اس کی کاپی لکھنے پر مامور کیا اور فرمایا کہ حضرت منشی صاحب کا خط مَایُقْرَءُ ہے اس لیے آپ ہی اس کو لکھیں چنانچہ منشی صاحب نے وہ مضمون اپنی قلم سے لکھا............''

حضرت مسیح موعود کی بعض کتب، اشتہارات اور ملفوظات میں آپ کا ذکر موجود ہے چنانچہ ازالہ اوہام میں آپ کا ذکر مخلصین میں ہے۔ حضرت اقدس نے انجامِ آتھم میں اپنے مخلص دوستوں میں اور اشتہار ۲۲ فروری ۱۸۹۸ء میں اپنی پُر امن جماعت میں آپ کا نام درج فرمایا ہے۔ اشتہار یکم جولائی ۱۹۰۰ء میں چندہ دہندگان منارۃ المسیح میں آپ کا نام درج ہے۔ اسی طرح ملفوظات جلد چہارم میں بھی آپ کا نام محبت بھرے الفاظ میں درج ہے۔

اگست ۱۹۰۲ء میں آپ وفات پا گئے اور تدفین موضع بُلانی میں ہوئی۔ آپ کا کتبہ یادگار بہشتی مقبرہ میں

ہے۔ آپ کی وفات پر حضرت اقدس نے سرد آہ بھر کر فرمایا: ''حضرت منشی جلال الدین مرحوم ہمارے یکتا اور بے نظیر دوست تھے۔

اُن کے صاحبزادے حضرت مرزا محمد اشرف (جنہیں حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل تھا) شروع میں فوج میں تھے لیکن وہ جلد ہی ملازمت چھوڑ کر قادیان منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ایک لمبا عرصہ سلسلہ کی خدمت میں گذارا۔ وہ یکم مئی ۱۹۳۲ء کو صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو ان کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے بھی شمولیت فرمائی۔ اس موقع پر حضور نے جو تقریر کی الفضل ۲۲ مئی ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس تقریر میں حضور نے انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''میرزا محمد اشرف صاحب کو میں نے دیکھا ہے اور ان کی یہ بات مجھے ہمیشہ پسند آئی کہ وہ اس طرح کام کرتے رہے ہیں جس طرح ایک عورت اپنے گھر میں کام کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کے پاس کتنا سرمایہ ہے اور وہ اس سے کس طرح بہتر سے بہتر کام لے سکتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ قلیل سے قلیل رقم میں ہی سب کام نپٹا لوں۔ ان کے اندر ہمیشہ یہی روح کام کرتی رہی ہے کہ سلسلہ کا صیغہ مالیات مضبوط چٹان کی طرح ہو اور چونکہ میرے اپنے خیالات کی روح بھی اس طرف ہے اس لیے مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی اور ہمیشہ اطمینان رہتا تھا کہ مالیات کی باگ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو اسے صحیح طریقے پر چلا رہا ہے۔ انسان سے غلطیاں ہوتی ہیں اور ممکن ہے ان سے بھی ہوئی ہوں لیکن ایسے شخص کے کاموں میں جو درد رکھتا ہے اور جو اس روح کے ساتھ کام کرتا ہے اس کی غلطیوں کے باوجود نتائج اچھے نکلیں گے۔ اگر تمام کارکن اس روح کے ساتھ کام کریں تو بہت جلد ترقی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ہمارا نظام اس وقت کھلونا سا ہے لیکن اس میں بڑی جان ہے اور ذرا سی بات سے بھی ترقی کر سکتا ہے۔ بعض مائیں بے احتیاطی سے بچہ کی صحت کو خراب کر لیتی ہیں اور وہ زیادہ ترقی نہیں کر سکتا لیکن عقلمند ماں کا اتنی ہی عمر کا بچہ اس سے کئی گنا مضبوط ہو جاتا ہے اور ہمارے سلسلہ کے کارکن بھی اگر عقلمند ماں والی کوشش کریں تو یہ بچہ موجودہ سامانوں میں ہی بہت ترقی کر سکتا ہے اور اس کی صحت موجودہ صحت سے بدرجہا زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرزا صاحب کو اُس آرام کی توفیق عطا کرے جس کے لیے وہ کام سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اگرچہ (دین) کی تعلیم تو یہی ہے کہ (اس کا ماننے والا) مرتے دم تک کام کرتا جائے اور اس کے نزدیک آرام کا یہی مفہوم ہے کہ عمر کے لحاظ سے کام کی نوعیت میں تبدیلی ہو جائے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی توفیق عطا کرے اور ان کے بعد آنے والوں کو اور دوسرے کارکنوں کو سچا اخلاص عطا کرے اور اتنی بصیرت بخشے کہ وہ ان آنکھوں سے ہی جو اس وقت ہمیں ملی ہوئی ہیں دیکھ سکیں کہ وہ کتنی بڑی عمارت ہے جس کی بنیاد کی اینٹ کے طور پر کام کرنے کے لیے اُنہیں چنا گیا ہے۔''

میری والدہ، محترمہ انور بیگم صاحبہ ان ہی حضرت مرزا محمد اشرف کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ اباجی کے ساتھ ان کی شادی ۱۹ جون ۱۹۳۳ء کو عمل میں آئی۔ اس تعلق کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں پانچ بیٹیوں سے نوازا جن کے نام علی الترتیب عزیزہ (جن کا اس کتاب میں ذکر ''آپا'' کے طور پر کیا گیا ہے)، رشیدہ،

صالحہ (جن کا اس کتاب میں ذکر "آپی" کے طور پر کیا گیا ہے)، صادقہ اور بشریٰ رکھے گئے۔ رشیدہ اور بشریٰ
عہدِ طفولیت میں وفات پا گئیں جب کہ باقی تین بیٹیاں ماشاء اللہ حیات ہیں۔

ابا جی بتایا کرتے تھے کہ ایک بار الفضل میں حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اگر کسی کے ہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہوں اور وہ اپنی نئی پیدا ہونے والی لڑکی کا نام بشریٰ رکھ دے تو پچانوے فیصد صورتوں میں اس کے فوراً بعد لڑکا پیدا ہوگا اور اگر کسی وجہ سے اس بار بھی لڑکی ہی پیدا ہو تو اس کے معاً بعد پیدا ہونے والا بچہ ضرور بالضرور لڑکا ہوگا۔ یہ مضمون ابا جی کی نظر سے گذرا تو تھا تاہم انہیں اس کے مشمولات پر یقین نہ تھا۔ جب آپ کے ہاں پانچویں بیٹی پیدا ہوئی تو آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے اس کا نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضور نے اس کا نام بشریٰ رکھا۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ انہیں یہ نام رکھے جانے کی اطلاع دفتر میں ملی۔ جب وہ گھر واپس جا رہے تھے تو راستہ میں حضرت میر محمد اسماعیل مل گئے۔ ابا جی نے انہیں اپنے ہاں پانچویں بیٹی کی پیدائش اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف سے اس کا نام بشریٰ رکھنے کی خبر سنائی تو وہ بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے دائیں ہاتھ سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا: تو مولوی صاحب! اب لڑکا لیں۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ۱۹ دسمبر ۱۹۴۴ء بروز منگل راقم کی پیدائش ہوئی۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۴ء کے الفضل میں میری پیدائش کی خبر پہلے صفحہ پر بایں الفاظ شائع ہوئی: "مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب مولوی فاضل اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل کے ہاں آج صبح اللہ تعالیٰ کے فضل سے پانچ لڑکیوں کے بعد لڑکا تولّد ہوا۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔"

ابا جی نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے میرا نام رکھنے کی درخواست کی چنانچہ حضور کی طرف سے میرا نام "محمد داوٗد" رکھا گیا۔ "طاہر" کا اضافہ میں نے خود ابا جی کے تخلص کے مدِ نظر بعد میں کیا۔

میرا شیرخوارگی کا سارا زمانہ قادیان میں گذرا۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ میں اپنے نانا، نانی، دادی، پھوپھی اور بہنوں کا بے حد لاڈلا تھا۔ وہ مجھے دن بھر گود میں لیے پھرتیں اور میری ذرا سی تکلیف پر سخت پریشان ہو جاتیں۔

قیامِ پاکستان کے وقت میری عمر دو سال آٹھ ماہ تھی اور مجھے اس دور کی کوئی بات یاد نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ دفعتاً بدلا ہوا کا رُخ

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کی طرح ہم بھی قادیان سے لاہور ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ ہم کم و بیش دو سال یہاں رہے۔ قادیان سے ہجرت یا لاہور میں قیام کے زمانہ کے حالات بھی میرے ذہن میں متحضر نہیں ہیں تاہم چونکہ مجھے اپنی ہوش کے زمانے میں کئی بار اس مکان پر جہاں ہم نے یہ دو سال گذارے تھے قیام کا موقع ملتا رہا ہے لہٰذا مجھے اس ماحول کا کسی حد تک اندازہ ہے جس میں ہم نے یہ وقت گذارا ہو گا۔

ہمارے خاندان نے قادیان سے دو مرحلوں میں ہجرت کی۔ ابا جی کی اپنی ایک تحریر کے مطابق وہ ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء بروز اتوار صبح پونے دس بجے کے قریب قادیان سے اس کانوائے میں جو جماعت کی طرف سے بھجوایا گیا تھا سوار ہو کر شام چھ بجے کے قریب لاہور پہنچے تھے۔ ابا جی کو کن حالات میں یہ سفر تنہا اختیار کرنا پڑا اس کی وضاحت حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کے اُس خط سے ہوتی ہے جس میں آپ نے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کو ہدایت فرمائی تھی کہ اب ''جو کانوائے آئے گا اس کے ساتھ تفسیر کے تین بکس دفتر سے ضرور بھجوا دیں اور مولوی محمد یعقوب کو تاکہ دو چار دن میں تفسیر کی آخری جلد مکمل کر دوں تا اس طرف سے دلجمعی ہو جائے۔ باقی کام ہوتا رہے گا۔ کون شخص ہے جس نے سارے دنیا کے کام کیے ہوں۔''

اس خط کے موصول ہونے پر حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے ۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ابا جی کو اطلاع دی کہ ''آپ کو سلسلہ کے کام میں لاہور بھجوایا جا رہا ہے۔ حضور نے فوراً بلوایا ہے۔ آپ کسی پرائیویٹ ٹرک میں فوراً جگہ حاصل کر کے فوراً روانہ ہو جائیں اور اگر پرائیویٹ ٹرک میں جگہ نہ ملے تو جو کانوائے جماعت کی طرف سے آئے گا اس میں چلے جائیں۔''

ابا جی کی قادیان سے روانگی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے اسی حکم کی تعمیل میں ہوئی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ہجرت کے وقت میری عمر ایسی نہ تھی کہ مجھے اُس دور کے واقعات یاد رہ سکتے لیکن میری تینوں بہنیں عمر کے اُس حصے میں تھیں جب اکثر باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ نے آپی کو بہت عمدہ حافظے کے ساتھ قوتِ بیان سے بھی مالا مال کر رکھا ہے۔ انہوں نے میری درخواست پر اُس زمانے کے تفصیلی حالات قلمبند کئے ہیں جو میں اس وضاحت کے ساتھ شاملِ کتاب کر رہا ہوں کہ ہر واقعہ پر ہر شخص کے تاثرات مختلف ہوتے ہیں لہٰذا اس بیان کو اُن کا ذاتی تجربہ سمجھ کر پڑھا جائے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ایک دن امی نانا جی کے گھر گئی ہوئی تھیں کہ ابا جی دفتر سے اچانک گھر آ گئے اور بتایا کہ انہیں غیر متوقع طور پر لاہور جانا پڑ رہا ہے اور اس کے لیے ضروری تیاری کرنی ہے لہٰذا میں فوری طور پر امی کو گھر بلا لاؤں۔
میں اسی وقت دوڑتی ہوئی نانی جی کے گھر چلی گئی جو ڈھاب کے کنارے تھا۔ مجھے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ امی

کے چچا حضرت مرزا افضل جنہیں حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل تھا وفات پا چکے ہیں اور گھر میں ان کا جنازہ پڑا ہے۔ امی اور بعض دوسری خواتین ان کی چارپائی کے پاس بیٹھی تھیں۔ اگر چہ یہ موقع ان کو وہاں سے اُٹھانے کا نہ تھا لیکن مجھے یہ بھی احساس تھا کہ ان کے یہاں رُکے رہنے سے ابا جی کا پروگرام متاثر ہو سکتا ہے لہٰذا میں نے اُن کے کان میں ابا جی کا پیغام پہنچا دیا۔ وہ اُسی وقت وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور کچھ ہی دیر میں ہم دونوں گھر پہنچ گئے۔

رات کے وقت ابا جی سفر کی تیاری کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہمراہ لے جانے کے لیے ضروری کتب اور کاغذات جمع کر رہے ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ وہ اگلی صبح کس وقت گھر سے نکلے لیکن دن کے نو یا دس بجے کے قریب امی نے بتایا کہ ابا جی کو لاہور لے جانے والی بس کالج گراؤنڈ میں کھڑی ہوگی اور ایک پوٹلی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ میں کھانے پینے کی یہ اشیاء ابا جی کو پہنچا آؤں۔ اس پوٹلی میں آٹے کی چھوٹی چھوٹی میٹھی ٹکیاں تھیں جو سفر کے دوران بھوک مٹانے کے کام آ سکتی تھیں۔ اس وقت شدید بارش ہو رہی تھی اور راستوں میں پھسلن تھی مگر میں گرتے پڑتے وہاں پہنچ ہی گئی۔ ابا جی بس کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی سیٹیں ابھی خالی تھیں حتیٰ کہ ڈرائیور بھی نہیں تھا۔ بہر حال میں یہ پوٹلی انہیں پہنچا کر گھر واپس آ گئی۔

اس کے بعد جلد ہی یہ خبر سنی گئی کہ قادیان پر ہندوؤں اور سکھوں کا حملہ ہونے والا ہے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے لیکن حسبِ توفیق حفاظتی تدابیر اختیار کی جا رہی تھیں۔ یقیناً اس حوالے سے کچھ اور انتظامات بھی کیے گئے ہوں گے اور جیسا کہ اب پتا چلتا ہے کیے بھی گئے لیکن غالباً نظام کی طرف سے موصول ہونے والی ہدایات کے تحت میں اور صادقہ (جو راقم کی سب سے چھوٹی ہمشیرہ ہیں) ساری دوپہر محلے میں سے اینٹیں روڑے اکٹھے کرتے رہتے۔ پھر ہم یہ روڑے چھت پر لے جا کر ڈھیر کر دیتے تا کہ اگر حملہ آور ادھر کا رُخ کریں تو انہیں اینٹیں مار کر بھگایا جا سکے۔ جماعتی ہدایات کے تحت ہم نے کچھ پسی ہوئی مرچیں بھی پاس رکھی ہوئی تھیں تا کہ اگر کوئی حملہ آور بہت قریب پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کی آنکھوں میں مرچیں ڈال کر اسے پسپا ہونے مجبور کیا جا سکے۔

قادیان کے محلہ دارالفضل میں ہمارے تین ددھیالی مکان تھے۔ ایک مکان جو دادا جی نے تعمیر کیا تھا اُن کی وفات کے بعد دادی جی، چچا ابراہیم (جو ہنگری سے واپسی کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول میں استاد کے طور پر کام کر رہے تھے)، چچا یوسف اور پھوپھی کے زیرِ استعمال تھا۔ دوسرا مکان تایا اسحاق نے اپنی رہائش کے لیے تعمیر کر رکھا تھا۔ وہ خود تو ریاست بہاولپور میں ملازمت کر رہے تھے لیکن ان کے اہل و عیال اس مکان میں مقیم تھے۔ تیسرا مکان ہمارا تھا۔

جب یہ ہنگامہ شروع ہوا اتفاق سے تایا اسحٰق کی فیملی بہاولپور گئی ہوئی تھی اور چچا ابراہیم اپنے خسر، ڈاکٹر سید رشید احمد مقیم مشہد کی دعوت پر سیر کے لیے ایران گئے ہوئے تھے۔ ابا جی لاہور جا چکے تھے۔ ایسے میں جب یہ خبر سننے میں آئی کہ ضلع گورداسپور پاکستان میں شامل کر دیا گیا ہے تو سب بے حد خوش ہوئے لیکن افسوس یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی کیوں کہ اگلے ہی روز اس کی تردید آ گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے گردونواح سے پناہ گزین قادیان پہنچنا شروع ہو گئے۔ وہ بیچارے حالات کے ستائے ہوئے تھے اور وہی چیزیں جو انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں اب کوڑیوں کے مول بیچنے پر مجبور ہو گئے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک آدمی دو روپے میں اپنی بکری بیچ رہا ہے۔ میں چھوٹی تھی اور حالات سے بے خبر۔ میرا دل نہ جانے کب سے بکری پالنے کی آرزو اپنے اندر لیے پھرتا تھا، بکری دیکھتے ہی مچل اُٹھا چنانچہ میں نے ضد شروع کر دی کہ میں یہ بکری لے کر رہوں گی مگر امی حالات کو بہتر سمجھتی تھیں چنانچہ انہوں نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔

پھر پتا چلا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی لاہور سے کانوائے بھجوا رہے ہیں اور تمام لوگ لاہور جا رہے ہیں۔ امی نے بھی گھر کا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ وہ نظارہ اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ امی نے بہت سا سامان اکٹھا کر کے حفاظتی نقطہ نظر سے کوٹھڑی یعنی سٹور میں بند کر دیا اور کچھ سامان ساتھ لے جانے کے لیے الگ رکھ لیا۔ اس کے بعد ہم سب اپنے گھر سے نکل پڑے لیکن روانگی کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کانوائے میں مزید افراد کی گنجائش نہیں ہے، اگلا کانوائے جائے گا تو ہم لوگ اس میں جاسکیں گے۔ ہم کئی روز تک گھر سے اس سفر کے لیے تیار ہو کر نکلتے لیکن یا تو کانوائے نہ آتا یا ہمیں اس میں جگہ نہ ملتی۔ بالآخر ایک روز ہماری اُمید بر آئی۔ ہم ایک ٹرک میں سوار ہوئے۔ لوگ زیادہ تھے اور جگہ کم تھی اس لیے کچھ سامان جو امی نے ساتھ لے جانے کے لیے تیار کر رکھا تھا بادلِ ناخواستہ وہیں چھوڑنا پڑا۔ عجیب دھکم پیل تھی جس میں ہمیں یہ سفر کرنا پڑا۔''

''ان کنوائیز کا انتظام کون کرتا تھا، جماعت یا فوج سے تعلق رکھنے والے احمدی احباب؟'' میں آپی سے پوچھا کرتا تھا۔

''میرے پاس اس سوال کا صحیح جواب موجود نہیں'' وہ جواب دیتیں ''تاہم میں نے سن رکھا ہے کہ جس کنوائے میں ہم نے سفر کیا وہ چچا یوسف کے ایک ہم زُلف، ملک محمد بشیر لے کر آئے تھے۔''

میں اتفاق سے ملک محمد بشیر کو اُس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ پاکستان آرڈیننس فیکٹریز، واہ کینٹ میں اسسٹنٹ فورمین ہوا کرتے تھے تاہم معلوم نہ تھا کہ اب کہاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ پتا چلا کہ موصوف خدا کے فضل و کرم سے حیات ہیں اور سٹیڈیم روڈ، سرگودھا پر مقیم ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے فون پر ان سے یہ واقعہ لکھ بھیجنے کی درخواست کی تو چند ہی دنوں میں اُن کا ایک تفصیلی خط موصول ہو گیا جس کا متعلقہ حصہ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''خاکسار محمد بشیر احمد ولد ملک محمد احمد، ساکن گھوگھیاٹ ضلع سرگودھا تقسیمِ ہند سے پہلے انڈین ایئرفورس میں بطور لیڈنگ ایئرکرافٹ مین ملازم اور لاہور کینٹ میں تعینات تھا۔ تقسیم ہند کے بعد یہاں پر انڈین ایئرفورس کا نام رائل پاکستان ایئرفورس کر دیا گیا اور اس کے ملازمین کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو انڈین ایئرفورس میں ملازمت جاری رکھیں اور چاہیں تو نوتشکیل شدہ پاکستان ایئرفورس میں شمولیت اختیار کر لیں۔ مسلمان ملازمین کی واضح اکثریت نے رائل پاکستان ایئرفورس میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا تاہم ان میں سے بہت سے ملازم اس وجہ سے بے حد پریشان تھے کہ ان کے اہل و عیال اُن علاقوں میں غیر محفوظ زندگی گذارنے پر مجبور ہو گئے ہیں جو تقسیم کے نتیجہ میں بھارت کا حصہ بن چکے ہیں۔

اندریں حالات رائل پاکستان ایئرفورس کی اعلیٰ قیادت نے فیصلہ کیا کہ ان ملازمین کو جن کے لواحقین

مشرقی پنجاب میں مقیم ہیں اپنے لواحقین کو پاکستان لانے کے لیے سرکاری طور پر ٹرک اور دیگر سہولیات مہیا کی جائیں۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کی ذمہ داری رائل پاکستان ایئرفورس کے لاہور سٹیشن کو سونپی گئی چنانچہ جوں ہی کسی علاقے یا شہر کے ملازمین کی تعداد اتنی ہو جاتی کہ ان کے لواحقین کے لیے دو یا دو سے زیادہ ٹرک بھجوائے جائیں، اس کا انتظام کر دیا جاتا۔ ہر ٹرک کے ساتھ دو محافظ ہوا کرتے تھے جب کہ حفاظتی نقطۂ نگاہ سے ہر ٹرک کو ایک لائٹ مشین گن بھی مہیا کی جاتی تھی۔

مجھے اب معین تاریخ تو یاد نہیں لیکن آزادی کے کچھ ہی دنوں بعد لاہور کینٹ سے پاکستان ایئرفورس کا دو ٹرکوں پر مشتمل ایک کانوائے ایئرفورس کے عملے کے کچھ خاندانوں کو بٹالہ سے لاہور لانے کے لیے تشکیل دیا گیا۔ یونٹ میں اعلان کیا گیا کہ اس کانوائے کے لیے محافظین کی ضرورت ہے لہٰذا جو افراد برضا و رغبت یہ ذمہ داری قبول کرنا چاہیں، اپنا نام لکھوا دیں۔ میرے ایک احمدی رفیقِ کار، چوہدری بشیر احمد جو چوہدری عبدالعزیز اے ایس آئی ساکن ظفروال کے صاحبزادے تھے میرے پاس آئے اور خواہش ظاہر کی کہ کیوں نہ ہم دونوں رضاکارانہ طور پر اس کانوائے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں بشرطیکہ افسر انچارج ہمیں لاہور واپسی سے پہلے قادیان کا چکر لگانے کی اجازت دینے کا وعدہ کرے۔ ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی زیارت سے فیضیاب اور قادیان کے حالات سے باخبر ہوسکیں۔

اللہ کو ہماری نیک نیتی پسند آئی چنانچہ ہماری یہ شرط مان لی گئی اور ہم ٹرک لے کر مغرب سے پہلے بٹالہ پہنچ گئے۔ ہم نے ٹرک بٹالہ ریلوے سٹیشن کے سامنے پارک کر دیئے۔ ہم چاروں محافظ ٹرکوں کے ساتھ رُکے رہے جب کہ دیگر ساتھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے تا کہ اپنے اہل و عیال کو پاکستان ہمراہ لے جانے کے لیے تیار کر کے لاسکیں۔

اس رات شدید بارش ہوئی جس سے جل تھل ایک ہو گیا۔ صبح کے وقت جب ہمارا افسر آیا اور ہم نے اس سے ٹرک قادیان لے جانے کی اجازت مانگی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس زمانے میں قادیان سے بٹالہ کی سڑک کچی تھی اور وہ ڈرتا تھا کہ اگر ٹرک کسی جگہ کیچڑ میں پھنس گیا تو اگلا سارا پروگرام فلاپ ہو جائے گا۔ اس پر چوہدری بشیر احمد نے شدید احتجاج کیا لیکن جب ان کی بات پھر بھی نہ سنی گئی تو انہوں نے کہا کہ اگر انہیں قادیان نہیں جانے دیا جائے گا تو وہ گولی مار کر تمام ٹائر پنکچر کر دیں گے۔ یہ تھی تو گیدڑ بھبکی لیکن کارگر ثابت ہوئی چنانچہ افسر نے کہا کہ وہ ناراض نہ ہوں بلکہ دونوں ٹرک لے جائیں تا کہ اگر خدانخواستہ ایک ٹرک کیچڑ میں پھنس جائے تو دوسرے کی مدد سے اسے باہر نکالا جا سکے۔ یوں ہم یہ دونوں ٹرک لے کر قادیان کی طرف روانہ ہو گئے۔

قادیان پہنچ کر ہم نے ٹرک ریتی چھلہ میں چھوڑ دیئے اور پیدل دفتر پرائیویٹ سیکرٹری پہنچ گئے۔ دفتر والے اچانک دو رائفل بردار نوجوانوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تاہم جب ہم نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم نے حضور سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے بکمال شفقت ہمیں فوراً بلوا لیا۔ جب ہم اوپر پہنچے تو حضور اپنے دفتر سے نکل کر برآمدے میں ایک کرسی پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے مصافحہ اور دست بوسی کے بعد بتایا کہ ہم صرف حضور اور مرکز سلسلہ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے ہیں جس پر آپ نے

خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جس دوران حضور نے فرمایا: ’’کل تک تو محمد احمد (سکواڈرن لیڈر رشید محمد احمد مراد ہیں) جہاز لے کر یہاں آتا تھا اور ضروری امور سرانجام دے کر واپس چلا جاتا تھا مگر آج شہر میں ڈوگرہ فوج آ گئی ہے۔ آج جب وہ جہاز لے کر آیا تو نیچے سے اس پر فائر کئے گئے چنانچہ اسے واپس جانا پڑا۔‘‘ مجھے یاد ہے حضور نے یہ بھی فرمایا کہ ’’میں نے صدر انجمن کا خزانہ دو، ایک دن پہلے پاکستان بھجوا دیا ہے۔‘‘

اس کے بعد ہم نے اجازت چاہی، پرائیویٹ سیکرٹری آفس سے اپنا اسلحہ واپس لیا اور قادیان سے بٹالہ پہنچ کر پناہ گزین خاندانوں کو مغرب سے پہلے لاہور پہنچا دیا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کی کسی تاریخ کو تین ٹرکوں پر مشتمل اسی طرح کا ایک کانوائے ایک احمدی فلائٹ لیفٹیننٹ سلطان صلاح الدین فاتح کی سرکردگی میں قادیان بھجوانے کے لیے تیار کیا گیا اور اس کی حفاظت کے لیے رضا کار طلب کئے گئے۔ رضا کاروں کو یہ سہولت حاصل تھی کہ ان میں سے ہر ایک واپسی پر اپنے ساتھ دو خاندانوں کو لا سکتا تھا۔ میں نے بھی اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ چونکہ اس وقت تک اس طرح کے کانوائے باقاعدگی سے دونوں ملکوں کے درمیان چلنا شروع ہو گئے تھے لہٰذا حکومتی فیصلے کے تحت پاکستان سے جانے والے کانوائے ہندو پناہ گزینوں کو لاہور سے امرتسر پہنچاتے تھے اور ہندوستان سے آنے والے کانوائے مسلمان مہاجرین کو لاہور لاتے تھے۔

ہمارا یہ کانوائے صبح نو بجے کے قریب اپنے کیمپ سے روانہ ہو کر لاہور شہر میں واقع ایک ہندو کالج پہنچا جو عارضی طور پر پناہ گزین کیمپ میں تبدیل کیا جا چکا تھا۔ ہم نے کچھ پناہ گزینوں کو اٹھایا اور امرتسر میں مقررہ مقام پر پہنچا کر قادیان کے لیے روانہ ہو گئے۔

جب ہم قادیان پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہم شہر کے اندر داخل نہیں ہو سکتے چنانچہ ہم نے اپنے ٹرک ریلوے سٹیشن کے قریب محلّہ دارالشکر میں پارک کر دیئے اور ایک دو منزلہ مکان جو اس وقت خالی پڑا تھا میں پڑاؤ ڈال لیا۔ ہم نے مکان کی چھت پر لائٹ مشین گن نصب کر دی اور اپنی اور اپنے ٹرکوں کی حفاظت کے لیے رات بھر چوکس بیٹھے رہے۔ ہمارے دیگر ساتھی اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے تاکہ اپنے عزیز و اقارب کو پیش آمدہ سفر کے لیے تیار کر سکیں۔ یہ طے پایا کہ اگلی صبح روانگی ہو گی۔

اُن دنوں قادیان ایک غیر سرکاری غیر اعلانیہ ریفیو جی کیمپ میں تبدیل ہو چکا تھا اور شہر کے باہر کھلی جگہوں پر ارد گرد کے دیہات سے آنے والے لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ حضرت مسیح موعود کے لنگر سے انہیں کھانا تو مل رہا تھا لیکن وہاں موجود لوگوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ دیہات کے جرائم پیشہ سکھ جتھوں کی صورت ان کے درمیان دندناتے نظر آتے تھے اور موقع پا کر ان کی رہی سہی پونجی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر ایک طرف سے اچانک شور سنائی دیا۔ ہم نے دیکھا کہ دو سکھ ایک نوجوان عورت کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے ہیں جب کہ ایک مسلمان نوجوان زخمی حالت میں زمین پر پڑا ہے۔ وہ عورت اس زخمی شخص کی بیوی تھی۔ وہاں موجود ڈوگرہ سپاہی اس واقعے سے بالکل لاتعلق رہے اور ہم بھی مسلح ہونے کے باوجود ایک

غیر ملک میں ہونے کی وجہ سے خود کو بے بس پا رہے تھے۔

صبح قریباً نو بجے حفاظتی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں حضرت مولوی فخر الدین کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پر میرے ہم زُلف برادرم محمد یوسف اور ان کے بہنوئی ملک نواب خان موجود تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دو خاندانوں کو ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ انہوں نے تجویز کیا کہ میں اپنی ہمشیرہ نسبتی (یعنی اہلیہ برادرم محمد یوسف اور ان کے بیٹے) اور مولوی محمد یعقوب صاحب (جو پہلے سے لاہور جا چکے تھے) کے اہل و عیال کو ہمراہ لے جاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ خاندان انتہائی ضروری سامان ساتھ لے جا سکتے ہیں جو دو یا تین صندوقوں تک محدود ہو۔ میں اجازت لے کر واپس ڈیوٹی پر پہنچ گیا اور تاکید کر آیا کہ یہ دونوں خاندان بارہ بجے دوپہر تک وہاں پہنچ جائیں۔

ہم ایک بجے کے بعد قادیان سے روانہ ہوئے۔ خدا کا شکر ہے کہ واہگہ بارڈر تک ہمارے قافلے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا حالانکہ اس وقت سکھوں نے جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں اور تلاشی کے بہانے لوگوں کو پریشان کر رہے تھے۔"

لیجئے اب اس سفر کی کہانی اور بعد کے حالات آپی کی زبانی سنیئے:

"اس سفر میں دادی جی بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ انہیں وقتاً فوقتاً شدید سر درد ہو جایا کرتا تھا۔ اس روز بھی ان پر غالباً اسی مرض نے حملہ کر رکھا تھا چنانچہ وہ سارا راستہ امی کی گود میں اپنا سر رکھ کر لیٹی رہیں اور جگہ کی کمی کے باعث میں نے پورا سفر کھڑے ہو کر کیا۔ سب ڈر رہے تھے کہ راستہ میں حملہ نہ ہو جائے لہٰذا ہر شخص مسلسل دعاؤں میں مصروف تھا۔ میں چھوٹی ہونے کے باوجود دعا کی اہمیت سے واقف تھی اور دعائیں مانگتی جا رہی تھی لیکن بشری تقاضے کے تحت اِدھر اُدھر دیکھتی بھی جا رہی تھی کہ کہیں ہندو سکھ تلواریں لے کر آ تو نہیں رہے مگر خدا کا شکر ہے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا اور ہم شام کے وقت بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے جہاں ہمارا کانوائے جودھامل بلڈنگ کے سامنے آ رُکا۔

ابا جی ہمیں لینے کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے لیکن ان کے پاس ہمیں ٹھہرانے کا کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ ہم نے وہ رات سڑک پر گزاری۔ اس اثناء میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کو ہماری آمد کی اطلاع ہو گئی اور وہ اگلی صبح ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آ گئے۔

یاد رہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ موضع گھگا تحصیل کھاریاں کے رہنے والے تھے۔ ان کے والدِ بزرگوار، حضرت میاں محمد دین (جن کا نام حضرت مسیح موعود کے ۳۱۳ رفقا میں تیسرے نمبر پر درج ہے) پٹواری کی حیثیت میں ٹکانی ضلع گجرات میں تعینات تھے اور امی کے دادا، حضرت مرزا جلال الدین اور ان کے صاحبزادوں سے متعارف تھے۔ ۱۸۹۳ء میں مرزا جلال الدین نے اپنے ایک صاحبزادے، مرزا محمد قیم کو حضرت مسیح موعود کی کتاب براہین احمدیہ بھجوائی تو انہوں نے اس کا ذکر میاں محمد دین سے کر دیا اور کہا کہ وہ دیگر کتابیں تو پڑھتے ہی رہتے ہیں کسی وقت اس کتاب کا بھی ضرور مطالعہ کریں۔ انہیں رضامند پا کر مرزا محمد قیم نے یہ کتاب انہیں پیش کر دی۔

میاں محمد دین دہریہ خیالات رکھتے تھے لیکن براہین احمدیہ کے مطالعہ نے ان کی کایا پلٹ دی۔ انہیں یوں محسوس ہوا گویا مردہ زندہ ہو گیا ہو اور خدائے واحد و یگانہ پر ان کا ایمان مستحکم ہو گیا۔ مرزا جلال الدین بلانی آئے تو ان سے مزید

تبادلہ خیال کے بعد میاں محمد دین نے ۱۸۹۴ء میں حضور کو بیعت کا خط لکھ دیا اور دستی بیعت سے ۱۸۹۵ء میں مشرف ہوئے۔

مرزا جلال الدین تو ۱۹۰۲ء میں وفات پا گئے لیکن میاں محمد دین ان کا اور مرزا محمد قسیم کا یہ احسان کبھی فراموش نہ کر سکے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں احمدیت کی نعمت اس خاندان کے ذریعہ عطا فرمائی تھی چنانچہ انہوں نے زندگی کے آخری سانس تک اس خاندان کے ساتھ تعلق محبت واخوت برقرار رکھا حتّٰی کہ قادیان میں اپنا مکان بھی میرے نانا، حضرت مرزا محمد اشرف کے مکان کے بالکل ساتھ تعمیر کیا۔

اگرچہ میاں محمد دین کے باقی صاحبزادگان یعنی حضرت صوفی غلام محمد (ناظر بیت المال ربوہ)، چوہدری غلام مرتضیٰ (وکیل القانون، تحریک جدید انجمن احمدیہ) اور چوہدری غلام یٰسین (مربی سلسلہ متعینہ امریکہ وانڈونیشیا) نے بھی اس خاندان کے ساتھ ہمیشہ قریبی مراسم رکھے لیکن میاں محمد دین کی اہلیہ، نیک بی بی (جو اپنے خاندان میں "بے بے جی" کے نام سے معروف تھیں)، ان کی صاحبزادی آمنہ بیگم (جنہیں ہم "ماسی آمنہ" کہا کرتے تھے) اور ان کے صاحبزادے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ تو اس معاملہ میں سب سے آگے رہے۔ ماسی آمنہ اور بے بے جی تو میری صغرسنی میں وفات پا گئیں لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے زندگی بھر ہمارے ساتھ جس محبت اور اپنائیت کا سلوک روا رکھا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ قیام پاکستان کے وقت میو ہسپتال میں سرجن کے طور پر کام کر رہے تھے اور انہیں ہسپتال کے اندر گھر ملا ہوا تھا چنانچہ انہیں جونہی ہماری آمد کی خبر ملی وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔

ہم لوگ قادیان سے لاہور آئے تھے۔ قادیان کی مقدس بستی میں رہنا بجائے خود ایک بہت بڑی سعادت تھی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لاہور کے مقابلہ میں قادیان کی ظاہری حیثیت ایک گاؤں سے بڑھ کر نہ تھی اور ہمارے اپنے گھر کا نین نقشہ بھی اسی ماحول کے مطابق تھا۔ یوں بھی ہمیں احساس ہو چکا تھا کہ ہم اب شاید قادیان واپس نہ جا سکیں، ہم ایک انتہائی غیر محفوظ راستے پر سفر کے مضمرات سے آگاہ تھے اور ایک رات سڑک پر گذارنے کے بعد اپنی بے بسی کے قائل بھی ہو چکے تھے لہٰذا میو ہسپتال کے احاطے میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کا یہ گھر مجھے بے حد پسند آیا۔ اس کے کمرے بہت بڑے بڑے تھے، سامنے وسیع برآمدہ تھا اور کچن بھی اچھا خاصا تھا۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا جس کے گراؤنڈ فلور پر ایک انگریز جوڑا رہتا تھا جو موٹر بائیک پر ادھر ادھر آتا جاتا تھا۔ اس گھر کا لان بہت خوبصورت تھا۔ سامنے نرسوں کا ہوسٹل تھا۔ یونیفارم میں ملبوس نوجوان نرسیں دن رات ہوسٹل میں آتی جاتی تھیں اور میں یہ سب کچھ بہت دلچسپی سے دیکھتی رہتی تھی۔ مجھے یہ رہائش بے حد پسند آئی، خاص طور پر اس لیے بھی کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ اور ان کے اہل وعیال نے ہمارے آرام کا خصوصی خیال رکھا اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہم ان کے لیے کسی قسم کا بوجھ ہیں تاہم اس گھر میں شاید فرنیچر کی کمی تھی چنانچہ ابا جی ایک ٹرنک کو جو وہ قادیان سے ہمراہ لائے تھے بطور میز استعمال کرتے اور زمین پر بیٹھ کر دفتری کام کرتے رہتے۔

یہاں پر ہمارا وقت مجموعی طور پر بہت اچھا گذرا۔ ابا جی کا دفتر نزدیک تھا اور وہ بہ آسانی وہاں آ جا سکتے تھے۔ رتن باغ بہت قریب تھا اور جمعہ وہیں ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے ہم بسہولت نماز جمعہ کی ادائی کے لیے بھی چلے جاتے تھے۔

چند ہی روز گذرے ہوں گے کہ ہمارے خالہ زاد، قاضی منظور احمد جنہیں ہم گھر میں بھائی جی کہتے تھے

جہلم سے آ کر نانا جی، نانی جی اور ماسی جی کو ہمراہ لے گئے۔ پھر چچا اسمٰعیل وہاڑی سے آئے اور دادی جی اور پھوپھی کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ اسی دوران چچا ابراہیم ایران سے واپس آئے۔ ہم انہیں ریلوے سٹیشن پر لینے گئے۔ میں نے لاہور کا ریلوے سٹیشن پہلی بار دیکھا تھا لہٰذا اس کی شان وشوکت سے بے حد متاثر ہوئی۔

مجھے یاد ہے اس موقع پر بیگم رعنا لیاقت علی بھی ریلوے سٹیشن پر آئی ہوئی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا۔ اس سے پہلے میرا تمام وقت قادیان میں گذرا تھا جہاں عورتیں برقعے کی پابندی کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں اور پردے کے بغیر کسی عورت کا گھر سے باہر نکلنے کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ ایسے میں بیگم رعنا لیاقت علی خان کا پردے کی رعایت کے بغیر اور پوری آرائش وزیبائش کے ساتھ بے محابا ریلوے سٹیشن پر موجود ہونا میرے لیے ایک ایسا اچنبھا تھا جس نے مجھے کئی دن تک حیران و پریشان کئے رکھا۔

میں چچا ابراہیم کے آنے پر بہت خوش تھی۔ وہ ناشتہ کے لیے ڈبل روٹی، جام اور مکھن لایا کرتے تھے جو میرے لیے ایک طرح سے نئی چیز تھی۔ یوں بھی بے سروسامانی کے اس دور میں اس رئیسانہ ناشتے کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا چنانچہ مجھے ان کے ساتھ ناشتہ کرنے کا بہت مزا آتا۔ ویسے بھی وہ بہت محبت کرنے والے انسان تھے لہٰذا ان کے آنے سے مجھے بہت تقویت محسوس ہوئی۔

ہمارے قادیان سے نکلنے کے چند ہی روز بعد قادیان پر حملہ ہو گیا۔ ہمارے ماموں یعنی مرزا محمد یعقوب اور ان کی فیملی اور پھوپھا یعنی ملک نواب خان اور ان کی فیملی اس وقت تک وہیں تھی۔ سُنتے ہیں ان لوگوں نے کافی پریشانی اُٹھائی جس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

ہمیں قادیان سے آئے ہوئے دو ڈھائی ماہ ہو گئے تھے اور زندگی اسی طرح رواں دواں تھی کہ ایک دن اباجی نے دفتر سے واپسی پر بتایا کہ انہیں ان کے ایک پرانے دوست، اختر ملے تھے۔ انہوں نے بیرون بھاٹی دروازہ میں ایک مکان اپنے لیے الاٹ کروایا تھا لیکن چونکہ وہ غیر شادی شدہ تھے اور یہ مکان ان کی ضرورت سے بہت بڑا تھا لہٰذا ان کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ اگر ہم لوگ چاہیں تو وہاں رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ہم لوگ فوراً وہاں منتقل ہو گئے۔

مکان نمبر ۸، گلی نمبر ۱۳، کوچہ دیوان دیوی دیال، شیش محل روڈ جہاں ہم نے ربوہ منتقل ہونے سے پہلے سارا وقت گذارا ایک وسیع وعریض مکان تھا۔ اس دومنزلہ مکان کے دو الگ الگ حصے تھے جن میں سے ہر حصہ میں کئی کمرے تھے۔ اگر چہ گراؤنڈ فلور پر واقع بعض کمروں کے دروازے گلی میں بھی کھلتے تھے لیکن اس مکان کے اندر داخل ہونے کا راستہ لکڑی کے ایک گیٹ میں سے تھا جو دن رات کھلا رہتا۔ گیٹ میں سے اندر آنے کے بعد دونوں حصوں میں داخلے کے راستے الگ الگ تھے۔ اس مکان کی دوسری منزل پر ایک نلکا لگا ہوا تھا اور اس مکان کے سبھی مکین پانی کی تمام ضروریات اسی نلکے سے پوری کرتے۔ وہ اپنے اپنے کپڑوں کی دھلائی اور برتنوں کی صفائی بھی وہیں کرتے۔ سب چھوٹے بڑے وہیں نہاتے جس کی وجہ سے نلکے کے اردگرد ہمہ وقت عجیب سی سیلن اور پھسلن رہتی۔

اگر چہ یہ متروکہ جائیداد تھی لیکن ہمارے یہاں پر منتقل ہونے سے پہلے اسے پوری طرح لوٹا جا چکا تھا اور

اس میں مختلف قسم کی دو کرسیوں، ایک رائٹنگ ٹیبل اور ڈگڈگی کی شکل کے لوہے کے ایک سٹول کے علاوہ کوئی اور سامان موجود نہ تھا۔ ہم قادیان میں ہنستے بستے گھر چھوڑ کر آئے تھے اور جیسا کہ بتایا جاتا ہے اگر چہ ہمارا شمار رؤسا میں نہ تھا پھر بھی اللہ کے فضل سے ضرورت کی ہر چیز ہمارے گھر میں موجود تھی۔ ایسے میں اتنی عسرت میں زندگی گذارنا ہمارے لیے ناممکن نہیں تو آسان بھی نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو حالات کے مطابق ڈھلنے کی بہت صلاحیت دے رکھی ہے اور یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا۔ ہم لوگ شروع میں نیچے سوتے رہے۔ آہستہ آہستہ گھریلو ضروریات کی بنیادی چیزیں خریدی جانے لگیں تاہم یہ چاروں چیزیں مدتِ دراز تک ہمارے گھر میں رہیں اور لمبی مدت تک ہمارے گھر کا کل فرنیچر ان ہی اشیاء پر مشتمل تھا۔

میو ہسپتال کے انتہائی صاف ستھرے علاقے سے نکل کر بھاٹی میں رہنا ہمارے لیے ایک دھچکے سے کم نہ تھا۔ اگر چہ میں چھوٹی تھی لیکن پھر بھی مجھے وہاں کا ماحول بہت خراب محسوس ہوا۔ ہمارے اردگرد گامے ماجے رہتے تھے جو غیر تعلیم یافتہ اور بداخلاق تھے۔ عورتیں بالکونیوں میں کھڑی ہو کر ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتیں۔ بھانڈ اور ہیجڑے اکثر اس گلی میں آتے رہتے تھے اور کبھی کبھی لوگ کنجیاں بھی نچواتے جو ساری ساری رات اُودھم مچائے رکھتیں۔ بچے اور بڑے غلیظ گالیاں بکتے اور بات بے بات ایک دوسرے سے مارا ماری پر اُتر آتے۔ ہماری پرورش قادیان کے پاکیزہ ماحول میں ہوئی تھی لہٰذا ہمیں یہ سب کچھ ایک آنکھ نہ بھاتا تاہم صورت حال کے تدارک کے لیے ہم دعا کے علاوہ کچھ بھی تو نہ کر سکتے تھے۔

خاندانوں کی وسیع پیمانے پر ہجرت کے نتیجے میں جہاں لوگوں کو بعض شدید جذباتی صدمات سے دو چار ہونا پڑا وہیں لوگ بیٹھے بٹھائے اپنے گھر بار اور روزگار سے محروم ہو گئے۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی اور ان کے جدھر سینگ سمائے ادھر نکل گئے۔ انہیں سونے کے لیے چارپائی، تن ڈھانپنے کے لیے دو کپڑے اور دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی اور ہماری گلی کے مکین بھی اس ماحول سے مستثنٰی نہ تھے۔ ہماری گلی کی بجلی کٹ چکی تھی۔ کسی کے پاس اتنی توفیق نہ تھی کہ بلوں کے بقایا جات ادا کرنے کے بعد اپنے گھر کی بجلی بحال کرا لے لہٰذا مجبوراً بجلی کے بغیر گذارا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ موسم گرما میں مرد محض پاجامے یا لنگوٹ میں گھومتے پھرتے۔ جگہ کی تنگی کے باعث مرد تو درکنار، عورتیں بھی تھڑوں پر سونے پر مجبور تھیں۔ کچھ خوش قسمت گلی میں چارپائیوں پر سوتے اور یوں رات کے وقت اس گلی میں گذرنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ اس طرزِ معاشرت کے اپنے منفی پہلو تھے لیکن خدا کا شکر ہے پاکستان میں پہلی رات کے علاوہ اس نے ہمیشہ ہمیں چھت مہیا کئے رکھی۔ آہستہ آہستہ جب حالات معمول پر آنے لگے تو لوگ اپنے اپنے رشتہ دار تلاش کرنے لگے۔

پارٹیشن کے فوراً بعد ہمارے ننہیال کو اوپر تلے تین صدمات سے دو چار ہونا پڑا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے نانا جی اور نانی جی، بھائی جی کے ہمراہ لاہور سے جہلم چلے گئے تھے۔ یہ اپنے دائمی مرکز سے جدائی کا نتیجہ تھا یا گھر بار سے محرومی کا شاخسانہ کہ نانا جی کچھ ہی عرصہ کے بعد یعنی ۱۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو دل کے شدید حملہ سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ بوقت وفات وہ مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے۔ ابھی ایک رکعت ادا کی

تھی کہ اچانک وفات پا گئے۔ نانا جی موصی تھے مگر حالات کے جبر کے تحت ان کی تدفین جہلم ہی میں کر دی گئی اور وہ بھی تابوت کے بغیر جس کی وجہ سے بعد میں بھی ان کی نعش کی بہشتی مقبرہ منتقلی ممکن نہ ہو سکی۔

اس زمانے میں فون کی سہولت عام تھی نہ فوری طور پر اطلاع پہنچانے کا کوئی اور انتظام چنانچہ بھائی جی نے نانا جی کی وفات کی خبر ان کی تدفین کے بعد بذریعہ خط دی۔ ابھی نانا جی کی وفات کا صدمہ بالکل تازہ تھا کہ نانی جی کا بھی انتقال ہو گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ نانا جی کا جنازہ گھر سے جانے لگا تو نانی جی نے روتے ہوئے کہا کہ آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہیں، مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ وہ قبولیت دعا کی کوئی گھڑی تھی یا یہ بات دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بڑے درد سے نکلی تھی جو سیدھی عرش پر جا پہنچی چنانچہ ابھی آٹھ دن ہی گذرے تھے کہ وہ سیڑھیوں سے گر کر بیہوش ہو گئیں اور تقریباً چوبیس گھنٹے کی بیہوشی کے بعد انتقال کر گئیں۔ ان کی تدفین بھی جہلم میں ہوئی۔

یہ دونوں بزرگان موصی تھے اور عام حالات میں بہشتی مقبرہ قادیان میں تدفین کے مستحق ہوتے تاہم ہنگامی حالات میں اُنہیں جہلم میں دفن کرنا پڑا اور وہ بھی تابوت کے بغیر۔ بعد میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خصوصی ہدایت پر ان کے کتبۂ یادگار بہشتی مقبرہ قادیان میں نصب کر دیئے گئے۔

والدین کی اوپر تلے وفات امی کے لیے ایک نہ بھولنے والا صدمہ تھا۔ اس زمانے میں جب مالی تنگی کی وجہ سے لاہور سے جہلم تک کا سفر بھی آسان نہ تھا امی ان کا آخری دیدار بھی نہ کر سکیں جس کا انہیں یقیناً ساری زندگی افسوس رہا ہو گا لیکن انہوں نے اس صدمے کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کیا اور اپنی اس محرومی پر ابا جی سے کبھی شکایت یا شکوہ نہ کیا۔

نانا جی اور نانی جی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد بھائی جی لاہور منتقل ہو کر اسی مکان کی ایک برساتی میں جا گزین ہو گئے۔ ان کے برادرِ خورد قاضی ظہور احمد (جنہیں گھر میں ''چھوٹے بھائی جی'' کہا جاتا تھا) بمع اپنی بیگم (المعروف ''آپا بدر النساء'') ان کے ساتھ ہی لاہور آ گئے۔

ان دنوں لاہور میں ہیضہ وبا کی صورت پھیلا ہوا تھا چنانچہ یہاں پہنچتے ہی آپا بدر النساء اسہال اور اُلٹیوں کی وجہ سے شدید بیمار ہو گئیں۔ ایک روز جب گھر پر کوئی مرد موجود نہ تھا ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ وہ بیچاری بار بار اُلٹیاں اور اجابت کرتی رہیں۔ میں اس وقت ابھی سکول داخل نہیں ہوئی تھی چنانچہ میں سارا دن ان کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھی رہی حتّٰی کہ عصر کے قریب انہوں نے کھڑکی بند کروا کر اپنے دونوں پاؤں اس کے سامنے رکھ لیے اور کہنے لگیں کہ کچھ عورتیں اس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو کر انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے کھڑکی تو بند کر دی لیکن تھوڑی دیر بعد ان کی وفات ہو گئی۔ انہیں قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا لیکن جلد ہی ان کی قبر معدوم ہو گئی۔

چونکہ ہمارا مکان خاصا وسیع تھا اور ہمارے رشتہ داروں کو کسی اور جگہ سر چھپانے کی مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی لہٰذا وہ آہستہ آہستہ اسی گھر میں منتقل ہونے لگے چنانچہ ہمارے ماموں، مرزا محمد یعقوب نیچے والے پورشن میں آ گئے۔ دوسری جانب برساتی میں چچا یوسف اپنی فیملی کے ساتھ رہنے لگے۔ ہمارے بالمقابل پھوپھی رہنے لگیں

اور ان کے نیچے والے حصہ میں تایا اسحاق اور ان کی فیملی آ گئی اور یوں ہمارا دل لگ گیا۔ میں اور تایا اسحق کی بیٹی ثریا تیسری جماعت میں داخل ہو گئے۔ مجھے اب سکول کا نام تو یاد نہیں آ رہا مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ سکول راوی روڈ پر تھا۔ ہم اکٹھے سکول آتے جاتے تھے اور پڑھائی بھی اکٹھے بیٹھ کر کرتے تھے۔ یہ ماحول ہمارے لیے نیا تھا لیکن آہستہ آہستہ ہمارا دل اس سکول میں لگ گیا اور وقت اچھا گذرنے لگا۔

ویسے تو ہجرت کے بعد امی نے حالات کا مقابلہ صبر اور ہمت سے کیا اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائیں مگر جس چیز کو امی نے از حد تکلیف پہنچائی وہ سلائی مشین کا نہ ہونا تھا۔ اس زمانہ میں زیادہ تر کاٹن کے کپڑے استعمال ہوتے تھے جو جلد پھٹ جاتے۔ امی انہیں نہایت سلیقہ کے ساتھ مرمت کرتیں۔ بعض بڑے کپڑوں کو چھوٹا کرتیں اور ناکارہ کپڑوں کے تکیے کے غلاف یا گھریلو استعمال کی کوئی اور چیز بنا لیتیں لہٰذا انہیں مشین کی بہت ضرورت رہتی۔ وہ کبھی کسی سے اور کبھی کسی سے عاریتاً مشین لا کر اپنی ضرورت پوری کرتیں اور جس سے مشین لیتیں اس کے احسان کا بدلہ اس کے کپڑے سی کر اُتارتیں۔ اس طرح انہیں سالہا سال تک سلائی پر بہت محنت کرنا پڑی اور اپنے کپڑوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کے کپڑے بھی سینا پڑتے رہے۔

اس مکان میں قیام کے زمانے میں ہم دلّی دروازہ والی بیت الذکر میں نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت تک یہی لاہور کی مرکزی بیت الذکر تھی اور حضرت مصلح موعود یہیں خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ابا جی نے تو یوں بھی وہاں جانا ہی ہوتا تھا تاہم وہ چاہتے تھے کہ گھر کا ایک فرد بھی جمعہ سے محروم نہ رہے چنانچہ وہ تنگدستی کے باوجود سالم تانگہ لے لیتے اور یوں ہم سب بہ آسانی بیت الذکر پہنچ جاتے۔

حضرت حکیم مرہم عیسیٰ رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے، ڈاکٹر عبدالحمید چغتائی ابا جی کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ موصوف کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات ۱۹۴۲ء میں قادیان میں ہوئی تھی جس کے بعد وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی دید کے مشتاق رہے۔ ان دونوں کی آپس میں خط و کتابت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت طویل خطوط لکھا کرتے جن میں بے شمار ذاتی، جماعتی، طبی اور تاریخی امور پر بحث ہوتی۔ جب ملتے تو پہروں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ان کی رہائش بیت الذکر کے بہت قریب تھی اور ان کے اہل وعیال سے ہم سب کی بے تکلفی تھی چنانچہ نمازِ جمعہ کے بعد ابا جی ہمیں ان کے گھر لے جاتے۔ ہم بالعموم مغرب کے قریب گھر واپس آتے۔''

یہ تو تھیں قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور کی وہ باتیں جو میں نے آپی سے سنیں اور صرف اس لیے ضابطہ تحریر میں لے آیا تا کہ نئی پود کو ان مشکلات کا کچھ اندازہ ہو سکے جس میں سے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آنے والوں کو گذرنا پڑا۔ یہ درست ہے کہ حضرت مسیح موعود کی اپنی جماعت کے لیے دعاؤں اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی بے مثال قیادت کی وجہ سے جماعت جانی نقصان سے بالعموم محفوظ رہی لیکن ترکِ وطن کی صورت میں انہیں بے انتہا مالی اور نفسیاتی اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔

جہاں تک میری اپنی یادداشت کا تعلق ہے مجھے اس زمانے کی صرف دو تین باتیں ہی یاد ہیں۔ مثلاً یہ کہ

خالصہ ہائی سکول جو قیامِ پاکستان کے بعد مسلم ہائی سکول کہلانے لگا تھا ہماری اس گلی سے تقریباً ملحق تھا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ابتداءً سکول اور اس گلی کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی اور اگر تھی تو زمانے کی دست بُرد کا شکار ہو چکی تھی۔ ہم اس سکول کے صحن میں کھیلا کرتے تھے۔ میرے اس زمانے کے ساتھیوں میں میرے اپنے دو پھوپھی زاد بھائی، مسعود اور داؤد؛ میرے ایک چچازاد محمد امین اور میرے خالہ زاد بھائی، قاضی منظور احمد کے دو بیٹے، مبشر اور بشارت شامل ہیں۔ مسعود اور مبشر عمر میں مجھ سے کچھ بڑے؛ داؤد اور بشارت میرے تقریباً ہم عمر اور امین مجھ سے سال بھر چھوٹے تھے۔ مسعود اور داؤد کا قدرے تفصیلی ذکر اس کتاب کے اگلے صفحات پر موجود ہے۔ مبشر اور بشارت دونوں نے آغازِ ربوہ میں تعلیم الاسلام پرائمری سکول میں داخلہ لیا تھا لیکن ان کا دل یہاں نہ لگا اور وہ جلد ہی لاہور منتقل ہو گئے۔ مبشر میٹرک کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آج کل برمنگھم میں مقیم ہیں جب کہ ان کے بھائی بشارت ایک تکلیف دہ بیماری کے بعد جس کا ذکر بعد میں آئے گا جوانی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ امین آج کل ربوہ میں ہیں اور اقصیٰ روڈ پر بجلی کے سامان کی دکان کرتے ہیں۔

اُسی زمانے میں میرے سینے کے دائیں طرف ایک پھنسی نکلی جس نے بڑھتے بڑھتے پھوڑے کی شکل اختیار کر لی۔ افراتفری کے اُس دور میں اس تکلیف کے ماہرانہ علاج کی گنجائش نہ تھی چنانچہ اباجی مجھے ڈاکٹر عبدالحمید چغتائی کے پاس لے گئے۔ انہوں نے اس پھوڑے کا معاینہ کیا اور بتایا کہ ''چیرا'' ہی اس کا واحد علاج ہے۔ اباجی نے ان سے اتفاق کیا جس پر انہوں نے نشتر سے اس پھوڑے کو کاٹ دیا۔ اس میں جمع شدہ پیپ اور فاسد مادے خارج ہو گئے جس سے میرے درد میں فوری کمی آ گئی۔ زخم مندمل ہونے میں کچھ دن لگے لیکن اس ''چیرے'' کا نشان آج بھی میرے سینے پر موجود ہے۔

تنگدستی کے اُس زمانہ میں ایک عام خاندان نئے کپڑے سِلوانے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس عرصہ میں ایک عید آئی تو میرے لیے نہ جانے کس طرح نئے کپڑوں کا اہتمام کیا گیا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ قمیص پر گہری رنگدار لکیریں تھیں لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ ان کا رنگ بالکل کچا ہے۔ اتفاق سے عید کے روز شدید بارش ہوئی۔ شیش محل روڈ والے اس مکان کے باقی بچوں کے ساتھ میں بارش میں کیا نہایا، میری قمیص کا رنگ اترنا شروع ہو گیا۔ بارش ختم ہونے کے بعد یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ وہی نئی قمیص ہے جسے اُس صبح پہلی بار پہنا گیا تھا۔

یہ تھا اس زمانے میں عمومی کسمپرسی کا عالم اور ہم اسی کیفیت میں ربوہ منتقل ہو گئے۔

میرے حضور آپ کے فیض کی ہیں یہ برکتیں

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ ہم لاہور سے ربوہ کب منتقل ہوئے تھے تاہم بعض شواہد کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ ہمارا خاندان ستمبر ۱۹۴۹ء کے دوسرے عشرے میں ربوہ پہنچا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ابا جی کے فرائضِ منصبی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے پاس ہمہ وقت موجودگی کے متقاضی تھے۔ حضور ربوہ میں مستقل قیام کے لیے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء کو یہاں تشریف لائے تھے لہٰذا قرینِ قیاس یہ ہے کہ ابا جی اس سے ایک یا دو روز پہلے یعنی ۱۷ یا ۱۸ ستمبر کو ربوہ پہنچے ہوں گے۔

اب یہ بات بھی میرے ذہن سے مکمل طور پر محو ہو چکی ہے کہ ہم نے لاہور سے ربوہ تک کا یہ سفر کیسے کیا تھا تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ ربوہ پہنچنے کے بعد شروع میں ہمارا قیام کچے کوارٹروں میں تھا۔ کچے کوارٹروں سے میری مراد صدر انجمن احمدیہ کے کارکنان کے لیے خام اینٹوں سے تعمیر کردہ وہ قیام گاہیں ہیں جو انہیں جماعتی طور پر مہیا کی گئی تھیں۔ ہمارا کوارٹر ساتھ ساتھ بنے ہوئے دو کمروں اور الگ سے تعمیر شدہ ایک باورچی خانے پر مشتمل تھا جب کہ بیت الخلا اور غسل خانہ صحن کے ایک کونے میں تھا۔ میرا خیال ہے اس گلی کے باقیماندہ کوارٹروں کا نقشہ بھی یہی ہوگا۔

ربوہ ایک بے آب و گیاہ قطعہ اراضی پر آباد ہوا تھا جہاں سے مسافر دن کے وقت بھی گذرنے سے گھبراتے تھے۔ یہاں کی زمین شور اور زیرِ زمین پانی انسانی استعمال کے قابل نہ تھا۔ جدید زمانے کی سہولیات تو درکنار یہ زمین کسی وادی غیر ذی زرع کا منظر پیش کر رہی تھی جہاں تاحدِ نگاہ خشک پہاڑیاں تھیں یا پھر چند خودرو جھاڑیاں۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں قائم ہونے والی خیمہ بستی کو ایک ایسی آبادی کی شکل دی جا رہی تھی جسے اگلے چند سالوں میں جماعت احمدیہ کے مرکز کی حیثیت سے اکنافِ عالم میں شہرت پانا تھی لیکن شروع میں یہاں کے حالات انتہائی مخدوش تھے جس کا پورا ادراک صرف ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جنہوں نے یہ دَور اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہو۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں بجلی تھی نہ پانی، جہاں ہریالی تھی نہ سبزہ اور جہاں آندھیوں اور بگولوں کی حکمرانی اور سنسانیوں اور ویرانیوں کا راج تھا۔ یوں ہی تو نہیں کہا تھا میر اللہ بخش تسنیم نے:

تھی محروم اس کی قسمت گھاس سے، خوش رنگ پھولوں سے
ہوا تھی کشمکش میں اس کی آوارہ بگولوں سے
نہ کچھ لذّت تھی پانی میں، نہ کچھ فرحت ہوا میں تھی
خموشی کی حکومت روز و شب ارض و سما میں تھی

یہاں دن رات ہیبت گھومتی تھی ، رقص کرتی تھی
تمنا سرد آہیں یاس کے عالم میں بھرتی تھی
یہاں کی گرمیوں سے ضیق ہوتا تھا فضاؤں کو
ترستی تھی دہکتی سر زمیں ٹھنڈی ہواؤں کو
نمونہ تھی یہ دھرتی بے گیاہ و آب وادی کا
اسے قسمت نے نقشہ تھا بنایا نامرادی کا

اس کے باوجود اس بستی کے ابتدائی آبادکاروں نے ہمت نہ ہاری اور صبر وشکر کے ساتھ مٹی کے ان ہی گھروندوں میں ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا چنانچہ ہم نے بھی انجمن کی طرف سے فراہم کردہ کوارٹر کی سہولیات کو ناکافی سمجھتے ہوئے اس کے صحن میں ایک چبوترا بنوالیا۔ یہ چبوترا تقریباً پانچ فٹ چوڑا اور سات آٹھ فٹ لمبا ہوگا۔ گرمیوں کے موسم میں صبح کا ناشتہ اور شام کا کھانا اسی چبوترے پر تیار ہوتا۔ امی نے اس چبوترے کے ایک کونے میں بڑے شوق کے ساتھ ایک چھوٹا تندور نصب کرایا۔ ہم اسے ''تندوری'' کہتے تھے۔ حسبِ ضرورت یہ تندوری تپا کر روٹی پکالی جاتی۔ اس معاشرے کی اقدار کچھ اور تھیں چنانچہ کبھی کبھار کسی ہمسائے کی طرف سے بھی روٹی کی فرمائش آجاتی جسے بہت خوش دلی کے ساتھ پورا کیا جاتا۔ وہ گندھا ہوا آٹا بھجوا دیتے اور امی روٹیاں لگا دیتیں۔

اسی چبوترے پر پانی کے گھڑے اور دھاتی برتن پڑے رہتے تھے۔ ایک دو پیڑھیاں بھی یہاں مستقل پڑی رہتیں اور گھر والے موسم کی مناسبت سے رات کا کھانا بالعموم یہیں بیٹھ کر کھاتے۔

اُن دنوں کسی کوارٹر میں نلکا نہیں تھا اور پانی گلی میں جماعتی طور پر لگوائے گئے ایک نلکے سے حاصل کیا جاتا۔ شروع میں ایک عورت پانی کے گھڑے بھر بھر کر گھروں میں پہنچاتی اور اپنا حق الخدمت وصول کر لیتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ کام ماشکی سرانجام دینے لگے تاہم چونکہ یہ پانی گھر کی جملہ ضروریات کا کفیل نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا خواتین رات کے وقت اس نلکے سے حسبِ ضرورت خود ہی پانی بھر لیتیں۔

یوں تو اس گلی میں کوئی درجن بھر گھر ہوں گے جن میں سلسلہ کے بعض ممتاز بزرگان بھی رہائش پذیر تھے لیکن اگر میں اپنی یادداشت پر ہی انحصار کروں تو صرف تین چہرے سامنے آتے ہیں: قاری محمد امین، چوہدری عطاء اللہ اور مولوی احمد خان نسیم۔ اول الذکر دو اصحاب کے ساتھ تو ہماری دیواریں بھی سانجھی تھیں۔

قاری محمد امین جو حضرت قاری غلام یٰسین رفیق حضرت مسیح موعود کے فرزندِ اکبر تھے اُن دنوں غالباً دارالضیافت کے انچارج تھے۔ خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے بزرگ تھے۔ اگرچہ میں نے انہیں کوٹ یا اچکن کا التزام کرتے تو نہیں دیکھا لیکن سر پر پگڑی ضرور رکھتے تھے۔ صاف رنگت کے دبلے پتلے دراز قد قاری محمد امین اکثر بائیسکل پر آتے جاتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے بعد میں محلّہ دارالصدر شمالی میں مکان بنالیا۔ سڑک پر ان کے چچا قاری غلام مجتبٰے المعروف ''چینی صاحب'' کا مکان تھا جب کہ ان کا مکان اس کے عقب میں تھا۔

موصوف سالہا سال تک صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں بطور سپرنٹنڈنٹ، امین اور محاسب خدمت بجالاتے رہے اور انہیں لمبا عرصہ بیت الانوار میں امامت کے فرائض سرانجام دینے کا موقع بھی ملا۔

بعد میں ان سے ہمارا ایک رشتہ بھی قائم ہو گیا اور وہ اس طرح کہ قاری محمد امین کی ایک بیٹی، نصیرہ میرے ایک تایازاد، محمد امین (جنہیں ہم اپنے گھر میں بھائی جان امین کہتے ہیں) سے بیاہی گئیں۔ وہ اُس زمانے میں سکول ٹیچر تھے لیکن جلد ہی انگلستان منتقل ہو گئے۔

جہاں تک چوہدری عطاء اللہ کا تعلق ہے سچ پوچھیں تو کچے کوارٹرز چھوڑنے کے بعد میرا ان سے رابطہ نہ رہ سکا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ربوہ کے ابتدائی دور ہی میں صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت ترک کر کے کہیں باہر منتقل ہو گئے تھے۔ جب میں نے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ اللہ بھلا کرے میرے ایک دوست کا جنہوں نے میرے استفسار پر کہا: ''تعجب ہے تم انہیں نہیں پہچانتے۔ وہ معاون ناظر امورِ عامہ ہوا کرتے تھے۔ پھر سرکاری ملازمت کر لی اور بطور ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے۔ بعد میں انہوں نے محلہ دارالفضل کے آس پاس اپنا مکان بنا لیا تھا لیکن آج کل کینیڈا ہوتے ہیں۔''

ایک روز جب میں نے ان کا فون ملایا تو اس پر آنسرنگ مشین لگی ہوئی تھی جس نے بتایا کہ یہ نمبر تو دھاریوال فیملی کا ضرور ہے لیکن اس وقت اس کا کوئی فرد گھر پر موجود نہیں۔ دوسری بار ان کی بہو سے بات ہوئی اور تیسری کوشش میں چوہدری عطاء اللہ سے گفتگو میں کامیابی ہوئی: ''مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ کا فون آیا ہے۔ میں سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ مولانا یعقوب طاہر کے بیٹے ہی ہو سکتے ہیں۔''

''آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے'' میں نے بے ساختہ کہا ''یہی تو احمدیت کی برکت ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھے کم وبیش ساٹھ سال بیت گئے لیکن آپ نے مجھے پھر بھی پہچان لیا ہے۔''

چوہدری عطاء اللہ کا تعلق چک ۴۳ جنوبی سے ہے جو لالیاں سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۹۴۹ء کے جلسہ سالانہ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے نوجوانوں کو زندگی وقف کرنے کی تحریک فرمائی تو وہ بی اے پاس کرنے کے بعد محکمہ خوراک میں ملازمت کر رہے تھے۔ انہوں نے اس ملازمت سے استعفیٰ دے کر خود کو حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضور نے ان کی تعیناتی بطور معاون ناظر امور عامہ کر دی۔ انہوں نے ایک سال سید زین العابدین ولی اللہ شاہ اور اگلے پانچ سال عبدالرحیم درد کے ماتحت کام کیا۔ وہ کچھ عرصہ معاونِ شخصی، ناظر بیت المال بھی رہے۔ اس دوران وہ انجمن کوارٹرز میں اس مکان میں مقیم رہے جو بعد میں مولوی قمر الدین کو الاٹ ہوا۔ اس مکان کے ساتھ کچھ کھلی جگہ تھی جس پر انہوں نے ڈھور ڈنگر رکھے ہوئے تھے۔ پھر کسی وجہ سے انہیں انجمن کی ملازمت چھوڑنا پڑی لیکن جلد ہی سکول ٹیچر کی ملازمت مل گئی اور وہ اپنے ہی گاؤں میں متعین ہو گئے۔

انہوں نے دورانِ ملازمت بی ایڈ کر لیا جس کی وجہ سے انہیں محکمانہ ترقی کے حصول میں مدد ملی اور وہ ۱۹۶۲ء میں ہیڈ ماسٹر بن گئے۔ انہوں نے اگلے تئیس سال اسی حیثیت میں کام کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ ناصر پبلک سکول، ربوہ میں بھی ہیڈ ماسٹر رہے۔

''ربوہ میں ملازمت کے دور کی کوئی دلچسپ یاد؟'' میں نے انہیں کریدا۔

''یادیں تو بہت سی ہیں لیکن انہیں پورے سیاق وسباق میں بیان کرنے کے لیے وقت چاہیئے تاہم ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کیے دیتا ہوں۔''

''ارشاد!''

''آپ کو پتا ہے ربوہ کے ماحول میں سرِ عام تمباکو نوشی کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی جاتی رہی ہے لیکن اپنے دیہی پس منظر کی وجہ سے میں ہمیشہ سے حقے کا عادی ہوں۔ دفتر میں حقہ رکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا لہٰذا میں دوپہر گیارہ ساڑھے گیارہ بجے گھر جا کر اپنا نشہ پورا کر آتا تھا۔ میرے خاص خاص دوستوں کو میری اس عادت کا علم تھا۔ ایک بار جب میری رہائش انجمن کوارٹرز میں تھی اور میں حقہ پینے کے لیے گھر آیا ہوا تھا اچانک کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے جا کر دیکھا تو مولوی عبدالرحمٰن انور کھڑے تھے۔''

''وہی جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری اور شاید کچھ عرصہ پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہے ہیں؟''

''جی وہی۔ میں انہیں دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کسی نے حضور کے پاس میری کوئی شکایت کر دی ہے اور مولوی صاحب کو تحقیق کے لیے میرے گھر بھجوایا گیا ہے لیکن جلد ہی انہوں نے میری یہ غلط فہمی دُور کر دی۔''

''وہ آئے کیوں تھے؟''

''قصہ دراصل یہ تھا کہ حضرت نواب محمد عبداللہ خان کے بعض غیر از جماعت رشتہ دار حضور کے پاس بطور مہمان تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ حقے کے عادی تھے۔ جب انہوں نے حقے کی خواہش ظاہر کی تو حضور نے مولوی عبدالرحمٰن انور کو بتایا کہ حقہ صرف چوہدری عطاء اللہ کے گھر سے مل سکتا ہے لہٰذا آپ ان کے پاس چلے جائیں۔ اس واقعے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ میں اپنی دانست میں حقہ نوشی کی عادت کو دنیا بھر سے چھپائے ہوئے تھا لیکن میرے اردگرد بھی لوگوں کو اس بات کا علم تھا۔ اوروں کا تو خیر ذکر ہی کیا، خود حضورِ انور بھی میری اس کمزوری سے واقف تھے۔''

چوہدری عطاء اللہ ۱۹۹۹ء سے کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی وہاں ہوتی ہے۔ خود موسم گرما وہاں گزارتے ہیں اور سردیوں کے موسم میں چند ماہ ربوہ رہتے ہیں۔

''اب میں پاکستان آیا تو ان شاء اللہ آپ سے ضرور ملوں گا'' انہوں نے میرے ساتھ اپنی آخری گفتگو میں وعدہ کیا۔

''میں اس موقع کا منتظر رہوں گا'' میں نے جواباً کہا ''آپ کے ساتھ دوبارہ ملاقات سے میری یہ حسرت پوری ہو جائے گی۔''

رہے مولوی احمد خان نسیم تو وہ چنگا بنگیال ضلع راولپنڈی کے حضرت محمد فضل خان، رفیق حضرت مسیح موعود کے

صحابہ [illegible] اور پرانے واقفین زندگی میں سے تھے۔ انہوں نے کئی سال تک برما میں مربی [illegible] کیا۔
قیام پاکستان کے موقع پر قادیان سے گرفتار ہوئے اور تقریباً آٹھ ماہ بعد دونوں ملکوں کے مابین قیدیوں کے تبادلہ
کے ایک معاہدے کے تحت پاکستان آئے۔ جن دنوں ہمیں اُن کے قریب رہنے کا شرف حاصل ہوا وہ مربی کے
طور پر کام کر رہے تھے لیکن چوہدری فتح محمد سیال کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے مقامی دعوت وارشاد کی
نگرانی کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے یہ ذمہ داری تا دم آخر نہایت محنت و جانفشانی کے ساتھ سرانجام
دی۔ وہ ستائیس اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اپنی وفات کے وقت بطور ایڈیشنل ناظر اصلاح وارشاد (مقامی) خدمت بجا
لا رہے تھے۔ اس موقع پر الفضل نے انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''آپ کو دیہاتی لوگوں
کے ساتھ میل ملاقات اور گفتگو کا خاص ملکہ تھا۔'' ہوگا، مگر میری رائے میں شہر کے لوگ بھی ان کے حُسنِ اخلاق
کے کم معترف نہ تھے۔ کم از کم میں نے بلند قامت، بلند آواز اور بلند اخلاق احمد خاں نسیم کو ہر کسی سے مسکرا کر
ہی ملتے دیکھا۔

مجھے اس گلی کے باقی مکینوں کے نام یاد نہیں ہیں لیکن میں نے آپا، آپی اور صادقہ کی مدد سے ان کی جو فہرست تیار کی ہے اس کے مطابق یہاں رہنے والوں میں حضرت مسیح موعود کے دو رفقا یعنی حضرت مولوی غلام نبی مصری اور حضرت حکیم محمد عمر شامل تھے۔ ان کے علاوہ شیخ محمد دین مختارِ عام صدر انجمن احمدیہ؛ ملک سیف الرحمٰن مفتی سلسلہ اور ان کے سُسر منشی چراغ الدین بھی اسی گلی میں رہا کرتے تھے۔ دیگر لوگوں میں صوفی خدا بخش عبد زیروی (جو لمبا عرصہ وقف جدید انجمن احمدیہ سے وابستہ رہے)، چوہدری اعجاز نصر اللہ سابق نائب امیر جماعت احمدیہ لاہور (جو چوہدری عطاء اللہ سے پہلے معاون ناظر امور عامہ تھے اور ۲۸ مئی کے سانحۂ لاہور میں شہادت کے مقام پر فائز ہوئے)، قاضی نور محمد (جنہیں طویل مدت تک روزنامہ الفضل کی کتابت کا موقع ملا تھا اور جنہوں نے تفسیر کبیر کے کچھ حصہ کی بھی کتابت کی تھی) اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے باڈی گارڈ محمد عالم کے والد غلام حسین شامل تھے۔

بعد کی زندگی میں مجھے ان میں سے اکثر اصحاب کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا لیکن اس زمانے میں تو میں ان کے نام سے بھی ناواقف تھا لہٰذا اس مرحلہ پر ان کے ذکر کو موقوف کرتے ہوئے میں یہاں صرف اسی قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب ہم ان کوارٹروں میں منتقل ہوئے تو میری عمر پانچ سال سے بھی کم تھی۔ اس عمر کی اکثر باتیں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بھول جاتی ہیں لیکن پھر بھی کچھ باتیں جو میرے ذہن پر آج تک نقش ہیں قارئین کی دلچسپی کے لیے بیان کی جا رہی ہیں۔ میری دانست میں ان واقعات و مشاہدات سے اُس ماحول کی جو اَب خواب و خیال ہو چکا ہے کچھ نہ کچھ عکاسی ضرور ہوتی ہے۔

کچے کوارٹروں میں قیام ہی کے دوران میں نے کاغذ کی ناؤ بنانا سیکھی تھی۔ میں پیتل کی پرات میں پانی بھر کر یہ ناؤ اس میں چھوڑتا تو وہ تیرنے لگتی۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا اور میرے دل میں یہ خواہش بار بار انگڑائیاں لیتی کہ ناؤ پانی کے کسی وسیع ذخیرے میں چلا کر دیکھی جائے۔ ایک روز مجھے اپنی اس خواہش کی تکمیل کا

موقع مل ہی گیا۔

ہمارے گھر کے بالکل قریب ریلوے سٹیشن کی موجودہ عمارت کے تقریباً سامنے ایک بہت بڑا گڑھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ربوہ کی عمارات میں استعمال ہونے والی خام اینٹیں اسی جگہ سے مٹی حاصل کر کے پاتھی گئی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہاں گھروں کا گندہ پانی جمع ہونے لگا اور برسات کے پانی نے اسے ایک بڑے جوہڑ کی شکل دے دی۔ اسے عام طور پر چھپڑ کہا جاتا تھا۔ اس پر ہمیشہ کائی جمی رہتی تھی اور اس کے کناروں پر گل عباس، اَرَنڈ (جسے عام طور پر اِرِنڈ کہا جاتا تھا) آک (جسے ہم اَک کہا کرتے تھے) اور کیکر کے خودرو پودے اُگے رہتے تھے۔ میں بہت دنوں تک سوچتا رہا کہ کیوں نہ اپنی ناؤ اس جوہڑ میں چھوڑ کر تماشہ دیکھوں چنانچہ ایک روز میں کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا اور ناؤ اس میں چھوڑ دی۔ اگرچہ پانی ساکت تھا لیکن ناؤ اتنی ہلکی تھی کہ ہوا کے زور سے دُور چلی گئی۔ میں کچھ دیر تک اس انتظار میں رہا کہ ناؤ واپس آئے تو اسے پکڑلوں لیکن میری اس خواہش کی تکمیل کا انحصار ہوا کے رحم وکرم پر تھا۔ خدا خدا کر کے ناؤ کنارے کی طرف آئی لیکن میری بے صبری کی وجہ سے ایک ایسا حادثہ رونما ہو گیا جو خدانخواستہ مجھے موت سے بھی ہمکنار کر سکتا تھا۔

اس اندیشے کے تحت کہ ناؤ پھر راستہ بھٹک کر دُور نہ نکل جائے میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران اپنا توازن کھو بیٹھا اور جوہڑ میں گر گیا۔ تیرنا مجھے آتا نہیں تھا چنانچہ پانی میں ڈبکیاں کھانے لگا۔ دوسرے کنارے پر کچھ دکانیں تھیں جن کی پشت جوہڑ کی طرف تھی۔ میری خوش قسمتی کہ ایک سبزی فروش جو اتفاقاً اپنی دکان کے پیچھے آیا ہوا تھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ جوہڑ کے کنارے پر آ بیٹھا۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ پانی میں ڈالتے ہوئے مجھے آواز دے کر کہا: ''اوئے! میری لت پھڑ لے۔'' میری زندگی ابھی باقی تھی سو کسی طرح میرا ہاتھ اس کی ٹانگ تک پہنچ گیا اور میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس نے مجھے کھینچ کر باہر نکال لیا اور پھر خود ہی گھر چھوڑ گیا۔

امی نے مجھے اس حال میں دیکھا تو وہ سخت پریشان ہوئیں۔ انہوں نے پہلے تو مجھے کتنی ہی دیر اپنی آغوش میں لیے رکھا، پھر مجھے نہلایا اور صاف کپڑے پہنا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ ابا جی اس وقت گھر سے باہر تھے۔ واپس آئے تو انہیں اس واقعہ کا پتا چلا۔ یقیناً وہ بھی سجدہ شکر بجا لائے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے میری جان محفوظ رکھی تھی۔ انہوں نے میری دلجوئی کی خاطر مجھے ایک آنہ دیتے ہوئے کہا تھا: ''جاؤ بیٹے! اپنی مرضی کی کوئی چیز کھالو۔'' میٹھا مجھے شروع سے ہی پسند ہے چنانچہ میں بھاگم بھاگ کریم حلوائی کی دکان پر پہنچا اور اس آنے کی برفی خرید لی۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود مجھے واضح طور پر یاد ہے کہ حلوائی نے مجھے ایک کاغذ پر برفی کے چار ٹکڑے رکھ کر دیئے تھے اور میں نے یہ برفی بہت مزے لے لے کر کھائی تھی۔

ہمارے ملنے جلنے والوں کو اس واقعے کی خبر پہنچی تو وہ اس کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ہمارے گھر آنے لگے۔ مجھے اپنے ان خیر خواہوں میں سے استانی حمیدہ راشدہ اور استانی زبیدہ کے نام ابھی تک یاد ہیں۔ استانی حمیدہ راشدہ تعلیم الاسلام ہائی سکول کے استاد حضرت صوفی غلام محمد کی صاحبزادی اور مبارک مصلح الدین کی ہمشیرہ

تھیں جب کہ استانی زبیدہ غلام حسین نامی ایک [illegible]
میں پڑھاتی تھیں اور "استانیوں والی گلی" میں رہائش پذیر تھیں۔

ہماری نئی نسل تو استانیوں والی گلی کے نام سے بھی آشنا نہیں ہو گی [illegible]
کہ نصرت گرلز ہائی سکول کے قیام کے وقت ایک گلی اس سکول کی معلمات کی رہائش [illegible]
یہ گلی سکول سے بالکل ملحق تھی۔ اس گلی کے قیام سے معلمات کی رہائش کا مسئلہ [illegible]
سکول آنے جانے میں بھی سہولت حاصل ہو گئی۔

مجھے آپی کے ہمراہ جو اُن دنوں اس سکول کی طالبہ تھیں کئی بار استانی [illegible] معلمات کے
گھر جانا یاد ہے۔ موصوفہ کا اب انتقال ہو چکا ہے البتہ ان کی چھوٹی بہن امۃ [illegible] کے
ساتھ رہائش پذیر تھیں ماشاء اللہ حیات ہیں۔ وہ بعد میں چوہدری غلام مجتبےٰ ایڈووکیٹ [illegible]
پچھلے کئی سال سے امریکہ منتقل ہو چکی ہیں۔ اسی طرح استانی امۃ الرشید اہلیہ [illegible]
جماعتِ احمدیہ حیدر آباد کی ایک بہن امۃ النصیر جو بعد میں چوہدری عبداللطیف آف [illegible]
کے عقد میں آئیں اور آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں اُس دور میں اپنی بہن کے پاس اسی گلی میں رہائش پذیر تھیں۔ یہ
دونوں خواتین میری عزیزوں میں سے ہیں اور میرا ان سے رابطہ ہے۔ ان دونوں نے آپی کی مدد سے میں نے
استانیوں والی گلی کی مکینان کی جو نامکمل سی فہرست تیار کی ہے اس میں استانی حمیدہ راشدہ، استانی [illegible]
استانی امۃ الرشید کے علاوہ استانی امۃ المنان قمر (اہلیہ میر غلام احمد نسیم مربی سلسلہ)، استانی [illegible]
شہیر شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کی صاحبزادی تھیں اور سید مبارک علی شاہ کے ساتھ شادی کے بعد [illegible]
میکلوڈ روڈ لاہور کی ہیڈ مسٹریس رہیں، استانی حمیدہ صابرہ، استانی امۃ الرحمٰن طیبہ (بنت حضرت خدا بخش [illegible])،
استانی سیّدہ (اہلیہ علی بن عبدالقادر)، استانی صالحہ خاتون (بنت محمد ابراہیم) اور استانی سلیمہ (بنت بابا محمد [illegible])
کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

میں ربوہ کی ان معلمات کے بارے میں مزید گفتگو موقوف کرتے ہوئے آپ کو [illegible] اپنے بچپن میں
لیے چلتا ہوں۔

اُس زمانے میں چچا ابراہیم تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں پڑھایا کرتے تھے اور [illegible] محلہ میں
ایک اچھا خاصا متروکہ مکان ان کے قبضے میں تھا۔ دادی جی ان کے پاس رہا کرتی تھیں۔ ابا جی ان سے ملاقات
کے لیے ہفتے میں دو بار چنیوٹ جایا کرتے تھے۔ بالعموم وہ یہ سفر ٹرین پر کرتے اور اکثر اوقات میں ان کے
ساتھ ہوتا تھا۔

ایک بار وہ دفتر سے گھر پہنچے تو گاڑی روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ہم بھاگم بھاگ سٹیشن پر پہنچے۔ وہ مجھے
ایک ڈبے میں بٹھا کر خود ٹکٹ خریدنے کے لیے چلے گئے لیکن ابھی واپس نہ پہنچ پائے تھے کہ گارڈ نے [illegible]
گاڑی چل پڑی۔ میں بہت پریشان ہوا اور چنیوٹ تک مجھے طرح طرح کے واہمے ستاتے رہے۔ میں اس قدر [illegible]

گھبرایا ہوا تھا کہ جب گاڑی چنیوٹ سٹیشن پر پہنچی تو میں نے اس کے رکنے کا انتظار کئے بغیر ہی پلیٹ فارم پر
چھلانگ لگا دی۔ میں اوندھے منہ گر پڑا اور میرا سامنے والا ایک دانت ٹوٹ گیا لیکن اللہ تعالےٰ نے مجھے کسی
بڑے حادثے سے بچالیا۔ اتنی دیر میں گاڑی رُک گئی۔ ابا جی نے جو ربوہ سے جلدی میں کسی اور ڈبے پر سوار ہو
گئے تھے نیچے اُتر کر مجھے اُٹھایا تو میری جان میں جان آئی۔

میری پڑدادی محترمہ کا تعلق چنیوٹ سے تھا اور ابا جی کی اُن کے خاندان کے ایک فرد، ڈاکٹر محمد اسحٰق کے ساتھ اچھی راہ و رسم تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا جماعت سے تو کوئی تعلق نہ تھا لیکن ہم جب ان کے پاس جاتے وہ ہمیں بہت عزت دیتے اور موسم کے مطابق ہماری تواضع کرتے۔ ایک روز ہم دونوں ان کے پاس بیٹھے تھے کہ ڈاکیا ان کے نام ایک منی آرڈر لے کر آیا۔ یہ منی آرڈر ستر روپے کا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اتنی بڑی رقم کبھی اکٹھی نہیں دیکھی تھی اس لیے مجھے لمبا عرصہ ڈاکٹر اسحٰق کی امارت پر رشک آتا رہا۔

ایک بار ہم چنیوٹ گئے تو دادی جی نے مجھے ایک خرگوش دیا۔ آہستہ آہستہ یہ خرگوش مجھ سے بہت مانوس ہو گیا۔ ایک دفعہ میری بے خبری میں ایک بلی اسے پکڑ کر لے گئی۔ مجھے اس بات کا اس وقت پتا چلا جب اچانک کسی نے باہر والا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں مولوی احمد خان نسیم کے بڑے صاحبزادے ناصر احمد کھڑے تھے۔ یہ وہی ناصر احمد ہیں جن کے سامنے مجھے سکول اور کالج، دونوں جگہ زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور جو اَب علمی، ادبی اور جماعتی حلقوں میں ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی کے طور پر پہنچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے یہی خرگوش شدید زخمی حالت میں اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسے ان کی بلی پکڑ کر لے گئی تھی اور آرام سے بیٹھ کر اس پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ پرویز پروازی نے دیکھ لیا اور بلی کو ڈرا دھمکا کر خرگوش اس سے چھڑوا لیا۔ اگرچہ بلی خرگوش کو کھا تو نہ سکی لیکن اس نے اسے شدید زخمی کر دیا تھا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ یہ خرگوش ہمارا ہے چنانچہ وہ اسے اسی حالت میں ہمارے گھر پہنچا گئے۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق خرگوش کو آرام پہنچانے کی خاطر اسے ایک بوری پر لٹانے کے بعد اسی بوری سے ڈھانپ دیا۔ بہت دیر تک تو میں اس غلط فہمی میں رہا کہ خرگوش محوِ آرام ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ میرا خیالِ خام تھا۔ خرگوش تو بہت پہلے مر چکا تھا۔

پرویز پروازی کی یہ مہربانی ایک ایسے کلچر کی غماز تھی جس میں سب لوگ ذاتی طور پر ایک دوسرے کو پہچانتے اور بہت عزت کرتے تھے۔ اُنہیں بھی یہ واقعہ اب تک یاد ہے چنانچہ کچھ عرصہ پہلے جب اُن سے اس موضوع پر بات ہوئی تو وہ بے ساختہ فرمانے لگے: ''اچھا! تو تمہیں یہ بات ابھی تک نہیں بھولی لیکن میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ خرگوش صالحہ کا تھا۔ آج پتا چلا ہے کہ اس کے اصل مالک تم تھے۔ اس کے مرنے پر میری طرف سے دلی تعزیت قبول کرو۔''

اُن دنوں ربوہ میں عوامی نوعیت کی اطلاعات مشتہر کرنے کا عمومی ذریعہ ''ڈھنڈورا'' تھا۔ یہ کام ایک بلند آواز شخص سرانجام دیتا جو ضرورت پڑنے پر ٹین کا خالی کنستر یا کنستر نما ڈبہ ہاتھ میں پکڑ کر میدانِ عمل میں نکل کھڑا ہوتا۔ وہ بازار میں کسی مرکزی جگہ پر یا رہائشی علاقے میں کسی گلی کے درمیان کھڑا ہو کر یہ ٹین اچھی طرح پیٹتا

جب محسوس کرتا کہ لوگوں کی خاطر خواہ تعداد اس کی طرف متوجہ ہو چکی ہے تو وہ متعلقہ اطلاع بہ آواز بلند عوام الناس تک پہنچانے لگتا۔ وہ بسا اوقات کاغذ کا بنا ہوا بھونپو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔ بھونپو جسے میگا فون کا جدِ امجد کہا جا سکتا ہے ڈھنڈورچی کی آواز کو زیادہ دور تک پہنچا دیتا تھا۔

اُس زمانے میں امریکہ اور پاکستان کے تعلقات میں گرمجوشی آ رہی تھی اور اس حوالے سے یونائیٹڈ سٹیٹس انفرمیشن سروس یعنی حکومتِ امریکہ کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے (غالباً پاکستان کے دیگر کئی چھوٹے بڑے شہروں کی طرح) ربوہ میں بھی وقتاً فوقتاً دستاویزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ڈھنڈورچی اس پروگرام کا پیشگی اعلان کر دیتا چنانچہ رات کے وقت کھلے آسمان کے نیچے پروجیکٹر کی مدد سے ایک بہت بڑے سکرین پر ہمیں ایک انجانی دنیا کی تصویریں دکھائی جاتیں۔ اس وقت تک مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ فلمیں دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک کی ہیں اور انہیں یہاں دکھائے جانے کا حقیقی مقصد کیا ہے۔ اس کے باوجود ربوہ کے باقی لوگوں کی طرح جو ایک بڑی تعداد میں فرشِ زمین پر بیٹھ کر بہت انہماک کے ساتھ یہ فلمیں دیکھا کرتے تھے میں بھی انہیں بہت شوق سے دیکھتا تھا۔ چونکہ یہ فلمیں رات کے وقت کھلے میدان میں دکھائی جاتی تھیں لہٰذا عورتیں بھی بکثرت اس تفریح میں شامل ہوتیں لیکن پردے کی رعایت کے ساتھ مردوں سے بالکل الگ بیٹھتیں۔

مجھے اُس زمانے میں ٹِڈّی دَل کا کئی بار ربوہ سے گذرنا بھی یاد ہے۔ جب آسمان یکا یک اُڑنے والی چھوٹی چھوٹی لاتعداد ٹِڈّیوں سے تقریباً بھر جاتا تو ربوہ میں شور سا مچ جاتا کہ ٹِڈّی دَل آ گیا ہے۔ لوگ یہ دَل دیکھ کر ٹین بجانے لگتے جس کا مقصد غالباً ٹِڈّیوں کو خبردار کرنا تھا کہ وہ یہاں قیام نہ کریں اور آگے نکل جائیں۔ اس کے باوجود کچھ تھکی ہاری ٹِڈّیاں زمین پر گر جاتیں۔ میں نے زمین پر گری ہوئی یہ ٹِڈّیاں خود دیکھی ہیں لیکن انہیں کبھی جمع نہیں کیا۔ ہاں! میں اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ بعض لوگ انہیں فرائی کر لیتے اور مزے لے لے کر کھاتے۔

آج بہت سے لوگوں کو شاید یہ بات عجیب لگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ فعل ایسا ناپسندیدہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں نے بہت بعد میں Peter Lienhardt نامی ایک مغربی ماہرِ بشریات کی کتاب "Disorientations: A Society in Flux - Kuwait in the 1950s" میں پڑھا ہے کہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں جب کویت ابھی برطانوی پروٹیکٹوریٹ تھا اور اس کا قدیم معاشرہ پوری طرح قصہ پارینہ نہیں بنا تھا کویتی موقع ملنے پر یہ ٹِڈّیاں جمع کر لیتے اور تیل میں تل کر پوری کی پوری ہڑپ کر جاتے۔

ممکن ہے اس زمانے میں یہ رواج ہر غریب اور پسماندہ ملک میں پایا جاتا ہو۔

بہرحال اس امر سے قطع نظر کہ ٹِڈّی کھانا کس حد تک مستحسن فعل ہے میں یہاں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آہستہ آہستہ ٹِڈّی دَل نظر آنا بند ہو گیا۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ ان ٹِڈّیوں کی وجہ سے فصلوں کو پہنچنے والے نقصان کے پیشِ نظر حکومت کی طرف سے اُٹھائے گئے بعض اقدامات کے نتیجہ میں ٹِڈّی کی نسل قریباً معدوم ہو گئی ہے۔

زمانے کے رواج کے مطابق اُن دنوں ہمارے گھر میں بھی ایک چرخہ ہوتا تھا۔ امی اور ماسی جی بھی اس چرخے پر روئی کاتتی تھیں۔ دھاگہ کاتنے سے پہلے روئی کو دھوپ میں خشک کیا جاتا اور پھر اس سے پُونیاں بنائی جاتیں۔ ان ہی پُونیاں سے دھاگہ کاتا جاتا۔ چرخے پر کاتا ہوا سُوت کسی جولاہے کے سپرد کر کے کھیس اور دوہیاں بنوائی جاتی تھیں جس کے لیے ریلوے لائن کے پار آبادی میں جانا پڑتا تھا جہاں بعض لوگوں نے اپنے گھروں کے اندر کھڈیاں لگا رکھی تھیں۔ سوتی دھاگے کے بنے ہوئے اس کھیس کی بُنکل جسم کو سردی کا احساس نہ ہونے دیتی اور ہلکی سردی میں یہی کھیس رات کے وقت کمبل کا کام دیتا۔

پرانے ماحول کے زیرِ اثر خواتینِ خانہ گھریلو ضروریات کے مطابق ازار بند گھر ہی میں بُنا کرتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے ایک چارپائی اُلٹی کر کے کسی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی جاتی اور اس پر ازار بند کی کھڈی (جو انتہائی سادہ ہوتی اور آسانی سے ایک سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتی تھی) نصب کر دی جاتی۔ گھر میں کسی خاتون کو ذرا سا وقت بھی ملتا تو وہ اس کھڈی پر جا بیٹھتی اور ازار بند کا مزید کچھ حصہ بُن لیتی۔ مردانہ ازار بند سفید سُوتی دھاگے سے بنائے جاتے جب کہ زنانہ ازار بندوں کے لیے رنگین ریشمی دھاگہ استعمال کیا جاتا اور ان پر طرح طرح کے بیل بوٹے بنائے جاتے۔

اُن دنوں رویتِ ہلال کمیٹی تھی نہ عید کا چاند دیکھنے کے لیے غالباً کوئی اور سرکاری انتظام لہٰذا آبادی کا ہر طبقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق عیدالفطر منانے میں آزاد تھا۔ ایک ایسے ہی موقع پر ۲۹ رمضان المبارک کو مقامی طور پر عید کا چاند نظر نہیں آیا لہٰذا اگلے دن روزہ رکھا گیا اور جماعتی دفاتر کھلے رہے۔ مجھے یاد ہے ابا جی بھی حسبِ معمول دفتر گئے تھے لیکن ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد غیر متوقع طور پر واپس آ گئے۔ ہم سب حیران تھے کہ وہ وقت سے اتنا پہلے کیوں کر گھر واپس آ گئے ہیں جس پر انہوں نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق کل عید کا چاند دیکھ لیا گیا تھا لہٰذا ربوہ میں بھی آج عید منانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور دفاتر میں چھٹی ہو گئی ہے۔ مجھے 'تازہ ترین اطلاعات' کی تفصیل تو یاد نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ اہلِ خانہ اچانک یہ خبر سن کر کچھ حیران ہوئے لیکن جلد ہی روزہ داروں نے اپنا روزہ توڑ دیا، لوگ عید پڑھنے کے لیے بیت مبارک کی طرف گئے اور پھر گھروں میں حسبِ توفیق اچھے اچھے کھانے پکائے گئے۔

میری سب سے پہلی تصویر اسی زمانے میں ولی محمد نامی ایک فوٹو گرافر نے بنائی تھی جن کے پاس ایک پلیٹ کیمرہ ہوتا تھا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے میری یہ تصویر ابا جی کے کہنے پر بنائی تھی یا ازخود لیکن میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک روز وہ مجھے گھر سے بلا کر بازار لے گئے اور کیمرے کے سامنے لوہے کی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ انہوں نے ایک کتاب کھول کر میرے ہاتھوں میں تھما دی اور مجھے کیمرے کی طرف دیکھنے کو کہا۔ میں بہت حیران ہوا جب تھوڑی ہی دیر کے بعد اس تصویر کا نیگیٹو ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے نیگیٹو پر برش کے ساتھ کچھ کام کیا اور پھر اسے کیمرے کے سامنے اُلٹا رکھ کے دوبارہ تصویر بنائی۔ انہوں نے مجھے کارڈ سائز کی اس تصویر کی دو یا تین کاپیاں دی تھیں لیکن میں اسے جب بھی دیکھتا حیران ہوتا کہ انہوں نے میرے ہاتھ میں

کتاب کیوں پکڑائی تھی۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ اگلے وقتوں میں مرد حضرات کے لیے قرآن پاک ہاتھ میں پکڑ کر اور عورتوں کے لیے گلدستہ ہاتھ میں پکڑ کر تصویر اتروانے کا رواج عام تھا اور غالباً مجھے بھی یہ کتاب اسی رواج کی تقلید میں پکڑائی گئی تھی تاہم جو مسئلہ میں آج تک حل نہیں کر پایا یہ ہے کہ اگر کتاب کو کھول کر ہی رکھنا تھا تو مجھے اس پر نظر جمانے کی بجائے کیمرے کی طرف دیکھنے کو کیوں کہا گیا؟

ولی محمد تعلیم الاسلام پرائمری سکول واقع محلہ دارالرحمت وسطی ربوہ کے ہیڈ ماسٹر، ماسٹر فقیر احمد کی اہلیہ اوّل کے بطن سے تھے اور آغازِ ربوہ ہی میں یہاں سے نقل مکانی کر کے لاہور چلے گئے تھے۔ انہوں نے کوٹ عبدالمالک میں رہائش اختیار کر لی اور گھڑی سازی کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔

میرا خیال ہے کہ وہ ربوہ کے اوّلین فوٹو گرافر تھے۔ ان کی بنائی ہوئی یہ تصویر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

اُس وقت تک میں نے کوئی نومولود نہیں دیکھا تھا۔ اس پس منظر میں جب ایک صبح میں نے افرادِ خانہ کو آپس میں یہ گفتگو کرتے ہوئے سُنا کہ اللہ تعالےٰ نے قاری محمد امین کو ایک اور بیٹے سے نوازا ہے تو مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میرا جی نومولود کو دیکھنے کے لیے مچلنے لگا۔ میں نے امی سے ضد کی کہ میں یہ بچہ دیکھنے کے لیے ضرور جاؤں گا۔ امی نے تو ویسے بھی مبارکباد کے لیے وہاں جانا ہی تھا چنانچہ ہم اسی روز قاری صاحب کے ہاں جا پہنچے۔ میں امی اور خالہ امتہ العزیز (یعنی اہلیہ قاری محمد امین) کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بے نیاز پہلے روز کے اس معصوم بچے کو بہت دیر تک جھولی میں لے کر بیٹھا رہا اور بعد میں بھی کبھی کبھار وہاں جا کر چند منٹ کے لیے اسے گود میں اٹھا کر اپنا شوق پورا کر لیتا۔

حال ہی میں بھائی جان امین انگلستان سے لاہور آئے اور ان کے ساتھ ماڈل ٹاؤن لاہور کے بیت النور میں جمعہ کے ایک اجتماع پر ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے اسی برادرِ نسبتی سے تعارف کراتے ہوئے کہا: ''تم نے انہیں پہچانا نہیں۔ یہ خالد امیر ہیں۔''

''میں نے انہیں مدتِ دراز کے بعد دیکھا ہے لیکن آپ ہمراہ نہ بھی ہوتے تو میں ان کے چہرے مہرے سے اندازہ کر لیتا کہ یہ قاری محمد امین کے صاحبزادے ہیں۔''

اُسی ملاقات کے دوران پتا چلا کہ خالد امیر نے کراچی کے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن سے ایم بی اے کر رکھا ہے، وہ لیزنگ اور بنکنگ کے شعبہ سے وابستہ رہے اور آج بھی ماشاءاللہ فعّال زندگی گزار رہے ہیں۔

''مجھے تو آپ کی پیدائش کا دن بھی یاد ہے اور اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود مجھے کل کی بات لگتی ہے۔ آپ کو دیکھ کر آپ کے والد، آپ کی والدہ، آپ کی بہنیں بشمول حفیظہ، بشریٰ اور خالدہ اور نصیر قاری سمیت سبھی لوگ یاد آ گئے ہیں لیکن اگر نہیں یاد آ رہی تو آپ کی تاریخ پیدائش۔ بھلا کب پیدا ہوئے تھے آپ؟'' میں نے خالد امیر سے سوال کیا۔

''۲۰ جنوری ۱۹۵۰ء''

''تریسٹھواں سال جا رہا ہے اس بات پر۔ جس بچے کو میں نے اپنی گود میں کھلایا تھا اب ماشاء اللہ خود اپنے پوتوں اور نواسوں کو کھلانے کی تیاری کر رہا ہے۔''

اوراقِ ماضی مزید پلٹتا ہوں تو مجھے کیکر کا وہ بلند و بالا درخت یاد آ جاتا ہے جو ربوہ ریلوے سٹیشن کی موجودہ عمارت کے تقریباً بالمقابل ریلوے لائن کے اِس پار ہمارے گھر کے قریب ہی ہوا کرتا تھا۔

اس درخت سے ذرا دور وہ چھپڑ تھا جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اگرچہ کیکر بنجر زمین میں زندہ رہنے والا درخت ہے تاہم اس درخت کے کچھ زیادہ ہی تر و تازہ رہنے کا ایک سبب غالباً وہ چھپڑ بھی تھا جہاں سے اس کی پانی کی ضرورت مسلسل پوری ہوتی رہتی تھی۔ اس درخت پر زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلتے تھے۔ جب جھکڑ چلتا تو بے شمار پھول نیچے آ گرتے۔ میں ایسے وقت میں وہاں پہنچ جاتا اور یہ پھول چنا کرتا تھا۔

ایک بار میں نے دیکھا کہ اس درخت پر کسی پرندے نے اپنا گھونسلہ بنا رکھا ہے۔ میں یہ گھونسلہ دیکھ کر حیران ہوا۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ کس طرح ایک بظاہر بے سمجھ پرندہ اپنی بود و باش کے لیے اس طرح کا گھونسلہ بنا سکتا ہے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ گھونسلے میں اس پرندے کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں جو اپنی ماں کی آمد پر اپنی نرم و نازک چونچیں کھول کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اوپر چڑھ کر ان بچوں کو قریب سے دیکھوں لیکن میں اس وقت بہت چھوٹا اور یہ درخت بہت اونچا تھا۔ ایک بار میں نے درخت پر چڑھنے کی نیم دلانہ کوشش بھی کی لیکن جلد ہی ہمت ہار بیٹھا۔

یہ درخت کچے کوارٹرز ختم ہونے کے عرصہ بعد تک موجود رہا۔ میں جب جب اس کے پاس سے گذرتا تو مجھے زرد رنگ کے وہ خوبصورت پھول بہت یاد آتے جو میں نے کئی بار اپنے ہاتھوں سے چنے تھے اور وہ پرندہ بھی یاد آ جاتا جس کے خوبصورت، معصوم سے بچے بار بار مجھے اپنی جانب متوجہ کرتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ ماضی کی اس یادگار کو گرنے یا کٹنے سے محفوظ رکھا جائے گا تاہم افسوس! کسی اور کا خیال اس طرف نہیں گیا۔ چند سال پہلے ایک بار یوں ہی میرا جی چاہا کہ یہ درخت جا کر دیکھوں اور اس کے سائے تلے کچھ دیر رُک کر بیتے دنوں کی یاد تازہ کروں لیکن درخت وہاں موجود نہ تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کسی نے کاٹ دیا یا اسے تیز آندھی نے گرا دیا۔

جہاں تک میرا مشاہدہ ہے ربوہ میں اس وقت کی آبادی میں اپنے قد و قامت کا یہ واحد درخت تھا۔ یہی اس درخت کی انفرادیت تھی اور اسی وجہ سے میں اس کی موت کا ماتم کر رہا ہوں۔

اس درخت کے پاس ایک بھٹیارن نے اپنی بھٹی لگا رکھی تھی۔ ان کا نام زینب بی بی تھا لیکن عوام الناس میں ''ماسی'' کے نام سے مشہور تھیں۔ عصر کے قریب جب دوپہر کا کھانا تقریباً ہضم ہو جاتا اور معدہ کسی ہلکی پھلکی چیز کی طلب محسوس کرنے لگتا تو قدیم ربوہ کے باسیوں کا دھیان اس بھٹی کے خستہ اور خوشبودار چنوں کی طرف چلا جاتا جو اُن کی یہ ضرورت بطریقِ احسن پوری کر سکتے تھے۔ بعض دفعہ جب میں وہاں جاتا تو بھٹی سرد پڑی ہوتی لیکن کچھ وقفے کے بعد میں جب دوبارہ وہاں جاتا تو موصوفہ آ چکی ہوتیں، بھٹی تپ رہی ہوتی اور دو چار گاہک

پہلے سے وہاں کھڑے ہوتے۔ گاہکوں کی یہ آمد ورفت مغرب تک جاری رہتی۔ یوں زینب بی بی کی دہاڑی بھی لگ جاتی اور اس محلے کے باسیوں کی ایک ضرورت بھی پوری ہوتی چلی جاتی۔

اُس زمانے میں ایک آنہ تو بہت بڑی رقم تھی، ٹکے (یعنی دو پیسوں) اور بسا اوقات ایک پیسے کے چنے بھی خریدے جا سکتے تھے اور زینب بی بی تھی کہ ماتھے پر بل لائے بغیر ہر ایک ''آرڈر'' کی بخوشی تعمیل کرتی چلی جاتیں۔ بعض لوگ چنے، مکی یا گندم اپنے گھر سے لے آتے اور زینب بی بی کو اس کا معمولی سا معاوضہ ادا کر کے بھنوا لیتے۔

محمد دین المعروف گگھا جن کی آواز اپنے اندر ایک خاص انفرادیت رکھتی تھی ان ہی زینب بی بی کے بیٹے تھے۔ وہ ربوہ کی جانی پہچانی شخصیات میں سے تھے اور کبڈی خوب کھیلتے تھے۔ جب وہ اپنے گہرے گندمی رنگ کے کسرتی بدن پر تیل مل کر لہراتے، بَل کھاتے مقابل ٹیم کی طرف جاتے تو دیکھنے والے حَبَّذا کے فلک شگاف نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ اسی طرح جب وہ مقابل ٹیم کے کسی کھلاڑی کو اچانک ہاتھ لگا کر اسے کوئی داؤ آزمانے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے واپس آ جاتے تو ہجوم کا جوش وخروش دیدنی ہوتا۔ اُس دور میں ربوہ میں گگھے کے بغیر کبڈی کے کسی میچ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ غالباً ۱۹۵۰ء کی دہائی میں انگلینڈ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ وہاں یقیناً وہی کچھ کرتے رہے ہوں گے جو اُس زمانے میں برصغیر سے انگلستان جانے والے غیر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت کرتی تھی لیکن زمانے سے نبرد آزمائی نے انہیں کشائشِ رزق کے علاوہ بے پناہ اعتماد بخشا اور انہوں نے انگلستان میں آباد کسی سپینش لڑکی سے شادی کر لی۔ ایک بار ربوہ میں یہ بات بہت مشہور ہوئی کہ جب وہ اپنی غیر ملکی اہلیہ کے ہمراہ پہلی بار پاکستان آنے کا پروگرام بنا رہے تھے تو انہوں نے ایک خط کے ذریعہ اپنی والدہ سے درخواست کی تھی کہ وہ ریلوے سٹیشن کے پاس واقع اپنی ''فیکٹری'' بند کر دیں اور یہ کہ یہ بھٹی اسی پس منظر میں ختم کی گئی تھی۔

گگھا اور ان کا خاندان ربوہ کے اوّلین آباد کاروں میں سے تھا۔ ویسے بھی وہ اپنی کبڈی کی وجہ سے پورے ربوہ میں پہچانے جاتے تھے۔ سُنا ہے کہ لندن کے ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر جب کسی ناواقف نے گگھے کو اپنا تعارف کرانے کو کہا تو انہوں نے بیساختہ جواب دیا: ''تم مجھے نہیں پہچانتے۔ مجھے تو تمہارا احمدی ہونے کا دعویٰ ہی مشکوک لگتا ہے۔''

برطانیہ منتقل ہو جانے کے بعد میں نے گگھے کو ایک یا شاید دو بار دیکھا تو سہی لیکن ان سے تفصیلی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ ہاں! ان کے بارے میں کچھ سنی سنائی باتیں مجھ تک پہنچتی رہیں۔ کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ خیال تھا لندن میں ہی آسودۂ خاک ہوں گے لیکن ان کے بھتیجے امجد نے بتایا: ''نہیں انکل! وہ تو یہیں دفن ہیں۔''

''ربوہ میں؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی۔ چند سال پہلے وہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ لندن واپس جانے کے لیے لاہور ائیر پورٹ پر

بیٹھے تھے کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ کوئی طبی امداد ملنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔''
گگّھا ربوہ کے عام قبرستان میں دفن ہیں اور ان کی قبر پر ان کے بچوں کی طرف سے اردو زبان میں یہ کتبہ نصب ہے:

''محمد الدین عاجز عرف گگّھا

ولد

نور محمد صاحب درویش قادیان

ولادت : ۱۹۳۷ء

وفات ۱۶ نومبر ۱۹۹۹ء

ہمارے ابا جان کا نام گگّھا حضرت اماں جان (نصرت جہاں بیگم صاحبہ) نے آپ کی بھاری آواز کی وجہ سے رکھا۔ آپ اپنے وقت کے کبڈی کے مایہ ناز کھلاڑی تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔''

''کیا یہ درست ہے کہ گگّھے نے آپ کو ایسا کوئی خط لکھا تھا؟'' ایک بار میں نے زینب بی بی سے پوچھ ہی لیا۔
''یہ بات ہم نے بھی سُنی ہے لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گگّھے نے کبھی کوئی ایسا خط نہیں لکھا۔''
''تو پھر یہ بات کیسے مشہور ہوئی؟''
''ربوہ میں ایک صاحب تھے۔ اب وفات پا چکے ہیں لہٰذا ان کا نام لینا مناسب نہیں۔ یہ لطیفہ انہوں نے گھڑا تھا جو آہستہ آہستہ زباں زدِ عام ہو گیا۔''

ربوہ ایک بنجر قطعہ اراضی پر تعمیر ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد خشک پہاڑیاں تھیں اور یہاں بچھو اور سانپ سمیت کئی طرح کے حشرات الارض پائے جاتے تھے۔

جہاں تک بچھُو کا تعلق ہے تو یہ ہر گھر کا مسئلہ تھا۔ جب بھی کوئی چیز کچھ مدت کے بعد اپنی جگہ سے سرکائی جاتی تو نیچے سے بچھو نکل آتا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اس کا ڈنک کس قدر زہریلا ہوتا ہے لہٰذا اس پر نظر پڑتے ہی اس کا کام تمام کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ہاں! ابا جی کو طبِ یونانی، ہومیو پیتھی اور ایلو پیتھی تینوں طریقہ ہائے علاج سے رغبت تھی۔ انہیں بچھو نظر آتا تو وہ اسے چمٹے سے زندہ پکڑ کر سپرٹ میتھی لیٹڈ کی بوتل میں ڈال دیتے۔ یوں کسی ایمرجنسی کے لیے بچھو کے زہر کا تریاق ان کے پاس ہر وقت تیار رہتا۔

ربوہ میں نظر آنے والا بچھو بالعموم زرد رنگ کا ہوتا تھا لیکن کبھی کبھار سیاہ رنگ کا بچھو بھی نکل آتا۔ اوّل تو زرد بچھو کا زہر ہی ناقابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن سنتے تھے کہ سیاہ بچھو اس سے کئی گنا زیادہ زہریلا ہوتا ہے اور اس کا ڈسا ہوا کئی روز تک بے انتہا درد، تیز بخار اور آنکھوں کی شدید سوزش میں مبتلا رہتا ہے۔ جب سامان سرکایا جاتا تو مادہ بچھو اپنے کئی کئی بچوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی لیکن ڈنڈے یا جوتی کا ایک کاری وار اس کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیتا۔

[illegible] بچھو کے ڈنک پر [illegible] باقی [illegible] استعمال [illegible]
تریاق ہوا اس انداز میں تیار کیا جاتا تھا کہ ہر ایک سے زیادہ بار استعمال کیا گیا اور ہمیں [illegible] کے
حوالے سے بہت مفید پایا۔

سانپوں کا اکا دکا دیکھے جانا یا بعض افراد کے سانپ سے ڈسے جانے کے بارے میں سنتے رہتے تھے
لیکن اللہ تعالیٰ نے اہل ربوہ کو ان کے شر سے بالعموم محفوظ رکھا۔ ہاں! سانپ کے ڈسنے سے ایک موت مجھے اب
تک یاد ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ربوہ میں ایک صاحب بشارت اللہ ہوا کرتے تھے جو ہمارے ساتھ والی
گلی میں رہائش پذیر تھے۔ وہ چھوٹے گوشت کا کام کرتے تھے اور اسی حوالے سے "بشارت اللہ قصائی" کے نام
سے معروف تھے۔ ان کے پاس کچھ بھیڑ بکریاں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان کا ایک بیٹا فرزند یہ جانور چرانے
کے لیے باہر نکل جاتا۔ ایک بار وہ چمن عباس کی طرف جا نکلا۔ وہاں کسی زہریلے سانپ نے اسے کاٹ لیا جس
سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ سنتے ہیں سانپ اس قدر زہریلا تھا کہ اس کے زہر کی وجہ سے مرحوم کے مساموں
سے بھی خون جاری ہوگیا تھا جو اس کی فوری موت پر منتج ہوا۔

یہاں شاید اس امر کی وضاحت ضروری ہو کہ فرزند بشارت اللہ کا حقیقی بیٹا نہیں تھا بلکہ ان کی اہلیہ کے پہلے
خاوند کی یادگار تھا لیکن بشارت اللہ کے ایک اپنے بیٹے، کرامت اللہ کے بیان کے مطابق "والد صاحب نے اس
سے ہمیشہ سگی اولاد کی طرح پیار کیا۔ اسی وجہ سے لوگ اسے بھی بشارت صاحب کا بیٹا سمجھتے تھے۔"

ان دنوں ربوہ میں بہت شدید آندھیاں آتی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے آسمان پر گہرا غبار چھا جاتا اور دیکھتے ہی
دیکھتے اتنی تیز آندھی شروع ہو جاتی کہ سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل پاتا۔ اسے بیشک ضعیف الاعتقادی کہیے یا کچھ اور
لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگ سرخ آندھی کو خونی آندھی بھی کہا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ یہ قتل ناحق پر اللہ تعالیٰ
کے غضب کا ایک مظہر ہے۔ بہرحال آندھی سرخ ہوتی یا سیاہ، بالعموم اس کی رفتار انتہائی تیز ہوتی اور اس کی وجہ
سے صحن میں پڑے دھاتی برتنوں کا لڑھکنا یا تار پر لٹکے ہوئے کپڑوں کا اُڑ کر اڑوس پڑوس میں جا گرنا معمول کی
بات تھی۔ بسا اوقات آندھی اتنی شدید ہوتی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا، چھپروں کی چھتیں اُڑ جاتیں اور کمزور
دیواریں گر جاتیں۔ آندھی کے تھمنے کے بعد احساس ہوتا کہ ہر شے پر مٹی کی ایک دبیز تہ جم چکی ہے، سر کے بال
نمدے کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی ہیں۔

آپی آندھی سے بہت ڈرتی تھیں لہٰذا اس کے آثار پیدا ہوتے ہی انہیں گھبراہٹ شروع ہو جاتی اور وہ
آندھی نہ چلنے کی دعائیں مانگنا شروع کر دیتیں۔ ہم نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ اگر آندھی چلنے سے پہلے کسی کھلی
جگہ کھڑے ہو کر انگلی شہادت سے فضا میں چاروں طرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دی جائے تو آندھی رُک جاتی
ہے لہٰذا اگر آندھی ٹل جاتی تو ہم اسے اس عمل کی تاثیر سمجھنے لگتے اور اگر آندھی نہ رُکتی تو دوبارہ اور سہ بارہ یہی عمل
دہرانے کے لیے تیار رہتے۔

ان دنوں ربوہ میں ٹوڈرکاں (جنہیں ڈھوڈرکاں بھی کہا جاتا ہے) بکثرت ہوتے تھے۔ صبح ہی صبح ان کی
کراری سی آواز اپنی جانب متوجہ کرتی تو دیوار یا اگنی پر بالعموم ایک سے زیادہ کوے بیٹھے ہوتے۔ ہم سمجھ جاتے کہ
انہیں روٹی کا کوئی ٹکڑا یا اپنی پسند کی کوئی اور چیز نظر آرہی ہے جسے وہ اچکنے کے لیے بیتاب ہیں چنانچہ وہ چیزیں
فوری طور پر ان کی نظر سے اوجھل کر دی جاتیں جو امکاناً ان کا نشانہ بن سکتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ بالعموم ہاتھ
لگانے میں کامیاب ہو ہی جاتے۔

ٹوڈرکاں کا جسم عام کوؤں سے ذرا بھاری اور سیاہ رنگت زیادہ چمکدار ہوتی۔ مجھے ان دنوں تو اس بات کا
احساس نہ تھا لیکن جب آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ کوے ربوہ سے غائب ہونے لگے تو معلوم ہوا کہ یہ پرندہ
عادتاً آبادیوں سے دور رہنا پسند کرتا ہے۔

یہ تو کوئی ماہرِ حیاتیات ہی بتا سکتا ہے کہ عام کوے اور ٹوڈرکاں کی عادات واطوار میں کیا فرق ہے لیکن
پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے ان دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ تیزی وطراری، پیش بندی وہوشیاری اور
چھینا جھپٹی میں کوئی دوسرے سے پیچھے نہیں۔

میرے بچپن میں اس محاورے پر کسی حد تک یقین کیا جاتا تھا کہ منڈیر پر کوے کا بولنا کسی مہمان کی آمد کا
اعلان سمجھنا چاہیے۔ اگر تو اتفاق سے اس روز گھر میں کوئی مہمان آجاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ کوا ابلا وجہ شور نہیں مچا رہا تھا
اور کوئی مہمان نہ آتا تو کوے کی کائیں کائیں کو یکسر فراموش کر دیا جاتا۔ تاہم آج میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا
ہوں کہ کوے کی کائیں کائیں کو کسی مہمان کی آمد سے منسلک کرنا صدیوں پرانے ان توہّمات میں سے ہے جن کی
کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ اگر یہ بات درست نہ ہوتی تو شاعر بیچارہ ہرگز یہ کہنے پر مجبور نہ ہو جاتا کہ:

وے کاواں اُڈ پُڈ جا نڑیا تُوں اَیویں نہ کُرلا

تینوں چُوریاں کُٹ کُٹ پاندیاں میں پوٹے لئے تُڑا

اُس زمانے میں جماعت کے مالی حالات اتنے اچھے تھے نہ ہوائی سفر کی اتنی سہولتیں میسر تھیں چنانچہ
غیر ممالک کو جانے والے داعیانِ الی اللہ ربوہ سے بالعموم ٹرین کے ذریعے کراچی جاتے اور وہاں سے سمندری یا
ہوائی سفر کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچتے۔ ایسے مواقع پر اہلِ ربوہ کثیر تعداد میں ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو کر اپنے ان
بھائیوں کو الوداع کہتے۔ کبھی کبھار حضرت خلیفۃ المسیح الثانی خود بھی سٹیشن پر تشریف لاتے اور انہیں اپنی دعاؤں
سے رخصت کرتے جب کہ عام طور پر بوقتِ رخصت سلسلے کا کوئی بزرگ اجتماعی دعا کرواتا۔

یہ داعیان اپنے بیوی بچوں سے ایک غیر معینہ مدت کے لیے رخصت ہو رہے ہوتے تھے اس لیے ان کا
غمزدہ ہونا ایک فطری امر تھا لیکن وہ اپنے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر اس عزم کے ساتھ ربوہ سے رخصت
ہوتے کہ وہ دعوت الی اللہ کے لیے اپنا تن من دھن، سب کچھ قربان کر دیں گے۔

انہیں الوداع کہنے والے اس یقین سے پُر ہوتے کہ یہ داعیان دینِ حق کے لیے فتوحات کے جھنڈے
گاڑتے ہوئے واپس لوٹیں گے لہٰذا یہ ایک طرح سے خوشی کا بھی موقع ہوتا۔ پرویز پروازی نے داعیانِ الی اللہ کو

الوداع کہنے والوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے۔

دیارِ غیر میں قرآں سناؤ گے جا کر
سعید روحوں کو اپنا بناؤ گے جا کر
وہ دل کہ اُجڑی ہوئی بستیوں کی صورت ہیں
یہ بستیاں تمہی آخر بساؤ گے جا کر
دلوں کو مہر و محبت سے آشنا کرکے
گرے ہوؤں کو زمیں سے اٹھاؤ گے جا کر
بفیضِ پرتوِ مہرِ جمالِ مصطفوی
نقوشِ ظلمتِ شب کے مٹاؤ گے جا کر
یقین ہے کہ اسی طرح جاؤ گے آ کر
یقین ہے کہ اسی طرح آؤ گے جا کر

اس زمانے میں داعیانِ الی اللہ بالعموم اچکن اور سبز پگڑی میں ملبوس ہوتے اور پورے مجمع میں منفرد نظر آتے۔ ٹرین آتی تو تمام مسافر حیرت واستعجاب کے عالم میں اس جمِ غفیر کو دیکھتے اور جب انہیں معلوم ہوتا کہ یہ سب لوگ اس ایک شخص کے لیے یہاں جمع ہیں تو مزید حیرانی کا اظہار کرتے۔

اہلِ ربوہ ان بزرگوں کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیتے اور وہ بزرگ اپنے ان چاہنے والوں کی دعائیں لے کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مرکز سے رخصت ہو جاتے۔

سلسلہ کی خاطر اپنوں سے مدتِ مدید تک دوری برداشت کرنے والوں کی واپسی ہوتی تو ریلوے اسٹیشن پر رونق دیکھنے والی ہوتی۔ ربوہ کا ہر شخص یہی سمجھتا تھا گویا اس کا کوئی اپنا واپس آ رہا ہے۔ اس موقع پر خوشی کے اظہار کے لیے ریلوے اسٹیشن کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا جاتا اور جب گاڑی ربوہ کے اسٹیشن پر آ کر رُکتی تو آنے والوں کا نعرہ ہائے تکبیر سے استقبال کیا جاتا، انہیں پھولوں کے ہار پہنائے جاتے اور ہر شخص ان سے مصافحے اور معانقے کا شرف حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

میں خود ایسے کئی مواقع پر ریلوے اسٹیشن پر موجود رہا ہوں اور اس فضا کو اب بھی محسوس کر سکتا ہوں جو داعیانِ الی اللہ کی ربوہ سے روانگی یا ان کی وطن واپسی کے موقع پر نظر آتی۔ ایسا ہی ایک موقع حافظ بشیر الدین عبید اللہ کی بیرونِ ملک کے لیے روانگی کا تھا۔

حافظ بشیر الدین عبید اللہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ماریشس کے بعد، سیرالیون، کینیا، لائبیریا اور گیمبیا میں بھی احمدیت کا پیغام پہنچانے کی سعادت عطا فرمائی تھی ابا جی کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ موصوف جو ماریشس میں احمدیت کے اولین مجاہد، حافظ عبید اللہ کے صاحبزادے تھے ۱۹۵۱ء میں ماریشس بھجوائے گئے۔

انہوں نے کراچی پہنچ کر ابا جی کے نام ایک خط لکھا۔ یقیناً اس خط میں اس سفر کی تفصیلات درج ہوں

گی اور کچھ ذاتی باتیں بھی لیکن انہوں نے اس خط کے ذریعے میرے لیے دو روپے ارسال کئے تھے۔ یہ رقم پوسٹل آرڈر کے ذریعہ بھجوائی گئی تھی اور اسے ڈاکخانہ سے کیش کرایا گیا تھا۔ یہ رقم اباجی کے ساتھ ان کے مراسم دیرینہ اور میرے لیے ان کے دل میں موجود محبت کی آئینہ دار تھی۔

اگر چہ محدود ذرائع آمد کی وجہ سے یہ رقم گھریلو ضروریات پر بھی خرچ ہو سکتی تھی تاہم اباجی نے یہ پوری رقم میرے تصرف میں دے دی۔ ان دنوں جب ایک پیسہ کی بھی کچھ نہ کچھ قوتِ خرید تھی یہ ایک خطیر رقم تھی جسے میں نے کئی اقساط میں خرچ کیا اور ہر بار ایک نیا حظ اُٹھایا۔

اس دور کی دکانوں میں سے مجھے کریم حلوائی کی دکان کے علاوہ صرف داؤد جنرل سٹور کا نام یاد ہے جو کیکر کے محولہ بالا درخت کے بالکل قریب واقع تھا۔ اس دکان سے کسی بڑی چیز کی خریداری کے متعلق تو کچھ یاد نہیں البتہ جب بھی ایک، دو پیسے ہاتھ میں آتے میں یہاں سے "مچھی" یا "پرامنٹ" خریدا کرتا تھا۔ یاد رہے "مچھی" سے مراد سویٹس ہیں اور "پرامنٹ" سے مراد پیپر منٹ ہے یعنی پودینے کے ست والی گولی جو اپنے مخصوص ذائقے کی وجہ سے منہ میں ٹھنڈک کا احساس پیدا کرتی ہے۔ پیپر منٹ کی شکل سوراخ دار پیسے سے مشابہت رکھتی تھی اور ایک پیسے میں ایک آ جایا کرتی تھی۔

ربوہ کے ابتدائی ایام میں معروف ترین ریستوران جلال الدین نامی ایک صاحب چلا رہے تھے جن کا تعلق سیلون سے تھا اور اسی نسبت سے انہوں نے اس کا نام "سیلون ریستوران" رکھا ہوا تھا۔ الفضل میں شائع ہونے والے ان کے ایک اشتہار سے پتا چلتا ہے کہ شروع میں یہ ریستوران لاہور میں جودھامل بلڈنگ کے قریب ایک خیمہ میں قائم ہوا، ۲۱ جون ۱۹۴۹ء کو "احمدیہ بازار" ربوہ میں منتقل ہوا اور اس میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ کتبِ سلسلہ اور ادویات بھی فروخت ہوتی تھیں۔

یہ ریستوران ہمارے گھر کے بہت قریب تھا۔ مجھے ایک دو بار وہاں سے گھر کی ضرورت کی کوئی چیز خرید کر لانا تو یاد ہے لیکن وہاں بیٹھنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ ہاں! ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر جب ربوہ کے بازاروں میں خوب چہل پہل تھی اباجی اور ان کے کسی مہمان کے ساتھ مجھے اس ریستوران میں بیٹھنا یاد ہے۔ گاہکوں کی متوقع کثرت کے خیال سے اس ریستوران میں ایک شامیانہ نصب تھا جس کے نیچے کچھ میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

جلال الدین "سیلونی حلوہ" کے نام سے سوہن حلوے سے ملتا جلتا ایک حلوہ بھی تیار کرتے تھے۔ میں اس حلوے سے اسی موقع پر متعارف ہوا تھا۔

اس زمانے میں ربوہ میں مقیم بعض دوستوں کی خودنوشت سوانح سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ "ربوہ کا پاک ٹی ہاؤس" تھا جہاں شعر و سخن کی محفلیں بھی سجا کرتی تھیں۔

جلال الدین بعد میں کسی وجہ سے ربوہ سے جھنگ منتقل ہو گئے اور پھر جماعت سے بھی الگ ہو گئے۔

اسی زمانے میں انگریزی دور کے سکے سرکاری طور پر تبدیل کر دیئے گئے اور ان کے تبادلہ کے لیے ایک خاص تاریخ مقرر کر دی گئی۔ یہ خبر مجھے اپنے گھر سے اس وقت ملی جب گھر میں موجود چند پرانے سکے مجھے

دیئے گئے جنہیں میں نے ایک انتہائی فضول خرچ بچے کی طرح دنوں میں اُڑا دیا۔

ہمارے گھر بکثرت آمد و رفت رکھنے والی خواتین میں سے ایک مائی کا کو بھی تھیں جن کی رہائش احاطہ میں ہوا کرتی تھی۔ وہ کبھی تو باہر کے دروازے ہی سے سلام کر کے آگے چلی جاتیں لیکن بالعموم کچھ دیر بیٹھتیں۔ مجھے ان کی کی کوئی بات یاد نہیں ہے البتہ ان کا کہا ہوا ایک فقرہ اب بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے کہ اگر میں چلتی پھرتی نہ رہوں تو بہت جلد ختم ہو جاؤں۔

آپ سے کیا پردہ، مجھے یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ مائی کا کو ہیں کون لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پتا چلا کہ ان کا اصل نام امیر بی بی تھا اور وہ محمد صدیق وائیں کی صاحبزادی اور مولانا جلال الدین شمس کی پھوپھی تھیں۔ موصوفہ کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ جب حضرت اماں جان بیاہ کر دلی سے قادیان آئیں تو وہ ان کی اردل میں رہیں۔ شیخ یعقوب علی عرفانی نے حضرت اماں جان کی سیرت پر اپنی کتاب میں مائی کا کو کی یہ روایت نقل کی ہے کہ اس وقت ''حضرت اماں جان اٹھارہ، انیس سال کی لڑکی تھیں۔ بالکل تپلی دُبلی اور نحیف سی تھیں۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پنجاب کے رواج کے بالکل خلاف رنگین یا سرخ جوڑا نہ تھا۔ اس وقت کھلے پائنچے کا غرارہ پہنے ہوئے تھیں۔ حضرت اماں جان ہم کو دیکھ کر کمرے سے باہر آ گئیں اور ہم کو جب ایک دبلی سی کم عمر لڑکی سفید لباس میں نظر آئی تو ہم کو تعجب ہوا اور ہم نے کہا کہ اے کس طرح دی ووہٹی اے......... اس کے بعد مائی کا کو صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ ہم نے پھر حضرت اماں جان کی جو شان دیکھی اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ تو ہے مائی کا کو کی شخصیت کا ایک پہلو۔ چوہدری عبدالعزیز ڈوگر سابق مہتمم مقامی مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''یادِ حبیب'' میں مائی کا کو کے اس نمایاں کردار کا ذکر موجود ہے جو انہوں نے ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب ایام میں قادیان پر سکھوں کے حملہ کے وقت محلّہ دارالرحمت کے ایک مکان میں محصور احمدی عورتوں کی حفاظت کے سلسلہ میں ادا کیا۔ روایت کے مطابق سکھ حملے کے پیش نظر مرزا احمد شفیع اور عبدالعزیز ڈوگر کو حکم ملا کہ یہ خواتین سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں پہنچا دی جائیں۔ اس وقت باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ فاضل مصنف کے الفاظ میں اس موقع پر مائی کا کو نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ''میں سب سے آگے ہوتی ہوں اور عورتیں قطار میں میرے پیچھے کر دو اور تم ان سب کے پیچھے رہو'' اور اس طرح یہ خواتین اللہ تعالےٰ کے فرشتوں کی حفاظت میں اس گھر سے باہر نکلیں اور دعا و درود پڑھتی ہوئی منزلِ مقصود پر پہنچ گئیں۔

کچے کوارٹرز سے منتقل ہونے کے بعد بھی مائی کا کو کبھی کبھار احاطے کے نواح میں نظر آ جاتیں لیکن یہ ان کی کمزوری کا زمانہ تھا جس کے جلد ہی بعد وہ مئی ۱۹۵۳ء میں وفات پا گئیں اور موصیہ ہونے کے ناطے بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئیں۔

اُس زمانہ میں کئی پھیری والے گلی گلی پھر کر اپنی اشیاء بیچا کرتے تھے۔ پٹھان ''ہینگ مصالحہ!'' کی صدا لگاتے پھرتے۔ ہینگ دال میں اپنی طبی تاثیرات کے علاوہ ایک خاص خوشبو اور لذت پیدا کر دیتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس مقصد کے لیے ہینگ کا استعمال متروک سا ہو گیا ہے۔ بعض پٹھان صرف چاقو چھریاں تیز کر کے اپنی

روزی کماتے تھے۔ انہوں نے کندھے پر انسانی قوت سے چلنے والی ایک سادہ اور ہلکی پھلکی [illegible]
نظر آنے والی کل اُٹھائی ہوتی تھی اور وہ کند سے کند چاقو، چھری یا قینچی کی دھار [illegible]
تھے۔ پینجے، برتن قلعی کرنے والے، بالٹیوں کی مرمت کرنے والے، گھگو گھوڑے بیچنے والی خانہ بدوش [illegible]
سر پر ٹوکرا اُٹھا کر گلی گلی سبزی فروخت کرنے والے ان کے علاوہ تھے۔

تاہم ان سب پھیری والوں میں سکینہ بی بی جو اپنے واقف کاروں میں ''سکینہ کپڑے والی'' کے نام سے پہچانی جاتی تھیں کی بات ہی نرالی تھی۔ وہ سفید لٹھے کا شٹل کاک برقع پہنتیں۔ انہوں نے اپنے کندھے پر ایک بڑی گٹھڑی سی اُٹھائی ہوتی تھی۔ اس گٹھڑی میں کپڑے کے کچھ تھان ہوتے تھے جو وہ فیصل آباد سے خرید کر ربوہ میں گھر گھر فروخت کیا کرتی تھیں۔ وہ ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھیں۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی گٹھڑی کسی چارپائی پر رکھ کر خود پاس بیٹھ جاتیں۔ ظاہر ہے اتنا بوجھ اُٹھانا ان کے لیے آسان نہ تھا اور ان کا تھک جانا قرین قیاس تھا چنانچہ وہ سب سے پہلے پانی کا گلاس طلب کرتیں اور پھر آرام کے ساتھ اپنی گٹھڑی کھول کر امی اور میری بہنوں کو ایک ایک کر کے سارے کپڑے دکھاتیں۔ اگر کوئی کپڑا انہیں پسند آجاتا اور گھر کا بجٹ اس خرچ کا متحمل ہوسکتا تو امی وہ کپڑا خرید لیتیں۔ اگر رقم گھر پر موجود ہوتی تو انہیں نقد ادائیگی کر دی جاتی ورنہ وہ ادھار بھی کر لیتیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ وہ بڑی خوش دلی سے ادھار پر کپڑا دے دیتی تھیں کیوں کہ شاید ان کا کاروباری سلسلہ اسی طرح رواں دواں رہ سکتا ہوگا۔ فارغ ہو کر وہ باقیماندہ کپڑا سمیٹتیں، گٹھڑی دوبارہ باندھتیں، اسے اپنے کندھوں پر رکھتیں اور نئے گاہک کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتیں۔

امی بتایا کرتی تھیں کہ مرحومہ کو حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل تھا اور وہ شیخ نورالدین نامی ایک تاجر کی بیوہ تھیں۔ قادیان میں ان کا زنانہ جنرل سٹور خواتین میں بہت مقبول تھا لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا اور ان کا اچھا بھلا چلتا ہوا کاروبار ہاتھ سے نکل گیا تو انہوں نے اسی صورت اپنا مقدر آزمانے کا فیصلہ کیا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر میں موصوفہ کی آمدورفت بالکل بند ہوگئی۔ کئی سال کے بعد کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۶۸ء کے آخر میں وفات پا گئی تھیں اور عارف والا میں (جہاں وہ اپنے کسی بیٹے کے پاس مقیم تھیں) دفن ہوئیں۔ میں انہیں بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا لہٰذا ان کے انتقال کی خبر سن کر بہت افسردہ ہوا اور ان کی مغفرت کے لیے دل سے دعا نکلی۔

کچے کوارٹروں میں ہمارا قیام کم و بیش دو سال رہا۔ پھر سنا گیا کہ صدر انجمن احمدیہ نے اپنے کارکنان کے لیے پختہ کوارٹرز تعمیر کئے ہیں اور ان میں سے ایک ہمیں بھی ملے گا۔ کچے کوارٹروں سے پختہ کوارٹروں میں منتقل ہونے کا خیال ہمارے لیے کافی مسرت انگیز تھا۔ ہمارے گھر میں اس موضوع پر اکثر بات ہوتی رہتی تھی اور ہم ان کوارٹرز کو اپنے اکثر و بیشتر مسائل کا حل سمجھنے لگے تھے۔

یوں تو انجمن کوارٹرز کی یہ قطاریں کچے کوارٹروں سے بھی نظر آتی تھیں لیکن وہاں منتقل ہونے سے پہلے ایک بار ہم سب یہ کوارٹر دیکھنے کے لیے بھی گئے تھے۔ اس وقت ۶۸ کوارٹرز تعمیر ہو چکے تھے۔ ہمیں کوارٹر نمبر چونتیس الاٹ ہوا تھا اور ہم نے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شروع میں یہاں رہائش اختیار کی۔

تنہائی میں جل اُٹھے ہیں یادوں کے فانوس

صدر انجمن کے یہ کوارٹرز تین قسموں کے تھے: اوّل وہ جو انجمن کے عام کارکنان کے لیے مخصوص تھے اور بسا اوقات جونیئر کوارٹرز کے طور پر پہچانے جاتے تھے، دوسرے وہ جو نائب ناظران کے لیے تعمیر ہوئے تھے اور تیسرے وہ جو ناظروں کے لیے مختص تھے۔ جہاں تک تیسرے درجہ کے کوارٹروں کا تعلق ہے ان کی بیرونی دیواریں پختہ لیکن اندورونی دیواریں کچی تھیں۔ ان پر شہتیروں، کڑیوں اور ٹائلوں کی چھت تھی۔ شروع میں ایسے اڑسٹھ کوارٹرز تعمیر ہوئے۔ یہ کوارٹر دو مختلف نقشوں میں تعمیر کئے گئے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی مکانیت ایک ہی تھی۔ ہمارے کوارٹر میں دو کمروں کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔ باورچی خانہ اور سٹور ان کمروں سے الگ لیکن مکمل طور پر کچے تھے۔ ہاں! باورچی خانے میں اینٹوں کا ناقص سا فرش تھا لیکن سٹور اس تکلف سے بھی آزاد تھا۔ بیت الخلا اور غسل خانہ صحن کے ایک کونے میں ہوتا تھا۔

ربوہ اگرچہ ایک حد تک آباد ہو چکا تھا لیکن اب بھی یہاں پر وسیع وعریض قطعاتِ اراضی بے آباد پڑے تھے جہاں خودرو جھاڑیوں میں طرح طرح کے حشرات الارض پائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ان سے سامنا بھی ہو جاتا۔ یہ صورتِ حال بعض اوقات پریشان کن اور بعض دفعہ دلچسپ شکل اختیار کر لیتی۔

ایک صبح امی نے باورچی خانے کا دروازہ کھولا تو وہ کیا دیکھتی ہیں کہ فرش پر تازہ مٹی کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔ انہوں نے اسے کسی چوہے کی کارستانی سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن جب یہ روزانہ کا معمول بن گیا اور ہر صبح تازہ مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیر اس جگہ نظر آنے لگا تو سب کو تشویش ہوئی اور بات گھر سے نکل کر ارد گرد کے دو چار گھروں تک پہنچ گئی۔ اس بارے میں ہر کسی کی اپنی رائے تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ باورچی خانے کے اندر کوئی اژدہا رہتا ہے جو رات کے وقت یہ کارروائی کرتا ہے جب کہ کچھ لوگ ہمیں کسی اور طرح سے ڈرا رہے تھے۔ غرض بات اتنی بڑھ گئی کہ ہم نے فرش اکھڑوا کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کا ارادہ کر لیا۔

اُن دنوں گول بازار زیرِ تعمیر تھا اور صوفی کریم بخش زیروی کی دکان (جہاں اب یونائیٹڈ بینک ہے) بن رہی تھی۔ میں وہاں جا کر ایک مزدور سے اگلی صبح فرش اکھڑوانے کی بات بھی کر آیا تھا کہ فاطمہ جٹّی آ گئیں۔

فاطمہ جٹّی ربوہ کی ایک غریب سی خاتون تھیں جنہیں لمبا عرصہ حضرت اماں جان کی خدمت کا موقع مل چکا تھا۔ اُن کی کُل کائنات ایک چھوٹی سی کُٹیا تھی۔ یہ کُٹیا محلّہ دارالصدر غربی میں جو اَب دارالصدر شمالی کہلانے لگا ہے تقریباً اس جگہ واقع تھی جو صاحبزادہ مرزا خورشید احمد اور صاحبزادہ مرزا غلام احمد کے موجودہ گھروں کے پیچھے ہے۔ وہ اس کُٹیا میں اکیلی رہا کرتی تھیں۔ اُن کا کل سامان ایک چارپائی، معمولی سے بستر اور مٹی کے ایک پیالے

پر مشتمل تھا جو ہر وقت ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ میرے علم کے مطابق وہ دن کا زیادہ حصہ ربوہ کے مختلف گھروں میں گزارتیں اور دوپہر یا رات کے کھانے کے وقت کوئی نہ کوئی انہیں ماحضر پیش کر دیتا۔

وہ حافظ قرآن تو مشہور نہ تھیں لیکن انہیں کلام پاک کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا اور وہ جہاں بیٹھتیں فرمائش کرتیں کہ ان سے قرآن پاک سنا جائے چنانچہ گھر کا کوئی فرد قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاتا اور وہ زبانی کسی سورۃ کی تلاوت کرنے لگتیں۔ یوں وہ موقع بہ موقع قرآن پاک کا اعادہ کرتی رہتیں اور انہیں اپنی غلطیوں کی اصلاح کا موقع بھی ملتا رہتا۔

فاطمہ جٹی ہمارے گھر بھی بکثرت آیا کرتی تھیں اور امی یا میری بہنوں سے فرمائش کر کے کلامِ پاک کا اعادہ کیا کرتیں۔ جب انہیں ہماری پریشانی کا علم ہوا تو انہوں نے اطمینان دلایا کہ اگر اللہ نے چاہا تو اس پریشانی کا سبب فوراً معلوم ہو جائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے آپی سے قرآن پاک لانے کو کہا اور پانی کا ایک گلاس منگوا کر پاس رکھ لیا۔ بعدۂ انہوں نے تلاوت شروع کی اور وقفے وقفے سے اس گلاس میں پھونکیں مارنے لگیں۔ تلاوت مکمل کرنے کے بعد انہوں نے یہ پانی اس بل پر چھڑکوا دیا جہاں سے مٹی نکلتی تھی۔ چند ہی منٹوں کے بعد جب ماسی جی باورچی خانے میں گئیں تو ایک موٹا تازہ چوہا بل میں سے جھانک رہا تھا۔ عام حالات میں ایک انسان کو قریب پا کر چوہے کو فوراً بل کے اندر گھس جانا چاہیے تھا لیکن وہ خلافِ توقع باہر نکل آیا۔ انہوں نے ایک ڈنڈا اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ تب چوہے نے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن موت نے اسے بل میں واپس گھسنے کی مہلت نہ دی۔ اسی اثناء میں ماسی جی نے اسے ایک اور ڈنڈا رسید کر دیا جس کے بعد اس نے تڑپ تڑپ کر وہیں جان دے دی۔ چوہے کی موت نے ہمارا یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیا۔

چوہا تو بظاہر ایک بے ضرر سا جانور ہے، اس زمانہ میں ربوہ میں سانپ بھی عام تھے اور بعض افراد کو ڈستے بھی رہتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے ہمیں ان کے شر سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے ایک بار امی صبح سویرے باورچی خانے میں داخل ہوئیں تو اندر قریباً دو فٹ لمبا سانپ موجود تھا۔ وہ اُلٹے پاؤں واپس آ گئیں اور ماسی جی کو سارا ماجرا سنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ماسی جی کو اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کی خاص صلاحیت ودیعت کر رکھی تھی چنانچہ انہوں نے چارپائی کے ایک پائے سے سانپ کا سر پوری قوت سے کچل دیا۔ میں قریب کھڑا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ سانپ بہت تلملایا اور اُس نے اس شکنجے سے آزاد ہونے کی پوری کوشش کی لیکن ماسی جی نے اس پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی۔ بالآخر جب انہیں یقین ہو گیا کہ سانپ ادھ موا ہو چکا ہے اور اب کسی کو نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہا تو انہوں نے پایہ اُٹھا لیا اور پھر اسی پائے کے پے در پے وار کر کے اسے موت کی وادیوں میں دھکیل دیا۔

فاطمہ جٹی کے ذکر نے مجھے ربوہ کی ایک اور خاتون کی یاد دلا دی ہے جو دفتر پرائیویٹ سیکرٹری کے کارکن منشی فتح دین کی اہلیہ تھیں۔ ان کا نام تو سکینہ تھا لیکن وہ اپنی بڑی بیٹی، امۃ الرشید کی مناسبت سے محلے میں ''امۃ الرشید دی اماں'' کے نام سے پہچانی جاتی تھیں۔ ان کے کئی بیٹے پیدائش کے فوراً بعد یا عالمِ طفولیت میں

وفات پا چکے تھے اور دو بیٹیاں ہی زندہ بچیں: امتہ الرشید اور امتہ الحمید۔ امتہ الرشید تو بہت دنوں سے قاضی عبدالرحیم کے صاحبزادے محمد احمد کے ساتھ بیاہ کر مشرقی افریقہ جا چکی تھیں جب کہ بعد میں چھوٹی بیٹی کی شادی مولوی عبدالرحمٰن انور پرائیویٹ سیکرٹری حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ایک بیٹے نعیم الرحمٰن انور کے ساتھ ہوئی جو واپڈا میں ملازم تھے۔ اسی عرصے میں انہوں نے اپنی بڑی بیٹی کا ایک بیٹا، مسعود احمد بعمر دو ماہ لے کر پال لیا۔ وہ اس سے بہت پیار کرتی تھیں اور اسے ہر وقت ساتھ لئے پھرتیں۔ یہ بچہ سوا آٹھ سال کا تھا جب وہ حادثاتی طور پر اپنے مکان کی چھت سے گر کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس حادثے نے موصوفہ کو اور بھی بے حال کر دیا۔

وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے گھر کا کام کاج نمٹاتے ہی برقعہ اپنے سر پر رکھ کر سہیلیوں سے ملاقات کے لیے نکل کھڑی ہوتیں اور شاذ ہی کوئی دن ایسا ہوتا جب وہ ہمارے گھر تشریف نہ لاتیں۔

ایک روز میں کھیل کود سے فارغ ہو کر مغرب سے ذرا پہلے گھر پہنچا تو وہ آ گئیں اور دُور ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا: میں نے کسی لڑکے کو وہاں پر کوئی چیز رکھ کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم ذرا جا کر دیکھو تو سہی، اس نے کیا چھپایا ہے۔ میں سرپٹ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ احمدیہ فیورٹ سٹور والے محمد احمد نظام کے زیرِ تعمیر مکان میں اس بچے نے ایک جگہ دو روپے چار آنے چُھپا رکھے ہیں۔ بچے نے یہ رقم غالباً کہیں سے چرائی تھی لیکن پکڑے جانے کے خوف سے یا بعد میں حسبِ منشا خرچ کرنے کے ارادے سے وہ اسے یہاں چھپا گیا تھا۔ چور پر مور پڑنے والا محاورہ اس دن بہت صحیح ثابت ہوا چنانچہ میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر یہ رقم اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی اور اسی تیزی سے بھاگ آیا۔ اُس زمانے میں دو روپے ایک خطیر رقم سمجھی جاتی تھی چنانچہ جب گھر والوں کو پتا چلا تو بحث شروع ہو گئی کہ کیا یہ رقم ہمارے لیے مباح ہے۔ اگرچہ میں اس ''مالِ غنیمت'' سے کسی طور جدا نہ ہونا چاہتا تھا تاہم بزرگان کے فیصلے کے مطابق مجھے یہ رقم اپنے ذاتی استعمال میں لانے کی اجازت نہ دی گئی اور بالآخر چندہ تحریکِ جدید میں ادا کر دی گئی۔

بعد میں مجھے عادت سی ہو گئی کہ وہاں سے گذرتے ہوئے میں ازراہِ تجسّس اس جگہ ضرور جھانکتا لیکن ایک موقع کے علاوہ جب مجھے اسی جگہ سے پھر ایک روپیہ ہاتھ آیا کبھی کوئی اور رقم نہیں ملی۔ میں نے گھر میں ذکر کیا تو اس روپے کے بارے میں بھی کافی بحث تمحیص ہوئی اور بالآخر یہ رقم بھی کسی ضرورت مند کی مدد پر خرچ کر دی گئی۔

اسی دور میں صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے ربوہ میں سکنی پلاٹوں کی الاٹمنٹ شروع ہوئی۔ انجمن اس بات کو ترجیح دیتی تھی کہ تمام رشتہ دار ایک جگہ پر پلاٹ خریدیں چنانچہ اباجی اور لاہور میں مقیم میرے پھوپھا، ملک نواب خان نے محلہ دارالنصر غربی میں ایک ایک کنال کے دو ملحقہ پلاٹ دو سو روپیہ فی پلاٹ کے حساب سے خرید لیے۔ ان پلاٹوں پر مکان کا نقشہ بھی ان ہی دنوں بنوالیا گیا۔ یہ نقشہ چنیوٹ کے حضرت ماسٹر محمد نور الٰہی نے تیار کیا تھا اور ایک ہی قطار میں تعمیر ہونے والے تین کمروں، ایک برآمدے، باورچی خانے، سٹور اور صحن پر مشتمل تھا جب کہ بیت الخلا اور غسل خانہ حسبِ رواج صحن کے ایک کونے میں تجویز کیا گیا تھا۔

اگرچہ انجمن کے قواعد کے مطابق پلاٹ کی الاٹمنٹ کے چھ ماہ کے اندر اندر مکان کی تعمیر ضروری تھی ورنہ

الاٹمنٹ کینسل ہوسکتی تھی تاہم اباجی نامساعد حالات کی وجہ سے اس پلاٹ پر مکان تعمیر نہ کر سکے۔
پھوپھا جی پلاٹ کی الاٹمنٹ کے فوراً بعد بعض ایسی الجھنوں میں گرفتار ہو گئے کہ مکان کی تعمیر ان کے لیے ممکن نہ رہی چنانچہ انہوں نے یہ پلاٹ ان ہی دنوں مبلغ سات سو روپے میں فروخت کر دیا۔ جہاں تک ہمارے پلاٹ کا تعلق ہے اباجی کی وفات کے بعد قضا کے ایک فیصلے کے تحت یہ پلاٹ میرے نام منتقل ہو گیا تاہم میں بھی اس پر مکان تعمیر نہ کر سکا اور اگست ۱۹۸۶ء میں اسے فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم تمام ورثا میں بحصہ رسدی تقسیم کر دی۔

اگرچہ اس وقت تک ان پلاٹوں کی نشان دہی کی گئی تھی نہ ان پر ناجائز قبضے کا کوئی احتمال تھا لیکن اس کے باوجود مجھے امی اور ہمشیرگان کے ساتھ یہ پلاٹ ''دیکھنے'' کے لیے وقتاً فوقتاً وہاں جانا یاد ہے۔ اب سوچتا ہوں تو ہمارے اس معمول کی دو وجوہات نظر آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم لوگ ہندوستان سے مہاجر ہو کر یہاں آئے تھے اور ہماری تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد وہیں رہ گئی تھی۔ دوم یہ کہ لاہور میں گذرنے والا زمانہ انتہائی محرومی کا تھا اور ربوہ کا وہ دور بھی مالی آسودگی سے تہی تھا۔ ایسے میں ایک رہائشی قطعہ اراضی کی ملکیت کا احساس پورے خاندان کے لیے وجہ اطمینان ہوگا۔ یہ اُمید کہ ہم لوگ بہت جلد اس پلاٹ پر اپنا گھر تعمیر کر لیں گے مزید حوصلہ افزا ہوگی اور شاید اسی لیے اس پلاٹ کو بار بار دیکھنا سب کے لیے وجہ طمانیت تھا۔

جب ہم وہاں جاتے تو ہمارے دائیں ہاتھ اس پہاڑی کے پاس جو محلّہ دارالنصر میں اب بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے ایک قبرستان تھا جس میں میرے اندازے کے مطابق کئی سو قبریں ضرور ہوں گی۔ علاقے کے رواج کے مطابق کسی قبر پر کوئی کتبہ نہ تھا البتہ ہر قبر کے سرہانے اور پائنتی کی جانب ایک یا دو چھوٹے یا بڑے پتھر ایستادہ تھے۔ یہ پتھر غالباً قبروں کی شناخت کے لیے رکھے گئے ہوں گے۔ یہ قبرستان کب سے تھا اور یہاں کون لوگ دفن تھے، اس بارے میں میرے لیے کچھ کہنا آسان نہیں مگر سمجھا یہ جاتا تھا کہ یہ قبرستان قریبی مواضعات یعنی موضع چھنّی و کھچّی کی ضرورت پوری کرتا ہوگا۔

مجھے بہت بعد میں موضع چھنّی کے ایک رہائشی کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا اپنا قدیمی قبرستان ان کے اپنے گاؤں میں واقع ہے اور اَب مسلم کالونی کی حدود میں آ چکا ہے۔ یہ قبرستان اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود موضع چھنّی اور اس گاؤں میں فوت ہونے والے افراد مدتِ مدید سے اسی قبرستان میں دفن ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ربوہ کے دیگر نواحی مواضعات یعنی کھچّی، کماکلے اور کوٹ وساوا والے قیام ربوہ سے پہلے اپنے مردے قبرستانِ شہیداں (جسے بعد میں عام قبرِستان کہا جانے لگا) میں دفن کرتے تھے لیکن جب وہاں جگہ باقی نہ رہی تو انہوں نے اپنے اپنے مواضعات میں اپنے قبرستان قائم کر لیے۔

اندریں حالات ممتاز صحرائی کے الفضل میں کئی اقساط میں چھپنے والے مضمون میں درج یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ ''دوسرا اگلے زمانہ کا گورستان تھوڑی سی قبروں پر مشتمل ہے جو ریلوے لائن کے جنوب میں ریتلی جگہ پر واقع ہے۔ میں نے ہر چند ربوہ کے پڑوسیوں سے پوچھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس کے متعلق کوئی روایت نہیں معلوم ہو سکی۔''

آہستہ آہستہ ربوہ کے باسیوں نے اس قبرستان میں سے پگڈنڈیوں کی صورت راستے بنا لیے اور یوں یہ قبریں عوام الناس کی عدم دلچسپی اور موسمی تغیر و تبدل کی وجہ سے صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ اب ان کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔

اُن دنوں محلّہ دارالنصر غربی کی محولہ بالا پہاڑی پر جہاں اب واٹر ٹینک تعمیر ہو چکا ہے ایک کمرے کے آثار باقی تھے۔ جب میں نے دیکھا اس کی چھت غائب ہو چکی تھی اور دیواریں بھی تھوڑی باقی رہ گئی تھیں۔

میں نے ان ہی دنوں کسی سے سنا کہ جب رنجیت سنگھ نے کسی بادشاہ کی دریائے چناب میں ڈوب جانے والی بعض توپیں نکالیں تو ان میں سے ایک یہاں رکھی گئی تھی۔ میں اس وقت پہلی یا شاید دوسری جماعت میں ہوں گا اور میں رنجیت سنگھ کے نام سے بھی واقف نہ تھا لہٰذا لمبے عرصہ تک اس روایت کو درست سمجھتا رہا۔ میں نے بعد میں کچھ اور لوگوں سے بھی یہی کہانی سنی لیکن آج میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس روایت کی حیثیت کسی من گھڑت قصے سے زیادہ نہیں۔

کنہیا لال نے اپنی کتاب ''تاریخِ پنجاب'' میں اس واقعہ کی جو تفصیل دی ہے اس کے مطابق جب شاہ زمان کا لشکر لاہور سے واپسی پر ''دریائے چناب سے اُترنے لگا تو دریا نہایت طغیانی پر تھا۔ پندرہ روز تک بادشاہ کو وہاں رہنا پڑا۔ بڑی مشکل سے لشکر دریا سے اُترا مگر جب توپخانہ کے اُترنے کی نوبت آئی تو دس عدد توپیں شاہی دریا میں غرق ہو گئیں۔ بادشاہ اس وقت حیران تھا کہ.......... دریا سے اب توپیں کیوں کر نکالی جائیں۔ جب کوئی تدبیر بَن نہ آئی تو ایک پروانہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام کہ وہ علاقہ اس کی حکومت میں تھا بدیں مضمون لکھا کہ بسبب طغیانی دریائے چناب کے بادشاہی توپیں پانی میں غرق ہو گئی ہیں جن کا نکالنا سرِ دست مشکل ہے البتہ جب پانی کم ہو گا ان کا نکالنا آسان ہو گا۔ چونکہ یہ علاقہ تمہاری حکومت میں ہے بعد فرو ہونے طغیانی کے اگر تم ان توپوں کو نکلواؤ اور کابل میں ہمارے پاس پہنچاؤ تو بموجب خوشنودی خاطر ایں جانب ہو گا اور اس خدمت کے عوض میں ہماری طرف سے تم کو اجازت ہے کہ لاہور پر جا کر قبضہ کر لو۔ آئندہ ہماری طرف سے کوئی حاکم و فرمانروا مزاحم حال تمہارے کا نہ ہو گا۔ یہ تحریر جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس پہنچی بہت خوش ہوا اور چار ماہ کے بعد جب دریا کا پانی اُترا تو بڑی کوشش سے آٹھ توپیں بادشاہ کی دریا سے نکلوائیں اور اپنے ایک معتبر کے ہاتھ کابل کو روانہ کیں۔ اس خدمت سے بادشاہ بہت خوش ہوا۔ معتبر کو خلعتِ فاخرہ بخشا اور بڑی عزت سے رخصت کیا۔ توپیں باقی ماندہ بادشاہی جو دریا میں تھیں وہ ایک سال کے بعد نکلوائی گئیں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تصرف میں رہیں۔''

سید محمد لطیف نے یہی واقعہ قدرے مختلف انداز میں بیان کیا ہے اور اس کا محل وقوع دریائے چناب کی بجائے دریائے جہلم بتایا ہے۔

اگر کنہیا لال کی بات درست تسلیم کر لی جائے تو اس واقعہ کا اس جگہ وقوع پذیر ہونا قرینِ قیاس نہیں کیوں کہ دریائے چناب کا یہ پتن لاہور سے پشاور جانے والی شاہراہ سے بہت دور ہے اور اگر سید محمد لطیف کی بات درست سمجھ لی جائے تو دریائے چناب ہی اس کہانی سے نکل جاتا ہے۔ یوں بھی یہ کمرہ عام اینٹ کا بنا ہوا تھا جب

کہ رنجیت سنگھ کے زمانے کی اکثر عمارات چھوٹی اینٹ سے تعمیر شدہ ہیں لہٰذا اس روایت کو قصہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ کمرہ دریائے چناب کے پُل کی تعمیر کے دوران کسی خاص مقصد سے تعمیر کیا گیا ہو۔

انجمن کوارٹرز اور دیگر پختہ جماعتی عمارات کی تعمیر کے ساتھ ساتھ وہ تمام کچی عمارتیں جو ابتدائے ربوہ میں ریلوے لائن کے دونوں اطراف میں تعمیر ہوئی تھیں منہدم کی جارہی تھیں۔ اس کے باوجود محلہ جات میں مکانات کی تعمیر کی رفتار خاصی سست تھی اور تاحدِ نظر صرف خودرو جھاڑیاں، اَرنڈ اور آک کے پودے یا کیکر کے درخت نظر آتے تھے۔ مجھے اَرنڈ کی کونپلیں اور اس کے بیج جو ایک خوبصورت لیکن خاردار خول کے اندر محفوظ ہوتے بہت اچھے لگتے تھے۔ آک کے ڈوڈے سے سفید روئی نکلتی جو ہوا میں اُڑتی پھرتی۔ ہم اسے ''مائی بڈّی دا چاٹا'' کہتے لیکن بعد میں پتا چلا کہ اہلِ زبان اسے ''آک کی بڑھیا'' کہتے ہیں۔

غلہ منڈی اور دارالصدر غربی میں خودرو جھاڑیاں بکثرت ہوا کرتی تھیں۔ جھاڑیوں پر پھول کھلتے تو رنگ برنگی تتلیاں ان پر منڈلانے لگتیں۔ نہ جانے کس طرح مجھے تتلیاں پکڑنے کا شوق پیدا ہو گیا جو بعد میں تتلیاں جمع کرنے کی شوق میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے یہ سبق شاید اپنے کسی ساتھی سے پڑھا ہو گا کہ اگر تتلی کے پر اچھی طرح پھیلا کر اسے کسی کتاب کے اندر دبا دیا جائے تو وہ لمبے عرصے تک محفوظ رکھی جا سکتی ہے۔ بس پھر کیا تھا! مجھے جہاں کوئی تتلی نظر آتی میں کتاب یا کاپی ہاتھ میں لے کر اس کا تعاقب شروع کر دیتا اور بالعموم اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں تتلی کے پر کھولتا اور اسے کتاب کے اندر رکھ کر دبا دیتا۔ چند دن کے بعد جب اس کا جسم پوری طرح خشک ہو جاتا تو اسے اپنی البم میں منتقل کر دیتا۔

اُسی زمانے میں پھوپھی نے اپنے دو بڑے بیٹوں یعنی مسعود اور داؤد کو تعلیم و تربیت کے لیے لاہور سے ربوہ بھجوا دیا۔ مسعود چچا ابراہیم کے گھر رہنے لگے اور داؤد ہمارے ہاں۔

مسعود عمر میں مجھ سے بڑے اور سکول میں ایک سال سینئر تھے جب کہ داؤد مجھ سے چھوٹا اور سکول میں ایک سال جونیئر تھا۔ داؤد کے آنے سے میری زندگی میں ایک رونق سی آ گئی۔ اگرچہ میں اپنے والدین اور بہنوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ گھر میں میرا کوئی ہم عمر نہ تھا۔ داؤد کی صورت میں مجھے ایک اچھا دوست مل گیا چنانچہ ہم صبح اکٹھے سکول جاتے، چھٹی کے وقت اکٹھے واپس آتے اور شام کو اکٹھے کھیلتے کودتے حتیٰ کہ سوتے بھی ایک ہی چارپائی پر تھے۔ داؤد کا اس سے پہلے کا سارا وقت لاہور میں گذرا تھا اس لیے اس کا مشاہدہ زیادہ وسیع اور اس کے خیالات ربوہ میں پلنے والے بچوں سے مختلف تھے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم دونوں کے گھروں کا ماحول تقریباً ایک جیسا اور شوق بھی یکساں تھے چنانچہ وہ بھی میرے اس شوق کی تکمیل میں میرا مددگار بن گیا۔

ربوہ میں عمومی طور پر پائی جانے والی تتلیاں بہت چھوٹی اور دیکھنے میں ایسی خوبصورت تو نہ تھیں مگر ہم اپنے پاس موجود تتلیوں کی تعداد بڑھانے کے شوق میں انہیں کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ احاطہ قصرِ خلافت میں بیت مبارک سے ذرا پہلے ایک تکونا باغیچہ ہوا کرتا تھا جس کے اطراف میں گارڈینیا کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ چونکہ اباجی

کا دفتر قصر خلافت سے ملحق تھا اس لیے ہم ان کے دفتر یا بیت مبارک میں نماز کے لیے آتے جاتے اس باغیچے سے پاس ضرور رکتے۔ یہاں قدرے بڑے سائز کی تتلیاں جن کے پروں پر سبز اور فیروزی رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ملتی تھیں۔ ہم یہ تتلیاں دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکتے اور انہیں پکڑ کر ہی دم لیتے۔ جب کوئی تتلی ہمارے ہاتھ آجاتی تو یوں محسوس ہوتا گویا ہمیں دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی ہو۔

ایک بار جب ہم گول بازار کے عقب سے گذر رہے تھے ہم نے دیکھا کہ محمد احمد نظام کے گھر کے پیچھے ایک ناکارہ ریکٹ پڑا ہے۔ ہمیں تتلیوں کو قابو کرنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی اور ان کے پیچھے بہت دُور تک بھاگنا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ کبھی ہاتھ آتیں تو کبھی بچ نکلتیں لہٰذا یہ ریکٹ دیکھتے ہی ہمیں ایک ترکیب سوجھی۔ ہم نے اسے اٹھالیا اور لوہے کی باریک جالی ،کیلوں کے ساتھ اس پر جوڑ دی۔ اس ریکٹ کی ایک ہی ضرب تتلی کو ادھ موا کردیتی، وہ اڑنے کے قابل نہ رہتی اور ہم اسے بہ آسانی قابو کر لیتے۔ یہ ریکٹ عرصہ دراز تک ہمارے اس شوق کی تکمیل کا ذریعہ بنا رہا۔

اُن ہی دنوں کسی نے ہمیں بتایا کہ بیت مبارک سے ملحقہ باغیچے کی باڑ میں لگنے والے سفید رنگ کے صراحی دار پھول کے نیچے شہد ہوتا ہے۔ ہم نے پھول کو ڈوڈی سے الگ کر کے اسے چوسا تو منہ کے اندر ایک عجیب سی مٹھاس محسوس ہوئی۔ اس کے بعد ہمارا معمول بن گیا کہ جب ادھر جاتے ان پھولوں کا رس ضرور چوستے۔ اس لذت سے طبیعت کچھ ایسی آشنا ہوئی کہ بعد میں کئی سال تک جہاں مجھے یہ پھول نظر آتا، میں اس کا رس چوسے بغیر نہ ٹلتا۔

اس زمانے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ایک باڈی گارڈ محمد عالم (جو بفضلِ خدا تادمِ تحریر بقیدِ حیات ہیں اور محلہ دارالنصر غربی میں رہائش پذیر ہیں) ہمارے عقب میں رہا کرتے تھے۔ ابا جی کی طرح وہ بھی حضور کے سفروں کے دوران ان کے ساتھ جاتے اور بہت دنوں تک ربوہ سے غیر حاضر رہتے۔ غالباً اسی اشتراک نے ہم دونوں خاندانوں کے درمیان ایک خاص طرح کی بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔ اسی پس منظر میں ہم نے مشترکہ دیوار میں سے ایک کھڑکی نکال رکھی تھی جہاں سے ایک دوسرے کے گھر جانا بہت سہل تھا۔

انہوں نے قیامِ ربوہ کے ابتدائی چند ہی سالوں میں محلہ دار النصر غربی میں اپنا مکان تعمیر کر لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ابا جی کے نام اسی محلہ میں ایک کنال کا پلاٹ موجود ہے چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر انہیں صرف ایک ہزار روپیہ مہیا کر دیا جائے تو وہ اس پلاٹ پر ایک قابلِ رہائش مکان تعمیر کر کے دے سکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام ہو تو کیسے؟

پچھلے دنوں مدتِ مدید کے بعد ان سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے ضعیف العمری کے باوصف مجھے فوراً پہچان لیا۔ ''تمہاری آنکھ کے تل کا کیا حال ہے؟'' انہوں نے مجھ سے پہلا سوال ہی یہ کیا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ بچپن میں میری ایک آنکھ کی سفیدی میں ہلکے سیاہ رنگ کا ایک خاصا بڑا نشان تھا جس کے بارے میں ابا جی بہت فکرمند رہا کرتے تھے۔ وہ اس کا ذکر ہر ملنے جلنے والے سے کرتے رہتے تھے تاکہ شاید کہیں سے کوئی مفید مطلب مشورہ مل جائے۔ خدا کے فضل سے یہ تل بعد میں خود ہی تحلیل ہو گیا اور اب اس کا

کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں'' میں نے انہیں بتایا۔

''مولوی صاحب بہت فکر کیا کرتے تھے اس بات کی۔''

''یاد ہے مجھے۔ اللہ نے ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور میں کسی دوا کے بغیر ہی ٹھیک ہو گیا۔''

محمد عالم کی اہلیہ گول بازار والے مستری علی گوہر کی بیٹی تھیں جن کا نام تو امتہ الرشید تھا لیکن محلہ بھر میں ''چھیدی'' کے نام سے معروف تھیں۔ وہ بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں چنانچہ میں اور داؤد وقت بے وقت ان کے گھر چلے جاتے اور کھیلتے کودتے رہتے۔

انہوں نے خرگوش پال رکھے تھے۔ وہ خرگوش کے بچوں کے ساتھ ہماری دلچسپی سے آگاہ تھیں چنانچہ ایک بار انہوں نے ہمیں خرگوش کا ایک بچہ تحفتاً دیا۔ سردیوں کے دن تھے اور ہم یہ بچہ ہاتھوں میں لئے پھرتے تھے۔ رات ہوئی تو اسے اپنی چارپائی کے قریب ایک ٹوکری کے نیچے بند کر دیا۔ لیٹنے کے بعد ہمیں خیال آیا کہ سردی بہت زیادہ ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ ہم اسے اپنے ساتھ سُلا لیں چنانچہ ہم اُٹھے اور خرگوش کو لحاف کے اندر لے آئے۔ اسے بھی یہ آسائش پسند آئی اور وہ ہمارے درمیان آرام کے ساتھ سو گیا۔ اس وقت ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہ آیا کہ ہماری بے خبری میں یہ بچہ ہمارے نیچے روندا جا سکتا ہے چنانچہ نہ جانے کس وقت ہم نیند کی پُر فسوں وادی میں جا نکلے۔ صبح اُٹھے تو یاد آیا کہ ہم نے خرگوش اپنے ساتھ سلایا تھا۔ ہم توقع کر رہے تھے کہ جب ہم لحاف ہٹائیں گے تو خرگوش چھلانگ لگا کر چارپائی سے نیچے اُتر آئے گا لیکن افسوس! یہ ہماری خام خیالی ثابت ہوئی۔ وہ رات کے کسی لمحے ہمارے نیچے دب کر ابدی نیند سو چکا تھا۔

ہمیں اس خرگوش کے مرنے کا بہت افسوس ہوا چنانچہ ہم نے اسے صحن کے ایک کونے میں دفن کر کے اس کی قبر بنائی جو کئی دنوں تک قائم رہی۔

تنگدستی کے اس دور میں ہم صرف وہی مشاغل اپنا سکتے تھے جن پر کوئی رقم خرچ نہ ہو چنانچہ مجھے یاد ہے ہم سگریٹ کی خالی ڈبیاں بہت شوق سے جمع کیا کرتے تھے۔ یوں تو عام حالات میں بھی ہمیں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی ڈبیہ گری پڑی مل ہی جاتی تھی لیکن جلسہ سالانہ کے ایّام میں جب بیرونِ ربوہ سے کثیر تعداد میں مہمانانِ ربوہ آتے تو ڈبیاں زیادہ کثرت سے مل جایا کرتیں۔ ہم اس کا اندر والا حصہ (جس میں سگریٹ پیک ہوتا ہے) نکال باہر پھینکتے اور باہر والا حصہ اپنے خزینے میں جمع کر لیتے۔

اُس دور کے بعض مقبولِ عام سگریٹوں میں سے ''پاسنگ شو'' ''سِزر رز'' ''تار'' ''بگلہ'' اور ''ہاتھی'' کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں۔

''پاسنگ شو'' ایک انگریزی نام تھا جس کی ڈبیہ پر ہیٹ والے ایک آدمی کو سگریٹ پیتا دکھایا گیا تھا جب کہ ''سِزر رز'' پر ایک قینچی کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ ہم باہم گفتگو میں اس ڈبیہ کے لیے قینچی کا لفظ ہی استعمال کرتے تھے۔ ''تار'' کا اصل نام ''ٹیلیگراف'' تھا اور ''بگلے'' کا اصل نام ''کنگ سٹارک''۔ جس سگریٹ کو ہم ''ہاتھی'' کہتے

تھے اس کا اصل نام ''ایلیفینٹ'' تھا تاہم چونکہ اس ڈبیہ پر ہاتھی کی تصویر بنی ہوتی تھی لہٰذا ہم اپنی زبان میں اسے ہاتھی کہتے تھے۔ ایک سگریٹ ''گولڈفلیک'' بھی ہوتا تھا جب کہ کیپسٹن (جسے ہم کیپٹن کہتے تھے) اس زمانے میں بھی ملتا تھا۔ اگرچہ ہم نے سگریٹ کبھی خریدا تو نہیں تھا تاہم میرے علم کے مطابق تار ان میں سب سے سستا سگریٹ تھا اور اس کے ایک پیکٹ کی قیمت غالباً ڈھائی آنے (موجودہ پندرہ پیسے) تھی۔

ہم ان خالی ڈبیوں کو برانڈز کے لحاظ سے الگ الگ باندھ کر رکھتے اور دوسروں پر رعب ڈالنے کے لیے ان ڈبیوں کی ''تھدیاں'' انہیں دکھاتے۔ ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح سگریٹ کی ڈبیوں کے تبادلے کا بھی رواج تھا۔

اس زمانے کا ایک اور شوق جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے سوڈا واٹر کی بوتلوں کے ڈھکنے جمع کرنا تھا۔ ہم نے یہ ڈھکنے بھی کلاسیفائی کر کے الگ الگ تھیلوں میں رکھے ہوتے تھے اور اس کی تعداد پر دوسروں کے مقابلہ پر اتراتے رہتے تھے۔

بچوں میں شیشے کی گولیاں (جنہیں ''بنٹے'' کہا جاتا تھا) جمع کرنے کا بھی رواج تھا۔ یہ بنٹے ایک کھیل میں بھی استعمال ہوتے تھے جسے ''بنٹے کھیلنا'' کہا جاتا تھا۔ ربوہ کے ماحول میں اس کھیل کو بالعموم ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

داؤد صرف ایک سال ربوہ رہے۔ تیسری جماعت پاس کرنے کے بعد وہ لاہور گئے لیکن واپس نہیں آئے۔ ان کے ربوہ سے چلے جانے کا سب سے زیادہ افسوس مجھے ہوا کہ میں ایک اچھے دوست سے محروم ہو گیا تھا۔ بدقسمتی سے لاہور جا کر داؤد کی پڑھائی میں دلچسپی قائم نہ رہ سکی جس کا ان کی آئندہ زندگی پر منفی اثر پڑا تاہم وہ ایک مخلص احمدی تھے اور انہیں نظامِ خلافت سے بے پناہ عقیدت تھی۔

اُنہیں کچھ سال پہلے عارضہ قلب کی شکایت ہو گئی تھی لیکن اس کا باقاعدہ علاج نہ ہو سکا۔ نتیجتاً مارچ ۲۰۰۹ء میں ان پر دل کا شدید حملہ ہوا۔ جناح ہسپتال، لاہور نے ان کے لیے بائی پاس تجویز کیا۔ اب تو کوئی راہِ مفر نہ رہ گئی تھی چنانچہ وہ پنجاب انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں داخل ہو گئے۔ مجھے خبر ملی تو میں فوراً ہسپتال پہنچا۔ اگلے روز ان کا آپریشن تھا۔ داؤد ماشاء اللہ ہشاش بشاش تھے اور ذہنی طور پر آپریشن کے لیے تیار۔ اسی دوران ہسپتال انتظامیہ نے انہیں بعض ضروری ٹیسٹوں کے لیے لیبارٹری میں طلب کر لیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ انہیں لیبارٹری میں کتنی دیر لگے گی چنانچہ ہم نے انہیں اس امید پر تپاک سے رخصت کیا کہ ان کے ساتھ آپریشن کے بعد ملاقات ہو گی۔

ان کا بائی پاس ہوا لیکن معاملات ڈاکٹروں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ افسوس! وہ آپریشن کے بعد بیہوشی سے باہر نہ آ سکے۔ انہیں تدفین کے لیے ربوہ لے جایا گیا۔ خدا کا شکر ہے مجھے بھی ان کے جنازہ اور تدفین میں شمولیت کا موقع مل گیا۔

ان کی شادی حکیم عبدالقدیر کاغانی، ساکن کریم پارک، لاہور کی صاحبزادی غزالہ سے ہوئی جس کے نتیجہ میں اللہ نے انہیں کثیر اولاد یعنی سات بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔

بیٹی، مہرالنساء جسے گھر میں پیار سے مہرُو کہا جاتا تھا داؤد کو سب بچوں سے عزیز تھی لیکن رسم دنیا نباہنا بھی

ضروری تھا چنانچہ انہوں نے مہروز کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کر کے اسے نیویارک کے لیے الوداع کر دیا جہاں وہ خدا کے فضل و کرم سے اپنے خاوند کے ساتھ راضی خوشی زندگی گذار رہی ہے۔

بیٹوں کے نام علی الترتیب عطا، سیف، ذکاء، سمیع، حبیب، شہباز اور وہاب ہیں۔ داؤد نے اپنی زندگی میں چار بڑے بیٹوں کی شادیاں کر دی تھیں لیکن اب باقی دو بیٹوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں۔

آج کل عطا انگلستان کے شہر برمنگھم میں؛ سیف کیلگری (کینیڈا) میں؛ ذکاء منامہ (بحرین) میں اور حبیب لندن میں ہے اور یہ سارے بچے خوشحال زندگی گذار رہے ہیں۔ باقی بیٹے فی الحال لاہور میں ہیں لیکن باہر جانے کے لیے پَر تول رہے ہیں۔

میں بہت چھوٹا تھا جب مجھے پہلی بار کار سواری کا موقع ملا۔ اس سے پہلے میں نے کار دُور سے ہی دیکھی تھی اور میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مجھے اس میں بیٹھنے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔

ہوا دراصل یوں کہ سید زین العابدین ولی اللہ شاہ کی ایک بیٹی، طاہرہ جو بعد میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے صاحبزادے مرزا حنیف احمد کے عقد میں آئیں، آپی کی کلاس فیلو اور گہری سہیلی تھیں۔ اُن کی بہن، وسیمہ جو ایف سی کالج میں معاشیات کے استاد، پروفیسر فیض الرحمٰن فیضی کی اہلیہ تھیں لاہور میں رہا کرتی تھیں اور طاہرہ ان سے ملنے وقتاً فوقتاً لاہور جاتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے آپی کو بتایا کہ صاحبزادہ مرزا حفیظ احمد کار سے لاہور جا رہے ہیں اور وہ بھی ان کے ہمراہ جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے آپی کو دعوت دی کہ اگر وہ بھی اس سفر میں ان کا ساتھ دے سکیں تو انہیں خوشی ہوگی۔ مجھے پتا چلا تو میں بھی ساتھ جانے کی ضد کر بیٹھا اور بالآخر اپنی بات منوا کر رہا۔

مجھے اس سفر کی اور کوئی تفصیل یاد نہیں ماسوا اس کے کہ مرزا حفیظ احمد ہمیں لینے کے لیے ہمارے گھر آئے تھے اور ہم راستے میں ایک نہر پر جس پر ''جھنگ برانچ'' کا بورڈ لگا ہوا تھا تھوڑی دیر کے لیے رکے تھے۔ شاید اس بورڈ پر کچھ اور بھی لکھا ہو لیکن مجھے اب صرف یہی الفاظ یاد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں رکنے کا مقصد بریک جرنی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہاں! مرزا حفیظ احمد نے یہاں کچھ فوٹو گرافی کی تھی۔

اس کے بعد موصوف نے گاڑی کسی جگہ نہیں روکی۔ اُن دنوں پھوپھی (جن کے ہاں مجھے اور آپی کو رُکنا تھا) شیش محل روڈ پر اسی مکان میں مقیم تھیں جہاں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہمارا بھی کچھ وقت گذرا تھا۔ اس وقت تک لوگ ہجرت کے صدمہ سے پوری طرح سنبھل نہ پائے تھے اور جیسے تیسے وقت گذار رہے تھے۔ ہمارے زمانہ میں گلی کی بجلی کٹی ہوئی تھی اور اب تک بحال نہ ہوئی تھی چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے تو ساری گلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی لیکن چارپائیوں سے اٹی پڑی تھی اور بعض لوگ تھڑوں پر بھی سوئے پڑے تھے۔ کہیں کہیں لالٹینیں ٹمٹماتی نظر آ رہی تھیں لیکن آج والی روشنیوں کا تصور موجود نہ تھا۔ مرزا حفیظ احمد ہمیں گلی کی نکڑ پر اُتار کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

اُن دنوں پھوپھی نے بلی کا ایک بچہ پالا ہوا تھا۔ مجھے یہ بچہ بہت بھلا لگا اور میرا جی اسے ہمراہ لے جانے کو مچلنے لگا۔ پھوپھی کو پتا چلا تو وہ میری یہ معصوم سی خواہش رد نہ کر سکیں اور عندیہ دے دیا کہ ہم ربوہ واپس جاتے ہوئے اسے ہمراہ لے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم دو یا شاید تین راتیں وہاں رہنے کے بعد مرزا حفیظ احمد

کے ساتھ ہی ربوہ واپس آ گئے۔

میں واپسی کے سفر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے ہاتھ میں بلی کے بچے والا تھیلا تھا۔ بچے کی سارا راستہ کوشش رہی کہ وہ تھیلے میں سے باہر آ جائے لہٰذا وہ میرے ساتھ مسلسل پنجہ آزمائی کرتا رہا اور میں تمام راستہ اسی خوف میں مبتلا رہا کہ کہیں وہ باہر نکل کر اودھم نہ مچا دے۔ مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ مرزا حفیظ احمد اور طاہرہ اس شورشرابے پر ہرگز خوش نہ ہوں گے لیکن خدا کا شکر ہے انہوں نے میری ڈانٹ ڈپٹ سے اجتناب کیا اور یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ان کا مہمان ان کے لئے بلائے جان بن گیا ہے۔ خدا خدا کر کے ہم ربوہ پہنچے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ان کی بھی یقیناً یہی کیفیت ہوگی۔

یہ بچہ جلد ہی ہمارے ساتھ مانوس ہو گیا اور ہمارے گھر میں رہ کر پلا بڑھا۔ میں دوپہر کے وقت سکول سے واپس آتا تو یہ بلی بالعموم صحن کے کونے میں رکھی پیڑھی کے پیچھے چھپی ہوتی۔ میں ''مانو مانو'' کہہ کر اسے بلاتا تو وہ اچھلتی کودتی میرے پاس آ جاتی۔ یہ بلی مجھے بہت عزیز تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ امی اسے پسند نہیں کرتیں۔ ایک بار وہ آناً فاناً کہیں غائب ہوگئی۔ بلی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنا گھر نہیں چھوڑتی اور اسے میلوں دُور بھی پہنچا دیا جائے تو ہر صورت میں واپس آ جاتی ہے لیکن یہ بلی پھر کبھی واپس نہیں آئی۔ مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ امی نے یہ بلی بوری میں بند کر کے کوٹ امیر شاہ سے دودھ بیچنے کے لیے آنے والی ایک جانگلیانڑی کو دے دی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ اسے کوٹ امیر شاہ پہنچ کر ہی آزاد کرے۔ بیچاری کو واپسی کا راستہ نہ ملا اور یوں وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی۔

میں نے کچھ دیر پہلے ''جھنگ برانچ'' کا ذکر کیا تھا۔ سچ پوچھیں تو اُس وقت مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ جھنگ برانچ کس نہر کی برانچ ہے لیکن جب میں لاہور سے ربوہ واپس پہنچا تو میرے اندر ایک احساس تفوّق پیدا ہو چکا تھا۔ آپا سے تو کبھی کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہی نہیں تھا لیکن اگر میری دانست میں صادقہ مجھ سے کوئی زیادتی کرتیں تو میں انہیں چپ کرانے کے لیے ''جھنگ برانچ'' نہ دیکھے ہونے کا "طعنہ "ضرور دیتا۔ دراصل یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ انہیں ابھی تک کار میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا جب کہ مجھے یہ ''سعادت'' حاصل ہو چکی ہے اور یوں مجھے ان پر ایک طرح سے فوقیت حاصل ہے۔ وہ میری اس بات کو ایک بچگانہ حرکت سمجھ کر نظرانداز کر دیتیں۔

بہت بعد میں جب میں ربوہ سے لاہور کا بکثرت سفر کرنے لگا تو مجھے پتا چلا کہ ''جھنگ برانچ'' نہر لوئر چناب کی وہ برانچ ہے جو جھنگ کی طرف جاتی ہے اور جس جگہ ہم رکے تھے وہ پنڈی بھٹیاں سے لاہور جانے والی سڑک پر سکھیکی سے ذرا پہلے واقع ہے۔

کسی اور جگہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ ابا جی کو ایلوپیتھی، طب یونانی اور ہومیوپیتھی سے یکساں دلچسپی تھی اور وہ یہ تمام ادویہ گھر میں رکھتے تھے۔ گھر کی بیٹھک میں ایک ہی الماری تھی اور وہ ان دواؤں سے بھری رہتی تھی۔ ایک بار ابا جی نے میری کسی تکلیف پر ایک ہومیوپیتھی دوا کھلائی تو مجھے پتا چل گیا کہ اس میں استعمال ہونے والی گولیاں چینی کی بنی ہوئی ہیں۔ میٹھا مجھے شروع ہی سے پسند ہے چنانچہ میں اُٹھتے بیٹھتے کسی ایسی شیشی کا ڈھکنا کھولتا اور چٹکی بھر گولیاں منہ میں ڈال کر چوستا رہتا۔ میں یہ احتیاط ضرور برتتا کہ کوئی شیشی مکمل طور پر خالی نہ ہونے دوں۔ یہ

سلسلہ نہ جانے کتنی دیر جاری رہا۔ ایک بار میں نے اباجی کو امی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہومیو پیتھک ادویہ کی شیشیاں معلوم نہیں کیوں خالی ہوتی جارہی ہیں۔ امی کو پتہ ہوتا تو وہ کوئی تسلی بخش جواب دیتیں۔ بہاں ۔۔۔ گیا۔ اگرچہ یہ معاملہ اس گفتگو سے آگے نہیں بڑھا لیکن میں چوکنا ہو گیا اور اس روز سے میں نے یہ ادویہ کھانا بند کردیں۔ اب میری توجہ کھانسی کے شربتوں کی طرف ہوگئی۔ بہت بعد میں جب مجھے ذرا شعور آیا تو میں نے دیکھا کہ ایلو پیتھک ادویہ پر بطور خاص یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ انہیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھا جائے۔ میرا خیال ہے یہی وضاحت ہومیو پیتھک ادویہ پر بھی ہونی چاہئے اگرچہ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان ادویہ کا سائیڈ ایفیکٹ نہ ہونے کا عمومی تاثر بالکل درست ہے۔

سفید پوشی کے اس دور میں بہت کم لوگوں کو ٹائم پیس یا وال کلاک میسر تھے اور ہاتھ کی گھڑی بھی گنتی کے ہی چند لوگ افورڈ کر سکتے تھے چنانچہ وقت کا اندازہ سورج کی تمازت، ندا کی آواز یا چڑھتے اور ڈھلتے سائے سے لگایا جاتا تھا۔ ایسے میں دفتر محاسب، صدر انجمن احمدیہ میں رکھا ہوا پیتل کا گھڑیال جو ہر گھنٹے کے بعد بجایا جاتا اہلِ ربوہ کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اس گھڑیال کی آواز دن کے شور شرابے میں تو بسا اوقات دب کر رہ جاتی لیکن رات کے وقت صاف سنائی دیتی۔ ہماری رہائش دفاتر صدر انجمن کے قریب تھی اس لئے ہمیں گھڑیال کی اس ٹن ٹن سے اپنے معمولات کو پابندِ اوقات کرنے میں خاص سہولت رہتی۔ اُس وقت میں اس شعر کی گہرائی سے واقف نہ تھا کہ

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

چنانچہ رات کے وقت اس کی مترنم آواز کانوں میں رس سا گھولتی محسوس ہوتی۔ اباجی بتایا کرتے تھے کہ یہ انتظام دفتر محاسب کی طرف سے وقت کی پہچان کے لئے اور رمضان کے دوران سحری اور افطاری کے اعلان کے لئے ۱۹۵۰ء میں کیا گیا تھا جو اُس وقت تک جاری تھا۔

ان دنوں آبادی بہت کم تھی اور ربوہ کی پہاڑیوں میں گیدڑ بکثرت تھے۔ دن کے وقت تو وہ چھپے رہتے لیکن رات ہوتے ہی باہر نکل آتے اور خوب شور مچاتے۔ پہاڑیاں انجمن کوارٹرز سے زیادہ دور نہ تھیں لہٰذا ہمیں یہ آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ اسی طرح رات کے کسی پہر دُور کسی ویرانے میں بیٹھے ہوئے اُلو یا اُلو کے پٹھے کی ہُوک بھی سنائی دیتی۔ گمان ہے کہ ان اُلوؤں کا بسیرا بھی ان ہی پہاڑوں پر تھا۔ اگرچہ ربوہ کے بعض لوگ اُلو کو نحس پرندہ خیال کرتے اور گردونواح میں اس کی موجودگی کا احساس انہیں طرح طرح کے توہمات میں مبتلا کر دیتا تھا مگر ہم ایسے اُلو نہ تھے کہ ان کی بات میں آکر اُلو بن جاتے۔

اسی زمانے میں ربوہ کی باقی کچی عمارات کی طرح ''احاطہ'' بھی مسمار کر دیا گیا اور اس میں مقیم بیوائیں اور بیکس خواتین اپنے اپنے انتظام کے تحت کسی اور جگہ منتقل ہوگئیں۔

کیا آپ کو پتا ہے کہ ''احاطے'' سے میری مراد کیا ہے؟

یتیموں اور وہ بیواؤں کا والی

قیامِ پاکستان کے ہنگامہ خیز دنوں میں ہندوستان سے نقلِ مکانی کرنے والے مہاجرین میں درویشانِ قادیان کے اہل وعیال اور وہ احمدی بیوائیں اور لاوارث عورتیں بھی شامل تھیں جن کے سہاگ ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے دوران اجڑ گئے تھے اور وہ اس قابل نہ رہی تھیں کہ بالکل نئے ماحول میں اپنے ذاتی وسائل سے عملی زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کر سکیں۔ حضرت مصلح موعود نے ایسے خاندانوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر ربوہ میں ایک محفوظ قیام گاہ تعمیر کروائی جسے ''دارالخواتین'' کا نام دیا گیا تاہم عرفِ عام میں اسے ''احاطہ'' کہا جاتا تھا۔

''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' میں دارالخواتین کے قیام کا پس منظر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''حضرت مصلح موعود کے زیرِ سایہ کم وبیش دوصد مستورات اور بچے رتن باغ لاہور کی مختلف عمارتوں میں اکتوبر ۱۹۴۷ء سے اپریل ۱۹۴۹ء تک مقیم رہے۔ ان میں زیادہ تر درویشانِ قادیان...... کے اہل وعیال تھے اور کچھ بے سہارا اور معذور مستورات تھیں۔

حضور نے اپریل ۱۹۴۹ء کے جلسہ سالانہ کے موقع پر ان سب کو ربوہ منتقل کرنے کا فیصلہ فرمایا...... روانگی سے ایک ہفتہ پہلے سب کو اس فیصلہ سے مطلع کر دیا گیا، لسٹیں تیار کی گئیں اور تیار رہنے کی ہدایت کی گئی۔

...... بارہ اپریل ۱۹۴۹ء کو روانگی تھی۔ اس دن دوپہر کے وقت سب مستورات اپنے بچوں اور سامان سمیت رتن باغ کے بڑے گیٹ کی طرف باغ میں جمع ہو گئیں۔ عاجزہ (یعنی مرتب تاریخ لجنہ اماء اللہ۔ ناقل) فہرست کے مطابق نام پڑھتی جاتی تھی اور مکرم میر داؤد احمد صاحب جو کہ امیر قافلہ تھے کی نگرانی میں خدام انہیں تانگوں میں سوار کرا کے سٹیشن کو روانہ کر دیتے تھے جب کہ حضور اوپر برآمدہ میں کھڑے ہو کر عمومی نگرانی فرما رہے تھے۔ سٹیشن پر بھی خدام انہیں سوار کرانے اور ان کی ہر ممکن مدد کے لیے موجود تھے۔ گاڑی کی تین بوگیوں میں جو ریزرو تھیں انہیں سوار کرایا گیا۔ حضرت سیدہ ام داؤد صاحبہ باوجود کمزور صحت کے ریل کے ذریعہ مستورات کے ہمراہ ہی تشریف لائیں۔ جب گاڑی ربوہ پہنچی تو رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ حضرت مصلح موعود جنہوں نے رتن باغ میں ہمیں الوداع کیا تھا بنفسِ نفیس سٹیشن پر موجود تھے۔ حضور لاہور سے بذریعہ کار ہماری آمد سے پہلے ربوہ پہنچ گئے تھے۔ حضرت سیدہ ام داؤد صاحبہ بھی موجود تھیں۔ ایک لائن میں خدام کھڑے تھے جنہوں نے سب مستورات کا سامان اتارا۔ مستورات کی فہرست (جو میرے پاس تھی) کے مطابق حضور ایک ایک عورت کا نام خود دریافت فرماتے۔ دو خدام سامان اٹھانے کے لیے اس کے ہمراہ کرتے...... اس طرح حضور نے اپنی ذاتی نگرانی میں احتیاط کے ساتھ سب مستورات اور بچوں کو ان کے سامان کے ساتھ لاہور سے ربوہ منتقل فرمایا۔

...... یہ انتظام ۱۹۵۴ء تک قائم رہا جب تک کہ پختہ مکان تعمیر ہو کر ان کو ان میں منتقل نہ کر دیا گیا اور کچھ نے

اپنے مکان بنوا لیے اور وہ ان میں چلی گئیں۔ اس میں رہنے والی خواتین کے لیے کام بھی مہیا کیا گیا تھا تا وہ بے کار نہ رہیں چنانچہ چرخے اور روئی منگوا کر دی گئی اور اس کا منافع شعبہ حفاظت مرکز میں دیا جاتا تھا۔''

ربوہ کی باقی عمارات کی طرح یہ ایک کچی عمارت تھی جو نصرت گرلز ہائی سکول سے ملحق یا بہت قریب تھی۔ میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔ ممکن ہے میں کسی ضرورت کے تحت ایک یا دو بار احاطے کے اندر بھی گیا ہوں تاہم میرے ذہن میں اب اس کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے پچھلے دنوں میرا رابطہ مسز شمس النساء خواجہ سے ہو گیا جو خواجہ برکت اللہ کی اہلیہ ہیں اور ۱۹۸۷ء سے اپنے پورے خاندان کے ساتھ پاکستان سے کینیڈا منتقل ہو چکی ہیں۔ وہ دفتر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کی انچارج، سراج بی بی (جنہیں عام طور پر سراج بی کہا جاتا تھا) کی صاحبزادی ہیں۔ سراج بی کے شوہر محمد عبداللہ برٹش آرمی میں سپاہی تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران انہوں نے برما کے محاذ پر جام شہادت نوش کیا۔ اُس وقت مسز شمس النساء خواجہ کی عمر صرف دو ڈھائی سال تھی۔ سراج بی نے اس بچی کو ہمیشہ اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھا اور اس کی پرورش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تاہم ابھی وہ بیوگی کے صدمہ سے ہی نہ سنبھل پائی تھیں کہ تقسیم ہندوستان کے نتیجہ میں اُن کے لیے نہ ختم ہونے والی مشکلات کا ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا۔ لاہور میں قیام کے دوان سراج بی جماعت احمدیہ کے باقی اراکین کی طرح رتن باغ میں رہیں اور جب ربوہ کی بنیاد رکھی گئی تو وہ احاطے میں منتقل ہو گئیں اور کچھ عرصہ یہیں رہیں۔

میں نے مسز شمس النساء خواجہ سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے احاطے کی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔ انہوں نے میری اس درخواست کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور ایک مختصر سا نوٹ لکھ کر بھیجا ہے جو اس امید کے ساتھ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے کہ وہ نہ صرف اس سے لطف اندوز ہوں گے بلکہ ان مشکلات کا بھی کچھ اندازہ لگا سکیں گے جن سے ربوہ کے ابتدائی آبادکاروں کو سابقہ پڑا۔ موصوفہ لکھتی ہیں:

''لاہور سے ربوہ آکر پہلے پہل ہمیں جس جگہ رہنے کا موقع ملا اُسے عرفِ عام میں ''احاطہ'' کہا جاتا تھا۔ یہ ایک وسیع وعریض احاطہ تھا جس کے اندر کچے گھر تعمیر کئے گئے تھے۔ احاطہ غالباً چوبیس گھروں پر مشتمل تھا۔ بارہ گھر ایک طرف تھے اور بارہ ہی دوسری طرف۔ درمیان میں کھلی جگہ تھی جس کے وسط میں ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ احاطے میں داخل ہونے اور وہاں سے باہر نکلنے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا جس کے بالمقابل، صحن کے دوسرے کونے میں بیت الخلاء تھے۔ احاطے میں بعض گھر دو کمروں پر بھی مشتمل تھے تاہم زیادہ تر گھر ایک کمرہ والے تھے۔ ہر گھر میں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی موجود تھا۔

میری اپنی یادداشت کے مطابق احاطے میں مقیم خاندانوں میں سے ایک عبدالرحیم درویش کا خاندان تھا جس کے افراد کی تعداد احاطہ میں آباد سب خاندانوں کے افراد سے زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو ایک بڑا گھر دیا گیا تھا جس میں آٹھ افراد رہا کرتے تھے۔ ان کے سامنے ''آپا لیلیٰ'' اپنے تین بچوں کے ساتھ مقیم تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا۔ بیٹے کا نام مُودی تھا جو تھا تو گونگا اور بہرا لیکن تھا بہت ہوشیار۔ آپا لیلیٰ بہت سلجھی ہوئی اور نفیس طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ بعد میں فیکٹری ایریا میں اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گئی تھیں۔

اس عمارت میں زیادہ تر بیوائیں ہی مقیم تھیں لیکن آہستہ آہستہ یہاں بعض ایسے خاندان بھی رہائش پذیر ہوگئے تھے جن کے مردسربراہ موجود تھے۔ جب یہ مرد اپنے گھروں میں آنا چاہتے تو احاطہ کے تمام مکینان کو بہ آواز بلند مطلع کیا جاتا کہ فلاں مرد اندر آنا چاہتا ہے لہٰذا خواتین پردہ کرلیں۔

احاطہ میں رہنے والی خواتین کی پچھلی زندگی شدید مشکلات میں گذری تھیں۔ان مشکلات نے ان کی طبائع کو خاصا متاثر کیا تھا چنانچہ ان میں سے بعض بے حد چڑچڑی ہو چکی تھیں، ان کو بہت جلد غصہ آجاتا اور بعض بات بے بات پر لڑائی جھگڑے کے لیے تیار ہو جاتیں۔ان خواتین میں ''ماسی سکینہ'' ''مائی پونچھ والی'' اور ''استانی برکت'' شامل تھیں۔ میں بچی تھی اور ان سب سے بہت ڈرتی تھیں خاص طور پر ماسی سکینہ سے جنہیں میری دو چوٹیاں بالکل نہ بھاتی تھیں۔ایک بار انہوں نے مجھے پکڑ کر زبردستی میرے بالوں کی مینڈھیاں بنا کر ایک سخت سی چوٹی کردی۔ یہ چوٹی اتنی سخت تھی کہ میں درد سے بلبلا اٹھی اور بے طرح رونے لگی۔امی کو پتا چلا تو انہوں نے فوراً میرے بال کھول دیئے اور معمول کے مطابق دو چوٹیاں بنا دیں۔ اُستانی برکت اپنی طبیعت کی سختی کے باوجود ایک بزرگ خاتون تھیں۔وہ بچوں کو قاعدہ یسرنا القرآن اور قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔وہ سبق یاد کرکے آنے والے طالب علموں کو پسند کرتیں لیکن نالائق طلبہ کی ٹھکائی سے بھی نہ چوکتیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ احاطہ میں مقیم تمام خواتین سخت مزاج تھیں۔یقین کریں یہاں بہت پیار کرنے والی ہستیاں بھی مقیم تھیں۔اس حوالے سے میں سب سے پہلے ''ماسی جی سائرہ'' کا ذکر کروں گی جو میرے مرحوم شوہر کی والدہ کی خالہ تھیں۔نہایت مدبّر، خاموش اور اپنے کام سے کام رکھنے والی ہستی تھیں۔ان کے ایک بیٹے کا نام یوسف تھا۔ وہ مجھے پیار سے ''ہماری تاج'' کہتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ایک بہن جس کا نام ممتاز تھا بچپن ہی میں وفات پا گئی تھی۔وہ اسے تصوّر میں لاکر مجھے ''تاج'' کہہ کر بلاتے اور پیار کرتے تھے۔

ایک اور بے حد نفیس فیملی ماں اور دو بیٹیوں پر مشتمل تھی۔باقی لوگوں کے نام تو مجھے یاد نہیں رہے لیکن ایک بیٹی کا نام سلمیٰ تھا۔ بہت خوبصورت، گورا چٹا، مسکراتا ہوا چہرہ۔اس کی والدہ میری اُمی کی ہم عمر ہوں گی۔اُمی کے ان کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ مجھے ان سے بھی بہت پیار ملتا تھا۔وہ جب بھی چاول کی کھیر بناتیں میرے لیے ضرور لے کر آتیں۔

لجنہ اماء اللہ کی عہدیداران صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے وقتاً فوقتاً احاطہ کا دورہ کرتی رہتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار اُمِ داؤد تشریف لائیں اور میرے سر پر بھی دستِ شفقت رکھا۔پھر انہوں نے مجھے سورۃ فاتحہ سنانے کو کہا۔اُس وقت تک اُمّی مجھے نماز یاد کرا چکی تھیں چنانچہ میں نے سورۃ فاتحہ فرفر سنا دی۔اُمِ داؤد میری زبان سے سورۃ فاتحہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور مجھے انعام سے نوازا۔

شروع شروع میں پورے احاطہ کے لیے کھانا لنگر خانہ سے آتا تھا۔ بعد میں جب حالات قدرے معمول پر آگئے تو احاطے کے مکینان اپنا اپنا کھانا خود تیار کرنے لگے۔

احاطے کے مکینان میں اختلاف کی یوں تو کوئی وجہ نہ تھی تاہم دو مواقع پر ان کے درمیان اکثر لڑائی یا کم از کم ناراضگی ہو جایا کرتی تھی۔ جب کھانا لنگر سے آیا کرتا تھا تو کھانے کی تقسیم کے دوران بالعموم جھگڑا ہو جاتا۔کسی کو کھانا

تقسیم کرنے والے کے رویّہ سے کوئی شکایت ہوتی تو کسی کو اس بات پر ناراضی کہ بعد میں آنے والوں کو اس سے پہلے کھانا کیوں دے دیا گیا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سالن میں آلوؤں اور بوٹیوں کی تعداد بھی وجہ نزاع بن جاتی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے احاطے کے اندر چوبیس گھرانوں کے لیے صرف ایک نلکا موجود تھا۔ یوں یہ نلکا کبھی فارغ نہ ملتا۔ مکینان احاطہ کے لیے یہاں سے پانی حاصل کرنے میں عملاً بہت دشواریاں حائل تھیں لہٰذا بالعموم باری پر جھگڑا ہو جاتا۔ کبھی نلکا خراب ہو جاتا تو پانی کی کمی طبائع میں ہیجان پیدا کر دیتی اور آپس میں جھگڑے شروع ہو جاتے۔ کبھی کبھار نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتی۔

ہمارا گھر احاطے کے عین وسط میں تھا۔ اُمی کا زیادہ وقت دفتر میں گذرتا۔ بعض اوقات وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتی تھیں لیکن بالعموم میں اپنی نانی اماں کے پاس رہتی تھی۔ وہی میرے کھانے پینے اور ہر طرح کی ضروریات کا خیال رکھتیں۔ ہم لوگ اپنی طبائع کی وجہ سے احاطہ کے جھگڑوں سے کوسوں دُور رہتے تھے۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ ہم احاطہ میں ہم کتنی دیر تک رہے تاہم جب لجنہ کی کارکنات کے لیے پکے کوارٹرز تعمیر ہو گئے تو ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ شروع شروع میں یہ تبدیلی مجھ پر بے حد گراں گذری۔ احاطہ کی رونق مجھے بہت یاد آتی تھی لیکن گذرتے وقت کے ساتھ ہم نئی جگہ سے مانوس ہوتے چلے گئے۔ یہ نئی جگہ تین کوارٹرز اور دفتر لجنہ کی خوبصورت عمارت تھی جو پتھر سے بنی ایک مضبوط چار دیواری کے اندر تھی۔ جب تک احاطہ قائم رہا میں اور اُمی وہاں بکثرت جاتے رہے کیونکہ اس کے ساتھ ہماری اچھی یادیں وابستہ تھیں تاہم پھر نہ احاطہ رہا نہ وہ لوگ اور یہ سب کچھ قصہ ماضی بن گیا۔"

یہ تو تھا مسز شمس النساء خواجہ کا بیان۔ ڈاکٹر امتہ السمیع بنت استانی امتہ العزیز، سابق ہیڈ مسٹریس، نصرت گرلز ہائی سکول، ربوہ حال مقیم آسٹریلیا بتاتی ہیں کہ جب وہ سکول میں پڑھا کرتی تھیں تو چھٹی کے بعد شدید گرمی سے بچنے کی خاطر اپنے گھر جانے کی بجائے احاطہ میں مقیم اپنی والدہ کی ایک خالہ المعروف "خالہ بٹالے والی" کے کمرے میں چلی جاتیں اور دو پہر وہیں گذارتیں۔ وہ لنچ بھی وہیں کرتیں اور شام ڈھلے گھر واپس جاتیں۔ اُن کے بیان کے مطابق خالہ بٹالے والی ان سے بہت محبت کرتیں۔ اسی طرح احاطہ میں مقیم بعض دیگر خواتین جن میں سراج بی، حضرت مائی کاکو، مائی حمیدہ اور لیلیٰ شامل تھیں ان سے بہت شفقت کرتیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر امتہ السمیع کا دل وہاں خوب لگتا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب میں پرائمری سکول میں پڑھا کرتا تھا لیکن کیا آپ کو پتا ہے کہ تعلیم الاسلام پرائمری سکول کے قیام سے پہلے چھوٹے بچے نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھا کرتے تھے اور میں نے بھی پکی جماعت یہیں سے پاس کی تھی۔

یہ اخلاق و سیرت کی نوعمر کھیتی، یہ تہذیب و تعلیم کا آستانہ

یہ ۱۹۵۱ء کا کوئی دن تھا۔ میری عمر ساڑھے چھ اور سات سال کے درمیان تھی جب مجھے سکول میں داخل کیا گیا۔ اُس وقت تک تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں تھا لیکن بہت چھوٹے بچوں کے لیے ربوہ سے روزانہ وہاں جانا اُن کے اور ان کے والدین کے لیے کئی طرح کی مشکلات پیدا کر سکتا تھا لہٰذا پانچویں جماعت تک نصرت گرلز ہائی سکول ربوہ میں کو ایجوکیشن رائج تھی۔ میں نے بھی اپنی تعلیم کا آغاز اسی سکول سے کیا اور پہلی جماعت (جسے اس زمانے میں ''پکّی'' کہتے تھے) کا امتحان یہیں سے پاس کیا۔

مجھے وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے جب میں امی کے ساتھ اس سکول میں داخلے کے لیے گیا تھا۔ امی نے سفید رنگ کا شٹل کاک برقع پہن رکھا تھا اور میں ہاتھوں میں بستہ اُٹھائے اُن کے ساتھ تیز تیز چلتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ سکول کی عمارت ریلوے سٹیشن سے زیادہ دُور نہ تھی اور خام اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے طالبات اور طلبہ کے لیے سکول کے اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے دو راستے تھے۔ ایک دروازہ ریلوے لائن کے بالمقابل کھلتا تھا اور دوسرا غالباً موجودہ دارالضیافت کے عقب میں تقریباً اس جگہ کھلتا جہاں آج کل کچھ مسیحی خاندان آباد ہیں۔ طالبات اور طلبہ آمد و رفت کے لیے اپنی اپنی سہولت کے مطابق ان میں سے کوئی بھی دروازہ استعمال کر سکتے تھے۔

یہ تو ہیں وہ باتیں جو میرے اپنے مشاہدے کے مطابق آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں لیکن ۲۴ مئی ۱۹۴۹ء کے الفضل میں سکول کی ہیڈ مسٹریس کی طرف سے ''مادرِ علم اولڈ گرلز ایسوسی ایشن کا قیام'' کے عنوان سے شائع ہونے والے ایک اعلان سے پتا چلتا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اپنا وہ مکان جس میں آپ جلسہ سالانہ ۱۹۴۹ء کے دوران فروکش رہے تھے اور جس کے ساتھ ایک وسیع پردہ دار احاطہ بھی تھا نصرت گرلز ہائی سکول کے لیے مرحمت فرما دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ اس احاطہ کے ساتھ بارہ رہائشی کوارٹرز تعمیر کئے جائیں۔ یاد رہے کہ وہ گلی جو اِن کوارٹروں کی تعمیر کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئی بعد میں ''استانیوں والی گلی'' کے نام سے معروف ہوئی۔

اس سکول کی ہیڈ مسٹریس استانی امتہ الرحمٰن عمر تھیں جو جماعت کے مشہور بزرگ اور قرآنِ کریم کے انگریزی مترجم، حضرت مولوی شیر علی کی صاحبزادی، میاں عبدالمنان عمر کی اہلیہ اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی بہو تھیں۔ امی مجھے ان کے پاس لے گئیں۔

مجھے یاد نہیں کہ سکول میں داخلے کے لیے میرا کوئی ٹیسٹ ہوا ہو البتہ یہ بات یقینی ہے کہ امی نے داخلہ فارم

اور مقررہ ٹیوشن فیس جمع کرائی ہوگی جس کے بعد ہی مجھے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت ملی ہوگی۔ امی نے خود ہی مجھے کلاس روم تک پہنچایا اور کلاس ٹیچر کے سپرد کر کے گھر واپس چلی گئیں۔ بعد میں پتا چلا کہ ہماری کلاس ٹیچر کا نام ''مومنہ'' ہے اور وہ انجمن کوارٹرز ہی میں مقیم حضرت مسیح موعود کے ایک رفیق، حضرت خدا بخش المعروف مومن جی کی صاحبزادی ہیں۔ وہ طلبہ اور طالبات کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتیں۔ مار پیٹ تو بہت دُور کی بات ہے مجھے تو ان کی ڈانٹ ڈپٹ کا بھی کوئی واقعہ یاد نہیں ہے۔

اس سطح پر کلاس ٹیچر کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو پیار کے ساتھ سکول کے ماحول میں رچانے کی کوشش کرے، کلاس روم میں نظم وضبط قائم رکھے، غیر ضروری شور شرابہ نہ ہونے دے اور کسی بچے کو بلا جواز کلاس روم سے باہر نہ نکلنے دے اور آج میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ استانی مومنہ یہ ذمہ داری بطریق احسن ادا کرتی تھیں۔ انہوں نے ہمیں بعض بنیادی آداب سکھانے کے علاوہ ہندسوں اور حروف تہجی کی پہچان کرائی۔ ہماری کل کائنات ایک تختی، سرکنڈے کی چند قلمیں، سیاہی کی ایک دوات، پتھر کی سلیٹ اور اردو کا قاعدہ تھا۔ انہوں نے ہمیں ان چیزوں کا استعمال سکھایا۔ بعض بچے واش روم جاتے تو اپنا ازار بند بھی خود نہ باندھ سکتے۔ استانی مومنہ ان کا یہ کام بھی ناک بھوں چڑھائے بغیر سرانجام دیتیں۔

موصوفہ ۱۹۳۲ء میں قادیان میں پیدا ہوئیں۔ جب ان کی والدہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے نومولودہ کا نام رکھنے کی درخواست کی تو حضور نے مومنہ نام رکھا۔ ان کی والدہ فضل بی بی جو امی سے بے حد مخلصانہ تعلق رکھتی تھیں ذکر کیا کرتی تھیں: ''میں نے حضرت صاحب سے کہا کہ اس بچی کا کوئی اور نام تجویز کر دیں تو حضور نے فرمایا: تو پھر کافرہ رکھ لو اور یوں اس کا نام مومنہ ہی رکھا گیا۔''

استانی مومنہ نے جے وی کے بعد نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھانا شروع کر دیا جہاں ان کی بڑی بہن امتہ الرحمٰن طیبہ پہلے سے پڑھا رہی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ان کی شادی شعبان احمد نسیم نامی ایک نوجوان سے ہوگئی جو لاہور میں محکمہ انہار میں سکیلر تھے لیکن یہ شادی انہیں راس نہ آئی۔ وہ پہلی ہی بچی کی پیدائش پر کسی پیچیدگی کا شکار ہوگئیں جو ۲۱ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ان کی اچانک وفات پر منتج ہوئی۔ ان کی وفات ان کے بھائی عبدالشکور اسلم (جو بعد میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں لیکچرر رہے) کے گھر پر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ ان سے یہ افسوسناک یاد تازہ کرنے کو کہا جائے تو وہ جواب دیتے ہیں: ''میں ان دنوں لاہور میں بی ایس سی کا سٹوڈنٹ تھا اور شام نگر، چوبرجی میں رہائش پذیر تھا۔ بچی کی پیدائش ہسپتال میں ہوئی جس کے بعد وہ بغرض آرام میرے پاس ٹھہری ہوئی تھیں۔ ایک دن جب بچی قریباً ایک ماہ کی ہو چکی تھی وہ کسی کام سے اوپر والی منزل پر گئیں۔ نیچے اُتر رہی تھیں کہ سیڑھیوں سے گر کر موقع پر ہی وفات پا گئیں تاہم ان کی وفات کا سبب سیڑھیوں سے گرنے والی چوٹ نہ تھی بلکہ وائٹ لیگ نامی ایک بیماری بتائی جاتی تھی جو پیدائش میں پیچیدگی کے سبب بعض خواتین کو ہو جاتی ہے۔''

عبدالشکور اسلم کا بیان ہے کہ ''ہم سب گھر میں انہیں بی بی کہتے تھے۔ وہ ہم بہن بھائیوں میں سب سے خوبصورت اور نہایت ہی خوش مزاج اور چلبلی طبیعت کی مالک تھیں۔ شرارتیں بہت کرتی تھیں اور کئی دفعہ میری

اور ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی ہو جاتی تھی لیکن وہ صلح کرنے میں بھی دیر نہ لگاتیں۔ وہ بچوں کو بہت پیار سے پڑھاتی تھیں اور جب سکول سے واپس آتیں تو گھر میں بھی ان کی شرارتوں اور معصومانہ حرکتوں ہی کی باتیں کرتی رہتیں جن سے پتا چلتا ہے کہ بچے ان کے ساتھ بہت مانوس تھے۔'' عبدالشکور اسلم کو مزید کریدا جائے تو وہ بے تکلفی سے جواب دیتے ہیں: ''پچپن سال پرانی باتیں اب پورے طور پر یاد نہیں رہیں لیکن ان کی خوش گفتاری ابھی تک ذہن پر نقش ہے۔ وہ کھانا بھی بہت مزیدار بناتی تھیں۔ انہوں نے چھوٹی عمر میں وصیت کرنے کی توفیق پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئیں۔''

میں ان کی قبر پر کئی بار حاضری دے چکا ہوں جہاں نصب یہ کتبہ ان کے قریبی رشتہ داروں اور شاگردوں کو ان کے لیے دعائے مغفرت کی تحریک دلاتا رہتا ہے:

مزار

استانی مومنہ تنویر صاحبہ زوجہ شعبان احمد صاحب نسیم

لاہور

ولادت: ۱۹۳۲ء پیدائشی احمدی

وفات: ۱۹۵۷-۱۲-۲۱ عمر ۲۵ سال

نمبر وصیت ۱۲۹۲۲

استانی مومنہ یقیناً ایک قابل ٹیچر تھیں کیوں کہ انہوں نے مجھ ایسے بے شمار طلبہ و طالبات میں حصولِ علم کی لگن پیدا کی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں ان کے کسی طرزِ عمل کے باعث اس وقت پڑھائی سے متنفر ہو جاتا تو کیا میں آگے بڑھ سکتا تھا اور ترقی کی وہ منازل حاصل کر سکتا تھا جو بعد میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا مقدر بنیں۔

طلبہ کے بیٹھنے کے لیے کلاس روم میں لکڑی کے لمبے لمبے تختے تھے جو خاص اس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے۔ اِن تختوں کی چوڑائی بمشکل دو فٹ ہوگی اور لمبائی چھ فٹ کے لگ بھگ۔ کلاس روم میں کچھ تختے لڑکوں کے لیے مخصوص تھے تو باقی لڑکیوں کے لیے۔ ہم بھی آلتی پالتی مار کر اس تختے پر بیٹھ جاتے اور بستہ سامنے رکھ لیتے۔

ربوہ کے ماحول کے زیر اثر کلاس کے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے دور دور رہتیں۔ اگر چہ اس وقت ہمیں اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے ناموں کا علم تھا اور یوں بھی ان میں سے کئی انجمن کوارٹرز میں مقیم صدر انجمن احمدیہ کے کارکنان کی بیٹیاں تھیں لیکن پکّی جماعت کے امتحان کے بعد ہمارے راستے بالکل جدا ہو گئے۔ یہ لڑکیاں بدستور نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھتی رہیں جب کہ ہم تعلیم الاسلام پرائمری سکول کے درجہ دوم میں منتقل ہو گئے لہٰذا بعد میں ان سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رہا اور نہ مجھے ذاتی طور پر ان میں سے دو کے سوا کسی کا نام یاد ہے۔

میری خواہش تھی کہ مجھے نصرت گرلز ہائی سکول کا اس زمانے کا رجسٹر داخل خارج یا پکّی جماعت کا اُس سال کا حاضری رجسٹر مل جاتا تو اپنے ہم جماعتوں کی فہرست تیار کرنا بہت آسان ہو جاتا لیکن سکول کی موجودہ

ہیڈ مسٹریس مسز ثمینہ رفیع کے تمام تر تعاون کے باوجود یہ رجسٹر تلاش نہیں کیے جا سکے۔ اپنی یادداشت پر زور دیتا ہوں تو صرف چھ لڑکوں کے نام میرے ذہن میں آتے ہیں جو میرے ساتھ اس سکول میں پڑھتے رہے تھے۔ ان میں سے ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری (جو ایک زمانے میں صادق تخلص کرتے تھے)، قاضی مبارک احمد، عزیز اللہ، فہیم احمد، عبدالعلی اور محمد یوسف شامل ہیں۔

ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری میرے ان معدودے چند ہم جماعتوں میں سے ہیں جن کے ساتھ پہلی جماعت میں قائم ہونے والا تعلقِ محبت و اخوت آج تک قائم ہے اور وہ کہیں بھی ہوں ان سے رابطہ رہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کالج پہنچ کر وہ سائنس پڑھنے لگ گئے اور میں نے عربی فارسی پڑھنے میں وقت گزار دیا لیکن ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہی۔ ایک روز پتا چلا کہ جاپان جا رہے ہیں۔ اس زمانے میں ہمارے ملک کے زیادہ تر لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے مغرب کی طرف رجوع کرتے تھے لیکن ان کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ میں ابھی ان کے اس فیصلے کے حسن و قبح پر غور کر ہی رہا تھا کہ وہ پی ایچ ڈی کر کے پاکستان واپس پہنچ گئے۔ ۱۹۷۶ء میں جب میں گوجرانوالہ میں تعینات تھا اور ایک ہنگامی ڈیوٹی پر علی پور چٹھہ گیا ہوا تھا وہ اچانک بازار میں نظر آ گئے۔ پتا چلا کہ اب وہ ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں اور پاکستان میں سیٹل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سچی بات ہے انہوں نے کوشش کی بھی بہت بلکہ ایک بار تو میں خود انہیں لاہور گوجرانوالہ روڈ پر واقع اتحاد کیمیکلز کے صدر دروازے پر اتار کر آیا تھا جہاں ملازمت کے سلسلے میں ان کا انٹرویو تھا تاہم ان کی پاکستان میں رہنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور وہ بالآخر امریکہ چلے گئے جہاں ان کے ایک بھائی، مجیب اللہ پہلے سے مقیم تھے۔

مجھے اپنے سفرِ امریکہ کے دوران موصوف کی میزبانی کا شرف بھی حاصل رہا۔ جب میں لاس اینجلس سے نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اُترا تو وہ وائن لینڈ سے ایک طویل سفر کے بعد میرے استقبال کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس دو یا شاید تین راتیں رُکا۔ اس دوران انہوں نے مجھے وِلنگ بورو میں ایک جماعتی تقریب جس کے مہمانِ خصوصی ایک امریکی کانگریس مین، جیمز سیکسٹن تھے میں شمولیت کا موقع فراہم کیا؛ اٹلانٹک سٹی دکھا دیا؛ اپنے بھائی حافظ سمیع اللہ کو ساتھ بھجوا کر فلاڈلفیا کی سیر کرا دی اور پھر وائن لینڈ سے ٹورانٹو تک سفر کے لیے گرے ہاؤنڈ کی بکنگ بھی کرا دی۔ امریکہ جیسے مصروف ملک میں کوئی کسی کے لیے اتنا بھی کر دے تو بہت سمجھا جاتا ہے اور ہم مشرقی لوگوں کی وضعداری دیکھیے کہ اس دن سے صفی اور ان کی بیگم کے گن گا رہے ہیں۔

اس ملاقات کے دوران صفی نے بار بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ امریکیوں کی طرح ہم بھی سکول اور کالج میں ایک ساتھ پڑھنے والوں کی ری یونین کیا کریں اور اس سلسلے میں وہ میرے تعاون کے طلب گار تھے۔ میں نے پاکستان واپس آ کر بمشکل تمام ۱۹۶۱ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک پاس کرنے والوں کی ایک فہرست حاصل کی اور ان میں سے بہت سے طلبہ کو تلاش بھی کر لیا لیکن یہاں کے ماحول کے عین مطابق ان میں سے بہت سے طلبہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس ری یونین کے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے اور میرے جواب پر وہ

اس میں شامل ہونے کے خیال سے ہی کنی کترا جاتے۔ غرض یہ پروگرام دھرے کا دھرارہ گیا تاہم میرا خیال ہے پروفیسر حمید احمد چوہدری کی کوششوں کے نتیجے میں جرمنی میں قائم ہونے والی تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن اوراس کے اتباع میں دنیا کے مختلف ممالک میں اس کی شاخوں کے قیام سے یہ مقصد کسی حد تک پورا ہوگیا ہے۔ میرے علم کے مطابق صفی بھی اس ایسوسی ایشن کے یوایس چیپٹر کے ایک سرگرم رُکن ہیں۔

جب صفی سے بات ہو کہ ان کا ترکِ وطن کا فیصلہ کیسا رہا تو وہ خوشی سے کہتے ہیں: ''ایک دم اچھا۔ مجھے امریکہ کے کئی معروف دواساز اداروں میں کام کا موقع ملا۔ نام کس کس کا لُوں لیکن میں نے ان اداروں کے ہر ہر شعبے میں کام کیا ہے اور خدا کے فضل سے کوالٹی ایشوُرنس کا تو خاص تجربہ ہے۔''

غیر ممالک میں آباد ہونے والے ہمارے بہت سے دیگر دوستوں کے برعکس صفی کا پاکستان آنا جانا رہتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ان کے والدین میں سے کوئی بھی امریکہ منتقل نہیں ہوا۔ ان کے والد چوہدری عطاء اللہ وڑائچ جو سلسلہ کے پرانے اور وفا شعار خدام میں سے تھے تحریک جدید کے ملازم تھے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وکالت مال میں کام کر رہے تھے۔ وہ اوران کی اہلیہ، رضیہ بیگم دونوں صفی اور باقی بچوں کی دعوت پر دوبار امریکہ تو گئے لیکن ان کی خواہش کے باوجود وہاں ڈیرا ڈالنے کی بجائے پاکستان میں قیام ہی کو ترجیح دی۔ اب چوہدری عطاء اللہ کی وفات پر کئی سال بیت چکے ہیں لیکن صفی کی والدہ جو حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت حافظ غلام رسول وزیر آبادی کی صاحبزادی ہیں ماشاء اللہ حیات ہیں اور ربوہ کے محلہ ناصر آباد میں مقیم ہیں۔ صفی ان سے ملاقات کے لیے پاکستان آتے رہتے ہیں۔ اس بہانے ان کا ہم ایسے دوستوں سے بھی رابطہ برقرار رہتا ہے۔

اپنی ساری عملی زندگی امریکہ میں گزارنے کے باوجود ان میں کچھ نہ کچھ وضعداری ابھی تک قائم ہے۔ سال دوسال پہلے پاکستان آئے تو معلوم ہوا کہ اپنے بیٹے کی شادی کر رہے ہیں اور وہ بھی اپنے مرحوم بھائی رضی اللہ کی بیٹی کے ساتھ۔ مجھے خوشی ہوئی کہ صفی کے بیٹے نے اپنے لیے کسی نیلی آنکھوں والی حسینہ پر اپنے خاندان کی اس لڑکی کو ترجیح دی ہے۔ رشک صفی پر بھی آیا جن کی اولاد پران کی تربیت کی چھاپ دیکھی جاسکتی ہے۔

قاضی مبارک احمد جو صفی کے خالہ زاد بھی ہیں صدر انجمن احمدیہ کے ایک کارکن قاضی عبدالوحید کے بیٹے اور ہماری طرح انجمن کوارٹرز ہی میں مقیم تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ان کے والدِ بزرگوار نے اپنی علالت کی وجہ سے صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے فراغت حاصل کرلی اور وہ کوارٹر خالی کر کے کسی اور جگہ منتقل ہو گئے تاہم مبارک نے پڑھائی جاری رکھی اور نصرت گرلز ہائی سکول کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول بلکہ تعلیم الاسلام کالج میں بھی کچھ عرصہ ہمارا ساتھ رہا۔ یاد رہے کہ مبارک کی والدہ جو مس عطیہ کے نام سے معروف تھیں کئی سال تک فضلِ عمر کنڈرگارٹن میں پڑھاتی رہی ہیں۔

بچپن ہی سے مبارک کے سر پر چاندی کے روپے کے برابر ایک داغ ہوا کرتا تھا۔ یہ نشان غالباً کسی پھوڑے کا چھوڑا ہوا تھا۔

انہوں نے ایف ایس سی کی تعلیم کے دوران تعلیم الاسلام کالج چھوڑ کر گورنمنٹ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ راولپنڈی میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا اور تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۶۶ء میں لاہور سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ بعدۂ انہیں راولپنڈی، ڈھرکی اور کراچی میں بعض پاکستانی اور غیر ملکی کمپنیوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے۔ ۱۹۷۰ء میں جب میں پراونشل الیکشن کمشنر، پشاور کے دفتر میں ہوتا تھا ایک جمعہ پر ان کے ساتھ اچانک ملاقات ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ وہ چارسدہ میں کسی غیر ملکی کمپنی کے ساتھ ایک پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں اور اسی حوالے سے پشاور آئے ہیں۔ میرے ایک احمدی رفیق کار، قاضی طاہر احمد اُن کے پھوپھی زاد تھے۔ موقع ملتا تو ہم تینوں کی خوب مجلس رہتی اور کئی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتیں۔

اسی دوران انہیں ایک جرمن کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کا زیادہ کاروبار مشرقی پاکستان میں تھا۔ کمپنی ان کے کام سے مطمئن تھی چنانچہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں وہ ٹریننگ پر جرمنی بھجوا دیئے گئے۔ اسی دوران سقوطِ ڈھاکہ کا دلخراش واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے اس کمپنی کا کاروبار بُری طرح متاثر ہوا چنانچہ کمپنی نے اپنا کراچی آفس بند کر دیا اور انہیں بھی نوکری سے فارغ کر دیا۔ تب مبارک نے جرمنی ہی کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا اور کمپیوٹر پروگرامنگ سیکھ کر کسی مقامی کمپنی میں بطور پروگرام انالسٹ ملازمت شروع کر دی۔ وہ ۱۹۷۴ء میں کینیڈا گئے اور وہاں ملازمت کے امکانات کا جائزہ لیتے رہے۔ اس وقت بعض کمپنیوں نے ان میں دلچسپی لی بلکہ ایک نے تو باقاعدہ طور پر سپانسر کر دیا چنانچہ اگلے ہی سال وہ کینیڈا چلے گئے اور اٹاوہ میں ملازمت شروع کر دی۔ کینیڈا انہیں خوب راس آیا اور وہ ۱۹۷۹ء میں کینیڈا کی سب سے بڑی فون کمپنی "Bell Canada" کے ساتھ ٹورانٹو میں کام کرنے لگے۔ انہوں نے اگلے ستائیس برس اسی کمپنی کے ساتھ گزار دیئے۔ اس دوران انہیں چار سال کے لیے کمپنی کی طرف سے سعودی عرب میں ریاض اور جدّہ میں بعض پروجیکٹس پر کام کرنے کا موقع ملا اور وہ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں پروجیکٹ منیجر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

مبارک کی جماعتی خدمات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ وہ نیشنل سیکرٹری وقفِ نو، صدر جماعت سکاربرو اور صدر جماعت ٹرانٹو رہے ہیں اور بعض دیگر اہم ذمہ داریاں بھی ادا کرتے رہے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: ''خدا کا شکر ہے اس نے میرے ساتھ ہمیشہ محبت اور شفقت کا سلوک فرمایا اور زندگی میں بہتر سے بہتر مواقع عطا کئے۔ مجھے کبھی سفارش کی ضرورت پیش نہیں آئی اور میرے تمام کام میرٹ پر اپنے وقت پر خود بخود ہوتے رہے۔''

میں ۱۹۸۹ء میں اپنے سفر کینیڈا کے دوران مبارک کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکا ہوں اور اس کا تفصیلی ذکر میری کتاب ''شوق ہمسفر میرا'' میں موجود ہے۔ میں امریکی شہر بفلو سے بس کے ذریعہ رات کے تین بجے ٹورانٹو کے بس ٹرمنل پر پہنچا تھا۔ نومبر کا مہینہ تھا اور شدید سردی لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز رات کے اس پہر میرے استقبال کے لیے اڈے پر موجود تھے۔ یہ اخلاص، یہ محبت اور یہ پیار اسی رفاقت کی بدولت تھا جو ہمیں سکول کے زمانے میں پہلے دن سے حاصل رہی تھی۔

اگرچہ میں نے مبارک کے ہاں صرف ایک ہی دن گذارا تھا (کہ میرے بعض اور دوست بھی مجھے شرفِ میز بانی بخشنے کو بے تاب تھے) لیکن یہ دن میری زندگی کا ایک یادگار دن ثابت ہوا۔ میں نے پہلی بار ان ہی کی معیّت میں نیا گرا فال دیکھی تھی جو اُس روز بدقسمتی سے دھند کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نیا گرا فال پارک میں موجود تفریحی سہولتوں سے بھی مبارک ہی کی بدولت لطف اندوز ہوا۔ خدا انہیں ان کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

عزیز اللہ سلسلہ کے دیرینہ خادم حافظ قدرت اللہ کے بیٹے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ پکی جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ انڈونیشیا چلے گئے تھے۔ کئی سال وہاں گزارنے کے بعد پاکستان واپس آئے تو میں چھٹی جماعت میں پہنچ چکا تھا۔ ہمیں پھر دو تین سال ایک ساتھ گزارنے کا موقع ملا جس کے بعد وہ ۱۹۵۹ء کے اواخر میں اپنے والد بزرگوار کے پاس ہالینڈ منتقل ہو گئے۔

وہ دن گیا اور آج کا دن آیا میری ان سے کبھی ملاقات ہوسکی نہ خط و کتابت۔ سچ پوچھیں تو مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ یہ تو اللہ بھلا کرے مبارک کا جس نے بتایا کہ عزیز اللہ کینیڈا میں ہیں۔ میں پچھلی نصف صدی سے ان سے رابطے کا خواہشمند تھا چنانچہ میں نے فوراً ان کا ای میل ایڈریس حاصل کیا۔ سائنسی ترقی نے انسانی رابطوں کو بہت آسان بنا دیا ہے سو عزیز اللہ سے اسی وقت بات ہوگئی۔ خوشی ہوئی کہ یہ چاہت یک طرفہ نہ تھی بلکہ معاملہ

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

والا تھا۔

''میں پاکستان سے گیا تو ہالینڈ تھا لیکن میرے والدین کی خواہش تھی کہ انگریزی زبان کی عالمگیر اہمیت کی وجہ سے میں انگلینڈ میں تعلیم حاصل کروں۔ اللہ نے اس کے اسباب پیدا فرما دیئے اور میں نے ۱۹۶۷ء میں یونیورسٹی آف لنڈن سے مکینیکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کر لی'' انہوں نے مجھے بتایا۔

''یہی وہ سال ہے جب میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا'' میں نے کہا۔

''ہمارا سنِ پیدائش بھی تو ایک ہی ہے، ۱۹۴۴ء''

عزیز اللہ نے اپنی ملازمت کا آغاز انگلش الیکٹرک کمپنی سے کیا اور قریباً سات سال اس کے ساتھ منسلک رہے۔ وہ بعد میں کینیڈا چلے گئے اور ویسٹنگ ہاؤس آف کینیڈا میں ملازمت اختیار کر لی لیکن یہ تو نقطہ آغاز تھا ایک نئی زندگی کا۔ ڈیڑھ سال کے بعد انہوں نے Pratt and Whitney Aircraft Company میں شمولیت اختیار کر لی جہاں انہیں قریباً پینتیس سال کام کرنے کا موقع ملا۔

''لیکن انگلینڈ چھوڑ کر کینیڈا کیوں منتقل ہوئے؟''

''یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ وقت ہے آپ کے پاس یہ سب کچھ سننے کے لیے؟''

''کیوں نہیں اتنے عرصے بعد آپ سے رابطہ ہوا ہے تو میں آپ کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہوں گا۔''

''تو جناب! جب میں نے انگلش الیکٹرک کمپنی جوائن کی تو میری تعیناتی رگبی میں ہوئی۔ کمپنی کی طرف سے میری رہائش کا انتظام دو انگریز لڑکوں کے ساتھ کیا گیا تاہم مجھے ان کے ساتھ رہنے میں ہزار طرح کی دقتیں تھیں۔ اسی دوران میری ملاقات رمیش نامی ایک ہندو لڑکے سے ہوئی جو اسی کمپنی میں کام کر رہا تھا اور کسی مسلمان کے گھر میں کمرہ کرایہ پر لے کر رہ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ گھر میں ایک اور کمرہ خالی ہے اور مشورہ دیا کہ اگر میں اس گھر میں شفٹ ہو جاؤں تو میرے کچھ مسائل فوری طور پر حل ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس تجویز میں کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ طے یہ پایا کہ وہاں منتقل ہو کر ہم اپنا کام بانٹ لیں گے، ہنڈیا میں پکایا کروں گا اور چپاتی وہ بنا دیا کرے گا۔ یوں ہم نے ایک ساتھ رہائش اختیار کر لی اور ہمارے درمیان خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ کبھی کبھی ہمارا مسلمان مالک مکان اور اس کی آئرش بیوی دونوں ہمارے ساتھ آ بیٹھتے اور ہماری خوب گپ شپ رہتی تاہم یہ سلسلہ میری وہاں سے تبدیلی کی وجہ سے جلد ہی منقطع ہو گیا۔ بعد میں رمیش نے منجو نامی ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی جو سکول ٹیچر تھی۔ اسے کینیڈا میں اساتذہ کی ایک کانفرنس میں شمولیت کا دعوت نامہ موصول ہوا تو وہ دونوں وہاں چلے گئے۔ رمیش کینیڈا دیکھ کر بے انتہا متاثر ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اس ملک میں آگے بڑھنے کے مواقع انگلینڈ سے کہیں زیادہ ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں کینیڈا منتقل ہو جائیں۔ کچھ عرصہ بعد رمیش نے مجھے کسی اخبار کا تراشہ بھجوایا جس میں ویسٹنگ ہاؤس کینیڈا کی طرف سے انجینئرز کی کچھ آسامیاں مشتہر کی گئی تھیں۔ میں نے تو اس اشتہار کی کوئی خاص پروانہ کی لیکن اگلے چند روز میں مجھے انگلینڈ میں اس کمپنی کے نمائندے کی طرف سے ایک کال موصول ہوئی جس میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ کیا میں اس کمپنی کے ساتھ ملازمت کے لیے انٹرویو دینا چاہوں گا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ میری طرف سے یہ درخواست رمیش نے بھیجی تھی۔ بہر حال انٹرویو ہوا، مجھے منتخب کر لیا گیا اور میں انگلینڈ سے کینیڈا پہنچ گیا۔''

''اور رمیش؟''

''آپ حیران ہوں گے کہ وہ پچھلے چالیس سال میں ایک بار بھی کینیڈا نہیں آ سکا۔ دراصل اس کے ضعیف العمر والد ہندوستان میں تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا ان سے مزید دور چلا جائے۔ یوں وہ انگلینڈ ہی کا ہو کر رہ گیا۔''

''ویسٹنگ ہاؤس میں کام کا تجربہ کیسا رہا؟''

''بہت اچھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جب مجھے تقرری کا خط ملا تو میں نے اسی وقت انگلش الیکٹرک کمپنی سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور اپریل ۱۹۷۴ء کی ۲۶ تاریخ۔ میں نے ہفتے کے روز اپنا سامان پیک کیا اور اتوار کو سفر کیا۔ جب ٹورانٹو کے ہوائی اڈے پر اترا تو کمپنی کا نمائندہ میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔ الحمدللہ! میں نے اگلے ہی روز اپنی ڈیوٹی جوائن کر لی۔''

''آپ پھر اس کمپنی میں ہی رہے؟''

''بمشکل ڈیڑھ سال۔ میں نے بعد میں Pratt and Whitney Aircraft Company جوائن

کر لی اور ملازمت کا باقی عرصہ وہیں گزارا۔‘‘

انہیں خدا کے فضل سے اپنے مخلص باپ کی طرح جماعت کی طویل خدمات کی توفیق ملی ہے۔ وہ جہاں رہے کسی نہ کسی رنگ میں جماعت کی خدمت بجالاتے رہے۔ آج کل وہ کارن وال جماعت کے صدر ہیں۔

حضرت صاحبزادہ سید عبداللطیف جنہوں نے حضرت مسیح موعود کی حیاتِ مبارکہ کے دوران احمدیت کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے جماعت میں ایک بے مثال مقام حاصل کیا، کے بڑے صاحبزادے، صاحبزادہ ابوالحسن قدسی جامعہ احمدیہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ سادہ وضع کے انسان تھے۔ وہ سر پر لنگی باندھتے تھے اور میں انہیں ہمیشہ پیدل یا سائیکل پر اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھتا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے چنانچہ کیپٹن خادم حسین کی کتاب ’’ربوہ‘‘ میں اس شہر کے شعراء کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں ان کا نامِ نامی بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر منیر الدین احمد نے اپنی کتاب ’’ڈھلتے سائے‘‘ میں ذکر کیا ہے کہ ان کی زیادہ تر شاعری فارسی میں تھی اور جب شہنشاہِ ایران پہلی بار پاکستان آئے تو موصوف کی ایک فارسی استقبالیہ نظم روزنامہ نوائے وقت، لاہور نے اپنے پہلے صفحہ پر شائع کی تھی۔ یہ نظم تو میری نظر سے نہیں گذری البتہ جنوری ۱۹۵۵ء کے الفضل کے کسی شمارے میں ان کی ایک فارسی نظم بعنوان ’’رواں ز تلخی کامم ہزار چشمۂ نوش‘‘ شائع شدہ موجود ہے جسے ذیل میں ان کے نمونہء کلام کے طور پر شاملِ کتاب کیا جارہا ہے:

دلم زتابِ مئے آرزو بود در جوش
ترانہ ہائے من آوردہ بزم را بخروش
نویدِ خضر بردیم درِ بہشت گشود
بگلستانِ تسلی رہم نمود سروش
بچشمِ کم منگر زحمتِ حیاتم را
رواں ز تلخی کامم ہزار چشمۂ نوش
زجوئے شیر کنم شامِ تیرہ را روشن
مرا چہ کار بساقی و بانگِ نوشا نوش
چہ گویم از ستمِ روزگارِ دوں پرور
سپردہ خاتمِ جم را بدیوِ عشوہ فروش
زبزمِ عیش بروں آئے غمگساری کن
ستم کشانِ بلا راگیر در آغوش
بفکرِ راحتِ منزل چرا شوی خرسند
کہ مردِ راہ کشد بارِ دیگراں بر دوش

چوں راز عشق نہاں داشت شد فروزاں شمع
چہ سوزہاست بجانش ولے زباں خاموش
بگیر دامنِ پاکاں کہ کیمیا سازند
بیک نگاہِ ترا باز آورند بہوش

ہماری قدسی صاحب سے علیک سلیک تھی اور اس کا اصل سبب ان کے صاحبزادے فہیم کے ساتھ ہماری دوستی تھی جو پکّی جماعت سے بی اے تک ہمارے ساتھ رہے۔ انگلش لٹریچر ان کا اوڑھنا بچھونا تھا چنانچہ المنار کے انگریزی حصہ کے ایڈیٹر رہے۔ بعد میں انہوں نے ایم اے انگریزی کر لیا اور جب میں نے تعلیم الاسلام کالج، گھٹیالیاں میں لیکچرر شپ کے لیے درخواست دی تو فہیم بھی انٹرویو کے لیے آئے تھے۔ ان کے منتخب نہ ہو سکنے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ بعد میں انہوں نے قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا لیکن پریکٹس کی نوبت نہ آئی کیوں کہ وہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہو گئے تھے۔ پھر وہ لاہور کے کسی کالج میں بھی پڑھاتے رہے مگر ان سے رابطہ قائم نہ رہا۔ معلوم ہوا کہ امریکہ چلے گئے ہیں۔

جب میں امریکہ گیا تو میری خواہش تھی کہ سب پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جائے لیکن مختصر وقت میں ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ فہیم ان دوستوں میں سے تھے جن سے میری ملاقات نہ ہو پائی تاہم بعد میں ان سے ای میل کے ذریعہ رابطہ ہو گیا۔

''آپ کا انگریزی کا ایم اے تو آپ کے خوب کام آیا ہوگا امریکہ میں؟'' میں نے ایک بار ان سے پوچھا۔

''نہیں، مجھے یہاں آ کر بہت محنت کرنا پڑی۔ میں نے امریکہ سے ماسٹر ان بزنس اینڈ پبلک ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی۔ میں نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی اور یونائیٹڈ ایئرلائن میں بھی کام کیا لیکن بہت دنوں سے میں ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ کے فارن سروس انسٹی ٹیوٹ میں لینگویج اینڈ کلچر انسٹرکٹر کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ مزے کا کام ہے اور میں اس میں بہت خوش ہوں۔''

انجمن کوارٹرز ہی کے ایک مکین، عبدالمجید تھے جو آڈیٹر صدر انجمن احمدیہ کے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے، عبدالعلی جو مجھ سے پہلے اس کلاس میں داخل ہو چکے تھے عام طور پر ''عبدی'' کہلاتے تھے۔ ہم میٹرک تک ایک ساتھ رہے جس کے بعد وہ پڑھائی جاری نہ رکھ سکے۔ دراصل ان کی دادی لاہور میں شدید بیمار تھیں اور ان کی تیمارداری کے لیے کسی باہمت نوجوان کی ہمہ وقت ضرورت تھی۔ قرعہ عبدی کے نام پر نکلا اور یوں وہ لاہور چلے گئے۔ وہ کم و بیش چار سال وہاں گزارنے کے بعد ۱۹۶۵ میں تلاشِ معاش کے لیے کراچی منتقل ہو گئے۔ شروع میں چند سال تک وہ جلسہ سالانہ یا بعض دیگر مواقع پر ربوہ میں نظر آ جاتے اور ان سے ملاقات ہو جاتی تھی لیکن ان کے والدِ بزرگوار کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا پورا خاندان کراچی چلا گیا اور ان کا ربوہ آنا جانا تقریباً ختم ہو گیا۔

انہوں نے کراچی میں کئی چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں اور تعلیمی استعداد میں بھی کچھ اضافہ کیا۔ بعد میں سعودی عرب چلے گئے جہاں انہیں مرسیڈیز میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ سات سال جدہ میں رہے اور اس دوران میں چار بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ انہوں نے یورپ کی سیاحت بھی کی لیکن گھریلو ذمہ داریوں نے انہیں وہاں چین سے نہ بیٹھنے دیا اور وہ پاکستان واپس آ کر اپنے بھائیوں کے لیے مناسب روزگار کی فراہمی اور بہنوں کی شادی کی فکر میں لگ گئے۔

سچ پوچھیں تو شاید ۱۹۷۰ء کے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی نہ ان کا کچھ اتا پتا تھا۔ یہ تو اُن کے پھوپھی زاد، قمر کوثر کی مہربانی ہے جن کے توسط سے مجھے عبدی کا فون نمبر ملا اور گفتگو پر یہ ساری باتیں سامنے آئیں۔

''اب آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے ان سے پوچھا۔

''میں نے ہومیو پیتھک پڑھ رکھی ہے لیکن میں عام ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کی طرح ہر چھوٹے موٹے مرض کا علاج نہیں کرتا۔ میں نے بڑی تحقیق کے بعد تین چار ادویہ تیار کی ہیں جو خصوصاً جاں بہ لب مریضوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ میں پچھلے بارہ تیرہ سال سے ایسے مریضوں ہی کی خدمت پر لگا ہوا ہوں۔ لوگ مجھ سے رابطہ کرتے ہیں اور میں خود ان کے پاس جا کر ان کا علاج کرتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے میرے علاج سے مریضوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے اور ان کی تکلیف میں خاطر خواہ کمی ہو جاتی ہے۔''

''آپ کس قسم کے امراض کا علاج کرتے ہیں؟''

''کینسر، ذیابیطس، فالج، لقوہ اور دل، جگر اور گردے کی ایسی تکالیف کا جن کا علاج ان اعضا کے ٹرانسپلانٹ میں بتایا جاتا ہے۔''

عبدی نارتھ ناظم آباد میں رہتے ہیں اور اپنے حالات پر کچھ خوش اور کچھ ناخوش سے نظر آتے ہیں۔

یوسف نام کا ایک شرارتی سالڑکا بھی ہمارا ہم جماعت تھا۔ ایک روز جب بارش ہو رہی تھی وہ آدھی چھٹی کے وقت سکول سے باہر نکل کر جھوٹا لینے کے لیے کسی ٹرک کے پیچھے لٹک گیا لیکن اپنی نوعمری و ناتجربہ کاری کی وجہ سے نیچے گر کر زخمی ہو گیا۔ جب وہ سکول واپس آیا تو اس کی کہنیاں چھلی ہوئی تھیں، پاجامہ پھٹ چکا تھا اور کپڑے کیچڑ سے لت پت تھے۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر سب کو تشویش ہوئی اور معاملہ استانی امتہ الرحمٰن، ہیڈ مسٹریس تک جا پہنچا۔ انہوں نے بطور سزا یوسف کی ٹانگ میں رسی ڈال کر اسے اپنی میز کے ساتھ باندھ دیا۔ شاید یہ سزا ''تابرخواستِ عدالت'' یعنی سکول میں چھٹی ہونے تک کے لیے تھی۔

یوسف بعد میں پڑھائی جاری نہ رکھ سکا اور چوتھی یا پانچویں میں سکول چھوڑ گیا۔ کچھ عرصہ تو ربوہ میں نظر آتا رہا لیکن ایک زمانے سے اسے دیکھا نہ اس کے بارے میں کچھ سنا۔

''لیکن میری یوسف سے ملاقات ہوئی ہے'' مبارک نے حال ہی میں مجھے غیر متوقع طور پر بذریعہ ای میل آگاہ کیا ''بس اسے اتفاق ہی سمجھیں۔ واشنگٹن کے ایک اجتماع میں ان سے تعارف ہوا تو پتا چلا کہ یہ تو وہی یوسف ہیں۔''

مبارک ہی نے مجھے ان کا فون نمبر مہیا کیا اور یوں ایک روز میری ان سے بات ہوگئی۔ اس ماحول کی برکت دیکھئے۔ ہم کم و بیش پچپن سال کے بعد آپس میں بات کر رہے تھے لیکن محسوس یوں یہ ہو رہا تھا گویا ہمارا رابطہ ایک دن کے لیے بھی منقطع نہیں ہوا۔ وہی پرانی باتیں، اسی ماحول کے قصے، ان ہی شخصیات کا ذکر خیر۔

''ہاں! میں نے پکی جماعت نصرت گرلز ہائی سکول سے پاس کی تھی اور استانی مومنہ سے پڑھا تھا'' یوسف نے مجھے بتایا ''میرے والد سکندر خان محنت مزدوری کر کے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ شروع میں تو وہ اینٹیں پاتھا کرتے تھے لیکن پھر انہوں نے کپڑے کی پھیری لگانا شروع کر دی۔ میرا ایک بھائی علی محمد غلہ منڈی میں کباب لگاتا تھا۔ گھر میں بہت تنگی تھی اس لیے میں پڑھائی سے بد دِل ہو گیا اور اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے محنت مزدوری شروع کر دی تاہم بنتا پھر بھی کچھ نہ تھا۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ کیا کروں۔ مجبوراً لوگوں کے گھروں میں کام شروع کر دیا۔ میرا ایک بھائی، شیر محمد حضرت مصلح موعود کا باورچی تھا۔ اس کی معرفت میں بھی حضور کے خدام میں شامل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ میں نے کھانا پکانا سیکھ لیا۔ پھر حالات مجھے کھینچ کر مولانا کوثر نیازی کے گھر لے گئے۔ کئی سال ان کے پاس رہا۔ انہوں نے مجھ پر بہت مہربانیاں کیں اور جب وہ وفاقی وزیر تھے تو انہوں نے مجھے حج بھی کرا دیا۔''

''ماشاءاللہ! پھر امریکہ کیسے پہنچے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں منڈی بہاؤالدین شوگر ملز کے گیسٹ ہاؤس میں شیف کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ان ہی دنوں چوہدری شاہنواز امریکہ میں شیزان کھولنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پچھوایا کہ اگر مجھے امریکہ بھجوا دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے رضا مندی کا اظہار کر دیا اور یوں میں امریکہ پہنچ گیا۔''

''کس سن کی ہے یہ بات؟''

''۱۹۸۱ء کی۔ مجھ جیسا غریب انسان سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ حج کر سکتا ہے یا امریکہ پہنچ سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی کارساز ہے۔ اس نے میری قسمت بدلنا تھی سو بدل ڈالی۔ میں اُس دن سے یہاں ہوں۔ میرے بیوی بچے ساتھ ہیں۔ ایک بیٹے کے علاوہ سب کی شادیاں کر دی ہیں۔ خدا کا شکر ہے وقت بہت اچھا گذر رہا ہے۔''

''سکول کے زمانے کی کوئی یاد؟''

''اب میری عمر ستر سال ہو چکی ہے۔ مجھے تو صبح کی بات یاد نہیں رہتی ساٹھ سال پرانی باتیں کہاں یاد رہیں۔ اور ہاں! آپ نے اپنا نام تو بتایا ہے لیکن ابھی تک آپ کی صورت میرے ذہن میں نہیں آئی۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے اپنا؟''

''داؤد طاہر۔''

''بھئی آپ مولوی یعقوب صاحب کے بیٹے تو نہیں؟''

''آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔''

''تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں تو مولوی صاحب کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ جس زمانے میں مجھے قصرِ خلافت میں خدمت کا موقع ملا مولوی صاحب سے بھی ملاقات رہتی تھی۔ بڑے نفیس انسان تھے۔ اچھا! تو آپ ان کے بیٹے ہیں۔ لیں جی اب پہچانا ہے اور اللہ نے چاہا تو کبھی بھولوں گا بھی نہیں۔''

پکی جماعت میں بہت سی بچیاں ہمارے ساتھ تھیں تاہم دو بچیوں کے علاوہ اب مجھے کسی کا نام یاد نہیں۔ ایک بچی کا نام رقیہ تھا اور وہ صوفی مطیع الرحمٰن مربی امریکہ کی صاحبزادی تھیں۔ اُن کی رہائش ابتداءً انجمن کوارٹرز میں تھی۔ شادی کے بعد امریکہ منتقل ہوگئیں۔ سنتے ہیں اب ورجینیا میں اپنے بچوں کے قریب مقیم ہیں تاہم سکول چھوڑنے کے بعد میرا اُن سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ ہاں! مبارک کا بیان ہے کہ ان کا رقیہ سے رابطہ ہے اور وہ بیمار رہتی ہیں۔ خداتعالیٰ انہیں صحت و عافیت کی نعمت سے نوازے۔ دوسری بچی کا نام صغریٰ تھا اور وہ ملک ریحان نامی ایک بزرگ کی صاحبزادی تھیں لیکن کچھ پتا نہیں، اب وہ کہاں ہیں۔

اُن دنوں ہمارے سکولوں میں اردو املا کی مشق کے لیے تختی اور حساب کے سوالوں کے لیے سلیٹ استعمال ہوتی تھی۔ تختی لکڑی کی بنی ہوتی تھی جب کہ سلیٹ ابتداءً پتھر کی اور پھر ٹین کی بننے لگی تھی۔ اب یہ بات شاید بعض سلیم طبائع پر گراں گذرے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم لوگ سلیٹ کی صفائی تھوک سے کرتے اور بسا اوقات بچوں میں مقابلہ شروع ہو جاتا کہ کون سا بچہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں تھوکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پہنچے تو کسی کو خیال آیا کہ یہ طریقِ کار مناسب نہیں چنانچہ سلیٹ کے ساتھ ایک ٹاکی باندھی جانے لگی جسے ہمہ وقت بھگو کر رکھا جاتا تھا۔ اب سلیٹ کو اس گیلی ٹاکی کی مدد سے صاف کیا جانے لگا۔

سیاہی جسے اُس زمانے میں روشنائی کہا جاتا تھا بازار سے پڑیوں کی صورت میں ملتی تھی۔ مجھے یاد ہے کسی زمانے میں اس کا ریٹ ایک پیسہ فی پڑیا تھا۔ دوات میں ایک ٹاکی (جسے کچھ لوگ صُوف بھی کہتے تھے) ڈال دی جاتی۔ سیاہی کی پُڑیا انڈیل کر اس میں کچھ پانی ڈالا جاتا اور پھر اسے قلم کی مدد سے اچھی طرح حل کر لیا جاتا۔ اس روشنائی کا نشان آسانی سے دُھل جاتا تھا۔

سکول سے واپسی پر ہم بسا اوقات راستے میں کسی نلکے یا چھپڑ کے پاس بیٹھ کر اپنی تختیاں دھو لیتے اور وہیں کھڑے کھڑے سکھا لیتے۔ اگر سایہ میسر ہوتا تو کئی بار وہیں بیٹھ کر گھر کا کام بھی مکمل کر لیتے۔

لیجئے نصرت گرلز ہائی سکول اور اس دور کے بعض ہم جماعتوں کی باتیں تو ہوگئیں لیکن یہ موضوع ختم کرنے سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس زمانے میں صبح کی اسمبلی میں تلاوتِ قرآن پاک کے بعد ایک یا دو خوش الحان بچے ایک نظم بھی ترنم سے پڑھا کرتے تھے جس کا پہلا شعر میرے حافظے میں اس طرح سے محفوظ ہے:

ہم احمدی بچے ہیں ، کچھ کر کے دکھا دیں گے
شیطاں کی حکومت کو دنیا سے مٹا دیں گے

مجھے یاد پڑتا ہے کہ بعض اجتماعات میں بھی یہ نظم ترنم سے اس طرح پڑھی جاتی تھی کہ نظم پڑھنے والا ایک

مصرع پڑھ کر رک جاتا جس کے بعد جملہ بچے کورس کی شکل میں اسے دہراتے۔ اس طرح بہت سے بچوں کو یہ نظم یاد ہوگئی۔ ممکن ہے زیادہ بہتر حافظے والے بچوں کو یہ نظم اب بھی پوری طرح یاد ہو مگر مجھے تو اس کا صرف ایک ہی شعر یاد رہ گیا ہے۔

اطفال الاحمدیہ کے کسی اجتماع کے موقع پر اس نظم کا پڑھا جانا میرے ذہن میں نہیں آ رہا لیکن میری یہ ہمیشہ خواہش رہی کہ میں کسی طرح یہ مکمل نظم حاصل کر سکوں۔ اس ٹوہ میں تھا کہ ربوہ کے ایک صاحب علم نے مجھے بتایا کہ یہ نظم مولانا دوست محمد شاہد کے خسر، محمد ابراہیم شاد کے مجموعۂ کلام ''بہارِ جاوداں'' میں شامل ہے۔ میں نے اس نظم کی نقل حاصل کر لی اور اپنی کامیابی پر پھولا نہیں سما رہا تھا کہ الفضل کے بعض پرانی فائلوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے دسمبر ۱۹۵۰ء کے ایک شمارے میں بھی یہ نظم مل گئی مگر وہاں شاعر کا نام عبدالمنان شاد درج تھا اور یہ نظم ''احمدی بچوں کا ترانہ'' کے عنوان سے چھپی تھی۔ یہ نظم ان کے مجموعے ''طلسمِ خیال'' میں شامل ہے اور ذیل کے یہ اشعار اسی نظم سے ماخوذ ہیں:

ہر طرف پکاریں گے دنیا میں نذیر آیا
ہر ایک کو جا جا کر پیغامِ خدا دیں گے
کہتی ہے غلط دنیا عیسیٰ ہے ابھی زندہ
برہان توفی کی قرآں سے بتا دیں گے

یاد رہے کہ اس نظم کے خالق جو ٹھیکیدار عبداللطیف کے صاحبزادے اور پیشے کے لحاظ سے ٹیکسٹائل انجینئر تھے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں کراچی میں مقیم تھے۔ وہ یکم ستمبر ۱۹۸۰ء کی شام اپنے کسی کام سے اپنی کار میں گھر سے نکلے لیکن زندہ واپس نہیں آ سکے۔ غالب گمان ہے کہ وہ کسی سازش کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

مجھے خوشی ہے کہ میں نے نصرت گرلز ہائی سکول میں اپنا تعلیمی سال کامیابی سے مکمل کر لیا۔ اس سکول نے میرے اندر تحصیل علم کی وہ شمع روشن کی جس نے زندگی کے ہر موڑ پر میری رہنمائی کی۔ میرا دل اللہ تعالیٰ کی حمد سے لبریز ہے جس نے مجھ نابکار پر یہ احسان فرمایا۔

اب میں دوسری جماعت میں ہو گیا تھا۔

یادیں نہ دل سے مِٹ سکیں مکتب کے دور کی

تعلیم الاسلام ہائی سکول جو قبل ازیں چنیوٹ میں تھا ۱۹۵۲ء میں ربوہ منتقل ہو گیا۔ اگر چہ ہائی کلاسز تو اس کی اپنی عمارت میں جو محلّہ دارالبرکات میں خاص اس مقصد کے لیے تعمیر کی گئی تھی ہوا کرتی تھیں لیکن پرائمری کلاسز کا آغاز ریلوے لائن کے اُس پار محلّہ دارالرحمت میں واقع ایک کچی بیت الذکر سے ہوا جہاں نصرت گرلز ہائی سکول سے پکّی جماعت کا امتحان پاس کر کے آنے والے بچوں کے علاوہ ان بچوں کو بھی جو کسی اور بنیاد پر اس جماعت میں داخلے کے اہل تھے داخلہ دیا گیا۔

سکول کے اس زمانے کے رجسٹر داخل خارج سے پتا چلتا ہے کہ میں نے ۱۱ جون ۱۹۵۲ء کو اس سکول میں داخلہ لیا تھا اور اس بات کا ذکر اس رجسٹر میں ۲۴۱۷ نمبر پر موجود ہے۔ مجھ سے فوراً پہلے علی یوسف نام کے ایک طالب علم نے میری ہی کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ علی یوسف سیٹھ ابوبکر یوسف کے صاحبزادے اور سیدہ ام وسیم احمد حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے سوتیلے بھائی ہیں۔ میرے فوراً بعد سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہونے والے طالب علم حمید احمد خان تھے جو محترمہ آپا طاہرہ حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کے بھائی تھے۔ علی یوسف بعد میں پڑھائی جاری نہ رکھ سکے اور آج کل لاہور میں شیخ نصیر احمد ایڈووکیٹ ابن شیخ بشیر احمد (سابق امیر جماعت احمدیہ لاہور) کے گھر پر مقیم ہیں جب کہ حمید احمد خان بعد میں ڈاکٹر بنے اور اب وفات پا چکے ہیں۔

اس سال سکول کی دوسری جماعت میں کُل پچھتر طلبہ داخل ہوئے۔ اگلے چند سالوں میں ان میں سے کئی طلبہ کا نام بوجہ کثرت غیر حاضری یا عدم ادائی فیس سکول سے خارج ہو گیا۔ کچھ طلبہ اپنی ذاتی وجوہ کی بنا پر سکول چھوڑ کر چلے گئے۔ ہاں! میٹرک تک ساتھ رہنے والے طلبہ بھی کچھ ایسے کم نہ تھے۔

میرے اُس زمانے کے ہم جماعتوں میں اُن چھ طلبہ کے علاوہ جن کا ذکر بابِ اول میں آ چکا ہے عبدالرحیم چیمہ کارکن دفتر تحریک جدید کے بیٹے عبدالکریم؛ مولوی عطا محمد ہیڈ کلرک، نظارت بہشتی مقبرہ کے بیٹے داؤد احمد اور قادیان کے ایک مشہور ناشر مولوی ابوالفضل محمود کے بیٹے قمر احمد شامل تھے۔ منور دین نامی ایک بزرگ کے دو بیٹے، سعادت محمود اور جاوید محمود جنھوں نے میٹرک کے بعد دندان سازی کی تربیت حاصل کر کے چنیوٹ میں اپنا کلینک شروع کر دیا تھا بھی میرے ہم جماعت تھے۔ رہڑہ بان عبدالرحمٰن کے بیٹے اور عبدالمنان کبابیے کے بھائی عبدالمجید؛ مختار احمد ہاشمی کارکن نظارت خدمت درویشان کے بیٹے، دلدار احمد ہاشمی؛ قریشی عبدالوحید کے بیٹے اور محمد یامین تاجر کتب کے نواسے، عبدالکریم انور، عبدالسّلام ٹیلر ماسٹر کے بیٹے عبدالمالک؛ مولوی عبداللطیف کے بیٹے مبارک احمد؛ قاضی رشید الدین کارکن دفتر تحریک جدید کے بیٹے، صفی الدین؛ غلام رسول تانگہ بان کے

عبدالرحمٰن شاکر ناظر ... کے بیٹے رفیق احمد قمر؛ تحریک جدید کے وکیل القانون چوہدری غلام مرتضےٰ کے بیٹے داؤد احمد؛ صدر انجمن احمدیہ کے بیٹے شمیم کرشن؛ میرے تایازاد، محمد کریم قمر؛ دواخانہ طب جدید والے حکیم محمد صدیق کے بیٹے صادق احمد نعیم؛ دارالسخاوت والے یوسف بریلوی کے بیٹے منور احمد؛ محمد عالم باڈی گارڈ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ایک عزیز محمد احمد؛ مربی سلسلہ محمد ابراہیم خلیل کے بیٹے محمد یحیٰی؛ مہاشہ محمد عمر کے بیٹے منیر احمد؛ مولوی فضل دین وکیل کے بیٹے طاہر احمد؛ حضرت صوفی غلام محمد استاد تعلیم الاسلام ہائی سکول کے نواسے اور استانی حمیدہ راشدہ کے صاحبزادے نیاز احمد اور خواجہ عبدالحیی کے بیٹے عبدالمومن بھی میرے کلاس فیلوز میں شامل تھے۔ ان میں سے بہتوں نے میٹرک کرلیا اور بعض کالج میں بھی میرے ساتھ رہے۔

ہماری کلاس صبح سے لے کر ظہر کی نماز تک ہوتی تھی۔ ہمیں پڑھانے پر ایک ایسے استاد مامور تھے جن کا تعلق ربوہ کے کسی نواحی گاؤں سے تھا۔ ہمیں اس بات کا اندازہ ان کے لب ولہجہ سے ہوا جو اہالیانِ ربوہ کے عام لہجے سے مختلف تھا۔ شاید اسی وجہ سے لڑکوں نے ان کا نام ''جانگلی ماسٹر'' رکھ چھوڑا تھا۔ اب مجھے ان کا اصل نام یاد نہیں نہ سکول ریکارڈ سے ان کا نام معلوم ہوسکا ہے۔

ہم نے اسی کلاس میں پہاڑے رٹنا شروع کیے تھے۔ اس کا طریق کار جو نہ جانے کب سے ہمارے سکولوں میں رائج ہوگا خاصا دلچسپ تھا۔ دولڑکے کلاس ٹیچر کے دائیں اور بائیں کھڑے ہوجاتے۔ اگر دو کا پہاڑہ یاد کرانا مقصود ہوتا تو ایک لڑکا ''ایک دُونی دُونی دو دُونی چار'' کا راگ الاپتا اور سب بچے کورس کی شکل ہی یہی ''شعر'' دہراتے۔ اس کے بعد دوسرا لڑکا ''تین دُونی چھ، چار دُونی اٹھ'' کا راگ الاپتا اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا حتّٰی کہ ہم ''نو دونی اٹھارہ دس دونی وی'' تک پہنچ جاتے۔ بعد کی کلاسز میں بھی طریق کار یہی رہا ماسوا اس کے کہ ہر پہاڑہ سولہ تک یاد کرایا جاتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ کلاس ٹیچر کے دائیں بائیں کھڑے لڑکوں کا انداز بڑا مضحکہ خیز ہوتا تھا۔ یہ لڑکے تقریباً ڈانس کے انداز میں یہ راگ الاپتے اور آواز کے ردِم کے ساتھ جسم کو اس طرح حرکت دیتے گویا کوئی سپاہی مارچ کررہا ہو۔

پہاڑے یاد کرنے کا یہ طریق اتنا مؤثر تھا کہ آج نصف صدی گذرنے کے باوجود مجھے یہ سب پہاڑے بالکل اسی طرح یاد ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوچکا ہے ہمارے کلاس فیلوز میں سے ایک مربی سلسلہ محمد ابراہیم خلیل کا بیٹا یحیٰی بھی تھا۔ یحیٰی چھوٹے سے قد کا دبلا پتلا بچہ تھا۔ ماسٹر صاحب کو نہ جانے اس کی کون سی ادا پسند تھی کہ انہوں نے سکول میں چھٹی یحیٰی کی چھلانگ سے مشروط کررکھی تھی۔ ماسٹر صاحب نے مستقل طور پر یہ شرط لگا رکھی تھی کہ جب تک یحیٰی چھلانگ نہیں مارے گا چھٹی نہیں ہوگی۔ یحیٰی کو بھی اپنی اہمیت کا اندازہ ہوچکا تھا لہٰذا وہ چھلانگ لگانے میں لیت ولعل کرنے لگتا تو باقی سارے طلبہ اس کی منت سماجت شروع کردیتے۔ بالآخر یحیٰی بڑی ادا سے اپنی جگہ سے اُٹھتا، مسجد سے باہر نکل جاتا اور پھر بھاگتا ہوا آکر ایک لمبی چھلانگ لگاتا۔ اس کے ساتھ ہی طلبہ ''چھٹی'' کا ایک فلک شگاف نعرہ بلند کرتے اور ماسٹر صاحب کی طرف سے باضابطہ اجازت کے بغیر ہی بستے ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے

[illegible] راہ لے لیتے ۔

یہی چند سال تک ہمارا کلاس فیلو رہا۔ پھر آناً فاناً کہیں غائب ہو گیا۔ پتا چلا کہ اس کا ذہن مختل ہو چکا ہے اور اس نے خود کو گھر کے اندر محبوس کر رکھا ہے۔

کچھ ہی عرصے کے بعد ہمارا اسکول اس بیت الذکر سے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے زیرِ تعمیر بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گیا لیکن ہمارے بیٹھنے کے لیے کوئی کمرہ مختص نہ تھا اور بنچ تو درکنار بیٹھنے کے لیے ٹاٹ کا بھی انتظام نہ تھا۔ ہم لوگ اپنے گھروں سے بوری یا کوئی اور کپڑا ہمراہ لے جاتے تھے اور اسے بچھا کر بیٹھ جاتے۔ اگر کبھی بوری وغیرہ لے جانا بھول جاتے تو اِدھر اُدھر سے کوئی اینٹ پکڑ لیتے اور پورا دن اسی پر بیٹھ کر گذار دیتے۔

ہماری اردو کی کتاب میں یقیناً اور بھی کئی نظمیں ہوں گی جن میں سے بعض ہمیں زبانی یاد کرائی گئی ہوں گی لیکن فی الوقت مجھے ان میں سے ایک نظم کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ اس نظم کا عنوان تھا: ہوائی جہاز اور اس کا پہلا شعر کچھ اس طرح تھا:

وہ دیکھو ہوائی جہاز آ گیا
بجاتا ہوا اپنا ساز آ گیا

اس نظم میں اُڑنے والی اس کل کے بارے میں عوامی شعور پیدا کرنے اور عوام الناس کے دماغ سے پرواز کے مضمرات کے بارے میں غیر ضروری خدشات دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی چنانچہ اس کے آخری دو اشعار یہ تھے:

جمیل اس کو سن کر بہت خوش ہوا
اُچھلنے لگا اور کہنے لگا
بڑا ہو کے سمجھوں گا میں اس کا راز
اڑاؤں گا میں بھی ہوائی جہاز

جب ہم تیسری جماعت میں ہوئے تو صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر اپنی عارضی عمارت سے موجودہ جدید عمارت میں منتقل ہو چکے تھے اور وہ عمارت خالی پڑی تھی۔ یہ عمارت لڑکوں کی پرائمری کلاسز کے لیے موزوں سمجھی گئی چنانچہ تعلیم الاسلام پرائمری سکول یہاں منتقل ہو گیا اور ہم نے تیسری، چوتھی اور پانچویں جماعت یہیں سے پاس کی۔

ہم نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز لکڑی کے تختوں سے کیا تھا اور درمیانی عرصہ میں چٹائیوں، گھروں سے لائی گئی بوریوں حتیٰ کہ اِدھر اُدھر سے اٹھائی گئی اینٹوں پر بیٹھتے رہے تھے تاہم یہاں ہمیں ایک نئی چیز سے واسطہ پڑا اور وہ تھا ٹاٹ۔ ٹاٹ پٹ سن کی بنی ہوئی کھردری سی کم و بیش دو فٹ چوڑی پٹی کو کہا جاتا تھا جو بازار سے ایک تھان کی صورت میں ملتی اور بعد میں اس کے ٹکڑے کاٹ لیے جاتے۔ چونکہ ان دنوں گرد و غبار کے طوفان عام تھے، سکول کے فرش کچے تھے اور طلبہ کیچڑ سے لت پت جوتوں سمیت بھی ٹاٹ پر بیٹھ جاتے تھے لہٰذا سکول کے بند ہونے تک یہ ٹاٹ مٹی سے اَٹ جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم صبح سکول پہنچتے ہی سب سے پہلے یہ ٹاٹ جھاڑتے لیکن لکڑ کھے

اُڈائی تے اپنے سروچ پائی کے مصداق ٹاٹ تو ایسے صاف نہ ہوتے لیکن ہم سب ''متیو ٹی'' ہو جاتے ... سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں گھس جاتی وہ اس پر مستزاد۔ لیکن یہ باتیں تو بعد کی ہیں اس وقت تو ہم سور ... ہی ٹاٹ جھاڑنے کا عمل مکمل کرتے اور دن کا باقی حصہ ان ہی گرد آلود کپڑوں میں گذار دیتے۔

تیسری جماعت میں ہمیں ماسٹر غلام محمد کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

اُن کا ایک بیٹا ہمارا ہم جماعت تھا۔ وہ شرارتی تو یوں بھی ہوگا لیکن کلاس ٹیچر کے ساتھ اس کے تعلق نے اسے غیر ضروری طور پر دلیر بنا رکھا تھا اور وہ بسا اوقات ایسی شرارتیں بھی کر جاتا جو عام حالات میں انتظامیہ شدید درگذر نہ کر سکتی۔ ایک دفعہ ماسٹر صاحب کی عدم موجودگی میں اس بچے نے اپنے بہت سے ہم جماعتوں کی ٹوپیاں چھین کر ایک مینار کی صورت اپنے سر پر رکھ لیں اور اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ باقی لڑکے اس کی اس حرکت سے محظوظ ہو کر شور مچا رہے تھے کہ یہ آواز ساتھ والی کلاس میں ماسٹر ظفر اقبال (ابن سردار مصباح الدین) تک پہنچ گئی۔ وہ اچانک ہماری کلاس میں داخل ہوئے اور اندھا دھند ''لاٹھی چارج'' شروع کر دیا۔ لڑکے اپنی دھما چوکڑی بھول گئے اور سہم کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ یہ ''لاٹھی چارج'' اتنا اچانک اور شدید تھا کہ ماسٹر غلام محمد کا بیٹا بھی اپنی جولانیاں بھول گیا۔ چند منٹوں کے بعد جب ہنگامہ فرو ہو چکا تو کسی نے ماسٹر ظفر اقبال سے دبے لفظوں میں شکایت کی کہ یہ سارا کیا دھرا اس لڑکے کا تھا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق اب تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے۔ ایک بار ہم سکول میں تھے کہ باہر بہت زور کا دھماکہ ہوا۔ کسی نے اس سے پہلے اتنا شدید دھماکہ نہ سنا تھا لہٰذا سب لڑکے گھبرا کر کلاس روم سے باہر نکل آئے۔ ماسٹر صاحبان بھی کیوں پیچھے رہتے۔ ہر شخص اسی پریشانی میں تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن کسی کے پاس کوئی جواب ہوتا تو بتاتا۔ ناگاہ کسی کی نظر آسمان پر گئی تو ایک جہاز بہت تیزی سے اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اس دھماکے کی مختلف تاویلیں کی جا رہی تھیں لیکن اس بات پر تقریباً سبھی متفق تھے کہ اس جہاز سے کسی جگہ کوئی بم گرایا گیا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ الگ الگ ٹولیوں میں کھڑے یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جب کچھ سمجھ نہ آئی اور ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرنے کے بعد تسلی ہوگئی کہ ربوہ پر کوئی بم نہیں گرا سب خاموش ہو کر اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ امریکہ سے ملنے والی فوجی امداد میں آواز کی رفتار سے تیز اڑنے والے کچھ جہاز پاکستان آئے ہیں اور یہ کہ جب ایسا کوئی جہاز ساؤنڈ بیریئر کراس کرتا ہے یعنی جب اس کی رفتار آواز کی رفتار سے تیز ہوتی ہے تو فضا میں ایک دھماکہ ہوتا ہے اور یہ کہ یہ دھماکہ اسی طرح ہوا تھا۔

ہم تیسری یا شاید چوتھی جماعت میں تھے۔ ایک روز جب ہم چھٹی کے بعد کلاس روم سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان پر سفید دھوئیں کی ایک لکیر سی بنی ہوئی ہے اور وہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس لکیر کے اگلے سرے پر ایک نقطہ نما چمکدار سی چیز رینگتی چلی جا رہی تھی۔ چونکہ ہم نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا اس لیے ہم سب اسے کوئی مافوق الفطرت چیز سمجھ رہے تھے۔ بچے تو خیر بچے تھے، سکول کا کوئی استاد بھی پورے یقین

سے نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ دھواں اور اس کے اگلے سرے پر رواں دواں نقطہ فی الحقیقت کیا چیز ہے۔ بہت مدت کے بعد پتا چلا کہ یہ بھی ایک ہوائی جہاز تھا جس کا چھوڑا ہوا دھواں فضا میں ساتھ کے ساتھ منجمد ہوتا جا رہا تھا۔

پچاس کی دہائی میں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات عروج پر تھے اور کمیونسٹ روس کے خلاف پاکستان کے متوقع کردار کی وجہ سے امریکی خارجہ پالیسی میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ ان دنوں امریکہ پاکستان کی فوجی امداد کے علاوہ عوام الناس میں اپنی مقبولیت میں اضافے کے لیے کئی اقدامات کر رہا تھا چنانچہ گندم کے علاوہ جو اشیا پاکستانیوں کے لیے امداد کی صورت میں آ رہی تھیں ان میں سے ایک خشک دودھ بھی تھا جو پاکستانی سکولوں کے غریب اور مفلوک الحال بچوں کے لیے تحفہ کے طور پر آتا۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ مرکزی حکومت یہ دودھ پاکستان کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے سکولوں میں کس طرح پہنچاتی تھی لیکن یہ بات ذاتی طور پر میرے علم ہے کہ یہ دودھ بہت عمدہ گتے کے بڑے بڑے ڈبوں جو اپنے سائز میں تارکول کے ڈرموں کے برابر تھے آیا کرتا تھا۔ سکولوں کی انتظامیہ اس دودھ میں سے کتنا حصہ اپنے لیے رکھتی اور کتنا دودھ طلبہ تک پہنچتا، یہ بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے تاہم امرِ واقعہ یہ ہے سکول میں دو چار بار ہمیں بھی یہ دودھ پلایا گیا۔

جب سکول کی انتظامیہ اس طرح کا کوئی پروگرام بناتی تو ایک دو دن پہلے سکول میں اس کا اعلان کر دیا جاتا اور بچے بہت بیتابی کے ساتھ اس دن انتظار کرنے لگتے۔ سچ پوچھیں تو ہم ایسے افلاس زدہ بچوں کے لیے یہ دن کسی تہوار سے کم نہ ہوتا تھا۔ اس روز سکول میں چھٹی کا سماں ہوتا۔ کوئی استاد کلاس نہ لیتا، جست کے بڑے ٹبوں میں تازہ پانی بھرا جاتا اور پھر اس میں خشک دودھ ڈال کر کسی درخت کی موٹی سی ٹہنی سے اچھی طرح ہلایا جاتا، پختہ اینٹوں سے عارضی چولہے تعمیر کیے جاتے، ان میں لکڑی جلائی جاتی اور یہ ٹب اٹھا کر آگ پر رکھ دیئے جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دودھ اُبلنا شروع ہو جاتا۔ دودھ تیار ہو جاتا تو بچوں کو ایک قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا جاتا اور جلسہ سالانہ کے مہمانوں کے لیے بنائے گئے پیالے یا آبخورے ان کے ہاتھوں میں تھما دیئے جاتے۔ کلاس انچارج ایک پڑا پکڑ کر بیٹھ جاتا اور ہر طالب علم کے برتن میں دودھ کا بھرا ایک ایک پڑا انڈیلتا چلا جاتا۔

اب سوچتا ہوں تو بچوں کو دودھ پلانے کا یہ طریقہ ان کی عزت نفس کے لیے سمِ قاتل تھا لیکن اُس وقت کسی کو اس کا احساس نہ تھا اور طلبہ خوشی خوشی یہ دودھ پیتے تھے۔

مجھے یہ بات اب تک نہیں بھولی کہ اس دودھ میں ایک ناگوار سی مہک ہوتی تھی۔ ممکن ہے یہ دودھ زائد المیعاد ہو چکا ہوتا ہو یا اس کی تیاری میں کوئی خرابی رہ جاتی ہو۔ ویسے بھی ابلنے کے باوجود مِلک پاؤڈر پوری طرح پانی میں حل نہیں ہوا ہوتا تھا اور اس کی پھٹکیاں ہمارے منہ میں آتی تھیں لیکن ہم اسے شوق سے چبا جاتے اور دل ہی دل میں امریکہ کا شکریہ ادا کرتے جس نے اتنی دور سے کسی ذاتی جان پہچان کے بغیر ہمارے لیے یہ نادر تحفہ بھجوایا تھا۔

میرا خیال ہے کہ امریکہ سے یہ دودھ بچوں کو روزانہ پلانے کے لیے موصول ہوتا ہوگا لیکن اس کا معتد بہ حصہ بالا بالا ہی بازار میں فروخت ہو جاتا ہوگا۔ باقی دودھ میں محکمہ تعلیم کے سب افسران درجہ بدرجہ شریک ہوں

گے چنانچہ اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کی اتنی کم مقدار باقی رہ جاتی ہو گی کہ طلبہ کو پورے سال میں ایک یا دو بار سے زیادہ نہ پلایا جا سکے۔

قیام پاکستان کے ابتدائی ایام میں ہمارے مُلک میں ٹی بی اور چیچک کا مرض عام تھا۔ یہ دونوں امراض بالعموم لاعلاج سمجھی جاتی تھیں اور کئی مریضوں کی موت پر منتج ہو رہی تھیں۔ جو مریض بچ رہتے وہ بسا اوقات مُردوں سے بھی بدتر ہوتے۔ جہاں تک چیچک کا تعلق ہے وہ اپنے شکار کے چہرے پر اپنا مستقل نشان چھوڑ جاتی جو مرتے دم تک اس کے ساتھ رہتا۔ حکومت نے ان امراض کے خاتمے کے لیے غیر ملکی امداد سے کئی پروگرام جاری کیئے اور خدا کا احسان ہے کہ اب کم از کم پاکستان بلکہ پوری دنیا میں چیچک کا کوئی کیس رپورٹ نہیں ہو رہا۔

سکول کے زمانے میں غالباً ہر تین سال کے بعد ہمیں ٹی بی کے حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے تھے۔ یہ تین ٹیکے کندھے اور کہنی کے درمیان بازو پر لگتے تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا چنانچہ کوئی بچہ بخوشی یہ ٹیکا لگوانے کے لیے راضی نہ ہوتا لیکن ماسٹر صاحبان پکڑ دھکڑ کر انہیں یہ ٹیکے لگوانے پر مجبور کر دیتے۔ ان ٹیکوں کو عام زبان میں ''لودے'' کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں انجیکشن کے لیے شیشے کی سرنجیں مستعمل تھیں۔ عام حالات میں انجیکشن لگانے سے پہلے سرنج اور سوئی کو پانی میں ابال لیا جاتا تھا لیکن جب ایک آدمی نے ایک ہی دن میں سینکڑوں انجیکشن لگانے ہوں تو سرنجوں اور سوئیوں کی صفائی کے لیے یہ اہتمام ممکن نہ ہوتا چنانچہ صبح سے لے کر شام تک ایک ہی سوئی سے سینکڑوں طلبہ بھگتا دیئے جاتے۔ بسا اوقات سوئی کی نوک ''کھونڈی'' ہو جاتی اور گوشت میں مشکل سے اپنا راستہ بناتی لیکن ویکسینیٹر کو اس بات کی کوئی پروا نہ ہوتی کہ ٹیکا لگوانے والا کس اذیت سے دوچار ہو رہا ہے۔ اسے تو صرف اور صرف اپنا ٹارگٹ پورا کرنے سے غرض ہوتی تھی۔ اس بد احتیاطی کی وجہ سے بعد میں بعض طلبہ کو انفیکشن ہو جاتی اور ٹیکے کے مقام پر زخم بن جاتا۔

دُور کیا جانا میرے اپنے بازو پر ایک ٹیکا خراب ہو کر بہت بڑا زخم بن گیا۔ اُس زخم میں سے ہر وقت پیپ رستی تھی اور اگر یہ زخم کبھی ٹھیک ہونے پر آ بھی جاتا اور اس پر کھرنڈ بننے لگتا تو اپنی ہی لاپروائی سے پھر چھِل جاتا۔ یوں یہ زخم پھیل کر چاندی کے روپے کے برابر ہو گیا لیکن اس زخم نے گھر والوں میں کوئی خاص تشویش پیدا نہیں کی۔ شاید اسے معمول کی ایک بات سمجھا جا رہا تھا۔

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ زخم کیسے ٹھیک ہوا لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس زخم کے لیے کوئی انٹی بائیوٹک مرہم، انجکشن یا کیپسول استعمال نہیں ہوا۔

پرانے وقتوں میں ہر نوجوان کے بازوؤں پر ٹی بی کے اِن ٹیکوں کے نشانات ہوا کرتے تھے اور بعض نشان تو خاصے بڑے ہوتے جن سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان کے زخم کس حد تک پھیل گئے ہوں گے۔ ایسے ہی نشانات میرے بازوؤں پر بھی موجود ہیں۔

سکول کے آخری سالوں میں ٹیکے کا طریق کار بدل گیا تھا۔ پہلی قسط میں کلائی پر ایک ٹیکا لگایا جاتا اور اس

کے گرد سیاہی سے ایک دائرہ بنا دیا جاتا۔ چوبیس یا شاید اڑتالیس گھنٹے کے بعد کلائی کا معاینہ کیا جاتا۔ اگر تو اس مقام پر ورم یا سوزش ہوتی تو سمجھا جاتا کہ جسم میں ٹی بی کا مادہ موجود ہے اور ایسے طالب علم کے بازو میں ایک ٹیکا لگایا جاتا لیکن اگر انجکشن کے مقام پر کوئی سوزش یا ورم نہ ہوتا تو ایسے طالب علم کو مزید انجکشن سے مستثنیٰ کر دیا جاتا۔

چیچک کا ٹیکا کلائی پر لگایا جاتا تھا۔ پہلے تو کلائی پر روئی کی مدد سے تین جگہ ویکسین لگائی جاتی جس کے بعد ویکسینیٹر انتہائی چابکدستی سے ان تینوں جگہوں پر ایک بلیڈ کی مدد سے بہت سے زخم لگا دیتا۔ یوں دوا براہِ راست خون میں جذب ہو جاتی۔ بعد میں یہی کام بلیڈ کی بجائے ایک دندانے دار مُدھانی سے لیا جانے لگا۔ مشّاق ویکسینیٹر اس مُدھانی کو اس طرح گھماتا کہ کلائی سے فوراً خون رِسنا شروع ہو جاتا۔

ٹی بی اور چیچک کے علاوہ سال کے سال برسات سے ذرا پہلے سکول میں ہیضے اور ٹائیفائیڈ کا ٹیکا بھی لگایا جاتا تھا۔ یہ ٹیکا لگنے کے بعد کم سے کم چوبیس گھنٹے سخت بے چینی میں گذرتے۔ بخار ہو جاتا اور جسم ٹوٹتا رہتا۔ سنتے تھے کہ بخار اس ٹیکے کا قدرتی ردعمل ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ پھر کسی نے ایک ٹوٹکا بتایا کہ اگر یہ ٹیکا لگوانے کے فوراً بعد نہا لیا جائے تو بخار نہیں ہوتا چنانچہ بعد میں ہم یہ ٹیکا لگواتے ہی نہانے لگے لیکن پھر بھی اکثر اوقات بخار ہو ہی جاتا۔

جب میں نے چوتھی جماعت کا امتحان دیا تو آپی نویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں۔ ان دنوں ہمارے ایک چچا، محمد اسماعیل فوق گجرات میں سٹیشن ماسٹر ہوتے تھے۔ ان کی دعوت پر اباجی نے ہم دونوں کو چھٹیاں گذارنے کے لیے ان کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس سے پہلے عملاً ربوہ سے کبھی باہر نہ نکلا تھا لہٰذا میں بڑی بے چینی کے ساتھ اس موقع کا منتظر تھا۔ چچا اسماعیل نے اس موقع پر گجرات سے اپنا ایک خاص ملازم ربوہ بھجوایا تا کہ وہ خود ہمیں گجرات لے جائے اور ہمیں راستے میں کسی قسم کی کوئی تکلیف یا پریشانی نہ ہو۔

پروگرام کے مطابق ہم ایک صبح ربوہ سے اس پسنجر ٹرین کے ذریعہ روانہ ہوئے جو لالہ موسیٰ جاتی تھی۔ اس ٹرین میں یوں بھی مسافروں کا اتنا رش نہیں تھا لیکن چچا اسماعیل کے اس کارندے نے گارڈ سے کہہ سن کر ایک چھوٹے سے کمپارٹمنٹ پر قبضہ کر لیا اور دورانِ سفر کسی اور مسافر کو اس کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا جس کی وجہ سے ہمارا یہ سفر بہت آرام سے طے ہوا اور ہم خوش و خرم لالہ موسیٰ پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر ٹرین بدل کر شام سے پہلے گجرات پہنچ گئے۔ چچا اسماعیل نے خود پلیٹ فارم پر ہمارا استقبال کیا اور اپنے ہمراہ گھر لے گئے۔ ان کے بچوں سے ہماری جان پہچان پہلے سے تھی لہٰذا وہاں پہنچتے ہی ان سے بے تکلفانہ نوک جھونک اور کھیل کود شروع ہوگئی۔

چچا اسماعیل کے دو بیٹے تھے اور کئی بیٹیاں۔ بڑے بیٹے کا نام منور تھا اور چھوٹے کا منصور۔ یہی بچے بڑے ہو کر منور احمد جاوید اور منصور احمد وقار کے نام سے معروف ہوئے اور ان ہی ناموں سے جماعتی حلقوں میں بھی پہچانے جاتے رہے۔ منور کا سارا عرصہ ملازمت پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ کینٹ میں گذرا اور منصور کا پاکستان ریلوے میں لیکن دونوں نے پینشن کے لیے کوالیفائنگ سروس کے بعد یہ ملازمتیں چھوڑ کر اپنے لیے روزگار کے

نئے وسائل تلاش کر لیے۔ منور نے اپنی خدمات کی وجہ سے واہ کینٹ کی جماعت میں بہت نام کمایا اور منصور
جماعت احمدیہ پشاور کے نائب امیر رہے۔ منور ۱۹۹۶ء میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجہ میں وفات پا گئے جب کہ
منصور آج کل ویلنشیا ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں اور ہومیو پیتھک پریکٹس کرتے ہیں۔

اِن سب نے ہمیں گجرات کی خوب سیر کرائی اور حضرت شاہ دولہ کے مزار پر بھی لے گئے۔ وہاں زندگی میں پہلی بار ایک ایسا منظر دیکھا جو میرے ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ دس بارہ سال کا ایک بچہ جس کا سر قدرے چھوٹا تھا حضرت شاہ دولہ کی قبر کے پاس ایک چارپائی پر لوہے کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ اس زنجیر کا ایک سرا ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا تو دوسرے سرے نے بصورت ہتھکڑی بچے کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ بچہ اپنے منہ سے غُوں غُوں کے علاوہ کوئی اور آواز نہ نکال سکتا تھا اور اس کی باقی حرکات وسکنات بھی عام بچوں سے مختلف اور بعض جانوروں سے قریب تر تھیں۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا لیکن اپنی کم عمری کی وجہ سے میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس بچے کو لوہے کی زنجیر کیوں پہنا دی گئی ہے، یہ بچہ بول کیوں نہیں سکتا اور اس کی حرکات وسکنات جانوروں سے کیوں مشابہہ ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ جاننے کی خواہش تو ہوئی لیکن کُھل کر کسی سے کوئی سوال نہ کر سکا۔ ہاں! میرے تاثرات کو بھانپتے ہوئے چچا اسماعیل نے کہا: ''یہ شاہ دولہ کا چوہا ہے۔ تم نے اس کا سر نہیں دیکھا؟''

یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک بیماری ہے جس میں بچے کا سر نسبتاً چھوٹا رہ جاتا ہے اور اس میں وہ ساری علامتیں موجود ہوتی ہیں جن کا ذکر شاہ دولہ کے چوہوں کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔ یہ بیماری پیدائشی طور پر بھی لاحق ہو سکتی ہے اور پیدائش کے بعد بھی۔ بتایا جاتا ہے کہ انسانی کھوپڑی کی مثال ایک فٹ بال کی ہے جو چمڑے کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ایک خاص شکل میں سی کر بنتا ہے۔ پیدائش کے بعد بچے کی کھوپڑی کی ہڈیاں بھی تقریباً الگ الگ ہوتی ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے دماغ کی افزائش رُک جائے یا یہ ہڈیاں وقت سے پہلے جُڑ کر دماغ کی افزائش روک دیں تو نہ صرف کھوپڑی کا سائز چھوٹا رہ جاتا ہے بلکہ دماغ بھی ان صلاحیتوں سے مستقل طور پر محروم رہ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالعموم تمام انسانوں کو ودیعت ہوئی ہیں۔ یہ بیماری ہر جگہ پائی جاتی ہے تاہم مغرب میں احتیاطی تدابیر سے اس پر بڑی حد تک قابو پایا جا چکا ہے۔ بچوں کا یرقان جو اس بیماری کا ایک بڑا سبب ہے اب قابلِ علاج مرض ہے اس لیے پاکستان میں بھی یہ بیماری آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔

رہا یہ سوال کہ ان بچوں کو حضرت شاہ دولہ کی طرف کیوں منسوب کیا جانے لگا تو اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ شاہ دولہ جو انسان دوستی میں مشہور تھے اور غریبوں و بے کسوں کا سہارا تھے اِن مریضوں کا سہارا بن گئے۔ ایسے بچے ماں باپ کے لیے ایک آزمائش بن جاتے لہٰذا حضرت شاہ دولہ از راہ شفقت ایسے بچوں کو اپنی کفالت میں لے لیتے ہوں گے۔ یوں یہ بچے آپ ہی کی کرامت سمجھے جانے لگے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مفاد پرست عناصر نے اس ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اُٹھانا شروع کر دیا ہو اور وہ بے اولاد سادہ لوح عورتوں کو ترغیب دیتے ہوں کہ وہ اس درگاہ پر منّت مانیں اور پہلا بچہ بطور شکرانہ درگاہ کے سپرد کر دیں۔ یہ بھی

ہو سکتا ہے کہ وہ صحت مند بچے کی شکل و صورت بگاڑ دیتے ہوں تا کہ اس سے مطلوبہ فوائد حاصل کیے جاسکیں۔
سنا گیا ہے کہ نذرانے کے یہ بچے انتہائی سنگدلی کے ساتھ فروخت کئے جاتے یا کرایہ پر دے دیئے جاتے ہیں اور ان سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔
اب بھی سبز چوغہ پہنے یہ چوہے کہیں کہیں بھیک مانگتے نظر آتے ہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو کوئی نہ کوئی ہٹا کٹا شخص ان کے ساتھ سائے کی طرح لگا نظر آ جاتا ہے۔ چوہے بیچارے کے مقدر میں تو قُوتِ لایموت ہی ہوتی ہے لیکن وہ ہٹا کٹا شخص اسے ملنے والی خیرات پر ہر طرح کے اللّے تللّے روا رکھتا ہے۔
ہمارے پرائمری سکول کے زمانہ میں ماسٹر محمد شفیع اسلم کئی بار سکول میں بلائے گئے تا کہ وہ میجک لینٹرن کے ذریعہ بچوں کو جماعت احمدیہ کی غیر از جماعت حلقوں میں اپنی اشاعت کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں کی تصویری جھلکیاں دکھا سکیں۔ وہ سلائیڈز کے ساتھ رننگ کمنٹری بھی کرتے تھے جسے لیکچر کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ میں تو اس وقت تک یونائیٹڈ سٹیٹس انفرمیشن سروس والوں کی طرف سے دکھائی جانے والی امریکہ کے بارے میں کئی دستاویزی فلمیں دیکھ چکا تھا لہٰذا میرے لیے یہ سلائیڈز کوئی اچنبھا نہ تھیں لیکن ہمارے سکول کے بہت سے لڑکوں کے لیے یہ چیز بالکل نئی تھی چنانچہ وہ یہ سلائیڈز بہت انہماک کے ساتھ دیکھتے اور اس بات پر سخت حیران ہوتے کہ کس طرح ایک تصویر خود بخود پردے پر نمودار ہوتی ہے اور چند لمحے نظروں کے سامنے رہنے کے بعد یکدم آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔
مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ ماسٹر محمد شفیع اسلم نے ایک دو بار سکول میں ہمیں اپنی کچھ نظمیں بھی ترنم کے ساتھ سنائیں۔
اُس وقت تو مجھے علم نہ تھا کہ ماسٹر محمد شفیع اسلم کون ہیں لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا میرے دل میں ان کے جذبہ ایمانی کی قدر بڑھتی گئی۔ چند سال پہلے ان کی خودنوشت سوانح ''میری کہانی'' جو اُن کی وفات کے کئی سال بعد ان کے بیٹے الیاس احمد اسلم نے انگلستان سے شائع کی تھی میری نظر سے گذری تو اندازہ ہوا کہ موصوف جو پیشے کے اعتبار سے استاد تھے انتہائی مخلص احمدیوں میں سے تھے اور انہوں نے شُدھی کی تحریک کے رد کے لیے سادھو کے بہروپ میں حد درجہ جانفشانی سے کام کیا۔ ان سے پہلے حضرت مفتی محمد صادق اور مولانا عبدالرحیم نیّر میجک لینٹرن کے ذریعہ لیکچروں کی بنیاد ڈال چکے تھے لیکن ماسٹر محمد شفیع اسلم نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ کام ایک نئے جذبے کے ساتھ شروع کیا۔ انہیں یہ تحریک کیسے پیدا ہوئی اور خدا تعالیٰ نے نامساعد حالات کے باوجود اس بظاہر ناممکن کام کو کیسے ممکن کر دکھایا، اس کی تفصیلات ''میری کہانی'' میں موجود ہیں۔
ماسٹر محمد شفیع اسلم کے اپنے بیان کے مطابق انہیں ۱۹۴۰ء کے جلسہ سالانہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحریک ہوئی کہ وہ میجک لینٹرن کے ذریعے اشاعتِ احمدیت کی کوشش کریں۔ اس زمانے میں میجک لینٹرن کی قیمت دو سے ڈھائی سو روپے کے درمیان تھی اور ایک سلائیڈ دو روپے کی بنتی تھی۔ ایک لیکچر کے لیے کم از کم پچاس سلائیڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے انہیں تین چار سو روپیہ درکار تھا مگر ان کے پاس ایک پیسہ بھی موجود نہ تھا۔ بالآخر خدا تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی اور غیب سے ایسے سامان پیدا فرما دیئے کہ ان کا یہ کام آسان ہو گیا، انہوں

نے کسی طرح یہ میجک لینٹرن خرید لی اور اس کے ذریعہ سینکڑوں لیکچر دیئے۔

میں چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا جب سکول کی انتظامیہ کی طرف سے ایک شعبدہ باز کو بلایا گیا۔ مجھے یاد ہے ہم سب اس کی شعبدہ بازیاں دیکھنے کے لیے سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں جمع ہوئے تھے۔ اس کا دکھایا ہوا ایک شعبدہ جو مجھے اب تک یاد ہے کچھ اس طرح تھا کہ اس نے ایک لڑکے کو کھڑا کیا اور پھر اس کے بازو کو یوں حرکت دینا شروع کی جیسے وہ نلکا ''گیڑ'' رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ایک کان میں سے پانی اس طرح نکلنا شروع ہو گیا جس طرح نلکے میں سے نکلتا ہے۔ جب تک وہ یہ ''نلکا'' گیڑتا رہا، پانی نکلتا رہا حتیٰ کہ اس پانی سے پاس کھڑے ایک بچے کے ہاتھ میں پکڑا ہوا برتن لبالب بھر گیا۔

آٹھویں، نویں اور دسویں میں ہماری کلاسیں بالعموم کلاس رومز میں ہوا کرتی تھیں لیکن کچھ اساتذہ موسم سرما میں دھوپ کی تمازت سے لطف اندوز ہونے کے لیے اور موسم گرما میں درختوں کی خنک چھاؤں کا مزا لینے کے لیے کلاسیں باہر بھی لے لیا کرتے تھے۔

نویں جماعت میں ایک نئے استاد ہمیں اردو پڑھانے کے لیے آئے۔ ایک بار وہ بڑی ترنگ میں تھے چنانچہ انہوں نے پڑھانے کی بجائے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں جس کی تان ان کی اپنی شاعری پر ٹوٹی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ شعر کہتے ہیں لیکن سچ پوچھیں تو میں شعر پرکھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ یہی کیفیت باقی کلاس فیلوز کی تھی لیکن طلبہ کو کلاس میں پڑھائی سے رخصت مل جانا ان کے لیے سب سے بڑا انعام ہوتا ہے چنانچہ جب استادِ محترم نے بتایا کہ وہ سبق پڑھانے کی بجائے آج ہمیں اپنی ایک غزل سنائیں گے تو طلبہ نے اک نعرہ تحسین بلند کیا اور بصد شوق شعر سننا شروع کر دیئے۔

ماسٹر صاحب نے ہمیں جو غزل سنائی اس کا پہلا شعر تھا:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

اگرچہ عمر کے اُس حصے میں ہم اس شعر کی روح پورے طور پر سمجھنے سے قاصر تھے لیکن پھر بھی ہم اس شعر سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ اس شعر پر طلبہ سے ملنے والی داد نے استادِ محترم کا حوصلہ بڑھایا اور انہوں نے اس غزل کا دوسرا شعر یوں طلبہ کی نذر کیا:

با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

طلبہ نے اس شعر پر بھی داد کے ڈونگرے برسائے۔ تب استادِ محترم نے کچھ اور شعروں کے بعد اپنا ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے کہا:

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گذریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

جب استادِ محترم کو داد ملتی تو وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر کہتے کہ ”ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے، اگلا شعر سنو گے تو تمہیں پتا چلے گا کہ میں نے کس درجہ خوبصورت بات کہی ہے۔“

یوں انہوں نے آہستہ آہستہ پوری غزل سنا ڈالی اور اسی دوران ان کا پیریڈ ختم ہوگیا۔ اب ہمیں اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا کہ ہمارے یہ استاد بہت پائے کے شاعر ہیں اور بحثیت شاعر ان کی شہرت بلاوجہ نہیں ہے۔

اس بات پر عرصہ گذر گیا۔ میں کالج میں داخل ہوگیا جہاں اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ اردو کی کتاب میں شاعری کا ایک انتخاب بھی شامل تھا اور اس انتخاب میں ایک غزل حسرت موہانی کی بھی تھی۔

جب میں نے یہ غزل پڑھی تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں یہی غزل پہلے بھی پڑھ یا سن چکا ہوں۔ ذہن نے اوراقِ ماضی پلٹنا شروع کیے تو یاد آیا کہ یہ تو وہی غزل ہے جسے ہمارے ایک استاد نے ہمارے سامنے اپنی غزل کے طور پر پیش کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ عین ممکن ہے حسرت موہانی نے یہ غزل ہمارے استاد کے شعری مجموعہ سے اڑائی ہو لیکن جب پتا چلا کہ حسرت موہانی تو بہت پہلے انتقال کر گئے تھے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ استادِ محترم ہی سرقے کے مرتکب ہوئے تھے۔

جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو آپا ملتان میں مقیم تھیں۔ ان کے شوہر مشہور تعمیراتی فرم ”گیمن لمیٹڈ“ میں کام کر رہے تھے۔ اسی سال آپی نے بی اے کا امتحان دیا تھا اور ہم دونوں فارغ تھے چنانچہ ابا جی نے ہمیں چند دنوں کے لیے ملتان بھجوا دیا تا کہ ہماری سیر وتفریح بھی ہو جائے اور ہم اپنی نومولود بھانجی بشریٰ (جو اَب ماشاء اللہ ڈاکٹر ہے اور لاہور میں مقیم ہے) کی نگہداشت میں آپا کی کچھ مدد کر سکیں۔

اس زمانے میں ربوہ سے ایک ہی ٹرین سیدھی ملتان جاتی تھی جسے چناب ایکسپریس کہا جاتا تھا۔ یہ ٹرین صبح نو، ساڑھے نو بجے ربوہ سے روانہ ہوتی اور سہ پہر پانچ بجے کے لگ بھگ ملتان پہنچتی۔ ابا جی نے آپی کو زنانہ ڈبے میں سوار کرا دیا جب کہ میں مردوں کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ اس وقت تک مجھے تنہا سفر کا کوئی تجربہ نہ تھا لہٰذا میں قدرے سہما ہوا تھا۔ میں نے از خود کسی سے کوئی بات نہیں کی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ایک مسافر مجھ سے غیر ضروری محبت جتلانے لگا ہے۔ وہ اُن چرب زبان لوگوں میں سے تھا جو دوسروں کو بہت جلد شیشے میں اتار لیتے ہیں۔ وہ میرے بارے میں ہر بات پوچھتا گیا اور میں اپنی سادگی میں اس کے ہر سوال کا جواب بہت تفصیل سے دیتا رہا۔ الغرض اسے جلد ہی معلوم ہو چکا تھا کہ میں کون ہوں، ملتان کیوں جا رہا ہوں، وہاں کس کے پاس ٹھہروں گا اور اس سفر میں میرے ہمراہ کون ہے۔

چک جھمرہ جنکشن اس ٹرین کا پہلا طویل سٹاپ تھا۔ ایسے سٹیشنوں پر اکثر مسافر پلیٹ فارم پر اتر جاتے ہیں۔ کچھ اپنی ضرورت کی اشیاء خریدتے ہیں تو کچھ ٹانگیں سیدھی کرنے کے خیال سے نیچے اتر کر چہل قدمی کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ چک جھمرہ ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکتے ہی اکثر مسافر نیچے اتر گئے تاہم چند لوگ اندر ہی بیٹھے رہے۔ میں بھی ان ہی مسافروں میں شامل تھا۔ اس دوران اس کی کوشش رہی کہ میں اس کے ہمراہ ایک خالی پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے چلوں۔ اس نے مجھے یہ لالچ بھی دیا کہ وہ وہاں جانے سے پہلے کھانے پینے کی

کچھ اشیاء بھی خرید لے گا اور ہم وہاں آرام سے بیٹھ کر ان سے لطف اندوز ہوں گے لیکن نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ شخص بظاہر میرا دوست لیکن در پردہ میرا دشمن ہے اور لالچ دے کر یا تو مجھے اغوا کرنا چاہتا ہے یا دھوکے سے مجھ سے کوئی ایسا کام لینا چاہتا ہے جو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میرے انکار کے باوجود اس کا اصرار قائم رہا لیکن جب اس نے محسوس کرلیا کہ میں اس کی بات ماننے والا نہیں ہوں تو وہ خاموش ہو گیا لیکن ناراض نہیں ہوا اور اس نے راستے میں ایک سے زیادہ بار خود کو میرا ہمدرد ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن خدا نے میری حفاظت کی اور میں اس کے شر سے محفوظ رہا۔

جب ٹرین ملتان پہنچی اور میں پلیٹ فارم پر اترا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی نیچے اتر آیا۔ وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا کوئی ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر کسی وجہ سے کوئی لینے نہیں آسکا تو ہمیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ وہ خود ہمیں ہمارے گھر پہنچا دے گا لیکن خدا کا شکر میرے بہنوئی آئے ہوئے تھے۔ جب ہماری ان سے ملاقات ہوگئی تو اس نے مایوس ہو کر ہمارا پیچھا چھوڑ دیا۔

اس واقعہ کو نصف صدی گذر چکی ہے لیکن میں آج بھی یہی سمجھتا ہوں کہ وہ شخص میری سادگی سے فائدہ اٹھا کر مجھے اپنے ہمراہ لے جانے کی کوشش میں تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ میرے ہوش وحواس قائم رہے اور میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آیا ورنہ آج نا معلوم میں کس حال میں ہوتا۔

مجھے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق جانے کیسے پیدا ہوا تھا لیکن یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ چوتھی جماعت میں پہنچنے تک میرا یہ شوق جنون کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس زمانے میں میرے بعض اور ہم جماعتوں نے بھی یہی مشغلہ اختیار کر رکھا تھا اور شاید چھوت چھات کی یہ بیماری مجھے ان ہی میں سے کسی سے لگی تھی لیکن اب جب کہ یہ بیماری لاحق ہو چکی تھی مسئلہ یہ درپیش تھا کہ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ حاصل کیسے کیے جائیں۔ ابا جی کے دفتر میں غیر ممالک سے تو درکنار، پاکستان سے بھی قابلِ ذکر ڈاک موصول نہ ہوتی تھی البتہ خلافت لائبریری (جس کی عمارت کے اندر اُن کا دفتر تھا) میں طرح طرح کے اخبارات ورسائل ڈاک کے ذریعے آتے تھے اور ان کے لفافوں یا ریپرز پر ٹکٹ چسپاں ہوتے تھے۔ خلافت لائبریری میں ممالکِ غیر سے ڈاک کے امکانات بھی رد نہیں کیے جاسکتے تھے چنانچہ میں ابا جی کی اشیر باد سے خلافت لائبریری کے انچارج، مولوی محمد صدیق کی ردی کی ٹوکری میں جھانکنے لگا اور جوں ہی مجھے کوئی ٹکٹ نظر آتا میں لفافے کا اتنا حصہ پھاڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ اگر کسی وجہ سے لفافہ لائبریری کے لیے محفوظ رکھنا ضروری ہوتا تو میں ٹکٹ اُتار لیتا لیکن اس کوشش میں ٹکٹ عام طور پر خراب ہو جاتا۔ میں گھر پہنچ کر لفافوں کے یہ تراشے پانی کی بالٹی میں ڈال دیتا جو رات بھر بھیگے رہتے۔ صبح تک ٹکٹ کاغذ سے الگ ہو چکے ہوتے۔ انہیں سکول کی تختی، سلیٹ یا ایسی ہی کسی اور چیز پر جما کر ہوا میں خشک کرلیا جاتا۔

ایک بار مجھے اپنے ایک عزیز کے پاس انگریز دور کا ایک قبض الوصول نظر آ گیا جس کے ہر صفحے پر آٹھ آٹھ دس دس رسیدی ٹکٹ چسپاں تھے۔ میں اُس وقت تک رسیدٹکٹ اور ڈاک کے ٹکٹ کا فرق نہیں سمجھتا تھا چنانچہ میں نے دبے لفظوں میں ان سے اس رجسٹر کی فرمائش کر ڈالی۔ یہ رجسٹر ان کے کسی کام کا نہ تھا چنانچہ انہوں نے

فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔ میں نے اس رجسٹر میں چسپاں تمام ٹکٹیں اُتار لیں اور بہت دنوں تک اپنے خزینے میں اس انمول اضافے پر اتراتا رہا۔

ابا جی کے کاغذات میں بعض پرانے اخبارات از قسم پرچہ جات الحکم اور الفضل بھی ہوتے تھے جن پر ہندوستان کی ٹکٹیں لگی ہوتی تھیں۔ بعض ٹکٹیں کسی خاص ریاست سے جاری ہوئی ہوتیں چنانچہ ان پر اس ریاست کا نام مثلاً ''پٹیالہ'' یا ''نابھہ'' واضح طور پر لکھا ہوتا۔ میں اپنی سادگی میں ایسی ٹکٹوں کو ان ریاستوں کی ٹکٹیں شمار کرتا اور ہمارے ساتھی بھی ان ٹکٹوں کے بارے میں یہی گمان رکھتے۔ ہم ایک دوسرے کو فخر کے ساتھ بتایا کرتے تھے کہ ہمارے پاس ''پٹیالہ'' یا ''نابھہ'' کی اتنی اتنی ٹکٹیں ہیں۔ اسی طرح برطانیہ کی بہت سی ٹکٹوں پر اس کے بعض مقبوضات (خواہ ان کے لیے کوئی بھی اصطلاح استعمال ہوتی ہو) مثلاً بحرین یا کویت کے نام لکھے ہوتے تھے۔ ہم یہ ٹکٹیں برطانیہ کی بجائے بحرین اور کویت کی شمار کرتے۔

بعض قارئین کے لیے یہ بات شاید نئی ہو کہ سید زین العابدین ولی اللہ شاہ کی اہلیہ کا تعلق شام سے تھا لیکن وہ شادی کے بعد اپنے میکے نہیں جا سکی تھیں۔ ۱۹۵۶ء میں وہ اپنے اعزّہ و اقارب سے ملاقات کے لیے اپنی بعض بیٹیوں کے ہمراہ دمشق گئیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ان کی بیٹی طاہرہ آپی کی سہیلی تھیں اور میں بھی ان سے بے دھڑک بات کر لیتا تھا۔ جب آپی کو طاہرہ کا پہلا خط آیا تو میں نے آپی سے فرمائش کر ڈالی کہ طاہرہ واپسی پر میرے لیے وہاں کی ٹکٹیں لے کر آئیں۔ انہوں نے یہ بات یاد رکھی اور جب وہ پاکستان واپس آئیں تو میرے لیے مختلف ملکوں کی کئی سو ٹکٹیں لے کر آئیں۔ غالباً ان کا کوئی قریبی عزیز شام کی وزارتِ خارجہ میں ملازم تھا اور انہوں نے دیس دیس کے یہ ٹکٹ اپنے اسی عزیز کی معرفت حاصل کئے تھے۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر اس وقت تک یہ ٹکٹ میرے خزینے میں سب سے بڑا اضافہ تھے۔

اُسی زمانے میں ربوہ سے باہر مقیم میرے ایک دو عم زادوں نے ذکر کیا کہ ان کے ہاں بازار میں استعمال شدہ ٹکٹیں بھی ملتی ہیں لیکن نہ ان کے پاس اتنی فاضل رقم ہوتی کہ وہ ٹکٹیں خرید کر مجھے بھجوا سکتے نہ میں انہیں ربوہ سے کوئی رقم بھجوانے کے قابل تھا لیکن دو چار بار ان کی طرف سے بھی مجھے ٹکٹوں کے کچھ سیٹ تحفتاً موصول ہوئے۔

ٹکٹوں میں اضافے کا ایک مروّجہ طریق ٹکٹ جمع کرنے والوں کا ٹکٹوں کا آپس میں تبادلہ تھا جس کے لیے ہم اپنی کم علمی کی وجہ سے ''چینج'' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ ہم اپنے اپنے البم اٹھا کر ایک جگہ جمع ہو جاتے اور ایک دوسرے کی موجودگی میں انہیں دیکھتے۔ اگر کسی دوسرے کے البم میں موجود کوئی ڈپلیکیٹ ٹکٹ پسند آ جاتی تو باہمی رضامندی سے اپنے پاس موجود کسی ڈپلیکیٹ ٹکٹ کے ساتھ اس کا تبادلہ کر لیتے۔ ہم اس کام میں منہمک ہو کر دنیا کا ہر اور کام بھول جاتے لہٰذا ہم گھر سے نکلتے ہوئے اہلِ خانہ کو عام طور پر بتا کر جاتے کہ ہم ٹکٹیں چینج کرنے کے لیے فلاں جگہ جمع ہو رہے ہیں اور دیر سے واپس آئیں گے۔

اواخر ۱۹۵۷ء یا اوائل ۱۹۵۸ء میں کسی نے مجھے بتایا کہ تحریک جدید کے ریسٹ ہاؤس میں جو اِن دفاتر کے کونے پر واقع تھا ایک انگریز مقیم ہے جو ٹکٹ جمع کرنے کا شوقین ہے اور اپنے جیسے ٹکٹ جمع کروانے والوں

کے ساتھ ٹکٹ ایکسچینج کرنا پسند کرتا ہے۔ میں نے یہ بات انجمن کوارٹرز ہی کے ایک اور ہم ذوق کو بتائی اور ہم نے طے کیا کہ ہم اس سے ملیں گے۔ شروع میں تو ہم کسی انگریز سے ''ملاقات'' کے لیے مطلوبہ اعتماد کی کمی محسوس کرتے تھے لہٰذا اس کے پاس جانے میں متذبذب تھے لیکن ایک روز ہم نے ریسٹ ہاؤس کا دروازہ جا کھٹکھٹایا اور جب وہ انگریز باہر آیا تو ہم نے جھجکتے جھجکتے غالباً پنجابی زبان میں حرفِ مدعا بیان کر دیا۔ خلافِ توقع عمر میں واضح تفاوت کے باوجود اس نے ہماری بات پر کسی ناموافق ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور بتایا کہ وہ ہمارے ساتھ ٹکٹ ایکسچینج کرنے کو تیار ہے۔

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہم ٹکٹ تو ضرور جمع کرتے تھے لیکن اس مشغلے کے رموز سے آشنا نہ تھے چنانچہ ہمارے پاس موجود ٹکٹوں میں بہتوں کے دندانے ٹوٹے ہوتے تھے، بعض ٹکٹ پھٹ جاتے تھے اور بعض ٹکٹوں پر گوند یا پانی کے داغ لگ جاتے جس کی وجہ سے ان کی چکا چوند ماند پڑ جاتی۔ میں اور مجھ ایسے ٹکٹ جمع کرنے کے دوسرے شوقین جو اس مشغلے کو غیر سائنسی بنیادوں پر جاری رکھے ہوئے تھے پھٹے ہوئے ٹکٹ بھی سنبھال کر رکھتے تھے اور اپنے پاس موجود ٹکٹوں کی گنتی کرتے ہوئے انہیں بھی اپنے خزینے کا حصہ شمار کرتے۔

اس انگریز کا طریق کار ہم سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے اپنا البم تو ہمیں کبھی نہیں دکھایا البتہ وہ قابلِ تبادلہ ٹکٹ چینی کی پلیٹوں میں رکھتا تھا۔ یہ ٹکٹ لفافوں سے کاٹ کر رکھے گئے ہوتے تھے اور انہیں ان مراحل سے گذارا نہیں گیا ہوتا تھا جس کے ہم عادی تھے چنانچہ یہ تمام ٹکٹ بالکل صحیح حالت میں ہوتے اور دیکھنے میں قریباً نئے نظر آتے۔ ہم نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اس نے اپنے پاس ایک چھوٹی سی چمٹی رکھی ہوئی ہے جس کی مدد سے وہ اپنی ٹکٹیں الٹتا پلٹتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹکٹوں کو بار بار ہاتھ لگانے سے ان کی چمک جاتی رہتی ہے، ان پر میل کچیل کے نشانات لگ جاتے ہیں اور وہ چڑ مڑ ہونے لگتی ہیں۔ اسی نے ہمیں بتایا کہ پھٹی ہوئی ٹکٹیں یا دندانہ ٹوٹی ہوئی ٹکٹیں کسی جگہ قابلِ قبول نہیں رہتیں لہٰذا ہم ان کے پاس تبادلہ کے لیے صرف وہی ٹکٹیں لایا کریں جو بالکل صحیح حالت میں ہوں۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم درجنوں دفعہ اس کے پاس گئے ہوں گے لیکن ہمارے درمیان کبھی کسی اور موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ اس نے ہم سے کبھی پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں نہ خود اپنے بارے میں کبھی کوئی بات کی۔ ہم اس کے ہاں پہنچتے تو وہ چینی کی ایک دو پلیٹیں جن میں ٹکٹیں پڑی ہوتیں ہمارے سامنے رکھ دیتا۔ ابتداءً تو وہ ہمارے پاس بیٹھا رہتا تھا لیکن بعد میں وہ یہ پلیٹیں وہاں چھوڑ کر خود اندر چلا جاتا اور تاکید کر جاتا کہ ہم ان پلیٹوں میں سے جتنی ٹکٹیں لیں، اتنی ہی ٹکٹیں اپنی طرف سے واپس ان میں ڈال دیں۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا بلکہ آہستہ آہستہ ہمارے اس گروپ میں دو لڑکے اور بھی شامل ہو گئے۔ کبھی ہم چاروں اکٹھے اور کبھی الگ الگ اس انگریز کے پاس جاتے اور کچھ نئی ٹکٹیں لے کر واپس آتے۔

ایک دفعہ ہم اپنی ٹکٹیں لے کر وہاں گئے تو ریسٹ ہاؤس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ پھر گئے تو بھی وہ انگریز ہمیں نہ ملا۔ ہمیں اس کے بارے میں تشویش ہوئی تو کسی نے بتایا کہ ہمارا یہ غیر ملکی دوست انگلینڈ واپس چلا گیا ہے۔

یہ تو ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف انگریز نہیں بلکہ سکاٹش تھے اوران کا نام بشیر احمد آرچرڈ تھا۔
مجھے اس اعتراف میں باک نہیں کہ اُس وقت تک مجھے قطعاً یہ علم نہ تھا کہ وہ شخص جسے ہم ایک معمولی انگریز سمجھ رہے ہیں پہلے برطانوی الاصل واقفِ زندگی اور مربی سلسلہ ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے مقام کا اندازہ ہوا اور سچ پوچھیں تو ان کی وفات پر الفضل میں چھپنے والے مضامین سے پتا چلا کہ بشیر آرچرڈ کس عظیم الشان شخصیت کا نام تھا۔

ان قارئین کے لیے جنہیں بشیر آرچرڈ کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں اتنا عرض کر دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں احمدیت کا پیغام عبدالرحمٰن دہلوی نامی ایک احمدی کے ذریعہ ملا جو فوج میں ان کے ساتھ حوالدار کلرک تھے۔ عبدالرحمٰن دہلوی نے ان کے قبولِ احمدیت کے حالات اپنے ایک مضمون میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کر رکھے ہیں تاہم انہیں دہرائے بغیر یہاں بشیر آرچرڈ کے خودنوشت حالات درقبولِ احمدیت کے اردو ترجمہ پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جن حالات میں مجھ کو احمدیت کو سمجھنے کی توفیق ملی وہ غیر معمولی تھے۔ ہوا یوں کہ میں جب ۱۹۴۴ء میں ہند برما کی سرحد پر چودہ آرمی میں متعین تھا مجھ کو فوج کی طرف سے دو ہفتے کی چھٹی کا حق دیا گیا کہ کہیں جا کر آرام کرسکوں لیکن ہندوستان میں میری کہیں واقفیت نہ تھی کہ وہاں جا کر وقت گذار سکتا۔ اندریں حالات میری یونٹ کے ایک حوالدار کلرک نے مجھ کو تحریص دلائی کہ میں یہ چھٹیاں قادیان جا کر ایک شریف النفس انسان مفتی محمد صادق کے ساتھ گذاروں۔ برما کی سرحد سے قادیان کا فاصلہ اس قدر زیادہ تھا کہ اتنے لمبے سفر کے خیال سے میں تذبذب میں پڑ گیا لیکن اس کے چہرہ پر سخت ناخوشگواری کے آثار دیکھ کر آخر کار مجھ کو اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ منی پور کے جنگی محاذ کی پہاڑیوں سے پنجاب کے وسیع وعریض میدانوں تک کا سفر آٹھ دن میں ختم ہوا۔ قادیان کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی سے اُتر کر اطمینان کا سانس لیا اور ایک تانگے والے سے کہا کہ مجھ کو مفتی صادق صاحب کے گھر لے چلو۔ ان کے گھر پہنچ کر میں ایک سفید ریش بزرگ سے متعارف ہوا اور میرے خیال میں ہم دونوں پر ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک خاص محویت طاری ہوگئی۔

قادیان کی زیارت نے مجھ پر ایک گہرا اثر ڈالا کیوں کہ احمدیت کو اس روشنی میں دیکھنے کا موقع ملا جو اس سے پیشتر کہیں میسر نہ آئی تھی۔ اس نیک اثر سے جو اس جگہ نے اور وہاں کے لوگوں نے جن سے مجھ کو ملنے کا موقع ملا میرے دل میں ایک خاص رشتہ الفت پیدا کر دیا۔ اس وقت مجھ کو نہ دینیات سے پوری طرح آگاہی تھی اور نہ ہی میں نے مذاہب کے بارے میں تقابلی مطالعہ کیا تھا اس لیے دلائل و براہین کی بحث میرے لیے احمدیت کا اثر قبول کرنے میں اس قدر ممد ثابت نہ ہوئی جتنا کہ اس کے ثمرات نے مجھ کو متاثر کیا جو مجھ کو کہیں اور نہ ملے تھے۔

میرے اس مختصر قیام کے دوران مجھ کو تقدس مآب حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام جماعت احمدیہ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھ کو یہ احساس ہوا کہ میں ایک روحانی شخصیت کے حضور بیٹھا ہوں۔ یہ احساس آپ کی کسی گفتگو کے نتیجہ میں نہ تھا بلکہ اس کے دو نہایت قوی موجبات تھے۔ ایک تو آپ کی

روحانی وضع قطع تھی اور دوسرے غیر مرئی طور پر آپ کے وجود سے نہایت تیز روحانی کرنیں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اگرچہ آپ اس مادی دنیا میں رہ رہے تھے لیکن صاف ظاہر تھا کہ آپ کا تعلق عالمِ روحانیت سے ہے۔
چونکہ مجھ کو اپنا بیان نہایت مختصراً عرض کرنا ہے گویا کہ اس لمبی کہانی کہ میں کس طرح گرجا سے بیوت الذکر کی طرف آیا بیان کرنے میں دریا کو کوزہ میں بند کرنا مراد ہے تو پھر اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ مجھ کو تو بس احمدیت نے اپنی مقناطیسی قوت سے از خود اپنی طرف کھینچ لیا۔''

قبولِ احمدیت کے بعد بشیر آرچرڈ نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے یکم مئی ۱۹۴۷ء کو قادیان آ گئے۔ چند ماہ وہاں رہے اور پھر پاکستان سے انگلستان بھجوا دیئے گئے جہاں انہوں نے گلاسگو میں احمدیہ مشن کی بنیاد رکھی اور پھر گیانا، ٹرینیڈاڈ، سکاٹ لینڈ اور آکسفورڈ میں بطور مربی سلسلہ خدمات بجا لاتے رہے۔ وہ نو سال تک Review of Religions کے ایڈیٹر رہے۔ انہوں نے تراسی سال کی عمر میں ۸ جولائی ۲۰۰۲ء کو انگلستان میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے نوعمری میں ان کے ساتھ انٹرایکشن کا کچھ موقع ملا۔ انہوں نے مجھ ایسے بچوں پر اندھا دھند اعتماد کر کے ہم پر دیانتداری کی اہمیت کو واضح کیا۔ میرا خیال ہے وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کوئی احمدی بچہ اس معاملہ میں بددیانتی کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور خدا کا شکر ہے ہم نے ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔

یہاں یہ ذکر بھی شاید بے جا نہ ہو کہ مجھے ربوہ میں قیام کے دوران بشیر احمد آرچرڈ کے ساتھ ساتھ اُن کے محسن، عبدالرحمٰن دہلوی کو بھی دیکھنے کا موقع ملا جو ڈاکٹر عبدالرحیم دہلوی کے صاحبزادے اور صوبیدار عبدالمنان، افسر حفاظتِ خاص کے بھائی تھے۔ ان دنوں وہ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ تشریف لا چکے تھے اور جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی وہ دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں کام کر رہے تھے۔ وہ اباجی کی خدماتِ سلسلہ کے معترف تھے اور اسی حوالے سے مجھے بہت پیار دیتے تھے۔ میں جب کبھی حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کے ساتھ ملاقات کے لیے حاضر ہوتا تو ان سے بھی سرسری سی ملاقات ہو جاتی۔

اس زمانے میں ان کی رہائش محلّہ دارالصدر غربی میں چوہدری ظہور احمد باجوہ کے مکان کے بالمقابل بیت انوار کے پہلو میں تھی۔ وہ سادہ، منکسر المزاج اور انتہائی شریف النفس تھے۔ میں انہیں بائیسکل پر اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھتا تھا۔ سردیوں میں بالعموم گہرے خاکی رنگ کی جرسی پہنتے جو فوجی یونیفارم کا حصہ ہوتی ہے۔

مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۸۲ء میں کینیڈا منتقل ہو گئے تھے جہاں ان کے بیٹے فضل الرحمٰن عامر پہلے سے مقیم تھے اور انہوں نے فروری ۲۰۰۹ء میں ننانوے برس کی عمر میں وہیں وفات پائی۔

میں سمجھ رہا ہوں کہ عبدالرحمٰن دہلوی کے ذکر میں محو ہو کر میں اصل موضوع سے ذرا ہٹ سا گیا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ میرے اس شوق کے بارے میں مزید کچھ جاننا چاہتے ہیں لیکن میں کیا عرض کروں کہ میٹرک کرتے ہی میرا یہ شوق بالکل ماند پڑ گیا۔ اس زمانے کی کچھ ٹکٹیں میرے پاس اب تک رکھی پڑی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے اس شوق کو سائنسی بنیادوں پر جاری نہ رکھ سکا جس کی ایک وجہ وسائل کی کمی اور اس موضوع پر مطالعہ کا فقدان تھا۔

جب ہم ہائی سکول میں تھے تو آدھی چھٹی کے دوران کبھی کبھار اساتذہ کے کوارٹروں کی طرف جانکلتے۔ وہاں کھڑے ریلوے لائن کے اُس پار پہاڑی کے اوپر پتھر کی بڑی بڑی تین چار سیڑھیاں سی نظر آتیں۔ کسی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ رائفل کلب کا فائرنگ رینج ہے۔

ایک بار ہم تین چار لڑکے یہ فائرنگ رینج دیکھنے گئے لیکن پتھر کی بنی ہوئی تین چار سیڑھیوں اور ایک ٹارگٹ کے علاوہ کوئی چیز نظر نہ آئی۔ ان چیزوں کے ساتھ ہماری دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہم تو چاند ماری کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ ہم اسی لالچ میں تین چار بار وہاں گئے لیکن ہماری یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے بعد یعنی جب سے ہم ہائی سکول میں پہنچے تھے رائفل کلب کی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے ابتدائی سالوں میں جب حکومتی سرپرستی میں رضا کاروں کی فوجی تربیت کا سلسلہ جاری تھا یہ رائفل کلب حکومتی ایما پر قائم کیا گیا تھا۔

اس ضمن میں الفضل میں شائع ہونے والی تین خبریں دلچسپی سے پڑھی جانے کے لائق ہیں۔ پہلی خبر الفضل ۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء میں چھپی ہوئی ہے۔ تفصیل کے مطابق ”جناب کیپٹن مہابت خاں صاحب سِول ڈیفنس آفیسر ضلع جھنگ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۱ء کو صبح ربوہ تشریف لائے۔ ...... صاحبزادہ مرزا منور احمد صاحب کی ہدایات کے ماتحت اس موقع پر اہلِ ربوہ کی طرف سے اے آر پی کا ایک مظاہرہ کیا گیا جسے ملاحظہ فرما کر معزز مہمان بہت متاثر ہوئے۔ ...... صاحبِ موصوف نے اس تقریب پر اہلِ ربوہ کو خطاب کرتے ہوئے رضا کاروں کے کام پر انتہائی خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا اور مبارک باد دی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے ضلع بھر میں اس قسم کی تربیت کا مظاہرہ آج تک نہیں دیکھا۔ میں جہاں بھی گیا مایوس ہو کر لوٹا کیوں کہ اکثر جمگھٹے تو بہت ہوتے ہیں لیکن وہاں تنظیم و تربیت کا فقدان تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ربوہ ایسی نو آباد جگہ میں ایسے تربیت یافتہ اور منظم رضا کار موجود ہیں۔ ...... آپ نے ملکی حالات کے پیشِ نظر اہلِ ربوہ سے ہر قسم کے تعاون کی توقع کا اظہار فرمایا اور مظاہرہ مذکور کے انسٹرکٹر شیر احمد خان صاحب کی قابلیت اور محنت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی خدمات طلب فرمائیں تا ضلع کے دوسرے مقامات میں بھی نوجوانوں کو تربیت دی جاسکے۔

آپ نے ربوہ میں رائفل کلب جاری کرنے کی بھی تلقین فرمائی اور اس بارہ میں حتی الامکان اپنے تعاون کا یقین دلایا۔“

دوسری خبر ۲۷ نومبر ۱۹۵۱ء کے اخبار میں ”ربوہ کی ڈائری“ کے عنوان سے شائع ہوئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتی پالیسی کے تحت ان دنوں ربوہ میں قومی رضا کاروں کی تربیت جاری تھی۔ خبر کے مطابق ”مورخہ ۱۹ نومبر کو ڈپٹی کمشنر ضلع جھنگ تشریف لائے اور شام کے وقت قومی رضا کاروں کا اے آر پی کا مظاہرہ ملاحظہ فرمایا جس سے آپ بہت متاثر ہوئے۔ آپ نے بعد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے سارے ضلع جھنگ میں اتنا اعلیٰ اور تربیت یافتہ مظاہرہ کہیں نہیں دیکھا اور سارے ضلع کے لیے ربوہ ایک نمونہ ہے۔“

تیسری خبر (جو ۲۱ دسمبر ۱۹۵۱ء کے الفضل میں شائع ہوئی) سے پتا چلتا ہے کہ یہ رائفل کلب مجلس خدام

الاحمدیہ مرکزیہ کے تحت قائم ہوا تھا اور اس کے نگران نائب صدر مجلس، صاحبزادہ مرزا منور احمد تھے۔ خبر کے مطابق
''ربوہ، چنیوٹ اور احمد نگر کے خدام نے ۶ نومبر ۱۹۵۱ء کو رائفل کلب کا رینج تیار کرنے کے لیے ربوہ میں چوتھا وقارِ عمل
منایا۔ تقریباً چار گھنٹے تک نوجوانوں نے پتھر اُٹھانے اور گڑھوں کو ہموار کرنے کا شدید محنت طلب کام کیا۔
صاحبزادہ مرزا منور احمد صاحب نائب صدر کی نگرانی میں یہ کام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو جلد پایہ تکمیل تک پہنچائے۔''

حال ہی میں مجھے یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ یہ فائرنگ رینج اب کس حال میں ہے چنانچہ میں ایک روز ادھر جا نکلا لیکن پہاڑیوں کی شکل اتنی بدل چکی تھی کہ مجھے اس جگہ کے تعین میں بہت دشواری ہوئی۔ اتفاق سے میری ملاقات چوہدری نصیر الحق سے ہوگئی جو تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کے سیکنڈ ماسٹر، چوہدری عبدالرحمٰن کے صاحبزادے ہیں اور ان دنوں امریکہ سے عارضی طور پر ربوہ آئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد تھا کہ ان کا گھر فائرنگ رینج سے زیادہ دور نہ تھا۔ جب ان سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا: ''اب فائرنگ رینج تو موجود نہیں رہی۔ پتھر کی وہ سیڑھیاں جنہیں آپ ڈھونڈتے پھرتے ہیں اب خواب وخیال ہو چکی ہیں اور عین اس جگہ ایک صاحب نے اپنا مکان تعمیر کرلیا ہے۔ چاہیں تو میں آپ کی ان سے ملاقات کرا سکتا ہوں۔''

اُن کا اشارہ چوہدری محمد دین کی طرف تھا جو وکالت اشاعت، تحریک جدید انجمن احمدیہ میں کام کررہے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے چوہدری نصیر الحق کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا: ''میرے ماموں یار محمد یہاں چوکیدار ہوا کرتے تھے۔ انہیں اس کلب کے سیکرٹری، صاحبزادہ مرزا منور احمد نے بھرتی کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے میرے ماموں کی تقرری ٹاؤن کمیٹی ربوہ میں کروادی لیکن وہ ڈیوٹی یہیں کرتے تھے۔''

''آپ کے ماموں کب یہاں چوکیدار بھرتی ہوئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم لوگ مقبوضہ کشمیر کے رہنے والے ہیں اور وہیں سے پاکستان آئے تھے۔ ۱۹۵۶ء تک گوجرانوالہ میں رہے لیکن پھر ربوہ منتقل ہوگئے۔ میں نے دسویں کا امتحان یہیں سے پاس کیا تھا۔''

''کتنی عمر میں آپ ربوہ آئے تھے؟''

''آپ خود ہی اندازہ لگالیں۔ سولہ، سترہ سال کا تو ضرور ہوں گا۔ میں نے میٹرک ۱۹۵۷ء میں کیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کو اس دور کی ساری باتیں یاد ہوں گی۔ آپ یہ بتایئے کہ اُس وقت اِس جگہ کی کیا کیفیت تھی؟''

''یہاں ایک کمرہ ہوتا تھا جس میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی ہوتی تھیں۔ ساتھ ایک چھوٹا سا کچن تھا لیکن اس جگہ بجلی تھی نہ پانی۔ ہم نے ماموں کے ساتھ یہیں ڈیرا لگالیا۔ اسی اثناء میں کسی وجہ سے انتظامیہ کی رائفل کلب کے ساتھ دلچسپی معدوم ہوگئی اور صاحبزادہ مرزا منور احمد کے حکم پر یہاں موجود میز کرسیاں ان کے گھر پہنچا دی گئیں۔ یوں یہ جگہ مکمل طور پر ہمارے تصرف میں آگئی۔ سرکاری زمین تھی اور کسی نے ہمیں یہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش نہیں کی سو آہستہ آہستہ ہم نے یہیں اپنا مکان تعمیر کرلیا۔''

''آپ نے اس جگہ چاند ماری ہوتی دیکھی ہے؟''

نہیں ، بالکل نہیں البتہ میں یہ تصدیق ضرور کر سکتا ہوں کہ سامنے پہاڑی پر سفید رنگ کے تین ٹارگٹ بنے ہوئے تھے۔ ممکن ہے کسی مرحلے پر کچھ لوگ یہاں چاند ماری کرتے رہے ہوں لیکن اگر ایسا ہے تو یہ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے۔ اب تو کسی کو پتا بھی نہیں کہ یہاں کوئی فائرنگ رینج تھی۔ آپ نہ جانے کیسے اِدھر آ نکلے ہیں۔''

ہم ساتویں جماعت میں تھے جب ہمارے سکول کی ہاکی ٹیم چنیوٹ کے کسی سکول کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے گئی۔ میچ کی وجہ سے سکول میں غیر متوقع طور پر چھٹی کا اعلان کر دیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ وہاں جا کر اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کر سکیں۔ اُس زمانے میں ربوہ سے چنیوٹ کا ریل کا ایک سواری کا کرایہ چار آنے تھا۔ میرے پاس اتفاق سے آٹھ آنے موجود تھے چنانچہ میں نے اور میرے چچازاد، زکریا داؤد نے اپنے طور پر حساب لگایا کہ اگر ہم ٹرین سے چنیوٹ چلے جائیں اور ٹرین ہی سے واپس آئیں تو اس رقم میں ہمارا یہ سفر طے ہو سکتا ہے اور یوں ہم بغیر سوچے سمجھے ربوہ سے چنیوٹ جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔

یہ میچ اُس گراؤنڈ میں کھیلا گیا جو چنیوٹ کے ریلوے پھاٹک کے پاس ہوا کرتی تھی۔ ہم ریلوے سٹیشن سے پیدل وہاں پہنچے اور یہ میچ دیکھا تاہم ہمیں اندازہ تھا کہ ہمارے پاس صرف واپسی کا کرایہ ہی موجود ہے لہٰذا ہم نے سارا دن بھوکے گذارا۔ شام کو ٹرین غیر معمولی طور پر لیٹ تھی چنانچہ ہم نے طے کیا کہ ہم بس کے ذریعے واپس چلے جاتے ہیں لیکن اس زمانے میں بس کا کرایہ تین آنے فی کس تھا اور بچے اور بڑے کے ٹکٹ کی شرح میں کوئی فرق نہ تھا۔ یوں ہمیں دو آنے کی ضرورت تھی جس کے لئے ہم نے اپنے بہت سے ہم جماعتوں کے آگے ہاتھ پھیلایا لیکن ہمیں کسی طرف سے کوئی مدد موصول نہ ہوئی۔

جب شام کا اندھیرا چھانے لگا تو ہم نے اپنی طرف سے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ ہم دونوں پیدل ربوہ چلے جاتے ہیں۔ ہم نے اُس چار آنے کے جو ہماری جیب میں تھے چلغوزے خرید لئے اور آدھے آدھے کر کے اپنی جیبوں میں ڈال لئے۔

قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۵۸۔۱۹۵۷ء میں ہماری عمر کیا ہوگی اور اُس زمانے میں خاص طور پر رات کے وقت یہ سڑک کس قدر ویران ہوتی ہوگی۔ اب تو ربوہ چنیوٹ روڈ پر کئی طرح کی دُکانیں بن چکی ہیں اور رات کو بھی دن کا سماں ہوتا ہے لیکن اس وقت یہ ایک نہ ختم ہونے والا ویرانہ تھا جسے ہم نے انتہائی خوف کی کیفیت میں طے کیا۔

مجھے اب بھی یاد ہے جب ہم دریائے چناب کے پہلے پل پر پہنچے تو ہمیں ایک گدھے والا مل گیا جو موضع چھنّی جا رہا تھا۔ ہم اُسے اپنا رہبر سمجھ کر تیز تیز اس کے ساتھ چلنے لگے۔ شکر ہے زمانہ اچھا تھا اور اس نے ہمارے ساتھ کوئی ہاتھ نہیں کیا بلکہ تسلی دی کہ ہم انشاء اللہ خیریت کے ساتھ گھر پہنچ جائیں گے۔

دوسرا پل عبور کرنے کے بعد جب وہ موضع چھنّی کی طرف مڑا تو ہمیں اس کی کمی محسوس ہونے لگی تاہم خدا کا شکر ہے کہ ہم بخیریت گھر پہنچ گئے۔

اُس زمانے میں رابطے کی وہ سہولتیں میسر نہ تھیں جو آج ہیں۔ ویسے بھی ہم گھر میں اطلاع دیئے بغیر

چنیوٹ چلے گئے تھے اس لیے گھر والے ہماری غیر حاضری سے پریشان تھے تاہم جب ہم واپس پہنچے تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ چچا ابراہیم کی رہائش تعلیم الاسلام ہائی سکول کے کوارٹرز میں تھی چنانچہ ابا جی خود زکریا کو اس سے گھر چھوڑنے کے لئے گئے۔

۱۹۵۹ء میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے مغربی پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اس ٹرین نے ربوہ ریلوے سٹیشن پر بھی رکنا تھا اور صدر ایوب کا اہالیانِ ربوہ سے خطاب بھی طے شدہ تھا چنانچہ موقع کی مناسبت سے ریلوے سٹیشن کو پاکستان کے جھنڈوں اور ہلالی پرچم والی جھنڈیوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ اہلِ ربوہ بہت بڑی تعداد میں ریلوے سٹیشن پر آئے ہوئے تھے لیکن نہ جانے کیوں عین وقت پر صدر ایوب کا ربوہ میں خطاب کا پروگرام بدل گیا۔ ان کی ٹرین ربوہ ریلوے سٹیشن پر رُکی تو سہی لیکن محض چند لمحے کے لیے۔ ایوب خان کمرے سے باہر آکر دروازے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر ہجوم کے والہانہ نعروں کا جواب دیا۔ جلد ہی یہ ٹرین چل دی اور سب لوگ ان کے خطاب سے محروم رہنے پر کفِ افسوس ملتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

ہم پانچ چھ لڑکوں نے جن میں سے محمد احمد (یکے از عزیزانِ محمد عالم، باڈی گارڈ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی)، محمد احمد گردیزی حال مقیم فرینکفرٹ اور طاہر احمد جاوید ابن مولوی فضل الدین وکیل کے نام مجھے اب تک یاد ہیں فیصلہ کیا کہ چنیوٹ جا کر ایوب خان کی تقریر سنی جائے۔ اس وقت چنیوٹ جانے والی ٹرین کا ٹائم نہ تھا لہٰذا لاری اڈے پر پہنچے مگر وہاں پر ہُو کا عالم تھا اور ٹریفک بالکل بند تھی۔ ہم نے ایوب خان کو سننے کے جوش میں زمینی حقائق بالکل فراموش کر دیئے اور اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ جب تک ہم گرتے پڑتے چنیوٹ پہنچیں گے ایوب خان اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو چکے ہوں گے پیدل ہی چنیوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چھ میل کا یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے کم از کم ایک گھنٹہ درکار تھا چنانچہ جب ہم چنیوٹ کی حدود میں داخل ہوئے تو لوگ وہاں سے واپس آ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ جلسہ ختم ہو چکا ہے اور ایوب خان چنیوٹ سے روانہ ہو چکے ہیں۔

اب جب کہ ہم چنیوٹ پہنچ ہی چکے تھے ہم نے مناسب سمجھا کہ شہر چلے جائیں۔ ہمارے سکول کے ایک استاد، ظفر اقبال (ابن سردار مصباح الدین) ان دنوں وہیں رہائش پذیر تھے۔ ہم ان کے گھر گئے اور کچھ دیر ان کے پاس گذار کر بذریعہ بس واپس آ گئے۔

سکول کا آغاز اسمبلی سے ہوتا جس کیلئے تمام طلبہ اپنی اپنی کلاسوں کے لیے مختص قطاروں میں کھڑے ہو جاتے اور سکول کے تمام اساتذہ سامنے اپنی جگہ سنبھال لیتے۔ اسمبلی کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوتا۔ یہ تلاوت مختلف اوقات میں مختلف بچے کیا کرتے تھے لیکن ایک غیر معمولی لمبے عرصے کے لیے یہ کام دواخانہ خدمتِ خلق کے منیجر سید بشیر احمد شاہ کے صاحبزادے سید نصیر احمد شاہ کے ذمے لگا رہا۔ مجھے یاد ہے وہ روزانہ قرآنِ پاک کے پندرہویں پارے کے ایک ہی رکوع کی تلاوت کرتے تھے جو اَقِمِ الصَّلٰوۃَ سے شروع ہو کر اَھْدٰی سَبِیْلًا پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ضروری اعلانات کئے جاتے اور پھر طلبہ اپنی اپنی کلاسز میں چلے جاتے۔

سکول میں وقتاً فوقتاً مختلف شخصیات کو مدعو کیا جاتا تھا تاکہ طلبہ ان کے خیالاتِ عالیہ سے مستفید ہوسکیں۔ ایسے ہی مدعوئین میں سے ایک شیخ بشیر احمد بھی تھے جو لاہور کے معروف وکیل اور امیر جماعت احمدیہ، لاہور رہے تھے۔ مجھے اُن کی تقریر کا موضوع تو یاد نہیں البتہ یہ محسوس کیا کہ وہ گفتگو کے دوران اپنی آنکھوں کو ایک مخصوص انداز میں مسلسل جنبش دیئے جاتے ہیں چنانچہ میں نے گھر آکر اباجی سے یہ بات کی تو انہوں نے بتایا کہ چونکہ موصوف وکالت کے پیشے سے منسلک رہے اور ان کا کام ہی جج کو اپنا ہمنوا بنانا ہوتا ہے لہٰذا یہ اندازِ بیان اُن کی فطرت ثانیہ بن گیا ہے۔

ہم نویں میں تھے جب سردار دیوان سنگھ مفتون ربوہ تشریف لائے اور انہوں نے ہمارے سکول کا دورہ کیا۔
سردار دیوان سنگھ مفتون دِلّی سے چھپنے والے ہفت روزہ ''ریاست'' کے ایڈیٹر تھے۔ تقسیم سے پہلے ان کا تعلق حافظ آباد سے تھا اور وہ اپنا آبائی گھر اور علاقہ دیکھنے کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ان کے روابط گیانی عباداللہ سمیت کئی احمدیوں سے تھے اور وہ ان ہی دوستوں کی پُر اصرار دعوت پر ربوہ آئے تھے۔
اِن کا ہمارے سکول کا دورہ انتہائی سرسری تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے موصوف ہیڈ ماسٹر اور کچھ دیگر لوگوں کے ہمراہ ہماری کلاس میں آئے جس پر ساری کلاس احتراماً کھڑی ہوگئی۔ وہ چند لمحے کلاس میں رُکے اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو کوئی بات کئے بغیر باہر نکل گئے۔ اس لحاظ سے میں اس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے دیوان سنگھ مفتون کو دیکھ رکھا ہے۔

انہوں نے ہندوستان واپس جاکر ایڈیٹر اخبار بدر کے نام ربوہ کے سفر کے حالات لکھ بھیجے جو ''احمدی جماعت کے مرکز ربوہ میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے اُن ہی دنوں بدر کے علاوہ الفضل اور ریاست میں بھی چھپ گئے۔ اس مضمون کا یہ حصہ احمدی قارئین میں بہت مقبول ہوا:
جامعہ احمدیہ میں ایک طالب علم نے اُن سے سوال کیا کہ آپ احمدی مذہب کیوں قبول نہیں کر لیتے۔ دیوان سنگھ مفتون کے الفاظ میں ''اس سوال کا جواب تو میں نے یہ دیا کہ میں نے اس مسئلہ پر آج تک کبھی غور نہیں کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری تو دعا ہے کہ خدا آپ کو بھی اپنی (......) سرگرمیوں میں کامیابی نصیب نہ کرے اور اس دعا کی وجہ یہ ہے کہ احمدی جماعت میں جتنے نیک اور مخلص لوگ ملتے ہیں دوسرے کسی مذہب میں نہیں مل سکتے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس جماعت کا حلقہ محدود ہے اور میں خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کی (......) سرگرمیوں کے نتیجہ کے طور پر جب اس جماعت کو بھی بہت زیادہ وسعت نصیب ہوگی تو اس میں بھی بُرے لوگ شامل ہو جائیں گے جیسے دوسرے بڑے مذاہب میں شامل ہیں یعنی زیادہ کپوتوں کے مقابلہ پر چند سپوت زیادہ قابلِ قدر ہیں۔''

موصوف کے دورۂ ربوہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ۳۰ مارچ ۱۹۶۰ء کو تعلیم الاسلام ہائی سکول کا جلسۂ تقسیمِ انعامات منعقد ہوا جس کی صدارت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد نے کی جو اُن دنوں ایڈیشنل چیف سیکرٹری، حکومتِ مغربی پاکستان تھے۔ یہ ایک اہم تقریب تھی جس کا سکول میں کئی دن پہلے سے انتظار کیا جا رہا تھا اور اس

کی ایک وجہ یہ تھی کہ مہمانِ خصوصی حضرت مسیح موعود کے پوتے اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے صاحبزادے تھے جن کی جماعتی اور دنیاوی حلقوں میں بہت عزت تھی۔ ذاتی طور پر یہ تقریب میرے لئے اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی تھی کہ مجھے آٹھویں جماعت کے امتحان میں جسے اُن دنوں ورنیکولر فائنل کا امتحان کہا جاتا تھا اسی فیصد سے زائد نمبر حاصل کرنے پر سکول کی طرف سے ایک سرٹیفکیٹ آف میرٹ ملنا تھا۔ یہ میری زندگی میں اپنی قسم کا پہلا اعزاز تھا لہٰذا مجھے اس کے ملنے پر بے حد خوشی تھی۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول میں گذرا ہوا وقت ہمارے لیے ہر لحاظ سے یادگار تھا۔ اس سکول میں ہماری اخلاقی تربیت پر پورا زور دیا گیا اور کوشش کی گئی کہ ہمیں دین کی بنیادی باتوں کا پتا چل جائے۔ ان پانچ سالوں میں جو ہم نے اس سکول میں گذارے ہمیں قرآن شریف ناظرہ پڑھا دیا گیا، اس کا ایک حصہ اور آخری دس سورتیں حفظ کروا دی گئیں، ادعیۃ القرآن اور ادعیۃ الرسول یاد کروا دی گئیں اور حضرت مسیح موعود کی تصنیفِ لطیف ''کشتیٔ نوح'' اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی کتاب ''دعوۃ الامیر'' سبقاً سبقاً پڑھا دی گئی۔ یوں خدا کے فضل سے ہمیں دین کی بنیادی باتوں سے واقفیت پیدا ہوگئی جو ہماری آئندہ زندگی میں بہت کام آئی۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اُن تمام مضامین کے علاوہ جو محکمۂ تعلیم کی ہدایت کے مطابق ہمیں پڑھائے جاتے تھے ہمارا ایک پرچہ دینیات کا بھی ہوتا تھا جس میں پاس ہونا ہر احمدی طالب علم کے لئے ضروری تھا۔

میں نے ۱۹۶۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ الحمدللہ میں اچھی فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوا تھا لیکن ہمارے سکول کے نعیم الرحمٰن درد جو معروف خادمِ سلسلہ، عبدالرحیم درد کے صاحبزادے تھے لڑکوں میں ضلع بھر میں اول رہے۔ وہ ہمارے کلاس فیلو تو تھے ہی رہائش بھی ہمارے ہی محلّہ کے تھے لہٰذا ہمیں خوشی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس نمایاں کامیابی سے نوازا ہے۔

تعلیم الاسلام سکول میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران مجھے بہت سے اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا جن کا ذکرِ خیر آپ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

جن کے اخلاص اور پیار کی ہر ادا، بے غرض، بے رِیا، دلنشیں، دلرُبا

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ میں تعلیم الاسلام پرائمری سکول میں ۱۹۵۲ء میں داخل ہوا تھا اور اوائل ۱۹۵۶ء میں پانچویں جماعت کا امتحان دے کر یہاں سے فارغ ہوگیا۔ ان پانچ سالوں میں مجھے مختلف اساتذۂ کرام سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا تاہم اُس زمانے کے رواج کے مطابق ایک ہی استاد سارا سال سارے مضامین پڑھایا کرتا تھا اور وہی کلاس انچارج ہوتا۔ یوں دوسری سے لے کر پانچویں جماعت تک مجھے چار مختلف اساتذۂ کرام سے واسطہ پڑا۔

دوسری جماعت میں جو استاد ہمیں ابتدا میں پڑھاتے رہے اُن کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے تاہم انہوں نے کچھ ہی عرصہ پڑھایا تھا کہ وہ سکول چھوڑ گئے یا کوئی اور کلاس لینے پر مامور ہو گئے۔ ان کی جگہ ہمیں ماسٹر شیر علی پڑھانے لگے جو اُن دنوں چنیوٹ میں رہائش پذیر تھے اور روزانہ ربوہ آیا کرتے تھے۔ وہ اپنی صحت کے زمانے میں کبھی نہ کبھی بازار میں نظر آ جایا کرتے تھے اور بہت محبت سے ملتے۔ انہوں نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور سر پر سفید پگڑی پہنتے تھے۔ پرانے بزرگان میں سے تھے اور وصیت کے نظام سے منسلک۔ الفضل ۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی خبر کے مطابق انہوں نے پانچ جولائی ۲۰۰۴ء کو بعمر ۹۴ سال وفات پائی۔ وہ اکتالیس سال تک درس و تدریس سے منسلک رہے اور بوقت وفات محلہ دارالصدر غربی میں مقیم تھے۔

یاد رہے کہ یہ وہی ماسٹر شیر علی ہیں جن کے ایک بیٹے، احمد یوسف کسی زمانے میں تحریک جدید کے دفاتر میں کام کرتے تھے اور تحریک جدید کے کوارٹرز میں رہائش پذیر تھے۔ وہ اپنے دفتری فرائض کے علاوہ قضا میں پیش ہونے والے بعض مقدمات کی بطور وکیل پیروی بھی کیا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے تحریک جدید سے علیحدگی اختیار کر لی اور ربوہ میں ریذیڈنٹ مجسٹریٹ کی عدالت کے قیام کے بعد اشٹام فروشی کا دھندا شروع کر دیا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے قتل ہو گئے تھے۔

جب ہم تیسری جماعت میں پہنچے تو ہمیں ماسٹر غلام احمد پڑھانے لگے۔ اُن کی ایک ٹانگ میں غالباً خلقی نقص تھا اور اس وجہ سے طلبہ نے ان کا ایک برا سا نام رکھا ہوا تھا لیکن تھے نہایت شفیق اور محبت کرنے والے انسان۔ اُس زمانے میں شاگردوں کی پٹائی استاد اپنا حق سمجھتے تھے اور ماسٹر غلام احمد اس اصول سے کسی صورت مستثنیٰ نہ تھے لیکن عمومی طور پر وہ اپنے شاگردوں سے بہت پیار کرتے اور اُن کی ذرا سی تکلیف پر مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔

ان کی صاحبزادی، امتہ الحفیظ بھٹی جو جامعہ نصرت ربوہ میں اردو کی لیکچرر رہی ہیں کی فراہم کردہ معلومات

کے مطابق ماسٹر غلام احمد موضع سلہو کی ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام علم دین تھا اور وہ اپنے گاؤں میں سب سے پہلے احمدی تھے۔

ماسٹر غلام احمد یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے اور مڈل پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ نارمل سکول، ڈسکہ میں داخل ہو گئے جہاں سے انہوں نے جے اے وی کا امتحان پاس کیا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر کی طرف سے جاری کردہ ایک سرٹیفکیٹ کے مطابق انہوں نے یہ تربیت ۳۰۔۱۹۳۱ء کے دوران حاصل کی۔ ہیڈ ماسٹر نے یہ سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہوئے توقع ظاہر کی تھی کہ موصوف ''وِل پرووائے گڈ ٹیچر'' اور حالات و واقعات نے ثابت کیا کہ ان کا یہ اندازہ کس قدر درست تھا۔

ہمارے اس شفیق استاد نے اپنے کیریئر کا آغاز ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت سے کیا لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تحریک پر کچھ عرصہ بعد زندگی وقف کر دی۔ اِن کے اہلِ خانہ کے پاس حضور کے پرائیویٹ سیکرٹری کی ایک چھٹی محررہ ۷ جنوری ۱۹۴۵ء موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی وقف کرنے کے بعد حضور سے رہنمائی چاہی تھی کہ کیا وہ اپنی سابقہ ملازمت جاری رکھیں۔ اس پر حضور نے فرمایا: ''جب وقف کیا ہے تو استعفیٰ دیں۔'' انہوں نے حضور کے منشا کے مطابق فوری طور پر استعفیٰ دے دیا جس پر انہیں حضور کی اراضی واقع سندھ پر بھجوا دیا گیا۔ بعد میں ان کی خدمات تعلیم الاسلام ہائی سکول کے پرائمری سیکشن کو منتقل کر دیں گئیں جہاں سے وہ ۱۹۶۵ء میں ریٹائر ہوئے۔

بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد دعوت الی اللہ کے کام پر خصوصی توجہ دی اور اس حوالے سے بعض قابلِ ذکر کامیابیاں بھی حاصل کیں۔

ماسٹر غلام احمد کی رہائش محلہ دارالعلوم شرقی میں تھی اور انہوں نے ۲۳ جولائی ۱۹۷۷ء کو یہیں وفات پائی۔ وہ موصی تھے۔ ان کا جنازہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے پڑھایا اور بہشتی مقبرہ میں تدفین عمل میں آئی۔

امۃ الحفیظ بھٹی کے پاس مرحوم کی ایک نوٹ بک موجود ہے جو تمام کی تمام ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ ان کا خط انتہائی پاکیزہ اور دلکش تھا اور ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک نیک اور عبادت گذار انسان تھے۔ اس نوٹ بک کا آغاز اللہ تعالیٰ کے حضور ایک دعا سے ہوتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں: ''اے ہستی ارحم الراحمین، احکم الحاکمین! اپنے خاص کرم سے میرے دل و دماغ کو راستی پر چلا اور طائرانہ قوتِ پرواز بخش۔ اے میرے مولا! اپنے اس کمزور اور پُرتقصیر بندے کی دعا قبول فرما اور اسے اپنی مخصوص رحمت کے لیے منتخب کر لے اور اس عالمِ فنا میں اپنی خاص نظرِ کرم کے سائے تلے رکھ اور عالمِ بقا میں اپنے صدیق بندوں میں جگہ دے اور ہر حالت میں صراطِ مستقیم پر چلا۔ تجھ سے نہ مانگوں تو کس سے مانگوں؟ تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟ اپنے خاص فضل اور بخششِ کریمانہ سے میری اولاد کو حسناتِ دارین سے ممتاز فرما۔''

اس نوٹ بک کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ موصوف بزرگانِ سلسلہ خصوصاً حضرت مولانا غلام رسول راجیکی سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس ڈائری میں مولانا کی قبولیتِ دعا کے کئی واقعات بھی

چوتھی جماعت میں ہمیں جس استاد نے پڑھایا ان کا نام ماسٹر عبدالکریم تھا اور وہ کشمیری النسل تھے۔ سادہ اور منکسر المزاج سے ماسٹر عبدالکریم اپنے کام سے کام رکھتے۔ اُن کی زندگی کا واحد مشن اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت تھا۔

میرے باقی اساتذہ کرام کی طرح ان کے حالات بھی پردۂ اِخفا میں تھے۔ ایک دفعہ مبارک عابد سے اس بات کا ذکر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ ماسٹر عبدالکریم کے ایک بیٹے، زین العابدین ربوہ میں اخبارات تقسیم کرتے ہیں اور تحریک جدید کے دفتر میں کام بھی کرتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، ذرا سی کوشش سے میرا رابطہ ان سے ہوگیا جو وہاں مددگار کارکن ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی عمر کے اعتبار سے اس لائق نہیں کہ اپنے والد بزرگوار کے آنکھوں دیکھے حالات بیان کرسکیں تاہم انہوں نے اِدھر اُدھر سے کچھ معلومات جمع کر کے مجھے دیں جن کے مطابق ماسٹر عبدالکریم میاں خیر دین کشمیری کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، وہ ۱۹۱۱ء میں قادیان میں پیدا ہوئے، انہوں نے بیس سال کی عمر میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں بطور پرائمری ٹیچر اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور پھر پوری زندگی یہیں بِتا دی۔ وہ ۱۹۷۱ء میں صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

وہ محلہ دارالرحمت وسطی میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد دفع الوقتی کے لیے اپنے گھر میں کریانے کی دکان کھول لی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس دکان میں چوری ہوگئی۔ ان کا خاصا نقصان ہوا چنانچہ انہوں نے بددِل ہوکر یہ دکان بند کردی۔

ماسٹر عبدالکریم نے ۲۷ اگست ۱۹۷۸ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ان کی پہلی شادی عائشہ بیگم نامی ایک خاتون سے ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی۔ موصوفہ اکتیس سال تک ان کی زوجیت میں رہیں لیکن اولاد نہ ہوسکی۔ ان کی وفات پر ماسٹر عبدالکریم نے دوسری شادی کی۔ ان کی اہلیہ ثانی کا نام بشریٰ پروین تھا۔ ماسٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس شادی کے نتیجے میں کثیر اولاد سے نوازا جس میں سے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ماشاءاللہ حیات ہیں۔ زین العابدین ان کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔

مرحوم سلیم الطبع تھے چنانچہ انہوں نے اوائل عمری میں نظامِ وصیت میں شمولیت اختیار کرلی اور تا دمِ مرگ اپنے اس عہد پر قائم رہے۔

اُن کی ایک بہت بڑی خوبی جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ان کی یتیم پروری اور صلہ رحمی ہے۔ ان کے دو بڑے بھائی، عبدالرحیم اور رحمت اللہ قیامِ پاکستان سے قبل یکے بعد دیگر وفات پا گئے۔ مرحومین کے بچوں کی پرورش کا کوئی ظاہری وسیلہ موجود نہ تھا۔ محدود مالی وسائل کے باوجود ماسٹر عبدالکریم نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا، حتی المقدور پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔ عبدالحکیم اکمل جو ہالینڈ میں ہمارے مربی رہے اور ان کی اہلیہ مسعودہ بیگم ان بچوں میں سے تھیں جن کی پرورش ماسٹر عبدالکریم نے کی تھی۔

پانچویں جماعت میں ہمیں ماسٹر فقیر احمد، ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام پرائمری سکول کی شاگردی کا شرف حاصل

ہوا۔ ان کا قد قدرے چھوٹا تھا۔ ان کی رنگت صاف اور چہرے پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ بالعموم شلوار قمیص اور اس پر واسکٹ پہنتے تھے۔ مجھے ان کی بے جا سختی یا غیر ضروری تادیب کا کوئی واقعہ یاد نہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ طبعاً شفیق تھے اور انتہائی مجبوری کے بغیر طلبہ کو بدنی سزا دینے کے قائل نہ تھے۔

سکول چھوڑنے کے بعد کہیں نظر آ جاتے تو میں رُک کر ضرور سلام کرتا لیکن غالباً وہ میرے خاندانی پس منظر سے پوری طرح آگاہ نہ تھے لہٰذا اس حوالے سے ان سے کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ اب ان کے حالات معلوم کرنے کی طرف توجہ ہوئی تو کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو اُن کے بارے میں تفصیل سے کچھ بتا سکتا۔

موصوف نے ۸ جنوری ۱۹۷۴ء کو وفات پائی اور وہ بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے لیکن ان کی وفات کے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر جو الفضل میں شائع ہوئی کے علاوہ ماسٹر فقیر احمد کے بارے میں کوئی اور تحریر میری نظر سے نہیں گذری۔ ہاں! ان کی قبر پر نصب کتبے سے بعض امور کا انکشاف ہوتا ہے مثلاً یہ کہ ان کے والد کا نام غلام سرور تھا، وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے سولہ سال کی عمر میں خود احمدیت قبول کی تھی۔ وہ احمدی ہونے کے جلد ہی بعد نظامِ وصیت میں شامل ہو گئے۔ اُس وقت ان کی عمر بمشکل اکیس سال تھی۔ کتبے پر ان کا نام ''ماسٹر حکیم فقیر احمد'' لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں طبِ یونانی سے بھی دلچسپی تھی۔

ماسٹر فقیر احمد کی حکمت میں دلچسپی کے ذکر نے مجھے یاد دلا دیا کہ موصوف کی رشتہ داری دواخانہ طبِ جدید والے حکیم محمد صدیق کے ساتھ بھی تھی۔ میں نے ان کے صاحبزادے طاہر احمد نسیم سے رابطہ کیا تو انہوں نے تصدیق کی کہ ماسٹر فقیر احمد ان کے پھوپھا تھے۔ ''ان کی پہلی بیوی نہ جانے کب وفات پا چکی تھیں۔ اس بیوی سے ان کا ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ بیٹے کا نام ولی محمد ہے اور وہ ابتدائے ربوہ میں یہاں فوٹو گرافر تھے۔ بیٹی کا نام نصیرہ ہے۔ ان کی والدہ کی وفات کے کئی سال بعد ان کی شادی میری سگی پھوپھی سے ہوگئی جو بیوہ تھیں۔ خدا نے اس بیوی سے انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی جس کا نام فضیلت ناہید ہے۔ وہ آج کل انگلینڈ ہوتی ہیں اور ماشاء اللہ خوشحال زندگی گذار رہی ہیں'' طاہر نسیم نے مجھے بتایا۔

''ماسٹر صاحب کی طب کے ساتھ دلچسپی کے حوالے سے کوئی قابلِ ذکر بات؟'' میں نے کریدا۔

''ان کے پاس معجونِ فلک سیر قسم کی بعض ادویہ کے نسخے موجود تھے۔ وہ یہ نسخے اپنے بعض خاص مریضوں کی فرمائش پر تیار کیا کرتے تھے۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے مخصوص گاہکوں کے پاس خود جا کر یہ ادویہ فراہم کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے گھڑی سازی کا کام بھی سیکھ رکھا تھا لیکن میں نے انہیں یہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے وہ کسی زمانے میں یہ کام کرتے رہے ہوں''

میرے پرائمری سکول کے اساتذہ کے بارے میں فی الحال اتنا ہی۔ اب کچھ ذکر ان اساتذۂ کرام کا جن سے مجھے ہائی کلاسز میں پڑھنے کا موقع ملا۔

مجھ کو بھی ان کے تلمّذ کا شرف حاصل تھا

میں ۱۹۵۶ء میں پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول میں داخل ہوا اور ۱۹۶۱ء میں یہاں سے فارغ ہوا۔ ان پانچ سالوں کے دوران مجھے بہت سے اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔ ان میں سے اکثر اساتذہ تو اس سکول کے مستقل سٹاف پر تھے اور پچھلے کئی برسوں سے اس کے ساتھ منسلک تھے، کچھ نو وارد تھے لیکن انہوں نے اسی سکول میں معلّمی کو اپنا کیریئر بنانے کا ارادہ کر رکھا تھا جب کہ بعض عارضی طور پر اس سکول میں تشریف لائے اور جوں ہی انہیں اپنی تعلیمی استعداد میں اضافے کا موقع ملا یا کوئی بہتر ملازمت مل گئی انہوں نے سکول کو خیر باد کہہ دیا۔ میں ان اساتذہ کا ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے مجھے زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور میرے اندر حصولِ علم کی لگن پیدا کی۔ میں ان کے اس احسان کا بدلہ تو نہیں اُتار سکتا البتہ ان کی یاد زندہ رکھنے کی کوشش کر سکتا ہوں اور اس مضمون کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے۔

میں اپریل کی کسی تاریخ کو اس سکول میں داخل ہوا تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق صبح کی اسمبلی میں سارے اساتذہ موجود ہوتے تھے چنانچہ چند ہی دنوں کے اندر اندر ہم ان سب کو نہ صرف ''بائی فیس'' بلکہ ''بائی نیم'' بھی پہچاننے لگے تھے۔

ابھی بمشکل دو ماہ گذرے تھے کہ ان میں سے چار اساتذہ کرام ریٹائر ہو گئے۔ یقیناً انہیں رسمی طور پر الوداع کہنے کے لیے سکول سٹاف کی طرف سے الگ سے کوئی تقریب بھی منعقد ہوئی ہو گی لیکن ہماری معلومات کا انحصار اس اعلان پر تھا جو ایک صبح اسمبلی میں کیا گیا تھا۔ ان اساتذہ میں صوفی محمد ابراہیم (ہیڈ ماسٹر)، حضرت صوفی غلام محمد (جو بعد میں ناظر بیت المال رہے)، ماسٹر اللہ بخش زراعتی اور ماسٹر نذیر احمد رحمانی شامل تھے۔ مجھے اوّل الذکر دو اساتذہ سے پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا البتہ موَخر الذکر دونوں اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

زراعتی صاحب ہمیں سائنس پڑھاتے تھے۔ ہمارے لیے یہ نام غیر روائتی اور قدرے نامانوس تھا لیکن ڈر کے مارے کسی سے نہ پوچھ سکے کہ بوقتِ پیدائش ان کے لیے کوئی اور بھلا سا نام کیوں تجویز نہ کیا گیا اور بعد میں یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہی کیوں کہ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر وہ تکمیلِ ملازمت کے بعد ریٹائر ہو گئے تھے۔

مجھے اب یہ یاد نہیں کہ انہوں نے ہمیں کیا پڑھایا تھا لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں آج بھی یہ بات موجود ہے کہ اپنے ایک لیکچر کے دوران انہوں نے بلیک بورڈ پر ایک چوہے کو لوہے کے پنجرے میں قید دکھایا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے یہ تصویر اپنے لیکچر کی وضاحت کے لیے بنائی ہو گی لیکن اب ان کے لیکچر اور اس

تصویر کے درمیان رابطہ قائم کرنا میرے بس کی ناممکنات میں سے ہے۔

اگرچہ ہم نے ان سے ڈیڑھ دو ماہ سے زیادہ نہ پڑھا تھا لیکن ہم نے انہیں ہمیشہ اپنا استاد ہی سمجھا اور انہوں نے بھی ہمیشہ ہمیں بہت پیار دیا چنانچہ وہ جہاں مل جاتے رُک کر حال احوال ضرور پوچھتے۔ مجھے پتا نہیں انہوں نے کب محلّہ دارالصدر غربی میں چوہدری شاہنواز کی کوٹھی کے بالکل سامنے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ وہ لمبا عرصہ صدر محلہ بھی رہے۔ چچا ابراہیم اسی محلے میں مقیم تھے اور میرا اُدھر آنا جانا رہتا تھا۔ اس طرح زراعتی جماعت سے ایک مستقل تعلق کی بنیاد فراہم ہوگئی۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ زراعتی صاحب کا اصل نام اللہ بخش تھا، ان کا خاندان موضع عینو والی کاہلو آں ضلع نارووال کا رہنے والا تھا اور انہوں نے گہرے مطالعے کے بعد ۱۹۲۶ء میں خود احمدیت قبول کی تھی۔

بتایا جاتا ہے کہ ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور حضور کے ارشاد پر ربع صدی کی سرکاری ملازمت کو لات مار کر قادیان آنے پر آمادہ ہو گئے۔ اُس وقت تک تعلیم الاسلام ہائی سکول میں زراعت نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ حضور کو اس کمی کا احساس تھا چنانچہ موصوف نے حضور ہی کے ارشاد پر زراعتی کالج فیصل آباد سے زراعت کا ایک سالہ کورس اپنے خرچ پر مکمل کیا اور تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھانے لگے۔ وہ اپنے مضمون کی مناسبت سے آہستہ آہستہ ''زراعتی صاحب'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

زراعتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اچھی صحت سے نواز رکھا تھا۔ پہلے تو میں نے انہیں ہمیشہ بائیکل چلاتے ہوئے دیکھا۔ بائیکل چلانا چھوڑا تو کسی اور سواری کے استعمال پر پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ ڈھلتی ہوئی عمر کے باوجود ان کا جسم تیر کی طرح سیدھا، چال میں نوجوانوں کی سی تیزی اور ذہن مکمل طور پر حاضر تھا۔ ہمیشہ پگڑی پہنتے، سر اور ڈاڑھی مہندی سے رنگتے اور ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔

انہوں نے تین بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ یوں تو مجھے ان کے سب سے بڑے بیٹے عبدالرشید (جو کچھ عرصہ پہلے تک لاہور کے علاقہ ڈیفنس میں رہائش پذیر تھے) سے بھی تعارف حاصل ہے لیکن ان کے ایک بیٹے عبدالحمید جو اَب وفات پا چکے ہیں سکول میں میرے کلاس فیلو تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے، مجید طاہر جرمنی میں مقیم ہیں۔ اللہ نے شعر کہنے کی صلاحیت سے مالا مال کر رکھا ہے اور ان کا پہلا مجموعہ کلام ''خوشبو کا سفر'' کے عنوان سے شائع ہو کر قارئین کے ایک وسیع حلقہ سے داد پا چکا ہے۔

میں ایک بار فرینکفرٹ گیا تو انہوں نے مہربانی کی اور وہ میری جائے قیام یعنی میرے چچا زاد، انور یوسف کے گھر مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میری فرمائش پر انہوں نے اپنے خوبصورت شعروں سے نوازا۔ آپ بھی سننا چاہیں گے یہ اشعار:

پہرے کچھ اس طرح سے لگے اس کی دید پر
اس مرتبہ تو چاند بھی نکلا نہ عید پر
سہمے ہوئے ہیں آج بھی بچے حُسین کے
اُٹھتی نہیں ہے ایک بھی انگلی یزید پر

مرشد نے اُس کی آخری پونجی بھی لوٹ لی
اب اور کیا کرے گا وہ شفقت مرید پر
اس وقت سارے شہر کے واعظ خموش تھے
جب ظلم بے حساب تھا طاہر مجید پر

جہاں تک ماسٹر نذیر احمد رحمانی کا تعلق ہے انہوں نے بھی ہمیں صرف چند ہی روز پڑھایا جس کے بعد وہ ریٹائر ہو گئے۔ سچ پوچھیں تو مجھے ان کا کوئی قابلِ بیان واقعہ یاد نہیں آ رہا ماسوا اس کے کہ انہیں بڑھاپے یا کسی اور کمزوری کے زیر اثر گفتگو میں کچھ دشواری ہوتی تھی تاہم میں یہ بھی جانتا ہوں کہ صرف اتنا کہہ دینے سے بات نہیں بنے گی۔

نذیر رحمانی ابتداءً سرکاری ملازم تھے تاہم وہ ۱۹۱۸ء میں عین جوانی کے عالم میں خدمتِ سلسلہ کی نیت سے یہ ملازمت چھوڑ کر قادیان آ گئے۔ انہیں شروع میں کچھ سال تعلیم الاسلام سکول گھٹیالیاں میں پڑھانے کا موقع ملا لیکن بعد میں وہ مسلسل بتیس سال تک قادیان، چنیوٹ اور پھر ربوہ میں پڑھاتے رہے۔

الفضل میں ان کے بارے میں چھپنے والے مضامین سے پتا چلتا ہے کہ وہ زہد واتقا میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہیں اساتذہ کے اردو اور فارسی کے بے شمار شعر اور لاتعداد تاریخی واقعات یاد تھے جو وہ کلاس روم میں اپنے شاگردوں اور سٹاف روم میں اپنے ساتھیوں کو سنا کر ان کا لہو گرم رکھتے تھے۔ ان کی ایک خوبی جس کا ذکر ایک سے زیادہ مضمون نگاروں نے کیا ہے وہ ہے گفتگو کی پاکیزگی۔ وہ اپنے شاگردوں کو بھی ان کے نام سے نہ پکارتے بلکہ نام سے پہلے ہمیشہ میاں کا لفظ لگاتے۔ دراصل یہ ان کی طرف سے بچوں میں عزتِ نفس پیدا کرنے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ پرویز پروازی کے الفاظ میں:

عِلم کا ایک خزانہ تھا ترا بحرِ وجود
فیض کا ایک سمندر تھا ترا ذہنِ رسا
خدمتِ دینِ محمد میں ہوئی عمر تمام
درگہِ حق میں ہوئے صَرف ترے صبح و مسا
کم سخن ، پاک نظر ، سادہ و دیندار و شریف
روز ہوتے ہیں کہاں ایسے جواہر پیدا

نذیر رحمانی نے ۸ نومبر ۱۹۵۹ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔ انہوں نے چار بیٹے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑی۔ ان کے بڑے صاحبزادے، سعید رحمانی پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے لیے منتخب ہوئے اور گریڈ ۲۱ میں ترقی پانے کے بعد بطور ڈائریکٹر فنانس، پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل ریٹائر ہوئے۔ یاد رہے کہ سعید رحمانی تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے سابق طالب علم ہیں اور کچھ عرصہ المنار کے انگریزی حصہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔

یہاں پر ذکر شاید بے جا نہ ہو کہ ماسٹر اللہ بخش زراعتی، ماسٹر نذیر احمد رحمانی اور باقی دونوں اساتذہ کرام کی ریٹائرمنٹ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھا تھا: ''ان لوگوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنے کام کو نہایت جانفشانی سے پورا کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی حسنِ خدمت کو قبول فرمائے اور ان کی ریٹائر ہونے کے بعد کی زندگی بھی نہایت خوشگوار اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور احسانوں کے نیچے گذرے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان کو، ان کی اولادوں کو (دین) کی خدمت کی توفیق بخشتا رہے۔''

اِن اساتذہ میں سے صوفی محمد ابراہیم کی جگہ میاں محمد ابراہیم نے لے لی جو جموں کے رہنے والے تھے اور اسی ناطے ''جمونی صاحب'' کے نام سے بھی معروف تھے۔ سنتے تھے کہ وہ اپنے علاقے کے ابتدائی گریجوایٹس میں سے تھے اور غالبًا اسی وجہ سے بعض پرانے لوگوں میں ''بی اے صاحب'' کے نام سے بھی مشہور تھے۔ یوں تو ہم صبح کی اسمبلی میں روزانہ ان کے پندونصائح سے فیضیاب ہوتے تھے لیکن ان سے پڑھنے کا موقع پہلی بار دسویں میں ملا اور وہ بھی سال کا کچھ ہی حصہ۔ ان کی طبیعت پر نرمی غالب تھی چنانچہ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے اپنے کسی شاگرد کو کبھی کوئی بدنی سزا دی ہو۔

مجھے ان کی بطور ہیڈ ماسٹر دو باتیں یاد ہیں۔ ایک کا تعلق حفظِ قرآن سے ہے جب کہ دوسری کا تعلق محنت اور قابلیت کی حوصلہ افزائی سے۔ ان کے دور میں سکول کے ہر طالب علم کو اس طرح قرآن پاک کا کچھ حصہ حفظ کرنے کا پابند کیا گیا تھا کہ اگر باری باری تمام طلبہ ایک ترتیب سے قرآن شریف زبانی سنانا شروع کر دیں تو اس کا ایک دور مکمل ہو جائے۔ اس سکیم کے تحت مجھے سورۃ آل عمران کا دوسرا رکوع یاد کرایا گیا تھا۔

سکول میں یہ بات مشہور تھی کہ اس حسین روایت کے بانی سکول کے ایک سابق ہیڈ ماسٹر، سید محمود اللہ شاہ تھے جسے بعد میں آنے والے ہیڈ ماسٹروں نے قائم رکھا۔ اگر یہ بات واقعاتی طور پر درست ہو تو بھی ایک اچھی روایت کو قائم رکھنے کی حد تک اس کا کریڈٹ میاں محمد ابراہیم ہی کو جاتا ہے۔

انہوں نے طلبہ میں محنت کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک نئی سکیم رائج کی اور وہ یہ کہ میٹرک اور ورنیکولر فائینل کے امتحان میں ۸۰ فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والوں کو سکول کی طرف سے میرٹ سرٹیفکیٹ دیئے جائیں۔ چونکہ خدا کے فضل سے میرا شمار بھی ان طلبہ میں تھا جنہوں نے ۱۹۵۹ء کے ورنیکولر فائینل میں مطلوبہ شرح سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے لہٰذا ایک جلسہ تقسیم انعامات میں جس کی کچھ تفصیل اسی کتاب میں کسی اور جگہ موجود ہے مجھے بھی یہ سرٹیفکیٹ ملا جس پر بطور ہیڈ ماسٹر ان کے دستخط موجود ہیں۔

وہ ۱۹۶۹ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے ریٹائر ہوئے تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے انہیں بطور مربی مریکہ بھجوا دیا۔ ادریس احمد عاجز عظیم آبادی نے اسی موقع پر کہا تھا:

عاملِ شرعِ مبین و خادمِ دینِ متیں
دل میں ان کے موجزن ہے عشقِ ختم المرسلین
اِس کُہن سالی میں ان کی ہے ابھی ہمت جواں
ہے یہ اُن پہ فضلِ رحمٰن خداوندِ یگاں

دین کی خاطر وہ امریکہ چلے
یہ دعا ہے ان کو ہر اک گام پر برکت ملے

۱۹۹۹ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتوں کا پتا چلا مثلاً یہ کہ وہ پرنس آف ویلز کالج جموں کی اس کرکٹ ٹیم میں شامل تھے جس کے کپتان مشہور کشمیری لیڈر چوہدری غلام عباس تھے؛ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع، دونوں کے استاد تھے؛ یہ کہ مشہور صحافی زیڈ اے سلہری نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز میاں محمد ابراہیم ہی کی نگرانی میں ''تعلیم الاسلام ہائی سکول میگزین'' کی سب ایڈیٹری سے کیا تھا؛ یہ کہ انہیں قریباً دس سال تک امریکہ میں بطور مربی خدمت بجا لانے کا موقع ملا تھا اور یہ کہ وہ جامعہ احمدیہ میں بھی پڑھاتے رہے تھے۔

ان کی وفات پر پروفیسر میاں محمد افضل کے ایک مضمون سے جو الفضل میں شائع ہوا ان کے بارے میں اور بھی کئی انکشافات ہوئے جن سے کم از کم میں پہلے لاعلم تھا۔ ان کی روایت کے مطابق میاں صاحب شروع سے ہی دینی غیرت رکھتے تھے اور جب سوال اسلام کی حقانیت کا ہوتا تو وہ علم اور تجربے میں اپنے سے کئی گنا بڑے معاند کے سامنے بھی خم ٹھونک کر میدان میں نکل آتے۔ ملاحظہ کیجئے میاں محمد افضل کا بیان کردہ یہ واقعہ:

''یہ بات ہے ۲۰۔۱۹۲۱ء کی اور متعلق ہے جموں شہر سے جو اُس زمانہ میں فرقہ وارانہ شکر رنجیوں سے پاک تھا مگر مذہبی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ ان دنوں اہلِ حدیث حضرات نے اپنے چوٹی کے عالم مولوی محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی سے دو تین لیکچر دلوائے۔ ایک عالم اور ایک اچھا مقرر جب سٹیج پر گرجے تو ایک دھاکہ ہوتا ہے۔ ان کا رُخ جب احمدیت کی طرف مُڑا تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ادھر بھی برس گئی۔ اب کون ہو جو اس عالم کے اعتراضات کا جواب دے؟ تلاش شروع ہوئی مگر اس میں کامیابی مشکل نظر آئی تو ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا اُٹھا اور بڑے وثوق سے کہا کہ اس عالم کے اعتراضات کا جواب وہ دے گا۔ شہر میں ڈھنڈورہ پٹوایا گیا۔ پھر لوگوں نے سٹیج پہ ایک سولہ سالہ لڑکا کھڑا دیکھا۔ کوئی ہنسا، کسی نے تیز جملہ لڑھکایا، کسی نے پھبتی کسی، کسی نے مصلحتاً چُپ سادھ لی مگر جب وہ لڑکا بولا اور اس نے ایک ایک اعتراض کا معقول اور مدلّل جواب دینا شروع کیا تو سب دنگ رہ گئے۔ پینتالیس منٹ تک یہ نوجوان بولتا گیا۔ کچھ چہرے لٹک گئے۔ کچھ خوشی سے تمتما اُٹھے۔ کامیابی اس نوجوان کا مقدر ٹھہری۔ سب حیران کہ یہ محیر العقول واقعہ کیسے ہو گیا۔''

مجھے تو اسی مضمون سے یہ بات بھی پہلی بار پتا چلی کہ انہیں اپنے قیامِ امریکہ کے دوران ڈاکٹر آف ڈیونٹی کی ڈگری عطا کی گئی تھی تاہم ان کا عجز ملاحظہ ہو، انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی ''ڈاکٹر'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

موصوف حدیثِ نبوی اُذْکُرُوْا مَوْتٰکُمْ بِالْخَیْرِ پر ممکن حد تک کاربند رہے۔ انہوں نے یقیناً دیگر علمی اور دینی موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہو گا لیکن الفضل کے پرانے فائل گواہ ہیں کہ انہوں نے اپنے ہر بچھڑنے والے رفیق کار کے ذکرِ خیر کے طور پر اس جماعتی اخبار میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ ان میں سے بعض اساتذہ کے سوانح و سیرت کے

بارے میں سلسلہ کے ریکارڈ پر کوئی اور مواد موجود نہیں ہے اور یوں تاریخی اعتبار سے ان مضامین کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

دراز قد چوہدری عبدالرحمٰن، سیکنڈ ماسٹر نویں اور دسویں میں ہمیں ریاضی پڑھایا کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے خوش لباس تھے اور اکثر و بیشتر بوشرٹ اور پینٹ میں ملبوس ہوتے۔ انہیں ریاضی پڑھانے کا خاص ملکہ حاصل تھا لیکن جب انہیں کسی طالب علم کی طرف سے اپنے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہ ملتا تو جسمانی تادیب کے علاوہ ہلکے پھلکے طنز کی شکل میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے تاہم ان کا رویہ بالعموم بہت مشفقانہ ہوتا۔

میں نے تو انہیں ''دور'' سے ہی دیکھا ہے اور وہ بھی کم عمری میں لیکن واقفانِ حال بتاتے ہیں کہ وہ بے شمار صفاتِ حسنہ سے متصف تھے۔ ان کے ایک نیازمند، مولوی بدرالدین نے ان کی وفات پر الفضل میں اپنے ایک مضمون میں لکھا: ''مرحوم و مغفور کے ساتھ مجھے لمبا عرصہ گذارنے کا موقع ملا۔.......... آپ میرے شفیق استاد اور ہمدرد دوست تھے۔ احمدیت کی نعمت بھی مجھے ان کے طفیل حاصل ہوئی۔ مرحوم نہایت متقی، دعا گو اور صاحبِ کشف والہام بزرگ تھے۔ بڑے محنتی اور مستقل مزاج تھے۔ حد درجہ مہمان نواز اور خصوصاً غربا کے ہمدرد تھے۔ غریب اور نادار طالب علموں کا خاص خیال رکھتے اور بعض کی خفیہ امداد کرتے رہتے۔.......... نہایت صائب الرائے اور بالغ النظر تھے۔ اکثر لوگ آپ سے مشورہ لے کر کام شروع کرتے۔.......... میں نے تو جو کچھ حاصل کیا آپ کی شاگردی سے کیا۔ ان کی وجہ سے ہی میرے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ میں (مربی) بن کر خدمتِ احمدیت میں زندگی گذاروں۔ میں بالکل اَن پڑھ تھا۔ قرآن مجید اور مسائلِ احمدیت ایک ایک کر کے ان سے سیکھے۔'' کون ہے جس کے دل سے ایسے نافع الناس وجود کی بلندیٔ درجات کے لیے دعا نہ نکلے۔

مرحوم کی دو بیویاں تھیں جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سات بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران فیصل آباد اور ربوہ کے درمیان میری روزانہ آمد و رفت رہی۔ ان سفروں کے دوران بعض اوقات ان کے سب سے بڑے صاحبزادے، سعید سے میری ملاقات ہو جاتی جو ٹرانسپورٹ بزنس سے متعلق تھے۔ وہ تو اب وفات پا چکے ہیں البتہ حال ہی میں صدر عمومی کے دفتر میں میری ان کے ایک اور فرزند، نصیر الرحمٰن سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ اُن کے ساتھ مرحوم کا ذکر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ جب ان کے والدِ بزرگوار نے محلہ باب الابواب میں اپنے مکان کی بنیاد رکھی تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اتنا بڑا پراجیکٹ مکمل نہ کر پائیں گے لیکن وہ جواب دیا کرتے کہ جس خدا نے مکان کی بنیاد رکھنے کی توفیق دی ہے وہی اسے تعمیر کرنے کے لیے وسائل بھی مہیا فرمائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اسی سال انہوں نے ''مدینہ ریاضی'' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر شائع کی جو ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور مکان مکمل ہو گیا۔

ان کی تصنیفات میں ''مدینہ ریاضی الف'' اور ''مدینہ ریاضی ب'' اور تین حصوں پر مشتمل ''گلوریس الجبرا'' شامل تھیں۔ اول الذکر کتاب مدینہ پرنٹنگ پریس، گنپت روڈ، لاہور نے جب کہ دوسری اُن کے اپنے ادارے، رحمٰن سنز نے شائع کی تھی۔ اُن دنوں یہ کتابیں پنجاب کے اکثر سکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد ایک غیر سرکاری سکول میں بطور استاد اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تحریک پر ۱۹۴۴ء میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہوکر تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں آ گئے۔ انہوں نے تقریباً بیس سال تک اس سکول میں پڑھایا اور دورانِ ملازمت ہی ۳۱ دسمبر ۱۹۶۴ء کو وفات پا کر بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول کے سابق طالب علم اور تعلیم الاسلام کالج میں اُردو کے استاد مبارک احمد عابد کا بیان ہے کہ وہ اپنے استاد مرزا عنایت اللہ کی وفات کے وقت دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انہوں نے اس موقع کی مناسبت سے ایک نظم کہی اور ہیڈ ماسٹر کی ہدایت کے مطابق اسمبلی میں اسے سب طلبہ کے سامنے ترنم سے پڑھ کر سنایا۔

ماسٹر عبدالرحمٰن بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں یہ نظم بے حد پسند آئی اور انہوں نے مبارک عابد سے فرمائش کی کہ وہ ان کی وفات پر بھی ایک ایسی ہی نظم کہیں۔ اُس وقت بات آئی گئی ہوگئی۔ مرزا عنایت اللہ کی وفات کے قریباً تین سال بعد ماسٹر عبدالرحمٰن بھی وفات پا گئے لیکن مبارک عابد کو مرحوم کی اس خواہش کی تعمیل کا موقع ہی نہ مل سکا۔

''تو اَب تعمیل کر دیجئے نا'' میں نے مبارک عابد سے کہا ''انگریزی کا محاورہ اِٹ از نیور ٹُو لیٹ غالباً ایسی ہی صورت حال پر چسپاں ہوتا ہے۔''

''تو مجھے چند دن دیجئے'' اور ان کا یہ مطالبہ بے جا نہ تھا۔

چند روز کے بعد مبارک عابد کی طرف سے مجھے ایک نظم بعنوان ''بیاد چوہدری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سیکنڈ ماسٹر'' موصول ہوگئی۔ یہ نظم جس میں مرحوم کی بہت سی خوبیوں کو گویا سمو دیا گیا ہے قارئین کی دلچسپی کے لیے شاملِ کتاب کی جا رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

دیانت کے پیکر ، شرافت خصال
ہر اِک طور سے تھے وہ گوہر مثال
وجود اُن کا شخصیتِ خوش نما
بہت نرم خُو اور شیریں مقال
ریاضی میں وہ دسترس اُن کو تھی
جواب اپنا دیتے تھے خود ہی سوال
''مدینہ ریاضی'' پڑھی تو لگا
سمندر سے لائے ہیں موتی نکال
اگرچہ وہ تھا دورِ سادہ دلاں
مگر سادگی میں بھی تھے پُر جمال

سدا ان کے مرقد پہ اور روح پر
خدا کی رہیں رحمتیں لازوال

ماسٹر عبدالرحمٰن خان بنگالی ہمیں ہائی کلاسز میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ بہت قابل اور شفیق استاد تھے چنانچہ کبھی ڈانٹتے بھی تو اس انداز سے گویا پیار کر رہے ہوں۔ یہ احساس پیدا کرنے میں کچھ دخل اردو لب ولہجہ سے ان کی ناواقفیت کا بھی تھا۔ وہ بدنی سزا سے اوّل تو اجتناب کرتے لیکن اگر کبھی یہ ضروری ہو جاتی تو یوں محسوس ہوتا گویا محض شرط پوری کر رہے ہوں اور کان کھینچتے تو ایسے گویا ان سے اپنی طبیعت کے خلاف کوئی حرکت سرزد ہو رہی ہو۔ کئی سال گذر جانے کے باوجود مجھے اب بھی یاد ہے کہ وہ مغضوب علیہ کا کان کھینچتے ہوئے اسے کچھ اس میٹھے لہجے میں ''گدھی'' ہونے کا طعنہ دیتے کہ وہ لہجے کی لذت میں ڈوب کر سزا کی تکلیف بھول جاتا۔

انگریزی زبان پر ان کی دسترس شک وشبہ سے بالاتر تھی اور پڑھانے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ ہم ٹینسز برسوں کی کاوش سے بھی سیکھ نہ پائے تھے، انہوں نے دنوں میں سکھا دیئے۔ میرا خیال ہے کوئی بہت ہی بدقسمت طالب علم ہوگا جو اُن سے پڑھنے کے بعد بھی انگریزی میں فیل ہو گیا ہو۔

وہ بالعموم اچکن اور رومی ٹوپی میں ملبوس رہتے۔ پورے سکول میں وہ غالباً واحد استاد تھے جو اس لباس میں ملبوس ہوتے لیکن ان کی اصل انفرادیت طلبہ سے ان کے بے لوث پیار، لہجے کی مٹھاس اور سکول کی نیک نامی کی ہر دم فکر میں تھی۔ میاں محمد ابراہیم، ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر نے اُن کی وفات پر الفضل میں یوں ہی تو نہیں لکھا تھا کہ ''بحیثیت استاد خان صاحب کا مقام حقیقتاً یکتا اور منفرد تھا۔.......... ابتدا میں اردو زبان پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو پڑھانے میں کچھ دقّت محسوس کرتے تھے لیکن ان کا پڑھانے کا شوق اور جذبہ، دلی رغبت اور خدمت کی لگن اردو کی کمی کو ڈھانپ لیتی تھی اور پھر وقت گذرنے پر تو وہ ہر لحاظ سے مثالی استاد بن گئے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے طلبہ کو محبت اور پیار سے پڑھانے کا جذبہ ٹپکتا تھا اور وہ جس اخلاص اور نیک نیتی سے پڑھاتے تھے اس کا پرتو متعلمین پر پڑتا تھا۔ صرف زبانی کاوش یا محض رٹانے والی بات ہی نہ تھی، وہ صحیح معنوں میں مکمل استاد تھے۔ پڑھائی کے ساتھ لکھائی کا باقاعدہ التزام فرماتے تھے۔ تقریباً ہر روز بچوں کو اپنے سامنے لکھواتے، ان کے تحریری کام کی کاپیاں روزانہ گھر لے جاتے اور اگلے روز مارک کر کے لے آتے۔ طلبہ کے تحریری کام میں دلچسپی لینا ان کی گھٹی میں داخل تھا اور ان کی وجہ سے ان کے زمانہ میں سکول کی نیک نامی عروج پر تھی۔''

عبدالرحمٰن بنگالی انتہائی سلیمُ الطبع، نیک فطرت اور ملک وقوم کے سچے ہمدرد وغمخوار تھے۔ ان کے ایک رفیقِ کار بتاتے ہیں: ایک بار بنگالی صاحب اپنے کوارٹر کے باہر کھڑے تھے کہ ایک پسنجر ٹرین گذری۔ یہ ٹرین لالہ موسیٰ جاتی تھی اور بالعموم خالی ہوتی تھی۔ اس روز بھی اس گاڑی میں مسافر خال خال تھے۔ بنگالی صاحب کی نظر اس گاڑی کے خالی ڈبوں پر پڑی تو وہ آزردہ ہو گئے۔ انہیں یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ مسافروں کی کمی کی وجہ سے ریلوے کو اور بالواسطہ ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے چنانچہ وہ وہیں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس گاڑی کو مسافروں کا مناسب لوڈ عطا فرماتا رہے تاکہ حکومت کو کسی صورت مالی خسارہ نہ

ان کی پیدائش برہمن بڑیہ (بنگلہ دیش) کے ایک غیراز جماعت باا‌ثر پٹھان خاندان میں ہوئی تھی۔ انہیں بیس سال کی عمر میں احمدیت قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے اس فیصلے پر ان کے خاندان کی طرف سے بھرپور مخالفت ہوئی مگر ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی بار قادیان گئے تو اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ اِن کی علمی قابلیت کے پیشِ نظر پہلے انہیں مشرقی بنگال سے نکلنے والے ''احمدی اخبار'' کی ادارت سونپی گئی جس کے بعد انہیں کچھ عرصہ جامعہ احمدیہ میں پڑھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۴ء میں ان کی تعیناتی تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں ہوئی۔ وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک اس ادارے سے منسلک رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں بطور داعی اِلی اللہ امریکہ بھجوا دیا گیا۔ وہ ۱۹۶۳ء میں وہاں تشریف لے گئے اور ڈیڑھ دو سال کے اُس وقفے کے علاوہ جب وہ پاکستان میں مقیم تھے وہ ۱۹۷۲ء میں اپنی وفات تک وہیں رہے۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائی کے دوران امریکہ میں وفات پانے والے دوسرے مجاہد تھے۔

مرحوم کی نعش امریکہ سے پاکستان لائی گئی۔ ان کی نمازِ جنازہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے پڑھائی اور وہ بہشتی مقبرہ کے قطعۂ مبشّرین میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر پر لگا ہوا سنگ مرمر کا یہ خوبصورت کتبہ زائرین کو ایک بار تو ضرور اپنی جانب متوجہ کرتا ہے:

مزار

عبدالرحمٰن خان صاحب بنگالی

بسلسلہ (دعوت الی اللہ) امریکہ میں (وفات) پائی

انہیں کلیولینڈ کے میئر نے شہر کی چابی بطور اعزاز پیش کی

پہلی بیوی کی وفات پر ان کی شادی حضرت سردار کرم داد خان کی صاحبزادی امینہ فرحت سے ہوئی۔ یاد رہے کہ سردار کرم داد خان اور ان کے والد، حضرت میاں خداداد، رسالیدار دونوں کو حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ میاں خداداد نے دادا جی کے ذریعہ احمدیت قبول کی تھی اور وہ اور سردار کرم داد خان ایک مرحلے پر فوج میں اکٹھے رہے تھے۔

ربوہ میں سردار کرم داد خاں تحریک جدید کوارٹرز میں مقیم تھے اور ابا جی ان سے ملاقات کے لیے بکثرت جاتے رہتے تھے۔ بعض اوقات میں بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ سردار کرم داد خان خود تو صاحب فراش تھے اور غالباً چلنے پھرنے سے معذور لیکن ان کی اہلیہ ثانی، عارفہ بیگم (جنہیں ہم چچی عارفہ کہا کرتے تھے) ہمارے گھر آتی رہتی تھیں۔ ان کی بیٹھک میں پرانے وقتوں کا ایک گروپ فوٹو آویزاں تھا جس میں سردار کرم داد خان اور دادا جی

تھی اور تمام لوگ یونیفارم میں ملبوس تھے۔ یہ تصویر فوجی ملازمت کے زمانہ کی

دونوں موجود تھے۔ یہ تصویر فوجی ملازمت کے زمانہ کی تھی اور تمام لوگ یونیفارم میں ملبوس تھے۔ برادرانہ شفقت کا برتاؤ کرتے اور ان

اس پس منظر میں اینہ ابا جی کو بھائی کہتیں، ابا جی بھی ان سے ہمیشہ

سے ملاقات کے لیے ان کے گھر جاتے رہتے۔ ایک دفعہ میں ابا جی کے ہمراہ ان کے گھر گیا تو موصوفہ کچن میں کام کر رہی تھیں۔ ابا جی سیدھے وہیں چلے گئے تو انہیں دوپٹے کی فکر ہوئی۔ ابھی اسی پریشانی میں تھیں کہ ابا جی نے آٹا گوندھنے والی خالی پرات اُلٹی کر کے ان کے سر پر رکھ دی اور کہنے لگے: ''تم دوپٹہ ڈھونڈ رہی تھی نا، میں نے خود ہی تمہارا سر ڈھانپ دیا ہے۔'' عبدالرحمٰن بنگالی جو پیچھے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے کھکھلا کر ہنس پڑے۔

جب ہم ہائی سکول میں پہنچے تو سکول کے ایک استاد روزانہ کی چیدہ چیدہ خبریں بلیک بورڈ پر لکھا کرتے تھے۔ یہ خبریں سارا دن جوں کی توں لکھی رہتیں تا کہ طلبہ کی آتے جاتے ان پر نظر پڑتی رہے۔ طلبہ کو کسی بات کی سمجھ آتی اور کسی کی نہ آتی لیکن یہ ان کے علم میں اضافے کا ایک اچھا طریقہ تھا۔ وہ بعض دفعہ حالات حاضرہ کے حوالے سے اسمبلی میں مختصر سا لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔ یہ ماسٹر سعد اللہ خان تھے جو سکول کے سینئر اساتذہ میں سے تھے لیکن مجھے ان سے براہِ راست اکتسابِ فیض کا موقع سکول کے آخری سال ہی میں ملا۔ بہت محنتی تھے اور بات کو ذہن نشین کرانے کا گُر جانتے تھے۔ لیکچر کو زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم بنانے کے لیے آواز کے زیر و بم کا انتہائی مناسب استعمال کرتے۔ کمزور طلبہ پر خاص توجہ دیتے اور ان سے پیار بھری چھیڑ چھاڑ بھی جاری رکھتے۔ مثال کے طور پر اگر سکندر نامی کوئی طالب علم اپنی نالائقی کا ثبوت فراہم کر دیتا تو وہ اسے ہمیشہ ''سکندرِ اعظم'' کہہ کر پکارتے۔ بدنی سزا تو گویا سکّہ رائج الوقت تھا لہٰذا وہ بھی اپنے شاگردوں کی ٹھکائی سے نہ چُوکتے لیکن معتوب کو باتوں ہی باتوں میں اس کی کمزوریوں کا احساس دلانے کا گُر بھی خوب جانتے تھے۔

ماسٹر صاحب پرانے وقتوں کے گریجوایٹ تھے۔ لوگ بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے ایم اے (انگریزی) کا امتحان بہت دفعہ دیا مگر کامیاب نہ ہو پائے۔ ان کی ناکامی میں غالباً ان کا اپنا کوئی قصور نہ تھا کہ اس زمانے میں ہماری یونیورسٹیاں انگریزی میں ایم اے کی ڈگری کسی خوش نصیب ہی کو دیتی تھیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے پاس انگریزی ادب میں ڈگری تھی یا نہیں، ان کی انگریزی بہت زبردست تھی یا کم از کم ہم یہی سمجھتے تھے۔

وہ جھنگ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد، حضرت میاں رمضان علی نے جو خود بھی استاد تھے حضرت مسیح موعود کے زمانے میں احمدیت قبول کی تھی۔ ماسٹر سعد اللہ مڈل پاس کرنے کے بعد وہیں کسی پرائمری سکول میں پڑھانے لگے۔ بعد میں پرائیویٹ طور پر میٹرک اور پھر ایف اے کر کے جنگ عظیم دوم کے زمانے میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ قسمت اچھی تھی خیریت سے واپس آ گئے اور خود کو جماعتی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ قادیان ہی کے زمانے میں سکول میں پڑھانے پر مامور ہوئے اور ساری زندگی یہاں گذار دی۔

انہیں یہ انفرادیت بھی حاصل تھی کہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ اُٹھتے بیٹھتے ان کا بس یہی ایک کام تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میں نے خود دیکھا کہ بائیسکل چلا رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں قرآن شریف کھول کر تھام رکھا ہے۔ ان پر ہر وقت یہی دُھن سوار رہتی۔ اللہ نے ان کی نیت کو شرفِ قبولیت سے

نوازا اور انہوں نے ضعیف العمری کے باوجود جلد ہی سارا قرآن پاک حفظ کر لیا۔
ایک روایت کے مطابق ان کے والدِ بزرگوار نے بھی پچپن سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کرنا شروع کیا اور چند ہی برسوں میں اسے مکمل کر لیا۔
انہوں نے فیکٹری ایریا ربوہ کی بیت احمد میں کئی سال تک نماز تراویح پڑھائی اور صدر محلّہ کے طور پر خدمت کا موقع بھی پایا۔
ماسٹر صاحب نے تین شادیاں کیں۔ ان کی پہلی اہلیہ کی یادگار ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے کا نام ثناء اللہ اور بیٹی کا نام کلثوم ہے۔ آپا ان ہی ثناء اللہ سے بیاہی گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ بیرونی ممالک میں ملازمت میں گذارا جب کہ کلثوم اپنے ایک بیٹے، آفتاب کے پاس امریکہ منتقل ہو چکی ہیں۔
دوسری اہلیہ سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تولد ہوئیں۔ عبدالسلام ارشد جو اپنی ملازمت کے دوران ایم ای ایس سے وابستہ رہے اور جماعت احمدیہ لاہور کے ایک فعال کارکن ہیں بیٹوں میں سے بڑے ہیں۔ اُن کی شادی صوفی بشارت الرحمٰن کی ایک بھانجی سے ہوئی ہے۔ ظفر اللہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے فارغ التحصیل ہیں۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ سعودی عرب میں ملازمت کرنے کے بعد اب کراچی میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ پشاور میں قیام کے دوران ہماری اُن کے خسر، فضل الرحمٰن خان کے ساتھ گاڑھی چھنتی رہی ہے۔ نصر اللہ سب سے چھوٹے ہیں۔ بنیادی طور پر انجینئر ہیں لیکن بزنس ایڈمنسٹریشن کا ملکہ بھی رکھتے ہیں اور برسوں سے کینیڈا جا چکے ہیں۔ وہ اور ان کی اہلیہ، امتہ الرؤف جو حضرت میاں محمد یامین تاجرِ کتب کی نواسی ہیں اپنے بچوں سمیت وہاں ایک مطمئن و خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔
ماسٹر سعد اللہ کی سب سے بڑی بیٹی نصیرہ چوہدری عبدالطیف اوورسیرؔ کے صاحبزادے، عزیز طاہر سے بیاہی گئیں جب کہ چھوٹی بیٹی، رفیقہ ربوہ کے ایک اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر، محمد احمد باجوہ کے عقد میں آئیں۔
ماسٹر صاحب نے تیسری شادی محمد الدین ناز، ناظر تعلیم القرآن صدر انجمن احمدیہ کی ہمشیرہ سے کی۔ بدقسمتی سے یہ شادی دیرپا ثابت نہ ہوئی اور وہ اس کے چند ہی روز بعد ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کو وفات پا گئے۔
ساتویں جماعت میں پہنچے تو رانا محمد بخش ہمیں انگریزی پڑھانے لگے۔ ہم نے آٹھویں میں بھی انگریزی ان ہی سے پڑھی۔ ہم لوگ اپنی گفتگو میں ان کا ذکر ''ماسٹر محمد بخش'' کے طور پر کیا کرتے تھے۔ بہت شفیق انسان تھے اور بڑی محنت سے پڑھاتے۔ ٹیچرز ڈائری ہر استاد کے لیے ضروری چیز سمجھی جاتی ہے۔ ایک بار انہوں نے نہ جانے کس مجبوری کے تحت ٹیچرز ڈائری لکھنے کا کام مجھے سونپ دیا۔ انہیں میری کارکردگی اتنی پسند آئی کہ بعد میں بہت دنوں تک یہ ڈائری میں ہی لکھتا رہا۔ ایک بار جب ہیڈ ماسٹر کی طرف سے یہ ڈائریاں معاینہ کے لیے منگوائی گئیں تو انہیں اس میں کوئی ایسی فاش غلطی نظر آ گئی جس کی وہ کسی استاد سے توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ماسٹر محمد بخش نے یہ کام مجھ سے لے لیا۔
وہ سکول کے سکاؤٹ ماسٹر بھی تھے۔ انہوں نے یقیناً مطلوبہ تربیت حاصل کر رکھی ہو گی لیکن یہ تفصیلات

جاننے کا موقع پیدا ہوا نہ مجھے ان کو اس حیثیت میں دیکھنے کا موقع ملا۔
ماسٹر محمد بخش اپنے شاگردوں کے مسائل سے بخوبی آگاہ تھے۔ ہمارے ہاں زیادہ بچے انگریزی میں فیل ہوتے ہیں لہٰذا وہ ہمیں سالانہ امتحان سے کچھ عرصہ پہلے سکول بند ہونے کے بعد روزانہ گھر بلا لیا کرتے اور کسی معاوضے کے بغیر تیاری میں رہ جانے والی خامیاں دور کرتے۔

اُس زمانے میں کیمرہ ربوہ میں خاصی نایاب چیز سمجھی جاتی تھی۔ فوٹو گرافی کا رواج بھی عام نہ تھا چنانچہ مجھے یاد نہیں کہ سکول کی پہلی جماعت سے لے کر دسویں تک کسی موقع پر بھی سکول کی طرف سے ہمارے کسی گروپ فوٹو کا اہتمام کیا گیا ہو۔ ماسٹر محمد بخش کے پاس ایک کیمرہ تھا اور اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب ایک روز انہوں نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ ہمارا ایک گروپ فوٹو کھینچنا چاہتے ہیں۔ ہم اس موقع پر بہت ایکسائیٹڈ تھے تاہم یہ فوٹو بغیر کسی پیشگی تیاری اور بغیر کسی اہتمام کے کھینچا گیا۔ ماسٹر محمد بخش پیچھے کھڑے ہو گئے اور تمام طلبہ زمین پر بیٹھ گئے۔ اپنے قد کاٹھ کا لحاظ کئے بغیر کچھ طلبہ زمین پر آلتی پالتی مار کر اور کچھ اکڑوں بیٹھ گئے۔ انہوں نے ایک دو تصویریں ہمیں قطاروں میں کھڑا کر کے کھینچیں۔ اس طرح جو تصویریں بن سکتی تھیں ان کے معیار کے بارے میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس کے باوجود یہ تصویریں ہمیں بہت عزیز ہیں اور کئی بھولے بسرے دوستوں کی یاد تازہ کرا دیتی ہیں۔

انہیں اپنے شاگردوں کی بہبود کا ہر دم خیال رہتا۔ جب میں گھٹیالیاں میں تھا تو وہ ایک بار مجھے اتفاقاً اقصیٰ روڈ پر مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ بلوچستان کے معروضی حالات کے پیشِ نظر وہاں کا محکمہ تعلیم پنجاب کے نوجوانوں کی بلوچستان کے کالجوں میں ملازمت کے لیے درخواستیں خوش دلی سے قبول کر لیتا ہے اور مشورہ دیا کہ مجھے ایک درخواست ڈائریکٹر ایجوکیشن کوئٹہ کو ضرور بھیجنی چاہیے۔ میں نے یہ درخواست اگلے ہی روز بھجوا دی۔ جلد ہی ان کی طرف سے جواب آ گیا کہ مجھے یہ درخواست مقررہ فارم پر جمع کروانی چاہیے۔ میں نے ان کی اس ہدایت کی فوراً تعمیل کر دی لیکن مجھے ان کی طرف سے کوئی کال لیٹر موصول نہ ہوا۔ میں اس عرصے میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے قدرے بہتر ملازمت میں آ چکا تھا اور مقابلے کا امتحان بھی پاس کر چکا تھا لہٰذا اس معاملے میں پیش رفت کو میری عدم دلچسپی سے بھی منسلک کیا جا سکتا ہے۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی کیوں کہ اس کے کچھ ہی عرصے بعد کسی نے یہ ذکر کر کے مجھے ملول کر دیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ بعد میں ان کے بارے میں الفضل میں چھپنے والے مضامین سے پتا چلا کہ جب وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں آئے تو وہ محض ایف اے پاس تھے لیکن انہوں نے یہاں رہ کر ایم ایڈ تک تعلیم حاصل کی۔ وہ ۱۹۶۹ء کے جلسہ سالانہ قادیان میں شمولیت کے بعد واپس آئے تو طبیعت خراب ہو گئی جو بالآخر ۲۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کو ان کی اچانک وفات پر منتج ہوئی۔ اگلے روز جب ان کا جنازہ پڑھا گیا تو جلسہ سالانہ کا پہلا دن تھا۔ ماسٹر محمد بخش اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ ہزاروں لوگوں کو ان کے جنازے میں شمولیت اور ان کے لیے دعائے مغفرت کا موقع ملا۔

مرحوم کے [illegible] بیٹے [illegible] محمود، سلمان احمد اور نصیر احمد مدتِ دراز سے کینیڈا میں ہیں۔ پانچوں بیٹیاں شادی شدہ [illegible] اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ صفدر نذیر گولیکی، مربی سلسلہ ان کے دامادوں میں سے ہیں۔

مجھے [illegible] زندگی میں پہلی بار انگریزی جس استاد سے پڑھنے کا موقع ملا وہ محمد ابراہیم سارچوری تھے۔ اس زمانے کے اردو میڈیم سکولوں میں انگریزی چھٹی جماعت سے شروع ہوتی تھی اور اس کا آغاز چھوٹی اور بڑی اے بی سی کی پہچان اور تحریر سے ہوتا۔ یہ درست ہے کہ اس طرزِ تدریس میں بے انتہا نقائص ہوں گے اور آج اس طریق کار کو غیر زبان سیکھنے کا کوئی مستند طریقہ گردانا بھی نہیں جاتا ہوگا لیکن ہم نے اسی طرح ''رٹ کھڑ'' کرا تنی انگریزی ضرور سیکھ لی کہ اپنی روزمرہ کی ضروریات احسن طریقے سے پوری کر سکیں۔

اُس زمانے میں سکول ''پیار نہیں مار'' کے اصول پر چلائے جاتے تھے چنانچہ کسی غلطی کے مرتکب پائے جانے پر ہمیں ابراہیم سارچوری کے ہاتھوں بھی سوٹیاں کھانا پڑتیں۔ اس کے باوجود ہمیں اُن سے اتنی محبت ملی کہ ہم آج بھی انہیں اسی احترام وعقیدت سے یاد کرتے ہیں۔

وہ انجمن کوارٹرز میں ہم سے ''اَیٹ اے سٹونز تھرو'' رہا کرتے تھے۔ بس یہ ہمارا اندازہ ہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کبھی ان کے گھر پر سنگ باری کی نوبت نہیں آئی۔

ایک بار جب ہم سوٹیاں کھانے کی عمر سے آگے نکل چکے تھے ہم نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ ''سارچوری'' کا لاحقہ کیوں استعمال کرتے ہیں۔ تب انہوں نے بتایا کہ سارچور قادیان سے کچھ دور ایک گاؤں تھا۔ وہ وہاں کے رہنے والے تھے اس لیے خود کو سارچوری کہلوانا شروع کر دیا۔

انہوں نے تقسیم سے پہلے صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت اختیار کی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہیں کسی وقت سکول میں تعینات کر دیا گیا۔ سکول کے قومیائے جانے کے بعد ان کا بھی تبادلہ باہر ہو گیا۔ ریٹائر وہ گورنمنٹ ہائی سکول، احمد نگر کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر ہوئے۔

اُن سے میری آخری ملاقات فروری ۱۹۸۷ء میں ربوہ میں ہوئی۔ وہ اپنے گھر سے پیدل لاری اڈے کی طرف جا رہے تھے۔ میرے پاس اپنی سواری تھی سو میں انہیں وہاں پہنچا آیا۔ اُن دنوں وہ گورنمنٹ زمیندارہ کوآپریٹو ہائی سکول، چک ۱۲۷ جنوبی ضلع سرگودھا میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ زیادہ دُور نہ تھی اور انہیں انکم ٹیکس بے باقی سرٹیفکیٹ درکار تھا جو انہیں فیصل آباد سے ملنا تھا۔ وہ اس حوالے سے میری مدد کے طلبگار تھے۔

مجھے اپنے نام ان کا واحد خط اسی حوالے سے موصول ہوا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں: ''اس روز کا تصوّر میرے ذہن میں انمٹ ہے جو تکلیف کر کے مجھے بس اڈے تک چھوڑ گئے۔ جزاکم اللہ۔ خاکسار آپ کی والدہ ماجدہ کی صحتِ کاملہ کے لیے دست بدعا ہے کہ وہ شافی مطلق اُنہیں جلد صحت عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ کے بچوں کو آپ کی نیک خواہشات کے مطابق دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کرے۔ ثم آمین۔ نمازوں میں سجدے کی حالت میں بھی دعا کا موقع مل جاتا ہے۔

آج مجھے انکم ٹیکس افسر...... کے دفتر حاضر ہونا تھا مگر اب اپنے دفتر میں بیٹھ کر آپ کو لکھ رہا ہوں۔ امید

ان کی خدمت میں بروقت بھجوادی ہوگی۔
آپ کا جواب آنے پر ان شاء اللہ آپ ـــ ہے کہ آپ نے میری فائل......
آپ کو مع اہل و عیال تشریف لانے کی دعوت دیتا ہوں......
حسبِ منشا پروگرام طے ہوسکے گا۔''

ان دنوں اُمّی شدید بیمار تھیں اور وہ اس خط کے ملنے کے چند ہی روز بعد انتقال کر گئیں۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اگرچہ اُمّی پچھلے چھ ماہ سے بیمار تھیں اور اُن کی بیماری میں زیر و بم آتے رہتے تھے لیکن پھر بھی مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے امیدِ کامل تھی کہ وہ ان کے بچوں کے سر پر ان کا سایہ تادیر قائم رکھے گا لیکن تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ مجھے اٹھائیس فروری اور یکم مارچ ۱۹۸۷ء کی درمیانی شب کبھی نہیں بھول سکتی جب میری بھانجی، ڈاکٹر بشریٰ ثوبیہ نے مجھے فون کر کے فوری طور پر سِول ہسپتال، فیصل آباد (جہاں اُمّی داخل تھیں) پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ میں کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے اٹھ کر آیا تھا لہٰذا اس فون کال کے پیچھے چھپے ہوئے اندیشے کی بابت سوچ کر میرا دل لرز اٹھا اور جب میں ہسپتال پہنچا تو اُمّی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اگلی صبح ان کا جسدِ خاکی ربوہ لے جایا گیا جہاں عصر کے وقت اُن کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اگلے کئی روز تعزیت کے لیے تشریف لانے والے دوستوں کا تانتا بندھا رہا لہٰذا سارچوری صاحب کے پاس جانے کا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ اس کے بعد ان سے کبھی ملاقات بھی نہ ہو پائی۔

ہم میاں بیوی ایک بار ہالینڈ گئے تو جمعہ کے اجتماع میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جس نے اپنا تعارف ابراہیم سارچوری کے فرزند کے طور پر کرایا تھا۔ محمد اسحٰق ناصر نامی اس نوجوان نے ہمیں خاص طور پر اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا اور اپنے والدِ بزرگوار کے اس شاگرد کو بہت محبت سے نوازا۔ اس وقت ابراہیم سارچوری زندہ تھے لیکن چند ہی ماہ بعد وہ یکم دسمبر ۲۰۰۰ء کو وفات پا کر بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ماسٹر عبدالرحمٰن اتالیق نے ہمیں ہائی کلاسز میں حساب پڑھایا۔ وہ منحنی جسم کے مالک تھے اور قد زیادہ لمبا نہ تھا۔ سر پر پگڑی رکھتے اور طلبہ سے انتہائی محبت کا برتاؤ کرتے۔ سکول میں اور سکول سے باہر بھی وہ اپنے نام سے زیادہ ''اتالیق صاحب'' کے طور پر پہچانے جاتے تھے لہٰذا اس بات پر کبھی غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ انہوں نے اپنے لیے یہ تخلص کیوں پسند کیا تھا۔

اُس دور میں بھی جب استاد ''مولا بخش'' کے بغیر خود کو نامکمل محسوس کرتے تھے ماسٹر اتالیق طلبہ کی مار پیٹ سے ممکن حد تک اجتناب کرتے۔ یوں بھی قدرت نے انہیں ایک اچھے استاد کی جملہ خوبیوں سے نواز رکھا تھا چنانچہ طلبہ نے کبھی ان کے بیمار ہونے یا کسی ناگہانی حادثہ میں مبتلا ہونے کی خواہش کا اظہار کیا نہ خود بیماری یا گھر میں کسی ضروری کام کے بہانے ان کی کلاس سے غیر حاضری کی۔

میں میٹرک کرنے کے بعد سکول سے چلا آیا تو بھی وہ مجھ سے اسی محبت کا اظہار فرماتے اور میں بھی انہیں وہی احترام دیتا جس کے وہ بجا طور پر حقدار تھے تاہم جب مجھے ان کے بارے میں کچھ لکھنے کا خیال آیا تو ان کی وفات پر کم و بیش تیس سال گذر چکے تھے۔ یہ تو میرے علم میں تھا کہ وہ بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہیں لیکن ان کی

وفات کی خبر میری نظر سے گذری تھی نہ ان کے بارے میں ان کے کسی شاگرد، رفیق کار یا عزیز کا لکھا ہوا کوئی مضمون۔ میں ان کے صرف ایک بیٹے، لطف الرحمن خالد کو پہچانتا تھا جو ربوہ میں پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام کرتے تھے لیکن ان کے انتقال پر بھی ایک مدت گذر چکی تھی لہٰذا بہت دنوں تک تو یہی سوچتا رہا کہ ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوں تو کس طرح۔ اتفاق دیکھئے کہ ان ہی دنوں مرزا خلیل احمد قمر نے ان کے بڑے بیٹے فضل الرحمن نعیم کے ساتھ اپنے روابط کا ذکر کر دیا۔ میں نے ان ہی سے فضل الرحمٰن نعیم کا نمبر حاصل کیا لیکن یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ وہ بیماری کے زیرِ اثر بات چیت میں سخت دشواری محسوس کرتے ہیں لہٰذا میں نے ان کے بیٹے کے ذریعہ ان تک اپنی یہ خواہش پہنچائی کہ وہ مجھے اپنے والدِ بزرگوار کے کچھ حالات لکھ کر دیں۔

اگر چہ میں فضل الرحمٰن نعیم کو اس زمانے سے پہچانتا تھا جب وہ ربوہ میں ہوا کرتے تھے اور اباجی سے ملنے کے لیے ان کے پاس آتے رہتے لیکن اباجی کی وفات کے بعد میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا اور جب ہوا تو اس کیفیت میں کہ ان کی قوتِ گویائی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہاں! انہیں لکھنے پڑھنے میں کوئی دشواری نہ تھی چنانچہ انہوں نے جلد ہی مجھے اپنے والدِ بزرگوار کے متعلق ایک طویل نوٹ لکھ کر ارسال کر دیا اور سچ پوچھیں تو ان کے بارے میں میری اس تحریر کی بنیاد یہی نوٹ ہے۔

ماسٹر عبدالرحمٰن اتالیق ۱۰ جون ۱۹۱۰ کو سکھوں کے ایک مشہور مرکز، بابا بکالہ ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی تین سال کے تھے کہ ان کے والد غلام قادر انتقال کر گئے۔ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود ۱۸ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان بطور پرائیویٹ امیدوار پاس کر لیا۔ اس وقت بابا بکالہ میں باقاعدہ جماعت نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے یہاں جماعت قائم کی اور ہر ماہ قادیان چندہ بھجوانے لگے۔

بابا بکالہ سے کچھ فاصلہ پر راج پورہ نامی قصبے میں ایک احمدی آڑھتی، چوہدری علی احمد کو منشی کی ضرورت پیش آئی۔ عبدالرحمٰن اتالیق کو پتا چلا تو وہ وہاں چلے گئے۔

میرے ذہن میں اکثر یہ سوال اُبھرتا تھا کہ اتالیق کا لفظ ان کے نام کا لاحقہ کیسے بنا۔ فضل الرحمٰن نعیم کے نوٹ میں اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں کہ: ''۱۹۳۰ء میں حضرت خلیفۃ ثانی راجپورہ تشریف لائے تو ایک ہجوم دور و نزدیک سے حضور کی زیارت کے لیے اُمڈ آیا۔ منتظمین کی طرف سے احبابِ جماعت کو تاکید کی گئی کہ وہ قطار بنالیں اور حضور سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا نام اور گاؤں کا نام بتا کر آگے نکلتے جائیں۔ جب اباجی کی باری آئی تو انہوں نے حضور سے مصافحہ کرتے ہوئے بتایا کہ ''میرا نام عبدالرحمٰن ہے.........'' ابھی مزید کچھ کہہ نہ پائے تھے کہ حضور نے فرمایا ''سیکرٹری مال بابا بکالہ؟'' حضور نے ان کا ہاتھ کافی دیر تک تھامے رکھا اور فرمایا: ''مجھے اپنے بچوں کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے۔ اگر آپ قادیان آسکتے ہیں تو آ جائیں۔'' ماسٹر اتالیق نے اسی وقت قادیان جانے کی تیاری کر لی اور صبح کی نماز جا حضور کے پیچھے بیت مبارک میں ادا کی۔ حضور نے آپ کی اس سعادت مندی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے علم تھا آپ نے آ جانا ہے۔''

اس وقت حضور کے تیرہ صاحبزادے اور نو صاحبزادیاں موجود تھیں۔ عبدالرحمٰن اتالیق نے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، صاحبزادہ مرزا مبارک احمد، صاحبزادہ مرزا منور احمد، صاحبزادی ناصرہ بیگم اور صاحبزادی امۃ العزیز کے علاوہ باقی سب بچوں کی کوچنگ کا موقع ملا اور ان سب بچوں نے عبدالرحمٰن اتالیق ہی کی رہنمائی میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہ سلسلہ قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ قبل تک جاری رہا جس کے بعد حضور نے انہیں کسی سکول میں ملازمت کی اجازت دے دی۔ چونکہ ابا جان کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے بہت سے بچوں اور بچیوں کو پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی لہٰذا وہ ''اتالیق'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔''

قیامِ پاکستان سے کچھ پہلے ان کا تقرر ڈی بی ہائی سکول جامکے چیمہ میں ماسٹر کے طور پر ہوا جہاں انہوں نے کم و بیش تین سال پڑھایا۔ ان کا ہیڈ ماسٹر ان کے کام سے ازحد مطمئن تھا اور انسپکٹر آف سکولز بھی ہر بار ان کی کارکردگی سراہتا۔ اسی عرصے میں انہیں حضور نے مرکز بلا کر جامعہ احمدیہ میں تعیناتی کر دیا جس کے بعد ان کی خدمات تعلیم الاسلام ہائی سکول کو منتقل کر دی گئیں۔ انہوں نے میٹرک کے بعد ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ منشی فاضل کر لیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد حضور کی ہدایات کے مطابق انہیں مزید ٹریننگ کے لیے گکھڑ منڈی بھجوایا گیا۔ یہ امتحان بھی انہوں نے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔

اتالیق صاحب انتہائی سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ وہ ایک متوکّل انسان اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ فضل الرحمٰن نعیم بتاتے ہیں: ''قادیان میں ہمارا مکان صرف ایک کمرے اور باورچی خانہ پر مشتمل تھا۔ ایک بار موسلا دھار بارش ہوئی تو یہ کمرہ دو جگہ سے ٹپکنے لگا۔ گھر میں چھت پر چڑھنے کے لیے کوئی سیڑھی موجود نہ تھی چنانچہ ابا جی نے مٹی کے دو ڈھیلے اُٹھائے اور دعا کرنے کے بعد ان سے کہا کہ اللہ کے حکم سے ان سوراخوں پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ خدا کی قدرت، چھت ٹپکنا فوراً بند ہو گئی۔ مجھے تجسّس تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اسی وقت خود چھت پر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لوں گا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ چھت پر چڑھا جائے تو کیسے۔ ساتھ والا مکان مستری عبدالعزیز کا تھا۔ ہمارے اور ان کے مکان کے درمیان پانچ فٹ کی گلی تھی۔ میں نے ان کی چھت سے اپنی چھت پر چھلانگ لگائی اور ایک ڈھیلا اٹھا کر دیکھا تو نیچے ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ مجھے دوسرے ڈھیلے کے نیچے بھی اسی طرح کا ایک سوراخ نظر آیا۔ یہ بظاہر ایک انہونی سی بات تھی چنانچہ میں حیرت و استعجاب کے عالم میں چیخنے لگا۔ ابا جی منہ سے تو کچھ نہ بولے البتہ انہوں نے چھت پر مزید مٹی پھینکتے ہوئے مجھے اشارے سے اس کی کٹائی کا حکم دیا۔''

انہوں نے ۷ نومبر ۱۹۸۳ء کو ربوہ میں وفات پائی، حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے ان کا جنازہ پڑھایا اور بہشتی مقبرہ میں تدفین عمل میں آئی۔

چوہدری غلام رسول ہمیں ساتویں جماعت میں کچھ عرصہ انگریزی پڑھاتے رہے۔ انتہائی شفیق استاد تھے۔ مجھے اب بھی یاد ہے ہمارے سالانہ امتحان میں انگریزی کا وائیوا بھی شامل تھا۔ اس وائیوا میں انگریزی زبان میں بعض بنیادی سوالات پوچھے گئے مثلاً ''وٹ اِز یوٗر نیم'' یا ''وٹ اِز یوٗر فادرز نیم''؟ ان کے علاوہ

اعضائے جسمانی کے ناموں کا امتحان بھی اس وائیوا میں شامل تھا اور سوالات کی نوعیت کچھ اس طرح تھی: ''وچ از یور نوز؟'' یا ''وچ از یور ایئر؟'' مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ''نوز'' ناک کو کہا جاتا ہے اور ''ایئر'' سے مراد کان ہے لیکن بدحواسی میں جوابی فقرے کی ساخت بالکل بھول گیا چنانچہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں گونگوں کی طرح ناک کو ہاتھ لگا کر دکھا دیا اور دوسرے سوال کے جواب میں کان کو چھو دیا۔ میرے جوابات ٹھیک تو تھے لیکن ان میں انگریزی کا عنصر بالکل غائب تھا۔ تب انہوں نے بہت محبت کے ساتھ مجھے سمجھایا کہ میرا جواب یوں ہونا چاہیے: ''دِس از مائی نوز'' یا ''دِس از مائی ایئر۔'' انہوں نے میری غلطیوں سے درگذر کرتے ہوئے مجھے وائیوا میں پاس کر دیا تھا۔

ان سے میرا دوسرا حقیقی رابطہ مدتِ دراز کے بعد اس وقت ہوا جب میں سی ایس ایس کا امتحان دینے کے لیے احمدیہ ہوسٹل، لاہور میں ٹھہرا۔ وہ ان دنوں وہاں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ گو ہم ایک عرصہ کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے لیکن انہیں میرے بارے میں سب کچھ یاد تھا مثلاً یہ کہ میں کون ہوں، میرے والدِ بزرگوار کون تھے اور میرا پروفیسر محمد ابراہیم ناصر کے ساتھ کیا رشتہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے بہت محبت کا برتاؤ کیا اور ہوسٹل میں جگہ کی کمی کے باوجود میرے قیام کو ممکن حد تک آرام دہ بنانے میں بھرپور تعاون کیا۔

میاں محمد ابراہیم سابق ہیڈ ماسٹر نے ان کی وفات پر الفضل میں اپنے ایک مضمون میں ان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے گویا دریا کوزے میں بند کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چوہدری غلام رسول صاحب بی اے، بی ٹی زندگی وقف کر کے تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے سٹاف میں شامل ہوئے۔ اس سے پہلے ڈی سی مڈل سکول، کوٹ مومن (سرگودھا) میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ تقسیم ملک کے بعد چنیوٹ اور پھر مرکزی سکول کے ربوہ میں منتقل ہو جانے پر ربوہ میں تدریسی فرائض ادا کرتے رہے۔ ایک عرصہ تک تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ جانے پر تعلیم الاسلام ہائی سکول کی خدمت سے بعہدہ سیکنڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے لیکن سلسلہ کی خدمت کی اس کے بعد بھی سالہا سال تک توفیق پائی۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول کھاریاں کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا۔ اس کے بعد احمدیہ ہوسٹل لاہور میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ کام کیا اور پچھلے سال ہوسٹل کا انتظام لاہور کی جماعت کے سپرد ہو جانے پر ربوہ آ گئے جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے پرائیویٹ سیکرٹری کے دفتر میں بیرونی ڈاک کے شعبہ میں پیغامِ اجل آنے تک مامور رہے۔ اس طرح اخلاص اور ایثار کے غیر معمولی جذبے کے ساتھ کم و بیش چالیس سال تک سلسلہ کی خدمت تواتر اور تسلسل سے کرتے رہنے کی سعادت پائی اور وقف کے عہد کو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے عمدگی سے آخر دم تک نبھا کر چودہ اگست ۱۹۸۳ء کو تہتر، چوہتر سال کی عمر میں اللہ کے حضور پہنچ گئے۔''

چوہدری غلام مرتضے پی ٹی آئی جنہیں طلبہ بالعموم ''پی ٹی ماسٹر'' کہا کرتے تھے بڑی دبنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا قد کاٹھ اچھا تھا۔ بالعموم شلوار قمیص میں ملبوس رہتے اور پگڑی پہنتے۔ ان کے گلے میں وسل لٹکتی رہتی تھی جس کی آواز دور دور تک پہنچ کر طالب علموں کو ان کی طرف متوجہ کر دیتی تھی۔ ان کی آواز میں دبدبہ تھا۔ جب وہ شیر کی طرح گرجتے تو بعض دفعہ کمزور طلبہ کا پیشاب تک خطا ہو جاتا۔

اسمبلی کے بعد بالعموم پہلا پیریڈ ان ہی کا ہوا کرتا تھا۔ وہ طلبہ کو کاشن کرنے کے ساتھ ساتھ لیٹ ہو
والے طلبہ پر بھی کڑی نگاہ رکھتے اور اس بات کو یقینی بناتے کہ لیٹ آنے والا کوئی طالب علم سزا بھگتے بغیر وقت پر
سکول پہنچ جانے والے طلبہ میں نہ گھس سکے۔ لیٹ آنے والوں کے لیے حسبِ حالات دو سے چھ سوئیوں
مقرر تھی۔ سوٹیوں کی تعداد کا انحصار اس تاخیر پر تھا جس کا کوئی طالب علم مرتکب ہوتا۔ یوں تو گرمیوں میں بھی یہ
برداشت کرنا آسان نہ تھا لیکن سردیوں میں تو یہ سوٹیاں بعض دفعہ ہاتھوں کا خون بھی منجمد کر دیتیں۔ سوٹی کی ضرب
سے ہاتھوں پر بننے والے عارضی نشانات کو ''لاسیں'' کہا جاتا اور ان لاسوں کو مٹانے کے لیے بہت کوشش کرنا
پڑتی۔ اس کا سب سے آزمودہ نسخہ یہ تھا کہ ہاتھوں کو پیالے کی شکل دے کر اس میں پھونکیں ماری جائیں اور
ہتھیلیوں کو کچھ دیر تک آپس میں تیزی کے ساتھ رگڑا جائے۔ زیادہ تکلیف کی صورت میں ہاتھ دونوں ٹانگوں کے
درمیان دبا لیے جاتے۔ اس سے درد میں افاقہ ہو جاتا اور کچھ دیر کے بعد لاسیں غائب ہو جاتیں۔

پی ٹی ماسٹر طلبہ کو ڈرل کرانے کے علاوہ سکول میں نظم و نسق کے بھی ذمہ دار تھے اور میرا تاثر یہ ہے کہ ان سے اپنے اس فرض کی ادائی میں شاذ ہی کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہوگی۔

میں نے بعض کتبِ سلسلہ میں پڑھا ہے کہ قیامِ ربوہ کے ابتدائی دور میں جب ایک نادان دشمن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی پر چاقو کا وار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اقبال احمد نامی باڈی گارڈ فوری طور پر حملہ آور اور حضور کے درمیان آ گئے۔ وہ حضور کو اس نوجوان کے مزید وار سے بچانے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن خود زخمی ہو گئے۔ اسی اثناء میں چوہدری غلام مرتضے جو اتفاق سے اس وقت بیت مبارک میں موجود تھے اور یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے آگے بڑھے۔ انہوں نے حملہ آور کو اپنی گرفت میں لے کر اس کے مذموم مقاصد کو ناکام بنا دیا۔

انہوں نے ہی تھانہ لالیاں میں اس واقعہ کی ایف آئی آر کٹوائی۔ ان کی طرف سے داخل کی گئی درخواست جس میں اس واقعہ کی تمام تفصیلات درج ہیں قارئین کی دلچسپی کے لیے تاریخ احمدیت جلد ہفت دہم کے حوالہ سے ذیل میں نقل کی جا رہی ہے:

''آج (بیت) مبارک ربوہ میں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی امام جماعت احمدیہ نماز پڑھانے کے بعد جب محراب کے مغربی دروازہ سے نکلنے لگے تو ایک نوجوان لڑکے نے جس نے صفِ اوّل میں حضور کے پیچھے ہی نماز پڑھی تھی آگے بڑھ کر یا علی کہتے ہوئے حضور پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ چاقو حضرت صاحب کی گردن میں دائیں جانب لگا اور حضور زخمی ہو کر گرے۔ اقبال احمد پہرہ دار نے حضرت صاحب کو سنبھالا اور نوجوان کو پکڑنا چاہا تو مذکور نے پھر دوسرا وار حضرت صاحب پر کیا لیکن یہ وار اقبال احمد کے بائیں کان پر لگا۔ اقبال احمد زخمی ہو گیا۔ اس پر میں نے آگے بڑھ کر حملہ آور نوجوان کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ حملہ آور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کشمکش میں میرے ناک کی بائیں جانب آنکھ کے نیچے رخسار پر چاقو کی نوک سے خراشیں آئیں۔ مولوی نور الحق، عبدالحکیم جامعہ مبشرین، ماسٹر فقیر اللہ، قاضی عبدالسلام، ملک ولایت خان و دیگر مردمان جو نماز پڑھ چکے تھے، نے حملہ آور کو پکڑ لیا اور چاقو بھی چھین لیا۔ حضرت صاحب کو سہارا دے کر

[illegible] لے گئے۔ حملہ آور نوجوان یہاں ..... موجود ہے جس نے چپ سادھ رکھی ہے اور کوئی پتا نہیں [illegible] آپ موقع پر پہنچ کر فوری کارروائی کریں۔"

مرزا عنایت اللہ صاحب نے ہمیں چھٹی جماعت میں کچھ عرصہ عربی پڑھائی اور کچھ اس انداز سے پڑھائی کہ کم از کم مجھے اس کے ساتھ گہری دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں نے گریجوایشن کی سطح تک اسے اختیاری مضمون کے طور پر پڑھا۔

اس کے بعد مجھے مرزا عنایت اللہ سے براہ راست اکتسابِ فیض کا موقع ملا نہ کسی اور حوالے سے ان سے کوئی انٹرایکشن ہوا البتہ وہ بعد میں صدر انجمن کوارٹرز میں مقیم رہے جس کی وجہ سے کبھی کبھار ان سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ میرا اپنا تاثر یہی تھا کہ وہ انتہائی بےنفس سے انسان ہیں جو کسی غیر کے معاملے میں بلاوجہ اپنی ٹانگ نہیں اڑاتے۔

میں جب انہیں دیکھتا ان کے ہونٹ ہل رہے ہوتے تھے گویا وہ زیرِلب کچھ پڑھ رہے ہوں۔ میں اپنی نوعمری کی وجہ سے اس کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایک بار ایک واقفِ حال نے یہ وضاحت کر کے کہ موصوف ہر وقت استغفار کرتے رہتے تھے میری یہ الجھن دُور کر دی۔

ان کی وفات پر ۲۴ اگست ۱۹۶۱ء کے الفضل میں شائع ہونے والی خبر میں یوں ہی تو نہیں کہا گیا تھا کہ "مرحوم بہت مخلص، نیک اور صالح نوجوان تھے اور ...... اخلاص اور محنت کے ساتھ اپنے فرائض بجا لاتے تھے۔" سکول کے ہیڈ ماسٹر، میاں محمد ابراہیم نے فرائضِ منصبی کے ساتھ مرحوم کی لگن کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "ایک موقع پر تو ایک انسپکٹر صاحب نے سکول کی لاگ بک میں خاص طور پر ان کے کام کی تعریف کی۔"

حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت مرزا اسلام اللہ کے یہ پنتالیس سالہ فرزند معدہ کے کینسر میں مبتلا تھے اور یہی بیماری بالآخر ان کی وفات پر منتج ہوئی۔ انہوں نے لاہور کے میو ہسپتال میں وفات پائی جہاں وہ پچھلے کچھ عرصہ سے زیرِ علاج تھے۔

میں سمجھتا ہوں مرزا عنایت اللہ کی وفات پر اساتذہ و بورڈران کی طرف سے پاس کی گئی قراردادِ تعزیت کے یہ الفاظ مرحوم کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کا درجہ رکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے تقویٰ، پرہیزگاری، محنت اور ہمدردی کا جو بہترین نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے وہ ہم اساتذہ اور طلبہ کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دے گا۔ آپ کی وفات سے ہم ایک مخلص رفیقِ کار اور مشفق استاد سے محروم ہو گئے ہیں۔"

مرزا عنایت اللہ کی وفات پر کہی گئی مبارک عابد کی جس نظم کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس کے پہلے تین اشعار کچھ اس طرح ہیں:

کل صبح روتی ہوئی تھی کہہ رہی بادِ صبا
اپنے مکتب کا درخشندہ ستارہ چھپ گیا

نوجواں استاد اپنے مرزا صاحب چل بسے
منتظر ربوہ میں تھے ہم جن کی آمد کے لیے
نوجواں اوصاف تیرے سارے ہم کو یاد ہیں
تیرے جانے پر ہمارے دل بہت ناشاد ہیں

ماسٹر عبدالقدیر ہمیں اردو پڑھایا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں پڑھایا تو بہت تھوڑا عرصہ لیکن اپنا دستِ شفقت ہمیشہ میرے سر پر رکھا۔ کبھی مل جاتے تو میں سلام کئے بغیر اور وہ میرا حال پوچھے بغیر آگے نہ بڑھتے مگر نہ جانے کیوں وہ ہمیشہ میرا نام بھول جاتے۔ وہ مجھے ''داؤد'' کی بجائے ''ودود'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس مغالطے کا سبب کیا تھا۔ شروع میں ایک دو بار میں نے ان کی توجہ اپنے صحیح نام کی طرف مبذول کرائی لیکن بعد میں ''ودود'' کہہ کر پکارے جانے پر بھی خاموشی اختیار کر لیتا۔

اُس زمانے میں میرے پاس ایک خوبصورت فاؤنٹین پین تھا جس پر چھوٹی چھوٹی ڈبیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک بار جب میں ان کے پاس کھڑا تھا انہیں لکھنے کے لیے پین کی ضرورت پیش آئی تو میں نے یہ پین انہیں پیش کر دیا۔ یہ پین بہت روانی سے لکھتا تھا اور اس کی یہی خوبی انہیں پسند آئی۔ تب میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ اگر وہ چاہیں تو یہ پین اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ وہ یہ تحفہ قبول کرنے میں متامّل تھے لیکن میرے اصرار پر انہوں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں جتنا عرصہ ان کی کلاس میں پڑھتا رہا وہ اس پین کی روانی کی تعریف کرتے رہے۔

ملازمت میں آ جانے کے عرصہ بعد تک میں جب بھی ربوہ جاتا تو کہیں نہ کہیں ان سے ملاقات ہو جاتی لیکن جب انہیں دیکھے مدت ہوگئی تو پوچھنے پر کسی نے ان کے انتقال کی خبر سنا دی۔ اب جو اُن کے حالات لکھنے کی طرف توجہ ہوئی تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ کس سے رابطہ کیا جائے۔ بالآخر بشیر سیفی نے یہ مسئلہ حل کیا اور میری بات مبارک کاٹھگڑھی سے کرا دی جو مرحوم کے برادرِ نسبتی، خلیل احمد کو جانتے تھے۔ ان کی معرفت مرحوم کے بھائی رشید ارشد سے بات ہوگئی۔

رشید ارشد کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق مرحوم رفیقِ حضرت مسیح موعود حضرت میاں شیخ دین کے پوتے اور میاں عبدالکریم کے بیٹے تھے اور وہ ۱۹۲۱ء میں قادیان میں پیدا ہوئے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر فوج میں بھرتی ہو گئے تاہم وہاں سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول میں بطور استاد ملازمت اختیار کر لی۔

قیامِ پاکستان کے بعد حضرت مصلح موعود کے حکم پر قادیان رُک گئے جب کہ ان کے خاندان کے باقی افراد یہاں آ گئے تھے۔ اُن ہی دنوں ان کے والدِ بزرگوار سخت بیمار ہو گئے۔ یہاں پر ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا لہٰذا ان کی والدہ نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں پاکستان بلا لینے کی درخواست کی چنانچہ وہ یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچ گئے اور سیدھے میو ہسپتال گئے جہاں ان کے والد موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا

تھے۔ [illegible] عبدالقدیر کو ان کی خدمت کا کوئی موقع نہ مل سکا کیوں کہ وہ اگلے ہی روز اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان دنوں تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں جاری ہو چکا تھا چنانچہ ماسٹر عبدالقدیر لاہور سے وہاں منتقل ہو گئے اور پھر سکول کے ربوہ آنے کے بعد یہاں رہائش پذیر ہو گئے۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول سے ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ نصرت جہاں اکیڈمی میں پڑھاتے رہے۔ انہوں نے ۹ جنوری ۱۹۹۹ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ماسٹر محمد ابراہیم بھامبڑی ان کے دیرینہ رفیق کار ہیں۔ ایک بار ان سے مرحوم کے بارے میں گفتگو چل نکلی تو وہ بتانے لگے: ''مولوی عبدالقدیر صاحب عمر میں تو مجھ سے کچھ سال چھوٹے تھے لیکن علم و عمل کے لحاظ سے مجھ سے قابلِ رشک حد تک آگے تھے۔ مجھے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے اور میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں وہ اپنے دوستوں سے ہمیشہ مہربانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔''

بھامبڑی صاحب کی گفتگو جاری تھی: ''عربی زبان کا ایک مقولہ ہے: اِنَّمَا الْمَرْءُ حَدِیْثٌ فَکُنْ حَدِیْثاً حَسَناً لِّمَنْ وَّعٰی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد انسان ایک کہانی بن کر رہ جاتا ہے پس تو ایسی کہانی بن کہ لوگ تجھے محبت سے یاد رکھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم اتنے اچھے کردار کے مالک تھے کہ ان کے مجھ ایسے دوست آج بھی انہیں بہت محبت سے یاد کرتے ہیں اور محبت سے یاد کریں بھی کیوں نہ، وہ تھے ہی بہت اچھے اور ہمدرد انسان۔ میں جب کبھی بیمار پڑتا تو وہ یہ خبر سنتے ہی میری مزاج پرسی کے لیے میرے گھر تشریف لے آتے اور میری دلجوئی کی خاطر دیر تک میرے پاس بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات پھل کی شکل میں کوئی چھوٹا موٹا تحفہ بھی لے کر آتے۔ میں ان کی اور ان جیسے دیگر دوستوں کی دعا سے جلد ہی صحت یاب ہو جاتا۔ یہی نہیں وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے لیے ہمیشہ دُعا کیا کرتے تھے اور یوں وہ حضرت مسیح موعود کے اس ارشاد کی عملی تفسیر تھے کہ اپنے بھائی کی سب سے بڑی مدد اس کے لیے دعا ہے۔''

انہوں نے ماسٹر عبدالقدیر کا بطور استاد مرتبہ متعین کرتے ہوئے مزید کہا: ''مولوی صاحب سکول میں میرے رفیق کار تھے۔ وہ طلبہ کو دینیات، عربی اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ مضمون کی تیاری کر کے کلاس میں جاتے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ طلبہ کو پڑھانا آسان کام نہیں ہے۔ اپنے ذہن کی بات طلبہ کے ذہن میں ڈالنا ہوتی ہے اور یہ کام تبھی ہو سکتا ہے جب استاد کو اپنے مضمون پر دسترس حاصل ہو اور وہ پورے انہماک کے ساتھ بچوں کو پڑھائے۔ مولوی صاحب یہ کام بڑی توجہ اور حکمت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ دورانِ تعلیم بعض بچوں کو سزا بھی دینا پڑتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ مولوی صاحب اصلاح کی خاطر سزا تو دیا کرتے تھے لیکن ان کی مار میں بھی پیار ہوتا تھا۔ میرے مشاہدے کے مطابق ایسے استادوں کے غصہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل ہوتی ہے کیوں کہ طلبہ کو کسی قابل بنانے میں اس کا بڑا کردار ہوتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ بچے بالعموم ان کی مار کا بُرا نہ مانتے۔ بطور استاد ان کی ایک اور خوبی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ سکول انتظامیہ کی طرف سے امتحانی پرچوں کی چھپائی اور نتائج کی ترتیب کا کام عرصہ تک ان کے سپرد رہا۔ انہوں نے یہ ذمہ داری بہت دیانتداری

سے سرانجام دی اور انتظامیہ کو ان سے کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔''

بھامبڑی صاحب ماسٹر عبدالقدیر کی سیرت و کردار پر گفتگو کرتے ہوئے فرمارہے تھے: ''مولوی صاحب خاموش طبیعت تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُ مَالَا يَعْنِيْهِ یعنی آدمی کے دین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بے مقصد باتیں نہ کرے۔ مولوی صاحب اس حدیث پر پورا پورا عمل کرتے تھے۔ میں نے انہیں فضول اور بے مقصد بات کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ سکول سٹاف جب اکٹھا بیٹھتا تو وہ صرف ضرورت کے تحت لب کشائی کرتے۔ انہیں بات کو بلاوجہ طول دینے یا لگائی بجھائی کرنے کی عادت نہ تھی تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ خشک مزاج تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر شخص سے انتہائی بشاشت اور حسنِ اخلاق سے ملتے۔''

ماسٹر عبدالقدیر کی ملّی خدمات کے حوالے سے بھامبڑی صاحب نے بتایا: ''ہم دونوں فرقان فورس میں شامل تھے اور ہمیں کشمیر کے محاذ پر جنگی خدمات سرانجام دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حکومتی سطح پر ہماری خدمات کا اعتراف ابتداءً سرٹیفکیٹس اور بعد میں میڈلوں کی شکل میں کیا گیا۔''

اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے بھامبڑی صاحب نے کہا: ''مولوی صاحب خوبیوں کا مرقع تھے۔ مجھے جب مرحوم یا اُن جیسے دین کو دنیا پر مقدم رکھنے والے باقی وفات یافتہ ساتھی یاد آتے ہیں تو میری زبان پر بے ساختہ عربی زبان کے یہ اشعار آجاتے ہیں:

وَا اَسَفَا عَلٰى فِرَاقِ قَوْمٍ
هُمُ الْمَصَابِيْحُ وَالْحُصُوْنُ
وَ الْمُدْنُ وَالْمُدْنُ وَالرَّوَاسِيْ
وَ الْخَيْرُ وَالدِّيْنُ وَالسُّكُوْنُ
لَمْ تَتَغَيَّرْ لَنَا اللَّيَالِيْ
حَتّٰى تَوَفَّهُمُ الْمُنُوْنُ
فَكُلُّ جَمْرٍ لَنَا قُلُوْبٌ
وَ كُلُّ مَاءٍ لَنَا عُيُوْنٌ''

عربی دان قارئین تو ان اشعار کا مفہوم بخوبی سمجھ گئے ہوں گے لیکن ان لوگوں کے لیے جو عربی زبان وادب سے خاطر خواہ واقفیت نہیں رکھتے ان اشعار کا ترجمہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔

یاد رہے کہ یہ ترجمہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے اس خطبہ جمعہ سے ماخوذ ہے جو آپ نے ۲۲ اگست ۱۹۴۱ء کو حضرت منشی ظفر احمد رفیق حضرت مسیح موعود کا نمازِ جنازہ غائب پڑھانے سے پہلے ارشاد فرمایا تھا اور جس میں حضور نے مرحوم کی صفاتِ حسنہ کا ذکر کرتے ہوئے ان ہی اشعار کا حوالہ دیا تھا۔ اشعار کا ترجمہ جو حضور ہی کا بیان فرمودہ ہے کچھ اس طرح ہے:

ہائے افسوس ان لوگوں کی جدائی پر جو دنیا کے لیے سورج کا کام دے رہے تھے اور جو دنیا کے لیے قلعوں کا رنگ رکھتے تھے۔ لوگ ان سے نور حاصل کرتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے عذابوں اور مصیبتوں سے دنیا کو نجات ملتی تھی۔

وہ شہر تھے جن سے تمام دنیا آباد تھی، وہ بادل تھے جو سوکھی ہوئی کھیتیوں کو ہرا کر دیتے تھے، وہ پہاڑ تھے جن سے دنیا کا استحکام تھا۔ اسی طرح وہ تمام بھلائیوں کے جامع تھے اور دنیا ان سے امن اور سکون حاصل کر رہی تھی۔

ہمارے لیے زمانہ تبدیل نہیں ہوا۔ مشکلات کے باوجود ہمیں چین ملا، آرام حاصل ہوا اور دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں نے ہمیں گھبراہٹ میں نہ ڈالا مگر جب وہ فوت ہو گئے تو ہمارے سکھ بھی تکلیفیں بن گئے اور ہمارے آرام بھی دکھ بن گئے۔

پس اب ہمیں کسی آگ کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہمارے دل خود انگارا بنے ہوئے ہیں اور ہمیں کسی اور پانی کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہماری آنکھیں خود بارش برسا رہی ہیں۔

ماسٹر عبدالقدیر کے بعد کچھ ذکر ماسٹر محمد اسماعیل کا جو ہمیں مڈل کلاسز میں عربی پڑھایا کرتے تھے۔ منحنی جسم اور قدرے چھوٹے قد کے تھے۔ سر پر ہمیشہ سیاہ رنگ کی ٹوپی رکھتے۔ اپنے شاگردوں سے بے حد محبت کرتے اور ان کی تعلیمی کمی پوری کرنے کے لیے انہیں سکول کے اوقات کے بعد بھی بخوشی وقت دیتے۔ محلہ دارالیمن میں رہائش پذیر تھے۔ سکول چھوڑنے کے بعد اِدھر اُدھر آتے جاتے ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک زمانے میں گول بازار میں فضلِ عمر ہسپتال کے بالمقابل بائیسکل مرمت کی ایک نئی دکان کھلی۔ میں انہیں کبھی کبھی اس دکان پر بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ غلطی نہیں کر رہا تو بسا اوقات وہ بائیسکل مرمت بھی کر رہے ہوتے تھے۔ یہ دکان ان کے بڑے بیٹے مبارک احمد طاہر نے کھولی تھی جنہوں نے بعد میں ایم اے فلاسفی کر لیا اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں لیکچرر ہو گئے۔

جب ماسٹر صاحب لمبا عرصہ نظر نہ آئے تو مجھے فکر ہوا۔ تب مبارک نے بتایا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ الفضل نے ان کی وفات کی چھوٹی سی خبر شائع کی تھی جس کے مطابق انہوں نے گیارہ اور بارہ اگست ۱۹۷۶ء کی درمیانی شب بعارضہ یرقان وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ تاہم اس خبر سے ان کے حالاتِ زندگی کا کچھ پتا چلتا تھا نہ میرے علم کے مطابق ان کے بارے میں کسی اخبار یا رسالے میں کچھ لکھا گیا تھا۔ ان کے بیٹے مبارک احمد طاہر نے بتایا کہ وہ ۱۹۲۰ء میں اٹر پور تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری اللہ بخش حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے ہاتھ پر بیعت کر کے حلقہ بگوشِ احمدیت ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے ماسٹر محمد اسماعیل پیدائشی احمدی تھے۔ انہوں نے مدرسہ احمدیہ قادیان میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۰ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا لیکن جلد ہی فوج کے ای ایم ای وِنگ میں بھرتی ہو کر برما چلے گئے۔

قیامِ پاکستان سے کچھ ماہ پہلے فوج سے فارغ ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر کے ضلع

شیخو پورہ منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصہ سرگودھا میں ڈاکٹر حافظ مسعود احمد کے کلینک پر بطور ڈسپنسر کام کیا اور ۱۹۵۴ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں بطور اورینٹل ٹیچر بھرتی ہو گئے۔

مبارک بتا رہے تھے: ''ایک بار صدر انجمن احمدیہ نے اپنی کسی مصلحت کے تحت سکول سٹاف میں تخفیف کی تو ابا جی اس کی زد میں آ گئے۔ تب ملک حبیب الرحمٰن انسپکٹر آف سکولز کے ذریعہ ان کی تعیناتی ڈی سی ہائی سکول گھڑیال کلاں ضلع شیخوپورہ میں کرا دی گئی جہاں وہ تین سال رہنے کے بعد پھر تعلیم الاسلام ہائی سکول میں آ گئے۔''

''ان کی کوئی خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت سی باتیں ہیں جو اِن کے کردار کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ انہوں نے گھڑیال کلاں میں قیام کے دوران اپنے حسنِ اخلاق سے سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں عنایت اللہ کے دل میں گھر کر لیا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ابا جی احمدی ہیں تو انہوں نے ان کا مزید احترام کرنا شروع کر دیا۔ وہ ابا جی سے جماعت کا لٹریچر اور الفضل لے کر پڑھتے رہے اور جماعت سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہیں اگرچہ خود تو احمدیت قبول کرنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی تاہم انہوں نے اپنی دو بیٹیوں کو بغرضِ تعلیم جامعہ نصرت میں بھجوا دیا۔ ان بچیوں نے ہوسٹل میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔

ابا جی انتہائی محنتی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد شیخوپورہ میں قیام کے دوران گاؤں سے دودھ اور دیسی گھی جمع کر کے بائیسکل پر لاہور لے جاتے۔ یوں انہیں روزانہ ساٹھ ستر میل سفر کرنا پڑتا مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ اس وقت تک یہ کام کرتے رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے روزگار کی کوئی بہتر صورت پیدا نہیں فرما دی۔''

ماسٹر صاحب بہت نرم طبیعت تھے لیکن کسی طالب علم میں کوئی تعلیمی یا اخلاقی کمزوری دیکھتے تو سخت سزا دینے سے بھی نہ ہچکچاتے۔ نمبر دینے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے اور بعض دفعہ سو میں سے سو نمبر بھی دے دیتے۔ کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس سے کیا جاتا ہے۔ اگر طالب علم نے درست لکھا ہے تو اسے پورے نمبر ملنے چاہئیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ہمیشہ خوشخطی کے خاص نمبر دیا کرتے تھے۔

خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

چوہدری عطاء اللہ جو اوڑ ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے ہمیں چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھایا کرتے تھے۔ وہ فاضلِ عربی تھے اور سکول میں اورینٹل ٹیچر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اسی نسبت سے عربی اور دینیات ان کے خاص مضامین تھے۔ بہت محنتی اور فرض شناس تھے لیکن بسا اوقات یوں محسوس ہوتا کہ پڑھاتے پڑھاتے استغراق میں چلے گئے ہیں۔ بچے سمجھتے کہ سو گئے ہیں اور وہ اپنی کھیل کود میں لگ جاتے لیکن دراصل ان کی توجہ کلاس پر ہی مرکوز ہوتی تھی۔ وہ اپنے پاس ایک بانس نما چھڑی رکھتے تھے چنانچہ کسی طالب علم کو سزا دینا مقصود ہوتی تو اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچانک اس کی ٹھکائی کر دیتے۔ بعض اوقات وہ طالب علم کو ہاتھ باہر نکالنے

دے دیتے لیکن جب چھڑی قریب پہنچتی تو اچانک اسے ہاتھ سے چھوڑ کر طالب علم کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیتے۔ طالب علم جو ذہنی طور پر بیدزنی کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو چکا ہوتا تھا اس تھپڑ پر ہکا بکا رہ جاتا۔

سچ پوچھیں تو فی الوقت مجھے چوہدری عطاء اللہ کی کوئی اور بات یاد نہیں آ رہی البتہ ان کی بیٹی ذکیہ عطا (جو میری بہن صادقہ کی ہم جماعت ہیں اور اب ذکیہ شاہد لطیف کہلاتی ہیں) کے بیان کے مطابق وہ ۱۹۱۳ء میں قادیان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مدرسہ احمدیہ سے تعلیم پائی اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ساتھ منسلک ہو گئے اور پھر اسی ادارے کے ہو کر رہ گئے۔ بیٹیوں کو تو باپ ویسے ہی بہت پیارے ہوتے ہیں اور ذکیہ کو اس قاعدہ سے مستثنٰی قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن کم از کم مجھے ان کے اس بیان میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا کہ وہ طبعاً بہت نڈر تھے۔

اس حوالے سے وہ ایک واقعہ خاص طور پر بیان کرتی ہیں۔ تفصیلات کے مطابق قادیان میں مجلس خدام الاحمدیہ کے تحت رضا کارانہ ڈیوٹی کے دوران ایک باران کا گھوڑ سوار چوروں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان کی للکار پر چوروں نے راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی لیکن نہتا ہونے کے باوجود چوہدری عطاء اللہ نے ان کا تعاقب جاری رکھا حتٰی کہ وہ خود ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ وہ شدید زخمی ہوئے اور یوں چوروں کو فرار ہونے کا موقع مل گیا مگر ان کی اس بہادری اور فرض شناسی کے اعتراف میں مجلس خدام الاحمدیہ کی طرف سے انہیں خوشنودی اور انعام سے نوازا گیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد چوہدری عطاء اللہ محلّہ دارالعلوم غربی میں رہائش پذیر رہے تاہم جب ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا اور وہ گھر میں تنہا رہ گئے تو وہ اپنے ایک بیٹے کے پاس تربیلہ منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے دسمبر ۱۹۸۷ء میں وفات پائی۔ موصی تھے لہٰذا بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مرحوم مخلص احمدی تھے۔ ۱۹۵۳ء کے پُر آشوب ایام میں جب جماعت کے خلاف تحریک اپنے جوبن پر تھی اور ملک کے طول و عرض میں احمدیوں کا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی مرکز کو مقامی حالات سے باخبر رکھنے میں جن لوگوں نے نمایاں حصہ لیا ان میں چوہدری عطاء اللہ بھی شامل تھے جو اُن دنوں چنیوٹ میں تھے اور ان کی اس خدمت کا حوالہ تاریخِ احمدیت مؤلفہ مولانا دوست محمد شاہد کی سولھویں جلد میں موجود ہے۔

ماسٹر سعادت علی شاہ نے ہائی کلاسز میں ہمیں چند مہینے سائنس پڑھائی۔ عجیب اتفاق ہے سکول چھوڑنے کے بعد ان سے ملاقات کا کبھی خیال ہی نہیں آیا لیکن اب جو اس طرف توجہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ کوشش کی ان کے کسی بچے سے رابطہ ہو جائے لیکن واقفانِ حال نے بتایا کہ وہ لاولد تھے اور یہ کہ ان کا ایک بھتیجا محمد اکرم دفتر تحریک جدید میں ملازم ہے۔

محمد اکرم کے بیان کے مطابق ماسٹر صاحب ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والدِ بزرگوار کا نام نعمت علی شاہ تھا اور وہ قیامِ پاکستان کے بعد بجواڑ سے بھیرہ آئے تھے۔ ماسٹر صاحب بھیرہ اور وزیر آباد میں پڑھتے رہے اور ایف ایس سی، سی ٹی کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء کی دہائی میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھانے لگے۔ دوران

ملازمت انہوں نے بی ایس سی اور بی ایڈ کے امتحانات پاس کر لیے۔ ۱۹۷۲ء میں جب ملک بھر کے پرائیویٹ
قومیا لیے گئے تو ان کی تبدیلی ملتان ہوگئی۔ اس کے بعد وہ میلسی، کوٹ مومن، مونا ڈپو اور مردان میں رہے۔
''مردان تو صوبہ سرحد میں ہے'' میں نے کہا ''ان کی تبدیلی پنجاب سے باہر کیسے ہوگئی؟''
''ماسٹر صاحب کی بیوی، ممتاز بیگم وفات پا گئیں تو انہوں نے مردان کی ایک خاتون لیڈی ہیلتھ وزیٹر
خالدہ نسیم سے دوسری شادی کی تھی اور ان کے مردان منتقل ہونے کی بڑی وجہ یہی شادی تھی۔''
خالدہ نسیم اب بھی مردان ہی میں مقیم ہیں۔ میری ان سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا:
''ماسٹر صاحب بہت محبت کرنے والے شوہر تھے۔ ۱۹۹۳ء میں اپنی ریٹائرمنٹ پر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔
خدا نے انہیں جماعتی خدمت کی بھی توفیق بخشی چنانچہ وہ چھ سال تک امیر جماعت احمدیہ مردان رہے اور کچھ عرصہ
ضلعی ناظم انصاراللہ بھی۔ انہوں نے ۱۹ جولائی ۲۰۱۰ء کو وفات پائی۔ موصی تھے لہٰذا ان کا جسدِ خاکی ربوہ لے جایا
گیا جہاں ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔''
''ان کے شاگردوں میں سے کوئی خاص نام؟'' میں نے پوچھا۔
''اس موضوع پر کبھی زیادہ بات نہیں ہوئی تاہم بتایا کرتے تھے کہ جب وہ ملتان میں تھے تو انہیں
جنرل ضیاءالحق کے دونوں بیٹوں اور ایک بیٹی کو کچھ عرصہ ٹیوشن پڑھانے کا موقع ملا۔''
ہمارے سکول کے اساتذہ میں سے ایک ماسٹر ضیاءالدین ارشد بھی تھے جو مڈھ رانجھا کے رہنے والے تھے۔
قیامِ پاکستان کے وقت وہ اسی گاؤں میں مدرس کے طور پر کام کر رہے تھے تاہم جب چنیوٹ میں تعلیم الاسلام ہائی سکول
کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے ساتھ منسلک ہو گئے اور کئی سال تک یہاں تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ میاں
محمد ابراہیم، ہیڈ ماسٹر کا بیان ہے کہ ماسٹر ضیاءالدین نے ''اپنے فرائضِ منصبی نہایت عمدگی سے ادا کیے اور مجھے بحیثیت
مدرس اعلیٰ مطلقاً کبھی......شکایت کا موقع نہ دیا۔ دلی تعاون اور تابعداری کرنے والے رکن تھے جن کی اعانت و تعاون
پر ہر طرح بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ سلسلہ جس قسم کے تعاون اور اخلاص و عقیدت کا ایک ماتحت سے توقع رکھتا ہے وہ مکمل
طور پر ان میں موجود تھی۔ ان کا ایک مقولہ اب تک مجھے یاد ہے کہ ''ماتحت کا کام محض ہلا جی، بھلا جی کہنا ہے، افسر مجاز
جو کچھ کہے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے، حیل و حجت کرنا نہیں بلکہ دیانتداری سے اس کے حکم کی تعمیل کرنا ہے'' اور
مجھے اس امر کا اظہار کرتے ہوئے انتہائی خوشی ہے کہ انہوں نے اس اصول پر ریٹائر ہونے تک نہایت شرح صدر اور
مداومت سے عمل کیا۔ اپنے رفقائے کار کے لیے نیک نمونہ اور مثالی کردار قائم کرنے کا موجب ہوئے۔''
موصوف مذہب کی تفریق کے بغیر مخلوقِ خدا سے محبت کرتے تھے چنانچہ تاریخ احمدیت جلد یازدہم میں یہ
واقعہ درج ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب ایام میں ''ماسٹر ضیاءالدین ارشد احمدی ٹیچر مڈھ رانجھا'' سائیکل پر ایک
طویل سفر طے کر کے ''موضع نصیر پور کے ایک غیر مسلم، ہرنام داس ایس وی ٹیچر کو سخت مخدوش ماحول میں بذریعہ
سائیکل سرگودھا لائے اور فوجی امداد سے اس کے رشتہ داروں کو برآمد کرایا۔''
ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں مختلف جماعتی خدمات کی توفیق ملی چنانچہ وہ پندرہ سال تک محلہ دارالبرکات

کے صدر ہے۔ اسی زمانے میں ان کے ایک بیٹے نعیم نے غلہ منڈی ربوہ میں نعیم ورائٹی سٹور کے نام سے ایک جنرل سٹور کھولا تھا۔ ماسٹر ضیاء الدین اپنے بیٹے کا ہاتھ بٹانے کے لیے خود بھی کئی بار اس دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔

مئی ۱۹۷۴ء میں جب احمدیوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو ربوہ کے کئی دوست جرم نا کردہ کے الزام میں پکڑ لیے گئے۔ ان گرفتار شدگان میں نعیم بھی شامل تھے۔ وہ سرگودھا جیل میں تھے کہ ایک روز ماسٹر ضیاء الدین ربوہ کے کچھ دوستوں کے ہمراہ ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ واپسی پر جب وہ سرگودھا ریلوے سٹیشن پر ربوہ آنے والی ٹرین کے منتظر تھے تو چند نقاب پوشوں نے ان پر فائرنگ کر دی جس کی وجہ سے نو احمدی شدید زخمی ہوگئے۔ وہ بھی ان زخمیوں میں شامل تھے اور ان کے سر میں گولی لگی تھی۔ جب فائرنگ کا سلسلہ رُکا تو احمدیوں نے اپنے زخمیوں کو اُٹھا کر ٹرین میں بٹھانا چاہا لیکن پولیس نے انہیں وہیں روک لیا اور کہا کہ واقعہ کی ایف آئی آر درج ہونے تک زخمیوں کو کہیں منتقل نہیں کیا جا سکتا چنانچہ رپورٹ درج کرانے کے بعد انہیں سرگودھا کے سرکاری ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ بعد میں انہیں لاہور کے جنرل ہسپتال میں منتقل کیا گیا لیکن ڈاکٹر ان کے سر سے گولی نکالنے میں ناکام رہے اور وہ کچھ وقت فضل عمر ہسپتال میں گذارنے کے بعد ۲۹ ستمبر ۱۹۷۴ء کو وفات پا گئے۔

ماسٹر محمد اعظم جو ہمیں ہائی کلاسز میں سائنس اور حساب پڑھاتے تھے سکول کے محنتی، قابل اور شفیق اساتذہ میں شمار ہوتے تھے تاہم بدقسمتی سے سکول چھوڑنے کے بعد میرا ان سے رابطہ نہ رہ سکا۔ یوں بھی وہ اس کے چند ہی سال بعد عین جوانی کے عالم میں وفات پا گئے لہٰذا جب میں یہ سطور لکھنے بیٹھا تو یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ اب آپ سے کیا پردہ مجھے تو مرحوم کا حدودِ اربعہ بھی بھول چکا تھا۔ کئی پرانے لوگوں سے بات ہوئی لیکن کسی کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ پرویز پروازی نے البتہ بہت صحیح رہنمائی کی: ''یار! تم نہیں جانتے۔ وہ تحریک جدید کے ایک پرانے کارکن، محمد رمضان کے بیٹے اور ارشد کے بھائی تھے جو نصرت جہاں سکیم کے تحت کسی افریقی ملک میں پڑھاتے رہے اور آج کل کینیڈا میں ہیں۔''

میں نے کسی طرح ان کا نمبر حاصل کیا تو انہوں نے پرویز پروازی کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق کی: ''ماسٹر اعظم میرے بڑے بھائی ضرور تھے لیکن مجھے تو ان کی تاریخِ وفات بھی بھول چکی ہے مگر آپ فکر نہ کریں میں آج ہی اپنے بیٹے مظفر کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ آپ کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دے گا۔'' مظفر جو اُن دنوں جامعہ میں پڑھا رہے تھے نے مہربانی کی اور مجھے ماسٹر محمد اعظم کی وفات پر الفضل میں چھپنے والے دو مضامین کی نقول فراہم کر دیں۔ اگر یہ مضامین میرے سامنے نہ ہوتے تو میں اِن کے بارے میں آپ تک یہ معلومات کبھی نہ پہنچا سکتا۔

ہمارے اس شفیق استاد کا سنِ ولادت ۱۹۳۰ء ہے۔ ان کے والد جو فی الاصل شادیوال ضلع گجرات کے رہنے والے تھے اور بعد میں نقلِ مکانی کر کے قادیان اور پھر ربوہ منتقل ہو گئے دفتر تحریک جدید میں مددگار کارکن تھے۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی اٹھارہ سال کی عمر میں اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ان کا وقف قبول فرمایا اور پڑھائی جاری رکھنے کی ہدایت کی چنانچہ انہوں نے

۱۹۵۲ء میں بی ایس سی کر لی اور وکالتِ دیوان میں بطور کلرک کام کرنے لگے۔ اسی عرصے میں انہوں نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ٹی کیا اور چند سال تعلیم الاسلام ہائی سکول گھٹیالیاں میں بطور ہیڈ ماسٹر گذارنے کے بعد ۱۰ نومبر ۱۹۵۸ء سے تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں بطور استاد تعینات ہو گئے۔ اس دوران انہوں نے ایم ایڈ کا امتحان پاس کیا اور کچھ عرصہ احمدیہ ہوسٹل لاہور کے سپرنٹنڈنٹ کے طور پر بھی خدمات بجالاتے رہے۔

ماسٹر محمد اعظم ایک قابل اور محنتی استاد تھے جنہوں نے مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ میں کئی سال تک مہتمم تحریک جدید و وقف جدید اور مہتمم اشاعت کے طور پر بھی کام کیا۔ انہوں نے یکم فروری ۱۹۶۶ء کو عین نوجوانی کے عالم میں معدہ کے کینسر سے وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات پر سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم نے اپنے ایک مضمون میں کیا خوب لکھا تھا کہ وہ ''محض پینتیس سال کی عمر میں ہی تجربہ کار اور کہنہ مشق اساتذہ کے زمرے میں شامل ہو گئے۔'' یہ الفاظ تو مرحوم کے لیے گویا سرٹیفکیٹ کا درجہ رکھتے ہیں کہ ''مرحوم سائنس اور ریاضی کے بہترین اساتذہ میں سے تھے بلکہ اپنے رنگ میں ایک حد تک یکتا۔'' مجھے فخر ہے کہ میرا شمار بھی مرحوم سے خوشہ چینی کرنے والوں میں ہے۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول کے مرحوم اساتذہ کرام کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ ہمارے پرائمری سکول کے استاد، ماسٹر غلام احمد کے اہلِ خانہ کے پاس سکول کے اساتذہ کا ایک گروپ فوٹو محفوظ ہے جو تعلیمی سال ۵۹-۱۹۵۸ء کے دوران لیا گیا تھا۔ میں نے اپنے اس مضمون میں یا اس کتاب میں کسی اور جگہ پر اپنے جن مرحوم اساتذہ کرام کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر اس تصویر میں موجود ہیں۔ ان اساتذہ میں میاں محمد ابراہیم (ہیڈ ماسٹر)، چوہدری عبدالرحمٰن (سیکنڈ ماسٹر)، عبدالرحمٰن خان بنگالی، سعد اللہ خان، چوہدری غلام رسول، سعادت علی شاہ، مرزا عنایت اللہ، ضیاء الدین ارشد، غلام مرتضیٰ، عبدالقدیر، محمد اسماعیل، عطاء اللہ، محمد بخش، عبدالکریم، غلام احمد، فقیر احمد اور محمد ابراہیم سارچوری شامل ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ مجھے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے جن اساتذہ سے براہِ راست اکتسابِ فیض کا موقع ملا ان میں سے بعض تادمِ تحریر بقیدِ حیات ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر ماسٹر محمد ابراہیم بھامبڑی کا!

اس تعلق پہ مجھے فخر ہے نازاں ہوں میں

ماسٹر محمد ابراہیم بھامبڑی ۱۹۱۴ء میں قادیان کے قریب موضع بھامبڑی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ بزرگوار کو اللہ تعالیٰ نے اُس وقت احمدیت کی نعمت سے سرفراز فرمایا جب بھامبڑی صاحب کی اپنی عمر صرف چار سال تھی۔ یوں انہیں بچپن ہی سے احمدیت کا ماحول ملا اور انہوں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان سے میٹرک اور وہیں سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے شروع میں کچھ عرصہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے پاس کام کیا، پھر نظارت بیت المال میں کلرک کے طور پر خدمت بجالاتے رہے اور بالآخر مختار احمد ہاشمی کے مشورہ پر کہ انہیں کسی تعلیمی ادارے میں ملازمت کی کوشش کرنی چاہیے وہ ۱۹۴۷ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں بطور مدرّس بھرتی ہوگئے۔ انہیں دینیات پڑھانے پر مامور کیا گیا۔

وہ سید محمود اللہ شاہ، ہیڈ ماسٹر کے دور میں سکول سٹاف میں شامل ہوئے تھے۔ انہیں بعد کے تین ہیڈ ماسٹروں یعنی صوفی محمد ابراہیم، میاں محمد ابراہیم اور ملک حبیب الرحمٰن کے ماتحت بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ ملک حبیب الرحمٰن کے بعد عبدالسمیع کاٹھگڑھی اس سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ بھامبڑی صاحب ان کے استاد رہ چکے تھے لیکن انہوں نے عبدالسمیع کاٹھگڑھی کے ماتحت کام کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کی۔

ماسٹر عبدالسمیع کی روایت کے مطابق ''کاغذات میں ابراہیم بھامبڑی کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۴ء کی بجائے ۱۹۱۵ء لکھی ہوئی تھی لیکن انہوں نے ایک سال پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب میری صحیح تاریخ پیدائش ۱۹۱۴ء ہے تو میں صرف ایک سال مزید ملازمت کے معمولی فائدے کے لیے جھوٹ کا سہارا کیوں لوں؟ وہ ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو ریٹائر ہوئے تاہم ربوہ ریلوے سٹیشن والے واقعہ کی وجہ سے اس موقع پر کوئی الوداعی تقریب منعقد نہ ہو سکی جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔''

ابراہیم بھامبڑی دَمِ تحریر ماشاء اللہ سو برس کے ہو چکے ہیں اور محلّہ دارالعلوم شرقی میں اپنے مکان میں اپنی ایک صاحبزادی کے ہمراہ مقیم ہیں۔ وہ ہمیں دینیات اور عربی پڑھایا کرتے تھے۔

ایک ہی شہر کے باسی ہونے کے ناطے میٹرک کرنے کے بعد ان سے کہیں نہ کہیں ضرور ملاقات ہو جاتی اور یہ ان کی مہربانی ہے کہ فوراً پہچان لیتے اور ازراہِ محبت اکثر ذکر کیا کرتے کہ: ''میں نے آپ کے دادا کو بھی دیکھ رکھا ہے۔ بڑے وجیہہ انسان تھے۔ آپ کے والدِ بزرگوار بھی میرے کرم فرماؤں میں سے تھے اور آپ کے چچا ابراہیم ناصر سکول میں میرے رفیقِ کار اور ہوسٹل میں میرے انچارج تھے اور ہاں! آپ کے ایک چچا تھے نا، یوسف! وہ میرے کلاس فیلو تھے۔''

ابراہیم بھامبڑی کو خدا تعالیٰ نے طویل العمری کے ساتھ ساتھ انتہائی عمدہ صحت اور قابلِ رشک یادداشت سے نواز رکھا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں: ''یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس عمر میں بھی میرا ذہن بالکل حاضر ہے، میری نظر ٹھیک ہے، قوتِ سماعت میں خاص فرق نہیں پڑا، ہاتھوں میں لرزش نہیں ہے اور اپنے پاؤں پر چل سکتا ہوں۔'' ان کے نزدیک ان کی طویل العمری کا راز اللہ تعالیٰ کے فضل اور خلفائے احمدیت کی دعاؤں میں مضمر ہے۔ ان کا کہنا ہے: ''میں نے ساری زندگی دوسروں کے ساتھ لڑائی جھگڑے سے اجتناب کیا ہے اور سکول کی زندگی میں نہ محلّہ دارالنصر کی صدارت کے دوران میں نے کسی کے ساتھ کوئی اختلافی صورت پیدا ہونے دی۔''

اللہ تعالیٰ نے اِنہیں بلا کا حافظہ بخشا ہے۔ وہ بتایا کرتے ہیں: ''مجھے قرآن کریم کا معتدبہ حصہ اور حضرت مسیح موعود، حضرت مصلح موعود اور حضرت نواب مبارکہ بیگم کے کلام کا بہت سا حصہ زبانی یاد ہے۔ میں نے روحانی خزائن کا کئی بار مطالعہ کیا ہے چنانچہ آج کل میں اس کا پانچواں دور مکمل کر رہا ہوں۔ یہ خدا کا احسان ہے کہ ان کتب کے اکثر مضامین میرے ذہن میں متحضر ہیں۔''

''آپ اپنے دورِ تدریس کا کوئی واقعہ سنائیں'' ایک بار میں نے بھامبڑی صاحب سے فرمائش کی۔

''واقعات تو بہت سے ہیں'' ان کی طرف سے جواب آیا ''لیکن ایک عرض کر دیتا ہوں۔ ایک بار جھنگ میں سکولوں کے ضلعی تقریری مقابلے ہونے والے تھے۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھے بچوں کے ہمراہ جھنگ بھجوایا۔ آپ تو جانتے ہیں میں اس زمانے میں بھی پگڑی اور اچکن پہنتا تھا اور یہ لباس میرے جسم پر پھبتا بھی تھا۔ جس سکول میں تقریری مقابلے ہونا تھے اس کے ہیڈ ماسٹر کا نام رب نواز تھا۔ انہوں نے بہت خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور جب مقابلہ شروع ہوا تو مجھے اس کی صدارت پیش کی اور خود سٹیج سیکرٹری کے فرائض سنبھال لیے۔ مقابلے ختم ہو گئے تو انہوں نے دعوت دی کہ اگر کوئی استاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ہدیہ نعت پیش کرنا چاہے تو سٹیج پر آ جائے۔ ان کے اس اعلان پر ایک استاد سٹیج پر آ گئے اور انہوں نے ایک نعت پڑھی۔ پھر مجھے نعت پیش کرنے کے لیے کہا گیا تو میں نے حضرت مسیح موعود کی اس نظم کا کچھ حصہ پیش کیا جو دُرِّثمین میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے لیکن میں نے اس کا صرف وہ حصہ پڑھ کر سنایا جس کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے متعلق ہے اور جس کا پہلا شعر ہے:

وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نُور سارا
نام اس کا ہے محمدؐ دلبر مرا یہی ہے

حضرت مسیح موعود کے اس بابرکت نعتیہ کلام نے حسبِ توقع اپنا اثر دکھایا چنانچہ حاضرینِ محفل جھومنے لگے۔ ہر شعر پر ماشاء اللہ اور سبحان اللہ کے نذرانے پیش کئے جا رہے تھے لیکن حضور کے اس شعر نے تو سامعین پر گویا وجد طاری کر دیا:

وہ آج شاہِ دیں ہے وہ تاجِ مرسلیں ہے
وہ طیّب و امیں ہے اس کی ثنا یہی ہے

نظم مکمل ہو گئی تو محفل میں موجود اساتذہ ایک ایک کر کے مجھے مبارکباد دینے لگے۔ اتنے میں کسی نے پوچھ لیا کہ میرا تعلق کس جگہ سے ہے۔ جب میں نے ربوہ کا ذکر کیا تو ان کا جوش وخروش ماند پڑ گیا لیکن زمانہ اچھا تھا، انہوں نے میرے لیے کوئی ناپسندیدہ صورتِ حال پیدا نہیں کی اگرچہ ان کے رویے میں وہ گرمجوشی باقی نہ رہی تھی۔"

مجھے یاد ہے کہ نویں یا دسویں میں عربی کے کورس میں ایک نظم امیر اور غریب کے درمیان فرق پر تھی۔ اس نظم کا عنوان تو نہ جانے کیا تھا لیکن مجھے اس کا ایک مصرع اتفاق سے اب تک نہیں بھولا۔ یہ مصرع تھا:

قَالُوْا صَدَقْتَ وَمَا نَطَقْتَ مُحَالاً

بھامبڑی صاحب یہ نظم بڑے مزے لے لے کر پڑھایا کرتے تھے اور اس کے مفاہیم ذہن نشین کرانے کے لیے بعض دلچسپ مثالیں دیا کرتے تھے۔ میں نے ایک ملاقات میں ان سے پوچھا: "سر! آپ کو وہ نظم یاد ہے جس میں امیر اور غریب کے فرق کو واضح کیا گیا تھا۔"

"بالکل یاد ہے!" انہوں نے جواب دیا اور پھر خود ہی یہ پوری نظم ترنم سے سنا دی۔ استاذی المکرم یہ نظم پڑھتے جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے تو اس نظم کا صرف ایک ہی مصرع (اور وہ بھی اتفاقاً) یاد رہ گیا تھا جب کہ انہیں پوری نظم بلکہ نہ جانے اس طرح کی کتنی ہی اور نظمیں اَزبَر ہیں۔ بلا کا حافظہ پانے پر وہ بجا طور پر ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز رہتے ہیں۔

اِن کے پاس تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ملازمت کے حوالے سے یادوں کا ایک وسیع خزینہ موجود ہے۔ انہیں فرقان فورس میں محاذِ کشمیر پر خدمت کا موقع بھی مل چکا ہے جس کا اعتراف پاک فوج کے اس وقت کے کمانڈر اِن چیف کی طرف سے ایک میڈل کی شکل میں کیا گیا تھا۔ وہ اس دور کے بعض دلچسپ واقعات بھی مزے لے لے کر سناتے ہیں۔

دُبلے پتلے، دراز قد اور چاق و چوبند ابراہیم بھامبڑی نظارت امور عامہ کے محتسب، عبدالعزیز بھامبڑی کے بڑے بھائی ہیں۔ اپنی ذمہ داریوں کی مناسبت سے عبدالعزیز بھامبڑی کی ایک خاص شہرت تھی اور اہلِ ربوہ ان کا نام سن کر ایک بار تو کانپ جایا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب اپنے طلبہ کے حوالے سے تقریباً ان ہی اختیارات کے مالک تھے جو اِن کے بھائی کو اہلِ ربوہ کے ضمن میں حاصل تھے۔ جو شاگرد انہیں مایوس کرتا وہ اُس سے "آہنی ہاتھ" سے نمٹتے۔

ان کی سزا کا ایک طریقہ اب بھی یاد ہے جو انہوں نے غالباً سی آئی اے کے کسی ظالم اہلکار سے سیکھ رکھا تھا۔ وہ پنسل طالب علم کی انگلیوں میں اس طرح پھنسا دیتے کہ دوسری اور چوتھی انگلی پنسل کے اوپر اور پہلی اور تیسری انگلی پنسل سے نیچے رہتی۔ پھر وہ بھرپور مصافحہ کے انداز میں ان انگلیوں کو اس طرح دباتے کہ بڑے بڑے پھنے خانوں کی چیخیں نکل جاتیں تاہم اس تادیب کا مقصد بھی طلبہ کو معاشرہ کا مفید وجود بنانا ہی تھا۔

بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو سزا دینے کے بعد خود بھی چین سے نہ رہ سکتے

اور بسا اوقات ان سے معافی بھی مانگ لیتے۔ اُن کے ایک شاگرد نے جو چند ماہ پہلے اللہ کو پیارے ہوئے ہیں مجھے خود سنایا کہ جن دنوں وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ کے ہوسٹل میں مقیم تھے بھامبڑی صاحب ان کے ٹیوٹر تھے۔ شاگرد مرحوم کے اپنے الفاظ میں ''متمول والدین کے بچے بھامبڑی صاحب سے دودھ، برفی، بَن وغیرہ کی پرچی لے کر ٹک شاپ سے اپنی پسند کی چیزیں کھالیا کرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ایک روز میں نے بھی جرأت کر کے بھامبڑی صاحب سے مطالبہ کر ڈالا کہ مجھے بھی ایک پاؤ دودھ اور ایک چھٹانک برفی کی پرچی دی جائے۔ اس پر انہوں نے مجھے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا: تمھارا وظیفہ پندرہ روپے ماہوار ہے اور کھانا، کتابیں وغیرہ تمام اخراجات اسی رقم سے پورے کرنا ہوتے ہیں لہٰذا تمہیں کوئی پرچی نہیں مل سکتی۔ میں نے بہت منت سماجت کی مگر ان کا دل نہ پسیجا۔ میں نے ان کے دستخط دیکھ رکھے تھے۔ بہت مشکل تھے لیکن میں تھوڑی سی مشق کے بعد ان سے ملتے جلتے دستخط کرنے کے قابل ہو گیا چنانچہ میں نے ایک پرچی اپنے نام کی لکھی اور ٹک شاپ والے کے پاس لے گیا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور خاموشی سے مجھے ملائی والا دودھ اور برفی دے دی۔ اس کے بعد بھی میں نے بھامبڑی صاحب سے کئی دفعہ پرچی جاری کرنے کی درخواست کی مگر وہ ہر بار انکار کر دیتے چنانچہ میں نے ان کے جعلی دستخط کر کے ایک ماہ کے اندر چار دفعہ دودھ اور برفی کی ''عیاشی'' کر لی۔ اگلے مہینے میں پھر بھامبڑی صاحب کی خدمت میں اس توقع کے ساتھ حاضر ہوا کہ شاید اب انہیں مجھ پر رحم آ جائے تاہم انہوں نے بہت غصے سے فرمایا: تم بہت ڈھیٹ ہو۔ کئی بار بتایا ہے کہ تمہیں پرچی نہیں مل سکتی لیکن تم پھر آ جاتے ہو۔ میں نے عرض کیا: آپ پرچی بے شک نہ دیں۔ میں جس طرح گذشتہ ماہ آپ کے جعلی دستخطوں سے دودھ پیتا اور برفی کھاتا رہا ہوں اس دفعہ بھی ایسے ہی کرلوں گا۔ یہ بات سن کر انھوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ہوسٹل کے کلرک کا نام محمد یوسف تھا۔ اسے کہا کہ وہ جلدی سے دودھ کی پرچیاں لے کر آئے۔ وہ فوراً پرچیاں لے آیا۔ انہوں نے غور سے ان کی پڑتال کرنے کے بعد فرمایا: کم بخت! ان میں سے کون سی پرچی تم نے خود لکھی ہے؟ میں نے عرض کیا: مولوی صاحب! جن پرچیوں پر میرا نام لکھا ہوا ہے وہ سب کی سب میری اپنی بنائی ہوئی ہیں۔ اس پر انہوں نے مجھے چار بید رسید کئے۔ اگلے روز بھامبڑی صاحب صبح کی نماز کے لیے جگانے آئے۔ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور فرمایا: میں نے تمہیں سزا تو دی لیکن اس کے بعد میں پوری رات سو نہیں سکا اور مجھے یوں محسوس ہوتا رہا گویا میں نے اپنے بیٹے مُنیر کو بید مارے ہوں۔ میں اس بات پر سخت شرمندہ ہوں۔ آج کے بعد تمہارا جب بھی دودھ اور برفی کو جی چاہے بے دھڑک مجھ سے پرچی لے لیا کرو۔''

میں نے سن رکھا تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس بھامبڑی صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جب میں نے ان سے اس بات کی تصدیق کی گذارش کی تو انہوں نے بتایا: ''ٹھیک سُنا ہے آپ نے۔ میں نے حضور کو اور ان کے بھائیوں کو سکول کے زمانہ میں پڑھایا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں نے محلّہ دارالنصر کی صدارت کے پچاس سال مکمل کئے اور میرے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد ہوئی تو حضور جو اُس وقت ناظرِ اعلیٰ تھے تشریف لائے اور انہوں نے اپنی تقریر میں برملا فرمایا کہ وہ میرے شاگرد رہے ہیں۔''

ایم ٹی اے نے ماسٹر ابراہیم بھامبوی کا ایک تفصیلی انٹرویو جو دو اقساط پر مشتمل ہے نشر کیا ہے۔ اس انٹرویو میں ان کے والدِ محترم کے قبولِ احمدیت، بھامبوی میں احمدیت کی اشاعت کے لیے کی جانے والی کوششوں اور بعض ذاتی باتوں کا بہت تفصیلی ذکر موجود ہے۔ آپ کو اس پروگرام کی سی ڈی مل جائے تو ضرور دیکھیے، ان کی شخصیت آپ کے سامنے کھل کر آ جائے گی۔

آپ جتنی دیر میں یہ سی ڈی تلاش کرتے ہیں میں کیوں نہ آپ کو ماسٹر ظہور احمد کے متعلق کچھ بتاتا چلوں۔

چھٹی جماعت میں ڈرائنگ ہمیں ایک الگ مضمون کے طور پر پڑھائی جانے لگی تو ماسٹر ظہور احمد اس کام پر مامور ہوئے۔ اُس زمانے میں کسی استاد کا نام لینا بہت بے ادبی کی بات سمجھی جاتی تھی لہٰذا نہ جانے کس ستم ظریف نے ان کا نام ''ڈرینگی صاحب'' رکھ دیا۔ یہ نام پنجابی کلچر کے عین مطابق تھا سو طلبہ میں اتنا مقبول ہوا کہ کبھی ان کا اصل نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

ان دنوں ڈرائنگ کا کُل کورس ''ماڈل ڈرائنگ'' یعنی مختلف اشیاء کی تصویر کشی تک محدود تھا اور اس میں باریکی کا کوئی کام نہ تھا لہٰذا بچے اس پیریڈ کے بہت شوق سے منتظر رہتے۔ اس پیریڈ میں طلبہ کی مارکٹائی کی بھی ضرورت کم کم پیش آتی تھی لہٰذا طلبہ ''ڈرینگی ماسٹر'' کے لیے بالعموم خیر سگالی کے جذبات ہی رکھتے تھے۔

موصوف ایک قابل استاد تھے۔ ان کی نگرانی میں سکول میں صنعت و حرفت یعنی نجاری، جلد سازی، رنگ سازی، کپڑے پر چھپائی اور ریڈیو کی ابتدائی مرمت کے شعبوں نے خاصی ترقی کی۔ انسپکٹر آف سکولز آئے تو وہ اس شعبہ میں سکول کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی رپورٹ میں رقم کیا کہ ''یہ شعبہ یقیناً طلبہ کی تخلیقی اُپج کی تکمیل اور ان کی شخصیت کو اجاگر کرنے کا باعث ہوگا۔'' تعلیم الاسلام ہائی سکول کی سالانہ رپورٹ بابت سال ۱۹۵۹۔۱۹۵۸ء کے مطابق ''اس ضمن میں محترمی انسپکٹر صاحب نے .... سکول کے ڈرائنگ ماسٹر، ظہور احمد صاحب کو خصوصاً مبارکباد بھی دی ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ ان کی کوششوں سے آئندہ یہ شعبہ اور زیادہ مفید کام کر سکے گا۔''

ماسٹر ظہور ایک اچھا استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت محبت کرنے والے انسان ثابت ہوئے۔ انہوں نے ہمیں چھٹی اور ساتویں جماعت میں پڑھایا تھا لیکن اس کے بعد جب بھی ملے اس پیار کے ساتھ کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی۔ جب انہیں سی ایس ایس کے امتحان میں میری کامیابی کی خبر ملی تو انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور دیر تک زندگی میں میری کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے دعا کرتے رہے۔ وہ اس بات پر پھولے نہیں سما رہے تھے کہ اللہ نے ان کے ایک شاگرد کو اس عزت سے نوازا ہے۔

ان کے ساتھ ایک حالیہ ملاقات میں جو اُن کے گھر واقع محلہ دارالعلوم غربی ربوہ میں ہوئی اُن کے متعلق بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ ''میں پنڈی بھٹیاں کا رہنے والا ہوں اور مولانا دوست محمد شاہد میرے فرسٹ کزن تھے'' انہوں نے بتایا ''جب میں نے میٹرک کر لیا تو میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہیے۔

گھر کے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں کالج اور پھر یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرسکوں۔ اندریں حالات ملازمت میری پہلی ترجیح تھی لیکن ہنر سیکھے یا کوئی تربیت کیے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ کسی خیر خواہ نے مشورہ دیا کہ میں کوئی ایسا ڈپلومہ حاصل کرلوں جس کی بنیاد پر مجھے فی الفور ملازمت مل جائے۔ اِس حوالے سے کافی غور وخوض کے بعد میں نے سنٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج، لاہور سے ایجوکیشنل ہینڈ ورک اینڈ ڈرائنگ میں داخلہ لے لیا۔ قسمت اچھی تھی میں اس میں کامیاب بھی ہوگیا۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ایک جگہ خالی تھی۔ میں نے درخواست دی اور منتخب ہوگیا۔ دورانِ ملازمت مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ مجھے اپنی کوالیفیکیشن بہتر بنانی چاہئے چنانچہ سکول میں قیام کے دوران میں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر ایف اے اور بی اے کیا اور الحمدللہ ایم ایڈ کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ میں کم وبیش بیس سال تک اسی سکول میں رہا لیکن جب ہمارا سکول قومیالیا گیا تو ۱۹۷۶ء میں میری تبدیلی اسلامیہ سیکنڈری سکول، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بطور سینئر سیکنڈری سکول ٹیچر کردی گئی۔ میں ربوہ کے ماحول کا عادی تھا۔ جب ٹوبہ ٹیک سنگھ والوں کو علم ہوا کہ میرا پس منظر کیا ہے تو میری مخالفت شروع ہوگئی۔ میرے لیے طرح طرح کی مشکلات پیدا کی گئیں لیکن الحمدللہ میں ثابت قدم رہا تاہم یہ حقیقت ہے کہ وہاں کے لوگوں نے مجھے قبول نہیں کیا تھا چنانچہ ان ہی دنوں بلوچستان سے کچھ پنجابی اساتذہ واپس آئے تو ان کی ایڈجسٹمنٹ کا بہانہ بنا کر مجھے بھکّر کے ایک چک میں جو ۴۳ ٹی ڈی اے کہلاتا تھا بھیج دیا گیا۔ یہ ایک مڈل سکول تھا جہاں مجھے ہیڈ ماسٹر تعینات کیا گیا تاہم اس علاقے میں شہری سہولیات مفقود تھیں اور میں پریشان رہتا تھا۔ اِن ہی دنوں لیبیا کی ایک کنسٹرکشن کمپنی الشرکۃ الاتحاد المقاولین، درنہ میں ایک جگہ خالی ہوئی تو میرے ایک عزیز نے مجھے وہاں بلالیا۔ میں نے وہاں کنسٹرکشن فورمین کے طور پر دو سال تک کام کیا۔ بعد میں حکومت نے یہ کمپنی قومیالی اور انہوں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی کوالیفیکیشن کی وجہ سے کنسٹرکشن کمپنی کی بجائے کسی سکول میں ہونا چاہئے تھا چنانچہ میں لیبیا کے شہر اَلْبَیْدَہ کے مَعْهَدَ الصَّنَاعِیْ یعنی ٹیکنیکل سکول میں ٹیکنیکل انگریزی پڑھانے لگا۔ میں قریباً دس سال لیبیا میں رہا۔''

''اس سکول میں ملازمت کے حوالہ سے آپ کا کوئی کنٹری بیوشن؟''

''آپ کے علم میں ہے کہ لیبیا ایک اشتراکی ملک تھا جہاں تمام سکول سرکاری نگرانی میں کام کرتے تھے۔ طلبہ کے لیے تعلیم مفت تھی حتّٰی کہ انہیں کتابیں اور کاپیاں بھی حکومت کی طرف سے فراہم کی جاتی تھیں تاہم اشتراکی نظام کی قباحتیں وہاں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ اول تو تدریسی کتب اور کاپیاں وقت پر موصول ہی نہ ہوتی تھیں اور بچوں کے کئی مہینے ان کے انتظار میں گذر جاتے لیکن اگر کبھی کتابیں اور کاپیاں بروقت موصول ہوبھی جاتیں تو ان کی تقسیم میں غیرضروری تاخیر برتی جاتی۔ ایک بار میں نے اپنے سکول کے پرنسپل کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو اس نے یہ کام میرے ہی ذمہ لگادیا۔ یہ ایک اضافی ڈیوٹی تھی جس کے لیے مجھے لائبریری میں بیٹھ کر کتابوں اور کاپیوں کی تقسیم کا ریکارڈ رکھنا پڑتا تھا لیکن میں نے اس ذمہ واری کو بھی ایک خدمت سمجھ کر قبول کیا اور کئی سال تک یہ کام کرتا رہا۔''

''ان دنوں لیبیا میں جماعتی حالات کیا تھے؟''

''اس زمانے میں کریم احمد طاہر جو روشن دین زرگر کے صاحبزادے تھے امیر جماعت احمدیہ لیبیا تھے۔ میں ان کے ماتحت اپنے حلقہ جس میں البرج سے طبرق تک کا علاقہ شامل تھا کا صدر رہا۔ اس علاقے میں احمدیوں کی تعداد گنی چنی تھی لیکن مجھے خدا کے فضل سے اس حلقہ کی خدمت کی کئی سال تک توفیق ملی۔''

''واپسی پر؟''

''واپس آیا تو میانوالی کے قریب بُوڑی خیل میں تعینات کر دیا گیا لیکن ملازمت کے آخری سات سال میں نے پنڈی بھٹیاں میں بطور اسسٹنٹ ایجوکیشن افسر گذارے اور وہیں سے ۱۹۹۶ء میں ریٹائر ہوا۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد سے میں ربوہ میں ہوں۔ اللہ نے اپنا گھر دے رکھا ہے۔ خدا کا شکر ہے میری صحت اچھی ہے۔ بچے پاس ہیں اور ان کے حوالے سے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں۔ بیت الذکر قریب ہے۔ پانچ وقت وہاں چلا جاتا ہوں۔ اس عمر میں مجھے اور کیا چاہیے؟''

ہمارے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے زندہ اساتذہ میں سے ایک ماسٹر حبیب احمد ہیں جنہوں نے آٹھویں اور نویں میں ہمیں کچھ عرصہ سائنس پڑھائی۔ دراز قد اور کشادہ سینے والے حبیب نصرت گرلز ہائی سکول کی دو معروف معلمات، استانی امتہ الرشید شوکت اہلیہ ملک سیف الرحمٰن مفتی سلسلہ اور استانی امتہ المنان قمر اہلیہ میر غلام احمد نسیم کے بھائی ہیں۔ جب تک ہم سکول میں رہے یہ وہیں پڑھاتے تھے۔ بعد میں ان سے کوئی ایسا رابطہ نہ رہا۔ ہاں! کبھی کبھار ربوہ میں پیدل یا بائیسکل پر ادھر اُدھر آتے جاتے نظر آ جاتے تھے۔ پھر کسی نے بتایا کہ افریقہ چلے گئے ہیں لیکن سچی بات ہے میرے پاس ان کے بارے میں حتمی معلومات نہ تھیں۔ حال ہی میں معلوم ہوا کہ کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح ان کا فون نمبر ڈھونڈ نکالنے اور ان سے بات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

خوشی ہوئی کہ ماسٹر حبیب بڑھاپے کے باوجود ذہنی اور جسمانی طور پر تندرست ہیں، فون پر بات کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے اور ہر سوال کا صحیح جواب دے سکتے ہیں۔ ''میرے والد کا نام منشی چراغ دین تھا جنہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی۔ وہ فارسی کے استاد تھے اور کسی سرکاری سکول میں پڑھاتے تھے'' ماسٹر حبیب نے مجھے بتایا ''جہاں تک میرا تعلق ہے میں ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو قادیان میں پیدا ہوا اور میٹرک وہیں سے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں ابتداءً ایک سال فوج میں اور پھر سات سال تک نیوی میں رہا۔ میں نے اسی دور میں ایف اے سی ٹی کر لیا اور ۱۹۵۸ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ملازم ہو گیا۔ میں نے اگلے سات سال وہیں گذارے۔ پھر سیرالیون کے جماعتی سکولوں میں پڑھاتا رہا۔ فری ٹاؤن، بو، جورو، غرض کہاں کہاں نہیں رہا۔ میں اس کے بعد دوبارہ ربوہ آ گیا اور کچھ عرصہ یہاں گذارنے کے بعد پھر افریقہ چلا گیا۔ اس بار میں نے وہاں چھ سال تک پڑھایا۔''

''اس کے بعد آپ کیا کرتے رہے؟'' میں نے پوچھا۔

"میں نے اس عرصے میں فلاسفی اور انگریزی میں ایم اے کر لیا تھا چنانچہ افریقہ سے واپسی پر میں جامعہ احمدیہ کے طلبہ کو انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گیا۔ میں ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۳ء تک، گیارہ سال وہاں رہا۔"
حبیب پچھلے دس سال سے ترکِ وطن کر چکے ہیں اور خوش وخرم زندگی گذار رہے ہیں۔

ماسٹر ناصر احمد جنہوں نے ساتویں جماعت میں ہمیں سائنس پڑھائی اب نہ معلوم کہاں ہیں۔ دلچسپ آدمی تھے۔ اگرچہ میرا اور سائنس کا خدا واسطے کا بیر رہا ہے لیکن ایک بار عجیب ہوا۔ وہ کسی سہ ماہی یا ششماہی امتحان کے پرچے طلبہ کو لوٹا رہے تھے۔ میری باری آئی تو ہنس کر فرمانے لگے: "میں نے نمبروں کا ٹوٹل کیا تو ایک سو پچیس نمبر بنتے تھے۔ میں حیران تھا کہ داؤد سو میں سے ایک سو پچیس نمبر کیسے لے گیا۔ پرچہ دوبارہ چیک کیا تو پتا چلا کہ اس نے چار کی بجائے پانچ سوال حل کر رکھے ہیں اور ہر سوال میں پچیس میں سے پچیس نمبر حاصل کئے ہیں۔" انہوں نے ساری کلاس کو بتایا کہ پرچہ اس طرح حل کرنا چاہیے۔

ماسٹر محمد اشرف جنہوں نے کچھ عرصہ ہمیں سائنس پڑھائی سکول میں ہماری موجودگی کے دوران ہی یہ ادارہ چھوڑ گئے اور پھر کبھی نظر نہیں آئے۔ اب میں نے ان کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے تک ربوہ کے محلہ دارالعلوم غربی میں ذاتی مکان میں رہائش پذیر تھے مگر اب انہوں نے یہ مکان کرائے پر اُٹھا دیا ہے اور وہ خود اپنے ایک بیٹے کے پاس جو فوج میں ڈاکٹر ہے منتقل ہو چکے ہیں۔ میں نے کسی طرح ان کے بیٹے، لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر عمران اشرف کو جو دمِ تحریر سی ایم ایچ اٹک میں تعینات تھے ڈھونڈ نکالا۔ معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب فالج کے مریض ہیں اور فون پر بات کرنے سے قاصر تاہم کرنل عمران کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کے مطابق ماسٹر محمد اشرف ۴ جنوری ۱۹۳۳ء کو چک نمبر ۳۳۲ ج ب فیصل آباد میں چوہدری محمد اعظم کے ہاں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے میٹرک ۱۹۴۹ء میں سانگلہ ہل کے کسی نواحی گاؤں سے اور بی اے ۱۹۵۴ء میں تعلیم الاسلام کالج لاہور سے پاس کیا تھا۔ وہ کالج میں تعلیم کے دوران ایک سے زیادہ بار بہترین ایتھلیٹ قرار پائے۔ انہوں نے بی اے کرنے کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں بطور استاد شمولیت اختیار کر لی، اسی دوران بی ایڈ کیا اور ۱۹۵۹ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ چار اکتوبر ۱۹۹۳ء کو سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے وقت ہائر سیکنڈری سکول، لالیاں میں بطور پرنسپل تعینات تھے۔"

موصوف کے ذکرِ خیر کے ساتھ میرے ان اساتذہ کرام کی فہرست تمام ہوئی جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں اور اپنے شاگردوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیاب و کامران دیکھ کر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

ان اساتذہ کرام کے علاوہ کئی اساتذہ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اس سکول سے کیا لیکن مختلف وجوہات کے بنا پر جلد ہی یہ ملازمت چھوڑ گئے۔ اس فہرست میں بعض دیگر اصحاب کے علاوہ قریشی سمیع اللہ، قریشی امان اللہ، ظفر اقبال، محمد ہادی مونس، محمد منیر، پرویز پروازی، منظور احمد شاکر اور اللہ بخش صادق کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟

دل نشیں طرزِ سخن، لطفِ بیاں وجد آور

قریشی سمیع اللہ اور قریشی امان اللہ سلسلہ احمدیہ کے ایک مخلص کارکن قریشی محمد عبداللہ، آڈیٹر، صدر انجمن احمدیہ کے صاحبزادے تھے۔ مجھے قریشی سمیع اللہ سے براہِ راست اکتسابِ فیض کا موقع تو نہ ملا البتہ قریشی امان اللہ ہمیں دسویں جماعت میں سائنس پڑھاتے رہے۔ یہ تو اس مضمون کے ساتھ میری اپنی بے رغبتی تھی جس کی وجہ سے میں نے کالج پہنچتے ہی آرٹس میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا ورنہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی طرف سے اس مضمون کو دلچسپ سے دلچسپ انداز میں پیش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔

وہ بی ایس سی بی ایڈ کرنے کے بعد اس سکول میں آئے تھے لیکن اسی دوران انہوں نے ایم اے عربی کا امتحان پاس کر لیا اور ایم ایڈ کرنے کے لیے لاہور منتقل ہو گئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد ابتداءً ان کی تقرری شیخوپورہ میں بطور سائنس ٹیچر ہوئی لیکن جلد ہی Government College of Education for Evaluation of Primary Teachers جو بعد ازاں کالج آف ایجوکیشن کہلانے لگا میں چلے گئے اور ۱۹۹۹ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک وہیں رہے۔

وہ ایک اچھے استاد اور بہت اچھے انسان ہیں۔ محمد خالد گورایہ سابق پرنسپل نصرت جہاں اکیڈمی ربوہ نے حال ہی میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''تعلیمی و تدریسی معلومات برائے طلبہ، اساتذہ و والدین'' میں بیان کیا ہے کہ ایک بار ان کی اکیڈمی میں ٹیچرز ٹریننگ ورکشاپ منعقد ہوئی۔ اس ورکشاپ میں قریشی امان اللہ اور میاں محمد افضل سابق پرنسپل کالج آف ایجوکیشن، فیصل آباد (وصدر جماعت احمدیہ حلقہ گلبرگ، لاہور) بھی مدعو تھے۔ ایک موقع پر جب قریشی امان اللہ اکیڈمی کے اساتذہ کرام کو لیکچر دے رہے تھے اچانک میاں محمد افضل بھی وہاں آ گئے۔ قریشی امان اللہ ان کے شاگرد رہے تھے چنانچہ انہوں نے میاں صاحب کو دیکھتے ہی اپنا لیکچر موقوف کر دیا اور ''مائی ٹیچر! مائی ٹیچر!!'' کہتے ہوئے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ قریشی امان اللہ نے انتہائی نیازمندی سے ان سے مصافحہ کیا، احتراماً ان کا بریف کیس اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور انہیں لا کر سٹیج پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ کیا خوب لکھا ہے خالد گورایہ نے: ''دنیا میں وہی لوگ عزت پاتے ہیں جو اپنے اساتذہ کی قدر و منزلت پہچانتے ہیں۔''

اگرچہ فیصل آباد میں میری تقرری کے دوران ان سے کبھی کبھار ملاقات رہتی تھی لیکن جب ان کے چھوٹے بھائی، ڈاکٹر قریشی احسان اللہ کی شادی میری ایک بھانجی، ڈاکٹر بشریٰ ثوبیہ کے ساتھ ہو گئی تو دونوں خاندان ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور وقتاً فوقتاً میری ان سے بھی ملاقات رہنے لگی۔

موصوف نے فیصل آباد ہی کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔ چند سال پہلے ان کی ایک جواں سال بیٹی، شازیہ جو اپنے شوہر اور دو بیٹیوں کے ہمراہ اپنی گاڑی پر ان سے ملنے کے لیے آئی ہوئی تھی واپسی کے سفر میں سڑک کے ایک حادثے میں خاوند اور بچوں سمیت وفات پا گئیں۔ اس حادثہ کے جلد بعد ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان پے در پے صدمات نے ان کی صحت پر بہت ناخوشگوار اثر مرتب کیا اور وہ طرح طرح کے عوارض کا شکار ہو گئے۔

قریشی سمیع اللہ نے اس سکول کی ملازمت ترک کرنے کے بعد بالآخر سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور ان کا زیادہ وقت جھنگ میں گذرا جہاں وہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بھی رہے تاہم ان کی ریٹائرمنٹ گورنمنٹ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ لاہور کے پرنسپل کے طور ہوئی۔

جن دنوں وہ جھنگ میں تعینات تھے روٹری کلب کے زیرِ اہتمام میری کتاب ''اک سفر اور سہی'' کی تقریبِ رونمائی ان کے شہر میں منعقد ہوئی۔ میری خواہش تھی کہ قریشی سمیع اللہ جو بے حد سلجھے ہوئے ادبی ذوق کے مالک تھے بھی اس تقریب میں مضمون پڑھیں اور انہوں نے مجھ سے وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن اپنی علالت کے سبب انہیں اس کے ایفاء کا موقع نہ مل سکا۔ انہوں نے چھ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو اسی حوالے سے مجھے ایک خط لکھا جو قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''معذرت خواہ ہوں کہ کوشش کے باوجود میں وہ کام نہیں کر پا رہا ہوں جس کا آپ کے تقاضے پر میں نے وعدہ کر لیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس دو میں سے آدھی آنکھ باقی ہے اور وہ بھی نہایت کمزور ہے۔ مثلاً آپ حیران ہوں گے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اسے سہولت سے پڑھ نہیں سکتا۔ مجھے اب نزدیک یا دور کی کوئی بھی عینک نہیں لگ سکتی۔ پچھلے تیس برسوں میں میرے تین آپریشن ہوئے مگر ایک بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ میں نے سینتیس برس پڑھایا اور آخری دس برس نہایت کامیابی سے پنجاب کے دو پرانے اور بڑے کالجوں کی سربراہی کے علاوہ پنجاب کی ایک تعلیمی ڈویژن کے زنانہ اور مردانہ کالجوں کی کمان کی۔

میں نے چاہا کہ آپ کے لیے میں کتاب کا دوبارہ مطالعہ کروں گا مگر میں ایسا نہیں کر سکا سو معذرت خواہ ہوں۔ اوراق آنکھ کے بہت قریب لاؤں تو کچھ نہ کچھ پڑھ لیتا ہوں مگر میرا سر زیادہ دیر تک یہ مشقت برداشت کرنے سے عاجز آ جاتا ہے۔''

قریشی سمیع اللہ ایک مخلص احمدی خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور وہ بی اے تک ربوہ ہی میں زیرِ تعلیم رہے تھے تاہم بعد میں انہوں نے جماعت احمدیہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنی سوانح عمری ''بیتے لمحوں کی چاپ'' کے عنوان سے لکھی ہے جسے لاہور کے ایک اشاعتی ادارے، بک ہوم نے شائع کیا ہے۔

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد زیادہ تر جھنگ ہی میں مقیم رہے۔ انہیں کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی حیاتِ مستعار کے آخری چند مہینے بہت تکلیف میں گذارے اور اسی تکلیف سے ۲۶ مارچ ۲۰۱۱ء کو وفات پائی۔ ان کی تدفین نشاط کالونی، لاہور والے قبرستان میں ہوئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد چنیوٹ میں ایک احمدی بزرگ سردار مصباح الدین ہوا کرتے تھے۔ انہیں اگست ۱۹۲۴ء میں جماعت کی طرف سے انگلستان بھجوایا گیا تھا اور جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ویمبلے کانفرنس میں شمولیت کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تو وہی لندن مشن کے انچارج تھے۔ انہیں قریباً سوا دو سال اس خدمت کا موقع ملا اور وہ حضور کے ساتھ ہی قادیان واپس آئے۔ تاریخِ احمدیت میں ویمبلے کانفرنس کی جو تصویر دی گئی ہے اس میں سردار مصباح الدین بھی ایستادہ ہیں۔ مختار شاہجہانپوری نے ان ہی کے بارے میں کہا ہے:

وہ جوانِ ذی خرد مصباحِ دیں روشن خیال
وہ طلب گارِ ضیائے دل کشائے قادیاں
صوفیِ پاکیزہ طینت فلسفی و حق پرست
سر بسر پابندِ آئینِ وفائے قادیان
روز و شب سرمست و سرشارِ مئے ذکرِ حبیب
دم بہ دم محوِ ثنائے مقتدائے قادیاں
خیر خواہِ خلق و نیک اطوار و خوش طبع و خلیق
تابعِ حکمِ جنابِ رہنمائے قادیاں

ان ہی سردار مصباح الدین کے صاحبزادے ظفر اقبال نے بھی کچھ عرصہ ہمیں پڑھایا۔ پہلی بار تو وہ میٹرک کرنے کے بعد چند ماہ کے لیے تعلیم الاسلام پرائمری سکول میں استاد رہے۔ اس وقت میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا تاہم میں ان کا براہِ راست شاگرد نہیں رہا۔ دوسری بار وہ ۱۹۵۸ء میں بی اے کا امتحان دینے کے بعد ہائی سکول میں استاد کی کسی عارضی آسامی پر کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے ہمیں نویں جماعت میں چند ماہ انگریزی پڑھائی۔

ظفر اقبال اچھے اور محنتی استاد تھے مگر وہ جلد ہی مزید تعلیم کے لیے لاہور چلے گئے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۶۲ء میں ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا جس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج، لورالائی میں لیکچرر ہو گئے۔ پھر ان کا تبادلہ گورنمنٹ ڈگری کالج، دھوبی گھاٹ، فیصل آباد میں ہو گیا جہاں وہ تقریباً سات سال رہے۔

۱۹۷۴ء میں جب جماعت احمدیہ کے خلاف ہنگامے زوروں پر تھے ظفر اقبال فیصل آباد کے علاقہ گلبرگ میں مقیم تھے۔ مخالفین کے ایک جلوس نے ان کے مکان کا گھیراؤ کر لیا تاہم سعید الفطرت مالکِ مکان نے شرپسندوں کو اپنے عزائم کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ ان دنوں میں بھی فیصل آباد میں تعینات تھا لیکن ہم وہاں ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ انہیں کسی طرح میرا پتا چلا تو انہوں نے از خود مجھے فون کیا چنانچہ میں اسی روز ان کے پاس حاضر ہو گیا۔ انہوں نے مجھے سارے حالات تفصیل سے سنائے اور یہ بھی بتایا کہ انہوں نے حالات سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے جلد ہی بعد وہ تیونس چلے گئے اور میرا ان سے

رابطہ منقطع ہو گیا۔

جب میں ۱۹۸۹ء میں پہلی بار جرمنی گیا تو ظفر اقبال لیبیا سے جرمنی منتقل ہو چکے تھے اور فرینکفرٹ سے کچھ دور وال ڈورف نامی ایک قصبے میں مقیم تھے۔ میرے میزبان نے میری درخواست پر وہاں جانے کا پروگرام بنایا تاہم ظفر اقبال سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے اگلی صبح واشنگٹن روانہ ہونا تھا۔ ظفر اقبال کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے کرم کیا اور صبح ہی صبح ملاقات کے لیے میری جائے قیام پر پہنچ گئے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تیونس میں صرف ایک سال رہنے کے بعد لیبیا منتقل ہو گئے تھے۔ وہ قریباً گیارہ سال لیبیا رہے اور ۱۹۸۶ء میں جرمنی میں آ ڈیرا لگایا۔ یہ ظفر اقبال کا اخلاص ہی تھا کہ وہ تا دمِ رخصت ایئر پورٹ پر موجود رہے۔ اس کے بعد مجھے جرمنی جانے کا اتفاق ہو یا وہ پاکستان آئیں تو ہماری ملاقات ضرور ہوتی ہے۔ وہ محبت کرنے والے آدمی ہیں اور میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالےٰ انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے تا کہ وہ اپنے جاننے والوں میں یوں ہی محبتیں بانٹتے رہیں۔

محمد ہادی مونس جو میرے تایا زاد ہونے کے علاوہ میرے بہنوئی بھی ہیں نے دسویں میں ہمیں کچھ دنوں انگریزی پڑھائی۔ ان کا مقابلہ سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم یا ماسٹر عبدالرحمٰن بنگالی جیسے تجربہ کار اساتذہ کے ساتھ تو مناسب نہیں تاہم انہوں نے طلبہ کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ وہ بھی جلد ہی یہ سکول چھوڑ گئے اور مختلف سرکاری سکولوں میں ملازمت کے بعد لارنس کالج گھوڑا گلی میں ماسٹر مقرر ہو گئے۔ وہاں سے نصرت جہاں سکیم کے تحت سیرالیون چلے گئے۔ بعد میں کئی سال تک نائیجیریا میں رہے۔ پاکستان واپسی پر ان کا کچھ وقت کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز فیصل آباد کے لیبر ڈیپارٹمنٹ میں گزرا جس کے بعد وہ ایک طویل عرصہ نصرت جہاں اکیڈمی میں پڑھاتے رہے لیکن آج کل جامعہ احمدیہ کینیڈا میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

ہادی مونس شعر و شاعری سے شغف رکھتے ہیں اور ذیل کے اشعار ان ہی کی ایک غزل سے ماخوذ ہیں:

ہمارے دل میں رہتا ہے کوئی پوشیدہ پوشیدہ
ہمیں لگتا ہے خوبی میں پرستیدہ پرستیدہ

اسے پا کر توانائی کے جذبے موجزن پائے
اسے کھونے سے گویا جسم و جاں لرزیدہ لرزیدہ

خمارِ عشق میں بیشک میں نازاں اس کے دم سے ہوں
مرا محبوب ہے سب کو پسندیدہ پسندیدہ

پرستاروں کا تیرے میکدے میں آنا جانا ہے
تری اس مے کا مونس کاش ہو نوشیدہ نوشیدہ

موصوف حضرت بھائی عبدالرحیم قادیانی، رفیق حضرت مسیح موعود کے نواسے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں اپنے حالاتِ زندگی "اذکارِ خیر اور میری شاعری" کے عنوان سے شائع کیے ہیں اور اس میں اپنے نانا کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔

جب ہم آٹھویں یا نویں میں تھے سکول کے سٹاف میں ایک نئے استاد کا اضافہ ہوا۔ ان کا نام منیر احمد تھا۔ وہ چوہدری رحمت خان، سپرنٹنڈنٹ، احمدیہ ہوسٹل، لاہور کے صاحبزادے تھے اور کئی سال پہلے وفات پا چکے ہیں۔ ان کے ایک بیٹے، مجیب احمد خان کے ذریعہ حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ''موصوف ۴ جنوری ۱۹۳۵ء کو اپنے آبائی گاؤں دھیر کے کلاں میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی تھی جب کہ میٹرک زمیندارہ ہائی سکول گجرات سے اور بی اے زمیندارہ کالج سے پاس کیا۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ملازمت سے کیا لیکن غالباً ۱۹۶۲ء میں انہوں نے یہ سکول چھوڑ کر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ وہ ۱۹۹۵ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج، گجرات کے پرنسپل تھے۔ خدا کا شکر ہے انہوں نے ملازمت کے دوران نیک نامی کمائی اور اپنے کسی قول یا فعل سے اپنے یا جماعت کے اوپر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ وہ ماشاء اللہ اکیس سال تک امیر جماعت احمدیہ ضلع گجرات رہے۔ اس دوران ان پر کئی مشکلات آئیں لیکن انہوں نے بڑی پامردی سے ان کا سامنا کیا۔ مخالفین کی طرف سے کئی بار ان کی جان لینے کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن خدا نے انہیں ہمیشہ ہر شر سے محفوظ رکھا۔ ان کے دور میں ضلع میں کئی نئی بیوت الذکر قائم ہوئیں۔''

''ان کی زندگی کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ؟''

''۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ مجلس خدام الاحمدیہ گجرات نے شادیوال میں پکنک کا پروگرام بنایا۔ میرا چھوٹا بھائی منیب احمد بھی اس گروپ میں شامل تھا جب کہ والد صاحب بطور امیر ضلع ہمراہ تھے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی پکنک کے دوران منیب نہر میں ڈوب گیا۔ آٹھ گھنٹے تک اس کی نعش نہیں ملی۔ اگرچہ والد صاحب نے اس سانحے کو بظاہر صبر کے ساتھ برداشت کر لیا تھا لیکن وہ یہ غم دل سے کبھی بھلا نہ سکے۔ ایک اور بات جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے گاؤں میں لڑکیوں کے لیے ایک پرائیویٹ سکول کی بنیاد رکھ دی تھی۔ الحمدللہ یہ سکول جو رحمت خان میموریل گرلز ماڈل ہائی سکول کے نام سے قائم کیا گیا تھا اب تک علاقے کے لوگوں کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔''

انہوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۹۵ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

پرویز پروازی نے ہمیں آٹھویں جماعت میں کچھ عرصہ پڑھایا۔ میں ایک پڑوسی کے طور پر انہیں بچپن سے پہچانتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے ایم اے کر لیا اور تعلیم الاسلام کالج میں لیکچرر ہو گئے جہاں مجھے پھر ان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔

میں کسی اور جگہ پرویز پروازی کی محبت اور وضع داری کے کچھ واقعات بیان کر چکا ہوں۔ یہاں میں صرف اس قدر ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں نے اس کتاب پر کام شروع کیا اور مجھے ربوہ میں آباد مختلف افراد سے باہمی رشتوں یا ربوہ میں ہونے والے بعض واقعات کی جزئیات کے بارے میں رہنمائی درکار ہوتی تو میں ان سے رابطہ کرتا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ میری ہر ای میل کا جواب اسی وقت دیتے اور صرف جواب دینے پر اکتفا نہ

کرتے بلکہ میں نے اگر کسی دوست کا رابطہ نمبر معلوم کیا ہوتا تو وہ کوشش کر کے مجھے یہ نمبر بھی فراہم کرتے۔
منظور شاکر موضع چھدیاں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ہمیں کچھ عرصہ اُردو پڑھائی اور ہماری موجودگی میں ہی سکول چھوڑ گئے۔ ان سے بعد میں میرا برابر رابطہ رہا اور اس کا تفصیلی ذکر اس کتاب کے بعض اور مقامات پر موجود ہے۔

اِسی زمانے میں سکول سٹاف میں ایک نئے اُستاد کا اضافہ ہوا۔ اگرچہ میں انہیں پہچانتا تو تھا تاہم مجھے ان کی شاگردی یا اُس زمانے میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ ہاں! بہت بعد میں ان کے ساتھ ایک اتفاقیہ ملاقات نے ان کے ساتھ راہ و رسم استوار کردی۔

ان سے میری یہ ملاقات ۲۵ دسمبر ۱۹۹۱ء کو قادیان کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کی غرض سے پاکستان سے روانگی کے وقت لاہور ریلوے سٹیشن پر ریل گاڑی میں ہوئی۔ ان دنوں وہ ناظر خدمتِ درویشان تھے۔ ہم دونوں ایک ہی ڈبے میں سفر کر رہے تھے اور ہمارے دیگر ہمراہیوں میں خواجہ نذیر احمد آف چکوال بھی شامل تھے۔ ان بزرگان سے میرا یہ تعارف اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت دیرپا تعلقات پر منتج ہوا۔

اس سفر کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ جماعتی ہدایات کے مطابق ہم صبح آٹھ بجے گاڑی میں سوار ہوگئے تھے لیکن گاڑی تھی کہ چلنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر اترنے کی اجازت نہ تھی کہ کچھ کھا پی لیتے۔ اسی کیفیت میں دوپہر ہوگئی اور بھوک ستانے لگی۔ میں مخمصے میں تھا کہ جانے کھانے کا کیا انتظام ہوگا کہ اچانک ڈبہ چرغے کی اشتہا انگیز خوشبو سے ''معطر'' ہوگیا۔ یہ خوشبو قریب آتی گئی حتّٰی کہ دو تین افراد جنہوں نے بڑے بڑے لفافے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے ہمارے پاس آئے اور یہ لفافے چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ میں نے قطعاً یہ غور نہیں کیا کہ یہ لفافے کون لے کر آیا ہے اور یہ کس کے لیے لائے گئے ہیں تاہم میرا خیال تھا کہ یہ لاہور کی جماعت کی طرف سے ناظر خدمتِ درویشان کی مہمان نوازی کا حصہ ہے چنانچہ بے تکلفی نہ ہونے کے باوجود میں نے اللہ بخش صادق سے برجستہ کہا: ''بڑیاں ٹُوراں نے تہاڈیاں چوہدری صاحب!'' تب انہوں نے میرے اس تاثر کی تردید کی کہ یہ کھانا ان کے لیے بھجوایا گیا ہے مگر ہم نے جس بے تکلفی سے یہ ''دعوت'' اڑائی اس سے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ یہ تو مجھ پر بہت بعد میں کُھلا کہ ہماری یہ ''دعوت'' لاہور سٹیشن پر تعینات کسٹمز کے عملے کی طرف سے تھی جن کے ایک سینئر افسر میرے ایک اور ہمراہی کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔

اس سفر نے ہمارے درمیان بیگانگی کی تمام دیواریں گرادیں اور مزید ملاقاتوں کا راستہ کھلتا گیا چنانچہ جن دنوں اللہ بخش صادق ناظم وقفِ جدید اور بعد میں صدرِ عمومی تھے میں ان کی خدمت میں بہت دفعہ حاضر ہوتا رہا۔ انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود مجھے ہمیشہ خوش آمدید کہا اور موسم کے مطابق خاطر تواضع کے بغیر اُٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی فرمائش کی ہو یا میں ان کے کسی کام آسکا ہوں لیکن اس کے باوجود بے غرضی کے یہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔

ایک دفعہ جب میں بہاولپور میں اپنے ایک غیراز جماعت دوست، طارق مسعود کے پاس بیٹھا تھا مجھے اللہ بخش صادق سے فون پر بات کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ جب میں بات کر چکا تو طارق مسعود نے یہ بتا کر مجھے قدرے حیران کر دیا کہ وہ بھی اللہ بخش صادق کو بہت اچھی طرح جانتے اور ان کے حسن اخلاق کے معترف ہیں۔

''مگر آپ انہیں کس طرح جانتے ہیں؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''ایک بار مجھے سُپر ایکسپریس پر فیصل آباد جانا تھا۔ میں نے بہاولپور سے سلیپر میں نشست مختص کرا رکھی تھی لیکن شدید رش کی وجہ سے گاڑی میں سوار ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔ اچانک ایک مسافر نے اندر سے دروازہ کھول کر میرے لیے گاڑی میں سوار ہونے کا راستہ ہموار کر دیا۔ جب میں اپنی نشست پر پہنچا تو وہاں کوئی اور مسافر براجمان تھا جو اسے کسی صورت چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ جب تُو تُو میں میں شروع ہوئی تو اس آدمی جس نے ڈبے کے اندر داخل ہونے میں میری مدد کی تھی نے بڑی شائستگی سے اپنی سِیٹ مجھے پیش کرتے ہوئے کہا: ''آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ میری جگہ بیٹھ جائیے۔ میرا کیا ہے میں حیدر آباد سے سِیٹ پر بیٹھ کر ہی آ رہا ہوں۔ اگر مجھے سِیٹ نہ بھی ملی تو خیر ہے۔''

مجھے اس مسافر کے غیر معمولی حسنِ اخلاق پر حیرت ہوئی۔ ان سے تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا نام اللہ بخش صادق ہے اور وہ ربوہ جا رہے ہیں۔ میں ربوہ کے نام سے ذرا چونکا۔ میں نے ربوہ والوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن رکھی تھیں اور میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس جگہ سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص اتنا بااخلاق بھی ہو سکتا ہے۔''

''سچی بات تو یہ ہے'' طارق کی بات جاری تھی ''کہ مجھے ان کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہتا ہے کیوں کہ نفسا نفسی کے اس دور میں ایک راہ چلتے کے ساتھ ان کی یہ نیکی اخلاقِ فاضلہ کی ایسی مثال ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اسی لیے تو وہ دن گیا اور آج کا دن آیا، میں وقتاً فوقتاً ان کی خیریت معلوم کرتا رہتا ہوں اور وہ بھی میرے بارے میں اسی فکر مندی کا اظہار کرتے ہیں۔''

یہی نیک نفس دم تحریر وکیل التعلیم تحریک جدید انجمن احمدیہ تعینات ہیں۔

اللہ بخش صادق کا تعلق ادرحماں ضلع سرگودھا سے ہے۔ انہوں نے وسط ۱۹۶۰ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تو میٹرک ایس وی کر رکھا تھا اور وہ چھٹی سے آٹھویں جماعت کو پڑھانے پر مامور ہوئے لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر خدا توفیق دے تو وہ اپنی زندگی امامِ وقت کے منشا کے مطابق سلسلے کی خدمت میں گذاریں۔ یہی سوچ کر انہوں نے اپنے آپ کو باضابطہ طور پر وقف کر دیا اور جامعہ احمدیہ میں داخل ہو گئے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد وہ کچھ عرصہ ڈیرا غازی خاں میں مربی رہے، پھر صیغۂ زودنویسی میں کام کیا اور کم وبیش چار سال تک معتمد، مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے طور پر خدمت بجالاتے رہے۔ وہ راولپنڈی میں مربی، سیکرٹری نصرت جہاں سکیم اور ناظم وقفِ جدید بھی رہے۔ اسی دوران انہیں بطور ناظر خدمتِ درویشان اور صدر

عمومی، ربوہ خدمت کا موقع بھی ملا۔ وہ تقریباً تین سال تک ہالینڈ میں مربی رہے۔

''ہالینڈ کا مشن تو خاصا پرانا ہے اور جب میں وہاں گیا تو ناصر شمس وہاں بطور مربی تعینات تھے'' انہوں نے ایک بار مجھے بتایا۔

''وہی جو آج کل سیکرٹری فضلِ عمر فاؤنڈیشن ہیں؟'' میں نے کہا ''وہ بھی آپ کی طرح حسنِ اخلاق کی دولت سے مالا مال ہیں اور وسیع حلقۂ احباب رکھتے ہیں۔''

''جی ہاں۔ میں اُن ہی کا ذکر کر رہا ہوں۔ میری واپسی کے بعد بھی اُن کی تعیناتی وہیں رہی اور جہاں تک میری معلومات ہیں انہوں نے اپنا یہ فریضہ پوری دلجمعی سے ادا کیا۔''

اللہ بخش صادق کو بطور ناظم وقفِ جدید حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کی جانشینی کا اعزاز حاصل ہوا جو حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کے ان پر بے پناہ اعتماد کا مظہر ہے۔

انہوں نے تحدیثِ نعمت کے طور پر مجھے بتایا کہ ایک بار ان کی والدہ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع سے ملاقات کے لیے گئیں تو حضور نے ان سے اُن کے بیٹوں کی تعداد دریافت فرمائی۔ اس پر انہوں نے جواباً کہا: ''حضور! میرا ایک ہی بیٹا ہے جو میں نے آپ کو دے دیا ہے۔'' اس پر حضور نے تبسم فرمایا اور کہا: ''آپ اسے ایک نہ سمجھیں، وہ اکیلا ہی گیارہ پر حاوی ہے۔''

وہ ''اللہ بخش شاہد'' سے ''اللہ بخش صادق'' کیسے ہوئے، یہ داستان آپ ان ہی کی زبانی سُنیئے:

''خاکسار ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۱ء تک احمدیہ مشن، ہیگ میں تعینات تھا۔ اس دوران وکالت تبشیر کی طرف سے ایک سرکلر موصول ہوا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ان مربّیان کے علاوہ جن کے نام میں ''شاہد'' کا لفظ شامل ہے کوئی مربی اپنے نام کے ساتھ ''شاہد'' کا لفظ استعمال نہ کرے۔ اس وقت خاکسار ''اللہ بخش شاہد'' کے نام سے معروف تھا۔ جب مجھے یہ ہدایت موصول ہوئی تو میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی خدمت میں ایک خط لکھا اور عرض کی کہ مغرب کے لوگ اپنی تحریروں میں کسی شخص کا ذکر کرتے ہوئے یا گفتگو میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اس کا پورا نام استعمال نہیں کرتے اور اسی نسبت سے وہ بعض اوقات مجھے ''مسٹر اللہ'' کہہ دیتے ہیں جو ظاہر ہے کسی طور پر مناسب نہیں۔ میں نے حضور سے درخواست کی کہ یا تو مجھے اپنے نام کے ساتھ بدستور ''شاہد'' کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے یا مجھے کوئی اور نام عطا کر دیا جائے۔ حضور نے خاکسار کی درخواست قبول فرماتے ہوئے میرے لیے ''صادق'' نام عطا فرمایا۔''

اللہ بخش صادق اپنے ملنے جُلنے والوں سے ہمیشہ درخواست کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسمِ بامسمّٰی بنائے۔

اُس دور کے اساتذہ کرام کے بعد اب کچھ ذکر سکول کے بعض کارکنان کا!

اب تک وہ لطف خیز تبسم ہے سامنے

تعلیم الاسلام ہائی سکول میں میرا قیام پانچ سال رہا۔ اس عرصے میں کسی ضرورت کے تحت کبھی کبھار آفس جانا تو پڑتا تھا لیکن سچ پوچھیں تو مجھے سوائے محمد یوسف نام کے ایک صاحب کے جو غالباً دفتر کے انچارج تھے کسی اور کارکن کا نام تک یاد نہیں۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ تمام ضروری امور خواہ اُن کا تعلق فیس کی وصولی سے ہو یا کسی اور معاملے سے، وہ خود ہی نمٹاتے تھے۔ اس حوالے سے میرا اُن سے پہلا رابطہ ورنیکلولر فائنل کے امتحان کے داخلے کے سلسلے میں ہوا اور جب ہم نے یہ امتحان اور بعد میں میٹرک کا امتحان پاس کرلیا اور سرٹیفکیٹس کی وصولی کا مرحلہ آیا تو بھی ان ہی سے ملاقات ہوتی رہی۔

یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ وہ سابق مربی اٹلی وسیرالیون عثمان صدیقی کے ہم زلف تھے اور ان کا مکان عثمان صدیقی کے گھر کے بالکل ساتھ محلہ دارالرحمت وسطی میں تھا۔ گھٹیالیاں میں قیام اور وہاں سے واپسی کے بعد جب میری عثمان صدیقی کے ہاں آمدورفت شروع ہوئی تو میں ایک دو بار ان کے ہاں بھی گیا مگر وہ مل نہ پائے۔

یوسف دیکھنے میں تو دُبلے پتلے تھے ہی، ان کی صحت بھی ایسی اچھی نہ تھی چنانچہ تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر میاں محمد ابراہیم کی طرف سے الفضل میں ان کی صحت یابی کے لیے کبھی کبھار دعا کا اعلان ہوتا رہتا تھا۔ انہوں نے ۱۷ جولائی ۲۰۱۰ء کو وفات پائی اور موصی ہونے کے ناطے بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ اُن کی قبر پر لگے ہوئے کتبے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے والد کا نام محمد اسماعیل تھا، وہ ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے، وہ پیدائشی احمدی تھے اور انہوں نے ۱۹۶۲ء میں وصیت کی تھی۔

سکول کے درجۂ چہارم کے ملازمین میں سے مجھے دو نام اب بھی یاد ہیں: فرزند علی اور بابا مالی۔

فرزند علی سکول میں چوکیدار تھے۔ ان کا رنگ گورا اور قد لمبا تھا۔ چال ڈھال میں سادگی نمایاں تھی لیکن فرائضِ منصبی کی ادائی میں ان سے کسی قسم کی کوتاہی سرزد نہ ہوتی۔ کبھی کبھی گھنٹی بھی بجایا کرتے تھے۔

موصوف کے چچا ابراہیم کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ یہ تعلقات اس زمانے سے تھے جب چچا ابراہیم اس سکول میں پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ان کی خدمات تعلیم الاسلام کالج کو منتقل کر دی گئیں مگر فرزند علی اور ان کی اہلیہ نے ان کے ساتھ رابطہ قائم رکھا اور میں نے بارہا انہیں چھٹی کا پورا دن چچا ابراہیم کے گھر گذارتے دیکھا۔ فرزند علی کو میرے سمیت چچا ابراہیم کے سارے بھتیجوں کی خوب پہچان تھی اور اسی نسبت سے وہ ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ سکول میں کہیں مل جاتے تو حال احوال پوچھتے اور سکول سے باہر بھی کہیں دیکھ لیتے

تو علیک سلیک کا کوئی موقع جانے نہ دیتے۔ اُن کی اہلیہ، مختاراں بی بی کو بھی ہمیشہ اس تعلق کا احترام رہا اور اگر بھی ان کی نظر بھی مجھ پر پڑ جاتی تو دعائیں دیئے بغیر آگے نہ جانے دیتیں۔

میں ایم اے کرنے کے بعد تلاشِ معاش کے سلسلہ میں ربوہ سے باہر چلا گیا اور پھر سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد تو باہر کا ہی ہو کر رہ گیا۔ اب فرزند علی بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے تھے جنہیں میں مدتِ دراز سے نہ مل پایا تھا۔ حال ہی میں چچا ابراہیم کے بیٹے، داؤد طاہر نے بتایا کہ فرزند علی اور ان کی اہلیہ تو فوت ہو چکی ہیں البتہ ان کا ایک بیٹا عبدالحی محلہ دارالبرکات میں کریانے کی دکان کرتا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ فرزند علی نے اسی محلے میں اپنا مکان بنایا تھا۔ داؤد طاہر نے ہی راقم الحروف کو عبدالحی کا نمبر فراہم کیا اور یوں ایک روز میری ان سے ملاقات ہوگئی۔

''آپ مجھے اپنے والدِ بزرگوار کے متعلق کچھ بتائیں۔ وہ کہاں کے رہنے والے تھے اور سکول میں کب آئے؟'' میں نے ایک ہی سانس میں نے ان سے بہت سے سوالات کر ڈالے۔

''میرے دادا کا نام غلام احمد تھا جو قادیان کے نواحی گاؤں موضع مراد پور کے رہنے والے تھے'' عبدالحیٔ نے جواب دیا ''انہوں نے ۱۹۳۵ء میں احمدیت قبول کی تھی۔ میرے والد پڑھے لکھے نہ تھے چنانچہ ایک بار میرے دادا انہیں حضرت سید زین العابدین ولی اللہ شاہ کے پاس چھوڑ آئے کہ وہ جس طرح مناسب خیال فرمائیں انہیں کسی جگہ ملازم کرا دیں۔ انہوں نے کہہ سن کر والد صاحب کو سکول میں چوکیدار رکھوا دیا اور انہوں نے اپنی ساری زندگی یہیں گذار دی۔''

''وہ سکول سے ریٹائر کب ہوئے تھے؟''

''۱۹۷۲ء میں جب بھٹو حکومت نے سارے پرائیویٹ سکول قومیا لیے تو والد صاحب نے حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد سے جو اُن پر ہمیشہ شفقت فرماتے تھے ملاقات کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ سرکاری ملازمت پر انجمن کی ملازمت کو ترجیح دیں گے۔ میاں صاحب نے مہربانی فرمائی اور ان کی تعیناتی نظارت امورِ عامہ میں کرا دی۔ والد صاحب نے اپنی ملازمت کا باقیماندہ عرصہ وہیں گذارا۔''

''ان کی زندگی کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ؟''

''والد صاحب اللہ کے فضل سے جسمانی طور پر بہت مضبوط اور بہادر تھے۔ نظارت امورِ عامہ میں ملازمت کے دوران ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو اپنی اراضی واقع موضع وَڈ کے لیے ایک چوکیدار کی ضرورت پیش آئی تو عبدالعزیز بھامبڑی نے ان کا نام تجویز کیا۔ حضور جو میرے والد صاحب کو پہچانتے تھے اس تجویز پر بہت خوش ہوئے چنانچہ والد صاحب وہاں چلے گئے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا جسے جھلا کہتے تھے۔ وہ روٹی وغیرہ پکاتا اور حفاظتی ڈیوٹی میں والد صاحب کی مدد کرتا تھا۔ ایک رات کچھ اوڈ چوری چھپے فصل کاٹنے لگے تو ان کے ساتھ لڑائی ہوگئی۔ اوڈ تعداد میں زیادہ اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے مگر والد صاحب نے بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا اور ایک چور کی کلہاڑی چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی تگ و دو میں چوروں نے اُن

پر وار کر دیا جس سے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے ایک بازو پر گہرا زخم آیا مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور چوروں کو فرار ہوتے ہی بنی۔ اگلی صبح وہ اسی کیفیت میں ربوہ پہنچے اور لمبا عرصہ صاحبِ فراش رہے۔ انہوں نے چار یا پانچ سال انجمن کے دفاتر میں ملازمت کی، ۲۰۰۸ء میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔''

تعلیم الاسلام ہائی سکول کے کارکنان میں سے دوسرا اہم نام جو مجھے آج بھی یاد ہے محمد اسماعیل مالی کا تھا جو اپنی ذمہ داریوں کی نوعیت کی وجہ سے سکول میں عام طور پر ''بابا مالی'' کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

لمبے قد اور گہری گندمی رنگت والے بابا مالی کی آنکھیں موٹی اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔ ربوہ کی کڑکتی دھوپ میں وہ اکثر دھوتی اور بنیان میں ملبوس کیاریوں میں گوڈی کرتے نظر آتے۔ کبھی کبھار گھنٹی بھی بجایا کرتے تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ بابا مالی قیامِ پاکستان سے پہلے فوج میں تھے اور جنگِ عظیم دوم کے دوران ان کا ایک بازو گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سکول میں ملازم ہو گئے۔

بابا اسماعیل کے اکلوتے صاحبزادے، محمد ادریس جنہوں نے مربی سلسلہ کی حیثیت میں بورکینا فاسو میں جماعتی مشن قائم کیا تھا بتاتے ہیں: ''جب والدِ بزرگوار نے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ملازمت اختیار کی تو سید محمود اللہ شاہ ہیڈ ماسٹر تھے۔ اُن کے سایۂ شفقت میں والد صاحب کو مزید ترقیٔ ایمان نصیب ہوئی۔ انہوں نے قرآن کریم سیکھ لیا اور روزانہ تلاوت اپنا معمول بنا لیا۔ سکول چنیوٹ سے ربوہ منتقل ہوا تو یہاں پودے لگانے کا کام بہت محنت طلب تھا۔ زمین کلر زدہ اور پانی سخت نمکین تھا لیکن انہوں نے اپنے کام میں دن رات ایک کر دیا۔ وہ بہت محنت سے پودوں کو سیراب کرتے۔ خدا تعالیٰ نے اس محنت کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور تعلیم الاسلام ہائی سکول میں سبزہ نظر آنے لگا۔ والدِ گرامی موصی تھے۔ انہوں نے اپنا حصہ جائیداد اپنی زندگی میں ادا کر دیا تھا اور حصہ آمد بھی باقاعدگی سے ادا کرتے رہے۔ وفات سے چند روز قبل خود دفتر مجلسِ کارپرداز میں جا کر اپنے چندے کی کیفیت معلوم کی اور دفتر سے ملنے والی تصدیق وفات کے وقت اُن کی جیب میں پائی گئی۔ وہ نہایت متوکل انسان تھے۔ درجہ چہارم کے ملازم تھے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ انہوں نے میری پیدائش سے قبل ہی مجھے وقف کر دیا تھا اور کچھ لوگوں کی ترغیب کے باوجود کہ وہ مجھے ڈاکٹر بنائیں، وہ اپنے عہد پر قائم رہے اور ہر شخص کو بتاتے کہ یہ خدا کی امانت ہے۔''

ادریس مزید بیان کرتے ہیں کہ بابا مالی نے ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء کو وفات پائی اور اگلے روز بعد نمازِ ظہر بیت مبارک میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔

درجۂ چہارم کے ایک اور ملازم جن کے ذکر کے بغیر یہ باب نامکمل رہے گا عبدالرحیم تھے جو سکول میں لیبارٹری اسسٹنٹ تھے تاہم چونکہ آٹھویں جماعت تک طلبہ کو لیبارٹری میں لے جایا جاتا تھا نہ ان کے کسی سائنسی مضمون کا پریکٹیکل ہوتا لہٰذا اُس وقت تک ان سے واسطہ پڑا نہ تعارف ہوا۔ ہاں! جب ہمارا میٹرک کا امتحان سر پر آیا تو معلوم ہوا کہ سائنس کے تینوں مضامین یعنی فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی میں تھیوری کے ساتھ ساتھ پریکٹیکلز

میں پاس ہونا بھی ضروری ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ نویں اور دسویں کے دوران ہمیں ایک یا دو بار لیبارٹری میں لے جایا تو ضرور گیا تھا لیکن اساتذہ نے عملاً ہمیں کوئی پریکٹیکل نہیں کرایا۔ اُن ہی دنوں ہم سکول کے لیبارٹری اسسٹنٹ، عبدالرحیم کے قریب ہوئے اور اسی دوران پتا چلا کہ وہ منظور نظر طلبہ کا پریکٹیکلز کے دوران خاص خیال رکھتے ہیں اور ان کی طرف سے رہ جانے والی کمی خود پوری کر دیتے ہیں۔ ہوتا دراصل یوں تھا کہ پریکٹیکل شروع ہونے سے پہلے جب ان کے ذریعہ ضروری سائنسی سامان نکلوا کر میزوں پر رکھا جاتا تو وہ سمجھ جاتے کہ امتحان میں کون سے پریکٹیکل کرائے جائیں گے چنانچہ وہ باہر آ کر اپنے منظور نظر طلبہ کو ان پریکٹیکلز کی نشاندہی کر دیتے اور وہ جلدی جلدی ان تجربات پر نظر ڈال لیتے۔ کوئی کسر رہ جاتی تو عبدالرحیم خود پوری کر دیتے۔

طلبہ کو بھی پتا ہوتا تھا کہ پریکٹیکلز میں پاس ہونا کتنا ضروری ہے اور ذرا سی کوشش سے ان میں اچھے نمبر حاصل کرنا کتنا آسان چنانچہ ان کی اکثریت موصوف کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کرتی اور اس کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا۔

سکول کے اس قدیمی کارکن کے ساتھ ان دنوں قائم ہونے والا تعلقِ محبت سکول چھوڑنے کے بعد بھی قائم رہا۔ نہ جانے کب لیکن اسی عرصے میں وہ ریٹائر ہو گئے اور ربوہ میں کہیں نہ کہیں گھومتے پھرتے نظر آ جاتے۔ بہت تپاک سے ملتے۔ ان کے منہ میں ہمیشہ پان کی گلوری ہوتی اور سرخ ہونٹوں پر ابدی مسکراہٹ۔ ان کے مالی حالات تو پہلے بھی اچھے نہ تھے لیکن ریٹائرمنٹ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

جب عبدالرحیم کافی عرصہ ربوہ کی سڑکوں پر نظر نہ آئے تو طبیعت میں تشویش پیدا ہوئی۔ تب کسی نے بتایا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

ان کے بڑے بیٹے کا نام عبدالرشید اور تخلص صحرائی ہے۔ وہ میرے کلاس فیلو تھے۔ ان کی دوستی بالعموم ایسے لڑکوں کے ساتھ ہوتی جو مالی اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ وسائل رکھتے تھے۔ وہ ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے۔ جب میں پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے کے لیے داخل ہوا تو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں داخلہ لیا۔ وہاں انہیں ہسٹاریکل سوسائٹی کے الیکشن میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا۔ عام طور پر یہ شوق رئیس زادوں یا جاگیرداروں کا ہوتا ہے لیکن انہوں نے تنِ تنہا یہ الیکشن لڑا اور اس میں کامیاب ہوئے جو ایک حیران کن امر تھا۔ جہاں تک میرا علم ہے وہ ایم اے کرنے کے بعد ایک مدت تک بیکار پھرتے رہے۔ غالباً ۱۹۸۹ء میں جب میں پہلی بار لندن گیا تو ان سے بیت الفضل میں ملاقات ہو گئی۔ معلوم ہوا انہوں نے یہاں سیاسی پناہ حاصل کر رکھی ہے اور اُن کے اپنے الفاظ میں وہ مزے کر رہے ہیں۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول کے اساتذۂ کرام اور عملے کے بعض اراکین کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ آیئے اب میں آپ کو تعلیم الاسلام کالج لے چلوں جہاں مجھے ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک تعلیم حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

وہ ٹی آئی کالج کہ جس نے مجھے روشنی اور رفعت کا تحفہ دیا ہے

میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا۔ اُن دنوں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد جو بعد میں خلافتِ ثالثہ کے مقامِ عالیہ پر فائز ہوئے کالج کے پرنسپل تھے۔ میں نے آپ کی سحر انگیز شخصیت کے حوالے سے کئی باتیں سن رکھی تھیں اور آپ کو دُور سے دیکھا بھی ہوا تھا لیکن اُس وقت تک مجھے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ تھا۔ کالج میں داخلے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا فیصلہ اُس انٹرویو کے بعد ہوگا جو کالج کے پرنسپل لیں گے۔ کالج کے قواعد کے مطابق مجھے اباجی کے ہمراہ آپ کے سامنے پیش ہونا تھا اور مجھے علم تھا کہ آپ انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں اپنی جگہ گھبرایا ہوا تھا اور آپ کا سامنا کرنے میں ایک انجانا سا خوف محسوس کر رہا تھا مگر اُن چند منٹوں کی ملاقات کے بعد جسے انٹرویو کا نام دیا گیا تھا میں آپ کی نرم خوئی اور شفقت کا قائل ہو چکا تھا۔ آپ نے میٹرک کے امتحان میں میری کارکردگی اور غالباً اباجی کی خدماتِ سلسلہ کے پیشِ نظر بغیر کسی مطالبہ کے میری نصف فیس معاف فرمادی۔

اُس زمانے میں فیس بہت معمولی تھی لیکن پیسے کی آج والی فراوانی بھی نہ تھی چنانچہ عام لوگوں کے لیے دو چار روپے بھی بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ اندریں حالات یہ رعایت میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور مجھے پڑھائی جاری رکھنے میں بہت سہولت ہوگئی۔

میں آرٹس کا طالب علم تھا۔ مضامین کے انتخاب کے لیے کسی اور طرف سے تو کوئی قابلِ ذکر رہنمائی نہ ملی چنانچہ میں بعض دیگر طالب علموں کی دیکھا دیکھی معاشیات، عربی اور منطق پڑھنے لگ گیا۔ ان مضامین کے علاوہ ہمیں انگریزی اور اُردو، دونوں زبانیں بطور لازمی مضامین پڑھائی جاتی تھیں۔

ہمیں بتایا گیا کہ لاہور بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کی پالیسی کے مطابق ایف اے کا امتحان بائی پارٹس ہوگا چنانچہ ان مضامین کا جتنا حصہ پہلے سال میں ختم کرلیا جائے گا، گیارہویں جماعت کے اختتام پر اس کا امتحان بورڈ لے گا۔ اس حصے کا دوبارہ امتحان نہیں ہوگا اور بارہویں جماعت کے اختتام پر صرف اسی سال کے کورس کا امتحان ہوگا۔ یوں پہلے سال کے اختتام پر ہر مضمون کا ایک ایک پرچہ ہوگیا اور دوسرے سال کے اختتام پر بھی ہر مضمون کا ایک ایک پرچہ ہی ہوا۔ دونوں امتحانات میں حاصل کردہ نمبروں کو جمع کرلیا گیا اور یہی نمبر ہمارے ایف اے کے امتحان کے نتیجہ کی بنیاد بنے۔

۱۹۶۳ء میں بی اے میں داخلے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں انگریزی (لازمی) کے علاوہ اپنے لیے دو

اختیاری مضامین کا انتخاب کرنا ہے۔ میں نے عربی اور سیاسیات کا انتخاب کیا جب کہ آپشنل مضمون فارسی رکھا۔ اُن دنوں ہر سو میں سے پچیس نمبر کالج کے اساتذہ کے پاس ہوتے تھے جو وہ ماہانہ کلاس ٹیسٹوں میں طالب علم کی کارکردگی کی بنیاد پر معین کر کے یونیورسٹی کو بھجواتے تھے۔ بی اے کا امتحان بھی دو حصوں میں ہوا صرف اس فرق کے ساتھ کہ ایف اے کے امتحان کے برعکس یہ امتحان بورڈ کی بجائے پنجاب یونیورسٹی نے لیا۔

تعلیم الاسلام کالج میں قیام کے دوران مجھے بہت سے اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا جن میں سے چوہدری محمد علی، مرزا انس احمد، ظفر احمد ونیس، عزیز طاہر، پرویز پروازی، آفتاب احمد، حمید احمد، محمد شریف خالد، سلطان اکبر، اسلم صابر، صوفی بشارت الرحمٰن، مرزا خورشید احمد، منور شمیم خالد، چوہدری عطاء اللہ، مولانا ابوالعطا جالندھری، مولانا غلام احمد بدوملہوی، ملک محمد عبداللہ، مولانا محمد الدین اور انور حسن شامل ہیں۔

یہ سب اساتذہ بہت قابل، بے حد شفیق اور انتہائی محنتی تھے۔ آفتاب احمد کے علاوہ باقی سبھی استاد احمدی تھے۔ ان میں سے بہت سے واقفینِ زندگی تھے اور باقی وقف کی روح سے سرشار تھے۔ ان میں سے بہتوں کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری تھی لہٰذا ان سے اکتسابِ فیض بذاتِ خود ایک بڑی سعادت تھی۔ انہوں نے ہمارے اندر علم کی جستجو پیدا کی اور ہمیں اُس راستے پر گامزن کیا جو انسان کو کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

کالج چھوڑنے کے بعد بھی میرا ان اساتذہ سے مسلسل رابطہ رہا۔ انہوں نے مجھے پھلتا پھولتا دیکھ کر ہمیشہ خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور دعاؤں سے نوازا۔ ان ہی دعاؤں کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے توقع سے کہیں بڑھ کر کامیابیاں عطا کیں۔

اِن عظیم القدر اساتذہ کے علاوہ کالج میں بہت سے ایسے اساتذہ بھی موجود تھے جن سے مجھے براہِ راست حصولِ فیض کا موقع تو نہیں ملا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میری اُن سے جان پہچان ہوگئی اور اُن کے دل میں بھی کالج کے ایک ہونہار طالب علم ہونے کی حیثیت میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کالج چھوڑنے کے بعد یہ تعلق مزید گہرا ہوگیا چنانچہ مجھے وہ ہمیشہ حد درجہ محبت اور احترام سے ملتے رہے۔ اس طویل فہرست میں چوہدری حمید اللہ، ڈاکٹر سلطان محمود شاہد، حبیب اللہ خان، حبیب الرحمٰن شاہ، سعید اللہ خان، ڈاکٹر محمد شریف خان، رفیق احمد ثاقب، مبارک احمد انصاری، شیخ محبوب عالم خالد، ڈاکٹر نصیر احمد خان، عبدالرشید غنی، عبدالشکور اسلم، اعجاز الحق قریشی، رشید احمد جاوید، ارشد ترمذی، عبدالجلیل صادق اور عبدالرشید فوزی شامل ہیں۔

تعلیم الاسلام کالج کا ماحول انتہائی سادہ اور غریب پرور تھا۔ اس میں داخلہ لینے والے طلبہ کی زیادہ تعداد کا تعلق کم مالی وسائل رکھنے والے خاندانوں سے تھا۔ کالج انتظامیہ کو ان کی مجبوریوں کا علم تھا چنانچہ اس نے یونیفارم کے طور پر سیاہ رنگ کا انڈر گریجوایٹ گاؤن اور اسی رنگ کی ٹوپی مقرر کر رکھی تھی۔ یہ گاؤن چند روپے میں بازار سے مل جاتا تھا اور چار سال استعمال ہوسکتا تھا۔ رہی ٹوپی تو طلبہ عام طور پر رام پوری کیپ استعمال کرتے تھے جو اُس زمانے میں دو روپے میں آ جایا کرتی تھی اور حسبِ ضرورت تہہ کر کے کتابوں کے ساتھ رکھی جا سکتی تھی۔ شلوار قمیص یا پینٹ اور قمیص پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی لہٰذا بعض طلبہ دھاری دار کپڑے کا پاجامہ اور بُش شرٹ

پہن کر بھی کالج آ جاتے حالانکہ عام طور پر اسے سلیپنگ سوٹ سمجھا جاتا تھا۔ شاید یہ اسی ماحول کی برکت تھی کہ مالی لحاظ سے بعض بہت کمزور خاندانوں کے بچوں نے بھی یہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد زندگی میں بہت ترقی کی۔

یہ یونیفارم ۱۹۵۹ء میں اُس وقت مقرر کیا گیا تھا جب تمام کالجوں کو محکمہ تعلیم کی طرف سے اپنے اپنے طلبہ کے لیے یونیفارم مقرر کرنے کی ہدایت موصول ہوئی تھی۔ جیسا کہ ۲ دسمبر ۱۹۵۹ء کے الفضل میں پرنسپل تعلیم الاسلام کالج کی طرف سے شائع کردہ ایک اعلان سے اندازہ ہوتا ہے، یہ یونیفارم مقرر کرنے کا صرف یہی مقصد تھا کہ طلبہ اوران کے والدین کو اس مد میں غیر ضروری اخراجات سے بچایا جا سکے۔

ایک اور اہم پہلو جس کا ذکر یہاں ضروری ہے کالج میں ڈسپلن کا قیام تھا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو بڑی نرم طبیعت بخشی تھی اوران کے چہرے پر ہر دم مسکراہٹ رہتی مگر وہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے اور کسی طالب علم کی کوئی ایسی حرکت برداشت نہ کرتے جس سے کالج کا ماحول خراب ہوتا ہو یا جماعتی نظام کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ کالج میں یونین موجود تھی لیکن یونین کو ہڑتالیں کرنے کی اجازت نہ تھی چنانچہ جب ملک بھر میں کالجوں میں سٹرائکس ہوتیں تعلیم الاسلام کالج میں توڑ پھوڑ تو دور کی بات ہے رسمی احتجاج کا موقع بھی نہ دیا جاتا۔ اگر کوئی طالب علم بضد ہو ہی جاتا ہے تو اسے جسمانی سزا دینے سے بھی گریز نہ کیا جاتا چنانچہ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب بعض طلبہ کو صاحبزادہ مرز ناصر احمد نے اپنے ہاتھ سے بیدزنی کی سزا دی۔

اُس دور کے بہت ہونہار طلبہ میں سے جنہوں نے بورڈ اور یونیورسٹی کے مختلف امتحانات میں پوزیشنیں حاصل کیں اعجاز الحق قریشی جو بعد میں پراونشل سول سروس اور پاکستان ملٹری لینڈز اینڈ کینٹونمنٹ سروس کے رکن رہے اور عطاء المجیب راشد شامل ہیں۔ اعجاز الحق قریشی کامیاب تکمیلِ ملازمت کے بعد آج کل چکلالہ سکیم تھری، راولپنڈی میں مقیم ہیں اور عطاء المجیب راشد جماعت احمدیہ لنڈن کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔

دیگر لائق طلبہ کی فہرست تیار کرنا آسان نہیں تاہم اِن میں رشید احمد جاوید، عنایت اللہ منگلا، برکت اللہ طاہر اور کچھ اور طلبہ شامل ہیں۔

رشید احمد جاوید صدر انجمن احمدیہ کے ایک کارکن، چوہدری بشیر احمد رائے ونڈی کے بھائی تھے اور اُن ہی کے ساتھ انجمن کوارٹرز میں مقیم تھے۔ ہمارے پڑوسیوں میں سے تھے لہٰذا میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک انتہائی شریف النفس اور محنتی طالب علم تھے۔

عنایت اللہ منگلا چک منگلا کے اُن خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہوں نے عزیز الرحمٰن منگلا کے ذریعہ احمدیت قبول کی تھی۔ انہوں نے بعد میں ایم اے اکنامکس کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں پڑھانے پر مامور ہوئے۔

رہے برکت اللہ طاہر تو وہ ربوہ کی ایک معروف خاتون جو گول بازار اور جماعتی و سرکاری دفاتر میں بکثرت نظر آتی تھیں اور ''حمیدہ چپڑاسن'' کے نام سے معروف تھیں کے صاحبزادے تھے۔ برکت اللہ کے والد خواجہ رحمت اللہ اُن کی پیدائش سے تین روز قبل قادیان میں وفات پا گئے تھے۔ جب اِن کی والدہ کے لیے کوئی اور ذریعۂ معاش باقی نہ رہا تو انہوں نے یہ ملازمت اختیار کر لی۔ وہ احاطے میں مقیم تھیں اور نصرت گرلز ہائی سکول میں مددگار کارکن تھیں۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائی

کے لیے پردے کی مکمل رعایت کے ساتھ دفاتر میں جاتیں اور پورے اعتماد سے اپنا کام مکمل کر کے واپس آتیں۔ میری یادداشت کے مطابق وہ بہت تیز چلا کرتی تھیں اور ہر کام پھرتی سے انجام دیتیں۔ برکت اللہ ان کے اکلوتے صاحبزادے تھے جو کالج میں ہم سے دو یا تین سال سینئر تھے۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ بعد میں انہوں نے قانون کا امتحان پاس کرلیا اور ان کی شادی سراج بی بی، کارکن، دفتر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ (جو عام طور پر سراج بی کے نام سے معروف تھیں) کی صاحبزادی، شمسہ سے ہوئی۔

برکت اللہ نے ایم اے معاشیات کا امتحان بھی پاس کیا اور پاکستان انشورنس کارپوریشن میں ملازمت اختیار کرلی۔ میرا مدتِ دراز سے اُن سے رابطہ نہ تھا۔ حال ہی میں کسی نے بتایا کہ وہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں کینیڈا منتقل ہوگئے تھے جہاں وہ چودہ جون ۲۰۱۱ء کو انتقال کر گئے۔ تفصیلات کے مطابق انہیں کچھ عرصہ سے کمر درد کی شکایت تھی جس کے لیے بالآخر انہیں آپریشن کرانا پڑا۔ آپریشن کے بعد اُن کی کمر کی تکلیف تو بہتر ہوگئی لیکن رعشہ شروع ہوگیا اور وہ غیر معمولی طور پر کمزور ہوتے گئے۔ اسی دوران ایک دفعہ غسل خانے میں گر گئے۔ انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے خون کا کینسر تشخیص کیا اور تسلی دلائی کہ مرض کا ہر ممکن علاج کیا جائے گا تاہم تقدیر ان ڈاکٹروں کی باتوں سے بے نیاز پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ اس واقعہ کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

انہوں نے چار بیٹے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ شمسہ کے ساتھ ان کی شادی بے حد کامیاب رہی چنانچہ اپنے شوہر کی وفات پر کئی سال گذر جانے کے باوجود شمسہ انہیں یاد کر کے اب بھی آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔

ناانصافی ہوگی اگر یہاں ایم اے عربی کے اُن طلبہ کا ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے خدا کے فضل سے اس امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں نمایاں پوزیشنیں حاصل کیں۔ اِن میں مولوی محمد صدیق، انچارج خلافت لائبریری؛ قریشی مقبول احمد، مربی امریکہ اور سید عبدالحیٔ شاہد ناظر اشاعت صدر انجمن احمدیہ شامل ہیں۔ انہوں نے ایم اے عربی کے امتحان میں مختلف پوزیشنیں حاصل کر کے عربی پڑھنے والے حلقوں پر کالج کی دھاک بٹھادی۔ یہ تینوں بزرگان اب وفات پاچکے ہیں۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا شمار بھی کالج کے ہونہار طلبہ میں سے تھا اور مجھے کالج ٹیسٹس اور بورڈ و یونیورسٹی کے امتحانات میں ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل ہوتی رہی جس کی وجہ سے میں انعامات کا حقدار ٹھہرتا رہا۔ مجھے یہ انعامات کالج کانووکیشنز پر مہمانانِ خصوصی کے ہاتھوں ملتے رہے تاہم میرے لیے زیادہ اعزاز کی بات یہ ہے کہ مجھے تمام انعامی کتب اور میرٹ سرٹیفکیٹس حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے دستخطوں سے ملے۔ یہ سرٹیفکیٹس میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں اور میں نے انہیں اپنے لیے ہمیشہ باعثِ برکت سمجھا ہے۔

ان دنوں کالج میں دو کھیلوں کا بہت چرچا تھا۔ اوّل باسکٹ بال اور دوم رونگ۔ اس کتاب میں کسی اور جگہ تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے کہ باسکٹ بال کے کھیل کا آغاز حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی ذاتی دلچسپی اور پروفیسر نصیر احمد خان کی بھرپور محنت سے ۵۸-۱۹۵۷ء میں ہوا تھا جس کے ساتھ ہی یہاں پہلا آل پاکستان

باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد ہوا۔ اُس کے بعد سے یہ ٹورنامنٹ سال بہ سال بغیر کسی وقفہ کے جاری رہا۔ ربوہ میں یہ ایک اہم ایونٹ سمجھا جاتا تھا جس میں شمولیت کے لیے ملک کے طول وعرض سے باسکٹ بال کی ٹیمیں حصہ لینے کے لیے آتی تھیں۔ یہ ٹورنامنٹ اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ کالج کے طلبہ کے علاوہ ربوہ کے عام شہری بھی اس کے منتظر رہتے۔ ابتدا میں باسکٹ بال کا صرف ایک ہی گراؤنڈ تھا لیکن بعد میں اس سے ملحق ایک اور گراؤنڈ تعمیر کر دیا گیا جس کی وجہ سے ٹورنامنٹ کو وقت پر ختم کرنے میں بڑی سہولت حاصل ہوگئی۔

ان ٹورنامنٹس کا سب سے دلچسپ حصہ اس کا کلب سیکشن تھا۔ یہ کلب ملک کے انتہائی منجھے ہوئے کھلاڑیوں پر مشتمل تھے لہٰذا ان کا کھیل دیدنی ہوتا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ اُن دنوں ریلویز، بدرز کلب اور پولیس کلب کا بہت چرچا تھا۔ کلب سیکشن کا فائنل میچ بالعموم اِن ہی کلبوں کے درمیان ہوا کرتا تھا اور ہر سال ان ہی میں سے کوئی نہ کوئی کلب فاتح قرار پاتا۔ اِن کلبوں کے اتفاقاً یاد رہ جانے والے اہم کھلاڑیوں میں ریلوے کے ''جاوید'' اور پولیس کے ''پایا'' شامل ہیں۔

ہم اگر باسکٹ بال کھیلنے والوں میں سے نہ تھے تو اسے دیکھنے والوں میں ضرور شامل تھے اور اُس زمانے کے ربوہ کے بعض نامور کھلاڑی ہمارے دوست تھے۔ ان میں نصیر بندہ اور مجید شامل تھے۔ انہیں پنجاب کی سطح پر کھیلنے کا موقع تو مل گیا لیکن وہ اپنے لیے کوئی مناسب ذریعہ معاش پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ دونوں نے ربوہ میں بجلی کے سامان کا کاروبار کیا لیکن وہ اس میں ترقی نہ کرپائے۔ یہ دونوں دوست وفات پاچکے ہیں۔

ربوہ کے دیگر کھلاڑیوں میں لطیف جھمٹ، وکیل المال ثالث تحریک جدید انجمن احمدیہ، میجر (ر) سعید احمد اور سلطان شُرلی شامل تھے۔

دوسرا کھیل جس میں تعلیم الاسلام کالج نے بہت شہرت کمائی روئنگ تھا۔ اُسے یہ شہرت اس زمانے میں ملی جب یہ کالج قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں قائم ہوا اور دریائے راوی کی قربت نے اسے یہ موقع فراہم کردیا کہ مسلسل محنت سے اپنے لیے اس کھیل میں نام کما سکے۔

ربوہ منتقل ہونے کے بعد بھی کالج نے اپنا یہ اعزاز برقرار رکھا اور میرے زمانۂ طالب علمی میں یہ کالج پچھلے دس بارہ سال سے پنجاب یونیورسٹی بمپنگ بوٹ چیمپئن تھا۔ اسی طرح کالج ویسٹ پاکستان رونگ ٹورنامنٹ میں بھی پوزیشن ہولڈر تھا۔

جب ہم کالج میں داخل ہوئے تو چوہدری محمد علی رونگ کے انچارج تھے۔

کالج کی رونگ ٹیم کے لیے مختص کشتیوں کے علاوہ کالج کی آٹھ دس کشتیاں دریائے چناب پر ہر وقت موجود ہوتی تھیں اور سردار نامی ملاح ان کا نگران تھا۔ کشتی کے حصول کے لیے طلبہ کو کالج کا شناختی کارڈ دکھانا پڑتا تھا جس کے بعد یہ ان کی اپنی مرضی ہوتی کہ وہ ملاح کو ساتھ لیتے ہیں یا خود ہی کشتی لے کر دریا کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ سردار تعلیم الاسلام کالج کا ملازم تھا۔ اس کی تنخواہ مددگار کارکن کے برابر ہوگی لہٰذا وہ طلبہ کی طرف سے بخشش کی توقع رکھتا تھا چنانچہ وہ ایسے طلبہ جو اس کا خیال رکھتے کا انتہائی خوش دلی سے استقبال کرتا اور جیسے تیسے انہیں فوری طور پر کشتی مہیا کردیتا جب کہ دوسروں کے لیے اس کے اصول قدرے مختلف تھے۔

میں چوہدری محمد علی کے شاگردوں میں سے تھا۔ وہ اپنے شاگردوں پر بہت شفقت فرماتے اور کشتی رانی کلب کے انچارج کی حیثیت میں ہمیں کئی بار دریا پر لے جاتے۔ ایک بار ہم نے ایک رات ان کی سرپرستی میں پانی کے مخالف رُخ کچھ اوپر جا کر ایک جزیرے پر گذاری۔ ہم ٹینٹ اور کھانے پینے کا خام سامان ہمراہ لے گئے تھے۔ ہم نے جزیرے پر اپنا خیمہ نصب کیا اور اینٹوں کے چولہے پر ہنڈیا اور روٹی بنائی اور یوں اس پکنک کا لطف دوبالا ہو گیا۔ اس گروپ میں محمد احمد گردیزی اور سعید انجم (جن کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں بعض اور جگہوں پر موجود ہے) کے علاوہ چند اور طلبہ بھی شامل تھے لیکن کھانا پکانے میں محمد احمد گردیزی پیش پیش رہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ سکول کے زمانے میں سکاؤٹنگ کے دوران سیکھا تھا اور اس رات انہیں اس ٹریننگ کا عملی ثبوت فراہم کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

اس زمانے میں رات کے وقت ربوہ سے دو ریل گاڑیاں گذرا کرتی تھیں یعنی ماڑی انڈس سے لاہور کی طرف جانے والی اور لاہور سے واپس آنے والی ''ماڑی انڈس''۔ رات کے اس سمے پُل پر سے گذرنے والی ان دونوں گاڑیوں نے عجیب سماں پیدا کر دیا۔ گاڑی گذرنے کی آواز اپنا طلسم جگا رہی تھی اور بوگیوں کے اندر روشنی اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ دُور سے یوں لگتا تھا گویا جھلمل کرتے ہوئے ستاروں کی ایک کہکشاں ہے جو بڑی تیزی کے ساتھ آسمان کے ایک سے دوسرے سرے کی جانب رواں دواں ہے۔

اُس زمانے میں سٹوڈنٹ یونین کے انچارج ڈاکٹر سلطان محمود شاہد تھے۔ کالج میں میرے قیام کے دوران جو طلبہ سٹوڈنٹ یونین کے صدر رہے اُن میں فضل احمد، ارشد ترمذی اور کریم قمر شامل ہیں۔ اِن میں سے باقی دو دوستوں کا ذکر تو کسی نہ کسی حوالے سے اس کتاب میں آ گیا ہے لیکن فضل احمد محتاجِ تعارف ہیں۔ یاد رہے کہ دبلے پتلے فضل احمد میجر عارف زمان کے صاحبزادے تھے جو اُن دنوں ناظر امورِ عامہ صدر انجمن احمدیہ تھے اور محلہ دارالصدر غربی (اب شمالی) میں نواب امتہ الحفیظ صاحبہ کی کوٹھی کے قریب رہائش پذیر تھے۔

سٹوڈنٹ یونین سال کے سال انٹر کالجیئٹ ڈیبیٹ کروایا کرتی تھی۔ ایک دن انگریزی ڈیبیٹ کے لیے مختص ہوتا اور دوسرا دن اردو ڈیبیٹ کے لیے۔ موضوع قبل از وقت دے دیا جاتا اور مہمان کالجز کے ایک مقرر کو قرارداد کے حق میں اور دوسرے کو قرارداد کے خلاف بولنا پڑتا۔ یہ ڈیبیٹس عام طور پر فروری یا مارچ میں ہوتیں اور ان کا دلچسپی سے انتظار کیا جاتا۔ ڈیبیٹس سننے کے لیے طلبہ کے علاوہ ربوہ سے مہمانوں کو بھی مدعو کیا جاتا اور گیلری تو خواتین کے لیے مختص ہوتی۔ لوگ اس میں جوق در جوق شامل ہوتے۔

ڈیبیٹنگ میں اُن دنوں چار پانچ ناموں کا بہت چرچا تھا۔ انگریزی کے ڈیبیٹرز میں سے ایک تو سید مشہود احمد تھے جو سید محمود اللہ شاہ، ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول اور مسز شاہ، پرنسپل جامعہ نصرت کے صاحبزادے تھے۔ گورے چٹے اور دراز قد مشہود کو ڈیبیٹنگ پر بے پناہ دسترس حاصل تھی اور وہ اسی حوالہ سے مختلف کالجوں میں تعلیم الاسلام کالج کی نمائندگی کرتے تھے۔ دوسرے نور محمد چانڈیہ تھے جو ڈیرا غازی خان کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی ایک بہت اچھے مقرر تھے اور کالج کے لیے انعامات جیت کر لاتے رہتے تھے۔ اردو مقررین میں سے جو نام

فوری طور پر یاد آ رہے ہیں ان میں عطاء المجیب راشد اور ارشد ترمذی سرفہرست تھے۔ عطاء المجیب راشد مولانا ابوالعطا جالندھری کے صاحبزادے ہیں جب کہ ارشد ترمذی تکمیلِ تعلیم کے بعد شعبہ تعلیم میں چلے گئے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اب وفات پا چکے ہیں۔ جاوید گوگا جو بی ٹی صاحب کے صاحبزادے ہیں اور اب لیڈز (انگلستان) میں مقیم ہیں بھی اردو مقررین میں سے تھے جب کہ ایک اور اچھے مقرر کریم قمر تھے۔ ان مقررین پر مشتمل ٹیمیں بھی دوسرے کالجوں سے بالعموم انعامات جیت کر لایا کرتی تھیں۔

اگرچہ کالج یونین اور دیگر سوسائٹیاں بھی اس معاملے میں بہت فعّال تھیں اور وقتاً فوقتاً مختلف مشاہیر کو بطور سپیکر کالج میں بلاتی رہتی تھیں مگر مجلسِ ارشاد کے تحت تو اس طرح کے اجلاس بکثرت ہوتے رہتے جس میں جماعت کے علماء اپنے علم و فضل کی روشنی میں طلبہ کی رہنمائی فرماتے۔ مجھے جن علماء کا اس مجلس کے تحت خطاب کرنا یاد ہے ان میں سید زین العابدین ولی اللہ شاہ؛ سید کمال یوسف، مربی سکینڈے نیویا: مولانا جلال الدین شمس اور ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد (جو اُن ہی دنوں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد انگلستان سے واپس تشریف لائے تھے) کے نام شامل ہیں۔

اُن دنوں خیرا گلی، مری ہلز میں حکومت مغربی پاکستان کے محکمہ سِول ڈیفنس کی جانب سے سال کے سال ایک سِول ڈیفنس کیمپ ہوا کرتا تھا جس میں پنجاب یونیورسٹی سے ملحق مختلف کالجوں کے طلبہ شامل ہوتے۔ یہ بات ذاتی طور پر میرے علم میں تھی کہ راجہ عبدالمالک جو میجر عبدالحمید کے صاحبزادے ہیں اور بعد میں کرنل مرزا داؤد احمد کے داماد بنے ایک سال اس کیمپ پر گئے تھے اور انہوں نے اس میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ میں ان کی زبانی اس کیمپ کی دلچسپ رُوداد سُن چکا تھا چنانچہ ۱۹۶۴ء میں جب اس محکمے کا ایک نمائندہ ہمارے کالج سے طلبہ کے انتخاب کے لیے آیا تو میں نے بھی اپنے آپ کو والنٹیئر کیا۔ رسمی سے انٹرویو کے بعد مجھے سیلیکٹ کر لیا گیا اور مجھے بعد میں اس امر کی باضابطہ اطلاع بھی مل گئی۔ اس خط کے مطابق یہ ٹریننگ آٹھ اگست سے اگلے دو ہفتے تک ہونا تھی اور مجھے سات اگست کو خیرا گلی رپورٹ کرنا تھی تاہم کسی وجہ سے میں اس ٹریننگ میں شمولیت اختیار نہ کر سکا جس کا مجھے بہت دیر تک افسوس رہا۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارے گھر کا ماحول دینی اور ادبی تھا۔ ابا جی خود نہ صرف ایک اچھے نثر نگار تھے بلکہ انہیں شعر گوئی کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ وہ ایک طویل عرصہ تک اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل اور ایڈیٹر مصباح رہے تھے اور ان کے سینکڑوں مضامین جماعتی اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ ان کے جماعت کے پڑھنے لکھنے والے دوستوں سے گہرے تعلقات تھے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے چنانچہ ان کی گفتگو میں ایک خاص ادبی چاشنی تھا اور گھر میں بھی یہ رنگ غالب رہتا تھا۔ وہ گھریلو تفکرات کو اپنے آپ پر زیادہ حاوی نہ ہونے دیتے اور اسلامی تاریخ اور بزرگانِ سلسلہ کے واقعات انتہائی دلچسپ انداز میں بیان کرتے رہتے۔ آپی بھی ان کی ہم ذوق تھیں اور صاحبِ مطالعہ بھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فصاحت کی خوبی سے بدرجہ اتم نواز رکھا ہے چنانچہ ان دونوں کی گفتگو کا محور بالعموم شعر و ادب ہوتا جس سے باقی افرادِ خانہ بھی حسبِ ذوق لطف اندوز ہوتے۔ یہ تھا ہمارے گھر کا ماحول جس میں راقم نے آنکھیں کھولیں۔

کالج میں انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو پڑھنا لازمی ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ہمیں پرویز پروازی کی شکل میں ایک ایسا استاد عطا فرمادیا جس نے اردو کی محبت دل میں راسخ کردی۔

قدرت کی طرف سے بھی مہربانی ہوئی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابا جی کی جن بہت سی خوبیوں کا وارث بنایا ان میں سے تصنیف وتالیف کی طرف میری رغبت نمایاں ہے اور میں یہ بات ذات باری تعالیٰ کے شکرانہ کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ میری جانب سے اس کا اظہار اوائل جوانی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں بارہویں جماعت میں تھا۔ اُن دنوں رشید احمد جاوید المنار کے حصہ اردو کے ایڈیٹر تھے۔ وہ مجھ سے خاصے سینئر تھے لیکن ہماری رہائش قریب قریب تھی اور مجلس خدام الاحمدیہ کی سرگرمیوں کے دوران ہماری اکثر ملاقات رہتی تھی۔ میں نے ان ہی کے اصرار پر اپنا پہلا مضمون لکھا جو ''رحمۃ للعٰلمین کا اپنے دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک'' کے عنوان سے المنار میں شائع ہوا۔

اس حوصلہ افزائی کے نتیجہ میں مجھے تحریک ہوئی کہ میں اپنے کالج کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کروں۔ اس حوالے سے میں نے بی اے سالِ اوّل کے دوران ایک طویل مضمون لکھا۔ اس کی پہلی قسط تو اسی وقت شائع ہو گئی لیکن دوسری قسط کچھ وقفے کے بعد اُن دنوں شائع ہوئی جب میں بی اے فائنل ایئر میں پہنچ چکا تھا۔ اس مضمون کی کل طوالت بائیس صفحات تھی۔

اسی سال میں نے المنار کی تاریخ بھی مرتب کی جو ''روشنی اور رفعت کا نشان: المنار کے پندرہ سالہ دور کی تاریخ'' کے عنوان سے فوری طور پر شائع ہو گئی۔

ان ہی دنوں المنار نے طلبائے کالج کے مابین ''اصلاحِ معاشرہ میں طالب علم کا کردار'' کے موضوع پر ایک مقابلہ کرایا۔ میں نے اس مقابلے میں حصہ لیا اور خدا کے فضل سے میرا مضمون اوّل قرار پایا۔ یہ مضمون کالج سے میرے چلے آنے کے بعد المنار میں شائع ہوا۔

کالج کے سابق طالب علم کی حیثیت میں میرے جو مضامین المنار میں شائع ہوئے۔ ان میں سے پہلا مضمون حضرت مصلح موعود کے علمی کارناموں کے جائزے پر مشتمل تھا اور ''علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ دوسرا مضمون ٹیکسلا عجائب گھر کے بارے میں تھا اور اس کا عنوان تھا ''چند لمحے ٹیکسلا میوزیم میں''۔ مؤخر الذکر مضمون کے حوالے سے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اگست ۱۹۶۴ء میں چھٹیاں گذارنے پہلی بار واہ کینٹ گیا تھا جہاں میرے چچا، محمد اسماعیل فوق مقیم تھے۔ اسی دوران مجھے ٹیکسلا کے کھنڈرات اور عجائب گھر دیکھنے کا موقع ملا۔ میں ایک سے زیادہ بار وہاں گیا اور پھر میں نے ایک مضمون لکھا۔ ان دنوں اشتیاق حسین نامی ایک افسر اس عجائب گھر کے کیوریٹر تھے۔ میں نے یہ مضمون ان کے پاس نظر ثانی کے لیے بھجوایا۔ زمانہ اچھا تھا۔ انہوں نے اس پر نظر ثانی کی اور اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا۔

ان تمام مضامین کی مجموعی طوالت المنار کے اٹھہتر صفحات پر محیط تھی۔

خدا کا شکر ہے میرے ان مضامین کو مجموعی طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور استاذی المکرم

چوہدری محمد علی نے کالج کے وائس پرنسپل کے طور پر میرے پروویژنل سرٹیفکیٹ میں لکھا کہ "He has a facile pen" ان کے اس فقرے کا مفہوم یہ تھا کہ اس طالب علم کے قلم میں خاصی روانی ہے۔ چوہدری صاحب کے ان ریمارکس نے بھی میرا مان بڑھایا اور مجھے ''مشقِ سخن'' جاری رکھنے کا حوصلہ بخشا۔

یہ تعلیم الاسلام کالج میں حاصل ہونے والی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ جب میں بی اے کا امتحان دے چکا تو میں نے ابا جی کے کاغذات کی ورق گردانی شروع کی اور بعض مضامین جو میری دانست میں شائع ہو سکتے تھے الفضل کو اشاعت کے لیے دے دیئے۔ اس حوالے سے سب سے پہلا مضمون ۲۷ جولائی ۱۹۶۵ء کو ''حضرت مسیح موعود اور علمِ طب'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یاد رہے کہ ابا جی کا ایک مضمون اسی عنوان سے کئی سال پہلے الفضل جلد ۲۵ میں سات اقساط میں شائع ہو چکا تھا۔ زیرِ نظر مضمون میں شامل حوالہ جات بھی اسی تسلسل میں جمع کیے گئے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا جب میرے نوٹ کے ساتھ الفضل میں کوئی مضمون شائع ہوا تھا چنانچہ مجھے اس کی اشاعت پر بے حد خوشی ہوئی۔ کئی لوگوں نے اسے میرا لکھا ہوا مضمون سمجھا اور اس حوالے سے مجھے مبارکباد دی۔ یوں مجھے تحریک ہوئی کہ مجھے ذاتی طور پر الفضل کے لیے کچھ لکھنا چاہئے چنانچہ میں نے ابا جی کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا۔ میں یہ مضمون لے کر شیخ خورشید احمد، نائب ایڈیٹر الفضل کے پاس حاضر ہوا۔ وہ اس مضمون کا حجم دیکھ کر گھبرا گئے لیکن انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کا قابلِ اشاعت حصہ جلد ہی الفضل میں شائع کر دیں گے۔ کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ اس مضمون کی پہلی قسط چھپ گئی۔ میں بہت خوش ہوا لیکن میرے نزدیک اس مضمون کی اشاعت کے پیچھے میرے کسی کمال سے زیادہ ابا جی کی اپنی شخصیت کا اثر تھا۔ یہ مضمون ''والدِ ماجد مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب طاہر کا ذکرِ خیر'' کے عنوان سے الفضل کی سات اقساط میں چھپا۔ اس مضمون کی پہلی قسط ۲۰ اگست ۱۹۶۵ء کے الفضل میں شائع ہوئی اور آخری قسط ۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ء کو آئی۔

اس وقت تک میرا حلقہ احباب ربوہ تک محدود تھا اور بہت سے لوگ مجھے کئی حوالوں سے جانتے تھے۔ جو بھی ملتا میری اس کاوش کو سراہتا۔ میں توقع نہیں کر رہا تھا کہ بیرونِ ربوہ کے کچھ قارئین کی طرف سے بھی میری حوصلہ افزائی ہوگی لیکن بعض دوستوں کے خطوط سے اندازہ ہوا کہ میرا یہ تاثر درست نہ تھا۔

سید سجاد احمد، منیجر جعفر فلور اینڈ آئل ملز لمیٹڈ، جڑانوالہ نے اپنے مکتوب میں لکھا: ''آج کے الفضل میں مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب طاہر کے متعلق آپ کا مضمون پڑھ کر ان کی اچانک وفات کا صدمہ پھر تازہ ہو گیا۔ میرے ساتھ ان کے ۱۹۴۲ء سے مراسم تھے اور میں نے انہیں اپنا بے حد ہمدرد اور مخلص دوست، مہربان مشیر اور شفیق بزرگ پایا۔ مجھے ان کی متبسم پُر وقار صورت نہیں بھولی۔ آپ کے تو وہ والد تھے لیکن میں نے انہیں اپنا بڑا مخلص مشیر پایا۔ ہر سلسلہ میں ان کا مشورہ بہر جہت مفید ہوتا تھا۔

مجھے ان کی وفات سے اس قدر صدمہ ہوا کہ میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ میں کسے تعزیت کے لیے لکھوں اور کیا لکھوں اور اسی عالم میں عرصہ گذر گیا۔ اب آپ کے مضمون سے اس خط کی تحریک ہوئی۔ براہِ کرم اپنی والدہ محترمہ، ہمشیرگان سے تعزیت کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر آن آپ سب کا حافظ و ناصر ہو اور مولوی صاحب مرحوم کو اعلیٰ

علیین میں بلند مدارج سے نوازتا چلا جائے۔
مولوی صاحب مرحوم کی ساری زندگی انتہائی خاموشی کے ساتھ گذری۔ آپ نے احمدیت کی تاریخ میں اس قدر اہم کام کیا ہے کہ رہتی دنیا تک آپ کا نامِ نامی زندہ و پائندہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے......''

مخدوم الطاف احمد نے میانی سے لکھا: ''آپ کا مضمون روزنامہ الفضل میں پڑھ کر خواہش پیدا ہوئی کہ آپ کو یہ خط بھیجا جائے۔ آپ کے والدِ ماجد مولوی محمد یعقوب صاحب طاہر مرحوم و مغفور کے حالات پڑھ کر دل کو بہت افسوس ہوا کہ اتنی خوبیوں والا قیمتی وجود ہم سے جدا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مکرم مولوی صاحب مرحوم و مغفور کو اپنے فضلوں سے جنت الفردوس کا وارث بنائے......''

اس حوالے سے بعض اور خطوط بھی موصول ہوئے جن کی تفصیلات میں جائے بغیر میں یہ عرض کروں گا کہ اباجی کے حالاتِ زندگی ایک پوری کتاب کے متقاضی ہیں لیکن اس مضمون کے ذریعہ ان کے بارے میں بنیادی معلومات قارئین تک پہنچا دی گئی تھیں۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ میں اباجی کے رفقائے کار کے علاوہ ان کے تمام جاننے والوں سے ان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کی درخواست کروں گا اور کسی مناسب وقت پر یہ تاثرات کتابی شکل میں چھپ جائیں گے لیکن افسوس! میں اُس وقت اِس کام کی طرف بھرپور توجہ نہ دے سکا۔ پھر بات پرانی ہوتی چلی گئی اور ان کے دوست احباب سب ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہوتے گئے۔ آج اس بات پر نصف صدی بیتنے کو ہے لیکن اباجی کی سوانح کا کام ادھورا پڑا ہے جس کا مجھے دلی افسوس ہے۔

اباجی کے بارے میں میرے اس مضمون کے بعد الفضل میں میرے درجِ ذیل مضامین شائع ہوئے:

۲ اکتوبر ۱۹۶۶ء	حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل کی یاد میں
۵ ستمبر ۱۹۶۷ء	ستمبر ۱۹۶۵ء کی تاریخی جنگ (قسط اوّل)
۶ ستمبر ۱۹۶۷ء	ستمبر ۱۹۶۵ء کی تاریخی جنگ (قسط دوم)
۸ ستمبر ۱۹۶۷ء	حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے بعض ارشادات (یہ مضمون حضور کے ان ارشادات پر مشتمل ہے جو حضور نے صیغہ زودنویسی کی طرف سے اپنی تقاریر برائے ملاحظہ پیش ہونے پر رقم فرمائے۔ یہ مضمون اباجی کے کاغذات کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا)
۲۱ ستمبر ۱۹۶۷ء	حضرت مرزا سلطان احمد صاحب کے متعلق ایک نوٹ (یہ نوٹ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے قلم کا شاہکار ہے۔ اباجی کے کاغذات میں سے دستیاب ہوا تھا اور میرے نوٹ کے ساتھ الفضل میں شائع ہوا)
۱۵ جون ۱۹۶۸ء	ایک نیک اور مخلص احمدی خاتون کا ذکرِ خیر (یہ مضمون میری خالہ، مظفر بیگم کے بارے میں تھا جو ہمارے پاس رہائش پذیر تھیں)

۴ اگست ۱۹۶۸ء	محترم چوہدری رحمت خان صاحب مرحوم
۱۸ اگست ۱۹۶۸ء	پاکستان اور اقلیتیں
۳۱ اگست ۱۹۶۸ء	پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ناصر مرحوم (قسط اول)
۴ ستمبر ۱۹۶۸ء	پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ناصر مرحوم (قسط دوم)
۶ ستمبر ۱۹۶۸ء	جنگِ ستمبر اور اس کا پس منظر

ان مضامین کی اشاعت پر بھی مجھے بعض قارئین کی طرف سے تعریفی خطوط موصول ہوتے رہے جو یقیناً میری حوصلہ افزائی کا باعث بنے۔ ان میں سے ایک خط جو اَب تک میرے پاس محفوظ ہے اور جسے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے کراچی سے مہتہ عبدالقادر نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو لکھا تھا: ''طاہر بیٹے! ابھی ابھی اخبار الفضل میں آپ کا مضمون حضرت قاضی اکمل صاحب کی یاد میں پڑھتے آپ کے صوفی منش ابا یاد آ گئے کہ ایک زمانہ ہوا ہم لوگ مدرسہ احمدیہ میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے اور بے تکلف دوست تھے۔

آپ کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان سے متاثر ہو کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔

طاہر بیٹے! اگر بارِ گراں نہ ہو تو اپنی مشغولیت اور آئندہ پروگرام کے متعلق لکھیں۔ شاید اس سلسلہ میں میں کسی خدمت کے قابل ہو سکوں۔''

ایک بار عطاء المجیب راشد جو اُن دنوں ربوہ میں مقیم تھے اور رسالہ خالد کے ایڈیٹر تھے نے المنار کی تاریخ پر مشتمل میرا مضمون دیکھ کر مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان ہی خطوط پر رسالہ خالد کی تاریخ بھی لکھوں۔ میں نے کئی دنوں تک گھنٹوں خلافت لائبریری میں بیٹھ کر اس مضمون کے لیے بنیادی مواد جمع کیا اور پھر اسے ایک مبسوط مضمون کی شکل دے کر ان کے سپرد کر دیا تاہم ان کے دفتر سے یہ مضمون گم ہو گیا۔ اس زمانے میں فوٹو کاپی کی سہولت اتنی عام نہ ہوئی تھی چنانچہ میرے پاس اس کی کوئی نقل موجود نہ تھی لہٰذا یہ مضمون کبھی شائع نہ ہو سکا۔

مضمون نویسی کے میرے رجحان کی ترقی میں مجلس خدام الاحمدیہ کی سرگرمیوں کا بھی بہت دخل ہے۔ ہماری مجلس کے اجلاسات بیت مبارک میں ہوتے تھے۔ میں مختلف تربیتی موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھ کر ان اجلاسوں میں پڑھتا تھا۔ میں نے کالج کے ابتدائی دور میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ضروری تحقیق کے بعد مختلف موضوعات پر کئی چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے جن پر میں وقتاً فوقتاً نظرِ ثانی کرتا رہا۔ نتیجتاً یہ مضامین مختصر مقالوں کی شکل اختیار کر گئے۔ یہ مضامین جو میں نے اشاعت کے لیے کہیں نہ بھجوائے تھے لمبا عرصہ میرے پاس پڑے رہے۔

اُن دنوں بھی خدام الاحمدیہ کے تحت سال کے سال خدام کے مابین مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوتا تھا جس میں امتیاز حاصل کرنے والوں کو سالانہ اجتماع کے موقع پر نقد انعامات سے نوازا جاتا۔ میں نے اس طرح کے تین مقابلوں میں حصہ لیا اور خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے تینوں بار انعام کا حقدار قرار پایا۔

پہلا مقابلہ سید میر داؤد احمد کے دورِ صدارت میں ہوا۔ مجھے اب اس کا موضوع یا سَن تو یاد نہیں لیکن اپنے پاس

موجود سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے معیارِ سوم میں حصہ لیا اور اوّل انعام کا مستحق قرار پایا۔
میں نے ۱۹۶۷ء میں مقالہ نویسی کے سالانہ مقابلے میں حصہ لیا۔ میں اس مقابلے میں دوم قرار پایا۔ ان دنوں حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صدرِ مجلس اور عطاء المجیب راشد مہتمم تعلیم تھے۔ ان کے دستخط سے جاری شدہ سند آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

اس کے بعد میں نے ۱۹۶۸ء کے مقابلہ میں حصہ لیا۔ میرا مقالہ اوّل قرار پایا چنانچہ حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد، صدرِ مجلس اور امین اللہ سالک، مہتمم تعلیم کے دستخط سے مجھے ایک سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ میں نے یہ سرٹیفکیٹ اور انعام خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے سالانہ اجتماع منعقدہ ۱۹۶۸ء کے اختتامی اجلاس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے دستِ مبارک سے وصول کیا۔ یوں ہی یاد آ گیا کہ میں یہ انعام وصول کرنے ننگے سر سٹیج پر پہنچ گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے جو مجھے ذاتی طور پر پہچانتے اور ہمیشہ بہت محبت سے پیش آتے تھے مسکرا کر مجھے شرفِ مصافحہ بخشا اور پھر پچتالیس روپے نقد پر مشتمل انعامی لفافہ عطا فرمایا۔ کسی اور نے تو مجھے میرے ننگے سر کا احساس نہ دلایا البتہ سٹیج پر بیٹھا ہوا ایک نامعلوم شخص مجھے بہ آوازِ بلند یہ مشورہ دیئے بنا نہ رہ سکا کہ مجھے اجتماع ختم ہوتے ہی اس انعامی رقم سے ایک ٹوپی ضرور خرید لینی چاہیے۔

مجھے سی ایس ایس کے امتحان کے لیے درخواست کے ساتھ تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل کا جاری کردہ کیریکٹر سرٹیفیکیٹ درکار تھا۔ اگرچہ میرے زمانہ طالب علمی میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ہمارے پرنسپل تھے لیکن وہ اس وقت تک تختِ خلافت پر متمکن ہو چکے تھے اور ان کی جگہ قاضی محمد اسلم نے لے لی تھی۔ میں نے ان سے درخواست کی تو انہوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود مجھے مایوس نہ کیا۔ انہوں نے اس سرٹیفیکیٹ میں دیگر باتوں کے علاوہ میری مضمون نویسی کے حوالے سے لکھا کہ "He writes with great care"

قاضی صاحب کے یہ ریمارکس میرے لیے یقیناً باعث صد افتخار ہیں۔

میں نے ۱۹۶۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ الحمدللہ میں نے سات سو میں سے چار سو اکانوے نمبر حاصل کر کے یونیورسٹی میں دسویں پوزیشن حاصل کی تھی۔ اب مجھے مزید تعلیم کے لیے لاہور جانا تھا لیکن اس راستے میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ اللہ نے فضل کیا اور جلد ہی وہاں داخلہ کے اسباب میسر آ گئے تاہم ان تفصیلات سے پہلے میں تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ کرام کی محبت اور شفقت کے کچھ واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ان اساتذہ کرام میں سرفہرست ہیں چوہدری محمد علی۔

مجھ میں جو کچھ ہے وہ سب اِن کے کمالات کا عکس

چوہدری محمد علی جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے تا دمِ تحریر بقیدِ حیات ہیں اور تحریکِ جدید انجمن احمدیہ میں وکیل التصنیف کی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے ہیں ہمیں فرسٹ ایئر میں منطق پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ بالکل غیر رسمی تھا۔ ممکن ہے وہ اس عرصے میں دو چار بار کلاس روم میں بھی آئے ہوں لیکن بالعموم وہ ہمیں اپنے گھر پر بلا لیا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ موصوف فضلِ عمر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے اور اس حوالے سے انہیں کالج کیمپس میں مکان ملا ہوا تھا۔ ہم ان کے ہاں پہنچتے تو وہ عموماً بنیان اور دھوتی میں ملبوس ہوتے۔ وہ اسی لباس میں چارپائی پر بیٹھ جاتے۔ ہم میں سے کچھ ان کے ساتھ چارپائی پر اور باقی سامنے پڑی کرسیوں اور موڑھوں پر بیٹھ کر ان کے گرد دائرہ سا بنا لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لہجے میں ایک خاص مٹھاس رکھی ہے اور واقعات کے بیان کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ وہ اپنے خوبصورت لہجے میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے اور باتوں ہی باتوں میں پڑھاتے بھی جاتے۔ بعض اوقات وہ ہمیں کچھ کھلا پلا بھی دیتے۔ یہ ان کی شفقت ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم شوق سے ان کے پیریڈ کا انتظار کرتے اور بغیر کسی اشد مجبوری کے اسے کبھی مِس نہ کرتے۔

ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ ہونے کے علاوہ وہ بیک وقت کالج کے ہائیکنگ کلب، کشتی رانی کلب اور باسکٹ بال کلب کے صدر بھی تھے۔ اس اعتبار سے ان کے فرائض بہت متنوع تھے لیکن وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کرتے۔

اللہ تعالیٰ چوہدری محمد علی کو جزائے خیر دے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجھے ''مقابلے کے امتحان'' میں بیٹھنے کی طرف توجہ دلائی۔ سچ پوچھیں تو اُس وقت تک مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ مقابلے کے امتحان سے مراد کیا ہے اور اس میں ''بیٹھنے'' سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اس کالج کے اُن اولڈ سٹوڈنٹس کا جو مختلف اعلیٰ سروسز میں چلے گئے تھے بہت محبت کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ دو اولڈ سٹوڈنٹس کا خاص طور پر حوالہ دیا کرتے جن میں سے ایک کنور ادریس تھے تو دوسرے رشید احمد چوہدری جو نامور انگریزی ادیب ہیزلٹ کی طرز نگارش کی پیروی کے سبب کالج میں رشید ہیزلٹ کے عرف سے پہچانے جاتے تھے۔ چوہدری صاحب بتایا کرتے تھے کہ اس امتحان میں کامیابی کے لیے انگریزی زبان پر دسترس بہت ضروری ہے اور اس صلاحیت کا اظہار نہ صرف اُمیدوار کی تحریر بلکہ اس کی بول چال سے بھی ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ کنور ادریس اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہوئے جب کہ رشید ہیزلٹ فارن سروس آف پاکستان میں آئے تھے۔

افسوس! چوہدری محمد علی کے ساتھ شاگردی کا باقاعدہ تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا جس کی وجہ سے بعد میں

ان کے ساتھ ملاقات کم ہوگئی۔ ہاں! وہ جہاں ملتے بالعموم مقابلے کے امتحان کی تیاری کی یاد دہانی کراتے رہتے۔ میں اب سوچتا ہوں کہ اگر میں بعد میں بھی ان کا باقاعدہ شاگرد رہتا تو ان کی مسلسل رہنمائی میری مزید کامیابیوں کی ضامن بن سکتی تھی۔

جب حکومتی پالیسی کے تحت ملک بھر کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے قومیا لئے گئے تو چوہدری محمد علی ایف سی کالج لاہور میں تبدیل کر دیئے گئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے تاہم وہ اس کے بعد بھی بہت فعّال زندگی گذار رہے ہیں اور انہوں نے جماعتی لٹریچر کی انگریزی زبان میں منتقلی کے سلسلے میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ انہیں بعض غیر ملکی سفروں میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کا شرف بھی حاصل ہو چکا ہے۔

وہ میرے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ابا جی کے دوستوں میں سے ہیں اور اس حوالے سے بھی مجھ پر شفقت فرماتے ہیں۔ غالباً ۱۹۶۷ء میں وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ساتھ دورۂ افریقہ سے واپس آئے ہی تھے کہ ان سے گول بازار میں مون لائٹ جنرل سٹور پر ملاقات ہوگئی۔ بہت محبت سے ملے اور دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ آبدیدہ ہو رہے ہیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ میرے چہرے میں ابا جی کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو تین چار سال پہلے اچانک فوت ہو گئے تھے۔

۱۹۸۲ء یا ۱۹۸۳ء میں جب میں پشاور میں تعینات تھا چوہدری محمد علی اپنے کسی کام سے وہاں آئے اور ازراہِ مہربانی مجھے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ان کا قیام تو کسی اور جگہ تھا لیکن میری دعوت پر وہ ایک سے زیادہ بار غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کی واپسی کا وقت آیا تو میں انہیں الوداع کہنے کے لیے پشاور کینٹ کے ریلوے سٹیشن پر گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ تیزابیت کے مریض ہیں اور ممکن ہے انہیں دورانِ سفر دودھ کی ضرورت پیش آ جائے لہٰذا میں ان سے اجازت لے کر دودھ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن پلیٹ فارم پر دودھ مل نہ سکا۔ مجبوراً میں سٹیشن سے باہر نکلا اور دودھ کے ایک دو پیکٹ لے کر واپس لوٹا لیکن اس عرصے میں ان کی ٹرین نکل چکی تھی۔ میرے علم میں تھا کہ یہ ٹرین کینٹ ریلوے سٹیشن سے چل کر پشاور سٹی ریلوے سٹیشن پر جا رُکتی ہے چنانچہ میں اپنی کار میں سٹی ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے ٹرین ابھی وہاں کھڑی تھی۔ خدا کا شکر ہے میں انہیں دودھ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ چوہدری صاحب نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں اور ربوہ پہنچ کر مجھے ایک خط لکھا جس میں بے حد ممنونیت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے میری تعریف میں بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کیئے تھے جن سے میرے بارے میں اِن کے بے پناہ حسنِ ظن کا اظہار ہو رہا تھا۔

چوہدری محمد علی انتہائی بے نفس اور نیک خُو انسان ہیں۔ مجھے یاد ہے رفیق محمد خان طاہر جو آج کل انڈس ڈویلپمنٹ کنسٹرکشن کمپنی لاہور میں ملازمت کر رہے ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی لئیق محمد خان ناصر، چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ (حال مقیم کینیڈا) ایف اے میں میرے کلاس فیلو اور فضلِ عمر ہوسٹل میں رہائش پذیر تھے۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ ایک بار چوہدری محمد علی ہوسٹل کے معمول کے راؤنڈ پر تھے۔ انہوں نے ان بھائیوں کو دیکھا

توجہ اس کی کہ وہ کسی وقت علیحدگی میں ان سے مل لیں۔ اگلے روز وہ ان کے دفتر میں گئے تو موصوف مصروف تھے چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو پھر کسی وقت آنے کو کہا۔ وہ چوہدری محمد علی کے پاس دوبارہ حاضر ہوئے تو انہوں نے بتایا: ''میں نے خواب میں لئیق کے چہرے پر غم واندوہ کے آثار دیکھے ہیں لہٰذا آپ دونوں کچھ صدقہ کردیں، میں بھی کردوں گا۔'' رفیق کہتے ہیں: ''اس وقت تو ہم چوہدری صاحب کی بات سمجھ نہ سکے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جب ہماری والدہ اچانک اللہ کو پیاری ہوگئیں تو ہمیں اندازہ ہوا کہ انہوں نے ہمارے بارے میں یقیناً منذر خواب دیکھا تھا لیکن احتیاطاً ہمیں پورا خواب سنانے کی بجائے انہوں نے صرف صدقہ دینے کے مشورے پر اکتفا کیا۔''

یہی رفیق بیان کرتے ہیں: ''چوہدری صاحب کی ایک خوبی جس سے میں بہت متاثر ہوں طلبہ کی تربیت سے تعلق رکھتی ہے۔ جب میں اور لئیق کالج میں داخلے کے لیے ربوہ آئے تو انہوں نے ابا جان سے وعدہ لیا کہ وہ ہمارے اخراجات کے لیے رقم ہمیں براہِ راست بھیجنے کی بجائے ان کی معرفت بھجوایا کریں گے۔ اُس وقت ہم ان کے اس فرمان کی حکمت نہ سمجھ سکے لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ اس پابندی نے ہمیں ضروری اور غیرضروری اخراجات میں تمیز سکھا دی۔ ہم چوہدری صاحب کے اس اطمینان کے بعد ہی مطلوبہ رقم حاصل کرسکتے تھے کہ ہماری ضرورت حقیقی ہے۔ چوہدری صاحب کے اس اقدام کا ثمر عمر بھر کھایا اور ہمیں فضول خرچی سے اجتناب کی عادت ہوگئی۔''

چوہدری محمد علی اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں اور مضطر عارفی تخلص فرماتے ہیں۔ ان کا کلام جا بجا منتشر تھا اور اس کے یکجا ہونے کی نوبت نہ آتی تھی جس کی سب سے بڑی وجہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے اپنے الفاظ میں چوہدری محمد علی کی ''طبعی عاجزی'' تھی۔ ۲۰۰۶ء میں بالآخر آپ اپنا کلام کتابی شکل میں چھپوانے پر راضی ہوگئے۔ مجلس انصار اللہ نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرلی، حضور نے خود اس کا نام ''اشکوں کے چراغ'' تجویز کیا اور اسی سال یہ کتاب چھپ کر منصۂ شہود پر آگئی۔

اس کتاب کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد میں چوہدری محمد علی سے ملنے ان کے دفتر گیا تو انہوں نے اپنا یہ مجموعہ اپنے دستخط سے مجھے مرحمت فرمایا۔ انہوں نے کس چاہت سے لکھا تھا:

نہایت ہی پیارے عزیزم محترم ومکرم محمد داؤد طاہر سلمہ اللہ تعالیٰ

کے لیے

دلی دعاؤں اور محبت کے ساتھ

خاکسار

محمد علی

8-1-07

کتاب عنایت کرنے کے بعد خود ہی فرمانے لگے کہ اس میں ان کا سارا کلام آگیا ہے ماسوا ایک نظم کے۔ میں نے پوچھا: وہ کیوں؟ ان کا جواب سننے کے بعد میں نے اصرار کیا کہ یہ نظم مجھے اپنے دستخط سے عنایت

فرمائیں۔ یہ ان کی محبت تھی کہ انہوں نے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور پانچ اشعار پر مشتمل ایک نظم کے نیچے اپنے دستخط کر کے مجھے دے دی۔ آپ ملاحظہ فرمانا چاہیں گے یہ نظم؟

ایک ماڑا ایک تگڑا چوک میں
کر رہے تھے رات جھگڑا چوک میں
تماشا دیکھنے کے واسطے
یہ جمع تھا ہر لولا لنگڑا چوک میں
کاٹ کھائی ماڑے نے تگڑے کی ٹانگ
تگڑے نے ماڑے کو رگڑا چوک میں
مل گئی ماڑے کی عزت خاک میں
ڈھے گیا تگڑے کا پگڑا چوک میں
فیصلہ پھر بھی نہ مضطر ہو سکا
کون ہے مدفون جبڑا چوک میں

ایک بار میں کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد چوہدری صاحب سے ملا۔ وہ ایک لمبی بیماری کے بعد ان ہی دنوں دفتر واپس آئے تھے مگر میری خوش نصیبی کہ انہوں نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا، مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بیٹھے بیٹھے مجھے گلے لگا لیا۔ وہ بار بار معذرت کر رہے تھے کہ اپنی صحت کی کمزوری کے سبب وہ اٹھ کر مجھے خوش آمدید نہیں کہہ سکے جب کہ میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ مجھے ایک بار پھر اس عظیم ہستی کی زیارت نصیب ہو رہی ہے جس نے ہمیشہ مجھے بہت محبت دی اور اپنی دعاؤں سے نوازا۔

مجھ سے پہلے ان کے پاس دفتر کے کوئی کارکن بیٹھے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے چوہدری صاحب سے اجازت طلب کی اور میں ان کی خالی کی ہوئی کرسی پر چوہدری صاحب کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے ان کی صحت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے برجستہ فرمایا: "I am alive although not kicking" جس کا مفہوم یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں زندگی تو دی ہے لیکن وہ کئی طرح کے عوارض کا شکار رہتے ہیں۔ پھر وہ اس حادثہ کا ذکر کرنے لگے جب وہ رات کے کسی پہر اپنے ہی گھر میں گر کر بیہوش ہو گئے تھے اور صبح ہونے پر ہسپتال پہنچائے گئے۔ اس چوٹ نے ان کے حافظے پر گہرا اثر کیا اور وہ اپنے ملنے جلنے والوں کو پہچاننے میں دقت محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا: ''میری ایک بہن غلام جنت ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود مجھے دیکھنے چلی آئیں۔ مجھے تو یاد نہیں لیکن ڈاکٹرز بتاتے ہیں کہ میں نے انہیں پہچان لیا تھا اور ''جنت دی گریٹ'' کہہ کر ان کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔''

اس روز چوہدری صاحب گفتگو کے موڈ میں تھے اور اپنی زندگی کے واقعات سناتے چلے جا رہے تھے۔ میں تقریباً دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھا ہوں گا لیکن ان کی گفتگو بلا تکان جاری تھی۔ اس عرصے میں ڈاکٹر محمد شفیق سہگل،

نائب وکیل التصنیف کوئی دفتری فائل چوہدری صاحب کے ملاحظہ کے لیے لائے تو انہوں نے اسے بہت بے دلی کے ساتھ دیکھا اور فرمانے لگے کہ وہ آج بالکل مختلف موڈ میں ہیں۔ وہ گفتگو کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا: کاش! اس وقت میرے پاس ٹیپ ریکارڈر ہوتا تو میں ان کا ایک ایک لفظ محفوظ کر لیتا۔ میں نے اسی پس منظر میں ان کے سامنے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں کسی وقت زیادہ دیر کے لیے ربوہ آؤں گا اور

وہ باتیں تیری وہ فسانے تیرے

سبھی کچھ محفوظ کرلوں گا۔ انہوں نے ازراہِ شفقت مجھ سے وعدہ کیا کہ میں جب چاہوں اپنی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے انہیں مستعد پاؤں گا چنانچہ میں نے ان سے تسلسل میں کئی ملاقاتیں کیں اور ان کی صحت اور مصروفیات کے مطابق کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اکتسابِ فیض کیا۔

ان ملاقاتوں کے دوران بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان کے سکول کی باتیں، موگا کالج کی کہانیاں، گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے قصے، ان کے قبول احمدیت کی داستان، تعلیم الاسلام کالج قادیان میں ملازمت کے واقعات، ہجرت کے مسائل، حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی نوازشوں، قاضی محمد اسلم کی شفقتوں، بعض غیر از جماعت دوستوں کی مہربانیوں، احمدی دوستوں کی کرم نوازیوں، غرض چوہدری صاحب نے بے شمار موضوعات پر لب کشائی کی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چوہدری صاحب اسی میٹھے اور دھیمے لہجے میں باتیں کرتے چلے جائیں اور میں سنتا جاؤں لیکن زندگی کے حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں۔ مجھے اسی روز لاہور واپس آنا ہوتا تھا اور اہل خانہ مجھے فون کر کے بار بار احساس دلا رہے ہوتے تھے کہ اگر دن کی روشنی میں گھر واپس پہنچنا ہے تو ہمیں جلد واپس روانہ ہو جانا چاہیے۔ چوہدری صاحب کو بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کالز کیوں آ رہی ہیں اور وہ معذرت خواہانہ انداز میں ''بس میں آپ کا تھوڑا سا وقت مزید لوں گا۔ آپ میری یہ بات ضرور سنتے جایئے'' کہہ کر اوراقِ ماضی پلٹتے جاتے تھے:

''ہم لوگ مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں، مسیتاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے میٹرک جے ایم ڈی بی ہائی سکول، زیرہ سے کیا جہاں مجھے سید رضا حیدر زیدی سے فارسی پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ عقیدۂ شیعہ تھے اور فارسی پر خاصی گرفت رکھتے تھے۔ اتفاق سے انٹرمیڈیٹ میں بھی ہمارے فارسی کے استاد ایک شیعہ ہی تھے جن کا نام عبدالطیف انصاری تھا۔ رضا حیدر زیدی طبعاً بہت شریف انسان تھے لیکن انصاری صاحب کی طبیعت اس کے بالکل برعکس تھی۔ ایک بار جب میں ایم اے کرنے کے بعد قادیان منتقل ہوا تو انصاری صاحب مخالفین کے کسی جلسہ کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ مجھے علم ہوا تو میں بھی جلسہ گاہ کے قریب جا پہنچا۔ اس وقت ان کی تقریر جاری تھی اور وہ بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ، خلفائے احمدیت اور خاندانِ حضرت مسیح موعود کی خواتین کے متعلق انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ مجھے انصاری صاحب کے خاندانی پس منظر سے آگاہی حاصل تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ کس لاأبالی طبیعت کے مالک ہیں لیکن سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ جماعت کی مخالفت میں اتنا آگے جا سکتے ہیں۔ میں افضل برادرز کی دکان پر بیٹھا بڑے بوجھل دل کے ساتھ انصاری صاحب کی مغلظات کن رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے کاغذ کا ایک پرزہ لیا اور اس پر لکھا: میں بہت شرمندگی کے

ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ میرے خیال میں آپ جس ناشائستہ زبان میں تقریر کر رہے ہیں وہ کسی شریف آدمی کو زیب نہیں دیتی۔ میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ اپنی تقریر فوراً بند کر دیں ورنہ میں آپ کا شجرہ نسب مشتہر کردوں گا۔ انصاری صاحب اپنے شجرہ نسب سے بخوبی واقف تھے اس لیے میری یہ دھمکی اپنا کام کر گئی۔ انہوں نے فوراً موضوع بدل دیا اور پھر جلد ہی سٹیج چھوڑ کر چلے گئے۔''

چوہدری صاحب نے گورنمنٹ کالج، لدھیانہ کے زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا: ''ہمارے پرنسپل اے سی سی ہاروے نامی ایک انگریز تھے، ڈسپلن کے بہت سخت۔ وہ تمام انتظامی امور خود نمٹایا کرتے تھے البتہ انہوں نے مشورہ کے لیے ایک سٹوڈنٹس ریپریزنٹیٹو کمیٹی (ایس آر سی) بنا رکھی تھی۔ میں ہوسٹل پریفیکٹ اور کالج یونین کا وائس پریذیڈنٹ ہونے کے علاوہ اس کمیٹی کا بھی سیکرٹری تھا۔ اسی دور کی بات ہے۔ کالج کے ایک پروفیسر، کے ایس تھاپر جو کیمرج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے شراب پی کر کلاس روم میں آ گئے۔ پرنسپل کو کسی طرح اس بات کی خبر ہوگئی چنانچہ انہوں نے فوری طور پر ایس آر سی کی میٹنگ طلب کر لی۔ فیصلہ ہوا کہ تھاپر صاحب کو بلا کر جواب طلبی کی جائے چنانچہ جب وہ پیش ہوئے تو انہیں چارج شیٹ سنائی گئی۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہے اور پھر بڑے وقار کے ساتھ کہنے لگے: "Yes, I took a drop too much." چوہدری صاحب یہ واقعہ سناتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے: ''اتنے پڑھے لکھے انسان نے جب خود ہی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تو انتظامیہ کے پاس تادیبی کارروائی کی گنجائش کہاں رہ جاتی تھی چنانچہ سب نے نظریں جھکا لیں۔ پرنسپل کو بھی احساس ہوا کہ تھاپر صاحب کو اپنی غلطی کی سزا مل چکی ہے چنانچہ ان کے خلاف مزید کارروائی کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔''

تھاپر صاحب کے حوالے سے چوہدری صاحب کی گفتگو جاری تھی: ''بی اے کے سالانہ امتحان میں میرا پہلا پرچہ انگریزی کا تھا۔ میں بدقسمتی سے کمرۂ امتحان میں قدرے تاخیر سے پہنچا۔ اُس وقت تک امتحانی کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری کاپی پر کسی اور طالب علم نے اپنا رول نمبر لکھ رکھا ہے اور یہ سیاہی سے لتھڑی پڑی ہے۔ میں اس کاپی پر اپنا پرچہ کیوں کر حل کر سکتا تھا چنانچہ میں نے مطالبہ کیا کہ اسے تبدیل کیا جائے۔ اس امتحان کے لیے لاہور کے کوئی پروفیسر سپرنٹنڈنٹ بن کر آئے ہوئے تھے اور تھاپر صاحب ان کے ڈپٹی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ مجھے کھڑا دیکھ کر تھاپر صاحب قریب آئے اور میری بات سن کر فرمانے لگے: "I am sorry, you can't change it" جب وہ اپنے اس فیصلے کی کوئی معقول وجہ نہ بیان کر سکے تو میں نے گذارش کی کہ .If you can't change it, I will not take the exam جب ارد گرد بیٹھے ہوئے طلبہ کو اندازہ ہوا کہ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو ان میں سے بعض میری حمایت میں اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے جس پر سپرنٹنڈنٹ سٹیج سے اُتر کر خود میرے پاس آ گئے۔ بحث تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ مجھے نئی کاپی فراہم تو کر دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ سیاہی سے لتھڑی ہوئی کاپی منسلک کر کے پورا واقعہ یونیورسٹی کو لکھ بھیجا جائے گا۔ اس جھگڑے میں میرا بہت سا وقت ضائع ہو گیا۔ میں غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن کر کچھ نہ سکتا تھا چنانچہ قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ امتحان نہیں دوں گا۔

یہی وجہ تھی کہ میں ہاف ٹائم ختم ہونے کے اعلان کے ساتھ ہی پرچہ امتحانی سٹاف کے حوالے کر کے کمرہ امتحان سے باہر آ گیا۔''

''اُس وقت ہاروے صاحب شہر سے باہر گئے ہوئے تھے'' چوہدری صاحب نے بتایا ''وہ شام کو واپس آئے اور انہیں اس واقعہ کی خبر ملی تو مجھے اپنے پاس طلب کرنے کی بجائے خود میرے کمرے میں تشریف لے آئے۔ اس زمانے میں ہوسٹل پریفیکٹ کا کمرہ بہت پُر آسائش ہوتا تھا۔ وہ آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور مجھ سے پورا واقعہ سُنا۔ انہوں نے حکما کہا کہ مجھے امتحان چھوڑنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے، رہے تھاپر صاحب تو وہ خود انہیں سمجھا دیں گے۔ میرے کانوں میں اب بھی ان کے الفاظ گونج رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے:
"You must continue. I will inform Thopper that if he does the same again, he will be transferred." میں نے امتحان تو دے دیا لیکن میری انگریزی میں آنرز اور ایم اے کرنے کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ شاید قدرت نے میرے لیے یہی مقدر کر رکھا تھا۔''

''اس کے بعد آپ کا تھاپر صاحب سے آمنا سامنا نہیں ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہوا۔ وہ بھی عجیب کہانی ہے۔ میں اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں تھا اور اپنے کسی کام سے انارکلی سے گذر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی آدمی میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے اور جب میں آہستہ ہوتا ہوں تو وہ بھی آہستہ چلنے لگتا ہے اور جب میں تیز چلنے لگتا ہوں تو وہ بھی تیز قدم ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں اس نے مجھے آ لیا۔ وہ تھاپر صاحب تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور پوچھنے لگے "Are you still angry with me?" داؤد صاحب! کچھ نہ پوچھیں اس وقت میرا کیا حال ہوا۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور میں نے کہا: "No, Sir. I can't even think of it. You have always been very kind to me." میں نے دیکھا تھاپر صاحب بھی جذباتی ہو رہے تھے۔''

چوہدری محمد علی نے ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور یہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں احمدیت کی نعمت سے متمتع ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ وہ بتاتے ہیں: ''اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ انگریزی میں آنرز کرنے کی خواہش پوری نہ ہوسکی تو میں فلاسفی کی طرف آ گیا۔ جب میں ایم اے میں داخلے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور پہنچا تو قاضی محمد اسلم اس شعبہ کے سربراہ تھے۔ قاضی صاحب بادیٔ النظر میں تو اس دور کے باقی اساتذہ کی طرح بڑے سمارٹ اور خوش لباس تھے لیکن ان میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جو انہیں باقی اساتذہ سے ممتاز کرتی تھی۔ میں احمدیت سے متاثر تو پہلے ہی تھا اور ایک بار قادیان بھی جا چکا تھا لیکن اس وقت تک میں حلقہ بگوشِ احمدیت نہ ہوا تھا۔ مجھے قاضی صاحب میں ایک مثالی استاد بلکہ مثالی انسان کی جھلک تو پہلے ہی نظر آتی تھی چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ احمدی ہیں تو میں شعوری طور پر ان کے زیادہ قریب ہو گیا اور میں نے ۱۹۳۹ء کے جلسہ سالانہ پر باقاعدہ طور پر احمدیت قبول کر لی۔''

''قاضی صاحب کے بارے میں کوئی اور قابلِ ذکر بات؟'' میں نے چوہدری صاحب کو کریدا۔

’’جن دنوں میں طالب علم تھا فرائڈ اور اس کے نظریات کا بڑا چرچا تھا اور میں کسی حد تک ان سے متاثر بھی تھا۔ میں نے ایم اے کے اپنے تھیس کے لیے "Sex in Islam" کا موضوع چنا۔ جب یہ موضوع حتمی منظوری کے لیے قاضی صاحب کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے سے روک دیا بلکہ لائبریرین کو بلا کر مجھے اس حوالے سے کوئی کتاب جاری کرنے سے بھی منع فرما دیا۔ اگرچہ اس وقت مجھے قاضی صاحب کی یہ بات پسند نہیں آئی تاہم بعد میں احساس ہوا کہ ان کا یہ فیصلہ درست تھا چنانچہ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق نئے موضوع پر کام شروع کر دیا۔‘‘

’’اُس زمانے کی کوئی اور دلچسپ یاد؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا تو جی ڈی سوندھی پرنسپل تھے‘‘ چوہدری صاحب نے جواباً بتایا’’ نہ جانے کیوں وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ ہوسٹل میں مقیم طلبہ شلغم بطور سلاد بکثرت استعمال کیا کریں جب کہ اکثر لڑکے شلغم پسند نہ کرتے تھے۔ میں ان لڑکوں میں سے تھا جو اس فیصلے کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور یہ بات کسی طرح سوندھی صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ اسی زمانے میں ایک اور بات یہ ہوئی کہ New Hostel Bell جسے کھانے اور سونے جاگنے کے اوقات میں بجایا جاتا تھا چوری ہو گئی۔ اس سے پہلے میں نے اس گھنٹی کے’’ خلاف‘‘ کالج کے مجلّہ ’’راوی‘‘ میں انگریزی میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "The New Hostel Bell" میں نے اپنے مضمون میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش کوئی یہ گھنٹی چُرا کر ہی لے جائے۔ اگرچہ میرا اس واقعہ سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا لیکن جب یہ گھنٹی چوری ہو گئی تو ہر کوئی مجھے موردِ الزام ٹھہرانے لگا۔ تیسری بات جو اُن ہی دنوں ہوئی کچھ اس طرح تھی: ہوسٹل میں مقیم طلبہ کو مہینے میں دو دن فلم دیکھنے کی اجازت تھی۔ اُس روز وہ رات دیر تک باہر رہ سکتے تھے۔ بعض لڑکے دو دنوں کی اس رخصت کو ناکافی سمجھتے تھے اور دبی زبان سے اس میں اضافے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ایک بار ہمارے سپرنٹنڈنٹ کتفالیہ صاحب کھڑے تھے اور ہوسٹل کے کچھ لڑکے جن میں مَیں بھی شامل تھا ان کے پاس ہجوم کیے ہوئے تھے۔ موضوع زیرِ بحث یہی تھا۔ اتفاقاً ایک طالب علم نے ان سے پوچھ لیا کہ وہ خود مہینے میں کتنی بار فلم دیکھتے ہیں۔ انہوں نے جواباً کہا: ’’بہت کم۔ مہینہ میں ایک آدھ بار اور وہ بھی جب میرے ہاں کوئی مہمان آیا ہوا ہو۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ آپ کے پاس اتنے کم مہمان آتے ہیں!۔ کتفالیہ صاحب نے اس بات کا بُرا منایا اور سوندھی صاحب کو میری شکایت کر دی جس پر انہوں نے مجھے طلب کر لیا۔

چونکہ یہ سب باتیں میرے علم میں تھیں لہٰذا میں ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھے کالج سے خارج ہی نہ کر دیا جائے۔ خیر جب میں ان کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا "Are you the same person who has written article on New Hostel Bell?" میں نے عرض کی Yes. I had the honor to write this article. پھر انہوں نے پوچھا "Are you the same person who said that the number of guests received by Katfalia was very few?" میں نے اثبات میں جواب

دیا۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا "Are you the same person who says that the students should not take turnip?" میں نے اس بات کا بھی اعتراف کر لیا۔

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اب کالج سے میرے اخراج کا فیصلہ محض لمحوں کی بات ہے لیکن دیکھیں سوندھی صاحب کتنے عظیم انسان تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ سوچا، خود مجھے کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا اور اپنے دفتر سے باہر لے آئے جہاں بہت سے طلبہ ان سے ملاقات کے لیے ایک لائن میں انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کچھ کہے سُنے بغیر مجھے گرمجوشی سے رخصت کیا۔ مطلب صاف ظاہر تھا۔ انہوں نے میری تمام کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔''

چوہدری محمد علی تعلیم الاسلام کالج کے ابتدائی اساتذہ میں سے ہیں اور اس لحاظ سے وہ کالج کی تاریخ سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ بتاتے ہیں'' قادیان میں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو مجھے سوئمنگ پُول کا انچارج بنایا گیا۔ میں نے لڑکوں کو ساتھ لگا کر پُول کی بہت اچھی طرح صفائی کرائی اور اس میں تازہ پانی بھرا۔ ہم نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی سے درخواست کی کہ وہ اس میں غسل کر کے پُول کا افتتاح فرمائیں لیکن جب کئی دنوں تک اس کا جواب موصول نہ ہوا تو میں نے صورتِ حال جاننے کے لیے دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں فون کیا۔ ٹیلیفون غیر متوقع طور پر حضور نے خود اٹھا لیا۔ سچ پوچھیں تو میں گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ میں ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ خیر میں نے ہمت کر کے اسے اٹھایا تو حضور نے ہولڈ کیا ہوا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں حضور کے سامنے اپنی درخواست دہرائی تو آپ نے جواباً فرمایا: ''آپ کا خط مل گیا تھا لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ سوئمنگ پُول کا افتتاح تو بہت پہلے ہو چکا ہے، کیا اس کے دوبارہ افتتاح کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کی کہ ہم نے اس پُول کو بہت اچھے طریقے سے صاف کیا ہے اور اس میں نئے سرے سے پانی بھرا ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس میں غسل کر کے اس کا افتتاح فرمائیں۔ اس پر حضور نے فرمایا: میں تو نقرس کا مریض ہوں اور میرے لیے تالاب میں نہانا ممکن نہیں لہٰذا آپ دوبارہ افتتاح کے بغیر ہی اس کا استعمال شروع کر دیں۔ یوں یہ پُول لڑکوں کے استعمال میں آنے لگا۔''

ہجرت کے بعد لاہور میں تعلیم الاسلام کالج کے قیام کے حوالے سے چوہدری محمد علی نے اپنی ایک گفتگو میں بتایا: ''جب میں قادیان سے رخصت ہو رہا تھا تو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے ارشاد فرمایا کہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کو آپ کا یہ پیغام پہنچا دوں کہ لاہور میں تعلیم الاسلام کالج کے قیام کے حوالے سے جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ میرے لاہور پہنچتے ہی کالج کمیٹی کی میٹنگ آ گئی۔ اس کمیٹی کے سربراہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد اور اراکین مولانا عبدالرحیم درد اور ملک غلام فرید تھے۔ حضور اس میٹنگ کی صدارت فرما رہے تھے اور فیصلہ یہ کیا جانا مقصود تھا کہ کالج کہاں اور کب شروع کیا جائے۔ چونکہ میں اس میٹنگ میں ایک طرح سے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی نمائندگی کر رہا تھا لہٰذا میں نے حضور تک آپ کا یہ پیغام پہنچا دیا کہ کالج کا فوری طور پر آغاز قرینِ مصلحت نہ ہوگا۔ اس پر حضور نے باری باری دونوں اراکین کمیٹی سے رائے طلب

کی۔ انہوں نے بھی کالج کے قیام کو مؤخر کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر حضور نے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ''رائے تو میری بھی یہی ہے۔'' اس پر حضور جلال میں آ گئے اور آپ نے قدرے اونچی آواز میں فرمایا: ''ہم اپنے نوجوانوں کے ساتھ ظلم نہیں کر سکتے۔ کالج شروع ہوگا، آج ہی سے اور ابھی۔''

حضور کے اس ارشاد کے بعد کالج کمیٹی کے لیے چوں و چرا کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی چنانچہ میٹنگ برخواست ہوتے ہی ہم نے لوہے کے ایک ٹوٹے پھوٹے بورڈ کا انتظام کیا اور اس پر ایک پینٹر سے جلی حروف میں ''تعلیم الاسلام کالج لاہور'' کے الفاظ لکھوائے۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ کالج قائم کہاں ہو؟ اس وقت بلڈنگ میں بہت سے خاندان مقیم تھے۔ ہم نے گراؤنڈ فلور پر بمشکل ایک کمرہ خالی کرایا، وہاں ایک میز کرسی رکھی اور جنید ہاشمی کو اس پر بٹھا دیا۔ اس کمرے کے باہر تعلیم الاسلام کالج لاہور کا بورڈ لگا دیا گیا۔ یہ تھا لاہور میں اس کالج کا پہلا دن۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اختلافِ عقائد کے باوجود مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ غیر مبائعین سے ساتھ عزت اور محبت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت مولوی صاحب اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ ڈلہوزی میں مقیم تھے۔ حضور نے ان کی پاکستان بحفاظت منتقلی کا انتظام فرمایا۔ چوہدری صاحب بتاتے ہیں: ''ایک بار جب میں رتن باغ کی طرف جا رہا تھا میں نے دُور سے ایک شخص کو وہاں سے نکلتے دیکھا۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ یہ مولوی محمد علی ہیں تاہم ان کے جماعت کے ساتھ اختلافات کے پیشِ نظر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں رتن باغ پہنچا تو حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا کچھ دیر پہلے مولوی محمد علی یہاں آئے ہوئے تھے۔ آپ نے تصدیق کی کہ وہ اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی پاکستان منتقلی کے حوالے سے حضرت صاحب کے تعاون پر آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آئے تھے۔''

چوہدری صاحب ایک طویل عرصہ تک تعلیم الاسلام کالج کی روئنگ ٹیم کے انچارج رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا: ''۱۹۵۳ء والے مارشل لا کا زمانہ تھا۔ جنرل اعظم نے وائی ایم سی اے ہال میں ایک میٹنگ طلب کی جس میں لاہور کے تمام کالجوں کے پرنسپل شامل تھے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں بہت سے دیگر امور کے علاوہ روئنگ کے حوالے سے بھی باتیں شروع ہوگئیں۔ اُن دنوں ریلوے والوں کا ایک گرلز روئنگ کلب تھا۔ اس کی طرف سے شکایت کی گئی کہ مردانہ کالجوں کے طلبہ ان کی کھلاڑیوں کو چھیڑتے ہیں جس کی وجہ سے وہ پوری دلجمعی کے ساتھ روئنگ نہیں کر سکتیں۔ اس پر جنرل اعظم نے کہا کہ یہ تو صریح غنڈہ گردی ہے جسے ہمیں ہر صورت میں روکنا ہے چنانچہ باہمی مشورے سے ایک ریزولیوشن پاس ہوا جس میں طے پایا کہ آئندہ کسی کھلاڑی کے خلاف ایسی کوئی شکایت موصول ہوئی تو اسے سزا دینے کی بجائے اس کالج کے پرنسپل کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ جب ریزولیوشن پاس ہو چکا تو ریلوے کی نمائندہ کھڑی ہوگئیں اور انہوں نے کہا یوں تو اب فیصلہ ہو چکا ہے لیکن اگر اس ریزولیوشن میں ایک ترمیم کر دی جائے تو بہت مناسب ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انہیں تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ سے کوئی شکایت نہیں ہے کیوں کہ اس

پرنسپل خود موقع پر موجود رہ کر اپنے کھلاڑیوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں لہٰذا اس ریزولیوشن میں تعلیم الاسلام کالج کو استثنا دے دیا جائے۔"

موصوف ایک لمبا عرصہ فضلِ عمر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔ وہ بتاتے ہیں: "ہم مَیس کے لیے کھانے پینے کا جملہ سامان خوب چھان پھٹک کر خریدتے تھے جس کی وجہ سے ہوسٹل کا کھانا نہ صرف اچھا بلکہ دیگر کالجوں کے ہوسٹلوں سے سستا بھی ہوتا۔ زمانۂ لاہور میں جب یہ خبر پھیلی تو گورنمنٹ کالج کے بعض طلبہ جو ہمارے کچھ بورڈرز کے دوست تھے ہمارے یہاں آ کر کھانا کھانے لگے۔ جب وہ واپس جا کر اپنے ساتھیوں کے سامنے ہمارے کھانے کی کوالٹی اور ارزانی کی تعریف کرتے تو ان کے دل میں اپنی انتظامیہ کے خلاف شکایت پیدا ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ بات ان کے پرنسپل، پروفیسر سراج تک جا پہنچی۔ انہوں نے پیغام بھیجا کہ وہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ پروفیسر سراج کے شاگرد رہے تھے چنانچہ آپ نے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ ملاقات ہوئی تو دیگر باتوں کے علاوہ پروفیسر سراج نے شکوۂ یہ بات بھی کہی جس کے بعد ہمارے ہوسٹل کی طرف سے بیرونی کالجوں کے طلبہ کے کھانے پر پابندی لگا دی گئی۔ میرا قیاس ہے کہ گورنمنٹ کالج کے لڑکوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے پروفیسر سراج کو جتلایا کہ انہیں صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی جس کے نتیجے میں ان کے مَیس کے دروازے ہم پر بند کر دیئے گئے ہیں۔ میری اپنی رائے ہے کہ پروفیسر سراج اپنے طلبہ کا دباؤ برداشت نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے پھر حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو پیغام بھجوایا کہ ممکن ہو تو وہ یہ پابندی ختم کر دیں۔ اس پر آپ نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ ہوسٹل ہے، ہوٹل نہیں کہ جس کا جی چاہے بل ادا کر کے روٹی کھاتا رہے اور یہ پابندی عمومی طور پر برقرار رہی۔"

"بطور ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ بعض دفعہ ہمیں عجیب وغریب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا" چوہدری صاحب کی گفتگو جاری تھی "ایک زمانے میں ہم اگلی دوپہر کے لیے سالن رات کے وقت ہی پکا لیا کرتے تھے۔ ایک بار محسوس کیا گیا کہ رات کے وقت کسی نے کچھ سالن نکال لیا ہے لیکن اس بات پر زیادہ دھیان نہ دیا گیا تاہم جب یہی شکایت روز روز ہونے لگی تو ہم نے اپنے لڑکوں کی ایک خصوصی ٹیم تیار کی۔ یہ لڑکے عشاء کی نماز کے بعد طلبہ کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے لگے۔ جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ اس شرارت میں کون کون سے طلبہ ملوث ہیں۔ وہ کچن میں سے سالن چُرا کر اپنے کمرے میں لے جاتے اور حسب ضرورت رات کے کسی پہر اس سے لطف اندوز ہوتے۔ ایک رات جب وہ لڑکے سالن اپنے کمرے میں لے جا چکے تھے میں نے انہیں جا لیا۔ انہوں نے اپنی طرف سے سالن کی پلیٹیں چارپائی کے نیچے چھپا رکھی تھیں لیکن حسنِ اتفاق سے کمرے میں داخل ہوتے ہی میری ان پر نظر پڑ گئی۔ میں چاہتا تو جاتے ہی جتلا سکتا تھا کہ میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں حتّٰی کہ نصف شب بیت گئی۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا لہٰذا ان کو شک پڑ گیا کہ ان کی یہ حرکت انتظامیہ کے نوٹس میں آ چکی ہے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس

ہو جائے لہٰذا میں ان سے اس موضوع پر کوئی بات کئے بغیر واپس آگیا۔ ان سے مخالف ... آپ ... چا...
سالن چوروں سے کوئی باز پرس نہیں کی تو ان کی طرف سے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو ... شکایت ...
چوروں سے ملا ہوا ہوں۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے مجھ سے اس شکایت کا ذکر کیا تو میں نے سارا معاملہ ان کے
گوش گذار کر دیا اور بتا دیا کہ ان لڑکوں نے کسی ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر ہی کھانے کی چوری بند کر دی ہے لہٰذا میں ان
کی جواب طلبی یا ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے میری
اپروچ سے اتفاق کیا اور یوں یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔''

چوہدری محمد علی نے تعلیم الاسلام کالج لاہور کی یادیں دہراتے ہوئے بتایا: ''ایک دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کالج کے منتخب ہونہار طلبہ کو مقابلے کے امتحان کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جن طلبہ کا انتخاب کیا گیا ان میں کنور ادریس بھی شامل تھے جو سائنس پڑھ رہے تھے۔ ہم نے اس امتحان کی ضروریات کے مطابق انہیں سائنس چھوڑنے پر آمادہ کرلیا۔ ان کے والد کو خبر ہوئی تو وہ سخت ناراض ہوئے اور مجھ سے لڑنے کے لیے آ گئے۔ انہوں نے کالج کے مین گیٹ پر مجھے آ لیا۔ وہ انتظامیہ کے اس فیصلے پر سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر واپس تشریف لے گئے تو میں نے پورا واقعہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے گوش گذار کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ چونکہ ہم نے ان طلبہ کا انتخاب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ہدایت کے پیش نظر کیا ہے لہٰذا اس احتجاج کے باوجود ہم کنور ادریس کو سائنس پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم نے ان طلبہ پر خاص توجہ دی اور کالج سٹاف کے علاوہ بعض دیگر قابل اساتذہ بھی ان کی کوچنگ کرتے رہے۔ ہم ان کی انگریزی بہتر بنانے کے لیے ان سے انگریزی اخبارات کے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھوایا کرتے تھے اور کچھ عرصہ تو ہم نے کہہ سن کر کنور ادریس کو سِول اینڈ ملٹری گزٹ کے سٹاف پر بھی رکھوا دیا تھا۔ میں جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جب اس امتحان کا نتیجہ آیا اور کنور ادریس سِول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہو گئے تو ان کے والد ایک بار پھر میرے پاس آئے اور یہ بات تسلیم کی کہ کنور ادریس کے مضامین کی تبدیلی کے لیے کالج انتظامیہ کا فیصلہ ہر لحاظ سے درست تھا۔ پھر وہ اصرار کے ساتھ مجھے عین اس جگہ پر لے گئے جہاں انہوں نے اس فیصلے پر اپنی ناراضی کا اظہار کیا تھا اور اپنے اس عمل پر اظہارِ ندامت کیا۔''

چوہدری صاحب بتاتے ہیں: ''تعلیم الاسلام کالج میں ملازمت ایک تنے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف تھی۔ لوگ چھوٹی چھوٹی باتیں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کو شکایت کی صورت میں پہنچاتے رہتے تھے اور جب ایسی کوئی بات حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے علم میں آتی تو وہ کہا کرتے: چوہدری صاحب! مصلّٰے پکڑلو اور میں سمجھ جاتا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

لاہور ہی کے زمانے کی بات ہے ایک شام ہم ٹینس کھیل رہے تھے۔ کچھ طلبہ دُور کھڑے تھے۔ ان میں سے دو طالب علم نہ جانے کس بات پر آپس میں اُلجھ پڑے اور ایک نے دوسرے کو چت کر دیا۔ اسی دھینگا مُشتی میں نیچے دبے ہوئے لڑکے کی ٹانگیں قبلہ رُخ ہو گئیں جس پر اس نے شور مچا دیا کہ دوسرے لڑکے نے جان بوجھ کر

اس کی باتیں قبلہ رُخ کر دی ہیں۔ جب بات زیادہ بڑھی تو ہم ٹینس چھوڑ کر اُدھر متوجہ ہوئے۔

اتفاق سے اس لڑکے کے والد بھی اپنے کسی کام سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے بچے کی تضحیک برداشت نہ کر سکے اور خفگی کا اظہار کرنے لگے کہ میں نے ان لڑکوں کو چھڑایا کیوں نہیں تھا۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ چھوٹے میاں سو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ۔ دو چار دن گذرے تھے کہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے کاریڈور میں سے گذرتے ہوئے مجھے کہا: چوہدری صاحب! مصلےٰ پکڑ لو۔ میں سمجھ گیا کہ کیا بات ہے اور دل ہی دل میں اپنی بریّت کے لیے دعا مانگنے لگا۔ چند روز بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے ملاقات ہوئی تو آپ نے میری بہت دلداری فرمائی اور اس شکایت کے حوالے سے کہا: آپ فکر نہ کریں۔ شکایت کرنا اُن کی عادت ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ بات کچھ بھی نہیں۔

ایسی ہی صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے منشا سے کالج کے بعض طلبہ کو مقابلے کے امتحانات کی تیاری کے لیے چُنا گیا۔ کنور ادریس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس گروپ میں بعض دیگر طلبہ کے علاوہ غلطی سے ایک ایسے طالب علم کو بھی شامل کر لیا گیا جو واقفِ زندگی تھا۔ کسی واقفِ حال نے حضور کے پاس شکایت کر دی کہ میں واقفین زندگی کو اپنا عہد توڑنے پر ورغلا رہا ہوں۔ اس پر سخت ناراض ہوئے اور آپ نے تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا لیکن چونکہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کوئی اقدام نہیں کیا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے میری بریّت کے سامان پیدا فرما دیئے۔"

جب بات حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی ہو تو چوہدری صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور آواز میں کھنک پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بہت سے ایسے دلچسپ واقعات سنانے لگتے ہیں جو آپ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

چوہدری صاحب بتاتے ہیں: "حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے اور ڈاکٹر مرزا منور احمد کے بیٹے، مرزا مبشر احمد کو میٹرک میں خاطر خواہ نمبر نہ ہونے کی وجہ سے ایف ایس سی (پری میڈیکل) میں اس شرط پر داخلہ دیا تھا کہ وہ فرسٹ ائیر میں دو سال لگائیں گے۔ انہوں نے فرسٹ ائیر کا امتحان کسی بیرونی مدد کے بغیر اچھے نمبروں پر پاس کر لیا جس پر انہیں سیکنڈ ائیر میں پروموٹ کر دیا گیا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو پتا چلا تو وہ سخت ناراض ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مبشر کو کسی صورت میں ایک سال کے بعد پروموٹ نہیں کریں کیوں کہ ان کا داخلہ فرسٹ ائیر میں دو سال لگانے کی شرط سے مشروط تھا جسے انہوں نے برضا و رغبت قبول کیا تھا۔ مرزا مبشر احمد کے میڈیکل کالج میں داخلے کے بعد مرزا منور احمد مجھے ملے تو فرمانے لگے: بھائی (جی ہاں! وہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کا ذکر "بھائی" کے طور پر کیا کرتے تھے) ٹھیک ہی تھے۔ فرسٹ ائیر میں دو سال لگانے سے مبشر کی بنیاد مضبوط ہو گئی ہے۔"

اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے کہا: "ہماری جماعت کے ایک ریٹائرڈ کرنل کا ایک بیٹا جس نے میٹرک میں سائنس نہ پڑھی تھی ایف ایس سی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اس

شرط پر ایف ایس سی میں داخل کرلیا کہ وہ ایک سال کے اندر اندر میٹرک کا ریاضی کا امتحان پاس کرے گا۔ ن
نے پرنسپل کو شکایت کر دی کہ اس لڑکے سے یہ رعایت برتی گئی ہے۔ انہوں نے میری جواب طلبی کی تو میں نے
سارے حقائق ان کے سامنے رکھ دیئے اور یقین دلایا کہ یہ بچہ ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا۔ انہوں نے
طوعاً و کرہاً میری رائے سے اتفاق کر لیا۔ میں نے بعد میں کرنل صاحب کو بلایا اور ساری بات انہیں بتائی۔ تب
انہوں نے کہا: ''آپ فکر نہ کریں، سر! میرے بیٹے نے بلوچ ماں کا دودھ پیا ہوا ہے۔ اس نے جو وعدہ کیا ہے وہ
ان شاء اللہ ضرور پورا کرے گا'' اور اس نے اپنا وعدہ واقعی پورا کر دکھایا۔ بچے نے نہ صرف ایف ایس سی کا امتحان
اچھے نمبروں پر پاس کرلیا بلکہ میری معلومات کے مطابق ایم ایس سی تک تعلیم حاصل کی۔''

۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے بات شروع ہوئی تو چوہدری صاحب نے بتایا: ''اس جنگ کے دوران دشمن کے طیارے ربوہ کی فضا سے گذر کر سرگودھا کی طرف جاتے تھے۔ سنتے تھے کہ ایک بار واپس جاتے ہوئے کسی طیارے نے ربوہ کے نواح میں اپنی پٹرول کی ٹنکی گرا دی ہے اور ایک بار قریب ہی کسی جگہ سٹریفنگ ہوئی یعنی جہاز کے ذریعہ مشین گن سے گولیاں برسائی گئیں۔ میری اور حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی دیوار سانجھی تھی۔ جب کوئی جہاز گذرتا آپ مجھے ضرور آواز دیتے اور بعض دفعہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ آتے جاتے جہازوں کو دیکھا کرتے۔ ان ہی دنوں آپ نے مجھے ہدایت کی کہ میں کالج کے کچھ دلیر طلبہ کا انتخاب کروں اور انہیں ہتھیاروں کے استعمال کی بنیادی تربیت دینے کے بعد کالج اور قصرِ خلافت میں ڈیوٹی کے لیے تیار کروں۔ مجھے یاد ہے ہم نے کچھ طلبہ کو اس مقصد کے لیے تیار کیا اور محمد احمد حیدر آبادی ڈی پی ای کے ذریعہ ان کی ضروری ٹریننگ کرائی۔ یہ طلبہ جنگ کے دنوں میں اور جنگ کے کچھ عرصہ بعد تک مندرجہ بالا دونوں مقامات پر ڈیوٹی دیتے رہے۔''

چوہدری صاحب حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے کس درجہ عقیدت رکھتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو مجھے فضل عمر ہوسٹل کے ایک بورڈر نے سنایا: ایک بار میس کمیٹی نے ایک نئی ڈش مینو میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تاہم چوہدری صاحب نے یہ فیصلہ رد کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ یہ ڈش بیگم صاحبہ (یعنی بیگم صاحبزادہ مرزا ناصر احمد) کو پسند نہیں۔ اگرچہ چوہدری صاحب کا یہ فیصلہ میس کمیٹی میں ہدفِ تنقید بنا رہا لیکن اس سے اس محبت و احترام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو اُن کے دل میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور ان کے خاندان کے لیے ہے۔

میرے زمانہ طالب علمی تک حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے پاس سیاہ رنگ کی ایک ماڈل کار ہوا کرتی تھی جس میں وہ اور ان کے اہلِ خاندان ادھر ادھر آتے جاتے تھے۔ اس کار کو آپ خود بھی ڈرائیو کر لیتے تھے لیکن اکثر اوقات محمد احمد حیدر آبادی اسے چلا رہے ہوتے تھے۔ اکثر طلبہ کا خیال تھا کہ یہ کار کالج کی پراپرٹی ہے جسے آپ بطور پرنسپل اپنے ذاتی مصرف میں لاتے ہیں تاہم چوہدری محمد علی نے ہماری یہ غلط فہمی دور کر دی اور بتایا کہ یہ کار آپ کی اپنی ملکیت ہے۔

یہ کار پرانی تھی اور چلتے ہوئے اس میں سے بہت آوازیں آتی تھیں۔ چوہدری صاحب بتاتے ہیں:

''کالج کے ایک متمول طالب علم نے جس کے پاس اس زمانے کے لحاظ سے ایک بہتر کار موجود تھی اور وہ اسی پر کالج آیا جایا کرتا تھا میاں صاحب کی کار پر انگریزی زبان میں ایک مضمون لکھ کر المنار میں اشاعت کے لیے بھجوایا۔ میں المنار کا پروفیسر انچارج تھا۔ میں نے مضمون پڑھا تو اسے اشاعت کے لیے موزوں خیال نہ کیا۔ مضمون نگار میرے اس فیصلے پر سیخ پا ہوا اور سیدھا صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے پاس جا پہنچا۔ آپ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ یہ مضمون ضرور چھپے گا چنانچہ آپ نے مجھے بلا کر اسے شاملِ اشاعت کرنے کا حکم دیا۔ یہ مضمون "Wolseley" کے عنوان سے المنار کی جون ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں چھپ گیا۔ اتفاق دیکھیے جس روز رسالہ چھپ کر ہمارے پاس پہنچا، مضمون نگار میرے پاس آیا اور اس نے روہانسی آواز میں بتایا کہ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور اسے شدید نقصان پہنچا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ اتفاقِ محض تھا لیکن نہ جانے کیوں مضمون نگار کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اس حادثہ کا کچھ نہ کچھ تعلق اس مضمون کے ساتھ ضرور ہے اور اس نے خود میرے سامنے ایک سے زیادہ بار اپنی اس تحریر پر ندامت کا اظہار کیا۔''

چوہدری محمد علی کے کشتگانِ عشق میں اپنے ہی نہیں غیر بھی شامل ہیں۔ میرے ایک نہایت ہی پیارے غیراز جماعت دوست، شیخ محمد شفیق جو مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نواسے ہیں اور جن کے والد، حکیم محمد ابراہیم قادیان میں حکمت کرتے تھے اپنی ملازمت کی آخری دہائی میں پنجاب کی سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ میں ڈائریکٹر رہے ہیں۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائی کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ربوہ جاتے رہتے تھے اور ان کی بعض دیگر لوگوں کے علاوہ چوہدری محمد علی سے بھی ملاقات رہی۔ وہ دن گیا اور آج کا دن آیا، شفیق ان کا بہت احترام کرتے ہیں اور دل سے ان کے حسنِ اخلاق کے معترف ہیں۔

شفیق کو علم ہے کہ چوہدری محمد علی مجھ پر بہت شفقت فرماتے ہیں لہٰذا ہماری ہر گفتگو کے دوران چوہدری صاحب کا ذکر ضرور آتا ہے۔ ہم نے کئی بار اکٹھے موصوف کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کی صحبت سے حظ اٹھایا ہے۔ شفیق ہر بار اپنے ساتھ نئے سے نئے علمی سوالات لے کر جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر چوہدری صاحب کسی جہاندیدہ مربی کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں اور گفتگو کا یہ دلچسپ سلسلہ گھنٹوں تک چلتا رہتا ہے۔ اس دوران دونوں طرف سے چھوڑے گئے چھوٹے چھوٹے چٹکلے محفل کو کشتِ زعفران بنائے رکھتے ہیں۔

جولائی ۲۰۱۳ کے نصف آخر میں چوہدری محمد علی طاہر ہارٹ انسٹی ٹیوٹ میں داخل تھے۔ اُن دنوں میں بھی اتفاق سے ربوہ میں تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں عیادت کے لیے حاضر ہوا۔ ان کے خدمتگار نے بتایا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں تاہم میرے منع کرنے کے باوجود اس نے انہیں جگا دیا۔ میں ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا اور اگلے روز بھی دیر تک ان سے اکتسابِ فیض کرتا رہا۔

چوہدری محمد علی کی صحت کی موجودہ کیفیت کے پیشِ نظر تحریک جدید کی طرف سے انہیں دو خدمتگار مہیا کیے گئے ہیں جن میں سے ایک دن کے وقت ان کے پاس موجود رہتا ہے تو دوسرا رات کے وقت ڈیوٹی دیتا ہے۔ چوہدری صاحب اپنی [illegible] کے سبب بسا اوقات شرمندگی محسوس کرتے ہیں کہ جماعت کو ان کی وجہ سے

اضافی مالی بوجھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ''ایک رات میں گر گیا تھا'' وہ مجھے کہہ رہے تھے ''اس کا خدمتگار کی ہمہ وقت موجودگی کے باوجود میں
مطلب یہ ہے کہ اس کا ہونا اور نہ ہونا میرے لیے برابر ہے۔''
''لوگ ہسپتالوں میں بڑے بڑے ڈاکٹروں کی موجودگی میں مرجاتے ہیں'' میں نے چوہدری صاحب کی بات پر قدرے بے تکلفانہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہسپتال بند کر دیئے جائیں یا ڈاکٹروں کی چھٹی کرادی جائے؟''

چوہدری صاحب ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئے اور پھر مسکرا کر فرمایا: ''کہتے آپ بھی ٹھیک ہیں۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ میں ان مہربانیوں کا مستحق نہیں ہوں۔'' اس موقع پر انہوں نے اپنے تین نئے اشعار بھی سُنائے جو ذیل میں درج ہیں:

اس قدر انکار پر انکار سے
لگ نہ جاؤ تم کہیں دیوار سے

نظریاتی مملکت بننے کے بعد
کیسے کیسے بھوت نکلے غار سے

ہم بھی گذرے پابجولاں سربکف
شام سے اور شام کے بازار سے

ہمیشہ کی طرح چوہدری صاحب کے ساتھ یہ ملاقات بہت خوشگوار رہی اور تمام تر ضعف کے باوجود سارا وقت ان کی شیریں بیانی کا سلسلہ جاری رہا: ''بیمار آدمی کے لیے ایسی ملاقاتیں بہت فرحت افزا ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تکلیف بھول کر اُس دور میں واپس چلا جاتا ہے جو اسے بہت عزیز ہوتا ہے۔ آپ آتے رہا کریں۔ بہت لطف آتا ہے آپ کے ساتھ گفتگو کر کے۔''

مجھے اپنے اس محسن کی بہت سی اور باتیں بھی یاد آ رہی ہیں لیکن ان کا ذکر موخر کرتے ہوئے میں فی الوقت یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب ہم بارھویں جماعت میں پہنچے تو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے فرزندِ اکبر، مرزا انس احمد فلاسفی میں ایم اے کرنے کے بعد کالج میں لیکچرر بن کر آ گئے اور ہماری کلاس انہیں مل گئی۔ ہم نے ان سے صرف ایک ہی سال پڑھا اور ایف اے کے بعد یہ مضمون چھوڑ دیا۔ وہ ان ہی دنوں مزید تعلیم کے لیے بیرونِ ملک چلے گئے اس لیے ان سے زیادہ رابطہ نہ رہ سکا۔ کالج کے قومیائے جانے کے بعد ان کی خدمات صدر انجمن احمدیہ نے اپنے لئے حاصل کر لیں اور وہ کمزوری صحت کے باوجود تا حال تحریکِ جدید انجمن احمدیہ کی وکالتِ اشاعت میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

میں پچھلے کچھ سالوں میں جب بھی ربوہ جاتا ان کے دفتر میں ان سے ملاقات کی کوشش کرتا رہا لیکن ہر بار مایوسی ہوتی رہی۔ میں حال ہی میں ان کے دفتر کے سامنے سے گذرا تو عادتاً پھر وہاں رُک گیا۔ معلوم ہوا کہ آج

وقت ہسپتال سے آئے ہیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اُن سے جا ملا۔ میں حیران رہ گیا کہ کئی سال سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود انہوں نے مجھے میرا نام لے کر پکارا اور بڑی محبت کے ساتھ میرا حال احوال پوچھتے رہے۔ ان کی علالت کی تفصیل سن کر دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے رکھے اور تادیر خدمتِ سلسلہ کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

ایف اے میں میرا ایک مضمون معاشیات تھا۔ کالج میں داخل ہوا تو اس مضمون کے صرف ایک ہی لیکچرر تھے جن کا نام چوہدری ظفر احمد وینس تھا۔ میں نے اُردو میڈیم سکول سے تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا جب وہ یہ مضمون دھواں دھار انگریزی میں پڑھاتے تو میری نالائقی کے سبب سارا لیکچر میرے سر کے اوپر سے گذر جاتا۔ وہ ان ہی دنوں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے بیرونِ ملک تشریف لے گئے لیکن واپسی پر قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کو جائن کرلیا اور وہاں سے کسی غیر ملک میں جا آباد ہوئے۔ سنتے ہیں آج کل امریکہ میں ہیں۔

جب ہم بارہویں جماعت میں پہنچے تو سٹاف میں معاشیات کے ایک اور لیکچرر کا اضافہ ہوا۔ میری مراد عزیز طاہر سے ہے۔ وہ چوہدری عبداللطیف اوورسیئر کے بیٹے ہیں جنہوں نے اپنی عملی زندگی کا زیادہ عرصہ سیکرٹری آبادی کمیٹی، صدر انجمن احمدیہ کے دفتر میں گذارا تھا۔ وہ اپنے دور میں ربوہ کے واحد معروف نقشہ نویس تھے اور میرا خیال ہے آج سے بیس پچیس سال پہلے تک اس شہر میں تعمیر ہونے والے اکثر مکانات کا نقشہ ان ہی کے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے۔ چوہدری عبدالطیف فیکٹری ایریا میں میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب کے پڑوسی تھے اور عزیز طاہر کے ایک بھائی، محمود سکول میں میرے ہم جماعت رہے تھے لہٰذا بالواسطہ طور پر ہی سہی میں پہلے ہی عزیز طاہر سے کسی حد تک متعارف تھا۔

عزیز طاہر کو فٹ بال سے دلچسپی تھی اور وہ اسی وجہ سے کالج کی فٹ بال ٹیم کے انچارج بنائے گئے۔ وہ بتایا کرتے ہیں: ''کالج میں ملازمت کے آغاز ہی کی بات ہے۔ پرنسپل صاحب کی زیرِ صدارت ایک سٹاف میٹنگ میں کالج کی بعض غیر نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے بات ہو رہی تھی۔ پرنسپل صاحب چاہتے تھے کہ کسی موزوں سٹاف ممبر کو فٹ بال کا انچارج بنایا جائے۔ انہوں نے سٹاف ممبرز کو نام تجویز کرنے کو کہا۔ سینیئر سٹاف ممبرز میں سے کسی نے ایک نام تجویز کیا، پھر کسی نے کوئی اور نام تجویز کیا لیکن آپ نے ان کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور پھر خود ہی فرمایا کہ کیوں نہ یہ ذمہ داری عزیز طاہر کو سونپ دی جائے۔ پرنسپل صاحب کی طرف سے میرا نام تجویز کیے جانے کے بعد کسی کے لیے اختلاف کی گنجائش نہ رہی تھی چنانچہ میں فٹ بال کا نگران قرار پایا۔''

انہوں نے اس حوالے سے اپنی کچھ یادداشتیں ایک مضمون کی شکل میں مرتب کی ہیں جو الفضل ۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء میں ''تعلیم الاسلام کالج کی حسین یادیں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کے نام دے رکھے ہیں۔ اس ٹیم کے کپتان منیر احمد باجوہ تھے جب کہ کھلاڑیوں میں جماعتِ احمدیہ کینیڈا کی ایک جانی پہچانی شخصیت، محمد ذکریا ورک؛ محمد عاقل خان ولد نذر احمد خان کارکن دفتر امورِ عامہ (حال مقیم جرمنی) اور عبدالحمید عابد ابن ماسٹر اللہ بخش زراعتی سمیت کئی دوسرے طلبہ شامل تھے۔

عزیز طاہر جو تعلیم الاسلام کالج کے سابق طالب علم بھی ہیں نے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو قریب سے دیکھا ہے اور وہ ان کی جن بہت سی خوبیوں کے معترف ہیں ان میں سے ایک کا تعلق کالج میں ڈسپلن کے قیام سے ہے۔ وہ بتایا کرتے ہیں: ''میری ملازمت کے پہلے یا شاید دوسرے سال کی بات ہے۔ میں اپنی کلاس کو نظریہ مقدار زر پڑھا چکا تھا اور میں نے اس حوالے سے اس کا ایک ٹیسٹ لیا۔ ٹیسٹ شروع ہوا تو ایک طالب علم کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ ایک روز پہلے اکنامکس کا پیریڈ نہ اٹینڈ کر سکا تھا اور اس نے یہ نظریہ نہیں پڑھا لہٰذا اسے اس ٹیسٹ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہ نظریہ پچھلے دو تین دنوں سے پڑھا رہا ہوں لہٰذا اسے یہ ٹیسٹ دینا ہی ہوگا۔ اس وقت تو وہ لڑکا خاموشی سے بیٹھ گیا لیکن جب میں نے پرچے مارک کیے تو معلوم ہوا کہ اس نے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے پرچے میں ایسی واہیات باتیں لکھ رکھی ہیں جنہیں پڑھ کر خود مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے اسے پچیس روپے جرمانہ کیا اور پرچہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی خدمت میں جرمانے کی توثیق کے لیے بھیج دیا۔ آپ نے جرمانے کی سزا ختم کر کے اسے کالج سے خارج کر دیا۔

یہ طالب علم باسکٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا اور کالج ٹیم میں شامل تھا۔ اس واقعہ کے ایک روز بعد ٹیم نے میچ کھیلنے کے لیے سیالکوٹ جانا تھا لہٰذا باسکٹ بال والوں کی خواہش تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح معافی مل جائے تاکہ وہ یہ میچ کھیل سکے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ اب تو بال پرنسپل صاحب کی کورٹ میں ہے اور وہی اسے معاف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ انہوں نے پرنسپل صاحب سے رابطہ کیا اور جب ان کی سفارش ماننے سے انکار کر دیا گیا تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ اگر کالج سے اس کا اخراج ضروری ہو چکا ہے تو اس سزا کا اعلان میچ تک نہ کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ لڑکا کالج کی طرف سے کھیل نہ پایا تو کالج کے جیتنے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔ پرنسپل صاحب نے ان کی یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا اور اس طالب علم کے کالج سے اخراج کے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ خدا کی شان دیکھئے! یہ میچ ہوا، ہماری ٹیم اس لڑکے کے بغیر کھیلی اور میچ جیت کر لوٹی۔ میچ کے بعد اس لڑکے کے والدین کی منت سماجت اور لڑکے کی طرف سے اچھے چال چلن کی ضمانت کے بعد اسے دوبارہ کالج میں داخلہ دے دیا گیا۔''

میں نے عزیز طاہر سے ایک سال پڑھا اور انہیں بہت قابل اور محنتی پایا۔ وہ بہت ملنسار ہیں چنانچہ انہوں نے جلد ہی اپنے شاگردوں کے دل میں گھر کر لیا۔ اگرچہ میں نے ایف اے کے بعد معاشیات کا مضمون چھوڑ دیا اور وہ خود بھی ستمبر ۱۹۶۴ء میں تعلیم الاسلام کالج کی ملازمت چھوڑ کر میونسپل کالج ٹوبہ ٹیک سنگھ چلے گئے تاہم ان سے میرا رابطہ ہمیشہ رہا۔ خدا کا شکر ہے وہ اب بھی مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں اور از راہِ حوصلہ افزائی اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتے ہیں کہ راقم ان کا ''ہونہار شاگرد'' ہے۔

اسی عرصے میں ان سے میری ایک رشتہ داری بھی ہو گئی اور وہ آپا کے نندوئی بن گئے۔ اس رشتے نے ہمارے تعلق کو مزید استحکام بخشا چنانچہ میں ملتان میں اپنی تعیناتی کے دوران ربوہ آتے جاتے کئی بار ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ان کے ہاں رُک جایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ خوش دلی سے ہمارا استقبال کرتے اور ہر طرح سے عزت افزائی

فرماتے۔

اپنے شاگردوں کی کامیابیوں کو اپنی کامیابی سمجھنے والے عزیز طاہر کی نظر سے میری پہلی کتاب گذری تو اسے ختم کر کے دم لیا اور اپنے مکتوب میں لکھا: ''ایسا دلچسپ سفر نامہ اس سے پیشتر میرے مطالعہ میں نہیں آیا۔ حیران ہوں کہ نقشِ اوّل اتنا خوبصورت ہے تو آگے آگے کیا ہوگا۔''

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ منتقل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ناصر آباد میں اپنا مکان بنالیا ہے اور آج کل وہیں مقیم ہیں۔

عزیز طاہر نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تقرری کے دوران جماعت سے مقدور بھر تعلق رکھا اور ربوہ منتقل ہونے کے بعد بھی جماعتی نظام کے تحت قاضی اور مجلس انصار اللہ مرکزیہ میں نائب قائد تعلیم کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔

انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بھی بخشی ہے کہ وہ اپنے والدِ بزرگوار کے حالات زندگی مدوّن کر کے ''حالات زندگی: چوہدری عبدالطیف صاحب (اوورسیئر)'' کے نام سے شائع کر سکیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ چوہدری عبدالطیف کو عزیز طاہر کی پیدائش سے صرف سترہ اٹھارہ روز پہلے احمدیت قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی چنانچہ انہوں نے بیٹے کی پیدائش پر گوجرہ کے احمدی احباب کی دعوت کی۔ اس موقع پر ایک احمدی شاعر، احسن صدیقی نے ایک نظم پڑھی جو بعد میں قادیان سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''فاروق'' میں چھپ گئی۔ اس نظم میں عزیز طاہر کی پیدائش کو چوہدری عبدالطیف کے لیے خوش نصیبی کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں نظم کے یہ دو اشعار:

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو خوش نصیبی کی دلیل
تجھ کو خالق نے دیا انعام میں لختِ جگر
ہدیۂ تبریک احسن آج کیجے گا قبول
اے خوشا کہ دونوں خوشیاں مل گئیں باہم دگر

اب آیئے پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی کی طرف!

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ایف اے میں میرا ایک مضمون اردو بھی تھا جسے اس زمانے میں ''اردو لازمی'' کہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں انگریزی کی طرح ہر طالب علم کے لیے اسے پڑھنا اور اس میں پاس ہونا بھی ضروری تھا۔ اللہ کی مہربانی سے ہمیں پرویز پروازی جیسے استاد مل گئے جو اسی سال اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے کر کے آئے تھے۔

ہم دونوں آغازِ ربوہ میں ایک ہی گلی میں رہا کرتے تھے اور ہمارے خاندان ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح متعارف تھے۔ ہم ایک ہی ماحول کے پروردہ تھے اور ایک دوسرے کے حالات سے بخوبی آشنا۔ جب میں آٹھویں یا نویں جماعت میں تھا موصوف نے کچھ عرصہ ہمیں پڑھایا بھی تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے مجھے

ہمیشہ بے حد پیار دیا اور میرا شاران کے پسندیدہ طلبہ میں رہا۔

پرویز پروازی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اور اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ خدا نے انہیں پڑھانے کا ملکہ عطا کر رکھا ہے چنانچہ وہ جو کچھ پڑھاتے، طلبہ کو ساتھ ساتھ ازبر ہوتا چلا جاتا۔ ان کی وجہ سے میرے ادبی ذوق کو مہمیز ملی اور اگرچہ میں بعد میں اردو ادب کا باقاعدہ طالب علم نہیں رہا لیکن مجھے اردو میں کچھ نہ کچھ لکھنے کا موقع ضرور ملتا رہا۔

بعد میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو زبان و ادب میں پی ایچ ڈی کر لی۔ وہ تعلیم الاسلام کالج میں پہلے لیکچرر اور آخر میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ پھر وہ جاپان کی اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسر جا لگے۔ واپس آئے تو محکمہ تعلیم کے متعصب کارپردازان نے ان کی تقرری ایک دور دراز دیہاتی علاقے کے انٹرمیڈیٹ کالج میں کر دی۔ اس تقرری کا مقصد انہیں ذہنی اذیت پہنچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا چنانچہ انہوں نے اس صورت حال پر ہر طرح سے احتجاج کیا اور تعلیم الاسلام کالج میں تبادلہ کرانے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

تین سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد سیکرٹری ایجوکیشن کا دل پسیجا اور انہیں گورنمنٹ کالج، فیصل آباد بھجوا دیا گیا۔ چونکہ ان کا تعلق نیشنلائزڈ کیڈر سے تھا لہٰذا سب سے سینیئر ہونے کے باوجود انہیں وہاں سب سے جونیئر حیثیت دی گئی۔ ہاں! وہ اپنے تجربہ کی بنا پر پوسٹ گریجوایٹ کلاسز کو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ انہیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ اس کالج میں اپنے کم از کم دو شاگردوں کی صلاحیتیں صیقل کرنے میں کامیاب ہوئے جن میں سے ایک اورینٹل کالج کے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر ہیں تو دوسری گورنمنٹ کالج، فیصل آباد کی ڈاکٹر پروین کلو۔ انہیں افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ انہیں اس کالج میں ان کا جائز مقام نہ مل سکا اور ان کے مخالفین کی طرف سے ان کی کردار کشی کی مہم مسلسل جاری رہی۔

جاپان میں طویل قیام نے ان کی شخصیت کو کئی لحاظ سے متاثر کیا تھا چنانچہ وہ پاکستان واپس آ کر جاپان کی ایسی مصنوعات درآمد کرنا چاہتے تھے جو پاکستانیوں کے لیے نسبتاً نئی ہوں اور ہاتھوں ہاتھ بک جائیں۔ وہ یہاں کوئی صنعت لگانے کے بارے میں بھی سوچتے رہے لیکن جس شخص کی پچھلی سات پشتوں نے کاروبار نہ کیا ہو اور جو خود ساری زندگی درس و تدریس سے منسلک رہا ہو اس کے لیے کاروباری دنیا میں جگہ بنانا ناممکن نہ بھی ہو تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ یہی کچھ ان کے ساتھ ہوا اور وہ محکمہ تعلیم کے متعصبانہ رویّے اور حالات کے جبر کے تحت ۱۹۹۰ء میں سویڈن چلے گئے اور اپسالا یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سنبھال لئے۔ وہ پچھلے کچھ برسوں سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔

ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ”ذکرِ اردو“ ”خوبصورت جاپان اور میں“ ”جاپان کا سب سے لمبا دن“ ”سورج کے ساتھ ساتھ“ ”تحریکِ آزادی میں سرظفر اللہ کا حصہ“ ”احمدیہ کلچر“ ”پس نوشت“ اور بعض دیگر کتابیں شامل ہیں۔ یہ کتابیں کئی اصنافِ ادب کا احاطہ کرتی ہیں جس سے ان کے متنوع ادبی ذوق کا

اندازہ ہوتا ہے۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ پرویز پروازی نے مجھے ہمیشہ بہت محبت دی اور میری سرپرستی فرمائی ہے۔ انہوں نے میری پہلی کتاب پر روزنامہ الفضل اور سرگودھا سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے ''اوراق'' میں تفصیلی مضامین لکھے لیکن یہاں میں اُن کی اس محبت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا اظہار انہوں نے میری اس کتاب کی اشاعت پر سویڈن سے بذریعہ خط کیا۔ انہوں نے لکھا تھا: ''آج الفضل کے پرچے آئے تو.....تمہارے سفر نامہ کا تذکرہ تھا...... بہت ہی خوشی ہوئی کہ تم نے اپنے ادبی ذوق کو غفرلہ نہیں ہونے دیا۔ حساب کتاب اور لینے دینے کے چکر میں ادبی ذوق کو استوار رکھنا کارِ دارد ہے..... الحمد للہ کہ تم اس آزمائش پر پورے اُترے۔ مصنف بننے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کرو۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

میں اس وجہ سے بھی خوش ہوں کہ میرے مصنف شاگردوں میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ پرویز پروازی کے نیازمندانہ تعلقات میرے علم میں تھے چنانچہ میں نے انہیں اپنی یہ کتاب بھجواتے ہوئے خاص طور پر ذکر کیا کہ میں پرویز پروازی کے شاگردوں میں سے ہوں۔ وزیر آغا نے فوری طور پر مجھے جواب سے نوازا اور پرویز پروازی کے ساتھ میرے نیازمندانہ تعلق پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں ''یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ برادرم پرویز پروازی کے شاگرد ہیں۔''

بعد میں جب سرگودھا کے اہلِ قلم کی جانب اس کتاب کی تقریب رونمائی طے ہوئی اور پرویز پروازی کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مجھے لکھا: ''اگر سرگودھا والے تقریب رونمائی کروانا چاہتے ہیں تو ضرور کروائیں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو آپ کا اوراق کے حلقہ میں تعارف بڑھے گا اور دوسرے لاہور گروپ والوں کو یہ احساس رہے گا کہ یہ شخص غیر جانبدار ہے کہ دونوں حلقوں کی توجہ کھینچ رہا ہے۔ پاکستان میں ادبی سیاست تو چلتی ہے۔ اس میں کسی ایک حلقے کے ساتھ منسلک ہو جانا اچھا نہیں لگتا۔''

کچھ ہی روز پہلے میں نے ان سے ان کی ایک بھولی بسری نظم (جو بہت سال پہلے المنار میں چھپی تھی) بھجوانے کے لیے کہا تو انہوں نے یہ انکشاف کر کے مجھے حیران کر دیا کہ ان کے پاس کوئی بیاض موجود نہیں ہے۔ جب میں نے انہیں اپنا کلام جمع کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے خود کو ہمیشہ جماعتی موضوعات تک محدود رکھا ہے اور یہ کہ ان کا کلام جماعتی رسالوں کے علاوہ کبھی کسی اور جگہ نہیں چھپا۔ ان کی دیگر نظمیں جو کسی وقتی ضرورت مثلاً کالج کے کسی فنکشن وغیرہ کے حوالے سے کہی گئیں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ خلافت کی صد سالہ جوبلی کے موقع پر ہونے والے دو مشاعروں کی صدارت (جن میں سے ایک میں خود حضرت خلیفۃ المسیح الخامس بھی تشریف فرما تھے) ان کے حصے آئی۔ وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش بختی قرار دیتے ہیں۔

پرویز پروازی کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ابا جی کا انتقال ہوا تو وہ

بہشتی مقبرہ ربوہ میں ان کی تدفین تک موجود رہے۔ تدفین سے پہلے جب اباجی کے چہرے کا آخری دیدار کرایا جا رہا تھا اور میں انتہائی افسردگی کے عالم میں ان کی میت کے پاس کھڑا تھا انہوں نے از راہ شفقت آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینہ کے ساتھ چمٹا لیا اور جب تک تدفین مکمل نہیں ہوگئی مسلسل میری ڈھارس بندھاتے رہے۔ اگرچہ ان کی شفقت میرے غم میں تو کوئی کمی نہ کر سکی لیکن ان کے اس عمل نے مجھے جینے کا حوصلہ بخشا اور میرے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ان کی اس نیکی کا مجھ پر گہرا اثر ہے اور میں ان کے لیے ہر دم دعا گو رہتا ہوں۔

میں نے ایف اے میں تین اساتذہ سے انگریزی پڑھی جن کے اسمائے گرامی ہیں: آفتاب احمد، حمید احمد چوہدری اور شریف خالد۔

جہاں تک آفتاب احمد کا تعلق ہے وہ ہمیں پہلا سال یا اس کا کچھ حصہ یہ مضمون پڑھاتے رہے۔ پھر وہ کالج ہی چھوڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ سی ایس ایس کرنے کے بعد اسسٹنٹ انکم ٹیکس افسر منتخب ہو گئے ہیں۔ کئی سال بعد جب میں پاکستان ٹیکسیشن سروس کے لیے منتخب ہو کر فیصل آباد میں تعینات ہوا تو پتا چلا کہ کسی وجہ سے ان کی یہ ملازمت ختم ہو چکی ہے اور وہ ذاتی کاروبار سے بھی دلبرداشتہ ہونے کے بعد فیصل آباد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے سیکرٹری کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

اپنی اس حیثیت میں اِن کی انکم ٹیکس آفس میں آمد و رفت رہتی تھی۔ اس زمانے میں وہاں پر اسی نام کے ایک انکم ٹیکس افسر ہوا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے آفتاب احمد کو دیکھ رکھا ہے وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ وہ وجیہہ شخصیت کے مالک ہیں جب کہ ان کے ہم نام خلقی طور پر ان صفات سے محروم تھے چنانچہ آفتاب احمد کے سابقہ رفقائے کار پہچان کی خاطر انہیں ''آفتاب سفید'' اور ان کے ہم نام کو ''آفتاب سیاہ'' کہا کرتے تھے۔

چونکہ میں ان کا شاگرد رہا تھا اور اتفاق سے اسی محکمے میں آ گیا جس میں انہوں نے خود کئی سال گذارے تھے لہٰذا ان سے قدرے بے تکلفی سے باتیں ہوتیں۔ اسی دوران انکشاف ہوا کہ اُن کے والدِ بزرگوار محکمۂ ڈاک کے ملازم تھے اور ان کی تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ ان کی تعیناتی چنیوٹ ہوگئی چنانچہ آفتاب احمد نے اسلامیہ کالج، چنیوٹ سے ایف ایس سی کیا اور پھر تعلیم الاسلام کالج کی شہرت سے متاثر ہو کر بی اے میں یہاں داخلہ لے لیا۔ وہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک یہاں رہے۔ اس دوران انہیں جن اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا ان میں صوفی بشارت الرحمٰن اور مرزا خورشید احمد شامل ہیں۔ آفتاب احمد کا کہنا ہے کہ ''دونوں بہت اچھے استاد تھے۔ انہوں نے میرے اندر حصولِ علم کی تڑپ پیدا کی۔'' ان کے کلاس فیلوز میں سے ایک نام جو انہیں آج تک نہیں بھولا پرویز پروازی کا ہے جو بعد میں ان کے رفیق کار بھی رہے۔ وہ کہتے ہیں: ''ہمیں اسی زمانے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک روز یہ اپنا اور اس کالج کا نام روشن کریں گے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا اندازہ غلط نہیں نکلا۔''

"زمانہ تدریس کی کوئی خاص یاد؟" ایک بار میں نے انہیں کریدا۔

"بہت سی باتیں ہیں" ان کا جواب تھا" میں کالج کی ہاکی ٹیم کا انچارج تھا لیکن آپ کو پتا ہے اس زمانے میں وہاں باسکٹ بال کا زور تھا اور ربوہ میں سال کے سال آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک بہت اہم ایونٹ ہوتا جسے دیکھنے کے لیے سارا شہر اُمڈ پڑتا تھا اور باہر سے بھی بہت لوگ آتے۔ باسکٹ بال کے انچارج ڈاکٹر نصیر خان تھے اور فزکس کے ایک لیکچرر محمد اسلم قریشی اس معاملے میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ ایک بار جب ٹورنامنٹ ہونے والا تھا اسلم قریشی کوئی انتظامی معاملہ پرنسپل کے علم میں لانا چاہتے تھے۔ وہ جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ مجھے یاد ہے شام کا وقت تھا۔ جب ہم پرنسپل آفس پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس ڈاکٹر عبدالسلام بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم باہر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ اسی اثناء میں وہ دونوں باہر نکل آئے اور یوں ہمیں بھی ڈاکٹر سلام سے مصافحے کا موقع مل گیا۔ ہم سب چندمنٹ برآمدہ میں کھڑے رہے اور خاموش سامع کے طور پر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور ڈاکٹر سلام کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے رہے۔ موضوعِ گفتگو تھا: کالج میں فزکس کی تدریس کے لیے سہولتوں کی فراہمی۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ان دنوں ایم ایس سی فزکس کی کلاسز کے اجرا کے بارے میں سوچا جا رہا تھا اور ان کی یہ میٹنگ اسی حوالے سے تھی۔ اگرچہ مجھے ڈاکٹر سلام سے براہِ راست گفتگو کا موقع تو نہیں ملا تاہم خوشی ہے کہ مجھے عالمی شہرت کے اس سائنس دان کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔"

"ٹی آئی کالج میں آپ کا وقت مجموعی طور پر کیسا گذرا؟"

"بہت اچھا۔ میں اسی کالج کا اولڈ سٹوڈنٹ تھا لہٰذا مجھے اس ماحول میں کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے اپنے پرنسپل اور رفقائے کار کی طرف سے بہت عزت ملی۔ اکثر شاگرد بھی مؤدب تھے۔ اس عرصے میں میری رہائش پروفیسر حبیب الرحمٰن کے ہمراہ رہی اور ان سے ایک خاص طرح کی ایکویشن بن گئی۔ عام طور پر مجھے دن میں دو یا تین پیریڈز لینا ہوتے تھے چنانچہ شاف روم کے علاوہ میرا ایک ٹھکانہ بیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں ان کا دفتر تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والے انسان ہیں اور ان کے ساتھ گذرا ہوا وقت مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے۔"

آفتاب احمد فعّال زندگی گذار رہے ہیں اور آج کل پاکستان ٹیکسٹائل ایکسپورٹرز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

حمید احمد چوہدری تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ایک اُستاد ماسٹر حسن محمد کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ ان کا شمار بہت اچھے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ بعد میں نائیجیریا چلے گئے اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۵ء تک وہاں کی وزارتِ تعلیم میں پرنسپل ایجوکیشن آفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔ میں ۱۹۸۹ء میں پہلی بار جرمنی گیا تو ان سے فرینکفرٹ میں اتفاقاً ملاقات سے پتا چلا کہ انہوں نے نائیجیریا میں اپنی ملازمت ختم ہونے کے بعد جرمنی کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ انہوں نے اصرار کر کے مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا اور بہت محبت کا برتاؤ فرمایا۔ میں اس کے بعد ۲۰۰۷ء میں اپنے ایک غیراز جماعت دوست حاجی فضل محمد کے ہمراہ یورپ کی سیر کے لیے گیا تو فرینکفرٹ میں بھی رُکا۔ واجب الاحترام حمید چوہدری کو معلوم ہوا تو انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر مدعو کیا اور تعلیم الاسلام کالج کے

بعض سابق طالب علموں سے ملاقات کرائی۔ آپ ہی بتایئے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنے ایک سابق طالب علم کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کرنے کو ان کی محبت کے علاوہ کس بات پر محمول کروں؟

اس ملاقات کے دوران جہاں اور بہت سی باتیں ہوئیں وہیں انہوں نے کالج میں ٹینس کلب کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا: ''۶۲-۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے محسوس کیا کہ طویل اوقاتِ کار اور ورزش کے فقدان کی وجہ سے آپ کا وزن بڑھ رہا ہے اور اسے کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹری مشورہ بھی یہی تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہو۔ آپ آکسفورڈ میں قیام کے دوران ٹینس کھیلتے رہے تھے چنانچہ آپ کی ہدایت پر کالج کے صحن میں ٹینس کورٹ بنایا گیا۔ طلبہ کے لیے دیگر بہت سی کھیلوں کا انتظام پہلے سے موجود تھا لہٰذا ٹینس کلب کی ممبر شپ کالج کے اساتذہ یا بعض مخصوص احباب تک محدود رکھی گئی۔ کھیلنے والوں میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے علاوہ میں، ڈاکٹر نصیر خاں، ڈاکٹر سلطان محمود شاہد، ظفر وینس، صاحبزادہ مرزا منصور احمد اور چند دیگر دوست شامل تھے۔''

''جس مقصد کے لیے یہ کلب بنایا گیا تھا وہ کس حد تک پورا ہوا؟''

''شروع میں تو سبھی ممبرز بہت باقاعدہ تھے لیکن حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اپنی مصروفیات کے سبب زیادہ دیر تک کھیل میں اپنی باقاعدگی برقرار نہ رکھ سکے جس کی وجہ سے اس کلب میں باقی لوگوں کی دلچسپی بھی کم ہوتی گئی اور دو تین سال کے بعد تو یہ کلب قصہٴ ماضی بن کر رہ گیا۔''

''آپ کو تو ماشاء اللہ ایک طویل عرصہ کالج میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ کوئی اور واقعہ سنایئے'' نہ جانے کس نے فرمائش کی۔

''جب ایوب خان برسرِ اقتدار آیا تو اس نے ملک کے تعلیمی نظام میں اصلاح کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جس کی ایک سفارش یہ بھی تھی کہ انٹرمیڈیٹ تو حسبِ سابق دو سال ہی میں مکمل ہو لیکن گریجوایشن دو سال کی بجائے تین سال میں مکمل ہوا کرے۔ اسی کمیشن نے ہائر سیکنڈری سکولز اور ڈگری کالجز کا تصور دیا اور تجویز کیا کہ موجودہ کالجوں کی ان خطوط پر تشکیل نو کی جائے۔ اس مقصد کے لیے کچھ گرانٹ حکومت کی طرف سے فراہم کی جانی تھی بشرطیکہ پرائیویٹ کالجز تقریباً اتنی ہی رقم کا انتظام خود کریں۔ چونکہ ہمارا کالج صدر انجمن احمدیہ کی ملکیت تھا لہٰذا اس رقم کا معتدبہ حصہ تو اسی کی طرف سے فراہم ہونا تھا تاہم تجویز یہ ٹھہری کہ کالج کے مخیر سابق طلبہ سے بھی عطیات جمع کیے جائیں۔ مجھے سابق طلبہ سے رابطے کی ذمہ داری سونپی گئی چنانچہ میری کوشش کے نتیجے میں کئی سابق طلبہ نے اس کارِ خیر میں دل کھول کر حصہ لیا۔ مجھے اکثر عطیہ دہندگان کے نام تو اب بھول چکے ہیں البتہ چوہدری حمید نصر اللہ اور انور کاہلوں کے اسمائے گرامی اب بھی یاد ہیں۔ ان کی طرف سے اس مد میں ایک خطیر رقم موصول ہوئی تھی۔''

''ماشاء اللہ!'' میں نے کہا ''اصل میں جماعت کی ترقی کا راز احمدیوں کا یہی جذبہٴ تعمیر تو ہے۔''

''حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد میں لیڈر شپ کی جملہ خصوصیات موجود تھیں۔ اُن ہی دنوں آپ نے

شیخ مبارک احمد سابق مربی انچارج مشرقی افریقہ سے دریافت فرمایا کہ اگر انہیں عطیات اکٹھا کرنے کے لیے مشرقی افریقہ بھجوایا جائے تو وہ اندازاً کس قدر رقم جمع کر کے لا سکیں گے۔ میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ شیخ مبارک احمد نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور پھر کہا: ''اگر میں اکیلا جاؤں تو پچاس ہزار روپیہ لا سکتا ہوں لیکن اگر آپ (یعنی حضرت مرزا ناصر احمد خود) بھی ساتھ تشریف لے جاسکیں تو بہ آسانی ایک لاکھ روپیہ جمع ہوسکتا ہے۔''

چوہدری حمید احمد کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ ان ہی کی مساعی سے جرمنی میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی گئی جس کی شاخیں خدا کے فضل سے امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ اور بعض دیگر ملکوں میں بھی قائم ہو چکی ہیں۔ کالج کے بہت سے سابق طلبہ اس ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں اور اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں ایک ایسی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جو طالب علموں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہر دم کوشاں رہتی اور ''عمل'' کے بغیر ''علم'' کو بے معنی سمجھتی تھی۔

یہ ایسوسی ایشن حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی اجازت سے قائم کی گئی ہے چنانچہ اس کی ویب سائٹ پر حضور کا ۲۵ نومبر ۲۰۰۵ء کا وہ پیغام موجود ہے جس میں آپ نے اس ایسوسی ایشن کے قیام پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''اللہ تعالےٰ آپ کو اس ایسوسی ایشن کے مقاصد پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت مسیح موعود نے جن اغراض و مقاصد کے تحت اس ادارے کو قائم فرمایا...... وہاں کے فارغ التحصیل انہیں پورا کرنے والے ہوں۔'' اسی طرح جب کچھ عرصہ بعد اس ایسوسی ایشن کی کارکردگی کی رپورٹ حضور کی خدمت میں پیش کی گئی تو آپ نے اپنے خط مرقومہ ۱۳ دسمبر ۲۰۰۷ء میں اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اللہ تعالےٰ آپ کی مساعی میں برکت ڈالے اور نیک نتائج ظاہر فرمائے۔''

حمید چوہدری جو اس ایسوسی ایشن کے روح رواں ہیں اراکین سے رابطے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور انہیں ایسوسی ایشن کی ذرا ذرا سی کارروائی سے باخبر رکھتے ہیں۔ وہ کمپیوٹر کی ایجاد سے فائدہ اُٹھانے کا گُر جانتے ہیں اور اگر ان سے کوئی سوال پوچھا جائے تو فوراً جواب دینا اپنا فرض منصبی جانتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایسوسی ایشن کو فعّال بنایا جائے اور کالج کے سابقہ طلبہ ایک جسم کی صورت اختیار کرلیں جس کے کسی ایک حصے کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرے حصے بھی اس کا درد محسوس کیے بنا نہ رہ سکیں۔

کچھ عرصہ پہلے جب انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی جانب سے اس ایسوسی ایشن کے ایک سالانہ فنکشن میں شمولیت کی منظوری کی اطلاع ملی تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ ہر رُکن کو اس تقریب میں شامل ہونے کی تلقین کررہے تھے اور ان کی توجہ حضرت صاحب کی اس خواہش کی تعمیل کی طرف بھی دلا رہے تھے کہ طلبائے قدیم کے بچے بھی اس تقریب میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل ہوں۔

جب یہ تقریب ہوچکی تو حمید چوہدری نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کالج کے سابقہ طلبہ کو نہ صرف اس کی تصاویر بھجوائیں بلکہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اس تنظیم کے ساتھ جو توقعات وابستہ کی ہیں انہیں پورا کرنے کی طرف توجہ دلانے لگے۔ حضرت صاحب کی خواہش کی تعمیل میں حمید چوہدری بہت سے سابق طلبہ سے پاکستان

میں کم از کم ایک مستحق احمدی طالب علم کے ایک سال کے تعلیمی اخراجات (جو نظارت تعلیم نے ۳۰۰ یورو مقرر کئے ہیں) ادا کرنے کے وعدے حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں لیکن وہ اپنی اس کارکردگی پر مطمئن نہیں اور مزید سابق طلبہ کو اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔

اور اب کچھ ذکر پروفیسر چوہدری محمد شریف خالد کا جو انگریزی کے استاد تھے۔ ان کا طرزِ تدریس بہت عمدہ اور اردو میڈیم سکولوں سے آنے والے طلبہ کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ وہ ان کے سامنے اپنا مدعا بہت اچھے طریقے سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں تو ان سے بے تکلفی نہ ہو سکی لیکن بعد میں میرا ان سے نیازمندانہ تعلق رہا اور اس کا ایک خاص پس منظر تھا۔

۱۹۶۸ـ ۶۹ء میں جب میں تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں میں پڑھاتا تھا اس کالج کے لاہور بورڈ کے ساتھ الحاق کی تجدید کے حوالے سے بورڈ کی ایک ٹیم یہاں آئی۔ اس ٹیم میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل، پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد اور سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر چاولہ شامل تھے۔ اس موقع پر بورڈ کی بعض شرائط پوری کرنے کے لیے تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے دو اصحاب کو یہاں منگوایا گیا تھا۔ اُن میں سے ایک شریف خالد تھے اور دوسرے محمد احمد حیدر آبادی جنہوں نے فزیکل ایجوکیشن میں ڈپلومہ کر رکھا تھا اور ربوہ کالج میں ڈی پی ای کے طور پر کام کر رہے تھے۔

محمد احمد حیدر آبادی گھٹیالیاں آتے ہوئے اپنی شاٹ گن ہمراہ لے آئے تھے۔ گھٹیالیاں دیہاتی علاقہ تھا جہاں پرندوں کا شکار بکثرت ملتا تھا چنانچہ کالج بند ہوتے ہی ہم تینوں باہر نکل جاتے۔ ان کا نشانہ بہت درست تھا لہٰذا ان کا کوئی وار شاید ہی خالی جاتا۔ ہم دونوں اِن پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندوں کو پکڑتے اور شریف خالد انہیں ذبح کرتے جاتے۔ گھر واپس پہنچ کر پرندوں کی ضروری صفائی کی جاتی اور پھر ہم سب مل کر یہ گوشت پکاتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے۔

شریف خالد کے ساتھ اُن دنوں استوار ہونے والا تعلق زندگی بھر قائم رہا اور میں جب بھی ربوہ جاتا کوشش کر کے ان سے ملتا۔ مرحوم لاگریجویٹ بھی تھے چنانچہ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ ہی میں پریکٹس شروع کر دی۔ ادھیڑ عمری میں کسی نئے کیریئر کا آغاز آسان نہیں ہوتا اور شریف خالد بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ربوہ میں یوں بھی وکلا کی زیادہ گنجائش نہ تھی لہٰذا انہیں بھی مشکلات تو پیش آئیں لیکن انہوں نے ہمت سے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بالآخر مقامی وکلا میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

میں عدالت کے سامنے سے گذرتے ہوئے ان کا ضرور پتا کرتا۔ اگر وہ اپنے دفتر میں (جو بالعموم کسی درخت کے نیچے میز کرسیاں لگا کر بنایا گیا ہوتا تھا) موجود ہوتے تو بہ اصرار اپنے پاس بٹھاتے، ساتھی وکلا سے فخریہ میرا تعارف کراتے اور انہیں بتاتے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا خاص فضل فرماتے ہوئے فرش سے عرش پر بٹھا دیا ہے۔ موصوف بے حد مہمان نواز تھے چنانچہ موسم کے مطابق تواضع کے بغیر نہ اُٹھنے دیتے۔

شریف خالد ربوہ کے معروف شعراء میں سے تھے چنانچہ کیپٹن خادم حسین نے اپنی کتاب ''ربوہ'' میں

''شعرائے ربوہ'' کے عنوان سے جن شاعروں کی فہرست دی ہے ان میں موصوف کا نام بھی شامل ہے۔ اسی طرح سلیم شاہجہانپوری نے اپنی کتاب ''شعرائے احمدیت'' میں بھی اُن کا نمونہ کلام شائع کیا ہے۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں اُن کا کلام المنار میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ اتفاق سے ایسا ایک پرانا شمارہ میرے پاس محفوظ ہے جس میں اِن کی ایک غزل چھپی ہوئی ہے۔ اگرچہ اسے ان کی نمائندہ غزل تو قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم بطور تبرک ملاحظہ فرمایئے اس کے یہ تین اشعار:

ہیں لبریز و پُر نم اگر میری آنکھیں
ہے خوں آرزو کا ، یہ پانی نہیں ہے
سُنے گا اگر تو پریشان ہو گا
یہ رُودادِ غم ہے ، کہانی نہیں ہے
اگرچہ ہوں خاموش و مجبور و بے بس
خموشی میری بے زبانی نہیں ہے

استادِ گرامی کی طبیعت میں مزاح کا خاص عنصر موجود تھا اور وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی تفنن طبع کا سامان ڈھونڈ لیتے تھے۔ چوہدری حمید احمد کا بیان ہے کہ ''ایک بار شریف خالد یرقان میں مبتلا ہو گئے۔ کالج میں ان کی بیماری کی خبر پہنچی تو میں اور میرے بعض رفقائے کار اکٹھے ہو کر ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے۔ اس ملاقات میں ہم میں سے ہر ایک نے عادتاً اپنے اپنے علم اور تجربہ کے مطابق ان کے لیے کوئی نہ کوئی دوا، غذا یا احتیاط تجویز کی۔ ایک صاحب نے گنے کی کھیر کھانے کو کہا تو دوسرے نے کچھ اور مشورہ داغا۔ غرض تمام دوستوں نے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شریف خالد بہت دیر تک ہماری باتیں سنتے رہے اور پھر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے: ''پہلے مجھے یرقان کا باقاعدہ علاج کر لینے دیں۔ اگر میں زندہ رہ گیا تو آپ کے بتائے ہوئے ٹوٹکے بھی ضرور آزماؤں گا۔''

چوہدری حمید اللہ، وکیل الاعلیٰ تحریک جدید انجمن احمدیہ بتاتے ہیں کہ'' کالج کا جملہ سٹاف ایک ہی ماحول کا پروردہ تھا اور ایک دوسرے کے حالات و مسائل سے بخوبی آشنا تھا لہٰذا سٹاف روم کا ماحول بالعموم بہت دوستانہ ہوتا تاہم کبھی کبھار بعض دوستوں کے درمیان شکر رنجی بھی ہو جاتی۔ ایسے مواقع پر شریف خالد ثالث کا کردار ادا کرتے اور نہ صرف ان کے درمیان صلح کراتے بلکہ موقع محل کے مطابق اپنی بذلہ سنجی سے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کی وجہ سے سٹاف روم میں بشاشت کا ماحول قائم تھا ان میں شریف خالد سرِفہرست تھے۔''

پرویز پروازی نے الفضل ۱۷ جنوری ۲۰۱۳ء میں اُن کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے:

شریف خالد تھے ''سیدھے سادے جاٹ! پرائیویٹ طور پر ایم اے انگریزی کر لیا تو کالج کے سٹاف پر آ گئے مگر انگریزی نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہی جاٹوں والی سادگی لباس میں بھی، پڑھانے میں بھی اور رکھ

رکھاؤ، برتاؤ میں بھی۔ ایک سائیکل پر کالج آتے تھے۔ پھر ایک روز سٹاف روم میں یہ اعلان فرمایا کہ میں نے اپنی سائیکل بیچ کر ایک بھینس خرید لی ہے۔ ایک دوست فرمانے لگے: لوگو! کل سے شریف خالد صاحب بھینس پر سوار ہوکر کالج تشریف لایا کریں گے مگر شریف خالد صاحب بھینس پر سوار ہوکر آتے یا سائیکل پر کلاس کا کبھی ناغہ نہ کرتے۔ کالج کے واحد استاد تھے جن پر کلاس چھوڑنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ لڑکوں میں بہت مقبول تھے۔ زیادہ تر طالب علم انہیں چاچا شریف خالد کہتے تھے اور شریف خالد صاحب کا برتاؤ بھی طلبہ سے بڑا ہمدردانہ اور چاچانہ تھا۔ کالج سے فارغ ہوتے تو اپنی بھینس کے لیے چارہ خود کاٹ کر لاتے اور گھر پر انہیں دیکھ کر ذرا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کالج کے پروفیسر ہیں۔ اندر باہر سے ایک تھے، کھرے اور صاف گو۔ بچوں کو انگریزی کی ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے مگر صرف ان کو جو گھر پر آ کر ان سے پڑھیں۔ کسی کے ہاں جا کر پڑھانا ان کی عادت نہیں تھی۔"

سچ پوچھیں تو مجھے ان کی وفات کا پتا ہی نہ تھا لیکن ایک بار جب میں قریشی سعید احمد اظہر مربی سلسلہ کی قبر پر دعا کے لیے بہشتی مقبرہ گیا تو اتفاقاً اس کتبے پر نظر پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہوں:

مزار

پروفیسر محمد شریف خالد صاحب ایڈووکیٹ

پنشنر صدر انجمن احمدیہ، ربوہ

ولد شمس الدین صاحب

دارالصدر غربی (لطیف) ربوہ

ولادت : ۱۹۲۰ء پیدائشی احمدی

وفات : ۲۶ اکتوبر ۲۰۰۴ء عمر ۸۴ سال

نمبر وصیت ۱۰۹۵۴/۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء

جماعت کے سکول اور کالج میں پڑھانے کی توفیق پائی

میں مرحوم کی قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے ان کی محبت کا ایک ایک واقعہ یاد آنے لگا اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کا خود حافظ و ناصر ہو۔

میں نے کالج میں اپنے قیام کے چاروں سال عربی اختیاری مضمون کے طور پر پڑھی تھی۔ میرے استادوں میں چوہدری محمد سلطان اکبر اور محمد اسلم صابر شامل تھے۔ یہ دونوں صاحبان اُن دنوں نئے نئے اس شعبے میں آئے تھے اور ان کا شمار محنتی اور قابل اساتذہ میں ہوتا تھا۔

جہاں تک سلطان اکبر کا تعلق ہے یوں تو وہ چک ۳۵ جنوبی سرگودھا کے رہنے والے ہیں لیکن انہوں نے مڈل پاس کرنے کے بعد قادیان کے مدرسہ احمدیہ میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں مولوی فاضل کا

امتحان پاس کیا اور پھر میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں پڑھتے رہے۔ بی اے آنرز کے بعد انہوں نے پرائیویٹ طور پر ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا، چند ماہ گورنمنٹ کالج ملتان میں پڑھایا لیکن ستمبر ۱۹۶۱ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ منتقل ہو گئے۔

جب کالج میں عربی کی ایم اے کلاسز کا اجرا ہوا تو سلطان اکبر کا نام بھی فیکلٹی میں شامل تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا: ''جب ایم اے کلاسز شروع کرنے کی تجویز ہوئی تو یونیورسٹی کی ایک ٹیم مطلوبہ سہولیات کے جائزے کے لیے کالج آئی۔ اس ٹیم کے سربراہ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ تھے۔ ہم نے فیکلٹی میں چھ نام شامل کر رکھے تھے۔ صوفی بشارت الرحمٰن صدر شعبہ تھے جب کہ اساتذہ میں میرے علاوہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، شیخ محبوب عالم خالد (جنہوں نے اردو کے علاوہ ناگپور یونیورسٹی سے عربی میں بھی ایم اے کر رکھا تھا)، مولانا ارجمند خاں اور محمد اسلم صابر شامل تھے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ فیکلٹی سے تو مطمئن تھے لیکن ان کے نزدیک کالج میں لائبریری کی خاطر خواہ سہولت موجود نہ تھی۔ تب انہیں بتایا گیا کہ ربوہ میں خلافت لائبریری کے نام سے ایک ایسی جامع لائبریری موجود ہے جہاں سے طلبہ کو ہر ضروری کتاب بہ آسانی مل سکتی ہے۔ ان کی خواہش پر انہیں وہاں لے جایا گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے بعد اپنا اعتراض واپس لے لیا تاہم مستقل الحاق کا فیصلہ ایم اے کے پہلے batch کے نتائج سے مشروط کر دیا۔''

''تو پھر کیسے رہے نتائج؟'' میں نے سوال کیا۔

''جب پہلے بیچ کا نتیجہ آیا تو پنجاب یونیورسٹی میں پہلی دو پوزیشنیں ہمارے حصہ میں آئیں۔ اس امتحان میں سونوی محمد صدیق، انچارج خلافت لائبریری اول آئے جب کہ ناصر الدین محمود اور بشارت الرحمٰن نامی دو طلبہ نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔''

''پھر تو یونیورسٹی کے ساتھ الحاق کی تجدید میں کوئی دقت پیش نہیں آئی ہوگی۔''

''نہیں۔ لیکن آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ جب نتیجہ آیا تو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے ہمیں مبارک باد دیتے ہوئے کہا: اس بار تو آپ پہلی دو پوزیشنیں لے گئے ہیں لیکن یاد رکھیں اب لاہور والے محتاط ہو جائیں گے۔ حضور کی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی اور اس کے بعد ہمارا کوئی طالب علم یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن نہ لے سکا۔''

اگرچہ سلطان اکبر تین سال تک بہاولنگر میں بھی تعینات رہے تاہم ان کی ملازمت کا باقی سارا زمانہ تعلیم الاسلام کالج میں ہی گذرا جس کی خوبصورت یادیں آج بھی ان کے ذہن پر نقش ہیں۔ ''ایک بار میں اور شعبہ عربی کے ایک غیر از جماعت استاد منظور حسین سیالوی ایم اے عربی کے کچھ طلبہ اور طالبات کو پنجاب یونیورسٹی میں ایک ورکشاپ پر لے گئے'' سلطان اکبر نے بتایا ''وہاں سے فارغ ہوئے تو چھانگا مانگا جانے کا پروگرام بن گیا۔ ہمارے پاس اپنی کوئی سواری تو تھی نہیں چنانچہ پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعہ وہاں پہنچے۔ ہم نے مہتابی جھیل کی بہت شہرت سنی ہوئی تھی اور وہاں جانا چاہتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس روز لوکل ٹرین کسی وجہ سے بند تھی اور پیدل جھیل

تک پہنچنے کے لیے ہمت اور وقت درکار تھا۔ اتفاق سے وہاں ایک سرکاری نمبر پلیٹ والی وَین کھڑی تھی۔ میں نے اس کے ڈرائیور سے کہا کہ اگر وہ ہمیں جھیل پر پہنچا دے تو ہم اس کا منہ مانگا حق الخدمت ادا کر دیں گے لیکن اس نے جواب دیا کہ وہ اپنے افسر کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کے افسر کا دفتر قریب ہی تھا، میں انہیں جا ملا۔ انہوں نے میری بات بہت توجہ کے ساتھ سنی اور پوچھا کہ ہمارا تعلق کس کالج سے ہے۔ میرے جواب پر وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے، مجھ سے معانقہ کیا اور خود باہر جا کر منظور حسین سیالوی اور طلبہ کو اندر بلا لائے۔ جب ہم سب لوگ آرام کے ساتھ بیٹھ گئے تو انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ احمدی تو نہیں تاہم تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ اس افسر نے جن کا نام میں اب بھول رہا ہوں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ انہوں نے ہماری بھرپور تواضع بھی کی اور جھیل کے علاوہ چھانگا مانگا کے دیگر قابل دید مقامات کی سیر بھی کرا دی۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب کالج کے اس ماحول کی برکت ہے جس میں مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر ہر طالب علم کو پڑھائی کے یکساں مواقع میسر تھے۔

سلطان اکبر کئی سال تک پنجاب یونیورسٹی اور اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کے بورڈ آف سٹڈیز (عربی) کے ممبر رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ جامعہ احمدیہ ربوہ میں اعزازی طور پر پڑھاتے رہے۔

وہ ۱۹۹۹ء میں امریکہ منتقل ہو گئے اور نیوجرسی میں مقیم ہیں۔

مجھے سلطان اکبر کی قابلیت سے زیادہ ان کی شفقت و محبت اور وضعداری نے متاثر کیا۔ اس امر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کالج چھوڑنے کے تقریباً پینتیس سال بعد جب میں اپنا کویت کا سفرنامہ لکھ رہا تھا مجھے اُس ملک کے بارے میں عربی کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ کرانے کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی وقت نہ لگا کہ میں اس کام کے لیے استادِ گرامی سے درخواست کر سکتا ہوں چنانچہ جب میں نے راولپنڈی سے فون پر ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے بلا تامل میری یہ درخواست قبول کر لی اور بہت ہی قلیل وقت میں اس کتاب کا ترجمہ کر کے مجھے ارسال کر دیا۔ للہ اللہ! سخت محنت کا یہ کام انہوں نے کسی معاوضے کی توقع کے بغیر دنوں میں مکمل کر دکھایا تھا۔

محمد اسلم صابر جو فی الاصل سیالکوٹ کے قریب موضع وَینس نیواں سے تعلق رکھتے ہیں تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ سٹوڈنٹس میں سے ہیں تاہم انہوں نے ایم اے کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا جس کے بعد ۱۹۶۲ء میں اس کالج میں بطور استاد ملازمت اختیار کر لی اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ستمبر ۱۹۹۶ء میں بیت المہدی، ربوہ میں ایک بم دھماکہ ہوا تھا۔ اسلم صابر ان دنوں قائم مقام صدر عمومی تھے اور پہلی صف میں محراب کے قریب یادِ الٰہی میں مصروف تھے۔ وہ اس دھماکے میں شدید زخمی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے جان تو محفوظ رکھی لیکن ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بطور نائب ناظر بیت المال خدمت سرانجام دینے لگے۔ انہیں مسلسل نو سال تک اس خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اب کچھ عرصے سے کینیڈا میں ہیں اور جامعہ احمدیہ میں پڑھا رہے ہیں۔

وہ ترنگ میں ہوں تو اپنی زندگی کے بعض واقعات بہت دلچسپ پیرائے میں سناتے ہیں۔ وہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی شخصیت سے بے حد متاثر ہیں اور ان کے ذکر کے بغیر اسلم صابر کی کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ ''میں ان کی کس کس نیکی کا ذکر کروں'' وہ اکثر کہا کرتے ہیں ''میں نے میٹرک کا امتحان سرگودھا سے پاس کیا تھا اور خدا کے فضل سے پورے ضلع میں اوّل رہا۔ میرا تعلق ضلع سیالکوٹ سے ہے لہٰذا میں چاہتا تھا کہ مرے کالج میں داخلہ لوں لیکن ایک اتفاق مجھے کھینچ کر تعلیم الاسلام کالج میں لے آیا۔ ہوا دراصل یہ کہ نتیجہ نکلنے کے بعد میں ایک بار اپنے ایک دوست سے ملنے احمد نگر گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ تعلیم الاسلام کالج لاہور سے ربوہ منتقل ہو رہا ہے اور اس سال سے کلاسز یہیں ہوا کریں گی۔ اس نے مجھے ساتھ چل کر کالج دیکھنے کی دعوت دی۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو اتفاقاً حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے ملاقات ہوگئی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں نے میٹرک کا امتحان ابھی پاس کیا ہے تو وہ میرے آئندہ پروگرام کے بارے میں پوچھنے لگے اور بین السّطور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے مرے کالج کی بجائے یہاں داخلہ لینا چاہئے۔ مجھے نیم رضامند پا کر انہوں نے مجھ سے پوچھا: اس وقت تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟ میرے پاس سیالکوٹ کے کرائے کے علاوہ صرف پانچ روپے تھے۔ میرا جواب سن کر انہوں نے پاس کھڑے ہوئے چوہدری محفوظ الرحمان سے کہا: اس بچے سے پانچ روپے لے کر اسے کالج میں داخل کرلیں۔ اگرچہ ان دنوں داخلہ لاہور میں ہو رہا تھا مگر آپ کی ہدایت پر مجھے یہیں داخل کرلیا گیا۔''

اسلم صابر کو حضور کی شفقت کے لاتعداد واقعات یاد ہیں اور وہ انہیں دہرانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ بتاتے ہیں: ''کلاسز شروع ہونے کے بعد ایک بار حضور نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور میرے خاندانی حالات دریافت فرماتے رہے۔ دو چار روز بعد مجھے دفتر کے ایک کلرک نے بتایا کہ کالج کی طرف سے میرے لیے بیس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں ہوسٹل کا میس بل پچیس روپے تک ہوتا تھا۔ اس وظیفے سے مجھے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے میں بہت سہولت ہوگئی اور میں اپنی تمام تر توجہ پڑھائی کی طرف دینے لگا۔''

موصوف چونتیس سال تک اس کالج میں پڑھاتے رہے۔ وہ بتاتے ہیں: ''ایک بار میں اپنے پیریڈ کے انتظار میں سٹاف روم میں بیٹھا تھا۔ جب وقت ہوا تو میں واش روم سے ہو کر باہر نکلا لیکن بے دھیانی میں اپنی پینٹ کے بٹن بند کرنا بھول گیا۔ اس وقت حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور ظفر وینس برآمدے میں کھڑے تھے۔ اتفاق سے حضور کی نظر میری کھلی پینٹ پر جا پڑی تو آپ نے مسکرا کر مجھے اپنی غلطی کا احساس دلایا اور یوں یہ بات آئی گئی ہوگئی لیکن ظفر وینس نے تو اس بات کا افسانہ بنا لیا۔ انہوں نے سارے سٹاف کے سامنے یہی بات کچھ اس طرح بیان کی گویا میری پینٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور جب پرنسپل صاحب نے اس طرف توجہ دلائی تو میں نے برملا کہہ دیا کہ جتنی تنخواہ مجھے مل رہی ہے اس میں تو روٹی پوری نہیں ہوتی، میں پینٹ کے بٹن کہاں سے لگواؤں۔''

میں اس بات کا چشم دید گواہ ہوں کہ سلطان اکبر اور محمد اسلم صابر، دونوں نے بہت سادہ زندگی گذاری۔ میں

نے انہیں ہمیشہ بائیسکل پر اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا۔ جب ملے متبسّم چہرے کے ساتھ۔ انہیں جن جماعتی خدمات کی توفیق ملی اس پر وہ دونوں بجا طور پر نازاں ہیں۔

بہت کم قارئین یہ جانتے ہوں گے کہ میں ایم اے پولیٹیکل سائنس کا امتحان دینے کے بعد عربی میں بھی ایم اے کرنا چاہتا تھا اور تعلیم الاسلام کالج کے شعبہ عربی کے صدر پروفیسر صوفی بشارت الرحمٰن نے بکمال مہربانی مجھے عارضی طور پر کلاس میں بیٹھنے کی اجازت بھی مرحمت فرما دی تھی۔ وہاں مجھے ان دونوں اساتذہ کے علاوہ صوفی بشارت الرحمٰن سے بھی پڑھنے کا موقع ملا لیکن جلد ہی میں نے کسی وجہ سے اپنا ارادہ بدل لیا۔

یاد رہے کہ صوفی بشارت الرحمٰن کالج کے سینئر اساتذہ میں سے تھے۔ وہ کالج کے چیف پراکٹر بھی تھے۔ ان کی شہرت ایک سخت گیر منتظم کی تھی۔ دیگر باتوں کے علاوہ وہ کالج یونیفارم کے بارے میں خاص طور پر حساس تھے اور طلبہ کا ننگے سر گھومنا تو بالکل برداشت نہ کرتے لہٰذا ایسے طلبہ انہیں دُور سے ہی دیکھ کر سر ڈھانپ لیتے یا راستہ بدل لیتے اور راستہ میں ملنے والے دوستوں کو ان کی موجودگی کی اطلاع دیتے جاتے تاکہ وہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مناسب پیش بندی کر سکیں۔

کسی زمانے میں وہ ٹاؤن کمیٹی ربوہ کے چیئرمین بھی تھے۔ اُس وقت مجھے ایک قضیّہ میں ان سے واسطہ پڑتا رہا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا رویّہ بہت ہمدردانہ تھا۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، صوفی صاحب زمانہ طالب علمی ہی سے شعائر اسلامی پر بڑی سختی سے کاربند تھے۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی نے اپنی کتاب ''بیتے لمحوں کی چاپ'' میں ادیبِ شہیر، داؤد رہبر کی یادداشتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ صوفی بشارت الرحمٰن نے ''گورنمنٹ کالج لاہور کے جلسہ تقسیم انعامات میں...... انعام وصول کرتے ہوئے مہمان خاتون سے یہ کہہ کر ہاتھ ملانے سے انکار کر کے سب کو حیران کر دیا کہ اسلام میں مرد کو عورت سے ہاتھ ملانے سے منع کیا گیا ہے۔''

میں اس واقعے کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا چنانچہ میں نے داؤد رہبر کی خودنوشت "Memories and Meanings" کی تلاش شروع کر دی اور اس حوالے سے لاہور کی تمام معروف لائبریریاں کھنگال ڈالیں تاہم یہ کتاب کہیں نہ مل سکی۔ اُس وقت تک پروفیسر سمیع اللہ قریشی وفات پا چکے تھے چنانچہ میں نے تھک ہار کر پرویز پروازی سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی کہ وہ اردو میں لکھی گئی جملہ خودنوشتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ حوالہ ذاتی طور پر ان کے علم میں بھی نہ تھا چنانچہ انہوں نے فلوریڈا میں مقیم داؤد رہبر سے فون پر گفتگو کی اور پھر مجھے بتایا: ''بھئی! داؤد رہبر کی خودنوشت تو ضرور موجود ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو صرف اُن عوامل تک محدود رکھا ہے جو اُن کی تبدیلی مذہب پر منتج ہوئے تھے۔ اس کتاب کی صرف پچاس جلدیں شائع کی گئی تھیں جو لائبریریوں میں رکھوا دی گئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس واقعہ کا ذکر اپنے کسی مضمون میں کیا تو ہے لیکن اب انہیں یاد نہیں کہ کس جگہ۔''

''اُن کی یادداشت کے مطابق اس واقعہ کی تفصیل کیا تھی؟'' میں نے پرویز پروازی سے وضاحت چاہی۔

''یہی کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک جلسہ تقسیم انعامات پر مشہور مسلم لیگی رہنما بیگم شاہنواز مہمان خصوصی تھیں۔ اس موقع پر صوفی صاحب کو بھی کوئی انعام ملنا تھا۔ جلسے کی کارروائی معمول کے مطابق جاری تھی لیکن جب ان کی باری آئی تو انہوں نے انعام وصول کرتے وقت محترمہ سے ہاتھ نہ ملایا کہ سب کو تعجب ہوا ان کو برا لگا۔ بعض لوگوں نے ان کی اس ''حرکت'' کا برا بھی منایا مگر کالج کے ایک مسلمان پروفیسر مولوی کریم بخش ان کے اس اقدام کو ہمیشہ عام سراہتے رہے۔''

ایک اور اہم بات جس کا ذکر پرویز پروازی نے اپنی کتاب ''احمدیہ کلچر اور دوسرے مضامین'' میں کیا ہے یہ ہے کہ صوفی بشارت الرحمٰن نے آئی سی ایس کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی مگر خدمت دین کا جذبہ انہیں اس طرف کھینچ لایا۔ اس حوالے سے پرویز پروازی نے موصوف کے ایک کلاس فیلو جو پچاس کی دہائی میں لاہور میں ہندوستان کے قونصل جنرل تھے کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔

جب میں نے پرویز پروازی سے اس واقعہ کی تفصیل دریافت کی تو انہوں نے بتایا: ''صوفی صاحب واقعی آئی سی ایس کے تحریری امتحان میں اول آئے تھے۔ ان کا انتخاب کس سروس کے لیے ہوا، مجھے علم نہیں۔ ان کے ایک کلاس فیلو لاہور میں انڈین ڈپٹی ہائی کمشنر تھے۔ میں قادیان کے ویزے کے لیے ان کے پاس صوفی صاحب کا خط لے کر گیا تھا۔ انہوں نے یہ بات کہی تھی اور صوفی صاحب نے تصدیق کی تھی کہ میں نے زندگی وقف کر دی اور اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ چوہدری محمد علی نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں یہی بات بیان کی ہے۔''

اگرچہ میری دانست میں کسی حتمی ثبوت کی عدم موجودگی میں یہ موضوع تشنۂ تحقیق رہتا ہے تاہم اس بحث میں پڑے بغیر یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صوفی بشارت الرحمٰن بہت اچھے انسان تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ کسی بھی امتحان میں کامیابی محنت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ اپنے شاگردوں کو بار بار اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے تاہم ان کا ایمان تھا کہ اللہ کے فضل کے بغیر یہ محنت رائیگاں بھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی اپنے شاگردوں کے لیے دعائیں کرتے اور وقتاً فوقتاً انہیں بھی دعا کی تحریک کرتے رہتے۔ مجھے یاد ہے ۱۹۶۴ء میں تعلیم الاسلام کالج سے ایم اے عربی کی پہلی کلاس امتحان دینے والی تھی۔ اس موقع پر ان کی طرف سے الفضل میں دعا کا ایک اعلان شائع ہوا جس سے اللہ تعالیٰ پر ان کے غیر متزلزل ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا: ''امسال انشاء اللہ العزیز تعلیم الاسلام کالج کے نو طلبہ و تین طالبات پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے (عربی) کے امتحان میں شامل ہو رہے ہیں۔ ہمارے کالج کی یہ پہلی کلاس ہے جو ایم اے فائنل کا امتحان دے رہی ہے اس لیے خاکسار ان کے لیے خاص طور پر تمام بزرگانِ جماعت سے درخواست کرتا ہے کہ دعا فرما دیں اللہ تعالیٰ انہیں صحیح رنگ میں محنت کرنے کی توفیق دے اور امتحان میں اعلیٰ کامیابی سے نوازے ...... اور اس کے بعد زندگی کے دوسرے بڑے امتحانوں میں بھی کامیاب کرے اور ہم سب کو نیکی، تقویٰ اور اپنی رضا کی راہوں پر گامزن رہنے کی توفیق بخشے اور سچا خادم دین بنائے نیز ہمارے مقدس مرکز ربوہ کو جس طرح اس نے آسمانی اور روحانی علوم کا گہوارہ بنایا ہے اسی طرح اسے جسمانی علوم کا مرکز بھی بنا دے۔''

ایم اے عربی کے ہر امتحان سے پہلے طلبہ کی کامیابی کے لیے دعاؤں کی خصوصی تحریک کرتے۔ ۱۹۶۶ء کا امتحان شروع ہونے سے پہلے ان کی طرف سے الفضل میں شائع ہونے والا یہ اعلان ان کی اسی سوچ کی عکاسی کرتا ہے: ''امسال ایم اے عربی کا امتحان ۱۲ جولائی سے شروع ہو رہا ہے۔ گزشتہ سال محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے یونیورسٹی کے اس امتحان میں پہلی تین پوزیشنز ہمارے کالج کے طلبہ نے حاصل کی تھیں۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ بزرگانِ سلسلہ اور احبابِ جماعت کی خدمت میں درخواست ہے کہ دعا فرمائیں کہ اس سال اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحم سے ہمارے طلبہ اور طالبات کو گزشتہ سے بڑھ کر ہر رنگ میں شاندار کامیابیاں عطا فرمائے اور ہر آن خود ان کا حافظ و ناصر ہو۔''

کسی شخص کے کردار پر سب سے مضبوط گواہی اس کے اہلِ خانہ کی ہو سکتی ہے جنہیں اس کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہوتا ہے۔ صوفی بشارت الرحمٰن کے چھوٹے بھائی، مبشر احمد طاہر جو ایک لمبا عرصہ ان کے زیرِ سایہ رہے اور آج کل برطانیہ میں مقیم ہیں کا بیان ہے کہ صوفی صاحب نماز باجماعت کے بے حد پابند تھے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں: ''میں لاہور سے میٹرک کر کے نیا نیا ربوہ آیا تھا اور یہاں کے ماحول میں ابھی گھلا ملا نہ تھا۔ ایک بار میں گول بازار میں سے گذر رہا تھا کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ اُس روز کرکٹ کا کوئی میچ ہو رہا تھا اور میں کسی دکان پر کھڑا ریڈیو سے کمنٹری سن رہا تھا۔ اچانک بھائی جان اُدھر آ نکلے۔ انہوں نے اپنی چھڑی سے مجھے ٹھوکا دیا اور کہا: نماز کا وقت ہو چکا ہے، بازار بند ہو رہا ہے اور تم ہو کہ کمنٹری سنے جا رہے ہو۔ فوراً بیت الذکر پہنچو۔''

مبشر طاہر مزید بیان کرتے ہیں: ''بھائی جان حد درجہ دیانت دار تھے۔ ایک بار باہر کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب کا گھر یہی ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ بھائی جان باہر آئے تو وہ شخص کہنے لگا کہ اس کے بیٹے کے عربی کے پرچے ان کے پاس آئے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اعلیٰ نمبروں سے پاس ہو جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لفافہ بھائی جان کو تھمانا چاہا اور بتایا کہ اس میں کچھ رقم ہے اور یہ کہ اگر یہ رقم کم ہو تو وہ مزید رقم کا بھی انتظام کر سکتا ہے۔ بھائی جان کے گھر کے ساتھ ہی روزنامہ الفضل کا دفتر تھا۔ وہ اسے ادھر لے گئے اور سامنے والی پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا وہ اسے سونے کا بنا سکتا ہے؟ وہ کھسیانا سا ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ تب بھائی جان کہنے لگے یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ میں ابھی پولیس بلاتا ہوں۔ یہ سن کر وہ شخص دُم دبا کر بھاگ گیا۔''

اس واقعہ نے مجھے سالوں پہلے کی ایک سُنی سنائی بات یاد دلا دی ہے۔ مشہور ہے کہ ایک بار جب پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پروفیسر حبیب اللہ خان کو کچھ پرچے مارکنگ کے لیے بھجوائے گئے تو ایک غرض مند اپنے پرچے کے پیچھے پیچھے ربوہ پہنچ گیا۔ وہ صوفی بشارت الرحمٰن سے متعارف تھا چنانچہ اس نے ان سے پروفیسر حبیب اللہ خان سے سفارش کی درخواست کی۔ صوفی صاحب نے اسے بہت مزیدار جواب دیا۔ انہوں نے فرمایا: تم مجھے تو اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر میں کریلا ہوں تو پروفیسر حبیب اللہ خاں ماشاء اللہ نیم چڑھے ہیں۔ اب تم

ہی بتاؤ کہ میں ان کے پاس تمہاری سفارش کس منہ سے کروں۔ صوفی صاحب نے ذاتی تعلقات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسلامی روایات کی پاسداری کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جس کی مثال آج کے ماحول میں ملنا آسان نہیں۔
اس واقعہ کے راوی میرے دوست رفیق محمد خان ہیں کہ فضل عمر ہوسٹل کی ایک تقریب میں صوفی بشارت الرحمن مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کے آخر میں دعا کے دوران کچھ لڑکے کسی بات پر ہنس پڑے۔ دعا ختم ہوئی تو صوفی صاحب نے ان لڑکوں کو سخت سست کہتے ہوئے فرمایا: اگر تعلیم الاسلام کالج ایسے ہی طلبہ پیدا کر رہا ہے جو دعا کی اہمیت سے بھی واقف نہیں تو کالج کا بند ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ان کا یہ فقرہ دراصل ان کی اس خواہش کا غماز تھا کہ تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ کو ہر لحاظ سے مثالی ہونا چاہئے۔

صوفی بشارت الرحمن ایم اے عربی کا امتحان پاس کرنے کے بعد یکم مئی ۱۹۴۵ء کو تعلیم الاسلام کالج قادیان سے منسلک ہوئے تھے۔ وہاں سے فراغت پر وہ ناظر تعلیم، صدر مجلس کار پرداز اور وکیل التعلیم تحریک جدید رہے۔ انہوں نے ۲۶ جنوری ۱۹۹۴ء کو اڑتالیس سالہ خدمات سلسلہ کے بعد قریباً اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔
روزنامہ الفضل نے ان کی وفات پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ "آپ کا شمار کثرت سے سچی خوابیں دیکھنے والے اور مستقبل کے معاملات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع پانے والے بزرگوں میں" ہوتا تھا۔
طاہر عارف جو ایک نامور خادمِ سلسلہ، مولانا محمد یار عارف کے صاحبزادے ہیں اور تکمیلِ تعلیم کے بعد پولیس سروس آف پاکستان کے رکن رہے نے ان کی وفات پر کیا خوب کہا تھا:

سراسر پیکرِ صدق و وفا تھا
مثالِ عجز، فخرِ صوفیا تھا
سُبک رفتار پہنچے آسماں تک
جہاں پہنچے وہ پہلے سے کھڑا تھا
تھا زاہد خود بھی اور واعظ بھی لیکن
وہ عاشق بھی بلا کا تھا، سدا تھا
بڑا ہے نام فرزانوں میں اس کا
وہ دیوانہ مگر اچھا بھلا تھا
سمندر علم و دانش، اِتقا کا
قد آور اور بھی ہیں وہ سوا تھا
وہ روشن ہے دلوں میں اب بھی طاہر
ستارہ جو کہ اگلے دن گرا تھا

مجھے بی اے میں جن اساتذہ سے انگریزی پڑھنے کا اتفاق ہوا ان میں صاحبزادہ مرزا خورشید احمد، ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ بھی شامل ہیں۔ آپ کی ذات یوں تو کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن شاید یہ ذکر مناسب

ہو کہ آپ حضرت مسیح موعود کے پڑپوتے، حضرت صاحبزادہ مرزا سلطان احمد کے پوتے اور صاحبزادہ مرزا عزیز احمد کے بڑے بیٹے ہیں۔

اگرچہ کالج کے زمانہ میں تو میری موصوف کے ساتھ کوئی بے تکلفی نہ تھی لیکن خوش قسمتی سے میں نے آپ کی شفقت سے ہمیشہ وافر حصہ پایا ہے۔

ستمبر ۱۹۸۶ء میں جب امی اچانک شدید بیمار ہوگئیں اور ایک روز ان کی حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تو میں نے گھبراہٹ میں ربوہ کے جن چند بزرگان سے دعا کی خصوصی درخواست کی تھی ان میں صاحبزادہ صاحب بھی شامل تھے۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھلا سکتا کہ مجھے آپ کی طرف سے فوراً تسلی کا خط موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب بزرگان کی تضرعات قبول فرمائیں اور وہ مشکل وقت بخیریت گذر گیا۔ اس واقعہ کے قریباً چھ ماہ کے بعد جب امی کا انتقال ہوا اور میں ان کی میت لے کر ربوہ پہنچا تو تعزیت کے لیے ابتدائی طور پر میری قیام گاہ پر پہنچنے والوں میں آپ بھی شامل تھے۔

صاحبزادہ صاحب نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا: ''ایک بار آپ کے چچا، ناصر صاحب نے اپنے بعض بے تکلف رفقائے کار کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ نمازِ جمعہ کے بعد ان کے ہاں جمع ہو جایا کریں تو بہت مزہ رہے گا، چائے کا دور بھی چلا کرے گا اور گپ شپ بھی ہو جائے گی۔ سب نے یہ تجویز بہت پسند کی اور کچھ دوست ان کے ہاں جمع ہونے لگے۔ ناصر صاحب اسے ''جمعہ کلب'' کہا کرتے تھے۔ بعد میں جب یہ سلسلہ چل نکلا تو یہ پارٹیاں باری باری جمعہ کلب کے ممبران کے گھروں پر ہونے لگیں۔ اس کلب کے ممبران میں میرے علاوہ ڈاکٹر سلطان محمود شاہد، چوہدری حمید اللہ، ظفر وینس اور سلطان اکبر کے نام مجھے اب تک یاد ہیں۔ کبھی کبھی مبارک مصلح الدین بھی آ جاتے۔ ان دنوں چنیوٹ کے لاری اڈے پر تکی کباب فروخت ہوتے تھے۔ ہم ناصر صاحب کی تجویز پر ایک دو بار اکٹھے یہ کباب کھانے چنیوٹ بھی گئے۔''

مرزا خورشید احمد میرے ''شوق آوارگی'' سے بخوبی آگاہ ہیں اور جب بھی ملاقات ہو اِس حوالے سے میری سرگرمیوں کے بارے میں ضرور پوچھتے ہیں۔ حال ہی میں جب میں نے اپنی کتاب ''ارمغانِ ملتان'' کا ایک نسخہ آپ کی نذر کیا تو آپ نے ۲۸ ستمبر ۲۰۱۱ء کو ازراہِ حوصلہ افزائی مجھے اپنے ایک خط میں لکھا:

''آپ کی طرف سے آپ کی تازہ تصنیف ''ارمغانِ ملتان'' ملی۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

آپ اللہ کے فضل سے ان شاگردوں میں سے ہیں جو اپنے استاد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں۔ ماشاء اللہ جتنی کتب آپ لکھ چکے ہیں استاد کو اتنے صفحے لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

میرے جیسے اساتذہ اپنے دل کو ایک مصرع سے جو ایک ایسی ہستی کا ہے اور ایسی ہستیوں کے متعلق ہے کہ ہم دونوں ان کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں تسلی دے لیتے ہیں:

شاگرد نے جو پایا استاد کی دولت ہے

اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور علمی ترقیات سے نوازتا رہے۔''

صاحبزادہ صاحب نے ایم اے انگریزی کے علاوہ انگلستان کی لیڈز یونیورسٹی سے لنگوسٹکس اور لینگوئج کا ایک سالہ کورس کر رکھا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے سید میر داؤد احمد کی وفات پر آپ کو ناظر خدمتِ درویشان مقرر کیا۔ یوں آپ کالج سے استعفیٰ دے کر اِدھر آ گئے اور آج تک کمال تندہی سے خدمتِ دین میں معروف ہیں۔

مرزا خورشید احمد اباجی کے مداحوں میں سے ہیں اور ان کی خدماتِ سلسلہ کے معترف۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں: تمہیں دیکھ کر تمہارے والد صاحب یاد آ جاتے ہیں۔ کس محنت اور جانثاری لیکن خاموشی کے ساتھ ساری زندگی خدمتِ دین میں مصروف رہے اور اس کے بدلے میں کبھی انعام کے طلب گار نہ ہوئے۔

''اُس زمانہ میں صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے کارکنوں کو ملنے والا گذارا الاؤنس اتنا کم ہوتا تھا کہ اس میں گھر کے بنیادی اخراجات بھی پورے نہ ہو سکتے تھے'' مرزا خورشید احمد نے ایک دفعہ مجھ سے ذکر کیا: ''ایک بار کہیں سے کوئی رقم آئی تو انجمن نے جھجکتے جھجکتے وہ رقم حضرت مولوی صاحب کو بھجوا دی کہ وہ اسے جس مصرف میں چاہیں لے آئیں۔ انہوں نے اس وقت تو یہ رقم قبول کر لی لیکن چند روز بعد خبر ملی کہ انہوں نے وہی رقم کسی اور مستحق کو بھجوا دی ہے۔ ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ یہ رقم اپنی ذات یا اپنے بال بچوں پر خرچ کریں۔''

''تم ان کے حالات زندگی کیوں نہیں لکھتے؟'' وہ مجھے پچھلی کئی ملاقاتوں میں یاد دہانی کرا چکے ہیں'' یہ بہت ہی ضروری بات ہے جس کی طرف تمہیں فوری توجہ کرنی چاہیئے۔''

''مجھے احساس ہے کہ میں نے اس معاملے میں بہت کوتاہی برتی ہے'' میں شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں'' لیکن اب میں نے کچھ مواد جمع کر لیا ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو جلد ہی یہ قرض ادا کر دوں گا۔''

''جلدی کرو بھئی'' وہ مجھے ہر بار یاد دلاتے ہیں'' زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ یہ نیک کام جتنی جلدی پایہ تکمیل کو پہنچ جائے اچھا ہے۔''

صاحبزادہ صاحب کی انسان دوستی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے: ربوہ میں ایک صاحب معذوری کی زندگی گذار رہے ہیں۔ میں کبھی کبھی ان کی خیریت معلوم کرنے ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ مرزا خورشید احمد پچھلے اٹھارہ بیس برسوں میں کم وبیش سو بار ان کی مزاج پرسی کے لیے ان کے ہاں قدم رنجہ فرما چکے ہیں اور یہی نہیں، وہ انہیں وقتاً فوقتاً چھوٹے موٹے تحائف بھی بھجواتے رہتے ہیں جس سے ان کی بہت دلجوئی ہوتی ہے۔''

''آپ نے سو بار کے الفاظ کثرت کے لیے استعمال کیے ہیں یا آپ کی مراد واقعی سو بار ہے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''یہ بات میں نے ایسے ہی نہیں کہہ دی۔ میاں صاحب جب بھی تشریف لاتے ہیں میں ایک نوٹ بک میں ان کی آمد کی تاریخ لکھ لیتا ہوں'' ان کی طرف سے جواب آیا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے میرے سامنے وہ نوٹ بک رکھ دی جس کے مطابق پچھلے چند برسوں کے

دوران میاں صاحب ان کے پاس ایک سو پانچ بار تشریف لائے تھے۔

اللہ اللہ! کتنے لوگ ہوں گے جو اس معاملہ میں صاحبزادہ صاحب کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کر سکیں۔

میں نے صاحبزادہ صاحب کو ہمیشہ اپنا ہمدرد و غمخوار پایا اور بعض ایسے مراحل پر جب مجھے ان کی خصوصی شفقت کی ضرورت تھی انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ آپ ہی بتایئے، میں ایسے نافع الناس وجود کی صحت و عافیت والی لمبی فعال زندگی کے لیے دعا کیوں نہ کروں؟

اور آئیں اب آپ کی ملاقات کرائیں منور شمیم خالد سے جو بی اے میں ہمیں سیاسیات کا مضمون پڑھایا کرتے تھے۔ وہ صدر شعبہ اردو شیخ محبوب عالم خالد کے فرزند ہیں اور اسی کالج کے سابق طالب علم۔ وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ انہیں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے براہِ راست اکتسابِ فیض کی سعادت حاصل رہی ہے۔ ان کا بیان ہے: ''ہماری پولیٹیکل سائنس کی کلاس دن کے دس بجے ہوا کرتی تھی۔ ہم اس سے ذرا پہلے پرنسپل آفس کے سامنے جمع ہو جاتے۔ رشید، نائب قاصد پرنسپل صاحب کو ہماری آمد کی اطلاع کرتا تو وہ اپنی ساری مصروفیات مؤخر کر دیتے۔ پانچ چھ کرسیاں تو پہلے ہی اندر پڑی ہوتی تھیں، رشید چار پانچ کرسیاں مزید لا دیتا۔ پرنسپل صاحب اٹھ کر ریٹائرنگ رُوم میں چلے جاتے اور گاؤن زیبِ تن کر کے واپس اپنی نشست پر تشریف فرما ہو جاتے جس کے بعد اپنی دائیں دراز سے رجسٹر نکال کر حاضری لگاتے اور پھر لیکچر شروع ہو جاتا۔

مجھے اب صحیح طور پر تو یاد نہیں لیکن ہماری کلاس میں گیارہ بارہ لڑکے ہوا کرتے تھے جن میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ایک صاحبزادے، مرزا حنیف احمد اور مرزا خورشید احمد کے برادرِ اصغر مرزا غلام احمد بھی شامل تھے۔ ایک بار کلاس میں حاضری غیر معمولی طور پر کم تھی۔ پرنسپل صاحب نے وجہ پوچھی تو کسی نے بتایا کہ کالج یونین کے پیش آمدہ الیکشن کی وجہ سے طلبہ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں لہٰذا صبح دیر سے اُٹھتے ہیں اور کم حاضری کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے۔ پرنسپل صاحب نے اس صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کیا اور اسی وقت جمیل ہاشمی کو طلب کیا۔ وہ آئے تو پرنسپل صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ وہ پانچویں پیریڈ میں کالج کے جملہ طلبہ اور سٹاف کو کالج ہال میں جمع کر لیں۔ اس زمانے میں ڈسپلن بہت سخت تھا چنانچہ جب ہم ہال میں پہنچے تو یہ طلبہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پرنسپل صاحب خود سٹیج پر تشریف لائے اور اعلان کیا کہ طلبہ کو کالج یونین کے الیکشن کے سلسلے میں جمع کیا گیا ہے چنانچہ اسی وقت مختلف عہدوں کے لیے امیدواروں کے نام تجویز ہوئے اور تائید کنندگان نے ان کی تائید کی جس کے بعد امیدواروں کو بعض موضوعات پر فی البدیہہ تقاریر کا موقع فراہم کیا گیا۔ طلبہ نے ہاتھ کھڑے کر کے ووٹ دیئے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر الیکشن مکمل ہو گیا۔ سب سے پہلے یونین کے صدر کا انتخاب ہوا جس میں عطاء الکریم شاہد کامیاب قرار پائے۔ افتخار احمد شہاب جو چنیوٹ کے ایک معزز گھرانے کے چراغ تھے اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی سے منسلک رہے دوسرے نمبر پر آئے۔ اس انتخاب کے موقع پر حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے ایک نئی روایت قائم فرما دی جب شکست خوردہ افتخار احمد شہاب کو Principal's Nominee کے طور پر سٹوڈنٹس یونین ایگزیکٹو کا رکن نامزد کیا گیا۔

پرنسپل صاحب کا یوں انکشن کرانا ان کی اس خواہش کا غماز تھا کہ طلبہ کا وقت قیمتی ہے اور اس کے غیر ضروری ضیاع سے بہر صورت اجتناب ہونا چاہیے۔"

منور شمیم خالد ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں کالج سٹاف میں شامل ہوئے۔ وہ بتایا کرتے ہیں:
"میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کا امتحان دینے کے بعد نتیجے کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے دفتر کی طرف سے پرنسپل صاحب کے ساتھ ملاقات کا پیغام ملا۔ میں اسی روز لاہور سے ربوہ چلا آیا اور صبح دس بجے پرنسپل آفس جا پہنچا۔ اس وقت آپ اپنے دفتر سے باہر نکل رہے تھے۔ آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا: اچھا تم آ گئے ہو۔ کلاس لینا شروع کر دو۔ اگلے روز ستمبر کی دس تاریخ تھی۔ میں گھر سے آ کر سیدھا کلاس روم میں چلا گیا۔ پہلا دن تھا اس لیے کچھ وقت تعارف میں لگ گیا۔ میں نے طلبہ کو بتایا کہ میں تو پرنسپل صاحب کے حکم کے مطابق کلاس میں آ گیا ہوں ورنہ میرا تو ابھی ایم اے کا نتیجہ بھی نہیں آیا۔ اس پر ایک طالب علم نے کہا: "سر! میں نے ابھی لائبریری میں پاکستان ٹائمز دیکھا ہے۔ ایم اے سیاسیات کا نتیجہ آ گیا ہے۔" میں پیریڈ ختم ہوتے ہی لائبریری گیا اور اس سٹوڈنٹ کی اطلاع درست پائی۔ الحمدللہ! میں اس امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا تھا۔ یہ تھا کالج میں لیکچرر کے طور پر میرا پہلا دن۔"

منور شمیم خالد انتہائی شریف النفس اور وضعدار انسان ہیں۔ وہ جب بھی ملے سراپا انکسار بن کر۔ وہ اپنے شاگردوں کی کامیابیوں پر ہمیشہ خوشی کا اظہار کرتے چنانچہ جب میری پہلی کتاب کی اشاعت کی خبر ان کی نظر سے گذری تو انہوں نے مجھے ایک خط کے ذریعے مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ "الفضل میں......شوق ہمسفر میرا کی بازگشت پڑھی اور خوشگوار حیرت ہوئی۔...... بڑے بڑے ادیبوں کی اسناد پذیرائی کے ساتھ دنیائے ادب میں شمولیت پر لازماً آپ کے والدِ گرامی کی روح بہت مسرور و شاداں ہوگی کہ وہ بھی تو قلم کے ذریعہ ساری زندگی سچائی کا اظہار و پرچار کر کے سرخرو ٹھہرے۔"

استادِ گرامی نے حضرت صاحبزادہ ناصر احمد کی شفقت سے ہمیشہ وافر حصہ پایا۔ وہ بتاتے ہیں: "یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ہی کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج میں مختلف سوسائٹیاں قائم تھیں اور ان کے فنکشنز بھی ہوتے رہتے تھے جس کی وجہ سے اخراجات بڑھتے چلے جا رہے تھے چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ ہسٹری، اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس کی سوسائٹیاں باہم مدغم کر کے صرف ایک سوسائٹی بنا دی جائے۔ اب ہر مضمون کے طلبہ کی خواہش تھی کہ اس نئی سوسائٹی کے انچارج پروفیسران کے اپنے پڑھانے والے ہوں۔ یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے آپ نے تینوں مضامین کے نمائندہ طلبہ کو اپنے دفتر میں بلایا اور ان کے سامنے کاغذ کی تین پرچیوں پر تینوں پروفیسروں کے نام لکھے۔ پھر آپ نے ان پرچیوں کو دوہرا کر کے میز پر پھینک دیا اور ایک طالب علم سے کہا کہ وہ ایک پرچی اٹھا لے۔ اٹھائی گئی پرچی کو آپ نے کھول کر پڑھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا: جو ہم چاہتے ہیں خدا ویسے ہی کر دیتا ہے۔ اس نئی سوسائٹی کے انچارج پولیٹیکل سائنس والے منور شمیم خالد ہوں گے۔ آپ نے ایک ایسا مسئلہ جو عام حالات میں جھگڑے کی صورت اختیار کر سکتا تھا چند منٹوں میں نہایت خوش اسلوبی سے حل کر دیا۔"

تعلیم الاسلام کالج کی نیشنلائزیشن کے بعد کے دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں: ”کالج کو قومی تحویل میں لینے کے بعد حکومت نے ایک بار تو تمام سٹاف ممبران کو دوسرے شہروں میں ٹرانسفر کر دیا۔ اس صورت حال میں جب کالج کے سینئر اساتذہ نے استعفے دے دیئے تو جونیئر اساتذہ کو مختلف ذمہ داریوں کی اسائنمنٹ کا مرحلہ درپیش ہوا۔ ایک دن میں گول بازار میں افضل بردرز کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ دوسری طرف سے چوہدری محمد علی آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی رُک گئے اور بتایا: میں آفس انچارج کی تقرری کے سلسلہ میں رہنمائی کے لیے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے نام تجویز کرنے کو کہا۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ایک نام لیا تو حضور نے فرمایا: کوئی اور نام؟ تب میں نے دوسرا نام پیش کیا لیکن حضور نے اسے بھی منظور نہ فرمایا۔ پانچویں یا چھٹے نمبر پر میں نے آپ کا نام پیش کیا تو فرمایا کہ اِسے مقرر کر دو۔ حضور کی دعائیں میرے شامل حال رہیں اور میں نے خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے پچیس سال تک یہ ڈیوٹی بطریقِ احسن سرانجام دی۔“

۱۹۷۴ء میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے بعد حکومتی سطح پر اس کالج کے سٹاف کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کی تلخ یادیں ابھی تک منور شمیم خالد کے ذہن سے محو نہیں ہوئیں۔ وہ بتاتے ہیں: ”یہ دسمبر ۱۹۷۴ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔ میں جلسہ سالانہ کی ڈیوٹی پر تھا کہ کالج میں نئے پرنسپل کی آمد اور ان کی طرف سے سٹاف کی طلبی کی اطلاع ملی۔ میں اور باقی سارے اساتذہ فوراً کالج پہنچے۔ زمیندارہ کالج، گجرات کے پروفیسر چوہدری محمد یعقوب نئے پرنسپل کے طور پر یہاں آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اخبارات میں خبریں آ رہی تھیں کہ ایف سی کالج کے طلبہ نے حکومت کی طرف سے مقررہ کردہ پرنسپل کو گیٹ کے اندر داخل نہیں ہونے دیا اور مطالبہ کیا ہے کہ باہر سے کسی آدمی کو لانے کی بجائے کالج سٹاف ہی سے پرنسپل لگایا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبریں چوہدری محمد یعقوب کی نظر سے بھی گذر چکی تھیں اور وہ ڈر رہے تھے کہ ہمارے طلبہ بھی ان کے ساتھ وہی سلوک نہ کریں چنانچہ انہوں نے اپنے پہلے خطاب ہی میں دھمکی دی کہ اگر کسی نے ان کے ساتھ تعاون نہ کیا تو وہ اسے پوری طاقت سے کرش کر دیں گے۔ مجھے اب بھی یاد ہے انہوں نے انگریزی کا یہ لفظ ادا کرتے ہوئے لیاقت علی خان کی طرح اپنے دائیں ہاتھ کا مکہ بھی ہوا میں لہرایا تھا۔ ان کے خطاب کے بعد ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے سٹاف کی طرف سے ان کی تعیناتی پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے انہیں ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

چوہدری صاحب ربوہ آتے ہوئے نہ جانے کن کن اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے لیکن یہاں پہنچ کر انہوں نے جو صورتِ حال دیکھی تو ربوہ اور اس کے مکینوں کے بارے میں ان کی رائے یکسر بدل گئی۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد انہوں نے خود مجھے بتایا کہ جب وہ ربوہ آئے تھے تو انہیں ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہتے تھے لیکن اب وہ خود کو اس فکر سے مکمل طور پر آزاد محسوس کرتے ہیں اور انہوں نے ان تمام افراد اور اداروں کو جو اُن کی سکیورٹی کے بارے میں پریشان رہتے ہیں کہہ دیا ہے کہ وہ اس بارے میں فکر مند ہونا چھوڑ دیں، یہاں کے سٹاف یا طلبہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

بعد کے برسوں میں جہاں تعلیم الاسلام کالج کے باقی سٹاف کو طرح طرح سے ستایا گیا منور شمیم خالد بھی

منفردانہ اکھاڑ پچھاڑ کا شکار ہوئے اور کبھی چنیوٹ اور کبھی کمالیہ بھجوائے گئے لیکن ان کی ریٹائرمنٹ ۱۹۹۹ء میں اسی کالج سے ہوئی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اس زمانے میں بی اے میں لازمی انگریزی اور دو اختیاری مضامین کے علاوہ ایک آپشنل مضمون بھی پڑھنا پڑتا تھا۔ قواعد کے مطابق عربی، فارسی اور اسلامیات میں سے ایک مضمون آپشنل مضمون کے طور چنا جا سکتا تھا۔ میں نے فارسی کا انتخاب کیا۔ کالج میں اس مضمون کے واحد استاد چوہدری عطاء اللہ سے میرا تعارف اسی حوالے سے ہوا۔ انہوں نے فارسی کچھ اس طرح پڑھائی کہ اکثر طلبہ امتحان میں بہت اچھے نمبر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی اس کامیابی میں کورس کے اختصار کے ساتھ بہت سا دخل موصوف کے طریقہ تدریس کا بھی تھا۔

چوہدری عطاء اللہ مجھ سے ایک شاگرد کے طور پر کتنی محبت رکھتے تھے اس کا اندازہ اُن کے اس خط سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپریل ۱۹۶۷ء میں میرے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا۔ چوہدری صاحب کے خط سے میری گذارش کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: ''آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ جواب میں تاخیر کے لیے نہایت شرمندہ ہوں۔

''سیاست نامہ'' پر تنقیدی نوٹ کے لیے بی اے کے فارسی کے نصاب ''گنج ادب'' کا صفحہ ۴ تا ۵ ملاحظہ ہو۔ اگر مکتفی نہ ہو تو براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا سے استفادہ کر کے اُردو میں نوٹ تیار کیا جائے گا۔ یہ کتاب اگر ہمارے ہاں نہ ہوئی تو خلافت لائبریری سے لے لی جائے گی۔ نیز تحریر فرمائیں کہ یہ نوٹ کب تک آپ کو پہنچنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو اور اپنا فضل ہمیشہ شاملِ حال رکھے''۔

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد نائب ناظر بیت المال کے طور پر صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں بیٹھنے لگے تو میں وہاں سے گذرتے ہوئے کبھی کبھی ان کے پاس بھی رک جایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت تپاک سے ملتے۔ اس عرصے میں وہ قاضی اور رکن مجلسِ کار پرداز کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

انہوں نے ۹ جنوری ۱۹۹۵ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ الفضل میں ان کی وفات کی خبر اور مقبول احمد ذبیح کے ان کے بارے میں ایک مضمون سے پتا چلتا ہے کہ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں مدرّس تھے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے کسی سرکاری سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۵۴ء میں جب تعلیم الاسلام کالج لاہور سے ربوہ منتقل ہوا اور یہاں پر اساتذہ کی کمی محسوس کی جانے لگی تو حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی تحریک پر سرکاری ملازمت خیر باد کہہ کر یہاں آ گئے اور قریباً بائیس سال تک کالج میں پڑھاتے رہے۔

حضرت سیّدہ منصورہ بیگم حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے بھی منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں مرحوم سے استفادہ کیا تھا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اُن مضامین کے علاوہ جو یونیورسٹی قواعد کے مطابق ہمیں کورس کے طور پر پڑھائے جاتے تھے ہم نے کالج میں قیام کے چاروں سال دینیات کا مضمون بھی پڑھا۔ چار مختلف اساتذہ ہمیں یہ مضمون پڑھاتے رہے۔ ان میں مولانا ابوالعطا جالندھری، مولانا غلام احمد بدوملہوی، ملک محمد عبداللہ اور چوہدری انور حسن شامل ہیں۔ اب یہ چاروں بزرگان اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجھے خالدِ احمدیت مولانا ابوالعطا جالندھری سے شرفِ تلمذ تو حاصل ہے لیکن چونکہ آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے لیے دینیات کا پیریڈ مشترک ہوتا تھا لہٰذا اس کلاس میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے مولانا کے ساتھ براہِ راست گفتگو یا سوال و جواب کا موقع بہت کم ملتا اور ان کا شاگرد ہونے کے باوجود میرا ان کے ساتھ ذاتی تعلق پیدا نہ ہو سکا۔ میں نے مولانا کے خطبات، دروس اور جماعتی اجتماعات میں ان کے خطابات تو بہت سنے تاہم ان سے وَن آن وَن ملاقات ایک ہی ہوئی اور وہ بھی کالج چھوڑنے کے کئی سال بعد، ۱۹۶۹ء میں جب میں ایم اے کا امتحان دے چکا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے وقفِ عارضی کی بابرکت تحریک جاری فرمائی تو میں نے بھی اپنا نام وقفِ عارضی کے لیے پیش کیا۔ اس تحریک کی بنیادی روح حضور کے اپنے الفاظ میں یہ تھی کہ "وہ دوست جن کو اللہ تعالیٰ توفیق دے سال میں دو ہفتہ سے چھ ہفتہ تک کا عرصہ دین کی خدمت کے لیے وقف کریں اور انہیں جماعت کے مختلف کاموں کے لیے جس جگہ بھجوایا جائے وہاں وہ اپنے خرچ پر جائیں اور ان کے وقف شدہ عرصہ میں سے جس قدر عرصہ انہیں وہاں رکھا جائے اپنے خرچ پر رہیں اور جو کام ان کے سپرد کیا جائے انہیں بجالانے کی کوشش کریں"۔ چنانچہ میں نے گذارش کی کہ نظام مجھے سو میل کے دائرہ میں جہاں چاہے بھجوا سکتا ہے۔

ان دنوں مولانا ابوالعطا جالندھری ناظر اصلاح وارشاد (شعبہ تربیت) تھے اور وقفِ عارضی کا شعبہ ان ہی کی ذمہ داری تھا چنانچہ ان کی طرف سے موصولہ چٹھی کے مطابق حضور نے راقم کو امیر وفد مقرر فرماتے ہوئے مجھے اور سید غلام قادر شاہ ساکن گوجرانوالہ کو یکم اگست ۱۹۶۹ء سے اپنا عرصہ وقف جماعت احمدیہ فیروزوالہ ضلع گوجرانوالہ میں گذارنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ وقف دو ہفتے کا تھا تاہم امی کی بیماری اور ذاتی نوعیت کی بعض دیگر وجوہ کی بنا پر میں اس وقف کی تکمیل نہ کر سکا۔

مولانا جن کا آفس دفتر پرائیویٹ سیکرٹری کے احاطہ میں تھا، سے میری پہلی اور آخری بالمشافہ ملاقات اسی وقف کے التوا کے حوالے سے تھی۔ انہوں نے میری معروضات سنیں اور بکمال شفقت میری درخواست قبول کر لی۔

اس وقت میرا ارادہ تھا کہ میں جلد ہی دوبارہ خود کو وقفِ عارضی کے لیے پیش کردوں گا تاہم ملازمت میں آنے کے بعد بدقسمتی سے اس طرف توجہ ہی نہ دے پایا حتّٰی کہ ۲۰۱۲ء آ گیا۔ میں ان دنوں لاہور کے حلقہ گلبرگ میں مقیم تھا۔ اب وقفِ عارضی کے لیے شہر سے باہر جانے اور عرصہ وقف کلی طور پر وہاں گذارنے کی شرط میں نرمی برتی جانے لگی تھی اور اس بات کی اجازت ہوگئی تھی کہ عرصہ وقف مقامی جماعت میں بھی گذارا جائے چنانچہ میں نے اور صدر جماعت احمدیہ گلبرگ، عبدالشکور نے یہ عرصہ حلقہ کیتھال پارک میں گذارا۔ اس حلقہ کا نماز

سنٹر مین مارکیٹ گلبرگ میں ہے۔ ہم مغرب کی نماز وہاں جا کر ادا کرتے جس کے بعد قرآن پاک کا درس دیتے۔ ہم نے اس دوران صدر جماعت احمدیہ کینال پارک کے منشا کے مطابق حلقہ کے بعض احمدی گھرانوں کا دورہ کیا اور انہیں احکامِ اسلامی اور جماعتی ہدایات کی پابندی کی طرف توجہ دلائی۔ اس عرصہ میں ہمیں ایک اجلاس عام سے خطاب کا موقع ملا اور پروفیسر بشیر احمد (جو ۲۸ مئی کے سانحہ لاہور میں شدید زخمی ہوئے تھے اور اُس وقت صاحب فراش تھے) کی کئی بار عیادت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

یہ وقفِ عارضی میرے لیے کئی لحاظ سے باعثِ خیر و برکت ثابت ہوا۔ اس عرصہ میں کم از کم دو نمازوں کی باجماعت ادائی کی توفیق ملتی رہی، قرآن فہمی میں اضافہ ہوا، بعض افراد کو قرآن پاک کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرنے کا موقع ملا، احباب کو جماعتی چندوں کی بروقت ادائی کی تلقین کا موقع ملا اور بہت سے نئے احمدی دوستوں سے تعارف حاصل ہوا۔ اس لحاظ سے یہ چند روز میری زندگی کے یادگار دن ثابت ہوئے۔ اس تجربے کے نتیجے میں میرے اس یقین میں پختگی آئی کہ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے خدائی منشا کے تحت جاری فرمائی تھی۔ مجھ پر حضور کے ان الفاظ کی صداقت بھی عیاں ہونے لگی جو حضور نے وقفِ عارضی سے واقفین کو پہنچنے والے فوائد کی وضاحت کرتے ہوئے ادا فرمائے تھے یعنی: ”جو لوگ وقفِ عارضی پر جاتے ہیں ان کو اپنے نفس کا بعض پہلوؤں سے محاسبہ کرنا پڑتا ہے۔ جانے سے پہلے انہیں اپنی بعض کمزوریوں کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اور دعاؤں کی طرف ان کی توجہ مائل ہو جاتی ہے یعنی وقفِ عارضی پر جانے کی جو تیاری ہے اس کا بڑا حصہ یہ ہے کہ وہ دعاؤں کی طرف متوجہ ہونے اور اپنی دینی معلومات میں اضافہ کرنے یا انہیں تازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جانے سے پہلے کتب کا زیادہ مطالعہ کرتے ہیں اور کچھ کتب اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں اور اپنی غفلتوں اور کمزوریوں پر نگاہ رکھتے ہوئے انہیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ دوسری جگہ جائیں تو لوگوں کے لیے نیک نمونہ بنیں، ان کے لیے ٹھوکر کا باعث نہ بنیں چنانچہ وقفِ عارضی کے وفود نے دعاؤں کی برکات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔“

جہاں تک مولانا غلام احمد بدوملہوی کا تعلق ہے وہ سلسلہ کے متبحر اور جید عالم اور معروف مربی تھے۔ وہ یکے از رفقائے حضرت مسیح موعود، حضرت مولوی عبدالحق کے صاحبزادے تھے اور انہیں خود بھی سات سال کی عمر میں ۱۹۰۷ء میں حضرت مسیح موعود کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ وہ مدرسہ احمدیہ سے فارغ التحصیل تھے۔ ان ہی کی گیمبیا میں بطور مربی انچارج تعیناتی کے زمانے میں وہاں کے گورنر جنرل آنریبل سنگھاٹے کو اُن کی درخواست پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے حضرت مسیح موعود کے مستعمل کپڑے کا ایک حصہ ارسال فرمایا اور اس طرح حضور کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ ”بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔“ بعد میں مولانا کو جزائر فجی میں بھی خدمتِ سلسلہ کا موقع ملا۔

مولانا پہلے احمد نگر میں مقیم تھے۔ پھر انہیں انجمن کا ایک کوارٹر الاٹ ہو گیا۔ یوں ہم اور مولانا کچھ عرصہ ایک ساتھ رہے۔ اُن کی اہلیہ ثانی، رابعہ بیگم امی کی ماموں زاد تھیں لہٰذا میرا بچپن ہی سے مولانا کے ہاں آنا جانا

تھا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ شفقت کا برتاؤ کرتے۔

اس وقت تک پاکستان میں ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کی رجسٹریشن کا قانون نافذ نہیں ہوا تھا اور ہر شخص ہومیو پیتھک پریکٹس میں آزاد تھا۔ کسی واضح ممانعتی قانون کی عدم موجودگی میں ان دنوں بعض نام نہاد ہومیو پیتھک میڈیکل کالج معمولی فیس کی ادائی پر ''ڈگریاں'' جاری کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے مولانا نے بھی اپنی بیٹھک میں ڈی ایچ ایم ایس کی ''ڈگری'' جو ایسے ہی کسی ہومیو پیتھک میڈیکل کالج کی جاری کردہ تھی آویزاں کر رکھی تھی۔ اس ڈگری کے مطابق مولانا ڈی ایچ ایم ایس (گولڈ میڈلسٹ) تھے۔ میں چھوٹا تھا اور ''وچلی گل'' سے مکمل طور پر بے خبر چنانچہ میں نے ایک بار ان سے پوچھا کہ کیا یہ طلائی تمغہ انہیں پنجاب بھر میں اوّل آنے پر ملا تھا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہے اور مجھے مطمئن کرنے کے لیے کوئی جھوٹی کہانی گھڑنے کی بجائے مسکرا کر جواب دیا: ''بھئی! کون سے تمغے کی بات کر رہے ہو۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ڈی ایچ ایم ایس کی ڈگری دو سو روپے میں مل رہی تھی جب کہ پچاس روپے کی فاضل ادائی پر مجھے یہ ڈگری مل سکتی تھی۔ میں نے سوچا جہاں دو سو، وہاں ڈھائی سو، کیوں نہ گولڈ میڈلسٹ والی ڈگری لے لوں۔''

بعد میں جب مولانا فیکٹری ایریا میں اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے تو بھی ان کے ساتھ میرا مسلسل رابطہ رہا اور کئی بار ان کی مجلس سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پوری دلجمعی سے ہومیو پیتھک پریکٹس کی طرف متوجہ ہوئے اور باقی تمام زندگی اہلِ محلّہ کی خدمت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

انہوں نے اٹھارہ اگست ۱۹۷۸ء کو کراچی میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مولانا کے زندہ رہ جانے والے کارناموں میں سے ایک قرآن حکیم کا اردو ترجمہ ہے جو اَب نایاب ہے۔ انہوں نے جماعت کے خلاف مشہور ''مقدمۂ بہاولپور'' میں مولانا جلال الدین شمس کی معاونت کی اور اس حوالے سے ان کی کتاب ''بیان المجاہد'' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ان کی اہلیہ ثانی سے ایک بیٹی اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ انیسہ سب سے بڑی ہیں اور شادی کے بعد ربوہ ہی میں مقیم ہیں۔ بڑا بیٹا، مجید مبارک بھی پاکستان میں ہے جب کہ چھوٹا بیٹا، حمید مدت سے امریکہ منتقل ہو چکا ہے۔

ملک محمد عبد اللہ جو سموٗیال کے رہنے والے رفیق حضرت مسیح موعود، حضرت ملک حسن محمد کے صاحبزادے تھے قریباً آٹھ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ قادیان منتقل ہوئے۔ انہوں نے مولوی فاضل کرنے کے بعد بہت سی جگہوں پر بطور مربی خدمات سرانجام دیں اور اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل، ایڈیٹر مصباح، مینجر الفضل اور اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری حضرت خلیفۃ المسیح الثانی بھی رہے۔

وہ ۱۹۵۶ء میں تعلیم الاسلام کالج میں دینیات پڑھانے پر مامور ہوئے۔ انہوں نے اپنے کتابچہ ''میری یادیں'' میں اس دور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ایک دفعہ اٹلی سے اکنامکس کے ایک پروفیسر تشریف لائے۔ ہمارے ہاں قریباً ہر مضمون کی ایک سوسائٹی تھی اور باہر سے آنے والے مہمان کی مہمانداری اسی مضمون کی سوسائٹی کرتی تھی۔ کالج میں اکنامکس کے پروفیسر محترم ظفر احمد صاحب ونیس تھے لیکن ان کی سوسائٹی کا

بجٹ ختم تھا۔ پرنسپل صاحب نے دریافت کیا کہ دیکھیں کس سوسائٹی کا بجٹ موجود ہے، اس کی زیر نگرانی میٹنگ اور دوسرے اخراجات کرائے جائیں۔ پروفیسر ظفر احمد صاحب نے حضرت میاں صاحب کو بتلایا کہ دینیات کی سوسائٹی، مجلسِ ارشاد کے پاس کافی فنڈ ہے۔ حضرت میاں صاحب نے فرمایا کہ ٹھیک ہے لیکن یہ شرط ہے کہ جو میٹنگ ہوگی اس کی صدارت بھی دینیات کے لیکچرار کریں گے۔ دینیات کے دو لیکچرار تھے۔ ایک حضرت مولانا ابوالعطا صاحب اور دوسرا خاکسار۔ حضرت مولانا صاحب اس وقت کالج میں موجود نہ تھے اس لئے صدارت کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ میں اس بات سے گھبرایا کیوں کہ پروفیسر صاحب نے انگریزی زبان میں خطاب کرنا تھا اور دینیات کا لیکچرار انگریزی زبان کا اتنا ماہر نہ تھا۔ بہرحال چوہدری حمید احمد صاحب جو انگریزی کے پروفیسر تھے اور میرے گہرے دوست تھے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ملک صاحب آپ یوں ہی گھبرا رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کی انگریزی اچھی بھلی ہے اور آپ نے بحیثیت صدر کرنا ہی کیا ہے۔ ابتدا میں چند جملے انگریزی میں کہنے ہیں جن میں معزز مہمان سے خطاب کرنے کی درخواست کرنی ہے اور آخر میں اس کا شکریہ ادا کر کے میٹنگ کو ختم کرنا ہے۔ انہوں نے کچھ ابتدائی اور اختتامی جملے مجھے بتلا دئے اور اس طرح یہ میٹنگ عمدگی کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔''

ملک محمد عبداللہ کے بڑے بیٹے ڈاکٹر مقبول احمد کی روایت کے مطابق وہ بارہ سال تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھاتے رہے۔ انہوں نے ایک سال کے لگ بھگ صدر انجمن احمدیہ کے شعبہ زودنویسی میں بھی کام کیا۔ یہ ان کی آخری تعیناتی تھی۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد مجلسِ انصاراللہ مرکزیہ میں مختلف خدمات بجالاتے رہے۔

انہوں نے ۲۳ جنوری ۲۰۰۴ء کو بانوے سال کی عمر میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ انہوں نے دو بیٹے اور چھ بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اس موقع پر ڈاکٹر مقبول احمد (جنہیں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں حضور کی طالب علمی کے دوران ان کے ساتھ کچھ وقت اکٹھا گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی) کے نام اپنے دستِ مبارک سے تحریر کردہ تعزیتی خط میں لکھا:

''بزرگوں کا وجود بڑا بابرکت وجود ہوتا ہے۔ اولاد ان کی دعاؤں کے طفیل بہت سی ابتلاؤں سے محفوظ رہتی ہے۔ بہرحال اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا بھی ہمارا فرض ہے۔ سب نے ایک نہ ایک دن اس کے حضور حاضر ہونا ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی خدمت کی توفیق ملی۔

ملک صاحب ماشاء اللہ تمام عمر اخلاص و وفا کے ساتھ اپنا عہد نبھاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد اور نسلوں کو اُن جیسی وفا، اخلاص اور نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے اور یہی اصل چیز ہے جس سے اولاد بزرگوں کا نام زندہ رکھ سکتی ہے۔

آج میں نے ان کی نمازِ جنازہ غائب بھی پڑھا دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے مغفرت کا سلوک فرمائے، ان کے درجات بلند فرماتا رہے اور آپ سب عزیزوں کو صبر عطا فرمائے۔ میری طرف سے سب بہن بھائیوں کو تعزیت کا پیغام پہنچا دیں۔''

مولانا محمد الدین جو موضع عمر کے ضلع سیالکوٹ کے مہتاب الدین کے بیٹے تھے ۱۹۰۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ وہ ابھی چار سال کے تھے کہ والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا جس کے بعد ان کی والدہ نے موضع آلہ (کھاریاں) کے میاں محمد دین سے عقدِ ثانی کر لیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے میاں محمد دین کو احمدیت کی نعمت سے سرفراز فرمایا تو مولوی محمد الدین بھی احمدی ہو گئے اور ایک سرکاری سکول کی مدرّسی چھوڑ کر ۱۹۲۰ء میں قادیان منتقل ہو گئے۔ اس وقت وہ مڈل پاس تھے لیکن انہوں نے پڑھائی جاری رکھی اور بالآخر ایم اے اسلامیات کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں اسی مضمون کے لیکچرر ہو گئے۔ میں نے اس کالج کے طالب علم کی حیثیت سے ان سے کچھ عرصہ دینیات پڑھی۔

''لیکن انہوں نے یہ مقام ایک دن میں حاصل نہ کر لیا تھا'' ان کے ایک بیٹے، مسعود احمد نعیم نے جو آج کل ربوہ میں مقیم ہیں مجھے بتایا ''دراصل ان کی زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت تھی جسے خلیفۂ وقت کی اطاعت نے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تحریک پر اپنی زندگی وقف کی اور مرتے دم تک اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ شروع میں کالج میں لائبریرین ہوا کرتے تھے لیکن جب انہوں نے چوہدری محمد علی کے مشورے سے ایم اے کر لیا تو وہ لیکچرر بنا دئے گئے اور ۱۹۶۴ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک یہی خدمت بجا لاتے رہے۔''

مسعود نعیم نے اپنے والدِ بزرگوار کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے مزید بتایا: ''میں اُس وقت تھا تو چھوٹا ہی لیکن قیامِ پاکستان کے ابتدائی زمانہ کی کچھ باتیں مجھے واضح طور پر یاد ہیں۔ ہماری رہائش تعلیم الاسلام کالج لاہور کے احاطہ میں لائبریری کے اوپر ہوتی تھی جب کہ کالج کے بعض دیگر اساتذہ جن میں محبوب عالم خالد، صوفی بشارت الرحمٰن، فیض الرحمٰن فیضی اور چوہدری محمد علی شامل تھے قریب ہی رہائش پذیر تھے۔ والد صاحب امام الصلوٰۃ بھی تھے۔ اُن دنوں لاؤڈ سپیکر کا انتظام نہ تھا اس لئے نمازوں کے اوقات پر ندا کے علاوہ گھنٹی بھی بجائی جاتی تھی۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی پر قاتلانہ حملہ ہوا اور اس کی اطلاع لاہور پہنچی تو پرنسپل صاحب کی ہدایت پر حسن دین، مددگار کارکن نے وہ گھنٹی بجا دی۔ سننے والے گھنٹی کے بے وقت بجنے پر حیران ہوئے اور تجسّس کے تحت فوراً اکٹھے ہو گئے۔ تب انہیں اس حادثہ کی خبر ملی۔ سارے لوگ سخت آزردہ تھے اور طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب نماز عشاء ہوئی تو والد صاحب نے سورۃ فاتحہ کی قرأت کرتے ہوئے اِھْدِ نَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ والی آیت کو اتنی بار دہرایا کہ سننے والوں پر بھی رقّت طاری ہو گئی اور انہوں نے اللہ کے حضور گریہ وزاری کی انتہا کر دی۔ خدا تعالیٰ نے ان کی متضرّعانہ دعاؤں کو سنا اور جماعت کو کسی بڑے صدمے سے بچا لیا۔''

''آپ کے والد گرامی کی کوئی اور بات؟'' میں نے فرمائش کی۔

''ہمارے خاندان میں کئی نسلوں سے ایک ہی اولادِ نرینہ ہوتی چلی آ رہی تھی اور وہ بھی عین جوانی میں اللہ کو پیاری ہو جاتی'' انہوں نے جواباً کہا ''والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ وہ قادیان میں قیام کے ابتدائی ایام میں ایک دفعہ سخت بیمار ہو گئے۔ بیماری نے انہیں اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ اپنی مرضی سے حرکت بھی نہ کر سکتے تھے۔

والد صاحب سمجھنے لگے کہ ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے لیکن خدا کی شان دیکھئے وہ شفایاب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد انہیں سات بیٹوں سے نوازا۔ وہ اپنی طویل العمری اور کثرت اولاد کو احمدیت کی برکت پر محمول کیا کرتے تھے۔"

اس بات کا تو میں خود بھی شاہد ہوں کہ مولانا کا خط انتہائی پاکیزہ تھا لیکن مسعود نعیم کا کہنا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ کتابت سیکھ رکھی تھی۔

مولانا ریٹائرمنٹ کے بعد کم وبیش ایک عشرہ تک جامعہ احمدیہ میں پڑھاتے رہے۔ انہوں نے لمبا عرصہ محلہ دارالرحمت غربی، ربوہ کی صدارت نبھائی اور وہ بیت ناصر میں امام الصلوٰۃ بھی رہے۔ عمومی طور پر ان کی صحت اچھی رہی تاہم وہ اپنی زندگی کے آخری دو سال خاصے علیل رہے۔ انہیں کینسر تھا لیکن وہ سرجری کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ انہوں نے اسی کیفیت میں ۱۲ مارچ ۱۹۸۸ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

چوہدری انور حسن جنہیں ان کے والدین نے پیدائش کے وقت سے ہی وقف کر رکھا تھا تعلیم الاسلام کالج کے سابق طالب علم تھے جو پنجاب یونیورسٹی سے اسلامیات میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۶۲ء میں یہیں بطور لیکچرر تعینات ہوئے۔ وہ کچھ عرصہ ہمیں دینیات پڑھاتے رہے لیکن سچ پوچھیں تو مجھے ان کے طرزِ تدریس سے زیادہ ان کی محبت وشفقت یاد ہے۔

وہ قریباً تیرہ سال یہاں پڑھانے کے بعد سیرالیون چلے گئے اور قریباً اتنا ہی عرصہ وہاں تدریسی خدمات بجالاتے رہے۔

واپسی پر ان کا تقرر بطور نائب وکیل التصنیف تحریک جدید ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کی صحت کمزور رہتی تھی جو اٹھارہ اگست ۱۹۸۱ء کو ان کی اچانک وفات پر منتج ہوئی۔ الفضل کی اطلاع کے مطابق "وفات سے ایک دن قبل دفتر تشریف لائے، دن بھر کام کیا...... رات کو بارہ بجے تک صاحبزادی کو پڑھاتے رہے۔ پھر سو گئے۔ رات کے پچھلے پہر ان کے بیٹے کی آنکھ ان کی تکلیف کی آواز سن کر کھلی۔ اس نے پوچھا کہ پانی لاؤں تو اسے اشارے سے روک دیا۔ بچے نے اپنے چچا چوہدری سلطان احمد صاحب کو اٹھایا جنہوں نے آکر پانی پلانے کی کوشش کی مگر مرحوم جلد ہی اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہو گئے۔"

اللہ بخش صادق جو انور حسن کے دوستوں میں سے ہیں نے مجھے بتایا کہ مرحوم نظام جماعت کے ساتھ والہانہ وابستگی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر رکھی تھی اور انہیں اپنے اس عہد کو بکمال وتمام وفا کرنے کی توفیق ملی۔ جب وہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے نصرت جہاں سکیم کے تحت سیرالیون گئے تو ان کی تعیناتی احمدیہ سیکنڈری سکول، بو میں ہوئی تاہم اس ملک کی آب وہوا انہیں راس نہ آئی اور وہ دمہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے جس میں آہستہ آہستہ بہت شدت آ گئی۔ اسی دوران ان کی تبدیلی ایک دُور دراز علاقے جوُرو میں ہو گئی۔ یہ جگہ شہری سہولیات سے عاری تھی۔ یہاں بجلی تھی نہ پینے کے لیے صاف پانی میسر تھا اور

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار

کے مصداق، قریب ترین ہسپتال بھی کم و بیش تیس کلو میٹر دور تھا۔ یہاں کی آب و ہوا انور حسن کی بیماری میں اضافہ کر سکتی تھی لہٰذا ان کے بہی خواہوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جوڑو جانے سے معذرت کر لیں لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ واقفِ زندگی ہیں لہٰذا انہیں نظام کی طرف سے جو حکم ملے گا وہ اس کی تعمیل فرضِ منصبی سمجھ کر کریں گے۔ احباب انہیں اپنے اس فیصلے پر دوبارہ غور کی درخواست کرتے تو وہ جواب دیتے کہ یہی تو وقت ہے وقف نبھانے کا اور کہتے کہ اگر میں مشکلات کے خوف سے پیچھے ہٹ گیا تو خلیفہ وقت کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ انہیں یہ بھی کہا گیا کہ وہ حضور سے درخواست کر کے اپنا تبادلہ رکوا لیں یا پاکستان واپس چلے جائیں تاہم انہوں نے کسی کی نہ سنی اور جوڑو پہنچ کر اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

اب وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ان کی صحت مزید بگڑ گئی۔ بالآخر امیر جماعت احمدیہ سیرالیون کی سفارش پر انہیں واپس پاکستان بھجوایا گیا لیکن اس وقت تک ان کی صحت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا تھا۔''

''مگر آپ کو یہ ساری باتیں کس طرح معلوم ہوئیں؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''بس کسی طرح پتا چل ہی گیا۔ انور حسن تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن آپ چاہیں تو ان کے بھائی سلطان احمد سے معلوم کر سکتے ہیں۔ انور حسن کے ایک سابق رفیق کار، منیر احمد امیر جماعت احمدیہ لودھراں بھی اس سلسلے میں آپ کو معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔''

سلطان سے بات ہوئی تو انہوں نے مندرجہ بالا امور کی تصدیق کی لیکن منیر تو اس معاملے کی پوری جزئیات سے واقف ہیں۔ ''ہاں! یہ بات درست ہے'' انہوں نے فون پر مجھے بتایا ''جب انور حسن کی جوڑو میں تقرری کا معاملہ چل رہا تھا تو بورڈ کے چیئرمین نے جو اس علاقہ کے پیراماؤنٹ چیف تھے اور بخوبی سمجھتے تھے کہ اُن کی یہ تعیناتی ان کے لیے کیا مشکلات پیدا کر سکتی ہیں ان کو مشورہ دیا کہ وہ حضور کو لکھ کر اپنے لئے استثنا حاصل کر لیں لیکن ان کا ایک ہی جواب ہوتا: میں واقفِ زندگی ہوں اور نظام کے ہر حکم کا پابند۔ میں اپنے لئے کوئی رعایت طلب نہیں کر سکتا۔ وہ جوڑو چلے گئے جس سے ان کی صحت کو بے حد تلافی نقصان پہنچا۔ بالآخر ان کی وطن واپسی کا فیصلہ بھی ان کی درخواست کے بغیر امیر جماعت کی سفارش پر ہوا۔''

یہ تو تھا ان اساتذہ کا ذکرِ خیر جن سے مجھے براہِ راست اکتسابِ فیض کا موقع ملا لیکن کالج کے اُس دور کے باقی اساتذہ سے بھی مجھے ایک خاص تعلقِ خاطر رہا۔ دراصل اُس زمانے کا ربوہ آج کے ربوہ سے بالکل مختلف تھا۔ آبادی بہت کم تھی اور اکثر لوگ ایک دوسرے کو ذاتی طور پر جانتے اور ایک دوسرے کے ساتھ بے لوث محبت رکھتے تھے۔ چھوٹے اپنے بڑوں کی عزت کرتے اور بڑے چھوٹوں سے بے پناہ شفقت کا برتاؤ کرتے۔ مزید برآں بفضلہ تعالیٰ میرا شمار کالج کے محنتی طلبہ میں ہوتا تھا اور میں اپنے بزرگوں کے سامنے اظہارِ سعادت مندی کا کوئی موقع نہیں جانے دیتا تھا لہٰذا کالج کے وہ اساتذہ بھی جن سے مجھے براہِ راست تحصیل علم کا موقع نہیں ملا تھا مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ان میں پروفیسر چوہدری حمید اللہ، وکیل اعلیٰ تحریک جدید بھی شامل ہیں۔

میری تابانی ہے سب ان کی ضیا پاشی سے

چوہدری حمید اللہ کے والد بزرگوار چوہدری محمد بخش المعروف ''تار بابو'' اور میرے تایا، محمد اسحٰق کی ملازمت کا زیادہ عرصہ ریاست بہاولپور میں گذرا۔ ان دونوں کے محکمے جدا جدا تھے لیکن احمدیت نے انہیں رشتہ مؤدت میں باندھ رکھا تھا اور ان دونوں صاحبان کی اولاد بھی ایک دوسرے سے بخوبی متعارف تھی۔ خود چوہدری حمید اللہ چچا ابراہیم کی طرح کالج میں ریاضی کے استاد تھے، وہ اباجی کی خدماتِ سلسلہ سے بھی واقف تھے اور ان کی ایک بہن رضیہ سلطانہ آپی کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ اسی پس منظر میں مجھے کبھی چوہدری حمید اللہ کو اپنا تعارف کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور وہ مجھ سے ہمیشہ بہت عزت و احترام سے پیش آئے۔

میں نے ۱۹۹۱ء کے جلسہ سالانہ قادیان میں شمولیت کی غرض سے ہندوستانی ویزہ کے لئے درخواست تو بروقت دے دی تھی لیکن ویزہ لگ کر پاسپورٹ آنے میں بہت تاخیر ہوگئی۔ جب مجھے پاسپورٹ ملا تو جلسہ شروع ہونے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا اور قافلے میں شمولیت چوہدری حمید اللہ (جو جلسہ سالانہ قادیان کے انتظامات کے نگران تھے) کی منظوری کے بغیر ممکن نہ تھی۔ ان دنوں میری تقرری اسلام آباد میں تھی۔ میں اُفتاں و خیزاں ربوہ پہنچا اور مغرب کے بعد اُن سے ان کے گھر جا ملا۔ موصوف نے ضروری مدد کا وعدہ کیا اور اگلے دن صبح ہی صبح دفتری کارروائی مکمل کر کے میرا نام بھی قافلے میں شامل کرا دیا۔

جب تعلیم الاسلام کالج میں گذرے ہوئے وقت کا ذکر ہو تو چوہدری حمید اللہ بتاتے ہیں:

''صوفی بشارت الرحمٰن کالج کے چیف پراکٹر ہوا کرتے تھے اور میں پراکٹر۔ اسی دوران وہ ٹاؤن کمیٹی، ربوہ کے چیئرمین مقرر ہو گئے۔ انہوں نے پرنسپل صاحب سے درخواست کی کہ چونکہ ان کی مصروفیت بڑھ گئی ہے لہٰذا اگر انہیں چیف پراکٹر کی ذمہ داری سے فارغ کیا جا سکے تو مناسب ہوگا۔ پرنسپل صاحب نے ان کی درخواست قبول کر کے مجھے چیف پراکٹر بنا دیا۔ جب صوفی صاحب بطور چیئرمین اپنے عہدہ کی میعاد پوری کر چکے تو میں نے پرنسپل صاحب سے گذارش کی کہ چونکہ صوفی صاحب اس ذمہ داری سے فارغ ہو چکے ہیں لہٰذا مجھے چیف پراکٹر کے عہدے سے فارغ کر دیا جائے۔ اس پر آپ مسکرائے اور فرمانے لگے: ''مجھے تو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے!'' آپ نے ایک ہی فقرے میں میرے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

جب تعلیم الاسلام کالج نیشنلائز ہوا تو چوہدری حمید اللہ یہیں پڑھاتے تھے۔ نیشنلائزیشن پر جماعت کا فوری ردعمل کیا تھا، خود اُن ہی کی زبانی سنیئے: ''جب ایک حکومتی فیصلے کے تحت پرائیویٹ کالجوں کو قومیا لیا گیا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے تعلیم الاسلام کالج کے واقف زندگی اساتذہ کا ایک اجلاس طلب کیا اور اپنے خطاب

میں فرمایا کہ کالج سٹاف کو اس حکومتی اقدام پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حضور کا خیال تھا کہ بھلے یہ کالج حکومتی انتظام میں چلا جائے، اگر اس کی تابندہ روایات قائم رہتی ہیں تو ہم یہی سمجھیں گے کہ گویا یہ کالج ہمارے پاس ہی ہے لہٰذا واقفین اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ ان روایات کی حفاظت کریں۔ اس موقع پر حضور نے واقفین اساتذہ کی ایک مجلس کے قیام کا اعلان فرماتے ہوئے مجھے اس کا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس میٹنگ میں ایک مختصر سا نوٹ بھی تیار ہوا جو کہیں نہ کہیں محفوظ ہوگا۔''

''ابھی اس بات پر دو سال ہی گذرنے تھے'' چوہدری حمید اللہ کا بیان جاری تھا ''کہ ربوہ ریلوے اسٹیشن والا واقعہ ہو گیا جس کے فوراً بعد پہلے سے طے شدہ ایک منصوبے کے تحت ملک بھر میں احمدیوں کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے۔ حکومت نے اپنی انتقامی کارروائیوں کے دوران کالج کے بہت سے احمدی اساتذہ کو بھی تبدیل کر دیا۔ حد یہ ہے کہ اچھے بھلے کوالیفائیڈ اساتذہ کو چھوٹے چھوٹے دیہی کالجوں میں بھجوا دیا گیا۔ اس پر حضور نے واقفین اساتذہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے تحریری استعفے خاکسار کے پاس جمع کرا دیں۔ مقصد یہ تھا کہ جب جماعت ان اساتذہ کی ضرورت محسوس کرے گی، انہیں حکومت کی نوکری چھوڑ کر یہاں رپورٹ کرنے کی ہدایت کر دی جائے گی۔ حضور کی اس ہدایت پر جملہ واقفین اساتذہ نے اپنے اپنے استعفے میرے پاس جمع کرا دیے۔ مرزا خورشید احمد تو حضور کے ارشاد پر کچھ عرصہ پہلے ہی یہ ملازمت چھوڑ کر ناظر خدمتِ درویشان مقرر ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۴ء کے فوراً بعد حضور نے جن واقفین کو خدمت کے لیے طلب فرمایا ان میں میرے علاوہ صوفی بشارت الرحمٰن شامل تھے۔ حضور نے مجھے ناظر ضیافت مقرر فرمایا اور صوفی صاحب کو ناظر تعلیم۔ بعد میں کچھ اور اساتذہ کو بھی طلب کیا گیا لیکن زیادہ تر اساتذہ کو کالج ہی میں رہنے دیا گیا۔''

جب حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی شفقتوں اور محبتوں کا ذکر ہو تو چوہدری حمید اللہ خاموش نہیں رہ سکتے:

''آپ کی شفقت و محبت کے اتنے واقعات ہیں کہ کئی کتابیں بھی ان کا پورا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں میری اور میرے بہت سے رفقائے کار کی نئی نئی شادیاں ہوئی تھیں۔ بعض دفعہ ان کی بیویاں میکے چلی جاتیں اور گھر پر کھانے کا انتظام نہ ہوتا تو وہ دوپہر کا کھانا بابا شادی یا لال دین سے کہہ کر ہوسٹل سے منگوا لیتے۔ ایک شام میں بھی اس ارادے سے سٹاف روم میں جا بیٹھا کہ میں کھانا ہوسٹل سے منگوا لوں گا۔ ابھی کسی مددگار کارکن کا انتظار کر رہا تھا کہ میں نے لال دین کو اپنے ہاتھ میں ایک پلیٹ پکڑے اپنی طرف آتا ہوا دیکھا۔ یہ پلاؤ کی پلیٹ تھی جو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے اس ہدایت کے ساتھ بھجوائی تھی کہ سٹاف روم میں جو لیکچرر بھی بیٹھا ہوا سے پیش کر دی جائے۔ اتفاق سے میں بیٹھا تھا چنانچہ وہ پلیٹ مجھے مل گئی۔ اگلے روز جب میں نے آپ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا تو آپ بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر کہنے لگے: ''بھئی ایسے تو نہیں کہتے کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔''

چوہدری حمید اللہ اپنے رفقائے کار کا ذکر بھی بہت محبت سے کرتے ہیں۔ وہ بتایا کرتے ہیں کہ جب انہوں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد خود کو وقف کے لیے پیش کیا تو وکالتِ دیوان میں ساری کاسہ لائی شریف خالد کے

ذریعہ ہوئی جو اُن دنوں غالباً نائب وکیل الدیوان تھے۔ یہ ان کا شریف خالد کے ساتھ پہلا تعارف تھا لیکن جب وہ کالج میں اکٹھے رہے تو ان کی بہت سی خوبیاں کھل کر سامنے آئیں جن میں سے ایک ان کی بذلہ سنجی تھی۔

موصوف میاں عطاء الرحمٰن کا ایک واقعہ بایں الفاظ بیان کرتے ہیں: ''ایک بار پرنسپل صاحب کے ساتھ کسی میٹنگ میں مختلف مضامین کے نتائج پر گفتگو ہو رہی تھی اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ طلبہ کی کمزوری کی وجوہات کیا ہیں۔ جب میاں عطاء الرحمٰن سے یہی سوال پوچھا گیا تو انہوں نے بہت دلچسپ جواب دیا: سر! میں اپنا لیکچر طلبہ کے کانوں تک تو پہنچا سکتا ہوں لیکن ان کے دماغ میں ٹھونسنا میرے بس سے باہر ہے۔ پرنسپل صاحب یہ جواب سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔''

سلسلہ کے اس نامور خادم نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ جب اس حوالے سے بات ہو رہی ہو تو وہ بتاتے ہیں: ''میں نے ۱۹۴۷ء میں آٹھویں جماعت پاس کی تھی۔ ان دنوں مدرسہ احمدیہ میں داخلہ آٹھویں جماعت کے بعد ہوتا تھا چنانچہ ایک شام میری والدہ مجھے اُمّ وسیم کے پاس لے گئیں اور ان سے درخواست کی وہ حضور سے پوچھ کر بتا دیں کہ اس بچے کو مدرسہ احمدیہ میں داخلہ کرایا جائے یا وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھائی جاری رکھے۔ اُمّ وسیم نے فرمایا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا ہے، حضور یہیں سے گذر کر بیت الذکر جائیں گے۔ آپ تھوڑا سا انتظار کریں، اس وقت ان سے پوچھ لیا جائے گا۔ کچھ ہی دیر بعد حضور تشریف لے آئے۔ وہاں حمام، ایک موڑھا اور تولیہ پڑا تھا۔ حضور نے میرے سامنے اپنی پگڑی اور کوٹ اتار کر ایک طرف لٹکا دیئے، حمام کے پانی سے وضو کیا اور پھر کوٹ اور پگڑی پہن لی۔ جب حضور بیت الذکر تشریف لے جانے کے لیے باہر نکلنے لگے تو اُمّ وسیم نے میری والدہ کی درخواست حضور تک پہنچائی جس پر آپ نے فرمایا کہ مجھے سکول میں تعلیم جاری رکھنی چاہیے۔ ۱۹۴۹ء میں جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو مجھے وکیل الدیوان کی طرف سے ایک چٹھی ملی جس کے مطابق مجھے ان کے دفتر میں حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میں وقت مقررہ پر وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے علاوہ وہاں سات لڑکے اور بھی موجود ہیں۔ ہم میں سے چھ نے میٹرک کر رکھا تھا جب کہ دو انٹرمیڈیٹ پاس تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے پانچ واقفین یعنی مجھے، مبارک مصلح الدین، سمیع اللہ سیال، بشیر احمد رفیق اور ڈاکٹر محمد شفیق سہگل کو اپنا عہدِ وقف نبھانے کی توفیق بخشی جب کہ باقی تین واقفین بوجوہ بعد میں وقف جاری نہ رکھ سکے۔''

''اس موقع پر ہمارا جو تحریری امتحان لیا گیا اس کا پرچہ خود حضرت خلیفہ ثانی نے تیار کیا تھا اور اس میں سترہ چھوٹے چھوٹے سوال تھے'' چوہدری حمید اللہ بتاتے ہیں ''اس پرچے اور بعد میں حضور کے ساتھ ہونے والی ہماری ملاقات کی کچھ تفصیل میں نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ خالد میں بیان کر رکھی ہے۔ جب لڑکوں نے پرچہ حل کر لیا تو پرائیویٹ سیکرٹری نے حضور کی خدمت میں اطلاع دی۔ اس وقت ناظر صاحبان کا ایک فرشی اجلاس حضور کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ حضور نے ہمیں بھی وہیں بلا لیا اور ہمارے پرچے سب کو پڑھ کر سنائے۔ لڑکوں کے بعض جوابات ایسے تھے جو بہت دلچسپی کا باعث بنے۔ حضور نے ہمارے پرچوں پر عمومی تبصرہ کے دوران فرمایا کہ ربوہ

میں تعلیم پانے والے واقفین کی سائنسی معلومات بیرون ربوہ تعلیم حاصل کرنے والے واقفین سے کمزور ہیں۔"

"اب میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتانے لگا ہوں" چوہدری صاحب کی گفتگو جاری تھی "میرا خیال ہے کہ حضور ناظران کرام سے باز پرس فرمار ہے تھے کیوں کہ ایک ناظر نے ہم واقفین کو دیکھ کر دبی زبان میں کہا: کاش آپ کچھ دیر پہلے آگئے ہوتے!"

وہ کالج میں بطور استاد اپنا پہلا دن یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں: "میں نے ایم اے کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۵ء میں تعلیم الاسلام کالج میں جوائنگ دی تھی۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے مجھے محبوب عالم خالد سے ملنے کو کہا جو ٹائم ٹیبل کے انچارج تھے۔ میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ان کا شاگرد رہا تھا اور وہ مجھے پہلے سے پہچانتے تھے۔ انہوں نے کالج میں میرے تقرر پر مجھے مبارکباد دی اور روزمرہ کی بعض باتوں کے علاوہ جن کا تعلق میرے ٹائم ٹیبل سے تھا مجھے تاکید فرمائی کہ میں آیت قرآنی وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰناً نَّصِیْراً کا بکثرت ورد کیا کروں۔ میں نے ان کی یہ نصیحت پلے باندھ لی اور تمام زندگی اس کے فیوض و برکات سمیٹتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر آڑے وقت میں میری دستگیری فرمائی اور میری توقع سے بڑھ کر میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔"

اب یاد کرتا ہوں تو ڈاکٹر سلطان محمود شاہد سے میرا ابتدائی تعارف پرویز پروازی کی المنار میں چھپنے والی ایک نظم سے ہوا جس کا عنوان تھا:

اب سلامت رہو تو باز آؤ

یہ نظم ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کی پوسٹ ڈاکٹریٹ ریسرچ کے لیے بیرونِ ملک روانگی کے حوالے سے کہی گئی تھی اور اس میں اس خواہش کا اظہار تھا کہ خدا اس بار آپ کو خیر سے واپس لے آئے، اس کے بعد آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہ جایئے گا۔

جب میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کی تو مجھے اس نظم کی تلاش ہوئی لیکن میرے پاس متعلقہ المنار موجود تھا نہ خلافت لائبریری سے دستیاب ہو سکا۔ گوجرانوالہ میں ایک صاحب رسائل جمع کرنے کا خاص شوق رکھتے ہیں۔ وہاں سے بھی ناکامی ہوئی تو میں نے پرویز پروازی سے یہ نظم بھجوانے کی فرمائش کی تاہم وہ بھی میری کوئی مدد نہ کر سکے۔

اگلا مرحلہ یہ تھا کہ خود ڈاکٹر سلطان محمود شاہد سے ملا جائے۔ اگرچہ میں مدت دراز سے ان کے پاس حاضر نہ ہو پایا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اس عرصے میں مجھے بھول چکے ہوں گے لیکن خدا کا شکر ہے یہ میرا خیال خام ثابت ہوا۔

میں نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک نوجوان باہر نکلا۔ یہ نوجوان ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کے صاحبزادے مہمان تھے جو گورنمنٹ اسلامیہ کالج، چنیوٹ میں فارسی پڑھاتے ہیں۔ میں نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ "میں نے آپ کا ایران اور ترکی کا سفرنامہ پڑھا ہے اور اسے بہت دلچسپ پایا" انہوں نے مجھے بتایا

''اس کے بعد میں خود ایران گیا تو محسوس ہوا کہ آپ نے ایران کا کتنا صحیح اور خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔''

ان کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مجھے اسی وقت اندر بلا لیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دو چھڑیوں کے سہارے ڈرائنگ روم میں تشریف لائے اور صوفے پر بیٹھ گئے۔ کچھ پرانی باتوں کا تذکرہ ہوا۔ پھر انہوں نے میری نوٹ بک پکڑ کر اپنے ہاتھ سے اس پر یہ شعر لکھا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

میں یہ شعر پڑھ کر سخت شرمندہ ہوا اور وعدہ کیا کہ آئندہ میں جب بھی ربوہ آیا ان سے ضرور ملا کروں گا۔ مجھے وہ نظم تو نہ مل سکی لیکن ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کے ساتھ ایک دیرپا تعلق کی بنیاد بن گئی۔ خدا کا احسان ہے اس کے بعد ان کے ساتھ میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور فون پر تو بہت بار بات ہوئی۔

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد جن کا تعلق ضلع ننکانہ صاحب کے موضع شاہ مسکین سے تھا حضرت مسیح موعود کے ایک رفیق، حضرت سید سردار احمد شاہ کے صاحبزادے تھے۔ وہ سولہ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد محکمہ آبپاشی میں ہیڈ کلرک تھے اور ان کی اکثر تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں سو موصوف کی ابتدائی تعلیم مختلف مقامات بشمول شیخوپورہ، ہیڈ مرالہ اور گوجرانوالہ میں ہوئی لیکن انہوں نے میٹرک مسلم ہائی سکول، بیرون دہلی گیٹ، لاہور سے کیا۔ وہ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ میں پڑھتے رہے اور بی ایس سی کرنے کے بعد علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ واقفِ زندگی تو وہ ہمیشہ سے ہی تھے، ایم ایس سی کرنے کے بعد عملاً اس میدان میں قدم رکھ دیا اور قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ قبل ان کا تقرّر تعلیم الاسلام کالج میں ہو گیا۔

''میں اکتوبر ۱۹۵۶ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے انگلستان گیا اور یونیورسٹی آف لنڈن سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد مارچ ۱۹۵۹ء میں واپس آیا'' ڈاکٹر سلطان محمود شاہد نے خود ایک بار مجھے بتایا: ''جب میں ربوہ پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پر حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کالج کے جملہ سٹاف کے ساتھ میرے استقبال کے لیے موجود تھے اور یہ میرے لیے ایک ایسا اعزاز ہے جس پر میں جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔''

وہ ۱۹۶۳ء میں پوسٹ ڈاکٹریٹ ریسرچ کے لیے دوبارہ انگلستان گئے اور کوئین میری کالج میں کچھ وقت گزار کر واپس آئے۔ اسی بنیاد پر انہیں رائل انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کی فیلوشپ عطا کی گئی تھی۔

ضعیف العمری کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی یادداشت حیرت انگیز تھی۔ جب ان سے زمانہ طالب علمی کا کوئی واقعہ سنانے کی فرمائش کی جاتی تو وہ بعض بہت دلچسپ باتیں سناتے: ''میں کالج میں والی بال کھیلا کرتا تھا اور اپنی ٹیم کا کپتان تھا۔ اسی حوالے سے ایک کنووکیشن پر مجھے حضرت قائداعظم کے دستِ مبارک سے انعام بھی ملا۔''

''آپ کے پاس اس موقع کی تصویر تو ہوگی؟'' میں نے اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

''میرے پاس تو موجود نہیں ہے'' انہوں نے جواباً کہا ''لیکن میری معلومات کے مطابق یہ تصویر لمبا عرصہ اسلامیہ کالج میں آویزاں رہی۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں جب کالج کی صد سالہ تقریبات ہوئیں تو اس میں دنیا بھر

گئی تھی۔ میں بھی وہاں مدعو تھا۔ ایک سیشن جس کی صدارت گورنر پنجاب
سے اولڈ سٹوڈنٹس کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میں بھی وہاں مدعو تھا۔ ایک سیشن جس کی صدارت گورنر پنجاب
میاں محمد اظہر کر رہے تھے میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شمس الحق قریشی نے میرا تعارف کراتے ہوئے حاضرین کو بتایا
کہ آج ان کے درمیان ایک ایسی شخصیت بھی موجود ہے جس نے کالج والی بال ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے
قائداعظم کے دستِ مبارک سے انعام وصول کیا تھا۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اس کے بعد
جب مجھے سٹیج پر بلایا گیا تو ہال میں موجود تمام لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔ اس کے
بعد بہت سے افراد نے سٹیج پر آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور سٹیج سیکرٹری پروفیسر راس مسعود نے تو فرطِ جذبات میں
میرے ہاتھ چوم لیے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے: مجھے فخر ہے کہ آج میرے ہاتھوں نے ان ہاتھوں کو چھوا ہے
جنہیں قائداعظم کے ہاتھ سے لمس کا شرف حاصل ہے۔"

والی بال کے ساتھ ان کی یہ دلچسپی بعد میں بھی قائم رہی چنانچہ شیخ عبدالحمید عاجز نے اپنی کتاب "ریگِ رواں" میں لکھا ہے کہ مارچ ۱۹۵۱ء میں ربوہ کی والی بال ٹیم میچ کھیلنے کے لیے بٹالہ گئی۔ اس ٹیم میں ڈاکٹر سلطان محمود شاہد، صوفی بشارت الرحمٰن اور محمد اسحاق ساقی کے علاوہ بعض دوسرے دوست شامل تھے۔

تعلیم الاسلام کالج کے قومیائے جانے کے بعد ۱۹۷۷ء میں اُن کا تبادلہ گارڈن کالج، راولپنڈی میں ہو گیا جہاں وہ کم و بیش چھ سال رہے۔ آخر میں انہیں گورنمنٹ گورونانک ڈگری کالج، ننکانہ صاحب کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ وہ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں وہیں سے ریٹائر ہوئے۔

ایک بار انہوں نے اس دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا: "الحمدللہ ننکانہ کالج میں میرا قیام مختصر ہونے کے باوجود یادگار رہا اور کالج کی ترقی کے حوالے سے مجھے بہت سے کام کرانے کا موقع ملا جن میں کالج بلڈنگ کی تزئین و آرائش، کالج کنووکیشن کا انعقاد، کالج میگزین "مضراب" کا احیا اور باسکٹ بال اور بیڈمنٹن کورٹس کی تعمیر شامل ہیں۔ مضراب کا ذکر ہوا ہے تو آپ کو بتاتا چلوں کہ میں نے اس کے انچارج، پروفیسر ظفر اقبال کی خواہش پر "خالد" کے عنوان سے ایک ہلکا پھلکا افسانہ تحریر کیا جو اس رسالہ میں چھپا۔ میں نے اس افسانے میں ایک مثالی طالب علم کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔"

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ارشاد پر ۱۹۷۸ء میں ناصر کنڈر گارٹن کے نام سے ربوہ میں ایک پرائیویٹ سکول کی بنیاد رکھی جو وقت گذرنے کے ساتھ ناصر پبلک سکول کی شکل اختیار کر گیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے ایما پر الہدیٰ ماڈل انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیا۔ ناصر پبلک سکول اور الہدیٰ کالج جماعتی تعلیمی اداروں کے قومیائے جانے کے بعد ربوہ کے بچوں کو معیاری تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کی غرض سے قائم کئے گئے تھے لیکن جب جماعت کے اپنے سکول اور کالج کام کرنے لگے اور ناصر پبلک سکول یا الہدیٰ کالج کی مزید افادیت نہ رہی تو انہوں نے یہ دونوں ادارے بند کر دیئے۔

ان کی ساری زندگی درس و تدریس میں گذری تھی۔ انہیں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا تجربہ بھی حاصل تھا چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے انہیں نائیجیریا بھجوایا تا کہ وہ وہاں پر ایک نرسری/پرائمری سکول کے قیام کے

بارے میں اپنی ماہرانہ رائے دے سکیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس دورے کی رپورٹ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۸ء کے الفضل میں شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد نے ماشاء اللہ نوے سال عمر پائی۔ وہ محلہ دارالرحمت وسطی میں مقیم تھے اور پیرانہ سالی کے باوجود آخری وقت تک ذہنی طور پر بالکل تندرست حالت میں تھے۔

میں حالیہ برسوں میں ان کے پاس کئی بار حاضر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ دیکھتے ہی مجھے پہچان جاتے اور دیر تک اباجی اور چچا ابراہیم کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے۔ ایسی ہی ایک نشست میں انہوں نے ذکر کیا کہ جب وہ پی ایچ ڈی کے لیے انگلینڈ گئے اور ان کے ایک نوبل انعام یافتہ پروفیسر، ڈی ایچ آر برٹن کو ان کے احمدی ہونے کا علم ہوا تو موصوف نے اپنے دو احمدی شاگردوں کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر محمد شفیق سہگل ہیں جو لمبا عرصہ امیر جماعت احمدیہ ملتان رہے اور آج کل نائب وکیل التصنیف تحریک جدید کے طور پر خدمت بجا لا رہے ہیں جب کہ دوسرے طالب علم ڈاکٹر عبدالحمید تھے جو اَب وفات پا چکے ہیں۔ پروفیسر برٹن کا کہنا تھا کہ دونوں صاحبان سائنس کی گتھیاں سلجھانے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے اور اگر وہ پی ایچ ڈی کے بعد بھی اسی شعبے سے وابستہ رہتے تو کارہائے نمایاں سرانجام دے سکتے تھے۔

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کو ایک طویل عرصہ تک تعلیم الاسلام کالج میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی سربراہی میں کام کرنے کا موقع ملا چنانچہ اس دور کی بہت سی خوبصورت یادیں ان کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ وہ بتایا کرتے تھے: ''جس سال قادیان میں تعلیم الاسلام کالج جاری ہوا اسی سال میرے ایک عزیز، عبدالرحمٰن نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے مگر اس کے مالی حالات ایسے نہ تھے کہ قادیان میں ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کر سکتا۔ مجھے اس کی اس خواہش کا علم ہوا تو میں نے محض للہ اُسے ساتھ لیا اور قادیان پہنچ گیا۔ کالج میں انٹرویو کے لیے میں اس کے ساتھ گیا اور عبدالرحمٰن کے نامساعد حالات صاحبزادہ صاحب کے گوش گذار کئے جس پر آپ نے اُس کی پوری فیس معاف کر دی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اس کی ممکن حد تک مالی مدد بھی کی جائے گی۔''

موصوف قادیان سے ہجرت کے بعد لاہور میں تعلیم الاسلام کالج کے اجرا کا زمانہ یاد کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے: ''قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد ڈی اے وی کالج کی متروکہ عمارت تعلیم الاسلام کالج کو الاٹ ہو گئی اور کالج اس عمارت میں جاری ہو گیا۔ وہ عجیب کسمپرسی کا زمانہ تھا۔ سائنس پڑھانے والے تو موجود تھے لیکن سائنس کے پریکٹیکلز کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس وقت اس سامان کا حصول بھی مشکل تھا۔ اتفاق دیکھیے۔ قریب ہی سناتن دھرم کالج کی متروکہ عمارت میں ایم اے او کالج شروع ہو چکا تھا۔ وہاں سائنس پریکٹیکلز کا بہت سا سامان پڑا ہوا تھا لیکن پڑھانے والے میسر نہ تھے۔ اس صورت حال میں ان کالجوں کا باہمی تعاون دونوں کے لیے مفید نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ خدا نے خود اس تعاون کے اسباب پیدا فرما دیئے چنانچہ ایم اے او کالج کے پرنسپل نے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو تجویز پیش کی کہ اگر تعلیم الاسلام کالج کے پروفیسر ایم اے او کالج کے طلبہ کو سائنس

مضامین پڑھا دیا کریں تو اس کے عوض تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ سائنس پریکٹیکل ایم اے او کالج میں کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ تجویز بخوشی قبول کر لی اور اس طرح دونوں کالجوں کے طلبہ کو عمدہ اور معیاری پڑھائی کا موقع مل گیا۔''

اس واقعہ کے راوی بھی ڈاکٹر سلطان محمود شاہد ہی ہیں کہ ''اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی سے منسلک کالجوں میں کشتی رانی کا مقابلہ ہر سال دریائے راوی پر ہوتا تھا۔ فائنل مقابلہ بالعموم اسلامیہ کالج لاہور اور تعلیم الاسلام کالج کے درمیان ہوا کرتا جسے دیکھنے کے لیے دونوں کالجوں کے طلبہ کے علاوہ بہت سے دیگر شائقین بھی جمع ہو جاتے تھے۔ ایک بار جب دونوں ٹیمیں مقابلہ کے لیے آمنے سامنے کھڑی تھیں اسلامیہ کالج کے پرنسپل نے اپنی ٹیم سے وعدہ کیا کہ اگر وہ جیت گئی تو اسے سو یا شاید دو سو روپیہ انعام دیا جائے گا۔ یہ اعلان سُن کر حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے فرمایا کہ اگر اسلامیہ کالج کی ٹیم جیت گئی تو وہ اپنی طرف سے بھی اسے اتنا ہی انعام دیں گے۔ یہ مقابلہ ہماری ٹیم جیت گئی تاہم مقابلے کے بعد اسلامیہ کالج کے پرنسپل، ٹیم کے ممبران اور طلبہ نے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی بہت تعریف کی اور اعتراف کیا کہ انہوں نے اپنی ٹیم کی بجائے اپنے مدّ مقابل کو انعام دینے کا اعلان فرما کر اپنی وسیع الظرفی کا ثبوت مہیا کیا ہے۔''

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کالج کی سٹوڈنٹس یونین کے انچارج تھے اور انہوں نے سالہا سال تک یہ ذمہ داری بطریق احسن نبھائی۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنی یادداشتیں تازہ کرتے ہوئے مجھے بتایا: ''یونین کے عہدیدار اپنی میٹنگز کے دوران ایک مخصوص لباس پہنتے تھے۔ صدر سرخ رنگ کا گاؤن پہنتا جب کہ سیکرٹری کے لیے زرد رنگ کا گاؤن اور کلاس ریپریزنٹیٹوز کے لیے سیاہ رنگ کا گاؤن مخصوص تھا۔ ان گاؤنوں کے بارڈر پر دو انچ چوڑی سُرخ ریشمی پٹی لگی ہوتی تھی۔ یونین کی افتتاحی تقریب شروع ہونے سے ذرا پہلے تمام عہدیدار یہ گاؤن پہن کر ہال کے مین گیٹ پر دو دو کی قطاروں میں کھڑے ہو جاتے۔ پرنسپل صاحب ازراہِ شفقت اس جلوس کی قیادت کرتے اور یہ جلوس مین گیٹ سے داخل ہو کر ہال کے درمیان میں سے گزرتا ہوا سٹیج پر پہنچتا جہاں تمام عہدیدار اپنے لیے مختص نشستوں پر بیٹھ جاتے۔''

سٹوڈنٹس یونین کے تحت ہونے والے سالانہ مباحثوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلطان محمود شاہد نے بتایا:
''یہ بین الکلیاتی اردو و انگریزی مباحثات کالج یونین کا سب سے اہم فنکشن ہوتا تھا۔ اس موقع پر کئی کالجوں سے مقررین کی ٹیمیں شرکت کیا کرتی تھیں۔ یہ مباحثات دو دن جاری رہتے تھے۔ دوسرے دن مباحثہ شروع ہونے سے پہلے مقررین اور منتظمین کو یونین کی طرف سے عشائیہ دیا جاتا تھا جس میں پرنسپل صاحب بھی شرکت فرماتے۔ قبل ازیں جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی اور انفرادی پوزیشنیں حاصل کرنے والے مقررین کو کپ بطور انعام دیئے جاتے تھے۔ مرزا فرید احمد نے سٹوڈنٹس یونین کے ایک اہم عہدیدار کی حیثیت میں پرنسپل صاحب کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ انگریزی اور اردو مباحثوں میں پہلی تین پوزیشنیں حاصل کرنے والوں کو علی الترتیب گولڈ، سلور اور برونز میڈل بطور انعام دیئے جائیں۔ پرنسپل صاحب نے یہ تجویز قبول کر لی۔ اس فیصلے سے کالج یونین کے

مباحثات میں حصہ لینے والے کالجوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی اور یہ مباحثے آدھی آدھی رات تک جاری رہنے لگے۔“

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اپنے طلبہ سے کس درجہ محبت رکھتے تھے، اس کا اندازہ ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کے بیان کردہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ: ”کالج کے طلبہ ہمہ وقت پرنسپل آفس کے سامنے سے گذرا کرتے تھے جس سے دن بھر وہاں خاصا شور رہتا۔ ایک بار میں نے تجویز پیش کی کہ اگر پرنسپل آفس کے دروازہ کے باہر برآمدہ میں دونوں طرف پھولدار گملے رکھوا دیئے جائیں تو طلبہ کی اس راستے سے آمد و رفت بند ہو جائے گی اور پرنسپل صاحب سکون سے اپنے دفتر کا کام کر سکیں گے۔ آپ نے میری اس تجویز کو پسند نہ کیا اور فرمایا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہے کیوں کہ اس طرح طلبہ سے میرا براہِ راست رابطہ ختم ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر سلطان محمود نے مزید بیان کیا کہ ”سردیوں کے دن تھے۔ ایک دفعہ پرنسپل صاحب دفتر سے نکل کر اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگے تو برآمدے میں ایک لڑکا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ اُس کے پاس گئے اور اُس کے جسم کو ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک قمیص پہنے ہوئے ہے۔ انہوں نے اس بچے کی محرومی کو شدت سے محسوس کیا اور گھر پہنچتے ہی بازوؤں والا ایک سویٹر مجھے بھجوایا کہ میں اُس لڑکے کو دوں۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ اور سویٹر منگوا کر مستحق لڑکوں میں تقسیم کیے۔“

شادی تعلیم الاسلام کالج کا ایک جیتا جاگتا کردار تھا۔ ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کا کہنا ہے کہ ”چونکہ وہ ہر کس و ناکس کا کام بغیر حیل و حجت کے کر دیا کرتا تھا لہذا سب لوگ اسے دن بھر دوڑاتے رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کالج میں کہیں بھی ہوں، وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ضرور آپ کے سامنے سے گذرتا۔ نہایت ہی فرمانبردار تھا۔ پرنسپل صاحب کو وہ ہمیشہ ”میاں صاحب جی“ کہہ کر بات کرتا تھا۔ وہ اُس کی سادگی کی وجہ سے بھی اُس سے انتہائی شفقت سے پیش آتے اور اُس کی کوئی فرمائش رد نہ کرتے۔ طلبہ کو بھی اس بات کا علم تھا چنانچہ کسی طالب علم نے پرنسپل صاحب سے کوئی کام کروانا ہوتا تو وہ شادی کے ذریعہ فوراً ہو جاتا۔“

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کو تعلیم الاسلام کالج سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ ادارہ جس کی بنیاد حضرت مسیح موعود کے منشا سے رکھی گئی تھی جماعت کو واپس مل جائے لیکن افسوس! ان کا یہ خواب ان کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا۔

ایک بار میں ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھے تعلیم الاسلام کالج کے زمانہ کے بعض گروپ فوٹوز دکھانے لگے۔ یہ فوٹوز مختلف کانووکیشنوں کے موقع پر لیے گئے تھے۔ انہوں نے پیشکش کی کہ اگر میں چاہوں تو ان تصاویر کی کاپیاں اپنے ریکارڈ کے لیے رکھ سکتا ہوں لیکن میرے لیے ان میں سے کوئی تصویر بھی نئی نہ تھی۔ پھر کالج کے بعض پرانے اساتذہ اور ان کے ساتھ گذرے ہوئے وقت کا ذکر ہونے لگا۔ جب میں نے ان سے اجازت چاہی تو انہوں نے مجھے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر یہ شعر لکھ کر دیا:

اے دوست کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ میری ملاقاتوں پر ہمیشہ دلی مسرت کا اظہار کیا، کمزوری صحت کے باوجود دیر تک گفتگو فرمائی اور مجھے "ہمدم دیرینہ" کے اعزاز سے سرفراز فرمایا۔

میرے زمانہ طالب علمی میں پروفیسر میاں عطاء الرحمٰن کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ ان سے اور پروفیسر حبیب اللہ خان کے ساتھ میرا تعارف کالج کے سالانہ جلسہ ہائے تقسیم اسناد کے موقع پر وقتاً فوقتاً ملنے والے انعامات کے حوالے سے ہوا۔

حبیب اللہ خان علی برادران یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے بڑے بھائی جنہیں خداتعالیٰ نے دائرہ احمدیت میں داخل ہونے کی سعادت عطا فرمائی تھی اور حضرت مولانا ذوالفقار علی خان گوہر کے نام سے پہچانے جاتے تھے کے صاحبزادے تھے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، حبیب اللہ خان شروع سے ہی سلسلہ کے فدائی تھے۔ انہیں ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ نظام وصیت میں شامل ہونے کا موقع ملا تو ان کے ایک مصدق، حضرت سیٹھ محمد اعظم نے ان کے بارے میں لکھا: "ینگ مینس احمدیہ ایسوسی ایشن، حیدرآباد کا پریذیڈنٹ ہے نیز نائب ناظر امورِ عامہ حیدرآباد ہے۔ (......) کا خاص شوق رکھتا ہے۔ حضرت (خلیفۃ المسیح الثانی) کی تحریک جدید پر لبیک کہتے ہوئے اس نے دو ماہ کے لیے (......) کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں اور دفتر تحریک جدید کے حکم کے تحت مؤرمین میں مئی اور جون ۱۹۳۵ء میں (..........) خدمات احسن طور پر سرانجام دیں جس پر حضرت (خلیفۃ المسیح الثانی) نے اظہارِ خوشنودی فرمایا۔ چندوں میں بہت باقاعدہ ہے۔ جس دن سے وصیت کرنے کا ارادہ کیا ہے اسی دن چندہ وصیت ادا کرنا شروع کر دیا حالانکہ درخواست وصیت بہت بعد دی۔ غرض مسمّی حبیب اللہ خان اُن نوجوانوں میں سے ہے جن پر جماعت احمدیہ، حیدرآباد کو فخر اور ناز ہے"۔

موصوف کے ساتھ میرا تعلق استاد شاگرد والا تو نہ تھا لیکن مجھے ایک خاص حوالہ سے ان سے بہت دفعہ ملاقات کا موقع ملا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اکثر و بیشتر کلاس ٹیسٹوں اور بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل ہوتی رہی جس کی وجہ سے مجھے کالج کی طرف سے بارہا انعامات سے نوازا گیا۔ ایک موقع کے علاوہ جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا یہ انعامات ہمیشہ کتابوں کی شکل میں ہوتے جن کے ہمراہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کا دستخط شدہ ایک سرٹیفکیٹ بھی ہوتا تھا۔ کنووکیشن سے قبل مختلف امتحانات میں حاصل ہونے والی پوزیشنوں کی بنیاد پر ہر طالب علم کی انعامی رقم کا تعین کر دیا جاتا اور پھر اسے اختیار دیا جاتا کہ وہ اتنی مالیت کی اپنی پسند کی کتابوں کی فہرست مہیا کر دے۔ اگر مارکیٹ میں یہ کتابیں میسر ہوتیں تو انعام جیتنے والے طالب علم کی خواہش پوری کر دی جاتی۔ ایسے نوٹس ہمیشہ پروفیسر حبیب اللہ خان یا پروفیسر میاں عطاء الرحمٰن صاحب کے دستخط سے آویزاں ہوتے تھے۔ میں بھی ان کے پاس اپنی پسندیدہ کتابوں کی لسٹ لے جاتا اور بالعموم میری خواہش پوری کر دی جاتی۔ مجھے انعام میں جو کتب ملتی رہیں ان میں فیروز اللغات نامی اردو کی جامع ڈکشنری بھی شامل تھی جو کم و بیش نصف صدی گذرنے کے بعد آج بھی میرے

پاس موجود ہے اور بکثرت میرے استعمال میں رہی ہے۔ چیمبرز سائیکلو پیڈیا بھی ان ہی کتب میں سے تھا۔ یہ کتاب بھی اب تک میرے پاس موجود ہے اور سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کے دوران میں نے اس سے خاصا استفادہ کیا تھا۔

میں بی اے کے سالانہ امتحان کے نتائج کی بنیاد پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دو طلائی تمغوں کا مستحق تھا بوجوہ مجھے بروقت نہ مل سکے۔ قریباً دو سال بعد یونیورسٹی کی طرف سے یہ تمغے وصول ہوئے اور ۱۹۶۷ء کی کانووکیشن میں مجھے پہنائے گئے۔ اس کنووکیشن میں پروفیسر نامدار خان، مشیر محکمہ تعلیم، حکومتِ مغربی پاکستان بطور مہمانِ خاص تشریف لائے تھے۔ مجھے اس کنووکیشن میں شمولیت کے لیے دعوت نامہ اور ریہرسل میں شمولیت کی تاکید پر مشتمل مراسلہ موصول ہوا تو میں پروفیسر حبیب اللہ خان کے پاس حاضر ہوا۔ تب انہوں نے فرمایا کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اس گرانقدر انعام کا مستحق گردانے جانے پر کالج کی طرف سے بھی مجھے ایک طلائی تمغہ دینے کا فیصلہ ہوا تھا لیکن بعد میں کسی وجہ سے اسے نقرئی تمغے میں بدل دیا گیا۔ بہرحال یہ تینوں تمغے مجھے اسی موقع پر ملے۔

پرویز پروازی پروفیسر حبیب اللہ خان کے متعلق اپنے ایک مضمون میں جو اُن کی وفات پر الفضل میں شائع ہوا لکھتے ہیں کہ مرحوم لمبا عرصہ کالج میں ناظمِ امتحانات رہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے فرائض کی ادائی میں کس درجہ محتاط تھے، اس کا کچھ اندازہ فاضل مضمون نگار کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے: ''ایک بار ہم پرچہ مرتب کر کے انہیں دے آئے۔ شام کو خان صاحب ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ فرمانے لگے: ایسا نہیں ہو سکتا آپ یہ پرچہ دوبارہ مرتب کر دیں؟ ہم نے پوچھا: کیا ہوا؟ فرمایا: کچھ نہیں، پرچہ میری میز پر پڑا تھا کہ پرنسپل صاحب نے بلا لیا۔ میں اسے مقفل کئے بغیر ان سے ملنے چلا گیا۔ اوّل تو کسی نے دیکھا نہیں ہو گا کیوں کہ کوئی میری عدم موجودگی میں میرے کمرہ میں داخل نہیں ہوتا مگر شائبہ ہے کہ شاید کسی نے اندر آنے کی جرأت کر ہی لی ہو اس لیے میرا جی نہیں مانتا کہ یہی پرچہ بعینہٖ امتحان میں ڈال دوں۔ آپ مجھ پر کرم کیجئے۔ پرچہ دوبارہ بنا دیجئے۔ ہم نے پرچہ دوبارہ بنا دیا تاکہ خان صاحب کی پریشانی دُور ہو جائے۔ یہ تھا ان کا معیار! کالجوں کے مقامی امتحانوں کے بارے میں کون اتنی احتیاط کرتا ہے؟ یہ ان کی خدا خوفی تھی۔''

حبیب اللہ خان اپنے بھائی، مولانا عبدالمالک کے برعکس انتہائی دُبلے پتلے تھے۔ آخری عمر میں ان کی کمر خاصی جھک گئی تھی لیکن صحت عمومی طور پر اچھی رہی۔ پرویز پروازی کے نزدیک ''خان صاحب کی صحت کا ایک راز..... ان کی سائیکل تھی جو پطرس کی ''مرزا کی بائیسکل'' سے گہری رشتہ داری رکھتی تھی۔ دونوں ایک ہی نسل اور ایک ہی خاندان سے تھیں۔ جس بائیسکل کو خان صاحب چلایا کرتے تھے اور اس پر سارا ربوہ چھان مارتے وہ بائیسکل کسی اور سے نہیں چل سکتی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کی اولاد انہیں نئی سائیکل لے کر نہیں دیتی ہو گی۔ وہ یقیناً ایسا کر سکتے تھے مگر خان صاحب کی وضع داری کہاں جاتی؟ وہ عمر بھر کے اس ساتھی کو اپنے سے جدا کرنے کے روادار نہ تھے۔ ایک دو بار کالج کے بعض طلبہ نے اس کارِ خیر کا ارادہ بھی کیا کہ اس سائیکل کو دریا بُرد کر دیں مگر دریا پر پہنچنے

کسی گمنام محلے میں چھوڑ آئے مگر اسی شام وہ سائیکل خان صاحب کو واپس مل گئی"۔
سے پہلے ارادہ بدل لیا اور اسے
پروفیسر حبیب اللہ خان کا ذکر تو ہوا اور پروفیسر حبیب الرحمٰن شاہ کے بارے میں بات نہ
یہ کیسے ممکن ہے کہ
کی جائے جو کالج میں باٹنی پڑھاتے تھے۔ اگرچہ میں کالج میں انہیں دیکھتا تو رہا لیکن اتفاق سے کبھی ملاقات کا موقع ہی پیدا نہ ہو سکا۔ جب مجھے یہ کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو پروفیسر حبیب الرحمٰن شاہ تکمیلِ ملازمت کے بعد لاہور آ چکے تھے۔ بمشکل تمام ان کا فون نمبر ملا تو ان سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ جب میں نے انہیں خود اپنے بارے میں کچھ بتانے کی درخواست کی تو انہوں نے بتایا: "میں نے ۱۹۵۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا جس کے بعد مجھے ایک سال دیال سنگھ کالج میں اور ایک سال پنجاب یونیورسٹی میں leave vacancy پر پڑھانے کا موقع ملا۔ ۱۹۶۱ء میں میرا تقرر تعلیم الاسلام کالج میں ہوا جہاں میں ۱۹۸۷ء تک پڑھاتا رہا۔ اُن دنوں میری والدہ بقیدِ حیات تھیں اور لاہور میں رہتی تھیں۔ میری خواہش تھی کہ میں لاہور آ جاؤں لیکن لاہور کے کسی کالج میں میرا تبادلہ نہ ہو سکا۔ اتفاقاً گورنمنٹ کالج، شیخوپورہ میں ایک جگہ خالی ہوئی تو میں نے موقع غنیمت جانا اور وہاں ٹرانسفر کرا لی۔ دن کو وہاں پڑھاتا اور شام کو لاہور چلا آتا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے میری یہ خواہش پوری کر دی کہ میں اپنی والدہ کے قریب رہ کر ان کی کچھ خدمت کر سکوں۔"

جب انہیں تعلیم الاسلام کالج میں گذرے ہوئے وقت کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے جواباً کہا: "آپ کو پتا ہے عقیدۃً میرا جماعت احمدیہ سے کوئی تعلق نہیں اس لیے وہاں ملازمت اختیار کرتے ہوئے میرے ذہن میں کئی طرح کے اندیشے تھے لیکن میں یہ بات پورے صدقِ دل سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس حوالے سے کبھی کسی قابلِ ذکر پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد بہت معاملہ فہم تھے۔ انہوں نے ہاکی اور کرکٹ میں میری دلچسپی کے مدِنظر مجھے ان دونوں کھیلوں کا انچارج بنا دیا۔"

"آپ نے ان کھیلوں کی ترقی کے لیے کیا اقدامات کیے؟"

"اس سوال کا جواب کافی طویل ہے۔ کبھی بیٹھیں گے تو بات ہو گی۔ فی الحال تو میں ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد!"

"ایک بار میں کالج کی ہاکی ٹیم لے کر راولپنڈی گیا جہاں یونیورسٹی ٹورنامنٹ کے سلسلے میں ہمارا میچ گورنمنٹ ڈگری کالج اصغر مال روڈ کے ساتھ تھا۔ میچ والے روز صبح کے وقت مجھے جماعت احمدیہ کے امام، مرزا بشیر الدین محمود احمد کے انتقال کی خبر ملی۔ میں یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ میچ کھیلا جائے یا میں ٹیم لے کر واپس ربوہ چلا جاؤں۔ اُس زمانے میں فون کی سہولت عام نہ تھی اور میں پرنسپل صاحب سے ہدایات لینے کی پوزیشن میں نہ تھا چنانچہ میں نے اس سانحے کی نوعیت کے پیشِ نظر خود ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ گورنمنٹ کالج اصغر مال روڈ کو واک اوور دے دیا جائے۔ میں نے ایک تحریر اس مضمون کی لکھ کر ان کے پرنسپل کو دے دی اور ٹیم لے کر ربوہ واپس پہنچ گیا۔"

"آپ کے اس فیصلے پر کالج انتظامیہ کا کیا ردِ عمل تھا؟"

"الحمدللہ! میرے اس اقدام کو سراہا گیا۔ بعد میں گورنمنٹ کالج اصغر مال روڈ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا کہ ان کے ساتھ میچ کھیلنے کے بعد ہار جیت کا فیصلہ ہو تو حرج ہی کیا اور ہے چنانچہ بعد میں یہ میچ کھیلا گیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"یہ اور بہت سی اور باتیں آپ کو ملاقات پر بتاؤں گا۔"

جتنی دیر میں میری ان سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے اور میں آپ کے ساتھ ان کی کچھ اور یادیں شیئر کرنے کے قابل ہوتا ہوں میں کیوں نہ آپ کو پروفیسر سعید اللہ خان کے بارے میں کچھ بتاتا چلوں جن کے ساتھ میری زیادہ جان پہچان اس وقت ہوئی جب میرے ایک عزیز نے ان سے میری معرفت محلہ دارالعلوم غربی ربوہ میں بارہ مرلے کے ایک سکنی پلاٹ کا سودا کیا۔ ان دنوں انہوں نے ایک پولٹری فارم بنا رکھا تھا اور ہومیوپیتھک پریکٹس بھی کرتے تھے۔ میں اس سودے کے سلسلے میں کئی بار ان کے مکان واقع محلہ دارالفضل پر گیا اور الحمدللہ میں نے انہیں اپنا وعدہ پورا کرنے والے پایا۔

ان ہی ملاقاتوں میں انکشاف ہوا کہ سعید اللہ خان میرے لیے تو ضرور اجنبی تھے لیکن میں ان کے لیے ہرگز اجنبی نہ تھا۔ "آپ کے چچا تو میرے رفیق کار رہے ہی ہیں، آپ کے والدِ بزرگوار بھی میرے جاننے والوں میں سے تھے" انہوں نے بتایا "ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ مجھے خضاب سے الرجی ہے۔ آپ میرے لیے کوئی ہومیوپیتھی دوا تجویز کر سکتے ہیں؟"

"کیا جواب دیا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے ذہن میں ایک دو دوائیں آئیں تو سہی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اس میدان میں مجھ سے بہت آگے ہیں لہٰذا میں نے ان کے لیے کوئی دوا تجویز کرنے سے معذرت کر لی۔"

ایک بار میں نے ان سے اپنے حالاتِ زندگی بیان کرنے کی فرمائش کی تو انہوں نے بتایا کہ ان کے آباؤ اجداد ضلع لدھیانہ کے رہنے والے تھے جہاں سے ان کے والدین قادیان منتقل ہو گئے۔ بچپن میں ان کی صحت بہت کمزور رہتی تھی۔ ان کے والدین کا خیال تھا کہ وہ پڑھائی کا بوجھ برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے چنانچہ وہ ابھی آٹھویں میں تھے کہ انہوں نے اپنے والدین کو آپس میں مشورہ کرتے ہوئے سن لیا کہ کیوں نہ انہیں سکول سے ہٹا لیا جائے۔ سعید اللہ خان بتاتے ہیں کہ انہیں پڑھائی کا بے حد شوق تھا لہٰذا وہ یہ بات سن کر بہت پریشان ہوئے۔ وہ کچھ اور تو نہ کر پائے البتہ انہوں نے بیت مبارک میں بیٹھ کر رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً کا وِرد شروع کر دیا۔ ابھی ایک ماہ بھی نہ گذرا تھا کہ ان کے والدین نے خود ہی اپنے فیصلے پر نظرثانی کر لی اور یوں ان کی پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا۔

انہوں نے میٹرک کے بعد ۱۹۴۶ء میں تعلیم الاسلام کالج قادیان میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۱ء میں گریجویشن کی۔ انہوں نے دو سال بعد پرائیویٹ طالب علم کے طور پر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے شماریات کا امتحان پاس

کر لیا جس کے ساتھ ہی وہ تعلیم الاسلام کالج میں لیکچرر لگ گئے۔ یاد رہے کہ وہ اس سے پہلے کچھ عرصہ یہاں ڈیمانسٹریٹر بھی رہ چکے تھے۔
وہ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد محلہ دارالفضل میں مقیم رہے لیکن اب اپنے ایک داماد کی وفات کے بعد محلہ دارالنصر میں اپنی بیوہ بیٹی کے ہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی وقف کرنے اور پھر اس عہد کو نبھانے کی توفیق بخشی ہے۔

سعید اللہ خان بتاتے ہیں کہ وہ اپنے شاگردوں کو ہر روز گھر کا کام دیا کرتے تھے اور اگلے دن یہ کام باقاعدگی سے چیک کرتے۔ وہ صرف ان ہی طلبہ کو حاضر شمار کرتے جنہوں نے یہ کام کیا ہوتا تھا۔ وہ کام نہ کر کے آنے والے طلبہ کی حاضری نہ لگاتے۔ بے پروا طلبہ کے لیے حاضریوں کی کمی کا خوف تازیانے کا کام دیتا اور وہ پڑھائی کی طرف توجہ دینے پر مجبور ہو جاتے۔

محمد شریف خان جو اَب ڈاکٹر محمد شریف خان کے طور پر پہچانے جاتے ہیں ۱۹۶۳ء میں کالج سٹاف میں شامل ہوئے۔ انہوں نے آٹھویں جماعت میں جب وہ گکھڑ کے کسی سکول میں پڑھا کرتے تھے زندگی وقف کی اور پھر عمر بھر اس عہد کو نبھا کر دکھایا۔

ڈاکٹر شریف خان کی کامیابیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے ۱۹۹۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ژوآلوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ چھتیس سال تک تدریس کے شعبہ سے منسلک رہے اور بے شمار طلبہ نے ان کی نگرانی میں اپنے ریسرچ پیپر مکمل کیے۔ کوئی ان سے پوچھے تو وہ فخر سے بتاتے ہیں کہ انہیں ۲۰۰۲ء میں پاکستان کا ژوالوجسٹ آف دی ییئر قرار دیا گیا تھا، اب تک ان کے تین سو سے زیادہ ریسرچ پیپرز شائع ہو چکے ہیں اور ان کی دو کتابیں اردو میں، دو انگریزی میں اور ایک جرمن زبان میں شائع ہو چکی ہے۔

میں کسی مرحلے پر ان کا شاگرد نہیں رہا تاہم موصوف کے شاگرد تصدیق کرتے ہیں کہ وہ ایک انتہائی محنتی استاد تھے اور ان کی تعلیمی کمی کے مدِ نظر زیرو پیریڈ لینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ ڈاکٹر احسان اللہ ہاشمی بتاتے ہیں کہ وہ اور ڈاکٹر نصیر احمد خان کے صاحبزادے، ڈاکٹر منیر احمد خان ایف ایس سی میں کلاس فیلو تھے۔ ڈاکٹر احسان کے والدِ بزرگوار کالج میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے اور انہوں نے ڈاکٹر شریف خان سے اپنے بچے پر خصوصی توجہ کی درخواست کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر نصیر احمد خان کالج میں فزکس کے پروفیسر تھے اور یہ بات بھی ڈاکٹر شریف خان کے علم میں تھی چنانچہ وہ کلاس میں وقتاً فوقتاً ان دونوں طلبہ کو ان کا نام لے کر مخاطب کرتے تاکہ ان کی توجہ لیکچر پر مرکوز رہے۔ "مگر ان کی یہ شفقت صرف ہم دونوں تک ہی محدود نہ تھی" احسان بتاتے ہیں "ڈاکٹر صاحب اکثر طلبہ کے نام جانتے تھے اور لیکچر کے دوران انہیں بھی موقع بہ موقع اسی طرح مخاطب کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد یہ ڈاکٹر صاحب کی محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم میں سے کئی طلبہ اُس سال میڈیکل کالجوں میں گئے۔"

میں نے سن رکھا تھا کہ وہ رینگنے والے جانوروں پر تحقیق میں خاص شہرت رکھتے ہیں چنانچہ ری

علیک سلیک کے باوجود ایک روز میں نے ان سے اپنا خزینہ دکھانے کی فرمائش کر ڈالی اور اجازت ملنے پر ان کے گھر جا کر بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھا اور یہ ان کی وسیع النظر تھی کہ انہوں نے میرے طفلانہ سوالات کے جواب بھی بہت تحمل سے دیئے تھے۔

پچھلے دنوں میں نے تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی ویب سائٹ پر ان کا پیغام پڑھا تو ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے مجھے پہچاننے میں کچھ بھی دیر نہیں لگائی حتیٰ کہ میرا حلیہ بھی بتا ڈالا: ''تم وہی ہو نا لمبے سے، جو عینک لگاتے تھے۔'' یہ ان کی محبت تھی جس کی وجہ سے مجھے انہیں اپنے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتانا پڑا۔

جب میں نے ان سے عمر رفتہ کو آواز دینے کی فرمائش کی تو انہوں نے بے تکلفانہ جواب دیا: ''آپ کو یہ بات شاید عجیب لگے کہ میں اپنی ملازمت کے دوران طلبہ کی پڑھائی کے معاملہ میں بے حد سنجیدہ رہا اور میں نے اپنے کام کو رفقائے کار کے پاس بیٹھ کر خوش گپیوں میں وقت ضائع کرنے پر ہمیشہ ترجیح دی۔ میری عادت تھی کہ فرصت پاتے ہی اپنے تحقیقی کام میں مگن ہو جاتا اور اگر دو چار چھٹیاں اکٹھی آ جاتیں تو جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کا رُخ کر لیتا۔''

''کالج کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ؟'' میں نے کریدا۔

''کوئی بھی نہیں! ایک بھی نہیں!! دراصل میں مجلسی آدمی نہیں ہوں۔ شروع میں میرے ایک رفیق کار نے مجھ سے کوئی خوش طبعی کرنا چاہی تو میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں اس ڈھب کا آدمی نہیں ہوں۔ اسے میری بات سمجھ آ گئی اور پھر اس کی طرف سے یا کسی اور طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں مردم بیزار ہوں۔ میں اپنے ہم مزاج دوستوں اور اہلِ خانہ کی صحبت سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہوں چنانچہ ربوہ میں قیام کے دوران بشیر احمد رفیق، عبدالرحمٰن شاکر اور ملک صفی اللہ حال مقیم کینیڈا جمعہ کے جمعہ میرے گھر تشریف لاتے تھے۔ ان کے ساتھ دیر تک مجلس رہتی جس دوران چائے بھی چلتی رہتی اور خوش گپیاں بھی۔ میں بیوی بچوں کی کمپنی سے بھی پوری طرح محظوظ ہوتا ہوں۔ مولانا محمد احمد جلیل کی ایک صاحبزادی جو پرویز پروازی کی اہلیہ ہیں میری بیگم کی باس اور گہری سہیلی تھیں۔ اسی ناطے میری محمد احمد جلیل اور پرویز پروازی، دونوں سے گاڑھی چھنتی ہے۔''

''اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا کوئی یادگار واقعہ؟''

''میں شاید پہلے بھی کسی جگہ بیان کر چکا ہوں کہ معمول کے ایک مطالعاتی دورہ میں ہم نے ربوہ کے نواحی گاؤں، بابل برجی کی پہاڑی پر کووں کو شور مچاتے ہوئے دیکھا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہاں کوئی سانپ ہے چنانچہ میرا ایک ساتھی جس کے پاس شاٹ گن تھی سیدھا پہاڑی پر چڑھ گیا۔ وہاں سانپ واقعی موجود تھا۔ اس نے سانپ کو نشانہ بنایا تو وہ زخمی ہو گیا اور تڑپ کر میرے پاس آ گرا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ زہریلا سانپ نہیں ہے لیکن اس کیفیت میں اسے پکڑنا آسان نہیں تھا۔ دوسری طرف مجھے اندیشہ تھا کہ سانپ پتھروں میں غائب ہو سکتا ہے چنانچہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اسی کشمکش میں سانپ نے میری کلائی

میں نے بمشکل تمام اپنی کلائی اس سے آزاد کرائی اور باقی کام ملتوی کر کے کالج روانہ ہوگیا۔ زہر کی تاب نہ لاتے ہوئے سانپ راستے میں ہی مر گیا لیکن میں خدا کے فضل سے زخمی ہونے کے باوجود بالکل محفوظ رہا۔''

''آپ خود تو امریکہ چلے آئے، آپ کے زُوآلوجیکل خزینے کا کیا ہوا؟''

''وہ میں نے گورنمنٹ کالج لاہور کو دے دیا تھا۔ رہیں کتابیں تو وہ خلافت لائبریری کو پیش کر دیں اور خود ہاتھ جھاڑ کر یہاں آگیا۔''

آپ ہی کہیئے، اب ایسے علم دوست کہاں ملتے ہیں۔

میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ پروفیسر رفیق احمد ثاقب سے میرا پہلا رابطہ کب اور کس طرح ہوا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھے ہمیشہ بہت پیار دیتے رہے ہیں۔ وہ اسی کالج کے سابق طالب علم ہیں۔ وہ ۱۹۵۰ء میں ایف ایس سی میں داخل ہوئے اور جب تک تعلیم الاسلام کالج لاہور میں رہا رفیق ثاقب وہیں پڑھتے رہے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں مائیگریشن کرالی اور آنرز کی تکمیل اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری کے حصول تک وہاں رہے۔ وہ خود بتاتے ہیں: ''ایم ایس سی کر چکا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے کالج بھجوا دیا۔ اس وقت کالج میں کیمسٹری کے استاد کی کوئی جگہ خالی نہ تھی لہٰذا حضور کے حکم پر میرے لیے خاص طور پر ایک اسامی پیدا کی گئی۔ میں نے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک یہاں کام کیا جس کے بعد مجھے نائجیریا بھجوا دیا گیا۔ میں نے وہاں انیس سال کام کیا اور جب ۱۹۸۹ء میں میرا کنٹریکٹ ختم ہوگیا تو میں انگلینڈ اور امریکہ میں کچھ رخصت گذارنے کے بعد واپس ربوہ آگیا۔''

''آپ کو یاد ہے کہ امریکہ میں آپ سے ایک جماعتی فنکشن میں ملاقات بھی ہوئی تھی؟'' میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے سب یاد ہے۔ میں اپنے ایک بیٹے کے نکاح کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا'' انہوں نے جواباً کہا۔

بعد میں جب میں نے اس سفر کی رُوداد سفرنامے کی شکل میں قلمبند کی تو اس میں اس ملاقات کا بھی ذکر تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ وِرلنگ بورَو میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ''ان میں سے ایک رفیق ثاقب تھے جو کئی سال پہلے پاکستان میں تدریس کے شعبے سے منسلک تھے لیکن بہتر مواقع کی تلاش میں نائجیریا چلے گئے جہاں کم و بیش بیس سال گذارنے کے بعد وہ اب مستقل طور پر وطن لوٹ رہے تھے۔'' مدت کے بعد ان سے ربوہ میں ملاقات ہوئی تو میری یہ کتاب ان کی نظر سے گذر چکی تھی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ وہ بہتر مواقع کی تلاش میں نہیں بلکہ واقفِ زندگی کے طور پر نائجیریا گئے تھے۔ اُس وقت تک کتاب کے چار ایڈیشن آچکے تھے لہٰذا میں نے پانچویں ایڈیشن میں ''بہتر مواقع کی تلاش میں'' کے الفاظ حذف کر کے اپنی اس غلطی کی اصلاح کر دی۔

وہ ربوہ واپس پہنچے تو تعلیم الاسلام کالج قومیایا جا چکا تھا چنانچہ انہیں نائب ناظر بیت المال کے طور پر صدر انجمن احمدیہ میں تعینات کر دیا گیا۔ اگرچہ ان کی ریٹائرمنٹ تو ۱۹۹۵ء میں ہوئی تاہم انہیں ۱۹۹۸ء تک یہ خدمت

سرانجام دینے کا موقع ملا۔ بعد میں کم و بیش تین سال نصرت جہاں اکیڈمی سے بھی وابستہ رہے لیکن اب مکمل طور پر آرام کر رہے ہیں اور ربوہ کے محلہ دارالعلوم غربی میں مقیم ہیں۔

ایک روز وہ پرانی باتیں سنا رہے تھے: ''غالباً لیٹ ففٹیز کی بات ہے۔ کالج میں بائیالوجی پڑھانے کے لیے کوئی استاد موجود نہ تھا چنانچہ مجھے حکم ہوا کہ میں کیمسٹری کی بجائے اس مضمون کی کلاسز لیا کروں۔ مجھے اس حکم کی تعمیل میں اعتراض تو کوئی نہ تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں نے خود بھی یہ مضمون پڑھا نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود مسئلے کا حل تو نکالنا تھا چنانچہ میں نے اپنے طور پر باٹنی یا زوآلوجی میں ایم ایس سی کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن پتا چلا کہ پنجاب یونیورسٹی کے قواعد کسی ایسے مضمون میں ایم ایس سی کی اجازت نہیں دیتے جو بی ایس سی میں پڑھا نہ گیا ہو اور بی ایس سی میں باٹنی یا زوآلوجی کا بطور فاضل مضمون اس وقت تک امتحان نہیں دیا جا سکتا تھا جب تک ایف ایس سی میں بیالوجی نہ پڑھی ہو۔ جب یہ بات پرنسپل صاحب کے علم میں لائی گئی تو انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں بیالوجی کا بطور ایڈیشنل سبجیکٹ ایف ایس سی کا امتحان دے دوں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں داخلے جانے والے تھے چنانچہ میں نے فوری طور پر داخلہ فارم منگوایا اور اسے پُر کر کے لاہور بھیج دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور میں پہلی ہی کوشش میں اس مضمون میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اسی عرصے میں اپنے ایک پرانے کلاس فیلو، عبدالشکور اسلم کو جو بی ایس سی تک یہ مضمون پڑھ چکے تھے اور ان دنوں ملیریا اریڈیکشن پروگرام کے تحت ربوہ سے باہر کام کر رہے تھے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے ذریعہ کالج میں آنے کی ترغیب دلائی۔ وہ یہاں آ گئے۔ ان کا تقرر بطور ڈیمانسٹریٹر ہو گیا اور میں لیکچرر کے طور پر کام کرنے لگا۔''

''تحدیث نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں'' رفیق ثاقب کا بیان جاری تھا ''کہ اللہ نے ہم دونوں کو خوب محنت کی توفیق بخشی اور طلبہ کو یہ احساس نہیں ہوا کہ انہیں پڑھانے والے استاد اس کام کے پورے طور پر اہل نہیں ہیں۔ انہیں ہماری اس کمزوری کا علم تو تھا لیکن انہوں نے طعن و تشنیع سے کام لینے کی بجائے ہمارا خوب ساتھ دیا اور پوری محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔''

''نتیجہ کیسا رہا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہمارے پہلے batch نے ایف ایس سی کے امتحان میں پہلی، تیسری اور ساتویں پوزیشنیں حاصل کیں اور اس میں سے چھ لڑکے میڈیکل کالجوں میں داخل ہوئے۔ یہ ایک ریکارڈ تھا کیوں کہ ہم اس سے پہلے نہ کبھی اس کے بعد بورڈ میں اتنی پوزیشنیں اکٹھی لے سکے نہ ہی کسی اور سال اتنی بڑی تعداد میں ہمارے بچے میڈیکل کالجوں میں پہنچے۔''

یہ تو تھا رفیق ثاقب کا ذکر۔ اب سن لیجئے کچھ باتیں ان کے بھائی، مبارک احمد انصاری کے بارے میں۔

مبارک احمد انصاری نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تحریک پر اُس وقت اپنی زندگی وقف کی تھی جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انہوں نے قادیان ہی سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا تو ان کی تعلیم میں بھی رکاوٹ پڑ گئی تاہم

ہمتِ مرداں مددِ خدا کے مصداق وہ ۱۹۵۲ء میں اسی کالج سے بی ایس سی اور ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیمیکل ٹیکنالوجی میں ایم ایس سی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ''آپ حیران ہوں گے کہ تعلیم الاسلام کالج میں میرے تقرر کے لیے انٹرویو خود حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے لیا تھا'' انہوں نے ایک بار مجھے بتایا ''حضور نے جو سب سے پہلا سوال ہی یہ پوچھا کہ کیا مجھے پڑھانے کا شوق ہے۔ مجھے پڑھانے کا قطعاً شوق نہ تھا اور میں نے حضور سے یہ بات چھپانی مناسب نہ سمجھی۔ میرا خیال ہے میرے جواب نے حضور کو قدرے مایوس کیا اور آپ نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دریافت فرمایا کہ اگر مجھے اس کام پر مامور کر دیا جائے تو کیا میں اپنے اندر یہ شوق پیدا کر سکتا ہوں۔ میں واقفِ زندگی تھا اور حضور کا منشا سمجھ رہا تھا چنانچہ میں نے حضور کے سوال کا اثبات میں جواب دیا جس پر کالج میں میرا تقرر ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے اس نے مجھے وقف کا عہد نباہنے کی توفیق دی اور میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۸۸ء تک تقریباً چونتیس سال یہاں پڑھاتا رہا۔''

وہ پچھلی ربع صدی سے کینیڈا میں ہیں۔ انہیں یہاں بھی طویل جماعتی خدمات کی توفیق ملی ہے۔ بعض دیگر ذمہ داریوں کے علاوہ وہ کم و بیش دو عشروں تک صدر قضا بورڈ رہے ہیں اور انہیں جامعہ احمدیہ میں پڑھانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔

''آپ جامعہ میں کیا پڑھاتے رہے ہیں؟'' میں نے ان سے پوچھا ''آپ کا اپنا مضمون تو یہاں نہیں پڑھایا جا رہا ہو گا۔''

''میں قرآن پاک پڑھاتا رہا ہوں۔''

''ماشاء اللہ!''

''اس کا پس منظر بھی عجیب ہے۔ جن دنوں کینیڈا میں جامعہ قائم کرنے کی تجویز زیرِ غور تھی یہاں کے امیر جماعت کی طرف سے اساتذہ کے تقرر کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کو ایک فہرست ارسال کی گئی۔ حضور کی طرف سے حتمی منظوری وصول ہونے کے بعد امیر صاحب نے مجھے بتایا کہ اس فہرست میں بعض پرانے مربیان کے نام بھی شامل تھے مگر حضور نے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کے لیے میرا نام ٹِک کیا ہے۔ الحمد للہ میں حضور کے اعتماد پر پورا اترا اور مجھے سات سال تک اس خدمت کی توفیق ملی۔''

مبارک انصاری ایک بار ربوہ آئے تو نصرت جہاں اکیڈمی کو کیمسٹری کے استاد کی تلاش تھی چنانچہ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس جو اُن دنوں ناظر تعلیم تھے کی تحریک پر کم و بیش ڈیڑھ سال تک وہاں بھی پڑھاتے رہے۔

ان سے تعلیم الاسلام کالج میں گذرے ہوئے وقت کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ کہتے ہیں: ''میری ملازمت کا پورا زمانہ اسی ادارے کے ساتھ گذرا اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ میرے پاس اس زمانے کی اتنی یادیں ہیں کہ بیان کرنے لگوں تو پوری کتاب بن جائے۔ میں نے نیشنلائزیشن سے پہلے اور بعد کے، دونوں ادوار دیکھے ہیں اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نیشنلائزیشن کے بعد ہر آنے والے دن میں

کے دونوں ادوار دیکھے ہیں اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نیشنلائزیشن کے بعد جو آنے والے دن میں کالج کا قدم پیچھے کی طرف ہی گیا۔ نیشنلائزیشن سے پہلے اس کالج کے نتائج بالعموم بہت عمدہ رہتے تھے اور ہمارے طلبہ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں نمایاں پوزیشنیں حاصل کرتے تھے لیکن بعد میں اس کی شاید ہی کوئی مثال ملے۔ نیشنلائزیشن سے پہلے اس کالج میں غیر از جماعت طلبہ کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا تھا جس کی تصدیق ان میں سے بہتوں نے مختلف فورمز پر خود ہی کی ہے لیکن جب حالات بدل گئے تو کالج کے بعض احمدی طلبہ کو اس حوالے سے شکایات پیدا ہوئیں۔ نیشنلائزیشن سے پہلے ہمارے کالج کا سپورٹس خصوصاً روئنگ اور باسکٹ بال میں بڑا نام تھا لیکن بعد میں یہ سب کچھ قصۂ ماضی بن کر رہ گیا۔ پہلے دور میں ڈسپلن کی ذرا سی خلاف ورزی بھی برداشت نہ کی جاتی تھی اور اُس وقت بھی جب پنجاب بھر کے کالجوں میں ہڑتالیں روزمرہ کا معمول بن چکا تھا تعلیم الاسلام کالج میں ہڑتال کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن جب کالج نیشنلائز ہو گیا تو یہاں کیا کچھ نہیں ہوا۔ نیشنلائزیشن سے پہلے یہاں کا زیادہ تر سٹاف واقفینِ زندگی پر مشتمل تھا جو کہ خدمت کے جذبے سے سرشار تھے لیکن بعد میں یہاں ایسے استاد بھی آ گئے جن کے مقاصد کچھ اور تھے اور انہوں نے بعض ایسے مسائل پیدا کر دیئے جن کا پہلے کوئی تصور ہی نہ تھا۔''

اگر مبارک انصاری سے پوچھا جائے کہ نیشنلائزیشن کا سب سے بڑا نقصان کیا ہوا تو وہ کہتے ہیں:
''میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ربوہ کے بچوں میں تعلیم کے ساتھ دلچسپی کم ہو گئی۔ یہ درست ہے کہ اس اندازِ فکر کے پیچھے بعض دیگر عوامل بھی کارفرما تھے مگر طلبہ میں پڑھائی چھوڑ کر غیر ممالک کی طرف ہجرت کا رجحان بڑھنے لگا۔ مجھے یہ بات بری طرح کھٹکتی تھی چنانچہ میں نے ایک عریضہ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی خدمت میں ارسال کیا جس میں آپ سے درخواست کی گئی تھی کہ اگر میری معروضات قابلِ قبول ہوں تو صورتِ حال کے تدارک کے لیے مناسب اقدامات اٹھانے کی ہدایت فرمائی جائے۔ حضور نے نظارت تعلیم کو اس بارے میں ضروری کارروائی کے لیے ارشاد فرمایا۔ اس کے بعد جامعہ احمدیہ میں احمدی طلبہ کی کوچنگ کا خصوصی اہتمام کیا گیا تاہم اس کے بھی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ میرے نزدیک اس کی ایک بڑی وجہ والدین کی بے حسی تھی جنہوں نے اپنے بچوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے عملاً انکار کر دیا تھا۔''

جب مبارک انصاری سے اس دور کی کوئی بات سنانے کو کہا جائے تو وہ بتاتے ہیں: ''نیشنلائزیشن کے بعد میں کالج کے سینئر ترین اساتذہ میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس حیثیت میں مجھے کالج کی ایڈمشن کمیٹی، پرچیز کمیٹی اور پراجیکٹ کمیٹی کے ساتھ کام کرنے اور مختلف اداروں اور افراد کے ساتھ انٹرایکشن کا موقع ملا۔ اس دور کی بہت سی یادیں ہیں۔''

میں ان یادوں کے بیان کو کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہوئے اس جگہ صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل مبارک انصاری رضاکارانہ خدمت کے لیے بہت وقت دیتے ہیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف حکومتی سطح پر بھی کیا گیا ہے چنانچہ کئی سال پہلے انہیں ٹورانٹو سٹی کونسل کی طرف سے ''کینیڈا ڈے ایوارڈ'' سے نوازا

گیا جب کہ ۲۰۰۵ء میں انھیں ''سینئر اچیومنٹ ایوارڈ'' دیا گیا ہے۔

وہ اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے ساتھ خوش وخرم زندگی گذار رہے ہیں۔ ''خدا کا شکر ہے میری صحت اچھی ہے'' وہ بتاتے ہیں ''اور میں اس عمر میں بھی مناسب حد تک بھاگ دوڑ کر لیتا ہوں۔ موقع کسی جماعتی خدمت کا ہو یا کسی ہسپتال یا اولڈ ہوم میں کسی کام کرنے والے کی ضرورت، میں اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کر دیتا ہوں اور یہی میری زندگی ہے۔''

پروفیسر محبوب عالم خالد اُس زمانے میں صدر شعبہ اردو تھے۔ اُن کا دفتر پرنسپل آفس کے بالکل سامنے تھا۔ مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا نہ ہی زمانہ طالب علمی میں براہِ راست تعارف کا موقع ملا لیکن بعد میں جب ان کے سب سے بڑے صاحبزادے، شیخ ناصر احمد خالد کی شادی ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کی صاحبزادی نعیمہ سے ہوئی تو ان کے ساتھ کسی حد تک ذاتی تعارف پیدا ہو گیا۔ بعد میں اسی حوالے سے میری ناصر خالد سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور ان کی معرفت محبوب عالم خالد سے بھی علیک سلیک رہنے لگی۔ وہ ایک بار بحیثیت ناظر بیت المال پشاور کے دورے پر تشریف لائے تو اُس وقت کے امیر جماعت، مرزا مقصود احمد کے ہاں ان سے کھانے پر تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اسی طرح ان کے خاندان میں بعض شادیوں کے موقع پر اور ان کے دفتر میں بھی متعدد مختصر ملاقاتیں ہوئیں۔ جس دوران وہ ہمیشہ بہت محبت اور اپنائیت سے پیش آتے رہے۔

ناصر خالد اپنے والدِ بزرگوار کے ایک خاص اعزاز کا حوالہ دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ خلافتِ ثالثہ پر متمکن ہونے کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالث صرف دو بار کالج تشریف لائے۔ پہلی بار ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو کالج کانووکیشن کے موقع پر اور دوسری بار ۱۷ مئی ۱۹۶۹ء کو جب والدِ بزرگوار کالج میں اکیس برس کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے۔ اس موقع پر کالج ہال میں ایک الوداعی تقریب منعقد ہوئی اور حضور نے سٹاف ممبران کے ساتھ ایک یادگار تصویر بھی کھنچوائی۔ اس تقریب میں سٹاف کی طرف سے جو ایڈریس محبوب عالم خالد کو پیش کیا گیا اس کا کچھ حصہ بغرضِ ریکارڈ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''مکرم خالد صاحب کی یہ نہایت درجہ خوش بختی ہے کہ آپ کو عمر بھر مختلف رنگوں میں سلسلہ احمدیہ کی خدمت کا بھرپور موقع ملا ہے۔ آپ اس منفرد اعزاز کے بھی حامل ہیں کہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود کے ارشاد کے تحت آپ ہی احمدی نوجوانوں کے اس تاریخی اجلاس کے داعی تھے جس میں مجلس خدام الاحمدیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ پھر سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے ساتھ اوائل عمر سے آپ کا تعلق رہا ہے اور حضور بھی جس رنگ میں آپ پر شفقت اور اعتماد فرماتے رہے ہیں وہ ہم سب کے لیے باعثِ رشک ہے۔

محترم خالد صاحب کالج میں تدریسی فرائض کی ادائیگی کے علاوہ بَرسَر کی حیثیت میں لمبے عرصہ تک کالج کے دفتری امور کی نگرانی کا فریضہ نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے ہیں۔ قواعد وضوابط کے بارے میں آپ کی مسلمہ مہارت ضربُ المثل کی حیثیت رکھتی ہے جس سے آپ کے قریباً سبھی رفقا مستفید ہوتے

رہے ہیں۔ آپ کی محنت و استقلال، علمی ذوق، انتظامی قابلیت، کام کی لگن اور پابندیٔ وقت، یہ سب خوبیاں چلی ذکر ہیں اور آپ کے جانے کے بعد بھی ہمیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔"

محبوب عالم خالد کو کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد مسلسل بتیس سال ناظر بیت المال (آمد) کے طور پر خدمت کی توفیق ملی۔ وہ ۲۰۰۰ء میں صدر، صدر انجمن احمدیہ مقرر ہوئے۔ اس موقع پر اسلم صابر نے انہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا:

اے پیر خردمندا! مبارک ہو صدارت
اس عمر میں پائی ہے جوانوں کی حرارت
تھا قابلِ صد شکرِ خدا لمحہ کہ آئی
دربارِ خلافت سے صدارت کی بشارت
مشکور ہوئے آپ کے اعمالِ نمایاں
ایثار سے اخلاص سے ہیں جو کہ عبارت
سالوں کا نہیں قصہ یہ ہے پون صدی کا
ہر کام ترا نقش بتصویرِ عبارت

وہ چار سال اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ انہوں نے ۱۲ جنوری ۲۰۰۴ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے ان کے بڑے صاحبزادے، منور شمیم خالد کے نام اپنے تعزیتی مکتوب میں فرمایا: ''آج صبح فجر کی نماز کے بعد آپ کے والدِ محترم اور میرے بزرگ محترم مکرم شیخ محبوب عالم خالد صاحب کی وفات کی اطلاع ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان سے بے انتہا مغفرت کا سلوک فرمائے اور ان کے درجات بلند سے بلند تر کرتا چلا جائے۔ وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے حضور مقبول خدمت کی توفیق پا کر حاضر ہوئے ہیں۔ انہوں نے زندگی بھر خلافتِ احمدیہ سے وفا کے نئے سے نئے معیار قائم کئے۔ پہلی خلافتوں میں تو کئی مرتبہ میں نے اس بات کا اُن کی باتوں سے اندازہ لگایا لیکن میرے وقت میں انہوں نے وفا کے جو دیئے جلائے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں کو ہمیشہ ان کو روشن رکھنے کی توفیق دے۔ ان کے بے شمار واقعات ذہن میں گھومتے ہیں۔ سب کچھ لکھ تو سکتا نہیں، اس وقت فوری کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا ہوں...... آپ سے تعزیت کے لیے اور آپ کی وساطت سے باقی تمام پسماندگان، عزیزان سے تعزیت کرتا ہوں۔

پانچ چھ سال جب میں ناظر اعلیٰ رہا ہوں انہوں نے باوجود تجربہ کار اور بزرگ ہونے کے (تقریباً میرے والد حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد کی عمر کے تھے) میری کامل بشاشت سے اطاعت کی۔ اس وقت سے میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ پھر جب انتظامی لحاظ سے بحیثیت صدر، صدر انجمن احمدیہ ان کا عہدہ مجھ سے اوپر تھا تب بھی، مجھ پر مہربانی اور شفقت کا ہاتھ رکھا اور اطاعت بھی کی اس لیے کہ میں خلیفۃ المسیح کی طرف سے امیر مقامی بھی مقرر تھا۔ ہمیشہ مشورے لیتے رہے اور مشوروں کی قدر کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات

بلند فرمائے۔ آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق دے اور ان کی نیکیوں کو قائم رکھنے کی توفیق دے۔ آمین! آپ لوگ بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اخلاص و وفا کے وہی معیار قائم کرتے چلے جائیں جن کے نمونے آپ کے بزرگوں نے دکھائے۔

بہر حال ان کی وفات ایک جماعتی صدمہ بھی ہے۔ ایک اعلیٰ منتظم، ایک صائب الرائے شخصیت اور ایک دعا گو بزرگ سے ہم سب محروم ہوئے ہیں۔ میرے والد صاحب کے ساتھ اخوت کے رشتے میں منسلک ہونے کی وجہ سے میرے ساتھ تو ان کا دوہرا تعلق قائم تھا۔"

اخوت کے اس رشتے کی وضاحت ناصر خالد کے اس مضمون سے ہوتی ہے جو موصوف کی وفات کے بعد الفضل میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مضمون نگار کے الفاظ میں: ''حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے قادیان میں حضرت والد صاحب کو حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب کا بھائی بنایا تھا اور حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تعزیتی خط اور خطبہ جمعہ میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔''

میں محبوب عالم خالد کا ذکرِ خیر پرویز پروازی کے ان الفاظ پر ختم کروں گا کہ ''خالد صاحب کے اٹھنے سے ایک ایسا وجود ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے جو اپنے اخلاص میں منفرد، محنت میں اَن تھک، سلسلہ کے کاموں میں ہمہ وقت مشغول رہنے والا اور اپنے سب کاموں پر سلسلہ کے کاموں کو فوقیت اور ترجیح دینے والا تھا۔''

پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان جنہوں نے سکول ہی کے زمانہ سے زندگی وقف کر رکھی تھی کالج میں فزکس پڑھانے پر مامور تھے۔ ویرووال ضلع امرتسر میں پیدا ہونے والے نصیر احمد خان نے تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان سے میٹرک، ایف سی کالج لاہور سے بی ایس سی اور علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ وہ شروع میں فضل عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے تھے لیکن ۱۹۵۱ء میں تعلیم الاسلام کالج سے منسلک ہو گئے اور یہ وابستگی ۲۹ نومبر ۱۹۸۳ء کو ان کی وفات تک قائم رہی۔ اسی دوران وہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک پی ایچ ڈی کے سلسلہ میں ڈرہم یونیورسٹی میں مقیم رہے۔ انگلستان سے واپسی پر ان ہی کی نگرانی میں کالج میں ایم ایس سی فزکس کلاسز کا اجرا ہوا۔

ڈاکٹر نصیر احمد خان کے ایک ہونہار شاگرد، ڈاکٹر نعیم احمد طاہر جو اِن دنوں جرمنی میں مقیم ہیں نے تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے قیام پر اپنے ایک پیغام میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے مرحوم کو بڑے واشگاف الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہ پیغام انگریزی میں ہے اور اس کا آزاد اردو ترجمہ اس طرح کیا جا سکتا ہے: ''مجھے اپنی تیس سالہ پیشہ وارانہ زندگی میں دنیا کی کئی یونیورسٹیاں اور بہت سے ریسرچ سنٹرز دیکھنے کا موقع ملا ہے اور میں علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ تعلیم الاسلام کالج والا اعلیٰ اخلاقی معیار کسی اور جگہ نظر نہیں آیا۔ فزکس ڈپارٹمنٹ کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان تمام طلبہ میں یکساں ذاتی دلچسپی لیتے اور ہر آن ان کی مدد پر کمربستہ رہتے۔ وہ یہ سب اس لیے کرتے تھے تاکہ امتحانات میں ان کی کارکردگی اسی طرز کے باقی اداروں کے طلبہ سے نمایاں طور پر بہتر طور ہو اور وہ اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے تیار کر سکیں۔ کالج کے

تو میائے جانے تک یہاں کے طلبہ دیگر ملکی اداروں کی نسبت خاصے بہتر نتائج دکھاتے رہے اور ان میں سے بہت سے مغربی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب یورپ اور امریکہ میں بعض بہت اہم ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔''

نصیر خان کالج میں باسکٹ بال کے پہلے انچارج تھے۔تعلیم الاسلام کالج کے باسکٹ بال کے ایک کھلاڑی، سراج الحق قریشی کے الفاظ میں''نصیر خان صاحب اپنے زمانہ طالب علمی میں ایف سی کالج لاہور کی باسکٹ بال ٹیم کے کھلاڑی تھے اور قیامِ پاکستان سے پہلے نیشنل باسکٹ بال چیمپئن شپ میں پنجاب کی نمائندگی کر چکے تھے۔انہیں ڈاکٹر ایس ایم شیٹس کی سرپرستی میں کھیلنے کا بھی اعزاز حاصل رہا تھا جو بجائے خود باسکٹ بال کے ایک مشہور کھلاڑی تھے اور تقسیم سے پہلے نہ صرف پنجاب بلکہ پورے برصغیر میں باسکٹ بال کے کھیل کے فروغ اور ترقی میں نمایاں خدمات بجالا چکے تھے۔یاد رہے کہ ساٹھ اور ستر کی دہائی تک پاکستان بھر کے ثانوی بورڈز اور یونیورسٹیز حتّٰی کہ صوبائی اور قومی چیمپئن شپس میں بھی باسکٹ بال کے مقابلہ جات کے لیے جو سکورنگ استعمال ہوتی تھی وہ ان ہی ڈاکٹر شیٹس کی تیار کردہ تھی اور ان کے ہی نام سے ملک بھر میں مروّج تھی۔

بہر صورت حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے ارشاد کی تعمیل میں ڈاکٹر نصیر احمد خان نے تعلیم الاسلام کالج میں ۱۹۵۰ء کی دہائی کے نصف آخر میں ایک کچی گراؤنڈ پر باسکٹ بال کے کھیل کا اجرا کیا اور باسکٹ بال کے ایک تجربہ کار کھلاڑی، آفیشل اور منتظم کی حیثیت سے کالج کے بالخصوص طویل القامت لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں تربیت دینا شروع کر دی۔انہوں نے کالج میں باسکٹ بال کے کھیل کے فروغ کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کر کے شب و روز محنت اور خلوص کے ساتھ کام کیا اور باسکٹ بال کے نو آموز کھلاڑیوں کو مزید تربیت اور تجربہ کے حصول کے لیے لائل پور، سرگودھا، لاہور اور سیالکوٹ کے سکولوں، کالجوں اور کلبوں کی ٹیموں کے ساتھ کھلانے کے لیے لے جانے لگے۔اسی طرح ان اہم مراکز میں آل پاکستان سطح کے باسکٹ بال کے جو مقابلہ جات منعقد ہوتے ان میں تعلیم الاسلام کالج کی ٹیم کی شمولیت بھی یقینی بنائی جاتی۔خوش قسمتی سے نصیر خان صاحب کے اُن شہروں میں جو اُس وقت پاکستان میں باسکٹ بال کے اہم مراکز شمار ہوتے تھے باسکٹ بال کے اہم اور مشہور کھلاڑیوں اور آفیشلز کے ساتھ بہت اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔یہی وجہ تھی کہ تعلیم الاسلام کالج باسکٹ بال ٹیم کو ان شہروں میں منعقد ہونے والے باسکٹ بال ٹورنامنٹس میں شرکت سے بہت اچھی تربیت حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں ایک مختصر عرصہ میں کالج کی ٹیم نے بورڈ اور یونیورسٹی کے مقابلہ جات نیز پنجاب باسکٹ بال چیمپئن شپس میں شرکت شروع کر کے شہرت حاصل کر لی اور کالج کے متعدد کھلاڑی سرگودھا بورڈ اور پنجاب یونیورسٹی کی ٹیم میں منتخب ہو گئے۔یوں تعلیم الاسلام کالج کے بہت سے طلبہ کو باسکٹ بال کے کھیل کی طرف رغبت اور دلچسپی پیدا ہوئی۔''

ان کے دور میں جو پانچ چھ سالوں پر محیط تھا باسکٹ بال کے کھیل نے خوب ترقی کی اور یہاں ہر سال آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد ہونے لگا جس میں پاکستان بھر کی بہترین ٹیمیں حصہ لیتیں۔یہ سب کچھ

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور ان کے بعد ڈاکٹر نصیر احمد خان کی مسلسل توجہ اور محنت کا مرہونِ منت تھا۔
باسکٹ بال کے انچارج کی حیثیت میں ڈاکٹر نصیر احمد خان کا اپنے کھلاڑیوں کے ساتھ بہت قریبی رابطہ بلکہ دوستی تھی۔ وہ ضرورت پڑنے پر ان کے خلاف سخت سے سخت کارروائی سے بھی گریز نہ کرتے لیکن پھر ان کی دلجوئی میں بھی کوئی کسر روانہ رکھتے۔ میجر (ر) سعید احمد نے جو اُس زمانے میں کالج باسکٹ بال ٹیم کے کپتان تھے مجھے خود سنایا کہ ''ہم لوگ فجر کی نماز سے کافی دیر پہلے اُٹھتے، وضو کرتے اور کورٹ پہنچ کر نماز ادا کرتے۔ اس کے بعد ایکسرسائز شروع ہو جاتی۔ ماسٹر فضل داد ہمیں اتنی مشکل ایکسرسائزز کرواتے کہ ہم سخت سردی میں بھی پسینے سے شرابور ہو جاتے۔ ان ایکسرسائزز نے ہمارے جسموں میں وہ لچک پیدا کر دی تھی جو کسی بھی اچھے کھلاڑی کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ ایکسرسائز ختم ہونے تک نصیر خاں صاحب بھی کورٹ میں پہنچ جاتے جس کے بعد ہم ایک گھنٹہ گیم کرتے تھے۔''

''کبھی یہ معمول ڈسٹرب بھی ہوا؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''ہاں جی۔ کبھی کبھار یہ معمول ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔ ایک بار میں گھر سے باہر نکلا تو سخت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ باقی کھلاڑی تو پہنچے ہی ہوں گے لہٰذا اگر میں چھٹی بھی کر لوں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ بس یہی سوچ کر میں نے کورٹ جانے کا ارادہ بدل دیا اور بستر میں دبک کر سو گیا۔ صبح جب میں کالج پہنچ کر نصیر خاں صاحب سے ملا تو وہ سخت ناراض تھے۔ دراصل ماسٹر فضل داد نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ تو اپنی ضعیف العمری کے باوجود کورٹ میں پہنچ گئے تھے لیکن اس روز کوئی کھلاڑی ایکسرسائز کے لیے نہیں آیا۔ میں اُن دنوں بورڈ کی ٹیم کا کپتان تھا اور مجھے یہ احساس شرمندہ کیے جا رہا تھا کہ میں اپنے سینئرز کی توقع پر پورا نہیں اُتر سکا چنانچہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ تب نصیر خاں صاحب نے میرے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھا اور فرمایا: جو ہو چکا سو ہو چکا، آئندہ پریکٹس میں ناغہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم نے ان کی یہ نصیحت پلّے باندھ لی اور اس حوالے سے پھر کبھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

سعید نے مزید بتایا: ''۱۹۶۱ء میں ہم یونیورسٹی چیمپئن شِپ کھیلنے کے لیے لاہور گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہم ان شاءاللہ چیمپئن شِپ جیت کر ہی لوٹیں گے۔ ہمارا پہلا میچ ایک ایسی ٹیم کے ساتھ تھا جسے ہم بہت کمزور سمجھتے تھے لیکن خدا کی شان دیکھیئے! ہم یہی میچ ہار گئے۔ یہ ٹورنامنٹ ناک آؤٹ سسٹم کے تحت کھیلا جا رہا تھا چنانچہ ہم پہلے ہی دن اس ٹورنامنٹ سے باہر ہو گئے۔ ہماری یہ شکست بالکل غیر متوقع تھی چنانچہ میچ ختم ہوا تو نصیر خاں صاحب نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا۔ جب ٹیم کی شکست کے عوامل پر غور کیا گیا تو پتا چلا کہ ایک کھلاڑی جو ہمارا اچھا سکورر تھا اور عام حالات میں عینک کے ساتھ کھیلا کرتا تھا نے اس میچ کے دوران اپنی عینک اُتار کر باہر کسی کو پکڑا دی تھی۔ ظاہر ہے اس کی اس حرکت نے اس کی بینائی کو متاثر کیا چنانچہ وہ جب شارٹ لگاتا وہ رِنگ سے تھوڑی اِدھر یا اُدھر جا پڑتی۔ نصیر خاں صاحب ٹیم کی اس شکست پر خاصے غصے میں تھے چنانچہ وہ فرمانے لگے: میرا جی چاہتا ہے میں تمہارے منہ پر توبڑے باندھوں اور بستر تمہارے سروں پر رکھ کر تمہیں پیدل ربوہ لے جاؤں۔ پھر انہوں نے اُسی

حصہ ہر میچ والے کھلاڑی کی طرف منہ کر کے کہا اور اپنے اظہار سے ... پھر تو میں سب سے بڑا توبہ
پڑھوں گا

''جب یہ تیر و تند باتیں ہو رہی تھیں تو میرے منہ سے نکل گیا کہ مجھے تو ٹاس ہارتے ہی یقین ہو گیا تھا کہ ہم یہ میچ جیت نہیں سکتے'' سعید کی گفتگو جاری تھی ''نصیر خان صاحب یہ بات سن کر آگ بگولہ ہو گئے۔ وہ اس کھلاڑی کو چھوڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے تم شرک کرتے ہو۔ کیسے احمدی ہو جو اس قسم کی باتوں پر یقین رکھتے ہو۔ تم نے ٹاس ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اللہ سے معافی مانگو، توبہ استغفار کرو۔ ٹاس کیا چیز ہوتی ہے؟ صرف ٹاس ہارنے یا جیتنے سے بھی کبھی کوئی میچ ہارا یا جیتا ہے'' انہوں نے مجھ پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا کہ میں شرمندگی کے باعث رونے لگ گیا۔''

''نصیر خان نے آپ کو چپ نہیں کرایا؟'' میں نے سوال کیا۔

''کرایا'' ادھر سے جواب آیا'' ہماری رہائش کا انتظام یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک خیمے میں تھا۔ ہم نصیر خان صاحب کی جھڑکیاں کھانے کے بعد ابھی وہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ بھی آ گئے۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ نصیر خان صاحب میری دلداری کے لیے میرے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھ پر لحاف ڈالا اور بہت دیر تک تسلی و تشفی کی باتیں کرتے رہے۔ فرمانے لگے میرا پروگرام تو آج ربوہ واپسی کا تھا لیکن اب میں نے یہ پروگرام بدل دیا ہے۔ تم لوگ کل دوپہر کا کھانا ماڈل ٹاؤن میں میرے ساتھ کھاؤ گے اور پھر جمعہ پڑھنے کے بعد ہم اکٹھے ربوہ واپس جائیں گے۔''

''میرا خیال ہے نصیر خان دل کے بہت اچھے انسان تھے اور ان کی یہ سختی صرف کھلاڑیوں کی بہتری کے لیے تھی۔''

''آپ درست کہتے ہیں۔ موصوف کا دھیان ہر وقت ہمارے کیریکٹر بلڈنگ پر رہتا تھا۔ ان کے لیے یہ تصور ہی سوہانِ روح تھا کہ ایک احمدی کھلاڑی توہمات میں گرفتار ہو اور یہ سمجھنے لگے کہ کھیل میں ہار جیت کا انحصار محض ٹاس ہارنے یا جیتنے پر ہے۔ سچ پوچھیں تو میرے ذہن میں قطعاً ایسی کوئی بات نہ تھی لیکن نصیر خان صاحب جو تقویٰ کی باریک راہوں کو بھی سمجھتے تھے برداشت نہ کر سکے کہ ہم میں سے کوئی کبھی ان خطوط پر سوچے۔''

یہ تو ہے ڈاکٹر نصیر احمد خان کی شخصیت کا صرف ایک رخ۔ شاید کچھ لوگوں کو علم نہ ہو کہ مرحوم ایک اچھے شاعر بھی تھے اور ''زودِ پشیمان'' کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ مسعود دہلوی کے الفاظ میں ''وہ ایسے ایسے شعر کہتے کہ ماہرینِ فن بھی پھڑک اٹھتے۔ زودِ پشیمان ان کی مہارتِ فن کی منہ بولتی تصویر ہے۔ سائنس دان ہوتے ہوئے اور سائنسی گتھیاں سلجھانے میں محو رہتے ہوئے بھی شعر و ادب کے مسلم الثبوت اساتذۂ فن سے خراجِ تحسین حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ یہ فرہاد واقعی نہر کھود لایا اور جی بھر کر صلہ پایا۔''

ادیب شہیر ڈاکٹر وزیر آغا کے یہ الفاظ تو گویا ڈاکٹر نصیر احمد خاں کے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں: ''میں پروفیسر صاحب کو قریباً بیس برس سے جانتا ہوں۔ مجھے کبھی ان کی شخصیت میں کوئی شکن نظر نہیں آئی۔ شخصیت تو ایک طرف مجھے تو ان کا لباس ہی کہ ان کی عام گفتگو بھی ہر قسم کی شکن سے پاک، انتہائی صاف ستھری اور ملائم محسوس ہوئی۔ ایک کلچرڈ انسان کا یہی امتیازی وصف ہے کہ اس کے ظاہر اور باطن میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ شکنوں اور سلوٹوں کو نہایت خوبصورتی سے دُور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پروفیسر نصیر احمد خاں کا کلام اگر ایک جوئے رواں کی طرح دکھائی دیتا ہے تو اس کا اصل سبب خود ان کی دلنواز اور آہستہ خرام شخصیت ہے۔''

ڈاکٹر نصیر احمد خان کے مجموعہ کلام میں بہت سی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہیں تاہم ان کے نمونہ کلام کے طور پر یہ چند اشعار نقل کیے جا رہے ہیں:

وفا ہو یا جفا ہم پر کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی
دلِ دیوانہ خوش تم سے صنم یوں بھی ہے اور یوں بھی
کہیں ہے نالۂ بلبل، کہیں ہے گریۂ شبنم
جنُوں کی داستانِ غم رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی
کبھی مدحِ حسیناں میں کبھی ہجوِ رقیباں میں
اُٹھایا بارہا ہم نے قلم یوں بھی ہے اور یوں بھی
اگر جینا بھی، مرنا بھی ہو لازم یار کی خاطر
تو اپنا راہِ اُلفت میں قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی
نہ اٹھواؤ نصیرِ بے نوا کو اپنی محفل سے
یہ مہماں راہیِ ملکِ عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

عبدالرشید غنی جو انبالے کے ساتھ اپنی نسبت کی وجہ سے بسا اوقات رشید انبالوی کے مختصر نام سے بھی پہچانے جاتے تھے تعلیم الاسلام کالج ہی کے سابق طالب علم تھے۔ ۱۹۵۶ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد وہ یہاں ڈیمانسٹریٹر لگ گئے اور پھر ریاضی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں لیکچرر ہو گئے۔ یہی سال تھا جب میں نے کالج میں داخلہ لیا لیکن ریاضی میرا مضمون نہ تھا لہٰذا ان کے ساتھ وہ تعلقِ قربت قائم نہ ہو سکا جو اس رشتے کے نتیجے میں بالعموم پیدا ہو جاتا ہے تاہم کالج میں اِدھر اُدھر آتے جاتے، ایک دوسرے کو بار بار دیکھنے کے بعد وہ غیریت باقی نہ رہی جو دو اجنبیوں کے درمیان ہو سکتی ہے۔ کئی سال بعد جب میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ انکم ٹیکس سے منسلک ہوا تو کالج کے ایک سابق طالب علم کے طور پر میری اپنی ایک شناخت بن گئی اور میرے اندر اُس دور کے اساتذہ کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے مطلوبہ اعتماد آ گیا سو ان کے ساتھ بھی قریبی تعلق قائم ہو گیا اور ہماری جہاں کہیں ملاقات ہوتی وہ بہت محبت سے پیش آتے۔

سید حسن خان اپنی کتاب ''ربوہ کی چند پرانی یادیں'' میں اُن کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''آپ طلبہ

دارالرحمت وسطی میں حضرت مولانا ابوالعطا صاحب جالندھری مرحوم کے ہمسایہ میں رہتے تھے...... آپ کالج کی ہاکی ٹیم کے انچارج تھے۔...... ہمیں ہاکی بڑے شوق سے کھلاتے اور ہر کھلاڑی کی ضرورت کو پورا فرماتے۔ ہر ایک کی بات بڑے پیار سے سنتے اور آپ نے ہم پر کبھی بھی رعب نہیں جمایا، نہ ہی کبھی جھڑکا بلکہ ہمیں اپنے گھر بلا کر ہم سب کو چائے وغیرہ پلاتے اور خوشی خوشی اگلے میچ کی پلاننگ ہمارے ساتھ مل کر کرتے تھے۔ گراؤنڈ میں خود بھی نیکر پہن کر ہمارے ساتھ کھیلتے اور ہمارے ساتھ خود کھیل کر ہماری کوچنگ کرتے۔ آپ بہت ہی ہنس مکھ، ہمدرد اور مہمان نواز انسان ہیں۔ ہاکی کی بے شمار یادیں آپ کے ساتھ وابستہ ہیں۔''

وہ ۱۹۹۴ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک تعلیم الاسلام کالج ہی میں پڑھاتے رہے جس کے بعد تحریک جدید میں ایڈیشنل وکیل المال (اول) مقرر ہوئے۔ انہوں نے کم وبیش نو سال یہ خدمت سرانجام دی۔ وہ مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ اور مجلس انصاراللہ مرکزیہ سے بھی منسلک رہے اور ممبر قضا بورڈ، ممبر مجلسِ افتا اور ممبر تدوین فقہ کمیٹی بھی رہے۔

انہیں قانونِ وراثت سے خصوصی دلچسپی تھی اور انہوں نے اس موضوع پر ایک مقالہ بھی تحریر کیا تھا جو فضل عمر فاؤنڈیشن کی طرف سے انعام کا حقدار قرار پایا۔ اس مقالہ کو جسے بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا وراثتی قوانین کی تشریح کے حوالے سے خاصی شہرت حاصل ہوئی چنانچہ یہ کتاب بعض لا کالجز میں پڑھائی جاتی رہی اور جامعہ احمدیہ کے کورس میں بھی شامل رہی۔

انہوں نے ۲۰ مارچ ۲۰۰۴ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ شاید اسی پس منظر میں ان کے کتبے پر اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے ''علمی میدان میں بھی قابلِ قدر خدمات کیں۔''

پروفیسر عبدالشکور اسلم حضرت خدا بخش المعروف مومن جی کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ وہ بی ایس سی کرنے کے بعد ساہیوال میں ملیریا اِریڈیکیشن آفیسر کے طور پر کام کر رہے تھے کہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے ارشاد پر سرکاری ملازمت چھوڑ کر تعلیم الاسلام کالج میں ڈیمانسٹریٹر لگ گئے۔ اس دوران وہ لیکچرر کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ یہ سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا اور جب کالج کو مرزا منظور احمد کی شکل میں باٹنی کا ایک باقاعدہ لیکچرر مل گیا تو عبدالشکور اسلم ایم ایس سی کرنے کے لئے کراچی چلے گئے۔ واپسی پر تعلیم الاسلام کالج میں مستقل لیکچرر مقرر ہو گئے لیکن جلد ہی جماعتی انتظام کے تحت سیرالیون تشریف لے گئے۔ سوئے اتفاق انہیں وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی چنانچہ انہیں ایک سال کے اندر اندر اپنا کنٹریکٹ ختم کر کے واپس آنا پڑا۔ انہوں نے اپنا باقی وقت ایچی سن کالج میں گذارا جہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اب لاہور میں مقیم ہیں۔ نماز جمعہ میں ان سے اکثر ملاقات ہوجاتی ہے اور باقی جماعتی فنکشنز میں بھی نظر آتے ہیں۔ ماشاءاللہ فعّال زندگی گذار رہے ہیں۔

میں اور میرے ایک دوست ایک بار سویڈن گئے تو ہم نے دو راتیں شکور اسلم کے چھوٹے بھائی، شہابُ الدّین المعروف ''شہابی'' کے پاس گذاریں جو وار برگ میں مقیم تھے۔ ہم گوٹن برگ جانا چاہتے تھے لیکن

وہاں رہائش کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ شہابی کو پتا چلا تو اس نے ہمیں تسلی آمیز لہجے میں بتایا: آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ وہاں بھائی جان شکور اسلم کے دو بیٹے رہتے ہیں۔ میں بڑے بیٹے کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ آپ کو لاری اڈے سے لے بھی لے گا اور حسب خواہش گھما پھرا بھی دے گا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق ہم نے یہ تجویز اس شرط کے ساتھ قبول کر لی کہ ہم اس بچے پر بوجھ نہیں بننا چاہیں گے بلکہ اپنی سیر و تفریح پر اٹھنے والا جملہ خرچ خود برداشت کریں گے۔ یوں ہم نے اگلے تین روز گوٹن برگ میں ریحان کے ساتھ گذار دیئے جہاں اس کا چھوٹا بھائی حسّان بھی بسلسلہ تعلیم مقیم تھا۔

لاہور واپس آ کر میں نے شکور اسلم کو بتایا کہ میں ان کی اجازت کے بغیر ہی ان کے بچوں کے پاس کچھ وقت گذار آیا ہوں تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ ''ان بچوں پر آپ کا بھی برابر کا حق ہے'' انہوں نے بیساختہ کہا: ''اس میں میری اجازت کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے پریشانی صرف یہ ہے کہ اُن سے آپ کی میزبانی میں کوئی کوتاہی نہ ہوگئی ہو۔''

۱۹۶۴ء کے آخری مہینوں میں جب میں بی اے کے آخری سال میں تھا کالج میں بعض نئے لیکچروں کی تقرری ہوئی جن میں سے اعجاز الحق قریشی، رشید احمد جاوید، ارشد ترمذی، عبدالجلیل صادق اور رشید احمد فوزی کے اسمائے گرامی مجھے اب تک یاد ہیں۔ یہ سب دوست اسی کالج کے اولڈ بوائز تھے اور مختلف مضامین میں ایم اے کرنے کے بعد طلبہ کو پڑھانے پر مامور ہوئے تھے۔

اعجاز الحق قریشی جنہوں نے بورڈ اور یونیورسٹی کی سطح پر مختلف امتحانات میں بارہا نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں تاریخ میں ایم اے ہیں لیکن انہیں انگریزی کا مضمون پڑھانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ خود بتاتے ہیں: ''جب حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے جنید ہاشمی کو میرے تقرّر کا خط جاری کرنے کو کہا تو موصوف نے انہیں بصد ادب یاد دلایا کہ میں نے انگریزی میں نہیں بلکہ تاریخ میں ایم اے کر رکھا ہے مگر حضور نے فرمایا کہ اس کی انگریزی اس مضمون میں باقاعدہ طور پر سند یافتہ بعض لوگوں سے زیادہ بہتر ہے لہٰذا اسے انگریزی پڑھانے کے لیے ہی بھرتی کیا جا رہا ہے۔'' اعجاز الحق قریشی جو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک اس کالج میں پڑھتے رہے تھے اگلے تین سال یہاں پڑھانے کے بعد سی ایس ایس کے امتحان کی بنیاد پر ملٹری لینڈز اینڈ کینٹونمنٹس سروس میں چلے گئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل چکلالہ سکیم تھری، راولپنڈی میں رہائش پذیر ہیں۔

رشید احمد جاوید جو سلسلہ کے ایک پرانے کارکن، چوہدری بشیر احمد رائے ونڈی کے چھوٹے بھائی تھے معاشیات پڑھانے پر مامور ہوئے لیکن دو ہی سال بعد سٹیٹ بنک آف پاکستان، کراچی میں ملازمت کے لئے منتخب ہوگئے۔ وہ ۱۹۶۶ء سے ۲۰۰۰ء تک وہیں رہے اور سٹیٹ بنک کے ڈائریکٹر کارپوریٹ افیئرز اینڈ میڈیا افیئرز کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ بعدہٗ چار سال تک اسی بنک کے ساتھ کنسلٹنٹ کے طور پر منسلک رہے اور پھر کچھ عرصہ ''آج'' ٹی وی سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم، اکنامک ایڈوائزر (ریٹائرڈ) سٹیٹ بنک آف پاکستان کی اطلاع کے مطابق وہ چند ماہ پہلے برین ہیمرج کی وجہ سے وفات پا چکے ہیں۔

ارشد ترمذی جو المنار کے ایڈیٹر اور سٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی رہے تھے سیاسیات کے استاد تھے۔ پھر وہ میونسپل کالج، شاہ کوٹ چلے گئے۔

بعد کے کسی مرحلہ پر انہوں نے خود کو نظام جماعت سے الگ کر لیا جس کی تصدیق کئی سال پہلے ان کے ایک بیٹے نے خود میرے سامنے کی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ستمبر ۲۰۰۳ء میں جب میری تعیناتی بطور ریجنل کمشنر، ایسٹرن ریجن، لاہور کے ہوئی تو ایک انکم ٹیکس افسر، بہزاد انور مجھ سے خاص طور پر ملنے کے لیے آئے۔ بہزاد سی ایس ایس کرنے کے بعد محکمۂ انکم ٹیکس سے منسلک ہوئے تو ارشد ترمذی نے ان کے سامنے اس محکمہ کے ساتھ میرے تعلق کا ذکر کیا تھا۔ ارشد ترمذی خود تو اُنیس اگست ۲۰۰۳ء کو وفات پا چکے تھے چنانچہ جب میں لاہور میں متعین ہوا تو بہزاد انور نے میرے سامنے اپنا تعارف ارشد ترمذی کے بیٹے کے طور پر کرایا۔ سچ پوچھیں تو مجھے ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تاہم انہوں نے تھوڑی سی گفتگو کے بعد یہ انکشاف کر کے مجھے قدرے حیران کر دیا کہ ان کے والد نے خود ترکِ احمدیت کا اعلان کر دیا تھا اور یہ کہ اب ان کا جماعت احمدیہ سے تعلق نہیں ہے۔ یہ تو خیر ان کا خالصتاً ذاتی معاملہ تھا جس پر مجھے رائے زنی کرنے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ ہاں! میں نے اپنے فرضِ منصبی کے تقاضوں کے مطابق اپنی تعیناتی کے دوران بہزاد کا ہر ممکن خیال رکھا اور انہیں کوئی بے جا تکلیف نہ ہونے دی۔

بہزاد سے بعد کی ملاقاتوں میں کئی بار ارشد ترمذی کا ذکر آیا: ''وہ شاہ پور سے ایم اے او کالج آ گئے تھے جہاں انہوں نے اپنے کیریئر کا سب سے لمبا زمانہ گذارا'' بہزاد بتایا کرتے تھے ''وہ قریباً بیس سال وہاں رہے اور پھر پنجاب کے وزیرِ تعلیم کے سٹاف آفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔ وہ دسمبر ۲۰۰۲ء میں ریٹائر ہوئے تھے۔''

عبدالجلیل صادق جو ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے اور یہاں سے بی اے آنرز کر کے نکلے تھے ایک سال کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پولیٹیکل سائنس کر کے ربوہ لوٹ آئے اور اسی کالج میں لیکچرر ہو گئے۔ وہ پہلے انگریزی اور پھر پولیٹیکل سائنس پڑھاتے رہے اور یہ سلسلہ ۲۰۰۳ء میں ان کی ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔ اسی دوران وہ قاضی، ممبر قضا بورڈ اور مجلس انصار اللہ مرکزیہ میں قائد ذہانت وصحت جسمانی کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

جلیل صادق کے ساتھ میری پرانی یاد اللہ ہے۔ وہ فخریہ بتاتے ہیں کہ ''مجھے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خدمت کا موقع مل رہا ہے چنانچہ میں ۲۰۰۳ء ہی سے نائب ناظر ترتیب ریکارڈ کی ذمہ داری ادا کر رہا ہوں اور مجلسِ صحت کا صدر بھی بنایا گیا ہوں۔ بس آپ دعا کریں اللہ تعالیٰ احسن طریقے سے یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کی توفیق دیتا رہے۔''

ڈیرا غازی خان کے رہنے والے عبدالرشید فوزی جو اے آر فوزی کے نام سے پہچانے جاتے تھے اسی کالج کے اولڈ سٹوڈنٹ تھے جب کہ ایم اے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ وہ کالج میں میری موجودگی کے دوران ۱۹۶۴ء میں یہاں تاریخ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ چار سال تک یہاں پڑھانے کے بعد وہ سیرالیون چلے گئے اور

مختلف جماعتی سکولوں میں تدریسی خدمات بجالاتے رہے۔ آج کل امریکہ کے شہر بالٹی مور میں ہیں جہاں وہ ۱۹۹۰ء میں منتقل ہو گئے تھے۔

مدتِ دراز کے بعد ان سے فون پر بات ہوئی تو پرانی باتیں شروع ہو گئیں۔ تب انہوں نے بتایا:

''ایم اے کے امتحان میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ میں ذاتی طور پر اکاؤنٹینسی کے شعبے میں جانا چاہتا تھا اور اپنی اس خواہش کی تکمیل میں کسی حد تک کامیاب ہو بھی چکا تھا کہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی طرف سے پیغام ملنے پر میں آپ کے پاس حاضر ہوا۔ تب مجھے آپ کی اس خواہش کا علم ہوا کہ میں کالج میں لیکچرر شپ قبول کر لوں۔ میری اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے اس خواہش کو آپ کا حکم سمجھ کر قبول کر لیا۔ اب میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میرے اس فیصلے میں اللہ تعالیٰ نے کتنی برکت ڈالی اور میں ایک لمبا عرصہ جماعتی اداروں میں خدمات بجالانے کے بعد آج کل امریکہ میں ہوں۔ خدا کا شکر ہے مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے اور میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گذار رہا ہوں۔ مجھ سے پہلے حمید اللہ ظفر یہ مضمون پڑھایا کرتے تھے لیکن جب میں نے بطور لیکچرر جوائن کیا تو وہ غالباً افریقہ کے کسی ملک تشریف لے جا چکے تھے۔ میری موجودگی میں چوہدری نذیر احمد نام کے ایک اور صاحب یہی مضمون پڑھانے پر مامور ہوئے مگر وہ بھی زیادہ عرصہ یہاں نہیں رکے۔ اب میرے لیے یہ کہنا آسان نہیں کہ دونوں صاحبان کتنا عرصہ اس کالج میں پڑھاتے رہے۔''

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ کچھ عرصہ سیرالیون میں بھی تو رہے ہیں۔''

''آپ نے درست کہا میرے تو کئی سال وہاں گذرے۔''

''سیرالیون میں تو میرے ایک بہنوئی بھی پڑھاتے رہے ہیں۔ کیا آپ بھی اُس دور میں وہاں تھے۔''

''آپ ہادی مونس کی بات کر رہے ہیں نا۔ میرا تقرر بھی اُسی سکول میں تھا جہاں وہ پڑھایا کرتے تھے۔ رفقائے کار کے طور پر ہمارا آپس میں بہت میل جول رہتا تھا اور ہم فیملیز لیول پر بھی بکثرت ملا کرتے تھے۔ کبھی اُن کے گھر کھانا اور کبھی ہمارے گھر چائے۔ ہم سارے کولیگز اکٹھے ہوتے تو بہت مزے مزے کی باتیں ہوتیں لیکن زندگی تو ایک سفر ہے اور کسی کو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کل اُسے کہاں چلے جانا ہے۔ ایک دن ہمارے راستے بھی جدا ہو گئے۔ ہادی مونس نائیجیریا چلے گئے اور میں کہیں اور۔ اب تو بہت مدت سے ہماری ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ کہاں ہوتے ہیں وہ آج کل؟''

''وہ اب کینیڈا میں ہیں۔ پہلے اُن کی دو بچیاں بیاہ کر وہاں گئیں، پھر آپی چلی گئیں اور اب اُن کا پورا خاندان وہاں پر ہے۔''

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ میرے مرحوم اساتذہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور باقیوں کو صحت و عافیت والی لمبی زندگی، میں اب کالج سٹاف میں سے بعض اراکین کا ذکر کروں گا۔ اصل میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اکثر لوگوں کی یاد ذہن سے محو ہو چکی ہے تاہم جو لوگ مجھے بوجوہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں ان میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر جنید ہاشمی کا۔

جذبہ عشق و وفا کا نام اونچا کر"گئے"

جنید ہاشمی حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کے صاحبزادے اور معروف صحافی، شبلی بی کام کے بھائی تھے۔ وہ اور ہم ربوہ میں قریب قریب رہائش پذیر تھے۔ یوں تو میں انہیں اپنے زمانہ سکول سے ادھر ادھر آتا جاتا دیکھا کرتا تھا لیکن ان کے ساتھ گفتگو کا کبھی موقع نہ آیا۔ بس اتنا سن رکھا تھا کہ تعلیم الاسلام کالج میں کام کرتے ہیں اور یہ بات واقعی درست تھی کیوں کہ جب کالج میں داخلے کا مرحلہ آیا تو انہیں آفس کے سب سے بڑے میز پر براجمان پایا۔ کالج میں داخلہ کے امیدواروں کے درخواست فارم ان ہی کے پاس تھے اور ان ہی کے ذریعہ امیدواروں کو انٹرویو کے لیے پرنسپل آفس میں طلب کیا جارہا تھا۔ دفتر میں کچھ اور کارکنان بھی موجود تھے لیکن ان کی حیثیت ثانوی معلوم ہوتی تھی۔ تب پتا چلا کہ وہ آفس سپرنٹنڈنٹ ہیں۔

موصوف پرانی وضع کے بزرگ تھے اور پان کھاتے تھے۔ غالباً انہیں یہ لت اس زمانے میں پڑی تھی جب یہ تحقیق سامنے نہ آئی تھی کہ پان خوری کی عادت گلے یا منہ کا کینسر پیدا کرتی ہے۔ بہرحال انہیں ہمیشہ پان کی گلوریاں منہ میں ادھر سے ادھر کرتے دیکھا گیا۔ ان کی میز کے نیچے چھپا ہوا اگالدان تہذیبِ رفتہ کی یادگار ہونے کے باوصف ان کے لیے بہت کام کی چیز تھا۔

معلوم نہیں کس طرح لیکن یہ بات کالج میں مشہور تھی کہ عہدوں میں فرق کے باوجود وہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے بے تکلف دوست اور نبض شناس ہیں لہٰذا جب طلبہ کو آپ سے کوئی کام ہوتا تو وہ جنید ہاشمی سے ضرور مشورہ کرتے کہ کیا اس وقت ان کا آپ سے ملنا موزوں ہوگا۔ جنید ہاشمی کبھی طلبہ کو غلط مشورہ نہ دیتے اور اگر سمجھتے کہ اس وقت پرنسپل صاحب کا موڈ ٹھیک نہیں ہے تو وہ بے تکلفانہ بتا دیتے۔ یوں طلبہ پرنسپل صاحب کی غیر ضروری جھاڑ سے بچے رہتے اور ان کا کام بھی، بھلے کچھ تاخیر سے ہی سہی، بالعموم ہو جاتا۔

جنید ہاشمی کی اہلیہ، مبارکہ خُم اپریل ۱۹۵۳ء میں بعارضہ کینسر چھوٹی ہی عمر میں وفات پا گئی تھیں۔ موصوف اس سانحہ کے بعد کم و بیش بیس سال زندہ رہے اور انہیں عقدِ ثانی کے لیے بعض تجاویز بھی موصول ہوئیں مگر انہوں نے دوسری شادی سے احتراز کیا تاکہ وہ پوری توجہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر مرتکز رکھ سکیں۔

خدا تعالیٰ نے جنید ہاشمی کو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نواز رکھا تھا۔ انہوں نے ان سب بچوں کو ممکن حد تک اعلیٰ تعلیم دلائی۔ یوں تو ان کے سارے ہی بچے لائق تھے لیکن جیسا کہ بعد میں قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر آئے گا

فیروزہ فائزہ تو حد درجے کی ذہین تھیں اور انہوں نے تمام امتحانات میں ڈویژن، بورڈ یا یونیورسٹی کی سطح پر کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور حاصل کی۔

جنید ہاشمی کے بچوں میں سے عبید الرحمن جاوید اور قانتہ وفات پا چکی ہیں۔ فیروزہ ماہر امراضِ قلب، میجر جنرل ڈاکٹر مسعود الحسن نوری کے چھوٹے بھائی، میجر مطلوب الحسن نوری سے بیاہی گئی تھیں لیکن وہ مفوضہ فرائض کی ادائی کے دوران حیاتِ دوام پا گئے۔ فیروزہ گورنمنٹ کالج فار ویمن، شیخوپورہ میں فلسفہ کی ایسوسی ایٹ پروفیسر رہی ہیں لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے بیٹے، موعود الحسن نوری کے آسٹریلیا منتقل ہو جانے کے سبب اب وہاں جا چکی ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن فرخندہ لاہور میں اور سب سے چھوٹے بھائی زبید الرحمٰن نوید کینیڈا میں ہوتے ہیں۔

فیروزہ بتاتی ہیں کہ جنید ہاشمی بے انتہا شفیق باپ تھے۔ مارنا تو بہت دُور کی بات تھی، انہوں نے کبھی اپنے بچوں کو ڈانٹا تک نہیں۔ وہ گھر میں زیادہ تر خاموش رہتے لیکن دوستوں کی محفل میں ان کی باغ و بہار شخصیت اپنا رنگ خوب دکھاتی۔ ان کے قریبی دوستوں میں تعلیم الاسلام کالج کے بعض اساتذہ کرام کے علاوہ عبدالعزیز بھامبڑی اور ڈاکٹر محمد احمد سرساوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب میں کسی اور جگہ قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر ہے، یہ تینوں دوست رات دیر گئے تک ڈاکٹر محمد احمد سرساوی کے کلینک پر اکٹھے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے۔

ان کی شخصیت کا ایک پہلو جو شاید اکثر قارئین کی نظر سے پوشیدہ ہوگا وہ کھیلوں میں ان کی دلچسپی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ سکول کے زمانہ میں ہاکی کھیلتے تھے اور گول کیپر کے طور پر ان کی کارکردگی ہمیشہ قابلِ تعریف رہی۔ چوہدری علی محمد مصنف ''تعلیم الاسلام ہائی سکول اور اس کی کھیلیں'' کے الفاظ میں ''قادیان اور قادیان سے باہر کوئی مشہور میچ ایسا نہیں ہوا جس میں جنید صاحب گول کیپر نہ رہے ہوں۔''

انہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد قریباً دو سال تک نائب ناظر بیت المال کے طور پر بھی کام کیا۔

تعلیم الاسلام کالج کے اس جانثار کارکن کے بارے میں باتیں تو اور بھی بہت سی کرنے والی ہیں لیکن میں فی الحال اسی پر اکتفا کروں گا کہ وہ ۲۲ جولائی ۱۹۷۳ء کو انتقال کر گئے۔ فیروزہ کی روایت کے مطابق وہ اُن دِنوں نصرت گرلز ہائی سکول، ربوہ میں پڑھا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی وفات سے پہلے خواب میں دیکھا گویا وہ کیپر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور میں واقع اپنے اس مکان میں ہوں جو نقوش پریس کے اوپر ہوا کرتا تھا اور جہاں وہ اپنے زمانۂ لاہور میں مقیم رہی تھیں تاہم انہیں محسوس ہوتا ہے گویا یہ مکان لاہور کی بجائے کوئٹہ میں واقع ہے۔ وہ کیا دیکھتی ہیں کہ اس کی برساتی کی چھت یکا یک گر گئی ہے چنانچہ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ جاتی ہیں۔ انہیں اس خواب کی تعبیر سمجھ تو نہ آئی مگر وہ پریشان رہنے لگیں چنانچہ انہوں نے اس خواب کا ذکر اپنی ایک رفیقِ کار، بشریٰ طیبہ سے کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ کوئی منذر خواب محسوس ہوتی ہے لہٰذا فوری طور پر صدقہ دے دیا جائے۔ فیروزہ کہتی ہیں کہ انہوں نے حسبِ توفیق صدقہ تو دیا لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پوری ہو کر رہی اور اس کے کچھ ہی دن بعد جنید ہاشمی کوئٹہ میں وفات پا گئے۔

ان کا جسدِ خاکی ربوہ لایا گیا جہاں وہ بہشتی مقبرہ میں آسودہ خاک ہوئے۔ عبدالسلام اختر نے اسی موقع

پر کہا تھا:

اے دوست دل پہ بار ہے یہ تلخی مدام
افسانہ بن گیا ہے جنید ہاشمی کا نام
طاعت شعار ، ملتِ احمد کا جانثار
اِک مردِ پُر خلوص ، قناعت کا شاہکار
ہر پہلوئے حیات میں اِک فردِ بے ضرر
بے داغ و بے کدورت و بے کینہ، بے شرر

جنید ہاشمی کی وفات کے اگلے روز حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ان کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے بھائی، شبلی بی کام (جو اس موقع پر لاہور سے آئے ہوئے تھے) اور بچوں سے تعزیت کی۔

یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حضور اُن کی والدہ، اُستانی سکینۃ النّساء کے شاگرد بھی رہے تھے اور اُن کے والدِ بزرگوار کی خدمات دینیہ سے بھی واقف تھے لہٰذا وہ اس خاندان کا بہت احترام کرتے تھے چنانچہ حضور نے ازراہِ شفقت فیروزہ اور ان کی دونوں بہنوں کی شادی کے موقع پر باراتوں کے استقبال کا اہتمام قصرِ خلافت میں کیا اور ان کی رخصتی وہیں سے ہوئی۔

جنید ہاشمی کے بعد اب کچھ ذکر ماسٹر فضل داد کا جو میرے زمانۂ طالبِ علمی میں کچھ عرصہ کالج کے لائبریرین رہے۔ لائبریری سے کتابیں جاری کراتے یا ریڈنگ روم سے استفادہ کرتے وقت ان سے اکثر آمنا سامنا ہو جاتا تاہم یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اگر وہ لائبریری سائنس کے آدمی ہیں تو ماسٹر کیوں کہلاتے ہیں۔ یہ پوچھتا تو کس سے؟ بہت بعد میں جب میری شادی ہوئی تو مجھے اپنی اہلیہ کے ننھیال سے ان کے تعلق کا پتا چلا۔ اب ان کے بڑے بیٹے، چوہدری حمید احمد (حال مقیم لاہور) میرے ملنے والوں میں سے ہیں اور انہوں نے ہی بالآخر یہ عقدہ حل کیا: ''ابا جی مشن ہائی سکول، دھاریوال میں پڑھاتے تھے'' انہوں نے بتایا ''ان کی صحت اچھی تھی اور کھیل کی طرف ان کا رجحان تھا۔ ایک بار وہ اپنے سکول کی ہاکی ٹیم کے ہمراہ قادیان آئے تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی دُور رس نگاہ نے ہاکی پر ان کی دسترس کو بھانپ لیا اور تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر، حضرت مولوی محمد دین (سابق صدر، صدر انجمن احمدیہ) کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر اس طرح کا کوئی نوجوان ہمارے پاس ہوتا تو ہماری ٹیم جیت سکتی تھی۔ مولوی محمد دین نے حضور کو بتایا کہ یہ نوجوان احمدی ہے اور میرا عزیز بھی۔ جب ابا جی تک یہ بات پہنچی تو وہ از خود مشن سکول کی ملازمت سے مستعفی ہو کر قادیان آ گئے اور میری معلومات کے مطابق ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھاتے رہے۔ جب تعلیم الاسلام کالج کا دورِ ثانی شروع ہوا تو کھیلوں میں ان کی دلچسپی کے مدِنظر ان کی خدمات بطور پی ٹی آئی وہاں منتقل کر دی گئیں۔ اس وقت غالباً پی ٹی آئی کا سند یافتہ ہونا ضروری نہ تھا لیکن بعد میں انہوں نے والٹن سے یہ ڈپلومہ بھی حاصل کر لیا۔ وہ چوہدری محفوظ الرحمٰن کے بطور پی ٹی آئی تقرر تک اسی حیثیت میں کام کرتے رہے تاہم اس کے

بعد اباجی کو لائبریرین مقرر کر دیا گیا اور وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک یہی خدمت سرانجام دیتے رہے۔“

”اور اس کے بعد؟“ میں نے حمید سے سوال کیا۔

”وہ بعد میں بھی حتی المقدور جماعتی خدمت پر کمربستہ رہے اور ڈگری کالج کی تعمیر کی نگرانی کرتے رہے۔“

ماسٹر فضل داد جو ۱۹۰۳ء میں تحصیل شکرگڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں، ممکا میں پیدا ہوئے تھے ۳۰ مئی ۱۹۸۰ء کو قریباً ستتر سال کی عمر میں وفات پا کر بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

بہلول پور ضلع سیالکوٹ (اب نارووال) کے رہنے والے، رفیق حضرت مسیح موعود حضرت چوہدری عنایت اللہ کے بیٹے، چوہدری محفوظ الرحمٰن بھی اُن دنوں کالج میں لائبریرین ہوا کرتے تھے اور ان سے میری جان پہچان اسی حوالے سے ہوئی تھی۔ اُن کی رہائش محلہ دارالصدر شمالی میں چچا ابراہیم کے گھر کے قریب تھی چنانچہ میں جب بھی اُدھر جاتا اکثر و بیشتر ان سے بھی آمنا سامنا ہو جاتا۔ وہ بالعموم بائیسکل پر اِدھر اُدھر آ جا رہے ہوتے تھے۔ مجھے دیکھ کر اپنا سائیکل روک لیتے اور علیک سلیک کے بغیر آگے نہ جاتے۔ الغرض انہوں نے مجھے ہمیشہ بہت محبت دی اور تپاک کے ساتھ ملتے رہے۔

انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد اپنی تمام زندگی ربوہ میں گذاری جب کہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں میرا بہت سارا وقت ربوہ سے باہر گذرا لہٰذا ان کے ساتھ رابطہ کچھ کمزور پڑ گیا۔

حالیہ برسوں میں جب چوہدری حمید احمد نے جرمنی میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو فعال کیا اور سابق طلبہ کو بذریعہ ای میل ان کے ساتھیوں کے حوالے سے تازہ بتازہ خبروں سے آگاہ کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ چوہدری محفوظ الرحمٰن کی قوتِ سماعت بالکل ختم ہو چکی ہے اور ان سے گفتگو ممکن ہی نہیں۔ مجھے یہ اطلاع پا کر ایک دھچکا سا لگا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کی سماعت میں اس حد تک ضعف آ چکا ہو گا چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اگلی بار جب بھی ربوہ گیا ان کے پاس ضرور حاضر ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے جلد ہی میری یہ خواہش پوری فرما دی اور میں ان کے بیٹے رفیع احمد طاہر کارکن دفتر وصیت کے ذریعے ان سے وقت طے کر کے ان کے پاس حاضر ہو گیا۔

یہ سردیوں کی ایک دوپہر تھی اور میں کم و بیش دو گھنٹے ان کے پاس رُکا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی قوتِ سماعت ختم ہونے والی بات اتنی درست نہ تھی۔ میں نے ان کے ساتھ گفتگو میں تحمل برقرار رکھا اور اپنا مدّعا چھوٹے چھوٹے فقرات میں ٹھہر ٹھہر کر بیان کیا۔ میرے خیال کے مطابق انہوں نے میرے نوّے فی صد سوالات کے بالکل صحیح جواب دیئے جس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ انہیں بہت اچھی ہیرنگ ایڈ کے علاوہ متحمل سامع کی ضرورت ہے۔ میں نے ان ہی دنوں حمید چوہدری کو اپنے اس تاثر سے آگاہ کیا۔ ٹیلیفون نمبر تو میں نے ان کے بڑے بیٹے وسیم احمد کا بھی لیا تھا تا کہ انہیں چوہدری محفوظ الرحمٰن کی اس ضرورت سے آگاہ کر سکوں لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہو رہا۔

محفوظ الرحمٰن ۳ جنوری ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے تھے، انہوں نے میٹرک اور ایف اے پسرور سے پاس کیا اور

وہ دوسال تک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں پڑھتے رہے لیکن تاریخ کے مضمون میں کمزور تھے لہٰذا بی اے نہ کر پائے۔ کچھ عرصہ دلّی میں ملازمت کی اور پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی تحریک پر اپنی زندگی وقف کردی۔ اس حیثیت میں انہوں نے نظارت بیت المال، وکالتِ دیوان اور ضیاء الاسلام پریس میں مختلف ذمہ داریاں ادا کیں۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں تعلیم الاسلام کالج میں لائبریرین اور ڈی پی ای کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔

وہ ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہوئے جس کے بعد ایک سال خلافت لائبریری ربوہ کے نائب انچارج رہے، دس سال تک ناصر پبلک سکول، ربوہ میں پڑھایا اور ایک سال نصرت جہاں اکیڈمی میں بھی خدمت کا موقع ملا۔

چوہدری محفوظ الرحمٰن والی بال کے دلدادہ تھے چنانچہ جب تک ان کی صحت اجازت دیتی رہی وہ غلہ منڈی کے پاس باقاعدگی سے والی بال کھیلتے رہے۔ ان کے دیگر ساتھیوں میں سے احمد حسن کاتب، میرے سکول کے ایک کلاس فیلو، محمد ارشد (حال مقیم جرمنی) اور عبدالجلیل صادق مجھے اب تک یاد ہیں۔ رفیع طاہر کی روایت کے مطابق اگرچہ چوہدری صاحب اونچا سننے لگ گئے تھے اور بڑھاپا بھی تھا مگر اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک بائیسکل پر ادھر ادھر آتے جاتے اور شام کو غلہ منڈی میں اپنے دوستوں کو والی بال کھیلتا ہوا ضرور دیکھتے۔

انہوں نے اپنی جماعتی خدمات کی جو تفصیل مجھے بتائی تھی وہ ان کی وفات پر الفضل ۲۰ اپریل ۲۰۱۳ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطابق ''ربوہ میں جو پہلا قافلہ بھجوایا گیا آپ اس میں شامل تھے۔ حضرت مصلح موعود کی حفاظتی ڈیوٹیاں دینے کا بھی موقع ملتا رہا۔ جلسہ مصلح موعود ۱۹۴۴ء دہلی میں خواتین کے پنڈال کی حفاظت پر آپ بھی مامور تھے اور مخالفین کا مقابلہ کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر بھی قادیان کی حفاظت کے لیے ڈیوٹیاں دیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں حضرت مصلح موعود کوئٹہ دورہ پر تشریف لے گئے تھے اور وہاں فسادات شروع ہو گئے۔ اس وقت جن افراد کو فوری طور پر کوئٹہ ڈیوٹی کے لیے بھجوایا گیا ان میں آپ شامل تھے اور حضور کی واپسی پر آپ حفاظتی دستہ میں شامل تھے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے چوہدری محفوظ الرحمٰن کی نمازِ جنازہ غائب پڑھانے سے پہلے فرمایا:
''اللہ تعالیٰ کے فضل سے موصی بھی تھے اور اپنا حساب اپنی زندگی میں صاف کر دیا تھا۔ تحریک جدید اور وقفِ جدید کا چندہ اپنے والدین، دادا اور پھوپھیوں وغیرہ بلکہ اگلی نسل میں دو پوتیوں کے بچوں کے طرف سے بھی ادا کیا کرتے تھے۔ بڑے نمازی، تہجد گذار تھے۔ ربوہ کے جو خاص لوگ ہیں اُن کرداروں میں سے ایک تھے۔ جو مرضی ان کو کوئی کہہ دے، میں نے نہیں دیکھا کہ کبھی انہوں نے آگے سے جواب دیا ہو۔ خاموشی سے اور ہنستے ہوئے ہر بات سنتے۔ انتہائی شریف النفس، درویش صفت، خاموش طبع انسان تھے۔''

جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو محمد احمد انور حیدر آبادی ڈی پی ای کے طور پر تعینات تھے اور وہ پہلا ایک سال ہمارا فزیکل ایجوکیشن کا پیریڈ لیتے رہے۔

وہ ہمارے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر تھے اس لیے ان سے جان پہچان کا یہ حوالہ بھی موجود تھا چنانچہ وہ مجھ سے ہمیشہ محبت سے پیش آتے۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ گھنٹیالیاں آتے ہوئے اپنی بندوق ہمراہ لے آتے تھے جس سے میں، وہ اور شریف خالد شکار کھیلنے جاتے تھے۔ بعد میں یہ بندوق کچھ عرصہ میرے پاس رہی لیکن کسی بداحتیاطی کی وجہ سے اس کا ٹریگر ٹوٹ گیا۔ مجھے نقصان کا پورا اندازہ تو نہ ہو پایا لیکن یہ یقین تھا کہ میری اس حرکت نے ان کی بندوق بے کار کر چھوڑی ہے۔ میں نے انہیں بندوق واپس کرتے ہوئے بہت شرمندگی کے ساتھ اپنی نالائقی کا اعتراف کیا تو انہوں نے یوں ظاہر کیا گویا یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ ''بعض دفعہ ایسے ہو جاتا ہے'' انہوں نے مجھے تسلی آمیز لہجے میں کہا'' لیکن اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں خود ٹھیک کرا لوں گا۔''

میرا کئی سالوں سے ان سے رابطہ نہ تھا چنانچہ حال ہی میں جب میں نے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ انگلینڈ میں ہیں۔ بمشکل تمام ان کا نمبر ملا تو ان کی بیٹی، امتہ المجید سے بات ہوئی۔ ''آپ ہیں کون اور ان سے کیا کام ہے؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا اور میرے جواب پر بہت افسوس کے ساتھ بتایا کہ محمد احمد حیدر آبادی اپنی یادداشت کھو چکے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی معنی خیز گفتگو ممکن نہیں ہے۔ ہاں! امتہ المجید نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا: ''آپ کو شاید علم نہ ہوا با جان نے بعد میں ایم اے کر لیا تھا اور وہ کالج میں اسلامیات پڑھانے لگے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں کالج کی نیشنلائزیشن کے بعد وہ نائیجریا چلے گئے اور کئی سال تک وہاں درس و تدریس سے منسلک رہے۔ پھر وہ جرمنی منتقل ہو گئے تھے لیکن پچھلے کچھ عرصہ سے انگلستان میں ہیں۔'' دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔

تعلیم الاسلام کالج میں میرے قیام کے آخری دنوں میں قریشی محمد عبداللہ غالباً ہیڈ کلرک بن کر آئے۔ کیوں کہ جنید ہاشمی کے ساتھ ہماری پرانی یاد اللہ تھی اور وہ ہماری ہر بات بہت محبت کے ساتھ سن بھی لیتے تھے لہٰذا قریشی صاحب کے ساتھ ہمارا واسطہ کم ہی پڑتا تھا مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی اُن سے آمنا سامنا ہو جاتا۔ اُن کی شہرت ایک نیک دل منتظم کی تھی جو طلبہ کے مسائل حل کرنے میں خاص خوشی محسوس کر رہا ہو۔

کئی سال کے بعد میری ایک بھانجی ان کے سب سے چھوٹے بیٹے، ڈاکٹر احسان اللہ ہاشمی کے عقد میں آئیں تو ان سے میل جول بڑھا۔ اب وہ صدر انجمن احمدیہ کے آڈیٹر بن چکے تھے اور انہوں نے زندگی میں نیک نامی کے علاوہ کچھ نہ کمایا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے ذاتی حالات کا علم ہوتا رہا اور میرے دل میں ان کی قدر بڑھتی رہی۔

قریشی محمد عبداللہ سلسلہ کے پرانے خدام میں سے تھے اور قیامِ پاکستان کے وقت صدر انجمن احمدیہ قادیان میں دفتر محاسب و امانت کے ہیڈ کلرک تھے۔ انہیں تقسیم کے وقت صدر انجمن احمدیہ کے بعض اثاثہ جات کی قادیان سے لاہور منتقلی کا اعزاز بھی حاصل ہوا چنانچہ ''تاریخِ احمدیت'' میں اس واقعہ کا ان کے اپنے قلم سے اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

''حضرت...... خلیفۃ المسیح الثانی کا ارشاد تھا کہ محاسب صدر انجمن احمدیہ (مرزا عبدالغنی صاحب) فوراً لاہور بذریعہ ہوائی جہاز چلے جائیں اور اپنے ساتھ کوئی ہوشیار کارکن جسے وہ پسند کریں...... لے جائیں اور وہاں دفتر

محاسب وامانت سیٹ کریں اور اپنے ساتھ روپیہ بھی لیتے جائیں چنانچہ مرزا عبدالغنی صاحب انیس اگست ۱۹۴۷ء کو جمعہ کی نماز کے بعد دفتر خزانہ صدر انجمن احمدیہ سے خزانہ کا روپیہ لے کر دارالانوار پہنچ گئے اور بذریعہ ہوائی جہاز لاہور روانہ ہو گئے۔ آپ نے روانگی سے قبل خاکسار کو جو اس وقت دفتر محاسب و امانت کا ہیڈ کلرک تھا ہدایت فرمائی کہ کل صبح نماز فجر کے معاً بعد حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب سے ہدایات لے کر لاہور پہنچ جاؤں جس کی تعمیل میں خاکسار دوسرے دن بیس اگست کو ہفتہ کے روز نماز فجر (بیت اقصیٰ) میں ادا کرتے ہی حضرت صاحبزادہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا اور اندر چٹ اپنے نام کی بھیج کر ہدایت چاہی جس پر حضرت میاں صاحب نے سرخی سے نوٹ فرمایا: ''لاہور ابھی چلے جائیں۔ جہاز دارالانوار میں تیار ہوگا۔ اپنے ساتھ صرف دفتر کا ضروری سامان دفتر چلانے کے لیے جو دس سیر سے زائد نہ ہو لے جا سکتے ہیں۔''

میں بجائے اس کے کہ گھر جاتا جو وہاں سے صرف پانچ چھ منٹ کا راستہ تھا محاسب پہنچا اور وہاں سے کچھ رسیدات اور دو ایک ضروری رجسٹر ساتھ لئے اور خزانہ کے پہرہ دار کو کہا کہ میرے گھر پیغام دے دیں کہ میں حضور کے ارشاد کی تعمیل میں لاہور جا رہا ہوں۔ میں بھاگا بھاگا دارالانوار پہنچا۔ وہاں (بیت دارالانوار) کے پاس جہاز اڑان کے لیے سٹارٹ ہو چکا ہوا تھا۔ اس کے پائلٹ سید محمد احمد صاحب تھے۔ میں نے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی چٹ سید محمد احمد صاحب کو دی۔ انہوں نے جو آدمی پہلے جہاز میں لاہور جانے کے لیے بیٹھا تھا اسے اتار دیا اور مجھے اس میں بیٹھنے کو فرمایا۔ میں نے رجسٹر وغیرہ جہاز میں رکھے اور جہاز میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی جہاز لاہور کے لیے اڑان کر گیا اور میں نے جہاز میں بیٹھے بیٹھے وطن کو آخری سلام کیا۔ اس دن بارش ہو رہی تھی۔ راستے میں سید صاحب موصوف مختلف جگہوں پر سکھوں اور ہندو حملہ آوروں کے ہجوم بھی دیکھتے تھے تا کہ وہ اس کی اطلاع حضرت (خلیفۃ المسیح) کو دے سکیں چنانچہ انہوں نے فرمایا میں جہاز کی کھڑکیاں مذکورہ اطلاع لینے کے لیے کھول رہا ہوں جم کر بیٹھے رہو۔ کھڑکیاں کھل گئیں۔ نیچے جگہ جگہ حملہ آوروں کے ہجوم مختلف دیہات میں دیکھے گئے۔ کئی جگہ آگ لگ رہی تھی۔

ہمارا جہاز امرتسر کے بالکل اوپر سے نہیں گذرا کیونکہ امرتسر میں تو ہمارے جہاز کو اڑا دینے کے پورے سامان موجود تھے اس لئے جہاز امرتسر سے ذرا ہٹ کر گذرا۔ قادیان سے لاہور ہم صرف نصف گھنٹہ میں پہنچ گئے۔ یہاں ہوائی اڈہ پر مکرم شیخ بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہی اس وقت لاہور میں مقامی امیر تھے۔ میں نے انہیں اپنی آمد اور آمد کے مقصد سے اطلاع دی۔ مجھے انہوں نے اپنی کار میں بٹھایا اور کوٹھی ۱۳۔ ٹیمپل روڈ لاہور میں (جو صدر انجمن احمدیہ کی ملکیتی ہے) پہنچے۔ یہاں اس وقت لاہور شہر اور بیرونجات سے احمدی احباب فسادات کے سلسلہ میں حملوں اور شہر میں جو لوٹ مار ہو رہی تھی کے باعث مکرم شیخ صاحب سے مشورے کرنے آ رہے تھے۔ مجھے تو حکم ہوا کہ میں وہاں کوٹھی میں دفتر قائم کر لوں اور جو احباب چندہ جات وغیرہ دیتے ہیں لینے شروع کر دوں۔ میں نے باوجودیکہ کوٹھی میں تِل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی ایک کونے میں کرسی لگا کر کام شروع کر دیا۔ چونکہ ابھی قادیان کی حفاظت کے سلسلہ میں سامان اور رضا کار بھجوائے جا رہے تھے جس کے

لیے شیخ صاحب مکرم پہلے پرچی جاری کرتے اور محاسب صاحب کی تصدیق سے میں ادائیگی کر دیتا تھا۔ مذکورہ ضروریات کے لیے حضور کے ارشاد کے مطابق حبیب بینک لمیٹڈ لاہور میں صدر انجمن احمدیہ پاکستان، لاہور کے نام سے اکاؤنٹ کھولا گیا جس کے آپریٹر شیخ بشیر احمد صاحب اور مرزا عبدالغنی صاحب محاسب قرار پائے تھے۔

مجھے بینک سے حسب ضرورت پچاس ساٹھ ہزار روپیہ نکلوا دیا گیا۔ میں روزانہ جو آمد چندہ جات وصول ہوتی اسے بنک مذکورہ میں جمع کرا دیتا اور بنک سے برآمد شدہ رقم ہر دو افسران کی ہدایات کے تحت خرچ کرتا اور اس کا حساب رکھتا جاتا۔‘‘

قریشی محمد عبداللہ کی والدہ حضرت عالم بی بی حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھیں۔ روایت کے مطابق وہ بالعموم حضرت اماں جان کی خدمت میں حاضر رہتیں اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھتیں۔ الفضل انٹرنیشنل ۲۰ جولائی ۲۰۰۱ء میں تفصیلی ذکر ہے کہ انہوں نے کس طرح ایک بار حضرت مسیح موعود کے ایک مہمان کو اپنا کھانا پیش کیا اور حضور کی طرف سے کلماتِ تحسین کی حق دار قرار پائیں۔

موصوف کے بعض ایمان افروز واقعات اسی الفضل میں چھپے ہوئے موجود ہیں چنانچہ وہ بتاتے ہیں کہ: ’’۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء میں جب میں دفتر خزانہ کا ہیڈ کیشیئر تھا تو ایک روز میرا ایک سو روپیہ کم ہو گیا۔ کچھ دنوں کے وقفہ سے دو تین بار ایسا ہی ہوا۔ میرے اسسٹنٹ نے بتایا کہ اس کے بھی ایک سو روپے کم ہو گئے ہیں۔ میں سخت پریشانی میں دعا کرتا رہا کہ ایک دن زور سے آواز آئی کہ فلاں چور ہے۔ میں نے اسسٹنٹ سے پوچھا کہ کیا اسے بھی کوئی آواز آئی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ خدائی آواز ہے۔ جس کا نام بتایا گیا تھا، بعد میں اُسے محتسب کے ذریعہ بلا کر دھمکایا گیا تو اُس نے جرم کا اقرار کر لیا۔

اسی طرح ایک دفعہ میرا ایک ہزار روپیہ گم ہو گیا۔ میں صبح و شام دعا کرتا رہا۔ ایک دن حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی اُس وصیت کے مطابق دعا کی جو آپ نے اپنی وفات سے پہلے اپنے بچوں کو کی تھی کہ جب کوئی مشکل وقت آپڑے تو شہر کے باہر کسی اونچی جگہ پر چڑھ کر دعا کرنا کہ اے نورالدین کے رب! نورالدین تجھے بہت پیارا تھا، تو اس کی دعاؤں کو قبول فرما لیتا تھا۔ میں اس مشکل میں مبتلا ہو گیا ہوں، اسے دُور فرما۔‘‘ میں نے روتے ہوئے دعا کی اور واپس گھر آ گیا۔ اگلے ہی روز مجھے ایک ہزار روپیہ واپس مل گیا جو میں غلطی سے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے اکاؤنٹنٹ کو دے بیٹھا تھا۔

میں نے ساری زندگی کبھی کسی کام کو عار نہیں سمجھا۔ گذارہ کرنے کے لیے ٹیوشنیں بھی پڑھائیں۔ اپنے کچے گھر کو خود آہستہ آہستہ پکی اینٹیں منگوا کر پکا کر لیا۔ خود چھتوں پر لپائی بھی کی، صحن کا فرش بھی ڈالا، بچوں کو تعلیم بھی دلوائی۔ میرا یہی پیغام دوسروں کے لیے بھی ہے کہ کبھی کسی کام کو کرنے میں عار نہ محسوس کریں۔‘‘

موصوف نے ۲۳ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ اُن کے صاحبزادوں میں سے قریشی سمیع اللہ پنجاب کے بعض مشہور کالجوں کے پرنسپل اور ڈائریکٹر آف ایجوکیشن رہے؛ قریشی امان اللہ بھی تدریس کے شعبے سے منسلک رہے جب کہ قریشی احسان اللہ آج کل علامہ اقبال میڈیکل کالج میں ہیں۔

تعلیم الاسلام کالج کے کارکنان میں ''شادی'' کے علاوہ مجھے فوری طور پر جو نام یاد آ رہے ہیں ان میں سے ایک نام ناصر احمد صدیقی کا ہے۔ وہ حکیم محمد صدیق، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے ہیں جو اباجی کے تایازاد بھائی تھے۔ ناصر صدیقی کیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں لیکچر اسسٹنٹ تھے لیکن ان کے سپرد بعض اضافی ذمہ داریاں بھی تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ہومیو پیتھک پریکٹس کو ذریعۂ معاش و خدمت خلق بنا رکھا ہے اور محلہ دارالرحمت وسطی میں مقیم ہیں۔

اُن سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے بہت سے دیگر کارکنان کے نام یاد دلا دیئے۔ ان کے بیان کے مطابق مبارک احمد صابر، ہارون الرشید اور بابر پرنسپل آفس میں کلرک تھے جب کہ شمعون پرنسپل آفس میں، عبدالشکور ظفر لائبریری میں، محمد علی نیو کیمپس میں اور مجید احمد بیالوجی ڈپارٹمنٹ میں مددگار کارکن تھے۔''

''پرنسپل آفس میں محمود اسلم بھی تو ہوا کرتے تھے!'' مجھے اچانک یاد آیا۔

''جی۔ چوہدری محمود اسلم! ماشاءاللہ حیات ہیں اور محلہ دارالعلوم غربی میں رہائش پذیر۔''

لمبے تڑنگے، بھاری بھرکم محمود اسلم یوں تو پرنسپل آفس میں جانے کیا کیا ذمہ داریاں نبھاتے ہوں گے لیکن میں نے انہیں ہمیشہ طلبہ سے فیس وصول کرتے ہی دیکھا۔ اس زمانے میں فیس کی شرح انتہائی معمولی تھی لیکن جماعتی کارکنان کے ذرائع آمدن اسی نسبت سے محدود تھے لہٰذا ہم ایسے طلبہ کی طرف سے فیس کی ادائی میں دیر سویر ہو جاتی لیکن محمود اسلم ہمیشہ ہماری سہولت کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔

کالج چھوڑنے کے بعد کئی سال تک تو ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی تھی لیکن پھر ملاقات میں ایک طویل وقفہ پڑ گیا۔ ناصر صدیقی نے یہ بتا کر کہ محمود اسلم ربوہ ہی میں رہائش پذیر ہیں اُن سے رابطہ ممکن بنا دیا۔

میں نے ان کے گھر پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے اپنی ایک بیٹی کے پاس کوئٹہ گئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کا نمبر لے لیا اور اپنا نام لے کر بتایا کہ میں ان کے پرانے نیازمندوں میں سے ہوں تو وہ بے انتہا خوش ہوئے اور کہا: ''مجھے آج بھی وہ دن نہیں بھولا جب آپ نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ آپ کے چچا تو خیر کالج میں پڑھاتے تھے، میں آپ کے والد بزرگوار سے بھی ذاتی طور پر متعارف تھا۔ پھر آپ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے اور اپنا اور جماعت کا نام خوب روشن کیا۔ آپ سے ملاقات تو کم ہی رہی لیکن مجھے کسی نہ کسی حوالے سے آپ کی ترقیات کی خبریں ملتی رہی ہیں۔''

''بہت مہربانی'' میں نے ان سے کہا ''یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ مجھے اُس دور کا کوئی خاص واقعہ سنائیے!''

''واقعات تو کئی ہیں'' انہوں نے کہا ''میری اڑتیس سالہ ملازمت کا نصف حصہ تعلیم الاسلام کالج میں گزرا جہاں مجھے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے زیر سایہ بھی کام کرنے کا موقع ملا اور میں یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ کی طرف سے ہمیشہ محبت ہی ملی۔ ایک واقعہ جو مجھے فوری طور پر یاد آ رہا ہے عرض کرتا ہوں۔''

''ارشاد!''

''ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر میری ڈیوٹی حسب سابق افسر جلسہ سالانہ کے دفتر میں تھی۔ جلسہ سے کچھ روز پہلے میرے ایک برادر نسبتی کی شادی آ گئی جس کے لیے مجھے جڑانوالہ جانا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میں شادی میں شمولیت کے بعد جلسہ کی ڈیوٹی شروع کرنے سے پہلے ربوہ پہنچ جاؤں گا لیکن کسی مجبوری کے تحت شادی کی تاریخ میں کچھ ردوبدل ہو گیا اور میں ربوہ اس وقت پہنچا جب ڈیوٹیاں شروع ہوئے پورا ایک دن گذر چکا تھا۔ بہر حال میں سیدھا افسر جلسہ سالانہ کے دفتر میں حاضر ہو گیا۔ محبوب عالم خالد جو نائب افسر جلسہ سالانہ تھے میری اس غیر حاضری پر سخت ناراض تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر سیخ پا ہو گئے اور کچھ ہی دیر میں مجھے افسر جلسہ سالانہ کے دستخط سے ایک خط تھما دیا۔ اس خط کے ذریعے مجھ سے میری غیر حاضری پر جواب طلبی کی گئی تھی۔ میں نے اس خط کی پشت پر لکھ دیا کہ کسی مجبوری کے تحت شادی آگے چلی گئی تھی جس کی وجہ سے میں بروقت ربوہ نہیں پہنچ سکا۔ میری وضاحت افسر جلسہ کے سامنے پہنچی تو انہوں نے کوئی تادیبی کارروائی کرنے کی بجائے مسکراتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا: کیا تمہاری اپنی شادی بھی ایسی ہی افراتفری میں ہوئی تھی؟ اور مجھے اپنا کام جاری رکھنے کی ہدایت کی۔''

''بہت خوب!''

''ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔ جن دنوں کالج کا نیو کیمپس (جسے عوام الناس بعد میں یونیورسٹی کہنے لگے تھے) زیر تعمیر تھا ایک روز پرنسپل صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور دریافت کیا کہ اگر مجھے اپنے موجودہ فرائض کے ساتھ ساتھ نیو کیمپس کی تعمیر کا حساب کتاب رکھنے کے لیے کہا جائے تو میرا ردِ عمل کیا ہوگا۔ میں آپ کے سامنے انکار کی جرأت کیسے کر سکتا تھا۔ مجھے آمادہ پا کر آپ نے دریافت فرمایا: اس وقت تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟ میں نے جواباً کہا: شاید سو روپے ہوگی یا کم و بیش۔ اس پر آپ نے فرمایا: اگر تمہاری تنخواہ میں پچیس روپے کا اضافہ کر دیا جائے تو تنخواہ کتنی ہو جائے گی؟ میں نے جواباً عرض کی: ایک سو پچیس یا اس کے لگ بھگ۔ بات یہاں ختم ہو گئی لیکن شام کو مجھے آپ کی طرف سے گھر حاضر ہونے کی ہدایت موصول ہوئی۔ میں گیا تو آپ نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ جب تک میرے ذمے یہ ڈیوٹی رہے گی مجھے تنخواہ کے ساتھ ہر ماہ پچیس روپے فالتو ملا کریں گے۔ یہ تھی آپ کی شفقت! اگر آپ چاہتے تو مجھے اضافی تنخواہ کے بغیر بھی یہ ڈیوٹی سرانجام دینا پڑتی لیکن آپ نے میری حق تلفی گوارا نہ کی۔''

آپ یقین جانیئے محمود اسلم اور تعلیم الاسلام کالج کے عملہ کے باقی اراکین کے پاس صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی شفقت و محبت کے بے شمار واقعات موجود ہیں اور اگر میں انہیں لکھنے بیٹھ جاؤں تو ایک الگ کتاب درکار ہوگی۔ میں نے محدود پیمانے پر کچھ واقعات جمع کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں جو اُمید ہے اُنہیں پسند آئیں گے۔

تعلیم الاسلام کالج اور اس کے اساتذہ اور عملے کے بعض اراکین کے ذکرِ خیر کے بعد اب میں آپ کو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۵ء کے اُس ربوہ میں واپس لئے چلتا ہوں جہاں شہری سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی براہیمی دعاؤں کے طفیل آہستہ آہستہ اس شہر پر انعاماتِ الٰہی کی بارش شروع ہو گئی۔ آپ بے شک اس بات پر یقین نہ کریں، میں تو خود اِن کا عینی شاہد ہوں۔

ایک دن رکھی گئی جن سے بنائے ربوہ اُن براہیمی دعاؤں کے اثر کو دیکھا

میں ربوہ کی قدم بہ قدم ترقی کا عینی شاہد ہوں۔شروع میں یہاں کی تمام عمارتیں کچی تھیں۔ کچھ بیوت الذکر،قصرِ خلافت،صدرانجمن احمدیہ اورتحریکِ جدیدانجمن احمدیہ کے دفاتر اوران کے کارکنان کے کوارٹرز، نورہسپتال،نصرت گرلز ہائی سکول،احاطہ اوردارالضیافت جماعتی طور پرتعمیر کیے گئے تھے۔ریلوے اسٹیشن،لاری اڈے اورڈاک خانے کی عمارات اور بازاران پر مستزاد تھے۔یہ سب عمارات ریلوے لائن کے آس پاس تعمیر ہوئیں۔دو تین سال تک یہی کیفیت رہی۔پھر آہستہ آہستہ پختہ عمارتیں بننے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بیت مبارک،قصرخلافت، صدرانجمن احمدیہ وتحریک جدید انجمن احمدیہ کے دفاتر،فضلِ عمر ہسپتال،تعلیم الاسلام ہائی سکول،تعلیم الاسلام کالج،نصرت گرلز ہائی سکول، جامعہ نصرت، جامعہ احمدیہ،فضل عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور جماعت کی ذیلی تنظیموں کے دفاتر کی تعمیر مکمل ہوگئی۔اسی دوران ریلوے سٹیشن، ڈاکخانے اورٹیلیفون ایکسچینج کی پختہ عمارتیں بھی تعمیر ہوگئیں۔ اب گول بازار میں بھی دکانیں کھلناشروع ہوگئیں اورربوہ کاایک نیاچہرہ سامنے آنے لگا۔

یہ تو ہے تیزی سے ترقی کرتی ہوئی اس آبادی کا ایک پہلو۔یہاں کا موسم سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں سخت گرم ہوا کرتا تھا۔اگرچہ مناسب سہولتوں کی عدم موجودگی میں شدید سردی کا مقابلہ بھی کسی طرح آسان نہ تھالیکن یہاں کی گرمی تو برداشت ہی نہ ہوتی بلکہ اس کا تصور ہی اہل ربوہ کے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھا۔مجھے اب بھی یاد ہے جب کوئی گرمی کی شکایت کرتا تو اباجی اکبرالٰہ آبادی کا یہ شعر ضرور پڑھا کرتے تھے:

پڑ جائیں گے چھالے ابھی اکبر کے بدن پر
پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل، مئی، جون

جب وہ شدید گرمی میں باہر سے آتے تو ان کا جسم پسینے سے شرابور ہوتا۔وہ گھر پہنچ کر سب سے پہلے پگڑی اُتار کرکسی کیل کے ساتھ لٹکاتے، بعد میں کوٹ اُتارتے اور پھر اُف اُف کرتے ہوئے کبھی کبھی یہ شعر بھی پڑھا کرتے:

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

صورتِ حال کے تدارک کے لیے گھروں کے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھی جاتیں تاکہ تازہ ہوا کی آمدورفت جاری رہے اور گرمی کی شدت میں کچھ کمی ہو سکے۔کبھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آجاتا تو گرمی سے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اُٹھتے ورنہ کھجور کے بنے ہوئے دستی پنکھوں سے استفادہ کیا جاتا۔گھر میں داخل

ہوتے ہی مرد حضرات قمیص اتار دیتے اور عورتیں کمر اور بسا اوقات پیٹ تک سے کپڑا اُٹھائے رکھنے پر مجبور ہو جاتیں۔ گھر میں دستی پنکھوں کی تعداد کا انحصار بالعموم افرادِ خانہ کی تعداد پر ہوتا جب کہ ایک دو پنکھے آنے جانے والوں کے لئے الگ رکھے جاتے۔ بعض سگھڑ خواتین ان پنکھوں پر کپڑا منڈھ دیتیں یا دھاگے سے پھول کاڑھ دیتیں جس سے ان پنکھوں کی خوبصورتی میں تو اضافہ ہوتا ہی تھا، ان کی زندگی بھی بڑھ جاتی۔ موسم گرما کی چلچلاتی دوپہروں اور تکلیف دہ راتوں میں ان پنکھوں کا دستہ جسم پر خارش کے کام آتا اور اس سے جسم کو ایک ایسی آسودگی حاصل ہوتی جس کا الفاظ میں بیان ممکن نہیں۔

گرمی کی شدت سے اہلِ ربوہ کا رنگ جُھلس جاتا۔ اس موسم میں لُو لگنے کے اوقعات بھی عنقا نہ تھے لیکن جسم پر گرمی دانوں کی کثرت معمولی بات تھی۔ گرمی دانوں سے جسم کو ایک عجیب سی چبھن کا احساس رہتا اور شدید کھجلی ہوتی جسے ختم کرنے کے لیے ٹالکم پاؤڈر استعمال کیا جاتا۔ اس سے وقتی طور پر کچھ افاقہ تو ضرور ہوتا لیکن گرمی دانوں کا اصل علاج درجہ حرارت میں کمی تھا جو کسی انسان کے اختیار میں نہ تھا۔ بعض لوگ بارش کو گرمی دانوں کا تیر بہدف علاج سمجھتے چنانچہ وہ بارش شروع ہوتے ہی قمیص اُتار کر صحن میں بیٹھ جاتے۔ گرمی دانے جاتے جاتے جسم پر اپنا نشان چھوڑ جاتے جو دو تین دنوں میں خود بخود غائب ہو جاتا۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بازار میں طرح طرح کے شربت ملا کرتے تھے جو مقامی دواخانے تیار کرتے تھے۔ بعد میں فضل عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا تیار کردہ آرنج اور لیمن سکویش بھی ملنے لگا تھا لیکن میرے علم کے مطابق ہمدرد کے شربتِ روح افزا کو عوام الناس میں زیادہ مقبولیت حاصل تھی تاہم یہ شربت اکثر لوگوں کی پہنچ سے باہر تھا۔

ابا جی گرمیاں شروع ہوتے ہی گھر پر بہت سا شربتِ صندل اور شربتِ بادام تیار کر لیتے۔ شربتِ صندل کا بنیادی جزو برادۂ صندل تھا جو بازار سے عام مل جایا کرتا جب کہ شربتِ بادام کا بنیادی جزو بادام کی گریاں تھیں۔ شربتِ صندل کی تیاری کے دوران اس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہ کی جاتی تھی البتہ بادام کے ساتھ چینی، خشخاش، چھوٹی الائچی اور چاروں مغز پیس لیے جاتے۔ یوں جو شیرہ تیار ہوتا اس میں پانی ملا کر حسب ضرورت استعمال کر لیا جاتا۔

اس وقت تک ہتھوڑا گروپ یا اس سے ملتے جلتے دہشت گرد گروہ معرضِ وجود میں نہ آئے تھے لہذا ہم کبھی نہ جا سکتا تھا کہ صحن میں سونا کسی خطرے کا باعث بن سکتا ہے چنانچہ شام ہوتے ہی صحن میں چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھا دی جاتیں۔ دن کے مقابلے میں رات خاصی ٹھنڈی ہوتی اور اگر خوش قسمتی سے ہوا چل پڑتی تو نیند کا لطف دوبالا ہو جاتا۔

رات کے وقت جب ہم صحن میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے بعض اوقات غیر متوقع طور پر مطلع ابر آلود ہو جاتا اور گرج چمک شروع ہو جاتی۔ ہم سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی چپ سادھے پڑے رہتے لیکن جب بارش شروع ہو جاتی تو طوعاً و کرہاً اُٹھتے، بستر بغل میں دابتے اور دوسرے ہاتھ میں چارپائی اُٹھا کر

برآمدے کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے۔ اگر بارش کا رُخ برآمدے کی طرف ہوتا تو آدھا بستر تر بتر ہو جاتا۔ شدید گرمی میں اس طرح سے بھیگے ہوئے بستر پر لیٹنے کا اپنا ہی مزا تھا اور پنڈلیوں پر بارش کی پھوار طبیعت کو ایک ناقابلِ بیان قسم کی فرحت سے آشنا کرتی۔

جب گرمی کا دورانیہ غیر معمولی طور پر طویل ہو جاتا تو لوگ بلبلا اُٹھتے۔ اس وقت بارش کی دعائیں مانگی جاتیں اور حالات متقاضی ہوتے تو نمازِ استسقا ادا کی جاتی۔ بادل آتے تو لوگوں کی نظریں آسمان کی طرف لگ جاتیں لیکن جب یہی بادل بن برسے کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتے تو ان کے منہ پھر سے لٹک جاتے اور مایوسی ان پر حاوی ہو جاتی۔ جب بارش شروع ہوتی تو خدا کا شکر ادا کیا جاتا۔ بچے قمیصیں اُتار کر ننگے پاؤں باہر گلی میں نکل آتے اور

کالیاں اِٹاں کالے روڑ
مینہ وسا دے زور و زور

کا ''ورد'' کرتے ہوئے پاؤں سے پانی کے چھینٹے اڑاتے پھرتے۔ اس شعر میں پہلا بے معنی مصرع تو صرف ضرورتِ شعری کے لئے گھڑا گیا ہے ورنہ حقیقتاً یہ خدا سے موسلا دھار بارش برسانے کی دعا ہے جسے خدا جب چاہتا سن لیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے تاحدِ نگاہ جل تھل ایک ہو جاتا۔ ایسے موسم میں سینکڑوں مینڈک نہ جانے کہاں سے یکا یک نمودار ہو کر کچھ ایسے ردھم میں ٹرانے لگتے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی۔

ربوہ میں باغات تو تھے نہیں کہ برسات میں ان میں جھولے پڑتے البتہ پُوڑے پکانے کا رواج عام تھا۔ دراصل یہ بھیگے ہوئے موسم سے لطف اندوز ہونے کا ایک روایتی طریقہ تھا جس کے مطابق میدے اور گُڑ کے پتلے سے آمیزے کو روٹی کی شکل دے کر وافر گھی میں تل لیا جاتا۔ گھر کے چھوٹے بڑے یہ پُوڑے بہت شوق سے کھاتے۔ ایسے موسم میں پکوڑے بھی بنائے جاتے۔ پُوڑوں کی طرح چٹ پٹے پکوڑوں کا بھی اپنا ہی لطف ہوتا۔

بارش سے بننے والی کیچڑ سے جسے ہم ''چکڑ'' یا ''کھوبا'' کہا کرتے تھے گذر کر ایک سے دوسری جگہ جانا آسان نہ تھا لیکن مجبوراً ہمیں اسی کھوبے میں سے گذرنا پڑتا۔ آپ کو کیا بتائیں، راستوں میں اس قدر پھسلن ہوتی کہ خدا کی پناہ۔ پکی سڑکوں اور پختہ گلیوں کی عدم موجودگی میں ان راستوں پر چلنا ہماری مجبوری تھی چنانچہ ہم گرتے پڑتے اپنے کام نمٹا کر گھر واپس آتے لیکن بعض دفعہ ہماری ہیئت کذائی دیکھ کر گھر والے ہنسے بغیر نہ رہ سکتے۔

جب بارش تھم جاتی تو جانے کہاں سے سینکڑوں کی تعداد میں بیر بہٹیاں نکل آتیں۔ سرخ رنگ کا یہ مخملیں کیڑا ہمیں بہت اچھا لگتا تھا چنانچہ ہم سب کام چھوڑ چھاڑ کر بیر بہٹیاں پکڑنے لگ جاتے، انہیں کھلے منہ کی کسی شیشی میں ڈالتے جاتے اور دوستوں کے ساتھ مقابلے میں اپنی اپنی بیر بہٹیوں کی گنتی کرتے رہتے۔

بارش کے بعد دو تین روز کی تیز دھوپ سے زمین کے اوپر چکنی مٹی کی پپڑیاں جم جاتیں۔ مجھے ان پپڑیوں کو پاؤں تلے روندنے میں بہت مزا آتا۔ بعض جگہوں پر بارش کے بعد شورہ زمین سے باہر آ جاتا اور سطحِ زمین تاحدِ نظر سفید ہو جاتی۔ شورہ جسے عام طور پر ''کلّر'' کہا جاتا تھا ایک بھر بھری سی چیز تھی جو قدموں

تلے فوراً دب جاتی۔ شور زدہ زمین پر چلتے ہوئے یوں محسوس ہوتا گویا فرش پر کوئی دبیز قالین بچھا ہوا ہو۔ ابھی فضل عمر ہسپتال کی عمارت تعمیر ہوئی تھی نہ ڈاکخانہ اور ٹیلیفون ایکسچینج بنا تھا بلکہ گول بازار کو تعلیم الاسلام ہائی سکول سے ملانے والے دڑے تک سارا علاقہ ایک چٹیل میدان کی صورت میں تھا جو بارش کے بعد شورے کی سفید چادر اوڑھ لیتا۔

یہی بارانِ رحمت ہمارے لیے کبھی کبھی شدید زحمت کا باعث بھی بن جاتا۔ دراصل انجمن کوارٹرز (اور میرا خیال ہے ربوہ کے عام مکانات) کی چھتیں اس قابل نہ تھیں کہ موسلا دھار بارش زیادہ دیر تک برداشت کرسکیں۔ یہی وجہ تھی کہ بارش کا دورانیہ ذرا طویل ہو جاتا تو چھتیں ٹپکنے لگتیں اور باہر دو گھنٹے بارش ہوتی تو اندر چار گھنٹے برتی۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ابا جی حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے سفروں میں بالعموم ان کے ہمرکاب ہوتے تھے۔ ایک روز جب حضور مرکز سے ایک طویل غیر حاضری کے بعد واپس تشریف لانے والے تھے ربوہ میں بہت شدید بارش ہوئی۔ بارش اتنی موسلا دھار تھی کہ چھت پر جمع ہونے والا پانی کمروں کی کچی دیواروں میں سے اپنا راستہ بنانے لگا۔ ہم نے فرش پر پانی کا پھیلاؤ روکنے کے لئے گھر کی تمام بالٹیاں، دیگچیاں، پراتیں، لوٹے اور جگ حتٰی کہ دھاتی پیالے تک جا بجا رکھ دیئے لیکن پانی تھا کہ کسی صورت قابو نہیں آ رہا تھا۔ بہ الفاظِ غالب یوں محسوس ہوتا تھا "گویا ہم کشتی نوح میں سوار ہوں۔" اس وقت میری عمر بمشکل بارہ یا تیرہ سال ہوگی۔ گھر میں کوئی اور مرد موجود نہ تھا لہٰذا میں نے امی کے مشورے سے اپنے ایک پڑوسی، مولوی نصیر احمد ناصر کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ وہ بارش کے ہاتھوں خود بھی پریشان بیٹھے تھے مگر ازراہِ ہمدردی میرے ساتھ آ گئے اور ہم دونوں نے مل کر کیچڑ کے کئی ٹوکرے چھت پر ڈالے لیکن چھت ٹپکنے کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کو ہماری حالتِ زار پر رحم آ گیا اور بارش تھم گئی تاہم گھر کے اندر ہونے والی بارش بہت دیر بعد بند ہوئی۔ اس عرصے میں فرش پر کیچڑ کی کئی کئی انچ موٹی تہہ جم چکی تھی۔ ہم دونوں نے کدال سے یہ کیچڑ کھرچا اور ٹوکرے بھر بھر کر باہر پھینکا۔ اتنی دیر میں ابا جی گرتے پڑتے گھر پہنچ گئے اور انہوں نے بتایا کہ بارش کی وجہ سے موٹر کا چلنا دوبھر تھا لہٰذا حضور بیل گاڑی پر بیٹھ کر قصرِ خلافت تشریف لے گئے ہیں۔

ربوہ کا زیرِ زمین پانی عام طور پر کھاری تھا۔ محلّہ دار النصر، دار الیمن، دار الفضل اور باب الابواب اس بارے میں خصوصی "شہرت" رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ہم تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتے تھے تو سکول کے نلکے کا پانی سخت بدبودار تھا اور اس میں ایک خاص طرز کی ترشی اور تیزی تھی۔ اس کے باوجود سب بچے یہی زردی مائل پانی پینے پر مجبور تھے۔

ابتدا میں انجمن کے کسی کوارٹر میں نلکا نہ تھا۔ میرا خیال ہے مالی وسائل کی کمی اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ یہ کمی پوری کرنے کے لیے صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے کوارٹروں کے ہر بلاک کے سامنے ایک ایک نلکا لگایا گیا تھا۔ دن کے وقت تو مرد یا لڑکے بالے ہی یہاں سے پانی بھرتے لیکن رات کے اندھیرے میں بالعموم خواتین یا بچیاں پانی بھرتیں۔ ایک بالٹی یا گھڑا بھرنے میں بھی کافی وقت لگتا تھا لہٰذا اپنی باری کے لیے بہت

انتظار کرنا پڑتا۔ یوں ان خواتین کو آپس میں خوش گپیوں کا موقع مل جاتا۔ آہستہ آہستہ اس جگہ نے کوارٹروں کی خواتین اور بچیوں کے لیے میٹنگ پوائنٹ کا درجہ حاصل کر لیا۔ میں اس زمانے میں بچہ تھا لہٰذا بے تکلفانہ ان خواتین کے پاس جا بیٹھتا۔ دن بھر کام کاج میں جتا رہنے کے بعد فرصت کے یہ چند لمحات ان کے لیے بہت فرحت بخش ہوتے۔ طرح طرح کے مسائل میں گھری ہوئی ان پریشان حال خواتین کے کیتھارسس کا ان حالات میں غالباً اس سے بہتر کوئی اور طریقہ ہو بھی نہ سکتا تھا۔

چونکہ یہ نلکا ان گھروں کی جملہ ضروریات پوری کرنے سے قاصر تھا لہٰذا اسے بہت کم فراغت نصیب ہوتی۔ میں جب بھی وہاں جاتا کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ''زور آزمائی'' میں مصروف ہوتا لیکن صبح کے وقت تو بہت پریشانی ہوتی۔ دراصل اُس وقت ہر کوئی جلدی میں ہوتا لہٰذا وہاں خاصا ہجوم ہو جاتا۔ ایسے میں کچھ مَن چلے لنگوٹ کس کر نلکے پر نہانا شروع کر دیتے۔ کچھ دیر تک تو شرافت کے ساتھ نلکے کی فراغت کا انتظار کیا جاتا لیکن اگر یہ غسل غیر ضروری طوالت اختیار کر لیتا تو اس شخص سے درخواست کرنا پڑتی کہ وہ نل سے ذرا دور ہٹ کر اپنے جسم پر صابن مل لے تا کہ اس اثناء میں دوسرے لوگ پانی بھر سکیں۔ اگر وہ معاملہ فہم ہوتا تو وہ یہ بات مان کر غسل ختم کر دیتا ورنہ بعض اوقات معاملہ تُو تُو مَیں مَیں کی صورت بھی اختیار کر لیتا لیکن زمانہ اچھا تھا لہٰذا کبھی سر پھٹول کی نوبت نہیں آئی۔

انجمن کوارٹرز کے مکینوں نے بعد میں آہستہ آہستہ اپنے خرچ پر اپنے گھروں میں نلکے تو لگوا لیے تھے لیکن شور زمین اور نمکین پانی کی وجہ سے یہ نلکے بہت جلد خراب ہو جاتے۔ ایک صبح اچانک پتا چلتا کہ پوری کوشش کے باوجود نلکا پانی نہیں دے رہا۔ ایسی صورت میں لوٹے سے نلکے کے اندر پانی انڈیلا جاتا۔ معمولی خرابی ہوتی تو یہ نسخہ کارگر ثابت ہوتا اور نلکا پانی دینے لگتا لیکن اگر بوکی بالکل خراب ہو چکی ہوتی تو اسے تبدیل کیے بغیر بات نہ بنتی۔ بعض دفعہ نلکے کے پانی میں ریت آنے لگتی جو اس بات کی علامت ہوتی کہ فلٹر کی جالی پھٹ چکی ہے یا پائپ کے زیرِ آب حصے میں سوراخ ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت میں نلکا اکھڑوانا ضروری ہو جاتا۔ بعض حالات میں تو پہلا بور ہی کام آ جاتا اور بعض دفعہ مرمت شدہ فلٹر اور پائپ نئے بور میں ڈالے جاتے۔

ان نلکوں سے حاصل ہونے والے پانی کو عرفِ عام میں نمکین پانی کہا جاتا تھا اور صرف نہانے، کپڑے دھونے اور برتنوں کی صفائی کے کام آتا جب کہ پینے کے لیے ''میٹھا پانی'' منگوایا جاتا تھا۔ اگرچہ نمکین پانی سے نہانا یا کپڑے دھونا بھی آسان نہ تھا کہ اس پانی سے صابن جسم کے ساتھ چپک کر رہ جاتا تھا اور کپڑوں کی میل نہ نکلتی لیکن یہ سارے کام طوعاً و کرہاً اسی پانی کے ساتھ سرانجام دیئے جاتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ میٹھا پانی کمیاب تھا اور مفت نہیں ملتا تھا۔ ہاں! خواتین کبھی کبھار میٹھے پانی سے سر دھونے کی عیاشی کر لیتیں اور پھر فخر یہ ایک دوسرے کو بتاتیں کہ انہوں نے اپنا سر میٹھے پانی سے دھویا ہے۔

نئی پود یقیناً جاننا چاہے گی کہ یہ میٹھا پانی آتا کہاں سے تھا۔ اس حوالے سے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قیامِ ربوہ کے ابتدائی ایام میں قریشی فضل حق نلکا ساز نے بورنگ کا پہلا تجربہ فضلِ عمر ہسپتال والی پہاڑی کے دامن

میں کیا جو نا کام رہا۔ ایک اور جگہ بورنگ کی گئی تو پانی نکل آیا مگر لیبارٹری رپورٹ کے مطابق یہ پانی انسانی استعمال کے قابل نہ تھا۔ تب حضور کی ہدایت پر دریا کے کنارے پر بورنگ کی گئی مگر یہاں سے حاصل ہونے والا پانی بھی اس لائق نہ تھا کہ اسے پیا جا سکے۔ بالآخر محلہ دار الصدر غربی میں عین اُس مقام پر جو اَب صاحبزادہ مرزا منور احمد کی کوٹھی کے ایک کونے میں واقع ہے بور کرایا گیا تو میٹھا پانی نکل آیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا مندرجہ ذیل الہامی شعر اسی واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے:

جاتے ہوئے حضور کی تقدیر نے جناب
پاؤں کے نیچے سے مرے پانی بہا دیا

ماشکی بالعموم اسی ٹیوب ویل سے پانی بھرا کرتے تاہم بہ امر مجبوری فیکٹری ایریا کے کسی نلکے سے بھی پانی لے آتے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو اس ٹیوب ویل کے دروازے پر ایک تختی نصب تھی جس پر مندرجہ بالا شعر لکھا ہوا تھا۔ اب یہ ٹیوب ویل غالباً صاحبزادہ مرزا منور احمد کے صحن میں شامل کیا جا چکا ہے اور قابلِ استعمال نہیں رہا۔

یہ پانی عام طور پر گھڑوں یا مٹکوں میں سٹور کیا جاتا تھا۔ اکثر لوگوں نے یہ گھڑے زمین پر رکھے ہوتے تھے لیکن بعض گھروں میں گھڑونچی کا رواج تھا۔ گھڑونچی سے مراد لکڑی کا وہ سٹینڈ ہے جس پر ایک ہی قطار میں یا اوپر نیچے بیک وقت دو یا تین گھڑے رکھے جا سکتے ہیں۔ رہے مٹکے تو ان سے استفادے کے مختلف طریقے رائج تھے۔ مٹکوں کا کچھ حصہ زمین میں دبا دیا جاتا جس سے ان کے لڑھکنے کے امکانات ختم ہو جاتے۔ ان مٹکوں میں سے پانی بالعموم مگ یا جگ سے نکالا جاتا تھا۔ بہت بعد میں ان مٹکوں میں دھاتی ٹوٹیاں نصب کرنے کا رواج بھی ہو گیا تھا۔

پانی ٹھنڈا رکھنے کے لئے گھڑوں کو چھاؤں میں رکھا جاتا۔ بعض لوگ ان کے نیچے ریت بچھا کر اس پر پانی چھڑکتے رہتے جب کہ گھڑوں کو بھیگی ہوئی پٹ سن کی بوریوں یا ٹاٹ میں لپیٹنے کا رواج بھی تھا۔ صراحی ایک نسبتاً دیدہ زیب چیز تھی جس میں پانی کی گنجائش قدرے کم ہوتی لیکن گھڑے یا مٹکے کی نسبت اس میں پانی زیادہ ٹھنڈا رہتا۔ شائد صراحی کی اسی خوبی کی بنا پر گاہک اس کے لئے کہیں زیادہ دام ادا کرنے پر بھی رضا مند ہو جاتا تھا۔

اگرچہ بعض لوگ حالات کے جبر کے تحت اپنی ضرورت کا میٹھا پانی خود ہی بائیسکل پر لانے کے عادی تھے لیکن ماشکی اس معاشرے کا ایک اہم کردار تھا اور اگر کسی وجہ سے وہ ناغہ کر لیتا تو گھر والوں کو بہت پریشانی ہوتی۔ لوگ ماشکیوں کے ساتھ عام طور پر تعلقات خوشگوار رکھتے تھے۔ ابتدا میں ماشکی بھری ہوئی مشک کندھے پر لٹکا کر پیدل ہر گھر تک جایا کرتے تھے لیکن چونکہ میٹھے پانی کا منبع صارفین کے گھر سے عام طور پر دور ہوتا تھا لہٰذا ان میں سے کسی کو جدّت سوجھی اور اس نے بائیسکل پر پانی پہنچانا شروع کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی ماشکیوں نے بھی بائیسکل خرید لیے لیکن عمر رسیدہ ماشکی اپنا وطیرہ بدل نہ سکے اور آہستہ آہستہ مارکیٹ سے آؤٹ ہوتے گئے۔ بائیسکل سوار ماشکیوں نے اپنے کام میں اس قدر مہارت پیدا کر لی تھی کہ وہ ایک ہاتھ سے مشک کو سہارا دیے رکھتے اور دوسرے ہاتھ سے بائیسکل کا ہینڈل کنٹرول کرتے اور پانی بحفاظت ایک سے دوسری جگہ پہنچا دیتے۔

ان ماشکیوں میں سے ایک رفیق حضرت مسیح موعود حضرت میاں نواب دین بھی تھے جو عوام الناس میں ''بابا کالو'' کی عرفیت سے پہچانے جاتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں پیرانہ سالی کی وجہ سے یہ پیشہ ترک کر دیا تھا تاہم میں نے خود انہیں اپنی کمر پر مشک لادے گھروں میں پانی بھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہوں نے حصولِ رزقِ حلال کو ہمیشہ عبادت کا درجہ دیا۔

مارچ ۱۹۶۲ء میں سیرالیون کے ایک ممتاز لیڈر، ابوبکر بگے کمارا جو خدا کے فضل سے احمدیت کے نور سے منور ہو چکے تھے زیارتِ مرکز کے سلسلہ میں ربوہ تشریف لائے۔ انہوں نے ایک جمعہ یہاں پڑھا، نماز کے بعد موجود احباب سے خطاب فرمایا اور انہیں شرفِ مصافحہ بھی بخشا۔ مجلسِ انصاراللہ مرکزیہ کے ترجمان، ماہنامہ انصاراللہ بابت اپریل ۱۹۶۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ''اسی دوران میں حضرت مسیح پاک کے چند رفقا کرام بھی اُن سے ملے۔ جناب ابوبکر بگے کمارا ان سے خاص طور پر بہت احترام کے ساتھ ملے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان خوش قسمت وجودوں کے آگے جنہیں مسیحِ پاک کی زیارت کا شرف حاصل ہوا فرطِ عقیدت میں بچھے جاتے ہیں۔ ان رفقائے پاک میں محترم حافظ عبدالسمیع صاحب، محترم منشی عبدالحق صاحب کاتب، محترم عبدالرحیم صاحب شرما اور محترم ڈپٹی محمد شریف صاحب ریٹائرڈ ای اے سی کے علاوہ ایک محترم میاں نواب دین صاحب عرف بابا کالو ماشکی بھی تھے۔ ان کی عمر نوے سال کے قریب ہے اور اُنہیں حضرت مسیح پاک کی خدمت کرنے کا خصوصی شرف حاصل ہوا تھا حتیٰ کہ جب ایک موقع پر کوئی اور سواری دستیاب نہ ہونے کے باعث حضرت مسیح پاک کو اُس زمانہ میں دیہات کے مروّجہ طریق کے مطابق کچھ فاصلہ پالکی میں تشریف فرما ہو کر طے کرنا پڑا تو محترم میاں نواب دین صاحب کو بعض دیگر احباب کے ساتھ حضور کی پالکی کو اپنے کندھے پر اُٹھانے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ سُنتے ہی جناب ابوبکر بگے کمارا فرطِ عقیدت میں آگے بڑھے، ان سے بغلگیر ہوئے اور پھر فوراً ہی اُن کے قدموں میں اُکڑوں بیٹھ گئے اور اپنے ہاتھ اُن کے گھٹنوں پر رکھ کر ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں برکت دیں۔ ایک عجیب و غریب نظارہ تھا جو اُس وقت قریب کھڑے ہوئے احباب نے دیکھا۔ انہوں نے اس حال میں کہ خود ان پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی دیکھا کہ افریقہ کے ایک آزاد ملک کا ممتاز لیڈر جو ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اپنے ملک کی نمائندگی کر کے واپس آیا ہے، جو اپنے ملک کی مسلم کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا رکن اور ڈسٹرکٹ کونسل کا ممبر ہے اور جو اپنے قبیلے کے سرداروں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے، ایک بالکل اَن پڑھ، ضعیف العمر اور نحیف و نزار ماشکی کے قدموں میں بیٹھا اُس سے برکت حاصل کرنے کی التجا کر رہا ہے۔ محترم میاں نواب دین صاحب نے آب دیدہ ہو کر جناب ابوبکر بگے کمارا کے سر اور پشت پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور دعا دی اور وہ مسیح پاک کے ایک ادنیٰ خادم سے برکت حاصل کرنے کے بعد خوشی خوشی یوں اُٹھ کھڑے ہوئے کہ گویا انہیں بہت بڑی دولت میسّر آ گئی۔''

میں نے حضرت میاں نواب دین کو آخری بار اقصیٰ روڈ پر ٹیلیفون ایکسچینج کی عمارت کے سامنے لاری اڈہ کی جانب سے آتے ہوئے دیکھا تھا اور رُک کر ان سے مصافحہ کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ پچاس سال پرانی یہ

بات بیان کرتے ہوئے موصوف کا چہرہ، سادہ وضع قطع، خمیدہ کمر اور چال میں ضعف میری آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے ابا جی کے انتقال کے چند ہی روز بعد وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں ان دونوں بزرگان کی قبریں پہلو بہ پہلو ہیں۔

مجھے بخوبی احساس ہے کہ میں حضرت میاں نواب دین کے ذِکر خیر میں محو ہو کر اصل موضوع سے ہٹ گیا ہوں حالانکہ بتانا میں یہ چاہ رہا تھا کہ نلکوں اور ماشکیوں کے اس دور میں اچانک ایک انقلاب کی نوید سنی جانے لگی۔ ٹاؤن کمیٹی ربوہ کی طرف سے شہریوں کے لئے میٹھے پانی کی فراہمی کے منصوبے پر کام کا آغاز ۲۰ مئی ۱۹۶۲ء کو دریائے چناب کے کنارے ٹیسٹ بورنگ سے ہوا تاہم اس منصوبے کی تکمیل میں کافی وقت لگ گیا۔ ٹاؤن کمیٹی کے چیئر مین، صوفی بشارت الرحمٰن نے ۱۹۶۶۔۱۹۶۵ء کے بجٹ کے خاص خاص نکات کی وضاحت کرتے ہوئے نمائندہ الفضل کو بتایا کہ "اہل ربوہ کو شیریں اور صحت بخش پانی مہیا کرنے کے لئے ٹاؤن کمیٹی کی مسلسل مساعی کے نتائج اللہ تعالیٰ کے فضل سے ۶۵۔۱۹۶۴ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئے چنانچہ محلّہ دارالنصر میں دریائے چناب کے قریب زیرِ زمین پانی حاصل کرنے کے لئے ٹیوب ویل کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور گول بازار، ربوہ میں تیس ہزار گیلن کی ٹینکی زیرِ تعمیر ہے۔ موجودہ پروگراموں کے مطابق ان شاء اللہ ۶۶۔۱۹۶۵ء کے آخر تک قریباً چھ لاکھ روپے کی واٹر سپلائی سکیم مکمل ہو کر اہل ربوہ کو پینے کا پانی ملنا شروع ہو جائے گا۔ ٹینکی کی تعمیر میں ایک خاص وجہ سے التوا ہوا ہے۔ اب عنقریب کام پھر شروع ہو جائے گا۔"

اہلِ ربوہ یہ خبر پڑھ کر ٹینکی کی تکمیل کی دعاؤں میں لگ گئے۔ خدا خدا کر کے ٹینکی مکمل ہوئی اور ٹیوب ویل سے لے کر ٹینکی تک پائپ بچھ گئے تو میٹھا پانی گول بازار میں دستیاب ہونے لگا۔ اس سے ماشکیوں کا کام قدرے آسان ہو گیا اور ان لوگوں کو جو اپنے استعمال کے لیے میٹھا پانی خود لاتے تھے بھی کچھ سہولت حاصل ہو گئی لیکن اصل لطف اس وقت آیا جب انجمن کوارٹرز کو بھی اس میٹھے پانی کا کنکشن دے دیا گیا اور آہستہ آہستہ ربوہ کے باقی رہائشیوں کو بھی یہ سہولت حاصل ہو گئی۔ اب ماشکیوں کی ضرورت ختم ہوتی گئی چنانچہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے اکثر لوگوں نے دیگر ذرائع معاش تلاش کر لیے۔

جب تک ربوہ میں بجلی نہیں آئی تھی گھروں میں عام طور پر لالٹینیں جلائی جاتی تھیں اگرچہ اِکّا دُکّا گھروں میں آرائشی لیمپ بھی موجود تھے جن کا نچلا حصہ شیشے یا کسی دھات کا اور چمنی شیشے کی بنی ہوتی تھی۔ لالٹینوں کے مقابلے میں یہ لیمپ زیادہ خوبصورت نظر آتے اور اس کے مالک کی امارت یا حُسنِ ذوق کی نشاندہی کرتے تھے۔

دیے کا رواج بھی عام تھا اور یہ کئی شکلوں میں مل جاتے تھے۔ اس زمانے میں دکانیں ٹین کے بنے ہوئے دیوں سے بھری ہوتی تھیں لیکن بسا اوقات کسی ٹین ساز کے ذریعہ شیشے کی دواتوں یا چھوٹی چھوٹی خوبصورت بوتلوں کو بھی دیئے کی شکل دلوالی جاتی۔ دیے کی بتی باریک ہوتی اور تیل کم خرچ ہوتا لہٰذا ان گھروں میں جہاں رات کو روشنی کر کے سونے کا رواج تھا ایسے ہی دیے جلائے جاتے۔ ہمارے گھر میں بھی رات کے وقت دیا جلتا تھا۔ اس کا

دھواں سانس کے ساتھ پھیپھڑوں میں جاتا اور جسم انسانی پر اس کے مضر اثرات پڑتے لیکن اس وقت لوگوں کو عام طور پر اس کا ادراک نہیں تھا۔ یوں! جب ہم صبح کے وقت اُٹھتے تو کالک نتھنوں پر جمی ہوتی تھی جو اس بات کی شہادت تھی کہ ہم ساری رات دھواں پھیپھڑوں میں لے جاتے رہے ہیں۔ ناک کئی کئی بار صاف کر کے بھی اس کالک سے کلی طور پر نجات حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔

ہمیں انجمن کوارٹرز میں منتقل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک روز میں نے اپنے بڑوں کو آپس میں ربوہ کے لئے بجلی کی منظوری کا ذکر کرتے ہوئے سنا۔ اُس وقت میرے ذہن میں بجلی کا کوئی واضح تصور موجود نہ تھا البتہ اندازہ تھا کہ یہ صاف وشفاف اور عمدہ روشنی کی ایک قسم ہے جس کا کنٹرول ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ دیوں اور لالٹینوں کے رحم وکرم پر زندگی گذارنے والوں کے لئے اس قسم کا انتظام کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا لہٰذا ہم سب اس دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے جب ہمارے گھر میں بجلی کے قمقمے روشن ہوں گے۔

اسی دور میں بجلی کے کھمبے تنصیب کے لئے ربوہ میں لائے جانے لگے۔ میں نے خود یہ کھمبے نصب ہوتے دیکھے ہیں۔ پہلے زمین میں گڑھا کھود کر کھمبے کے لئے بنیاد تیار کی جاتی، پھر کھمبے کا نچلا سرا اس گڑھے کے قریب لایا جاتا اور اس کے دوسرے سرے پر مضبوط رسے ڈال کر کھمبے کو آہستہ آہستہ اتنا اُوپر اُٹھا دیا جاتا کہ یہ بنیاد میں اپنی جگہ پکڑ لے۔ یہ کام چونکہ بہت طاقت اور احتیاط کا متقاضی تھا لہٰذا کسی حادثے سے بچنے کے لئے غیر متعلقہ لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔

جب موجودہ اقصیٰ روڈ پر بجلی کے کھمبوں کی تنصیب جاری تھی میں بڑی دلچسپی سے یہ ساری کارروائی دیکھا کرتا تھا۔ مزدور ایک دوسرے کی ہمت بڑھانے کے لیے ''زور لگا کے حیا! زور لگا کے حیا!!'' کے مترنم نعرے بلند کرتے جس سے ان کے جوش وخروش میں اضافہ ہو جاتا اور وہ اس کام کو بسرعت پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔ اگلا مرحلہ بجلی کی تاروں اور ٹرانسفارمرز کی تنصیب کا تھا جس کی تکمیل کے بعد اہلِ ربوہ شہر کو بجلی کی فراہمی کے بارے میں خاصے پر اُمید ہو گئے۔

بجلی کی فراہمی کے حوالے سے ایک اور اہم مرحلہ گھروں میں وائرنگ کا تھا۔ انجمن کوارٹرز میں وائرنگ پر مامور الیکٹریشنز اپنا تعلق لاہور سے بتاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صدر انجمن احمدیہ کی تمام عمارات میں وائرنگ کا ٹھیکہ آئی سی ڈی کمپنی لمیٹڈ، گول بازار، ربوہ کے پاس تھا۔ وائرنگ کرنے سے پہلے لکڑی کی ایک باریک سی تختی دیوار پر ٹھونکی گئی اور اس کے اوپر سیاہ رنگ کی تار کلپس کی مدد سے بچھا دی گئی۔ دونوں کمروں اور برآمدے میں بلب کا ایک ایک پوائنٹ اور ایک ایک پلگ فراہم کیا گیا جب کہ باورچی خانے، سٹور اور صحن میں صرف بلب کے لئے ایک ایک پوائنٹ مہیا کیا گیا۔

سچ پوچھیں تو مجھے یاد نہیں کہ انجمن کوارٹرز میں بجلی کب آئی لیکن ابا جی کے ایک تحریری نوٹ سے جو اُن کی ایک ڈائری میں درج ہے پتا چلتا ہے کہ یہ واقعہ ۶ فروری ۱۹۵۴ء کا ہے۔ ابا جی کے اپنے الفاظ میں ''ہمارے ہاں ربوہ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے ۶ فروری ۱۹۵۴ء کو شام کے وقت بجلی آ گئی۔ الحمد للہ۔ ہمارے میٹر میں صرف تین

یونٹ بجلی پہلے خرچ ہو چکی ہے۔ اب ہمارا خرچ اس کے بعد شروع ہوگا''۔ معلوم ہوتا ہے کہ ازراہِ آزمائش انجمن کوارٹرز کو بجلی ۶ فروری کو فراہم کر دی گئی تھی جب کہ ربوہ میں ''بجلی کے کرنٹ'' کا باقاعدہ افتتاح ۸ جون ۱۹۵۴ء کو بعد نمازِ عشا ہوا۔ الفضل کی خبر کے مطابق اس موقع پر ''بیت مبارک کی پیشانی اور بڑے دروازے پر مختلف رنگوں کے بلب لگائے گئے تھے نیز شاہراہوں پر کھمبوں کے ساتھ ٹیوبیں لگائی گئی تھیں۔ جوں ہی بجلی کی رو آئی بیت مبارک اور شاہراہیں جگمگا اُٹھیں اور ربوہ بقعہ نور بن گیا۔''

۶ فروری ۱۹۵۴ء کو میری عمر نو سال اور دو ماہ تھی اور میں نے اپنی زندگی میں بجلی کی روشنی پہلی بار اسی روز دیکھی تھی۔

اُن دنوں ربوہ میں کوئی بنک موجود تھا نہ بجلی کے بلوں کی وصولی کا کوئی اور انتظام لہٰذا اہلِ ربوہ کو بل جمع کرانے کے لیے خود چنیوٹ جانا پڑتا تھا۔ یہ طریقِ کار اخراجات میں غیر ضروری اضافے اور ضیاعِ وقت کا سبب بن رہا تھا۔ پہلے تو اڑوس پڑوس کے دو چار گھر مل کر باری باری یہ بل جمع کرا دیتے لیکن پھر بعض لوگوں نے اس کام کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ ایسے افراد مختلف گھروں سے بل اکٹھے کر لیتے اور ایک آنہ فی بل حق الخدمت وصول کر کے یہ تمام بل چنیوٹ جمع کرا آتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ چارجز بڑھتے بڑھتے ایک روپیہ فی بل ہو گئے۔ اس طرح بل جمع کرانے والوں میں محمد رفیع نامی ایک مددگار کارکن بھی تھے جو نظارت امورِ عامہ میں کام کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء کے آخر میں اہلِ ربوہ کو نظارت امورِ عامہ کی طرف سے یہ نوید سنائی گئی کہ بجلی کا بل ربوہ ہی میں جمع کرانے کا انتظام ہو گیا ہے اور اس مقصد کے لئے واپڈا کا ایک کلرک ہر ماہ میں دو ہفتے بجلی کے دفتر واقع محلہ دارالبرکات میں بیٹھا کرے گا۔ بدقسمتی سے یہ انتظام زیادہ عرصہ چل نہ سکا اور ربوہ میں اس کلرک کے قیام کی مدت گھٹا کر مہینے میں صرف دو دن کر دی گئی۔ واپڈا کے اس اقدام کے خلاف نظارت امورِ عامہ کی طرف سے باقاعدہ احتجاج کیا گیا۔ صورتِ حال نہ جانے کب بدلی لیکن اس کے بعد جب تک میرا قیام ربوہ میں رہا، بل مقامی طور پر ہی جمع ہو جاتے۔

اگرچہ انجمن کوارٹرز میں وائرنگ کرتے وقت صرف انتہائی ضروری جگہوں پر بجلی کے چند پوائنٹس دیئے گئے تھے لیکن بجلی آتے ہی ان کوارٹروں کے مکین اس پریشانی میں گرفتار رہنے لگے کہ وہ بجلی کا بل کیسے دے پایا کریں گے۔ بس یہی سوچ کر انہوں نے کفایت شعاری کی مہم شروع کر دی اور ہر وقت بلب بجھانے کی فکر میں رہتے۔ ہم لوگ رات کے وقت تیز روشنی میں سونے کے ویسے بھی عادی نہ تھے لہٰذا سوتے وقت زیرو واٹ کا بلب جلانے لگے۔

بتایا جاتا ہے کہ قادیان میں صاحبزادہ مرزا منصور احمد اور حضرت نواب زادہ محمد عبداللہ خان نے مل کر ''میک ورکس'' کے نام سے ایک کارخانہ قائم کر رکھا تھا جس کی مصنوعات میں سے ایک ''میک لائٹ'' بھی تھی۔ ربوہ میں بجلی آنے کے بعد دوبارہ اس آلے کی عوامی سطح پر ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ یہ آلہ بازار میں ملنے لگا۔ پرویز پروازی بتاتے ہیں کہ اس آلے پر ''میڈ اِن انڈیا'' کی مہر لگی ہوتی تھی۔ غالب گمان ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت میک ورکس والے میک لائٹ کا کچھ سٹاک پاکستان منتقل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اَب بازار میں

بکنے لگا تھا۔

میک لائٹ بلب ہولڈر کے ساتھ بہ آسانی نصب ہو جاتا تھا اور اس پر ٹارچ کا بلب فِٹ ہوا کرتا تھا۔

بجلی کی آمد کے بعد میک لائٹ کی فراہمی نے ہماری زندگی مزید آسان بنا دی اور ہم کاربن پھانکنے سے محفوظ ہو گئے۔

اگرچہ اب بجلی تو آ گئی تھی لیکن اکثر گھروں میں بجلی کا پنکھا خریدنے کی سکت نہ تھی۔ مجھے انجمن کوارٹرز کے باقی باسیوں کا بھی اندازہ ہے لیکن اپنے گھر کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بجلی آنے کے کئی سال بعد تک بھی ہمارے ہاں بجلی کا کوئی پنکھا نہیں تھا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں صاحبزادہ مرزا منصور احمد نے منصور الیکٹریکل انڈسٹریز کے نام سے فیکٹری ایریا میں چھت کے پنکھوں کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ ان پنکھوں کا نام پریمیکس تھا۔ اباجی نے اپنی وفات سے ایک یا دو سال پہلے ذکر کیا کہ یوں تو اس پنکھے کی بازاری قیمت قدرے زیادہ ہے لیکن ان کی فرمائش پر میاں صاحب انہیں یہ پنکھا ایک سو روپے میں دینے پر رضا مند ہو گئے ہیں۔ ہم بہت بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگے جب ٹھنڈی ہوا ہماری دسترس میں ہو گی۔ بالآخر وہ روزِ سعد آ گیا اور پنکھا ہمارے ایک کمرے کی چھت پر نصب ہو گیا۔ جس روز ہمارے گھر میں یہ پنکھا نصب ہوا، وہ دن ہمارے لئے عید سے کم نہ تھا۔

فرج اور ایر کنڈیشنر تو بہت بعد میں آئے، شروع میں تو ہم ٹھنڈے پانی کے لیے بھی ترستے تھے۔ اگر برف مل جاتی تو ٹھنڈا پانی میسر آ جاتا ورنہ تازہ پانی پر قناعت کرنا پڑتی۔ ان ہی دنوں ہم نے یہ خبر سنی کہ جماعت فیکٹری ایریا میں اپنی آئس فیکٹری لگانے کی فکر میں ہے۔ یہ فیکٹری تحریک جدید کے ایک ذیلی ادارے، سندھ ویجیٹیبل آئلز اینڈ الائیڈ پراڈکٹس کمپنی لمیٹڈ ربوہ نے قائم کی تھی اور وسط ۱۹۵۶ء میں اس کی پروڈکشن بھی شروع ہو گئی۔ خیال تھا کہ اس فیکٹری کے قیام سے ربوہ میں برف کی ہمہ وقت اور سستے داموں فراہمی یقینی ہو جائے گی لیکن بدقسمتی سے یہ فیکٹری جلد ہی بند ہو گئی۔ اس فیکٹری کے بند ہونے کی اصل وجوہات تو خدا جانے کیا ہونگی لیکن مشہور تھا کہ اسے اردگرد کی فیکٹریوں نے فیل کر دیا ہے۔ اس فیکٹری کے قیام سے پہلے برف چنیوٹ یا لالیاں سے آتی تھی، فیکٹری بند ہونے کے بعد بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ برف حسبِ ضرورت بازار سے خریدی جاتی۔ جب یہ برف ختم ہو جاتی تو بازار سے مزید منگوالی جاتی لیکن کبھی کبھی بازار میں برف کمیاب ہو جاتی تو یوں لگتا گویا گرمی کی شدت میں یکدم کئی گنا اضافہ ہو گیا ہو۔

اُس زمانہ میں کسی مہمان کی تواضع یا ایک پہر کی ضروریات کے لئے ایک یا دو آنے کی برف بہت کافی ہوتی تھی۔ سخت دھوپ میں برف کا لانا کار دارد تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہی تھا۔ بازار سے برف لانے کے لئے ہر گھر میں ایک کپڑا مختص ہوتا جو کوئی استعمال شدہ تولیہ بھی ہو سکتا تھا۔ غیر استعمال شدہ برف اسی کپڑے میں لپیٹ کر محفوظ کر لی جاتی اور ضرورت پڑنے پر دوبارہ استعمال کر لی جاتی۔ بعض لوگ زمین کے اندر ایک چھوٹے سے گڑھے میں لکڑی کا برادہ بھر دیتے اور برف اس میں دبا دیتے۔ عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اس طرح برف کم پگھلتی ہے۔ اس زمانے میں عوام الناس میں یرقان یا گندے پانی کے ذریعہ پھیلنے والی دیگر بیماریوں

کے متعلق کوئی شعور نہ تھا چنانچہ بازار سے ملنے والی برف بے دھڑک استعمال کر لی جاتی اور کوئی شخص یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کرتا کہ یہ برف کس پانی سے کس قسم کے بلاکس کے اندر تیار ہوتی ہے۔ کارخانہ دار برف کی تیاری پر اُٹھنے والے اخراجات میں کمی اور بازار میں برف کی مانگ پوری کرنے کے لئے عام طور پر ناپختہ بلاک باہر نکال دیتے۔ ایسے بلاکوں کی برف کی بیرونی تہہ تو خوب شفاف ہوتی لیکن اندر سے اس کا رنگ دودھیا ہوتا۔ عُرفِ عام میں بیرونی برف کو ''پکی برف'' اور دودھیا برف کو ''کچی برف'' کہا جاتا تھا۔ جب برف فروش کچی برف بھی پکی برف کی قیمت میں فروخت کرتا تو ہم جیسے خریداروں کو شدید جھنجلاہٹ ہوتی لیکن وہ گاہکوں کے ردِ عمل سے بے نیاز حلال وحرام کی بے تکلفانہ آمیزش میں کوئی عار محسوس نہ کرتا۔

ابھی تک کوکا کولا اور سیون اَپ جیسے مشروب بازار میں نہیں آئے تھے لیکن مقامی طور پر تیار کی گئیں بہت سی ''بوتلیں'' جو لیمن، وِمٹو، بنانا، روز، جنجر اور نہ جانے کن کن فلیورز میں تیار ہوتی تھیں بہ آسانی میسر تھیں۔ علاوہ ازیں ''کھاری'' بوتلیں بھی ملا کرتیں جو بدہضمی کے اثرات زائل کرنے کے لیے مفید سمجھی جاتی تھیں۔ یہ بوتلیں دو قسموں کی ہوتی تھیں، ایک وہ جنہیں شیشے کی گولی سے بند کیا ہوتا تھا جب کہ دوسری بوتل عام ڈھکنے والی ہوتی۔ گولی کو بوتل کے اندر دھکیل کر اور ڈھکنے کو مروجہ طریق کے مطابق چابی سے کھولا جاتا تھا۔ میری یادداشت کے مطابق اس بوتل کی قیمت ایک آنہ ہوا کرتی تھی۔

ربوہ میں محمد عبد اللہ نام کے ایک بزرگ ہوا کرتے تھے جو بابا جی فضل محمد ہرسیاں والے کے صاحبزادے تھے۔ امتہ الباری ناصر نے اپنی کتاب "زندہ درخت" میں ان ہی محمد عبد اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ قادیان کے زمانے میں ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے تحریک فرمائی کہ باہر کی آبادیوں والے کم از کم ایک نماز ضرور بیت مبارک میں ادا کیا کریں۔ انہوں نے حضور کے اس ارشاد کی تعمیل میں ایک نماز بیت مبارک میں ادا کرنا شروع کر دی لیکن ایک بار جب حضور اپنی علالت کی وجہ سے چند روز نماز پڑھانے تشریف نہ لا سکے تو موصوف نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ جب تک حضور کی طبیعت ناساز رہے گی وہ اپنے محلّہ میں نماز ادا کر لیا کریں گے۔ چند روز بعد جمعہ کا دن تھا۔ حضور نے خطبہ میں اپنا ایک خواب بیان کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات ایک نوجوان میرے سامنے لا کھڑا کیا اور فرمایا: یہ کہتا ہے کہ چونکہ حضور نمازیں پڑھانے نہیں آ رہے لہٰذا میں اپنے محلّہ میں نماز ادا کر لیا کرونگا۔ حضور نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا: میں اس نوجوان سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم محمود کی نمازیں پڑھنے بیت مبارک میں آتے تھے یا اللہ تعالیٰ کی؟ مصنفہ بیان کرتی ہیں کہ اُن کے یہ بزرگ یہ خواب سن کر سخت شرمندہ ہوئے اور اپنے دل میں عہد کر لیا کہ وہ آئندہ اس معاملہ میں ہرگز سستی نہیں کریں گے۔

یہی محمد عبد اللہ قادیان میں ''دیانت سوڈا'' واٹر فیکٹری کے نام سے مشروبات بنانے کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غلہ منڈی میں بھی ایک سوڈا واٹر فیکٹری قائم کی جس میں کم و بیش تمام مشروبات تیار ہوتے تھے جن کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے تاہم محدود گنجائش کے اس پلانٹ کے لئے مقامی مارکیٹ کی طلب پوری کرنا آسان نہ تھا چنانچہ ربوہ کے دکاندار چنیوٹ اور لالیاں سے بھی یہ مشروبات منگواتے تھے۔

اُسی زمانے میں کوکا کولا اور سیون اَپ بازار میں آ گئے۔ ان مَلٹی نیشنلز نے دیکھتے ہی دیکھتے صارفین کی پسند ناپسند کا معیار بدل دیا اور کچھ ہی عرصہ میں ملکی سوڈا واٹر فیکٹریوں کو مارکیٹ سے نکال باہر کیا۔ محمد عبداللہ کی قائم کردہ سوڈا واٹر فیکٹری بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔

اُن دنوں گھروں سے خارج ہونے والے گندے پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ بعض لوگ گھر سے ذرا دُور ایک گول گڑھا کھود دیتے۔ گندہ پانی اس گڑھے میں جمع ہوتا رہتا۔ کچھ پانی ساتھ کے ساتھ زمین میں جذب ہو جاتا تو باقی آبی بخارات کی شکل میں ہوا میں تحلیل ہوتا رہتا۔ پھر ایک بدرَو بنائی گئی جو کوارٹروں کے سامنے سے گذرتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ پانی آگے کہاں جاتا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ سانپ کی طرح لہراتی ہوئی یہ بدرَو عجیب سی چیز تھی۔ یہاں سے اٹھنے والی مہک تو یوں ہی طبیعت صاف کرنے کے لیے کافی ہوتی لیکن صبح کے وقت جب صفائی کے نام پر اس کا سارا گند نکال کر کناروں پر رکھ دیا جاتا تو اس کی بدبو میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ کوارٹروں کے مکین تو اس تعفن کے بہت حد تک عادی ہو چکے تھے لیکن وہاں سے کبھی کبھار گذرنے والوں کو تو گویا چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا اور وہ توبہ استغفار کرتے ہوئے وہاں سے راہِ فرار میں اپنی نجات سمجھتے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کوارٹروں میں غسل خانہ اور بیت الخلا صحن کے ایک کونے میں ہوتا تھا۔ غسل خانہ غسل کے لیے مختص تھا جب کہ بیت الخلا میں حوائجِ ضروریہ سے فراغت کا انتظام تھا۔ شروع میں ہر بیت الخلا میں دو کھڈیاں ہوتی تھیں۔ یہ کھڈیاں بالعموم اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں لیکن انجمن کوارٹرز میں یہ کھڈیاں لکڑی سے بنائی گئی تھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ زمین سے کوئی ڈیڑھ فٹ بلندی پر لکڑی کا ایک فریم نصب کر دیا گیا تھا جس پر بیٹھ کر اجابت کی جاتی۔ نیچے فرش پختہ تھا لیکن بعض گھروں میں گندگی کا پھیلاؤ روکنے کے لیے مٹی کی پراتیں رکھنے کا رواج تھا۔ جب حلال خور یعنی جمعدار آتا تو وہ یہ پرات اپنے ٹوکرے میں خالی کرتا اور پھر اسے پانی سے دھو دیتا۔

زمانہ بدلا اور ربوہ میں بعض بیت الخلا ایسے بھی بننے لگے کہ حلال خور باہر کھڑے کھڑے فضلہ اٹھا سکتا تھا۔ اس نظام کے تحت بیرونی دیوار میں سطحِ زمین کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنا کر ان پر ٹین کا پردہ لٹکا دیا جاتا۔ حلال خور یہ پردہ ہٹاتا اور گھر میں داخل ہوئے بغیر کھرپے کی مدد سے فضلہ اٹھا کر ٹوکری میں ڈال کر اپنی راہ لیتا۔

ہمارے ہاں سال ہا سال ایک ہی حلال خور صفائی کے لیے آتی رہی۔ اس کا نام سرداراں تھا اور وہ موجودہ دارالضیافت کے نزدیک تقریباً اُس جگہ رہائش پذیر تھی جہاں آج کل ایک پوری مسیحی بستی آباد ہو چکی ہے۔ اُس کے خاوند کا نام باوا مسیح تھا۔ اگر کبھی سرداراں نہ آ سکتی تو باوا صفائی کر جاتا۔ بہت مدت تک اس کا معاوضہ صرف سوا روپیہ ماہوار رہا۔ ہاں جمعہ کے جمعہ دوپہر کے وقت سرداراں ہر گھر کا چکر لگاتی اور دو دو روٹیاں وصول کرتی۔ اگر کسی وجہ سے روٹی تیار نہ ہوتی تو وہ آٹے کی ایک یا دو مٹھیوں پر قناعت کر لیتی۔

کئی سال کے بعد ٹوائلٹس کو ایک نئی شکل دی گئی اور زمین میں بور کرنے کا رواج شروع ہوا۔ اس نظام کی افادیت اور نقصانات سے قطع نظر یہ طریق کار زیادہ عرصہ نہ چلا۔ پھر زمین میں گڑھا کھود کر اوپر سیمنٹ کا سوراخ دار سلیب رکھنے کا رواج بھی ہوا۔ بتایا جاتا تھا کہ اس سسٹم کے تحت گڑھے میں جمع شدہ فضلے میں ایک کیڑا پیدا ہو کر

اسے ساتھ کے ساتھ ختم کرتا رہتا ہے۔ بالآخر ربوہ میں سیپٹک ٹینک بنانے کا رواج شروع ہوا اور سیوریج لائن بچھائے بغیر بعض گھروں میں فلش سسٹم متعارف ہوا۔ اب تو شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں یہ سسٹم رائج نہ ہو۔

اس تمام تر ''ترقی'' کے باوجود ربوہ میں نالیوں کے گندے پانی یا کچرے کی ڈسپوزل کا مناسب انتظام نہ تھا۔ حلال خور نظر بچا کر کوڑا کرکٹ کسی قریبی جگہ پر ڈھیر کرتے جاتے اور کچھ عرصے کے بعد اسے آگ لگا دیتے۔ یوں مضرِ صحت گیسیں خارج ہو کر ربوہ کے ماحول کو مکدّر کرتیں۔ سیوریج سسٹم کی عدم موجودگی میں نالیوں کا پانی خشک ہونے کے لئے گلیوں میں چھوڑ دیا جاتا۔ اس کا تعفّن اپنی جگہ مضرِ صحت اثرات پیدا کرتا۔ ان حالات میں مکھی اور مچھر کا بکثرت پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا جو ملیریا، ٹائیفائیڈ اور پیچش جیسی بیماریوں کا باعث بنتا۔

صورتِ حال کے تدارک کے لئے جماعت کی ذیلی تنظیموں کے تحت بار بار ''یومِ صفائی'' منایا جاتا تھا اور برسات میں جب متعدّی امراض پھوٹنے کا اندیشہ ہوتا ''ہفتہ صفائی'' منایا جاتا۔ اس ہفتے کے دوران اہلِ ربوہ اپنے گھروں کو غلاظت سے پاک رکھنے کا ازسرِ نو عزم کرتے۔ انہیں سمجھایا جاتا تھا کہ وہ پھل اور سبزیوں کے چھلکوں اور گھر کے باقی کچرے کے لئے ایک ٹین مختص کریں اور اس کی روزانہ صفائی کی عادت ڈالیں۔ ان سے درخواست کی جاتی کہ وہ بیت الخلا کے پاس ایک برتن میں مٹی یا راکھ رکھنا اپنا معمول بنائیں اور اسے بیت الخلا کی غلاظت کو ڈھانپنے کے لئے استعمال کیا کریں۔ انہیں تلقین کی جاتی کہ بیت الخلا کو دن میں کم از کم ایک بار اور گھر کا فرش ہفتے میں کم از کم دو بار فنائل سے دھویا جائے۔ اس ہفتے کے دوران اہلِ شہر کو یہ احساس دلایا جاتا کہ ماحول کی صفائی ان کے لئے کس درجہ ضروری ہے چنانچہ انہیں اس امر کو یقینی بنانے کی بار بار درخواست کی جاتی کہ نہ تو وہ خود مکان کے قرب و جوار میں کوڑا کرکٹ پھینکیں گے نہ کسی اور کو ایسی حرکت کی اجازت دیں گے اور اگر کوئی اس ہدایت کی خلاف ورزی کرتا ہوا پایا جائے تو اس کی ٹاؤن کمیٹی میں رپورٹ کریں گے۔

ہفتہ صفائی کے دوران کم از کم ایک بار وقارِ عمل کے ذریعہ راستوں کی صفائی کی جاتی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں اور نالیوں پر چونا چھڑکا جاتا۔

اُن دنوں مکھی کے خاتمہ کے لئے ایک دوا استعمال کی جاتی تھی جس کا نام غالباً ٹُوگن یا ٹوجن تھا۔ اس دوا کو پانچ سو گنا پانی میں حل کرنے کے بعد گڑ ملایا جاتا تو مکھی مار دوا تیار ہو جاتی۔ اس کا طریقِ استعمال ذرا مختلف تھا۔ گھر کے کسی کونے کھدرے میں پڑا ہوا بوری کا کوئی پھٹا پرانا ٹکڑا اس محلول میں بھگونے کے بعد باورچی خانے یا بیت الخلا کے قریب زمین پر پھیلا دیا جاتا۔ ٹاٹ کا یہ ٹکڑا مکھیوں کے لئے پیغامِ اجل بن جاتا۔ مکھیاں اس پر بیٹھنے کے بعد اُٹھ نہ سکتیں۔ یہ ٹاٹ تین چار دن تک کارآمد رہتا جس کے بعد اسے نئے سرے سے مذکورہ بالا محلول میں بھگونا پڑتا تھا۔ یوں تو یہ دوا ٹاؤن کمیٹی سے بھی مل جاتی تھی لیکن جماعت کی ذیلی تنظیموں کی طرف سے بھی بلا قیمت مہیا کی جاتی اور مفید نتائج پیدا کرتی تھی۔

میرا خیال ہے یہاں پر ملیریا اریڈیکیشن ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ربوہ میں مچھروں کے خاتمہ کے لئے کی جانے والی کوششوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مقررہ مدت کے بعد اس محکمے کے کارندے کاندھوں پر بڑے

سنڈ اُٹھائے پہنچ جاتے۔ وہ پورے گھر (اور بالخصوص کونوں کھدروں) میں ڈی ڈی ٹی کا سپرے کرتے۔ بعض دفعہ تو اس سپرے کی بُو کئی کئی دن تک قائم رہتی اور بعض دفعہ پتا بھی نہ چلتا کہ سپرے کیا گیا ہے۔ مجھے یاد ہے ہم لوگ سپرے کی بُو سے اس کے خالص یا نا خالص ہونے کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔

اور اب کچھ ذکر ہفتہ شجر کاری کا!

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ربوہ ایک بنجر قطعہ اراضی پر تعمیر ہوا تھا تاہم خدا تعالیٰ نے یہاں آباد ہونے والوں کو نہ صرف معجزانہ طور پر وافر شیریں پانی سے نوازا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے طرح طرح کے خوش نما پودے اور رنگ برنگے پھول یہاں بہارِ جانفزا دکھلانے لگے تاہم جدید نسل کیا جانے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے پرانے لوگوں کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔

بدقسمتی سے ربوہ میں شجر کاری کے لیے کی جانے والی شعوری کوششوں کے خاطر خواہ نتائج پیدا نہ ہو سکے جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ درخت لگانے کے بعد ان کی مناسب دیکھ بھال نہ ہو سکتی تھی۔ نتیجتاً بعض درخت پنپنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتے اور بعض دفعہ بھیڑ بکریاں انہیں ٹنڈ منڈ کر دیتیں۔ ہفتہ شجر کاری کے دوران محکمہ جنگلات کی طرف سے فراہم کردہ پودے اور قلمیں ربوہ میں مفت تقسیم کی جاتیں اور توقع کی جاتی کہ ہر شہری اس ہفتے کے دوران اپنے گھر کے اندر یا باہر کم از کم ایک پودا ضرور لگائے گا اور صدقِ دل سے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کرے گا۔

غالباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے شجر کاری کی ایک ایسی ہی مہم کے دوران شاہدرہ کے ایک احمدی، ماسٹر غلام محمد نے ربوہ کے لاری اڈہ پر برگد کا ایک درخت لگایا اور وہ ایک لمبا عرصہ شاہدرہ سے ربوہ آکر اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے کتنا عرصہ اپنا یہ معمول جاری رکھا لیکن اس کا ایک قابلِ تقلید مثال کے طور پر الفضل میں ذکر ہوتا رہا تاہم افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی یہ محنت نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی اور یہ درخت اب یہاں موجود نہیں۔ غالباً لاری اڈے کی منتقلی کے بعد یہ درخت نظر انداز ہو کر خشک ہو گیا۔

میں ایسی ہر مہم کے دوران اپنے گھر میں کم از کم ایک پودا لگانے کی کوشش کرتا لیکن سوائے ایک بکائن کے اور کوئی پودا چل نہ سکا۔ جب یہ بکائن چل پڑی تو بدقسمتی سے صحن کی دیوار اس پر آ گری جس سے یہ پودا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے صحن میں ایک کیکر لگایا جو ہمارے کوارٹر چھوڑتے وقت تک اتنا اُونچا ہو گیا تھا کہ اس کے سائے میں کرسی رکھ کر بیٹھا جا سکے۔

ربوہ کے گھروں اور گلیوں محلّوں میں شجر کاری کی مہمات کا تو ذکر ہی کیا، الفضل ۱۱ مارچ ۱۹۶۲ء کی ایک خبر کے مطابق پہاڑیوں پر درخت اگانے کا منصوبہ بھی بنایا گیا اور ''پرانے لنگر خانہ کے نزدیک والی پہاڑی'' پر ایک پودا نصب کر کے اس مہم کا آغاز کیا گیا۔ اس موقع پر لاہور سرگودھا روڈ کے اطراف میں درختوں کی دو دو قطاریں نصب کی گئیں لیکن عملاً یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

آغاز ربوہ میں گنتی کے چند گھروں کو چھوڑتے ہوئے جہاں کھانا پکانے کے لئے شاید مٹی کے تیل کے سٹوو بھی

استعمال ہوتے ہوں گے عام طور پر لکڑی جلائی جاتی جس کے حصول کا واحد ذریعہ وہ ٹال تھے جو ربوہ میں ایک سے زیادہ جگہ کھل گئے تھے۔ اس کے باوجود لکڑی کی عام طور پر قلت رہتی تھی۔ ہر ٹال پر ایک بڑی ترازو جسے ''تکڑ'' کہتے تھے لگی ہوتی تھی۔ یہی تکڑ لکڑی تولنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اگرچہ ٹال والا ہمیشہ یقین دلاتا کہ وہ بالکل خشک لکڑی فراہم کر رہا ہے لیکن اس کا بیان شاذ ہی درست ثابت ہوتا اور گھر پہنچتے ہی انکشاف ہوتا کہ ٹال والا اس بار پھر خریدار کے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے اور یہ کہ جب تک یہ لکڑی ختم نہ ہوگی خاتونِ خانہ اک عذابِ مسلسل میں سے گذرتی رہے گی۔

گھروں میں لکڑی کسی ایسی جگہ سٹور کی جاتی جہاں یہ بارش سے محفوظ رہے۔ گیلی لکڑی دن کے وقت باہر نکال کر صحن میں رکھ دی جاتی تا کہ ہوا اور دھوپ سے اس کی نمی جاتی رہے۔ شام ہوتے ہی اسے پھر اندر رکھ دیا جاتا تا کہ ''تریل'' یعنی اوس اسے نئے سرے سے گیلا نہ کر دے۔

واقفانِ حال جانتے ہیں کہ گیلی لکڑی بہت مشکل سے آگ پکڑتی ہے اور بفرضِ محال آگ پکڑ بھی لے تو اس کے جل کر راکھ ہونے تک دھواں ختم نہیں ہوتا۔ یہ دھواں آنکھوں میں چبھتا اور گلے میں خراش پیدا کرتا ہے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے مصداق امی نے اس کا ایک حل ڈھونڈ لیا تھا چنانچہ گھر میں کوئلہ اور مٹی کا تیل رکھا جاتا اور باریک ٹہنیوں والی وہ لکڑی بھی جسے ربوہ میں پلچھی کہا جاتا تھا۔ سنتے تھے کہ پلچھی دریائے چناب کے بیلے میں اگتی ہے۔ میں اب بھی چشمِ تصور سے اونٹوں کی وہ لمبی لمبی قطاریں دیکھ سکتا ہوں جو ہر صبح ربوہ کے گلی محلوں میں سے گذرتی تھیں۔ پٹھانوں نے ان اونٹوں پر پلچھی لاد رکھی ہوتی تھی اور وہ اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ''بالن لے لو بالن!'' کی صدا لگا کر خواتین خانہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے تھے۔

بعض اوقات پلچھی بھی گیلی ہوتی لیکن چند دن دھوپ میں پڑے رہنے کے بعد بالکل خشک ہو جاتی۔ ویسے بھی یہ لکڑی اپنی مخصوص ساخت کی وجہ سے گیلا ہونے کے باوجود ٹال والی لکڑی کی نسبت قدرے آسانی سے آگ پکڑ لیتی۔

اب تو یہ سب باتیں خواب و خیال لگتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ربوہ میں خواتینِ خانہ کا بہت سا وقت اس فکر کی نذر ہو جاتا تھا کہ وہ گیلی لکڑی کے ساتھ چولہا کیسے جلائیں۔ اسی ضرورت کے تحت فارغ اوقات میں پلچھی کی درجہ بندی کی جاتی یعنی قدرے موٹی اور باریک ٹہنیاں الگ الگ کی جاتیں اور بُورا الگ۔ یہاں بُورے سے مراد پلچھی کی انتہائی نرم و نازک ٹہنیاں ہیں جن کا ڈھیر الگ لگایا جاتا اور آگ سلگانے کے لیے استعمال ہوتا۔

ان دنوں باورچی خانے میں لکڑی کے علاوہ اُپلے بھی استعمال ہوتے تھے جنہیں عمومی طور پر ''تھاپیاں'' کہا جاتا۔ یہ لفظ ''پاتھیاں'' کی بگڑی ہوئی شکل تھا اور بے تکلفانہ استعمال کیا جاتا۔ تھاپیاں گائے بھینس کے گوبر میں گھاس پھونس ملا کر تیار کی جاتی تھیں۔ انہیں خشک ہونے کے لیے زمین پر پڑا رہنے دیا جاتا یا کسی دیوار پر لگا دیا جاتا۔ دھوپ اور ہوا آہستہ آہستہ انہیں خشک کر کے استعمال کے قابل بنا دیتی۔ ربوہ میں گائے بھینس والے لوگ زیادہ بڑی تعداد میں موجود نہ تھے لہٰذا ان تھاپیوں کا معتد بہ حصہ اردگرد کے دیہات سے آتا تھا۔

بعض گھروں میں لکڑی کا کوئلہ جو ٹالوں یا کچھ پرچون فروشوں سے مل جاتا تھا بھی کھانا پکانے کے

استعمال ہوتا تھا تاہم لکڑی اور اُپلوں سے مہنگا ہونے کے سبب اس کا استعمال بہت محدود تھا۔

اس دور میں پھونکنی ہر گھر کی ضرورت تھی۔ یہ لوہے کا تقریباً ڈیڑھ انچ قطر کم وبیش ڈیڑھ فٹ لمبا پائپ ہوتا تھا۔ اس کا ایک سرا چولہے میں اُس جگہ جہاں آگ بھڑکانا مقصود ہوتا اور دوسرا سرا اپنے منہ کے پاس رکھا جاتا۔ منہ سے پائپ میں زور سے پھونک ماری جاتی۔ بالعموم چند پھونکوں سے آگ بھڑک اُٹھتی۔ بسا اوقات خاتونِ خانہ پھونکیں مار مار کر تھک جاتی تو یہ کام اپنے بچوں کے سپرد کر کے خود زیادہ ضروری امور نمٹانے لگتی۔ یہ پھونک اگر بے احتیاطی سے ماری جاتی (یعنی پھونک مارتے ہوئے اچانک سانس ٹوٹ جاتا) تو لکڑی کا سارا دھواں پائپ کے راستے منہ میں واپس آ جاتا جس سے پھونک مارنے والے کے گلے میں خراش پیدا ہو کر شدید کھانسی شروع ہو جاتی۔ الغرض پھونکنی کا استعمال بھی ایک آرٹ تھا جس پر دسترس کے بغیر لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔

یوں تو رفتہ رفتہ بازار سے بنے بنائے چولہے بھی ملنے لگے تھے لیکن ربوہ کی اکثر عورتیں اپنے محدود وسائل کے پیشِ نظر چولہے گھر میں خود بناتیں۔ یہ چولہے مٹی سے بنتے تھے۔ باورچی خانہ میں تو چولہا ہوتا ہی تھا، قریباً ہر گھر میں ایک چولہا صحن میں بھی ہوا کرتا تھا تاکہ گرمی کے موسم میں قدرے کھلی فضا میں کوکنگ کی جا سکے۔ اُس وقت تک ربوہ کے عام گھروں میں کھانے کی میز کا کوئی تصور نہ تھا۔ چولہے کے پاس ایک دو پیڑھیاں رکھ دی جاتیں اور اہلِ خانہ باری باری ان ہی پیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ہاں! سربراہِ خاندان کو بعض اوقات کھانا اس کی چارپائی پر ہی فراہم کر دیا جاتا۔

کوئلے کا ذکر آیا ہے تو بتاتا چلوں کہ چولہے کے علاوہ اس کا ایک استعمال استری میں بھی تھا۔ لوہے کی استری میں کوئلہ بھر دیا جاتا۔ اس پر کپڑے کی بیکار کترنیں یا ردی کاغذ رکھ کر مٹی کا تیل چھڑک دیا جاتا۔ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی سے کترنیں فوراً آگ پکڑ لیتیں۔ ان کے خاکستر ہونے تک کوئلہ بھی آگ پکڑ چکا ہوتا۔ پھر پھونکنی یا دستی پنکھے سے کوئلے کو ہوا دی جاتی تو وہ پوری طرح آگ پکڑ لیتا۔

یہی کوئلہ انگیٹھیوں میں بھی استعمال ہوتا۔ ان دنوں بجلی یا سوئی گیس کے ہیٹروں کا کوئی تصور نہ تھا اور گرم کپڑے بھی واجبی سے ہی ہوتے لہٰذا موسمِ سرما میں کمروں کو گرم رکھنے کے لئے کوئلے کی انگیٹھی جلا کر رکھ دی جاتی۔ یہ کوئلہ لکڑی کا ہوتا لہٰذا اس میں سے ضرر رساں گیس کے اخراج اور اس کے مہلک اثرات کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں۔

زمانہ بدلا تو ربوہ میں وہ انگیٹھیاں رائج ہوئیں جن میں لکڑی کا بُرادہ جسے عرفِ عام میں بورا کہا جاتا جلایا جاتا تھا۔ بورا آرا مشینوں سے بوریوں کے حساب سے خریدا جا سکتا تھا۔ میں اپنے گھر کی ضرورت کی مطابق یہ بُورا خود فیکٹری ایریا کی ایک آرا مشین سے لایا کرتا تھا۔ یہ بُورا انگیٹھی کے اندر اچھی طرح ٹھونس کر بھرا جاتا اور پھر اسے آگ دکھائی جاتی۔ اس انگیٹھی کی خوبی یہ تھی کہ بُورا بہت آہستہ آہستہ جلتا لیکن اس کی آگ خاصی تیز ہوتی۔ مجھے یاد ہے امی بہت بار اس ایجاد پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں کہ ”یہ انگیٹھی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ گیلی لکڑی کے دھوئیں سے تو مت ہی ماری جاتی تھی۔“

تقریباً اسی دور میں مارکیٹ میں مٹی کے تیل سے جلنے والا چولہا متعارف ہوا۔ اس میں بیک وقت دس بارہ

بتیاں جلتی تھیں۔ یوں تو اس چولہے نے خواتین خانہ کے لیے بہت سہولت پیدا کر دی تھی لیکن یہ ایک قدرے خطرناک ایجاد تھی۔ اُن دنوں بیرونِ ربوہ سے آئے دن یہ چولہا پھٹنے سے اموات کی خبریں آتی رہتی تھیں لہٰذا یہ چولہا جلاتے وقت اہلِ خانہ کو ایک انجانا سا خوف دامن گیر رہتا۔ جہاں تک میرا علم ہے ربوہ میں ایسا کوئی واقعہ تو نہیں ہوا لیکن اس چولہے میں سے دھماکے کی آوازیں معمول کی بات تھی۔ بسا اوقات یہ آواز اتنی بلند ہوتی کہ ایک بار تو پاس بیٹھے ہوؤں کا دل دہل جاتا چنانچہ فوری طور پر چولہے کی ٹینکی کا پیچ دار ڈھکنا کھول دیا جاتا جس کے بعد مزید ''دھماکے'' رک جاتے۔

اب ذکر مٹی کے تیل ہی سے جلنے والے ایک اور چولہے کا جس کی ساخت بتیوں والے چولہے سے قدرے مختلف تھی۔ یاد رہے کہ بتیوں والے چولہے میں بتیاں جلتی تھیں اور تیل کی ٹنکی برنر کے نیچے ہوتی تھی جب کہ اس چولہے میں تیل کی ٹنکی برنر کے پہلو میں ہوتی اور تیل براہِ راست جل کر حرارت پیدا کرتا۔ ٹنکی کو تیل سے بھر کر اُلٹا رکھ دیا جاتا جس کے بعد یہ حسبِ ضرورت برنر تک پہنچتا رہتا۔ الفضل میں رشید اینڈ برادرز، ٹرنک بازار، سیالکوٹ کے تیار کردہ چولہوں کا اشتہار بکثرت آتا رہتا تھا جس کے مطابق یہ چولہے ''اپنی خوبصورت شکل وشباہت، مضبوطی، تیل کی بچت اور افراطِ حرارت کے لیے دنیا میں بے مثال'' تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ ربوہ اس قسم کے چولہا خریدنے سے پہلے اطمینان کر لیتے تھے کہ یہ رشید برادرز ہی کا بنا ہوا ہو۔

اسی زمانے میں ربوہ والوں نے طیور کی زبانی یہ اڑتی سی خبر سنی کہ ان کے شہر کے لئے سوئی گیس کی فراہمی کا فیصلہ ہو گیا ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں جلد ہی کارروائی شروع ہو جائے گی۔ یہ خبر درست ثابت ہوئی کیوں کہ سوئی گیس کی مین لائن بچھانے کے لئے لاہور۔ سرگودہا روڈ کے متوازی کُھدائی شروع ہو گئی۔ پھر سٹیل کے موٹے موٹے پائپ آنا شروع ہوئے اور ساتھ ہی وہ مشینری بھی جس کی مدد سے یہ پائپ آپس میں جوڑنے کے بعد زمین کے اندر دبائے جانے تھے۔ میں کبھی کبھی کام کی رفتار کا ''جائزہ'' لینے ادھر جاتا تو ربوہ کے اور بھی بہت سے لوگ یہ تماشہ دیکھنے کے لئے وہاں پہنچے ہوتے۔ بالآخر یہ کام مکمل ہوا لیکن گھروں کے اندر پائپ بچھوانا مالک کی اپنی ذمہ داری قرار پایا۔ انجمن اور تحریک کے کوارٹرز کی حد تک یہ ذمہ داری ان دونوں اداروں نے قبول کر لی اور یہ کام اوائل ۱۹۶۸ء میں مکمل ہو گیا۔ شروع میں ہر کوارٹر کو ایک چولہا فراہم کیا گیا اگر چہ بعض لوگوں نے دفتری طور پر فراہم کردہ چولہا ہٹا کر اسی کنیکشن کے ساتھ دو چولہوں والا سیٹ نصب کرا لیا تھا۔

انجمن کے ہر دو کوارٹروں کے لیے مشترکہ میٹر لگایا گیا تھا۔ بل آتا تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا۔ زمانہ سستا تھا۔ کم از کم بل غالباً چار روپے ہوا کرتا تھا لیکن سوئی گیس کی محدود کھپت کی وجہ سے بل اس رقم سے شاذ ہی بڑھتا۔ یہ گیس ہمارے لیے قدرت کا بہت بڑا انعام ثابت ہوئی۔ ربوہ کے باقی محلوں میں سوئی گیس بہت بعد میں پہنچی اور اس کے لیے اہلِ محلّہ کو خاصی تگ و دو کرنا پڑی تاہم اب اس شہر کا غالباً کوئی محلّہ ایسا نہیں رہا جہاں سوئی گیس نہ پہنچی ہو۔ قصہ مختصر اہلِ ربوہ کو جوں جوں گیس ملتی گئی لکڑی، کوئلہ اور بُورے اور تیل والی انگیٹھیاں قصہ ماضی بنتی چلی گئیں تاہم مجموعی طور پر یہ غربت اور سادگی کا دور تھا۔

کیا آپ اِس کی تفصیل میں جانا پسند کریں گے؟

کبھی بہار کو ترسے، کبھی خزاں سے ڈرے یہ پھول کھلنے سے پہلے ہزار موت مرے

اُس دور میں عام آدمی ہر قابلِ ذکر آسائش سے محروم تھا اور اس کی زندگی حسرت و یاس سے عبارت تھی اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے کبھی مایوس نہ ہوا تھا۔ گھروں میں سادگی تھی۔ کسی اور بات کا تو خیر ذکر ہی کیا مرد و زن لانڈری سوپ سے نہانے میں بھی انقباض محسوس نہ کرتے اگرچہ سن لائٹ اور لائف بوائے سوپ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ کبھی کبھار گھروں میں لکس یا رکسونا بھی آ جاتا۔ رہا شیمپو، تو میرا خیال ہے ربوہ میں بہت ہی کم لوگ اس نام سے واقف ہوں گے۔

ٹوتھ پیسٹ ان کے لیے شجرِ ممنوعہ تھی۔ مرد حضرات صبح کے وقت سیر کے لیے ربوہ سے باہر نکل جاتے۔ وہ اپنی جیب میں ایک تیز دھار چاقو رکھتے اور موقع ملتے ہی کیکر کے کسی درخت سے ٹہنی کاٹ کر مسواک بنا لیتے۔ سیر کے دوران وہ یہ مسواک کرتے جاتے۔ بعض گھروں میں پسا ہوا کوئلہ یا نمک اور سرسوں کے تیل کا آمیزہ بھی دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بعض لوگ یہی مقصد منجن کے استعمال سے حاصل کرتے تھے جو بازار میں مختلف ناموں سے ملتے تھے اور الفضل میں ان کے اشتہارات آتے رہتے تھے چنانچہ ڈاکٹر شریف احمد کا ''موتی منجن'' اس حوالے سے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اس منجن کے ''موجد'' کا دعویٰ تھا کہ ''یہ حیرت انگیز منجن ہے۔ قیمتی اور اعلیٰ اجزا شامل کیے گئے ہیں جو پائیوریا جیسی نامراد مرض کو جڑ سے اکھاڑ دیتے ہیں۔ یہ منجن مسوڑھوں کو طاقت دیتا ہے اور ان میں پیپ پڑنے سے محفوظ رکھتا ہے، ہلتے دانتوں کو جما دیتا ہے، دانتوں کا میلا پن دُور کر کے ان کو صاف، شفاف اور خوشبودار بنا دیتا ہے۔ دانتوں کی ہر مرض کے لیے مفید ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے، یہ منجن اپنی تعریف خود کرتا ہے۔''

ناصر دواخانہ نے ''اکسیر پائیوریا'' کے نام سے ایک ملتی جلتی دوا تیار کر رکھی تھی جو اس کے بنانے والوں کے دعویٰ کے مطابق مسوڑھوں سے خون اور پیپ آنے، دانتوں کے ہلنے اور دانتوں کی میل اور بدبو دُور کرنے کے لیے بے حد مفید تھی۔

بعد کے سالوں میں جب ریڈیو پاکستان کی کمرشل سروس اور پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات شروع ہوگئیں تو ڈنٹونک ٹوتھ پاؤڈر کی بھی خوب دھوم رہی لیکن یہ مصنوعات دانتوں کی امراض کے لیے کس قدر مؤثر تھیں اور ہیں اس سوال کا جواب تو کوئی پیر فرتوت ہی دے سکتا ہے۔

دانتوں کے امراض کا ذکر ہو ہی رہا ہے تو لگے ہاتھوں ککروں کی بھی بات ہو جائے جو اس زمانے میں بہت عام تھے۔ جدید نسل تو شاید ککروں کے نام سے بھی واقف نہ ہو لیکن وہ جو اس بیماری میں مبتلا رہے ہیں بخوبی

سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بیماری مریض کو کس طرح بے حال کر دیتی تھی۔ مرض کی شدت کم کرنے کے لیے آنکھیں بورک ایسڈ سے دھوئی جاتیں اور یہ ایک ایسا عمل تھا جسے مکمل کرنے کے لیے مریض کو ایک مددگار کی ضرورت پڑتی تھی۔ بورک ایسڈ نیم گرم پانی کے ایک کٹورے میں حل کر لیا جاتا اور روئی کے چھوٹے چھوٹے گالے اس میں چھوڑ دیئے جاتے۔ ان گالوں کو آہستہ آہستہ آنکھوں میں نچوڑا جاتا تو عجیب سی فرحت کا احساس ہوتا اور جی چاہتا کہ یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہو چلا جائے لیکن آخر کب تک۔ عبدالحفیظ ڈسپنسر اس مرض کے لیے پوٹے پلٹ کر کاربالک ایسڈ کا محلول ٹچ کیا کرتے تھے۔

ان دنوں آشوبِ چشم بھی عام تھا لیکن جب یہ وبا کی صورت میں پھیلتا تو لوگ ایک دوسرے سے منہ چھپاتے پھرتے حتّٰی کہ مریض کے اپنے گھر والے بھی اس سے کنی کترانے لگتے۔ اس مرض میں آنکھیں حد سے زیادہ سُرخ ہو جاتیں، سوج جاتیں اور چیپڑ (جسے اہلِ پنجاب گِد کہتے ہیں) سے بھر جاتیں۔ آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد تو کھلنے کا نام نہ لیتیں۔ ایسی آنکھوں کو کھولنے کے لیے کیا کیا جتن کرنا پڑتے تھے، اس مختصر سے مضمون میں ان تفصیلات کی گنجائش کہاں!

دو دو تین تین بلیڈوں والی ڈسپوزیبل سیفٹیاں تو حالیہ دور کی پیداوار ہیں۔ جب میں نے شیو بنانا شروع کی تو چین کی بنی ہوئی ایک سیفٹی خریدی جو گتے کی ایک ڈبیہ میں بند تھی اور صرف بارہ آنے میں مل گئی تھی۔ اس ڈبیہ کے ڈھکنے کے اندر شیشہ لگا ہوا تھا جسے بوقتِ ضرورت سامنے رکھ کر شیو بنائی جا سکتی تھی۔

امپورٹڈ بلیڈوں کی فراوانی نہ ہوئی تھی لہٰذا لوگ شیو کے لیے بالعموم ٹریٹ بلیڈ استعمال کرتے جس کا دس بلیڈوں کا پیکٹ آٹھ آنے میں مل جاتا تھا۔ سیاہ رنگ کے اِن بلیڈوں کی دھار پہلے ہی شیو سے کند ہو جاتی اور جلد کو لہولہان کر دیتی۔ بعد میں ان بلیڈوں کی ایک بہتر شکل بھی مارکیٹ میں آ گئی۔ یہ بلیڈ جو پلاٹینم ٹریٹ کہلاتا تھا قدرے مہنگا تو ضرور تھا لیکن شیو مقابلتاً آرام دہ بناتا۔ آہستہ آہستہ ملک میں جب سمگل شدہ اشیاء کی فراوانی ہونے لگی تو یہاں سیون او کلاک، وِلکنسن اور دیگر کئی غیر ملکی برانڈز کے بلیڈ دستیاب ہونے لگے جن کا معیار مقامی بلیڈ سے بہت بہتر تھا۔

شیونگ کریم، شیونگ سِٹک یا شیونگ فوم کا تو اس وقت تک کوئی تصور ہی نہ تھا۔ عام لوگ ہما سوپ سے شیو بناتے تھے جس کی ایک ٹکیہ چار آنے میں مل جاتی تھی۔ اس گول ٹکیہ کو پلاسٹک یا چینی کی کٹوری میں رکھ دیا جاتا۔ شیونگ برش کو گیلا کر کے اس پر رگڑا جاتا تو جھاگ بن جاتی جسے چہرے پر لگا لیا جاتا۔ اسی وجہ سے اس صابن کو ''کپ سوپ'' بھی کہا جاتا تھا اور حجام عام طور پر یہی صابن استعمال کرتے تھے۔

زمانہ بدلا اور بازار میں شیونگ سٹک متعارف ہوئی۔ شیونگ کریم اس کے بھی بعد آئی۔ اس حوالے سے یہ بات شاید قابلِ ذکر ہو کہ میں ۱۹۶۵ء میں بی اے کرنے کے بعد جب لاہور منتقل ہوا تو میں نے ہوسٹل میں مقیم اپنے بعض ساتھی طلبہ کی دیکھا دیکھی پہلی بار کولبری شیونگ کریم استعمال کی جو میرے لیے ایک اچھنبے سے کم نہ تھی۔ اب تو بال رنگنے کے لیے ایک سے ایک بڑھیا ڈائی بازار میں دستیاب ہے اور اس کا استعمال بھی بہت

سہل ہے لیکن اُس زمانے میں بال رنگنا ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ چونکہ میں نے ابا جی کو جمعہ کے جمعہ اپنے بال رنگتے ہوئے دیکھا ہے لہٰذا میں اس عمل کی پیچیدگیوں سے بھی کسی حد تک واقف ہوں۔

مجھے یاد ہے اُن دنوں ایک بنا بنایا خضاب (جو ''بی مارکہ خضاب'' کہلاتا) بازار میں ملتا تھا۔ یہ خضاب اچھرہ کا کوئی ادارہ تیار کرتا تھا اور زرد رنگ کی ایک ڈبیہ میں پیک ہوتا تھا۔ یہ خضاب ناقص شیشے کی ایک ادنیٰ سی بوتل میں پاؤڈر کی شکل میں ہوتا اور اس کے ہمراہ ٹین کے دستے والا ایک تھرڈ کلاس سا برش بھی ہوتا۔ خضاب کی یہ ڈبیہ آٹھ یا دس آنے میں مل جاتی تھی لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ خضاب بالوں کو غیر قدرتی حد تک سیاہ کر دیتا اور بعد میں جلد پر اپنا نشان بھی چھوڑ جاتا تھا لہٰذا ابا جی وسمہ استعمال کرتے جس میں مازو ملائے جاتے تھے۔

یاد رہے کہ مازو سے مراد سرو کے بیج ہیں جنہیں سرسوں کے تیل میں کڑکڑایا جاتا اور جب وہ اچھی طرح جل جاتے تو انہیں پٹ سن کی بوری کی دو تہوں کے درمیان رکھ کر کسی پتھر سے مسل لیا جاتا۔ پسے ہوئے اس پاؤڈر اور وسمے میں غالباً کچھ اور چیزیں ملا کر ایک لیئی سی تیار کی جاتی۔ یہ لیئی کسی چپٹی کے ساتھ بالوں پر لگائی جاتی اور بعد میں بالوں کو اَرنڈ کے پتوں سے ڈھانپ کر کپڑے کی پٹیاں باندھ دی جاتیں۔ یہ کام خاصا مشکل تھا۔ اول تو اس لیئی کا ڈاڑھی پر ٹکنا آسان نہ تھا۔ اسے اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے فوری طور پر اس پر اَرنڈ کا پتا رکھنا پڑتا تاہم ایک وقت میں ایک سے زیادہ پتوں کو اپنی گرفت میں لینا اور بھی مشکل ہوتا لہٰذا اس مرحلے پر خضاب لگانے والے کو کسی مددگار کی ضرورت پیش آتی۔ ہمارے گھر میں عام طور پر یہ خدمت امی سرانجام دیتیں اور اگر وہ فارغ نہ ہوتیں تو میں یا آپی ابا جی کی مدد کو پہنچ جاتے۔ جب ساری پٹیاں بندھ چکتیں تو خضاب لگانے کا مرحلہ اختتام پذیر ہوتا۔ ابا جی کچھ دیر انتظار کرتے اور پھر پٹیاں کھول کر غسل کر لیتے۔ یہ رنگ تقریباً ایک ہفتہ قائم رہتا جس کے بعد پھر سے اسی کارروائی کا اعادہ کرنا پڑتا۔

اُس زمانے میں لباس کا معیار بھی بس ایسا ہی تھا۔ عام گھروں میں مردانہ اور زنانہ شلواریں لٹھے سے بنائی جاتیں۔ لٹھا دو قسم کا ہوتا تھا ایک ''کورا لٹھا'' اور دوسرا صرف ''لٹھا''۔ کورا لٹھا جسے آپ گرے کلاتھ کہہ سکتے ہیں قدرے سستا ہوتا تھا لیکن اس کی دھلائی اور استری بہت مشکل تھی۔ اس لٹھے سے تیار شدہ کپڑوں کو دھوبی سوڈے کے آمیزے میں ڈال کر ابالا جاتا اور پھر لکڑی کے ڈنڈے کے ساتھ اس کی ''اکڑ'' ختم کی جاتی۔ اس قسم کے کپڑوں کو دھلائی کے دوران دھوبیوں کی طرح فرش پر پٹخنے کا رواج عام تھا۔ قمیص بالعموم کسی اور کپڑے سے بنائی جاتی۔ ان کپڑوں میں سے پاپلین، لینن اور سنگوہ نامی تین کپڑوں کے نام اب تک یاد ہیں۔ چھینٹ زیادہ تر رضائیوں اور دھاری دار سوتی کپڑا تو شکوں کے لیے استعمال ہوتا۔ ساٹن اور لیڈی ہملٹن اعلیٰ معیار کے زنانہ لباس میں استعمال ہوتا۔

چنیوٹ کا ایک دھوبی جمعہ کے جمعہ انجمن کوارٹرز سے کپڑے اکٹھے کر کے لے جاتا اور ایک ہفتے کے بعد واپس کر جاتا۔ یہ دھوبی ایک گدھا گاڑی پر آتا تھا۔ وہ ہر کوارٹر کے سامنے اپنی گاڑی روکتا، استری شدہ کپڑے لوٹاتا اور دھونے والے کپڑے وصول کر کے آگے نکل جاتا۔ اس وقت ایک کپڑے کی دھلائی شاید دو آنے ہوا

کرتی تھی لیکن اکثر لوگوں کو یہ ریٹ بھی زیادہ محسوس ہوتا چنانچہ خاتون خانہ کی کوشش ہوتی کہ دھوبی کو کم سے کم کپڑے دھلنے کے لیے دیئے جائیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ اُن دنوں لانڈری سوپ کا کیا ریٹ ہوا کرتا تھا لیکن غالب گمان ہے کہ عام گھروں کا بجٹ اس کی خرید کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ بعض خواتین نے کہیں سے لانڈری سوپ کا فارمولا حاصل کر لیا۔ اب وہ چنیوٹ سے اس کے اجزائے ترکیبی خرید لاتیں اور جب صابن گاڑھے شیرے کی شکل میں ہوتا اسے مٹی کی پراتوں میں جما لیتیں۔ عام طور پر کپڑے دھوتے وقت صابن کپڑوں پر رگڑا جاتا ہے لیکن جب سے صابن گھروں میں بننا شروع ہوا، کپڑے صابن کی پرات پر رگڑے جانے لگے جس سے فوراً جھاگ بن جاتی اور کپڑے کی دھلائی قدرے آسان ہو جاتی۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں جنگ عظیم دوم کے دوران ناکارہ ہو جانے والے پیراشوٹ بہت بڑی تعداد میں لنڈے بازار میں بکنے آ گئے۔ یہ پیراشوٹ نائلون یا اس سے ملتے جلتے کسی میٹریل کے بنے ہوتے تھے اور اس کے ایک ایک ٹکڑے سے پورا پورا زنانہ سوٹ تیار ہو جاتا تھا۔ اسی طرح یورپ سے خواتین کے لمبے لمبے فراک بھی بکثرت امپورٹ ہو رہے تھے۔ یہ فراک بھی مناسب تراش خراش کے بعد گھروں میں استعمال ہونے لگے۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی کے ٹی یا پولیئسٹر ملے دوسرے کپڑے یہاں رائج نہ ہوئے تھے۔ میرے ذہن میں یہ بات آج بھی متحضر ہے کہ ۵۹۔۱۹۵۸ء میں ہمارے گھر میں یہ ذکر ہوا کہ چنیوٹ میں شیشہ نائلن کا دوپٹہ دیکھا گیا ہے۔ میں نے یہ اصطلاح پہلی بار سنی تھی۔ شیشہ نائلن سے مراد وہ کپڑا تھا جو دیکھنے میں پولیتھین شیٹ سے مشابہت رکھتا تھا اور زنانہ لباس کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے بعد زمانے کی برق رفتار ترقی شروع ہو گئی اور واش اینڈ ویئر کپڑے عام ہو گئے۔

ربوہ میں گرمی کی شدت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لیکن اس کے مقابلے کے لیے خس کی ٹٹیوں کی سہولت کسی خوش نصیب کو ہی حاصل ہو گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نامساعد مالی حالات کی وجہ سے لوگ گھروں میں خس کی ٹٹیاں تو کجا بیرونی دروازوں کھڑکیوں پر چکیں تک نہ لگوا سکتے تھے۔ دروازے بند کرتے تو حبس میں دم گھٹتا اور کھولتے تو بے پردگی ہوتی چنانچہ بستر کی چادریں اور بعض گھروں میں پٹ سن کی بوریوں سے تیار کیے گئے پردوں سے کام چلایا جاتا تھا۔

اُس وقت تک ہم نے تو خیر سے ایئر کنڈیشنر کا نام بھی نہیں سنا تھا اور عام گھروں میں ڈیزرٹ کولر کا بھی کوئی تصوّر نہ تھا۔ پھر سنا گیا کہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے اپنے گھر میں ڈیزرٹ کولر لگوایا ہے جس سے شدید گرمی میں بھی راحت محسوس ہوتی ہے۔ بعد میں اُن کے ہاں ایئر کنڈیشنر آنے کی خبر بھی ربوہ میں عام ہوئی لیکن بتایا جاتا تھا کہ میاں صاحب ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں جانے اور وہاں سے باہر نکلتے وقت حد درجہ احتیاط سے کام لیتے ہیں مبادا جسم سرد گرم ہو کر کسی بیماری کا باعث بنے۔ بتایا جاتا تھا کہ وہ کچھ دیر ڈیزرٹ کولر والے کمرے میں بیٹھنے کے بعد ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں جاتے ہیں اور واپسی پر بھی یہی ''رُوٹ'' اختیار کرتے ہیں۔

زمانے کے رواج کے مطابق اُن دنوں تقریباً ہر گھر میں ایک بڑا صحن ہوتا تھا جو رات کے وقت سونے کے لیے بھی استعمال ہوتا۔ عصر کے قریب خواتینِ خانہ صحن میں جھاڑو لگاتیں، پانی میسر ہوتا تو ہلکا سا چھڑکاؤ کردیتیں اور پھر چارپائیاں ڈال کران پر بستر بچھا دیئے جاتے۔ رات یوں بھی قدرے خنک ہو جاتی تھی لیکن اگر کسی کو پیڈسٹل فین نصیب ہوتا تو اُس کے وارے نیارے ہو جاتے اور رات آرام سے گذر جاتی۔

اس زمانے میں بستر کی بنی ہوئی چادریں عام نہ ہوئی تھیں لہٰذا چادروں اور تکیے کے غلاف گھروں میں تیار کئے جاتے۔ اس کام کے لیے لٹھا استعمال ہوتا۔ چادروں، میز پوشوں، انگیٹھی پوشوں اور تکیوں کے غلافوں پر ہاتھ سے تیار کی گئی کروشئے کی لیسیں لگانے کے علاوہ کڑھائی کا رواج عام تھا بلکہ یہ کڑھائی خاتونِ خانہ کے سگھڑاپے کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ تکیوں پر اشعار کاڑھے جاتے جن میں اس پر سر رکھ کر سونے والے کی صحت وعافیت اور کامیابی وکامرانی کی دعائیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

یا الٰہی! نرم تکیہ باعثِ راحت رہے
سونے والا سو رہا ہے جاگتی قسمت رہے

ابھی برائلر مرغ مارکیٹ میں متعارف نہ ہوا تھا اور پنجاب کے باقی علاقوں کی طرح ربوہ کے اکثر گھرانے بھی دو چار مرغیاں ضرور پالتے جن سے گھر کی انڈوں کی ضرورت پوری ہوتی رہتی۔ جب کوئی مرغی ''کُوک'' ہوتی تو گھر میں جمع کئے گئے یا ادھر ادھر سے اکٹھے کئے گئے انڈے اس کے نیچے رکھ دیئے جاتے۔ اکیس دن انتظار کیا جاتا جس کے بعد انڈوں میں سے چوزے نکل آتے۔ مرغی ان ننھے مُنے بچوں کو دن رات اپنے ساتھ رکھتی اور ہر خطرے سے بچاتی۔ مرغی اور اس کے بچے دن بھر گھر کے صحن میں یا باہر گلی میں دانہ دُنکا چگتے رہتے اور شام ہوتے ہی گھر واپس آجاتے جہاں انہیں ایک بڑے ٹوکرے کے نیچے بند کر دیا جاتا۔ اس ٹوکرے کے اوپر عام طور پر دو چار اینٹیں یا کوئی اور وزن رکھ دیا جاتا تا کہ مرغی بلی کے حملے سے محفوظ رہے۔

گھروں میں مرغ پکانے کا رواج عام طور پر نہ تھا۔ ہاں! جب کوئی بیمار پڑ جاتا اور یخنی یا مرغ کے شوربے کے بغیر اس کی صحت کی بحالی کے امکانات معدوم ہوتے یا کوئی خاص مہمان آ جاتا تو پالتو مرغیوں میں سے ایک ذبح کر لی جاتی۔

برائلر کے برعکس آزاد ماحول میں پلی ہوئی اس پھرتیلی مرغی کو قابو کرنا ایک باقاعدہ فن تھا جس کے لیے پورا گھر ایک ٹیم کے طور پر میدانِ عمل میں نکل آتا۔ بسا اوقات مرغی اُڑ کر دیوار پر جا بیٹھتی اور وہاں سے پڑوسیوں کے گھر میں کود جاتی۔ اس شور شرابے کی وجہ سے پورے محلہ کو مہمانوں کی آمد کی خبر ہو جاتی۔ بالآخر جب مرغی قابو آتی تو گھر کا سربراہ تکبیر پڑھ کر اس کے گلے پر چھری پھیرتا۔ بچے بالے یہ منظر دیکھنے کے لیے اس کے گرد جمگھٹا کر لیتے اور اُس وقت تک وہیں کھڑے رہتے جب تک مرغی گوشت میں تبدیل نہ جاتی۔

اب تو مرغی کی کھال چشمِ زدن میں اُدھیڑ دی جاتی ہے لیکن اُس زمانے میں کھال ضائع کرنے کا رواج نہ تھا چنانچہ مرغی کا ایک ایک پر ہاتھ سے نوچا جاتا اور رُوئیں چولہے پر جلائی جاتیں۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ مرغی کی کھال

ہی اس کے گوشت کا سب سے لذیذ حصہ ہے اور اس حوالے سے یہ گھسا پٹا لطیفہ اکثر گھروں میں سنا جاتا تھا۔

ایک رئیس پر برا وقت آیا تو اس نے باورچی کا کام سیکھ لیا اور کسی نواب کے پاس ملازمت کرنے لگا۔ کھانے کا میز بھی وہی لگاتا۔ ایک بار جب نواب کھانا کھا رہا تھا اور باورچی ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا اچانک باورچی کو گذرا ہوا وقت یاد آ گیا جب وہ اور اس کے اہلِ خانہ ایک شاندار میز پر بیٹھے ہوتے تھے اور نوکر چاکر ان کی خدمت کے لیے دست بستہ کھڑے ہوتے۔ وہ یہ باتیں یاد کرتے ہوئے جذباتی ہو گیا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر فرش پر گر گیا۔ جب اسے ہوش آئی تو نواب نے اس سے اس کیفیت کا سبب دریافت کیا اور جب اس نے حقیقتِ حال منکشف کی تو نواب کو اس پر رحم آ گیا تاہم اس نے سوچا کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے کیوں نہ اس کا امتحان لے لیا جائے۔

نواب نے کہا کہ اگر اس کی بیان کردہ کہانی حقیقت پر مبنی ہے تو وہ صرف یہ بتا دے کہ مرغ کے گوشت کا کون سا حصہ سب سے لذیذ ہوتا ہے۔ وہ جدّی رئیس تو تھا ہی اور مختلف کھانوں کی قدر و قیمت بخوبی سمجھتا تھا چنانچہ اس نے جواب دیا کہ ''مرغ کی کھال، حضور''۔ نواب سمجھ گیا کہ باورچی نے اچھے دن دیکھے ہوئے ہیں چنانچہ اسے باورچی کی بجائے اپنے مصاحب کے طور پر ساتھ رکھ لیا۔

ایک اور نوکر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے باورچی کی قسمت پر رشک آیا اور اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی اسی قسم کا ڈراما رچا کر نواب کے مقربین میں شامل ہو جاؤں چنانچہ جب وہ بیہوشی سے باہر آیا اور وہی کہانی دہرائی تو نواب نے اس سے سوال کیا کہ گائے کے گوشت کا کون سا حصہ سب سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ اس بے وقوف نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا: ''اس کی کھال، سرکار''۔ نواب پر اس کا جھوٹ کھل گیا چنانچہ اس نے اسے بیدزنی کی سزا دی اور ملازمت سے برطرف کر دیا۔

آج کل تو مرغی کا گوشت بناتے ہوئے اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے لیکن اُس زمانے میں اسے ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ مرغی کا بھیجا ہی تو کھانے والی چیز ہے چنانچہ سب سے پہلے اسی پر ہاتھ صاف کیا جاتا۔ اس وقت تک کلیجی کے بارے میں جدید تصورات بھی رائج نہ ہوئے تھے چنانچہ باربی کیو کا مزہ لینے کے لیے اسے کسی سلائی میں پرو کر بھون لیا جاتا یا سالن میں پکا لیا جاتا۔

ابا جی پوٹے کی اندرونی جھلّی (جسے سنگ دانہ مرغ کہا جاتا تھا) الگ کر کے ململ کے کسی ٹکڑے میں باندھ کر الگنی پر لٹکا دیتے۔ سنگ دانہ مرغ کئی دنوں تک دھوپ میں لٹکتا رہتا اور جب مکمل طور پر خشک ہو جاتا اسے بعض دیسی ادویہ میں استعمال کے لیے محفوظ کر لیا جاتا۔

مرغی کی ٹانگ پر مہمان کا حق فائق سمجھا جاتا چنانچہ کھانا شروع ہوتے ہی مرغی کی ٹانگ مہمان کی پلیٹ میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی۔ مہمان بھی اس مشرقی روایت سے بخوبی آشنا ہوتا چنانچہ وہ معمولی سے تکلف کے بعد یہ پیشکش قبول کر لیتا اور باقی بوٹیاں درجہ بدرجہ اہلِ خانہ کے حصے میں آتیں۔ اس دعوت کے بعد اگلے قابلِ ذکر مہمان کی آمد تک گھر میں دال ساگ ہی پکتا۔

اب یہ بات شاید عجیب لگے لیکن اُن دنوں عام گھروں میں جدید فرنیچر نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ ڈرائنگ روم کا کوئی تصور نہیں تھا اور گھر کا ایک کمرہ جس میں مہمانوں کو بٹھایا جاتا بیٹھک کہلاتا تھا۔ صوفے ابھی رائج نہ ہوئے تھے چنانچہ ہر گھر میں دو چار کرسیاں پڑی ہوتی تھیں جو مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے اور خود اہلِ خانہ کے استعمال میں آتیں۔ عام طور پر بیٹھک میں ایک چارپائی بھی بچھی رہتی تھی جو کسی آنے جانے والے مہمان کے کام آ جاتی ورنہ عام حالات میں گھر کا کوئی فرد اس پر سو جاتا۔ بیٹھک میں تخت پوش بچھانے کا رواج بھی تھا جو دراصل چارپائی کا نعم البدل سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس پر گدا ڈال کر جھالر والی کوئی خوبصورت سی چادر بچھا دیتے اور گاؤ تکیہ رکھ دیتے۔ پرانے زمانے کی روایتی بوڑھیاں ایسے ہی تخت پوشوں پر بیٹھ کر اپنے پان کے لیے چھالیہ کترا کرتی تھیں۔

مشینی یا دستی قالین تو بہت بعد میں عام ہوا اس زمانے میں فرش بالعموم ایسے ہی رہنے دیا جاتا تھا۔ پھر ٹاٹ بچھانے کا رواج ہوا اور آہستہ آہستہ اُونی دریاں بھی مارکیٹ میں آ گئیں جو زیادہ تر گکھڑ کی بنی ہوتی تھیں۔

سادگی کے اس دور میں کسی آنے جانے والے کی تواضع بالعموم شربت یا چائے سے کی جاتی جو عام گھروں میں مٹی کے روغنی پیالوں میں پیش کی جاتی۔ اگر کوئی خاص مہمان اچانک وارد ہو جاتا تو اسے چائے کے پیالے کے ہمراہ ایک یا دو رس پیش کر دیے جاتے۔ زیادہ تکلف برتنا مقصود ہوتا تو اس کے سامنے ایک یا دو کیک رس رکھ دیے جاتے جو سائز میں آج کے کیک رس سے کہیں بڑے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ایسا ایک کیک رس صرف ایک آنے میں مل جاتا تھا۔ رہے بسکٹ تو ان میں تنوع نہیں آیا تھا۔ بازار میں منٹگمری (حال ساہیوال) کی کسی بسکٹ فیکٹری کی طرف سے ''نائس'' کے نام سے ایک بسکٹ فروخت ہوتا تھا۔ اس کا ایک ڈبہ آٹھ آنے میں مل جاتا تھا اور اس ڈبے میں دس یا بارہ بسکٹ ہوتے تھے۔ ان بسکٹوں پر جو مستطیل شکل کے ہوتے تھے چینی لگی ہوتی تھی۔ یہ بسکٹ بہت مزیدار تھا اور بھوک کی کیفیت میں ایسے ایک یا دو بسکٹ کھا کر دل کو سہارا سا ہو جاتا۔

پرانے لوگوں کو یاد ہوگا کہ اُس زمانے میں موسم گرما کی تعطیلات گذارنے کے لیے طلبہ کا اپنے رشتہ داروں کے ہاں جانے کا رواج عام تھا۔ پاکستان ویسٹرن ریلوے (جی ہاں! ان دنوں پاکستان ریلوے کا یہی نام تھا) تعطیلات کے دوران سفر کرنے والے طلبہ کی سہولت کے لیے ایک پاس جاری کرتی تھی جس پر یک طرفہ ٹکٹ ادا کر کے دونوں طرف کا سفر کیا جا سکتا تھا۔ تعطیلات شروع ہونے سے پہلے بیرونِ ربوہ سے آئے ہوئے طلبہ اپنے گھروں کو جانے کے لیے اور سیر و تفریح کے لیے کسی کے ہاں جانے کا پروگرام رکھنے والے طلبہ سکول کے ہیڈ ماسٹر سے اپنے کوائف کی تصدیق کرا کے سٹیشن ماسٹر کو دیتے تو اسے مطلوبہ پاس جاری ہو جاتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بچے کئی کئی ہفتے اپنے چچاؤں، ماموؤں اور خالاؤں کے ہاں ٹھہرے رہتے لیکن انہیں کبھی احساس نہ دلایا جاتا کہ وہ اپنے میزبان کے لیے بوجھ بن گئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ مہمان کے لیے کسی قسم کا تکلف نہیں برتا جاتا تھا۔ ان مہمانوں کی موجودگی میں بھی گھر میں عام دنوں کی طرح ایک ہی ہنڈیا پکتی۔ ہاں! ضرورت کے مطابق روٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا۔ کھانے کی میز عام گھروں کی دسترس سے باہر تھی چنانچہ بچے اور

بڑے فرش پر کھیس یا چادر بچھا کر کھانا کھا لیتے۔ بسا اوقات ایک ایک پلیٹ میں دو دو تین تین افراد بھی مل کر کھانا کھا لیتے۔ اس طرح برتن بھی کم گندے ہوتے اور خاتون خانہ کو ان کی صفائی کے لیے اضافی محنت نہ کرنا پڑتی۔

گھر میں آئے ہوئے مہمان کے لیے چائے کے ساتھ طرح طرح کے لوازمات اور کھانے میں تنوع کا رواج تو بہت بعد میں شروع ہوا اور مہمانوں کو بوجھ سمجھے جانے کا چلن بھی اسی وجہ سے عام ہوا۔

کھانے پینے کی اشیاء کو ضیاع سے محفوظ رکھنے کے لیے اب بظاہر دقیانوسی نظر آنے والے طریقے استعمال کئے جاتے تھے۔ قدرے آسودہ حال لوگوں نے نعمت خانے بنوا رکھے تھے جن سے مراد لکڑی کی ایسی الماریاں تھیں جن کے سامنے اور دائیں بائیں جالی لگی ہوتی تھی۔ وہ یہ اشیاء نعمت خانے میں رکھ کر بے فکری کی نیند سو جاتے لیکن عام گھر اس سہولت سے محروم تھے۔ یہی وجہ تھی موسم گرما میں خاص طور پر دودھ بار بار اُبالا جاتا اور بچا کھچا سالن ہر چند گھنٹوں کے بعد گرم کیا جاتا۔ ان دونوں چیزوں کو بلی کے اچانک حملے سے بچانا بھی ضروری تھا چنانچہ دن کے وقت بھی جب سب گھر والے جاگ رہے ہوتے تھے یہ چیزیں ٹوکروں کے نیچے رکھی جاتیں مگر رات کے وقت تو خواتین خانہ ان اشیاء کو اپنی چارپائی کے قریب رکھ کر سوتیں تاکہ اگر بلی حملہ آور ہو بھی جائے تو اسے فوراً بھگایا جا سکے۔

اُس زمانے میں ایک اور چیز بھی رائج تھی جسے "چھکا" کہا جاتا تھا۔ یہ لوہے کی ایک جالی دار سی ٹوکری ہوتی جسے لٹکانے کے لیے تین تاریں اور سب سے اوپر ایک کنڈا لگا ہوتا تھا۔ کھانے کی ایسی چیز جسے کھلی ہوا میں رکھنا مقصود ہوتا چھکے میں رکھ کر الگنی کے ساتھ لٹکا دی جاتی۔ یوں یہ چیز بلی کی پہنچ سے دور ہو جاتی اور اگلے دن تک محفوظ رکھی جا سکتی تھی۔

بلی کا ذکر ہوا ہے تو کچھ ذکر چوہوں کا بھی ہو جائے جو ہر گھر میں پائے جاتے تھے۔ ہم نے ان کی موجودگی سے تو سمجھوتہ کر لیا تھا لیکن جب ان کی تعداد بڑھنے لگتی تو ان سے نجات کی تدبیریں سوچی جانے لگتیں۔ اس کا سب سے سہل طریقہ کڑکی لگانا تھا جو لکڑی یا لوہے کا ایک پھندہ ہوتا۔ اس میں روٹی کا ایک ٹکڑا رکھ دیا جاتا۔ جہاں تک لوہے کی کڑکی کا تعلق ہے چوہا روٹی کے لالچ میں شکنجے میں پھنس کر اپنی جان دے دیتا اور اگر کسی وجہ سے زندہ بھی رہتا تو مُردوں سے بدتر حالت میں۔ صبح اُٹھ کر کڑکی کا باقاعدہ معاینہ کیا جاتا۔ اگر کوئی چوہا شکار ہوا ہوتا تو اہلِ خانہ اپنی اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

لکڑی کے پھندے میں پھنسنے والا چوہا صبح تک بالکل صحیح سالم ہوتا تھا۔ یہ کڑکی کسی کھلی جگہ میں کھولی جاتی۔ جوں ہی چوہا باہر نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتا ڈنڈے سے اس کا کام تمام کر دیا جاتا۔

بعد میں بازار میں چوہے مار گولیاں آ گئیں۔ یہ گولیاں باورچی خانے اور گھر کے کونوں کھدروں میں پھینک دی جاتیں۔ چوہے اسے کھاتے تو مر جاتے لیکن اس طریق کار میں قباحت یہ تھی کہ بالعموم چوہوں کے مرنے کا پتا گھر میں پھیلنے والے تعفن سے پتا چلتا۔ اندریں حالات چوہے مار گولیوں پر عموماً کم سے کم انحصار کیا جاتا اور ترجیح کڑکی کو ہی دی جاتی۔

اب تک قارئین نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس زمانے میں عام آدمی کی آمدنی کم تھی لیکن کارکنان کو انجمن کی طرف سے ملنے والی گذارے کی رقم تو اور بھی کم تھی چنانچہ ''قرضہ گندم'' کی شکل میں انہیں ایک ایسی سہولت مہیا کر دی جاتی جس کی وجہ سے ان کے لیے قُوتِ لا یموت کا حصول قابلِ عمل رہتا۔ اس مقصد سے ہر کارکن کے افرادِ خانہ کی تعداد کی مناسبت سے اس خاندان کی گندم کی سالانہ ضرورت کا اندازہ لگایا جاتا۔ اس گندم کی بازاری قیمت کو سامنے رکھتے ہوئے ہر کارکن کے لیے ایک رقم کا تعین کیا جاتا جو اسے اپریل کے شروع میں ادا کر دی جاتی۔ یہ رقم عرفِ عام میں پیشگی کہلاتی اور بارہ برابر اقساط میں انجمن کو قابل ادا ہوتی۔ انجمن کے کارکنان دفتر کی طرف سے ملنے والی ''پیشگی'' سے سال بھر کی گندم اکٹھی خرید لیتے اور اسے حسبِ ضرورت پسوا کر استعمال کرتے رہتے۔

ہم ہر ماہ کے شروع میں گندم کی ایک بوری پسواتے تھے۔ اس کام کے لیے محلّہ الف میں رہائش پذیر خیر دین کمہار کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں جو اپنے گدھوں کے ساتھ اِدھر اُدھر آتے جاتے کہیں نہ کہیں نظر آجاتے تھے۔ وہ اپنے گدھے پر یہ بوری لاد کر لے جاتے اور اسے پسوا کر گھر واپس پہنچا جاتے۔ کسی وجہ سے وہ نہ مل پاتے تو ہم سیف علی نامی ایک کشمیری مہاجر جو کسی زمانے میں سید ولایت حسین شاہ کے گھر میں کرایہ دار کے طور پر رہا کرتے تھے اور جن کا مستقل ٹھکانہ لاری اڈہ تھا سے آٹا پسوا لیتے۔ وہ لوگوں میں ''ہاتو'' کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ڈھائی من کی بوری اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیتے اور آٹا پسوانے کے بعد گھر واپس پہنچا جاتے۔ آپ شاید حیران ہوں گے اس کام کا معاوضہ ایک روپے سے زیادہ نہ تھا۔

سید حسن خان اپنی کتاب ''ربوہ کی چند پرانی یادیں'' میں اِن ہی سیف علی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بے حد نیک، ہمدرد اور مہمان نواز تھے اور یہ کہ اُنہیں جب بھی موصوف کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ انہیں کھانا کھلائے بغیر واپس نہ آنے دیتے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا گندم پسوانے کا۔ اگر کسی وجہ سے تھوڑی گندم پسوانا مقصود ہوتا تو ابا جی یہ کام اپنے دفتر کے کسی مددگار کارکن کے ذمہ لگا دیتے۔ اس زمانے میں ان کے دفتر میں دو مددگار کارکن ہوتے تھے۔ ایک راجوری کے رہنے والے محمد عبداللہ تھے اور دوسرے سلیم اللہ جو محلّہ الف میں رہائش پذیر تھے۔ اگر دونوں میں سے کوئی بھی میسر نہ ہوتا تو میں خود گندم پسوانے کے لیے مشین پر چلا جاتا جو گول بازار میں تقریباً اس جگہ ہوا کرتی تھی جہاں اب صدر عمومی کا دفتر ہے۔

میں اب بھی چشمِ تصور سے دیکھ سکتا ہوں کہ میں وہاں پہنچتا تو گندم کے تھیلوں، گٹھڑیوں اور پوٹلیوں کی ایک لمبی قطار پہلے ہی سے لگی ہوتی۔ ہر نیا گاہک اپنا تھیلا اس قطار میں لگا دیتا۔ یہ مشین ڈیزل سے چلتی تھی۔ شاید یہ کوئی کم طاقت والی مشین تھی کیوں کہ یہ بہت آہستہ چلتی اور بسا اوقات دو دو تین تین گھنٹوں کے بعد باری آتی۔ بدقسمتی سے مجھے یہ سارا وقت وہیں گذارنا پڑتا کیوں کہ امی مجھے تاکید کر کے بھیجتی تھیں کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں آٹا اپنے سامنے ہی پسواؤں۔

دراصل امی صفائی کے معاملہ میں بہت حساس تھیں اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ آٹا پسواتے وقت ہماری گندم کسی اور گندم کے ساتھ مکس نہ ہو لیکن یہ اس لیے ممکن نہ تھا کہ گندم ہر حال میں چلتی ہوئی مشین میں ڈالنا پڑتی تھی اور پہلی گندم ابھی تھوڑی سی موجود ہوتی کہ گندم کی اگلی قسط انڈیلنا پڑتی۔ اگر گندم کا مالک خود موجود نہ ہوتا تو مشین والا بسا اوقات دو دو تین تین تھیلے اکٹھے ہی انڈیل دیتا جس کی وجہ سے گندم کی صفائی کے لیے کی گئی محنت اکارت چلی جاتی اور صاف شدہ اور غیر صاف شدہ گندم کا آٹا مکس ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں تمام وقت آٹا چکی پر موجود رہتا اور جب پہلی گندم ختم ہو رہی ہوتی تو اپنی گندم ڈالتا۔ اس تمام تر احتیاط کے باوجود پکی ہوئی روٹی میں کبھی کبھار کرک آ ہی جاتی۔ اس پر آٹا پسوا کر لانے والے کی شامت آ جاتی اور اسے سرزنش کی جاتی کہ اس کی بے پروائی سے ہماری ''صاف گندم'' کسی اور کی ''گندی گندم'' کے ساتھ مکس ہو گئی ہے اور اسے تاکید کی جاتی کہ آئندہ وہ سارا وقت مشین پر ہی موجود رہے اور گندم اپنے ہاتھ سے مشین میں ڈالے تا کہ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا کوئی امکان نہ رہے۔

اب یاد آتا ہے کہ اس مشین کے ایگزاسٹ پر ٹین کا ایک ڈبہ الٹا بندھا ہوتا تھا اور مشین چلتے ہوئے اس میں سے ٹک ٹک، ٹک ٹک قسم کی آواز آتی رہتی تھی۔ ہوسکتا ہے اس نظام کی کوئی اور حکمت بھی ہو لیکن مشہور تھا کہ یہ ڈبہ جان بوجھ کر باندھا جاتا ہے اور اس کا مقصد عوام الناس کو مطلع کرنا ہوتا ہے کہ مشین چل رہی ہے اور وہ آٹا پسوانے کے لیے آ سکتے ہیں۔

ابا جی بتایا کرتے تھے کہ ڈیزل کے دھوئیں کی وہ باقیات جو اس ڈبے میں جمع ہو جاتی ہیں بعد میں مشین والے کھرچ لیتے ہیں اور یہی چیز دواخانوں میں کاجل کی شکل میں بکتی ہے۔ رات کے وقت ٹک ٹک! ٹک ٹک!! کی یہ آواز اور بھی بھلی بلکہ پُر اسرار لگتی۔

اس مشین پر روئی دُھننے کا انتظام بھی تھا۔ دُھنی ہوئی روئی ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہوتی رہتی اور دُھنیا ایک لمبی چھڑی کی مدد سے روئی کے بکھرے بکھرے گالے اکٹھے کر کے لحاف یا توشک میں بھرائی کر دیتا۔ ''دُھنیے'' نے اپنا منہ اور ناک کپڑے کی کسی چادر سے پوری طرح لپیٹ رکھا ہوتا تھا تا کہ روئی کے ذرات اس کے پھیپھڑوں میں نہ جائیں۔ کچھ لوگ لحاف یا توشک کی لگندوائی اسی دُھنیے سے کرا لیتے جب کہ باقی یہ کارروائی خود پایہ تکمیل کو پہنچاتے۔

اور اب کچھ باتیں ربوۂ قدیم میں طبی سہولتوں کے بارے میں!

کبھی مرے دل میں جھانک کر دیکھ داغ کتنے ہیں زندگی کے

یہ پاکستان کا بالکل ابتدائی دور تھا اور پورے ملک میں طبی سہولتوں کا فقدان تھا۔ ربوہ بھی جو اُن دنوں آبادکاری کے ابتدائی مراحل میں سے گذر رہا تھا اس اصول سے کسی طور مستثنیٰ نہ تھا تاہم وسائل کی کمی کے باوجود یہاں نور ہسپتال کے نام سے ایک ایسا ادارہ موجود تھا جس میں علاج معالجہ کی روز مرّہ سہولیات موجود تھیں۔ یہ ہسپتال چھوٹا اور اس میں تعینات ڈاکٹروں کی تعداد انتہائی محدود تھی اور اس حوالے سے ڈاکٹر حشمت اللہ، ڈاکٹر مرزا منور احمد، لیڈی ڈاکٹر غلام فاطمہ اور زینب نرس یہاں کی جانی پہچانی شخصیات تھیں۔

اس ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر حشمت اللہ تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ پر ڈاکٹر مرزا منور احمد اس کے چیف میڈیکل آفیسر قرار پائے اور ڈاکٹر حشمت اللہ حضرت خلیفہ المسیح الثانی کے کل وقتی ذاتی معالج کی حیثیت میں کام کرنے لگے تاہم یہاں نور ہسپتال یا فضلِ عمر ہسپتال کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس ماحول کی عکاسی کرنا ہے جس میں اہلِ ربوہ ان دنوں اپنا وقت گذار رہے تھے لہٰذا میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ عوام الناس میں اپنی صحت کے حوالہ سے مطلوبہ شعور کا فقدان تھا اور صدیوں پرانے ٹونے ٹوٹکے اس کلچر کا حصہ تھے۔ طبِ یونانی میں جونکوں اور سینگی کے ذریعہ علاج کی اہمیت ہمیشہ مسلّم رہی ہے اور فصد کھلوانا بعض بیماریوں کا علاج سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس پس منظر میں اُن دنوں جونکیں لگانے والے، سینگی لگانے والے اور فصاد بھی ربوہ آتے رہتے تھے اور گلی محلوں میں آواز لگا کر ضرورتمندوں کو اپنی جانب متوجہ کیا کرتے تھے۔

بہت سے قارئین کو شاید یہ بات عجیب لگے کہ آج سے پچاس سال پہلے تک پھوڑے پھنسی اور بعض جلدی امراض کے علاج کے لیے جونکیں لگوانا تیر بہ ہدف علاج سمجھا جاتا تھا۔ جونکیں جسم کے متاثرہ حصہ پر چھوڑ دی جاتیں۔ وہ مریض کا خون چوسنے لگتیں اور جب تک ان میں مزید خون چوسنے کی سکت باقی رہتی وہ اپنی جگہ چمٹی رہتیں۔ بعد میں انہیں اتار لیا جاتا اور سمجھا یہ جاتا کہ جونک نے فاسد مادے چوس لیے ہیں اور مریض کے تندرست ہونے کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ علاج کے اس طریق کار میں کئی طرح کے اندیشے بھی مضمر تھے لیکن اس کے باوجود یہ سلسلہ برصغیر میں نہ جانے کب سے رائج تھا چنانچہ میں نے ''قائداعظم کے آخری ایام'' جو قائداعظم کے معالج کرنل الٰہی بخش کی انگریزی کتاب "With The Quaid e Azam During His Last Days" کا اردو ترجمہ ہے کے دیباچہ میں پڑھا ہے کہ علامہ اقبال کے بچپن میں ان کی کسی تکلیف کا علاج جونکوں کے ذریعہ کیا گیا۔ کتاب میں یہ تو ذکر موجود نہیں ہے کہ اس علاج سے ان کی تکلیف میں کچھ کمی واقع ہوئی یا نہیں البتہ یہ ذکر ضرور موجود ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کی ایک آنکھ کی بینائی کمزور ہو گئی۔

ہندوستانی معاشرے میں فصد کے ذریعہ علاج ازمنہ قدیم سے جاری ہے اور اس کا حوالہ کتب طب کے علاوہ اردو شاعری میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کسی استاد کا یہ شعر:

راز ہوتا ہے جو افشا مجھے ہوتا ہے ملال
خون روتا ہوں لہو فصد اگر دیتی ہے

یہ طریق علاج زیادہ تر ذہنی مریضوں کے لیے مؤثر سمجھا جاتا تھا۔ یوں مریض کے جسم سے کچھ خون نکال لیا جاتا۔ اخراج خون سے مریض کے جوش میں کمی آ جاتی اور دیکھنے والے سمجھتے کہ اسے آرام آ گیا ہے۔ یوں ہی تو نہیں کہا کسی شاعر نے:

وہ پری کہتا ہے دیوانہ بنا کر زلف کا
فصد لو اپنی ، کرو جا کر دوا دو چار دن

میرے ایک خالہ زاد، قاضی منظور احمد کے بیٹے، بشارت جو کچھ عرصہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں میرے کلاس فیلو رہے لیکن بعد میں لاہور چلے گئے میٹرک کا امتحان دینے کے بعد شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئے اور مرض اتنا بڑھ گیا کہ انہیں دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ ان کے والدین نے ان کا مقدور بھر علاج کیا اور کبھی ہسپتال میں اور کبھی گھر پر اس کا دوا دارو کرتے رہے لیکن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کے مصداق شفا کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کسی نے قاضی منظور احمد کو بتایا کہ چک چٹھہ میں ایک احمدی، حکیم عبدالعزیز (جن کا الفضل میں بھی بکثرت اشتہار آتا رہتا تھا) دماغی امراض کا علاج کرتے ہیں چنانچہ وہ بشارت کو وہاں لے جانے لگے لیکن پتا چلا کہ حکیم عبدالعزیز کے پاس اس مرض کا فصد کھولنے کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے جس سے چند روز تو اچھے گذر جاتے لیکن جلد ہی مرض عود کر آتا۔ دو چار بار کی آزمائش کے بعد قاضی منظور احمد نے بشارت کو مجبوراً اپنے گھر کے ایک کمرہ میں مقید کر دیا کہ وہ باہر نکل کر گلی محلے والوں کی تضحیک کا نشانہ بننے لگے تھے۔ انہوں نے بالآخر اسی کمرے میں گھٹ گھٹ کر جان دے دی۔

جہاں تک سینگی لگانے یا لگوانے کی بات ہے میں نے اپنی آنکھوں سے ربوہ کے کسی آدمی کو اس طریق علاج سے استفادہ کرتے نہیں دیکھا لیکن ایک اور ''ٹوٹکے'' اور اس میں مضمر فوائد کا تو میں چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے بچپن سے امی کو جوڑوں میں درد کی شکایت کرتے سنا۔ ابا جی اپنے علم کے مطابق اُن کا علاج معالجہ کرتے رہتے تھے لیکن نہ آج کی طرح ربوہ میں اس مرض کے سپیشلسٹ موجود تھے نہ آج والی دوائیں میسر تھیں لہٰذا ٹونوں ٹوٹکوں سے بھی کام چلانے کی کوشش کی جاتی۔ میں نے دیکھا کہ ابا جی کبھی کبھار ان کے کولہے پر گلاس لگایا کرتے تھے۔ اس کا طریق یہ تھا کہ پہلے جسم پر گتے کا تقریباً ایک مربع انچ کا ٹکڑا کاٹ کر رکھ دیا جاتا۔ اس کے اوپر سپرٹ میں بھیگی لیڈ میں تر روئی کا ایک پھاہا رکھ کر اسے آگ دکھا دی جاتی اور اس پر شیشے کا گلاس الٹا رکھ دیا جاتا۔ جوں جوں گلاس کے اندر موجود ہوا کم ہوتی جاتی ہوا کے بیرونی دباؤ سے گوشت گلاس کے اندر اکٹھا

ہونے لگتا۔ یہ کیفیت چند منٹ تک رہتی جس کے بعد جسم پر گلاس کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ جاتی۔ بالآخر گلاس اتر جاتا اور جسم معمول پر آ جاتا۔ امی اس طریقِ علاج سے جسے فزیوتھراپی کی ایک شکل قرار دیا جا سکتا ہے وقتی طور پر افاقہ محسوس کرتی تھیں۔ ابا جی کی ربوہ سے غیر حاضری کے دوران میں نے امی کو خود بھی کئی بار یہ گلاس لگایا تھا۔

ربوہ کے بالکل ابتدائی میڈیکل پریکٹیشنرز میں سے ایک قریشی عبدالعزیز تھے۔ ڈاڑھی کو مہندی سے رنگتے، سفید پگڑی پہنتے اور ان کا لباس بھی بالعموم سفید ہوتا۔ انہوں نے اپنے ایک خواب کی بنا پر ۱۹۳۱ء میں خود احمدیت قبول کی تھی۔ تفصیلات کے مطابق ان کا قادیان کی ایک نواحی بستی پھیروچیچی میں آنا جانا لگا رہتا تھا جہاں احمدیوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ وہاں پر ان کے ایک دوست نواب دین نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی بیعت کر لی۔ قریشی عبدالعزیز کو پتا چلا تو وہ ان کے گھر گئے اور قرآنِ مجید ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگے: میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مرزا غلام احمد (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں اور تم نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔'' وہ رخصت ختم ہونے پر اپنی ڈیوٹی پر موضع سرسنگھ پہنچے ہی تھے کہ انہیں خواب میں حضرت مسیح موعود کی زیارت ہوئی۔ آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: ''عبدالعزیز! تمہیں کیا حق تھا کہ قرآن اُٹھا کر کہتے کہ میں جھوٹا ہوں۔'' وہ بیدار ہوتے ہی قادیان کے لیے روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر کسی سے کچھ پوچھے سُنے بغیر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی بیعت کر لی۔

قریشی عبدالعزیز ڈسپنسر تھے لیکن ڈاکٹر کے طور پر معروف تھے اور ان کا کلینک (جسے ہم دکان کہا کرتے تھے) کچے ریلوے سٹیشن کے پاس محلہ دارالرحمت میں تھی۔ اسی دور کی بات ہے ایک بار میری ایک ڈاڑھ کو کیڑا لگ گیا اور علاج دندان اخراجِ دنداں کے مصداق اس ڈاڑھ کا اخراج ہی اس کا مقدر ٹھہرا لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوا، ایک سُننے والی داستان ہے۔

ایک دن ابا جی مجھے ان کے پاس لے گئے۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن اندازہ کر سکتا ہوں کہ انہوں نے ابا جی سے مجھے اگلی صبح اپنے پاس بھجوانے کو کہا تھا کیوں کہ اگلی صبح ابا جی دفتر جاتے ہوئے امی کو بتا گئے کہ وہ اپنے دفتر سے کسی مددگار کارکن کو بھجوا دیں گے، میں اس کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر اپنی ڈاڑھ نکلوا لوں۔

ابا جی کی ہدایت کے مطابق امی نے وقت مقررہ سے پہلے ایلومینیم کی ایک کیتلی میں پانی ابال رکھا تھا چنانچہ جوں ہی خواجہ محمد عبداللہ، مددگار کارکن گھر پہنچے امی نے پانی کی کیتلی ان کے ہاتھ میں تھما دی اور میں اُن کے پیچھے تیز قدم ''سوئے مَقتل'' روانہ ہو گیا۔

اس کلینک میں ایک دیوار کے ساتھ بنچ لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس پر بیٹھنے کو کہا اور پھر مسوڑھے کو سُن کرنے کے لیے کوئی ٹیکا لگائے بغیر میری ڈاڑھ کو اپنے زنبور سے قابو کر لیا۔ یوں تو ڈاڑھ کچی تھی اور اسے نکالنا اس قدر مشکل نہ ہونا چاہیے تھا لیکن انہیں اس کام میں غالباً مطلوبہ مہارت حاصل نہ تھی اس لیے باوجود کوشش کے ڈاڑھ نکل نہیں رہی تھی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا گویا ان کے پاؤں زمین سے اُٹھے ہوئے ہوں اور وہ پورے وزن کے ساتھ میری ڈاڑھ کے ساتھ لٹک گئے ہوں۔ اچانک منظر بدلا اور یوں محسوس ہوا گویا میں کسی

بہت بڑی اذیت میں سے گذر رہا ہوں۔ میں درد کے مارے چیخ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: "بُر چیڈا کیوں ایں۔ ڈاڑھ تے نکل گئی اے۔"

اُس وقت شدید درد کی وجہ سے میرا برا حال تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی پانی میں جسے گھر سے لایا گیا تھا پوٹاشیم پرمنگنیٹ ڈال کر مجھے کلّی کرنے کو کہا۔ میں دکان کے ایک کونے میں بیٹھ کر کلّیاں کرنے لگا۔ جب میرے ہوش و حواس بحال ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے نکالی گئی ڈاڑھ ایک پرانے اخبار میں لپیٹ کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے از راہِ تجسس اسے کھول کر دیکھا تو ڈاڑھ کے ساتھ گوشت کا ایک لوتھڑا بھی لگا ہوا تھا۔

ڈاڑھ نکلوانے کے بعد عرصے تک میرے مسوڑھے میں اس جگہ ایک گڑھا سا بنا رہا۔ میں جب فارغ ہوتا اس گڑھے میں اپنی زبان پھیرتا رہتا تا وقتیکہ یہ جگہ آہستہ آہستہ نئے دانتوں نے پُر کر دی۔

اتنی مدت گذر جانے کے باوجود مجھے اب بھی کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے گویا میں سفید برّاق لباس میں ملبوس، مہندی رنگی سرخ ڈاڑھی والے اس فرشتہ صورت ڈاکٹر کے سامنے منہ کھولے بیٹھا ہوں اور وہ میری ڈاڑھ پر زور آزمائی کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہیں۔

مجھے احساس ہے کہ یہ ڈاڑھ نکلوانے کے لیے مجھے جس اذیت سے دوچار ہونا پڑا اس میں ڈاکٹر صاحب کا قطعاً کوئی دوش نہ تھا کہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنے علاج معالجہ کے سلسلے میں ان سے ملاقات کا موقع نہیں ملا لیکن حال ہی میں ایک محفل میں مرحوم کی اس خواہش کا ذکر ہوا کہ بعد از وفات ان کی قبر پر یہ شعر ضرور لکھا جائے:

عزیزو! اقرباؤ!! دوستو!!! جب تم یہاں آؤ
خدا سے میری بخشش کے لیے دل سے دعا کرنا

تو میں نے کوشش کر کے بہشتی مقبرہ میں ان کی قبر تلاش کی اور ان کے بلندی درجات کے لیے "دل سے" دعا مانگی۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کی نصفِ اول کی بات ہے۔ اس وقت دادی جی کی عمر تقریباً اڑسٹھ سال تھی۔ ان کی آنکھوں میں موتیا تھا اور اس کے آپریشن کی ضرورت تھی لیکن اس زمانے میں ربوہ میں یہ سہولت میسر نہ تھی۔ چنیوٹ کے سول ہسپتال میں یہ انتظام موجود تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس عرصہ میں دادی جی اور ان کے تیمار دار رہیں گے کہاں؟

چچا ابراہیم اس سے کچھ عرصہ پہلے تک خود چنیوٹ میں رہائش پذیر تھے۔ اگر یہ آپریشن اسی زمانے میں ہو جاتا تو دادی جی کے قیام کے حوالے سے کوئی مشکل پیش نہ آتی لیکن تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ربوہ منتقل ہو جانے کی وجہ سے وہ اب وہاں سے آ چکے تھے۔ بالآخر امی نے اس مسئلے کا حل نکالا۔ ان کے حضرت صوفی غلام محمد رفیق حضرت مسیح موعود کے ساتھ دیرینہ خاندانی مراسم تھے چنانچہ انہوں نے پیشکش کی وہ صوفی غلام محمد کی اہلیہ سے درخواست کر کے ان کے ہاں ٹھہرنے کا انتظام کر سکتی ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، سب نے اس تجویز پر بہت

خوشی کا اظہار کیا۔ اگلے ایک دو روز میں ان کی طرف سے گرین سگنل موصول ہو گیا، ابا جی نے سول ہسپتال چنیوٹ سے آپریشن کی تاریخ لے لی اور یوں ہم سب ایک شام چنیوٹ جا پہنچے۔

صوفی غلام محمد کی رہائش چنیوٹ کے محلہ پورن تلاد میں واقع ایک حویلی میں تھی جو چنیوٹ کے کسی ہندو سول جج یا مجسٹریٹ کی ملکیت اور "منصف منزل" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ حویلی جو غالباً تقسیم سے کچھ ہی عرصہ پہلے تعمیر ہوئی تھی چنیوٹ کے قدیم شہر سے ذرا ہٹ کر اور کئی منزلہ تھی۔ اس حویلی کے طرزِ تعمیر سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا اصل مالک خاصا متمول لیکن پختہ خیالات کا ہندو تھا۔ اس کا تمول اس مکان کی وسعت اور اس کی آرائش و زیبائش سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس وسیع مکان کی انٹری ایک چبوترے پر سے تھی۔ گیٹ کے دونوں جانب پتھر سے تراشے گئے دو سنتری کھڑے تھے جن کے سروں پر پگڑیاں اور ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ یہ بت اس مہارت سے تراشے گئے تھے کہ پہلی نظر میں ان پر سنتریوں ہی کا گمان ہوتا تھا۔ حویلی کی منڈیر پر ہاتھیوں، شیروں اور ہنومان کے دھڑ بنے ہوئے تھے اور اس کے پرنالوں سے بارش کا بہتا ہوا پانی شیروں کے منہ سے نکلتا ہوا نظر آتا تھا۔

یہ تو تھا اس کا بیرونی منظر۔ اس کی بعض دیواریں تین فٹ سے زیادہ موٹی تھیں اور بعض قدرے کم۔ بتایا جاتا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد جب مہاجر یہاں پہنچے تو زیریں منزل کے ایک کمرے میں سرنگ ہوتی تھی جو چنیوٹ کچہری میں جا کر کھلتی تھی لیکن بعد میں اسے حفاظتی نقطہ نگاہ سے بند کر دیا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس افواہ میں کس حد تک صداقت تھی کیوں کہ میں نے خود یہ سرنگ نہیں دیکھی۔ ہاں! میں نے وہ کمرہ ضرور دیکھا ہے جس کے اندر اس سرنگ کا دہانا بتایا جاتا تھا۔ اس حویلی کے بعض کمروں کی چھتوں پر شیشے کا خوبصورت کام تھا اور بعض چھتوں پر ہندو دیومالائی کہانیوں کے مختلف مناظر رنگ و روغن کی مدد سے نمایاں کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں اس مکان کی شان دیکھنے والی تھی۔

اگرچہ صوفی غلام محمد اس مکان کے غالب حصے پر قابض تھے لیکن مکان کے بعض دیگر قابضین کا ان کے ساتھ جھگڑا رہتا تھا اور انہوں نے ان سے مکان خالی کروانے کے لیے ان پر مقدمات کر رکھے تھے تاہم ہمیں اطمینان تھا کہ ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں ان شاء اللہ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

پروگرام کے مطابق دادی جی کا آپریشن سول ہسپتال میں ہوا۔ وہ چوبیس یا شاید اڑتالیس گھنٹے ہسپتال میں رہیں۔ ڈاکٹر نے ان کا موتیا جو سائز میں مردانہ قمیص پر ٹانکے جانے والے سیپ کے بٹن کے برابر تھا نکال کر ابا جی کو دے دیا اور مریضہ کو گھر منتقل ہونے کی اجازت دے دی۔ اس دوران وہ حویلی کے مین گیٹ کے پاس ایک کمرے میں رہیں جس کا دروازہ باہر کھلتا تھا۔ اس کمرے کا اصل مصرف تو پتا نہیں کیا ہو گا لیکن اس کا محلِ وقوع اور سائز دیکھتے ہوئے خیال پیدا ہوتا تھا کہ کسی وقت یہ کمرہ بطور گارڈ روم استعمال ہوتا ہو گا۔

اُس زمانے تک میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی چنانچہ آپریشن کے بعد کئی دنوں تک مریض کو مکمل آرام کی ضرورت ہوتی۔ اس دوران مریض کے قریب پیاز یا لہسن کا بگھار نہ لگایا جاتا کیوں کہ عام خیال کے

مطابق اس خوشبو سے آنکھ کا زخم خراب ہو سکتا تھا۔
دادی جی آپریشن کے بعد قریباً ایک ہفتہ چنیوٹ میں رہیں۔ اس عرصے میں امی اور میری بہنیں ان کی خدمت کے لیے وہیں ٹھہری رہیں۔ ان دنوں صوفی غلام محمد کی اہلیہ، فاطمہ بیگم بالکل تندرست تھیں اور ان کی کچھ بیٹیاں جن میں رفیقہ، بشریٰ اور طاہرہ شامل تھیں غیر شادی شدہ تھیں۔ انہوں نے ہمیں ہر طرح کا آرام پہنچایا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہم اپنے گھر سے باہر ہیں۔ رات کے وقت رفیقہ مجھے اپنی جھولی میں لے کر کہانیاں سنایا کرتیں تھیں۔ بعد میں رفیقہ کی شادی رشید چٹھہ سے، بشریٰ کی شادی چوہدری غلام مجتبیٰ ایڈوکیٹ سے اور طاہرہ کی شادی مبشر بٹ نامی ایک نوجوان سے ہوئی۔ رفیقہ آجکل راولپنڈی میں اور بشریٰ لاس اینجلس میں مقیم ہیں جب کہ طاہرہ وفات پا چکی ہیں۔ ان تینوں کی والدہ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی نیکیوں کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

ابا جی اور چچا ابراہیم دادی جی کو دیکھنے کے لیے سہ پہر کے وقت چنیوٹ جاتے اور کچھ وقت ان کے پاس گذار کر رات کو واپس ربوہ چلے آتے۔ ابا جی تو ٹرین یا بس پر سفر کرتے لیکن چچا ابراہیم بائیسکل پر چنیوٹ آتے جاتے تھے۔ خدا کا شکر ہے دادی جی کا آپریشن کامیاب رہا جس کے بعد وہ کچھ دن تو سبز پٹی باندھ کر پھرتی رہیں اور پھر انہیں عینک لگ گئی۔

کسمپرسی کے اسی دور میں میرے دائیں کندھے کے قریب ایک دھدری بن گئی۔ دھدری کا سائز چاندی کے روپے جتنا تھا۔ اُس کے کنارے اُبھرے ہوئے تھے البتہ اندر والا حصہ ہاتھ لگانے سے ملائم محسوس ہوتا تھا اور اس میں خارش رہتی تھی۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ اُس کا کوئی انگریزی علاج کیا گیا ہو لیکن علاج کے طور پر آزمائے گئے دو ٹوٹکے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان میں سے ایک تھا گندم کے تیل کا استعمال اور دوسرا تھا کارڈ کے تیل کا استعمال۔

آپ حیران تو ضرور ہونگے کہ گندم کے تیل سے مراد کیا ہے اور یہ کس طرح نکالا جاتا تھا۔ اس حوالے سے شاید یہاں اتنا بتانا ہی کافی ہو کہ لوہے کا ایک باٹ چولہے کے اندر دہکنے کے لیے رکھ دیا جاتا۔ دوسری طرف توے کے اُوپر تھوڑی سی گندم رکھ دی جاتی اور جب باٹ پوری طرح سرخ ہو جاتا تو اُسے گندم کے اوپر رکھ کر پورے زور سے دبا دیا جاتا۔ اس دباؤ سے گندم جل جاتی اور دانے ایک کیک کی شکل اختیار کر لیتے تاہم اس دوران گندم میں سے تیل کی طرح کی کوئی چیز نکل آتی۔ امی یہی تیل اُنگلی سے اس دھدری پر مل دیتی تھیں۔

رہا کارڈ کا تیل تو شائد بعض قارئین کے لئے یہ بات نئی ہو کہ اس زمانے میں خط لفافے کے اندر ڈال کر بھی بھجوایا جا سکتا تھا اور یہی خط پوسٹ کارڈ پر بھی لکھا جا سکتا تھا۔ ان دنوں ایک پوسٹ کارڈ پانچ پیسے میں ملتا تھا اور کفایت کے مدِ نظر اکثر لوگ خط لکھنے کے لیے یہی کارڈ استعمال کرتے تھے۔ مکتوب الیہ کی سہولت کے لئے کارڈ سے منسلک ''جوابی پوسٹ کارڈ'' بھی بھجوایا جا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اُسے کارڈ خریدنے کے لیے ڈاکخانے بھی نہیں جانا پڑتا تھا اور وہ اپنی طرف سے کچھ خرچ کئے بغیر جواب لکھ کر سپرد ڈاک کر سکتا تھا۔

کارڈ کا تیل نکالنے کے لیے اسے دو انگلیوں کے درمیان پکڑ لیا جاتا اور پھر ماچس دکھا دی جاتی۔ ماچس

کے شعلے سے یہ کارڈ جو پتلے سے خاکی گتے کا بنا ہوتا تھا آہستہ آہستہ جلنا شروع ہو جاتا۔ کارڈ کو اس طرح پکڑا جاتا کہ اس کے خاکستر ہونے تک یہ شعلہ مسلسل بھڑکتا رہے۔ جب آگ بڑھتے بڑھتے اُس کارڈ کے آخر تک پہنچتی تو اُس میں سے ایک روغنی قطرہ نیچے گرتا۔ یہی قطرہ کارڈ کا تیل کہلاتا تھا اور دھدری پر لگایا جاتا۔

اب میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھے گندم کے تیل سے افاقہ ہوا تھا یا کارڈ کا تیل میری اس بیماری کے لیے تیر بہ ہدف ثابت ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور یہ دھدری انگریزی دوا کے استعمال کے بغیر ہی ٹھیک ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سا علاج صدیوں سے آزمودہ ٹوٹکوں کے ذریعہ کیا جاتا۔ میرے کچھ بھانجے اور بھانجیوں کی ولادت ربوہ میں ہوئی۔ جب کبھی ایسا وقت آتا تو امی زچہّ کے پینے کے لیے ایک خاص پانی تیار کیا کرتی تھیں۔ اس کے لیے لوہے کا ایک بڑا باٹ جلتے ہوئے چولہے کے اندر رکھ دیا جاتا۔ ساتھ ہی ایک دیگچے میں پانی اُبلنے کے لیے رکھ دیا جاتا۔ جب باٹ تپ کر انگارے کی طرح سرخ ہو جاتا تو اُسے دیگچے میں ڈال کر اسے ڈھک دیا جاتا۔ لوہے کا یہ باٹ بہت دیر تک پانی کے اندر اُچھلتا رہتا اور جب تک بالکل ٹھنڈا نہ ہو جاتا یہ آواز آتی رہتی۔ بعد میں یہ باٹ نکال کر پانی کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کیا جاتا۔ یہی پانی زچہّ کو استعمال کرایا جاتا۔

اُس وقت تو مجھے اس طریقہ علاج کی حکمت سمجھ نہیں آتی تھی لیکن اب سوچتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پانی کو جراثیم سے پاک کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ دھکتے ہوئے باٹ سے پانی فوراً کھولنے لگتا اور اس طریقِ کار سے اُس کے بہت سے جراثیم مر جاتے ہوں گے۔ اُس کی دوسری حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوہا پانی میں اپنی تاثیر چھوڑ دے اور اُس میں ایک خاص قسم کی طاقت پیدا ہو جائے۔ غرض وجہ جو بھی تھی یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی تک حسبِ ضرورت یہی پانی زچہّ کو پلایا جاتا تھا اور میرا خیال ہے کہ اکثر گھروں میں یہی طریقہ رائج تھا۔

طبی سہولیات کے فقدان کے اس پسِ منظر میں جب فضل عمر ہسپتال کی بنیاد رکھی گئی تو اہلِ ربوہ کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب اس ہسپتال کی بنیاد رکھی گئی۔ چونکہ اس دور کے لحاظ سے یہ ایک رفیع الشان بلڈنگ ہونا تھی لہٰذا اس کی بنیادیں کافی گہری کھودی گئیں۔ ہسپتال کی مجوزہ عمارت اور انجمن کوارٹرز کے مابین صرف ایک سڑک ہی حائل تھی لہٰذا کوارٹروں کے باسیوں کے لیے ان بنیادوں نے ایک سیر گاہ کا درجہ حاصل کر لیا اور شام ہوتے ہی کوارٹروں کی خواتین اور بچے وہاں پہنچ جاتے۔ عورتوں کی ٹولیاں مٹی کے کسی ڈھیر پر بیٹھ کر خوش گپیوں میں محو ہو جاتیں اور بچے بنیادوں میں اتر کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگتے۔ چونکہ یہ بنیادیں ایک طرح کی بھول بھلیاں تھیں لہٰذا جب ہسپتال کی دیواریں بلند ہونے لگیں تو اہل محلّہ کی تفریح کا یہ ذریعہ ختم ہو گیا جس پر میں نے خود بعض خواتین کو کفِ افسوس ملتے دیکھا ہے۔

اس ہسپتال کے افتتاح کا منظر بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ عمارت جس کا سنگ بنیاد کم و بیش دو

سال پہلے رکھا گیا تھا اب مکمل ہو چکی تھی اور آج اس کا افتتاح ہونے جا رہا تھا۔ پہلے کی طرح اس موقع پر بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی یہاں تشریف لائے اور پُر سوز دعا کے ساتھ اس عمارت کا افتتاح فرمایا۔

اس حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا!

ہسپتال کے عملے میں ایک صاحب عبدالقیوم ڈسپنسر ہوا کرتے تھے۔ جب حضور ہسپتال کا افتتاح فرما چکے تو اِن سمیت ہسپتال کے عملے کے مختلف افراد ہاتھوں میں لڈوؤں کے تھال اُٹھائے ہوئے ایک کمرے سے باہر نکلے اور مجمع میں پھیل گئے۔ میرا خیال ہے انتظامیہ نے ان میں سے ہر آدمی کے سپرد حاضرین کا ایک حلقہ کر رکھا ہوگا اور انہیں ہدایت ہوگی کہ ہر شخص کو صرف ایک لڈو اٹھانے کا موقع دیا جائے لیکن انتظامیہ نے یہ بات بالکل نظر انداز کر دی کہ ہجوم کی ذہنیت فردِ واحد کی ذہنیت سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور اسے قابو میں رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ یوں بھی غالباً حاضرین کی اکثریت لڈو کھانے کے لیے بیتاب تھی لہٰذا انہوں نے امکاناً یہ سوچ کر کہ اگر وہ خاموشی سے لڈوؤں کا انتظار کرتے رہے تو کہیں ان سے بالکل محروم ہی نہ رہ جائیں لڈوؤں کے تھال میں سے چھینا جھپٹی شروع کر دی۔ عبدالقیوم نے کچھ دیر تک تو لڈو ہجوم کی دست برد سے بچانے کی کوشش کی اور تھال کو اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے ممکن حد تک اوپر اٹھائے رکھا لیکن بے قابو ہجوم نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہجوم لڈوؤں کے پیچھے ان کا جسم نوچنے سے بھی گریز نہیں کرے گا تو انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے ہوئے لڈوؤں کا تھال ان کے منہ پر دے مارا۔ لڈو ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر بکھر گئے جس کے بعد حاضرین نے موصوف کا پیچھا چھوڑ کر لڈوؤں پر یلغار کر دی اور جس کے ہاتھ جو لگا، اٹھا کر وہاں سے چلتا بنا۔

اگرچہ اب فضل عمر ہسپتال کا باضابطہ افتتاح ہو چکا تھا اور مریضوں کو قدرے بہتر طبی سہولیات ملنے لگی تھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ہسپتال میں میسر سہولتیں بس ایسی ہی تھیں اور پیچیدہ امراض کے علاج معالجہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ایمرجنسی کا شعبہ تو موجود تھا لیکن یہ شعبہ بالعموم کسی ڈسپنسر کے رحم و کرم پر رہتا جس کی وجہ سے پیچیدہ کیسوں میں فوری طبی امداد میسر آ سکتی نہ یہاں تعینات ڈاکٹر ان معاملات سے نمٹنے کے لئے ضروری مہارت رکھتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ابا جی کی اچانک بیماری نے مجھے ربوہ میں ناکافی طبی سہولیات کا پہلی بار بہت شدت سے احساس دلایا۔ ابا جی دفتر میں بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئے تھے۔ دراصل انہیں برین ہیمرج ہو گیا تھا جو اُن کے جسم کے بائیں حصے پر فالج پر منتج ہوا۔ انہیں دیکھنے کے لیے ڈاکٹر رشید احمد بلائے گئے جنہوں نے ان کے لیے فوری طور پر کچھ علاج تجویز کیا۔ میں کالج سے واپس آ رہا تھا کہ گول بازار کے قریب میرے ایک تایا زاد، نعیم نے مجھے اطلاع دی کہ ابا جی کو کچھ ہو گیا ہے لہٰذا مجھے فوراً ان کے دفتر پہنچنا چاہیے۔ مجھے ''کچھ ہونے'' کی سنگینی کا احساس ان کے دفتر پہنچ کر ہی ہوا۔ ان پر فالج کا حملہ ہوئے کئی گھنٹے گذر چکے تھے اور وہ اس وقت تک وہیں ایک چارپائی پر پڑے تھے۔ بعد میں وہ ایک تانگے پر لاد کر گھر منتقل کر دیئے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہسپتال میں اس نوعیت کے مریضوں کے علاج کا کوئی بندوبست نہیں ہوگا ورنہ انہیں گھر منتقل کرنے کا فیصلہ نہ کیا جاتا۔ صاحبزادہ مرزا منور احمد کم از کم دو بار

انہیں دیکھنے کے لیے گھر آئے، اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ابا جی کے علاج میں ردّ و بدل کیا اور ان کے لیے آکسیجن سلنڈر کا بھی انتظام کر دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں جس نگہداشت کی ضرورت تھی وہ میسر نہ آ سکی۔ گھر میں میرے اور میرے ماموں زاد، اسماعیل کے علاوہ ان کی تیمارداری کرنے والا اور کوئی نہ تھا لیکن ہماری موجودگی بھی عملاً بے معنی تھی کیوں کہ ہم جاگتے تو رہ سکتے تھے، ان کے لئے کچھ کر نہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی کی آخری رات بہت بے چینی اور تکلیف میں گذری لیکن اگلی صبح تک ان کا دماغ خدا کے فضل سے پورے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ کاغذ قلم منگوا کر اپنے لیے خود ہومیو پیتھک ادویہ تجویز کر رہے تھے اور مجھے ہدایت کر رہے تھے کہ بعض بزرگان کو دعا کی درخواست کی جائے لیکن اچانک ہسپتال سے محمد ظریف ڈسپنسر اور نعمت اللہ بھٹی، میل نرس پہنچ گئے اور ان کا لبر پنکچر کیا۔ میرے خیال میں وہ اس کام کے لیے مناسب طور پر تربیت یافتہ نہ تھے۔ اس پروسیجر جسے ایک بے بس انسان پر شدید ظلم ہی قرار دیا سکتا ہے کے بعد ابا جی کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی اور وہ چند گھنٹوں کے اندر اندر وفات پا گئے۔

کہتے ہیں جب مصیبتیں آتی ہیں اکٹھی آتی ہیں۔ آپی اُن دنوں اُمید سے تھیں اور ان کے ہاں پہلے بچے کی ولادت متوقع تھی۔ وہ یہ سارا وقت فضل عمر ہسپتال کے ساتھ رابطہ میں رہی تھیں لیکن آخری وقت پر انہیں بتایا گیا کہ بچے کی ولادت معمول کے مطابق ہوتی نظر نہیں آ رہی اور اس کے لیے سرجری کی ضرورت پیش آ سکتی ہے جس کی سہولت یہاں میسر نہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا، انہیں عالمِ مجبوری میں مانگے کی ایک جیپ پر فیصل آباد لے جایا گیا جہاں مشن ہسپتال میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی سے نوازا۔ ولادت معمول کے مطابق ہوئی چنانچہ انہوں نے ہمیں دوسرے یا تیسرے روز چھٹی دے دی لیکن یہاں پہنچ کر آپی کی ایک ٹانگ میں شدید درد رہنے لگا۔ ہم نے فضل عمر ہسپتال سے بہتیرا علاج کرایا لیکن آپی کی تکلیف میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ایک دن ڈاکٹر حشمت اللہ اچانک ہمارے گھر آ گئے۔ انہوں نے کسی سے آپی کی بیماری کا سُنا تو ابا جی کے ساتھ اپنے تعلقات کے پیشِ نظر رہ نہ سکے اور ''بن بلائے'' تشریف لے آئے۔ ہمارے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ حضرت مسیح موعود کا ایک جلیل القدر رفیق یوں ہمارے گھر میں رونق افروز ہو لہٰذا ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

آپی کو یہ واقعہ آج بھی پوری تفصیل سے یاد ہے۔ وہ بتاتی ہیں: میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے پاس پا کر حیران ہوئی، خوش بھی ہوئی اور ان کی ممنون بھی۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھے۔ ابا جی کی اچانک وفات پر افسوس کرتے رہے۔ مجھے تسلی بھی دیتے رہے اور مذاقاً کہنے لگے: ''ہم نے تمہاری شادی اس لیے تو نہ کی تھی کہ تم اتنی سخت بیمار ہو جاؤ۔''

انہوں نے یقیناً آپی کے لیے کچھ نہ کچھ علاج تجویز کیا ہو گا لیکن انہیں اس حوالے سے بار بار زحمت نہ دی جا سکتی تھی چنانچہ جب آپی کی تکلیف نا قابلِ برداشت ہو جاتی تو میں ملاّ کی دوڑ مسجد تک کے مصداق بھاگ کر اپنے محسن و مشفق، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کے پاس چلا جاتا اور وہ جو مشورہ دیتے اس کے مطابق عمل کیا جاتا۔

بلاآ خر ہم ان ہی کے مشورے پر آپی کو دوبارہ فیصل آباد لے گئے اور ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ اس ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، ڈاکٹر عبدالقادر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقادر ہمارے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے، انہوں نے آپی کے لیے ایک پرائیویٹ کمرے کا انتظام کر دیا اور ان کے تفصیلی معاینہ کے بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ انہیں ٹی بی ہے۔ انہوں نے آپی کو بیہوش کر کے ان کی ٹانگ سیدھی کرنے کے بعد اس پر پلستر لگا دیا اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ان کا علاج شروع کر دیا۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے آپی کو گھر آنے کی اجازت دے دی لیکن سچ پوچھیں تو ان کی تکلیف میں خاطر خواہ کمی کے آثار پیدا نہ ہو رہے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم بسا اوقات نیند کے چند چھوٹے چھوٹے وقفوں کو چھوڑتے ہوئے پوری پوری رات جاگ کر گذارتے، آپی کی مٹھی چاپی کرتے اور کچھ نہ بھی کر سکتے تو انہیں زبانی تسلی تشفی دینے کی کوشش کرتے۔

یہ پلستر دسمبر ۱۹۶۴ء کے آخر میں لگایا گیا تھا اور چار ماہ بعد اتارتے ہی دوبارہ دو ماہ کے لئے پھر لگا دیا گیا۔ اس علاج سے آپی کی تکلیف میں افاقہ تو ہو گیا تاہم وہ ابھی کھڑی نہ ہو سکتی تھیں اور بعض دفعہ ان کی ٹانگ نیلی پڑ جاتی چنانچہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ ایک بار ہمیں پھر اسی فرشتہ رحمت کے پاس لے گئے۔ اُس روز ان کی کوئی میٹنگ تھی لہٰذا وہ پہلے جتنا وقت نہ دے سکے۔ آج کے دور میں عام آدمی کے لئے کسی معروف ڈاکٹر سے وقت لینا کارِ دارد ہے اور پوری فیس کی ادائی کے بعد بھی مریض اس سے بے تکلفانہ گفتگو کی جرأت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ خط لکھ کر اس سے مشورہ طلب کیا جائے لیکن میں نے ربوہ پہنچتے ہی انہیں ایک تفصیلی خط لکھا۔ میں نے دبے لفظوں میں شکوہ کیا کہ وہ اس روز ہمیں پورا وقت نہ دے پائے تھے اور درخواست کی کہ وہ اس خط میں درج کیفیت کو مدِ نظر رکھ کر علاج تجویز فرما دیں۔ ان کی شرافت دیکھئے، انہوں نے میری کسی بات کا بُرا نہیں مانا اور فوراً مجھے جواب سے سرفراز فرمایا۔ ان کے اس خط میں جو ۸ جون ۱۹۶۵ء کا لکھا ہوا ہے تفصیلی نسخہ درج ہے اور یہ ہدایت بھی کہ مریضہ کو زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میں نے اس خط کا حوالہ صرف اس لئے دیا ہے تاکہ قارئین اندازہ کر سکیں کہ پرانے لوگ آپس میں کس درجہ اخلاص رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ڈاکٹر عبدالقادر سے کوئی واقفیت نہ رکھتا تھا لیکن انہوں نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کے ساتھ اپنے تعلق کی وجہ سے مجھے مایوس نہیں کیا۔

یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالقادر حضرت مسیح موعود کے رفیق قاری غلام مجتبیٰ المعروف ''چینی صاحب'' کے صاحبزادے اور ایک کامیاب و نیک نام ڈاکٹر تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی شرافت اور نیک دلی کی وجہ سے جس کا میں خود عینی شاہد ہوں خاص و عام میں مقبول تھے۔

کچھ سالوں کے بعد دشمنانِ احمدیت نے ان ہی ڈاکٹر عبدالقادر کو متاعِ زندگی سے محروم کر دیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے الفاظ میں اس واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے: ''۱۶ جون ۱۹۸۴ء کو دن کے تقریباً بارہ بجے پیپلز کالونی فیصل آباد میں آپ اپنی کوٹھی میں موجود تھے اور روزے سے تھے کہ ایک شخص نعیم اللہ ہاشمی

بیماری کے بہانے آپ کی کوٹھی پر آیا۔آپ نے اسے اندر بلایا۔اس نے پیٹ درد کی شکایت کی چنانچہ ڈاکٹر صاحب اسے دیکھنے کے لئے نیچے جھکے تو اس نے چھرے سے ان کے بازو پر ایک اور پیٹ میں دو وار کئے اور بھاگ گیا۔ان کا ملازم شور سن کر قاتل کے پیچھے بھاگا اور تھوڑی دور جا کر لوگوں کی مدد سے اسے پکڑ لیا اور پولیس کے حوالہ کر دیا۔ڈاکٹر صاحب کو زخمی حالت میں ہسپتال لایا گیا مگر زخم اتنے کاری تھے کہ آپ جانبر نہ ہوسکے اور ایک بجے کے قریب ہسپتال میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

آپی کی بیماری کے دوران لاہور میں ابا جی کے ایک مخلص دوست موجود تھے جو ڈاکٹر عبدالحمید چغتائی کے نام سے معروف تھے۔ وہ حضرت مسیح کے رفیق، حضرت حکیم محمد حسین المعروف مرہم عیسیٰ کے سب سے بڑے صاحبزادے اور میاں فیروز الدین جو اپنے زمانہ کے مشہور اور متمول ترین ٹھیکیدار، میاں محمد سلطان کے متبنیٰ تھے کے نواسے تھے۔انہیں خود بھی حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل رہا تھا۔کوالیفائیڈ ڈاکٹر تو نہ تھے لیکن طبِ یونانی پر دسترس اور ایلو پیتھک سسٹم آف میڈیسن سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے تھے اور اسی وجہ سے عوام الناس میں ڈاکٹر کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ان کی ابا جی کے ساتھ بہت پرانی دوستی تھی چنانچہ وہ ان کی وفات پر بہت آزردہ ہوئے اور ہمارا ہر ممکن خیال رکھا۔اس وضاحت کے ساتھ کہ وہ ابا جی کے ساتھ اپنے تعلقات کو دائمی شکل دینے کے خواہشمند ہیں اور اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مقصود نہیں،انہوں نے میرے لئے اپنی ایک پوتی کا رشتہ بھی تجویز کیا لیکن کسی وجہ سے اس تجویز کو عملی شکل نہ دی جا سکی۔یاد رہے اس وقت میں بی اے کا طالب علم تھا اور میرا مستقبل غیر یقینی تھا۔ایسے میں ان کی طرف سے اس رشتے کی پیشکش ان کے اخلاص کے علاوہ کسی اور بات کی مظہر نہ تھی۔ابا جی کی وفات کے بعد میری ان سے خط و کتابت رہی۔ میں انہیں آپی کی کیفیت تفصیلاً لکھتا رہا اور وہ اپنے فہم و فراست کے مطابق میری رہنمائی کرتے رہے۔

میں نے یہ بات پہلی بار ڈاکٹر عبدالحمید چغتائی ہی سے سنی تھی کہ سورۃ یٰسین کا ورد ازالہ مشکلات کے لیے بے حد مفید ہے۔انہوں نے بتایا تھا کہ بزرگان نے اس عمل کے لیے گیارہ، اکیس یا چالیس دن مقرر کئے ہیں جس دوران اللہ تعالیٰ بالعموم انسان کی مشکلات ٹلنے کے اسباب پیدا فرما دیتا ہے اور میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہ عمل بے حد مفید بلکہ نتیجہ خیز پایا۔

ڈاکٹر صاحب ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ اس طرح کے مریضوں کے لئے انگلینڈ کے بنے ہوئے سونے کے ٹیکے بھی انتہائی نفع رساں ہوتے ہیں اور یہ کہ اگر یہ ٹیکے ربوہ سے نہ ملیں تو لاہور یا کراچی سے ضرور مل جائیں گے۔لاہور میں کسی سے نہ ملے تو کراچی سے پتا کرایا گیا۔وہاں سے معلوم ہوا کہ کچھ عرصے سے یہ ٹیکے امپورٹ نہیں ہو رہے۔اس پر انہوں نے لکھا کہ طب یونانی میں اسی چیز کو ماء الذہب کا نام دیا گیا ہے جو گھر میں بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔

میں نے ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عبدالسلام زرگر سے سونے کا کچھ برادہ خریدا اور دوڑ بھاگ کر کے نائٹرک ایسڈ کا انتظام بھی کر لیا۔ایک ٹیسٹ ٹیوب میں برادہ ڈال کر اس پر یہ ایسڈ ڈال دیا۔ ٹیسٹ ٹیوب میں ایک وقتی سا اُبال آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ گیا۔ چوبیس (یا شاید اڑتالیس) گھنٹوں کے اندر

اندر برادہ تیزاب میں حل ہو چکا تھا۔ پھر سو گنا عرقِ گلاب لے کر اس میں یہ تیزاب ملا دیا تو ایک انتہائی خوش رنگ سنہری محلول تیار ہو گیا جس میں سے دو دو قطرے دن میں تین بار آپی کو دیئے جانے لگے۔
اب یقین سے کہنا مشکل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری کس کوشش کو بار آور کیا مگر آپی آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگیں۔ بالآخر پلستر اُتر گیا جس کے بعد لمبا عرصہ ٹانگ کی مالش کی جاتی رہی اور ایک دن ایسا بھی آ گیا جب وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخلہ لیا تو وہ بہت حد ٹھیک ہو چکی تھیں لہٰذا اس حوالے سے میرا وقت قدرے بےفکری سے گذرنے لگا۔ فرصت ہوتی تو میں ڈاکٹر عبدالحمید چغتائی سے ملاقات کے لئے ان کے گھر واقعہ ۶۸ سی ماڈل ٹاؤن چلا جاتا۔ وہ کثیر العیال تھے اور سخت عُسرت کی زندگی گذار رہے تھے۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو ان کی زندگی

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔
کسی زمانے میں ان کی رہائش بیت احمدیہ دلی دروازہ کے قریب تھی تاہم ۱۹۵۳ء میں بلوائیوں نے ان کا گھر نذرِ آتش کر دیا اور وہ بمشکل تمام اپنی جان بچا کر سخت کسمپرسی کے عالم میں اپنے ایک قریبی عزیز کے ہاں ماڈل ٹاؤن پہنچے۔ صاحبِ خانہ نے بکمالِ مہربانی انہیں اپنے ایک سرونٹ کوارٹر میں جگہ دے دی لیکن انہیں ہمیشہ اپنا گھر جلنے سے زیادہ اپنی لائبریری کے ضیاع کا افسوس رہا۔ ایک زمانہ بیت گیا لیکن وہ گردشِ دوراں کے اثر سے آزاد نہ ہو سکے اور ان کی باقی زندگی اسی سرونٹ کوارٹر میں گذر گئی۔ جنازہ بھی اُٹھا تو وہیں سے۔
مجھے یاد ہے کہ وہ نہ صرف خود اور ان کی اہلیہ بلکہ ان کے بچے بھی مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے اور مجھے اپنے گھر کا فرد سمجھتے۔ ڈاکٹر صاحب صاحبِ مطالعہ اور اباجی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ہماری ملاقاتوں کے دوران ان کی زبان پر زیادہ تر اباجی کا ہی ذکر رہتا۔ وہ اب اِس دنیا میں نہیں رہے لیکن میرے پاس اباجی کے نام ان کے بہت سے خطوط موجود ہیں جن میں ایک خاص ادبی چاشنی ہے۔ میں ان کے یہ خطوط پڑھتا ہوں تو مجھے ان کی محبت اور چاہت کے سارے واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب نے ان خطوط میں اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ان واقعات میں سے ایک کا تعلق بلوائیوں کے ہاتھوں ان کے گھر کی بربادی سے بھی ہے۔ یوں تو اس کا حوالہ تاریخ احمدیت جلد ۱۶ میں بھی موجود ہے لیکن ان کے ایک خط میں اس کی کسی قدر تفصیل موجود ہے جو یہاں برائے ریکارڈ نقل کی جا رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس ''غنڈہ گردی میں میرا گھر بھی لُٹ گیا، لائبریری نذرِ آتش ہو گئی، اثاثہ البیت میں سے راکھ بھی ہاتھ نہ آئی اور ہم بفضلہٖ تعالیٰ جانوں کو سلامت لے کر ماڈل ٹاؤن پہنچ گئے۔ یہ ایک پُر درد کہانی ہے کہ یہاں آ کر ہم پر کیا گذری۔ کوئی اپنا یا پرایا پُرسانِ حال نہ تھا۔ ہماری طرف کسی نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا نہ کسی نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُس وقت ایک دوست بڑی تکلیف سے کوٹھی کا نمبر پوچھتا پوچھتا پہنچ گیا۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری بیوی کو بلا کر کہا: آپا! ایسے صدمات سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ بھائی حمید ایک علم دوست آدمی

ہے۔اُس کی لائبریری کا نقصان اسے کہیں تکلیف میں نہ ڈال دے۔اس کا خاص خیال رکھنا اور یک صد روپیہ کا
نوٹ دے گیا۔پھر (ایک غیر از جماعت عزیز۔ناقل) فراست آ گیا۔اس نے ایک بات بڑی پتے کی کہی۔کہنے
لگا: تمہارے بہت سے رشتہ دار ہیں جو اس قابل ہیں کہ تمہاری مدد کر سکیں۔ان میں سے کسی کا امتحان نہ کرنا نہ ان کو
کسی طور پر پرکھنا۔یہ سب کم عیار نکلیں گے؛ کوئی معیار پر پورا نہ اُترے گا اور تمہارا ایمان لغزش کھائے گا اور ایک
صد روپیہ دے کر چلا گیا کہ اگر تم نے کسی سے ذکر بھی کیا کہ فراست نے سو روپیہ دیا ہے تو کبھی تمہارے پاس نہیں
آؤں گا۔غرض ہم نے سب سے پہلے چارپائیاں اور بستر خریدے اور اپنی بے بسی اور تنگ دستی پر خود ہی آنسو بہا
کر خاموش ہو گئے۔''

وہ اپنے اس خط میں جو اس واقعہ کے قریباً نو سال بعد ۱۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو لکھا گیا رقمطراز ہیں: ''اس مصیبت کے بعد میں تو ابھی تک سنبھل نہیں سکا۔ہاں اس حقیقت پر میری جبینِ نیاز درگاہِ باری تعالیٰ میں سجدہ ریز ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنے فضل سے ہمارے بال بچوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھا۔''

یہ تو تھا ڈاکٹر عبدالحمید چغتائی کا کچھ ذکر خیر۔اب میں اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ اباجی کی وفات اور آپی کی طویل بیماری کے بعد میرے لیے ایک بڑا حادثہ ماسی جی کی ناگہانی وفات تھی۔بظاہر ناکافی یا غلط علاج ان کی وفات کا سبب بنا جس کا مجھے آج بھی افسوس ہے۔

یہ جون ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔شدید گرمیوں کے دن تھے۔ میں، امی اور ماسی جی صحن میں سوئے ہوئے تھے۔اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ وہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے سمجھا کہ اپنی کسی ضرورت کے تحت جاگ رہی ہیں لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ وہ دبی دبی آواز میں کراہ بھی رہی ہیں تو میں اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہیں گھبراہٹ ہے۔اب تو اہلِ ربوہ بلکہ گردونواح کے لوگوں کے لیے امراضِ قلب کی تشخیص و علاج کے لیے طاہر ہارٹ انسٹی ٹیوٹ کی شکل میں جدید ترین سہولتوں سے مزیّن ایک ہسپتال موجود ہے لیکن اس زمانے کا ربوہ عملاً ایک گاؤں تھا جہاں رات تو رات، دن کے وقت بھی ڈاکٹر کا ملنا آسان نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ ہسپتال میں ڈاکٹر مرزا منور احمد کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعزیز سندھی اور ڈاکٹر محمد احمد بھی ہوا کرتے تھے لیکن رات کے اس سمے میری ان تک رسائی ممکن نہ تھی۔ دوسری طرف ماسی جی کی کیفیت مضطرب کر رہی تھی چنانچہ مجھے کچھ اور تو نہ سوجھا اور میں بھاگ کر عبدالحفیظ ڈسپنسر کو بلانے چلا گیا جو ہمارے گھر سے کچھ ہی دور رہائش پذیر تھے۔وہ بیچارے اٹھے اور فوری طور میرے ساتھ آ گئے۔ان کا فرسٹ ایڈ باکس سٹین لیس سٹیل کی ڈبیا میں بند شیشے کی ایک سرنج اور ایک ٹیکے پر مشتمل تھا۔انہوں نے آتے ہی وہ ٹیکا سرنج میں بھرا اور ماسی جی کو لگا دیا۔ ٹیکا لگتے ہی ماسی جی کی گھبراہٹ میں کمی ہو گئی۔ میں ان کی طبیعت میں بہتری کے آثار دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ عبدالحفیظ ڈسپنسر ان کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے ہیں۔ میں انہیں رخصت کر کے واپس آیا تو ماسی جی کی گھبراہٹ بالکل ختم ہو چکی تھی اور وہ بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے جسم کو

ہاتھ لگایا تو وہ بالکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ میں ڈر سا گیا تھا اور میرے دل میں ان کے بارے میں طرح طرح کے وہم آنے لگے۔ میں نے ان کا بازو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر چھوڑا تو وہ پتھر کی طرح نیچے گر گیا۔ تب مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس حقیقت پر یقین کرنا پڑا کہ وہ مالکِ حقیقی کے حضور حاضر ہو چکی ہیں۔

اگرچہ موت برحق ہے اور ہر کسی نے ایک نہ ایک دن اس کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن جس بیچارگی کے عالم میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوئیں اس کا مجھے آج تک دکھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو لگایا جانے والا ٹیکا اپنی میعاد پوری کر چکا تھا یا مریضہ کی تکلیف اس دوا کی بجائے کسی اور دوا کی متقاضی تھی۔ اگر ربوہ کے ہسپتال میں کچھ بہتر سہولتیں موجود ہوتیں تو شاید ان کی زندگی بچائی جا سکتی۔

آج میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے اور اس کے شعبہ ہائے تخصیص کا کوئی شمار ہی نہیں۔ بقول شاعر:

جسم کے حصے نہیں اتنے ہیں جتنے ڈاکٹر
ہڈی ، بوٹی کا الگ اور کھال، ختنے کا الگ
ایک ناک اور دو دو ماہر ابنِ آدم تیری شان
دائیں نتھنے کا الگ اور بائیں نتھنے کا الگ

اس کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب فضلِ عمر ہسپتال کی خدمات میں ماشاء اللہ خاصی وسعت آ چکی ہے اور یہاں پر ہر معروف شعبۂ طب کے ماہرین موجود ہیں۔ باقی کمی اندرون اور بیرونِ ملک مقیم وہ احمدی ڈاکٹرز پوری کر دیتے ہیں جو اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود وقتاً فوقتاً یہاں آ کر مریض دیکھتے ہیں۔

یہ تو ہے موجودہ صورتِ حال لیکن ۱۹۶۰ء کی دہائی تک اس ہسپتال میں ڈاکٹروں کی تعداد بہت محدود تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں ان میں سے بہتوں سے فیضیاب ہوا اور اپنے یا اپنے گھر کے کسی فرد کے علاج معالجے کے سلسلہ میں میرا ان سے رابطہ رہا۔

ان میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر ڈاکٹر حشمت اللہ کا!

خدمتِ خلقِ خدا تھا کام اُن کا صبح و شام

ڈاکٹر حشمت اللہ جنہیں حضرت مسیح موعود کی حیاتِ مبارکہ کے دوران بیعت کی سعادت حاصل ہوئی تھی فی الاصل پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں میڈیکل کالج، لاہور کے چار سالہ کورس میں داخلہ لیا اور یہاں سے فارغ ہوتے ہی ان کا تقرر پٹیالہ کے ایک ہسپتال میں ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثانی بیمار ہوئے تو وہ رخصت لے کر قادیان آئے لیکن اس سے اگلے ہی سال وہ مستقل طور پر یہاں منتقل ہو گئے۔ وہ ۲ فروری ۱۹۱۹ء کو نور ہسپتال، قادیان کے آفیسر انچارج مقرر ہوئے اور مسلسل پچیس سال اس عہدے پر فائز رہے۔ بعد میں وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے کُل وقتی ذاتی معالج مقرر ہو گئے اور اس حیثیت میں ان کا قیام قصر خلافت میں حضور کے کمرے کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۵ء میں حضور کی وفات تک جاری رہا۔

وہ ابا جی کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور ان دونوں کی ملاقات تقریباً روز کا معمول تھی لہٰذا ہمارے گھر میں ان کا کسی نہ کسی حوالے سے ذکر ہوتا رہتا تھا۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی قاتلانہ حملے کے بعد یورپ تشریف لے گئے تو آپ حضور کے ہمراہ تھے۔ واپسی پر وہ ابا جی کے لیے سوغات کے طور پر ایک بال پوائنٹ لے کر آئے۔ ممکن ہے یہ چیز ابا جی کے لئے بھی نئی ہو لیکن میرے لیے تو بہر حال نئی تھی کہ اس سے پہلے اس طرح کی کوئی چیز میرے مشاہدہ یا استعمال میں نہ آتی تھی لہٰذا یہ بال پوائنٹ دیکھ کر میرا جی للچا گیا۔ ابا جی نے بال پوائنٹ میں میری دلچسپی دیکھی تو مجھے دے دی چنانچہ میں نے یہ پنسل ابا جی کے ہومیو پیتھک ادویہ کے ایک ڈبے میں رکھ چھوڑی۔ کبھی جی مچلتا تو نکال کر اس سے چند لفظ لکھ لیتا اور دوبارہ اسے اپنی جگہ پر رکھ دیتا۔ آج کل کے بال پوائنٹ کے مقابلے میں یہ پنسل بہت اچھی بنی ہوئی تھی اور کئی سال تک میرے کام آتی رہی۔ کہا جا سکتا ہے کہ بال پوائنٹ سے میرا تعارف ڈاکٹر حشمت اللہ کی معرفت ہی ہوا۔

سکول اور کالج کے زمانہ میں آپی کے سر میں شدید درد رہتا تھا چنانچہ ابا جی انہیں گاہے بگاہے ڈاکٹر حشمت اللہ کے پاس بھی لے کر جایا کرتے تھے۔ آپی بتاتی ہیں: ڈاکٹر صاحب بڑی توجہ سے میری بات سنتے اور علاج تجویز کیا کرتے تھے۔

ابا جی نے اِنہیں اپنی تمام بیٹیوں کی شادی پر مدعو کیا۔ انہیں آپا کی شادی کا کارڈ ملا تو انہوں نے ایک خط لکھ کر ابا جی کو مبارکباد بھی دی اور پانچ روپے نقد تحفۃً پیش کیے۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے جب لوگ شادیوں کے موقع پر ایک روپیہ تک سلامی دے دیا کرتے تھے۔ انہوں نے آپی کی شادی کے موقع پر ایک مخملیں جائے نماز

بجھوائی۔ وہ میری تینوں بہنوں کی رخصتی کی تقاریب میں شامل ہوئے اور انہیں اپنی دعاؤں کے ساتھ الوداع کیا۔ موصوف نے ۱۹۶۷ء میں وفات پائی۔ صدیق امرتسری نے یہ اشعار اسی موقع کی مناسبت سے کہے تھے:

نیک طینت ، نیک سیرت ، باوفا و باصفا
لا جرم تھا قابلِ تقلید اُسوہ آپ کا
خدمتِ خلقِ خدا تھا کام ان کا صبح و شام
بس اسی میں ہی وہ رہتے تھے ہمیشہ شاد کام
ہو کے ہم سے یوں جدا مقصود اپنا پا گئے
آپ مر کر ہم کو رازِ زندگی سمجھا گئے
عہد جو باندھا مسیحِ پاک سے پورا کیا
احمدیت پر سبھی کچھ اپنا قرباں کر دیا

ڈاکٹر حشمت اللہ کے بعد جس ڈاکٹر کو اُس دور میں فضل عمر ہسپتال کی طویل ترین خدمت کا موقع ملا ان کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ میرا اشارہ ڈاکٹر مرزا منور احمد کی طرف ہے جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے صاحبزادے تھے۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرانے گریجوایٹ تھے جو ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ڈیڑھ سال تک گلینسی میڈیکل کالج امرتسر میں بطور ڈیمانسٹریٹر کام کرتے رہے۔ بعد میں انہوں نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی اور ان کا پہلا تقرر نور ہسپتال قادیان میں میڈیکل افسر کے طور پر ہوا۔ وہ ۱۹ مارچ ۱۹۵۹ء سے ہسپتال کے چیف میڈیکل آفیسر مقرر ہوئے اور مسلسل چوبیس سال تک اس عہدے پر مامور رہے۔ عام دستور کے مطابق صرف وہی مریض ان سے مشورے کے حقدار ہوتے جنہیں ماتحت ڈاکٹروں کے تجویز کردہ علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوتا۔ ایسے مریضوں کی تعداد اچھی خاصی ہوتی اور وہ سویرے سویرے چیف میڈیکل آفیسر کے کمرہ کے باہر ڈیرا ڈال دیتے۔ مرزا منور احمد عموماً ذرا تاخیر سے ہسپتال پہنچتے چنانچہ ان کی گاڑی کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی "میاں صاحب آگئے! میاں صاحب آگئے!" کا شور سا مچ جاتا اور مریض اپنی منزل قریب پا کر اطمینان کا سانس لیتے۔

میں نے میاں صاحب کو اپنی گاڑی پر اِدھر اُدھر آتے جاتے تو بہت دفعہ دیکھا اور ایک دو بار ان سے طبی مشورہ کے لیے امی کے ساتھ ہسپتال میں بھی حاضر ہوا لیکن مجھے ان کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ وہ ابا جی کی آخری بیماری کے دوران انہیں دیکھنے کے لیے چوبیس گھنٹے کے اندر دو بار غریب خانے پر تشریف لائے۔

اس ہسپتال کے ابتدائی ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر عبدالسمیع تھے جو جماعتِ احمدیہ انبالہ کے ایک مخلص کارکن، بابو عبدالغنی انبالوی کے صاحبزادے اور تعلیم الاسلام کالج میں ریاضی کے استاد، عبدالرشید غنی کے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنی پیشہ وارانہ تعلیم کا آغاز امرتسر کے میڈیکل سکول سے کیا تھا تاہم ایم بی بی ایس قیامِ پاکستان کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے کیا۔ ڈاکٹر عبدالسمیع نے کچھ عرصہ نور ہسپتال میں گذارا لیکن پھر سرکاری ملازمت اختیار

کر لی جس دوران ان کا زیادہ وقت بلوچستان میں گزرا اگرچہ وہ اپنی ملازمت کے آخری سالوں میں لاہور آ گئے
تھے۔انہوں نے اگست ۱۹۹۵ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔
ان کے صاحبزادے، آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر عبداللطیف سمیع بتایا کرتے ہیں کہ ان کے والدِ بزرگوار
نے احمدی ہونے کی وجہ سے ملازمت کے دوران ہر جگہ تکلیف اُٹھائی۔۱۹۷۴ء میں بعض غنڈہ عناصر نے ان پر
سخت جسمانی تشدد کیا تاہم اللہ تعالیٰ نے انہیں استقامت بخشی اور ان کی جان بھی محفوظ رکھی۔ڈاکٹر لطیف کے
نزدیک اُن کے والدِ بزرگوار کی بہت سی خوبیوں میں سے اللہ تعالیٰ پر ان کا غیر متزلزل ایمان، دعا پر ان کا یقینِ
کامل، احمدیت کے ساتھ ان کا اخلاص، خدمتِ خلق اور حقوق العباد کی ادائی شامل ہے۔

ڈاکٹر عبدالسمیع کا تعلیمی ریکارڈ خاصا عمدہ تھا لیکن وہ اپنی ذاتی مجبوریوں کے سبب اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک
سے باہر نہ جا سکے جس کا انہیں ہمیشہ افسوس رہا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش ایک اور شکل میں پوری فرما دی۔
ان کی صاحبزادی، ڈاکٹر امتہ المصوّر کے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۲ فروری ۲۰۰۷ء) کے مطابق ان کی ایک بہن،
امتہ الرزّاق سمیع ایم بی بی ایس کے فائنل امتحان میں چھ طلائی تمغوں کی مستحق قرار پائیں۔فاطمہ جناح میڈیکل کالج
کے جس کانووکیشن میں انہیں یہ تمغے عطا کئے جانے تھے اُس میں ڈاکٹر عبدالسمیع اور ان کی اہلیہ بھی بطور مہمان مدعو
تھے۔کانووکیشن کے مہمانِ خصوصی، وزیر اعظم پاکستان امتہ الرزّاق سمیع کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوئے اور کہا
کہ وہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے حکومتی خرچ پر باہر بھجوائیں گے۔اس پر ڈاکٹر عبدالسمیع نے کھڑے ہو کر بتایا کہ اس بچی
کا داخلہ پہلے ہی کنگز کالج، لندن میں ہو چکا ہے اور وہ عنقریب برطانیہ روانہ ہونے والی ہے۔امتہ المصوّر لکھتی ہیں
کہ جب امتہ الرزّاق نے ایڈنبرا اور گلاسگو سے ایف آر سی ایس کا امتحان پاس کر لیا اور اپنے والدِ بزرگوار کو فون پر اپنی
کامیابی کی اطلاع دی تو وہ فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہو گئے اور انہوں نے برجستہ کہا: ''مجھے آج ایسے محسوس ہو رہا ہے
گویا میں نے خود ایف آر سی ایس کر لیا ہو۔''

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر عبدالسمیع کے دو بیٹے اور آٹھ بیٹیاں ڈاکٹر بنیں جب کہ ایک بیٹا
انجینئر اور ایک بیٹی کمپیوٹر پروگرامر ہے۔

ایک اور ڈاکٹر جنہیں ابتدائے ربوہ میں اس جماعتی ہسپتال میں خدمت کا موقع ملا ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر
تھے۔وہ حضرت مولانا عبدالماجد بھاگلپوری کے پوتے اور پروفیسر سید عبدالقادر کے صاحبزادے تھے۔وہ پٹنہ میڈیکل
کالج کے گریجوایٹ تھے اور کچھ عرصہ پاکستان آرمی میں بھی رہے۔حضرت مصلح موعود کے مشورہ سے آنکھوں کی امراض
میں تخصیص حاصل کی اور اس حیثیت میں اتنی شہرت پائی کہ دور دور سے آنے والے بگڑے ہوئے کیس ان کے ہاتھ
سے شفا پانے لگے۔انہوں نے بیس سال تک لیاقت میڈیکل کالج میں بطور پروفیسر تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔
انتہائی مخلص اور جوشیلے احمدی تھے۔۱۹۸۵ء کی ایک سہ پہر وہ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو وہیں کہیں
چھپے ہوئے دو افراد نے ان کی گردن پر چاقو کے پے در پے وار کئے۔انہوں نے کار کا ہارن بجایا تو قاتل
بھاگ گئے۔وہ ہمت کر کے خود کار چلا کر قریبی ہسپتال پہنچے لیکن اس وقت تک ان کا بہت خون ضائع چکا تھا

جس کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے اس بہیمانہ قتل کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے ایک خطبہ جمعہ میں جماعت کو سمجھایا کہ اس قتل و غارت کے ’’نتیجہ میں وہ پاکیزہ لوگ اور وہ پیارے وجود پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں جو دراصل پاکستان کی بقا کے ذمہ دار ہیں۔ ایسے وجود ہیں کہ جن پر خدا کی رحمت کی نظر پڑتی ہے تو باقی لوگ بھی بخشے جایا کرتے ہیں۔‘‘

وہ ڈاکٹر جو سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد سلسلے کی خدمت کے ارادے سے یہاں آئے ان میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ سرفہرست ہیں۔ انہوں نے امرتسر کے میڈیکل سکول سے گریجوایشن کر رکھی تھی اور وہ قیامِ پاکستان کے وقت میو ہسپتال میں تعینات تھے۔ جب ربوہ کی آبادکاری شروع ہوئی تو انہوں نے مرکز سے قرب کی خواہش میں کوشش کر کے اپنی تبدیلی لالیاں کرالی۔ یہی نہیں بلکہ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ارشاد پر ۱۹۵۴ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ربوہ آ گئے اور کچھ عرصہ ڈاکٹر حشمت اللہ کے ہمراہ حضور کے ذاتی معالج کے فرائض انجام دیتے رہے چنانچہ میرے پاس حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اور آپ کے قریبی احباب کی ایک تصویر موجود ہے جو ۲۰ ستمبر ۱۹۵۶ء کو حضرت سید احمد شہید بریلوی کے مزار واقع بالاکوٹ پر کھینچی گئی تھی۔ اس تصویر میں ابا جی، ڈاکٹر حشمت اللہ، میاں غلام محمد اختر، عبدالرحمٰن انور، عبداللطیف خان نتھا، قاضی محمد یوسف امیر جماعت ہائے احمدیہ صوبہ سرحد اور بہت سے دوسروں کے علاوہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ بھی موجود ہیں۔

میری معلومات کے مطابق یہ سلسلہ بوجوہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور وہ جلد ہی ان دونوں ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئے۔

وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے معتمد ساتھیوں میں سے تھے۔ اس حوالے سے ابا جی کی ڈائری میں ۷ مئی ۱۹۵۶ء کا مری میں لکھا ہوا یہ نوٹ قابلِ توجہ ہے: ’’آج میں، مولوی نورالحق صاحب اور مکرمی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب مولانا ظفر علی خان صاحب سے ملنے کے لئے گئے۔ مولوی ظفر علی خان نے حضرت (خلیفۃ المسیح الثانی) ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی نوازشات کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے بالائے طاق نہیں رکھا۔ ساتھ ہی کہا کہ میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کر دیا جائے۔‘‘

موصوف فضلِ عمر ہسپتال میں بھی کام کرتے رہے۔ الفضل نے ان کی وفات پر ان کی خدمات دینیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: ’’محترم ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت ہی نیک، عابد، زاہد اور حضرت مصلح موعود کے ساتھ بالخصوص محبت و عقیدت کا غیر معمولی عاشقانہ اور فدائیانہ............ تعلق رکھتے تھے۔ عمر بھر سلسلہ کی خدمت کو ہر کام پر مقدم رکھا......‘‘

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خود ذکر کیا کرتے تھے کہ چوہدری فضل الٰہی جو اُن دنوں پاکستان کے صدر تھے ان کے ذاتی دوستوں میں سے ہیں اور وہ بذریعہ خط انہیں احمدیت کا پیغام پہنچاتے رہتے ہیں۔ اسی پس منظر میں جب ان کے داماد، شیخ ناصر احمد خالد نے جو اُن دنوں حبیب بنک میں آڈٹ آفیسر ہوا کرتے تھے چوہدری فضل الٰہی کو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی وفات کی اطلاع دی تو اِن کی طرف سے فوراً تعزیتی خط موصول ہوا۔ اس خط سے اندازہ

ہوتا ہے کہ چوہدری فضل الٰہی کی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گونہ بے تکلفی اور ان کے خانگی حالات سے پوری واقفیت تھی۔ چوہدری فضل الٰہی نے صدرِ پاکستان کی حیثیت میں اپنے ۲۱ نومبر ۱۹۷۷ء کے اس خط میں جو ''ڈیر ناصر! السلام علیکم! کے الفاظ سے شروع ہوتا تھا لکھا ہے:

''مجھے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کی اچانک وفات کا سُن کر دلی صدمہ ہوا ہے۔ مرحوم سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ وہ ایک بے لوث اور مخلص انسان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی پیرانہ سالی میں ان کے بھائی اور جواں سال بیٹی کا وفات پا جانا ان کے لئے شدید صدمات تھے۔ ان اموات کا ان کے ذہن پر جو کرب اور بوجھ ہوا ہوگا اس کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات سے ایک بزرگ ہستی جو آپ کے لئے دعا و برکت کا سرچشمہ تھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئی لیکن مشیتِ ایزدی میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ میری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور غم زدہ خاندان کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ کا مخلص

(دستخط)

فضل الٰہی چوہدری''

اس خط میں مرحوم کے ایک بھائی اور بیٹی کی وفات کا ذکر ہے۔ ''بھائی'' سے مراد چوہدری غلام مرتضیٰ، وکیل القانون، تحریک جدید انجمن احمدیہ ہیں جو مرحوم سے چند سال پہلے وفات پا گئے تھے جب کہ ''بیٹی'' سے مراد حبیبہ اہلیہ عزیز احمد مقیم لندن ہیں جو بعارضہ کینسر وفات پا گئی تھیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی طرح کیپٹن ڈاکٹر محمد رمضان کو بھی کم و بیش تین سال اس ہسپتال میں خدمت کا موقع ملا۔ وہ قادیان کے ایک قریبی گاؤں سری گوبند پور کے رہنے والے تھے اور انہوں نے ابتدائی تعلیم قادیان میں حاصل کی تھی اور اسی دوران اپنے ایک خواب کی بنا پر احمدیت قبول کر لی۔

وہ ایل ایس ایم ایف کا امتحان پاس کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۵۳ء کے آخر میں ربوہ آ گئے اور نور ہسپتال میں آنریری طور پر خدمت سرانجام دینے لگے تاہم تین ہی سال بعد فالج کے شدید حملے کی وجہ سے صاحبِ فراش ہو گئے اور ایک طویل عرصہ اس بیماری میں گذارنے کے بعد جون ۱۹۷۶ء میں وفات پا گئے۔

مرحوم نے محلہ دارالصدر غربی میں ایک وسیع پلاٹ پر اپنا مکان تعمیر کر رکھا تھا۔ اس پلاٹ کے گرد پتھروں کی چھوٹی چھوٹی چار دیواری تھی جس کا بہت سا حصہ وقت کے ساتھ ساتھ منہدم ہو گیا تھا اور خالی جگہوں کو خاردار جھاڑیوں کی مدد سے پُر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پلاٹ کا معتدبہ حصہ خالی پڑا تھا اور تعمیر شدہ مکان اس کے آخری سرے پر تھا۔

مجھے ان کی صحت کا زمانہ تو یاد نہیں لیکن ان کی علالت کے دوران دو یا تین بار ان کے گھر جا کر ان سے ملنا یاد ہے۔ فالج نے ان کی نقل وحرکت محدود کر رکھی تھی اور میں نے انہیں ہر بار کرسی یا ویل چیئر پر ہی بیٹھے پایا۔

انہوں نے ابا جی کی وفات پر میرے نام اپنے تعزیتی خط میں لکھا: ''درحقیقت انہوں نے اپنی جان عزیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر کے شہادت کا رتبہ حاصل کیا ہے۔'' انہوں نے چچا ابراہیم کے نام بھی افسوس کا ایک خط لکھا جس میں انہوں نے ابا جی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: ''آپ مرحوم جیسے کام کرنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ میں تو اکثر حضور کی تفسیر کبیر اور تقاریر کے بارہ میں آپ کو لکھتا رہتا تھا۔''

وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ انہوں نے ابا جی کی وفات پر چچا ابراہیم کی معرفت اپنی ایک نظم المنار میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی جو معلوم نہیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو پائی یا نہیں۔

مرحوم بہت نیک انسان تھے۔ ان کے صاحبزادے رفیق احمد نے الفضل میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے کہ دورانِ ملازمت ایک بار ساؤتھ افریقہ سے مریضوں کے دو جہاز فرانس کی کسی بندرگاہ کے لیے روانہ ہوئے اور راستہ میں مشرقی افریقہ کی کسی بندرگاہ پر تیل لینے کے لیے رُکے۔ وہاں سے روانگی کے وقت کسی وجہ سے دوسرے جہاز کے انچارج ڈاکٹر کو ان کے جہاز پر بھیج دیا گیا اور دوسرا جہاز ان کے سپرد کر دیا گیا۔ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ دشمن کے بمبار طیارے آن پہنچے۔ مصیبت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر ڈاکٹر صاحب اپنے کیبن میں جا کر اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرنے لگے۔ جب باہر نکلے تو اِن کا جہاز بالکل محفوظ تھا لیکن دوسرا بحری جہاز جو تین چار میل پیچھے تھا آگ لگنے کے بعد ڈوب رہا تھا۔ رفیق احمد کے الفاظ میں ''جنگ ختم ہونے کے بعد کئی افسر جو دشمنوں کی بمباری کے دوران بھی ابا جان کی عبادت گذاری اور کلبوں کی محفلوں میں شراب کی بجائے جوس وغیرہ کا گلاس ہاتھ میں پکڑنے کا مذاق اُڑایا کرتے تھے ان کے پاس آئے اور معذرت سے اقرار کرنے لگے کہ ڈاکٹر رمضان! ہمارا دل کہتا ہے کہ اگر تم ہمراہ نہ ہوتے تو آج ہم سمندر کی تہ میں یا کسی اجتماعی قبر میں سڑ رہے ہوتے۔''

موصوف نے اپنی اہلیہ اول میں سے ایک بیٹی اور اہلیہ ثانی میں سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑا۔ اہلیہ ثانی کی اولاد میں سے بڑی بیٹی، بشریٰ رمضان آپی کی ہم جماعت تھیں جو بعد میں مرزا ناصر احمد حال مقیم کینیڈا سے بیاہی گئیں۔ دوسری بیٹی طاہرہ صادقہ کی ہم جماعت تھیں اور ان کی شادی قریشی نور الحق تنویر کے ساتھ ہوئی۔ رہے صاحبزادے تو وہ مدت ہوئی کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد رمضان کے بعد اب کچھ باتیں ڈاکٹر ضیاء الدین کے بارے میں جو میرے سکول کے آخری زمانے میں فضل عمر ہسپتال کے سٹاف میں شامل ہوئے تھے۔ ان کا تعلق کھاریاں کے ایک مخلص احمدی خاندان سے تھا اور ان کے دادا حضرت مولوی فضل دین حضرت مسیح موعود کے تین سو تیرہ رفقا میں سے تھے۔ یہ تو خیر ان کا خاندانی پس منظر تھا۔ جہاں تک اُن کی اپنی ذات کا تعلق ہے انہوں نے ریڈیالوجی میں تخصیص حاصل کی اور وہ پانچ چھ سال اس ہسپتال میں رہے۔ ابا جی کبھی ہسپتال سے ہو کر آتے تو ان کا بہت محبت و احترام سے ذکر کرتے۔

وہ جلد ہی فصلِ عمر ہسپتال چھوڑ کر چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ جماعت کی طرف سے نائیجیریا بھجوا دیئے گئے ہیں جہاں انہوں نے کانو میں کلینک قائم کیا ہے۔ یہی کلینک آہستہ آہستہ ایک ہسپتال کی شکل اختیار کر گیا اور اس کی وجہ سے اس ملک میں احمدیت کو بہت نیک نامی حاصل ہوئی۔

جن لوگوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو کام کرتے دیکھا ہے وہ شاہد ہیں کہ انہیں دعا پر کتنا یقین تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں کس قدر شفا رکھی تھی اور انہیں ان کی ذاتی خوبیوں اور احمدیت کی برکت کی وجہ سے نائیجیریا کے حکومتی اور سیاسی حلقوں میں کس قدر رسائی حاصل تھی۔

مخلص اور معروف احمدی، اے سٹیزن آف ٹو ورلڈز نامی کتاب کے مصنف اور اِنڈس وَیلی کنسٹرکشن کمپنی کے مدارُالمہام، کرنل ڈاکٹر عطاء اللہ کو ۱۹۷۵ء میں نائیجیریا میں ڈِرلنگ کے بعض ٹھیکے ملنے کی توقع پیدا ہوئی تو وہ اپنے صاحبزادے، میجر شاہد عطاء اللہ کے ہمراہ تقریباً ڈیڑھ سال وہاں مقیم رہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے دمِ رخصت انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ وہاں جا کر ڈاکٹر ضیاء الدین سے رابطہ رکھیں اور ضروری ہو تو ان ہی کے پاس قیام کریں۔ اگرچہ کرنل عطاء اللہ اور ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ضیاء الدین پر بار نہیں بننا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے وہاں پہنچتے ہی اپنی رہائش کے لیے ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا لیکن جب نائیجیریا کے سیاسی حالات میں اچانک بعض تبدیلیاں آ گئیں اور ٹھیکہ جات کی تکمیل میں غیر متوقع طور پر دقتیں پیش آنے لگیں تو وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی خواہش پر بمع اہل و عیال ان کے ہاں منتقل ہو گئے اور انہوں نے احمدیہ ہاسپٹل، کانو کے فرسٹ فلور پر جو اُن دنوں خالی پڑا تھا رہائش اختیار کر لی۔ یوں انہیں ڈاکٹر ضیاء الدین کو کئی مہینے تک بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

شاہد عطا اللہ جو میرے کرم فرماؤں میں سے ہیں بتاتے ہیں: ''ڈاکٹر ضیاء الدین انتہائی مخلص احمدی تھے۔ وہ اپنے دن کا آغاز ہمیشہ دعا سے کرتے جس کے لیے کانو کے امیر جماعت بلاناغہ صبح آٹھ بجے ہسپتال تشریف لایا کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر ضیاء الدین کے ہاتھ میں بے حد شفا رکھی تھی چنانچہ دُور و نزدیک سے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے تھے۔ یوں بھی رجسٹریشن فیس انتہائی معمولی تھی جس کی وجہ سے ان کے پاس زیادہ تر غریب اور متوسط طبقے کے مریض آتے تھے تاہم اس ہسپتال کی شہرت کی وجہ سے ضرورت پڑنے پر سرکاری افسران اور سیاسی شخصیتیں بھی سرکاری ہسپتال کی بجائے ادھر ہی کا رُخ کرتیں اور ہمیشہ مطمئن و مسرور واپس جاتیں۔''

''میں آپ کو ایک اہم بات بتاؤں'' شاہد عطاء اللہ کی گفتگو جاری تھی ''احمدیہ ہسپتال میں مریضوں کو ٹوکن جاری ہوتے اور کسی کو باری کے بغیر نہ دیکھا جاتا۔ ایک بار جب میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے پاس بیٹھا ہوا تھا ایک افریقی جو اپنی وضع قطع سے کوئی اہم آدمی معلوم ہوتا تھا اچانک اندر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ وزیر ہے اور طبی مشورہ کے لیے آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے بتایا کہ وہ ٹوکن کے بغیر کسی مریض کو نہیں دیکھتے۔ ہاں! اگر کوئی مریض کی وجہ سے کسی خاص وقت پر ہی ہسپتال آ سکتا ہو تو اسے پیشگی فون کر کے انتظامیہ سے وقت لے لینا چاہیے تا کہ

اسے کوئی وقت ہو نہ پہلے سے آئے ہوئے مریضوں کو شکایت۔ وزیر بھی کوئی شریف آدمی تھا چنانچہ وہ کسی منفی ردعمل کے اظہار کے بغیر واپس چلا گیا۔''

ڈاکٹر ضیاء الدین کے امیر کانو کے ساتھ بہت قریبی تعلقات تھے۔ شاہد عطاء اللہ کا کہنا ہے:''ہماری کچھ مشینری بندرگاہ پر آئی پڑی تھی لیکن کسٹمز والوں نے اسے روک رکھا تھا۔ وہ ہماری بات سننے کو بھی تیار نہ تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں نے ڈاکٹر ضیاء الدین سے بات کی تو انہوں نے میرے بیٹھے بیٹھے امیر کانو سے فون پر بات کر کے ان سے مدد کی درخواست کی۔ امیر کانو نے انہیں اگلی صبح ملاقات کے لیے وقت دے دیا۔ ہم دونوں ان کے پاس حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ معاملہ ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے اور اس کے لیے ہمیں مرکزی وزیر خزانہ کے پاس جانا ہوگا۔ تب انہوں نے خود ہی ذکر کیا کہ وہ اگلے روز لیگوس جا رہے ہیں لہٰذا اگر میں وہاں ان سے مل لوں تو وہ متعلقہ حکام سے کہہ دیں گے۔ میں طے شدہ پروگرام کے مطابق لیگوس پہنچ گیا۔ امیر کانو سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے درخواست لے لی اور وزیر خزانہ سے فون پر کہا: مجھے علم نہیں کہ اس کام کی نوعیت کیا ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے لیکن چونکہ میرے ایک بہت عزیز دوست نے مجھ سے سفارش کی ہے لہٰذا تم نے یہ کام بہر صورت کرنا ہے۔ وزیر خزانہ نے مجھے اسی وقت اپنے پاس بلا لیا اور کسٹمز چیف سے فون پر کہا کہ قانون جو مرضی کہتا رہے، تم نے یہ کام کر کے مجھے آج ہی رپورٹ کرنی ہے۔''

اس واقعہ کی مزید تفصیلات شاہد عطاء اللہ ہی کی زبانی سنیئے:''میں کسٹمز چیف کے پاس پہنچا تو وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اسی وقت متعلقہ اہلکاروں کو طلب کیا اور دفتر بند ہونے سے پہلے پہلے میرا کام کرا دیا۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب کچھ ڈاکٹر ضیاء الدین کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے ہوا جس پر آج بھی میرے دل سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔''

شاہد عطاء اللہ اور ان کے والد بزرگوار ایک لمبا عرصہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے مہمان بن کر رہے۔ وہ برملا تسلیم کرتے ہیں کہ''ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کی بیگم نے ہمارے آرام کا ہر ممکن خیال رکھا اور ہمیں احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم ان پر کسی طرح کا بوجھ ہیں۔ یہ ان کا ہم پر اتنا بڑا احسان ہے جس کا بدلہ اُتارا ہی نہیں جا سکتا۔''

جب ڈاکٹر ضیاء الدین کی وفات کا ذکر ہوا تو شاہد عطاء اللہ نے بتایا:''ڈاکٹر صاحب کو دمے کی پرانی شکایت تو تھی ہی لیکن ان کی وفات ہارٹ اٹیک سے ہوئی۔ جنازہ نائیجیریا سے ربوہ لایا گیا اور ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔''

یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ذاتی طور پر بھی ڈاکٹر ضیاء الدین کی خدمات دینیہ کے معترف تھے اور یہ بات جماعتی ریکارڈ پر موجود ہے۔ ان کی وفات پر مجلس تحریک جدید کی تعزیتی قرارداد مطبوعہ الفضل کے مطابق''جب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وصیت کی فائل حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پیش کی گئی تو...... حضور نے فرمایا:''ان کی خدمات دینی ظاہراً بہت سے موصیان سے افضل ہیں۔ شاید صرف اسی وجہ سے بلا وصیت بہشتی مقبرہ میں تدفین کا حق ہو جاتا۔''

ایک اور ڈاکٹر جنہیں دو عشروں سے زیادہ اس ہسپتال میں خدمت کا موقع ملا ڈاکٹر محمد احمد کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ ڈاکٹر حشمت اللہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کی رہائش انجمن کوارٹرز میں ہی تھی اس لیے ہسپتال کے علاوہ گھر سے بازار یا کسی اور کام سے ادھر اُدھر آتے جاتے بھی نظر آ جاتے۔ یہ نہیں کہ میری ان سے کوئی بے تکلفی تھی لیکن انہیں دیکھ کر ایک منکسر المزاج اور درویش صفت انسان کا تصور ابھرتا۔ زندگی کے آخری چند سالوں میں ان کی قریب کی بینائی متاثر ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ بسا اوقات اپنی ہی تجویز کی ہوئی کسی دوا کے اوپر دوسری دوا لکھ دیتے۔ اس سے لکھے موسیٰ پڑھے خدا والا معاملہ ہو جاتا اور دیکھنے والوں کو تفننِ طبع کا موقع بھی مل جاتا لیکن

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

کے مصداق ہسپتال میں ادویہ کی تقسیم پر مامور کارکن یہ نسخہ بہ آسانی پڑھ لیتا۔

ڈاکٹر محمد احمد نے حیدر آباد کے میڈیکل سکول سے چار سالہ کورس کے بعد بمبئی یونیورسٹی سے ایل سی پی ایس کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ شروع میں قادیان اور لاہور میں پرائیویٹ پریکٹس کرتے رہے اور کچھ عرصہ ریلوے میں بھی ملازمت کی لیکن ۱۹۵۷ء میں مستقل طور پر ربوہ آ گئے اور اگلے بائیس سال تک یہیں خدمت بجالاتے رہے۔ ایک ہی محلہ کے رہائشی ہونے کے ناطے ان کے ایک بیٹے مبشر احمد کے ساتھ ہماری اچھی جان پہچان تھی۔ وہ بعد میں پاکستان نیوی میں چلے گئے تھے لیکن اب عرصہ دراز سے جرمنی منتقل ہو چکے ہیں۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں فضل عمر ہسپتال میں عبدالعزیز نام کے ایک ڈاکٹر آئے جنہیں عام طور پر ڈاکٹر عبدالعزیز سندھی کہا جاتا تھا۔ معلوم ہوا کہ صوبہ سندھ میں تکمیل ملازمت کے بعد یہاں تشریف لائے ہیں۔ انہیں اپنی رہائش کے لیے ہسپتال کے اندر مکان ملا ہوا تھا اور وہ بطور فزیشین اس ہسپتال کے ساتھ منسلک ہوئے تھے۔

میں جب بھی ہسپتال جاتا تو وہ آؤٹ ڈور میں موجود ہوتے اور شفقت سے پیش آتے۔ ابا جی صدر انجمن احمدیہ کے ملازم تھے لہٰذا ہمارا خاندان مفت طبی سہولت کا حقدار تھا چنانچہ ڈاکٹر عبدالعزیز سٹاک میں موجود ادویات میں سے کوئی دوا تجویز کرنے سے نہ ہچکچاتے اور اگر کوئی دوا زیادہ مہنگی ہونے کی وجہ سے موجود نہ ہوتی تو صاف معذرت کر لیتے۔ ایک ہی محلہ میں رہائش کے سبب آہستہ آہستہ ہماری بے تکلفی ہو گئی، بس اتنی ہی جتنی ان کے اور میرے مابین ہو سکتی تھی چنانچہ میں ضرورت پر مشورے کے لیے ان کے گھر بھی جانے لگا۔ کنڈی کھٹکھٹاتا تو وہ فوراً باہر آ جاتے اور برآمدے میں کھڑے کھڑے ضروری مشورے سے سرفراز فرما دیتے۔

سندھی ہونے کے ناطے ان کا اردو لب و لہجہ مروجہ لہجے سے ذرا مختلف تو ضرور تھا لیکن ان کی زبان میں چاشنی تھی اور خلوصِ نیت ان کے چہرے سے عیاں ہوتا۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کی شخصیت کے اُن پہلوؤں میں سے جو اُن کی زندگی میں کم از کم مجھ سے مخفی رہے ایک کا تعلق احمدیت سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایک غیر از جماعت گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن ہندوستان سے عدن کے

ایک سفر کے دوران ایک احمدی، ڈاکٹر حاجی خان کے ذریعہ احمدیت سے متعارف ہوئے اور عدن میں قیام کے دوران پوری تحقیق کے بعد بیعت سے مشرف ہوئے۔ ایک اہم بات جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے اُن کا احمدیت پر غیر متزلزل ایمان اور اس کے نتیجہ میں غیر معمولی روحانی فیوض کا حصول ہے۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری ''نشانِ کبیر'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کس طرح قدم قدم پر ان کی تائید ونصرت کے نشانات ظاہر فرمائے اور ان کے لئے غیر ممکن کو ممکن میں بدل دیا۔ اس کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر عبدالعزیز کے داماد اور اُن دنوں امیر جماعتِ احمدیہ بیلجیئم، سید حامد محمود کے نام حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کا ایک خط محرّرہ ۳۰ جنوری ۲۰۰۱ء شائع ہوا ہے۔ اس خط میں حضور نے ڈاکٹر صاحب کو بہت نیک اور خدا ترس انسان قرار دیا ہے اور انٹ وَرْپَن مشن ہاؤس کا نام اُن ہی کے نام پر رکھا ہے۔

ان کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو اُن کا علمی تبحر تھا۔ وہ بعد میں آئے لیکن بہتوں سے آگے نکل گئے۔ ان کی وفات پر الفضل میں چھپنے والے ایک مضمون سے پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تالیف وتصنیف کا ملکہ عطا کر رکھا تھا چنانچہ انہوں نے ''دجال اور ابنِ مریم کی حقیقت'' کے عنوان سے ایک کتابچہ تحریر کیا اور کسی معترض کی کتاب کے جواب میں ''جواب الجواب'' نامی کتاب لکھی۔ یہ دونوں کتابیں سندھی زبان میں ہیں۔ اسی طرح انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی بعض معروف کتب کا سندھی زبان میں ترجمہ کر کے جماعت کی ایک عظیم خدمت سرانجام دینے کی توفیق ملی۔

ناانصافی ہوگی اگر یہاں پر اُن دو ڈاکٹروں کا ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے کچھ عرصہ اس ہسپتال کی خدمت میں گذارا لیکن اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر رشید احمد تھے جو چوہدری غلام مرتضےٰ، وکیل القانون کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ فضل عمر ہسپتال میں کام کرتے رہے لیکن جلد ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ وہ بچوں کے امراض میں تخصیص حاصل کرنا چاہتے تھے مگر ذہنی طور پر مختل ہو گئے اور اسی کیفیت میں ربوہ واپس آ گئے۔

انہوں نے محلہ دارالرحمت میں اپنا کلینک قائم کیا جو کچھ عرصے کے بعد بند کرنا پڑا۔ ان کی رہائش محلہ دارالصدر شمالی میں اپنے آبائی مکان میں تھی اور سنتے ہیں کہ اگر کوئی مریض آ جاتا تو وہ اسے دیکھ لیتے۔ وہ تمباکو نوش تھے اور ان کے پاس سگریٹ کی خالی ڈبیاں بھی پڑی رہتی تھیں چنانچہ وہ نسخہ اپنے پیڈ کی بجائے سگریٹ کی ڈبیہ پر لکھتے۔ میری معلومات کے مطابق کوئی ایسی شکایت نہیں سنی گئی جس سے ظاہر ہو کہ ان کی تجویز کردہ دوا مریض کی ضرورت سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

انہوں نے لمبا عرصہ اس بیماری میں گذارا۔ وہ اپنے ہی خیالات میں گم سردی گرمی کی پروا کئے بغیر ربوہ کی سڑکوں پر گھومتے رہتے تھے۔ میں جب بھی انہیں دیکھتا ضرور سلام کرتا۔ عام طور پر وہ کسی ردعمل کا اظہار نہ کرتے لیکن ایک بار انہوں نے میرے سلام کے جواب میں ''داؤد کی حال اے؟'' کہہ کر ثابت کر دیا کہ ان کی یادداشت

قائم تھی اگرچہ وہ ذہنی دباؤ کے زیرِ اثر اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

وہ وفات کے بعد ربوہ ہی میں دفن ہوئے۔ ان کے والدِ بزرگوار اور ایک ہمشیرہ کی وفات کے بعد ان کی اپنی وفات ان کی والدہ کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا جسے انہوں نے بہت صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے اس شعر پر یقینِ کامل رکھتی تھیں کہ:

ہو فضل تیرا یارب یا کوئی ابتلا ہو
راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تیری رضا ہو

اب اُن کی والدہ بھی وفات پا چکی ہیں۔ باقی رہے نام اللہ کا!

دوسرے ڈاکٹر جن کا ذکر یہاں مقصود ہے ڈاکٹر حمید احمد خان تھے جو خان عبدالمجید خان صاحب آف ویرووال کے صاحبزادے، حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے برادرِ نسبتی اور پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان کے بھائی تھے۔ وہ بچپن ہی سے نہایت محنتی اور ذہین تھے۔ وہ سکول کے ہر امتحان میں تو اول رہتے ہی تھے انہوں نے میٹرک کے امتحان میں بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ دو سال بعد انہوں نے تعلیم الاسلام کالج سے ایف ایس سی (پری میڈیکل) کیا اور بورڈ میں اوّل رہے۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا اور کچھ عرصہ فضلِ عمر ہسپتال میں ملازمت کے بعد اعلیٰ تعلیم امریکہ میں مکمل کی جس کے بعد وہ برطانیہ چلے گئے اور قریباً تیس سال تک ہارٹلے پول میں مقیم رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ جماعت احمدیہ ہارٹلے پول کے صدر رہے۔

ڈاکٹر حمید احمد خاں نے اسی روز تعلیم الاسلام ہائی سکول کے پرائمری سیکشن میں داخلہ لیا تھا جس روز میں اس سکول میں داخل ہوا چنانچہ سکول کے داخل خارج رجسٹر میں میرا نمبر ۲۴۱۷ ہے تو ان کا ۲۴۱۸۔ انہوں نے پانچویں جماعت میں داخلہ لیا تھا۔

انہوں نے ۲۹ فروری ۲۰۰۰ء کو وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر حمید احمد خان کے ذکرِ خیر کے بعد اب کچھ ذکر ڈاکٹر لطیف احمد قریشی کا جن کا نام ربوہ کے پرانے لوگوں کے لیے قطعاً نیا نہیں ہوگا۔ وہ فی الاصل اجمیر کے رہنے والے لیکن کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے گریجوایٹ ہیں۔ انہوں نے انگلستان سے ایم آر سی پی کرنے کے بعد انتیس سال کی عمر میں ۱۹۶۹ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے حضور اپنی زندگی خدمتِ سلسلہ کے لیے وقف کی اور مسلسل اکتیس سال تک فضل عمر ہسپتال میں خدمت بجا لاتے رہے۔ ان سے ایک مریض کے طور پر ملنے کا اتفاق ہوا اور انہیں اپنا ہمدرد پایا لیکن بعد میں جب وہ ایک بار انکم ٹیکس کے کسی معاملہ میں رہنمائی کے لیے میرے پاس فیصل آباد تشریف لائے تو ان سے مراسم کی نوعیت بدل گئی اور جب میری ایک عزیزہ کو فوری طبی امداد کی ضرورت پڑی تو وہ میری درخواست پر انہیں دیکھنے کے لئے ہسپتال سے اٹھ کر ان کے گھر تشریف لے گئے اور جب تک ضروری تھا وہیں موجود رہے۔

انہیں یقینِ کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں کی گئی قربانی کبھی رائیگاں نہیں جانے دیتا۔'' آپ سنیں گے

تو حیران رہ جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کس کس طرح نوازا ہے'' وہ ایک دفعہ مجھے بتا رہے تھے''اگر چہ میں نے اپنی ملازمت کا سارا عرصہ ربوہ میں ہی گذارا تھا لیکن مجھے میری ریٹائرمنٹ سے بھی کئی سال پہلے ایف آر سی پی کے اعزاز کا مستحق سمجھا گیا جو ممکن ہے انگلستان میں مسلسل ملازمت کے باوجود مجھے وہاں حاصل نہ ہوسکتا۔ اسی طرح جب میں فضل عمر ہسپتال سے ریٹائر ہوا تو کچھ واضح نہیں تھا کہ آئندہ اپنا وقت کیسے گذاروں گا۔ اُن ہی دنوں مجھے انگلستان کے مشہور نیول ہسپتال، کوئین الیگزینڈرا ہاسپٹل، پورٹ سمتھ میں کنسلٹنگ فزیشن کا جاب آفر ہوگیا۔ میں نے پانچ سال وہاں کام کیا اور میں آپ کو یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اگر میں نے اپنی ملازمت کا پورا عرصہ انگلستان کے ہسپتالوں میں ہی گذارا ہوتا تو بھی میں پیشہ ورانہ طور پر زیادہ سے زیادہ اسی سطح تک پہنچ سکتا تھا جہاں اللہ نے مجھے سلسلے کی خدمت کے نتیجے میں پہنچا دیا۔''

ڈاکٹر لطیف قریشی احبابِ جماعت میں صحتِ جسمانی کا شعور بیدار کرنے کے لیے بعض جماعتی رسالوں میں "Healthy Living" کے عنوان سے انگریزی زبان میں کالم لکھتے رہے ہیں جن کا اُردو ترجمہ انہوں نے ''صحت مند زندگی'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ لطیف قریشی نے جب تک یہ کتاب مجھے ارسال نہیں کی میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ عوام الناس کی رہنمائی کے لیے اس موضوع پر اردو میں اتنی اچھی کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے۔

وہ پاکستان میں ہوں تو محلہ دارالعلوم شرقی میں رہتے ہیں۔ آپ ان سے مل کر تو دیکھئے ان شاء اللہ مایوس نہیں ہوں گے۔

آخر میں کچھ ذکر ڈاکٹر مرزا مبشر احمد کا جو ڈاکٹر مرزا منور احمد کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں اور آج بھی فضل عمر ہسپتال میں سینئر سرجیکل سپیشلسٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہ ایم بی بی ایس کرنے کے فوراً بعد ۱۹۶۸ء میں اس ہسپتال میں آئے اور آج بھی اسی جوش و جذبہ کے ساتھ مصروفِ کار ہیں۔ وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ انہیں زمانہ طالب علمی ہی میں اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کرنے کی توفیق ملی۔

میں ڈاکٹر مبشر کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے دو سال سینئر تھے اور انہوں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۹ء میں پاس کیا تھا۔ ہمارے درمیان دوستی تو نہیں لیکن جان پہچان ضرور تھی۔ ان کے ساتھ تعلقات کا ایک حوالہ اباجی کی ذات بھی تھی جنہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے مختلف سفروں میں ان کے ہمرکاب رہنا پڑتا تھا۔ بسا اوقات مبشر بھی حضور کے قافلہ میں شامل ہوتے۔ یوں انہیں اباجی کو کام کرتے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ ان کی خدمتِ سلسلہ کے معترف ہوئے۔ شاید اسی وجہ سے وہ میری بھی ہمیشہ بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ بتایا کرتے ہیں: ''ابا جان ڈاکٹر تھے لہٰذا میرے دل میں بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کی خواہش تو تھی لیکن سکول کے زمانے میں اس کے لیے خاطر خواہ محنت نہ کر پایا۔ مجھے ایف ایس سی (پری میڈیکل) میں داخلہ تو مل گیا تھا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں فرسٹ ایئر میں دو سال لگاؤں گا۔ اس وقت تو مجھے اس فیصلے پر بعض تحفظات تھے لیکن حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی دُور رَس نگاہوں نے

پہچان لیا تھا کہ جب تک میری بنیاد مضبوط نہیں ہوگی مجھے اگلے امتحان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ آج میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو میرے دل سے آپ کے لیے دعا نکلتی ہے جنہوں نے میرے مستقبل کی خاطر ایک ایسا فیصلہ کیا جو میرے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس فیصلے کے ثمرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں ہر مضمون میں اوّل آنے لگا اور جب ایف ایس سی کا بورڈ کا امتحان ہوا تو میری نہ صرف ہائی فرسٹ ڈویژن آئی بلکہ میں وظیفہ کا حقدار بھی قرار پایا۔‘‘

ڈاکٹر مبشر نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد فضل عمر ہسپتال میں کام شروع کیا۔ وہ دو سال بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے لیکن واقفِ زندگی ہونے کے باوجود اس کورس کے جملہ اخراجات ان کے والدِ بزرگوار نے خود اپنی جیب سے برداشت کئے۔ انہوں نے ایڈنبرا سے ایف آر سی ایس کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۷۸ء میں ربوہ واپس آ گئے۔

فضلِ عمر ہسپتال میں ان کی خدمات کا سلسلہ کم و بیش پنتالیس سال پر محیط ہے۔ انہوں نے یہ عرصہ انتہائی صبر و شکر کے ساتھ گذارا ہے اور اس دور کی بہت سی تلخ و شیریں یادیں ان کے ذہن میں محفوظ ہیں جنہیں وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ شیئر کرتے رہتے ہیں۔

جب اُن سے کہا جائے کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنائیں تو وہ اپنی اس خوش بختی پر ناز کرتے ہیں کہ انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث اور خاص طور پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی آخری بیماری کے دوران آپ کی خدمت کا خاص موقع ملا۔ وہ اپنی زندگی کا حاصل حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی ان دعاؤں کو قرار دیتے ہیں جن کا حوالہ حضور کی اس تحریر میں ہے جو آپ نے ڈاکٹر مبشر کو اپنی تصنیف "Revelation, Rationality, Knowledge and Truth" کا ایک نسخہ عنایت فرماتے ہوئے رقم فرمائی۔ یہ تحریر انگریزی میں ہے اور یوں پڑھی جاتی ہے:

"To Dearest Dr. Mubashar

You have made immense financial and professional sacrifice to be free of all other cares just to dedicate all your time and attention for me. Only Allah knows how deeply I am indebeted to you and how profroundly I wish you the best of the life and the life to come. May Allah shower His choicest blessing upon you and your's for all the good you have done to me and mine.

Most lovingly yours,
Mirza Tahir Ahmad
21-09-99"

یہ تو تھا اِس ہسپتال میں اُس زمانے میں کام کرنے والے بعض مرد ڈاکٹروں کا ذکرِ خیر۔ جہاں تک لیڈی ڈاکٹرز

کا تعلق ہے ہسپتال کی سب سے پہلی لیڈی ڈاکٹر غلام فاطمہ تھیں جو برصغیر کی تقسیم سے کچھ عرصہ پہلے قادیان کے زنانہ ہسپتال کی انچارج مقرر ہوئی تھیں۔

اِن کے والد، چوہدری غلام محمد جو تعلیم وتدریس کے شعبہ سے منسلک تھے انتہائی مخلص احمدی تھے۔انہوں نے اپنی اس بیٹی کو محض اس نیت سے ڈاکٹری کی تعلیم دلائی تھی کہ وہ جماعت کے لئے ایک مفید وجود ثابت ہوسکیں تاہم جب انہوں نے لیڈی براؤن میڈیکل سکول، لدھیانہ سے تعلیم مکمل کی تو صدر انجمن احمدیہ کا بجٹ کسی لیڈی ڈاکٹر کی تنخواہ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔اندریں حالات انہیں سرکاری ملازمت اختیار کرنا پڑی تاہم وہ جب کبھی رخصت پر قادیان جاتیں تو اپنی خدمات نور ہسپتال کو پیش کر دیتیں۔یوں انہیں مسلسل کئی کئی روز تک قادیان کی غریب اور مستحق مستورات کے علاج معالجہ کی توفیق ملتی رہی۔حضرت سیدہ اُمِ طاہر کی علالت کے دوران قادیان میں لیڈی ڈاکٹر کی کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی ہدایت پر لیڈی ڈاکٹر غلام فاطمہ ۱۹۴۴ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوکر قادیان چلی آئیں اور جب تک ان کی صحت نے اجازت دی وہ نور ہسپتال اور بعد میں فضل عمر ہسپتال کے ساتھ منسلک رہیں۔انہیں ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کا مرض لاحق ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ ۱۹۵۹ء میں ریٹائر ہوگئیں۔

میں اپنے بچپن سے انہیں دیکھتا آیا تھا۔وہ پرانے فیشن کا ابری والا برقع پہنتیں۔مشہور تھا کہ وہ پردے کی مکمل رعایت سے مفوضہ فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ان کے شوہر چوہدری محمد تقی ضلع سیالکوٹ کے موضع ڈھپئی کوٹلی لوہاراں کے رہنے والے تھے اور بطور ہیڈ ماسٹر بورسٹل جیل لاہور سے ریٹائر ہوئے تھے چنانچہ صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے فراغت کے بعد موصوفہ ان کے پاس ان کے گاؤں منتقل ہوگئیں جہاں انہوں نے ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔

میری معلومات کے مطابق لیڈی ڈاکٹر غلام فاطمہ کے بعد فضل عمر ہسپتال کو کئی سال تک مستقل بنیادوں پر کسی لیڈی ڈاکٹر کی خدمات میسر نہ آسکیں۔یہ درست ہے کہ بعض احمدی لیڈی ڈاکٹرز وقتاً فوقتاً یہاں کام کرتی رہیں لیکن اس ہسپتال میں ان کا تقرر عارضی بنیادوں پر تھا اور وہ حسبِ حالات ملازمت چھوڑ جاتی رہیں۔ان ''عارضی'' لیڈی ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر حلیمہ مرتضیٰ بھی تھیں جو ڈاکٹر رشید احمد کی ہمشیرہ تھیں۔وہ آپی کی کلاس فیلو تھیں اور ان کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا لہٰذا میں انہیں بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔انہوں نے فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ان کی شادی ڈاکٹر عبدالصمد، ڈینٹل سرجن سے ہوئی۔اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی اور ایک بیٹے سے نوازا لیکن وہ ان کے عہدِ طفولیت میں ہی بعارضہ کینسر وفات پا گئیں۔

ڈاکٹر مرزا منور احمد کی طرف سے الفضل کے ذریعہ وقتاً فوقتاً لیڈی ڈاکٹر کی خدمات طلب کی جاتی رہیں لیکن ہسپتال کو اس حوالے سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔اس پر کوئٹہ سے مسعود احمد نامی ایک مخلص احمدی نے اپنی ایک بچی کو جس کی عمر مئی ۱۹۶۴ء میں صرف نو سال تھی وقف کر دیا اور وعدہ کیا کہ وہ اسے ڈاکٹری کی تعلیم دلا کر سلسلہ کی خدمت کے لئے پیش کر دیں گے۔اپنے اس خط میں جو انہوں نے ڈاکٹر مرزا منور احمد کے نام لکھا تھا اور جو اُن ہی دنوں الفضل میں شائع ہوا تھا مسعود احمد لکھتے ہیں: ''میرے تین چھوٹے بچے ہیں جن میں سے

لڑکی کی عمر صرف نو سال ہے اور چوتھی جماعت میں پڑھتی ہے۔میری طرف سے حضرتِ اقدس کی خدمت میں عرض کر دیجیے گا کہ آج مسعود احمد اپنی لڑکی وقف کر رہا ہے۔میں اسے لیڈی ڈاکٹر کی تعلیم دونگا اور ان شاء اللہ اگر اس کی زندگی رہی تو یہ سلسلہ کے کسی ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹر کا کام کرے گی۔''

معلوم ہوتا ہے کہ واہ کینٹ کے ایک احمدی ملک محمد صدیق اس اعلان سے بے حد متاثر ہوئے چنانچہ انہوں نے بھی ایک ایسا ہی خط ڈاکٹر مرزا منور احمد کے نام لکھا۔یہ خط بھی الفضل میں شائع ہوا۔ملک محمد صدیق نے لکھا: ''میری اولادِ نرینہ فی الحال نہیں ہے اور میری پانچ بچیاں ہیں چنانچہ میں اپنی سب بچیوں کو خدا تعالیٰ کی خاطر وقف کر رہا ہوں۔میری بڑی لڑکی عزیزہ نعیمہ خالد جس کی عمر ساڑھے آٹھ سال ہے جماعت چہارم میں پڑھتی ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے تمام سکول میں پڑھائی میں اعلیٰ کارکردگی میں ایک نمونہ ہے۔اس کو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔''

اس بحث میں پڑے بغیر کہ یہ بچیاں بعد میں ڈاکٹر بن سکیں یا نہیں امرِ واقع یہ ہے کہ اس حوالے سے کی جانے والی کوششیں بالآخر رنگ لائیں اور ۱۹۶۵ء میں فضل عمر ہسپتال کو فہمیدہ عظمت (جو شادی کے بعد فہمیدہ منیر کے نام سے معروف ہوئیں) کی شکل میں ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر میسر آ گئیں جنھوں نے اپنی بے مثال خدمت سے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ چھوڑا۔انہوں نے پچھتر سال کی عمر میں اٹھارہ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو کینیڈا میں وفات پائی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:''ربوہ میں اس زمانے میں لیڈی ڈاکٹر کوئی نہیں تھی بلکہ اردگرد کے علاقوں میں کوئی نہیں تھی اور بڑا وسیع catchment area تھا جس کو اکیلے ہی انہوں نے اپنے زمانے میں بھگتایا۔سردی ہو یا گرمی، رات کو بھی دو یا تین بجے کسی بھی وقت کوئی بھی مریض آتا تو فوراً بستر چھوڑ کر مریض دیکھنے چلی جاتیں۔یہ بھی ان کے بارے میں بیان ہوتا ہے کہ ولیمہ والے دن دلہن بن کے سٹیج پر بیٹھی تھیں کہ ہسپتال سے کال آ گئی کہ ایمرجنسی آئی ہے۔اپنے اسی لباس میں وہاں سے اُٹھیں اور ہسپتال چلی گئیں اور مہمانوں نے ان کے بغیر ہی بعد میں کھانا کھا لیا۔انہوں نے وقف کی روح کے ساتھ اپنے اس خدمت کے عہد کو نبھایا۔اللہ تعالیٰ باقی واقفین کو بھی اس نمونے کو قائم رکھنے کی توفیق دے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی اس سندِ خوشنودی کے بعد ان کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے تاہم ان کا ذکر ختم کرنے سے پہلے علم طب میں ان کی مہارت کے ساتھ ساتھ ان کے شاعرانہ ذوق کی داد بھی دینا ضروری ہے۔پرویز پروازی کے الفاظ میں ''فہمیدہ کے لہجے میں وہ کشش...... موجود ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور معانی کی حدت سے بہرہ ور کرتی ہے۔'' چوہدری محمد علی نے انہیں ''ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعرہ'' قرار دیا ہے تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے یہ الفاظ تو ان کے لیے یقیناً ایک سند کا درجہ رکھتے ہیں کہ ''میرے دل میں آپ اور آپ کے کلام کی بہت قدر ہے۔''

حاصلِ کلام مرحومہ کا یہ شعر قرار دیا جا رہا ہے:

مدت سے گھر پہ تالا پڑا ہے
اس سے کہہ دو کہ اپنے گھر آئے

ہسپتال کی نرسوں میں سب سے اہم نام زینب خاتون المعروف ''زینب نرس'' کا تھا جو ایک لمبا عرصہ ہسپتال میں رہیں۔ اس زمانے میں پورے ہسپتال میں غالباً وہی واحد نرس تھیں۔ وہ مخلص احمدی تھیں۔ اُن کے شوہر حکیم احمد الدین موجد طب جدید نے ۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔ وہ موصی تھے تاہم حصہ جائیداد کی عدم ادائی کی وجہ سے امانتاً دفن کئے گئے۔ موصوفہ کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ اُن کی نعش بہشتی مقبرے منتقل ہونی چاہیے لیکن قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں کی مشکلات اُن کی راہ میں حائل رہیں۔ بالآخر انہوں نے وصیت کی تکمیل کرا کے میت کی بہشتی مقبرہ میں تدفین کی اجازت حاصل کر لی۔

یاد رہے کہ حکیم احمد الدین حضرت مسیح موعود کے رفقا اور ابتدائی موصیان میں سے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی بہشتی مقبرہ میں تدفین ان کی اہلیہ ثانی کا ایک قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔ دراصل ان کا یہ اقدام حضرت مسیح موعود کی لازوال تعلیمات پر یقینِ کامل کی ایک شکل ہے جس پر وہ ہم سب کی دعاؤں کی مستحق ہیں۔

زینب نرس حکیم احمد الدین کی دوسری اہلیہ تھیں۔ حکیم احمد الدین کی پہلی شادی سکینہ نام کی ایک خاتون جو اپنے حلقہ میں ''بڈھی'' کے نام سے معروف تھیں سے ہوئی تھی۔ زینب نرس نے ان کے وجود کو انتہائی خوش دلی کے ساتھ برداشت کیا اور تمام عمر اپنے ساتھ رکھا۔ یہ خاتون حضرت مسیح موعود کی رفیقہ تھیں اور جب انہوں نے ۱۹۶۸ء میں وفات پائی تو الفضل میں ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست زینب نرس ہی کی طرف سے شائع ہوئی۔

میں نے زینب نرس کو خود ربوہ کی سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ ان کا قد چھوٹا اور جسم بھاری تھا۔ وہ سفید رنگ کا پرانے فیشن کا ابری والا برقع پہنا کرتی تھیں۔ انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۷۳ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئیں۔

بعد کی نرسوں میں سے ''رضیہ نرس'' جو انجمن کوارٹرز میں رہائش پذیر تھیں خصوصی طور پر ذکر کے لائق ہیں۔ وہ داؤد جنرل سٹور والے چوہدری داؤد احمد کی سگی ہمشیرہ تھیں اور زچگی کے مسائل کے حوالے سے بہت شہرت رکھتی تھیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں گھر پر کسی بچے کی ولادت پر ان کی خدمت میں پچاس روپے بھی پیش کر دیے جاتے تو وہ اسے بصد شکریہ قبول کر لیتیں۔ ان کا ایک بیٹا، طاہر سکول میں میرا ہم جماعت تھا۔

جہاں تک ہسپتال کے مردانہ عملے کا تعلق ہے اس میں سے عبدالقیوم ڈسپنسر کا سرسری ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ڈاکٹر حشمت اللہ کے بھتیجے تھے۔ اگرچہ ان کی تعیناتی فضل عمر ہسپتال میں تھی مگر وہ ڈیوٹی ڈاکٹر حشمت اللہ کے اسسٹنٹ کے طور پر قصرِ خلافت میں دیا کرتے تھے۔ وہی ضرورت پڑنے پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو انجکشن لگاتے اور وہی دوا دارو کا اہتمام کرتے۔ جب حضور ربوہ سے باہر تشریف لے جاتے تو وہ بھی ہمراہ جانے والے کارکنان میں شامل ہوتے۔ چونکہ ابا جی بھی حضور کے ہر سفر میں اُن کے قافلہ میں شامل ہوتے تھے لہٰذا ان دونوں کے درمیان ایک خاص بے تکلفی تھی۔ انہیں صبح کے وقت تازہ پانی سے غسل کی عادت تھی۔ ایک بار (غالباً مری میں) غسل کے دوران ان کے ایک بازو پر فالج گر گیا۔ خدا تعالیٰ نے ان کے باقی جسم کو تو محفوظ رکھا مگر یہ بازو مستقل طور پر بیکار ہو گیا۔ اس کے باوجود اُن کی تازہ پانی سے غسل کی عادت نہ گئی چنانچہ سردی ہوتی یا گرمی، وہ ربوہ میں صبح کے وقت گلی میں لگے ہوئے نلکے کے نیچے غسل کرتے نظر آتے تھے۔

اُن کی اہلیہ سعیدہ امی کی سہیلیوں میں سے تھیں اور بکثرت غریب خانے پر آتی رہتی تھیں۔اُن کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ایک بیٹی امتہ السلام رفعت جنہوں نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا کوئین میری کالج ۱۹۸۸ء میں ڈیپارٹمنٹ آف پاکستان سٹڈیز کی ہیڈ کے طور پر ریٹائر ہوئی ہیں جب کہ بیٹا عبدالحیٰ طاہر جس نے اپنے کیریئر کا آغاز اٹامک انرجی کمیشن سے کیا تھا آجکل کینیڈا میں ہے۔

عبدالقیوم ایک نیک اور عبادت گذار شخص تھے چنانچہ ۱۸ مارچ ۱۹۶۱ء کے الفضل میں ڈاکٹر حشمت اللہ کے قلم سے "ایک مبارک رؤیا" کے عنوان سے ایک نوٹ چھپا ہوا موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالقیوم ان خوش قسمت افراد میں سے تھے جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اپنی زیارت سے مشرف کیا تھا۔

ہسپتال کے دیگر پرانے خدمت گذاروں میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر عبدالحفیظ ڈسپنسر کا جو عبدالقیوم کے قریبی عزیزوں اور میرے مہربانوں میں سے تھے۔گھر میں جب کسی کو پیٹ کی خرابی یا نزلہ زکام وغیرہ معمولی امراض کی شکایت ہوتی میں بے دھڑک ان کے پاس جا کر ۲۸ نمبر یا ۲۲ نمبر مکسچر کی فرمائش کر دیتا۔وہ بھی مجھ پر مہربانی کرتے اور اس کے اجزائے ترکیبی مقررہ نسبت سے ایک شیشی میں ڈال کر میرے حوالے کر دیتے۔بعد میں اس میں حسب ضرورت پانی ملا کر استعمال کر لیا جاتا۔وقت بے وقت گھر میں کسی کا بلڈ پریشر چیک کرنا ہوتا یا کسی کو انجکشن لگانا ہوتا تو میں ان ہی سے درخواست کرتا۔وہ گھر تشریف لے آتے۔ان کے گھر آنے کی فیس نصف روپیہ ہوا کرتی تھی۔

آہستہ آہستہ مجھے اُن پر اس قدر اعتماد ہو گیا کہ اپنے چھوٹے موٹے سرجیکل مسائل کے بارے میں بھی ان سے مشورہ کرنے لگا۔میری گردن پر ایک سکن ٹیگ بن گیا جو ہر ایک کو نظر آتا تھا۔میں نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا: "یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔آپ ہسپتال آ جائیں، میں کاٹ دوں گا۔" ایک دوپہر میں ان کے پاس چلا گیا۔وہ ایک تیز دھار قینچی اور کاربالک ایسڈ کی بوتل ہاتھ میں لئے مجھے ہسپتال کے صحن میں لے گئے اور وہیں کھڑے کھڑے سکن ٹیگ کاٹ دیا، زخم پر کاربالک ایسڈ لگایا اور پھاہا رکھ کر سٹکنگ پلاسٹر لگا دیا۔میں نے یہ پلاسٹر چند روز بعد خود ہی اتار دیا۔زخم ماشاء اللہ مندمل ہو چکا تھا۔

انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد گول بازار میں اپنا کلینک قائم کیا تھا لیکن اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

اسی دور کے ایک اور ڈسپنسر بلند قامت کرامت تھے جو محلہ دارالرحمت وسطی میں رہا کرتے تھے۔وہ معروف خادم سلسلہ چوہدری برکت علی جو حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھے اور جنہوں نے اپنی تمام زندگی جماعت کی خدمت میں بسر کی، کے صاحبزادے تھے۔وہ تحریک جدید کے قیام کے وقت صدر انجمن احمدیہ میں آڈیٹر کے طور پر کام کر رہے تھے۔حضرت مصلح موعود نے انہیں اس ذمہ داری کے ساتھ ساتھ فنانشل سیکرٹری، تحریک جدید کا عہدہ بھی سونپ دیا۔انہوں نے مفوضہ فرائض کچھ اس خوبی سے سرانجام دیئے کہ صدر انجمن احمدیہ سے ریٹائر ہونے کے باوجود تحریک جدید میں ان کی خدمات کا سلسلہ مسلسل بیس برس تک جاری رہا۔تحریک جدید کے پانچ ہزاری مجاہدین کا لٹریچر انہی کی نگرانی میں طبع ہوا۔حضرت مصلح موعود نے ایک بار ان کے متعلق فرمایا تھا "چوہدری برکت علی صاحب ان چند اشخاص میں سے ہیں جو محنت، کوشش اور اخلاص سے کام کرنے والے ہیں اور جن کے سپرد کوئی کام کر کے

نہیں ہوتی۔''

پھر انہیں یاد دہانی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔'' مولوی عبدالرحمٰن انور کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے ہسپتال میں لطف الرحمٰن المعروف لطفی جو مولوی عبدالرحمٰن انور کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے ہسپتال میں لیب اسسٹنٹ تھے لیکن سند یافتہ پتھالوجسٹ کی عدم موجودگی میں بول و براز اور خون کے جملہ ٹیسٹ وہی کیا کرتے تھے۔ ان کے کمرے کی کھڑکی کے باہر بنا ہوا کنکریٹ کا ایک چھجہ بول و براز کے نمونوں کے لیے مختص تھا۔ اس زمانے میں جراثیم سے پاک کنٹینر کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا چنانچہ مریض حسب سہولت گھر میں موجود جام یا چائے کی کوئی بوتل یا پیالہ دھو کر اس مصرف میں لے آتے۔ اس کھڑکی میں ہر وقت طرح طرح کے پیالے اور مرتبان ان اشیاء کے نمونوں سے بھرے رہتے تھے۔

آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ عبدالحفیظ ڈسپنسر، کرامت ڈسپنسر اور لطف الرحمٰن، تینوں ابتدائے ربوہ سے اس ادارے کے ساتھ منسلک تھے۔ انہوں نے یہیں رہ کر عملی تربیت مکمل کی اور پھر ایک ہی سال یعنی ۱۹۵۴ء میں کمپاؤڈری اور لیب اسسٹنٹ کا امتحان پاس کیا۔ عبدالحفیظ بڑے فخر کے ساتھ بتایا کرتے تھے کہ اُس سال پورے پنجاب میں سات سو اُمیدوار اس امتحان میں شامل ہوئے تھے جن میں سے صرف نوے پاس ہوئے۔

بعد میں ہسپتال کے عملہ میں شمولیت اختیار کرنے والوں میں ظریف احمد ڈسپنسر اور مانسہرہ کے رہنے والے محمد اسلم شگفتہ شامل ہیں۔ ظریف تو لمبا عرصہ اس ہسپتال کے ساتھ منسلک رہے لیکن اسلم جو کوالیفائیڈ ریڈیالوجسٹ کی عدم موجودگی میں اس حوالے سے جملہ خدمات سرانجام دے رہے تھے اور آغازِ ربوہ میں بڑے گوشت کا کام کرنے والے سید اسلام کے داماد تھے کچھ ہی سالوں بعد ملازمت چھوڑ کر چلے گئے۔ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اچھی شکل وصورت سے نواز رکھا تھا اور دونوں کی رہائش انجمن کوارٹرز میں ساتھ ساتھ تھی۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ظریف نُور آئی ڈونرز ایسوسی ایشن کے رُکن تھے اور اس ایسوسی ایشن کے زیر انتظام سب سے پہلے ان ہی کا کارنیا ایک ضرورتمند کو لگایا گیا۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں ان کے درجات بلند سے بلند تر کرتا چلا جائے۔

فضلِ عمر ہسپتال کے پرانے عملہ کی بات ہو رہی ہے تو دو دیگر دوستوں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک عبدالسمیع تھے جو حضرت خدا بخش المعروف مومن جی کے صاحبزادے تھے اور دوسرے عثمان صدیقی کے بڑے صاحبزادے، محمد کریم ظفر۔ ان دونوں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس ہسپتال میں بطور ڈسپنسر کام کیا۔ عبدالسمیع تو اب وفات پا چکے ہیں جب کہ کریم ظفر گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد پچھلے کچھ سالوں سے طاہر ہارٹ انسٹی ٹیوٹ میں کام کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور حضرات نے بھی اس ہسپتال میں رہ کر ڈسپنسنگ کی عملی تربیت حاصل کی لیکن جلد ہی ملازمت چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں سے ایک چوہدری عبداللطیف اوورسیئر کے بیٹے، محمود تھے اور دوسرے محمد امین صدر انجمن احمدیہ کے ایک مددگار کارکن محمد شریف کے بیٹے تھے۔ تیسرے مظفر تھے جو امین کے عزیزوں میں ہونے کے ساتھ ساتھ میرے سکول کے ایک ہم جماعت، بشارت کے چھوٹے بھائی بھی تھے۔

ہسپتال میں یوں تو ضیاء الدین، راجہ محمد عباس اور بعض دوسرے میل نرس بھی موجود تھے مگر میں یہاں صرف نعمت اللہ بھٹی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ابا جی کی آخری بیماری میں ظریف ڈسپنسر کے ساتھ مل کر ان کا لمبر پنکچر کیا تھا۔ ابا جی کی وفات کے بعد انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس ابا جی کی ایک ''یادگار'' محفوظ ہے جو وہ مجھے عنایت فرمانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بات کی وضاحت کی نہ میں نے ان سے پوچھا لیکن دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ وہ ''یادگار'' کیا ہو سکتی ہے۔ چند روز بعد انہوں نے مجھے ایک ٹیسٹ ٹیوب لا کر دی جس میں خون کی آمیزش والا ایک سیال تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ وہ مواد ہے جو ابا جی کی ریڑھ کی ہڈی سے نکالا گیا تھا اور اگر میں چاہوں تو ان کے جسم کا ایک حصہ سمجھ کر اسے اپنے پاس محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ یہ سیال جو کچھ ہی عرصہ بعد خشک ہو کر خون کے ذرات کی شکل اختیار کر گیا تھا آج بھی میرے پاس ابا جی کی آخری بیماری کی یاد دلانے کے لیے موجود ہے۔

اور اب کچھ ذکر ہسپتال کے آپریشن اسسٹنٹ، انتہائی خوش اخلاق اور ملنسار عبدالجبار مرحوم کا!

مجھے یاد نہیں کہ میرا ان سے کس طرح تعارف ہوا تھا لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ وہ امی اور آپی کا بلڈ پریشر دیکھنے کے لیے ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ میں نے ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں خلوص کی چمک دیکھی۔ بسا اوقات گھر کا دروازہ کھٹکتا تو باہر جبار کھڑے ہوتے۔ بتاتے کہ وہ اِدھر سے گذر رہے تھے، سوچا کیوں نہ خالہ جی کا حال پوچھتے جائیں۔ اللہ! اللہ!! ایسے بے نفس وجود کہاں ملتے ہیں۔ بازار میں بھی دیکھ لیتے تو بائیسکل سے اُتر کر گھر کے ہر فرد کا نام لے لے کر حال پوچھتے اور دعاؤں سے نوازتے۔

انہوں نے پنتالیس سال تک فضل عمر ہسپتال میں خدمت کی توفیق پائی اور ایک روز اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے تک بظاہر بالکل صحتمند تھے اور روزمرہ کے معمولات سرانجام دے رہے تھے۔ منور شمیم خالد، سابق پروفیسر تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے بیان کے مطابق ''ان ہی دنوں میرا پتّہ کا آپریشن ہوا تھا۔ میں نے یہ آپریشن فیصل آباد سے کرایا تھا لیکن شوگر کی وجہ سے زخم مندمل ہونے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ ایک روز میں نے موصوف سے فون پر گھر آنے کی درخواست کی۔ وہ اسی شام پانچ بجے کے قریب تشریف لے آئے۔ میں نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اگلی صبح آٹھ بجے آ کر زخم کی ڈریسنگ کر دیں گے۔ میں نے انہیں بالعموم صَادِقُ الْوَعد پایا تھا چنانچہ جب وہ وقتِ مقررہ پر نہ پہنچے تو میں نے انہیں فون کیا۔ فون پر گھنٹی بج رہی تھی لیکن وہ اسے سن نہ رہے تھے۔ تب کسی اور نے مجھے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ وہ تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔''

ان کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے ایک خطبہ جمعہ میں ان کا خاص طور پر ذکر فرمایا اور نماز جنازہ غائب پڑھایا۔ حضور کے یہ الفاظ مرحوم اور ان کے لواحقین کے لیے سرمایہ صد افتخار ہیں: ''ان کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی کافی خدمت کا موقع ملا۔ بڑے ملنسار اور منکسر المزاج تھے بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ ہسپتال کے عملے میں سب سے زیادہ خوش اخلاق یہی تھے اور مریض ان کو پسند بھی بہت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر اور حوصلہ عطا فرمائے۔''

عبدالجبار مرحوم کے ذکرِ خیر کے بعد اب کچھ باتیں ہسپتال کے سٹور کیپر قادر بخش کے بارے میں جو بستی

رنداں، ڈیرہ غازی خان کے ایک بزرگ، الٰہی بخش کے بیٹے تھے۔ ہسپتال کے مستقل سٹاف میں شامل ہونے سے پہلے انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے باڈی گارڈ کے طور پر اور اس سے بھی پہلے فرقان فورس میں خدمت کا موقع مل چکا تھا۔ وہ کچھ ایسے تعلیم یافتہ تو نہ تھے لیکن خوش اخلاقی کی دولت سے مالا مال تھے۔ ہسپتال کے ڈاکٹروں کی طرف سے کارکنان کے لیے تجویز کردہ ادویات کی تقسیم ان ہی کی ذمہ داری تھی اور وہ یہ فریضہ انتہائی ذمہ داری سے سرانجام دیا کرتے تھے۔ بسا اوقات کسی مریض یا اس کے نمائندے کی طرف سے تلخی کا اظہار ہو جاتا لیکن وہ یہ سب کچھ انتہائی خوش مزاجی سے برداشت کر لیتے۔

ان کی رہائش انجمن کوارٹرز میں ہمارے بہت قریب تھی لہٰذا اِدھر اُدھر آتے جاتے یا نمازوں پر بیت الذکر میں ان سے صاحب سلامت ہو جایا کرتی تھی۔ ایک بار اتفاقاً ملے تو انہوں نے بتایا کہ وہ محلہ دار العلوم میں ذاتی مکان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے، محمد سلطان بتاتے ہیں: ''اپنی وفات سے چند روز پیشتر انہوں نے اپنے سب بیٹوں، بیٹیوں اور دامادوں کو ۳۰ جنوری ۲۰۱۱ء کی دوپہر کے وقت اپنے گھر پر کھانے کے لیے مدعو کیا۔ ان کے ایک بیٹے نے معذرت کی کہ اسے چار پانچ روز بعد ویسے ہی کسی کام سے ربوہ آنا ہے لہٰذا اسے اس دعوت میں حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ انہوں نے جواباً کہا: میں نے دعوت کی تاریخ مقرر کر دی ہے اور اسے قبول کرنا یا نہ کرنا تمہاری اپنی صوابدید پر ہے۔ ہو سکے تو آ جانا لیکن نہ جی چاہے تو مجھے کوئی شکوہ نہ ہو گا۔ ۳۰ جنوری کو حسبِ پروگرام بیٹے اور بیٹیاں گھر پر جمع ہو گئیں۔ خدا کی شان دیکھیے! دوپہر کھانا کھانے کے بعد باتیں کرتے کرتے ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔''

کیا قادر بخش اپنی وفات کے بارے میں قبل از وقت آگاہ ہو چکے تھے یا یہ اتفاقِ محض تھا؟ اب کوئی نہیں جو اس سوال کا جواب دے سکے۔

اور آخر میں کچھ ذکر محمد اسحٰق کا جو قادر بخش کے برادرِ نسبتی تھے اور فضل عمر ہسپتال میں مددگار کارکن کے طور پر کام کرتے تھے۔ انہیں ہسپتال کے اندر کوارٹر ملا ہوا تھا۔ بظاہر ٹھیک ٹھاک تھے لیکن فالج کے اچانک حملے نے انہیں بے بس کر دیا اور وہ وقت سے کچھ پہلے ہسپتال کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ کوتاہ قامت محمد اسحٰق قسمت کے دھنی نکلے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے ایک بیٹے، محمد افضل فہیم کو اپنی زندگی خدمتِ دین کے لئے وقف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور وہ بطور مربی سلسلہ خدمت بجالا رہے ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی انگلستان اور جرمنی میں ہیں۔ ان کی رہائش یوں تو اب بھی ربوہ ہی میں ہے لیکن وہ حسبِ ضرورت بچوں کے پاس انگلینڈ اور جرمنی جاتے رہتے ہیں۔ ایک بار اتفاقاً دار الضیافت کی لابی میں مل گئے تو بہت خوش تھے اور خود پر خدا تعالیٰ کے افضال کا بار بار شکر ادا کر رہے تھے۔

یہ تو تھا جماعت کے ان مخلص کارکنان کا ذکر جنہوں نے اپنی پوری زندگی یا اس کا بیشتر حصہ فضل عمر ہسپتال میں رہ کر خدمتِ خلق میں بسر کیا۔ اب کچھ ذکر ان پرائیویٹ ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹروں، دندان سازوں اور اطبا کا جن کا نام ایک طویل عرصہ تک ربوہ کی افقِ طب پر چمکتا رہا۔

اے ہم نفسو! ڈھونڈو کہ وہ لوگ کہاں ہیں

اس زمانے کے پرائیویٹ میڈیکل پریکٹیشنرز میں سے دو چار نام بہت اہم ہیں۔

ڈاکٹر کیپٹن بشیر احمد گول بازار میں پریکٹس کرتے تھے۔ اِن کا تعلق ضلع سیالکوٹ سے تھا اور انہوں نے ایل ایس ایم ایف کا امتحان آگرہ سے پاس کیا تھا۔ شروع میں سرکاری ملازمت میں رہے لیکن جنگ عظیم دوم کے زمانہ میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کئی سال قادیان میں درویشانہ زندگی گذاری لیکن اپنے پیشے کی مناسبت سے دن رات خدمت خلق میں مصروف رہے۔ ان کی اس خدمت کا عمومی طور پر بہت خوشگوار اثر مرتب ہوا چنانچہ تاریخ احمدیت میں یہ بات درج ہے کہ ''قادیان اور اس کے ماحول میں غیر مسلموں کے اندر رواداری کی فضا قائم کرنے میں آپ کا بھاری عمل دخل تھا۔ آپ کی شفقت و مروّت کا یہ اثر ہے کہ دُور و نزدیک کے ہندو سکھ آج تک ان کو یاد کرتے ہیں اور ان کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔'' وہ پچاس کی دہائی میں پاکستان آگئے اور پھر ربوہ کے ہو کر رہ گئے۔

میرے ماموں زاد، مرزا محمد اسماعیل اپنے مختلف عوارض کے علاج کے لئے ان کے پاس بکثرت جایا کرتے تھے۔ مجھے بھی کئی دفعہ ان کے ہمراہ ڈاکٹر بشیر احمد کے کلینک پر جانے کا موقع ملا لیکن کبھی انہیں فارغ بیٹھے نہیں دیکھا۔ ان کے پاس ربوہ اور بیرونِ ربوہ سے دو چار مریض ضرور بیٹھے ہوتے تھے اور یہ سلسلہ سارا دن چلتا رہتا۔ طبیعت میں مزاح تھا اور اپنے مستقل مریضوں کے ساتھ ان کی نوک جھونک جاری رہتی۔ اسماعیل سے بھی دل لگی کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن کی دوا کے لئے وہ ایک سے ڈیڑھ روپیہ چارج کرتے تھے جو اُس زمانے کے لحاظ سے بہت چھوٹی رقم نہ تھی لیکن مریض یہ فیس خوشدلی سے ادا کرتے۔ اکا دُکا مستحق مریضوں کو مفت بھی دیکھ لیتے تھے۔

ایک بار مجلس خدام الاحمدیہ کے زیرِ انتظام خدام کے لئے فرسٹ ایڈ کلاس جاری کی گئی جس کا دورانیہ دو ہفتے تھا۔ یہ کلاس صبح کے وقت بیت المہدی میں ہوتی تھی اور جو ڈاکٹر بشیر احمد لیتے تھے۔ اس کلاس میں ہمیں فوری طبی امداد کے حوالے سے بعض بنیادی باتیں ذہن نشین کرائی گئیں۔ یہ مضمون میرے لئے نیا تھا مگر ان کی سکھائی ہوئی باتیں آج بھی بہت حد تک یاد ہیں اور میرے نزدیک اس کا زیادہ کریڈٹ موصوف ہی کو جاتا ہے جنہوں نے اچھا طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو ایک اچھا اُستاد بھی ثابت کیا۔

میں نے سن رکھا ہے کہ ڈاکٹر بشیر احمد کو جنگِ عظیم دوم کے دوران غیر معمولی جرأت کے مظاہرے پر برطانوی حکومت کی طرف سے ملٹری کراس دیا گیا تھا۔ احمدی ہونے کے ناطے مجھے اُن کے اِس کارنامے کی

تفصیلات میں دلچسپی تھی لیکن مجھے یہ خیال اُس وقت آیا جب اُنہیں وفات پائے عرصہ گذر چکا تھا اور ان کے سب بچے تتر بتر ہو چکے تھے لہٰذا میرے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ مجھے یہ معلومات کہاں سے مل سکیں گی۔ یہ تو اللہ بھلا کرے شیخ نور احمد منیر مربی سلسلہ کے صاحبزادے، عمر کا جنہوں نے مجھے یہ بتا کر میری مشکل آسان کر دی کہ ان کی اہلیہ ڈاکٹر بشیر احمد کی نواسی ہیں اور یہ کہ ان کے پاس ڈاکٹر بشیر احمد کے سب سے بڑے صاحبزادے اختر کا فون نمبر موجود ہے۔ میرا خیال تھا مجھے ان سے یہ معلومات بہ آسانی مل جائیں گی تاہم انہوں نے یہ بتا کر مجھے مایوس کر دیا کہ اُن کے پاس ایسی کوئی تفصیل کبھی موجود تھی نہ باوجود کوشش کے وہ اِسے حاصل کر پائے ہیں۔

اختر نے بتایا کہ اُن کی اطلاع کے مطابق اُس زمانے کے فوجی اعزازات اور ایوارڈز کا جملہ ریکارڈ پبلک ریکارڈ آفس کو منتقل کیا جا چکا ہے جو انگلستان کے شہر کیو میں واقع ہے۔ انہوں نے مجھے فوج کے متعلقہ محکمے سے موصول ہونے والی ایک چٹھی کی نقل بھی بھجوائی جس سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر بشیر احمد کو یہ اعزاز برما کے محاذ پر کارکردگی کے حوالے سے دیا گیا تھا اور یہ کہ اب اس کی تفصیلات پبلک ریکارڈ آفس کے سرچ ڈپارٹمنٹ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس خط میں یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ پبلک ریکارڈ آفس خود اس ''سرچ'' کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا بلکہ ان کے پاس کچھ پیشہ ور ریسرچرز موجود ہیں جو اپنی فیس وصول کرنے کے بعد یہ کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اختر کا کہنا تھا ''مجھے یہ خط ملے کئی سال ہو گئے ہیں لیکن میں کسی ریسرچر سے رابطہ نہیں کر پایا لہٰذا ابھی تک ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے۔''

جتنی دیر میں اس مسئلے کا کوئی حل نکلتا ہے میں آپ کو بتا تا چلوں کہ ربوہ میں پرائیویٹ میڈیکل پریکٹس کے حوالے سے ایک اور اہم نام ڈاکٹر محمد احمد کا تھا جو ماسٹر احمد حسین فرید آبادی کے صاحبزادے تھے۔ ابھی چار سال کے تھے کہ ان کے والدِ بزرگوار کا انتقال ہو گیا چنانچہ ان کی والدہ سکینۃ النساء نے شیخ محمد اسماعیل سرساوی سے نکاحِ ثانی کر لیا اور وہ اسی نسبت سے ڈاکٹر محمد احمد فرید آبادی کے علاوہ ڈاکٹر محمد احمد سرساوی کے نام سے بھی معروف ہوئے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا وہ منڈی میں شفا میڈیکل ہال کے نام سے کلینک کیا کرتے تھے۔ ربوہ کا یہ علاقہ فضل عمر ہسپتال سے قدرے دور تھا چنانچہ چمن عباس اور دیگر نواحی دیہات کے مریض ان ہی سے طبی مشورہ حاصل کرتے۔

آپا کا رشتہ ڈاکٹر محمد احمد سرساوی کی ہمشیرہ حمیدہ سرساوی نے اپنے رشتے داروں میں طے کرایا تو وہ مجھے پہچاننے لگ گئے اور میں بھی کبھی کبھار ان کے کلینک پر رک کر ان سے علیک سلیک کر لیا کرتا تھا۔

الفضل میں ان کی طرف سے وقتاً فوقتاً چھپنے والے اشتہارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ابتدائے ربوہ میں ''ہضمین'' کے نام سے ایک دوا تیار کی تھی۔ پھر ''سرمہ سفید نورانی'' تیار کیا اور آخر میں ''جاگلے پلو'' بھی جسے وہ طاقت وقوت کا خزینہ قرار دیتے تھے۔ عبدالسلام اختر کے یہ اشعار ان ہی پلو کے بارے میں ہیں:

آگدازِ زندگی کی اپنے دل میں آگ لے
بھاگ سکتا ہے تو فکرِ رنج و غم سے بھاگ لے

ہاں! مگر یہ نسخۂ اکسیر بھی کچھ آزما
"جاگلے" کھا اور اپنی زندگی بھر جاگ لے

ایک بات جس کا میں ذاتی طور پر شاہد ہوں یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد احمد سورج ڈھلتے ہی اپنی دکان کے سامنے جھاڑو لگوا کر پانی چھڑکواتے جس کے بعد وہاں تین چار آرام کرسیاں بچھا دی جاتیں۔ سردی ہوتی یا گرمی، شام ہوتے ہی جنید ہاشمی اور عبدالعزیز بھامبڑی وہاں پہنچ جاتے اور پھر تینوں کی بیٹھک رات گئے تک جاری رہتی۔ اگر اس دوران کوئی مریض آجاتا تو ڈاکٹر محمد احمد اسے دیکھنے کے لئے اُٹھ جاتے لیکن دوادارو سے فارغ ہوتے ہی باہر آکر بیٹھ جاتے۔ کبھی کبھار وہاں سے اتفاقاً گذرنے والا ان کا کوئی واقف کار یا دوست بھی ان کے پاس کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتا لیکن اس محفل کے مستقل اراکین یہی تین دوست تھے۔ اگرچہ مجھے اس محفل میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا اور نہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کیا کیا موضوعات زیرِ بحث رہتے ہوں گے لیکن شام کے وقت میرا جب بھی ادھر سے گذر ہوا میں نے انہیں خوش گپیوں میں محو پایا۔

بعد میں ڈاکٹر محمد احمد غلہ منڈی سے اقصیٰ روڈ پر منتقل ہو گئے لیکن ان تینوں دوستوں کا یہ معمول نہ بدلا۔

کسی مستند ذریعہ سے تصدیق نہیں ہو پائی کہ وہ کوالیفائیڈ ڈاکٹر تھے تاہم ایک روایت کے مطابق انہوں نے امرتسر کے میڈیکل سکول سے ڈیڑھ سال کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ ان کے ایک بھانجے خلیل احمد (حال خلافت لائبریری) کا یہ بیان لائق توجہ ہے کہ اپنی سفید پوشی کے باوجود ڈاکٹر محمد احمد نادار مریضوں کا ہمیشہ مفت علاج کرتے تھے۔ خلیل نے ہی مجھے بتایا کہ اُن کے ماموں کو شکار کا بہت شوق تھا چنانچہ وہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، صاحبزادہ مرزا منصور احمد اور صاحبزادہ مرزا منور احمد کے ہمراہ اکثر و بیشتر شکار پر جاتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ تینوں بزرگان اِن کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے اور ان کے مخدوش مالی حالات کے پیشِ نظر موقع بموقع ان کی مالی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔

ایک اور ڈاکٹر جن کے ذکر کے بغیر یہ تذکرہ نامکمل رہے گا ڈاکٹر رشید احمد تھے جن کے والد، صوبیدار کرم بخش حسن ابدال کے سب سے پہلے احمدی تھے۔ ڈاکٹر رشید کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے گریجوایٹ تھے اور انہوں نے ایک طویل عرصہ اومان میں گذارا تھا لیکن ۱۹۶۹ء میں پاکستان آگئے اور ربوہ میں پارٹ ٹائم پریکٹس کا آغاز کیا۔ وہ صبح کے وقت فیصل آباد سرگودھا روڈ پر چھیالیس اڈہ سٹاپ پر قمر ہسپتال میں کام کرتے اور شام کے وقت محلہ دارالرحمت ربوہ میں۔ تاہم وہ بعد میں اسی شہر کے ہو کر رہ گئے۔

انہوں نے انگلستان سے ٹراپیکل میڈیسن میں ڈپلومہ حاصل کر رکھا تھا۔ بعد میں انہوں نے شعبہ امراضِ چشم میں بھی تخصیص حاصل کر لی اور ربوہ میں ان کی زیادہ شہرت اسی حوالے سے تھی۔ وہ ۱۹۸۴ء میں سویڈن منتقل ہو گئے جہاں انہیں بعض جماعتی خدمات کی توفیق ملی۔

ڈاکٹر رشید نے ۴ جنوری ۱۹۹۰ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات پر ان کی اہلیہ نے الفضل میں اپنے ایک مضمون میں ان کی سیرت کے بعض اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ تحریر فرماتی

ہیں کہ مرحوم اپنے پاس علاج کے لیے آنے والے مریضوں کے لیے دوا کے ساتھ ساتھ دعا بھی کرتے اور رات کے وقت بھی کوئی مریض آجاتا تو ماتھے پر شکن لائے بغیر اسے دیکھ لیتے تاہم ان کی سب سے بڑی جماعتی خدمت قرآنِ کریم کے سویڈش زبان میں ترجمے میں ان کی معاونت ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ مرحوم ایک پُر جوش داعی الی اللہ تھے اور اس حوالے سے ان کے ایک سویڈش ہیڈ ماسٹر سے بہت قریبی تعلقات پیدا ہو گئے۔ موصوفہ کے الفاظ میں ''قرآن کریم کا سویڈش زبان میں ترجمہ......... ایک احمدی سویڈش خاتون مکرمہ ڈاکٹر قانتہ صادقہ نے کیا۔ اس ترجمہ کی تصحیح بڑی محنت سے اس ہیڈ ماسٹر نے کی......... محترمہ ڈاکٹر صادقہ قانتہ کی طرف سے جُوں ہی سپارۂ قرآن بذریعہ ڈاک ملتا آپ اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر چل دیتے۔ اُن دنوں سخت برف باری ہو رہی تھی اور آپ پیدل ہی تقریباً آدھا کلومیٹر چل کر یہ فریضہ سرانجام دیتے اور تیس پاروں کے لیے تیس دفعہ ان کے گھر گئے۔ جب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تو بہت خوش ہوئے۔''

ڈاکٹر کیپٹن پیرزادہ گل حسن بھی جو حضرت ڈاکٹر پیر بخش متوطن دائرہ دین پناہ، رفیق حضرت مسیح موعود کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے ربوہ میں پریکٹس کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ سنین کا حتمی تعین تو میرے بس میں نہیں ہے لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ فیکٹری ایریا میں اپنے ہی گھر میں کلینک کرتے تھے اور اس دور میں ان کی خوب شہرت تھی۔ شنید ہے کہ بعد میں وہ محلہ دارالعلوم میں منتقل ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر کیپٹن بشیر احمد، ڈاکٹر محمد احمد، ڈاکٹر رشید احمد اور ڈاکٹر پیرزادہ گُل حسن کے علاوہ ایک اور ڈاکٹر جنہوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ربوہ میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کی ڈاکٹر نذیر احمد تھے جو برطانوی فوج کے ساتھ ایتھوپیا، مشرقی افریقہ، مصر اور نائیجیریا میں متعین رہے تھے۔ ان کے بیٹے، میجر خلیل احمد ناصر جو محلّہ دارالصدر غربی میں رہائش پذیر تھے اور فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد مدت سے انگلستان میں آباد ہو چکے ہیں راوی ہیں کہ ''جب اٹلی اور ایے سینیا میں جنگ شروع ہوئی تو حبشہ والوں کو ڈاکٹر نہیں ملتے تھے۔ چونکہ حبشہ کے آباء و اجداد نے صحابہ کو پناہ دی تھی چنانچہ والدِ گرامی حضرت مصلح موعود کے ارشاد پر حبشہ چلے گئے اور نہایت خطرناک مواقع پر اہالیان حبشہ کی خدمت کی۔ جنگ کے اختتام پر بادشاہ نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو میڈیکل آفیسر بنا دیا اور آپ مزید ۸ سال اس خدمت پر مامور رہے۔ بعدازاں اُردن، فلسطین، مصر، شام اور یمن وغیرہ میں قیام کرتے ہوئے ۱۹۵۳ء میں ربوہ پہنچے اور چند ہی روز بعد حضرت مصلح موعود کے ارشاد پر مغربی افریقہ روانہ ہو گئے۔ ۱۹۹۶ء میں واپس پاکستان آئے لیکن جلد ہی تحریک جدید کے تحت سیرالیون بھجوائے گئے۔ دو سال کے بعد برطانیہ جا کر ایک میڈیکل کورس کیا اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔ انہوں نے ۱۹۸۰ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ارشاد پر سکنڈے نیوین ممالک کا دورہ کیا نیز سپین، مراکش اور جنوبی افریقہ میں وقف عارضی کی بھی توفیق پائی۔ پھر کینیڈا اور امریکہ کا دورہ بھی کیا۔

ایک چیز جس کا میں ذکر ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ آپ کے کینیا کے سابق صدر جوموکینیاٹا سے بھی بہت اچھے تعلقات تھے جنہیں صدر بننے سے قبل قید کے دوران ڈاکٹر صاحب سے قرآن کریم پڑھنے کی سعادت

بھی حاصل ہوئی تھی۔

آپ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۷ء کو لندن میں وفات پا گئے اور تدفین بہشتی مقبرہ ربوہ میں ہوئی۔

ربوہ میں پرائیویٹ پریکٹس کے حوالے سے ایک اور اہم نام ڈاکٹر سردار علی کا تھا جو حضرت شیخ عبدالغنی کے صاحبزادے تھے۔ وہ گلگت سے ریٹائر ہو کر ربوہ آئے اور محلہ دارالصدر غربی میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے سعید احمد سکول اور کالج میں ہمارے ساتھ رہے۔ شروع دنوں کی بات ہے ایک بار وہ اپنے ہم جماعتوں کے سامنے انکشاف کر بیٹھے کہ وہ گلگت سے آئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، یار لوگوں نے ان کا نام ہی سعید گلگتی رکھ دیا۔ وہ پاکستان ائیر فورس کی ایجوکیشن برانچ میں رہے لیکن پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن جا بیٹھے۔ اب وہ بیت الفتوح کے قریب اپنے مکان میں رہائش پذیر ہیں۔ میں ۲۰۰۸ء میں انگلستان گیا تو ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ اُن دنوں اپنے حلقہ کے صدر تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی اہلیہ کا تعلق روس سے ہے جب کہ اس تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بیٹا قادیان میں بیاہا گیا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی ڈاکٹر سردار علی کی۔ میں ان سے ملا ہوں۔ سادہ طبیعت اور منکسر المزاج تھے اور کمزوری صحت کے باوجود آخری دم تک اہلِ محلّہ کی خدمت میں مصروف رہے لیکن وہ یہ کام محض جذبہ خدمت خلق کے تحت کرتے تھے اور کسی سے ایک پیسہ تک لینے کے روادار نہ تھے۔ شاید شاعر نے ایسے ہی کسی شخص کے بارے میں کہا ہے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ تو تھا ان سند یافتہ پرائیویٹ میڈیکل پریکٹیشنرز کا ذکر جو ایک لمبا عرصہ اپنے اپنے رنگ میں اہل ربوہ کی خدمت میں مصروف رہے۔ ان کے علاوہ کچھ غیر سند یافتہ افراد بھی اس میدان میں موجود تھے اور مریضوں کا ایک حلقہ ان کا بھی گرویدہ تھا۔ ان میں سے ایک سید عبداللہ شاہ تھے جو سید بشیر احمد شاہ منیجر دواخانہ خدمت خلق کے بھائی اور پیشے کے اعتبار سے ڈسپنسر تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ فضل عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور تعلیم الاسلام کالج کی ڈسپنسریوں میں کام کیا اور ربوہ میں میڈیکل پریکٹس بھی کی۔ ان کی ایک ٹانگ میں نقص تھا اور وہ لنگڑا کر چلا کرتے تھے۔ شریف آدمی تھے۔ وہ محلہ دارالرحمت وسطی میں احاطہ بیت الذکر خضر سلطانہ میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے ایک بیٹے حمید احمد شاہ کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ میں انسپکٹر تھے اور ان کی تقرری شیخوپورہ میں تھی۔ ان کی شادی جنید ہاشمی کی سب سے بڑی بیٹی قانتہ فردوس سے ہوئی جنہوں نے انگریزی میں ایم اے کر رکھا تھا۔ قانتہ گورنمنٹ کالج فار گرلز میں لیکچرر ہو گئیں اور بالآخر اسی کالج سے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئیں۔

سید عبداللہ شاہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حمید احمد شاہ کے پاس مقیم تھے۔ انہوں نے شیخوپورہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

اسی حوالے سے ایک اور اہم نام ملک دوست محمد کا تھا جو بہاولنگر کے کسی سرکاری ہسپتال میں آپریشن روم اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد غلہ منڈی میں ارشد میڈیکل ہال کے نام سے پریکٹس کرنے

لگے۔ ان کی دکان میرے دوست ماجد کی ریڈیو ورکشاپ سے ملحق تھی لہذا میں ماجد کے پاس جاتا تو
کے لیے ان کے پاس بھی رُک جاتا۔

جب انہیں سی ایس ایس میں میری کامیابی کا علم ہوا تو انہوں نے انکشاف کیا کہ ان کے بڑے
صاحبزادے، ملک محمد افضل نے پی سی ایس (جوڈیشیل) کا امتحان پاس کر رکھا ہے اور وہ رحیم یار خان میں
سول جج تعینات ہیں۔ اگر چہ میں اس وقت تک ملک محمد افضل سے ذاتی طور پر متعارف نہ تھا لیکن ان کے
انکشاف نے ہمارے درمیان ایک نئے تعلق کی بنیاد فراہم کر دی چنانچہ اس کے بعد میں جب بھی ان کی دکان کے
سامنے سے گذرتا ان سے ضرور ملاقات کرتا اور باتوں ہی باتوں میں ان کے اس صاحبزادے کے تازہ ترین
حالات سے بھی آگاہی ہو جاتی۔

ملک دوست محمد نے بعد میں یہ دکان چھوڑ دی اور اپنے گھر میں جو غلہ منڈی کے قریب واقع تھا پریکٹس
کرنے لگے تاہم اپنی وفات سے چار پانچ سال پہلے انہوں نے خود کو یادِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا۔ ایک بار میں
نے ان سے سوال کیا کہ کیا وہ پیدائشی احمدی تھے یا انہوں نے خود بیعت کی تھی تو انہوں نے بتایا ''میرے بڑے
بھائی نے جن کا نام عبداللہ تھا اپنے کسی خواب کی بنا پر احمدیت قبول کی تھی اور میں ان کے مشورہ پر جماعت میں
داخل ہوا تھا لیکن میری تربیت میں زیادہ حصہ میری اہلیہ کا ہے جو تعلیم الاسلام کالج میں ریاضی کے استاد
چوہدری حمید اللہ کی بڑی ہمشیرہ ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے قرآن مجید پڑھایا، بنیادی مسائل سکھائے اور ان ہی کی
کوشش سے میں نماز روزہ کا عادی ہوا۔''

اب ملک دوست محمد وفات پا چکے ہیں۔ انہوں نے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ اللہ تعالیٰ
نے دونوں بیٹوں کو دنیاوی جاہ و حشم کے ساتھ دین کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے
شعبوں میں شہرت و نیک نامی کمائی ہے اور دونوں جماعت کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں۔

ملک افضل جن کا ذکر سول جج کے طور پر آ چکا ہے سیشن جج کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد اب ریٹائر
ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ایک دیانتدار اور غیر جانبدار جج کے طور پر جو شہرت کمائی وہ انہیں ان کے ساتھیوں سے
ہمیشہ ممتاز کرتی رہے گی۔

مجھے اب یاد نہیں کہ ملک افضل کے ساتھ میری پہلی ملاقات کہاں اور کب ہوئی تھی لیکن اتنا ضرور یاد ہے
کہ جب میں نے پہلی بار ان سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ سیشن جج کے عہدہ پر ترقی پانے
کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تعینات تھے۔ اُن دنوں استاذی المکرّم عزیز طاہر میونسپل کالج ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پڑھاتے
تھے اور ہم دونوں ان سے ملاقات کے لیے اکٹھے ان کے گھر گئے تھے مگر اس روز وہ شہر سے باہر تھے۔ بہرحال اس
بحث سے قطع نظر کہ ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی مجھے اِن کے ساتھ کئی دفعہ ملاقات کا موقع ملا اور وہ ہمیشہ
خندہ پیشانی سے ساتھ پیش آتے رہے۔ مجھے ذاتی طور پر تو کبھی انہیں کوئی سفارش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی
لیکن ان کی شہرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ''میرٹ'' کا ہمیشہ احترام کیا اور کسی مصلحت کو اس راہ میں

اس کے ساتھ ہی بعض جماعتوں نے ملک افضل کی ممکنہ تقرری کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ روزنامہ ''پاکستان'' لاہور (۱۸ دسمبر ۱۹۹۶ء) کے مطابق ''مجلس تحفظ ختم نبوت نے لاہور ہائیکورٹ میں قادیانی جج مقرر کرنے پر حکمران حکومت کے خلاف دھرنا تحریک شروع کرنے کی دھمکی دے دی ہے۔ یاقت ہوئے مولانا سیف الدین سیف، سعید الرحمان، فتح محمد کے علاوہ دیگر تمام مکاتب فکر کے علماء نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ چیف جسٹس خلیل الرحمان نے قادیانی ججوں کی تقرری نہ کر کے انتہائی قابل تحسین کارنامہ سرانجام دیا لیکن انہیں اس ''جرم'' کی پاداش میں سپریم کورٹ بھیج دیا گیا۔''

اسی اخبار نے ۲۱ دسمبر ۱۹۹۶ء کو لکھا: ''سنی تحریک کے کارکنوں نے مبینہ طور پر لاہور ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس خلیل الرحمن خان کو ایک قادیانی سیشن جج کو ہائیکورٹ کا جج بنانے سے انکار کرنے پر سپریم کورٹ بھیج دینے کے خلاف روزنامہ پاکستان کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا۔ مظاہرین نے کہا کہ قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں، کوئی قادیانی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کی طرح وزیر یا ہائیکورٹ کے جج کے عہدے کا حلف اُٹھا سکتا ہے۔''

احمدیوں کا سب سے بڑا ہتھیار تو دعا ہے۔ ملک افضل بھی حالات سے مایوس ہو کر اللہ ہی کو مدد کے لیے پکارتے رہے اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی خدمت میں بھی بار بار دعا کے لیے عرض کرتے رہے۔ جب حضور کو ان کی طرف سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ان کی دادرسی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تو حضور نے انہیں ایک خط لکھ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حضور نے اس خط میں ملک افضل کو ''پیارے مکرم ملک افضل صاحب'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ حضور کے چھ اپریل ۱۹۹۸ء کے اس خط کا متن ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے: ''آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ ماشاء اللہ صاحب عقل و دانش ہیں اور ایمان کی قوت سے مالا مال ہیں۔ یہی آپ کی ڈسٹنکشن ہے۔ ان دنیا والوں سے کیا شکوہ؟ یہ لوگ تو اپنے آپ سے انصاف نہیں کر سکتے آپ سے کیا کریں گے؟ جو مل گیا ہے اس کو غنیمت جانیں۔ جب معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے تو پھر وہ یقیناً بہت عمدہ فیصلہ فرمائے گا۔ اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ گھر میں سب کو میری طرف سے محبت بھرا اسلام اور عید مبارک۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کا یہ فرمان کہ ''جو مل گیا ہے اس کو غنیمت جانیں۔ جب معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے تو پھر وہ یقیناً بہت عمدہ فیصلہ فرمائے گا'' کس شان سے پورا ہوا، اس کا اندازہ صرف واقفانِ اندرون خانہ ہی لگا سکتے ہیں۔ اگرچہ ملک محمد افضل ہائیکورٹ تو نہ پہنچ پائے لیکن ان کی ریٹائرمنٹ کے تقریباً ایک سال بعد انہیں ایک معاہدہ کے تحت ڈپٹی پراسیکیوٹر جنرل (نیب) مقرر کر دیا گیا جہاں انہوں نے بہت اچھی شرائط پر مسلسل سات سال تک کام کیا۔ سید مینو چہر نے اپنی سوانح عمری ''میرے شب و روز'' میں کیا خوب لکھا ہے کہ ان کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ڈپٹی کمشنری کے زمانہ میں ''ملک افضل بڑے دیانتدار اور خلیق جوڈیشل افسر تھے۔ بڑی اچھی شہرت کے مالک۔ ہائی کورٹ کی ججی کے لیے نہایت موزوں مگر چونکہ عقیدے کے لحاظ سے قادیانی تھے اس لیے کچھ رخنہ پڑ گیا۔ بہرحال خدا تعالیٰ کی ذات نے انہیں پوری طرح خوش و خرم رکھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد معاہدہ

ہوا جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نماز با جماعت کی ادائی میں تو باقاعدہ تھے ہی وہ تہجد بھی بیت الذکر میں ا
کرتے تھے اور اس معاملہ میں کبھی سستی نہ کرتے۔

بھٹی صاحب کے ایک صاحبزادے، مودود احمد بھٹی سکول میں ہم سے سینیئر تھے لیکن وہ ذہنی طور پر متا
گئے۔ آہستہ آہستہ ان کی یہ بیماری بڑھ گئی اور وہ دنیا و مافیہا سے لاتعلق ربوہ کی سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ دل ما
بطور پینٹر محنت مزدوری بھی کر لیتے۔ سُنا ہے اب وہ بھی اس دنیا میں موجود نہیں رہے۔

ربوہ کے باقی ہومیو پیتھس میں سے ایک اہم نام ڈاکٹر راجہ نذیر احمد ظفر کا تھا۔ انہوں نے غلہ منڈی ربوہ
میں غالباً اس دکان میں جہاں پہلے ڈاکٹر محمد احمد فرید آبادی کلینک کرتے تھے محدود پیمانے پر اپنے کام کا آغاز کیا
لیکن جلد ہی اپنے کاروبار میں ایک انفرادیت پیدا کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایسی بلندیوں پر پہنچا دیا جہاں
ربوہ کا کوئی اور ہومیو پیتھ نہ پہنچ پایا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ والدین اپنے چھوٹے بچوں کی نشوونما کے بارے
میں کس قدر حساس ہوتے ہیں اور ان کی ذرا سی تکلیف اور بے چینی یا کمزوری انہیں کس قدر پریشان کر دیتی ہے
چنانچہ انہوں نے آغازِ کار ہی میں بعض ایسے مرکبات تیار کرنا شروع کر دیئے جن کی طلب روز بروز بڑھتی گئی۔
''بے بی ٹانک'' ان ادویہ میں سے ایک تھی۔ یہی نہیں انہوں نے حیوانات کے لیے بھی بعض ایسی دوائیں تیار کیں
جو دیہی علاقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں سے ایک دوا مویشیوں کے اپھارہ کے لیے تھی اور اس کا اشتہار
الفضل میں بکثرت آتا رہتا تھا۔ ایک منظوم اشتہار جو ''تریاقِ ربوہ'' کے عنوان سے شائع ہوتا رہا کچھ اس طرح تھا:

ہے شغل و بریسم خطرناک سا چارہ
حیواں کوئی مر جائے تو کتنا ہے خسارہ
ربوہ میں ہر اک زہر کا تریاق ہے پیدا
راجہ سے کہو بھیج دے اکسیر اپھارہ

انہوں نے ایک جامع کیور یو سسٹم آف میڈیسن متعارف کرایا جس کے تحت تقریباً ہر مرض کا کیور تیار
کیا گیا۔ ان کی تحقیق کی معراج وہ خوشبوئیات تھیں جن کے ذریعہ وہ مختلف امراض کے علاج کا دعویٰ کرتے تھے۔

۱۹۶۳ء میں راجہ نذیر (جو عوام الناس میں راجہ ہومیو کے نام سے مشہور ہو گئے تھے) غلہ منڈی سے
گول بازار منتقل ہو گئے اور اس دکان کا افتتاح صاحبزادہ مرزا رفیع احمد نے کیا۔

راجہ نذیر کا ''ایجاد کردہ'' کیور یو سسٹم تو خاصا مقبول ہوا لیکن ان کا دریافت کردہ امراضِ مردانہ کا علاج
سخت تنقید کا نشانہ بنا۔ مجھے یاد ہے ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر ان کی طرف سے ربوہ کی شاہراہوں پر اور خصوصاً
گول بازار میں لوہے کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں کئے گئے جن پر اس کی تشہیر کی گئی تھی۔ ان اشتہاروں میں
''طاقت'' کا لفظ بہت نمایاں تھا اور دور سے پڑھا جاتا تھا۔ سُنتے تھے کہ اس طاقت کی بنیاد ایک انجکشن ہے۔ یہ
مریض پر یہ انجکشن آزمایا گیا تو اسے بے حد تکلیف ہوئی اور اس کی چیخ پکار پر راجہ نذیر کو اپنی اس دوا کی مزید تشہیر
فوری طور پر روک دیا گیا اور یہ بورڈ فوری طور پر اُتروا دیئے گئے۔

یوں تو میں راجہ نذیر سے پہلے سے متعارف تھا لیکن ایک بار جب انہیں محلہ انڈیا کی طرف سے ...
وہ مجھ سے ملاقات کے لیے فیصل آباد میں میرے دفتر تشریف لائے اور اپنا وزٹنگ کارڈ مجھے دیا۔ ان کارڈ
کے فاضل عربی، ایم اے (سیاسیات) اور ایل ایل بی ہونے کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کی تعریف ... تھی
انہوں نے کیوریٹو سسٹم آف میڈیسن کا موجد ہونے کے علاوہ اپنے بارے میں یہ ... بھی ... تھا
مائنڈ اینڈ میموری ایکسپرٹ ہیں۔ مجھے یہ کارڈ رائج الوقت کارڈوں سے خاصا مختلف محسوس ہوا چنانچہ میں نے اسے
بطور سوونیئر مدت تک اپنے پاس سنبھالے رکھا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھے اور میں نے ان کی ... کی
کوشش کی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس ملاقات کے بعد جب بھی ملے بہت عزت واحترام کے ساتھ۔

مرحوم یقیناً بے شمار ذاتی خوبیوں کے مالک ہوں گے لیکن ان کی وفات پر یوسف سہیل شوق کے قلم سے
الفضل میں شائع ہونے والا مضمون پڑھ کر اندازہ ہوا کہ خدا تعالیٰ نے ان کے کاروبار میں بہت برکت دے رکھی
تھی اور اپنی وفات کے وقت وہ ربوہ میں سب سے زیادہ چندہ حصہ آمد اور چندہ تحریک جدید ادا کرنے والے
تھے۔ انہوں نے اکتیس اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ختم ہونے والے تحریک جدید کے سال میں دو لاکھ سات ہزار سات سو ...
روپے چندہ دیا تھا۔

راجہ نذیر احمد ظفر کو شعر گوئی کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ وہ مختلف موضوعات پر نظمیں لکھتے جو سلسلہ کے بعض
اخبارات وجرائد میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ مشاعروں میں ان کا کلام دلچسپی سے سنا جاتا تھا اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع
نے ان کے کلام کا تعریفی رنگ میں ذکر فرمایا ہے تاہم ابھی تک یہ کلام کتابی شکل میں نہیں شائع ہو سکا۔ میری
معلومات کے مطابق ان کی ''نعتِ مرکب'' اور ''بھارت نامہ'' کے عنوان سے ایک طویل نظم دو الگ الگ کتابچوں
کی شکل میں شائع ہوئی ہیں اور پڑھنے کے لائق ہیں۔ ''بھارت نامہ'' کے اندرونی ٹائٹل پر انہوں نے اپنی ایک
تصویر بھی دے رکھی ہے جس سے ان کے مجاہدانہ جوش وجذبے کا اظہار ہوتا ہے۔

ربوہ کے ابتدائی دندان سازوں میں سے ایک مفیض المعارف تھے جنہوں نے محلہ دارالصدر غربی میں
موجودہ بیت الانوار سے ملحق کسی مکان میں کلینک قائم کر کے اپنی پریکٹس کا آغاز کیا تھا۔ ایک محلے کی اندر قائم اس
کلینک پر دانتوں کے کتنے مریض آسکتے تھے چنانچہ جلد ہی انہوں نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی اور غلہ منڈی میں
منتقل ہو گئے لیکن غالباً وہاں بھی ان کا کام نہ چلا اور وہ بالآخر ربوہ چھوڑ گئے۔

میں نے سن رکھا تھا کہ مفیض المعارف مجیب الرحمٰن، سابق امیر جماعت احمدیہ راولپنڈی کے خاندان میں سے
ہیں چنانچہ حال ہی میں ان سے اس حوالے سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا: ''مفیض المعارف مولوی بذل الرحمن
کے بیٹے، انشائیہ نگار حامد برگی کے بھائی اور میرے تایا زاد تھے۔ وہ آرمی کی میڈیکل کور میں رہے تھے اور انہوں
نے وہیں سے دندان سازی کے شعبہ میں تربیت حاصل کی تھی۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ میں آباد
ہونے کی کوشش کی لیکن ان کا کام نہ چل سکا چنانچہ وہ کراچی منتقل ہو گئے۔ اب تو ان کی وفات پر کئی سال گذر
چکے ہیں۔''

مفیض المعارف کے بعد سعادت محمود اور جاوید محمود نام کے دو بھائیوں نے بھی ربوہ میں دانتوں کا کام شروع کیا۔ یہ دونوں سکول کے زمانہ میں میرے کلاس فیلو تھے لیکن میٹرک کے بعد چنیوٹ میں یہ کام کرنے لگے۔ ہماری آپس میں بے تکلفی تھی چنانچہ جب انہوں نے کلینک قائم کیا تو بعض دفعہ میں اور میرے بعض دوست ان سے ملاقات کے لیے ان کے ہاں جابیٹھتے تھے۔ پھر وہ ربوہ میں غلہ منڈی میں منتقل ہو گئے۔ بتایا کرتے تھے کہ وہ مصنوعی دانت بہت خوبصورت تیار کر لیتے ہیں لیکن اس زمانے میں ہمارے پاس قدرت کی طرف سے فراہم کردہ دانت موجود تھے اس لیے ان کے اس دعویٰ کی تصدیق کا موقع نہیں مل سکا۔

جاوید کئی سال پہلے وفات پا چکے ہیں جب کہ سعادت کراچی میں ہیں لیکن وہ بھی دندان سازی کے شعبہ سے الگ ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر شریف احمد واحد ڈینٹسٹ تھے جنہوں نے سالہا سال تک چنیوٹ اور پھر ربوہ میں پریکٹس کی۔ میرا ان سے بھی بطور مریض کبھی واسطہ نہیں پڑا لیکن کچھ لوگ ان کے کام کے معترف تھے۔ سنتے ہیں اب لندن منتقل ہو چکے ہیں لیکن اقصیٰ روڈ پر ان کے نام کا بورڈ آج بھی لگا ہوا ہے۔

ربوہ میں جہاں فضل عمر ہسپتال، پرائیویٹ میڈیکل پریکٹیشنرز اور ہومیوپیتھس اپنے اپنے رنگ میں مخلوقِ خدا کی خدمت میں مصروف تھے وہیں بعض مریض جو ''دیسی علاج'' میں یقین رکھتے تھے اپنے مسائل کے حل کے لیے اطبا کی طرف رجوع کرتے۔ ان میں سے کچھ طبیب ربوہ میں مقیم تھے اور مختلف ناموں سے دواخانے چلا رہے تھے لیکن بعض دواخانے ربوہ سے باہر ہونے کے باوجود اپنی مصنوعات اور خدمات کے حوالے سے اس شہر میں بے حد مقبول تھے۔ ان میں سے ایک لاہور کا ''دواخانہ نورالدین'' تھا جس کے مدارالمہام حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے صاحبزادے، میاں عبدالوہاب عمر تھے۔ اس دواخانے کی مصنوعات حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے نسخہ جات پر مبنی تھیں اور نسوانی امراض اور اولادِ نرینہ کے لیے انتہائی مؤثر سمجھی جاتی تھیں۔ یہ ادویہ غیر از جماعت احباب میں بھی بے حد مقبول تھیں چنانچہ اس دواخانے کے ایک اشتہار میں مولانا غلام رسول مہر کا ایک خط بھی شائع ہوتا رہا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا: ''میرے گھر میں پے درپے چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ برادرم حکیم عبدالوہاب صاحب عمر سے سرسری طور پر ذکر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل (یعنی ان کے والد ماجد حکیم نورالدین صاحب مرحوم) کا ایک نسخہ ہے وہ گھر میں استعمال کرائیں۔ چنانچہ میں نے خدا کا نام لے کر وہ نسخہ گھر میں استعمال کرا دیا۔ خدا کی رحمت سے اُس کے بعد یکے بعد دیگرے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ اسی طرح میرے پڑوس میں ایک صاحب رہتے تھے۔ ان کے بھی لڑکیاں ہی تھیں، دو یا تین۔ میری بیوی نے ان کے گھر میں بھی وہی نسخہ استعمال کروایا۔ خدا کے فضل سے اُن کے ہاں بھی دو لڑکے پیدا ہوئے۔ میرا عقیدہ ہے کہ لڑکے یا لڑکی کا ہونا صرف خدا کی رحمت اور اُس کے فضل پر موقوف ہے لیکن اس سلسلے میں جائز تدبیریں معالجات کی طرح گناہ نہیں ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس ضمن میں حکیم صاحب مرحوم والا نسخہ بہت ہی مؤثر ہے۔''

احمد آباد ضلع گوجرانوالہ میں ایک احمدی، حکیم مبارک احمد طبیبِ عجائب گھر کے نام سے ایک دواخانہ چلا

[illegible]تے تھے۔ ان کی مصنوعات کا اشتہار وقتاً فوقتاً الفضل میں آتا رہتا تھا۔ ان میں سے ایک [illegible] جام عشق بھی تھا۔

قارئین کرام اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ زد جام عشق کا اصل نسخہ [illegible] نایاب [illegible] معروف ترین نسخہ جات میں سے ہے۔ زعفران، دارچینی، جائفل، افیون، مشک خالص، مقوی [illegible] مروارید اور روغن سم الفار سے تیار شدہ اس دوا کی خوبیاں تو اس کا کوئی استعمال کرنے والا ہی [illegible] طبیہ عجائب گھر کے شاعرِ نامعلوم ہمیشہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ موسم سرما کا استقبال زد جام عشق سے [illegible] کرنا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

اچھا ہوا کہ موسمِ گرما گذر گیا
سرما جو آگیا تو زمانہ بدل گیا
اِک خوشگوار تازہ بُرودت ہوا میں ہے
کچھ برف سی ملی ہوئی ٹھنڈی ہوا میں ہے
دھوپ اور آگ کے بھی مزے خوب لیجئے
جب خون منجمد ہو تو ورزش بھی کیجئے
ٹھنڈا نہ روح کے لیے ہو جسم کا غلاف
سردی اگر ہے تیز تو پھر اوڑھیئے لحاف
بوڑھوں کے سَرد خُوں کو حرارت بھی چاہیے
ہر نوجواں کو جوشِ طبیعت بھی چاہیے
لازم ہے طاقت اور نقاہت میں امتیاز
بتلاؤں خیر مقدمِ سرما کا ایک راز
سرما جو آگیا ہے تو فکر اس کی کیجئے
زد جامِ عشق بہ نسخہ خاص آپ لیجئے

قیس مینائی ایک مشہور احمدی شاعر ہو گذرے ہیں۔ وہ حکیم اجمل خان سے فیض یافتہ اور اجمل طبیہ کالج، امرتسر سے سند یافتہ تھے۔ کراچی کی وِلسن سٹریٹ میں دواخانہ کرتے تھے۔ ان کی تیار کردہ ادویہ میں سے ایک ''دم دَم'' تھی جو قلتِ خون کے مریضوں کے لیے تیار کی گئی تھی۔ قیس مینائی کا دعویٰ تھا کہ یہ دوا نہیں ''قلزمِ شفا'' ہے۔ وہ ہمیشہ مریضوں کو مشورہ دیا کرتے کہ:

ایک حَب صبح اور اک حَب شام
کھا کے دیکھو ملے گا یہ انعام
معدہ، امعاء اور جگر، گردے
زندہ ہو جائیں گے یہ سب مُردے

اس سے رگ رگ میں خون دوڑے کا
موجزن ہوگا خون کا دریا
اور وہ خون صاف اور تازہ
ہوگا چہروں پہ حسن کا غازہ
بات تو جب ہے کھا کے ہم دیکھیں
اور خود آزما کے ہم دیکھیں
اصل میں تجربہ ہی نسب ہے
بات کھل جائے بات تو جب ہے

ان کی تیار کردہ دوسری اشتہاری دوا ''روحِ شفا'' تھی جو دمہ اور ضیق النفس کے مریضوں کے لیے تیر بہدف دوا کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ آپ دیکھیئے تو سہی اس دوا کے کیا کیا فوائد گنوائے جاتے تھے:

دوش پر بادِ صبا اپنے خبر لائی ہے
یعنی بازار میں ایک تازہ دوا آئی ہے
دمہ و ضیق نے مرنے کی قسم کھائی ہے
ہم غریبوں کو ستانے کی سزا پائی ہے
آج کے پرچوں میں اعلامیہ تازہ نکلا
للہ الحمد دمہ کا بھی جنازہ نکلا
گھر میں سینہ کے یہ کمبخت اکڑ بیٹھا تھا
بے طرح چھاتی کو بد ذات جکڑ بیٹھا تھا
دل کی نالی کی طرف ایسا اکڑ بیٹھا تھا
سانس تو ایک طرف دل کو پکڑ بیٹھا تھا
للہ الحمد دمہ کی بھی دوا آ ہی گئی
صورت روحِ شفا ایک شفا آ ہی گئی
دمہ سینہ سے نکل کر ہوا کچھ ایسا فرار
منہ چھپانے کو نہ دنیا میں ملی جائے قرار
دم میں دم آ ہی گیا قیس دوا کے دم سے
دمہ بے دم ہوا ہے روحِ شفا کے دم سے

قیس مینائی کا اصل نام محمد یعقوب خان تھا۔ وہ نجیب آباد کے رہنے والے تھے جہاں وہ ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ابتدائے جوانی سے وہ عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ سید سلیم شاہجہانپوری مؤلف ''شعرائے احمد

کی روایت کے مطابق انہوں نے تحریک خلافت کے دوران ایک ایسے اجلاس کی جس کی صدارت کی ... ابوالکلام آزاد، جواہرلال نہرو اور مولانا محمد علی جیسی عظیم شخصیات نے تقاریر کی تھیں۔
وہ ۱۹۲۷ء میں حلقہ بگوشِ احمدیت ہوئے۔ اس فیصلے کی بنا غالباً کوئی خواب تھا جو انہوں نے ... "استخارہ" کے عنوان سے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

کیا تصور میں استخارہ تو دیکھا میں نے عجب نظارہ
کھڑی ہے اک نوجواں حسینہ مثالِ تصویرِ ماہ پارہ
بڑے وقار اور تمکنت سے کھڑی ہے مالا گلے میں ڈالے
چمک دمک اور روشنی میں ہر ایک موتی ہے اک ستارہ
جو نام پوچھا تو احمدیت، مقام پوچھا تو قادیاں ہے
جو کام پوچھا محمدیّت، حدود پوچھیں تو کُل جہاں ہے
قدم جمائے وہ دے رہی ہے دلوں کو اک درسِ استقامت
کہ ہر (......) مرد و عورت کے سامنے ایک امتحاں ہے

شاید یہ بات قارئین کے لیے باعثِ دلچسپی ہو کہ قیس مینائی علمِ توجہ یا ہپناٹزم میں خصوصی مہارت رکھتے تھے اور انہیں ایک بار علامہ اقبال کے سامنے بھی اس کے مظاہرے کا موقع ملا۔ انہوں نے اس واقعہ کی روداد مجلّہ "حمایتِ اسلام" میں بیان کی تھی جہاں سے اسے غلام احمد پرویز نے اپنی کتاب "تصوف کی حقیقت" میں نقل کیا ہے اور یہاں یہ واقعہ اسی کتاب میں سے پیش کیا جا رہا ہے۔

قیس مینائی لکھتے ہیں: "ایک روز ڈاکٹر اقبال کا ایک پیغام پہنچا کہ جلد پہنچیے۔ ڈرائیور غالباً ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کا تھا۔ میں بعد نمازِ مغرب کوٹھی پہنچا تو دس گیارہ حضرات تشریف فرما تھے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی بھی موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو روحانیات سے بھی شغف ہے۔ اس کے بعد ایک صاحب سے تعارف کرایا اور کہا کہ یہ صاحب لنڈن سے تشریف لائے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ ایک شخص کی جائیداد کا ایک اہم کاغذ گم ہو گیا۔ چھ ماہ کی تلاشِ بسیار کے باوجود جب نہ ملا تو ایک عالمِ روحانیات سے رجوع کیا گیا تو اس نے کسی روح کو بلا کر دریافت کیا اور معلوم ہوا کہ وہ کاغذ تمہارے گھر میں بڑے بکس کے نیچے فرش پر پڑا ہے چنانچہ وہ اسی جگہ سے مل گیا۔ اس پر آپ کے وطن کے یہ نوجوان کہنے لگے کہ ڈاکٹر قیس مینائی ہمارے وطن نجیب آباد کے ہیں۔ ڈیرا دون میں کرن پورہ محلّہ میں قاضی محمد اکرم صاحب انسپکٹر پولیس کے بنگلہ پر انہوں نے بھی ایک روح کو بلا کر ایک پوشیدہ راز معلوم کر کے بتایا تھا۔ اس پر علامہ تاجور صاحب نے فرمایا کہ قیس مینائی تو ہمارے ہم وطن اور ہم محلّہ ہیں۔ مجھے تو ان کے اس علم کا علم نہیں اور وہ آج کل ڈاکٹر مسعود قریشی ہومیوپیتھ کے بالکل قریب میڈیکل پریکٹس کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے کہ اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔"

اس کے بعد قیس مینائی نے لکھا ہے: ''خاکسار نے دل میں سوچا کہ اگر ابھی صاف جواب دوں کہ یہ سب ڈھکوسلہ بازی ہے، کوئی روح وغیرہ نہیں آتی تو تفریح کیا ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ آخر روح کو بلا کر آپ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا تاجور کو نیند نہ آنے کا مرض لاحق ہے۔ کسی بڑے طبیب کی روح کو بلوا کر کوئی نسخہ معلوم کریں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو خاندانِ شریفی کے کسی طبیب مثلاً محمود خان دہلوی کی روح کو بلا دوں؟ فرمایا کہ مناسب ہے چنانچہ میں نے عرض کیا کہ ایک قدِ آدم شیشہ اور ایک گلاس پانی منگا لیجئے۔ فرمایا کہ اگر قدِ آدم آئینہ نہ ہو، نصف قد ہو تو۔ میں نے کہا وہی سہی چنانچہ ایک سنگار میز آ گئی اور پانی کے گلاس میں سے تولہ بھر پانی بھاپ بن کر آئینہ کو دھندلا گیا اور اس پر ایک شبیہہ نمودار ہوئی۔

آواز آئی کہ السلام علیکم! محمود خان حاضر ہے۔

میں نے کہا کہ ہمارے مولانا تاجور صاحب کو سہر کا مرض ہے۔ نیند نہیں آتی۔

آواز آئی کہ قیس صاحب وہ جو آپ کا اپنا مجوزہ نسخہ، خوابِ راحت ہے وہ استعمال کرائیں۔ ان شاءاللہ شفاءِ کلی ہوگی۔

آواز آئی ایک گلاس پانی کا تو پلایئے۔

میں نے عرض کیا کہ بھلا روحوں کو بھی کہیں پیاس لگتی ہے۔

جواب ملا کہ آپ کی دنیا میں جو آ گئے۔ چنانچہ گلاس اُٹھا اور شبیہہ کے منہ سے جا لگا۔ چھت کو چھو کر پھر آہستہ سے میز پر آ کر ٹھہر گیا۔

آواز آئی الحمدللہ! جزاک اللہ! اور تصویر غائب۔

تمام حاضرینِ مجلس کی حیرت و استعجاب کی حد نہ تھی۔ دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور علامہ اقبال اور علامہ تاجور بڑی حیرت سے مجھے لپٹ لپٹ گئے۔''

قیس مینائی لکھتے ہیں کہ انہوں نے ''شوگر اَوف مِلک میں یونہی ذرا سی کوئی دوائی ملائی اور اسے مولانا تاجور صاحب کو دے دیا۔ چونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ حکیم محمود خان دہلوی کی تجویز کردہ دوائی ہے اس لیے انہیں اس عقیدت کی بنا پر نیند آنی شروع ہوگئی اور ہفتہ عشرہ کے بعد اچھی طرح نیند آنے لگ گئی۔ ایک ماہ کے قریب گذر گیا تو پھر علامہ اقبال کی جانب سے دعوت آئی کہ آئندہ اتوار کی شام کھانا ہمارے یہاں کھایئے اور اس عجیب و غریب علم پر روشنی ڈالئے چنانچہ اتوار کو میں حاضر ہوا۔ ہال کمرہ میں صوفہ سیٹ، کرسیاں وغیرہ اُٹھا دی گئی تھیں اور سب حاضرین قالینوں پر بیٹھے تھے۔ گاؤ تکیئے لگے تھے۔ پیچوان چل رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ اُس روز جب میں نے وہ عمل کیا تھا، اُس مجلس میں جو حضرات موجود تھے اس وقت ان میں سے کتنے یہاں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ بشمول دونوں علاماؤں کے نو حضرات اور بھی تھے اور آج دو شخصیتیں غیر حاضر ہیں اور نو افراد موجود ہیں۔

میں نے پوچھا: کیا آپ حضرات نے محمود خان دہلوی کی روح کو اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا۔

سب نے جواب دیا: ہم نے دیکھا۔

پھر میں نے پوچھا روح کی آواز سنی؟

جواب: جی ہاں سنی بلکہ روح کو پانی پیتے بھی دیکھا۔

میں نے پوچھا مولانا اب آپ فرمائیے جو نسخہ بتایا گیا وہ میں نے آپ کو استعمال کرایا [illegible]

فرمانے لگے: پہلی ہی رات میں چار گھنٹے پھر بتدریج پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے [illegible]

خراب نیند پھر نارمل ہوگئی۔ چھ گھنٹے سوتا ہوں اور دماغ میں ایک عجیب سکون، تقویت اور قلب میں فرحت و بشاشت محسوس کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ قرآنِ حکیم کے مطالعہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ برزخ سے [illegible] یوم نشور سے قبل کسی روح کو اپنے مقام سے مفر نہیں۔ ابرار کی ارواح بطور [illegible] علیین میں اور بدوں کی ارواح بحوالات سجین میں مقیم ہیں۔ روحیں وہاں سے کہیں آ جا نہیں سکتیں اور آپ حضرات فرماتے ہیں کہ ہم نے روح کا مشاہدہ بھی کیا اور روح کی آواز بھی سنی۔ اب یہ فرمائیے کہ آپ حضرات کا مشاہدہ غلط ہے یا قرآنی نظریہ غلط ہے؟

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے مولانا تاجور سے درخواست کی۔

وہ فرمانے لگے: ہم نے آپ کو یہ تکلیف دی ہے۔ آپ ہی اس پر روشنی ڈالئے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ ماشاء اللہ فاضلِ دیوبند بھی ہیں اور پنجاب یونیورسٹی سے بھی فاضل ہیں۔ قرآنی علوم کے متعلق آپ سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔

فرمانے لگے: اچھا۔ زیادہ نخرے نہ دکھا۔

اس کے بعد میں علامہ اقبال کی طرف متوجہ ہوا اور عرض کیا کہ آپ ہی فرمائیے۔

کہنے لگے: قرآن بھی سچا اور ہمارا مشاہدہ بھی سچا۔ صرف ہمارا فہم سچا نہیں ہے۔ ہم آپ کے تجربہ اور آپ کے نظریات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ قرآن ہی سچا ہے اور آپ حضرات کا مشاہدہ غلط اور سراسر ایک فریبِ نظر تھا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

وہ کسی کی روح نہ تھی۔ میرے ذہن میں میرے استاد حکیم محمود خاں دہلوی کا جو تصور تھا وہ میں نے علم توجہ کے اثر سے آئینہ پر بھاپ سے دھندلا کر کے آپ حضرات کو دکھایا اور وہ میری اپنی آواز تھی۔“

لیجئے صاحب! بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں ذکر کر رہا تھا بیرون ربوہ کے ان دواخانوں کا جن کی دوائیں احبابِ جماعت میں بہت مقبول تھیں اور سیالکوٹ کا شفاخانہ رفیق حیات بھی ان میں شامل تھا۔ آسٹریلین دواخانہ لاہور کا اشتہار بھی الفضل میں آتا رہتا تھا۔ مرزا محمد شریف بیگ جو پہلے گجرات میں رہتے تھے لیکن بعد میں چنیوٹ منتقل ہوگئے ”سرمہ تریاق چشم“ کے موجد تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ سرمہ جو ”خالص ممیرا اور دیگر قیمتی اجزاء سے مرکب شدہ

سائنٹفک طریق پر سال بھر میں ایک ہی مرتبہ تیار ہو سکتا ہے۔ گذشتہ تین برس سے بڑے بڑے ڈاکٹروں، نامور حکیموں، پروفیسروں، افسروں، پیشہ وروں، طالبعلموں اور پبلک کے عام افراد سے اپنے سریع التاثیر اور [illegible] ہونے کی [illegible] اسنادات حاصل کر چکا ہے۔ ککرے خواہ کس قدر پرانے ہوں جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ آنکھوں کی اندرونی بیماری [illegible] زائل کر دیتا ہے۔ جو مریض لیمپ کی روشنی میں آنکھ نہ کھول سکتے تھے چند یوم کے استعمال سے اپنا مطالعہ شروع [illegible] کے قابل بن گئے ہیں۔ بعض نے اس کو معجزہ قرار دیا۔ باوجود زُود اثر ہونے کے بالکل بے ضرر ہے۔''

تونسہ شریف کے ڈاکٹر عبدالقادر خان نے ''تریاقِ سانپ'' کے نام سے ایک دوا تیار کر رکھی تھی جسے [illegible] کا آٹھواں عجوبہ قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''دنیا میں آج تک سانپ کے جتنے تریاق ایجاد ہوئے ہیں، تمام اکسیر الاثر اور معجز نما تریاق کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ تریاق ایک جرمن خاتون کا عطیہ ہے جسے صدہا مریضوں پر استعمال کر کے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی جا چکی ہے۔ سانپ خواہ کتنا ہی زہریلا ہو، مارگزیدہ سمّیت کے باعث بیہوش ہو کر چند گھڑیوں کا مہمان نظر آ رہا ہو ایسی گئی گذری حالت میں اس قیمتی دوا کی ایک ننھی سی ٹکیہ استعمال کرا کر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دیکھیے۔ اس دوائی کے استعمال سے سانپ کا زہر چند منٹوں میں زائل ہو جاتا ہے۔ اس پر طُرہ یہ کہ قے اور دست بھی شروع نہیں ہوتے اس لیے اسے اگر دنیا کا آٹھواں عجوبہ [illegible] جائے تو بے جا نہ ہو گا۔''

''تریاقِ سانپ'' کے ذکر نے مجھے یاد دلا دیا ہے کہ ایک دفعہ ایک سپیرا نہ جانے کہاں سے گھومتا گھامتا ہمارے محلے میں آ نکلا اور اس نے ہمارے گھر کے تقریباً سامنے آ منڈلی لگائی۔ اس نے اپنا ساز و سامان کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھ دیا اور اپنے بین کی آواز سے محلے بھر کے بچوں کو اکٹھا کر لیا۔ جب وہ سانپ کا تماشہ دکھا کر بچوں بالوں سے اپنا حق الخدمت وصول کر چکا تو ابا جی اپنے کسی کام سے اچانک گھر سے باہر نکل آئے۔ سپیرے نے انہیں دیکھ کر حسبِ رواج پہلے سلام کیا اور پھر فرمائش کی کہ اگر اُسے پانچ روپے نقد یا ایک تہہ بند مہیا کرنے کا وعدہ کیا جائے تو وہ انہیں ایک فقیری تحفہ دے کر جائے گا جسے وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ فقیری تحفے کا سن کر ہمارے کان کھڑے ہوئے اور اس سے پوچھا گیا کہ وہ تحفہ کیا ہے۔ تب اس نے بتایا کہ یہ سانپ کا منکا ہے۔

اس کتاب میں کسی اور جگہ یہ ذکر موجود ہے کہ ابا جی کو ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور طب یونانی کے ساتھ گہری دلچسپی تھی اور انہوں نے اپنے شوق سے بے شمار نسخہ جات جمع کر رکھے تھے۔ اُن کے پاس بہت سی ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ادویہ کے علاوہ کئی یونانی مفردات اور مرکبات بھی ہر وقت موجود رہتے اور وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے بعض ادویہ خود تیار کر کے ضرورت مندوں کو مفت فراہم کرتے تھے۔ ایسے میں انہوں نے سپیرے کی طرف سے ایک ایسا دعویٰ جو اُن کے ذوقِ تجسس کو مہمیز دے سکتا تھا بخوشی قبول کر لیا۔ ابا جی نے سپیرے کو ایک تہہ بند دیا تو اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک منکا نکال کر انہیں پیش کر دیا۔

اس کا دعویٰ تھا کہ یہاں سے بہت دور بلند و بالا پہاڑوں پر ایک جانور رہتا ہے جو سانپ بہت شوق سے کھاتا ہے اور اسی وجہ سے مارخور کہلاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ مارخور سانپ کو دور سے دیکھ سکتا ہے اور وہ خود [illegible]

تنی کی بلندی پر پہنچ کر جب سانپ پہنچتے ہیں [illegible]
[illegible] سانپ [illegible] میں بھی [illegible]
[illegible] زور سے اندر کی طرف کھینچتا ہے [illegible] سانپ [illegible]
[illegible] کے بعد جگالی کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس دوران [illegible] منہ سے [illegible]
سخت ہو کر منکے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ہمارے پاس سپیرے کے اس دعوے کی تصدیق کا کوئی طریقہ موجود نہ تھا اور نہ ہم یقین سے کہہ سکتے تھے کہ منکا مارخور کے منہ سے گرنے والی جھاگ سے بنتا ہے یا اس میں سانپ کا زہر چوسنے کی صلاحیت ہوتی ہے تاہم سپیرے نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایک عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ اس نے ایک پٹاری میں سے ایک سانپ نکالا اور اُسے اپنی کلائی پر ڈسوایا۔ پھر اس نے عین اس مقام پر جہاں سانپ نے ڈسا تھا وہ منکا رکھ دیا جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑا سا پھول گیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ منکے نے واقعی سانپ کا زہر چوس لیا ہے سپیرے نے ہاتھ کے ٹہوکے سے زہر پاش کی ایک ڈبیا میں نکال لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر یہ زہر کسی کتے کو پلا دیا جائے تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے مر جائے گا۔ یہ تجربہ تو نہ کیا گیا البتہ اباجی نے وہ منکا لے کر چاندی کی ایک ڈبیہ میں رکھ دیا۔ سپیرے نے ہدایت کی تھی کہ اس کو سیندور، لونگ اور نہ جانے کن کن اشیاء کے آمیزے میں رکھا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کس سن کی بات ہوگی لیکن ۱۹۶۴ء میں جب اباجی کا انتقال ہوا یہ منکا ان کے سامان میں موجود تھا۔

خدا کا شکر ہے اس منکے کے استعمال کی نوبت نہیں آئی اور نہ اس کے حقیقی ہونے کا دعویٰ جانچا جا سکا۔

لیجئے صاحب! بات جو دواخانوں کے ذکر سے شروع ہوئی تھی سانپ کے منکے کی طرف چل نکلی۔ میں ذکر کرنا چاہ رہا تھا ربوہ کے ان دواخانوں کا جن کی دوائیں احبابِ جماعت میں بہت مقبول تھیں لیکن اس سے بھی پہلے کیوں نہ عرض کر دیا جائے کچھ فضل عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ربوہ کے فارمیسیوٹیکل ڈویژن کے بارے میں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اگرچہ یہ ادارہ بہت اعلیٰ اور ارفع مقاصد کے لیے قائم ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے ان توقعات پر پورا اتر نہ سکا جو اس سے وابستہ کی گئی تھیں۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں اس ادارے کے سربراہ ملک حبیب الرحمن انسپکٹر آف سکولز کے صاحبزادے، ملک منور احمد تھے اور یہ ادارہ اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہا تھا۔ اس زمانے میں اس کی جن مصنوعات کا ذکر عام طور پر سنا جاتا تھا ان میں "[illegible]" سرفہرست تھا اور اس کا قدرے تفصیلی ذکر اسی مضمون میں بعد میں آئے گا۔ اسی طرح شیر خوار بچوں کی تکالیف کے ازالے کے لیے "سن شائن گرائپ واٹر" متعارف کرایا گیا جو مشہورِ عام "وڈورڈز گرائپ واٹر" بلکہ ہمدرد دواخانے کے "نونہال" سے بھی سستا تھا اور ذائقے میں ان سے ملتا جلتا تھا۔ سر درد، نزلہ اور زکام میں افاقے کے لیے "[illegible]" کی طرز پر "بامیلس" نام کی ایک دوا مارکیٹ میں لائی گئی جو میرے ذاتی تجربے کے مطابق خاصی پراثر تھی۔ الفضل میں ان تینوں دواؤں کا اشتہار بکثرت آتا رہتا تھا اور اخباری اطلاع کے مطابق صدر ایوب کی حیثیت

آمد کے موقع پر یہ ادویہ انہیں پیش بھی کی گئیں تاہم اس تلخ حقیقت کو تسلیم کئے بنا کوئی چارہ نہیں کہ مختلف وجوہ
فضل عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ان مصنوعات کو ملکی سطح پر پذیرائی نہ مل سکی اور آہستہ آہستہ اسے اپنی یہ ڈویژن بھی بند کرنا پڑی۔
ربوہ کے وہ اطبا اور دواخانے جن کی مصنوعات احباب جماعت میں خاصی مقبول تھیں ان میں سے
ایک قریشی عبدالعزیز تھے جن کا ذکر پہلے بھی بطور ڈاکٹر عبدالعزیز ہو چکا ہے۔ انہوں نے ''اٹھ ا ا لی چالیس پیالی''
کے نام سے ایک دوا تیار کر رکھی تھی۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے تھی۔ وہ اس دوا کے تیر بہدف ہونے
بارے میں انتہائی پُر یقین تھے چنانچہ ان گنہ گار آنکھوں نے ایک بار الفضل میں ان کی اس دوا کا اشتہار
''پانچ روپے میں لڑکا'' کے عنوان سے بھی چھپا ہوا دیکھا ہے۔

محمد صادق نامی ایک بزرگ نے ''نمک سلیمانی'' نامی ایک چُورن تیار کر رکھا تھا جس کے متعلق ان کا
دعویٰ تھا کہ ''یہ نسخہ حکما نے شاہ جہان کے لیے طیار کیا تھا۔ اورنگ زیب بادشاہ کے لیے بھی یہی استعمال ہوتا رہا
ہے۔ معدہ کی تمام بیماریوں کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور معدہ کو بہت طاقت دیتا ہے یہاں تک کہ ابتدائی ہیضہ
میں بھی مفید ہے۔ حافظہ کو خاص طور پر تیز کرتا ہے، آنکھوں کی بنیائی بڑھاتا ہے، چہرے کے رنگ کو درست کرتا
ہے اور منجن کے طریقہ سے استعمال کرنا دانتوں کو مضبوط اور درد کو زائل کرتا ہے۔''

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بات معدہ کی بیماریوں اور ان کے علاج کی ہو اور ''ہاضمون'' کا ذکر بیچ میں نہ
آئے۔ یہ سفوف بھی معدہ کی ہر بیماری کا علاج بتایا جاتا تھا اور اس کے بنانے والے اس کے متعلق بلند بانگ
دعوے کرتے تھے تاہم اس کے بارے میں ابنِ آدم کی رائے قدرے مختلف تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے کہا تھا:

اس قدر تاثیر دیکھی نہ سنی
گل گئے جبڑے مرے دانتوں سمیت
اور جب معدہ میں اتری ہاضمون
ہضم کھانا ہوگیا آنتوں سمیت

پرویز پروازی کی روایت کے مطابق ان اشعار کی اشاعت پر ہاضمون تیار کرنے والوں کی طرف سے
نظارت امورِ عامہ میں درخواست دائر کر دی گئی کہ ہاضمون کا مذاق اڑانے پر شاعر کو سزا دی جائے۔

ربوہ کے دواخانوں کی بعض مصنوعات کے متعلق ان کے تیار کنندگان کے دعوؤں کی حقیقت جاننے کی
بجائے فی الوقت اُن دواخانوں کا ذکر مقصود ہے جو لمبا عرصہ ربوہ کے مریضان کی خدمت کرتے رہے۔ ان میں
''دواخانہ خدمت خلق'' ''دواخانہ طب جدید'' ''ناصر دواخانہ'' ''خورشید یونانی دواخانہ'' ''دواخانہ رحمت
''دواخانہ الحکمت'' ''سنیاسی دواخانہ'' ''احمدیہ دواخانہ'' ''المنار دواخانہ'' ''دواخانہ دار
''دواخانہ حکیم رحمت اللہ'' اور بعض دوسرے دواخانے شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر دواخانے وقت کے ساتھ
ساتھ بند ہوتے چلے گئے البتہ بعض دواخانے ماشاءاللہ اب تک قائم ہیں۔

ربوہ کے ان دواخانوں میں سے جو عرصہ دراز سے لوگوں کی خدمت میں مصروف ہیں سب سے پہلے

ذکر دواخانہ خدمتِ خلق کا جو اپنے وقت میں ربوہ کا سب سے بڑا دواخانہ تھا۔
یہ دواخانہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ملکیت تھا اور اس کا افتتاح ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء کو ہوا۔ اس کے منیجر
سید بشیر احمد شاہ اور اسسٹنٹ منیجر چوہدری عبدالعزیز ڈوگر تھے۔ گورے چٹے دراز قد بشیر شاہ سید شیر شاہ کے
صاحبزادے تھے اور ان کی اہلیہ حکیم سید آل احمد کی ہمشیرہ تھیں۔ یاد رہے کہ حکیم آل احمد کا تعلق مشرقی ترکستان
سے تھا اور وہ اپنے باقی بھائی بہنوں کے ساتھ راستے کی ہزاروں مشکلات برداشت کرتے ہوئے پاپیادہ ۱۹۳۹ء
میں ترکستان سے قادیان پہنچے تھے۔ حکیم سید آل احمد اگرچہ موصی نہ تھے لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ان کی
نیکی اور تقویٰ کے پیشِ نظر انہیں بہشتی مقبرہ میں دفن کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔
سید بشیر احمد جو قبل ازیں نظارت بیت المال میں بطور کلرک کام کر رہے تھے دواخانہ خدمتِ خلق میں
آنے کے بعد تادمِ آخر یہیں رہے۔ چوہدری عبدالعزیز واقف زندگی تھے اور اس دواخانے میں ان کا تقرر اسی
حیثیت میں تھا تاہم ایک مرحلہ پر وہ لاہور منتقل ہو گئے اور انہوں نے ایم ای ایس کے ساتھ ٹھیکیداری شروع کر
دی۔ آج کل وہ لندن میں مقیم ہیں۔

انہوں نے حال ہی میں چھپنے والی اپنی خودنوشت ''یادِ حبیب'' میں دواخانہ خدمت خلق کے بارے میں
بعض ایمان افروز باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس کا ابتدائی سرمایہ محض پانچ صد روپیہ تھا لیکن
اللہ تعالیٰ نے اس کاروبار میں ایسی برکت ڈالی کہ نومبر ۱۹۶۵ء تک اس کی آمدنی میں سے ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ
حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں پیش کیا جا چکا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس دواخانے کے
دونوں کارکنوں میں سے کسی کو طب کی شُد بُد نہ تھی لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی مشفقانہ رہنمائی میں اس
دواخانے نے خوب ترقی کی اور اس کی مصنوعات کو خاص پذیرائی حاصل ہوئی۔

یوں تو اس دواخانے کی بہت سی مصنوعات مریضوں میں مقبول ہوں گی لیکن میں یہاں پر صرف
''شربت خانہ ساز'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ۵۸۔۱۹۵۷ء میں جب ربوہ (بلکہ شاید پنجاب بھر میں) انفلوئنزا کی
شدید وبا پھیلی تو اس کے سدباب کے لیے مختلف ادویہ مارکیٹ میں آئیں جن میں سے ایک اس دواخانے کا
''شربت خانہ ساز'' بھی تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے گھر کا ہر فرد نزلہ، زکام، کھانسی اور بخار میں مبتلا تھا اور آرام کی
کوئی صورت نظر نہ آتی تھی چنانچہ اباجی ہم سب کو یہ شربت استعمال کرانے لگے۔ ان ہی دنوں فضل عمر ریسرچ
انسٹی ٹیوٹ کی فارمیسوٹیکلز ڈویژن نے ''کف ایکس'' کے نام سے کھانسی کا ایک شربت بنایا تھا۔ اباجی یہ شربت
بھی گھر میں لاتے رہے۔ یقیناً ان دنوں شربتوں کے علاوہ مروّجہ انگریزی ادویات بھی استعمال ہوتی رہی ہوں گی
لیکن شہر میں انفلوئنزا کی صورتِ حال کو بہتر بنانے میں ان شربتوں کے کردار کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔
اللہ تعالیٰ نے دواخانہ خدمتِ خلق کو بشیر شاہ اور چوہدری عبدالعزیز کی شکل میں دو انتہائی مخلص کارکن عطا
فرمائے جنہوں نے اس ادارے کی خدمت میں دن رات ایک کر رکھا تھا۔ بشیر شاہ کے سسرالی خاندان کی جماعتی
خدمت کا کچھ ذکر تو ہو چکا، چوہدری عبدالعزیز کے حوالے سے یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ پارٹیشن کے

وقت ان کی والدہ بقیدِ حیات اور اس پیدل قافلے میں شامل تھیں جسے قادیان سے لاہور آنا تھا تاہم بلوچ رجمنٹ کی ہدایت پر اس کا رُخ ڈیرا بابا نانک کی طرف موڑ دیا گیا۔ اِن کی والدہ جو قادیان چھوڑنے کے غم سے ویسے ہی نڈھال تھیں بمشکل دو یا تین میل چل سکی ہوں گی کہ انہیں اسہال کی تکلیف ہوگئی اور کمزوری کے سبب ان سے چلنا دوبھر ہوگیا۔ اس وقت چوہدری عبدالعزیز نے دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ خواہ ان کی جان چلی جائے وہ اپنی والدہ کو کمر پر اٹھا کر پاکستان ضرور پہنچائیں گے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ وعدہ پورا کرنے کی توفیق بخشی۔ وہ مسلسل چھ روز تک اپنی والدہ کو کندھوں پر اُٹھا کر چلتے رہے اور بالآخر جسڑ پہنچ گئے۔

چوہدری عبدالعزیز بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی والدہ کی دعاؤں نے زندگی بھر ان کی حفاظت کی اور انہیں مشکل حالات میں بھی ثابت قدمی عطا فرمائی۔ ان کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے موصوف سے تعزیت کرتے ہوئے فرمایا: ''عبدالعزیز! تم پر جنت واجب ہوگئی ہے۔'' حضور کا اشارہ چوہدری عبدالعزیز کی اپنی والدہ کی اسی بے مثال خدمت کی طرف تھا۔

دواخانہ خدمتِ خلق کے علاوہ ربوہ میں کم از کم تین دیگر معروف دواخانے بھی موجود تھے جن میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر ''دواخانہ طب جدید'' مملوکہ حکیم محمد صدیق کا جو حکیم احمد الدین موجد طب جدید و بانی انجمن خادم الحکمت، شاہدرہ کے بھتیجے اور ان کے لے پالک تھے۔ انہوں نے حکمت کی تعلیم اور عملی تجربہ ان ہی کے زیر سایہ حاصل کیا تھا۔ وہ رسالہ ''استاذ الاطبا'' کے ایڈیٹر اور جماعت احمدیہ شاہدرہ کے امیر بھی رہے تاہم ۱۹۴۱ء میں قادیان منتقل ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۴ء میں ربوہ آئے اور غلہ منڈی میں ''دواخانہ طب جدید'' قائم کیا۔ وہ پگڑی پہنتے اور ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔ ان کی ایک ٹانگ خلقی طور پر یا بعد کے کسی حادثے کی وجہ سے خراب تھی لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ ایک ماہر طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے اور ان کا کلام جماعتی اخبارات وجرائد کی زینت بنتا رہتا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی حکیم محمد صدیق سے طبی امور میں مشورہ کرتے رہتے تھے چنانچہ سلیم شاہجہانپوری نے اپنی تالیف ''شعرائے احمدیت'' میں بیان کیا ہے کہ حضور نے اپنے دوسرے سفر یورپ کے بعد ''حکیم صاحب کو طلب فرمایا اور کیفیتِ مزاج سے آگاہ کیا۔ بعد معاینہ حکیم صاحب نے ایک دوا استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ حضور نے فرمایا: یہ دوا ہالینڈ کے ایک ڈاکٹر نے تجویز کی تھی مگر اس کے استعمال سے فائدہ نہیں ہوا۔ اس پر حکیم صاحب نے ایک دوسری دوا کا نام پیش کیا۔ حضور نے فرمایا: یہ دوا جرمنی کے ایک ڈاکٹر نے تجویز کی تھی لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر حکیم صاحب نے ایک تیسری دوا کی نشاندہی کی تو حضور نے مسکرا کر فرمایا: دیکھئے وہ سامنے اسی دوا کی شیشی رکھی ہوئی ہے۔ یہ دوا جاپان کے ایک ڈاکٹر نے تجویز کر کے لکھی تھی۔ میں اسے استعمال تو کر رہا ہوں لیکن فائدہ محسوس نہیں ہو رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضور اب میں خود دوا بنا کر حضور کی خدمت میں پیش کروں گا چنانچہ دوسرے روز حکیم صاحب حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دوا پیش کی۔''

لامی اور حکیم محمد صدیق کا ایک دوسرے کے ساتھ تھوڑا بہت اُٹھنا بیٹھنا تھا تاہم ان کے ساتھ میری ملاقات

کا کوئی موقع پیدا نہ ہوا تھا۔ ابا جی کے انتقال کے بعد میں نے ان کے کاغذات پر نظر دوڑائی تو حکیم احمد الدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مضمون مل گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے کسی رسالہ میں شائع کرا دوں چنانچہ میں حکیم محمد صدیق کے پاس اس امر کی اجازت کے لیے حاضر ہوا جو انہوں نے بخوشی دے دی۔ میں نے یہ مضمون موچی دروازہ لاہور سے شائع ہونے والے ماہوار طبی رسالے ''الحکیم'' کو بھیج دیا۔

۱۹۸۶ء میں حکیم محمد صدیق کی وفات کے ساتھ ہی یہ دواخانہ بند ہو گیا۔

حکیم محمد رفیع ناصر نے ۱۹۵۴ء میں ''ناصر دواخانہ'' کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ ان کے والد حکیم محمد شفیع قادیان میں حکمت کرتے تھے اور رفیع ناصر نے یہ کام ان ہی سے سیکھا تھا۔

''خورشید یونانی دواخانہ'' حکیم خورشید احمد نے قائم کیا تھا۔ قبل ازیں حکیم خورشید جامعہ احمدیہ میں علمِ حدیث کے استاد تھے اور وہاں سے فراغت پر یہ کام شروع کیا جو اُن کی وفات کے بعد بھی جاری و ساری ہے۔

حکیم خورشید احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک کامیاب مقرر، اعلیٰ منتظم، ماہر طبیب اور ایک اچھے استاد تھے۔ اُن کی وفات پر محمد صدیق گورداسپوری کے قلم سے الفضل میں شائع شدہ ایک مضمون سے پتا چلتا ہے کہ ''انہوں نے جس محنت، لگن اور محبت کے ساتھ...... پڑھایا وہ قابلِ داد ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ کو علومِ حدیث پر خوب عبور حاصل ہے۔ روایت و درایت کے اصول، مختلف احادیث میں باہمی تطبیق اور ان کے حل کے طریق، اسماء الرّجال اور جرح و تعدیل وغیرہ علوم پر گھر سے باقاعدہ نوٹس تیار کر کے لاتے اور طلبا کو لکھواتے......اور حدیث کے مالہٗ و ماعلیہ پر خوب روشنی ڈالتے جس سے حدیث کا مفہوم اچھی طرح سمجھ آ جاتا۔''

ان کے تفصیلی حالات ناصر احمد ظفر بلوچ کے قلم سے الفضل میں دو اقساط میں شائع ہو چکے ہیں تاہم چونکہ اس جگہ حکیم خورشید احمد کی طبی خدمات پر ہی روشنی ڈالنا مقصود ہے لہٰذا یہاں اس مضمون مطبوعہ الفضل ۱۴ جون ۲۰۱۲ء کا صرف وہی حصہ نقل کیا جا رہا ہے جو موضوع زیرِ بحث کا احاطہ کرتا ہے۔

فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو دستِ شفا عطا فرمایا تھا۔ اسی بنا پر آپ نے ایک دواخانہ کی بنیاد ڈالی اور خورشید یونانی دواخانہ کے نام سے کاروبار کا آغاز کیا۔ طب کی تعلیم آپ نے اپنے ذاتی شوق اور مطالعہ سے حاصل کی۔ آپ چونکہ غیر معمولی ذہین اور محنتی تھے تھوڑے ہی عرصہ میں خورشید یونانی دواخانہ کامیاب دواخانوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کی ابتدا بہت معمولی تھی، پہلے پہل دوا فروشی سے کام کا آغاز کیا اور پھر چند سالوں میں مریضوں کا چیک اَپ اور امراض کی تشخیص میں آپ نے اپنا منفرد مقام بنا لیا۔ دُور دراز سے مریض آپ سے ادویات لینے بڑی تعداد میں ربوہ آتے اور آپ کی آمد سے پہلے ہی دکان کے باہر منتظر ہوتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مریضوں کو گھنٹوں انتظار کے بعد...... حکیم صاحب کو دکھانا نصیب ہوتا اور آہستہ آہستہ آپ کے مریضوں کی لائن میں بڑے بڑے افسران اور زمیندار بھی شامل ہوتے گئے۔ ایک دفعہ چنیوٹ کا ایک بڑا افسر آپ کے پاس حاضر ہوا۔ اس نے کہا: میں اعصابی کمزوری کا شکار ہوں، بہت علاج کرایا

افاقہ نہیں ہوتا۔ آپ نے پوچھا شادی شدہ ہیں؟ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو............ حکیم صاحب نے دوائی مرحمت فرمادی۔ چند دن کے بعد وہی افسر دوبارہ ربوہ آیا اور حکیم صاحب کو بتایا کہ وہ اب بالکل ٹھیک اور تندرست ہے اور اس نے حکیم صاحب کا شکریہ ادا کیا۔............

حکیم صاحب اپنا مطب محض بازاری حکیموں کی طرح نہیں چلاتے تھے بلکہ ماہر حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ جرأت مند، معاملہ فہم اور صاحب حکمت بھی تھے۔"

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے حکیم خورشید احمد کی وفات پر ان کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ بہت سے ایسے مریض جو حکومت کے ملازم ہوتے تھے یا علاقے کے بڑے زمیندار جن سے عموماً شر پہنچتا تھا وہ مولوی صاحب کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی حکمت اور طبابت کے نسخے بہت مفید ہوتے تھے۔ چنیوٹ سے بھی سلسلے کے مخالف یا تو بھیس بدل کر دوا لینے آتے یا کسی کو بھجوا دیتے اور درخواست کرتے کہ ہمارا نام نہ لیا جائے۔"

یوں تو حکیم خورشید احمد کی تیار کردہ بہت سی ادویہ مقبولِ عام ہوں گی اور مریضان ان سے حسبِ ضرورت فیضیاب ہوتے ہوں گے تاہم سلسلے کے اخبارات و جرائد میں ان کے "نور کا جل" کا اشتہار بکثرت آتا رہتا تھا۔ اس کی دھوم دور دور تک تھی اور بعض غیر از جماعت خواتین کی طرف سے بھی اس کی فرمائشیں ہوتی رہتی تھیں۔ یوں ہی تو نہیں کہا تھا شاعر نے:

حیرت ہے ایک ملاّ دعوت پہ جانا بھولے
بیوی نے جب لگایا آنکھوں میں نور کا جل
مضمر ہیں کتنے فتنے ، فرمائشوں کی تہ میں
آنکھوں کا نور کا جل ، دل کا فتور کا جل

یہ تو تھا ۱۹۶۰ء کی دہائی تک ربوہ میں طبّی سہولتوں کا اجمالی جائزہ اور یہ تھا وہ ماحول جس میں میرا بچپن اور جوانی کا اوائل زمانہ گذرا تھا۔ اب میں بی اے کر چکا تھا اور پنجاب یونیورسٹی میری منزل تھی۔

یہ دیوانہ چلا اب سُوئے لاہور

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بی اے کے امتحان میں میرے نمبر بہت اچھے تھے اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے عطا کردہ میرٹ سرٹیفکیٹ کے مطابق مجموعی طور پر میرا شمار یونیورسٹی کے پہلے دس طلبہ میں تھا۔ میں انگریزی، عربی یا پولیٹیکل سائنس میں سے کسی بھی مضمون میں ایم اے میں داخلہ لے سکتا تھا اور میں جس مضمون میں بھی ایم اے کرتا مجھے بہر طور وظیفہ مل جانا تھا۔ نہ معلوم کس طرح میں نے پولیٹیکل سائنس کے حق میں فیصلہ کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے اس شعبہ میں داخلے کے لیے درخواست دے دی۔

ابھی داخلے کا مرحلہ باقی تھا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کردیا اور یوں وہ جنگ شروع ہوگئی جسے تاریخ میں جنگ ستمبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی وجہ سے معمولاتِ زندگی بگڑ گئے اور خاص طور پر ہوائی حملوں کے خوف اور بلیک آؤٹ کی وجہ سے آمدورفت میں دقتیں پیدا ہونے لگیں۔ اس کے باوجود لوگوں کا حوصلہ بلند تھا چنانچہ میں بھی حسبِ ضرورت لاہور چلا جاتا اور مطلوبہ کارروائی مکمل کرکے واپس چلا آجاتا۔

اُس زمانے میں اینٹری ٹیسٹ کی بدعت رائج نہ ہوئی تھی چنانچہ داخلہ بی اے میں حاصل کردہ نمبروں کی بنیاد پر ہی ملتا تھا۔ انٹرویو ضرور لیا جاتا تھا لیکن یہ محض ایک رسمی کارروائی تھی۔ میں نے اس انٹرویو کی بنیاد پر کسی کے داخلے کی درخواست رد ہوتی نہیں دیکھی۔ جب میرٹ لسٹ لگی تو معلوم ہوا کہ کلاس میں میرا رول نمبر پانچ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھ سے زیادہ نمبروں والے چار طلبہ اس شعبے میں داخل ہوئے تھے۔

اُن دنوں پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ اولڈ کیمپس سے نیو کیمپس منتقل ہو چکا تھا تاہم نیو کیمپس شہر سے اتنی دُور تھا کہ یہاں پہنچنے میں ہی کم وبیش آدھا گھنٹہ لگ جاتا۔ لاہور اومنی بس سروس کی صرف دو بسیں، نمبر ۲۷ اور ۲۸ چوک رنگ محل سے نیو کیمپس کے لئے چلا کرتی تھیں۔ یہ دونوں بسیں دو منزلہ تھیں اور ان کا یکطرفہ کرایہ ۲۸ پیسے (جن کو اُس زمانے میں پرانے پیسے کے مقابل پر نئے پیسے کہا جاتا تھا) ہوا کرتا تھا۔ ربوہ سے آتے ہوئے میں بادامی باغ اُتر جاتا اور اگر بہت زیادہ سامان ساتھ نہ ہوتا تو شیرانوالہ دروازہ کے ذریعے شہر کے بیچوں بیچ ہوتا ہوا پیدل رنگ محل پہنچ جاتا جہاں کچھ انتظار کے بعد ان میں سے کوئی بس مل جاتی۔ ایک بس میو ہسپتال اور ہال روڈ کے راستے یونیورسٹی جاتی تھی تو دوسری بھاٹی دروازہ کے ذریعہ۔

اُس زمانے کا لاہور آج سے بہت چھوٹا اور مختلف تھا۔ وحدت کالونی تو موجود تھی لیکن نیو مسلم ٹاؤن کا نام ونشان نہ تھا۔ وحدت روڈ پختہ ہو چکی تھی البتہ یہ ایک سنگل روڈ تھی جس سے ایک وقت میں بمشکل دو گاڑیاں گذر سکتی تھیں۔ یہ سڑک سیدھی گورنمنٹ سپیریئر سائنس سکول کو چلی جاتی جب کہ وحدت کالونی سے نیو کیمپس تک

سڑک کچی تھی اور بارش ہو جاتی تو وہاں پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ یونیورسٹی کے تدریسی شعبے نہر کے اِس پار تھے اور ہوسٹل نہر کے اُس پار۔

نہر کی دونوں پٹڑیاں کچی تھیں اور اس کے کناروں پر اُگی ہوئی خودرو جھاڑیوں میں ہر طرح کے کیڑے پتنگے ملتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی سانپ بھی نظر آ جاتا۔ یونیورسٹی کی تعمیر کے بعد اس علاقے میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے مگر اس کے باوجود شام ہوتے ہی یہاں ہُو کا عالم ہو جاتا اور بسا اوقات رات کے وقت بس سٹاپ سے ہوسٹل جاتے ہوئے طبیعت میں خوف پیدا ہونے لگتا۔ رات کے وقت نہر کا منظر اس لحاظ سے بہت خوبصورت ہوتا کہ لاتعداد جگنو جھاڑیوں پر جگ مگ جگ مگ کر رہے ہوتے۔

اب تو یونیورسٹی میں ہوسٹلوں کا ایک شہر آباد ہو چکا ہے لیکن ۱۹۶۵ء کی آخری سہ ماہی تک یہاں لڑکوں کے صرف ایک ہوسٹل کا افتتاح ہوا تھا اور اگلے دو سالوں میں تین نئے ہوسٹل بنے تھے۔ اس وقت لڑکیوں کا ایک ہی ہوسٹل تھا جو لڑکوں کے ہوسٹل سے ذرا ہٹ کر سٹوڈنٹ ٹیچرز سنٹر کے اُس پار تھا۔

سٹوڈنٹ ٹیچرز سنٹر ایک لمبی چوڑی عمارت کا نام تھا جس کا کچھ حصہ تجارتی استعمال میں تھا۔ یہ حصہ مختلف دکانوں کے لیے مختص تھا۔ ہماری موجودگی تک اس کا بہت سا حصہ خالی رہا البتہ یہاں ایک بہت خوبصورت اور صاف ستھرا کیفے ٹیریا تھا جس میں انتہائی سستے داموں کھانا اور چائے مل جاتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اِس کیفے ٹیریا کا سارا ساز و سامان امریکہ سے آیا تھا۔

میرے پاس لاہور میں قیام کی کوئی جگہ موجود نہ تھی چنانچہ میری درخواست پر مجھے ہوسٹل نمبر ا کے کمرہ نمبر ۳۰۵ میں جگہ مل گئی۔ اس سے اگلے سال میرے کمرے کا نمبر بدل گیا چنانچہ میں نے یہ سال کمرہ نمبر ۳۵۵ میں گذارا۔ قارئین نے کمروں کے نمبروں سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ کمرے دوسرے فلور پر تھے اور یہاں سے دُور دُور تک نظر جاتی تھی۔ اگرچہ سب سے بالائی منزل ہونے کے ناطے گرمیوں میں یہ کمرے سخت تپ جاتے تھے مگر ان میں وہ گھٹن نہ تھی جو بسا اوقات گراؤنڈ فلور کے مکین محسوس کرتے۔ ہر کمرے میں لوہے کا فرنیچر مہیا کیا گیا تھا اور اس میں ایک پلنگ، ایک رائٹنگ ٹیبل، ایک کرسی اور ضرورت کی ایک دو اور چیزیں شامل تھیں۔

میرا ہوسٹل میں رہنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ سچ پوچھیں تو میں الا ماشاء اللہ کبھی گھر سے باہر نہ رہا تھا اس لیے مجھے ابتدا میں یہاں بہت پریشانی ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا مجھے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا ہو لیکن دو تین دن کے اندر اندر یونیورسٹی کے کئی طلبہ میرے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے۔ اِن میں سے کچھ ہوسٹل نمبر ا کے رہائشی تھے چنانچہ کلاسز ختم ہونے کے بعد کامن رُوم اور ڈائننگ ہال میں اِن سے ملاقاتیں رہنے لگیں۔ موقع بہ موقع ہم ایک دوسرے سے کمروں میں بھی جا کر ملنے لگے جس کی وجہ سے جلد ہی اجنبیت کا وہ احساس جاتا رہا۔

ہم لوگ ہوسٹل میں منتقل تو ہو گئے تھے مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ناشتے کا انتظام ہمیں خود کرنا ہوگا۔ یہ انتظام بھی اللہ نے کر دیا۔ ہوسٹلوں کی تعمیر کے سلسلہ میں اردگرد کی جھگیوں میں مقیم مزدوروں کی سہولت کے لیے بعض پٹھانوں نے وہاں چائے کی دکانیں بنا رکھی تھیں۔ اگرچہ یہاں اٹھنے بیٹھنے کا کوئی معقول انتظام موجود نہ تھا

لیکن یہ دکانیں ہماری ضرورت بطریق احسن پوری کرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ جب کیفے ٹیریا نے کام شروع کر دیا تو ہم لوگ اُدھر بھی جانے لگے۔ مجھے اب بھی واضح طور پر یاد ہے کہ اُس زمانے میں ان ہوٹلوں میں پی کا ایک بند چار آنے میں مِل جاتا تھا اور چار آنے میں مکھن کی ایک ٹکیہ دستیاب تھی۔ غالباً دو آنے میں چائے کا کپ مل جاتا تھا۔ یوں دس سے بارہ آنے میں ہم اچھا بھلا ناشتہ کر لیتے اور خدا کا شکر بجالاتے۔ کیفے ٹیریا میں اسی طرز کا ناشتہ ایک روپے میں ملتا تھا چنانچہ جیب اجازت دیتی یا طبیعت کسی وقت عیاشی پہ مائل ہوتی تو کیفے ٹیریا میں جا بیٹھتے ورنہ پٹھانوں کے ہوٹل پر ناشتہ کرتے اور خدا کا شکر بجالاتے۔ ہوسٹل میں ہفتے بھر کا ایڈوانس مینیو ڈائننگ ہال کے دروازے پر لگا دیا جاتا تھا اور ہوسٹل کے ہر مکین کو معلوم ہوتا تھا کہ اُسے آج کھانے کو کیا ملے گا۔ ہر ڈش کے مطابق کھانے والے کی حاضری لگتی۔ مثال کے طور پر دال پکی ہوتی تو ایک طالب علم کی ایک حاضری لگتی لیکن اگر مرغ پکا ہوتا تو ڈیڑھ یا دو حاضریاں لگتیں۔ اگر کوئی مہمان ساتھ ہوتا تو حاضریوں کی تعداد دگنی ہوجاتی۔ ہفتے میں دو یا تین دن رات کے وقت سویٹ ڈش بنتی تھی تاہم واحد سویٹ ڈش جو ہوسٹل میں تیار ہوتی ربڑی تھی جس کی ایک فالتو حاضری لگا کرتی تھی۔

ہمارے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر خیرات ابن رسا تھے جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور پھر ایک پرائیویٹ یونیورسٹی (غالباً محمد علی جناح یونیورسٹی اسلام آباد) کے وائس چانسلر بھی رہے۔ اُن کے ساتھ ہمارا واسطہ کم کم پڑتا تھا اور جب تک کوئی خاص بات نہ ہوتی یا کسی طالب علم کے خلاف کوئی شکایت نہ ہوتی ان کے ساتھ آمنا سامنا نہ ہوتا۔

ہم لوگ ربوہ سے نئے نئے لاہور گئے تھے لہٰذا ہماری سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ ہم نماز جمعہ کہاں ادا کیا کریں گے؟ کسی نے یہ بتا کر ہمارا مسئلہ حل کر دیا کہ احمدیہ ہوسٹل جو ماڈل ٹاؤن میں کرایہ کی ایک کوٹھی میں قائم ہے ہمارے ہوسٹل سے زیادہ دُور نہیں۔ وہاں نمازِ جمعہ باقاعدگی سے ادا کی جاتی ہے۔ بس پھر کیا تھا ہم نے وہاں جانا شروع کر دیا لیکن وہاں جانے کے لئے کسی سواری کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اُن دنوں گارڈن ٹاؤن یا فیصل ٹاؤن نامی آبادیاں موجود نہ تھیں اور یہاں کھیت ہوا کرتے تھے۔ ہم اپنے ہوسٹل سے نکلتے اور کھیتوں کے بیچوں بیچ اپنا راستہ بناتے ہوئے منٹوں میں ماڈل ٹاؤن جا پہنچتے۔

جب میں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اُس وقت فائنل ایئر میں چند احمدی طلبہ پہلے سے پڑھ رہے تھے جن میں سے دو کے ساتھ میرا بعد میں بھی رابطہ رہا۔ لڑکوں میں سے سرگودھا کے رہنے والے مجید قریشی ان میں سے ایک تھے۔ سنتے تھے کہ ان کا سرگودھا میں اسلحے کا کاروبار ہے چنانچہ ایم اے کرنے کے بعد وہ اس کاروبار کو دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے پنجاب کے محکمۂ جیل خانہ جات میں بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل ملازمت اختیار کر لی۔ انہوں نے بہت دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دیئے اور پھر ایک فرض شناس افسر کی شہرت پا کر ۲۰۰۵ء میں ریٹائر ہو گئے۔ اس وقت وہ سپرنٹنڈنٹ جیل تھے اور ان کی تعیناتی شیخوپورہ میں تھی۔ مجید قریشی کو اپنے زمانہ ملازمت میں جن اہم شخصیات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ان میں ذوالفقار علی بھٹو،

خان عبدالولی خان، سردار شیر باز خان مزاری، جنرل گل حسن، حنیف رامے، ایئر مارشل اصغر خان، مفتی محمود، پرویز الٰہی، شہباز شریف، فاروق لغاری، میاں محمود علی قصوری، اعتزاز احسن، فلم ایکٹر محمد علی اور مشہور شاعر حبیب جالب شامل ہیں۔ یہ سب لوگ سیاسی بنیادوں پر مختلف مقدمات میں ماخوذ ہو کر جیل کاٹ رہے تھے لیکن مجید قریشی کو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع مل گیا اور وہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق بعض ایسی معلومات رکھتے ہیں جو کسی اور کے پاس نہیں۔

جہاں تک ذوالفقار علی بھٹو کا تعلق ہے مجید قریشی ان کے ایام اسیری کے دوران راولپنڈی جیل میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے اور اس لحاظ سے ان کی بھٹو کے ساتھ بکثرت ملاقات رہتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں بھی شامل تھے جو بھٹو کی پھانسی کے وقت موقع پر موجود تھے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے بھٹو کو ذہنی طور پر پھانسی کے لئے تیار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

چونکہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی (جسے بعض لوگ سیاسی قتل بھی کہتے ہیں) برسوں سے ایک متنازعہ امر رہا ہے لہٰذا اس موضوع پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ مون ڈائجسٹ نے ۱۹۸۶ء میں اس موضوع پر مجید قریشی کا ایک تفصیلی انٹرویو شائع کیا جو اِن کا پہلا انٹرویو تھا۔ اس کے بعد مختلف اخبارات و رسائل ان کے انٹرویوز شائع کرتے رہے ہیں اور یہ ساری چیزیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

مجید قریشی اب سرگودھا میں مقیم ہیں اور مجلس انصار اللہ کے سرگرم کارکن۔

ایم اے فائنل کی دوسری احمدی طالبہ ربوہ کی صادقہ قمر تھیں۔ وہ حاجی پیر محمد کی صاحبزادی اور تحریک جدید انجمن احمدیہ کے کارکن، مولوی محمد شریف کی ہمشیرہ تھیں اور اُن ہی کے ساتھ تحریک جدید کوارٹرز میں مقیم تھیں۔ ابھی اُن کا رزلٹ بھی نہ آیا تھا کہ جامعہ نصرت نے اُنہیں سیاسیات پڑھانے کے لیے بطور لیکچرر رکھ لیا اور وہ چونتیس سال اس ادارے کے ساتھ منسلک رہنے کے بعد ۲۰۰۰ء میں بطور پرنسپل ریٹائر ہوئیں۔ اسی عرصے میں اُن کی شادی ہوئی اور وہ صادقہ قمر سے صادقہ شمس کہلانے لگیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ربوہ میں مقیم ہیں۔

اگرچہ اُن کا کلام جماعتی اخبارات و رسائل میں بہت کم چھپا ہے مگر وہ اچھا شعر کہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ سلیم شاہجہانپوری نے اپنی کتاب شعرائے احمدیت میں اُن کے کلام کا نمونہ شائع کیا ہے۔ یہ ایک نظم ہے جو صادقہ قمر نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی یاد میں کہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اُس کے یہ چند اشعار:

ٹوٹا وہ گل جو زینتِ باغِ جہان تھا
نصرت جہاں کے راج دُلارے چلے گئے

بلبل خموش، پھول پریشاں، چمن اُداس
گلشن کا رنگ روپ، نظارے چلے گئے

آنکھوں میں اشک، لب پہ دعا، دل میں درد ہے
تُربت پہ اُن کی اُن کو پکارے چلے گئے

ایک ایک کر کے آنکھ کے تارے چلے گئے
اشکوں میں ڈھل گئی ہے متاعِ دلِ قمر

اپنے ہم جماعتوں میں سے میں ربوہ سے تعلق رکھنے والے دو دوستوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ان میں سے ایک تو محمد منظور صادق ہیں جو فی الاصل مقبوضہ کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ وہ ۴۹-۱۹۴۸ء میں مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور گرمولہ ورکاں میں مقیم ہو گئے۔ انہوں نے میٹرک تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ سے اور بی اے تعلیم الاسلام کالج سے کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ راولپنڈی چلے گئے اور اپنے لیے صحافت کا شعبہ پسند کر لیا۔ میں ۱۹۶۷ء کے وسط میں ایک بار راولپنڈی گیا تو وہ ایک احمدی کشمیری نوجوان، ڈاکٹر محمد افضل کے ساتھ مقیم تھے۔ میں نے ایک رات ان کے ہاں گذاری تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ریڈیو آزاد کشمیر تراڑکھل میں ٹرانسلیٹر کی آسامی پر کام شروع کر رکھا ہے، وہ خبروں کا اردو سے کشمیری زبان میں ترجمہ کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر خبریں پڑھ بھی لیتے ہیں۔ وہ ساتھ ساتھ روزنامہ تعمیر میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہے تھے اور یہ سلسلہ ساری زندگی جاری رہا۔ وہ ریڈیو پاکستان سے ایڈیٹر کی حیثیت میں ریٹائر ہوئے اور اس عرصے میں انہوں نے راولپنڈی اور اسلام آباد سے چھپنے والی تمام اخبارات بشمول نوائے وقت، خبریں، پاکستان، کائنات اور حیدر میں کام کا تجربہ حاصل کیا۔ اُن کی آخری ذمہ داری چیف نیوز ایڈیٹر کی تھی۔

منظور صادق انتہائی مخلص احمدی ہیں اور انہوں نے ساری زندگی جماعت سے اپنے رابطے کو برقرار رکھا۔ وہ نہ صرف جماعت کی ذیلی تنظیموں میں عہدیدار رہے بلکہ انہیں ایک لمبا عرصہ جماعت احمدیہ راولپنڈی و اسلام آباد کی سطح پر بھی خدمت کا موقع ملا چنانچہ جماعت احمدیہ راولپنڈی کی طرف سے شائع ہونے والا صد سالہ خلافت جوبلی سووینیئر ان ہی کا مرتب کردہ ہے۔ انہیں جماعت احمدیہ راولپنڈی کی تاریخ مرتب کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی جو بجائے خود اُن کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اب وہ جماعت احمدیہ اسلام آباد کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔

ان کی رہائش تو احمدیہ ہوسٹل میں تھی لیکن ربوہ سے اپنے تعلق کی وجہ سے ہمارے دل کے بہت قریب تھے اور موقع بہ موقع ہمارے ہوسٹل میں آتے رہتے تھے۔

میرے ساتھ ان کے تعلقات بے حد مخلصانہ رہے اور میں نے جب انہیں کوئی کام کہا، انہوں نے میری فرمائش خوش دلی کے ساتھ پوری کی۔ میں نے انہیں اپنی تمام کتابیں تبصرے کے لیے بھجوائیں اور انہوں نے بکمالِ محبت ان تمام کتب پر خود تبصرے لکھ کر مختلف اخبارات میں شائع کرائے۔

دوسرے دوست مقبول احمد ناصر تھے جن کے والد بزرگوار، میاں محمد عارف اپنی زمینوں کی نگہداشت کے لئے بہاولنگر رہا کرتے تھے لیکن اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے فیکٹری ایریا ربوہ میں اپنا مکان بنا رکھا تھا۔ مقبول کے ساتھ میری ابتدائی ملاقاتیں یہیں کہیں ہوئیں۔ وہ فٹ بال کے کھلاڑی تھے تاہم اُس زمانے میں ربوہ میں باسکٹ بال کا زور تھا لہٰذا اُن کی کھیل میں زیادہ چمک نہ پیدا ہو سکی۔ ہم لوگ بی اے کر چکے تو معلوم ہوا کہ وہ

بھی ایم اے پولیٹیکل سائنس کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں داخلہ بھی مل گیا اور پھر اس ہوسٹل میں جگہ بھی جس میں میں رہائش پذیر تھا۔ اس قربت نے ہمارے تعلقات کو استحکام بخشا اور ہماری دوستی روز بروز مضبوط تر ہوتی گئی۔

ایم اے کرنے کے بعد مقبول کراچی چلے گئے اور انہوں نے سندھ مسلم لا کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان کے قیام کراچی کے دوران ان سے خط وکتابت رہی اور ان کے حالات کا علم ہوتا رہا۔ ان کی خواہش تھی کہ قانون کا امتحان پاس کرلیں تو اپنے ہی علاقے میں وکالت کریں۔ میں انہیں کہتا کہ وہ کسی بڑے شہر کا انتخاب کیوں نہیں کرتے تو وہ بالعموم جواب دیتے کہ پریکٹس وہیں کرنی چاہئے جہاں واقفیت ہو اور چونکہ ان کی واقفیت اسی علاقے میں زیادہ ہے لہٰذا وہ یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے فیصلے پر آج بھی قائم ہیں اور چشتیاں میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ ان کا کام اچھا ہے۔

مقبول جماعتی طور پر بھی خاصے فعال ہیں اور آج کل جماعت احمدیہ چشتیاں کے صدر ہیں۔

ان دنوں ایم اے کے کورس میں سات پرچے ہوا کرتے تھے جن میں سے چار لازمی تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چاروں پرچے ہر طالب علم کے لئے پڑھنا ضروری تھے جب کہ باقی ماندہ تین پرچوں کے لیے طلبہ کو چناؤ کا اختیار حاصل تھا۔ لازمی پرچہ جات میں پاکستان مومنٹ، ویسٹرن پولیٹیکل تھاٹ، مسلم پولیٹیکل تھاٹ اور کانسٹی ٹیوشنل لا شامل تھے جب کہ اختیاری پرچہ جات میں سے میرے اختیار کردہ مضامین انٹرنیشنل لا، انٹرنیشنل ریلیشنز اور پبلک ایڈمنسٹریشن تھے۔

پنجاب یونیورسٹی میں اپنے دوسالہ قیام کے دوران ہمیں بہت سے قابل اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان میں ڈاکٹر دلاور حسین، ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، ڈاکٹر بشیر اے خان، ڈاکٹر محمد رفیع انور، محمود احمد بٹ اور کچھ دیگر نام شامل تھے۔ ان اساتذہ کی ساری زندگی درس وتدریس میں گذری تھی لہٰذا ان سے اکتساب فیض بجائے خود ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

ڈاکٹر دلاور حسین جنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رکھا تھا اُن دنوں ایم اے او کالج لاہور کے پرنسپل تھے اور پولیٹیکل سائنس کے شعبہ کے صدر کی ذمہ داری ان کے پاس اضافی تھی۔ وہ انڈیا کے ابتدائی ٹیسٹ کرکٹرز میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز انگلینڈ کے خلاف ایک ٹیسٹ میچ سے کیا جو کلکتہ میں ۳۳۔۱۹۳۴ء میں کھیلا گیا تھا۔ وہ خود بتایا کرتے تھے کہ وہ کرکٹ کھیلتے وقت سر اور ہاتھوں کو ڈھکتے نہ تھے چنانچہ پہلی ہی اننگ میں جس کا آغاز انہوں نے کیا تھا ایک باؤلر نے ان کے سر کا نشانہ لے کر انہیں شدید زخمی کر دیا تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مرہم پٹی کے بعد دوبارہ میدان میں آگئے۔ اب کے ایک اور باؤلر نے اُن کے انگوٹھے کو زخمی کر دیا مگر اس کے باوجود وہ اس میچ میں سب سے زیادہ رنز بنانے والے کھلاڑی قرار پائے۔

اُن کے متعلق دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ انتہائی خوش خوراک ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ دنیا کے کسی بھی موضوع پر بے تکان گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہمیں ان کی خوش خوراکی کا مشاہدہ کرنے کا موقع تو نہیں ملا البتہ ہم نے یہ ضرور دیکھا کہ وہ اپنے لیکچر کو طلبہ کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں اور اسے

لطائف سے اس طرح مزین کئے جاتے ہیں کہ غیر سنجیدہ طلبہ بھی اسے انتہائی توجہ سے سننے پر مجبور ہو جاتے۔

اب تو ہمارے سرکاری دفاتر میں کاروں کی ریل پیل ہے اور معمولی افسران بھی کسی اور سواری پر سفر کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں لیکن ڈاکٹر دلاور حسین ایم اے او کالج سے ہمیشہ رکشے پر سوار ہو کر آتے اور اسی سواری سے واپس جاتے۔

ڈاکٹر دلاور حسین پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کے فاؤنڈر ممبر اور سلیکٹر بھی تھے۔

موصوف ہمیں ویسٹرن پولیٹیکل تھاٹ پڑھایا کرتے تھے جو بذاتِ خود ایک خشک مضمون ہے لیکن وہ اپنی مہارت سے اس میں اتنی رنگینی ضرور پیدا کر دیتے کہ ان کا لیکچر قابل برداشت ہو جائے۔

وہ پنجاب یونیورسٹی میں ہماری موجودگی کے دوران ہی شعبہ سیاسیات کی سربراہی سے الگ ہو گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر منیر الدین چغتائی نے لے لی جو پہلے سے ہمیں پاکستان مُومنٹ اینڈ اِٹس بیک گراؤنڈ نامی پرچہ پڑھا رہے تھے۔ ان کا تعلق موچی دروازہ کے مشہور خاندانِ حکیماں سے تھا۔ یہ وہی خاندان ہے جو ''الحکیم'' کے نام سے ایک ماہانہ طبی رسالہ بھی نکالتا تھا۔ ہمارے احمدی دوست، ڈاکٹر عبدالحمید چغتائی اس کے لیے باقاعدگی سے مضامین لکھا کرتے تھے جو بعض اوقات اُن کے اپنے نام سے اور بعض اوقات کسی اور نام سے چھپا کرتے تھے۔ یہ رسالہ اباجی بھی منگوایا کرتے تھے اور مجھے اِس میں اُن کے ایک دو مضامین کا چھپنا بھی یاد ہے۔

ڈاکٹر منیر الدین چغتائی نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی اور وہ انتہائی شفیق اساتذہ میں سے تھے۔ اُن کے لہجے میں ایک خاص مٹھاس تھی اور گفتگو میں روانی۔ انہیں اپنے موضوع پر مکمل دسترس حاصل تھی چنانچہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ لیکچر دیتے اور طلبہ کے سوالات کا جواب دینے میں بھی کوئی دِقت محسوس نہ کرتے۔

وہ ہمارے یونیورسٹی سے چلے آنے کے بعد دو سال کے لیے یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور چار سال تک وائس چانسلر رہے جو اُن کے لیے اور اِن کے چاہنے والوں کے لیے ایک بڑا اعزاز تھا۔

ڈاکٹر منیر الدین چغتائی نے ۲۳ جولائی ۲۰۰۷ء کو وفات پائی اور کیولری گراؤنڈ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

لاہور میں مدفون مشاہیر (جلد دوم) کے مصنف ایم آر شاہد نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر چغتائی کی اہلیہ خالدہ منیر الدین کے حوالے سے یہ بات خاص طور پر نقل کی ہے کہ موصوف نہ صرف اچھے انسان تھے بلکہ ایک شفیق باپ، بہترین شوہر اور حقوقِ نسواں کے زبردست حامی تھے۔

ڈاکٹر بشیر اے خان کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ ان کا تعلق کسی احمدی خاندان سے ہے اور یہ کہ وہ تعلیم الاسلام کالج کے زمانۂ لاہور میں اس کے ساتھ منسلک تھے تاہم جب کالج ربوہ منتقل ہوا تو انہوں نے وہیں رہنے کو ترجیح دی اور پھر جماعت سے بھی دور ہو گئے۔ مجھے ان افواہوں کی صداقت جاننے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ وہ ہمیں انٹرنیشنل لا اور انٹرنیشنل ریلیشنز: بٹوین دی ٹو ورلڈ وارز پڑھایا کرتے تھے اور اس لحاظ سے ان سے رابطہ بھی

بحث [illegible] رہتا تھا لیکن اس مضمون پر جب [illegible] شاگرد بھی ہمت ہی نہ [illegible]۔ ممکن ہے وہ بھی نہ مانتی [illegible] ہے۔
انہوں نے پی ایچ ڈی نہ جانے کس یونیورسٹی سے کر رکھی تھی لیکن ان سے پڑھنے میں بہت [illegible]
تھی۔ ہمیشہ سیاہ عینک استعمال کرتے جس کی ایک طرف روئی کا پھاہا رکھا ہوتا تھا۔ سنتے تھے وہ ایک آنکھ سے [illegible]
تھے۔ نہ جانے پیدائشی طور پر ایسا تھا یا کوئی حادثہ اس کا سبب بنا۔

پنجاب یونیورسٹی میں قیام کے دوران ہمیں محمود احمد بٹ سے پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا جو ان ہی دنوں ایم اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں پڑھانے پر مامور ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت ''کھلی ڈلی'' طبیعت پائی تھی اور اپنے شاگردوں کے ساتھ اُن کا رویہ انتہائی دوستانہ تھا۔ بعد میں انہوں نے پراونشل سول سروس کا امتحان پاس کر لیا اور اُن کی آخری تعیناتی ڈپٹی کمشنر ضلع ڈیرا غازی خاں کے طور پر تھی۔ اُن ہی دنوں میری کتاب ''یہ زندگی ہے'' شائع ہوئی تو انہوں نے اُس کی ایک تقریبِ پذیرائی وہاں منعقد کی۔ افسوس! اس کے چند ہی روز بعد وہ ایک رات اچانک ہارٹ فیل ہونے سے وفات پا گئے اور لاہور میں دفن ہوئے جہاں ان کی اہلیہ کسی سرکاری ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹر ہوا کرتی تھیں۔

پروفیسر محمد رفیع انور یونیورسٹی کے مستقل سٹاف پر نہ تھے۔ یاد نہیں کس کالج میں ہوا کرتے تھے تاہم ہمارا پبلک ایڈمنسٹریشن کا پیریڈ وہی لیا کرتے تھے۔ بول چال اور چال ڈھال سے سادگی عیاں تھی۔ وہ احمدی تو نہ تھے لیکن چوہدری عزیز احمد، نائب ناظر صدر انجمن احمدیہ کے عزیزوں میں سے تھے لہٰذا احمدیوں کے متعلق اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بعد میں ڈائریکٹر ایجوکیشن فیصل آباد ڈویژن بھی رہے اور اس حیثیت میں ربوہ کے مردانہ اور زنانہ، دونوں کالجوں کے دورے پر بھی تشریف لاتے رہے ہیں۔

اس زمانے میں معاشیات، تاریخ اور سیاسیات کے شعبہ جات میں طلبہ کی تعداد یونیورسٹی کے باقی شعبہ جات کی نسبت بہت زیادہ تھی لیکن سیاسیات میں تو یہ تعداد دوسو کے لگ بھگ پہنچی ہوئی تھی جس میں سے تین چوتھائی لڑکیاں تھیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ صورتِ حال ڈاکٹر دلاور حسین کی اس فراخدلانہ داخلہ پالیسی کی وجہ سے پیدا ہوئی جس کے تحت انہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے شہدا اور غازیوں کے متوسّلین کو بلا حیل و حجت داخلہ دے دیا اور جذبۂ حب الوطنی کے تحت یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دی کہ اتنی بڑی کلاس کو کنٹرول کرنے میں کیا کیا دقتیں پیش آ سکتی ہیں۔

ڈاکٹر دلاور حسین کا یہ جذبہ یقیناً قابلِ قدر تھا لیکن اتنی بڑی کلاس میں ڈسپلن قائم رکھنا آسان نہیں ہوتا چنانچہ بعض طلبہ نے اس میں سے غیر حاضر رہنا شروع کر دیا۔ ''پراکسی'' کا لفظ میں نے پہلی بار وہیں بکثرت استعمال ہوتے سنا تھا۔ کچھ طالب علم جاتے جاتے اپنے کسی دوست کو کہہ جاتے کہ حاضری ہو تو وہ اُسے پریزنٹ مارک کرا دے۔ یوں کام چلتا رہتا اور طلبہ میں بدنظمی بڑھتی رہتی۔

کچھ طلبہ کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ یونیورسٹی میں یہ عرصہ عیش و آرام سے گذاریں اور اگر بغض [illegible] پاس ہو بھی جائیں تو کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں جا ڈیرا لگائیں۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسے طلبہ تھے جو [illegible]

کلاس فیلوز کے ساتھ گھومتے اور سیف [illegible] یا [illegible] [illegible] میں [illegible] اپنی [illegible] [illegible] [illegible]
کے استعمال میں رہتیں۔

ان سب باتوں کے باوجود ہمارے بعض کلاس فیلوز سنٹرل سپیریئر سروسز کا امتحان پاس [illegible] [illegible]
مختلف سرکاری ملازمتوں میں آئے۔ ان میں محمد ایوب مارتھ (ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ)، خضر نیازی (پاکستان
فارن سروس)، ہارون الرشید (پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس)، وکیل احمد خان (پاکستان ٹیکسیشن سروس)
اور ملک محمد افضل، منیر احمد اور رضا اشرف (آفس مینجمنٹ گروپ) شامل ہیں۔ افواج پاکستان کے بعض [illegible]
افسران بشمول کرنل افتخار اور کرنل بشیر، پراونشل سول سروس (جوڈیشل) کے ممتاز منور نیازی، ریڈیو پاکستان کے
محمد شفیع اور صوبائی سروسز کے بعض اراکین بشمول سرکاری کالجوں کے بعض مرد و خواتین لیکچررز ہماری کلاس فیلو
تھیں۔ نجمہ نام کی ہماری ایک کلاس فیلو اُن ہی دنوں پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس کے طور پر چلی گئیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں میرا دو سالہ قیام میرے لیے ہر لحاظ سے باعثِ خیر و برکت ثابت ہوا۔ ایک تو
مجھے وہ کوالیفیکیشن حاصل ہوگئی جس نے میری آئندہ ترقیات کی راہ ہموار کی۔ اسی طرح مجھے دوستوں کا ایک
ایسا حلقہ نصیب ہوا جس پر میں ساری زندگی ناز کرتا رہا۔ ان میں سے کچھ دوست اب اللہ کو پیارے ہو چکے
ہیں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین سے نوازے اور باقیوں کو ہمیشہ ہر دکھ اور بلا
سے محفوظ رکھے۔

اللہ کو پیارے ہو جانے والوں میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر ایوب مارتھ کا جو ملک کی اعلیٰ ترین سروس
کے رکن ہونے کے باوصف ایک وضعدار انسان تھے۔ جن دنوں وہ کمشنر سوشل سیکورٹی، پنجاب تعینات تھے تو میری
ایک عزیزہ نے سوشل سیکورٹی ہسپتالوں میں ملازمت کے لیے درخواست دی۔ وہ کسی سفارش کی تلاش میں تھیں۔
جب انہوں نے مجھ سے بات کی تو میں نے انہیں تسلی دلائی کہ انشاء اللہ ان کا کام ہو جائے گا۔ میں ایوب مارتھ
سے ملا اور اپنا مسئلہ بتایا۔ انہوں نے میری درخواست نوٹ کر لی اور اگلے چند روز کے اندر اندر میری اس عزیزہ کو
تقرری کا خط مل گیا۔ یہ ان کا مجھ پر ایک بڑا احسان تھا۔

۱۹۹۶ء میں جب میں پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج میں ٹریننگ کے لیے گیا تو ایوب مارتھ بھی ہمارے
ساتھ تھے۔ چار مہینوں کے اس کورس میں ہم دن رات اکٹھے رہے اور ہانگ کانگ، کوریا، جاپان، سنگاپور اور
بنکاک کے دورے میں بھی ایک ساتھ بلکہ ایک کمرے میں رہے۔ میں نے انہیں بے حد نفیس الطبع اور محبت کرنے
والا انسان پایا۔

ان کے ایک بھائی محمد اشرف مارتھ جو پولیس سروس آف پاکستان کے رکن تھے اور چوہدری پرویز الٰہی
کے بہنوئی، دہشت گردوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ایوب یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور اشرف کے انتقال کے
ایک ہفتے کے اندر اندر راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔

ہمارے کلاس فیلو، رضا اشرف ٹیبل ٹینس کے قومی سطح کے کھلاڑی تھے اور چین میں پاکستان کی نمائندگی کر

چکے تھے۔ ان کی رہائش ال لڑتی، راولپنڈی میں تھی۔ ابھی گریڈ ۲۰ میں بھی نہ پہنچ پائے تھے کہ ایک رات فرشتہ اجل نے انہیں آ لیا۔

ان کے چہرے پر سدا مسکراہٹ رہتی تھی اور وہ دوستوں کا کام کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

کرنل افتخار بھی ان لوگوں میں سے تھے جو اَب انتقال کر چکے ہیں۔فوج کی ملازمت سے علیحدگی کے بعد وہ اپنا کام کرتے رہے لیکن انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔زود حِس انسان تھے اور شعر کہتے تھے۔ایک روز بیٹھے بٹھائے ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

لاہور میں میرا دو سالہ قیام بہت یادگار رہا۔ میں نے اپنے شوق کے تحت لاہور کو اچھی طرح دیکھا اور اس زمانے کی بعض شخصیات سے بھی ملا لیکن یہ سب کچھ اس کتاب کے موضوع سے باہر ہے لہٰذا اسے نظر انداز کرتے ہوئے میں اس وقت صرف ایک واقعہ کی تفصیلات عرض کرنا چاہوں گا جو اس سارے عرصہ میں میرے لئے سوہانِ روح بنا رہا۔

یہ ۱۹۶۵ء کے دسمبر کی اکیس تاریخ تھی۔ میں پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس آڈیٹوریم کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ اتفاقاً منظور صادق مل گئے۔انہوں نے بتایا کہ الفضل کی ایک خبر کے مطابق جامعہ نصرت کی ایک طالبہ کو بی اے کے امتحان کے نتائج کی بنیاد پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پانچ طلائی تمغہ جات کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔منظور کو باقی تفصیلات کا تو کچھ علم نہ تھا تاہم ان کا اندازہ تھا کہ اس طالبہ کو یہ تمغے یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر دیئے جائیں گے جو اس سے اگلے روز اسی آڈیٹوریم میں منعقد ہونے والی تھی۔

اس طالبہ نے میرے ساتھ، اسی سال بی اے کا امتحان پاس کیا تھا اور وہ اتفاق سے ہماری محلے دار بھی تھیں۔ان کا اپنی بڑی بہن کے ہمراہ میری بہنوں کے پاس آنا جانا تھا اور میں ان کے والدِ بزرگوار سے ذاتی طور پر بھی اچھی طرح متعارف تھا لہٰذا مجھے اِن کے بی اے میں مجموعی طور پر حاصل کردہ نمبروں کے علاوہ ان کے مضمون وار نمبروں کا بھی علم تھا۔ یہ درست ہے کہ ان کے مجموعی نمبر مجھ سے زیادہ تھے لیکن مشترک مضامین میں میرے نمبر ان سے زیادہ تھے لہٰذا مجھے یہ خبر کھٹکی اور خیال پیدا ہوا کہ کہیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے نادانستہ طور پر میرے ساتھ کوئی ناانصافی تو نہیں ہو رہی۔ مجھے ان میڈلز کی تقسیم کے خلاف عدالت سے حکمِ امتناعی حاصل کرنے کی تو نہ سوجھی اور میں ان حالات میں شاید اس کے اخراجات کا متحمل بھی نہ ہو سکتا تھا البتہ مجھے یہ جاننے کا حق ضرور تھا کہ کہیں یونیورسٹی کے اس اقدام سے میری کوئی حق تلفی تو نہیں ہو رہی چنانچہ میں اسی شام لاہور سے ربوہ جا پہنچا تا کہ ضروری مشورے کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکوں۔

ربوہ پہنچ کر سب سے پہلے تو میں نے الفضل کا وہ پرچہ دیکھا جس میں یہ خبر چھپی تھی۔خبر میں اس صاحبزادی کو ملنے والے میڈلز کے نام تو موجود تھے تاہم اس سے یہ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ میڈلز ان کی کس کارکردگی کے حوالے سے عطا کیے جا رہے ہیں۔ میں اسی وقت چچا ابراہیم کے پاس گیا اور ساری صورتِ حال ان کے سامنے رکھی۔انہوں نے بتایا کہ ان میڈلوں کے استحقاق کے بارے میں صحیح معلومات پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں

اور اس کے لیے مجھے بہر طور اگلی صبح کا انتظار کرنا تھا۔

اگلے روز میں صبح ہی صبح تیار ہو کر تعلیم الاسلام کالج لائبریری جا پہنچا۔ خوش قسمتی سے یونیورسٹی کیلنڈر موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ ان میڈلوں میں سے دو یعنی آلور گولڈ میڈل اور امرت لال رائے گولڈ میڈل فی الاصل اُس طالب علم کے لیے مختص ہیں جو بی اے کے امتحان میں سنسکرت اور انگریزی کے مجموعی نمبروں میں یونیورسٹی بھر میں اول پوزیشن حاصل کرے تاہم اگر پوری یونیورسٹی میں سنسکرت کا کوئی طالب علم نہ ہو تو یہ میڈل عربی اور انگریزی کے مجموعی نمبروں میں یونیورسٹی بھر میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر عطا کئے جائیں گے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ عربی اور انگریزی میں میرے مجموعی نمبر ۲۹۲ تھے جب کہ اس طالبہ کے نمبر ۲۹۰ تھے۔ اندریں حالات یہ میڈلز قانونی طور پر انہیں نہ مل سکتے تھے لیکن عملاً یہ میڈل پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر انہیں عطا بھی ہو چکے تھے۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ قبول تھی چنانچہ میں مزید مشورے کے لیے قاضی محمد اسلم سے ملاقات کے لیے ان کے دفتر پہنچ گیا جو حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے بعد تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔

ان قارئین کے لیے جن کے لیے قاضی محمد اسلم کا نام نیا ہے یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ وہ حضرت مسیح موعود کے ایک رفیق، حضرت ڈاکٹر کرم الٰہی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے لاہور کے علاوہ علیگڑھ اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی تھی جس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ وہ اس کالج کے پرنسپل بھی رہے اور اسی دوران انہیں ڈی پی آئی اور صوبائی سیکرٹری ایجوکیشن کے طور پر کام کرنے کا بھی موقع ملا۔ وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کے چیئرمین اور کراچی یونیورسٹی میں اقبال پروفیسر آف فلاسفی کے طور پر خدمت بجالاتے رہے۔

ان کا ایک اور حوالہ مدراس لیکچرز کا ہے۔ یاد رہے کہ مدراس یونیورسٹی نے ان لیکچرز کے لیے برصغیر کے چوٹی کے جن صاحبانِ علم کو مدعو کیا تھا ان میں موصوف بھی شامل تھے اور ان کے لیکچرز کا موضوع تھا: "The Meanings of History." باقی فضلا علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی تھے۔

وہ پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کے فیلو، نیشنل سائنس پالیسی (ہیلتھ اینڈ میڈیسن) کے پینل کے رُکن، آل پاکستان فلاسوفیکل کانگریس کے سیکرٹری اور سائیکالوجی کانگریس کے بانی صدر رہ چکے تھے۔ وہ اُس سائیکولاجیکل وارفیئر کمیٹی کے رُکن بھی تھے جو ۱۹۶۵ء میں صدر پاکستان کو مشاورت فراہم کرنے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔

جماعت کے لیے ان کی خدمات کی فہرست بھی کافی طویل تھی اور وہ کچھ عرصہ امیر جماعتِ احمدیہ، لاہور بھی رہے۔

میں اس بلند و بالا شخصیت کے ساتھ پہلی بار ملنے والا تھا لہٰذا میرے ذہن میں ان کے متوقع ردِعمل کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے لیکن خدا کا شکر ہے وہ بہت شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے

میری رام کہانی بہت توجہ سے ساتھ سنی اور میں نے ان کے مشورے کے مطابق اسی روز پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے نام ایک درخواست تیار کر کے ان کے حوالے کر دی۔
ان کی طرف سے یہ درخواست یکم جنوری ۱۹۶۶ء کو پنجاب یونیورسٹی کو بھجوائی گئی۔ جلد ہی یونیورسٹی کی طرف سے کالج کو اس خط کی رسید موصول ہوگئی۔ یونیورسٹی نے نوید سنائی تھی کہ معاملے کی تحقیق کی جارہی ہے تاہم جب بہت وقت گذر گیا اور اس حوالے سے کوئی پیش رفت ہوتی نظر نہ آئی تو میں دوبارہ قاضی صاحب سے ملا اور انہیں اس معاملے میں یونیورسٹی کو یاددہانی کرانے کی درخواست کی۔ انہوں نے اسی وقت ایک خط بشیر الدین علوی، سپرنٹنڈنٹ امتحانات، پنجاب یونیورسٹی کے نام لکھ کر مجھے تھما دیا تاکہ میں اپنے اطمینان کے مطابق اسے خود پوسٹ کردوں۔ انہوں نے لکھا تھا:

''ہمارے کالج کے محمد داؤد طاہر نے ایک یا دو میڈل کے متعلق اپیل کی ہوئی ہے۔ آپ نے (حوالہ ۹۳ ای/۱۳ جنوری ۱۹۶۶ء) کہہ رکھا ہے کہ جلد ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ صرف یاددہانی کرواتا ہوں۔
اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔''

یونیورسٹی کو اپنی غلطی کے اعتراف میں بہت وقت لگ گیا اور بالآخر جب یہ تسلیم کر لیا گیا میڈلز کی تقسیم میں اس کے کسی اہلکار سے غیر ارادی طور پر غلطی سرزد ہوگئی ہے تو یونیورسٹی نے جامعہ نصرت کی پرنسپل کو ایک خط لکھ کر ان دونوں میڈلز کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ یہ خط جو پنجاب یونیورسٹی کے کنٹرولر امتحانات نے ۲۶ مارچ ۱۹۶۶ء کو لکھا تھا ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

"I have the honour to enclose herewith a copy of the application dated 31 December, 1965 submitted by one Muhamamd Daud Tahir against the award of Amrit Lal Roy Gold Medal and Alwar Gold Medal to Miss .... of your College.

The facts of the case have been fully investigated and found correct.

I am sorry to admit that the unhappy situation has been created by the omission on the part of this office. Action is being taken against the person responsible for this carelessness.

I am to request to please collect the medals from Miss .... and return the same to this office as early as possible for being awarded to the rightful candidate."

میں خود بھی یہی چاہتا تھا چنانچہ میں اس کوشش میں لگا رہا کہ جامعہ نصرت کی پرنسپل یونیورسٹی کے اس مطالبہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں تاہم وہ اس اقدام پر تیار نہ تھیں بلکہ انہوں نے اس معاملہ پر مکمل چپ سادھ

ی۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے جامعہ نصرت کی پرنسپل کو یاد دہانی سے کئی خطوط لکھے گئے تاہم ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں گیا۔ یونیورسٹی نے انہیں یاد دہانی کا پہلا خط ۲۰ اپریل ۱۹۶۶ء ۔۔۔ اپریل ۱۹۶۶ء ۔۔۔ ۸ جون ۱۹۶۶ء کو لکھا اور درخواست کی میڈلز اس طالبہ سے واپس لے کر فوری طور پر انہیں بھجوائے۔ تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل نے بھی ان سے یہ معاملہ سلجھانے کی درخواست کی اور میں خود بھی پرنسپل جامعہ نصرت سے اصلاحِ احوال کی درخواست کرتا رہا تاہم وہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

یوں تو مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے وقتاً فوقتاً شرف ملاقات حاصل ہوتا رہتا تھا لیکن میں نے آپ کے ساتھ اس معاملے پر گفتگو سے ہمیشہ اجتناب کیا تھا اور حضور نے بھی از خود اس بارے میں مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ جب پرنسپل جامعہ نصرت کا رویہ میرے لیے پریشانی کا باعث بننے لگا تو میں نے یہ معاملہ حضور کے گوش گذار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۲۰ مئی ۱۹۶۶ء کو حضور کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

جب میں نے اپنا مسئلہ حضور کے سامنے رکھا تو آپ نے متبسم چہرے کے ساتھ فرمایا ''تم نے تو مجھے نہیں بتایا تھا لیکن میں اس معاملے سے پوری طرح باخبر ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری حق تلفی ہوئی ہے اور تمہیں اس کے لیے پنجاب یونیورسٹی سے ضرور لڑنا چاہئے لیکن چونکہ یونیورسٹی نے یہ میڈل اس طالبہ کو خود دیئے تھے لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ تم اس طالبہ اور جامعہ نصرت کو بیچ میں لائے بغیر ان سے معاملہ طے کرو۔''

میں نے حضور کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس طالبہ کو ملنے والے میڈل ضرور واپس ہونے چاہئیں کیوں کہ ان کا اصل حقدار میں تھا اور اگر یونیورسٹی ان سے میڈل واپس لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔

اس پر حضور نے فرمایا: ''تمہارا جھگڑا یونیورسٹی کے ساتھ ہے، اس طالبہ کے ساتھ نہیں۔ تم یونیورسٹی سے میڈلوں کا مطالبہ ضرور کرو لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہاری طرف سے اس طالبہ سے میڈلوں کی واپسی کے تقاضے پر اصرار نہ کیا جائے۔''

میں نے عرض کیا کہ ''مجھے اس قضیئے نے سخت پریشان کر رکھا ہے اور اگر میں بھاگ دوڑ نہ کرتا تو یہ کیس کبھی یہاں تک نہ پہنچتا۔'' اس پر حضور نے فرمایا: ''یہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ بس آج کے بعد تم نے یونیورسٹی سے اس طالبہ سے میڈلوں کی واپسی کے مطالبہ پر اصرار نہیں کرنا۔''

حضور کے اس ارشاد کے بعد میرے لیے اس طالبہ کو دیئے گئے میڈلز کی واپسی کے مطالبہ پر قائم رہنا ممکن نہ رہا تھا لیکن اس معاملے میں پیش رفت کے لیے ضروری تھا کہ جامعہ نصرت کی پرنسپل کی طرف سے یونیورسٹی کو فوری طور پر کچھ نہ کچھ جواب چلا جائے، بھلے وہ میڈلز کی واپسی سے انکار ہی کر دیں۔ میرے اصرار پر وہ بالآخر یونیورسٹی کو خط لکھنے پر راضی ہو گئیں۔ انہوں نے ۲۶ جون ۱۹۶۶ء کو یونیورسٹی کے نام اپنے خط میں لکھا کہ یہ طالبہ اب جامعہ نصرت چھوڑ کر جا چکی ہیں لہٰذا وہ ان سے میڈلز کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ میڈلز خود یونیورسٹی کی طرف سے انہیں عطا کیے گئے تھے لہٰذا ان کی غلط تقسیم کی ذمہ دار یونیورسٹی خود ہے اور

یونیورسٹی کی غلطی کی سزا اس طالبہ کو نہیں ملنی چاہیے۔

اب جب کہ جامعہ نصرت کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی کو میڈلز کی واپسی سے انکار کیا جا چکا تھا، اسے فی الفور یہ معاملہ نمٹا دینا چاہیے تھا لیکن وہ اس کے لیے تیار نظر نہ آتی تھی۔ یقین کیجئے، مجھے اس حوالے سے یونیورسٹی کے رجسٹرار اور کنٹرولر امتحانات اور ان کے ماتحت عملے سے اس کثرت سے ملنا پڑا کہ ان دفاتر کے چپڑاسی تک مجھے پہچاننے لگے لیکن میری کوئی شنوائی نہ ہوتی۔

ان دنوں ملک امیر محمد خان مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ وہ بلحاظ عہدہ پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ جب یہ معاملہ غیر ضروری طول پکڑ گیا تو میں نے استاذی المکرّم ماسٹر سعد اللہ خان کے مشورے سے ان کے نام ایک درخواست لکھی اور اس کے مشمولات کے بارے میں ہر طرح سے اطمینان کے بعد بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ انہیں ارسال کر دی۔

میں اس وقت تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ گورنر میری یہ درخواست پڑھتے ہی آگ بگولہ ہو جائیں گے اور پنجاب یونیورسٹی کی اس نااہلی کے ذمہ داران سے فوراً جواب طلبی کریں گے تاہم جلد ہی ثابت ہو گیا کہ یہ میرا خیالِ خام تھا۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور اس مسئلے کے حل کے لیے میری یہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔

اندریں حالات میں نے وائس چانسلر سے ملاقات کی کوشش شروع کر دی۔ صبر آزما انتظار کے بعد میں بالآخر ۱۰ نومبر ۱۹٦٦ء کو ان سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔

ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مولانا ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی، حمید احمد خان تھے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور نامور اہلِ قلم تھے۔ وہ تعلیم الاسلام کالج کی ۱۹٦۲ء کی کانووکیشن میں مہمانِ خصوصی تھے اور میں نے انہیں دیکھ رکھا تھا لیکن اس اتفاق کو ملاقات کا درجہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اب جب کہ ان سے ملاقات کی صورت پیدا ہو رہی تھی میرا دل ایک انجانی سی مسرت سے لبریز تھا کہ مجھے ایک ایسے شخص کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا جو تعلیم و تدریس اور علم و ادب کی دنیا میں ایک خاص مقام رکھتا ہے تاہم تعجب اس بات پر ہوا (حالانکہ اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی) کہ وہ اس معاملے سے کلی طور پر بے خبر تھے۔ بہر حال انہوں نے میری بات توجہ کے ساتھ سنی اور ہدایت کی کہ میں اے کیو قریشی، ڈپٹی کنٹرولر امتحانات سے مل لوں۔ حمید احمد خاں نے انہیں فون کیا اور پھر میری ہی بھجوائی ہوئی چٹ کی پشت پر ان کے نام یہ ''پیغام'' لکھ کر چٹ مجھے تھما دی:

''قریشی صاحب!

اس خط سے متعلق بات کریں

حمید احمد خان

۱۰-۱۱-٦٦''

میں پہلے بھی اے کیو قریشی سے ملتا رہتا تھا لیکن اس بار اُن کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ قدرے ملائمت

ے پیش آئے اور اس بات پر حیران ہوئے کہ میں پہلے سے تقسیم شدہ میڈلز کی واپسی کے مطالبے سے کیوں دستبردار ہو گیا ہوں۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ مجھ پر کسی قسم کا کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا گیا۔ میرے انکار پر انہوں نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''میرا مطلب ہے اب آپ اصل میڈلوں کی واپسی پر اصرار کیوں نہیں کر رہے؟'' میں نے انہیں بتایا کہ جھگڑا بہت طول کھینچ چکا ہے اور میں ان میڈلوں کے پیچھے بھاگتا بھاگتا تھک گیا ہوں لہٰذا مسئلے کا فوری حل چاہتا ہوں لہٰذا اگر مجھے نئے میڈل بھی بنوا دیئے جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ ان ساری کوششوں کے باوجود مجھے میڈلز دیئے جانے کا فیصلہ بدستور التوا میں رہا۔

میں اُن دنوں ایم۔اے فائینل میں پڑھتا تھا چنانچہ میں ایک روز اپنے صدرِ شعبہ، پروفیسر ڈاکٹر [illegible] حسین کے پاس چلا گیا اور انہیں ساری کہانی سنائی۔ انہوں نے میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور یقین دلایا کہ اگر میں وائس چانسلر کے نام ایک درخواست میں یہ ساری باتیں لکھ دوں تو وہ یہ درخواست اپنی سفارش کے ساتھ انہیں بھجوا دیں گے۔ یہ ۲۵ جنوری ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ میں نے اسی وقت درخواست لکھ کر صدر شعبہ کے حوالے کر دی اور انہوں نے اگلے ایک دو روز میں اسے آگے بھجوا دیا۔

نہ جانے کب پنجاب یونیورسٹی نے ہار مانی اور یہ فیصلہ ہوا کہ مجھے نئے میڈلز بنوا کر دیئے جائیں گے۔ ملاحظہ ہو قاضی محمد اسلم کا میرے نام ۳ مارچ ۱۹۶۷ء کا لکھا ہوا یہ خط:

''آپ کا خط ملا۔ میں اگلے روز یونیورسٹی میں تھا۔ فیصلہ ہوا ہے کہ آپ کو میڈل بہرحال دیا جائے گا چنانچہ اُمید ہے ہماری آنے والی کانووکیشن میں وہ میڈل دیں گے۔ جو میڈل بے استحقاق ایک اور جگہ پہنچا ہوا ہے اس کی واپسی کے لیے یونیورسٹی خود فیصلہ کرے گی۔ ہم انہیں امداد دیں گے۔

دشمنوں کی نہیں میری اپنی طبیعت کچھ ناساز رہی لیکن جلد ہی بحال ہو گئی۔ الحمدللہ اب خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہوں۔

آپ سول سروس کا خیال پختہ کریں۔ آئندہ نصاب کے انتخاب میں (یعنی ایل ایل بی ہو یا کوئی اور ایم اے وغیرہ) اور عام تیاری میں مشورہ کر لیں۔ اللہ آپ کو اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔''

قاضی صاحب نے یہ خط مکمل کرنے کے بعد بطور پوسٹ سکرپٹ لکھا: ''کانووکیشن ہم تو ۱۹ کو طے کر چکے تھے۔ اب وزیرِ تعلیم صاحب (ہمارے مہمانِ خصوصی) اس میں کچھ تبدیلی چاہتے ہیں۔''

اب جب کہ ان میڈلز پر میرا حق تسلیم کیا جا چکا تھا میری یہ خواہش بے جا نہ تھی کہ مجھے یہ میڈلز پنجاب یونیورسٹی کی پیش آمدہ کانووکیشن کے موقع پر عطا کیے جائیں تاہم یونیورسٹی حکام بضد رہے کہ کانووکیشن پر سال ہائے گذشتہ کے نتائج کی بنیاد پر قابلِ تقسیم میڈل عطا نہیں کیے جا سکتے۔

ایک روز مجھے قاضی صاحب کی طرف سے بلاوا آیا۔ میں ان کے دفتر میں حاضر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں حبیب بنک لمیٹڈ، اولڈ کیمپس برانچ کے منیجر کی طرف ایک مہر بند لفافہ موصول ہوا ہے جو مجھ تک پہنچایا جانا مقصود ہے۔ انہوں نے وصولی کی رسید حاصل کرنے کے بعد یہ لفافہ مجھے تھما دیا۔ یہ لفافہ جو انہیں ڈاک سے ملا تھا

پانچ سو روپے میں بیمہ شدہ تھا۔ اس زمانے میں پانچ سو روپے ایک خطیر رقم تھی۔ میں سمجھ گیا اس کے اندر کیا ہے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے یہ لفافہ کھولا تو اس میں سے دو سنہرے میڈل پھسل کر میری جھولی میں آ گرے۔ یہ واقعہ ۱۸ مئی ۱۹۶۷ء کا ہے۔

دو تین روز بعد کالج کانووکیشن ہونے والی تھی۔ قاضی صاحب نے از راہ شفقت خود ہی یہ فیصلہ فرمایا۔ رسمی طور پر یہ میڈل مجھے اس موقع پر عطا کئے جائیں گے۔ بعد میں مجھے پروفیسر حبیب اللہ خاں کی طرف سے کانووکیشن میں شمولیت کا باقاعدہ دعوت نامہ بھی موصول ہو گیا چنانچہ میں ۲۱ مئی ۱۹۶۷ء کو منعقد ہونے والی کانووکیشن میں شامل ہوا۔ اس کانووکیشن کے مہمانِ خصوصی پروفیسر نامدار خان تھے جو ان دنوں حکومت مغربی پاکستان کے مشیر تعلیم تھے۔ انہوں نے ہی مجھے یہ میڈل ڈیکوریٹ کئے۔ میرے لیے یہ بہت خوشی کا موقع تھا۔ یہی وہ میڈل تھے جن کے لیے میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایک طویل جنگ لڑی تھی۔ یہ جنگ جیتنے میں میری زندگی کے دو قیمتی سال ضائع ہو گئے تھے اور اس کا میرے تعلیمی کیریئر پر بے حد منفی اثر پڑا تھا لیکن اب یہ باتیں یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی سے اس معاملے میں غلطی سرزد نہ ہوتی اور یہ میڈل اپنے وقت پر مجھے مل جاتے تو اس اعزاز کا لطف ہی کچھ اور ہوتا لیکن خدا کا شکر ہے جس نے مجھ پر فضل فرمایا اور حق بحقدار رسید کے مصداق بالآخر یہ میڈل مجھے مل گئے۔

اس موقع پر قاضی محمد اسلم نے اپنی رپورٹ میں جانے کیا کچھ کہا اور پروفیسر نامدار خاں نے اس پر کیا تبصرہ کیا لیکن مجھے قاضی صاحب کی ایک بات کبھی نہیں بھولی۔ انہوں نے فرمایا تھا: ''زندگی کی دوڑ میں وہی کامیاب ہوتے ہیں جو تیاری کے زمانہ کی اہمیت کو سمجھتے اور اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔'' ان کا کہنا تھا کہ ''جب تم زندگی کی دوڑ میں شامل ہو کر اپنا کام سنبھالو گے تو تمہارے کام آنے والے وہی لمحات، وہی دن رات اور وہی سال ہوں گے جو تم نے محنت سے آئندہ زندگی کی تیاری میں گذارے ہوں گے۔''

یہ حقیقت ہے کہ عملی زندگی میں وہی محنت کام آتی ہے جو کالج اور یونیورسٹی میں قیام کے دوران کی جاے اور میں بھی اس اصول سے کسی طرح مستثنیٰ نہ تھا۔

مجھے احساس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے میڈلوں کی غلط تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پریشانی کی تفصیلات میں پڑ کر میں اصل موضوع سے ذرا سا ہٹ گیا تھا۔ دراصل میں آپ کو بتانا یہ چاہتا تھا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء سے لے کر جون ۱۹۶۷ء تک کا یہ وقت پلک جھپکتے میں گذر گیا۔ اب سالانہ امتحان اتنا قریب تھا کہ یونیورسٹی سے رول نمبر سلپیں بھی موصول ہو گئی تھیں۔

کانٹے ہیں اور پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے

یہ امتحان جون کی ۲۷ تاریخ کو شروع ہوا۔ رول نمبر سلپ کے مطابق میرا سنٹر اینیمل ہسبنڈری کالج المعروف گھوڑا ہسپتال میں بنا جو نیو کیمپس سے کافی دُور تھا۔ اُن دنوں لاہور میں شدید گرمی پڑ رہی تھی چنانچہ میں نے نیو کیمپس سے رکشہ لیا اور اینیمل ہسبنڈری کالج کے سامنے جا اُترا تاہم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ سنٹر ایک ایسے ہال میں قائم کیا گیا ہے جو فی الاصل جانوروں کے آرام یا علاج معالجہ کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک اصطبل تھا جس کے اندر امیدواروں کے لیے کرسیاں میز لگا دیئے گئے تھے۔ ہال میں چھت کے پنکھے تک موجود نہ تھے اور یہ کمی پوری کرنے کے لیے محدود تعداد میں پیڈسٹل فینز کا انتظام کیا گیا تھا جن میں سے کئی بند پڑے تھے۔ رہی سہی کسر لوڈشیڈنگ نے پوری کردی۔

پہلا پرچہ ''پاکستان مُوومنٹ اینڈ اِٹس بیک گراؤنڈ'' یعنی ''تحریکِ پاکستان اور اس کا پس منظر'' کا تھا۔ میں نے اس پرچے کی بہت اچھی تیاری کر رکھی تھی اور اپنی عمدہ کارکردگی کے بارے میں خاصا پُراُمید تھا۔ پرچہ تقسیم ہوا تو میں نے اس کے مطالعہ سے پہلے حسبِ طریقِ سابق دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ پرچہ پڑھا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات بخوبی جانتا ہوں لیکن میں نے جوں ہی پرچہ شروع کیا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، سر چکرانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کو ہو۔ میں نے اسی وقت ایک نگران کو اپنی کیفیت سے آگاہ کیا اور تھوڑی دیر کے لیے ہال سے باہر جانے کی اجازت طلب کی مگر اس نے نہ جانے کیا سمجھ کر میری بات سُنی اَن سُنی کردی۔ چند لمحوں کے بعد ایک اور انوِجلیٹر پاس سے گذرا تو میں نے اس کے سامنے اپنی درخواست دہرائی لیکن اس نے بھی چپ سادھ لی۔ اب میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ میں اجازت کے بغیر ہی اُٹھ کر باہر چلا جاؤں سو میں نے ایسا ہی کیا اور پرچہ وہیں چھوڑ کر ہال سے باہر نکل گیا۔

باہر آرام کی کوئی جگہ موجود نہ تھی چنانچہ میں ایک دیوار کے سائے میں زمین پر لیٹ گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دیر یوں ہی پڑا رہا لیکن جب طبیعت کچھ سنبھلی تو واپس کمرہ امتحان میں جا بیٹھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا پون گھنٹہ ضائع ہو چکا ہے۔ یہ تصور ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا چنانچہ میں پرچہ کیا خاک حل کرتا۔ میں نے ہمت ہار دی اور پانچ میں سے بمشکل تین سوال حل کر پایا تھا کہ وقت ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود میں آخری وقت تک کمرہ امتحان میں بیٹھا رہا لیکن دو سوالوں کا مکمل طور پر چھوٹ جانا چالیس نمبروں کا پرچہ حل نہ کر سکنے کے مترادف تھا۔ یہ ایک پریشان کُن صورتِ حال تھی۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ اس پرچے میں میری ناقص کارکردگی میرے مجموعی نتیجے کو بے حد متاثر کرے گی چنانچہ میں نے کسی سے مشورہ لیے بغیر باقی پرچے دینے کا ارادہ ترک کر

دیا اور ہوسٹل واپس جانے کی بجائے بس کے ذریعہ سیدھا ربوہ جا پہنچا۔

ان دنوں گھر میں صرف امی اور ماسی جی ہوا کرتی تھیں۔ وہ غیر متوقع طور پر مجھے وہاں پا کر ... لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کس طرح امتحان بیچ میں چھوڑ کر آ گیا ہوں تو امی نے ... اگرچہ ہمارے گھر کے حالات اس قسم کے رویے کی اجازت نہیں دیتے تھے تاہم انہوں نے مجھے تسلی ... ''پھر کیا ہوا۔ اس سال نہیں تو ان شاء اللہ اگلے سال تم بہت اچھے نمبروں پر پاس ہو جاؤ گے۔'' بعد میں بعض ... رشتہ داروں کو یہ خبر ملی تو وہ بھی ہمارے گھر ''افسوس'' کے لیے پہنچ گئے۔ تب باہمی مشورے سے طے پایا کہ مجھے ... امتحان ہر صورت میں مکمل کرنا چاہیے۔ میرے بہی خواہوں کا استدلال تھا کہ اللہ تعالیٰ ... بات پر قادر ... ہیں ممکن ہے میرے باقی پرچے میری توقع سے کہیں اچھے ہو جائیں اور میں اتنے نمبر حاصل کر لوں کہ دوبارہ امتحان ... دینے کی ضرورت نہ رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر خدانخواستہ مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو بھی ... مجھے ... فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ یہ چانس ضائع کرنے کے بعد بھی تو مجھے نئے سرے سے یہ امتحان دینا ہی ہے۔

میں لاہور واپس تو چلا گیا تھا لیکن سچ پوچھیے تو میں نے باقی چھ پرچے بہت بے دلی کے ساتھ ... پوری کرنے کی خاطر دیئے۔ بالآخر امتحان ختم ہو گیا اور جب نتیجہ نکلا تو میں نے سات سو میں سے تین سو پندرہ ... حاصل کئے تھے اور یوں یہ تھرڈ ڈویژن بنتی تھی۔

مجھ ایسا طالب علم جس کی مڈل سے لے کر بی اے تک ہر امتحان میں ہائی فرسٹ ڈویژن ہو ... ایف اے اور بی اے، دونوں امتحانات کے نتائج کی بنیاد پر میرٹ سکالرشپ ملا ہو اور جسے بی اے کے امتحان میں اپنی عمدہ کارکردگی کی بنا پر یونیورسٹی کی طرف سے دو طلائی تمغے اور اپنے کالج کی طرف سے ایک نقرئی تمغہ عطا ہوا ہو اس مایوس کن نتیجے پر حد درجہ پریشان اور شرمندہ تھا۔ ہمارے بعض ''شریکوں'' کا خیال تھا کہ مجھے لاہور کی ہوا لگ گئی تھی چنانچہ میں اپنے ملنے جلنے والوں سے منہ چھپا رہا تھا۔ ویسے بھی تھرڈ ڈویژن کے ساتھ کسی اچھی ملازمت کا حصول آسان نہ تھا لہٰذا اس نتیجے کو قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموشی سے قبول کر لینا مسئلہ کا حل نہ تھا۔ یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق میں اپنی ڈویژن بہتر بنانے کے لیے یہی امتحان دوبارہ دے سکتا تھا چنانچہ میں نے فوری طور پر دوبارہ قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔

ان ہی دنوں واپڈا نے لاہور میں واقع اپنے سیکرٹریٹ میں تقرر کے لیے سیکشن آفیسرز کی کچھ اسامیاں مشتہر کیں جن کے لیے بنیادی اہلیت گریجوایشن تھی۔ یہ سوچ کر کہ اگر مجھے یہ ملازمت مل گئی تو میرے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے میں نے یہاں درخواست بھجوا دی تاہم واپڈا کی طرف سے اس کا کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

اس کے بعد بہت دنوں تک ایسی کسی اسامی کا کوئی اشتہار میری نظر سے نہیں گذرا جس کا میں خود کو اہل ... تاہم ۴ جنوری ۱۹۶۸ء کا پاکستان ٹائمز ایک خوشخبری لے کر آیا۔ نوید یہ تھی کہ لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ کے دفتر میں پبلک ریلیشنز آفیسر کی ایک اسامی خالی ہے جس کے لیے سیاسیات یا جرنلزم میں ایم اے کی ڈگری رکھنے والا کوئی بھی شخص درخواست دینے کا اہل ہے۔ میں نے درخواست بھجوائی اور مجھے انٹرویو کے لیے بھی بلا لیا گیا لیکن ...

اکتالیس امیدوار اور بھی پہنچے ہوئے تھے جن میں سے بہت سے ایم اے میں میرے اپنے کالج فیلو تھے۔ یہ صورت
حال دیکھنے کے بعد ہمارا عمومی تاثر تھا کہ یہ سارا ''ڈھونگ'' ہمارے ہی ایک کالج فیلو کو ملازمت میں باضابطہ شامل
دینے کے لیے رچایا گیا ہے جو پہلے سے وہاں ایڈہاک بنیاد پر کام کر رہا تھا اور ہوا بھی وہی جس کا اندیشہ تھا۔

فروری ۱۹۶۸ء میں ڈائریکٹر فیملی پلاننگ، سنٹرل ایویلیوایشن یونٹ، لاہور کی طرف سے ''انٹرویورز اور
''ایڈیٹرز اینڈ کوڈرز'' کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ میں نے یہاں بھی درخواست بھجوا دی۔ انٹرویو بورڈ دو ارکان
پر مشتمل تھا۔ اس کے چیئرمین ولایت احمد خاں سی ایس پی تھے جو اس ادارے کے سربراہ تھے جب کہ دوسرے رکن
ایک غیرملکی تھے۔ چیئرمین نے مجھ سے زیادہ تر سوالات علم سیاسیات پر پوچھے جن کے میں نے اپنی دانست میں بالکل
صحیح جوابات دیئے۔ وہ میری کارکردگی سے بظاہر مطمئن بھی نظر آرہے تھے لیکن بورڈ کے دوسرے رکن جو غالباً
ڈونر ایجنسی کی نمائندگی کر رہے تھے فکرمندی کا اظہار کرنے لگے کہ سوشل سروے کا تجربہ نہ ہونے کے سبب مجھے یہ کام
چلانے میں دقت ہوسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعد میں انہوں نے ہی میرے متعلق چیئرمین کی رائے بدل ڈالی۔

اس کے بعد اس محاذ پر لمبا عرصہ مکمل خاموشی چھائی رہی لیکن سچ پوچھیں تو میری توجہ امتحان پر مرکوز تھی۔
میں اس داغ کو ہر صورت دھونا چاہتا تھا جو ''تھرڈ ڈویژن'' کی صورت میں میرے ماتھے پر لگ چکا تھا لیکن اس کے
لیے محنت اور مسلسل محنت کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک خاص پروگرام کے تحت اس امتحان کی تیاری کر رہا
تھا۔ میں روزانہ سولہ سولہ گھنٹے پڑھتا تھا اور اگر کسی ضرورت کے تحت مجھے پڑھائی کا سلسلہ چند منٹ کے لیے بھی
منقطع کرنا پڑتا تو بعد میں اتنا ہی وقت اس مضمون کو مزید دے کر حساب برابر کر دیتا۔ میں ہر مضمون کو اپنی ضرورت
کے مطابق وقت دیتا اور محض نوٹس پر اکتفا کرنے کی بجائے حوالہ جاتی کتب کا مطالعہ بھی کرتا۔

امی دن رات میرے لیے دعاؤں میں مصروف تھیں لیکن ایک اور بہت محبت کرنے والا وجود جو مجھے اپنی
نیم شبانہ دعاؤں میں یاد رکھتا ماسی جی کا تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے نہ صرف اس امتحان میں
بلکہ زندگی کے آئندہ امتحانات میں بھی میری کامیابی کے لیے دعائیں مانگتی رہتیں اور مجھے یقین ہے کہ میری
کامیابیوں کے پیچھے ان کی دعاؤں کا بھی بہت ہاتھ ہے۔

میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس امتحان تک کسی اور فکر کو اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دوں گا۔ امی بھی اس
معاملے میں بہت محتاط تھیں اور وہ میرے سامنے بھولے سے بھی گھر کی کسی پریشانی کا ذکر نہ کرتیں۔ غرض میں نے
اپنی دانست میں ہر پہلو سے اپنی تیاری مکمل کر لی۔

میں یوں بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے ملتا رہتا تھا اور وقتاً فوقتاً تحریراً بھی دعا کے لیے عرض کرتا رہتا
تھا۔ میں نے وسط مارچ ۱۹۶۸ء میں حضور کو دعا کے لیے ایک خط لکھا جس کے جواب میں مجھے آپ کے پرائیویٹ
سیکرٹری، مولوی عبدالرحمٰن انور کے دستخط سے یہ والا نامہ موصول ہوا:

''آپ کا خط مورخہ ۶۸-۳-۱۴ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہُ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خدمت
میں موصول ہوا۔ بعد ملاحظہ حضور نے دعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں نمایاں کامیابی عطا فرمائے اور

دینی و دنیوی ترقیات سے سرفراز فرمائے۔ آمین!''

مجھے ایک فکر یہ بھی تھی کہ میں دوران امتحان کہاں ٹھہروں گا۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی میں اپنے دوسالہ قیام کے دوران احمدیہ ہوسٹل دیکھ رکھا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ یہاں میری عارضی رہائش کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ میری ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے سرسری سی ملاقات تھی چنانچہ میں نے انہیں ایک خط یہ دریافت کرنے کے لیے لکھا کہ کیا ضرورت پڑنے پر مجھے ہوسٹل میں قیام کی اجازت مل جائے گی۔ چند ہی روز بعد مجھے ان کا جواب موصول ہوگیا جو ذیل میں صرف اس لیے نقل کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین اس زمانے کی قیمتوں کا آج کی قیمتوں سے موازنہ کرسکیں اور چوہدری رحمت خان کے لیے دعا کی تحریک بھی ہو سکے جنہوں نے بغیر کسی ذاتی تعلق کے میرا خط ملتے ہی مجھے جواب سے سرفراز فرمایا تھا۔ خط کی نقل ملاحظہ ہو:

''اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو اور اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کی توفیق دے۔

آپ کا سات اپریل ۶۸ء کا تحریر کردہ خط ملا۔ جواباً قلمی ہے کہ آپ کے امتحان کے دوران قیام کے لیے ہوسٹل میں جگہ مل جائے گی۔ آپ کو مندرجہ ذیل رقوم جو واجبات ہوسٹل ہیں ادا کرنا ہوں گی: پیشگی میس: ۶۰ روپے فیس رہائش: ۸ روپے، فیس روشنی: ۸ روپے، فیس داخلہ: ۵ روپے، شکست وریخت: ۳ روپے۔ کل میزان: ۸۴ روپے۔ چونکہ آپ کا قیام مختصر ہوگا ۳۵ روپے کی رقم جو مندرجہ بالا رقوم کے علاوہ بطورِ ضمانت لی جاتی ہے وصول نہیں کی جائے گی۔''

اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو ڈیٹ شیٹ کا انتظار شروع ہوگیا۔ تفصیل کے مطابق امتحان ۲۵ جون کو شروع ہو کر ۱۵ جولائی کو ختم ہونا تھا۔

ان ہی دنوں مجھے ملک صلاح الدین (جنہوں نے رفقائے حضرت مسیح موعود کے حالاتِ زندگی کی تدوین و اشاعت کے سلسلے میں بے مثال کام کیا ہے) کا ۲۰ جون ۱۹۶۸ء کا لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا جس کے ذریعے انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ وہ نہ صرف خود میری نمایاں کامیابی کے لیے دعا کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے بیت مبارک میں ایک اعلان کے ذریعہ قادیان کے جملہ احباب سے بھی میری کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کر دی ہے۔

۲۵ جون ۱۹۶۸ء کو امتحان شروع ہوا چنانچہ میں نے اس روز بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی خدمت میں پرچے سے قبل دعا کی درخواست کی۔ مجھے ۳ جولائی ۱۹۶۸ء کو حضور کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری کے دستخط سے اس خط کا جواب ملا جس میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ ''آپ کا خط حضور نے ملاحظہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں نمایاں کامیابی عطا فرمائے۔'' موصول ہوا۔ بعد ملاحظہ

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو اطمینان ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہ مرحلہ بھی آسان ہو جائے گا۔

یہ ایک مہینہ احمدیہ ہوسٹل میں گذرا لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس ہوسٹل میں اپنے قیام کے دنوں کے بارے میں بتاؤں مناسب ہوگا کہ اس قیام کا پس منظر آپ کے گوش گذار کر دیا جائے۔

منزل کی ہو خواہش تو نکل آتے ہیں رستے

جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی مقامِ خلافت پر فائز ہوئے تو قادیان میں کوئی کالج نہیں تھا لہٰذا جماعت کے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بالعموم لاہور کے کالجوں میں داخلہ لینا پڑتا تھا۔ اس صورتِ حال میں ترجیحی لحاظ سے نوجوانوں کے لیے بہت سے خطرات مضمر تھے۔ حضور نے جماعت کی نئی پود کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ۱۹۱۵ء کے آخر میں لاہور میں ایک ہوسٹل قائم کیا جس کا نام ''احمدیہ ہوسٹل'' تجویز کیا گیا۔

جن احمدی طلبہ کو اس ہوسٹل میں رہ کر حصولِ تعلیم کا موقع ملا اس کی فہرست خاصی طویل ہے تاہم سلسلہ کے جن نامور بزرگان نے یہاں رہ کر لاہور کے مختلف کالجوں یا پنجاب یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ان میں حضرت نواب محمد عبداللہ خان، ملک غلام فرید، ملک عبدالرحمٰن خادم، ڈاکٹر بدرالدین احمد، اخوند عبدالقادر، ڈاکٹر سردار علی، مولانا عبدالرحیم درد، سید محمود اللہ شاہ، شیخ بشیر احمد، مرزا عبدالحق، شیخ محمد احمد مظہر، میاں عطاء اللہ ایڈووکیٹ، کرنل ڈاکٹر عطاء اللہ، میجر ڈاکٹر شاہنواز اور صوفی محمد ابراہیم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان کے وقت ترجیحات یکسر بدل گئیں تو یہ ہوسٹل بند کرنا پڑا۔ آہستہ آہستہ جب حالات معمول پر آئے تو باہر سے آ کر لاہور کے کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے احمدی طلبہ کی سہولت اور تربیت کی غرض سے اس ہوسٹل کی ضرورت پھر سے محسوس کی جانے لگی۔ اس پس منظر میں مجلس مشاورت کے ایک فیصلہ کی تعمیل میں ستمبر ۱۹۶۴ء میں یہ ہوسٹل کرائے کی ایک عمارت میں قائم کیا گیا۔ بعد میں یہ ہوسٹل مختلف وجوہ کی بنا پر ایک سے دوسری عمارت میں منتقل ہوتا رہا اور اُن دنوں ۱۰۸ سی، ماڈل ٹاؤن میں ہوا کرتا تھا۔ یہ کوٹھی حضرت نواب محمد عبداللہ خان کے خاندان کی ملکیت تھی جو انہوں نے جماعت کو کرائے پر اُٹھا رکھی تھی۔ یہ کوٹھی متروکہ املاک میں سے تھی اور قیامِ پاکستان سے نہ جانے کتنا عرصہ پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ ویسے بھی اس کی مرمت اور رنگ و روغن کی طرف کم توجہ دی گئی تھی لہٰذا اس کی حالت ایسی تسلی بخش تو نہ تھی لیکن ہوسٹل کے تقاضے بطریقِ احسن پورا کر رہی تھی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اس ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ چوہدری رحمت خاں تھے۔ یوں تو اُن کی ذات کسی تفصیلی تعارف کی محتاج نہیں تاہم ان قارئین کے لیے جو انہیں نہیں جانتے یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ گجرات کے رہنے والے اور حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت چوہدری خوشی محمد کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ بی ٹی کرنے کے بعد زمیندارہ ہائی سکول گجرات میں مدرس کے طور پر کام کرنے لگے اور یہ سلسلہ ۱۹۵۴ء میں ان کی ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔ ۱۹۶۰ء میں انہیں بطور انچارج لنڈن مشن بھجوا دیا گیا جہاں وہ چار سال رہے۔ واپسی پر انہیں سپرنٹنڈنٹ احمدیہ ہوسٹل متعین کر دیا گیا۔

ان دنوں ہوسٹل میں مقیم طلبہ کی تعداد محدود سی تھی اور دو درجن سے تو کسی صورت متجاوز نہ تھی۔ یہ طالب علم عرصہ سے ایک ساتھ رہ رہے تھے اس لیے ان میں گونہ بے تکلفی تھی لیکن میں نے بھی یہاں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کیا۔ دراصل احمدیت کے رشتے میں منسلک ہونے کے سبب ہم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے سے اجنبی نہ تھا چنانچہ جب اکٹھے بیٹھتے تو خوب گپ شپ ہوتی۔

ہوسٹل میں نماز با جماعت کا انتظام تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے مکینوں کے لیے نمازِ باجماعت کی پابندی تھی۔ چوہدری رحمت خاں خود امامت کراتے اور نماز فجر کے لیے تو سب کو فرداً فرداً جگاتے۔ نوجوانی میں نیند بھی کچھ زیادہ ہی گہری ہوتی ہے اور نمازِ فجر کے لیے وقت پر اُٹھنا آسان نہیں ہوتا۔ ہوسٹلوں میں مقیم طلبہ کا پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور وہ سبھی یکساں طور پر تربیت یافتہ بھی نہیں ہوتے چنانچہ ایک دو لڑکے جو اس معاملے میں ذرا سست تھے بعض اوقات نماز سے غیر حاضر ہو جاتے تاہم چوہدری صاحب نے ان طلبہ کی اصلاح کی کوشش پورے استقلال سے جاری رکھی۔ چوہدری صاحب کی طرف سے کسی سخت ردِّعمل کے عدم اظہار نے ان طلبہ کے دل پر گہرا اثر کیا۔ انہوں نے خود چوہدری صاحب کے سامنے اپنی غلطی پر اظہارِ ندامت کیا اور نمازوں میں باقاعدگی سے شامل ہونے لگے۔

اُن دنوں ماڈل ٹاؤن کی شکل وہ نہ تھی جو اَب ہو چکی ہے۔ غالباً اُس وقت تک پلاٹوں کی تقسیم در تقسیم کا رواج شروع نہ ہوا تھا اور زیادہ تر آبادی ہندوؤں اور سکھوں کی تعمیر کردہ کئی کئی کنال پر مشتمل پرانی بڑی بڑی کوٹھیوں پر مشتمل تھی۔ وہ جگہ جہاں اب ماڈل ٹاؤن پارک، ایک بہت بڑی مارکیٹ، ڈویژنل پبلک سکول اور نہ جانے کیا کچھ تعمیر ہو چکا ہے خالی پڑی ہوتی تھی۔ میری یادداشت کے مطابق یہاں صرف نیشنل بنک آف پاکستان کی ایک برانچ تھی اور ایک بہت بڑے درخت کے نیچے چائے کا ایک کھوکھا تھا جہاں احمدیہ ہوسٹل کے طلبہ رات کے وقت خوش گپیوں کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ یہی ان کی سب سے بڑی تفریح ہوا کرتی تھی۔

یہاں بیٹھ کر وقت گذارنے والوں میں سے ایک عطاء الرحمٰن چغتائی بھی تھے جو ''لاہور تاریخ احمدیت'' مرتبہ شیخ عبدالقادر کے مطابق اُن دنوں حلقہ ماڈل ٹاؤن کے سیکرٹری جنرل اور سیکرٹری اصلاح وارشاد تھے۔ وہ مولوی فضل الٰہی بھیروی رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے تھے اور وہی اس بات کے راوی تھے کہ ان کے والدِ بزرگوار ہی کی بدولت سرگودھا میں جماعت احمدیہ کا قیام عمل میں آیا، ان ہی کی کوششوں سے سرگودھا شہر میں احمدیہ بیت الذکر تعمیر ہوئی اور وہی ملک کے ممتاز صنعتکار نصیر اے شیخ کے والد شیخ محمد اسماعیل کے قبولِ احمدیت کا سبب بنے تھے۔

عطاء الرحمٰن چغتائی رائل اسٹیٹ ڈیلرز کے نام سے مال روڈ پر جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے یا اس نام سے کسی ادارے سے منسلک تھے۔ وہ ہمارے خاندان سے دیرینہ مراسم اخوت و محبت رکھتے تھے اور مجھے یاد تھا کہ انہوں نے اباجی کی وفات کے موقع پر چچا ابراہیم کے نام اپنے تعزیتی مکتوب میں ان تعلقات کا تذکرہ کیا تھا لہٰذا ان سے مل کر مجھے پہلے ہی لمحے سے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ یوں بھی وہ خاصے مجلسی آدمی تھے اور احمدیہ ہوسٹل کے طلبہ سے کافی بے تکلف لہٰذا میری بھی ان کے ساتھ گاڑھی چھننے لگی۔

میرا امتحان جاری تھا کہ ایک شام چوہدری رحمت خان کے ذریعہ مجھے چچا ابراہیم کی اچانک وفات کی خبر موصول ہوئی۔ اگرچہ انہیں بلند فشارِ خون کا عارضہ لاحق تھا اور ان کی صحت بہت اچھی نہ تھی لیکن وہ معمول کی زندگی گذار رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ نمازِ مغرب کے بعد گھر آئے تو چکرا کر گر گئے۔ ان کے ناک سے کچھ خون نکلا اور وہ طبی امداد پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ غالباً انہیں برین ہیمرج ہو گیا تھا۔

میں نے یہ خبر انتہائی غم اور افسوس کے ساتھ سُنی۔ مجھے مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور میں ان کی عظمتِ کردار سے بے حد متاثر تھا۔ وہ ذاتی طور پر مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے تھے لہٰذا اس اندوہناک خبر سے مجھے شدید صدمہ پہنچا۔

اُس وقت تک چچا ابراہیم کے سب بچے غیر شادی شدہ تھے۔ اگرچہ ان کی بڑی بیٹی، رضیہ فردوس جامعہ نصرت میں ریاضی کی لیکچرر کے طور پر کام کر رہی تھیں اور سب سے بڑے بیٹے، زکریا داؤد ایئر فورس میں فلائنگ آفیسر کے عہدے پر فائز تھے لیکن باقی سارے بچے زیرِ تعلیم تھے۔ ایک بیٹی، صالحہ یاسمین تو اُن دنوں ایم اے عربی کا امتحان دے رہی تھیں۔ اس لحاظ سے اس نازک موقع پر مجھے فوری طور پر ربوہ پہنچ کر ان کے غم میں شریک ہونا چاہیئے تھا لیکن اگلی صبح میرا پرچہ تھا۔ اگر میں یہ پرچہ چھوڑ دیتا تو میرا مزید ایک سال ضائع ہو جاتا اور میں زندگی کی دوڑ میں ایک سال مزید پیچھے چلا جاتا۔ میں مرحوم کے جنازے میں شامل نہ ہو پایا تاہم میرے دل سے دعا نکلی کہ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیّین میں جگہ دے۔

ابھی ماڈل ٹاؤن میں احمدیہ بیت الذکر کی اپنی عمارت تعمیر نہ ہوئی تھی چنانچہ جمعہ ہوسٹل میں ہی ہوتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران میں اور بعض دیگر احمدی طلبہ پیدل جمعہ پڑھنے کے لیے یہیں آیا کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اس وقت تک گارڈن ٹاؤن نہ بنا تھا اور ہم پنجاب یونیورسٹی کے بوائز ہوسٹل نمبر ایک سے کھیتوں کے بیچوں بیچ ہوتے ہوئے پیدل ماڈل ٹاؤن پہنچ جایا کرتے تھے۔

مجھے اب یاد نہیں کہ ان دنوں احمدیہ ہوسٹل میں کوئی چوکیدار تھا یا نہیں البتہ ایک باورچی ضرور تھا جس کا اصل نام تو خدا جانے کیا تھا لیکن طلبہ اسے بالعموم ''بولا'' (یعنی اونچا سُننے والا) کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہوسٹل میں گیس نہ تھی اور کھانا لکڑی والے چولہے پر تیار ہوتا تھا۔ کھانے کا الگ کمرہ تو موجود تھا لیکن ہم صبح کا ناشتہ باورچی خانے ہی میں کرتے۔ جب باورچی خانے میں پہنچتے تو بولا مادرِ شفیق کی طرح چولہے کے پاس پیڑھی پر بیٹھا ہوتا اور طلبہ اس کے گرد دوسری پیڑھیوں پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے۔ طلبہ کی بولے کے ساتھ حد درجہ بے تکلفی تھی جو بسا اوقات دھول دھپّے کی شکل بھی اختیار کر لیتی چنانچہ انتظار کی یہ کیفیت کسی کو بھی نہ چبھتی۔ بولا ہر آنے والے طالب علم کو اپنے ہاتھ سے گرم گرم پراٹھے اور آملیٹ بنا کر دیتا جاتا۔ چائے کی کیتلی الگ سے اُبل رہی ہوتی۔ کچھ لڑکے پراٹھوں کے ساتھ ہی چائے کا کپ بھر لیتے اور کچھ بعد میں لے لیتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ چائے کی پیالیوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن مہینے بھر کا کھانے کا بل چند روپوں سے تجاوز نہ کرتا۔

احمدیہ ہوسٹل میں قیام کے دوران جن طلبہ سے میرا دیرپا تعلق قائم ہوا ان میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر

سیرت علی شیخ کا جو سیالکوٹ کے ایک نامی وکیل شیخ ارشد علی کے صاحبزادے اور شیخ سعادت علی ... کے بھائی ہیں اور ان دنوں ایم اے کا امتحان دے رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے میرے ساتھ ہی ... کا امتحان دیا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی کامیابی کے ساتھ سرفراز کیا۔ وہ پاکستان پوسٹل سروس کے لیے منتخب ہوئے تاہم انہوں نے اس کامیابی کو زندگی کی معراج نہ سمجھا۔ ان کے پاس سی ایس ایس کے امتحان کا ایک اور چانس موجود تھا چنانچہ انہوں نے دوبارہ ہمت کی اور آفس مینجمنٹ گروپ کے لیے منتخب ہو گئے اور

پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

کے مصداق سارا عرصہ اسی سروس سے منسلک رہے۔ وہ تکمیل ملازمت کے بعد چند سال پہلے جوائنٹ سیکرٹری کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

سیرت علی شیخ کی شادی راولپنڈی کے چوہدری عطا محمد کی صاحبزادی لیڈی ڈاکٹر اعجاز سیرت سے ہوئی جو معروف شاعرہ، ارشاد عرشی کی چھوٹی بہن اور بچوں کی امراض کی ماہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سیرت علی شیخ کو بہت سی خوبیوں سے نواز رکھا ہے جن میں سے دوست نوازی کی صفت نمایاں ہے۔ مجھے یاد ہے ۱۹۷۴ء میں میرا فیصل آباد سے راولپنڈی تبادلہ ہوا تو فوری طور پر میرے پاس رہنے کا اپنا کوئی انتظام نہ تھا۔ سیرت اُن دنوں اسلام آباد میں تعینات تھے اور سرکاری مکان میں رہائش پذیر۔ اتفاق سے ان کی اہلیہ حصولِ تعلیم کے لیے انگلستان گئی ہوئی تھیں چنانچہ میں ان کی دعوت پر کئی روز تک ان کے ہاں مقیم رہا اور ان کی پُر تکلف میزبانی سے محظوظ ہوتا رہا۔

خدا کا شکر ہے آج سے کم و بیش پنتالیس سال پہلے ان کے ساتھ قائم ہونے والا اخلاص و وفا کا یہ رشتہ اب تک قائم ہے اور وہ روزِ اوّل کی طرح آج بھی مجھ پر مہربان ہیں۔

ہمارے یہ دوست تو خیر سے پیدائشی احمدی ہیں لیکن احمدیہ ہوسٹل میں کم از کم دو طلبہ ایسے بھی تھے جنہیں خود احمدیت قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک محمد خالد گورایہ ہیں جو گوجرانوالہ کے کسی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور اُن دنوں میری طرح ایم اے پولیٹیکل سائنس کا امتحان دے رہے تھے۔ جب مجھے کسی نے بتایا کہ انہوں نے خود بیعت کی ہے تو مجھے ان حالات و واقعات سے دلچسپی پیدا ہوئی جو اُن کے اس اقدام پر منتج ہوئے تھے۔

خالد گورایہ احمدیت قبول کرنے سے پہلے اہلِ حدیث مسلک رکھتے تھے۔ ان کے ایک دوست عطاء الرحمٰن جو مولوی ثناء اللہ امرتسری کے شاگرد زادہ تھے کے پاس مولانا محمد عبداللہ معمار کی تحریر کردہ کتاب ''محمدیہ پاکٹ بک'' ہوا کرتی تھی جس میں حضرت مسیح موعود کی تحریرات کے حوالے سے مختلف عناوین کے تحت احمدیت پر سینکڑوں اعتراضات جمع کر دیئے گئے تھے۔ خالد گورایہ نے یہ کتاب پڑھ رکھی تھی چنانچہ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ اپنے احمدی خالو بشیر احمد ساکن موضع بیداد پور ورکاں اور ان کے بچوں (جن کے پاس ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا) کے سامنے احمدیت پر کئی طرح کے اعتراض اُٹھاتے اور یوں فریقین کے درمیان بکثرت بحث و تمحیص رہتی جس دوران بیداد پور ورکاں میں تعینات معلم اصلاح وارشاد حکیم علی احمد سے بھی ان کی بات چیت ہوتی رہی۔

۱۹۶۵ء کی موسمی تعطیلات میں خالد گورایہ وہاں گئے تو محمدیہ پاکٹ بک بھی ہمراہ لیتے گئے۔ وہ حکیم علی احمد کے

پاس بیٹھ جاتے۔ وہ انہیں حضرت مسیح موعود کی کتابیں دکھاتے اور بتاتے کہ کس طرح معترضین کی طرف سے آپ کی تحریروں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ خالد گورایہ سمجھتے تھے کہ بانی سلسلہ احمدیہ کی وفات مولوی ثناء اللہ امرتسری کے ساتھ مباہلے کے نتیجے میں ہوئی تھی تاہم جب انہیں مولوی ثناء اللہ امرتسری کی یہ تحریر (مطبوعہ اخبار ''اہلحدیث'') دکھائی گئی کہ ''خدا تعالیٰ جھوٹے، دغاباز، مفسد اور نافرمان لوگوں کو لمبی عمریں دیا کرتا ہے تاکہ وہ اس مہلت میں اور بھی برے کام کرلیں'' تو احمدیت کے بارے میں ان کے تمام شکوک رفع ہو گئے تاہم انہوں نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے استخارہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ استخارے کے نتیجہ میں آنے والے خواب کے بعد انہیں اپنا فیصلہ مؤخر کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ انہوں نے اسی روز یعنی پچیس اگست ۱۹۶۵ء کو اپنا بیعت فارم پُر کر کے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں ارسال کر دیا۔

خالد گورایہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں کہ ان کی ساری زندگی خدمتِ سلسلہ میں گذری ہے۔ وہ کم و بیش پندرہ سال نائیجیریا میں جماعتی نظام کے تحت کام کرتے رہے اور بعد میں ایک طویل مدت تک نصرت جہاں اکیڈمی، ربوہ کے پرنسپل رہے۔ اب وہ نائب صدر عمومی ربوہ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

دوسرے نو مبائع طالب علم جن کا ذکر یہاں مقصود ہے ظفر احمد گھمن ہیں جو اُن دنوں معاشیات میں ایم اے کر رہے تھے۔ وہ اپنے گاؤں موضع بجے سے جو سیالکوٹ شہر سے دس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے روزانہ بائیسکل پر مرے کالج آتے جاتے تھے۔ وہ ایک روز حسبِ معمول کالج جا رہے تھے تو ان کے آگے آگے دو سائیکل سوار حیات و وفاتِ مسیح کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ انہیں تجسس ہوا اور وہ چپ چاپ ان کے پیچھے رہ کر ان کی گفتگو سننے لگے۔ ان میں سے ایک شخص دوسرے کو بتا رہا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے دوران عیسائی پادری کس طرح حیاتِ مسیح کو بنیاد بنا کر سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ مسلمان حیاتِ مسیح کے قائل ہیں لہٰذا وہ انہیں عیسائیت کی طرف راغب کرنے کے لیے زیادہ تر اسی موضوع پر بات کرتے۔ سائیکل سوار اپنے ساتھی کو اپنا یہ چشم دید واقعہ سنا رہا تھا کہ ایک ٹرین میں کسی پادری نے مسافروں سے سوال کیا کہ اگر وہ کوئی دل لگتی بات کہے تو کیا وہ اسے قبول کرلیں گے۔ سب نے کہا کہ سچ کو کون نہیں مانے گا۔ اس پر پادری نے ان سے سوال کیا کہ اگر دو کشتیاں کسی متلاطم دریا میں سفر کر رہی ہوں اور ان میں سے ایک کشتی کا ملاح اچانک فوت ہو جائے تو کون سی کشتی بحفاظت کنارے لگے گی، وہ جس کا ملاح فوت ہو گیا ہے یا وہ جس کا ملاح زندہ ہے؟ سب نے بیک زبان جواب دیا کہ وہی کشتی کنارے لگے گی جس کا ملاح زندہ ہے۔ اس پر پادری نے کہا کہ جب مسلمان جانتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام وفات پا چکے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں تو وہ اس کشتی پر کیوں سوار نہیں ہو جاتے جس کا ملاح زندہ ہے۔ مسلمانوں سے پادری کی اس بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور یوں محسوس ہو رہا تھا گویا انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ اتفاقاً ٹرین میں ایک احمدی مسافر بھی موجود تھا۔ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے کھڑے ہو کر پادری کو بتایا کہ وہ حیاتِ مسیح کے عقیدے کو غلط سمجھتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کی وفات کا بڑے واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے اور احادیث

یادوں کا شہر ہے یہ مرا سوختہ جگر

ربوہ کے نواحی مواضعات یعنی چھنی، کھچی، ڈاور، چمن عباس اور کوٹ امیر شاہ مختلف زمینداروں کی ملکیت ہیں اور یہاں کی زیادہ تر آبادی اُن کے مزارعین پر مشتمل ہے جنہیں عرفِ عام میں جانگلی کہا جاتا ہے۔ آغاز میں ان کی عورتیں بالعموم سیاہ قمیص اور اسی رنگ کی دھوتی پہنتیں۔ دوپٹہ ان کے لباس کا مستقل حصہ نہیں تھا لیکن بعد میں انہوں نے چادر یا دوپٹے کا استعمال شروع کر دیا اور اس تبدیلی کا بڑا سبب ربوہ کی خواتین کا نمونہ تھا جو ''جانگلیانڑیاں'' خود مشاہدہ کرتی تھیں۔

جانگلیانڑیوں کے علاوہ جانگلی مرد بھی اپنے کام کاج سے ربوہ آتے رہتے تھے اور غیر ارادی طور پر اس ماحول کا اثر قبول کر رہے تھے۔

ان دنوں جانگلیوں میں رواج تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلتے وقت اپنی جوتی (جسے جدید کھسے کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے) جھاڑ کر اپنے سر پر رکھ لیتے۔ انہیں اس کام میں اتنی مہارت حاصل تھی کہ سر پر رکھی ہوئی جوتی کبھی ڈولتی نہ نیچے گرتی اور وہ اسی کیفیت میں طویل سے طویل فاصلہ طے کر لیتے۔ ممکن ہے اس رواج کی بنیاد کوئی مقامی روایت بھی ہو لیکن غالب گمان ہے کہ وہ اس بظاہر نامعقول سی حرکت کا سہارا جوتی کی حفاظت کے خیال سے لیتے تھے۔

جب اس علاقے کا کوئی جانگلی بیمار پڑ جاتا تو اس کے اعزہ و اقربا اس کی چارپائی کندھوں پر اٹھا لیتے اور اسے فضلِ عمر ہسپتال یا ربوہ کے کسی پرائیویٹ میڈیکل پریکٹیشنر کے پاس لے آتے۔ یہی نہیں، گاؤں کے دس بیس افراد بھی ازراہِ ہمدردی مریض کے ساتھ ہو لیتے۔ ایک دو آدمی تو مریض کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے اور باقی ہسپتال یا کلینک کے باہر اس وقت تک انتظار کرتے جب تک ڈاکٹر مریض کا معاینہ کرنے کے بعد اس کے لیے دوا دارُو تجویز نہ کر دیتا۔ اگر مریض کا ہسپتال میں داخلہ ضروری ہوتا تو لواحقین دن رات ڈیوٹی دیتے۔ اگر ہسپتال میں قیام زیادہ طویل ہو جاتا تو بھی لواحقین دلبرداشتہ نہ ہوتے اور ڈیرا لگائے رکھتے۔ یوں مریض کا حوصلہ قائم رہتا اور لواحقین کو اس کی تازہ ترین کیفیت کا علم ہوتا رہتا۔ جانگلیوں کی اس روایت میں کوئی لاکھ نقص نکالے حقیقت یہ ہے کہ وہ باہمی محبت و اخوت کا ایک ایسا نمونہ پیش کر دکھاتے جو آج کے معاشرے میں عنقا ہو چکا ہے۔

اگر کوٹ امیر شاہ اور بہشتی مقبرے والے درّے کے اُس پار دیگر آبادیوں میں کسی جانگلی کا انتقال ہو جاتا تو اسے ربوہ کے قبرستان میں دفن کیا جاتا جو نہ جانے کب سے ''قبرستانِ شہیداں'' کے نام سے معروف تھا۔ ماتمی جلوس

میں مرد و زن بھی شامل ہوتے۔ اس موقع پر عورتیں بین کرتیں۔ وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتیں اور اس کے چلے جانے پر افسوس کا اظہار کرتیں۔ دین ایسے مواقع پر بین کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا چنانچہ احمدی ان کی اس حرکت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اب جانگلیوں سے اس رواج میں وہ شدت باقی نہیں رہی۔

اس علاقے کی اپنی زبان تھی اور اپنی ہی شاعری۔ رات کے کسی سمے کوئی دل جلا اچانک بہت اونچی آواز میں کوئی ڈھولا گانا شروع کر دیتا۔ ابتدائے ربوہ میں رات کے وقت لاہور سرگودھا روڈ پر گذرنے والی ٹریفک کا شور نہ ہونے کے برابر تھا لہٰذا سناٹے میں یہ آواز دور دور تک سنائی دیتی۔ اگرچہ لہجے اور زبان میں فرق کی وجہ سے اکثر اوقات یہ ڈھولے ہمارے سر کے اوپر سے گذر جاتے لیکن یہ ضرور اندازہ ہو جاتا کہ کوئی دل جلا اپنی پھوٹی ہوئی قسمت کا رونا رو رہا ہے۔

آغاز ربوہ میں اکثر گھروں میں دودھ اردگرد کے ان ہی دیہات سے آتا تھا۔ جانگلیانڑیاں دودھ کی گاگر سر پر رکھے صبح سویرے دروازہ کھٹکھٹا دیتیں۔ میرے بچپن میں چار آنے کا ایک سیر دودھ آ جایا کرتا تھا۔ یہ دودھ عام طور پر مٹی کی ہنڈیا میں ہلکی آنچ پر کاڑھا جاتا جس سے اس پر زردی مائل ملائی کی دبیز تہہ آ جاتی۔ اب یہ اہل خانہ کی اپنی مرضی ہوتی کہ وہ یہ ملائی اسی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں یا چند دن کی ملائی جمع کرنے کے بعد اس میں سے گھی نکال لیتے ہیں۔ یہی جانگلیانڑیاں فرمائش پر دیسی گھی بھی مہیا کر دیتی تھیں اور آغازِ ربوہ میں اس کا بھاؤ چار روپے کلو سے زیادہ نہ تھا۔

جو گوالنیں وقتاً فوقتاً ہمارے ہاں دودھ لاتی رہیں ان میں سے ایک زینب تھی جو زینو کہلاتی اور کوٹ امیر شاہ سے آیا کرتی تھی۔ یہ جواں سال گوالن ایک عرصہ تک ہمارے ہاں آتی رہی۔ پھر اس نے اچانک آنا بند کر دیا۔ معلوم ہوا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ اُن دنوں اردگرد کے دیہات میں اغوا کی وارداتیں بہت عام تھیں۔

مجھے ایک اور عمر رسیدہ گوالن بھی ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ مدتوں پہلے اس کی ایک جوان بیٹی فوت ہوئی تو وہ اس کی تدفین کے لیے قبرستان ساتھ چلی گئی۔ اپنی بیٹی کو قبر کے اندھیروں میں اترتا دیکھ کر اس کے دل میں اندھیرے اور گھٹن کا خوف مستقل طور پر بیٹھ گیا۔ وہ بتایا کرتی تھی کہ اس دن کے بعد سردی ہو یا گرمی، کھڑکی بند کر کے وہ کمرے کے اندر نہیں سو سکتی۔ اسے قبر کی تاریکی اور گھٹن یاد آ جاتی ہے اور وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ربوہ کے مقامی لوگوں کے حالات اور ان کی سوچ بدل گئی اور انہوں نے بدلتے اوقات کے لیے نئے نئے ذرائع وضع کر لیے۔ ان میں سے بعض اردگرد کے دیہات سے دودھ اکٹھا کر کے فروخت کے لیے بائیسکلوں اور بعد میں موٹر سائیکلوں پر ربوہ لانے لگے۔ ایسے افراد مختلف سائز کے ڈرموں میں دودھ بھر کے لاتے اور اسے گھر گھر سپلائی کر کے روزگار کماتے۔ یوں دودھ کی فروخت سے جانگلیانڑیوں کی آمد و رفت کم ہوتی چلی گئی۔

بعض قارئین کو اس بات پر شاید یقین نہ آئے کہ ابتدائے ربوہ میں دودھ میں ملاوٹ کا کوئی تصور نہ

ں دودھ عام مل جاتا۔ یہ تو میرے ہوش سنبھالنے سے بہت بعد کی بات ہے جب دودھ میں پانی کی آمیزش کی شکایت شروع ہوئی۔ پھر سنا گیا کہ کوئی ایسا آلہ آگیا ہے جو اس ملاوٹ کا کھوج لگالیتا ہے۔ میونسپل کمیٹی نے اپنے کسی کارندے کو یہ آلہ فراہم کر رکھا تھا اور وہ شیر فروشوں کو اچانک روک کر ان کی ملاوٹ چیک کرسکتا تھا۔ تاہم شیر فروش بھی ایسی کچی گولیاں نہ کھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے جلد ہی اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا۔ دراصل انہیں پتا چل گیا تھا کہ یہ آلہ صاف پانی کی ملاوٹ پکڑنے کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن کسی جوہڑ یا بدرو کے پانی کی ملاوٹ نہیں پکڑ سکتا۔ پس پھر کیا تھا ہر قسم کا ناپاک پانی دودھ میں ملایا جانے لگا اور بے بس صارف تھے کہ یہی دودھ غٹاغٹ پیتے اور خدا کا شکر بجالاتے۔

اور اب کچھ ذکر گھی کا! ابتدائے ربوہ میں دیسی گھی فراواں ملتا تھا اور اس نسبت سے اس کا استعمال بھی عام تھا۔ ہاں! بعض پکوان سرسوں کے تیل میں تلنے کی روایت موجود تھی۔ مثال کے طور پر پکوڑے تلنے یا کریلے پکانے کے لئے ترجیحاً یہی تیل استعمال ہوتا تھا۔ پھر مارکیٹ میں بناسپتی گھی آگیا جو دیسی گھی سے نمایاں طور پر سستا تھا لیکن اسے کھلے بندوں خریدنے سے احتراز کیا جاتا اور خریداری سے پہلے ادھر اُدھر دیکھ کر پوری تسلی کر لی جاتی کہ کوئی خریدار کی یہ ''حرکت'' نوٹ تو نہیں کر رہا۔ اب پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بناسپتی گھی خریدنے والے دوسروں کے سامنے اپنی ناک کٹنے کے خوف میں مبتلا تھے اور اسی لئے اپنی اس حرکت کو عوام الناس کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے خواہاں تھے۔ بناسپتی گھی مارکیٹ میں کب آیا، اس بحث سے قطع نظر امر واقعی یہی ہے کہ لوگوں نے آہستہ آہستہ اس گھی کے ساتھ سمجھوتا کرلیا اور پھر وہ دن بھی آگیا جب یہی گھی ہر گھر کی ضرورت بن گیا اور ہر پکوان کی تیاری میں استعمال ہونے لگا۔

آج کوئی ٹی وی چینل لگائیں تو تعجب ہوتا ہے کہ بناسپتی گھی تیار کرنے والی کمپنیاں کروڑوں روپے کے خرچ سے اپنی مصنوعات کی اشتہار بازی میں مصروف ہیں اور ہر قسم کا پکوان اسی گھی یا تیل میں تیار کرنے کی ترغیب دلائی جارہی ہے جب کہ دیسی گھی کا ذکر صرف کتابوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے اور نئی پود تو اس کی لذت اور خوشبو سے بھی نا آشنا ہے۔

یہاں یہ ذکر شائد بے جا نہ ہو کہ جب بناسپتی گھی اور دیسی گھی کی قیمت میں فرق بہت بڑھ گیا اور قانون کا خوف بھی ختم ہوگیا تو زیادہ سے زیادہ منافع کے لالچ میں ملاوٹ شدہ دیسی گھی فروخت کیا جانے لگا۔ یہ کام ارد گرد کے دیہات سے تعلق رکھنے والی گوالنیں کرتیں اور ٹاؤن کمیٹی کی طرف سے ان کی پکڑ دھکڑ جاری رہتی۔ بعض گھی فروش خواتین [illegible] کے ڈر سے اپنا گھی چھوڑ کر بھاگ نکلتیں اور جیسا کہ ٹاؤن کمیٹی کی طرف سے الفضل میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے اعلانات سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے برتنوں کی واپسی کے لئے بھی رجوع نہ کرتیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں برائلر مرغ کی ریل پیل ہوئی تھی نہ انڈوں کی آج والی فراوانی تھی۔ ارد گرد کے دیہات سے عورتیں دیسی مرغیوں کے انڈے لاکر گھر گھر فروخت کرتی تھیں تاہم انڈوں کی خرید سے پہلے یہ تسلی کر لی جاتی تھی کہ ان میں سے کوئی خراب نہ ہو۔ اس کا ایک آسان ٹیسٹ یہ تھا کہ انڈوں کو پانی کی ایک دیگچی یا

مگ میں ڈال دیا جاتا۔ اس ٹیسٹ سے دودھ کا دودھ اور پانی پانی ہو جاتا۔ ٹھیک انڈے نیچے بیٹھ جاتے جب
خراب انڈے پانی کے اوپر آ جاتے۔

یہ تو تھا ربوہ کے ماحول کا عمومی تذکرہ۔ اب میں جس اندوہناک حادثہ کا ذکر کرنے لگا ہوں یوں تو
ترکی ضلع جہلم میں وقوع پذیر ہوا تھا لیکن اس کی بازگشت ربوہ میں بھی سنی گئی۔ تفصیلات کے مطابق ۱۹۵۱ء
موسم گرما میں وہاں کے ایک احمدی گھرانے میں خاتونِ خانہ اپنے ہی ایک صاحبزادے کے ہاتھوں غلطی سے گولی
چل جانے کے باعث انتقال کر گئیں۔

موصوفہ یوسف بریلوی کی اہلیہ تھیں جو میری معلومات کے مطابق تعمیراتی ٹھیکے لیا کرتے تھے اور اُن کا شمار
ربوہ کے خوشحال لوگوں میں ہوتا تھا۔ اُن کی رہائش گاہ محلّہ دارالصدر غربی میں لاہور سرگودھا روڈ کے بالمقابل واقع
تھی اور اس کا نام دارالسّخاوت تھا۔ یہ نام اس رہائش گاہ کے ماتھے پر جلی حروف میں شیشے سے کنداں تھا لہٰذا دُور
سے نظر آتا۔ سورج کی شعاعیں اس پر پڑتیں تو اس کی چمک میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

یوسف بریلوی کے ایک صاحبزادے، منور میرے ہم جماعت تھے۔ ان کا ڈیل ڈول اپنے ہم جماعتوں
سے نمایاں تھا لیکن بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ یاد نہیں اُن کی وفات کا سبب کیا بنا۔ میں عمر کے اس حصے میں تھا
جب ایسی باتوں کی گہرائی میں جانے کا شوق نہیں ہوتا۔ یوں بھی میں اس خاندان کے کسی اور فرد کو نہیں پہچانتا تھا
لہٰذا اس واقعہ کی تفصیلات معلوم کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

حال ہی میں مجھے پتا چلا کہ یوسف بریلوی کے ایک صاحبزادے ظفر قریشی جو امریکہ کی ریاست ایریزونا
میں مقیم ہیں یہ تفصیلات بتا سکتے ہیں۔ میں نے اُنہیں ایک ای میل ارسال کی تو انہوں نے فوراً اس کا جواب دیا جو
ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

"Thanks for touching the base. This is the way, I remember the incident. My father was a hunter, he had a gun that was not kept locked. We used to play with it, by pointing the gun at each other and pulling the trigger. The gun being unloaded will make a clicking sound and we will laugh. One day, after returing from a hunting trip, my dad forgot to empty the gun before entering the house premises which was his routine. He was distracted by the presence of an unexpected stranger in our front yard. He handed the gun to me to take in the house while he dealt with the stranger. I took the gun and playfully pointed the gun at my mother and said "Mom! I am going to shoot you". Mom equally playfully raised her arms and said. "Shoot me". I pulled the trigger."

میں نے بعد میں ان سے اس واقعہ کی مزید تفصیلات بھی معلوم کیں اور اس حوالے سے ہمارے مابین بہت سی ای میلز کا تبادلہ ہوا جس دوران انکشاف ہوا کہ ظفر قریشی کی والدہ کا نام عابدہ خاتون تھا اور وہ خانصاحب چوہدری ابوالہاشم بنگالی کی صاحبزادی تھیں۔ وہ یوسف بریلوی کی دوسری اہلیہ تھیں لیکن پہلی بیوی کے بچوں بشمول ظفر قریشی سے بے پناہ محبت رکھتی تھیں اور بچے بھی ان کے ساتھ اسی الفت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جس وقت یہ واقعہ رونما ہوا ظفر قریشی کی عمر تیرہ سال تھی اور یہ سب کچھ کھیل ہی کھیل میں ہو گیا تھا۔ ظفر قریشی کے الفاظ میں:

"She was very concerned about her step mother status. That is why she suggested to my father to have her statement taken by the Judge before taking her to the operation theater."

اس کے بعد کیا ہوا، یہ تفصیلات بھی ظفر قریشی کی زبانی سنیے:

"The mother was taken to District Hospital in Jhelum. While on deathbed, she gave a statement to District Judge under oath that all her children had great unconditional love for her. It was an innocent mistake and that I meant no harm, and I should not be held accountable for any crime. The investigating department of Police concurred and I was held innocent. No charges were filed."

ان ای میلز کا آزاد اردو ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا:

''ہاں! میں ہی وہ بدقسمت بیٹا ہوں جس کے ہاتھوں لگنے والی گولی سے اس کی والدہ نے دم توڑ دیا تھا۔ دراصل میرے والدِ بزرگوار شکار کے شوقین تھے اور اس حوالے سے ان کے پاس ایک بندوق ہوا کرتی تھی جو گھر میں بالعموم کھلی پڑی رہتی تھی۔ چونکہ اس بندوق میں گولی نہیں ہوتی تھی اس لیے ہم بچے اسے اٹھا کر ایک دوسرے پر تانتے رہتے اور گھوڑا دبنے سے پیدا ہونے والی آواز سے لطف اندوز ہوتے۔ ہمیں یہ آواز اتنی اچھی لگتی کہ ہم یہ کھیل بار بار کھیل کر بھی اکتاتے نہ تھے۔ ایک بار والدِ بزرگوار شکار سے واپس آئے اور ابھی گھر میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ کسی نے باہر کا دروازہ آ کھٹکھٹایا۔ وہ اپنی بندوق مجھے تھما کر باہر چلے گئے۔ میں تو گویا اسی موقع کا منتظر تھا چنانچہ میں نے فوراً یہ بندوق اپنی والدہ کی طرف تانتے ہوئے کہا کہ میں آپ کو گولی ماردوں گا۔ میری والدہ بھی میری اس کھیل میں خوشی کے ساتھ شریک ہو گئیں اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے مجھے اپنی مرضی پوری کرنے کی اجازت دے دی۔ اُس روز یہ بندوق بدقسمتی سے لوڈڈ تھی۔ میں نے جوں ہی گھوڑا دبایا، اس میں سے ایک گولی نکل کر میری والدہ کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ اُنہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ وہ ہماری سوتیلی والدہ ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ غیر ارادی طور پر ہو گیا تھا لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ مجھے پولیس اور عدالتوں کی غیر ضروری کھینچا تانی سے محفوظ رکھنے کے لیے آپریشن تھیئٹر جانے سے پہلے کوئی جج اُن کا بیان ریکارڈ کر لے۔ ان کی اس

خواہش پر عمل ہوا چنانچہ انہوں نے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال، جہلم پہنچ کر ڈسٹرکٹ جج کے سامنے اپنے حلفیہ بیان میں کہا کہ ان کے تمام بچے ان سے بے انتہا پیار کرتے تھے اور یہ کہ یہ واقعہ اتفاقاً رونما ہو گیا ہے جس کی ذمہ داری کسی طرح بھی ظفر قریشی پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ پولیس کی تفتیشی ٹیم نے بھی انہیں بے گناہ ٹھہرایا اور یوں یہ افسوناک واقعہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔''

اب اس واقعہ پر چونسٹھ سال گذر چکے ہیں مگر ظفر قریشی کو اس کا آج بھی بے انتہا افسوس ہے۔ اگرچہ یہ اندوہناک واقعہ کھیل ہی کھیل میں وقوع پذیر ہو گیا تھا لیکن اس نے ظفر قریشی کو ماں کی شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔

یاد رہے کہ ظفر قریشی تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ انہوں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا جس کے بعد میو ہسپتال میں ایک سال ہڈی و جوڑ وارڈ میں ہاؤس جاب کرنے کے بعد امریکہ منتقل ہو گئے اور انیستھیزیا میں تخصیص حاصل کی۔ تب سے وہ امریکی ریاست ایریزونا میں مقیم ہیں۔ اللہ نے انہیں عزت کے ساتھ ساتھ فراخیٔ رزق سے بھی نوازا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے ہی علاقہ میں دو بیوت الذکر کی تعمیر کا تمام خرچ خود برداشت کیا ہے۔ ان میں سے ایک بیت الذکر یوسف کہلاتی ہے جس کا نام ان کے والد گرامی کے نام پر رکھا گیا ہے جب کہ دوسری بیت الذکر حاجرہ کہلاتی ہے جس کا نام ان کی نانی کے نام پر رکھا گیا ہے جنہوں نے ان کی والدہ کی ناگہانی وفات کے بعد ان کی پرورش کی اور انہیں ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دی۔ جن لوگوں نے یہ بیوت الذکر دیکھ رکھی ہیں وہ ان کے حسن و جمال کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتے۔

موصوف خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں چنانچہ وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے دوستوں کو بتاتے ہیں کہ وہ اب تک اپنے خاندان اور حلقہ احباب میں سے ڈیڑھ سو افراد کو مستقل بنیادوں پر امریکہ بلوا چکے ہیں۔

اب میں قارئین کو ایک بار پھر اکسٹھ سال پیچھے لیے چلتا ہوں اور انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۵۳ء کا سال جماعت احمدیہ کے لیے ابتلا و آزمائش کا سال تھا۔ اس سال مجلس احرار کے ایما پر جماعت کے خلاف ملک گیر ہنگامے ہوئے اور احمدیوں کی جان و مال کو سخت نقصان پہنچایا گیا۔ اگرچہ پاکستان کے باقی شہروں میں بھی جماعتی مفادات کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہ کیا گیا تاہم لاہور جماعت کے خلاف اس ہنگامے کا مرکز تھا اور اگر یہاں پر بروقت حکومتی اقدامات نہ ہوتے تو احمدیوں کو نہ جانے کتنا نقصان پہنچتا۔

ان دنوں ایک موہوم سا اندیشہ یہ بھی تھا کہ مخالفین کی طرف سے جماعت احمدیہ کے مرکز یعنی ربوہ پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ان ہی اطلاعات کے پیش نظر حکومت نے صدر انجمن احمدیہ کے کوارٹر نمبر ۳۷ - ۶۱ میں ایک عارضی پولیس چوکی قائم کی تھی اور کچھ سپاہی ہمہ وقت یہاں موجود رہتے تھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس چوکی کو سرکاری طور پر چوکی کا درجہ دیا گیا تھا یا نہیں تاہم جب حالات بہتر ہو گئے تو یہ چوکی ختم کر دی گئی جس کی وجہ سے میں نے اس کے لیے ''عارضی پولیس چوکی'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

اور اب کچھ ذکر ایک ایسے واقعہ کا جس کا تعلق ربوہ میں کرکٹ کی ترویج و ترقی سے ہے۔ آپ سننا چاہیں گے یہ واقعہ؟

میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اور اپنے گھر سے محلہ دارالصدر غربی کی طرف جا رہا تھا۔ اس زمانے میں سیکیورٹی کے حالات اس قدر مخدوش نہ تھے چنانچہ قصرِ خلافت کے گیٹ دن رات کھلے رہتے اور میں بیت مبارک، دفتر پرائیویٹ سیکرٹری، دفتر ایم این سنڈیکیٹ اور کار کے گیراجوں کے سامنے سے گذر کر اس میدان میں داخل ہو جاتا جہاں اب خاندان حضرت مسیح موعود کے بعض افراد کی کوٹھیاں ہیں۔ اُن دنوں یہ میدان تقریباً خالی پڑا تھا اور اس میں ربوہ کرکٹ کلب نے اپنی گراؤنڈ بنا رکھی تھی۔

اس کلب کے زیادہ تر اراکین کا تعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے خاندان سے تھا۔ کبھی کرکٹ کھیلی جا رہی ہوتی تو میں بھی چند لمحوں کے لیے رُک جاتا۔ اس روز میں وہاں سے گذرا تو غیر معمولی چہل پہل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ نامور ٹیسٹ کرکٹر خان محمد تشریف لائے ہوئے ہیں اور ربوہ کے کھلاڑیوں کو باؤلنگ کے رموز سکھا رہے ہیں۔ میں تو تین میں تھا نہ تیرہ میں لہٰذا خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو کر سب کچھ دیکھتا رہا۔ ربوہ کے کھلاڑیوں نے سفید رنگ کی یونیفارمز پہن رکھی تھیں اور فضا ایک ناقابلِ بیان قسم کی مسرت سے معمور تھی۔

یاد رہے کہ خان محمد پاکستان کے ایک معروف میڈیم فاسٹ باؤلر تھے جنہوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ٹیسٹ کرکٹ میں اپنے ملک کا نام خوب روشن کیا۔ اگرچہ وہ کسی شدید چوٹ کے زیرِ اثر پاکستان کی طرف سے صرف تیرہ ٹیسٹ میچ ہی کھیل سکے لیکن انہوں نے اپنے اس محدود کیریئر میں پچاس وکٹیں حاصل کر کے ایک ایسا ریکارڈ قائم کر دکھایا جو بعد میں کئی برس تک قائم رہا۔

خان محمد یکم جنوری ۱۹۲۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام جان محمد تھا اور وہ عمارتی لکڑی کے کاروبار سے منسلک تھے۔ خان محمد سنٹرل ماڈل ہائی سکول کے طالب علم تھے اور انہوں نے اسی سکول میں کرکٹ کھیلنا شروع کی تھی۔ اس سکول میں انہوں نے دیگر اساتذہ کے علاوہ چوہدری محمد عبداللہ خان سے بھی پڑھا تھا جو ہیڈ ماسٹر تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ میں مقیم تھے۔ خان محمد کو اس بات کا علم تھا چنانچہ وہ پشاور سے لائلپور جاتے ہوئے محض ان کے ساتھ ملاقات کے لیے یہاں ٹھہرے تھے۔

میرا خیال ہے کہ ربوہ قیامِ پاکستان کے بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت آباد ہونے والا واحد قصبہ ہے جس میں سنیما کے لیے کوئی جگہ مختص نہیں کی گئی۔ جماعتِ احمدیہ کا یہ اقدام اُس کی اس سوچ کا عکاس ہے کہ فلمیں اخلاقِ انسانی پر تباہ کن اثر ڈالتی ہیں اور موسیقی ایک شیطانی ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ سیدھے سادے بندوں کو ورغلا کر صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے فلم بینی اور موسیقی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور وہ جماعت کو ان میں مضمر خطرات سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہے۔ یوں تو حضور نے پہلے بھی کئی مواقع پر اس برائی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا لیکن آپ نے اپنے ایک خطبہ جمعہ میں جو آپ نے ۱۴ ستمبر ۱۹۵۸ء کو ارشاد فرمایا تھا اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ مسلمان حکومتوں کے زوال کا ایک بڑا سبب

ان حکمرانوں کا رقص و سرود اور موسیقی کے ساتھ حد سے بڑھا ہوا لگاؤ ہی تھا۔ اس حوالے سے حضور نے دہلی، بغداد، اُندلس اور کئی دیگر مسلمان مملکتوں کی مثال دی کہ دشمن اُن کے سر پر کھڑا تھا لیکن وہ رقص و سرود اور موسیقی کے نشے میں دُھت اپنی ہی دنیا میں مگن تھے حتیٰ کہ دشمن نے انہیں آلیا اور نہ صرف اُنہیں بلکہ اُن کی نسلوں کو بھی نیست و نابود کر دیا۔ حضور نے ان ساری باتوں کے بالوضاحت ذکر کے بعد فرمایا:

''میں جماعت کو حکم دیتا ہوں کہ کوئی احمدی سینما، سرکس، تھیٹر وغیرہ غرضیکہ کسی تماشے میں بالکل نہ جائے اور اس سے بکلّی پرہیز کرے۔ ہر مخلص احمدی جو میری بیعت کی قدر و قیمت سمجھتا ہے اس کے لئے سینما یا کوئی اور تماشہ وغیرہ دیکھنا یا کسی کو دکھانا جائز نہیں۔ سینما کے متعلق میری رائے ہے کہ نقصان دہ چیز ہے۔ موجودہ فلموں کو دیکھنا ملک اور اس کے اخلاق کے لئے مہلک ہے اس لئے قطعاً ممنوع ہونا چاہئے مگر میں ہمیشہ کے لئے اس کی ممانعت نہیں کرتا کیوں کہ یہ حرمت کی صورت ہو جاتی ہے۔ فی الحال ضرورتِ دینی کے لحاظ سے اس کی ممانعت کرتا ہوں۔ سینما کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس زمانہ کی بدترین لعنت ہے، اس نے سینکڑوں شریف گھرانوں کے لڑکوں کو گویّا اور سینکڑوں شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو ناچنے والی بنا دیا ہے اور سینما ملک کے اخلاق پر ایسا تباہ کن اثر ڈال رہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میرا منع کرنا تو الگ رہا اگر میں ممانعت نہ کروں تو بھی مومن کی روح کو خود بخود اس سے بغاوت کرنی چاہئے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے اِن ہی ارشادات کی روشنی میں ربوہ میں فلم بینی اور موسیقی کے پروگرام سننے کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ ربوہ میں تو خیر کوئی سینما تھا ہی نہیں چنانچہ بعض قدرے غیر تربیت یافتہ نوجوان چنیوٹ چلے جاتے لیکن نظارتِ امورِ عامہ نے ایسے نوجوانوں کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے لیے اپنا نظام وضع کر رکھا تھا چنانچہ شو ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے اس ڈیوٹی پر متعیّن ربوہ کے بعض نوجوان سینما ہال کے باہر پہنچ جاتے اور اِن غیر تربیت یافتہ نوجوانوں کی فہرست تیار کر لیتے۔ بعد میں نظارت امورِ عامہ میں بلا کر ان کے خلاف مناسب تادیبی کارروائی کی جاتی۔

جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے ربوہ میں ریڈیو رکھنے والے گھروں کی تعداد یوں بھی گنی چنی تھی اور وہ بھی موسیقی کے پروگرام نہ سنتے تھے یا ان کی آواز اتنی نیچی رکھتے کہ باہر کسی کے کان تک نہ پہنچے۔ ربوہ میں یہ بھی معمول تھا کہ اگر کبھی کسی گھر سے موسیقی کی آواز آ رہی ہوتی تو اُس کا دروازہ کھٹکھٹا کر اہلِ خانہ کو ان کی کوتاہی کا احساس دلا دیا جاتا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف سے فلم بینی کے حوالے سے جن خطرات کی نشاندہی کی جا رہی تھی وہ کس قدر درست تھے اس کا اندازہ اُس خبر سے ہوتا ہے جو کم و بیش ساٹھ سال پہلے الفضل میں شائع ہوئی تھی۔ اس خبر کے مطابق بعض نوجوانوں نے ایک فلم کی کہانی سے متاثر ہو کر کسی ٹیکسی ڈرائیور کو قتل کر دیا تھا لیکن وہ پکڑے گئے، اُن پر مقدمہ چلا اور ان میں سے بعض کو پھانسی اور باقیوں کو مختلف میعاد کی قید کی سزائیں ہوئیں۔ الفضل کی پرانی فائل دیکھتے ہوئے مجھے دو اپریل ۱۹۵۶ء کو شائع ہونے والی یہ خبر مل گئی جسے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''لاہور یکم مئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اینڈ سیشن جج [illegible] ریاض [illegible] قتل کا فیصلہ سنا دیا ہے۔

۲۰ سالہ ملزم محمد رفیق کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۳۰۲/۳۴ کے تحت سزائے موت [illegible] دفعات ۳۹۲ اور ۲۰۱ کے تحت علی الترتیب دس اور سات سال قید بامشقت کی سزائیں دی گئی ہیں۔ دوسرے ساتھی محمد رمضان کو عبدالخالق ٹیکسی ڈرائیور کے قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا دی گئی ہے [illegible] ۳۹۴/۳۹۷ کے تحت سات سال اور زیر دفعہ ۲۰۱ پانچ سال قید بامشقت کی سزائیں دی گئی ہیں۔ [illegible] سزائیں بیک وقت شروع ہوں گی۔ تیسرے ملزم محمد اختر کو عدم ثبوت کی بنا پر بری کر دیا گیا ہے۔ چوتھا [illegible] اعجاز احمد سلطانی گواہ بن گیا تھا۔

اس مقدمہ کے سلسلہ میں کل ۱۵۵ گواہوں کے بیانات قلمبند کیے گئے۔ صفائی کے گواہوں کے بیانات قریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس مقدمہ کا فیصلہ گنجان ٹائپ کے ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

عدالت نے جرائم کے فروغ کے سلسلہ میں غیر ملکی فلموں کے اثر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ [illegible] ایسی فلموں سے جن میں شکاگو کے لٹیروں کی زندگی پیش کی جاتی ہے نہایت برا اثر پڑتا ہے۔ فاضل جج نے فلم ٹیکسی ڈرائیور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور کے مقدمہ قتل کے واقعات فلم ٹیکسی ڈرائیور کے واقعات سے ملتے جلتے ہیں۔ جج نے لکھا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ ہمسایہ ملک بھارت سے [illegible] قبل جو فلم ٹیکسی ڈرائیور درآمد کی گئی تھی اور جس کی نمائش لاہور میں ہوئی تھی اس سے شہریوں کے [illegible] ہوئی تھیں۔ جج نے لکھا ہے کہ حکام متعلقہ کے لیے یہ وقت ہے کہ وہ اس قسم کی فلموں کی درآمد بند کر دیں۔

استغاثہ کے مطابق ملزم رفیق احمد (۲۰ سال) اور محمد رمضان (۲۷ سال) نے باہمی مشورہ سے یہ ٹیکسی ڈرائیور کو قتل کرنے کے بعد ٹیکسی کو لوٹنے کی سازش کی۔ اس سازش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ملزمان محمد رفیق اور محمد رمضان نے اپنے ایک اور ساتھی اعجاز احمد کے ہمراہ لاہور ہوٹل سے ٹیکسی نمبر پی آئی ۶۲۴۱ کرایہ پر لی اور اس کے ڈرائیور عبدالخالق کو سات اور آٹھ اکتوبر ۱۹۵۴ء کی درمیانی رات کو شیخوپورہ روڈ پر شیخوپورہ سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر قتل کر دیا۔ ملزمان نے ڈرائیور کو قتل کرنے کے بعد [illegible] کر دیا اور ٹیکسی کو بیچنے کے لیے کراچی فرار ہو گئے۔ ملزمان نے ٹیکسی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دی اور شیشے پر سے ٹیکسی کا لفظ اُڑا دیا۔ اس کے بعد پولیس نے ملزمان کو کراچی سے گرفتار کر لیا۔''

میں نے اپنے طور پر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس مقدمہ کے بڑے ملزم محمد رفیق کی طرف سے اپیل پر بعد میں ان کی سزا میں تخفیف ہو گئی۔ وہ یہ سزا مکمل کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے [illegible] جرمنی چلے گئے جہاں وہ تاحال مقیم ہیں افسوس! ان سے ملاقات کر کے اس واقعہ کی تفصیلات جاننے کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔

اور اب کچھ ذکر اقلیم سخن کے بے تاج بادشاہ، احسان دانش کا'

فروری ۱۹۵۸ء میں تعلیم الاسلام کالج یونین کا چوتھا سالانہ بین الکلیاتی اردو مباحثہ منعقد ہوا۔ افضل کے مطابق قرارداد زیر بحث تھی: ''قوم کو سیاستدانوں کی ضرورت نہیں۔'' اس مباحثہ میں منصفی کے فرائض ملک کے مشہور شاعر و ادیب، احسان دانش؛ ہفت روزہ قندیل، لاہور کے ایڈیٹر شیر محمد اختر اور جامعہ احمدیہ کے پرنسپل سید میر داؤد احمد نے ادا کئے۔

بتایا جاتا ہے کہ احسان دانش پہلی مرتبہ ربوہ تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر انہیں اس نوخیز بستی کی سیر کرائی گئی۔ جیسا کہ پرویز پروازی کے ایک مضمون سے جوانہوں نے احسان دانش کی ربوہ آمد کے کئی سال بعد لکھا تھا اور ہفت روزہ ''لاہور'' میں شائع ہوا پتا چلتا ہے کالج کی طرف سے پرویز پروازی اور بعض دیگر طلبہ کی ڈیوٹی احسان دانش کو ربوہ کی سیر کرانے پر لگی۔ اس موقع پر اُنہوں نے بہشتی مقبرہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پرویز پروازی کے الفاظ میں: ''ایک جگہ فرمانے لگے: بھئی! وہ آپ لوگوں کا بہشت کہاں ہے؟ ہم نے گاڑی بہشتی مقبرہ کی جانب موڑ دی۔ بہشتی مقبرہ میں دفن ہونے کے لیے احمدی احباب کی لاشیں وقت بے وقت ربوہ پہنچتی رہتی ہیں اس لیے ایک قبر ہر وقت کھدی رہتی ہے۔ اس قبر کو مینہ برسات سے بچانے کے لیے اس پر لکڑی کا ایک اوپر سے ڈھکا ہوا چوکھٹا سا دھرا رہتا ہے۔ وہاں پہنچے تو احسان دانش نے توقف کیا اور ذرا سی دیر کے بعد فرمایا: سنو

قبر کا چوکھٹا خالی ہے اسے مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے

ہم نے اور دیگر ساتھیوں نے یہ شعر احسان دانش سے سنا اور بے پناہ داد دی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ شعر اسی وقت ہوا تھا یا پہلے کا کہا ہوا تھا مگر اس وقت موقع کی مطابقت کے لحاظ سے اس کی معنویت دو چند ہوگئی۔''

کچھ ہی عرصہ بعد شورش کاشمیری کی ادارت میں لاہور سے چھپنے والے ہفت روزہ چٹان میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ ''ربوہ'' کے بارے میں احسان دانش کی ایک ''معرکتہ الآرا طویل نظم'' (جسے ''شاعری کی بولتی ہوئی تصویر'' قرار دیا گیا تھا) چٹان کی اگلی اشاعت میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

چٹان میں چھپنے والی یہ اطلاع خلافت لائبریری کے ریڈنگ روم میں میری نظر سے گذری۔ یقیناً یہ اطلاع باقی اخبار بینوں کی نظر سے بھی گذری ہوگی لیکن ابا جی نے گھر آ کر اس کا خاص طور پر ذکر کیا اور ہم سب بے چینی سے احسان دانش کی اس نظم کا انتظار کرنے لگے۔

خدا خدا کر کے ایک ہفتہ گذرا۔ چٹان کا اگلا شمارہ آیا تو اس میں یہ نظم موجود تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے یہ نظم قدرے جلی حروف میں چٹان کے دو پورے صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ اب یہ نظم احسان دانش کے دیوان میں بھی شامل ہے۔ اگرچہ نظم طویل ہے لیکن اس کے موضوع اور اس کی ادبی چاشنی کے پیشِ نظر اسے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

یہ مُفلس پہاڑوں کا ویران دامن خمیدہ کمر راستوں کا نظارا
کہیں اونچی اونچی چٹانوں کے قدموں کو چُھوتا چنابِ رواں کا کنارا

یہ پُر شور میداں میں نادار کھیتوں سے ہونٹوں پہ پیڑوں پہ چڑیاں [illegible] رہی ہیں
گماں ہے یہاں گردشیں آسماں کی کبھی رقص کرتے ہوئے تھم گئی ہیں
یہ ٹیلے ہیں یا قافلے آندھیوں کے جو سجدہ میں جھک کر جھکے رہ گئے ہیں
یہ ہے کوہ کا سلسلہ یا بگولے جو تھک کر رُکے اور رُکے رہ گئے ہیں
یہ رستہ کو روکے ہوئے اژدھے کی طرح تیز دریا کا پُر ہول دھارا
یہ بانکے کناروں پہ لوہے کے پُل میں گرجتے ہوئے ارتقا کا نظارا
یہاں کی خموشی بہت زمزموں کو کفن دے کے چپ چاپ سوئی ہوئی ہے
امیدوں کے دھانی جزیروں کی کھیتی قیاسوں کے سائے میں بوئی ہوئی ہے
یہاں کا ہر اک بے زباں سنگریزہ اصولِ خموشی سے افسانہ خواں ہے
یہاں کوئی ڈھلوان ہو یا چڑھائی بہت دُور کے وقت کی داستاں ہے
تخیل کی جھیلوں سے چشمے نکل کر بیابانِ دل کو چمن کر رہے ہیں
تصور کے بہکے خرابات خلوت کو بھی سربسر انجمن کر رہے ہیں
چٹانوں کے منہ پر لُوؤں کے طمانچوں سے کس درجہ نیلے نشاں پڑ گئے ہیں
بڑھے تھے جو دریا کی جانب کو پتھر، جبیں جھک گئی ہے، قدم گڑ گئے ہیں
معطر بیاباں کا ہر تُند جھونکا خِرد کو شعورِ جنوں دے رہا ہے
فضاؤں کی چُنری کا سلما ستارہ خموشی کو درسِ فسوں دے رہا ہے
یہاں دُوب کے زرد ریشوں کی پلکوں پہ اشکوں کی زنجیر کم دیکھتا ہوں
جئیں گے یہاں لالہ و گل بمشکل کہ مٹی میں تاثیر کم دیکھتا ہوں
یہ کہسار کی کوکھ سے ایک بستی جو اُگتی ہوئی سی نظر آ رہی ہے
زمینوں کے خوابوں کی تعبیر اس مردہ مٹی میں اک روح دوڑا رہی ہے
یہ لیٹے ہوئے سرد ساحل کی آغوش میں دُور تک کشتیوں کی قطاریں
چٹانوں کی انگڑائیوں میں محلّے، محلّوں میں جلوے لُٹاتی بہاریں
ہیں کنوارے خلاؤں میں رنگیں مکانات یا کیاریوں کے مصمم ارادے
نئی عمر کے یوکلپٹس کہ جیسے مصیبت کے مارے ہوئے شاہزادے
یہاں ہنس کے زلفیں سکھاتی ہیں صبحیں یہاں آ کے کاجل لگاتی ہیں راتیں
یہاں جھٹپٹے خود بناتے ہیں جگنو یہاں چاندنی خود بچھاتی ہے راتیں
یہ آسودہ راہیں یہ مسرور گلیاں کہیں سیدھی سیدھی کہیں سادہ سادہ
مرا رُخ ہے ٹی آئی کالج کی جانب بڑھے جا رہے ہیں قدم بے ارادہ

یہ اخلاق و سیرت کی نوعمر کھیتی ، یہ تہذیب و تعلیم کا آستانہ
یہ تنقید و تحلیل کا اک ادارہ ، یہ اذہان کا نوبنو کارخانہ
یہاں چشم و دل کے دھندلکوں کی فصلوں میں محرومیوں کا سویرا نہیں ہے
یہاں ہر سحر روشنی بانٹتی ہے مگر شامِ غم کا اندھیرا نہیں ہے
یہ حلقہ ہے صیقل گرانِ جنوں کا کہ اربابِ علم و خبر کا حرم ہے
ہراول میں جو من چلے گامزن ہیں ، نہ احساس مردہ نہ ایثار کم ہے
یہاں مغربی کھاد سے لوگ دم توڑتی خاک کو بانکپن دے رہے ہیں
عقاید کے ڈھلوان وادی میں آ کر گل ولالہ و یاسمن دے رہے ہیں
یہاں بھی مگر طرزِ تعلیم دانش مری آرزو کے مطابق نہیں ہے
یہ ناقص روش میرے نادار طبقے کے بچوں کو ہرگز موافق نہیں ہے
لگانا پڑے گا خدا جانے کس گھاٹ یہ ڈولتا، ڈگمگاتا سفینہ
کہ اس ملک کی اب روایت نہیں ہے دلوں کی صفائی ، نظر کا قرینہ
یہاں عام جب تک نہ تعلیم ہو گی یونہی لوگ گردش میں بہتے رہیں گے
یہ صابون کے بلبلے جانے کب تک ہوا کے جھکولوں کو سہتے رہیں گے
ہے کیا خاک وہ علم جو زندگی کے نشیبوں کو بھر کر نہ ہموار کر دے
نہ ذرّوں کو جو مہر و مہتاب کر دے ، نہ قطروں کو جو بحرِ ذخّار کر دے
نئی نسل کو دو نہ تعلیمِ کہنہ کہ یہ ماضیوں کی مسافر نہیں ہے
یہ اولاد بے شک تمہاری ہے لیکن تمہارے زمانے کی خاطر نہیں ہے

ابا جی نکھرے ہوئے ادبی ذوق کے مالک تھے اور آپی بھی اسی میدان میں پیچھے نہ تھیں چنانچہ یہ نظم کئی دن تک ہمارے گھر میں موضوعِ بحث بنی رہی۔ اس بات پر نصف صدی بیت چکی ہے لیکن میرا تاثر یہی ہے کہ ربوہ میں عمومی طور پر اس نظم کا وہ حصہ جس میں تعلیم الاسلام کالج کے ''طرزِ تعلیم'' کو ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا موضوعِ گفتگو بنا رہا اور بعض احمدی شعراء نے جواباً کچھ اشعار کہے۔ اس حوالے سے سب سے پہلی نظم جو عبدالسلام اختر نے کہی تھی ''ربوہ'' ہی کے عنوان سے سولہ اپریل ۱۹۵۸ء کے الفضل میں اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی کہ ''مندرجہ ذیل اشعار جناب احسان دانش کے تاثرات کے پیشِ نظر کہے گئے''۔ نظم ذیل میں پیش کی جا رہی ہے:

مرے دوست تیری قلمکاریوں کا حقیقت کی جانب اشارا نہیں ہے
مگر جنبشِ لب کی مجھ کو اجازت کہ اب ضبط کا دل کو یارا نہیں ہے
اگر دل خدا دے تو دُنیا کے خدشات و حالات و آفات کا غم نہیں ہے
گلوں کی خموشی چمن کی نظر میں ستاروں کی جھنکار سے کم نہیں ہے

حقیقت یہ ہے [illegible]
یہاں کی نوکیلی چٹانوں [illegible]
بجا ہے یہاں کا [illegible]
حقیقت میں شہری غلاظت کے بدلے نگاہوں [illegible]
یہاں پنجوقتہ نمازیں ، دعائیں ، یہاں [illegible]
وہ آغازِ شب جذبۂ دل کی رقت، وہ پچھلے پہر [illegible]
تو مٹی میں تاثیر کم دیکھتا ہے میں ان پتھروں [illegible]
نگاہِ محبت دکھاتی ہے سب کچھ خیاباں خیاباں ارم [illegible]
مرے دوست جو مالکِ بحر و بر ہے ، وہی عشق کی آبرو جانتا ہے
کبھی پھول اُگائے گی کیا کیا یہ مٹی ، نہ میں جانتا ہوں نہ تو جانتا ہے

ابھی اس نظم کی اشاعت پر چند ہی روز گذرے تھے کہ الفضل میں ایک اور نظم شائع ہوئی جس کا عنوان تھا ''درسگاہوں کی بستی۔'' یہ نظم استاذی المکرّم پرویز پروازی نے کہی تھی اور شعری خوبیوں سے مالا مال اور فصاحت و بلاغت کا ایک بے مثال نمونہ تھی۔ انیس اپریل ۱۹۵۸ء کو شائع ہونے والی اٹھارہ اشعار پر مشتمل [illegible] کی یہ نظم بھی ملاحظہ ہو:

چٹانوں کا پُر ہول و خاموش دامن جہاں۔ وقت بھی سہم کر سو گیا تھا
پہاڑوں کی وہ سحر آلود وادی جہاں کوئی ویرانیاں بو گیا تھا
جہاں گرد کی بیکراں وسعتیں تھیں جہاں رقص کرتے تھے اندھے بگولے
جہاں آرزوؤں کی خاموش قبروں سے اُٹھتے تھے آہوں کے زندہ ہیولے
جہاں جگمگاتے ستاروں کی آنکھیں کسی ماورا خوف سے مُند گئی تھیں
جہاں چاند کی نُور افروز کرنیں کسی غم سے تاریک تر ہو گئی تھیں
جہاں سانس لیتے ہوئے سہمتی تھیں حسیں سنگریزوں کی گونگی زبانیں
جہاں رقص کرتے ہوئے تھم گئی تھیں پہاڑوں کی خونریز جنگی سنانیں
جہاں بھولے بھٹکے مسافر کی صورت مُغیلان کے چند پودے کھڑے تھے
جہاں منجمد سنگریزوں کی شکلوں میں آہوں کے بیکار آنسو پڑے تھے
جہاں زندگی موت کے دیوتا کو ہزاروں برس بانج دیتی رہی ہے
جہاں زندگی انتقاماً تمناؤں کے بیج دھرتی میں بوتی رہی ہے
بہاروں کی پریاں جہاں آ کے اندھی فضاؤں کے پنجے میں جکڑی گئی تھیں
خزاؤں کی مسموم سانسیں جہاں زندگی کو [illegible]

یہ کس نے فضاؤں کے تاریک دامن میں ڈالا ہے لا کر یہ اُجلا سویرا
یہ کس کے خجستہ قدم لے کے آئے خزاؤں میں روشن بہاروں کا پھیرا
فلک نے انہیں قادیاں سے اُٹھا کر یہاں لا کے پھینکا تھا ویرانیوں میں
مگر اہلِ دل نے بسالی ہے بستی کہ جلتی ہوئی آگ تھی اِن دلوں میں
اسی خاک سے لالہ و گل کھلے ہیں جہاں شور تھا اور پانی نہیں تھا
وہاں سرو قد یوکلپٹس اُگے ہیں جہاں گھاس کا نام تک بھی نہیں تھا
ان ہی مُردہ پُر پیچ رستوں پہ انگڑائیاں لے کے چلتی ہیں رنگیں بہاریں
ان ہی سحر آلود گونگی فضاؤں میں اب گونجتی ہی خوشی کی ملاریں
بہاروں کی صاف اور شفاف بستی جہاں رہنے والے امِٹ اور اَمرہیں
جہاں (......) کے سفید اور اُونچے منارے محبت کے پیغام بر ہیں
جہاں کے مکینوں کے دل مطمئن ہیں ، جہاں کے مکانات میں زندگی ہے
جہاں کے شب و روز میں بانکپن ہے ، جہاں کے خیالات میں زندگی ہے
جہاں پنجوقتہ ’’نداؤں‘‘ کی میٹھی صداؤں کا بہتا ہے پُر نور دھارا
سحر کی خموشی میں لرزاں، درخشاں دلوں سے تڑپتی دعاؤں کا پارا
اخوت کے پانی سے سیراب بندے محبت کی چنچل نگاہوں کی بستی
یہ علم و عمل کی حسیں شاہراہوں پہ چلتی ہوئی درسگاہوں کی بستی
وہ ٹی آئی کالج کی اُجلی عمارت پہاڑی کے دامن میں ستا رہی ہے
حسیں شاخساروں کی اُٹھتی جوانی بہاروں کے سائے کو بہلا رہی ہے
وہ ٹی آئی کالج کہ جس نے مجھے روشنی اور رفعت کا تحفہ دیا ہے
اسی کی محبت بھری گود میں آ کے میں نے محبت کا پانی پیا ہے
خدا اس محبت کی بستی کو اپنی محبت سے مخمور و پُر نور رکھے
خدا اس کو آفات سے خود بچائے ، خدا اس کو آفات سے دُور رکھے

اس حوالے سے تیسرا ردِعمل لاہور کے عنایت میر کی جانب سے سامنے آیا لیکن ذرا تاخیر کے ساتھ۔ ان کی یہ نظم جس کا عنوان ’’ارضِ ربوہ‘‘ ہے دس اکتوبر ۱۹۵۸ء کے الفضل میں شائع ہوئی:

خدا کی اس گُل زمیں پہ یوں تو خدا کے بندوں کا ہے بسیرا
مگر ہے تفریق پھر بھی اتنی کہیں ہے ظلمت ، کہیں اندھیرا
بلاشبہ بادیٔ النظر میں سبھی کو اِس بات کا یقیں ہے
وہیں اندھیرا ہے کارفرما جو زد میں خورشید کی نہیں ہے

یہی ہے بس فرق ہر نظر اور نگاہ حق بیں لی روشنی میں
کہ اس زمیں پہ جو اہلِ حق ہیں وہ نور پاتے ہیں تیرگی میں
یہی نہیں بلکہ جس جگہ بھی زمیں پہ اہلِ خدا رہے ہیں
وہیں وہیں مہر بن کے ذرّے بھی رات دن جگمگا رہے ہیں
ہے جس زمیں پہ دیارِ ربوہ وہاں بھی ہر سمت ہے اُجالا
زمانہ یہ خوب جانتا ہے، یہ سوچا سمجھا ہے، دیکھا بھالا
کسی کے نقشِ قدم سے ہر اک گلی یہاں کہکشاں بنی ہے
وفورِ سجدہ گذاریوں سے زمین یہ آسماں بنی ہے
خدا کے بندوں کی اس زمیں پر رواں ہیں یوں رحمتوں کے دھارے
پناہ لیتے ہیں زندگی کے ستائے درد و الم کے مارے
ہر ایک دنیائے دل میں اس جا بلند (......) کا عَلم ہے
نہ اس جگہ زندگی کو خطرہ ، نہ اس جگہ موت ہی کا غم ہے
یہی ہے حقانیت کی وادی ، یہاں حقائق کے سلسلے ہیں
نہ کچھ خدا ہی سے بعد و فرقت ، نہ کچھ خدائی سے فاصلے ہیں
یہاں کہیں دشمنی نہیں ہے ، نفاق کا یاں گذر نہیں ہے
خدا کی اس سر زمیں پہ ہرگز کسی کو کوئی خطر نہیں ہے
یہاں ہیں حق بات کہنے والے اور ان کی پہچان رکھنے والے
خدا اور اس کے رسول پر ہیں یہاں سب ایمان رکھنے والے
کسی کی اک جنبشِ نظر سے رموز و اسرار کھل رہے ہیں
وہ بارشِ نور ہو رہی ہے کہ داغ ہر دل کے دُھل رہے ہیں
خلافتِ باعمل کا مَسکن ، امامتِ دیں کا یہ وطن ہے
یہاں نہیں کاہ کا تصور ، یہاں ہے جو بھی وہ کوہکن ہے
کمال روحانیت یہاں ہے ، جمالِ ادراک بھی یہاں ہے
قسم غمِ سعی و جستجو کی کہ دل ہے خوش ، روح شادماں ہے
یہاں ہر انسان صدقِ دل سے رضا کے پیکر میں ڈھل گیا ہے
یقین ہے راہ چلتے چلتے یہاں زمانہ بدل گیا ہے

عبدالسلام اختر، پرویز پروازی اور عنایت میر کے علاوہ محمد ہادی مونس بھی ان شعراء میں شامل ہیں جنہوں نے احسان دانش کی نظم کے حوالے سے کچھ اشعار کہے۔ یہ اشعار ''خداوالوں کی بستی'' کے عنوان سے ماہنامہ خالد

ے جولائی ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئے۔ نو اشعار پر مشتمل یہ نظم بھی خاصے کی چیز ہے۔ میں نے ہادی مونس
ے یہ بات خاص طور پر پوچھی کہ انہوں نے احسان دانش کی نظم پر اپنے ردعمل کے اظہار میں اتنی دیر کیوں لگائی
انہوں نے جواباً بتایا ''یہ وہ سال ہے جب میں بی ایڈ کرنے کے لیے لاہور گیا ہوا تھا۔ مجھے احسان دانش کی
کے بارے میں بروقت پتا ہی نہ چل سکا۔ جب میں بی ایڈ کا امتحان دینے کے بعد ربوہ واپس آیا اور یہ نظم میری
سے گذری تو میں نے اپنے اشعار میں اس پر اپنے خیالات کا اظہار کردیا۔'' ملاحظہ فرمائیے ان کی یہ نظم:

چٹانوں کے دامن کی رنگیں فضا میں محبت کا سرچشمۂ زندگانی
جہاں عہدِ رفتہ میں باغِ نظر تھا، حریر صبا تھا نہ عنبر فشانی
جہاں تھی فقط دھیمی سُروں میں سسکتی ہوئی زندگی کی نفیری
جہاں کی بیابانیوں میں عیاں تھی نہ عالم فروزی نہ خورشید گیری
جہاں پر بھٹکتا مسافر یہ سوچے کہ ہو جائے گا راکھ ہستی کا جامہ
یا اس کو گماں ہو کہ خاموش ہونے کو ہے کوئی دم میں دموں کا دمامہ
چٹانوں کے سہمے ہوئے سلسلے خوف و سکتہ کی تصویر سی بن گئے تھے
کہیں خشک مٹی کے پھیلے ہوئے ڈھیر خوابوں کی تعبیر سی بن گئے تھے
جہاں کی فضا تھی پرندوں سے عاری، جہاں کے بگولے تھے گرمی کے ہالے
تھے وقتاً فوقتاً قدم گاہِ غم میں درندوں کے پُر ہول و دِلسوز نالے
وہاں پر رُخِ احمدیت کا ہے اب چھلکتا سبوزارِ حسن و جوانی
حسیں اور شاداب منظر کی وادی کا ہر عضو اک شیشۂ شادمانی
وہاں پنجوقتہ ''ندا'' کے اثر سے معطّر جبینِ نظر چار سُو ہے
وہاں کے دلوں میں میرے پاک مولا ہمیشہ نظر آرہا تو ہی تو ہے
وہاں پہ ہیں اعجازِ قدسی کے جلوے کہ انسان کی جس سے حیرت فزوں ہے
خدا کی محبت سے معمور و پُر نور شمعوں سے مہتاب بھی سرنگوں ہے
حقیقت میں احسان ہے اُس کا مونس کہ جس نے محبت کی بستی بسائی
اسی ان حسین اور رنگین بستی کی کچھ داستاں میں نے بھی کہہ سنائی

آپ نے اس ''رنگین بستی'' کی کچھ داستان ہادی مونس کی زبانی سنی۔ آیئے! اب میں آپ کو اسی بستی کی
یک ''دلچسپ'' داستان سناؤں جس کا تعلق خود ہمارے اپنے خاندان سے ہے۔

[illegible] مجھ سے چھ سال بڑی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں جب میں آٹھویں جماعت میں تھا وہ جامعہ نصرت
سے ایف اے کا امتحان دیتے ہوئے شدید علیل ہوگئیں اور انہیں یہ امتحان ادھورا چھوڑنا پڑا۔
ان دنوں ابا جی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ہمراہ نخلہ گئے ہوئے تھے چنانچہ جب انہیں یہ اطلاع ملی

سوں نے آپا کے نام اپنے خط محررہ ۳ جون ۱۹۵۹ء میں لکھا

''کل آپ کی والدہ کا خط آنے کے بعد میں سخت پریشان ہو ... تھی کہ تمہیں امتحان

...حمد للہ ہمیں جو آپا کی سکول کی کلاس فیلو اور گہری سہیلی تھیں۔ ناقل) نے مجھے بتایا ... بائنہ چھوٹی آپا کے نام آیا ہے جس میں صحت کی اچانک بیماری کا ذکر تھا۔ اس سے وہ بھی بہت پریشان تھیں ... صاحب تھی کہ میں ... جان (یعنی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی۔ ناقل) کو بھی دعا کے لیے کہوں گی اور یہ بھی کہتی تھی کہ ... طرف سے بھی صدقہ کو کہہ دیں میں اس کے لیے بہت دعائیں کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کے لیے اتنی ہمدرد اور غمگسار بہنیں پیدا کر دیں جو آپ کے لیے دعائیں کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بہت بہت فضل نازل فرمائے اور ہمیشہ خوشی کی ہوائیں چلائے اور خوشخبریاں سناتا رہے اور غم و حزن سے بچائے۔ رَبِّ کُلُّ شَیْءٍ خَادِمُکَ رَبِّ فَاحْفَظْنِیْ وَانْصُرْنِیْ وَارْحَمْنِیْ بہت کثرت سے پڑھا کریں۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور ہمیشہ آپ کو اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھے۔''

آپا شروع سے ہی بہت ذہین اور محنتی تھیں اور انہوں نے پانچویں، آٹھویں اور میٹرک کے امتحان کی بنیاد پر وظیفہ حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں سال ضائع ہونے کا بہت افسوس تھا اور وہ دن رات آزردہ رہتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے ان کی زبان پر یہی بات ہوتی اور وہ ہر ایک سے دعا کے لیے کہتی رہتیں۔ اب راضی برضا رہتے ہوئے انہوں نے اگلے امتحان کی بطور پرائیویٹ امیدوار تیاری شروع کر دی اور ساتھ ساتھ دعا بھی کرتیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور نہ صرف امتحان اچھا ہو جائے بلکہ نتیجہ بھی ان کی توقع سے کہیں بڑھ کر آئے۔ ابا جی، امی اور تمام بھائی بہنوں کے علاوہ آپا کی سہیلیوں اور سب سے بڑھ کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی دعائیں ان کے ساتھ تھیں چنانچہ خدا کے فضل سے امتحان کا مرحلہ بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

امتحان کا نتیجہ آنے سے دو روز پہلے یعنی ۱۹ جولائی ۱۹۵۹ء کی سہ پہر کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھا گیا کہ باہر کون ہے تو وہاں موجود شخص نے سوال کیا کہ کیا صالحہ یہیں رہتی ہیں اور استفسار پر وضاحت کی کہ موصوفہ نے ایف اے کے امتحان میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور میں لڑکیوں میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی ہے تو اس نے بتایا وہ انگریزی روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کا نمائندہ ہے اور لاہور سے اُن کا انٹرویو کرنے آیا ہے۔ ابا جی نخلہ گئے ہوئے تھے اور اتفاق سے میں بھی گھر پر موجود نہ تھا چنانچہ اخباری نمائندہ کو ڈرتے ڈرتے بیٹھک میں بٹھا دیا گیا۔ آپا خود ساتھ کے کمرہ میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئیں اور وہ آپا کا انٹرویو کرنے لگا۔

اس نے دیگر باتوں کے علاوہ آپا سے بطورِ خاص یہ پوچھا کہ ان کی اس کامیابی کا راز محنت میں مضمر ہے یا ذہانت میں؟ آپا نے جواب دیا کہ اُن کی کامیابی کے پیچھے ان کی محنت کا دخل ہے نہ ذہانت کا بلکہ یہ کامیابی صرف اور صرف ان کی اور ان کے والدین اور بزرگان کی دعاؤں کا ثمر ہے تو وہ از حد حیران ہوا اور اپنے اخبار میں نمائندے نے یہ بات منسوب کر دی کہ ان کی کامیابی صرف اور صرف ان کی محنت کی مرہونِ منت ہے۔

وہ آپی کی تصویر حاصل کرنا چاہتا تھا تا کہ اپنے اخبار میں شائع کر سکے لیکن آپی نے صاف انکار کر دیا کہ پردہ دار خاتون ہونے کے ناطے وہ اخبار میں اپنی تصویر کی اشاعت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ حیران تھا کہ آپی اخبار میں اپنی تصویر کی اشاعت کا یہ سنہری موقع کیوں ضائع کر رہی ہیں اور احمد یہ کلچر سے ناواقفیت کی بنا پر سمجھ رہا تھا کہ ذرا سی منت سماجت سے اس کا مطلب نکل آئے گا چنانچہ اس نے پیشکش کی کہ اگر آپی اباجی کی اجازت کے بغیر یہ قدم نہیں اٹھا سکتیں تو وہ نخلہ جا کر ان سے یہ اجازت حاصل کرنے کو تیار ہے لیکن آپی کا تعلق ماشاءاللہ ایک مخلص احمدی خاندان سے تھا چنانچہ وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

ابھی وہ غالباً لاری اڈے پر ہی پہنچا ہوگا کہ روزنامہ پاکستان ٹائمز کا نمائندہ ہمارے گھر آ پہنچا اور اس نے بھی یہی خوشخبری سُنا کر آپی سے انٹرویو اور تصویر کی فرمائش کر ڈالی۔ اس کے سوالوں کا جواب بھی دے دیا گیا البتہ اس کی تصویر کی خواہش پوری نہ کی جا سکی۔

میں گھر واپس لوٹا تو سب اہلِ خانہ حیرت و مسرت کی ملی جلی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اگرچہ اس خبر کی تصدیق ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ہم ڈر رہے تھے کہ مبادا یہ خبر غلط ہی ہو لہٰذا طے یہ ہوا کہ فی الحال اس بات کا ذکر کسی اور سے نہ کیا جائے تاہم کچھ ہی دیر میں ہم اس فیصلے پر نظر ثانی کر چکے تھے۔

آپی وقتاً فوقتاً حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے پاس دعا کی غرض سے جاتی رہتی تھیں چنانچہ وہ چاہتی تھیں کہ میاں صاحب کو خوشی کی یہ خبر فوری طور پر سنا دی جائے۔ میاں صاحب اُن دنوں انجمن کوارٹرز میں ہی مقیم تھے۔ آپی نے اُن کے پاس حاضر ہو کر سارا واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ آپ یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئے اور آپی کو ڈھیروں دعاؤں اور مبارک باد سے نوازا۔ جب آپی نے بتایا کہ دونوں اخباری نمائندے ان کی تصویر حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے انکار کر دیا تو میاں صاحب نے آپی کے اس اقدام کو بہت سراہا اور مذاقاً کہا کہ اگر وہ بہت ہی اصرار کر رہے تھے تو منہ دوسری طرف کر کے فوٹو اتروا لینا تھی۔

اس زمانے میں فون کی سہولت موجود تھی نہ نخلہ تار جاتی تھی لہٰذا اباجی کو خوشی کی یہ خبر فوراً نہ سنائی جا سکی۔ اگلے روز نتیجہ آ گیا تو یہ خبر خود ہی عام ہوگئی۔

میرے پاس روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کا ۲۱ جولائی ۱۹۵۹ء کا وہ تراشہ ابھی تک موجود ہے جس میں آپی کی نمایاں کامیابی کی خبر بایں الفاظ دی گئی ہے:

"Saleha, private candidate of Rabwah is the daughter of the stenographer of the Head of Ahmadyya Community. She won scholarships in Primary, Middle and Matriculation Examinations.

She said that her main interest lay in studies and it was because of this that she had been able to secure positions in various examinations."

محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان ٹائمز کا نمائندہ ہمارے ہاں سے کچھ زیادہ ہی مایوس لوٹا۔ اُسے نہ تو فرصت

نے ان طالبہ کی تصویر دستیاب ہو گئی نہ تھا ... اپنے ... [illegible]

پاکستان ٹائمز نے اپنی ۲۱ جولائی ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں اس خبر کے ... [illegible]

"Saleha (Roll No.5430) of Jhang District has stood First among women candidates of this Group by securing 597 marks."

روزنامہ نوائے وقت، لاہور نے آپا کی اس کامیابی کی خبر ... انداز میں شائع کی یعنی افضل نے ۲۲ جولائی ۱۹۵۹ء کو یہ خبر اپنے پہلے صفحہ پر لگائی:

"مولوی محمد یعقوب صاحب مولوی فاضل کی صاحبزادی کی نمایاں کامیابی

ایف اے کے امتحان میں بورڈ بھر کی لڑکیوں میں اول آئی۔ الحمدللہ

۲۲ جولائی ۵۹ء: یہ خبر جماعت میں نہایت خوشی کے ساتھ سنی جائے گی کہ ثانوی تعلیم بورڈ کے امتحان ایف اے (آرٹس) میں ایک احمدی بچی یعنی صالحہ بنت مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب مولوی فاضل، انچارج شعبہ زودنویسی لڑکیوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بورڈ بھر میں اول آئی ہے۔ الحمدللہ اس نے ۵۹۷ نمبر حاصل کئے۔ یہ ہونہار لڑکی جس نے پرائیویٹ طور پر ایف اے کا امتحان دیا تھا پرائمری، مڈل اور میٹرک کے امتحانوں میں بھی وظائف حاصل کرتی رہی ہے۔ احباب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ یہ کامیابی سلسلہ کے لیے اور ملک وملت کے لیے ہر لحاظ سے بابرکت کرے اور اسے مزید کامیابیوں کا پیش خیمہ بنائے۔ آمین"

یاد رہے کہ اس وقت لاہور بورڈ پورے پنجاب کا احاطہ کرتا تھا بلکہ اس کی حدود میں بلوچستان اور شمالی علاقہ جات بھی شامل تھے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

جب ابا جی کو اس خبر کا پتا چلا ہوگا تو ان کی خوشی دیدنی ہوگی۔ وہ نخلہ میں تھے چنانچہ انہوں نے اسی روز آپی کے نام ایک خط لکھا جو اس زمانے کے دستور کے مطابق دوسرے یا تیسرے روز یہاں پہنچا ہوگا۔ انہوں نے لکھا تھا:

"الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑی کامیابی عطا فرمائی اور آرٹس میں صوبہ بھر میں اول آنے کی اس نے آپ کو توفیق بخشی۔ مجھے اس کا علم کل ۲۱ جولائی کو عصر کے وقت ہوا جب کہ ربوہ سے اخبارات پہنچے۔ چونکہ تمام اخبارات فوری طور پر میاں ناصر احمد صاحب اور سیدہ ام متین نے منگوا لیے اس لیے مجھے نتیجہ کا علم نہ ہو سکا۔ صاحبزادہ مرزا منور احمد کا لڑکا مبشر باہر آیا تو میں نے اسے آپ کا رول نمبر بتایا اور کہا کہ اخبار دیکھ کر مجھے نتیجہ بتائے۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد باہر آیا اور اس نے کہا: مبارک ہو۔ آپ کی لڑکی آرٹس میں صوبہ بھر میں اول آئی ہے۔ اس پر تمام دوست ایک ایک کر کے مبارکباد دینے کے لیے آنے شروع ہوئے اور بڑی خوشی ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے یہ مبارک دن دکھایا۔ پھر سیدہ ام متین صاحبہ نے اخبار بھجوایا اور کہا کہ یہ صالحہ آپ کی لڑکی ہے؟ میں نے جواب میں کہہ بھیجا کہ یہ رول نمبر اور نام میری لڑکی کا ہے۔ ان کی طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔

ہے۔ اس پر وہ خود دروازہ تک آئیں اور مجھے بلوا کر بڑی مبارک باد دی اور کہا کہ اس نے بڑے اچھے نمبر لیے ہیں مگر ساتھ ہی کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ اس نے کالج کی طرف سے امتحان نہ دیا ورنہ ہمارے کالج کا نام نکل جاتا۔ مرزا ناصر احمد صاحب نے بھی مبارک باد دی۔ میاں طاہر احمد صاحب آئے تو انہوں نے بھی مبارک باد دی بلکہ کہا کہ ہمارے سب خاندان کی طرف سے آپ کو مبارک ہو۔ گھر کے تمام افراد آپ کو مبارک باد کہتے ہیں۔ رات کو ربوہ سے ڈاک آئی تو اس میں آپ کا بھی تفصیلی خط آ گیا۔ برادرم ابراہیم صاحب نے بھی مبارکباد کا خط لکھا ہے۔ مولوی سلطان احمد صاحب کا خط آیا تو انہوں نے بھی مبارک باد کہی ہے۔ مولوی نور الحق صاحب بھی مبارک باد کہتے ہیں۔ غرض نخلہ میں خاندان کے تمام افراد اور تمام قافلہ والوں نے مبارک باد کہی۔ سید عبدالرزاق شاہ صاحب نے بتایا کہ میں نے حضرت صاحب کو بتایا تھا کہ مولوی صاحب کی لڑکی تمام یونیورسٹی میں اوّل آئی ہے۔ اس پر حضرت صاحب نے بھی بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

آپ کی امی جان کو بھی بے حد مبارک ہو۔ اسی طرح آپ کی تمام بہنوں، بھائیوں اور خالہ صاحبہ کو بھی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کامیابی کو آپ کی مزید کامیابیوں کا پیش خیمہ بنائے اور آپ کو دین و دنیا کی حسنات سے متمتع فرمائے۔

سِول اینڈ ملٹری گزٹ کا پرچہ میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا انٹرویو شائع کیا ہے۔ بہرحال آپ نے اچھا کیا جو انہیں فوٹو نہیں دیا ورنہ تمام اخبارات میں چھپ جاتا اور احمدیت بدنام ہوتی۔ یہ بھی آپ نے بہت اچھا جواب دیا کہ میری کامیابی کا راز محض دعا میں مضمر ہے۔ یہی حقیقی اور سچا جواب تھا۔ دنیا کے لوگ اس جواب کو ایک پاگلانہ بڑ سمجھیں گے مگر سچی بات یہی ہے کہ اسی کا خدا تعالیٰ نے نمونہ دکھایا ورنہ ایک سال سے آپ نے کالج چھوڑ رکھا تھا اور پرائیویٹ طور پر امتحان دیا۔ ایسے حالات میں یہ کامیابی دعا کا نتیجہ نہیں تو اور کس چیز کا نتیجہ ہے؟''

صاحبزادی امتہ الجمیل نے اس موقع پر اپنے خط میں لکھا:

''میری پیاری صالحہ!

السلام علیکم۔ تمہاری کامیابی کا الفضل میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا اپنے فضل سے تمہیں ہزاروں خوشیاں دکھائے۔ آمین

خط میں دیر اس لیے ہوئی کہ میں مری تھی۔ الفضل وہاں نہیں آتا تھا۔......

تم میرا خط دیکھ کر حیران تو ضرور ہوگی اور میں خود بھی حیران ہوں۔ مجھ سے کسی قسم کا شکوہ نہ کرنا کیوں کہ تم نے خود ملنا چھوڑا ہے۔ مجھے تو تم سب اسی طرح پیارے ہو اور اسی طرح یاد بھی آتے ہو۔

میری طرف سے اپنی امی کو بھی بہت بہت مبارک دینا۔

سب کو سلام۔ والسلام

تمہاری جمیل''

آپی کی سہیلی، طاہرہ بنت سید زین العابدین ولی اللہ شاہ جو ان دنوں اپنی بڑی بہن کے پاس رسالپور گئی ہوئی تھیں نے آپی کو بذریعہ تار مبارک باد ارسال کی۔

بعد میں بورڈ کی طرف سے آپی کو اس کامیابی پر ایک نقرئی میڈل دیا گیا۔ پرنسپل جامعہ نصرت کی طرف سے الفضل مورخہ ۸ فروری ۱۹۶۰ء میں یہ خبر بایں الفاظ شائع ہوئی:

''نمایاں کامیابی

محترمہ صالحہ فردوس صاحبہ جو جامعہ نصرت میں بی اے کی طالبہ ہیں نے ثانوی تعلیمی بورڈ کی طرف سے ایف اے کے امتحان منعقدہ مئی ۱۹۵۹ء میں اوّل آنے پر ''نیشنل قابلیت کا نقرئی تمغہ'' حاصل کیا ہے۔ احباب جماعت دعا فرمائیں کہ یہ کامرانی مزید دینی اور دنیاوی ترقیات کا پیش خیمہ ثابت ہو۔''

آپ کی ایف اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی کے ذکر کے بعد اب کچھ ذکر محمد ادریس اور محمد بشیر نامی ربوہ کے دو افریقی النسل بھائیوں کا جو اپنے مخصوص حالات کے پیشِ نظر طرح طرح کے نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہو کر ایک غیر مطمئن زندگی گذار رہے تھے۔ ہم سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی صبح اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک بچہ گلی میں ہماری سیڑھی پر سویا پڑا ہے۔ اس نے یہ یخ بستہ رات بستر کے بغیر کھلے آسمان کے نیچے گذاری تھی۔ ہم نے اسے اندر بلا کر چائے کی پیشکش کی لیکن وہ کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔

سبھی لوگ جانتے تھے کہ مولوی محمد صدیق امرتسری نے افریقہ میں اپنی تعیناتی کے دوران کسی مقامی خاتون سے شادی کر لی تھی اور وطن واپس آتے ہوئے وہ اس کے دونوں بچوں کو ربوہ لے آئے تھے۔ وہ خود تو اپنے فرائضِ منصبی کی ادائی کے سلسلے میں زیادہ تر پاکستان سے باہر رہتے لہٰذا ان بچوں کی دیکھ بھال اُن کی دادی کی ذمہ داری ٹھہری۔ بدقسمتی سے بچے اس ماحول میں رچ بس نہ سکے اور پھر اچانک ربوہ سے غائب ہو گئے۔ ان میں سے بڑے بیٹے کا نام محمد ادریس تھا۔ اس کی تلاش میں ناکامی کے بعد مولانا کی طرف سے الفضل (۲۳ ستمبر ۱۹۵۶ء) میں ایک اعلان شائع ہوا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''خاکسار کا بڑا بیٹا بعمر بارہ سال جو کہ افریقن ماں سے ہے عرصہ ڈیڑھ سال سے ربوہ سے غائب ہے۔ اسے تلاش کرنے کی ہر طرح سے کوشش کی گئی ہے مگر اب تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ربوہ میں اپنی دادی کے پاس رہتا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت اپنے بوٹ اور کوٹ لے کر چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ اتنا عرصہ کوئی سراغ نہ ملنے کی وجہ سے خاکسار اور خاکسار کے والدین کو بہت ہی تشویش ہے۔ سنا گیا ہے کہ لاہور یا اس کے ارد گرد کہیں رہتا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ اگر کسی دوست کو اس بارے میں کوئی علم ہو یا انہوں نے کبھی کسی جگہ دیکھا ہو تو براہِ کرم خاکسار کی والدہ صاحبہ یا دفتر وکالت تبشیر ربوہ کو اطلاع دے کر ممنون فرمائیں۔''

اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی محمد بشیر بھی مفقود الخبر ہو گیا۔ مولانا نے اس کی گمشدگی کا اعلان الفضل (اکیس اگست ۱۹۵۹ء) میں ان الفاظ میں کروایا: ''خاکسار کا ایفرو پاکستانی لڑکا عزیز محمد بشیر بعمر تیرہ چودہ سال جو کہ تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور خاکسار کی والدہ مرحومہ کے پاس رہتا تھا والدہ مرحومہ

کی وفات کے بعد کچھ عرصہ سے مفقود الخبر ہے اور ربوہ سے کہیں چلا گیا ہے۔ لڑکے کا رنگ سانولا، بال گھنگریالے افریقن نما اور قد قدرے لمبا اور جسم پتلا ہے۔''

ان دونوں بچوں کی گمشدگی پر مولانا کی طرف سے ایک انتہائی دردمندانہ اپیل الفضل (۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوئی جس کے مشمولات پڑھنے کے لائق ہیں۔ مولانا نے لکھا تھا: ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ خاکسار کا دوسرا لڑکا عزیز محمد بشیر جو کہ ربوہ میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں تعلیم حاصل کرتا تھا کچھ عرصہ سے ربوہ سے کہیں چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خاکسار اس قدر دور بیٹھا اس معاملے میں کوئی عملی جدوجہد نہیں کر سکتا اور اگرچہ وکالت تبشیر اپنی طرف سے کوشش کر رہی ہے کہ کسی طرح اس کا پتا مل جائے مگر احبابِ جماعت سے بھی میری درخواست ہے کہ اس بارے میں جس قدر ممکن ہو میری مدد کر کے ممنون فرمائیں۔ مختلف ضلعوں میں مقیم مربیانِ سلسلہ سے بھی درخواست ہے کہ اپنے اپنے علاقہ میں میرے لڑکے کا پتا کرنے اور جماعت اور خدام سے پتا کروانے کی کوشش فرمائیں۔ اس بارے میں جو بھی خرچ ہوگا اس کا میں ذمہ دار ہوں اور وکالتِ تبشیر سے وصول کیا جا سکتا ہے۔

لڑکے کے کوائف حسب ذیل ہیں:

نام محمد بشیر، عمر تیرہ چودہ سال، رنگ سانولا، بال افریقن نما گھنگریالے، ناک قدرے چپٹا، قد قدرے لمبا اور پتلا جسم۔

اس کا بڑا بھائی بھی عرصہ چھ سال سے ربوہ سے غائب ہے جس کا آج تک کوئی پتا نہیں لگ سکا۔ دونوں لڑکوں کی ماں افریقن ہے جس کی وجہ سے اُن پر افریقن نقش و رنگ اور حلیہ غالب ہے۔ احباب دعا بھی فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میری اس پریشانی کو دُور فرمائے اور ان کا پتا مل جائے۔''

بدقسمتی سے یہ بچے ربوہ میں دوبارہ کبھی نظر نہیں آئے۔

اسی زمانے کی بات ہے ربوہ میں سائنسی تحقیقات کا ایک ادارہ فضلِ عمر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے کام کر رہا تھا اور اس کی عمارت تعلیم الاسلام کالج سے ملحق تھی۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے قادیان میں کام شروع کیا تھا اور قیام پاکستان کے بعد اسے ربوہ میں نئے سرے سے قائم کیا گیا تاہم بدقسمتی سے یہ ادارہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو پایا اور عام استعمال کی بعض ایسی اشیاء تیار کرنے لگا جن کی مارکیٹنگ قدرے آسان تھی تاہم یہ تجربہ بھی کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر ان مصنوعات کی تیاری بھی بند کر دی گئی۔

یاد رہے کہ اس کا فارماسیوٹیکلز ڈویژن نزلہ، زکام، سردرد اور شیر خوار بچوں کے بعض امراض کی دوائیں تیار کرتا تھا؛ فوڈز ڈویژن نے سکویش متعارف کرایا اور کاسمیٹکس ڈویژن نے شائنو ہیئر آئل، شائنو ویزیلین اور شائنو پومیڈ تیار کرنا شروع کی۔ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائنو بوٹ پالش بھی متعارف کرائی گئی جو سیاہ اور براؤن، دونوں رنگوں میں دستیاب تھی۔ الفضل میں اس کا اشتہار بکثرت شائع ہوتا رہتا تھا جس میں پالش کی ڈبیہ اور ایک جوتے کی تصویر ہوتی۔ اس جوتے میں سے روشنی منعکس ہو رہی ہوتی اور ساتھ ہی یہ فقرہ بھی لکھا ہوتا تھا: ''پاپوش میں لگاؤ کرن آفتاب کی۔'' اب تو یہ مصرع کسی تعلیم یافتہ نوجوان کے سامنے بھی پڑھا جائے تو شاید

وہ اس کا مطلب نہ سمجھ پائے لیکن اُس زمانے میں میرے جیسے مبتدی کو بھی یہ علم تھا کہ ''پاپوش'' جوتے کو کہا جاتا ہے اور ''کرن آفتاب کی'' سے مراد وہ چمک ہے جو شائنو پالش جوتے میں پیدا کر دیتی ہے۔ مجھے اب یاد نہیں کہ یہ پالش مروجہ پالشوں از قسم چیری بلاسم یا کیوی کے مقابلے میں کتنی سستی تھی لیکن لمبا عرصہ ہمارے گھر میں بھی آتی رہی۔

میں نے کچھ دیر پہلے ربوہ کے نواح میں آباد جانگلیوں کا ذکر کیا تھا۔ اکثر جانگلی غیر تعلیم یافتہ اور غیر متمدن تھے۔ وہ ایک ایسے ماحول کے پروردہ تھے جس میں بہت سی دیگر معاشرتی برائیوں کے ساتھ ساتھ چوری چکاری کو بھی ایسا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ وہ موقع بموقع ربوہ میں بھی وارداتیں کرتے رہتے تھے۔ چوروں کے یہ گینگ کبھی کبھار ربوہ کے کسی فرد کو بھی لالچ یا دھونس کے ذریعہ اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جاتے۔

غالباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ ایک روز محلہ دار الصدر غربی کے ایک رہائشی، شیخ منظور علی کا بیٹا اپنے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں کسی دوست کے گھر گیا ہوا تھا۔ وہ رات گئے اپنے گھر واپس پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اندر چور گھسے ہوئے ہیں۔ وہ اُلٹے پاؤں واپس آ گیا اور سڑک پر کھڑے ہو کر ''چور! چور!!'' کا شور مچا دیا۔ یہ شور سُن کر چور بھاگ نکلے اور محلے کے بہت سے لوگوں نے جو یہ شور سن کر اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ جب چوروں نے محسوس کیا کہ اب وہ پکڑے جائیں گے تو انہوں نے اہلِ محلہ پر گولی چلا دی۔ خوش قسمتی سے تعاقب کرنے والوں میں سے کوئی اس فائرنگ سے تو زخمی نہ ہوا مگر برکھا لوہار نامی ایک چور نے اپنے تعاقب میں آنے والے ایک شخص کو کلہاڑی سے شدید زخمی کر دیا جس کے بعد وہ خود اور اس کے دو ساتھی پکڑے گئے۔ دورانِ تفتیش انہوں نے انکشاف کیا کہ ان کے تین ساتھی اور بھی ہیں جو موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ پولیس نے ان کی نشاندہی پر مختلف گھروں پر چھاپہ مار کر ان کے تینوں ساتھیوں...... کو گرفتار کر لیا اور واردات میں استعمال ہونے والا اسلحہ اور سیاہ رنگ کے کپڑے بھی برآمد کر لیے۔

اتفاق کی بات ہے کہ میں ان چوروں میں سے ایک سے بہت اچھی طرح متعارف تھا۔ وہ ربوہ کا ایک جلد ساز تھا۔ میں اپنی جلد بندی کی بعض ضروریات اسی دکان سے پوری کیا کرتا تھا لیکن میں نے اس واقعہ کے بعد اُسے ربوہ میں کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس مقدمہ میں اسے کوئی سزا ہوئی یا وہ بری ہو گیا تھا لیکن اس نے ربوہ کی رہائش ترک کر دی تھی۔

حال ہی میں ربوہ کے ایک دوست کے ساتھ اُس کا ذکر چل نکلا تو انہوں نے انکشاف کیا کہ: ''اُس کا ایک بھائی میرے دوستوں میں سے تھا اور میں اس سے ملنے کے لیے کبھی کبھار اس کی دکان پر چلا جاتا تھا۔ چوری کی اس واردات کے سالوں بعد میں ایک بار اپنے کسی ذاتی کام سے میر پور متھیلو گیا تو سوچا کہ کیوں نہ سکھر کی بھی سیر کرتا جاؤں۔ وہاں میں نے ایک دکان پر ایک شخص کو جو اپنے دو گن مینوں کے ہمراہ خریداری کے لیے آیا ہوا تھا دیکھا تو مجھے اس کا چہرہ مانوس سا لگا۔ اس شخص نے بھی نوٹ کر لیا کہ میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں چنانچہ جب میں باہر نکل آیا تو اس نے اپنے ایک گن مین کو میرے پیچھے دوڑایا۔ وہ مجھے اس کے پاس لے گیا۔ اس نے

حسبِ توقع مجھ سے سوال کیا کہ میں اس کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا تو میں نے جواباً اس سے پوچھا کہ کیا وہ ..... نہیں ہے۔ وہ ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر قدرے حیران ہوا اور پھر اس نے مجھے اپنا تعارف کرانے کو کہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کے دشمنوں میں سے نہیں ہوں تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ پھر وہ میرے انکار کے باوجود مجھے اپنے گھر لے گیا جو خاصا وسیع و عریض اور پُر آسائش تھا اور میرے لیے کھانا تیار کرایا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے پاس کم از کم ایک رات ضرور ٹھہروں جب کہ میں اسی شام ربوہ واپس آنا چاہتا تھا۔ پہلے تو وہ میری معذرت قبول کرنے کو تیار نہ تھا لیکن بالآخر اس نے مجھے اجازت دے دی اور تاکید کی کہ میں ربوہ پہنچ کر اس کے بھائی سے ضرور ملوں اور اس کے دیئے ہوئے پانچ ہزار روپے اسے پہنچا دوں۔''

ان چوروں نے ربوہ کے قبرستان میں اپنی کمیں گاہ بنائی ہوئی تھی جس میں وہ چوری کا مال چھپاتے تھے اور حسبِ ضرورت خود بھی اس میں چھپ سکتے تھے۔ کمیں گاہ ایک زمین دوز کمرے پر مشتمل تھی۔ اس کی چھت پتھروں سے اس طرح ڈھانپی گئی تھی کہ دیکھنے میں وہ قبرستان کا حصہ ہی نظر آئے لیکن اس میں ہوا اور روشنی کا انتظام موجود تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کمیں گاہ سابق عراقی صدر، صدام حسین کی تکریت میں واقع اُس کمیں گاہ سے بہت حد تک ملتی جلتی تھی۔ جہاں سے امریکی افواج نے انہیں گرفتار کیا تھا۔ پولیس نے اس کی چھت اُتار دی جس کے بعد یہ کمیں گاہ ایک چوکور گڑھے کی صورت اختیار کر گئی۔ یہ گڑھا بعد میں کئی سال تک قائم رہا۔ میرا جب کبھی ادھر سے گذر ہوتا تو میں یہ گڑھا ضرور دیکھتا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مٹی سے اَٹ گیا تھا۔ اب تو شاید اس کا نشان بھی باقی نہ رہا ہو گا۔

اوراقِ ماضی پلٹتا ہوں تو ایک اور منظر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ میں اُن دنوں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ امریکہ اور رُوس کے درمیان خلائی تسخیر کے لیے مقابلہ جاری تھا اور امریکہ نے ''ایکو وَن'' نامی ایک مصنوعی سیارہ خلا میں چھوڑ رکھا تھا۔ یہ سیارہ ربوہ کی فضا میں سے بھی گذرتا تھا اور اس کا مشاہدہ عام آنکھ سے کیا جا سکتا تھا تاہم کسی کو علم نہ تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ بعد میں الفضل (۲۰ اگست ۱۹۶۰ء) میں شائع ہونے والی ایک خبر سے پتا چلا کہ یہ ''ایکو وَن'' ہے اور یہ پہلا مصنوعی سیارہ ہے جو زمین سے کسی دوربین کی مدد کے بغیر دیکھا جا سکتا ہے۔

امریکہ اور روس تو چاند پر اُترنے کی تیاری کر رہے تھے لیکن اہلِ ربوہ کے لیے اپنے شہر سے لاہور جانا کارِ دارد تھا اور اگر کوئی شخص دن ہی دن میں لاہور کے کام نمٹا کر ربوہ واپس آنا چاہتا تو اسے کوئی ٹرین سُوٹ نہ کرتی اور مجبوراً بس کا سہارا لینا پڑتا۔ اُن دنوں کراؤن بس سروس، ہمالیہ ٹرانسپورٹ کمپنی، میانوالی ٹرانسپورٹ کمپنی، یونائیٹڈ بس سروس، سپیڈ ویز ٹرانسپورٹ اور طارق ٹرانسپورٹ کمپنی کی بسیں جو میانوالی، جوہر آباد یا سرگودھا سے چلا کرتی تھیں نمازِ فجر کے لگ بھگ وقفے وقفے سے ربوہ سے گذرتیں۔ ان میں سے یونائیٹڈ بس سروس اور طارق ٹرانسپورٹ کمپنی بعض احمدی احباب کی کُلی یا جزوی ملکیت تھیں اور ان کے اشتہارات بھی الفضل میں شائع ہوتے رہتے تھے چنانچہ ربوہ کے دوست ان بسوں کو ''اپنا'' سمجھ کر ان کی سرپرستی اپنا فرضِ منصبی جانتے لیکن بہر

مجبوری دوسری بسوں پر بھی سفر کر لیتے۔

یہ بسیں ہر چھوٹے سے چھوٹے سٹاپ پر رکتیں اور دو ٹکے کی سواری بھی نہ چھوڑتیں۔ اگر فوری طور پر کوئی سیٹ میسر نہ ہوتی تو دُور جانے والے مسافروں کے لیے راستہ میں اُترنے والی سواریوں سے زبردستی سیٹیں خالی کروالی جاتیں۔ باقی مسافر بس کے وسط میں لگے ہوئے ڈنڈے کے ساتھ اس وقت تک جھولتے رہتے جب تک ان کی منزل نہ آ جاتی۔

بس میں داخل ہوتے ہی جب فرنٹ سیٹ کے اوپر لکھے ہوئے اس فقرے پر نظر پڑتی کہ ''اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے، شاید یہ تمہاری زندگی کا آخری سفر ہو'' تو بے پرواسے بے پرواسافر بھی سفر کی دعا پڑھنے پر مجبور ہو جاتا۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے آتے اور پتا چلتا کہ اس بس کے رواں دواں رہنے میں نہ ڈرائیور کی کسی خوبی کا دخل ہے نہ انجن کے کسی کمال کا بلکہ یہ تو محض خدا کے سہارے چلی جا رہی ہے تو مسافر پھر سے توبہ استغفار میں لگ جاتے۔ سفری قواعد کے مطابق ہر مسافر اپنے سامان کی حفاظت کا خود ذمہ دار تھا لہٰذا اس کا سارا سفر اسی دھڑکے میں گذر جاتا کہ کوئی اور مسافر اس کا سامان مالِ غنیمت سمجھ کر نہ لے اڑے۔ یہی وجہ تھی کہ سفر کے بخیروخوبی اختتام پذیر ہونے پر مسافر سجدہ شکر بجالاتا۔

اُن دنوں پرائیویٹ کمپنیوں کے علاوہ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کی بسیں بھی لاہور جاتی تھیں۔ اگرچہ اس کے اوقات گنے چُنے تھے تاہم یہ سروس وقت کی بے حد پابند تھی۔ اگر کسی سواری کو ربوہ اُترنا ہوتا یا بس میں کوئی سیٹ خالی ہوتی تو یہ بس یہاں رُکتی ورنہ بغیر رُکے آگے نکل جاتی۔ لاہور میں اس کا اڈہ ریلوے سٹیشن کے پاس تھا اور وہاں سے پنجاب کے طول وعرض میں بسیں جاتی تھیں۔ وہ مسافر جنہیں لاہور سے آگے کسی اور جگہ جانا ہوتا یہ سروس خاص طور پر پسند کرتے تھے۔

ان بسوں میں اگلی دو یا شاید چار سیٹیں ڈیلکس کہلاتی تھیں۔ ان کا کرایہ ڈیوڑھا ہوتا تھا لیکن ان سیٹوں پر بیٹھنے والے مسافر ڈائیوو بس سروس کے مزے لوٹ سکتے تھے۔ اس وقت ڈیوڑھا کرایہ ادا کرنے کی استطاعت اکثر مسافروں میں نہیں ہوتی تھی لہٰذا وہ ان سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو بہت رشک بلکہ شاید حسد کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ بہت دفعہ یہ سیٹیں خالی ہی رہتیں۔

اُن دنوں لاہور جانے کا واحد راستہ چنیوٹ، پنڈی بھٹیاں، سکھیکی، خانقاہ ڈوگراں، شیخوپورہ اور شاہدرہ سے ہو کر جاتا تھا اور یہ فاصلہ تین سے ساڑھے تین گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ یوں تو یہ بسیں راستے کی ''چھوٹی سے چھوٹی سواری'' بھی نہ چھوڑتیں اور انہیں اُٹھانے یا اُتارنے کے لیے کسی بھی جگہ ''بریک مارنے'' کو تیار ہو جاتیں لیکن مندرجہ بالا اڈّے تو ان بسوں کے پکے سٹاپ تھے جہاں یہ جتنی دیر چاہتیں رکی رہتیں۔

اس رُوٹ پر سفر کرنے والوں میں سکھیکی کے سموسے بہت مقبول تھے۔ یوں تو یہ سموسے بس میں بیٹھے بیٹھے بھی پکڑا دیے جاتے تھے لیکن دکان پر کھڑے ہو کر گرم گرم چائے کے ساتھ ان سموسوں سے لطف اندوز ہونے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

اگرچہ میں اس سے پہلے بھی کئی بار ربوہ سے لاہور آتا جاتا رہا تھا لیکن ۱۹۶۵ء میں جب میں نے
پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو ہفتے دو ہفتے کے بعد ضرور یہ سفر کرنا پڑتا تھا۔ اُن دنوں اس سفر کا یک طرفہ کرایہ
تین روپے انیس پیسے تھا اور اس سے مراد تین روپے انیس پیسے ہی تھے۔ اگر کوئی مسافر دس کا نوٹ کنڈکٹر کو دیتا
تو وہ توقع رکھتا تھا کہ اسے چھ روپے اکاسی پیسے واپس ملیں گے۔ اس زمانے میں ایک ٹیڈی پیسے کی بھی اچھی
خاصی قوتِ خرید تھی اور میں نے اسی پس منظر میں بعض مسافروں کو ایک پیسے کے لیے کنڈکٹر سے باقاعدہ تُو تُو
میں میں کرتے دیکھا ہے۔

جہاں تک لاہور جانے والی یا وہاں سے واپس آنے والی ریل گاڑیوں کا تعلق ہے سوائے ماڑی انڈس
کے جو نصف شب کے قریب ربوہ سے گذرتی تھی کوئی گاڑی لاہور نہیں جاتی تھی۔ ماڑی انڈس بھی فیصل آباد سے
ہو کر جاتی جس کی وجہ سے یہ سفر طویل تر اور مزید پریشان کن ہو جاتا چنانچہ اہلِ ربوہ لاہور جانے کے لیے یہ گاڑی
بالعموم استعمال نہیں کرتے تھے۔ اس پس منظر میں جب انہیں یہ خوشخبری ملی کہ نارتھ ویسٹرن ریلوے سرگودھا اور
لاہور کے درمیان ایک تیز رفتار کار جو صبح سویرے اور شام ڈھلے یہاں سے گذرا کرے گی چلانے کے بارے میں
سوچ رہی ہے تو ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

یہ ریل کار اکتوبر ۱۹۶۰ء میں چلنا شروع ہوئی اور اہلِ ربوہ میں خوب مقبول ہوئی۔ شروع میں یہ ریل کار
دو ڈبوں پر مشتمل تھی، غالباً جاپان سے امپورٹ شدہ تھی اور اس وقت بالکل نئی تھی۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ان
گھسی پٹی بوگیوں کے مقابلے میں جن میں ہمیں اس سے پہلے عام طور پر سفر کرنا پڑتا تھا اس ریل کار کے گدے
انتہائی نرم و پُر آسائش تھے۔ اُن مسافروں کی سہولت کے لیے جنہیں بیٹھنے کے لیے نشست نہ مل پاتی چھت کے
ساتھ ایلومینیم کے درجنوں ہینڈل لٹکے ہوئے تھے جنہیں پکڑ کر کھڑے مسافر دورانِ سفر اپنا توازن بخوبی برقرار رکھ
سکتے تھے۔ یہ ریل کار ایئر کنڈیشنڈ تو نہ تھی لیکن اس میں نصب شدہ پنکھے اس قدر سبک رفتار اور بے آواز تھے کہ
ایئر کنڈیشنر کی کمی کا احساس نہ ہوتا۔ ہم نے قومی مزاج کے عین مطابق جلد ہی اس ریل کار کا حلیہ بگاڑ دیا چنانچہ
دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہینڈل اُتار لیے گئے، سیٹیں پھاڑ ڈالی گئیں، غسل خانے میں نصب شیشے غائب کر دیئے گئے
حتیٰ کہ دروازوں کے تالے بھی بدل ڈالے گئے۔

یاد رہے کہ یہ ریل کار ربوہ سے چک جھمرہ جاتی اور وہاں سے لائن بدل کر لاہور کی طرف مُڑتی۔ شروع
میں اس ریل کار کو بروقت منزلِ مقصود پر پہنچانے کے لیے باقی گاڑیوں کو روک لیا جاتا تھا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا
اس رُوٹ پر چلنے والی دیگر گاڑیوں کو تاخیر سے بچانے کے لیے اسے حیلے بہانوں سے مختلف سٹیشنوں پر روکا جانے
لگا جس سے اس کی افادیت دن بہ دن کم ہوتی گئی۔

ایک مرتبہ اس ریل کار کے روٹ کو جھنگ تک توسیع دے دی گئی یعنی یہ ریل کار براستہ ربوہ جھنگ سے
لاہور جانے لگی۔ اسی طرح کچھ عرصہ کے لیے اسے راولپنڈی تک توسیع بھی دی گئی مگر یہ دونوں تجربے کامیاب نہ
ہو پائے اور بالآخر اس کے لیے سرگودھا، لاہور کا روٹ ہی جاری رکھا گیا۔ آہستہ آہستہ یہ ریل کار شاید خراب ہو

رفتہ عام سے غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ریل ے بسوں نے لے لی۔ اب یہ گاڑی ''سرگودھا ایکسپریس'' کہلاتی ہے۔

گاڑیوں اور بسوں کا ذکر ہو ہی رہا ہے تو کیوں نہ یہ بھی بتاتا چلوں کہ ایک زمانے میں ربوہ میں لکی پٹرولیم سروس کے نام سے ایک پٹرول پمپ ہوا کرتا تھا۔ یہ پمپ چنیوٹ سرگودھا روڈ پر قبرستان کے بالمقابل موجودہ لاری اڈے اور پولیس چوکی کے تقریباً وسط میں واقع تھا اور یہاں کالٹیکس مصنوعات فروخت ہوتی تھیں۔ اُس زمانے میں پٹرول پمپوں پر جنرل سٹور، مسجد اور واش روم وغیرہ کی سہولتوں کا رواج تھا نہ رنگ برنگے برقی قمقموں سے انہیں سجایا جاتا تھا۔ یہ پٹرول پمپ بھی اس رواج سے کسی طور پر مستثنیٰ نہ تھا تاہم برلب سڑک واقع ملک کے دیگر پٹرول پمپوں کے برعکس یہ پمپ شروع سے ہی اُجڑا اُجڑا سا نظر آتا تھا۔

ابتدا میں یہاں انتظامیہ کے لیے ایک دفتر، ٹائر شاپ اور گاڑیوں کی مرمت کے لیے ایک برائے نام سی ورکشاپ ہوا کرتی تھی لیکن قرائن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کاروباری تجربہ ناکام رہے گا۔ میری رہائش اس پمپ سے زیادہ دور نہ تھی اور صبح و شام کی سیر کے دوران میں نے الا ماشاءاللہ کبھی کسی گاڑی کو یہاں سے پٹرول لیتے نہیں دیکھا تاہم جیسا کہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء کے الفضل میں اس کے ایک اشتہار سے مترشح ہوتا ہے مندی کے باوجود اُس وقت تک یہ پمپ چل رہا تھا۔ آج کے ماحول میں یہ اشتہار خاصا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ آپ بھی پڑھ لیجئے یہ اشتہار۔ لکھا ہے: ''یقین کیجئے کہ مشینری میں بھی جان ہوتی ہے۔ انسان کی طرح وہ بھی سانس لیتی ہے، پانی کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور خوراک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ خوراک کے معاملے میں وہ انسان سے بھی زیادہ نفاست پسند ہے اس لیے ہمارا ہمدردانہ مشورہ ہے کہ اس کی خوراک کے معاملہ میں پوری پوری احتیاط کریں۔ پٹرول، ڈیزل، موبل آئل یا کیروسین آئل خریدتے وقت کالٹیکس کا نشان ضرور ملاحظہ کریں کیوں کہ یہ نشان آپ کی مشینری کی صحت کا ضامن ہے۔''

اشتہار میں جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لیے اپنی کاروں پر آنے والے احباب کی اطلاع کے لیے یہ ذکر بھی موجود تھا کہ ''ربوہ میں کالٹیکس پٹرول پمپ دن رات آپ کی خدمت کے لیے کھلا رہے گا۔ آپ اپنی ضرورت یہیں سے پوری کریں اور مرکزی تجربات کی اعانت فرمائیں۔''

جہاں تک میرا اندازہ ہے اس کے جلد ہی بعد یہ پمپ بند ہو گیا اور سٹاف یہاں سے ہٹا لیا گیا البتہ پمپ کے سروس پوائنٹس اور سڑک کے اوپر کالٹیکس کا بڑا بورڈ کچھ عرصہ موجود رہا۔ ممکن ہے کوئی چوکیدار اس مشینری کی حفاظت پر مامور ہو لیکن پھر یہ چیزیں بھی غائب ہو گئیں۔ یقیناً زیرِ زمین ٹینک بھی نکال لیے گئے ہوں گے۔ اب صرف اینٹوں کا وہ فرش اور اس کے گرد چند فٹ اونچی وہ دیوار باقی رہ گئی تھی جو یہاں پر پٹرول پمپ کی موجودگی کی یاد دلایا کرتی تھی لیکن نہ معلوم کب یہ اینٹیں بھی اکھیڑ لی گئیں۔

مشہور تھا کہ یہ پٹرول پمپ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے صاحبزادے مرزا حفیظ احمد کی ملکیت ہے لیکن اس کی تصدیق کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ جب مجھے یہ کتاب لکھنے کی طرف توجہ ہوئی تو میں نے صاحبزادہ

مرزا حنیفہ احمد سے بات کرنے کی کوشش کی تاہم ان کی شدید علالت کے سبب ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ ہاں ان کے بیٹے ڈاکٹر مرزا لئیق احمد (ماہر امراض ناک، کان، گلا) نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے والد گرامی سے بات کر کے مجھے اس معاملے میں مکمل معلومات فراہم کریں گے۔

چند روز بعد انہوں نے مجھے فون پر بتایا "یہ پٹرول پمپ انہوں نے ہی ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں لگایا تھا لیکن چل نہ سکا۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ اُن دنوں ربوہ میں گاڑیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ خیال تھا کہ سڑک سے گذرنے والی گاڑیاں یہاں سے پٹرول اور ڈیزل لیا کریں گی لیکن غالباً ٹریفک لوڈ کا صحیح اندازہ لگانے میں غلطی ہو گئی۔ ممکن ہے بعض گاڑیوں کے مالکان کا متعصبانہ رویہ بھی انہیں یہاں ٹھہرنے سے روکتا ہو۔ قصہ مختصر یہ پمپ چل نہ سکا۔ یوں بھی اس کاروبار کو چلنے کے لیے جتنا وقت درکار تھا ابھی نہ گذرا تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف سے اسے خریدنے کی خواہش کا اظہار ہوا۔"

"تو گویا اپنی تنصیب کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ پٹرول پمپ حضور نے خرید لیا؟" میں نے ڈاکٹر لئیق سے پوچھا۔

"ابا سے میں نے خاص طور پر یہ سوال پوچھا تھا۔ ابا کو اب یاد نہیں کہ انہوں نے یہ پمپ حضور کو ہدیۃً پیش کر دیا تھا یا اس کی قیمت وصول کی تھی لیکن حقیقت یہی ہے کہ ابتدائی چند ماہ کے بعد ابا کا اس پمپ سے عملاً کوئی تعلق نہ رہا اور اس کا انتظام این ایم سنڈیکیٹ کے پاس چلا گیا لیکن سنڈیکیٹ اسے نفع بخش کاروباری یونٹ میں تبدیل نہ کر پایا اور یوں اس کا نام و نشان مٹ گیا۔"

اُس زمانے میں ربوہ کے بازار چھوٹے، دکانوں پر دستیاب ساز و سامان کی ورائٹی محدود اور قیمتیں چنیوٹ سے کچھ زیادہ تھیں لہٰذا ربوہ کے بعض لوگ مہینے بھر کے سودا سلف کی خریداری چنیوٹ سے کرنے کو ترجیح دیتے جہاں ریل، بس اور تانگے کے علاوہ بائیسکل پر بھی بہ آسانی پہنچا جا سکتا تھا۔ ایسے لوگ اپنی ضرورت کی تمام اشیاء جن میں چاول، چینی، دالیں، مرچ مصالحے شامل ہوتے وہیں سے خریدتے۔ بعض لوگ ہفتے کے ہفتے چنیوٹ جاتے اور گھر کی ضروریات کے لیے سبزی اور پھل منڈی سے خرید لاتے۔

گھروں میں شادی بیاہ کی کوئی تقریب آ جاتی تو کپڑا لتّا اور دیگر ضروری اشیاء کی خریداری بھی وہیں سے کی جاتی۔ ربوہ میں کپڑے کی پوری ورائٹی میسر تھی نہ ہی معیاری کا سامان یہاں سے ملتا لہٰذا کپڑوں، برتنوں اور آرائش کے سامان کی خریداری صرف چنیوٹ ہی سے ممکن تھی۔ دلہن کے سوٹوں پر زری اور سلما ستارے کا کام بھی چنیوٹ ہی سے کرایا جاتا اور زیور بھی ترجیحاً وہیں سے بنوایا جاتا۔ جماعت کی مخالفت تو ان دنوں بھی ہو گی لیکن لوگ بے دھڑک چنیوٹ چلے جایا کرتے تھے بلکہ حسب ضرورت تنہا عورتیں بھی کسی خطرے کے بغیر وہاں جا کر شاپنگ کر لیا کرتی تھیں۔ بعد میں حالات بدلے تو چنیوٹ جانے کی حوصلہ شکنی کی جانے لگی۔

۱۹ جنوری ۱۹۶۱ء کو آپا کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام اُس کے ننھیال نے بشریٰ اور ددھیال نے ثوبیہ تجویز کیا۔ نومولودہ خاندان میں پہلی بچی ہونے کے ناطے سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ ہم اُسے سارا دن اٹھائے

پھر دانے کھلانے چاہتے اور اس کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے۔ بشریٰ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا تحفہ عطا فرما دیا تھا جس سے خاندان کے بڑے چھوٹے سب ہی حتی المقدور لطف اندوز ہوتے تھے۔ ابا جی تو اپنی اس نواسی کے لیے ہر وقت دل و جان فدا کیے رکھتے تھے لیکن باقی بھی اس معاملہ میں پیچھے نہ تھے۔ بعد میں خدا تعالیٰ نے آپا کو ایک بیٹے زبیر احمد اور ایک بیٹی فوزیہ سے نوازا۔

صادقہ کے ہاں پہلے بیٹے کی ولادت اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ اس بچے کا نام اُسامہ اور اپنے والد بزرگوار کے نام کی نسبت سے تخلص اظہر رکھا گیا۔ بعد میں خدا تعالیٰ نے صادقہ کو تین اور بچوں سے نوازا جن کے نام علی الترتیب قدسیہ روحی، احمد الشافی اور عمران اظہر رکھے گئے۔

آپی کے ہاں پہلی بیٹی کی ولادت اباجی کی وفات کے معاً بعد اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ اُس کا نام مبارکہ ہما تجویز ہوا تاہم گھر میں وہ ہما کے نام سے ہی معروف ہوئی۔ بعد میں آپی کے ہاں تین اور بچیاں تولد ہوئیں جن کے نام ھلا، بشریٰ اور عالیہ رکھے گئے۔

یہ سارے بچے خدا کے فضل و کرم سے حیات ہیں اور صاحبِ اولاد بھی۔ اِن میں سے بشریٰ بعد میں ڈاکٹر بنیں اور اُسامہ اظہر آج کل دار الضیافت میں بطور معاون نائب ناظر ضیافت کام کر رہے ہیں۔

میں ستمبر ۱۹۴۹ء سے ستمبر ۱۹۶۵ء تک مسلسل سولہ سال ربوہ میں مقیم رہا اور اس سے اگلے پانچ سال میری ربوہ میں بکثرت آمد و رفت رہی۔ اس عرصے میں حضرت اماں جان، حضرت اماں جی، حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد، حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد، حضرت خلیفۃ المسیح الثانی، حضرت مسیح موعود کے بہت سے رفقا اور سلسلہ کے بعض جید علماء نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی لیکن پہلی وفات جس نے میرے ذہن پر انمٹ نقوش مرتسم کیے حضرت صاحبزادہ مرزا شریف کی تھی جو مختلف وجوہات کی بنا پر میرے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے اور میرے دل میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔

حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ حضرت مسیح موعود کی مبشر اولاد سے تھے جن کے متعلق حضور نے فرمایا ہے:

خدایا تیرے فضلوں کو کروں یاد
بشارت تو نے دی اور پھر یہ اولاد
کہا ہرگز نہیں ہوں گے یہ برباد
بڑھیں گے جیسے باغوں میں ہوں شمشاد
خبر مجھ کو یہ تو نے بارہا دی
فَسُبْحَانَ الَّذِیْ أَخْزَی الْاَعَادِیْ

میاں صاحب موصوف کے ساتھ ملاقات کا موقع تو کبھی نہیں ملا تھا تاہم میں نے آپ کو ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا تھا اور مجھے احساس بھی تھا کہ حضرت مسیح موعود کے فرزند ہونے کے ناطے آپ جماعت میں ایک انتہائی محترم

مقام رکھتے ہیں۔ میرا ان کے ساتھ چوہدری محمد علی مضطر والا معاملہ تھا جن کا شعر ہے:

نہ میں اس سے، نہ وہ مجھ سے ملا ہے
مگر دل ہے کہ اس کو جانتا ہے

ایسے میں جب میں نے ۱۹۶۱ء کے جلسہ سالانہ کے افتتاحی اجلاس میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی زبانی آپ کی وفات کی خبر سُنی تو اپنی نوعمری کے باوجود مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مجھے یاد ہے یہ المناک خبر سن کر پہلے تو مجمع پر سناٹا سا چھا گیا لیکن چند ہی لمحوں کے بعد اس میں سے دبی دبی سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اگرچہ احباب نے اس موقع پر مثالی صبر کا مظاہرہ کیا لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ جلسہ گاہ میں ایک سے دوسرے سرے تک رنج والم اور حزن وملال کی لہر دوڑ گئی ہے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد حضرت مسیح موعود کی وہ مبارک اولاد تھے جو اللہ تعالیٰ کی خاص بشارت کے تحت حضرت اماں جان کے بطن سے پیدا ہوئی۔ حضرت مسیح موعود نے اپنی کتاب ''انوارُالاسلام'' مطبوعہ ۱۸۹۵ء میں ایک خدائی بشارت کا ذکر کرتے ہوئے رقم فرمایا تھا: ''اللہ جل شانہٗ نے بشارت دی اور فرمایا کہ اِنَّـا نُبَشِّـرُكَ بِـغُلَام یعنی ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں'' چنانچہ جب یہ بشارت پوری ہوئی تو حضور نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی کتاب ''ضیاء الحق'' میں فرمایا: ''ہمیں خدا تعالیٰ نے ...... بشارت دی تھی کہ تجھے ایک لڑکا دیا جائے گا جیسا کہ ہم اُسی رسالہ انوار الاسلام میں اِس بشارت کو شائع بھی کر چکے ہیں۔ سو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْمِنَّۃ کہ اِس الہام کے مطابق ۲۷ ذی قعد ۱۳۱۲ھ میں مطابق ۲۴ مئی ۱۸۹۵ء میرے گھر میں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شریف احمد رکھا گیا۔''

روزنامہ الفضل مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۶۱ء کے ضمیمہ کے مطابق: ''حضرت مرزا شریف احمد صاحب بچپن سے ہی بہت نیک، متقی، فیاض اور رحمدل واقع ہوئے تھے چنانچہ جب قادیان میں آپ کا کارخانہ معقول منافع دینے لگا تو آپ بڑی کثرت کے ساتھ غرباء کی مدد فرماتے رہے حتّٰی کہ بعض ضرورت مندوں کو خود ہی ان کی ضرورت کا احساس کر کے خطیر رقوم بھی عطا فرما دیتے تھے۔ بہت فراخدل اور طبیعت کا شاہانہ رنگ رکھنے والے بزرگ تھے۔ دینی علوم آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل سے حاصل کئے اور بالخصوص بخاری شریف تو آپ نے درساً درساً مکمل کی چنانچہ چندسال پیشتر علالتِ طبع کے باوجود آپ کچھ عرصہ تک ربوہ کی بیت مبارک میں نمازِ فجر کے بعد بخاری شریف کا درس بھی دیتے رہے۔ سلسلہ کی نمائندگی کرتے ہوئے احمدیہ ٹیری ٹوریئل فورس کو کمانڈ کیا اور وہاں بہت اچھا نظم وضبط برقرار رکھا نیز سالہاسال سلسلہ کی مختلف نظارتوں میں بطور ناظر اہم دینی خدمات بجالا کر خدمتِ سلسلہ کا شاندار نمونہ قائم کیا۔ آپ کی رائے بہت صائب ہوتی تھی اور طبیعت میں ...... توازن پایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں آپ نے قیامِ پاکستان کے بعد بحیثیت ناظر اصلاح وارشاد کئی سال تک جلسہ سالانہ کے انعقاد کا بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے انتظام فرمایا اور ''ذکرِ حبیب'' کے موضوع پر کئی تقاریر بھی فرمائیں۔

حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد ایک لمبے عرصہ سے اعصابی تکلیف اور نقرس وغیرہ کی وجہ سے بیمار چلے

آتے رہے مگر صبر و شکر کے ساتھ بیماری کی تکالیف کو برداشت کرتے رہے اور بیماری کے باوجود سلسلہ کی خدمت بجا لاتے رہے۔ بعض اوقات بیماری کا اتنا غلبہ ہوجاتا کہ بظاہر معلوم ہوتا کہ شاید آپ چند دن بھی زندہ نہ رہ سکیں گے مگر اس لمبے عرصہ میں بار بار آپ کے متعلق حضرت مسیح موعود کا الہام عَمَّرَہُ اللّٰہُ عَلٰی خِلَافِ التَّوَقُّعِ کے پورا ہونے کا نظارہ دیکھنے میں آیا۔"

موصوف کی وفات کئی لحاظ سے لائق صد افسوس تھی۔ عبدالمنان ناہید کے الفاظ میں:

اِس حادثے نے چھیڑ دیا سازِ دَرد کو
اے "نسلِ سیّدہ" ترے پیاروں کی خیر ہو
اِک مملکت کی جس سے مقدّر تھی ابتدا
"وہ بادشاہ آیا" اور آکر چلا گیا
یاد آ رہی ہے اُس کی غریبانہ زندگی
اُس دل کے بادشہ کی فقیرانہ زندگی
"اصغر شریف" باپ کی خُوبُو پہ ہُوبہُو
تعبیرِ یَتَزَوَّجُ وَ یُوْلَدُ لَہٗ
وہ جسم جس سے موت نے چھینی ہے زندگی
پیکر سپاہیانہ شجاعت کا تھا کبھی
غمہائے ہجر لے کے دلِ پُرشکوہ میں
ربوہ میں آکے سوگیا دامانِ کوہ میں

حضرت مرزا شریف احمد کی نماز جنازہ بہشتی مقبرہ کے اندر ادا کی گئی جس میں راقم بھی شامل ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا جنازہ نہ دیکھا تھا اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے یہ جنازہ ہمیشہ یاد رہا۔

ربوہ کی تاریخ کے حوالے سے ایک اہم (اور غالباً منفرد نوعیت کا) واقعہ قبر کشائی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہوا دراصل یوں کہ عبدالقادر ایس ڈی او منگلہ کی جواں سال صاحبزادی، مسلمہ جو کچھ روز پہلے آگ سے جھلس جانے کے باعث تشویشناک طور پر بیمار ہوگئی تھیں مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۶۳ء کو وفات پاگئیں۔ اُن کی تدفین ربوہ میں ہوئی۔ یہ منگلہ کے کسی سکول کی طالبہ تھی۔ شنید ہے کہ کسی بدخواہ نے جان بوجھ کر ایسی صورت حال پیدا کردی جس سے ان کے لباس نے آگ پکڑلی اور وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ تدفین کے چند روز بعد اس حادثہ کی تفتیش کے حوالے سے قبر کشائی ہوئی۔ اس موقع پر راقم سمیت چند لوگ ازراہِ تجسّس وہاں جمع ہوگئے تھے تاہم پولیس نے انہیں دور ہی رکھا اور تمام ضروری کارروائی ایک چارپائی کی اوٹ میں ہوتی رہی۔

۲ ستمبر ۱۹۶۳ء کو قمر الانبیاء حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی وفات ربوہ کی تاریخ کے حوالے سے ایک اہم واقعہ کے طور پر یاد رکھے جانے کے لائق ہے۔

حضرت میاں صاحب اپنی وفات سے قریباً دو سال پہلے تک انجمن کوارٹرز میں مقیم تھے۔ آپ کا کوارٹر ہمارے کوارٹر سے زیادہ دُور نہ تھا لہٰذا دن میں ایک دو دفعہ ضرور آپ کی زیارت ہو جاتی۔ دراصل آپ پنجوقتہ نمازیں اور نمازِ جمعہ بیت مبارک میں ادا کیا کرتے تھے جہاں میں بھی بالعموم موجود ہوتا۔ آپ گھر سے پیدل نکلتے۔ آپ کے پیچھے آپ کے خادم بشیر احمد سیالکوٹی ہوتے جنہوں نے اپنی بغل میں آپ کا جائے نماز داب رکھا ہوتا اور ہاتھ میں عصا پکڑا ہوتا تھا۔ میاں صاحب ان نمازیوں میں سے نہ تھے جو پہلے سے موجود نمازیوں کو پھلانگتے ہوئے اگلی صف میں جا بیٹھتے ہیں بلکہ میرے مشاہدے کے مطابق وہ بالعموم پچھلی صفوں میں بیٹھنے کو ترجیح دیتے۔ بیت مبارک میں آپ کا جائے نماز تیسری یا چوتھی صف میں بچھایا جاتا۔ میاں صاحب اس پر تشریف رکھتے اور جب تک نماز شروع نہ ہوتی بشیر احمد سیالکوٹی آپ کے پیچھے ڈنڈا لے کر اپنی ڈیوٹی پر مستعد کھڑے رہتے۔ نماز جمعہ کے لیے سردی گرمی کی تخصیص کے بغیر میاں صاحب کا جائے نماز صحن میں پیچھے سے دوسری یا تیسری صف میں بچھایا جاتا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے بعد آپ کی شخصیت جماعت میں سب سے محترم جانی جاتی تھی۔ آپ نے علمی ذوق پایا تھا۔ آپ نے متعدد اعلیٰ پایہ کی تحقیقی کتب کے علاوہ الفضل میں بلند پایہ مضامین کا ایک نادر خزانہ اپنی یادگار چھوڑا۔ ربوہ میں آپ کے قیامِ کا زیادہ عرصہ بطور ناظر خدمتِ درویشان گذرا اور اس حوالے سے آپ کی سب سے بڑی ذمہ داری درویشانِ قادیان کے مسائل کا حل اور قادیان کے جلسہ سالانہ کے لیے پاکستان سے زائرین کے وفد کی تشکیل ہوتی تھی۔ دوست آپ سے دعا کے لیے درخواست کرتے رہتے اور اپنے معاملات میں آپ سے رہنمائی کے طلب گار رہتے۔ میاں صاحب یہ تمام ذمہ داریاں انتہائی خوش دلی سے سرانجام دیتے۔

اب آپ سے کیا پردہ، ہمارے ایک رشتہ دار نماز کے عادی نہ تھے۔ ان کی اہلیہ اس بات پر بے حد رنجیدہ رہتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کو خط لکھ کر اصلاحِ احوال کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپ کی طرف سے اس خط کا جو جواب موصول ہوا افادۂ احباب کے لیے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ خط جو آپ نے صدر نگران بورڈ کی حیثیت میں تیئس اکتوبر ۱۹۶۲ء کو لکھا تھا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ کا اخلاص اور جذبۂ نیکی بہت قابلِ قدر ہے۔ مجھے آپ کا خط پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بات یاد آ گئی کہ وہ میاں بیوی کتنے خوش قسمت ہیں کہ اگر بیوی کسی عملِ صالحہ کے معاملہ میں سُستی کرتی ہے تو خاوند اسے ہوشیار کر کے اس کی اصلاح کر دیتا ہے اور اگر خاوند کوئی سُستی کرتا ہے تو بیوی اس کی اصلاح کا خیال رکھتی ہے۔ آپ کو کم از کم آدھی جنت تو حاصل ہو گئی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے خاوند میں نیکی کے جذبات پیدا کرے اور امرِ صالح کی توفیق دے۔ نماز ایک بڑا اچھا مبارک عمل ہے جس کے ذریعہ بندے اور خدا کے درمیان رابطہ قائم ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن پہلا سوال و جواب نماز کے متعلق ہی ہوگا۔ پس آپ محبت کے رنگ میں اور ادب کے ساتھ (یہ

دونوں [illegible] ضروری ہیں) اپنے خاوند کو نصیحت کرتی رہیں اور ان کے سامنے نماز پڑھا کریں اور تلاوت قرآن بھی کیا کریں تا کہ اس ذریعہ سے بھی آپ کے خاوند کو تحریک پیدا ہو مگر کبھی ایسے رنگ میں بات نہ کریں جس سے چڑ پیدا ہو کیونکہ اس کے نتیجے میں بعض اوقات ضد پیدا ہو جاتی ہے اور ضد کی وجہ سے انسان اور بھی دُور ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کے خاوند کی اصلاح کا ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا ہے۔ خدا کرے وہ بھی نتیجہ خیز ثابت ہو مگر آپ اصل زور دعا پر دیں۔ یہ بڑا قیمتی جوہر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔"

آپ بعض جنازے بھی پڑھاتے اور چیدہ چیدہ وفات یافتہ بزرگوں کی تدفین پر دعا بھی کراتے۔ اسی پر بس نہیں، حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی بیماری کے دوران جب مجلس مشاورت کے ایک فیصلے کے تحت نگران بورڈ تشکیل پایا تو آپ اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

میاں صاحب کی شخصیت میں ایک خاص سحر تھا جو ہر واقف و ناواقف کو اپنی طرف کھینچتا چنانچہ چھوٹے بچے اور جوان بھی ان سے ملاقات میں دلی راحت محسوس کرتے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں آپ ہر آڑے وقت میں میاں صاحب کے پاس حاضر ہو کر رہنمائی حاصل کرتیں اور مجھے بھی کم از کم دوبار آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنا یاد ہے۔ پہلا موقع میٹرک کے امتحان کے موقع پر دعا کی درخواست کا تھا جب کہ دوسری ملاقات گیارہویں جماعت کے بورڈ کے امتحان سے پہلے ہوئی۔ دونوں مواقع پر میاں صاحب نے کمال محبت سے میری معروضات سنیں اور دعا کا وعدہ کیا۔ شاید یہ اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نہ صرف میٹرک میں بلکہ بعد کے امتحانات میں بھی بالعموم نمایاں کامیابی سے نوازا۔ وہ چھوٹوں سے کس شفقت سے پیش آتے، اس کا کچھ اندازہ ان کی وفات پر الفضل میں شائع ہونے والے نعیم الرحمٰن درد ابن مولانا عبدالرحیم درد کے ایک مضمون سے بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس مضمون میں میاں صاحب کی مہربانیوں کے بعض دلچسپ واقعات بیان کئے ہیں۔

میاں صاحب کا ایک مضمون جو جماعت کی طرف سے کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہوتا رہا ہے "امتحان پاس کرنے کے گر" کے عنوان سے ہے۔ میرے زمانہ طالب علمی میں اس مضمون کا بہت چرچا تھا اور الفضل کے ذریعہ بھی طلبہ کی توجہ اس کے مطالعہ کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی۔ اس مضمون میں امتحان دینے والے طلبہ کے لیے بہت سے کارآمد مشورے دیئے گئے تھے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے میں نے بعد ان ہدایات پر عمل کی کوشش کی لیکن ایک ہدایت جسے میں نے اپنے لیے بے حد مفید پایا پرچہ شروع کرنے سے پہلے دعا سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ بچپن کی تربیت کے زیر اثر امتحانات کے دوران ویسے ہی یہ خیال غالب رہتا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کامیابی کا حصول ناممکنات میں سے ہے اور دھیان بار بار اس کی رحمت کی طرف جاتا مگر میں نے یہ عادت بنالی تھی کہ کمرہ امتحان میں پرچے کی تقسیم کے بعد اسے فوراً پڑھنے کی بجائے میز پر الٹا رکھ کر [illegible] دعا ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ یہ مرحلہ آسان فرما دے۔ اللہ تعالیٰ اضطراب کی اس کیفیت میں مانگی ہوئی دعا کو [illegible] قبول کر لیتے [illegible]۔ وہ سوالات کی صحیح تفہیم بھی عطا فرما دیتا اور امتحان کے دوران غیر معمولی

طور پر امتحان کے بعد پرچہ دیکھتا چلا جاتا۔ رہی سہی کسر پرچے کی نظر ثانی (جسے ہم اس زمانے میں دہرائی کہتے ہے) کے دوران پوری ہو جاتی چنانچہ بعض اہم نکات جو کسی وجہ سے سوالات حل کرتے وقت ذہن سے نکل گئے ہوتے تھے اس وقت یاد آ جاتے۔

حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے کامیابی کا ایک گر یہ بھی بتایا تھا کہ کسی بھی صورت میں امتحان کا وقت ختم ہونے سے پہلے کمرۂ امتحان نہ چھوڑا جائے اور بھلے ایک بھی سوال کا جواب نہ آتا ہو، تمام وقت وہیں گذارا جائے۔ میں نے اس اصول کو بھی ہمیشہ حرزِ جان بنائے رکھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ہمارے بعض ساتھی جو کسی وجہ سے پرچہ امتحان کو اپنے لیے مشکل پاتے دل چھوڑ کر بیٹھ جاتے۔ وہ پرچے پر توجہ دینے کی بجائے سارا وقت ہاف ٹائم کے انتظار میں گذار دیتے۔ جوں ہی آدھا وقت ختم ہونے کا اعلان ہوتا وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور اپنا پرچہ سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر کے چلے جاتے۔ ان طلبہ کا نتیجہ کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس ہم ایسے طلبہ جو آخری وقت تک ہال میں بیٹھے رہتے اور کچھ نہیں تو اپنے لکھے ہوئے پر نظرِ ثانی کرتے رہتے زیادہ بہتر نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ میرے نزدیک ایسے طلبہ کے قدرے بہتر نتائج کا ایک سبب میاں صاحب کے زریں مشوروں پر عمل تھا اور یہ آپ کا مجھ پر ذاتی طور پر بھی ایک ایسا احسان ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میاں صاحب نے اباجی کی درخواست پر میری سب سے بڑی ہمشیرہ، عزیزہ مسرت کے رخصتانہ کی تقریب میں بطور خاص شمولیت اختیار فرمائی اور انہیں اپنی دلی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ یہ تقریب ۱۴ نومبر ۱۹۵۹ء کو ہمارے پڑوسی پروفیسر مسعود احمد عاطف کے کوارٹر کے صحن میں ہوئی تھی جس میں حضرت مسیح موعود کے بہت سے رفقاء اور سلسلہ کے دیگر بزرگان بھی شامل ہوئے تھے۔

آپ کی زندگی کے آخری برسوں میں آپ کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی۔ اب آپ گھر سے کم نکلتے تھے مگر اس کے باوجود آپ بعض جنازے پڑھایا کرتے۔ میرے بہنوئی قریشی سعید احمد اظہر کے والدِ بزرگوار ماسٹر محمد علی اظہر (جو حضرت مسیح موعود کے رفیق تھے اور جنہیں ایک طویل عرصہ تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں بطور استاد پڑھانے کا موقع بھی ملا تھا) نے یکم نومبر ۱۹۶۲ء کو وفات پائی تو ان کا جنازہ میاں صاحب نے ہی پڑھایا اور اسے کندھا بھی دیا۔ یہ جنازہ البشریٰ کے سامنے تقریباً اس جگہ ہوا تھا جہاں آج کل مرزا خورشید احمد اور مرزا غلام احمد کے مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔

جون ۱۹۶۳ء میں آپ کی تکلیف بہت بڑھ گئی چنانچہ آپ کو لاہور لے جایا گیا جہاں آپ نے ۲ ستمبر ۱۹۶۳ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اُن دنوں بہشتی مقبرہ کا معتد بہ حصہ خالی پڑا تھا چنانچہ جنازہ چار دیواری کے اندر پڑھا گیا۔ جنازہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے پڑھایا تھا۔ اس موقع پر چار کی بجائے پانچ تکبیریں کہی گئیں۔ میں نے اپنی کم علمی کی بناء پر اس وقت اسے غلطی سمجھا لیکن بعد میں مجھے کسی نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے نماز جنازہ میں چار کی بجائے پانچ تکبیریں کہنا بھی ثابت ہیں۔ آپ کی تدفین بہشتی مقبرہ کی اندرونی چار دیواری

میں ہوئی جہاں صرف گنے چنے مخصوص احباب کو واعلے کی اجازت تھی چنانچہ عوام الناس کی اکثریت کے ساتھ میں باہر تدفین مکمل ہونے کا انتظار کرتا رہا اور دعا کے بعد بوجھل دل کے ساتھ گھر واپس لوٹا۔

حضرت حافظ سید مختار شاہجہان پوری نے شاید میرے ہی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا:

فدائے دیں ، قمر الانبیاء نے پائی وفات
جہانِ عشق میں جن کا وقار باقی ہے
وہ چل دیئے جنہیں تھا درد خستہ حالوں کا
یہ دل فگار ، یہ غم کا شکار باقی ہے
نگاہیں ڈھونڈ رہی ہیں وہ شہسوار کہاں
غبار ہے کہ پسِ راہوار باقی ہے
یہ درد جس نے دیا ہے وہی دوا دے گا
یہی یقین، یہی انتظار باقی ہے

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے بعد ایک اور شخصیت جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں میجر جنرل نذیر احمد کی ہے۔ سچ پوچھیں تو میں نے انہیں کبھی دیکھا تک نہ تھا لیکن میں اتنا جانتا تھا کہ وہ احمدی اور پاکستان کے سینئر ترین جرنیلوں میں سے ہیں۔ اس وقت میں خود طالب علم تھا اور میرے خاندان یا حلقہ احباب میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس مرتبے تک پہنچا ہو لہٰذا میں انہیں نہ جانتے ہوئے بھی ان کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۶۴ء کی ایک دوپہر جب میں نے نماز ظہر کے لیے بیت یادگار میں جمع ہونے والے دوستوں میں سے کسی کی زبانی ان کی وفات کی خبر سُنی تو مجھے بے حد افسوس ہوا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ ان کی نماز جنازہ میں ضرور شریک ہوں گا جو اسی روز عصر کی نماز کے بعد بیت مبارک میں ادا کی جانا تھی۔

مجھے یاد ہے رمضان کے ایام تھے اور اس روز قاضی محمد نذیر لائلپوری درس دے رہے تھے لیکن نمازِ جنازہ مولانا جلال الدین شمس نے پڑھائی تھی۔ درس کے لیے جمع ہونے والے اکثر احباب نمازِ جنازہ میں شامل ہوئے۔ اس زمانے میں سیکیورٹی کے حالات اس قدر مخدوش نہ تھے اور اہل ربوہ بھی اس قدر مصروف نہ ہوتے تھے جتنے اب ہو چکے ہیں چنانچہ نمازِ جنازہ میں شامل اکثر لوگ میت کی تدفین تک قبرستان میں موجود رہے۔

روزنامہ الفضل (۲۳ جنوری ۱۹۶۴ء) نے اُن کی وفات کی خبر ان الفاظ میں شائع کی: ''ربوہ: ۲۲ جنوری۔ لاہور کارپوریشن کے سابق چیئرمین، میجر جنرل نذیر احمد مرحوم جنہوں نے مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۴ء مطابق ۴ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ بروز دوشنبہ لاہور میں وفات پائی تھی ان کا جنازہ کل مورخہ ۲۱ جنوری مطابق ۵ رمضان المبارک کو لاہور سے ربوہ لایا گیا۔ جنازہ نماز عصر سے قبل اُس وقت ربوہ پہنچا کہ جب لوگ بیت مبارک میں بیٹھے قرآن کریم کا درس سن رہے تھے۔ درس محترم مولانا قاضی محمد نذیر صاحب فاضل لائلپوری دے رہے تھے۔ درس کے بعد نماز عصر ادا کی گئی جس کے بعد احاطہ بیت مبارک میں محترم مولانا جلال الدین صاحب شمس،

ناظر اصلاح و ارشاد نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں خاندان حضرت مسیح موعود کے افراد اور اہل ربوہ بھی کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ بعدہٗ جنازہ قبرستان لے جا کر میجر جنرل نذیر احمد مرحوم کا جسد خاکی سپردِ خاک کیا گیا۔ قبر تیار ہونے پر محترم مولانا جلال الدین صاحب شمس نے دعا کرائی۔

احبابِ جماعت دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامِ قرب سے نوازے نیز جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرتے ہوئے دین و دنیا میں ان کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین

نوائے وقت مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۴ء کی اطلاع مظہر ہے کہ ''لاہور کارپوریشن کے سابق چیئرمین میجر جنرل نذیر احمد کی نعش کو تجہیز و تکفین کے لیے ربوہ پہنچانے سے قبل گلبرگ میں ان کی رہائش گاہ پر نمازِ جنازہ ادا کی گئی جس میں لاہور کارپوریشن کے عملے اور دوسرے معززین شہر کے علاوہ اعلیٰ سول و فوجی حکام نے بھی شرکت کی۔

......لاہور کارپوریشن نے نماز جنازہ میں شرکت کے لیے عملے کو دس بجے سے بارہ بجے تک چھٹی دی۔

۲۱ جنوری منگل کو یہاں لاہور میونسپل کارپوریشن ایمپلائز فیڈریشن کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں کارپوریشن کے سابق چیئرمین میجر جنرل نذیر احمد کی وفات پر گہرے رنج و غم اور مرحوم کے پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اجلاس کی صدارت مسٹر محمد اسلم باجوہ، چیئرمین لاہور میونسپل کارپوریشن نے کی۔ اجلاس کے اختتام پر مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔''

جنرل نذیر دوالمیال کے رہنے والے تھے۔ ''ضلع چکوال تاریخِ احمدیت'' کے مصنف ملک ریاض احمد کی زبانی روایت کے مطابق جو انہوں نے میرے ایک سوال کے جواب میں بیان کی جب ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہرڈ ڈ دوالمیال آئے تو یہاں کے سابقہ فوجی بھی استقبالیہ لائن میں کھڑے تھے۔ ان سابقہ فوجیوں میں ایک احمدی، صوبیدار فتح محمد بھی شامل تھے۔ جب وائسرائے نے ان سے ہاتھ ملایا تو انہوں نے اپنے بیٹے نذیر احمد (جنہوں نے ان ہی دنوں مشن ہائی سکول وزیر آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا) کو فوج میں کمیشن دینے کی درخواست کی۔ لارڈ ہرڈ ڈ نے ان کی یہ درخواست ہمدردی سے سنی اور نذیر احمد کے انٹرویو کے بعد انہیں وائسرائے کمیشن دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد نذیر احمد کو ملنے والا وائسرائے کمیشن کنگ کمیشن میں تبدیل کر دیا گیا اور یوں اُن کے لیے ترقی کے راستے کھلتے گئے۔ جنرل نذیر چوہدری شمشاد علی کے داماد اور چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے ہم زُلف تھے۔

جب چوہدری محمد ظفر اللہ خان کا تقرر چین میں ایجنٹ جنرل کے طور پر ہوا اور وہ کچھ عرصے کے لیے چنگ کنگ تشریف لے گئے تو جنرل نذیر جو اُن دنوں فوج میں میجر تھے ان کے ملٹری سیکرٹری کے طور پر ساتھ گئے۔

قیامِ پاکستان کے وقت موصوف بریگیڈیئر تھے اور ان کی تقرری جہلم میں تھی تاہم وہ جنوری ۱۹۴۸ء میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر پشاور میں ڈو کمانڈر تعینات ہو گئے۔

''ضلع چکوال تاریخ احمدیت'' کے مطابق پاکستان بننے کے بعد شاہ ایران پہلی بار پاکستان کے دورہ پر آئے اور وہ نوابزادہ لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کے ہمراہ پشاور پہنچے تو ان کا استقبال کرنے والی [illegible]

شخصیات میں جنرل نذیر بھی شامل تھے۔ اسی طرح ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے ان کی رجمنٹ کا معاینہ کیا۔ محکمہ ڈاک نے اس حوالے سے ۲۰۰۱ء میں ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا جس میں جنرل نذیر نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں جنرل نذیر پاک فوج کے بعض دیگر افسران اور مشہور شاعر، فیض احمد فیض سمیت کچھ دانشوروں کے ہمراہ حکومت کے خلاف ایک سازش کے الزام میں دھر لیے گئے جو تاریخ میں ''راولپنڈی سازش کیس'' کے نام سے معروف ہے۔ ایک خاتون سمیت کُل پندرہ افراد تھے جن پر باقاعدہ مقدمہ چلا۔ خاتون تو بری کر دی گئیں لیکن باقی سب ملزموں کو مختلف میعاد کی قید اور جرمانے کی سزائیں ہوئیں۔ میجر جنرل نذیر احمد واحد افسر تھے جنہیں سب سے کم یعنی تا برخواست عدالت قید اور ملازمت سے برطرفی کی سزا سنائی گئی۔

بعد میں راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان میں سے ایک کتاب ظفر اللہ پوشنی کے قلم سے ''زندگی زِنداں دلی کا نام ہے'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب اس کیس کے ملزموں کے ایامِ اسیری کی داستان ہے اور اس میں جنرل نذیر کا بھی کچھ ذکر موجود ہے۔

ملاحظہ فرمائیے مصنف کا بیان کردہ یہ واقعہ جو مرحوم کی بہت سی خوبیوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے:

''شام کا وقت تھا۔ جنرل اکبر، اسحاق، حسن اور میں ڈیک ٹینس کھیل رہے تھے۔ اس کھیل میں ہم سب اتنی مہارت حاصل کر چکے تھے کہ ایک ایک گیم آدھ پون گھنٹے لگاتار چلتا رہتا تھا۔ ایک روز کی بات ہے نہایت معمولی سی بات پر میرے اور حسن کے درمیان تکرار ہو گئی۔ یہی کھیل میں آؤٹ اور اِن کا جھگڑا تھا۔ حسن کا دعویٰ تھا کہ پوشنی نے آؤٹ پھینکا ہے اور مجھے اصرار تھا کہ بالکل اِن ہے۔ پہلے تو یونہی معمولی سی تکرار ہوئی لیکن رفتہ رفتہ آوازیں بلند ہوتی گئیں یہاں تک کہ حسن نے کہا: ''تم جھوٹے ہو۔''

میں نے بپھر کے کہا: ''تم بکواس کرتے ہو۔''

''میں تمہارے جیسے بے ایمانوں کے ساتھ نہیں کھیلوں گا'' یہ کہہ کر حسن کورٹ سے باہر چلا گیا۔

''نہیں کھیلتے تو جہنم میں جاؤ۔''

''میں کہتا ہوں تم چپ کرو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

''ارے، جاؤ جاؤ۔ تمہارے جیسے کئی دیکھے ہیں۔''

''بائی گاڈ آئی وِل کِل یُو''

حسن خان مٹھی بھینچ کر میری طرف تیزی سے لپکا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور بھویں سمٹ کر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ اکبر خان، بیگم نسیم اور سجاد ظہیر پاس ہی کرسیوں پر بیٹھے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بیچ بچاؤ کی کوشش نہیں کی۔ سجاد ظہیر مزے سے سگریٹ پیتے رہے اور اکبر خان نے دفعتاً اپنے ہاتھ کے ناخنوں کا معاینہ شروع کر دیا البتہ اسحاق فوراً ہماری طرف لپکے لیکن قبل اس کے کہ وہ قریب پہنچتے مکے بازی شروع ہو چکی تھی۔ حسن کا بھاری بھر کم مکا ہتھوڑے کی طرح میری چھاتی پر پڑا اور میرا گھونسا اس کے رُخسار پر

آنکھ کے نیچے جا کر لگا لیکن ابھی دو تین وار ہی ہوئے تھے کہ اسحاق ہمارے بیچ آ گئے۔ انہوں نے زور سے مجھے ایک طرف کو دھکیل دیا اور حسن کو پکڑ کر دوسری طرف لے گئے۔ اتنے میں فیض جو ذرا دُور بیٹھے تھے قدم اُٹھاتے ہوئے ہمارے قریب آ پہنچے۔ وہ مجھے کھینچ کر گراؤنڈ کی دوسری طرف لے گئے۔

جنرل نذیر نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ انہوں نے آواز دی: ''ٹھنڈا پانی پلاؤ ان بے وقوفوں کو!''

دس پندرہ منٹ بعد میرا غصہ بالکل جاتا رہا اور حسن کے مزاج کا پارا بھی کچھ نیچے آ گیا۔ جنرل نذیر نے نماز سے فارغ ہو کر حسن کو اور مجھے اپنے پاس بلایا۔ ہم دونوں کو بزرگانہ نصیحت کی اور ہمارے درمیان صلح کرا دی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور بغلگیر ہو کر معافی مانگی۔''

اور اب ایک اور واقعہ:

''۱۹۵۱ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔ رات کے وقت ہم سب بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے کہ فیض نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی۔ انھوں نے کہا: اس کے بجائے کہ میں ہی تنہا شعر لکھوں اور سب دوستوں کو اپنا کلام سناتا رہوں کیوں نہ ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی جائے تاکہ میں بھی غزل لکھوں اور دیگر اصحاب بھی طرح کے مصرع پر طبع آزمائی کریں۔ پہلے تو کچھ ساتھیوں نے اس بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا لیکن غور کرنے پر تجویز معقول نظر آئی چنانچہ فیصلہ یہ کیا گیا کہ مصرع طرح چن لیا جائے اور ظفر اللہ پوشنی کو سیکرٹری مقرر کیا جائے اور یہ اس کی ذمہ داری ہو کہ بزمِ مشاعرہ کے انعقاد کا موزوں بندوبست کرے......

حیدر آباد سنٹرل جیل کے دورانِ قیام ہم نے کم از کم دس گیارہ بار مشاعرے کی محفلیں برپا کیں......

جس مشاعرے کا میں پہلے ذکر کروں گا وہ انیس اگست ۱۹۵۲ء کو جنرل نذیر احمد کی صدارت میں بی کلاس وارڈ کے صحن میں ہوا۔ نذیر صاحب جب تک ہمارے ساتھ رہے مستقل طور پر مشاعروں کی صدارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم نے ان کو مستقل مشاعرہ پریذیڈنٹ مقرر کر دیا تھا......

اُنیس اگست ۱۹۵۲ء کے مشاعرے کے لیے طرح کے دو مصرعے چُنے گئے تھے۔ اس مشاعرے میں چھ شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ پانچ نے طرحی غزلیں پڑھیں اور ایک ''بائیں بازو کے کج رو'' یعنی محمد حسین عطا نے غیر طرحی نظم سنانے پر اصرار کیا۔ پوچھا گیا کہ ''طرح پر غزل کیوں نہیں لکھی، مسٹر؟'' تو جواب دیا کہ ''ہماری طبیعت جس طرف چل نکلے اسی کے مطابق شعر کہتے ہیں۔'' واضح ہو کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ ان کی پہلی اور آخری کوشش تھی!......

سب لوگ جب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو جنرل نذیر احمد نے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر جمائی۔ اچٹتی ہوئی ایک نگاہ حاضرینِ محفل پر ڈالی اور کھانس کر گلا صاف کیا۔ میں نے بطور سیکرٹری شعراء کے ناموں کی فہرست ان کے سامنے پیش کر دی اور فہرست پر نشان لگا دیئے کہ آج کون کون سے افراد غزل لکھ کر لائے ہیں اور کون سے یوں ہی خالی ہاتھ چلے آئے ہیں لیکن جنرل صاحب نے پہلے ان تمام حضرات کے نام پکارے جن کے ناموں کے آگے نشان نہ تھے یعنی وہ لوگ جو کچھ لکھ کر نہیں لائے تھے۔ ان دوستوں نے باری باری صاحب صدر

سے معذرت طلب کی اور جنرل نذیر نے ایک ایک کو اس لاپروائی پر ڈانٹا اور ان کے غیر ذمہ دارانہ رویے کی سخت مذمت کی۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ صاحبِ صدر خود بھی کچھ لکھ کر نہیں لائے تو محفل قہقہوں سے گونج اٹھی!''

فیض نے اپنی یہ مشہور غزل پہلی بار اسی مشاعرے میں پڑھی تھی:

دوستو اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام
دِلبری ٹھہرا زبانِ خلق کُھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
اِن دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
محتسب کی خیر اونچا ہے اُسی کے فیض سے
رِند کا ، ساقی کا ، مے کا ، خُم کا ، پیمانے کا نام
ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام
فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام''

راولپنڈی سازش کیس نے جنرل نذیر کا فوجی کیریئر تو ختم کر دیا مگر ۱۹۶۱ء میں وہ لاہور کارپوریشن کے چیئرمین مقرر ہوئے اور وفات سے کچھ دن پہلے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ روزنامہ الفضل (۲ فروری ۱۹۶۴ء) میں مبشر احمد کے قلم سے چھپنے والے ایک مضمون کے مطابق ''دورانِ ملازمت آپ نے اہلِ لاہور کی فلاح و بہبود کے لیے پوری کوشش کی۔ اپنے عرصۂ ملازمت میں اپنے ماتحت ملازمین سے اتنا اچھا سلوک کیا کہ وہ ہمیشہ آپ کے گرویدہ رہے۔ نرم مزاجی اور صلح پسندی کے باعث آپ نے اپنے ماتحت عملہ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ان خوبیوں کی وجہ سے جب آپ کا عرصۂ ملازمت ختم ہونے لگا تو لاہور میونسپل کارپوریشن ایمپلائز فیڈریشن کی کوشش تھی کہ آپ کی ملازمت میں توسیع کر دی جائے مگر آپ نے اپنی الوداعی تقریر میں فرمایا: ''اب میں چونکہ بیمار رہتا ہوں اس لیے مزید ملازمت کا اہل نہیں۔ میں نے اہلِ لاہور کی بہتری کے لیے ہمیشہ سوچا اور کچھ کام کیے۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔''

اس کے جلد ہی بعد وہ اس جہان سے رخصت ہو گئے۔ ان کی قبر پر لگا ہوا یہ سادہ سا کتبہ ادھر سے گذرنے والوں کو ایک بار ضرور اپنی جانب متوجہ کرتا ہے:

ملک نذیر احمد صاحب
میجر جنرل
خلف حاجی ملک فتح محمد صاحب
ساکن دوالمیال ضلع جہلم

ولادت: ۱۹ مارچ ۱۳۳۷ھ

وفات: ۳ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَ نَوِّرْ مَرْقَدَهٗ
وَارْفَعْ دَرَجَاتَهٗ وَاَدْخِلْهُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْم

میجر جنرل نذیر احمد کے بعد اب کچھ ذکر ایک ایسے خاندانی حادثہ کا جس سے میں لمبا عرصہ سنبھل نہیں پایا۔ میرا اشارہ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ابا جی کی غیر متوقع وفات کی طرف ہے۔ وہ وفات سے ایک روز پہلے تک بظاہر صحتمند تھے اور معمول کے مطابق صبح دفتر گئے تھے لیکن دوپہر کے وقت کام کرتے کرتے ان کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور ان کے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا۔ کالج سے واپسی پر یہ خبر پاتے ہی میں ان کے دفتر پہنچا۔ اس وقت تک ڈاکٹر رشید احمد انہیں دیکھ کر واپس جا چکے تھے اور ابا جی اپنے دفتر میں ہی چار پائی پر پڑے تھے۔ اس کے بعد ابا جی صرف ایک رات زندہ رہے۔ ہم ان کے پاس ساری رات بیٹھے رہے لیکن افسوس ہے کہ ہم ان کی تکلیف میں کمی کے لیے کچھ بھی نہ کر پائے۔

اگلے روز عصر کے قریب ان کی وفات ہو گئی۔ اس غیر متوقع حادثے نے میری کمر توڑ کر رکھ دی۔ میں اُس وقت تھرڈ ائیر کا طالب علم تھا اور دنیا کی اونچ نیچ سے بالکل بے خبر تھا۔ اگرچہ اس وقت تک میری بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں لیکن ان میں سے بعض کے عائلی مسائل چل رہے تھے۔ میں نے ابا جی کی زندگی میں گھر گرہستی کے بارے میں کبھی سوچا تک نہ تھا اور مجھے یہ قطعاً علم نہ تھا کہ انہیں یہ گھر چلانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑ رہے تھے۔ اب یہ ساری ذمہ داری امی اور ان کے بعد مجھ پر آن پڑی تھی اور یہ کوئی چھوٹی ذمہ داری نہ تھی۔

ابا جی کی وفات پر سب سے پہلے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے ہمارے گھر پہنچ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ وہ زار وقطار رو رہے تھے اور بار بار کہہ رہے تھے: ''داؤد! تم نے بالکل پریشان نہیں ہونا۔ آج سے میں تمہارا باپ ہوں'' اور انہوں نے مجھے واقعی باپ بن کر دکھایا۔ انہوں نے میری تعلیم کی راہ میں حائل مشکلات پر قابو پانے میں مدد کی، تلاشِ معاش میں ہر ممکن رہنمائی کی اور میرے لیے مناسب رشتہ کے انتخاب میں بھرپور دلچسپی لی۔ خدا انہیں ان کی نیکیوں کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

اس وقت ہمارے قریبی رشتہ داروں میں سے صرف چچا ابراہیم ربوہ میں رہا کرتے تھے۔ تایا اسحٰق، چچا اسماعیل اور چچا یوسف تینوں ربوہ سے باہر تھے۔ اسی طرح پھوپھی بھی لاہور میں تھیں۔ ان کو وفات کی اطلاع تو اسی وقت دے دی گئی لیکن ان سب کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں چنانچہ ان میں سے کوئی بھی بروقت ربوہ نہ پہنچ سکا۔

اگلی صبح ابا جی کا جنازہ اُٹھایا گیا اور دفاتر صدر انجمن احمدیہ کے صحن میں تقریباً اس جگہ جہاں کچھ عرصہ خواتین کا جلسہ سالانہ ہوتا رہا ہے نماز جنازہ پڑھی گئی۔ جنازہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے پڑھایا اور اس میں بلا مبالغہ ہزاروں لوگ شامل ہوئے۔ ابا جی کا اپنا حلقہ احباب بہت متنوع اور وسیع تھا اور یہ سب لوگ جنازے میں پہنچ گئے تھے۔ بہت سے لوگ جو ابا جی سے براہ راست جان پہچان تو نہ رکھتے تھے چچا ابراہیم کے ساتھ اپنے تعلقات کی وجہ سے شامل ہو گئے۔ کچھ لوگ میرے ماموں مرزا محمد یعقوب کی وجہ سے آ گئے جو اُن دنوں وکالت دیوان، تحریک جدید انجمن احمدیہ میں کام کرتے تھے۔ میرے سکول اور کالج کے کلاس فیلوز اور دیگر جاننے والے ان کے علاوہ تھے۔

بہشتی مقبرہ میں تدفین کے مروجہ طریق کے مطابق نعش لکڑی کے تابوت میں بند تھی لیکن قبرستان پہنچ کر اس کا ڈھکنا ہٹا دیا گیا تا کہ جو لوگ ابا جی کا چہرہ دیکھنا چاہیں دیکھ لیں۔ یوں ایک خاصی لمبی لائن زائرین کی بن گئی جو تابوت کے پاس ایک لمحے کے لیے ٹھہرتے اور بارگاہِ رب العزت میں مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ میں تمام وقت تابوت کے پاس کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ مجھے ابا جی کے یوں چلے جانے کا کئی وجہ سے افسوس تھا۔ میں اپنی کم عمری اور کم علمی کی وجہ سے ابھی ان کا مقام ہی نہ پہچان پایا تھا کہ وہ رخصت ہو گئے۔ ان کی آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ تھے۔ اگرچہ انہوں نے پریشانی کی اس کیفیت میں بھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہی ادا کیا تھا لیکن درحقیقت انہیں ایک دست و بازو کی ضرورت تھی۔ میں تکمیل تعلیم کے بعد (جس میں اب زیادہ وقت باقی نہیں رہ گیا تھا) ان کا دست و بازو بن سکتا تھا لیکن وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ علامہ اقبال کے ایک شعر میں معمولی تصرف کے ساتھ:

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تُو چل "بسا"

مجھے ان کی وفات کے بعد احساس ہوا کہ ان کے آخری ایام کئی طرح کے عوارض میں گذرے تھے۔ انہیں ہائی بلڈ پریشر کا عارضہ تھا اور کئی بار ان کا سر چکرانے لگتا تھا۔ فضل عمر ہسپتال سے بلڈ پریشر کے لیے ملنے والی روایتی دوا "سرپاسل" اتنی مؤثر نہ تھی جب کہ قدرے جدید دوا "اَیلڈومیٹ" مہنگی ہونے کی وجہ سے ہسپتال مہیا نہ کرتا تھا۔ افسوس! وہ اس زمانے تک ہونے والی طبی ترقیات کے ثمر سے محروم رہے۔ کبھی چلتے پھرتے سر چکرا جاتا تو وہ بیٹھ جاتے اور کسی کو آواز دے کر اپنا سر پکڑنے کے لیے کہتے۔ ہم لوگ قریب ہوتے تو چند لمحوں کے لیے ان کا سر پکڑ کر سمجھنے لگتے کہ ان کی تکلیف ختم ہوگئی ہے حالانکہ چکروں کی بیماری تو سنجیدہ علاج کی متقاضی تھی۔

آخری عمر میں ان کے دانت بھی خراب ہو گئے تھے جو بالآخر نکلوانا پڑے۔ شروع میں وہ ڈاکٹر محمد شریف کے پاس چینوٹ جایا کرتے تھے لیکن پھر کسی کے مشورہ سے لاہور جانے لگے۔ ان دنوں ڈاکٹر اعجاز الحق ڈیمونٹ مورینسی کالج کے پرنسپل تھے۔ یہیں ایک اور احمدی ڈینٹسٹ، ڈاکٹر ہمایوں اختر بھی ہوا کرتے تھے۔ کسی طرح ان تک رسائی حاصل کی گئی۔ اب ابا جی لاہور جا کر دہلی دروازہ والی بیت میں شیخ عبدالقادر (سابق

سوداگرمَل) کے ہاں قیام کرتے اور انہیں ساتھ لے کر ڈینٹل کالج سے علاج معالجہ کراتے لیکن میں نے انہیں لاہور سے واپسی پر کبھی مسرور و مطمئن نہ پایا تھا۔ وہ ہمیشہ ڈاکٹروں کے رویہ کے شاکی رہتے تھے۔ ڈینچر ان کے منہ میں ٹھیک جمتا نہیں تھا جس کی وجہ سے انہیں کھانا چبانے میں سخت دقت پیش آتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہیں کھانا بھی ٹھیک سے ہضم نہ ہوتا اور معدے کی ناقص کارکردگی کی شکایت رہتی۔ موت نے ابا جی کو ان تمام تکالیف سے تو آزاد کر دیا لیکن پسماندگان کے لیے یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس کے زخم مدتوں مندمل نہ ہو سکے۔

جس وقت ابا جی کی تدفین ہو رہی تھی میں سوچ رہا تھا کہ مجھ پر ان کا ایک بہت بڑا قرض ہے جو میں ان کی بلندی درجات کے لیے دعاؤں کی صورت ہی میں ادا کر سکتا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ یوں ہی نہیں کیا تھا کہ میں دن میں دو بار ابا جی کی قبر پر حاضری دیا کروں گا: صبح نماز فجر کے بعد اور شام، نمازِ مغرب سے ذرا پہلے۔ الحمدللہ میں نے چالیس دنوں تک یہ التزام جاری رکھا جس کے بعد میں جب تک ربوہ رہا دن میں ایک بار ضرور آپ کی قبر پر حاضری دیتا رہا۔

اے خدا بر تربتِ اُو ابرِ رحمت ہا ببار
داخلش کن از کمالِ فضل در بیت النعیم

پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات ابا جی کی وفات سے کچھ عرصہ قبل یا فوراً بعد شروع ہوئیں۔ ان نشریات کا آغاز غالباً لاہور سے ہوا تھا تاہم اُن دنوں ٹی وی شاید ہی کسی خوش نصیب کے پاس ہوگا۔ جن لوگوں نے سینما میں کوئی فلم دیکھ رکھی تھی ان کے لئے تو ٹی وی کا تصوّر ایسا ناقابلِ فہم نہیں تھا لیکن جو لوگ سینما اور اس میں دکھائی جانے والی فلم کے طریقہ کار سے واقف نہ تھے ان کے لئے یہ ایک اچنبھا تھا۔ میں بھی اُن لوگوں میں سے تھا جو ٹی وی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر سمجھنا چاہتے تھے کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ ربوہ میں کم از کم میرے کسی واقف کار کے پاس ٹی وی موجود نہ تھا چنانچہ میں خاص طور پر لاہور گیا اور اپنی پھوپھی کے ہاں قصور پورہ میں قیام کیا۔ ٹی وی کی نشریات شام کو ہوتی تھیں چنانچہ میں نے اسی علاقے میں واقع ایک ریسٹورانٹ میں جا کر چائے کی ایک پیالی پر ٹی وی چلتا ہوا دیکھا۔ وہ لوگ جو چائے کے کپ کو فضول خرچی میں شمار کرتے تھے اس ریسٹورانٹ کے باہر کھڑے ہو کر کھلے دروازے میں سے ٹی وی نشریات سے لطف اندوز ہوتے۔

آہستہ آہستہ لوگوں نے اپنے گھروں کے لئے ٹی وی کی خریداری شروع کر دی لیکن پھر بھی ابتدا میں ٹی وی سے محروم گھروں کی تعداد مقابلتاً بہت زیادہ تھی۔ ٹی وی پر جب کوئی مقبولِ عام پروگرام مثلاً ڈرامہ وغیرہ چل رہا ہوتا تو محلّے کی عورتیں اور بچے ٹی وی والے گھر پہنچ جاتے اور وہ بطیبِ خاطر انہیں خوش آمدید کہتے۔ ایسے دنوں میں رات کے وقت گلیوں میں چہل پہل بڑھ جاتی اور اہل محلّہ کا رُخ ٹی وی والے گھر کی طرف ہوتا۔

یوں تو اب فلپس اور نہ جانے کن کن کمپنیوں کے ٹی وی یہاں عام ملنے لگے تھے لیکن عظیم سنز کے نام سے ایک ادارہ روسی ٹیلیویژن امپورٹ کرتا تھا جو قیمت میں مقابلتاً بہت سستا تھا۔ اُس وقت یہ ٹیلیویژن ایک ہزار روپے سے کم میں آ جایا کرتا تھا جب کہ دوسرے ٹیلیویژن اس سے کم و بیش دُگنے مہنگے تھے۔

ان ہی دنوں میں پاک بھارت تعلقات نے ایک نیا موڑ لیا اور دونوں ملک رن آف کچھ کے تنازعہ پر محدود پیمانے پر جنگ کرنے کو تیار ہو گئے۔ پاک افواج کے کانوائے سرگودھا لاہور روڈ سے گذرا کرتے تھے۔ چونکہ اخبارات میں اس تنازعہ کی خبریں چل رہی تھیں لہٰذا عمومی تاثر یہ تھا کہ یہ افواج محاذ کی طرف رواں دواں ہیں اور انہیں دیکھنے کے لیے اہلِ ربوہ بکثرت لاری اڈے یا سڑک کے دونوں اطراف میں جمع ہو جاتے اور فوجیوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کرتے۔ کبھی کبھار ان پر گل پاشی بھی کی جاتی۔ مجھے ایک موقع پر صاحبزادہ مرزا رفیع احمد کا لاری اڈے پر ان فوجیوں کو الوداع کہنا بھی یاد ہے۔

میں نے بی اے کا امتحان ۱۹۶۵ء میں دیا تھا۔ امتحان اور اس کے نتیجے کے درمیان دو تین ماہ کا وقفہ تھا۔ کسی نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں یہ وقت ضائع کرنے کی بجائے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ لوں تو میرے لیے ملازمت کے حصول میں آسانی ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ اگر میں لاہور چلا جاؤں تو نہ صرف ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ سکتا ہوں بلکہ عین ممکن ہے مجھے کوئی عارضی ملازمت بھی مل جائے تاہم لاہور منتقل ہونے میں بعض دشواریاں حائل تھیں۔

اُن ہی دنوں کسی نے بتایا کہ حسن محمد عارف جو تحریک جدید انجمن احمدیہ میں غالباً نائب وکیل التبشیر تھے نے اپنے گھر میں ''عارف کمرشل سکول'' کے نام سے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کا ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے چنانچہ میں نے اس ''سکول'' میں داخلہ لے لیا۔ حسن محمد عارف نے میرے لیے ایک گھنٹہ مختص کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے مجھے ٹائپ سیکھنا چاہیے جس کے بعد ہی شارٹ ہینڈ سیکھی جا سکتی ہے۔ میں نے ایک ماہ کی فیس جو مبلغ چار روپے تھی ان کو ادا کی اور ان کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے مکان کے بیرونی برآمدے میں ٹوٹی پھوٹی میز پر ایک پرانا سا ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ پہلے دن انہوں نے مجھے اے ایس ڈی ایف اور سیمی کولن ایل کے جے کی پریکٹس کرنے کو کہا لیکن میری انگلیاں تھیں کہ چلتی ہی نہ تھیں۔ میں پورا ایک مہینہ اے ایس ڈی ایف کے چکر میں رہا اور پھر یہ کورس ادھورا چھوڑ کر آ گیا کہ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ میرے مزاج کے مطابق نہ تھا۔

۱۹۶۵ء کے ان مہینوں میں مقبوضہ کشمیر کے اندر مجاہدین کی سرگرمیاں شدت اختیار کر گئی تھیں تاہم کسی کو اندازہ نہ تھا کہ یہ سرگرمیاں پاک بھارت جنگ پر منتج ہو سکتی ہیں اور بھارت بین الاقوامی سرحد عبور کر کے اچانک پاکستان پر حملہ آور ہو جائے گا۔

اُس زمانے میں ربوہ کی بستی آج کی جدید سہولتوں سے ناآشنا تھی۔ دُور کیا جانا ملکی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رہنے کا سب سے بڑا ذریعہ ریڈیو تھا جو صرف چند خوش نصیبوں کے پاس تھا۔ ایسے میں پاکستان پر ہندوستان کے اچانک حملہ سے بے خبر رہنا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ یہ تو اتفاق محض تھا کہ ۶ ستمبر کو دن کے تقریباً گیارہ بجے میں گول بازار گیا تو احمدیہ ماڈرن سٹور کے سامنے کچھ لوگوں کو تشویش کے عالم میں کھڑے دیکھا۔ میں نے وہاں رک کر کسی سے پوچھا کہ یہ اکٹھ کیسا ہے۔ تب کسی نے بتایا کہ صدر ایوب ریڈیو پر قوم سے خطاب کرنے والے ہیں۔ اس وقت تک جنگ کے بارے میں سرکاری طور پر کچھ بتایا نہیں گیا تھا لیکن صدر کا یوں

اچانک خطاب لوگوں کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کر رہا تھا اور وہ قیاس آرائیوں میں مصروف تھے۔ اتنے میں ریڈیو نے اعلان کیا کہ صدر کا خطاب شروع ہوا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے صدر ایوب کا خطاب ہمیشہ ''عزیز ہم وطنو!'' سے شروع ہوتا تھا اور اس روز بھی ان ہی الفاظ میں شروع ہوا لیکن ان کا انداز بدلا ہوا تھا۔ صدر ایوب کی آواز میں جلال اور لہجے میں ایک خاص کھنک تھی۔ انہوں نے قوم کو آگاہ کیا کہ بھارتی فوج نے آج صبح سویرے لاہور کی جانب سے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور بھارتی ایئر فورس نے وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر کھڑی ایک مسافر گاڑی پر ہوائی جہاز سے گولیاں برسا کر پاکستان کے خلاف کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ ''پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دل کی دھڑکنوں میں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بسا ہوا ہے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ بھارت کی توپوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش نہیں کر دیں گے۔'' انہوں نے بجا طور پر کہا تھا کہ ''بھارتی رہنماؤں کو ابھی تک یہ احساس نہیں ہوا کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔ وہ پختہ ایمان اور راستی توحید پر یقین رکھتے ہیں اور وہ اُمیدِ کامل کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر لڑیں گے جس کا ارشاد ہے کہ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔''

میں محسوس کر سکتا تھا کہ صدر ایوب کی اِس تقریر نے سننے والوں کے دل میں وطن کی محبت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور وہ لمحے بھر میں اس کی آن اور شان پر مر مٹنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔

جماعت احمدیہ کا سب سے بڑا ہتھیار تو دعا ہی ہے لہٰذا جنگ کی خبر سنتے ہی ہر شخص اپنے اپنے رنگ میں اللہ تعالیٰ کے حضور پاکستان کی فتحمندی کے لیے دست بدعا ہو گیا۔ مجلس خدام الاحمدیہ کے ذریعہ گھر گھر یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ اہلِ ربوہ ظہر کی نماز بیت مبارک میں ادا کریں جہاں وطن کی سُرخروئی کے لیے اجتماعی دعا ہوگی۔ میں نے یہ نماز وہیں ادا کی تھی۔ اس موقع پر قاضی محمد نذیر لائلپوری نے ایک مختصر خطاب کے بعد لمبی دعا کرائی۔ دعا کے دوران احباب پر رقّت کا عالم طاری تھا چنانچہ اس سارے عرصے میں بیت مبارک کی فضا گریہ وزاری اور دبی دبی سسکیوں میں ڈوبی رہی۔

جنگ شروع ہوتے ہی ملک بھر میں بلیک آؤٹ شروع ہو گیا۔ ربوہ میں تو گلیاں یوں بھی تاریکی میں ڈوبی رہتی تھیں لیکن حکومتی ہدایات کے پیشِ نظر اس بات کا خاص اہتمام کیا جانے لگا کہ کسی گھر کے باہر کوئی بلب نہ جلایا جائے اور گھروں کے اندر بھی روشنی نہ کی جائے لیکن اگر کسی مجبوری کے تحت ایسا کرنا ضروری ہو تو روشنی کسی صورت باہر سے نظر نہ آئے۔ الحمد للہ اس حوالے سے کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی۔

کبھی کبھی یہ افواہ گردش کرنے لگتی کہ دشمن کے چھاتہ بردار ربوہ یا اس کے نواح میں اُترے ہیں لیکن اس افواہ کی صداقت کبھی سامنے نہیں آئی۔ ملک طاہر احمد سابق اسسٹنٹ وائس پریزیڈنٹ، حبیب بنک لمیٹڈ نے جو اُس زمانے میں مجلس خدام الاحمدیہ مقامی میں ناظمِ عمومی تھے ان ہی دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل ۲۵ مارچ ۲۰۱۰ء میں جو دراصل صاحبزادہ مرزا ادریس احمد کے ذکرِ خیر پر مبنی ہے رقمطراز ہیں:

''پاک و ہند جنگ زوروں پر تھی۔ ربوہ میں بلیک آؤٹ کو مزید مؤثر بنانے کے لیے حضرت مرزا ناصر احمد

مرزا طاہر احمد صاحب.........جو اس وقت ہمارے کالج کے پرنسپل ہونے کے علاوہ صدر، صدر انجمن احمدیہ پاکستان تھے نے حضرت مرزا طاہر احمد صاحب.........کو جو اُس وقت نائب صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکز یہ تھے اس کام کا انچارج بنا دیا اور تمام ربوہ کو ان کی نگرانی میں دے دیا۔ تمام صحت مند انصار، خدام اور بڑے اطفال دن اور رات حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کے پاس حاضر رہتے۔ آپ نے دفتر وقف جدید کو اپنا مرکز بنایا ہوا تھا۔ دو دو تین تین کے گروپس بنتے تھے۔ دن کے اوقات میں بھی رات کے علاوہ ربوہ کے اردگرد کے علاقہ کی اور خاص طور پر پہاڑوں کی چھان پھٹک ہوتی تھی کیوں کہ یہ افواہ مسلسل گردش کرتی تھی کہ ہندوستانی پیراٹروپس رات کو اُترتے ہیں جو کہ بعد میں بالکل غلط ثابت ہوئی اور صرف افواہ ہی ثابت ہوئی۔ اچھی میاں (یعنی صاحبزادہ مرزا ادریس احمد۔ ناقل) کو خاکسار نے دیکھا کہ دو افرادِ خاندان کے ساتھ اپنی ذاتی لائسنس یافتہ بندوق کے ساتھ سرگودھا روڈ پر جانب احمد نگر ربوہ کے مضافات میں علاقہ کی نگہداشت رات گئے تک کرتے رہے۔ خاکسار چونکہ ایک اور گروپ کے ساتھ تھا جو کہ اچھی میاں کے گروپ کے پیچھے تھا اس لیے خاکسار اس بات کا ذاتی گواہ ہے کہ ان افراد نے بہت محنت اور لگن سے یہ کٹھن کام سرانجام دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کوئی ایک رات کا نہیں تھا، مسلسل تھا۔ اہالیان ربوہ نے مثالی بلیک آؤٹ آبزرو کیا اور ان افواہوں کی تردید اپنے عملی کام سے کی کہ کوئی پیراٹروپر ربوہ کے اردگرد نہیں اُترا۔ اس طرح سرگودھا ایئر بیس کی حفاظت میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔''

جنگ کے دوران حکومت کی ہدایات کے تحت ہر گھر میں خندقیں کھودی گئیں۔ میں نے اپنے گھر کے صحن میں جو خندق کھودی انگریزی کے حرف ''ایل'' سے مشابہہ تھی۔ میں نے یہ خندق کئی دن کی محنت سے کھودی تھی اور اس میں اُترنے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس خندق میں پناہ لینے کا موقع ایک آدھ بار ہی پیدا ہوا اور وہ بھی صرف میری حد تک۔ آپی، امی اور ماسی جی ناسازی طبع کی وجہ سے اس میں پناہ لینے کو تیار نہ تھیں سو تنہا میں ہی تھا جو شاید ایک بار ہوائی حملہ کا سائرن بجنے پر اس کے اندر داخل ہوا تھا۔

اس جنگ کے دوران بارڈر ایریا کے علاوہ لاہور کے بہت سے شہری بھی محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں اندرونِ ملک اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ہاں منتقل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں میرے ایک خالہ زاد بھائی قاضی منظور احمد بھی شامل تھے جو اُن دنوں شفا میڈیکوز پر کام کرتے تھے۔ وہ جنگ شروع ہوتے ہی اپنی فیملی ہمارے گھر چھوڑ گئے۔ اگرچہ گھر سے بے گھر ہو جانے کے اپنے مسائل ہیں اور یقیناً انہیں اس حوالے سے کئی طرح کے تلخ تجربات سے گذرنا پڑا ہو گا لیکن ہماری اس فیملی سے بے تکلفی تھی لہٰذا ان کی ربوہ آمد سے ہمارے گھر میں چہل پہل سی ہو گئی۔ قاضی منظور احمد کو اپنی فیملی کے لیے ربوہ کی رہائش اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے بعد میں محلہ دارالبرکات میں اپنا مکان بنالیا اور یہیں مستقل رہائش اختیار کرلی۔

''ایکوون'' نامی امریکی مصنوعی سیارے کے فضائے ربوہ میں سے گذرنے کا ذکر تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں فضا میں ایک دُمدار ستارہ نمودار ہوا جو ربوہ میں بھی نظر آتا تھا۔ دُمدار ستارہ انگریزی میں کومٹ کہلاتا ہے۔ ویسے تو یہ ایک عام ستارہ ہی ہوتا ہے لیکن اس سے روشنی کی شعاعیں نکلتی ہیں جو دُور سے دیکھنے

والوں کو ''دُم'' کی طرح نظر آتی ہیں۔

یہ دُمدار ستارہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بھی دیکھا جا رہا تھا۔ لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ امروز (۵ نومبر ۱۹۶۵ء) میں چھپنے والے ایک مضمون کے مطابق ''اس ستارے کو پہلے پہل جاپان کے دو شوقیہ ماہرینِ فلکیات، کاؤروکیا اور سوٹوسکی نے دیکھا تھا چنانچہ ان ہی کے نام پر اسے اکیا سکی کا نام دیا گیا ہے۔'' اخبار کا مزید کہنا تھا کہ حال ہی میں ''اکیا سکی دُمدار ستارہ جب سورج سے چند کروڑ میل کے فاصلے پر پہنچا اور اس کی رفتار دس لاکھ میل فی گھنٹہ ہوگئی تو وہ گرم ہوگیا اور اس کے وسطی حصے کے گرد بخارات کا ہالہ سا بن گیا۔.........سورج کی روشنی اور ذرّوں کے شدید فشار کے بوجھ تلے یہ ہالہ پچک گیا اور اس نے دُم کی شکل اختیار کرلی۔ اب جیسے جیسے یہ ستارہ سورج سے قریب تر ہو رہا ہے اس کی چمک اور آب و تاب بڑھتی جا رہی ہے۔ فرانس کی ایک رصدگاہ نے اکیا سکی دُمدار ستارے کے بارے میں جو معلومات اکٹھی کی ہیں ان کے مطابق اس ستارے کا قطر تین ہزار میل ہے۔ ٹوکیو کی رصدگاہ کے ماہروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس ستارے سے وقفوں کے ساتھ بخارات اُٹھتے دیکھے ہیں۔ ستارے کی دُم کی طوالت کے بارے مختلف ماہروں کی مختلف رائے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ایک کروڑ میل لمبی ہے۔ کوئی مُصر ہے کہ یہ بیس لاکھ میل لمبی ہے۔ دراصل ستارہ نہایت تیزی سے پڑاں ہے۔ اس کے اجزا اسی سرعت سے بکھر اور پھیل رہے ہیں۔ ستارے کی دم سے بھی بخارات کا فشار ہوتا دیکھا گیا ہے۔ بہر طور وقت گذرنے کے ساتھ دُم طویل ہوتی جائے گی اور ممکن ہے کہ دس کروڑ میل تک لمبی ہو جائے۔ ایک ماہر کا کہنا ہے کہ ستارہ.........سورج میں جذب ہو جائے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ بتدریج سورج کی کشش سے دور ہوتا جائے گا اور یوں ایک بار پھر ٹھنڈا ہوگا اور اس کے منتشر اجزا باہم مل جائیں گے اور پھر غالباً ۲۹۰۰ء میں دوبارہ دکھائی دے گا۔''

شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے جولیس سیزر میں لکھا ہے کہ:

"When baggers die there are no comets seen;

The heavens themselves blaze forth the death of princes"

اس عظیم ڈرامہ نگار کے یہ الفاظ دراصل ان صدیوں پرانے خیالات کا عکاس ہیں جن کے مطابق اس طرح کے کسی ستارے کا ظہور کسی بڑے آدمی کی موت سے منسلک ہوتا ہے۔ ہمارے بعض افراد جو اس قسم کے توہّمات سے نجات حاصل نہ کر پائے تھے آپس میں گفتگو کے دوران اس سیارے کے ظہور کو اپنے لیے نحس قرار دے رہے تھے۔ اسی دوران ۸ نومبر ۱۹۶۵ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا انتقال جماعت کے لیے تو ایک بڑا سانحہ تھا ہی، ذاتی طور پر میرے لیے بھی کسی روح فرسا حادثے سے کم نہ تھا۔

اگرچہ ذہن پر پورا زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں نے کبھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے ملاقات کی ہو یا (اس امر کے سوا کہ اباجی کی درخواست پر میرا نام حضور ہی نے رکھا تھا) ذاتی طور پر ان کی شفقت سے کوئی حصہ پایا ہو مگر اس کے باوجود میں نے ہمیشہ خود کو حضور کے خاندان کا ایک فرد ہی سمجھا۔ میں نے آپ کے

بعض خطبات اور جلسہ سالانہ کی کچھ تقاریر سنی ہیں، ربوہ سے بیرونی سفروں کے لیے روانگی اور واپسی کے وقت ربوہ کے ریلوے سٹیشن پر آپ کی زیارت سے فیضیاب ہوا ہوں، الفضل میں آپ کی صحت کے بارے میں تازہ بہ تازہ رپورٹس میری نظر سے گذری ہیں، آپ کے خطبات پڑھے ہیں، آپ کی بعض کتب دیکھی ہیں، یوم مصلح موعود کے موقع پر ہونے والے جلسوں میں آپ کے متعلق حضرت مسیح موعود کی پیشگوئیوں کے بارے میں آگاہی حاصل کی ہے اور بعض پیشگوئیوں کو بڑی شان سے پورا ہوتے دیکھا ہے۔ ابا جی حضور کے خطبات اور تقاریر محفوظ کرنے پر مامور تھے۔ وہ تفسیر صغیر اور تفسیر کبیر کی تیاری کے دوران حضور کی ہدایات کے مطابق آپ کی ممکنہ معاونت کرتے تھے اور حضور کے سفروں میں آپ کے ساتھ رہتے تھے لہٰذا دن میں ایک دو بار ضرور حضور سے شرف باریابی حاصل کرتے تھے اور ہمارے گھر میں سب سے زیادہ ذکر حضور ہی کا ہوتا تھا۔

یہ تو حضور کی صحت کے زمانے کی باتیں ہیں لیکن اپنی بیماری کے دوران بھی جب جب حضور کو خیال آتا کہ ابھی بہت سا کام ہونے والا ہے تو وہ ابا جی کو طلب کر لیتے۔ ابا جی دفتر میں ہوتے تو قریب ہی واقع قصر خلافت میں حضور کی خدمت میں حاضر ہو جاتے لیکن چھٹی کے روز طلب کئے جانے پر دفتر پرائیویٹ سیکرٹری کا کوئی آدمی گھر آکر آپ کا پیغام پہنچا دیتا۔ ابا جی جس حال میں ہوتے اُٹھ جاتے۔ وہ جلدی جلدی کوٹ پہنتے، سر پر پگڑی رکھتے اور چھڑی ہاتھ میں لے کر قصر خلافت کی طرف روانہ ہو جاتے۔ وہاں پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرتے تو حضور فوراً اپنے پاس بلا لیتے لیکن بسا اوقات اسی دوران حضور آرام فرمانے لگ جاتے تو ابا جی کچھ دیر قصر خلافت میں انتظار کے بعد واپس آ جاتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ گھر پہنچتے ہی دفتر پرائیویٹ سیکرٹری کا آدمی دوبارہ دروازہ کھٹکھٹا دیتا اور حضور کا بلاوا پہنچاتا۔ یہ سلسلہ دن بھر جاری رہتا اور بعض اوقات ابا جی کو دن میں چھ چھ سات سات بار قصرِ خلافت میں حاضر ہونا پڑتا۔

ابا جی گھر میں بھی دفتری امور کی انجام دہی میں مصروف رہتے۔ ان کا زیادہ وقت حضور کے خطبات و تقاریر کو قابلِ اشاعت شکل دینے میں گذر جاتا لیکن اگر کبھی فارغ ہوتے تو وہ حضور کی شفقت و محبت کے واقعات بیان کرنا شروع کر دیتے۔ ان میں حضور کے ساتھ کئے گئے سفروں کے قصے، حضور کے ساتھ کام کے دوران پیش آنے والے واقعات، تفسیر القرآن کے سلسلہ میں حضور سے رابطہ میں رہنے والے بزرگان خصوصاً مولوی عبدالرحمٰن انور، مولوی ابوالمنیر نورالحق اور ملک غلام فرید کی نکتہ آفرینیاں، حضور کے ملاقاتیوں کی باتیں، الغرض بہت کچھ شامل ہوتا۔ ہم بیت الذکر جاتے تو ہر نماز میں حضور کی صحت کے لیے باجماعت دعائیں مانگی جا رہی ہوتیں۔ حضور کی صحت کے بارے میں حوصلہ افزا خبر سننے کو ملتی تو ہمارے چہرے کھل اُٹھتے اور اگر خدانخواستہ حضور کی علالت میں شدت کا پتا چلتا تو صدقات شروع ہو جاتے، نفلی روزے رکھے جانے لگتے اور آدھی آدھی رات کو خدا کے حضور گڑگڑا کر آپ کی صحت اور لمبی زندگی کے لیے دعائیں مانگی جانے لگتیں۔

حضور کے ساتھ ابا جی کا دیرینہ اور مخلصانہ تعلق ہی تھا جس کی وجہ سے ابا جی کی وفات کی خبر سن کر حضور سخت مضطرب ہو گئے۔ چھوٹی آپا جو ابا جی کی وفات پر ہمارے ہاں تعزیت کے لیے تشریف لائی تھیں راوی ہیں کہ حضور

بار بار فرماتے تھے: "آہ! مولوی صاحب چلے گئے۔ اب میرا کام کون کرے گا۔" حضور نے شفقت فرمائی اور اس روایت کی بنیاد پر کہ اباجی نے عہدِ طفلی میں ایک بار حضرت مسیح موعود کو دیکھا تھا اباجی کی قطعہ رفقا میں تدفین کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی۔

یہ بات تو سلسلہ کے ریکارڈ پر ہے کہ جب حضور کو اباجی کی وفات کی خبر پہنچائی گئی تو حضور سخت آزردہ ہوئے اور آپ کو شدید گھبراہٹ شروع ہوگئی جس کے لیے فوری طور پر دوا دینا پڑی۔

اس پس منظر میں ۱۹۶۵ء کے آخر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی وفات میرے لیے کسی ذاتی صدمہ سے کم نہ تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں بھی ہزاروں کے اس مجمع میں شامل تھا جسے حضور کے چہرے کا آخری دیدار نصیب ہوا، آپ کے جنازے میں شمولیت کا موقع ملا اور آپ کی تدفین کے بعد اجتماعی دعا میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

موقع کی مناسبت سے بہت سے احبابِ جماعت نے حضور کی سیرت و سوانح پر مضامین لکھے اور نظمیں کہیں لیکن ثاقب زیروی کا یہ قطعہ نہ جانے کیوں آج بھی مجھے من وعن یاد ہے:

ہونٹوں پہ آہِ سرد ، جبینوں پہ غم کی دُھول
آنکھوں میں سیلِ اشک چھپائے ہوئے چلا
دن ڈھل گیا تو درد نصیبوں کا قافلہ
کاندھوں پہ آفتاب اُٹھائے ہوئے چلا

میں اپنی اس خوش قسمتی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے کہ میں ان درد نصیبوں میں سے ایک ہوں اور میں نے خود اس آفتاب کو غروب ہوتے دیکھا ہے۔

اور اب کچھ ذکر بیت اقصیٰ کا!

یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ اُن دنوں ربوہ میں بیت اقصیٰ کی تعمیر کا منصوبہ زیرِ غور تھا اور اس پر اُٹھنے والے اخراجات پورے کرنے کے لیے جماعت کی طرف سے الفضل میں ایک اشتہار شائع ہوا جس کے ذریعے مخیر احباب سے اس مد میں چندہ ادا کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس اشتہار کی اشاعت کے چند ہی روز بعد اباجی نے دفتر سے واپسی پر بتایا کہ جماعت کے کسی مخیر دوست نے اس بیت پر اٹھنے والے جملہ اخراجات برداشت کرنے کی پیشکش کی ہے بشرطیکہ اُن کا نام خفیہ رکھا جائے۔ تاہم ایسی باتیں خفیہ کہاں رہتی ہیں چنانچہ اس کے چند ہی روز بعد ہمارے گھر کے تمام افراد کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مخیر دوست سیٹھ محمد صدیق بانی آف چنیوٹ ہیں جو اب بہشتی مقبرہ میں دفن ہیں۔ میں جب بھی بہشتی مقبرہ میں اپنی والدہ مرحومہ کی قبر پر دعا کے لیے حاضری دیتا ہوں تو اسی قطار میں مدفون ان کی قبر پر بھی ضرور رکتا ہوں۔ سیٹھ محمد صدیق بانی آف چنیوٹ کی قبر پر دعا کرتے ہوئے مجھے وہ حدیثِ پاک یاد آ جاتی ہے جس کے مطابق جس نے زمین پر اللہ کا ایک گھر بنایا خدا اسے جنت میں ایک گھر عطا فرمائے گا۔ خدا تعالیٰ سیٹھ صاحب کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

ان کی وفات کی خبر دیتے ہوئے الفضل نے کیا خوب لکھا تھا: ''محترم سیٹھ صاحب مرحوم بہت مخلص اور فدائی احمدی تھے۔ بہت نیک اور منکسر المزاج تھے اور ہر ایک کے ساتھ بہت محبت سے ملتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت دریا دل بنایا تھا اور ہر موقع پر بہت بڑھ چڑھ کر قربانی کرنا اور خدمت کے مقاماتِ محمود تلاش کرنا آپ کا خاص وصف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو سلسلہ احمدیہ...... کی مختلف النوع خدمات بجالانے کی غیر معمولی توفیق ملی۔ غرباء کا خیال رکھنے اور ان کے کام آنے میں بھی آپ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ الغرض بہت سی خوبیوں اور اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے۔''

اس بیت کا سنگِ بنیاد ۱۹۶۶ء کے آخر میں رکھا گیا۔ اگرچہ میں اُن دنوں لاہور میں پڑھ رہا تھا لیکن یہ خبر سن کر میں بھی ربوہ پہنچ گیا اور مجھے بھی بفضلہ تعالیٰ اُن دعاؤں میں شامل ہونے کا موقع مل گیا جو خاص طور پر اس موقع پر مانگی گئیں۔

بیت اقصیٰ کی تعمیر کی نگرانی ایک احمدی انجینئر، چوہدری نذیر احمد کے سپرد ہوئی۔ میں نے چوہدری نذیر احمد کو دیکھا تو ضرور ہے البتہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ ہاں! بہت عرصہ بعد ان کی ایک صاحبزادی جن کا نام ضیا ہے میرے ایک برادرِ نسبتی کے عقد میں آئیں اور اس طرح مجھے وقتاً فوقتاً ان کے والدِ بزرگوار کے کچھ حالات سننے کا موقع ملتا رہا۔

چوہدری نذیر احمد موضع ککرالی ضلع گجرات کے رہنے والے تھے اور ان کے خاندان میں احمدیت ان کے والد چوہدری رحمت اللہ کے ذریعے آئی تھی جو اپنے گاؤں کے نمبردار ہونے کے علاوہ سکول ٹیچر بھی تھے۔ چوہدری نذیر احمد شروع سے ذہین اور لائق طالب علم تھے اور انہوں نے میٹرک تک وظیفہ حاصل کیا تھا۔ جب رسول کے ٹیکنیکل سکول میں داخلے کا مرحلہ آیا اور چالیس سیٹوں کے لیے پنجاب بھر سے سینکڑوں طلبہ نے داخلے کے امتحان میں شرکت کی تو وہ اس میں اوّل آئے۔ انہوں نے تین سالہ ڈپلومہ کیا اور پھر کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۴ء میں بیچلر آف انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی لیکن انہیں یہ ماحول جس میں رشوت عام تھی پسند نہ آیا اور انہوں نے جلد ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ پرائیویٹ ملازمت کریں گے جہاں انہیں نہ صرف رزقِ حلال کمانے کا موقع ملے گا بلکہ ان کی تنخواہ بھی بہتر ہوگی۔ اسی فیصلے کے تحت انہوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور خدا کے فضل سے منگلا ڈیم کے جری کس پراجیکٹ کے چیف انجینئر کے عہدے تک ترقی پائی۔ یاد رہے کہ منگلا ڈیم کی تعمیر تین مختلف پراجیکٹس کے تحت پایہ تکمیل تک پہنچی جن میں سے ایک جری کس پراجیکٹ تھا۔ باقی دو پراجیکٹس کے چیف انجینئرز غیر ملکی تھے۔ اس سے ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انہوں نے الفضل میں بیت اقصیٰ کی تعمیر کے لیے کسی انجینئر کی ضرورت کا اعلان پڑھا تو ان کے دل میں خدمتِ دین کا جذبہ بیدار ہوا اور انہوں نے اپنی خدمات صدر انجمن احمدیہ کو پیش کر دیں۔

موصوف کے بیٹے طارق کا بیان ہے کہ جری کس پراجیکٹ کے چیف انجینئر کی حیثیت میں انہیں

اتنی بڑی تنخواہ دینے کی پوزیشن میں تو نہیں لیکن ان کے تجربہ اور جذبہ کے پیش نظر ان کی تنخواہ چھ سو روپے ملاقات حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے ہوئی تو یہ موضوع پھر زیرِ بحث آیا۔ حضور نے ان سے فرمایا کہ انجمن انہیں ساڑھے تین سو روپے تنخواہ کی پیشکش کی۔ انہوں نے یہ تنخواہ بھی قبول کر لی لیکن بعد میں جب ان کی بائیس سو روپیہ ماہوار تنخواہ مل رہی تھی جو اُس زمانے کے لحاظ سے ایک خطیر رقم تھی لیکن صدر انجمن احمدیہ نے

ماہوار کی جاری ہے۔

چوہدری نذیر احمد کئی سال تک اسی تنخواہ پر کام کرتے رہے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔

وہ کچھ عرصہ تک صدر انجمن احمدیہ کے افسرِ تعمیرات بھی رہے۔ اس حیثیت میں انہیں خلافت لائبریری، تعلیم الاسلام ڈگری کالج اور جامعہ نصرت سمیت بعض اہم جماعتی عمارات کی تعمیر و توسیع کی توفیق ملی۔

وہ یہاں سے فراغت پا کر ایران چلے گئے جہاں انہیں شہزادی اشرف پہلوی (ہمشیرہ شہنشاہِ ایران) کے جاری کردہ کچھ تعلیمی منصوبوں پر زاہدان میں کام کرنے کا موقع ملا۔ پھر وہ عراق کے صوبہ عمارہ میں آبپاشی کے نیٹ ورک پر کام کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کا بہت اعلیٰ اجر دیا کیونکہ ایران اور عراق دونوں جگہوں پر انہیں بہت عمدہ تنخواہ پر کام کرنے کا موقع ملا۔

اب انہوں نے ماڈل ٹاؤن لاہور میں رہائش اختیار کر لی تھی جہاں انہوں نے ۲ جولائی ۱۹۹۷ء کو مختصر علالت کے بعد وفات پائی اور لکرالی میں دفن ہوئے۔

بیت اقصیٰ کی تعمیر کے زمانے میں ان کی فیملی بھی ربوہ میں رہی۔ طارق بتاتے ہیں کہ جب کبھی حضرت خلیفۃ المسیح الثالث اس منصوبے کے معاینہ کے لیے تشریف لاتے تو ان کے والد بچوں کو وہاں بلا لیتے۔ طارق بتاتے ہیں کہ حضور ہمیں بہت پیار سے ملتے۔ ایک بار ان کی دو چھوٹی بہنیں جنہوں نے پونیاں کر رکھی تھیں وہاں موجود تھیں۔ حضور نے ایک بچی کی پونی کو چھو کر مسکراتے ہوئے پوچھا کہ اس انٹینا سے راولپنڈی سٹیشن آتا ہے یا لاہور۔

طارق سے پوچھا جائے کہ اس دور کا کوئی یادگار واقعہ تو وہ بتاتے ہیں: ''جس روز بیت اقصیٰ کا لینٹل پڑنا تھا اچانک بادل آ گئے اور یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا کہ کہیں اس حوالے سے کی گئی تیاریاں بیچ کی بیچ میں نہ رہ جائیں۔ اباجی یہ صورتِ حال دیکھ کر پریشان ہوئے اور اسی وقت حضور کے پاس جا کر دعا کے لیے عرض کی۔ حضور نے فرمایا: ''جائیں چوہدری صاحب۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے آپ کی مدد کرے گا اور ان شاء اللہ آپ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔'' اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھٹ گئے اور لینٹل کا کام سہولت کے ساتھ مکمل ہو گیا۔

اور اب کچھ ذکر ایک مخلص احمدی خاتون کا جن کا نام مظفر بیگم تھا لیکن ہم اپنے گھر میں انہیں ''ماسی جی'' کہا کرتے تھے۔ وہ میری والدہ کی سگی بہن تھیں جو عمر میں ان سے پانچ سال بڑی تھیں لیکن کم عمری میں بیوہ ہو گئیں۔ تقسیم تک تو وہ اپنے والدین یعنی میرے نانا نانی کے ہمراہ رہیں لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جب یہ دونوں

بزرگ ایک ہفتے کے وقفے سے یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے اور ان کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تو وہ ہمارے پاس رہنے لگیں اور تاوفات ہمارے ساتھ ہی مقیم رہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ ان کی شادی میاں حاکم دین نامی ایک نوجوان سے ہوئی تھی جو ڈومیلی ضلع جہلم میں پوسٹ مین تھے۔ وہ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک منی آرڈر کی تقسیم کے سلسلے میں کسی دُور دراز گاؤں کو جارہے تھے کہ کچھ لوگوں کو پتا چل گیا۔ اُس زمانے میں چند سو روپے بھی بہت بڑی رقم ہوتی تھی چنانچہ جب وہ ایک جنگل سے گذر رہے تھے تو ان کا تعاقب کرنے والوں نے انہیں جالیا۔ ظالموں نے ان کے قتل پر اکتفانہ کیا بلکہ ان کی لاش بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالی۔ کئی دن تک تو ان کا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ جب حقیقتِ حال کھلی تو جنگلی جانور یہ ٹکڑے بھی بُری طرح نوچ چکے تھے۔ ہاں! اتفاقاً بچ رہنے والی ان کی ایک انگلی سے پتا چلا کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس حادثے نے ماسی جی کے جسم و جان پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے لیکن انہوں نے یہ چرکہ بہت ہمت کے ساتھ برداشت کیا۔ میں نے یہ بات اپنے خاندان ہی میں کسی سے سنی ہوئی ہے کہ اس زمانے میں ان کی دوسری شادی کے لیے بعض تجاویز موصول ہوئیں مگر انہوں نے ہر تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ وہ دوسری شادی نہیں کریں گی۔ انہوں نے تمام زندگی بیوگی میں نہایت عفت اور پاکیزگی کے ساتھ گذار دی۔

مرحومہ انتہائی سادہ، نیک دل اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ میں نے انہیں نماز میں بہت باقاعدہ پایا۔ مرحومہ خود ذکر کرتی تھیں کہ وہ بارہ تیرہ سال کی تھیں جب سے انہوں نے ادائی صلوٰۃ میں اہتمام روا رکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ ان کے آخری دم تک جاری رہا۔

میرا مشاہدہ تھا کہ باوجود کمزوری کے وہ کبھی بیٹھ کر نماز نہ پڑھتیں بلکہ ہر نماز پورے لوازمات کے ساتھ ادا کرتیں۔ بتایا کرتی تھیں کہ وہ نماز میں اپنے بھانجے بھانجیوں اور بھتیجے بھتیجی کی خیر و عافیت، ان کی تعلیم و تربیت اور دین و دنیا میں سرخ روئی کے لیے بکثرت دعائیں کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمارے حق میں ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور دین و دنیا کی جملہ نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔

قرآن شریف کی تلاوت ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور وہ نمازِ فجر کے بعد اپنے معمولات کا آغاز اللہ تعالیٰ کے پاک کلام ہی سے کرتیں۔ جب وہ بلند آواز میں اپنی مخصوص لَے میں قرآن شریف کی قرأت کرتیں تو ایسا سماں بندھتا جس کا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا۔

جمعہ میں باقاعدگی سے جاتیں اور میرے اس اصرار پر بھی کہ اُن کے لیے تو خدا نے چھوٹ دے رکھی ہے ہمیشہ کہتیں کہ انسانی زندگی کا کیا بھروسہ لہٰذا جتنا موقع نیکی کا مل جائے اس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ اوّلین وقت میں بیت الذکر پہنچ جائیں۔ وہ مجھے بھی تاکید کیا کرتیں کہ پہلی ندا کے ساتھ ہی بیت الذکر پہنچ جانا چاہئے کیوں کہ ایسا کرنے والوں کو تاخیر سے پہنچنے والوں کی نسبت زیادہ ثواب ملتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اس حدیث کا حوالہ ضرور دیا کرتی تھیں جس میں نمازِ جمعہ کے لیے اولیں وقت میں پہنچنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ جب میں انہیں کہتا کہ وہ یہ حدیث بہت بار سنا چکی ہیں تو وہ جواب دیا کرتیں: ''یاددہانی کا فائدہ ہی ہوتا ہے۔''

موصوفہ کو حضرت مسیح موعود اور آپ کے خلفاء سے دلی عقیدت تھی۔ جب تک حضرت خلیفۃ المسیح الثانی بقیدِ حیات رہے وہ الفضل آنے پر سب سے پہلے آپ ہی کی صحت کے متعلق تازہ ترین اطلاع پڑھتیں۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ حضرت مسیح موعود کے ملفوظات، اخبار احمدیہ اور حضرت مصلح موعود کی تحریروں اور خطباتِ جمعہ کا مطالعہ کرتیں اور جب تک ایسا نہ کر لیتیں بے چین اور مضطرب رہتیں۔

اس پنشن کے علاوہ جو انہیں اپنے مرحوم شوہر کی خدمات کے حوالے سے پاکستان پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف ڈیپارٹمنٹ سے ملتی تھی ماسی جی کا کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، یہ پنشن نو روپے ماہوار تھی جو بعد میں بڑھ کر تیرہ یا ساڑھے تیرہ روپے ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ چندہ جات کی ادائی میں بہت باقاعدہ تھیں۔ انہوں نے جائیداد کے تیسرے حصہ کی وصیت کر رکھی تھی اور اس کی ادائی وصیت کی منظوری کے فوراً بعد قیامِ پاکستان سے پہلے ہی کر دی تھی۔ وہ تحریک جدید کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھیں چنانچہ جماعت کی طرف سے شائع شدہ ان مجاہدین کی فہرست میں آپ کا نام موجود ہے۔ وہ دیگر مالی تحریکات میں بھی ہمیشہ اپنی ہمت سے بڑھ کر حصہ لیتیں چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف سے امانت تحریک جدید میں روپیہ جمع کروانے کی تحریک پر محض حصولِ ثواب کی نیت سے اپنا کچھ زیور بیچ کر ایک سو روپیہ جمع کرایا۔ منارۃ المسیح پر چندہ دہندگان کی فہرست میں بھی آپ کا نام کندہ ہے۔

ماسی جی پردے کی بہت پابند تھیں اور ضعیف العمری کے باوجود برقع کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ رکھتیں۔ میں نے کبھی انہیں دروازے کے پیچھے سے بھی کسی غیر مرد سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ دُور کیا جانا وہ برسوں ہمارے گھر میں مقیم رہیں لیکن میں نے اس تمام عرصہ میں انہیں ابا جی سے جو اُن کے بہنوئی تھے براہِ راست گفتگو کرتے نہیں دیکھا۔ ایسا کسی ناراضی کے سبب نہیں تھا بلکہ ان کا یہ رویہ ان کی احتیاط پسندی کا مظہر تھا۔

بعض اوقات بزرگان اپنے چھوٹوں پر ناراضی کے اظہار کے لیے انہیں سخت سست کہہ دیتے ہیں اور اس کیفیت میں ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو متعلقہ شخص کے لیے بددعا کا درجہ اختیار کر سکتی ہیں۔ میں نے ماسی جی کی زبان سے کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں سنا جسے گالی کہا جا سکے بلکہ اگر وہ کسی سے خفگی کا اظہار کرنا چاہتیں تو اسے ذرا غصے سے ''نیک بخت'' کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ مثلاً اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو وہ کہا کرتیں: ''نیک بخت! تم نے یہ کام کیوں کیا؟'' شاید کوئی اور شخص ہوتا تو وہ ایسی صورت میں مجھے ''نیک بخت'' کی بجائے ''کم بخت'' کہتا لیکن یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ ناراضی کی کیفیت میں بھی ان کے منہ سے ہر کسی کے لیے دعا ہی نکلتی۔

موصوفہ انتہائی صابرہ وشاکرہ تھیں۔ مجھے یاد ہے ان کی زندگی میں ہمارے گھر میں فریج نہیں آیا تھا چنانچہ پانی بازاری برف سے ٹھنڈا کیا جاتا۔ رمضان کے مہینے میں جو اُن کی زندگی کے آخری سالوں میں جون اور جولائی کے گرم ترین مہینوں میں بھی آتا رہا وہ روزہ بالعموم تازہ پانی سے تیار کئے ہوئے چینی کے شربت کے ساتھ کھولتیں۔ میں انہیں کئی بار کہتا کہ وہ برف ڈال کر اسے ٹھنڈا کر لیں مگر وہ ہمیشہ جواب دیتیں کہ وہ اپنی عادت نہیں بگاڑنا چاہتیں۔ ان کا استدلال یہ ہوتا کہ اس وقت تو اتفاقاً برف موجود ہے لیکن اگر کبھی برف میسر نہ ہوئی تو ان

کے لیے تازہ پانی سے تیار شدہ شربت پینا مشکل ہو جائے گا۔

ماسی جی کے ذوقِ مطالعہ کے حوالے سے شاید یہ بات قارئین کے لیے دلچسپی کی حامل ہو کہ اس زمانے میں پلیتھین بیگز کا رواج شروع نہ ہوا تھا اور دکاندار اشیائے خورونوش زیادہ تر کاغذ کے لفافوں میں ڈال کر دیا کرتے تھے۔ یہ لفافے درسی کتابوں یا استعمال شدہ کاپیوں سے بنے ہوتے تھے۔ اگر کوئی ایسا لفافہ گھر میں آ جاتا تو ماسی جی اسے بہت احتیاط سے کھول کر اس پر لکھی ہوئی تحریر کا مطالعہ کرتیں۔ کوئی نصیحت آموز واقعہ ہوتا تو مجھے اور میری بہنوں کو ضرور سناتیں بلکہ پڑھاتیں۔

جب میں بی اے کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور چلا گیا تو ہفتے دو ہفتے میں ایک بار ربوہ آیا کرتا تھا۔ میں کوشش کرتا کہ ایسی بس پر سفر کروں جو مجھے مغرب سے پہلے ربوہ پہنچا دے۔ اگر مجھے ربوہ پہنچنے میں ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو ماسی جی بے چین ہو جاتیں اور برقعہ اوڑھ کر خود لاری اڈے پر پہنچ جاتیں اور جب تک میں نہ پہنچ جاتا وہ وہیں بیٹھ کر میری خیریت کے لیے دعائیں مانگتی رہتیں۔

گفتگو میں لغویات سے پرہیز کرتیں۔ اگر کسی مجلس میں کوئی غیر سنجیدہ بات چل نکلتی تو وہ وَھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ کے مصداق اس مجلس سے اُٹھ جاتیں۔ بات چیت ہمیشہ سنجیدگی اور شائستگی کے ساتھ کرتیں اور اس پر دینی اور مذہبی رنگ بالعموم غالب ہوتا۔

نَھْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ اور دَعْوَۃٌ اِلَی الْخَیْرِ آپ کا شیوہ رہا۔ ہمیشہ اپنے سے چھوٹوں کی اصلاح کا خیال دامنگیر رہتا اور وہ انہیں نماز باجماعت و دیگر احکاماتِ شرعی کی پابندی کی تلقین کرتیں۔ وہ اپنے عزیزوں کو شعائرِ اسلامی کا پابند دیکھنے کی خواہاں تھیں۔

لڑائی جھگڑے، گالی گلوچ، فتنہ و فساد اور جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی اور بظاہر معمولی نیکیوں کا بھی خیال رکھتیں مثلاً جب کوئی نیا کپڑا سِل کر آتا تو جمعہ کے روز پہنتیں تاکہ بابرکت ثابت ہو۔ اسی طرح سنتِ نبوی کے مطابق جمعہ کو غسل اور دُھلے ہوئے کپڑے پہننے کا اہتمام بھی کرتیں۔

رمضان المبارک کے ایام میں بیت مبارک میں ہونے والے دروس میں شمولیت اپنا فرض سمجھتیں اور نمازِ تراویح میں بھی شامل ہونے کی کوشش کرتیں۔

سونے سے قبل درود شریف، آیت الکرسی اور بعض دیگر آیاتِ قرآنی پڑھنے کی عادی تھیں۔ بہت دعا گو خاتون تھیں اور بسا اوقات انہیں سچی خوابیں بھی آیا کرتی تھیں۔

مہمان نواز تھیں۔ صدقہ کی برکات سے بخوبی آگاہ تھیں اور حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتی ہی رہتیں۔ اپنے بھانجے بھانجیوں، ان کے بچوں اور اپنے بھتیجے بھتیجی سے بہت پیار تھا۔ ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے میں ان سے بہت بے تکلف تھا۔ وہ میرے آرام و آسائش کا ہر ممکن خیال رکھتیں اور باوجود کمزوری کے گھر کے کام کاج میں میری والدہ کا ہاتھ بٹاتیں۔

غیبت ایک انتہائی قبیح فعل ہے اور قرآنِ پاک نے اسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا

ہے تاہم بدقسمتی سے عام طور پر غیبت وہمارے معاشرے میں کوئی بڑی اخلاقی کمزوری نہیں سمجھا جاتا اور جہاں دو شخص بیٹھتے ہیں وہ تیسرے شخص کی برائی شروع کر دیتے ہیں لیکن میں نے انہیں کبھی کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔
ماسی جی نے مورخہ ۴ جون ۱۹۶۸ء بروز منگل وفات پائی۔ ان کی وفات کا واقعہ جو اسی کتاب میں کسی اور جگہ قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے خاصا افسوس ناک ہے تاہم وہ ہمیں کسی آزمائش میں ڈالے بغیر خاموشی سے اگلے جہان سدھار گئیں۔

ان کی نمازِ جنازہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے بعد نمازِ عصر پڑھائی۔ جب حضور کو مرحومہ کے ساتھ میرے تعلق کا علم ہوا تو حضور نے نمازِ جنازہ کی ادائی کے بعد مجھ سے تعزیت فرمائی اور جنازے کو دور تک کندھا دیا۔

مرحومہ لاولد تھیں۔ ان کے بہت قریبی رشتہ داروں میں ہمارے علاوہ ان کے ایک بھائی مرزا محمد یعقوب ربوہ ہی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے ایک بھانجے قاضی منظور احمد جو اُن دنوں لاہور میں مقیم تھے اور ان سے بہت پیار کرتے تھے جنازے پر لاہور سے پہنچ گئے۔ کچھ اور بھانجے بھانجیوں نے جن کا تعلق جماعت سے نہ تھا پرواہ نہ کی لیکن مجھے ان کی وفات کا بے حد دُکھ تھا لہٰذا ان کی میت کو قبر میں اتارتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا اور میں دل کی گہرائی سے ان کی مغفرت اور بلندی درجات کے لیے دعا کرنے لگا۔

میں مرحومہ کو بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے میری تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ وہ میری خالہ تھیں لیکن انہوں نے مجھے ماں کا پیار دیا اور ہر طرح میرا خیال رکھا۔ وہ میرے ہر دُکھ سُکھ میں شریک تھیں لہٰذا ان کی وفات میرے لیے ایک بڑا سانحہ تھا جسے میں اب تک نہیں بھول پایا۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ میرے دل میں ربوہ کی یادوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے اور ان کا ایک بڑا حصہ جماعتی تنظیموں کے اجتماعات، جلسہ سالانہ اور ربوہ میں گذرے ہوئے شب و روز سے تعلق رکھتا ہے۔

یہاں پنجوقتہ نمازیں، دعائیں، یہاں شش جہت سجدۂ عاشقانہ

اُن دنوں ربوہ کی آبادی بہت تھوڑی تھی اور تمام لوگ ایک دوسرے کو نام سے نہیں تو چہرے سے ضرور پہچانتے تھے۔ جماعتی تنظیمیں بہت فعال تھیں اور وہ افرادِ جماعت کی تربیت کے لیے ہر دم کوشاں رہتیں۔ بچوں کو بظاہر چھوٹی چھوٹی لیکن اہم باتیں ذہن نشین کرائی جاتیں۔ انہیں سکھایا جاتا تھا کہ راستے میں ملنے والے ہر شخص کو بلا لحاظِ مرتبہ و بلا تخصیصِ عمر سلام کیا جائے۔ انہیں سمجھایا جاتا تھا کہ صرف السلام علیکم کہنے والے کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے جب کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے والے کو بیس نیکیاں ملتی ہیں اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ کہنے والے کے نامہ اعمال میں تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں لہٰذا انہیں ہمیشہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ ہی کہنا چاہیے۔ اسی طرح یہ بات بھی ان کے اذہان میں راسخ کر دی جاتی تھی کہ سلام میں پہل نہ کرنے والا احکاماتِ اسلامی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ربوہ میں شاذ ہی کوئی شخص ہوگا جو راہ میں ملنے والے ہر واقف و ناواقف کو سلام کا ہدیہ پیش نہ کرتا ہو۔

ربوہ میں پنجوقتہ نمازوں کی باجماعت ادائی کو باقی ہر شے پر مقدم رکھا جاتا تھا۔ یوں تو اس قصبے کے ہر محلے میں بیوت الذکر موجود تھیں جہاں ملحقہ آبادی کے فرزندانِ توحید دن میں پانچ بار خدائے واحد و یگانہ کے حضور سربسجود ہوتے تاہم بیت مبارک کو ربوہ کی بیوت میں مرکزی حیثیت حاصل تھی لہٰذا یہاں نماز پڑھنے والوں کی تعداد باقی بیوت سے کہیں زیادہ ہوتی۔ اپنی صحت کے زمانے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی خود یہاں نمازوں کی اقتدا فرماتے تھے لیکن قاتلانہ حملہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کے سبب جب آپ صاحبِ فراش رہنے لگے تو سلسلہ کے بعض نامور بزرگان نے یہاں پر امام الصلوٰۃ کے فرائض سرانجام دینا شروع کر دیئے۔ ان بزرگان کی فہرست خاصی طویل ہے لہٰذا اسے دہرائے بغیر میں یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۶۵ء میں حضور کی وفات حسرت آیات کے بعد بیت مبارک میں تمام نمازیں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی اقتدا میں ادا کی جانے لگیں۔

مجھے یاد ہے اہلِ ربوہ میں نماز کی عادت راسخ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی چنانچہ جماعتی تنظیموں کے ہر اجلاس اور تربیتی اجتماع میں نہ صرف نمازِ باجماعت کی ادائی کا اہتمام کیا جاتا بلکہ اس موضوع پر احکاماتِ ربانی، احادیثِ نبوی اور حضرت مسیح موعود کے ارشادات حاضرین کے سامنے بار بار دہرائے جاتے، نمازوں میں اطفال و خدام کی حاضری لگائی جاتی اور نماز باجماعت میں شامل نہ ہونے والے افراد کو اپنی یہ کمزوری دور کرنے کی طرف توجہ دلائی جاتی۔ چونکہ نماز فجر کے لیے وقت پر اُٹھنا ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہوتا لہٰذا احباب

کو وقت پر جگانے کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ بسا اوقات کسی طفل یا خادم کی ڈیوٹی لگائی جاتی [illegible] پہلے محلے کے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اہل خانہ کو نماز کے لیے جگاتے لیکن اس کا سب سے دلکش طریقہ یہ تھا [illegible] اطفال و خدام دو دو چار چار کی ٹولیوں میں پورے محلے کا چکر لگاتے اور بلند آواز سے صل علی نبینا صل علی محمد کا ورد کرتے چلے جاتے۔

جب یہ مسحور کن آواز کانوں میں پڑتی، سننے والا فوراً بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ [illegible] تحت بھی یہ آواز نظر انداز بھی کرنا چاہتا تو طوعاً و کرہاً بستر چھوڑ کر نماز کی تیاری شروع کر ہی دیتا۔

میں سمجھتا ہوں ربوہ کی بیوت الذکر میں فجر کی نماز میں معقول حاضری کا ایک بڑا سبب اطفال و [illegible] اس کاوش کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنا آرام تیاگ کر نماز سے کچھ دیر پہلے ایک جگہ جمع ہوتے اور [illegible] صورت میں اہل محلہ کو جگاتے۔

یہ خدا کا خاص احسان ہے کہ مجھے اپنے بچپن ہی سے بیت مبارک میں نماز کی ادائی کا موقع ملتا رہا۔ یوں بھی ہمارے گھر سے نزدیک ترین بیت یہی تھی لیکن ۱۹۵۸ء میں فضل عمر ہسپتال کے افتتاح کے ساتھ ہی یہاں ایک نئی بیت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس بیت کی بنیادی اینٹ بیت مبارک قادیان سے لائی گئی تھی اور اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے دعا فرمائی تھی لیکن اس کا سنگ بنیاد حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے رکھا۔ یہ بیت جو اب بیت یادگار کہلاتی ہے عین اس مقام پر تعمیر کی گئی ہے جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے افتتاح ربوہ کے موقع پر پہلی نماز ادا کی تھی۔ تاریخ احمدیت جلد بارہ کے مطابق اس جگہ پر ایک مستقل چبوترہ (جو بعد میں بیت میں تبدیل کر دیا گیا) بنانے کا خیال صوفی خدا بخش عبد زیروی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔

بیت یادگار کی محراب پر اب بھی ایک تختی نصب ہے جس پر اس بیت کی وجہ تعمیر بایں الفاظ بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مرکز ربوہ کے قیام کی تجویز کے بعد

حضرت .... خلیفۃ المسیح الثانی

نے

۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء مطابق ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۶۰ھ

کو

اس جگہ پہلی نماز ادا فرمائی اور نہایت دردمندانہ دعاؤں کے ساتھ

اس مرکز کا افتتاح کیا

چونکہ یہ بیت بہت چھوٹی تھی لہٰذا اس کی تعمیر جلد ہی مکمل ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی یہاں نماز کی [illegible]

...ہوگئی۔ اُن دنوں ہسپتال کی چاردیواری نہیں ہوتی تھی چنانچہ میں اپنے گھر سے باہر نکلتا تو اکا دکا ... بیت یادگا
...ہوتا۔ اس بیت کی تعمیر سے میری نماز باجماعت کی عادت میں مزید پختگی آئی۔ ادھر اذان کی آواز کان میں پڑتی
...بیت یادگار جا پہنچتا۔ کبھی وقت سے ذرا پہلے پہنچ جاتا تو نوافل کی سعادت بھی مل جاتی کہ اس بیت میں کوئی مستقل
...موجود نہ تھا۔

مجھے اس بیت میں محلہ کے کئی بزرگان کی اقتدا میں نماز کی ادائی کا موقع ملا جن میں سے مجھے فوری طور ... دوست محمد شاہد، صوفی رمضان علی اور عبدالرحیم کاٹھگڑھی کے اسمائے گرامی یاد آ رہے ہیں۔ وہ دوست جو ... کی ادائی کے لیے یہاں پر آتے تعداد میں بہت زیادہ نہ تھے لیکن اب ان کی مکمل فہرست تیار کرنا ممکن ... ہاں! ان میں سے چوہدری عبدالرحیم کاٹھگڑھی کے چاروں صاحبزادوں یعنی سمیع، مبارک، منور اور مظفر ... محمد یعقوب؛ پیر خلیل احمد؛ چوہدری نور محمد؛ ملک گل محمد؛ مرزا نذیر علی قادیانی؛ مولوی فضل دین وکیل اور ... چوہدری صادق علی کے نام ابھی تک میرے حافظے میں موجود ہیں۔

بیت یادگار کے آئمہ کرام اور مقتدیوں کی اس فہرست میں سے مولانا دوست محمد شاہد کا نام تو کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ باقی احباب میں سے صوفی رمضان علی، عبدالرحیم کاٹھگڑھی، ملک گل محمد، مرزا نذیر علی قادیانی، مولوی فضل دین وکیل، پیر خلیل احمد اور چوہدری نور محمد کا تفصیلی تعارف اس کتاب کے بعض اور مقامات پر موجود ہے۔ رہے محمد یعقوب تو وہ خلافت لائبریری کے کارکن تھے جب کہ صادق علی، چوہدری نور محمد کی اہلیہ کے بھتیجے تھے اور اُن دنوں تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے بعد میں پشاور یونیورسٹی سے ایم ایس سی باٹنی کر لیا اور وہ کالج میں لیکچرر کے طور پر کام کرنے لگے۔

وہ طبعاً خاموش تھے۔ بعد میں اُن سے میل جول کچھ بڑھا مگر انہوں نے اپنی "خو" نہ چھوڑی اور ہم اپنی "وضع" بدلنے پر تیار نہ ہوئے لہٰذا ان سے بے تکلفانہ گفتگو کا موقع بہت کم آیا لیکن عزت و احترام کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ وہ تعلیم الاسلام کالج سے ریٹائرمنٹ کے بعد آسٹریلیا منتقل ہو گئے جہاں ان کے بیٹے پہلے سے مقیم تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ پہلے بعارضہ کینسر وفات پائی اور وہیں آسودہ خاک ہوئے۔

ہاں! تو میں ذکر کر رہا تھا بیت یادگار کے نمازیوں کا اور میں آپ کو بتانا یہ چاہتا تھا کہ موسم سرما میں نماز ظہر اور نماز عصر کے علاوہ باقی تینوں نمازیں ہال کے اندر ادا کی جاتیں لیکن موسم گرما میں فجر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں صحن میں پڑھی جاتیں۔ شروع میں صحن کے اندر کھجور کی بنی ہوئی صفوں پر نماز ادا کی جاتی تھی لیکن بعد میں مخیر احباب کے تعاون سے آہستہ آہستہ یہاں دریاں آ گئیں جس سے نماز ادا کرنے میں مزید سہولت پیدا ہو گئی۔

اس بیت کی ایک منفرد خوبی جو میرے علم کے مطابق ربوہ کی کسی اور بیت میں نہ تھی اس کے صحن میں بنے ... سیمنٹ کے وہ تھڑے تھے جہاں وقت سے پہلے آ جانے والے نمازی آرام کے ساتھ بیٹھ سکتے تھے۔ یہ ... ان ضعیف العمر نمازیوں کے لیے خاص طور پر بہت بڑی سہولت تھے جن کے لیے بعض جسمانی ...

عوارض کی وجہ سے فرش پر بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔
اس زمانے میں سکیورٹی کی صورت حال ایسی پریشان کن نہیں تھی چنانچہ بیت یادگار کے دروازے ہر
وقت کھلے رہتے۔ امتحانات سے کچھ عرصہ پہلے جب ہمیں کالج کی طرف سے فری کر دیا جاتا تو میں دن کے وقت
کتابیں لے کر وہاں جا بیٹھتا کہ اس جیسی یکسوئی گھر میں حاصل نہ ہو سکتی تھی۔

ربوہ میں نمازوں کے اوقات میں تمام کاروباری سرگرمیاں یکسر معطل ہو جاتیں۔ ندا کی آواز کانوں میں
پڑتے ہی دکانوں کے شٹر گرنے لگتے اور دیکھتے ہی دیکھتے بازاروں میں ہُو کا عالم طاری ہو جاتا۔
بعینہٖ یہی کیفیت نماز جمعہ کے وقت دیکھنے میں آتی۔ اہل ربوہ آیتِ قرآنی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا
نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ کی عملی تصویر بن جاتے۔ وہ جمعہ کا
وقت ہوتے ہی خرید و فروخت چھوڑ کر تیز قدم اللہ کے ذکر کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ وہ اس ابدی حقیقت سے
پوری طرح آگاہ تھے کہ یہی کام ان کے لیے بہتر ہے۔

عام رواج کے برعکس ربوہ کے دفاتر اور سکولوں میں ہفتہ وار تعطیل اتوار کی بجائے جمعہ کو ہوا کرتی تھی
چنانچہ گھروں میں صبح سے ہی نمازِ جمعہ کی تیاری شروع ہو جاتی۔ مرد و زن غسل کرتے اور حسب حالات صاف
ستھرے کپڑے پہن کر نمازِ جمعہ کی ادائی کے لیے تیار ہو جاتے۔

بیت اقصیٰ کی تعمیر سے پہلے نمازِ جمعہ بیت مبارک میں ادا کی جاتی تھی۔ اس وقت ندا پر حکومتی پابندی نہ تھی
چنانچہ دوپہر کے بارہ بجتے ہی لاؤڈ سپیکر پر پہلی ندا ہو جاتی۔ مختلف ادوار میں مختلف افراد یہ ندا دیتے رہے ہیں۔
محمد حسین مؤذن تو خیر تھے ہی اسی کام پر مامور، ان کے علاوہ رشید امریکن اور بعض دیگر دوست بھی یہ فریضہ سرانجام
دیتے رہے ہیں۔

یاد رہے رشید امریکن ایک سیاہ فام امریکی تھے جو احمدیت قبول کرنے کے بعد ربوہ آ گئے اور جامعہ احمدیہ
میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بطور مشنری اپنے وطن واپس تشریف لے گئے۔ وہ قیام پاکستان کے ابتدائی
سالوں میں یہاں آئے اور ۱۹۵۴ء کے آخر میں واپس چلے گئے لہٰذا میں ان کے ساتھ ملاقات کا دعویٰ تو نہیں کر
سکتا البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں انہیں پہچانتا تھا۔ اسی عرصے میں ان کی شادی مربی سلسلہ، محمد ابراہیم خلیل کی
صاحبزادی سائرہ قدسیہ سے ہوگئی۔ محمد ابراہیم خلیل ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کے بہنوئی تھے اور جیسا کہ اس کتاب میں کسی
اور جگہ ذکر آ چکا ہے اس خاندان کے ساتھ ہمارے گہرے خاندانی مراسم تھے لہٰذا مجھے اپنے گھر میں ہونے والی
گفتگو سے پتا چلا کہ اس شادی کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے رشید امریکن کو اپنا ایک استعمال شدہ کُلّہ
عنایت فرمایا جس کے اندر حضرت مسیح موعود کی قمیص کا ایک ٹکڑا بطور تبرک سیا گیا تھا۔
اس بحث سے قطع نظر کہ بعد میں اس شادی کا کیا انجام ہوا مجھے یہاں صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ
رشید امریکن (جو ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۸ء کے دوران امریکہ کے نیشنل امیر رہے اور جنہوں نے ۷ فروری ۲۰۱۵ء کو
اکانوے برس کی عمر میں ملواکی (امریکہ) میں وفات پائی) کی یہ ندا اپنے مخصوص انداز کے سبب سننے والوں کے

کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہوتی۔

ان کے علاوہ ربوہ کے جن دوستوں کو وقتاً فوقتاً بیت مبارک میں نِدا دینے کی سعادت حاصل ہوتی رہی ان میں بشارت اللہ بھی شامل تھے جو گول بازار میں چھوٹے گوشت کا کام کرتے تھے لیکن سنتِ بلالی کی اتباع بہت خوبصورتی سے کرتے۔ اخبار ''ریاست'' دہلی کے ایڈیٹر، سردار دیوان سنگھ مفتون ۱۹۶۰ء میں ربوہ آئے تو بھی بشارت اللہ بیت مبارک میں فجر کی نِدا دیا کرتے تھے۔ سردار صاحب نے وطن واپسی پر اپنے اخبار میں ربوہ کے اس دورے کے بارے میں دو اقساط پر مشتمل ایک مضمون لکھا جس میں نے انہوں نے موصوف کی خوش الحانی کی بایں الفاظ تعریف کی ہے: ''صبح پانچ چھ بجے کے قریب (......) ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خوش الحانی کے ساتھ (......) نہ سنی تھی چنانچہ صبح میں نے ایک دوست سے یہ دریافت کیا کہ کیا (......) دینے والا عرب تھا یا پاکستانی تو معلوم ہوا کہ (......) ربوہ کا ہی ایک پاکستانی ہے۔''

بشارت اللہ ہی کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء کو بیت اقصیٰ کے افتتاح کے موقع پر جمعہ کی نِدا دیں۔

میرے علم کے مطابق بشارت اللہ صدر انجمن احمدیہ کے کارکن تو نہ تھے لیکن ان کی رہائش انجمن کوارٹرز میں تھی۔ ان کا بڑا بیٹا، حفیظ اللہ سکول میں میرا ہم جماعت تھا لیکن کچھ یاد نہیں آتا ہم دونوں کا ساتھ کب چھوٹا۔

ابا جی بشارت اللہ کے پرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ زمانہ قادیان میں ایک بار سائیکل چلانے کا مقابلہ ہوا تو اس نوجوان نے یہ ریس ایک بڑے مارجن سے جیت لی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی جو اس موقع پر موجود تھے بشارت اللہ کی برق رفتاری پر بہت خوش ہوئے اور آپ نے برجستہ فرمایا: ''تم بشارت اللہ نہیں سائیکل اللہ ہو!''

ایک اور صاحب جو عرصہ دراز تک اس بیت میں نِدا دیتے رہے اور بعض مقامی جلسوں کے علاوہ جلسہ سالانہ پر بھی نظمیں پڑھتے رہے ملک مبشر احمد تھے جو محلّہ دارالصدر غربی والے ملک ممتاز علی کے صاحبزادے اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے لیکچرر، عبدالشکور اسلم کے برادرِ نسبتی تھے۔

ملک ممتاز علی محکمہ جیل خانہ جات سے ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ منتقل ہوئے تھے۔ وہ ایک نیک انسان تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے ربوہ میں اپنا مکان تعمیر کیا تو حصولِ برکت کی نیت سے بعض واقف زندگی طلبہ کو کچھ عرصہ کے لیے اپنے ہاں مفت رہائش مہیا کی۔ انہیں طب سے دلچسپی تھی اور انہوں نے ''حبِ صدکام'' کے نام سے ایک دوا تیار کر رکھی تھی۔ ممکن ہے وہ اس دوا کا اشتہار بھی دیتے ہوں لیکن مجھے ان کی طرف سے اپنے خاص احباب سے ملاقات کر کے اس دوا کی خرید کی ترغیب دلانا یاد ہے چنانچہ ایک بار وہ ہمارے گھر بھی تشریف لائے اور دیر تک ابا جی کے ساتھ ''حبِ صدکام'' کے فوائد کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مبشر نام ہی کے ایک اور صاحب بھی کچھ عرصہ فجر اور جمعہ کی نِدا دیتے رہے ہیں۔ وہ حضرت بھائی عبدالرحیم قادیانی کی زندگی میں ان کی خدمت پر مامور تھے تاہم بھائی جی کی وفات کے بعد

ہو گئے تھے۔

وہ حضرت حکیم محمد عمر کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ بزرگوار کی خواہش پر رضا کارانہ طور پر بجالا رہے تھے" ان کے ایک بھ
" لیکن وہ یہ خدمتِ اپنے والدِ بزرگوار ... وہ جلد ہی ربوہ سے چلے گئے اور محکمہ سیٹلمنٹ اور پھر پی آئی اے
منیر کھوکھر نے کچھ ہی عرصے پہلے مجھے بتایا" میں ملازمت کرتے رہے لیکن خوش الحانی کے علاوہ ان کا ایک تعارف شاعری کے حوالے سے بھی ہے۔ وہ ادبی
حلقوں میں وسیم گورداسپوری کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور ان کا کلام "ضیائے طور" کے نام سے ۱۹۷۱ء میں
چھپ گیا تھا۔"

ہاں تو بات ہو رہی تھی جمعہ کی پہلی صدا کی جسے سنتے ہی مرد تو مرد، شہر کی عورتیں بھی اپنے گھروں سے نکل پڑتیں۔ سیاہ اور سفید برقعوں میں ملبوس ان پاک باز احمدی خواتین میں ہر عمر کی عورتیں شامل ہوتیں۔ وہ بھی جو قلانچیں بھرتی ہوئی بیت مبارک کی طرف جا رہی ہوتیں اور وہ بھی جن کے لیے چلنا بھی دو بھر تھا لیکن وہ افتاں و خیزاں بیت مبارک میں پہنچ کر ہی دم لیتیں۔ یہ ایک انتہائی روح پرور منظر ہوتا جو مجھے بعد میں کسی اور جگہ نظر نہیں آیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی بیماری کے دوران بالعموم مولانا جلال الدین شمس جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ہاں! ان کی عدم موجودگی میں یہ کام کسی اور بزرگ کے سپرد ہو جاتا۔

وہ احباب جو اپنی یا اپنے اہل و عیال کی طویل بیماری کے ہاتھوں پریشان ہوتے اور وہ جو کوئی امتحان دے رہے ہوتے، کسی مقدمہ میں ماخوذ ہوتے یا انہیں کوئی اہم مہم درپیش ہوتی اس موقع پر دعا کا اعلان کرا دیتے۔ ایسے اعلانات خطبہ سے پہلے کئے جاتے۔ یہ اعلانات بالعموم مولوی ابوالمنیر نورالحق یا قاضی عزیز احمد، انچارج لاؤڈ سپیکر کرتے تھے۔

دیر سے موصول ہونے والی درخواست ہائے دعا اور اہم جماعتی نوعیت کی اطلاعات کا اعلان خطبہ ثانیہ کے دوران کیا جاتا تھا۔ ان اعلانات میں سب سے اہم اعلان حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی صحت کے بارے میں ہوتا۔ احباب کی خلافت کے ساتھ وابستگی اور حضور کے ساتھ عقیدت کا عالم یہ تھا کہ آپ کی خیریت کی خبر سن کر ان کے چہرے کھل اٹھتے اور بیت الذکر "الحمدللہ" کے کلماتِ تشکر سے گونج اٹھتا لیکن آپ کی علالت کی خبر سن کر ان کے چہرے لٹک جاتے اور وہ آپ کی صحتیابی کے لیے دعا مانگتے مانگتے اپنی سجدہ گاہیں آنسوؤں سے تر کر دیتے۔

یہاں شاید اس امر کا ذکر بے جا نہ ہو کہ ۱۹۵۴ء کے قاتلانہ حملہ کے بعد حضور نے ایک لمبا عرصہ بیماری میں گذارا جو وقتاً فوقتاً اپنا رنگ بدلتی رہی۔ الفضل میں آپ کی صحت کے متعلق تازہ ترین اطلاع روزانہ کی بنیاد پر شائع ہوتی تھی چنانچہ جمعہ کے علاوہ بھی ربوہ کی تمام بیوت الذکر میں حضور کی صحت کے لیے دن رات دعائیں جاری رہتیں۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا

کے مصداق مخلصین جماعت آدھی آدھی رات کو اٹھ کر حضور کی صحت کے لیے دعائیں مانگتے اور نفلی روزے

رکھتے۔ نمازوں میں حضور کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعائیں مانگی جاتیں۔ ردّ بلا کے لیے صدقات کی ادائی بھی اس ماحول کی ایک خاص بات تھی۔

بیت مبارک میں نماز جمعہ کے حوالے سے دو باتیں اور بھی قابلِ ذکر ہیں جن میں سے ایک کا تعلق بعض مرحومین کی نمازِ جنازہ سے ہے تو دوسری کا اس موقع پر ہونے والے اعلاناتِ نکاح سے۔

اُن دنوں بھی بہشتی مقبرہ میں تدفین کے لیے بیرون ربوہ سے میتیں ربوہ لائی جاتی رہتی تھیں۔ یہ شہر خود بھی فرشتہ اجل کی دسترس سے باہر نہ تھا چنانچہ نماز جمعہ کے بعد موجود جنازے بھی پڑھائے جاتے اور بعض مرحومین کی نمازِ جنازہ غائب بھی ادا کی جاتی جس کے بعد جنازہ قبرستان لے جایا جاتا۔

چونکہ ربوہ کے اکثر لوگ ایک دوسرے کو جانتے اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے لہٰذا وہ بڑی تعداد میں جنازوں کے ساتھ قبرستان جایا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک جنازے کو کندھا دینے میں دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔ اسی پس منظر میں میتیں قبرستان پہنچانے کے لیے ایک خصوصی چارپائی تیار کی گئی جس کے ساتھ حسبِ ضرورت لمبے لمبے بانس باندھے جاسکتے تھے۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا۔ ربوہ کی آبادی میں اضافہ ہوگیا اور لوگوں کی مصروفیات بھی بڑھ گئیں چنانچہ جنازوں کے ہمراہ جانے والوں کی تعداد میں روز بروز کمی آنے لگی اور بعض دفعہ تو جنازے کو کندھوں پر اُٹھا کر قبرستان پہنچانا دوبھر ہو جاتا۔ تب نظام کی طرف سے ایک ہتھ ریڑھی متعارف کرائی گئی جسے کھینچنے کے لیے زیادہ افرادی قوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب تو ربوہ کا قدیم بہشتی مقبرہ قبروں سے پُر ہو چکا ہے اور نیا بہشتی مقبرہ شہر سے ذرا ہٹ کر واقع ہے چنانچہ یہ ہتھ ریڑھی بھی تقریباً متروک ہوگئی ہے اور اس کی جگہ میّت گاڑیوں نے لے لی ہے۔

قبرستانِ عام میں میتوں کی تدفین کے لیے دونوں طریقے رائج تھے۔ بعض میتیں لحد میں دفن کی جاتیں تو بعض تابوت میں لیکن بہشتی مقبرہ میں میتیں بالعموم تابوت میں دفن کی جاتی تھیں۔ تابوت قبر میں اتارنے کے بعد اس پر کڑیاں پھیلا کر ٹائلیں جوڑ دی جاتیں۔ یہ اہتمام اس مفروضے کی بنا پر کیا جاتا تھا کہ تابوت ٹوٹ پھوٹ سے تادیر محفوظ رہے گا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ یہ کڑیاں کچھ ہی عرصے میں شکستہ ہو کر تابوت کے اوپر گر جاتی ہیں جس سے قبر میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ تب سے یہ طریقہ متروک ہو گیا ہے۔ اب مٹی ڈالنے سے پہلے تابوت کے چاروں جانب ریت ڈالی جاتی ہے تا کہ قبر کے اندر کوئی خلا باقی نہ رہے۔

یہ تو تھیں نمازِ جنازہ اور تدفین کے بارے میں کچھ باتیں۔ جہاں تک اعلانِ نکاح کا تعلق ہے یہ ربوہ کی کسی بھی بیت میں یا استثنائی حالات میں گھر میں بھی ہوسکتا تھا لیکن احمدیوں کی اکثریت بیت مبارک میں نماز جمعہ کے بعد اعلانِ نکاح کو ترجیح دیتی۔ ایسی صورت میں اس امر کا اعلان بالعموم خطبہ جمعہ سے پہلے کر دیا جاتا۔ دُلہا اور دلہن کے خاندانوں نے تو اس تقریب میں شامل ہونا ہی ہوتا تھا، اس طرح بہت سے دیگر لوگوں کو بھی دعا میں شمولیت کا موقع مل جاتا۔

یہ تقریب انتہائی سادہ ہوتی۔ اس موقع پر خلیفہ وقت یا جماعت کے کوئی اور بزرگ مختصر سا خطبہ نکاح بھی

ارشاد فرماتے جس میں نکاح کے بارے میں پُر حکمت اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالی جاتی اور فریقین کی قابلِ ذکر جماعتی خدمات کا تذکرہ بھی ہوتا۔ ایجاب وقبول کے بعد دعا ہوتی۔

اعلانِ نکاح کے بعد چھوہاروں کی تقسیم کا دلچسپ مرحلہ شروع ہوتا۔ اُس زمانے میں نمود ونمائش کم تھی اور بِد کی تھیلیوں یا ڈبیوں کا رواج شروع نہ ہوا تھا چنانچہ دولہا کا ایک نمائندہ چھوہاروں اور مکھانوں کی گٹھڑی یا تھیلا ہاتھ میں پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے گرد جمگھٹا کرنے والوں کو ایک ایک مُٹھی چھوہارے دیتا چلا جاتا۔ بڑی عمر کے لوگ تو پھر بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے اور وقار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیتے لیکن بچوں کے لیے تو یہ ایک کھیل تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ چھوہاروں کے حصول کے لیے بدتمیزی سے بھی گریز نہ کرتے۔ بعض اوقات یہ بچے تقسیم کنندہ کے ہاتھ سے گٹھڑی ہی چھین لیتے اور کبھی اسے اتنا زِچ کر دیتے کہ وہ چھوہارے فرش پر پھینک کر راہِ فرار اختیار کرنے کو ترجیح دیتا اور اس دھکم پیل میں جو کچھ کسی کے ہاتھ آتا لے اُڑتا۔ عرصہ دراز تک یہی معمول رہا لیکن پھر کسی کو خیال آیا کہ یہ دھکم پیل بیت الذکر کے وقار کے منافی ہے چنانچہ بیت الذکر کے اندر چھوہاروں کی تقسیم پر پابندی لگا دی گئی۔ اب تقسیم کنندہ بیت الذکر کے باہر کھڑا ہو کر گھروں کو لوٹتے ہوئے نمازیوں کو مٹھیاں بھر بھر کر چھوہارے دیتا چلا جاتا جس سے پہلے والی ناپسندیدہ صورتِ حال بہت حد تک بدلنے لگی۔

نکاح کا ذکر ہوا ہے تو بارے کچھ ذکر شادی کی تقریبات کا بھی ہو جائے۔ ربوہ میں ہونے والی شادی کی تقریبات میں سادگی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا۔ جماعتی ہدایات کے تحت لڑکی والوں کی طرف سے مقامی مہمانوں کی تواضع پر مکمل پابندی تھی اور انہیں کھانے پینے کی کوئی چیز پیش نہ کی جا سکتی تھی۔ ہاں! بیرونِ ربوہ سے آنے والی باراتیں اور دلہن والوں کے بیرونِ ربوہ سے آئے ہوئے اعزہ واقربا اس پابندی سے مستثنیٰ تھے۔

اس زمانے میں ربوہ میں کوئی شادی ہال تھا نہ کوئی اور ایسی جگہ جہاں شادی کی تقریبات سرانجام پا سکیں لہٰذا باراتوں کا استقبال دلہن کے گھر پر کیا جاتا جہاں حسبِ ضرورت معمولی سا شامیانہ نصب کر کے مہمانوں کی نشست کا انتظام کر دیا جاتا۔ چونکہ اس موقع پر مہمانوں کی تواضع پر مکمل پابندی تھی لہٰذا شادی کی تقریبات انتہائی کم خرچ میں پایہ تکمیل کو پہنچ جاتیں۔

رُخصتی کی تقریبات خلیفہ وقت یا کسی معروف جماعتی بزرگ کی زیرِ صدارت منعقد ہوتیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی بیماری کے زمانہ میں ان تقریبات کی صدارت بالعموم حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد، حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، صاحبزادہ مرزا رفیع احمد یا جماعت کا کوئی اور بزرگ کرتا جب کہ حضور کی وفات کے بعد یہ تقریبات حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث یا کسی جماعتی بزرگ کی زیرِ صدارت ہونے لگیں۔

ان تقریبات کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوتا۔ ان دنوں تلاوت کرنے والے احباب میں سے حافظ محمد رمضان اور قاری محمد عاشق نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور ہر قابلِ ذکر شادی میں وہی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

تلاوت کے بعد یوں تو کوئی بھی دعائیہ نظم پڑھی جا سکتی تھی لیکن عام طور پر اس موقع پر پڑھے جانے

والے اشعار حضرت مسیح موعود کی نظم ''اولاد کے حق میں دعا'' سے لیے جاتے جس کا پہلا بند یہ ہے:

حمد و ثنا اسی کو جو ذات جاودانی
ہمسر نہیں ہے اس کا کوئی ، نہ کوئی ثانی
باقی وہی ہمیشہ غیر اس کے سب ہیں فانی
غیروں سے دل لگانا جھوٹی ہے سب کہانی
سب غیر ہیں وہی ہے اک دل کا یار جانی
دل میں مرے یہی ہے سُبْحَانَ مَنْ يَّرَانِی

آخر میں مہمانِ خصوصی دعا کرا دیتے جس کے بعد احباب رخصت ہو جاتے اور گھر میں باراتی یا دلہن کے قریبی رشتہ دار اور اس کی سہیلیاں ہی باقی رہ جاتیں۔ دلہن کی رخصتی کے ساتھ ہی یہ لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو تشریف لے جاتے۔

ولیمہ کے موقع پر دولہا کی طرف سے مہمانوں کو کھانے کی دعوت دی جاتی جس میں مہمان ذوق و شوق سے شامل ہوتے۔ اگر چہ اس دعوت کا معیار دولہے کی مالی اور معاشرتی حیثیت پر منحصر تھا اور عام لوگ تنبو قنات پر اُٹھنے والے اخراجات کی بچت کے لیے دعوت کا اہتمام گھر کے اندر ہی کر لیتے تھے تاہم پلاؤ اور زردہ اس موقع پر پیش کئے جانے والے کھانے کا لازمی جزو سمجھے جاتے تھے۔ یہ کھانا ربوہ کے بعض حجام تیار کیا کرتے تھے جو اس معاملے میں خاصے شہرت یافتہ تھے۔

اس تقریب کا اختتام بھی اجتماعی دعا پر ہوتا۔ بعد میں جب معاشرہ بدلنے لگا اور اہلِ ربوہ کے مالی حالات بھی قدرے بہتر ہو گئے تو اس سلسلے میں کچھ نرمی برتی جانے لگی اور مرکز کی طرف سے رخصتانہ کے موقع پر مدعوئین کو اسراف سے اجتناب کرتے ہوئے چائے وغیرہ پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی البتہ اس موقع پر دعوتِ طعام بدستور ممنوع رہی۔ اب دلہن والوں کی طرف سے مقامی مہمانوں کی تواضع موسم کے مطابق گرم یا سرد مشروبات اور سنیکس سے کی جانے لگی تھی اور ولیمے کی تقریبات میں بھی کسی حد تک جدّت کا عنصر داخل ہونے لگا تھا۔

رمضان کا بابرکت مہینہ اہلِ ربوہ کے لیے ناقابلِ بیان روحانی مسرت کا پیغام لے کر آتا۔ رمضان کی آمد کے ساتھ ہی اہلِ ربوہ کے معمولات بدل جاتے۔ وہ دن کے وقت روزہ رکھتے، قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے، درسِ قرآن میں شامل ہوتے، نمازِ تراویح ادا کرتے اور رات کے پچھلے پہر اپنے رکوع و سجود سے اپنی سجدہ گاہوں کو تر کر دیتے۔

فضیلتوں والے اس مہینے میں دن کا آغاز سحری سے ہوتا۔ اہل ربوہ کو بروقت جگانے کے لیے فجر کی ندا سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے بیت مبارک سے اعلانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو وقفے وقفے سے اختتامِ سحر تک جاری رہتا۔ بعض محلوں میں ڈھنڈورچی بھی یہ خدمت سرانجام دیتے اور کبھی کبھی اطفال و خدام کی ٹولیاں ہر دروازہ کھٹکھٹا کر لوگوں کو جگاتیں۔

بیت الذکر کا رخ کرتے۔ نماز و درسِ حدیث سے فراغت پا کر کھانا کھا کر دعا کے ساتھ ہی اہلِ ربوہ بہشتی مقبرہ کی جانب نکل جاتے اور باقی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔ مرحوم عزیزوں کی قبور پر دعا کے لیے بہشتی مقبرہ کی جانب نکل جاتے اور باقی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔

ماہِ صیام کے دوران موسم گرما میں نمازِ عصر اور مغرب کے درمیان اور موسم سرما میں نمازِ ظہر و عصر کے درمیان درسِ قرآن ربوہ کے ماحول کا خاصہ تھا۔ روزانہ ایک پارے کا درس ہوتا اور یوں رمضان کے مہینے میں ترجمہ و تفسیر کا کم از کم ایک دور مکمل کر لیا جاتا۔ درس دینے والے صاحبان قرآن کریم کے کچھ حصہ کی تلاوت کے بعد اس کا اردو ترجمہ اور عام فہم تفسیر بیان کرتے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس درس کا اہتمام صرف بیت مبارک میں ہوتا تھا۔ اس مقصد کے تحت قرآن کریم کو پانچ پانچ پاروں کے چھ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور ہر حصے کا درس علیحدہ علیحدہ علماء کے سپرد ہوتا۔ ان علماء میں سے مجھے صاحبزادہ مرزا رفیع احمد، قاضی محمد نذیر لائلپوری، مولانا جلال الدین شمس، مولانا ابوالعطا جالندھری، مفتی سیف الرحمٰن، مولانا محمد احمد جلیل، مولانا ابوالمنیر نورالحق، مولانا دوست محمد شاہد اور حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے اسمائے گرامی اب تک یاد ہیں۔ اہلِ ربوہ اس درس میں بہت ذوق و شوق سے شامل ہوتے۔ وہ قرآنِ پاک ہاتھوں میں لیے نمازِ عصر سے ذرا پہلے بیت مبارک میں پہنچ جاتے اور جب درس شروع ہوتا قرآنِ پاک کھول کر سامنے رکھ لیتے تا کہ اپنی قرأت کو بہتر بنا سکیں اور ترجمہ و تفسیر بسہولت سمجھ سکیں۔ عبدالسلام اختر نے ان ہی پاک محافل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

لیے ہاتھوں میں قرآں صف بہ صف بیٹھے ہیں متوالے
جمالِ دیں کے پروانے ، متاعِ دیں کے رکھوالے
یہ ہیں عشقِ نبی خونِ جگر میں پالنے والے
ان ہی ہاتھوں میں تقدیرِ جہاں معلوم ہوتی ہے
زمینِ ربوہ بزمِ آسماں معلوم ہوتی ہے

۲۹ رمضان المبارک کو دعا ہوتی۔ اس موقع پر بیت مبارک کھچا کھچ بھر جاتی حتٰی کہ صحن میں بھی تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ بعض اوقات آخری چند سورتوں کا درس حضرت خلیفۃ المسیح الثالث خود آ کر دیتے اور دعا بھی آپ ہی کراتے۔

اس دعا میں شامل ہونے والوں کی متضرعانہ دعائیں اپنے اندر ایک خاص رنگ رکھتی تھیں۔ ہو سکتا ہے اس موقع پر ہونے والی آہ و زاری سے ایک بار تو عرش بھی ہل جاتا ہو۔

ربوہ میں نمازِ تراویح کا سب سے بڑا اجتماع بیت مبارک میں ہوتا جہاں بالعموم حافظ محمد رمضان نماز پڑھایا کرتے تھے۔

یاد رہے کہ حافظ محمد رمضان حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت میاں مولا بخش کے صاحبزادے تھے اور محلہ دارالرحمت وسطی میں رہائش پذیر تھے۔ اگرچہ بصارت سے محروم تھے لیکن خدا نے انہیں بعض دیگر غیر معمولی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا جن میں سے سب سے اہم ان کا حافظہ تھا۔ انہوں نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کر رکھا تھا اور انہیں حضرت مسیح موعود کی کتب پر بھی گہرا عبور حاصل تھا۔

موصوف نے ۱۹۶۸ء میں وفات پائی۔ اس موقع پر ان کے بچپن کے ایک ساتھی [illegible] اسماعیل [illegible] نے الفضل میں اپنے ایک مضمون میں بیان کیا کہ "ان کی قوت لمس بھی بلا کی تھی۔ ہم کئی دفعہ حافظ صاحب کو [illegible] سے پکڑتے اور منہ سے کچھ نہ بولتے۔ دوسرا آدمی دریافت کرتا: حافظ صاحب! یہ کون ہیں؟ وہ ہاتھ ٹٹول کر فرما دیتے۔"

ان کے علمی مقام کا اندازہ شیخ نور احمد منیر کے بیان کردہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ "ایک دفعہ ایک معزز مصری ربوہ کی زیارت کے لیے آئے۔ حضرت سید زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب مرحوم اور خاکسار نے ان سے تبادلہ خیالات کیا۔ ایک دن دورانِ ملاقات اس عاجز نے ان سے کہا کہ ہمارے ہاں بھی ڈاکٹر طٰہٰ ہیں (ڈاکٹر طٰہٰ حسین نابینا ہیں اور حافظ قرآن ہیں اور ممالکِ عربیہ کے مشہور دینی عالم ہیں)۔ انتہائی اشتیاق سے کہنے لگے کہ پھر ان سے ضرور ملاقات کرنی چاہیئے چنانچہ حافظ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان پر بہت ہی اثر ہوا۔ کہنے لگے: بلاشبہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے مماثلت موجود ہے۔"

حافظ محمد رمضان نماز تراویح کے بعد مختصر طور پر اس پارہ کا ترجمہ و تفسیر بھی بیان کر دیتے۔

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں بہت سے خوش قسمت معتکف ہوتے۔ بیت مبارک میں معتکف ہونے کے لیے نظام جماعت سے پیشگی اجازت ضروری تھی جب کہ باقی بیوت الذکر میں معتکف ہونے کے لیے غالباً صرف صدر محلّہ کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ لوگ درس یا نمازِ تراویح کے لیے بیت مبارک پہنچتے تو معتکفین اپنے حجروں کی چادریں اُٹھا دیتے اور بیت مبارک پھر سے ایک وسیع ہال کی شکل اختیار کر لیتی جہاں بیک وقت ہزاروں لوگ اپنے اپنے رنگ میں ذکر الٰہی میں مصروف نظر آتے۔

ستائیسویں کی رات خصوصی برکتیں لے کر آتی۔ اہل ربوہ اس رات اپنی اجتماعی اور انفرادی عبادات کو انتہا تک پہنچا دیتے۔ ہر شخص اسے وہی رات سمجھ کر گذارتا جسے قرآن کریم نے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے اسی رات کے رُوح پرور مناظر سے متاثر ہو کر فرمایا تھا:

ذکر سے بھر گئی ربوہ کی زمیں آج کی رات
اُتر آیا ہے خداوند یہیں آج کی رات
شہرِ جنت کے ملا کرتے تھے جس کو طعنے
بن گیا واقعتاً خُلدِ بریں آج کی رات
کافر و مُلحد و دجّال بلا سے ہوں مگر
تیرے عشاق کوئی ہیں تو ہمیں آج کی رات

اس بابرکت مہینے کا اختتام عیدالفطر سے ہوتا جس کا بہت بے تابی سے انتظار کیا جاتا تھا۔ اُس دور میں مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی تشکیل پا چکی تھی لیکن اہلِ ربوہ انتیس تاریخ کو خود بھی پورے ذوق و شوق سے عید کا چاند دیکھتے اور اگر بات اگلے دن تک مؤخر ہو جاتی تو بھی چاند دیکھنے کا شوق کم نہ ہوتا۔

ہمیں نیا چاند دیکھنے کی دعا سکول کے زمانے میں سکھائی گئی تھی چنانچہ ہم عید کا چاند دیکھتے ہی اپنے دونوں

ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے جب تک اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ کا ورد نہ کر لیتے چین سے نہ بیٹھ سکتے تاہم یہ دعا صرف عید کے چاند تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ہر ماہ میں جب بھی پہلے دن کا چاند دیکھتا تو اسی جگہ کھڑے ہو کر دعا مانگنے لگتا اور میرا یہ معمول ماشاء اللہ آج بھی جاری ہے نئی پود اور خصوصاً بیرون ربوہ پرورش پانے والوں کو شاید یہ بات عجیب لگے مگر اُن دنوں وہاں یہی رواج تھا۔

اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ عید کیسے منائی جاتی۔ اس موقع پر گھروں میں حسب توفیق اچھے کھانے تیار کیے جاتے جس میں شیر خرما کا روائتی ڈش سرفہرست تھا۔ امی کی کوشش ہوتی کہ صبح ہی صبح نماز عید سے پہلے اپنے تمام ہمسایوں کو شیر خرما کی ایک ایک پلیٹ ضرور بھجوا دی جائے۔ ایسے ہی تحائف ان کی طرف سے بھی موصول ہوتے۔

نماز عید پر جانے سے پہلے نئے یا صاف کپڑے پہنے جاتے۔ بچپن میں تو ہم نماز پڑھتے ہی گھر آ جاتے لیکن جوں جوں ہوش سنبھالا خطبہ عید کی اہمیت ہم پر اُجاگر ہوتی گئی۔ والدین اور بہن بھائیوں سے ان کی استطاعت کے مطابق عیدی کی وصولی، ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کود، اعزہ و اقربا سے ملاقاتیں اس دن کا خاصا ہوتیں لیکن عید کی اصل خوشی کمزور رشتہ داروں اور احباب سے ملاقات اور انہیں اپنی توفیق کے مطابق تحائف دینے سے ملتی۔

عید الاضحیٰ کا خطبہ بالعموم آیت قرآنی لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ کی تفسیر پر مشتمل ہوتا۔ دعا کے بعد گھر لوٹتے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ توفیق دیتا وہ قربانی کرتے اور باقی لوگ روشن دین تنویر کی ہمنوائی میں یہی سوچتے رہ جاتے کہ

عیدِ قرباں ہے مگر عید کا سامان کہاں!
جان قربان کروں تن میں مگر جان کہاں!

قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے جاتے۔ ایک حصہ اپنے استعمال کے لیے رکھا جاتا۔ دوسرا حصہ رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کے لیے مختص ہو جاتا اور تیسرا حصہ مستحقین میں تقسیم کے لیے مخصوص کر دیا جاتا۔ یہ گوشت جماعتی انتظام کے تحت صدر محلّہ کے پاس جمع کرا دیا جاتا تاکہ اسے ان لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے جو کسی وجہ سے خود قربانی نہ کر سکے ہوں۔ قربانی کی کھالیں بھی جماعتی انتظام کے تحت صدر محلّہ کے پاس جمع کرائی جاتیں۔ بیرون ربوہ کے احمدی اگر چاہتے تو دار الضیافت میں ایک مقررہ رقم جمع کرا کے یہ ذمہ داری انہیں منتقل کر سکتے تھے۔

ربوہ میں جن جلسوں کا جماعتی سطح پر اہتمام کیا جاتا ان میں سے ایک ہر سال ۲۰ فروری کو منایا جانے والا یوم مصلح موعود تھا۔ اس روز علماء حضرت مسیح موعود کی پیشگوئی بابت مصلح موعود کی روشنی میں تقاریر کرتے۔ ۲۳ مارچ کو یوم مسیح موعود اور ۲۷ مئی کو یوم خلافت منایا جاتا۔ یاد رہے کہ حضرت مسیح موعود نے پہلی بیعت ۲۳ مارچ ۱۸۸۹ء کو لی تھی چنانچہ یوم مسیح موعود اس بیعت کے حوالہ سے اور یوم خلافت احباب جماعت میں ظہور قدرت ثانیہ کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے منایا جاتا تھا۔

میں افادۂ احباب کے لیے یہاں پر یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں بعض منافقین کی طرف سے خلافت اور آئندہ خلیفہ کے بارہ میں بے بنیاد پراپیگنڈہ شروع کر دیا گیا اور بعض ملکی اخبارات بھی اس مہم میں ان کے شریک کار بن گئے۔ شروع میں تو یہ باتیں نظام کی نظر سے چھپی رہیں لیکن جب سامنے آئیں اور مختلف حوالوں سے ان کی تصدیق بھی ہوتی چلی گئی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں پاکستان اور غیر ممالک کی جماعت ہائے احمدیہ کی طرف سے قراردادوں اور انفرادی خطوط کے ذریعہ اس مہم سے بے زاری اور لاتعلقی کا اظہار کیا جانے لگا۔ حضور جو اس صورتِ حال کا گہری نظر سے جائزہ لے رہے تھے نے مشتبہ افرادِ جماعت کو پورا موقع فراہم کیا اور ہر جہت سے مکمل تحقیقات کے بعد بعض ناقابلِ اصلاح اور شرارتی منافقین کو نظامِ جماعت سے علیحدہ کر دیا۔ اس وقت استحکامِ خلافت کے لیے بعض اقدامات کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان میں سے ایک حضور کی جلسہ سالانہ ۱۹۵۶ء کی دو تقاریر جو ''خلافتِ حقہ اسلامیہ'' اور ''نظامِ آسمانی کی مخالفت اور اس کا پس منظر'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی تھیں کا امتحان تھا تو دوسرا یومِ خلافت کا قیام۔

یہ امتحان جولائی ۱۹۵۷ء میں ہوا۔ ربوہ میں اس امتحان کا بہت چرچا تھا۔ اگرچہ میں تو اس امتحان میں شامل نہیں ہو سکا لیکن ہمارے خاندان کے کئی افراد اس میں شامل ہوئے۔ ان میں آپی، چچا ابراہیم اور میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب شامل تھے۔ الحمدللہ یہ تینوں اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور اس امر کا ذکر اس امتحان کے تفصیلی نتیجے میں موجود ہے۔

دوسرا اقدام یومِ خلافت کے قیام سے تعلق رکھتا تھا سو پہلا یومِ خلافت ۲۷ مئی ۱۹۵۷ء کو منایا گیا اور اس سلسلہ میں مسجد مبارک میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس کی صدارت مولانا ابوالعطا جالندھری نے کی تھی۔ مجھے الا ماشاء اللہ یومِ خلافت کے تمام جلسوں میں شمولیت کا موقع ملتا رہا ہے۔

شائد بہت سے قارئین اس حقیقت سے باخبر نہ ہوں گے کہ جماعت احمدیہ کے زیرِ اہتمام سیرت النبی کی بابرکت محافل کا باقاعدہ انعقاد ۱۹۲۸ء سے شروع ہوا۔ بدنامِ زمانہ کتاب ''رنگیلا رسول'' ان ہی دنوں شائع ہوئی تھی اور ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی انتہا کو پہنچ چکی تھی لہٰذا ضرورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ اور سیرت اطہر کا تذکرہ عام کیا جائے تا کہ مخالفین بانی اسلام کے صحیح چہرے اور آپ کے عالمگیر پیغام کی روح سے آشنا ہو سکیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کئے جانے والے ''حملوں کے دفاع کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو توجہ دلائیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات خود پڑھیں اور ان سے صحیح طور پر واقفیت حاصل کریں۔ جب وہ آپ کے حالات پڑھیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی ذات نور ہی نور ہے اور اس ذات پر اعتراض کرنے والا خود اندھا ہے۔''

اس مقصد کی تکمیل کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ایک جامع منصوبے کا اعلان کیا جس کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ عید میلاد النبی کے معروف، رسمی جلسوں کی بجائے ہر سال سیرت النبی کے خاص علمی اور ہمہ گیر جلسے منعقد کئے جائیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے پہلے سے طے شدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے اور

اس موقع کے لیے ۱۲ ربیع الاول کی بجائے کوئی اور دن مقرر کیا جائے۔ حضور کی خواہش تھی کہ ان جلسوں میں پڑھے لکھے اور سنجیدہ غیر مسلم مقررین بھی شرکت کیا کریں کیوں کہ ان کی زبانی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا ذکر زیادہ دلچسپ اور پیارا معلوم ہوگا۔ اس منصوبے کے تحت پہلا یومِ سیرت النبیؐ ۱۷ جون ۱۹۲۸ء کو منایا گیا۔

ربوہ میں سیرت النبی کے سالانہ جلسے اسی سلسلے کی کڑی تھے۔ اس روز کوئی جلوس نکلتا نہ لاؤڈ سپیکر پر نعت خوانی ہوتی اور نہ روضہ نبوی کے ماڈل کندھوں پر اُٹھا کر گلی گلی گھوما جاتا بلکہ جماعتی انتظام کے تحت بیت مبارک میں ایک جلسے کا انعقاد ہوتا جس میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی۔ اہلِ ربوہ اپنے اپنے طور پر صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کا دلکش راگ الاپتے ہوئے ایک وقار کے ساتھ مقامِ جلسہ پر پہنچ کر تقاریر کی سماعت کرتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

سیرت النبی کی ان پاکیزہ محافل میں علمائے سلسلہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے۔ اس موقع پر حضرت مسیح موعود اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے علاوہ بعض دیگر احمدی شعراء کا نعتیہ کلام بھی پڑھا جاتا۔ بکثرت پڑھی جانے والی ان نظموں میں حضرت میر محمد اسماعیل کی وہ نظم بھی شامل تھی جس کا پہلا بند ہے:

بہ درگاہِ ذی شانِ خیرُ الانام
شفیعُ الورٰی ، مرجعِ خاص و عام
بصد عجز و منّت، بصد احترام
یہ کرتا ہے عرض آپ کا اک غلام
کہ اے شاہِ کونین عالی مقام!
عَلَیْکَ الصَّلٰوۃُ عَلَیْکَ السَّلَامُ

ان جلسوں اور خوشی کے بعض دیگر مواقع پر ربوہ میں چراغاں کیا جاتا جس کے لیے مٹی کے دیوں میں سرسوں کا تیل جلایا جاتا۔ یہ دِیے ایک گول سی پیالی کی شکل کے ہوتے جن کے ایک طرف منہ بنا ہوتا تھا۔ اس کے اندر روئی کی بتی اس طرح رکھی جاتی کہ اس کا ایک سرا تیل میں ڈوبا ہوا ہوتو دوسرا سرا دِیے کے منہ سے باہر نکلا ہوا۔ اس سرے کو آگ دکھائی جاتی تو دیا جلنے لگتا اور اس وقت تک جلتا رہتا جب تک دِیے کے اندر سرسوں کا تیل ختم نہ ہو جاتا۔ یہ دِیے مزارات پر روشن کئے جانے والے دیوں سے مشابہہ تھے اور بازار سے بہ آسانی مل جاتے تھے۔

ایک خاص موقع جب ربوہ بھر میں چراغاں کیا گیا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی یورپ سے مراجعت کا تھا۔ اسی طرح یوم آزادی کے موقع پر بھی چراغاں کا اہتمام کیا جاتا۔ ایسے مواقع پر میں اپنے مکان کی چھت پر جا کر خالی چراغ ایک قطار کی صورت منڈیر پر رکھتا، ان میں تیل ڈالتا اور ماچس دکھانے کے بعد نیچے اُتر آتا۔ جوں جوں رات کی تاریکی بڑھتی چراغاں کا منظر خوب سے خوب تر نظر آنے لگتا۔ میں خود تو نیچے اُتر کر معمول کے مطابق سو جاتا اور دیے اپنی عمرِ طبعی گذارنے کے بعد گُل ہو جاتے۔

ان جلسوں کے علاوہ جو ہر سال کسی خاص موقع کی مناسبت سے منعقد ہوتے تھے ربوہ میں ہنگامی

بنیادوں پر بھی جلسے ہوتے رہتے تھے۔ یہ جلسے بالعموم عوام الناس کو کسی مسئلے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے یا کسی خاص موضوع پر اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے منعقد ہوتے تھے۔ ایسا ہی ایک جلسہ حضرت مسیح موعود کی کتاب ''سراج دین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب'' کی ضبطی کے خلاف احتجاج کے لیے بھی منعقد ہوا تھا۔

یاد رہے کہ اپریل ۱۹۶۳ء کے آخر میں حکومت مغربی پاکستان نے حضرت مسیح موعود کی تصنیفِ لطیف ''سراج دین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب'' اچانک ضبط کر کے اس کی فروخت و اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ اس حکومتی فیصلے کے خلاف دنیا بھر کے احمدیوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ حکومت کے اس غیر منصفانہ اقدام کے خلاف جماعت کی طرف سے پہلا باضابطہ احتجاج حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی طرف سے ہوا جنہوں نے اپنے ایک اخباری نوٹ کے ذریعہ اس فیصلے کو عقلی اور منطقی لحاظ سے بالکل غلط قرار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کتاب جو ایک عیسائی کی طرف سے اُٹھائے گئے بعض سوالات کے جواب میں لکھی گئی تھی پہلی بار تقریباً پینسٹھ برس قبل شائع ہوئی تھی۔ اس وقت ہندوستان پر انگریزوں یعنی عیسائیوں کی حکومت تھی لیکن انہوں نے اس کتاب کی بار بار اشاعت کے باوجود اس پر کسی قسم کی قدغن مناسب نہ سمجھی اور اب جب کہ مملکت خداداد پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہے مذہبی رواداری کے نام پر اسے ضبط کرایا گیا ہے۔

اس حکومتی فیصلے کے خلاف اہلِ ربوہ کا ایک احتجاجی جلسہ بیت مبارک میں منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے فرمائی۔ اس اجلاس میں مولوی محمد صدیق صدر عمومی کی طرف سے ایک احتجاجی قرارداد پیش کی گئی ہے جسے اہلِ ربوہ نے بیک زبان منظور کر لیا۔ میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا۔

اخبار الفضل کے فائل اس بات پر گواہ ہیں کہ اندرون و بیرون پاکستان مختلف جماعتوں کی طرف سے اس فیصلے کے خلاف احتجاج مسلسل جاری رہا جس کے نتیجے میں اس کتاب کی ضبطی کا فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے اس فیصلے پر حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

''حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے تقریر و تحریر کے ذریعہ...... کی جو عدیم المثال خدمات سرانجام دی ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں اور دوست اور دشمن، اپنے اور بیگانے اُن کا لوہا مان چکے اور آپ کو...... کا ایک ''فتح نصیب جرنیل'' قرار دے چکے ہیں۔ پس یہ کتنے دُکھ اور افسوس کی بات تھی کہ وقت کی ......حکومت نے جلد بازی اور کوتاہ اندیشی سے آپ کی ایک ایسی کتاب کو ضبط کرنے کا فیصلہ کیا جو...... کی تائید اور ایک نادان مسیحی کے اعتراضوں کے جواب میں پینسٹھ سال پہلے لکھی گئی تھی اور جسے خود اُس وقت کی عیسائی حکومت اپنے پچاس سالہ دور میں وسعتِ قلب کے ساتھ برداشت کرتی چلی آئی تھی۔ بہرحال اگر صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اُسے بھولا ہوا نہیں سمجھنا چاہیے اور ہم حکومت کے شکر گذار ہیں کہ اُس نے اپنے اِس ناواجب اور غیر منصفانہ فیصلے کو جلدی منسوخ کر کے ہمارے زخمی دلوں پر مرہم کا پھایہ رکھا ہے۔ دعا ہے کہ خدا اُسے آئندہ ایسی غلطی سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ دراصل اگر حکومت غور کرے تو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا وجود حکومت کے لیے ایک مقدس تعویذ ہے۔ کاش! وہ سمجھ پائے۔''

بعد میں جماعتی سطح پر اس کتاب کا امتحان ہوا جس میں احمدی احباب نے بکثرت شرکت کی۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل تھا جنہیں اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع ملا اور خدا کا احسان ہے اس نے مجھے اس امتحان میں کامیابی بخشی۔

اس واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد حکومت مغربی پاکستان نے حضرت مسیح موعود کا تحریر فرمودہ ایک اور کتابچہ ''ایک غلطی کا ازالہ'' بحق سرکار ضبط کر لیا۔ اس کتابچہ کی پہلی اشاعت کے تریسٹھ سال بعد اس کی ضبطی ایک ایسا واقعہ تھا جس پر جماعت احمدیہ احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکی۔ الحمدللہ! جلد ہی حکومت کو اس غلطی کا بھی احساس ہو گیا اور جماعتی وفد کے ساتھ مذاکرات کے بعد گورنر مغربی پاکستان، ملک امیر محمد خان نے یہ فیصلہ واپس لے لیا۔

حضور نے اس کتابچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ''حضرت فاطمہ نے کشفی حالت میں اپنی ران پر میرا سر رکھا اور مجھے دکھایا کہ میں اس میں سے ہوں۔'' حکومت کی رائے میں یہ فقرہ پاکستان کی اکثریتی آبادی کی دلآزاری کا موجب بن رہا تھا لہٰذا جماعت کو یقین دہانی کرائی گئی کہ اگر اس کتابچے سے یہ فقرہ حذف کر دیا جائے تو حکومت اس کی ضبطی کا فیصلہ فی الفور واپس لے سکتی ہے۔ جماعتی وفد کا مؤقف تھا کہ ایسا کرنا جماعت کے لیے ممکن نہیں۔ وفد نے وضاحت کی کہ حضور نے یہی کشف اپنی کتاب ''براہین احمدیہ'' میں تفصیلاً بیان فرمایا ہے اور حضرت فاطمہ کے نام کے ساتھ ''مادرِ مہربان'' کے الفاظ استعمال کر کے خود ہی اس کی تشریح فرما دی ہے چنانچہ بالآخر فریقین کے درمیان طے پایا کہ اس کتابچہ میں درج شدہ کشف علی حالہ برقرار رہے گا مگر اس کے نیچے حاشیہ میں براہین احمدیہ میں درج شدہ پورا کشف نقل کر دیا جائے گا۔

یاد رہے کہ براہین احمدیہ میں یہ کشف بایں الفاظ درج ہے:

''اور ایسا ہی الہام متذکرہ بالا میں جو آلِ رسول پر درود بھیجنے کا حکم ہے سو اس میں بھی یہی سرّ ہے کہ افاضہ انوارِ الٰہی میں محبت اہلِ بیت کو بھی نہایت عظیم دخل ہے اور جو شخص حضرتِ احدیت کے مقرّبین میں داخل ہوتا ہے وہ انہیں طیبین طاہرین کی وراثت پاتا ہے اور تمام علوم و معارف میں ان کا وارث ٹھہرتا ہے۔ اس جگہ ایک نہایت روشن کشف یاد آیا اور وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نمازِ مغرب کے بعد عین بیداری میں ایک تھوڑی سی غیبت حس سے جو خفیف سے نشاء سے مشابہ تھی ایک عجیب عالم ظاہر ہوا کہ پہلے یکدفعہ چند آدمیوں کے جلد جلد آنے کی آواز آئی جیسی بسرعت چلنے کی حالت میں پاؤں کی جوتی اور موزہ کی آواز آتی ہے۔ پھر اسی وقت پانچ آدمی نہایت وجیہہ اور مقبول اور خوبصورت سامنے آ گئے یعنی جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت علیؓ و حسنینؓ و فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم اجمعین اور ایک نے ان میں سے اور ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نہایت محبت اور شفقت سے مادرِ مہربان کی طرح اس عاجز کا سر اپنی ران پر رکھ لیا۔ پھر بعد اس کے ایک کتاب مجھ کو دی گئی جس کی نسبت یہ بتلایا گیا کہ یہ تفسیر قرآن ہے جس کو علیؓ نے تالیف کیا ہے اور اب علیؓ وہ تفسیر تجھ کو دیتا ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک''

حضرت مسیح موعود کی مندرجہ بالا کتب کی ضبطی کے احکامات اور ان کی واپسی کے ذکر کے بعد اب مجھے یاد ہیں اطفال و خدام کے سالانہ اجتماعات کی!

ہر ذرّہ خاکی میں نہاں سوزِ عمل ہے

چار اہم مواقع جن کا جماعتی حلقوں میں بے چینی سے انتظار کیا جاتا جماعت کی ذیلی تنظیموں یعنی مجلس اطفال الاحمدیہ، مجلس خدام الاحمدیہ، مجلس انصار اللہ اور لجنہ اماء اللہ کے مرکزی اجتماعات تھے جو بالعموم اکتوبر کے دوسرے پندھرواڑے میں منعقد ہوتے تھے تاہم یہاں پر صرف مجلس اطفال الاحمدیہ اور مجلس خدام الاحمدیہ کے سالانہ اجتماعات کا ذکر مقصود ہے۔ یہ اجتماعات جہاں ان تنظیموں کے اراکین کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے وہیں افرادِ جماعت کے درمیان قریبی رابطے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ثابت ہوتے۔ ان اجتماعات میں تمام اطفال و خدام کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی اور انہیں ان اجتماعات کی افادیت سے آگاہ کرنے کے لئے مقررہ تاریخوں سے بہت پہلے الفضل اور رسالہ خالد یا تشحیذ الاذھان میں اعلانات شائع ہونا شروع ہو جاتے تھے۔ اتفاق سے میرے پاس ۱۹۶۸ء کے سالانہ اجتماع سے پہلے رسالہ خالد میں شائع ہونے والا ایسا ایک اعلان موجود ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے یہ اعلان:

''اس عظیم الشان روحانی اجتماع میں آپ کیا پائیں گے اور اس میں شمولیت سے آپ کیا حاصل کریں گے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس اجتماع میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز خدام سے روح پرور خطاب فرمائیں گے: خدام کو قرآن مجید، احادیث اور ملفوظات حضرت مسیح موعود کے درس سُننے کا موقع ملے گا؛ روزانہ پانچوں نمازیں باجماعت ادا کرنے کے علاوہ روح پرور ماحول میں باجماعت نماز تہجد ادا کرنے اور دُعائیں کرنے کا موقع میسر آئے گا؛ خدام کو مختلف علاقوں سے آئے ہوئے خدام بھائیوں سے ملنے، محبت واخوت کو بڑھانے اور ایمان تازہ کرنے کا موقع ملے گا؛ مختلف علمی اور ورزشی مقابلہ جات میں حصہ لینے کا موقع ملے گا؛ بزرگان سلسلہ کی زبان سے وعظ و نصیحت سُننے کا موقع مل سکے گا؛ مجلس شوریٰ میں رائے دینے اور اہم دینی مسائل پر آراء سُننے کا موقع ملے گا؛ مہتمم حضرات اپنے اپنے شعبہ کے بارہ میں ہدایات دیں گے اور پرچہ قرآن مجید، پرچہ عام معلومات اور پرچہ ذہانت کی روشنی میں خدام کو اپنی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکے گا۔

الغرض یہ تین دن انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے دینی، روحانی، علمی اور اخلاقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔

کیا آپ اس بابرکت اجتماع سے غیر حاضری گوارا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔''

یہ اجتماعات بالعموم کسی جمعہ کے روز شروع ہو کر اتوار کو ختم ہوتے۔ توقع کی جاتی تھی کہ جملہ اطفال و خدام یہ تمام وقت مقامِ اجتماع پر گذاریں گے اور درمیان میں آنے والی دونوں راتیں اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ

خیموں میں بسر کریں گے۔ الفضل کے ذریعہ اس حوالہ سے جس ضروری سامان کی فہرست مشتہر کی جاتی اس میں چار چادریں یا دو کمیں (جنہیں اس زمانے میں ''دوتہی'' بھی کہا جاتا تھا)، چار بانس، آٹھ کھونٹے اور کچھ رسی شامل تھی۔

ان تنظیموں کے تمام احزاب جو آٹھ سے دس اطفال یا خدام پر مشتمل ہوتے تھے اپنا خیمہ خود تیار کرتے اور اس کے لئے چادروں، بانسوں، رسیوں اور کھونٹوں کی فراہمی خود ان کی اپنی ذمہ داری ہوتی۔ چونکہ یہ سارا سامان رضا کارانہ طور پر مختلف گھروں سے اکٹھا ہوتا تھا اور ٹینٹ تیار کرنے والے اس کام کے لیے ضروری مہارت نہیں رکھتے تھے لہٰذا اکثر ٹینٹ دیکھنے میں ڈھیلے ڈھالے ہوتے اور ان میں معمولی جھکڑ کے مقابلہ کی سکت بھی نہ ہوتی تاہم جس جذبہ کے تحت یہ سارے امور سرانجام پاتے یقیناً قابل قدر تھا۔ اس موقع پر سب سے خوبصورت خیمے کو اوّل انعام سے نوازا جاتا لہٰذا ہر حزب اپنے خیمے کی اندرونی و بیرونی زیبائش کے لیے دل و جان سے محنت کرتا۔

اجتماع سے ایک دو روز پہلے ہر حزب اپنے خیمے کا سامان کسی ایک جگہ (جو بالعموم سائق کا گھر ہوتا) اکٹھا کر لیتا اور پھر سارے اطفال و خدام مل کر چادریں سیتے اور بانسوں کو مطلوبہ شکل دینے کے لیے انہیں رسیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھتے۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ ہوتا جس دوران دل لگی کی باتیں جاری رہتیں اور مطلوبہ اہداف بھی حاصل ہوتے چلے جاتے۔ اس بات کو یقینی بنایا جاتا کہ یہ سارا کام جمعرات کی شام تک مکمل ہو جائے۔ اطفال و خدام جملہ ساز و سامان اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جمعہ سے پہلے مقامِ اجتماع پر پہنچ جاتے جہاں ہر خیمے کے لیے جگہ کی نشاندہی پہلے ہی سے کی گئی ہوتی تھی۔ وہ اس جگہ خیمہ نصب کرتے اور اس کے اندر اپنا سامان رکھنے کے بعد اگلی کارروائی کے لیے تیار ہو جاتے۔

اس موقع پر ہر طفل یا خادم کے لئے ایک سیر بھنے ہوئے چنے، ایک چاقو، سوئی دھاگہ، چالیس فُٹ لمبی رسی، چار انچ چوڑی پٹی کا قریباً دو گز ٹکڑہ، ایک پلیٹ، ایک مگ یا گلاس، ٹارچ، غلیل، ایک بالٹی، ایک تھیلا اور پانچ فٹ لمبی ایک چھڑی یا بانس ہمراہ لانا ضروری تھا۔ اس میں سے کچھ سامان مثلاً مگ یا گلاس، پلیٹ، ٹارچ اور بھنے ہوئے چنے تو اجتماع کے دوران خوب کام آتے جب کہ استثنائی حالات میں دیگر اشیاء بھی کام آ جاتیں۔

اجتماع کے موقع پر دو امور کی خاص طور پر تاکید کی جاتی تھی۔ اوّل تو یہ کہ ہر طفل یا خادم اپنے بازو پر سیاہ رنگ کا ''بلا'' ضرور باندھے۔ بلے سے مراد سیاہ کپڑے کا ایک چوکور ٹکڑا ہوتا تھا جسے بکسوؤں کی مدد سے بازو پر باندھ لیا جاتا۔ اس کپڑے پر سفید رنگ کا ایک کاغذ چپکا دیا جاتا جس پر طفل یا خادم کے ذاتی کوائف از قسم نام، ولدیت اور مجلس کا نام درج ہوتے اور نیچے مجلس اطفال الاحمدیہ مرکزیہ یا مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے کسی عہدیدار کے تصدیقی دستخط ہوتے تھے۔ یہ بلا اس طفل یا خادم کی شناخت سمجھا جاتا تھا اور اس کے بغیر اسے مقامِ اجتماع میں داخلے سے روکا جا سکتا تھا۔

بیج ایک اور ضروری آئٹم تھا۔ ٹین کے بنے ہوئے اس بیج پر جسے پشت پر لگے ہوئے ایک پن کی مدد سے

سینہ پر آویزاں کیا جا سکتا تھا لوائے احمدیت یا شاید منارۃ المسیح کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ یہ بیج سیاہ رنگ کا ہوتا اور اس پر بنی ہوئی تصویر سفید رنگ کی ہوتی تھی۔ اطفال و خدام سے توقع کی جاتی تھی کہ ایسے مواقع پر وہ یہ بیج بھی اپنے سینہ پر ضرور آویزاں کریں گے۔

ان اجتماعات کا آغاز بالعموم صدر مجلس کے افتتاحی خطاب سے ہوتا۔ میں نے سن رکھا ہے کہ جب تک حضرت خلیفۃ المسیح الثانی تندرست تھے آپ ہی افتتاحی اور اختتامی اجلاسوں میں تشریف لایا کرتے تھے لیکن ۱۹۶۰ء کی دہائی کے نصفِ اول میں مجھے آپ کا ایسے کسی اجتماع میں تشریف لانا یاد نہیں۔ ہاں! مجھے سید میر داؤد احمد، صاحبزادہ مرزا رفیع احمد اور حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کے بطور صدر مجلس اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ایمان افروز خطابات بخوبی یاد ہیں۔

اجتماع کے موقع پر علمی، ذہنی اور جسمانی، ہر طرح کے مقابلہ جات ہوتے اور ان مقابلوں میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو انعامات سے نوازا جاتا جو بالعموم کتب سلسلہ پر مشتمل ہوتے۔

ایک کھیل جس میں تمام اطفال و خدام کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی مقابلہ پیغام رسانی کہلاتا تھا۔ اس مقابلے میں ہر حزب کے اطفال و خدام ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ ہر دو افراد کے درمیان کم و بیش چھ فٹ فاصلہ ہوتا۔ مقابلے کا آغاز سائق کے کان میں ایک فقرہ بول کر کیا جاتا۔ توقع یہ کی جاتی کہ وہ یہی فقرہ پیچھے کھڑے ہوئے طفل یا خادم کے کان میں کہے گا، وہ یہ فقرہ اپنے سے پیچھے والے کے کان میں کہے گا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا حتّٰی کہ یہ فقرہ آخری طفل یا خادم تک پہنچ جاتا۔ کھیل کے قواعد کے مطابق آخری طفل یا خادم کو موصولہ پیغام ایک کاغذ پر لکھ کر انتظامیہ کو فراہم کرنا ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ پیغام انتہائی مختصر اور بالعموم ایک فقرہ پر مشتمل ہوتا تاہم قطار میں کھڑے آخری آدمی تک پہنچتے پہنچتے اس کی ہیئت بعض اوقات بالکل بدل جاتی۔ مثال کے طور پر اگر گروپ لیڈر کو پیغام دیا جاتا کہ ''میں اور ارشد آج رات ماڑی انڈس سے لاہور جائیں گے'' تو آخری طفل یا خادم تک پہنچتے پہنچتے فقرہ یہ شکل اختیار کر لیتا: ''میں اور راشد کل چناب ایکسپریس کے ذریعہ کراچی سے ربوہ پہنچے تھے۔'' اس کھیل کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اطفال و خدام کو ایسی ہنگامی صورت حال کے لیے تیار کیا جا سکے جب خدانخواستہ تحریری پیغام کی جگہ زبانی پیغام پر انحصار ناگزیر ہو جائے۔

کھیل کی حد تک یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہوتا اور اس میں وہی حزب فاتح قرار پاتا جو موصولہ پیغام صحیح ترین حالت میں اپنے آخری آدمی تک پہنچا سکتا۔

''مشاہدہ و معاینہ'' دراصل اطفال و خدام کے حواسِ خمسہ کا امتحان ہوتا تھا۔ اُن کے سامنے ملتی جلتی کچھ چیزیں اس طرح رکھ دی جاتیں کہ بادیٔ النظر میں ان میں تمیز نہ کی جا سکے اور حواسِ خمسہ میں سے کسی نہ کسی حس کے استعمال کے بغیر ان کی شناخت نہ ہو سکے۔ یہ مقابلہ قدرے آسان مقابلوں میں شمار ہوتا اور اطفال و خدام کی اکثریت اس میں حصہ لیتی تھی۔

جسمانی مقابلوں میں رسّہ کشی کا مقابلہ خاص دلچسپی کا حامل ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ مقابلہ بالعموم بہت جلد ختم ہو

جاتا لیکن دیکھنے والوں کے لئے اس میں دلچسپی کے بعض خاص پہلو تھے۔ بسا اوقات تو رسہ کشی کی ٹیمیں مقررہ کے لباس میں میدان میں نکل پڑتیں اور کبھی لنگوٹ کس کر مقابلے کے لئے آتیں تاہم ان دونوں صورتوں میں فتح اسی ٹیم کا مقدر ٹھہرتی جس کے اراکین زیادہ طاقتور ہوتے، زیادہ دیر تک اپنی جگہ جم کر کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتے اور مخالف ٹیم کی ذرا سی لغزش سے فائدہ اُٹھا کر زمین سے اس کے پاؤں اکھاڑنے میں کامیاب ہو جاتے۔

کلائی پکڑنے کا مقابلہ دو افراد کے درمیان ہوتا اور جو فرد اپنے مقابل کا ہاتھ پہلے زمین کے ساتھ لگانے میں کامیاب ہو جاتا فاتح قرار پاتا۔

ان اجتماعات پر کبڈی، والی بال، فٹ بال اور میرو ڈبہ کے میچ بھی ہوتے لیکن ان میچوں میں اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کے لیے تالیاں بجانے کی اجازت نہ تھی۔ ہمیں بتایا جاتا کہ اسلامی تعلیمات کے تحت صرف عورتیں ہی تالی بجا سکتی ہیں جب کہ مردجذباتِ تحسین کا اظہار حَبَّـذَا کہہ کے کر سکتے ہیں سو ہم یہ جانے بغیر کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے اور اس کے لغوی معنی کیا ہیں حَبَّـذَا حَبَّـذَا کہہ کر اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کو داد دیا کرتے تھے۔ یہ تو ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا یہ فعل اُس حدیثِ نبوی کے عین مطابق ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض متحارب قبائل میں صلح کرانے کے لیے تشریف لے گئے۔ اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا چنانچہ مؤذن نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ کیا وہ نماز پڑھا دیں گے۔ آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ نماز کے دوران حضور بھی تشریف لے آئے اور ایک مقتدی کے طور پر صف میں کھڑے ہو گئے۔ اس پر بعض نمازیوں نے تالی بجائی۔ حضرت ابو بکرؓ نے مڑ کر دیکھا تو حضور نے اشارے سے آپ کو نماز جاری رکھنے کو کہا مگر حضرت ابو بکر پیچھے آ گئے۔ تب حضور آگے بڑھے اور نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حضور نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ انھوں نے تالی کیوں بجائی تھی اور ارشاد فرمایا کہ جو کوئی کمی بیشی دیکھے سبحان اللہ کہا کرے۔ اس موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اِنَّمَا التَّصۡفِیۡقُ لِلنِّسَاءِ یعنی تالی بجانا فقط عورتوں کے لیے ہے۔

چونکہ ان اجتماعات میں سینکڑوں اطفال و خدام شامل ہوتے تھے جن کا تربیتی معیار ایک جیسا نہ ہوتا تھا اور انہیں یہ دو راتیں والدین یا منتظمینِ اجتماع کی براہِ راست نگرانی کے بغیر اپنے ہم عصروں اور ہم جلیسوں کے ساتھ گذارنا ہوتی تھیں لہٰذا اس امر کو یقینی بنایا جاتا تھا کہ ہر طفل و خادم اپنا مکمل بستر ہمراہ لائے۔ انتظامیہ کے اراکین رات کے وقت اس خیمہ بستی کا مسلسل چکر لگاتے اور گرجدار آواز میں ''ایک رضائی میں دو نہ ہوں'' کی صدا اس کثرت سے لگاتے کہ خیموں میں موجود اطفال و خدام ایک بار تو سہم جاتے۔ منتظمین غیر متوقع طور پر کسی بھی خیمے کا پردہ ہٹا کر تسلی کر سکتے تھے کہ کہیں ان ہدایات کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی لہٰذا کبھی کوئی اخلاقی شکایات کو سننے میں نہیں آئی۔

اُن دنوں بھی سال کے سال خدام کے مابین مضمون نویسی اور مقالہ نویسی کا مقابلہ ہوتا تھا جس میں امتیاز حاصل کرنے والوں کو سالانہ اجتماع کے موقع پر نقد انعامات سے نوازا جاتا۔ جیسا کہ میں نے اس کتاب میں کسی اور جگہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے میں نے اپنے قیامِ ربوہ کے زمانے میں اس طرح کے تین مقابلوں میں حصہ لیا

اور خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے تینوں بار انعام کا حقدار قرار پایا۔
اِن اجتماعات کا ایک دلچسپ فیچر عثمان چینی اور حنیف سیلونی کے کرتب تھے۔
عثمان چینی چین کے صوبہ سنکیانگ کے رہنے والے تھے اور انہیں خود احمدیت قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور وہ اُن دنوں جامعہ احمدیہ میں زیرِ تعلیم تھے یا تکمیل تعلیم کے بعد کسی دفتر میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ وہ شٹل کاک کے ساتھ بعض اَیسے غیر معمولی کرتب دکھاتے جو دیکھنے والوں کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیتے۔ اتنے سالوں کے بعد اب میرے لئے ان کرتبوں کی الفاظ میں عکاسی قریباً ناممکن ہے لیکن عثمان چینی کے ایک ہم عصر، ڈاکٹر منیر الدین احمد کی کتاب ''ڈھلتے سائے'' کے مطالعہ سے ان کرتبوں کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ موصوف جو عثمان چینی کے انتہائی قریبی دوست معلوم ہوتے ہیں لکھتے ہیں کہ ''عثمان چینی نے چیل کے پروں سے بیڈمنٹن جیسی ایک کاک بنا رکھی تھی جس کے ساتھ کھیلنے کے لئے ریکٹ کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ اس کو پاؤں سے کھیلتے ہیں۔ ہاتھ صرف کاک کو ہوا میں اچھالنے کے کام آتے ہیں۔ نیچے گرتی کاک کو دوبارہ پاؤں سے اُوپر کی طرف اچھالنا، اس کو کنٹرول میں رکھنا اور زمین پر گرنے سے بچانا ہوتا ہے۔ اس کام کے لئے دونوں پاؤں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ عثمان بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ کاک اس کے سر کے اوپر سے اُڑتی ہوئی اس کی پیٹھ کے پیچھے گرتی تھی جہاں پر اس کا دایاں یا بایاں پاؤں کاک ...... وصول کرتا اور سر کے اوپر سے اچھال کر سامنے کی طرف پھینک دیتا۔ عثمان بعض اوقات کاک صرف اس قدر اُنچائی پر بھیجتا تھا کہ وہ اس کے ماتھے پر جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ پھر وہ سر کی جنبش سے اوپر کو اچھالی جاتی تھی اور زمین پر گرنے کی بجائے اس کے پاؤں میں آ کر جم جاتی تھی۔''
حنیف سیلونی تلوار کے ساتھ کرتب دکھاتے تھے۔ جن قارئین نے یہ کرتب دیکھ رکھے ہیں وہ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شمشیر زنی کے فن پر کس درجہ مہارت عطا کر رکھی تھی تاہم وہ قارئین جن کے لئے یہ نام نیا ہے ضرور سوچ رہے ہونگے کہ حنیف سیلونی تھے کون۔ ان کی معلومات کے لئے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محمد حنیف مجاہد سیلونی کا تعلق سیلون یعنی سری لنکا کے ایک قصبے بیٹی کلو سے تھا اور وہ تامل تھے۔ حنیف سیلونی کے بیٹے طاہر احمد سیلونی کی روایت کے مطابق ان کے والد بزرگوار ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے تھے اور میٹرک پاس کرنے کے بعد گوریلا فورس میں بھرتی ہوئے تھے جہاں انہوں نے شمشیر زنی، تیر اندازی اور گتکے میں خصوصی تربیت حاصل کی۔
موصوف نے بارہ سال کی عمر میں ایک خواب دیکھا تھا جس میں ایک بزرگ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد انہیں ایک جھنڈا اور ایک تلوار عنایت کی۔ اس خواب نے حنیف سیلونی کی گویا کایا ہی پلٹ دی اور وہ اپنے اس خواب کی تعبیر کی تلاش میں دن رات بے چین رہنے لگے۔ اسی دوران ان کا تبادلہ سیلون کے دارالحکومت کولمبو ہو گیا جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی ملاقات ایک احمدی سے کرا دی۔ انہیں اس احمدی کے پاس کسی کتاب میں حضرت مسیح موعود کی تصویر دیکھ کر یاد آ گیا کہ یہ تو وہی بزرگ ہیں جو انہیں خواب میں ملے تھے۔ بس

کسی نہ کسی طرح قادیان جا پہنچے جہاں وہ ایک سال تک احمدیت
پر کیا تھا انہوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور کسی نہ کسی طرح قادیان جا پہنچے جہاں وہ ایک سال تک احمدیت
کے بارہ میں تحقیق اور غور و فکر کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے پورے شرح صدر کے ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی
کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کر لیا اور مدرسہ احمدیہ میں داخل ہوئے تاہم کسی وجہ سے تعلیم ادھوری
چھوڑ کر قادیان ہی میں ایک حجامت خانہ قائم کر لیا۔ انہوں نے خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے سالانہ اجتماع منعقدہ
۱۹۴۶ء کے موقع پر شمشیر زنی، تیراندازی اور گتکے کا اس قدر خوبصورت مظاہرہ کیا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی
نے انہیں جماعت احمدیہ کا علَم اور ایک تلوار بطور انعام عطا فرمائی اور یوں وہ خواب پورا ہو گیا جس کی تعبیر کی تلاش
میں وہ مدت سے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ غالباً اس کے بعد انہیں خدام الاحمدیہ کے اجتماعات اور بعض دیگر
جماعتی تقریبات میں اپنے اس فن کے اظہار کا خاص طور پر موقع دیئے جانے لگا۔

میں نے حنیف سیلونی کے گھر میں اب تک محفوظ یہ جھنڈا اور تلوار دونوں چیزیں دیکھی ہیں۔ ان کے
اہلِ خانہ نے جھنڈے کو فریم کروا کر بطور تبرک اپنی بیٹھک میں آویزاں کر رکھا ہے۔ تلوار کی نیام جو پلائی وڈ کی بنی
ہوئی ہے اب بالکل خستہ ہو چکی ہے۔ تلوار کی ایک طرف ''شمشیرِ اسلام'' اور دوسری طرف اس کے بنانے والے کا
نام لکھا ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تلوار چاند تلوار ورکس، لاہور کی بنی ہوئی ہے۔

اب حنیف سیلونی ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کے زندہ رہ جانے والے کارہائے نمایاں میں سے ایک
قرآن پاک کا تامل زبان میں ترجمہ ہے۔ طاہر سیلونی کے پاس ناظر اشاعت صدر انجمن احمدیہ کے نام ان کی والدہ
کے ایک خط کی نقل پڑی ہے جس کے مطابق ان کے شوہر نے کئی سال کی شبانہ روز محنت کے بعد قرآن کریم کا تامل
زبان میں ترجمہ مکمل کر لیا تھا جو اُس وقت ان کے پاس محفوظ تھا۔ انہوں نے پیشکش کی تھی کہ اگر صدر انجمن احمدیہ
ضرورت محسوس کرے تو وہ یہ مسودہ نظارت اشاعت کو پیش کر سکتی ہیں۔ ناظر اشاعت نے اس خط کے جواب میں
یہ مسودہ انہیں بھجوانے کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ وہ "اس کی نقول حضور کے علاوہ جماعت احمدیہ سیلون کو
بھجوائیں گے تاکہ اگر یہ قابلِ اشاعت ہو تو اسے شائع کیا جا سکے۔ حفاظت کے لئے اس کی ایک نقل خلافت لائبریری
میں بھی محفوظ کی جائے گی۔''

مرحوم کے ذکرِ خیر کے بعد میں دوبارہ اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوا عرض کروں گا کہ اُن دنوں
مجلس خدام الاحمدیہ مقامی کی طرف سے حضرت مسیح موعود کی کتب کا امتحان سہ ماہی بنیادوں پر ہوا کرتا تھا۔ میں ان
امتحانات میں شمولیت کی کوشش کرتا اور بعض اوقات نمایاں پوزیشن بھی حاصل کر لیتا چنانچہ ۱۹۶۸ء کی پہلی سہ ماہی
کے امتحان میں خدا تعالیٰ کے فضل سے اوّل آیا اور اس امر کا اعلان الفضل کے پہلے صفحہ پر شائع ہوا۔

مجلس خدام الاحمدیہ مقامی ہی کے زیرِ انتظام ربوہ میں ہر چھ ماہ یا سال کے بعد ''یومِ والدین'' منایا جاتا
تھا۔ اُس روز بیت مبارک میں ایک جلسہ ہوتا جس میں قرآن حکیم کی تعلیمات، احادیثِ مبارکہ اور حضرت مسیح موعود
کے ارشادات کی روشنی میں اطفال و خدام پر والدین کے حقوق واضح کئے جاتے۔ ان جلسوں میں والدین سے بھی
شمولیت کی توقع کی جاتی تھی تاکہ تربیت اولاد کے حوالہ سے ان میں بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس اُجاگر کیا جا سکے۔

ربوہ کے ماحول میں اطفال و خدام کے ہر چھوٹے بڑے اجتماع کے علاوہ ان جلسہ جات میں بھی اطفال و خدام کی شمولیت لازمی تھی اور بعض دفعہ تو شامل نہ ہونے والوں کے نام بھی نوٹ کئے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان جلسوں میں بھی حاضری کافی اطمینان بخش رہتی۔ ان جلسوں سے والدین اور بچوں کے اندر ایک دوسرے کے حوالے سے اپنے اپنے حقوق و فرائض کا احساس اجاگر ہوتا۔

اطفال و خدام کے بہت سے تربیتی پروگراموں میں سے ایک کُلُوا جَمِیعاً کے نام سے معروف تھا۔ حلقہ کے تمام اراکین مقررہ وقت پر ایک جگہ جمع ہو جاتے۔ وہ اپنے اپنے گھروں سے کھانے کی کوئی چیز ہمراہ لے کر آتے تھے۔ سادگی کا زمانہ تھا اسی لیے اکثر افراد گھر سے سالن، روٹی، چاول یا کوئی میٹھی چیز پکوا کر پوٹلی میں باندھ لاتے کہ ٹفن کیریئرز اور ہاٹ کیسز تک اکثر کی رسائی نہ تھی۔ ربوہ کے سبھی باسی کم وبیش ایک جیسے مفلوک الحال تھے لہٰذا ایک دوسرے سے حجاب کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ بعض اوقات تو ساری پوٹلیاں بیک وقت کھول کر درمیان میں رکھ دی جاتیں اور جس کا جو جی چاہتا کھالیتا۔ کبھی کُلُوا جَمِیعاً میں شامل سب اطفال و خدام ایک دوسرے سے کھانے کا تبادلہ کر لیتے۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ایسے پروگرام باہمی یگانگت کو فروغ دینے کے علاوہ باعثِ برکت بھی ہوتے ہیں اور آج احساس ہوتا ہے کہ یہ بات تھی بھی کتنی صحیح۔

نوجوانوں کی ذہنی و جسمانی تربیت اور ان میں ہوشیاری اور جواں مردی کی صفات پیدا کرنے کے لیے مجلس خدام الاحمدیہ کے تحت کئی طرح کے تربیتی پروگرام بنتے رہتے تھے جس میں جملہ خدام بہت جوش و خروش سے حصہ لیتے۔ مجھے یاد ہے ہمارے محلّے کے خدام کو ایک شام محلہ دار الفضل میں محصول چونگی کے پاس پہنچنے کی ہدایت موصول ہوئی۔ جب میں وہاں پہنچا تو تیس سے پینتیس خدام پہلے سے وہاں موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں راجہ نذیر احمد ظفر جو مجلس خدام الاحمدیہ مقامی کے کوئی عہدیدار تھے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے انتہائی راز دارانہ انداز میں ہمیں بتایا کہ ان کی اطلاع کے مطابق ربوہ کا ایک لڑکا اور لڑکی رات کی تنہائی میں بہشتی مقبرے والی پہاڑی کے پیچھے جا کر چوری چھپے ملتے ہیں۔ ہمیں ہدایت کی گئی کہ ہم دو دو تین تین کی ٹولیوں میں وہاں جا کر خاموشی سے موقع ملاحظہ کریں اور تصدیق کریں کہ اس اطلاع میں کس حد تک صداقت ہے۔ یہ تاکید بھی کی گئی کہ ہم نے دُور ہی سے صورتِ حال کا جائزہ لینا ہے اور ان کے کسی معاملہ میں دخل دیئے بغیر پلٹ آنا ہے۔

ہدایت کے مطابق ہم چونگی سے محلہ دار الفضل کی عقبی پہاڑی پر چڑھ گئے اور بہشتی مقبرہ کے پیچھے سے اس درّے میں داخل ہو گئے جو ربوہ اور کوٹ امیر شاہ کو ملاتا تھا لیکن اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ درّہ پار کرنے کے بعد ہم پہاڑی کے ساتھ ساتھ دریا کی جانب چل پڑے۔

ہماری یہ مہم عشا کی نماز کے بعد شروع ہوئی۔ عام جوتوں کے ساتھ تو پتھروں پر دن کے وقت بھی چلنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ یہی کام رات کے وقت کیا جائے لیکن چونکہ بہت سے خدام اکٹھے تھے اس لیے یہ مہم قدرے آسان اور دلچسپ ہو گئی اور ہم گپیں ہانکتے اس ٹیلے کے پاس جا پہنچے جس کی اوٹ میں روایت کے مطابق وہ لڑکا اور لڑکی لیلیٰ مجنوں کا کھیل کھیلتے تھے۔

دور سے دیکھا تو ایک مرد کھڑا نظر آیا جس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی سیاہ رنگ کی چادر میں لپٹی ہوئی کوئی جوان سی چیز نظر آرہی تھی جسے ہم نے اس وقت لڑکی سمجھا۔ جب ہم ذرا نزدیک پہنچے تو مرد نے ہم پر پتھر برسانا شروع کر دیے گویا متنبہ کر رہا ہو کہ اگر ہم نے اس کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو وہ ہمیں پتھروں سے لہولہان کر دے گا۔ ہمیں ہدایت بھی یہی تھی کہ ہم نے ان کے قریب نہیں جانا لہٰذا ہم وہیں سے واپس آگئے اور جو کچھ دیکھا تھا راجہ نذیر احمد ظفر کے سامنے من وعن بیان کر دیا۔

جب ہم اس مہم پر روانہ ہو رہے تھے تو ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ ایک ایکسرسائز ہے لیکن واپسی کے سفر میں اس مہم کے مختلف پہلوؤں پر کھل کر بات ہوئی تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ربوہ کے کسی لڑکے اور لڑکی کا رات کی اس تاریکی میں پہاڑی کے اُس پار جا کر ملنا قرینِ قیاس نہیں۔ بعد میں ہمارے اس خیال کی تصدیق بعض دیگر ذرائع سے بھی ہوگئی اور پتا چلا کہ ٹیلے سے ہم پر پتھر برسانے والا شخص فی الحقیقت مجلس خدام الاحمدیہ مقامی کا ایک عہدیدار تھا جب کہ وہ چیز جسے ہم چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی سمجھ رہے تھے فی الحقیقت ایک پتھر تھا جس پر سیاہ رنگ کی چادر ڈالی ہوئی تھی۔

یوں تو ربوہ میں امن و امان کا دور دورہ تھا لیکن چوری کی وارداتیں عنقانہ تھیں۔ اکثر اوقات تو ان چوریوں کا سراغ نہ ملتا اور گھر کا اثاثہ سڑک پر جا کر غائب ہو جاتا لیکن ایک بار چور پکڑے گئے۔ میں اُن دنوں غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھا۔ ایک رات تین چور محلّہ دارالبرکات کے کسی گھر میں چوری کرتے ہوئے دیکھ لئے گئے۔ اگرچہ انہوں نے فرار ہونے کی کوشش میں پہریدار پر فائرنگ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا مگر اہلِ محلّہ نے ان کا تعاقب جاری رکھا اور بالآخر انہیں جالیا۔ ان چوروں کا تعلق لائلپور سے تھا اور انہیں پولیس کے حوالہ کر دیا گیا جہاں عبدالرحمٰن نامی ایک چور ضربات کی تاب نہ لاتے ہوئے مرگیا۔ ان دنوں یہ بات بھی مشہور ہوئی تھی کہ عبدالرحمٰن ایک ڈاکو تھا جو کچھ عرصہ قبل جیل سے فرار ہو گیا تھا اور پولیس پہلے سے اس کی تلاش میں تھی۔ اس کے چند سال بعد چوری کی ایک اور بڑی واردات سامنے آئی جس میں چھ چور ملوث تھے۔ وہ سب پکڑے گئے اور ان میں سے دو پولیس حراست میں مارے بھی گئے مگر چوری کی وارداتوں میں کمی نہ ہوئی اور چوروں کو جہاں موقع ملتا داؤ لگا جاتے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے محلّہ جات میں رات کے وقت پہرے کا انتظام ہوتا اور اس مقصد سے خدام اور صفِ دوم کے انصار کی ڈیوٹیاں لگتیں۔

مجھے بھی بہت دفعہ انجمن کوارٹرز اور قصرِ خلافت میں پہرہ دینے کا موقع ملا تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ ہاں! مجلس خدام الاحمدیہ کی طرف سے لاٹھیاں اور ٹارچیں فراہم کی جاتی تھیں جو ہم ہاتھوں میں پکڑ کر ساری رات ایک مخصوص علاقے میں گشت کرتے رہتے۔ مجلس خدام الاحمدیہ کے ذمہ داران کی ہدایت کے مطابق ہم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لاٹھی زمین پر مارتے اور وقفے وقفے سے کچھ وقت کے لئے کسی جگہ بیٹھ کر آرام کر لیتے اور یوں کسی نہ کسی طرح رات گذر جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں کسی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا ورنہ ہم نہتے پہریداروں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔

ایک رات جب ہم انجمن کوارٹرز میں پہرہ دے رہے تھے ہم نے ایک گھر کی بیٹھک میں بجلی کی روشنی دیکھی یہ گھر مرزا احمد شفیع مرحوم جو حضرت میر محمد اسماعیل کے برادر نسبتی تھے اور قیام پاکستان کے وقت قادیان میں عورتوں کی حفاظت کے دوران سکھوں کے حملہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے کے اہل خانہ کے پاس تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور رواج تھا تمام لوگ صحنوں میں سویا کرتے تھے لہذا ہمارے نزدیک کمرے کے اندر روشنی کا جواز نہ تھی۔ ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ گھر کے اندر چور گھسا ہوا ہے لیکن خوف کے مارے دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت پیدا نہ ہو رہی تھی چنانچہ ہم نے یہ معصومانہ فیصلہ کیا کہ جب چور باہر نکلے گا تو اچانک اس پہ حملہ کر اسے قابو کر لیں گے۔ یہ طے کرنے کے بعد ہم نے گشت موقوف کر دیا اور ساری رات اسی گھر کے سامنے مورچہ زن رہے۔ ہم فجر تک چور کے باہر نکلنے کے منتظر رہے لیکن اندر کوئی ہوتا تو باہر نکلتا۔ جب اہل محلہ جاگ اُٹھے اور نمازی بیت الذکر کی طرف جانے لگے تو ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تب مرزا احمد شفیع کے بیٹے، مسیح اور رفیع باہر آئے اور ہماری بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بتایا کہ وہ رات کے وقت بیٹھک کی بتی بجھانا بھول گئے تھے جس کی وجہ سے یہ ساری غلط فہمی پیدا ہوئی۔

ربوہ میں جہاں خدمت خلق کے دیگر کئی کام سرانجام دیئے جاتے وہیں مجلس خدام الاحمدیہ کی طرف سے موسم گرما میں ریلوے سٹیشن اور لاری اڈے پر مسافروں کو پانی پلانے کا انتظام کیا جاتا۔ اُن دنوں یہ اڈہ بیت مبارک اور انجمن کوارٹرز کے درمیان موجود گرین بیلٹ کے بالمقابل سڑک کے اس پار یعنی بیت مبارک کی طرف ہوا کرتا تھا۔ اڈے پر بڑے بڑے ڈرم رکھے ہوتے تھے۔ ماشکی صبح سویرے ان میں پانی بھر دیتے اور جب سورج نصف النہار پر پہنچتا تو مختلف محلوں کے اطفال و خدام ڈیوٹی لسٹ کے مطابق وہاں پہنچ جاتے۔ سب سے پہلے ڈرموں میں برف ڈالی جاتی اور جوں ہی پانی ٹھنڈا ہو جاتا تمام اطفال و خدام اپنی اپنی بالٹی بھرتے اور لاتعین گلاس ہاتھ میں پکڑ کر ہر آنے جانے والی بس کے قریب جا کر ''ٹھنڈا پانی پی لو! مفت پانی پی لو!'' کی صدائیں لگانے لگتے۔

لاری اڈوں پر موسم گرما میں پانی پلانے کا رواج تو ہمیشہ سے ہے لیکن عام طور پر یہ کام معاوضے کی توقع پر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر مسافر پانی پینے سے پہلے ہم سے پوچھتے کہ اس گلاس کی قیمت کیا لی جائے گی۔ جب ہم وضاحت کرتے کہ یہ کام محض جذبہ خدمت خلق کے تحت کیا جا رہا ہے نہ کہ کسی معاوضے کے لالچ میں تو بعض مسافر بخوشی پانی پی لیتے لیکن جماعت سے خدا واسطے کا بیر رکھنے والے وہ مسافر جنہیں معلوم ہوتا کہ پانی پلانے والے ''مرزائی'' ہیں نہ صرف خود پانی پینے سے انکار کر دیتے بلکہ اپنے گرد بیٹھے ہوئے مسافروں کو بھی یہ پانی پینے سے روکنے لگتے۔

پانی پلانے کی خدمت پر مامور بچے عام طور پر سکول کے طالب علم ہوتے تھے۔ انہیں دوپہر کا کھانا کھاتے ہی اس ڈیوٹی کے لیے حاضر ہونا پڑتا تھا لہٰذا وہ بسا اوقات آپس میں اس طریق کار پر نکتہ چینی بھی کرتے لیکن ملوضہ ڈیوٹی پوری دلجمعی سے ادا کرتے۔ ایک روز یہ سلسلہ اچانک بند کر دیا گیا۔ اصل وجہ کا علم تو

ارباب اختیار کو ہوگا لیکن افواہ یہ تھی کہ کسی ناہنجار نے پانی کے ڈرم میں کوئی زہریلی چیز ملا دی لیکن اس کا بروقت پتا چل گیا اور اللہ تعالیٰ نے جماعت کو کسی ناموافق ردعمل سے بچالیا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ عملاً پانی میں زہر نہیں ملایا گیا تھا بلکہ زہر ملانے کی دھمکی موصول ہوئی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خدمت خلق کا ایک اور انداز بیماروں کی تیمارداری تھی۔ ساٹھ کی دہائی کے نصف اوّل میں نامور خادم سلسلہ سید زین العابدین ولی اللہ شاہ سخت بیمار ہوگئے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ چارپائی سے لگ کر رہ گئے تھے۔ ان کے گھر میں ان کی دیکھ بھال کا مناسب انتظام نہ تھا چنانچہ ان کی خدمت کے لیے محلے کے خدام کی ڈیوٹی لگا کرتی تھی۔ یہ نوجوان ان کا جسم دباتے، پنڈلیوں پر مالش کرتے اور بعض امور نمٹانے میں اہل خانہ کی مدد کرتے۔ مجھے بھی کئی باران کی خدمت کا اعزاز حاصل ہوا تاہم ستمبر ۱۹۶۵ء میں میرے لاہور منتقل ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا اور وہ اسی اثناء میں وفات پا گئے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے اپنے قیامِ ربوہ کے دوران بعض اور بزرگان کی مٹھی چاپی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

چونکہ انجمن کوارٹرز فضل عمر ہسپتال کے بہت قریب تھے لہٰذا اس محلہ کے اطفال و خدام سے امید کی جاتی تھی کہ وہ ہسپتال میں داخل ہونے والے بے سہارا مریضوں کی دیکھ بھال بھی کریں گے۔ اس دیکھ بھال میں ان کی مزاج پرسی، ان کے لئے بازار سے اشیائے ضروریہ کی فراہمی اور مٹھی چاپی شامل ہوتی۔ اس حوالے سے میری بھی کئی بار ڈیوٹی لگتی رہی۔ باقی مریضوں کے کوائف تو مجھے اب یاد نہیں البتہ گھٹیالیاں سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ جن کا نام محمد حسین تھا کبھی نہیں بھولے۔ میں دن میں کئی کئی باران کی مزاج پرسی کے لئے جاتا تھا اور دو چار بار تو ان کے لیے گھر سے کھانے پینے کی کوئی چیز بھی بنوا کر لے گیا۔ یوں ہمارے درمیان ایک ذاتی تعلق پیدا ہو گیا۔ کبھی حاضری میں کوتاہی ہو جاتی تو وہ بہت دلآویز انداز میں اس کا احساس دلا دیتے۔ بات چیت سے تو اس بات کا پورا اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن موصوف نے ادبی ذوق پایا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے ان کا یکم اگست ۱۹۶۵ء کا لکھا ہوا یہ خط

''ربوہ کی سرزمینِ مقدس ایک مردِ قلندر کی تخت گاہ ہے۔ کیفِ جذب و مستی کی مچلتی انگڑائیاں، روحانیت کی صدا بہار مسکراہٹیں دلآویز سماں کی حامل ہیں۔ ایسے میں تو کفر بھی باوضو ہو کر سجدہ سہو ادا کرنے پر مجبور ہے اور اسی میں عافیت سمجھتا ہے۔ مکینانِ جنت نشان! تم پر سلام۔ دعا فرماتے رہا کریں۔''

اتفاق سے اسی عرصہ میں میری ممانی وفات پا گئیں اور میں دو تین روز تک ان کے پاس حاضر نہ ہو سکا۔ انہوں نے الفضل میں محترمہ کی وفات کا پڑھا تو فوراً مجھے افسوس کا خط لکھا اور دبے لفظوں میں عدمِ ملاقات پر شکوہ بھی کیا۔ ملاحظہ فرمایئے ان کا یہ خط:

''بہت دن بیت گئے دیدارِ فرحت آثار سے محروم ہی چلا آرہا ہوں۔ ممانی صاحبہ کے رحلت فرما ہو جانے کی وجہ سے شاید مجبوراً تشریف نہیں لائے۔ آپ کی ممانی صاحبہ کی وفات کا ازحد افسوس ہے۔ حضرت امی جان صاحبہ کی خدمت میں اظہارِ افسوس پہنچا دیویں۔ خدا تعالیٰ مرحومہ کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا

فرمائے۔ آمین
عاجز شاید جانے والا ہے۔ اگر بوقتِ فرصت تشریف لاویں تو ممنون ہونگا اور مسرور بھی۔‘‘
میں ان سے ملا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور اس کے دو تین دنوں بعد اپنے گاؤں چلے گئے۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر بھی مجھ سے خط و کتابت جاری رکھی۔ یہ سلسلہ بعد میں میری ہی کوتاہی سے منقطع ہوا۔

’’وقارِ عمل‘‘ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی جاری کردہ ایک تحریک ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ احبابِ جماعت کسی بھی جائز کام کو (خواہ معاشرہ اسے کیسی ہی بُری نظر سے دیکھتا ہو) اپنے ہاتھ سے کرنے میں عار محسوس نہ کریں بلکہ ایسے کاموں میں عزت و افتخار محسوس کریں۔ حضور نے اس تحریک کے فوائد بیان کرتے ہوئے ایک بار فرمایا تھا: ’’اس تحریک سے دو ضروری فوائد حاصل ہونگے، ایک تو نکما پن دُور ہوگا اور دوسرے غلامی کو قائم رکھنے والی روح کبھی پیدا نہ ہوگی۔ یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ فلاں کام بُرا ہے اور فلاں اچھا ہے۔ بُرا کام کوئی نہ کرے اور اچھا چھوٹے بڑے سب کریں۔ بُرا کام مثلاً چوری ہے یہ کوئی نہ کرے اور جو اچھے ہیں ان میں سے کسی کو عار نہ سمجھا جائے تا اس کے کرنے والے ذلیل نہ سمجھے جائیں اور جب دنیا میں یہ مادہ پیدا ہو جائے کہ کام کرنا ہے اور نکما نہیں رہنا اور کسی کام کو ذلیل نہیں سمجھنا تو اس طرح کوئی طبقہ ایسا نہیں ہوگا جو دنیا میں غلامی چاہتا ہو۔‘‘ حضور کو یقینِ کامل تھا کہ وقارِ عمل کی تحریک پر عمل جماعتی اور ملکی اقتصادیات کو ترقی دے سکتا ہے، شہروں اور دیہات کی قسمت بدل سکتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ قائم کر سکتا ہے جس میں امارت اور غربت یا پیشہ وارانہ تخصیص کی بنیاد پر کسی کو دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہ رہے گا۔

ربوہ میں وقارِ عمل بالعموم ہفتہ وار تعطیل کے روز کیا جاتا تھا۔ اہم جماعتی تقریبات بالخصوص جلسہ سالانہ سے پہلے وقارِ عمل کئی روز تک مسلسل کیا جاتا۔ اس کی عملی شکل یہ ہوا کرتی تھی کہ محلّہ کے اطفال، خدام اور انصار یعنی ہر عمر کے بچے اور بڑے کسی جگہ اکٹھے ہو جاتے۔ گندگی کے کسی ڈھیر کی صفائی مقصود ہوتی تو اسے دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا اور نالیوں کی صفائی کی جاتی۔ اسی طرح اتفاقاً گر جانے والی دیواروں کا ملبہ راستوں سے ہٹایا جاتا اور بارش کی وجہ سے عوامی گذر گاہوں میں پڑ جانے والے گڑھے پُر کئے جاتے۔ اگر کوئی درخت یا خار دار جھاڑی آنے جانے والوں کے لیے مشکل پیدا کر رہی ہوتی تو اس کی مناسب قطع و برید کر کے اس رکاوٹ کو دور کر دیا جاتا۔ یہی نہیں اگر کوئی سرکاری محکمہ خدام الاحمدیہ کو اپنی مدد کے لئے پُکارتا تو فوراً لبیک کہا جاتا۔

ایک بار جب سیلاب کی وجہ سے دریائے چناب کے پُل کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تو ربوہ کے سینکڑوں انصار و خدام نے شدید جسمانی مشقت کے بعد ہزاروں مکعب فُٹ پتھر متاثرہ مقام تک پہنچایا۔ اسی طرح ایک بار جب محکمہ زراعت ٹڈیوں کے انڈے تلف کرنے کی مہم پر تھا درجنوں خدام نے ایک مختصر وقت میں ڈاور کے قریب کئی انچ گہری اور سینکڑوں فٹ لمبی نالی کھود کر خدمت خلق کی ایک روشن مثال قائم کر دکھائی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق دونوں مواقع پر متعلقہ حکام نے انصار و خدام کے اس جذبہ کو واشگاف الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

یہ واقعات تو میرے آنکھوں دیکھے ہیں لیکن جماعت احمدیہ کی تاریخ بے لوث خدمت کی درخشاں مثالوں

سے ابھری پڑی ہے چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے مجلس خدام الاحمدیہ دہلی کے ایک اجتماعی وقارِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے اپنے رسالہ ''منادی'' میں لکھا ہے: ''آج دہلی کی قادیانی جماعت کے چالیس افراد خدمتِ خلق کے لیے آئے اور مجھ سے پوچھا کہ کہیں کا راستہ صاف کرنا ہو تو بتا دیجئے۔ میں نے اپنے مسافر خانہ کا راستہ خود جا کر بتایا اور ان لوگوں نے مزدوروں کی طرح پھاوڑے لے کر راستہ صاف کیا۔ ان میں وکیل بھی تھے اور بڑے بڑے عہدوں کے سرکاری نوکر بھی تھے اور مرزا صاحب کے قرابت دار بھی تھے۔ ان کے اس مظاہرے کا درگاہ کے زائرین اور حاضرین پر بہت اثر ہوا۔ ایک صاحب نے کہا کہ پراپیگنڈا کے لیے یہ کام کر رہے ہیں۔ میں نے کہا حضرت سلطان المشائخؒ نے فرمایا ہے جو شخص ظاہرداری کے لیے خدمت کرتا ہے اس کو ایک اجر ملتا ہے اور جو شخص خدا کے لیے خدمتِ خلق کرتا ہے اس کو دو اجر ملتے ہیں۔ درگاہوں سے اعتقاد رکھنے والے اپنی ذات کے لیے مجاہدے کرتے ہیں۔ اس قسم کے مجاہدے جن کا تعلق عوام کی آسائش سے ہو بہت کم دیکھے جاتے ہیں۔''

قارئین وقارِ عمل کی برکات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مختلف جماعتی رسالوں میں شائع ہونے والی رپورٹوں سے پتا چلتا ہے کہ ممالکِ بیرون میں جہاں مزدور کی اجرت بہت زیادہ ہے احباب ہفتے میں ایک یا دو بار دن یا رات کے وقت وقارِ عمل کر کے بعض اہم جماعتی عمارات پر اُٹھنے والے اخراجات میں خاطر خواہ بچت کا سبب بن رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ربوہ میں وقارِ عمل بالعموم جمعہ کے روز ہوتا تھا۔ ہماری مجلس جو مجلس خدام الاحمدیہ محلہ دارالصدر شرقی کہلاتی تھی اور جس میں انجمن کوارٹرز کے علاوہ قصرِ خلافت اور اس سے ملحق پرائیویٹ رہائش گاہیں بھی شامل تھیں اس لحاظ سے خاصی فعال تھی اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس کا سہرا اُس وقت کے زعماء کے سر پر تھا جن میں سے ایک محمد ابراہیم سار چوری تھے تو دوسرے بشیر احمد قادیانی جنھیں لوگ ''بشیر قادیانی'' کے مختصر نام سے یاد کیا کرتے تھے۔

اطفال و خدام کی سرگرمیوں کے اس مختصر سے جائزے کے بعد اب کچھ یادیں جلسہ سالانہ کی جو اس شہر میں منعقد ہونے والا سب سے بڑا جماعتی اجتماع ہوا کرتا تھا۔

کیا آپ کے علم میں ہے کہ جماعتِ احمدیہ کا پہلا جلسہ سالانہ کب اور کہاں منعقد ہوا تھا؟

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے

حضرت مسیح موعود نے خدا تعالیٰ کے حکم اور منشا کے عین مطابق ۲۷ دسمبر ۱۸۹۱ء کو جماعت احمدیہ کے پہلے جلسہ سالانہ کے انعقاد کا اعلان فرمایا۔ اس جلسے میں شامل ہونے والوں کی تعداد صرف پچھتر تھی۔ اس کے بعد یہ جلسہ قادیان میں الا ماشاء اللہ ہر سال منعقد ہوتا رہا اور اس میں شامل ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تقسیم ملک کے بعد پہلا جلسہ سالانہ تو لاہور میں ہوا لیکن ربوہ میں پہلا جلسہ سالانہ ۱۹۴۹ء میں ہوا اور تب سے ۱۹۸۳ء تک ہر سال منعقد ہوتا رہا۔ وقت کے ساتھ اس جلسہ میں شامل ہونے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا چنانچہ ۱۸۹۱ء کے پچھتر افراد کے مقابلے میں ۱۹۸۳ء کے جلسہ سالانہ میں پونے تین لاکھ سے زائد فرزندانِ احمدیت شامل ہوئے۔

بعض حکومتی پابندیوں کی وجہ سے ۱۹۸۳ء کے بعد ربوہ میں تو جلسہ سالانہ نہیں ہو سکا البتہ دنیا کے طول وعرض میں جہاں جہاں احمدی جماعتیں موجود ہیں مقامی حالات کے مطابق جلسہ ہائے سالانہ باقاعدگی سے منعقد ہو رہے ہیں اور ان میں احمدیوں اور غیر از جماعت احباب کی ایک بڑی تعداد شامل ہو کر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتی ہے جن کی خاطر اس جلسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

یاد رہے کہ حضرت مسیح موعود نے جلسہ سالانہ کا اجرا خالصۃً تعلیمی اور تربیتی مقاصد کے لئے فرمایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جماعت کے افراد ہر سال مرکز میں جمع ہو کر اپنے دینی بھائیوں سے تعارف حاصل کریں، باہم محبت کے تعلقات استوار کریں، دین کا علم سیکھیں اور اس چشمۂ فیض سے جو خدا کے مسیح نے خدائی حکم اور منشا کے مطابق جاری کیا ہے سیراب ہوں۔

حضور نے اپنے ایک اشتہار بعنوان ''اطلاع'' اور دوسرے بلاعنوان اشتہار محررہ ۷ دسمبر ۱۸۹۲ء مشمولہ ''مجموعہ اشتہارات'' جلد اوّل میں اس جلسہ کے اغراض و مقاصد بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ حضور کے اپنے الفاظ میں ''اس جلسہ کے اغراض میں سے بڑی غرض تو یہ ہے کہ تا ہر ایک مخلص کو بالمواجہ دینی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے اور ان کے معلومات وسیع ہوں اور خدا تعالیٰ کے فضل و توفیق سے ان کی معرفت ترقی پذیر ہو۔''

جلسہ سالانہ کے بعض دیگر مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے حضور فرماتے ہیں: ''اور ایک عارضی فائدہ ان جلسوں میں یہ بھی ہوگا کہ ہر یک نئے سال میں جس قدر نئے بھائی اس جماعت میں داخل ہوں گے وہ تاریخ مقررہ پر حاضر ہو کر اپنے پہلے بھائیوں کے منہ دیکھ لیں گے اور روشناسی ہو کر آپس میں رشتہ تودد و تعارف ترقی پذیر ہوتا رہے گا اور جو بھائی اس عرصہ میں اس سرائے فانی سے انتقال کر جائے گا اس جلسہ میں اُس کے لیے

دعائے مغفرت کی جائے گی اور تمام بھائیوں کو روحانی طور پر ایک کرنے کے لیے اور ان کی خشکی اور اجنبیت اور نفاق کو درمیان سے اُٹھا دینے کے لیے بدرگاہِ حضرت عزت جلشانہ کوشش کی جائے گی۔'' نیز یہ کہ ''اس جلسہ میں ایسے حقایق اور معارف کے سنانے کا شغل رہے گا جو ایمان اور یقین اور معرفت کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں اور نیز ان دوستوں کے لیے خاص دعائیں اور خاص توجہ ہوگی اور حتی الوسع بدرگاہِ ارحم الرّاحمین کوشش کی جائے گی کہ خدائے تعالیٰ اپنی طرف ان کو کھینچے اور اپنے لیے قبول کرے اور پاک تبدیلی ان میں بخشے۔''

حضرت مسیح موعود اس جلسے کے مقاصد کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تمام مخلصین داخلینِ سلسلہ بیعت اس عاجز پر ظاہر ہو کہ بیعت کرنے سے غرض یہ ہے کہ تا دنیا کی محبت ٹھنڈی ہو اور اپنے مولا کریم اور رسُول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت دل پر غالب آ جائے اور ایسی حالتِ انقطاع پیدا ہو جائے جس سے سفرِ آخرت مکروہ معلوم نہ ہو۔ لیکن اس غرض کے حصول کے لیے صحبت میں رہنا اور ایک حصہ اپنی عمر کا اس راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے تا اگر خدائے تعالیٰ چاہے تو کسی برہانِ یقینی کے مشاہدہ سے کمزوری اور ضعف اور کسل دور ہو اور یقینِ کامل پیدا ہو کر ذوق اور شوق اور ولولہِ عشق پیدا ہو جائے۔ سو اس بات کے لیے ہمیشہ فکر رکھنا چاہیئے اور دعا کرنا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ یہ توفیق بخشے اور جب تک یہ توفیق حاصل نہ ہو کبھی کبھی ضرور ملنا چاہیئے کیوں کہ سلسلہِ بیعت میں داخل ہو کر پھر ملاقات کی پروانہ رکھنا ایسی بیعت سراسر بے برکت اور صرف ایک رسم کے طور پر ہو گی اور چونکہ ہر یک کے لیے بباعثِ ضعفِ فطرت یا کمیِ مقدرت یا بُعدِ مسافت یہ میسر نہیں آ سکتا کہ وہ صحبت میں آ کر رہے یا چند دفعہ سال میں تکلیف اُٹھا کر ملاقات کے لیے آوے کیوں کہ اکثر دلوں میں ابھی ایسا اشتعالِ شوق نہیں کہ ملاقات کے لیے بڑی بڑی تکالیف اور بڑے بڑے حرجوں کو اپنے پر روا رکھ سکیں لہٰذا قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے کہ سال میں تین روز ایسے جلسہ کے لیے مقرر کیے جائیں جس میں تمام مخلصین اگر خدا تعالیٰ چاہے بشرطِ صحت و فرصت و عدمِ موانعِ قویہ تاریخِ مقررہ پر حاضر ہو سکیں۔''

حضور اس جلسے کی عظمت و اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اور مکرّر لکھا جاتا ہے کہ اس جلسہ کو معمولی انسانی جلسوں کی طرح خیال نہ کریں۔ یہ وہ امر ہے جس کی خالص تائیدِ حق اور اعلائے کلمہ ...... پر بنیاد ہے۔''

بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اس جلسہ میں شمولیت اختیار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا فرمائی ہے کہ ''ہر یک صاحب جو اس للّٰہی جلسہ کے لیے سفر اختیار کریں خدا تعالیٰ ان کے ساتھ ہو اور ان کو اجرِ عظیم بخشے اور ان پر رحم کرے اور ان کی مشکلات اور اضطراب کے حالات ان پر آسان کر دیوے اور ان کے ہم و غم دور فرماوے اور ان کو ہر یک تکلیف سے مخلصی عنایت کرے اور ان کی مرادات کی راہیں ان پر کھول دیوے اور روزِ آخرت میں اپنے اُن بندوں کے ساتھ ان کو اُٹھاوے جن پر اس کا فضل و رحم ہے اور تا اختتامِ سفر ان کے بعد ان کا خلیفہ ہو۔''

حضرت مسیح موعود کی ان ہی تعلیمات کے مطابق ربوہ میں یہ جلسہ الّا ماشاء اللہ ہر سال دسمبر کی ۲۶، ۲۷

اور ۲۸ تاریخ کو منعقد ہوتا رہا۔ یہ جلسہ اس شہر کے باسیوں کے لیے ایک خاص خوشی کا پیغام لے کر آتا۔ وہ تو سال بھر سے اس موقع کے منتظر ہوتے تھے چنانچہ اس موقع پر تزئین ربوہ کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ جلسہ سے پہلے وقار عمل کے ذریعے گلیوں محلوں کی ممکن حد تک صفائی کی جاتی۔ گھروں کے سامنے اور آس پاس چھڑکاؤ کیا جاتا۔ جب تک نالیاں کچی تھیں ان پر کئی دن پہلے سے چونا چھڑکا جانے لگتا اور جب نالیاں پختہ ہوگئیں تو ان کی دھلائی کی جانے لگی۔ اراکینِ انصاراللہ اور لجنہ سے توقع کی جاتی کہ وہ اپنے گھروں کے اندر حتی المقدور صفائی کا اہتمام کریں گی۔ یہ تاکید بھی کی جاتی کہ ربوہ کے رہائشی اپنے گھروں کے باہر بجلی کا ایک ایک بلب ضرور لگا دیں اور اسے رات بھر جلائے رکھیں تاکہ مہمانانِ کرام کو وہاں سے گذرتے ہوئے تکلیف نہ ہو۔ اُس زمانے میں ربوہ میں سٹریٹ لائٹ کا انتظام نہیں تھا لہٰذا عام حالات میں پورا شہر سرِ شام تاریکی میں ڈوب جاتا۔ ایامِ جلسہ میں خصوصی طور پر لگائے گئے ان بلبوں سے ربوہ کا نقشہ یکسر بدل جاتا۔

آخری چند سالوں میں تو زیادہ مصروف راستوں پر آرائشی محرابیں بنانے کا رواج بھی ہو چلا تھا جو آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتیں۔ علاوہ ازیں لوہے کے بڑے بڑے بورڈ جن پر کلمہ طیبہ، آیات قرآنی اور حضرت مسیح موعود کے بعض الہامات لکھے ہوتے نمایاں جگہوں پر نصب کر دیئے جاتے۔ ان میں سے تین الہامات جو مجھے ابھی تک یاد ہیں ”میں تیری (......) کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا“، ”یَاْتِیْکَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔ یَاْتُوْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ“ اور ”غلام احمد کی جے“ تھے۔

بعض دکان دار اپنی دکانوں کو کاغذ کی جھنڈیوں سے بھی آراستہ کرتے جس سے ربوہ کا حسین چہرہ اور نکھر جاتا۔

دکانداروں کو علم ہوتا تھا کہ دسمبر کے آخری عشرے میں یہاں کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا اور مہمانوں کو روزمرہ کی ضرورت کی تمام چیزیں یہیں سے خریدنا ہوں گی لہٰذا وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں وقت سے پہلے ضروری ساز و سامان خرید کر رکھ لیتے۔ رزق دینے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے، ربوہ کے دکانداروں کے لیے جلسہ سالانہ ایک نادر کاروباری موقع بھی ثابت ہوتا چنانچہ میں نے بعض دکانداروں کو خود یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ جلسہ کے دنوں میں سال بھر کی روٹی کما لیتے ہیں۔

جلسہ سالانہ کے ایام میں ربوہ میں بہت سی عارضی دکانیں بھی کھلتیں۔ یہ دکانیں جلسہ سے کم و بیش تین دن پہلے اور تین دن بعد تک چلتی رہتیں۔ زیادہ تر دکانیں گول بازار کے وسط میں جہاں اب بیت المهدی، واٹر ٹینک اور دفتر صدر عمومی تعمیر ہو چکا ہے لگتی تھیں۔ کچھ دکانیں رحمت بازار میں بھی لگتیں۔ یہ دکانیں خیموں کے اندر یا سائبان کے نیچے ہی لگائی جا سکتی تھیں اور اس مقصد کے لیے کسی قسم کی تعمیر کی اجازت نہ تھی۔ یہ دکانیں افسر جلسہ سالانہ کی مقرر کردہ جگہوں پر ہی لگتیں اور ان پر منظور شدہ نرخ نامہ آویزاں کرنے کی پابندی تھی۔

ان دکانوں میں ریستوران؛ مٹھائی، سموسوں، پکوڑوں، دہی بھلوں، تازہ پھلوں اور خشک میوہ جات کی دکانیں اور ٹی سٹال سرِ فہرست ہوتے۔ بعض دواخانے مثلاً طبیہ عجائب گھر، ایمن آباد؛ دواخانہ حکیم نظام جان،

گوجرانوالہ اور شفاخانہ رفیقِ حیات سیالکوٹ بھی اپنے اپنے سٹال لگاتے۔ کچھ لوگ کتابوں، اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ والی انگوٹھیوں اور ٹوپیوں کی دکانیں بھی لگاتے تاہم تمام تر چہل پہل کے باوجود اس موقع پر ملک کے روایتی میلوں ٹھیلوں کا رنگ عنقا ہوتا۔ بعض اوقات پنگھوڑوں والے تو یہاں پہنچ جاتے جو چھوٹے بچوں کو تفریح کے چند لمحات مہیا کر سکتے تھے اور کبھی کبھار کوئی بندر والا یا سپیرا بھی ادھر آ نکلتا لیکن اس موقع پر یہاں کوئی تھیٹر لگنے دیا جاتا نہ کسی بازی گر کو کرتب دکھانے کی اجازت ہوتی۔ اسی طرح بازار میں سگریٹ فروشی پر پابندی ہوتی۔

اگرچہ جلسہ کی کارروائی کے دوران تمام دکانیں حکماً بند رہتیں لیکن جلسہ ختم ہوتے ہی ان پر گاہکوں کا ہجوم ہو جاتا اور مہمانوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں ریستورانوں میں بیٹھ کر طرح طرح کے کھانوں اور گرم چائے سے اپنا دل بہلانے لگتیں۔ یہیں مدتوں کے بچھڑوں ہوؤں کی آپس میں ملاقاتیں ہوتیں، یہیں بعض جھگڑے نمٹائے جاتے اور یہیں بعض نئے تعلقات کی بنیاد رکھی جاتی۔

جلسہ سالانہ کی سوغاتوں میں سے لنگر خانے کے تبرک کے علاوہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ والی انگوٹھیاں، حضرت مسیح موعود اور خلفائے احمدیت کی تصاویر، کتبِ سلسلہ اور ربوہ کے بعض دواخانوں کی مقبولِ عام مصنوعات از قسم کاجل، اُبٹن اور کچھ ادویہ شامل تھیں۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ والی چاندی کی انگوٹھیاں احمدی مردوں اور خواتین میں یکساں مقبول تھیں بلکہ ایک مرحلہ پر تو یہ انگوٹھیاں احمدیوں کی پہچان بن گئیں تھیں۔ حضرت مسیح موعود اور آپ کے خلفاء کی تصاویر کے یکجا فریموں کا رواج بھی اسی زمانے میں فروغ پایا۔ کتب سلسلہ کا انتخاب خریداروں کے اپنے ذوق اور ضرورت پر منحصر تھا لیکن میرے مشاہدے کے مطابق پیر منظور محمد کے قاعدہ یسّرنا القرآن کی طلب سب سے زیادہ تھی۔

میں اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک تمام جلسوں میں شامل ہوا ہوں لیکن دونوں ادوار میں اس جلسہ میں شمولیت کا رنگ جدا تھا۔ بچہ ایسے مواقع سے لطف اندوز ہونے کے اپنے طریقے وضع کر لیتا ہے جب کہ عمر بڑھنے کے ساتھ سوچ میں ایک تبدیلی آنے لگتی ہے اور ان مواقع کے روحانی فوائد سے متمتع ہونے کی خواہش دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے۔ کچھ ایسے ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے بچپن میں جلسے سے پہلے ربوہ کے در و دیوار پر بہت بڑے بڑے اشتہارات لگنا شروع ہو جاتے۔ ان میں سے ایک اشتہار جس کی شکل و شباہت اور نفسِ مضمون مجھے آج تک نہیں بھولا جلسے کے پروگرام کا ہوتا تھا جو غالباً صدر انجمن احمدیہ شائع کرتی تھی۔ جہازی سائز کے اس اشتہار پر منارۃ المسیح کی تصویر ضرور ہوا کرتی تھی۔ میں اور میرا ہم نام پھوپھی زاد یہ اشتہار اور ہر طرح کے دیگر اشتہارات بہت شوق سے جمع کرتے تھے۔ تازہ چسپاں کئے گئے اشتہاروں کو اتارنا تو بہت آسان تھا لیکن ہمیں دو چار دن پہلے سے لگے ہوئے اشتہاروں کو بھی اُتارنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آتی چنانچہ جلسہ ختم ہونے کے بعد ہمارے پاس یہ اشتہار بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے۔ اگرچہ پیچھے لگی ہوئی لئی کی وجہ سے یہ اشتہار کسی استعمال کے قابل تو نہ ہوتے لیکن بس ہمیں اشتہارات جمع کرنے کا جنون سا تھا۔ جب ہم دیوار پر لگا ہوا اشتہار اُتارنے میں

کامیاب ہو جاتے تو ہمیں ایک انجانی لیکن بے پایاں مسرت کا احساس ہوتا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر گھر کی طرف بھاگتے ہوئے محسوس ہوتا گویا ہمیں کوئی نعمتِ غیر مترقبہ حاصل ہو گئی ہو۔ رات کے وقت ہم اپنے طے کردہ معیار کے مطابق ان اشتہارات کی درجہ بندی کرتے اور ان کے الگ الگ رول بنا کر سنبھال لیتے تاہم جلسہ گذرنے کے بعد جب سکول کھل جاتے تو ہمارا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جاتا اور کچھ عرصے کے بعد ہماری عدمِ دلچسپی سے یہ اشتہارات ضائع ہو جاتے۔

جلسہ سالانہ کے ایام میں جب دور ونزدیک سے لوگ جمع ہوتے تو ہماری عمر کے بچے اس موقع کو بھرپور تفریح کے لیے استعمال کرتے چنانچہ اس دوران ہم فضل عمر ہسپتال کے پیچھے والی پہاڑی کی چوٹی فتح کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے۔ اس وقت سانس بھی کم کم پھولتا تھا چنانچہ میں اور میرے کزن تقریباً بھاگتے ہوئے چوٹی پر پہنچ جاتے اور وہاں سے دیر تک جلسہ گاہ، گول بازار اور دریا کا نظارہ کرتے رہتے۔ موقع ملتا تو ہم بہشتی مقبرہ کے پیچھے والی پہاڑی پر بھی چڑھتے اور بعض دفعہ درّہ پار کر کے کوٹ امیر شاہ کی طرف جا نکلتے۔ ہم دیکھتے کہ کئی مہمان دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں، گنے چوسے جا رہے ہیں یا کسی بیلنے والے سے گنے کے رس یا تازہ گڑ کی فرمائش کی جا رہی ہے۔ بعض مہمان امرود کے باغات کے گرد منڈلاتے اور اس نعمتِ خداوندی سے فیضیاب ہونے کے طریقے ڈھونڈتے بھی نظر آتے تھے۔

اس موقع پر دریا کی سیر بھی ہمارے معمول میں شامل تھی۔ موقع ملتا تو کشتی رانی بھی کر لیتے اور اس کا وقت نہ ہوتا تو ویسے ہی گھوم پھر کر واپس آ جاتے۔ وقت اجازت دیتا تو ہم دریا کے اُس پار وہ ہندو مندر دیکھنے چلے جاتے جو اُس وقت تک ٹھیک حالت میں تھا۔ اُن دنوں دریا پر خاصی رونق ہوتی۔ بعد میں تو حالات بہت بدل گئے لیکن اس زمانے میں لوگوں کے خیالات میں بالعموم اتنی شدت نہ تھی چنانچہ نہ تو نقضِ امن کا کوئی اندیشہ ہوتا نہ غیر از جماعت افراد کی طرف سے کسی شرارت کا امکان لہٰذا دریا پر سیر کرنے والوں کا بھی خاصا رش ہوتا۔

مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی صحت کا زمانہ کچھ کچھ یاد ہے۔ اگرچہ میں کم عمری کی وجہ سے آپ کے بیان فرمودہ روحانی معارف سے تو پوری طرح بہرہ ور نہ ہو سکتا تھا لیکن میں نے آپ کی بعض تقاریر بہت انہماک کے ساتھ سنی ہیں چنانچہ نصرت گرلز ہائی سکول کے صحن میں ہونے والا وہ جلسہ مجھے آج بھی یاد ہے جس میں آپ کی سیر روحانی والی تقریر کم وبیش پانچ یا چھ گھنٹے جاری رہی تھی۔ یہ حضور کی قوتِ قدسی تھی یا فنِ خطابت پر آپ کی دسترس کا کمال کہ بارش کے باوجود سامعین میں کسی طرح کی بھگدڑ نہ مچی اور وہ انتہائی ضبط کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھ کر یہ تقریر سنتے رہے۔

حضور کی ان تقاریر کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری صیغہ زودنویسی کی تھی جس کے انچارج اباجی تھے۔ اُس دور میں مولوی سلطان احمد پیر کوٹی ان کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس اعتبار سے کچھ تقاریر یقیناً وہ بھی قلمبند کرتے ہوں گے لیکن حضور کے خطابات کی اہمیت کے پیشِ نظر اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ آپ کو اباجی کی کارکردگی پر زیادہ اعتماد تھا حضور کی تقاریر بالعموم وہی لکھتے۔

یہ موقع فن زودنویسی کی باریکیوں میں جانے کا نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ٹیپ ریکارڈنگ کی سہولت کے بغیر یہ کام انتہائی مشکل تھا۔ خدا کا شکر ہے اباجی اس فرض سے ہمیشہ بہت خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوئے اور حضور کو ان کے کام سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے اباجی سے سن رکھا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے غالباً کلکتہ کی جماعت نے حضور کی خدمت میں ایک ریکارڈنگ مشین تحفۃً پیش کی تھی جو امریکہ کی بنی ہوئی تھی۔ یہ مشین پاکستان بھی پہنچ گئی اور مدتوں بعد تک اباجی کے دفتر میں پڑی رہی۔ اس مشین کا نام ڈکٹافون تھا اور اس پر ٹیپ کی بجائے ایک کارڈ استعمال ہوتا تھا۔ یہ مشین جو دو حصوں میں تھی سائز کے لحاظ سے بہت بڑی تھی۔ افسوس یہ مشین اس کام کے لیے کبھی استعمال نہ ہو پائی جس کے لیے اسے حضور کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ شاید اس مشین میں شروع ہی سے کوئی خرابی تھی یا اسے استعمال کرنے کے لیے مطلوبہ مہارت کا فقدان تھا۔

ایک نوٹ سے جو حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے قلم سے الفضل (۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا پتا چلتا ہے کہ ۱۹۵۱ء کے جلسہ سالانہ پر امریکہ سے ایک صاحب شامل ہوئے تھے جن کا نام سید عبدالرحمٰن تھا۔ وہ بتیس سال کے طویل عرصہ کے بعد وطن واپس لوٹے تھے اور انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تقاریر ریکارڈ کی تھیں۔ جیسا کہ حضرت میاں صاحب کے درج ذیل الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اس وقت ٹیپ ریکارڈنگ کو ایک غیر معمولی واقعہ کے طور پر لیا گیا:

''سید عبدالرحمٰن صاحب نے اس جلسہ میں حضرت (......) خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی ساری تقریر اپنی امریکن مشین میں جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے من وعن ریکارڈ کی ہے تاکہ واپس جا کر حضور کی تقریر حضور ہی کے الفاظ اور حضور ہی کی آواز میں امریکن دوستوں کو سنا کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس محفوظ رکھ سکیں۔''

ریکارڈنگ کی یہ سہولت جلد ہی عام ہوگئی چنانچہ ۱۹۵۲ء کے جلسہ سالانہ سے پہلے الفضل میں یہ اعلان شائع ہوا کہ اس ''موقع پر بعض احباب ریکارڈنگ مشین لایا کرتے ہیں۔ اس بارہ میں اگر ضروری احتیاط نہ برتی جائے تو آلہ نشرُ الصوت کی آواز میں نقص پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے اس لیے امسال یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جو احباب جلسہ سالانہ کے موقع پر تقاریر ریکارڈ کرنا چاہیں وہ پندرہ دسمبر سے پہلے ...... درخواست بھجوا دیں ...... یہ ضروری ہوگا کہ ریکارڈنگ مشین کے مائیکروفون کی تار بیس یا پچیس فٹ لمبی ہو۔ اسی طرح مناسب سٹینڈ بھی ساتھ ہو۔''

الفضل کے پرانے فائل دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۵۳ء کے جلسہ سالانہ پر حضور کی سیر روحانی والی تقریر باقاعدہ طور پر ریکارڈ کی گئی اور بعد میں اسے (غالباً پہلی بار) جماعتوں میں سنانے کا اہتمام بھی کیا گیا۔

اباجی کی زندگی میں صیغہ زودنویسی کو دو ریکارڈنگ مشینیں فراہم کر دی گئی تھیں۔ یہ مشینیں سائز میں ایک چھوٹے صندوق کے برابر اور وزن میں بہت بھاری تھیں۔ قاضی محمد نذیر لائلپوری کے صاحبزادے قاضی عزیز احمد ان مشینوں کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔

حضرت مصلح موعود اپنی زندگی کے آخری چند برس بہت علیل رہے جس کی وجہ سے آپ نے ان جلسہ

ہائے سالانہ کے موقع پر یا تو اپنی ہی پہلے سے لکھوائی ہوئی تقاریر پڑھیں یا آپ کے پیغامات سامعین کو پڑھ کر سنائے گئے۔ میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ابا جی حضور کے پاس بیٹھ کر آپ کی ہدایت کے مطابق تقاریر یا پیغامات کے مشمولات نوٹ کر لیتے اور پھر انہیں مضمون کی شکل دے کر حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد اور ان کی وفات کے بعد حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے توسط سے حضور کو دکھا دیتے۔ حضور یہ تقاریر یا پیغامات پڑھنے سننے کے بعد ان پر اپنے دستخط ثبت فرماتے۔ بعد میں ان پیغامات کو جلی حروف میں خوش خط لکھوایا جاتا۔ یہ خدمت مولوی بشیر احمد قادیانی نامی ایک بزرگ سرانجام دیتے تھے۔ یہ تقاریر و پیغامات کتابی سائز میں لکھے جاتے تا کہ حضور کو انہیں پکڑنے میں آسانی رہے۔

تقریر کے دوران اللہ تعالیٰ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، مکہ اور مدینہ، حضرت مسیح موعود اور قادیان کے ذکر پر حضور کی آواز بھرّا جاتی اور رقّت طاری ہو جاتی۔ جن لوگوں نے آپ کی فصاحت و بلاغت سے بھرپور کئی کئی گھنٹوں پر محیط تقاریر سُن رکھی تھیں سسکیاں لینے لگتے اور دیکھتے ہی دیکھتے جلسہ گاہ حزن و ملال کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا۔ ثاقب زیروی کے مدِ نظر یہی صورت حال تھی جب انہوں نے کہا تھا:

چشمِ میگوں میں یہ دلدوز سی حسرت کیا ہے
رُوئے روشن پہ پریشان سی نکہت کیا ہے
تجھ کو دیکھا تو بجھے دل کو قرار آ ہی گیا
تیری بیمار نگاہوں میں بھی برکت کیا ہے
شمع افسردہ ہو پروانوں کی حالت معلوم
جانے اس کرب میں مالک کی مشیّت کیا ہے
''ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب!
آج معلوم ہوا ہے کہ علالت کیا ہے''

جلسہ سالانہ کے لیے کوئی ایک جگہ مستقل طور پر مخصوص نہ تھی بلکہ حالات کے مطابق اس میں تبدیلی کی جاتی رہتی تھی۔ میرے علم کے مطابق کچھ سال مردانہ جلسہ نصرت گرلز ہائی سکول کے صحن میں ہوا۔ اسی طرح مجھے زنانہ جلسے کا دفاتر صدر انجمن احمدیہ کی گراؤنڈ میں ہونا بھی یاد ہے۔ بعد میں جلسہ بیت الاقصیٰ والے میدان میں اور آخری سالوں میں بیت الاقصیٰ کی چار دیواری کے اندر منعقد ہونے لگا۔ جلسہ کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے جلسہ گاہ کو سٹیڈیم کی شکل دے دی جاتی یعنی اس کے چاروں طرف لکڑی کے شہتیروں سے مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے عارضی سیڑھیاں بنا دی جاتیں۔

باوجودیکہ جماعت کی مخالفت کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اُس وقت تک سکیورٹی گیٹوں یا میٹل ڈیٹیکٹرز کے استعمال کا رواج نہ ہوا تھا۔ ہاں! خدمتِ خلق کے کارکن آنے جانے والوں پر نظر رکھتے، کبھی کبھار کسی مہمان کے پاس موجود سامان کھلوا کر بھی دیکھ لیتے اور ضروری ہوتا تو اس کی جامہ تلاشی سے بھی گریز نہ کرتے لیکن یہ امر

ملحوظ رکھا جاتا کہ کسی مہمان کی دل آزاری نہ ہو اور اس کی عزت و تکریم پر کوئی حرف نہ آئے۔
جلسہ گاہ کی طرف آنے والے تمام راستوں پر خدمت خلق کے رضا کار دن رات ڈیوٹی پر موجود رہتے۔ مصروف سڑکوں پر مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ راستے بنا دیئے جاتے اور یہ امر یقینی بنایا جاتا کہ اس سلسلہ میں جماعتی ہدایات پر عمل میں کسی قسم کا تساہل نہ ہونے پائے۔
یوں تو جلسہ سالانہ کے موقع پر ضلعی انتظامیہ کی طرف سے ربوہ میں پولیس کی بھاری نفری بھی تعینات ہوتی تھی لیکن حقیقتاً امن عامہ کے قیام کی اصل ذمہ داری جماعتی رضا کاروں پر تھی جو اپنے فرض کی ادائی میں دن رات ایک کر دیتے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کے مجمع میں شرپسند عناصر کا گھس آنا نا قابلِ فہم بات نہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسے عناصر کو اپنے مذموم مقاصد میں ہمیشہ ناکامی ہوئی۔
اس موقع پر مہمانوں کی سہولت کے لیے پاکستان ریلوے خاص خاص مقامات سے ربوہ کے لیے سپیشل ٹرینیں چلاتی اور واپسی پر بھی ریلوے کی طرف سے ایسا ہی انتظام کیا جاتا۔ یہ ٹرینیں بالعموم کراچی، نارووال، سیالکوٹ، گجرات، جھنگ اور راولپنڈی سے چلتیں اور مسافروں کی متوقع تعداد کے پیشِ نظر بعض مقامات سے معمول کی گاڑیوں کے ساتھ فالتو بوگیاں لگا دی جاتیں۔ جب کوئی ٹرین سٹیشن پر پہنچتی تو مہمانوں کا استقبال نعرہ ہائے تکبیر اور أَهْلاً وَّسَهْلاً وَّمَـرْحَباً کے فلک شگاف نعروں سے کیا جاتا۔ مہمان بھی اسی جوش و خروش سے جوابی نعرے بلند کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتے۔ دفتر استقبال والوداع کے رضا کار مہمانوں کا سامان اتارنے اور انہیں اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف رخصت کرنے کے انتظامات میں جُت جاتے۔ پلیٹ فارم پر بے تحاشہ رش کی وجہ سے کبھی کبھار کوئی بچہ اپنے والدین سے بچھڑ جاتا یا کوئی بڑا مطلوبہ شخص کی تلاش میں ناکام ہو جاتا تو ریلوے سٹیشن پر نصب لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہونے لگتے۔ یہی منظر لاری اڈے پر دیکھنے میں آتا۔ کچھ مہمان سپیشل بسوں کے ذریعہ ربوہ پہنچتے تو کچھ انفرادی طور پر لیکن ان میں سے ہر ایک کے استقبال اور رہنمائی کے لیے ایک باقاعدہ انتظام موجود ہوتا۔
مہمانوں کی آنکھیں مرکز سلسلہ میں آمد کی خوشی سے چمک اُٹھتیں اور ان کا استقبال کرنے والوں کے دل مسرت سے لبریز ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے ہم اپنے مہمانوں کو اُن کے دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق لینے کے لیے بروقت ریلوے سٹیشن یا لاری اڈے پر پہنچ جایا کرتے تھے۔ مہمان پہنچتے تو فضا کا رنگ ہی بدل جاتا اور مصافحوں اور معانقوں کا سلسلہ تادیر جاری رہتا جس کے بعد ہم انہیں اپنے ہمراہ لے کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ہفت روزہ ''لاہور'' کے مدیرِ محترم نے ان مہمانوں کے جذبات کی کیا خوب عکاسی کی ہے:

نظر نظر میں لیے جان و دل کے نذرانے
طواف شمع کو پھر آگئے ہیں پروانے
جبیں پہ گردِ رہِ عشق دل میں نور و سُرور
ہیں آسمانِ عقیدت پہ آج دیوانے

زمینِ ربوہ کو سجدوں سے ناپنے کے لیے
مچل رہے ہیں جبینوں میں پاک نذرانے
کس اہتمام سے اِک شمعِ انجمن کے لیے
وفا کے نور میں ڈوبے ہوئے ہیں پروانے

اُس زمانے میں ربوہ میں تانگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی لیکن جلسہ سالانہ کے موقع پر گردونواح سے درجنوں تانگے یہاں آ جاتے چنانچہ لاری اڈے اور ریلوے اسٹیشن کے باہر بہت گہما گہمی ہوتی۔ افسر جلسہ سالانہ کی طرف سے مختلف محلوں کے لیے تانگے کے نرخ مقرر ہوتے تھے۔قلیوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود ہوتی جن کے اجرت نامے کی جلسہ سالانہ سے پہلے خوب تشہیر کر دی جاتی تھی لیکن ساتھ ہی ایسے خدام بھی ڈیوٹی پر مامور ہوتے جو ٹرین یا بسوں سے مسافروں کا سامان اتارنے اور انہیں حسب خواہش ان کے گھروں تک پہنچانے میں ان کی ہر ممکن مدد کرتے۔ یاد رہے کہ یہ سارا کام محض خدمت خلق کے جذبہ کے تحت رضا کارانہ طور پر سرانجام دیا جاتا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اتنے بڑے ہجوم میں چھوٹے بچوں کا ادھر ادھر ہو جانا یا سامان کا گم جانا بعید از قیاس نہیں لہٰذا لاری اڈے اور ریلوے اسٹیشن پر اور جلسہ گاہ میں احباب جماعت کو اس بارے میں بار بار احتیاط کا مشورہ دیا جاتا۔ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں بعض والدین کو وقتی طور پر اپنے بچوں کی گمشدگی کا سامنا کرنا پڑا لیکن میرے علم کے مطابق ان مواقع پر ایک بھی بچہ گم نہیں ہوا۔گمشدہ سامان بھی بالعموم مالکان تک بحفاظت پہنچ جاتا اور اس کا باعث خدمت خلق کا وہ جامع نظام تھا جس کی بنیاد پچھلے کئی سالوں کے تجربے پر رکھی گئی تھی۔

اگر کسی مہمان کی کوئی گمشدہ چیز فوری طور پر نہ مل پاتی تو جلسہ سالانہ کے بعد الفضل میں اس کا اعلان کرا دیا جاتا۔وہ زمانہ غربت اور تنگدستی کا تھا چنانچہ بسا اوقات اب بظاہر بہت معمولی نظر آنے والی اشیاء مثلاً بستر کی چادر، ٹفن کیریئر اور ایسی گٹھڑی جس میں صرف دو چار استعمال شدہ کپڑے تھے کی گمشدگی کے اعلانات بھی شائع ہوتے رہتے۔اسی طرح بازیاب ہونے والی اشیاء کی بھی مناسب تشہیر کر دی جاتی جس سے بیشتر گم شدہ چیزیں بالآخر اپنے اصل مالکان تک پہنچ جاتیں۔

جلسہ سالانہ کے موقع پر مہمانوں کی ایک بڑی تعداد جماعتی قیام گاہوں میں ٹھہرتی۔ جماعتی قیام گاہوں سے مراد وہ عمارات ہوتیں جنہیں کسی خاص جماعت یا جماعتوں سے تعلق رکھنے والے مہمانوں کی رہائش کے لیے مختص کر دیا جاتا تھا۔ان میں سے کچھ قیام گاہیں صرف مردوں کے لیے مخصوص ہوتیں تو دیگر صرف عورتوں کے لیے۔چونکہ مہمانوں کے لئے چارپائیوں کا انتظام ناممکنات میں سے تھا لہٰذا مہمان جماعتی طور پر مہیا کردہ پرالی پر اپنے ہمراہ لائے ہوئے بستر بچھا کر سو جاتے ۔ ہر قیام گاہ کے ساتھ پہلے سے موجود ٹوائلٹس کے علاوہ عارضی ٹوائلٹس بھی تعمیر کئے جاتے اور طہارت کے لئے مٹی کے لوٹے فراہم کئے جاتے۔اگرچہ فلش سسٹم کی عدم موجودگی

میں تو اخلاص کی خاطر غوامضائی تو نہ ہو سکتی تھی لیکن ان قیام گاہوں کے مکین یہ سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کر لیتے۔
باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کی تواضع کے لیے جلسہ سے بہت پہلے کثیر تعداد میں مٹی کے آبخورے اور پیالے تیار کرائے جاتے۔ آبخورہ پانی پینے کے کام آتا جب کہ پیالہ سالن ڈالنے کے لیے استعمال ہوتا۔ جماعتی قیام گاہوں میں ٹھہرنے والوں کو موقع پر ہی کھانا کھلایا جاتا تھا۔ مہمان قطاروں میں بیٹھ جاتے اور ڈیوٹی پر موجود رضا کار سالن سے بھری بالٹی میں سے ڈوئی کی مدد سے پیالوں میں سالن ڈالتے چلے جاتے۔ آٹھ آٹھ دس دس مہمانوں کے لیے روٹی ایک جگہ اکٹھی رکھ دی جاتی، کچھ رضا کار پانی کے جگ لیے کھڑے ہوتے۔ وہ حسبِ ضرورت پانی آبخوروں میں ڈالتے چلے جاتے۔ رضا کار بھی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہوتے لیکن مہمانوں کو بھی اپنے میزبانوں کی تنگ دامنی کا پورا احساس ہوتا چنانچہ خدا کے فضل سے یہ مرحلہ انتہائی خوش اسلوبی سے اختتام پذیر ہوتا۔

اُن مہمانوں کے لیے جو کسی وجہ سے جماعتی قیام گاہوں میں ٹھہرنا نہ چاہتے دارالضیافت سے ملحق گراسی پلاٹ میں خیمے نصب کئے جاتے تھے۔ ہر خیمہ ایک خاندان کے لیے مختص ہوتا۔ اس خیمہ بستی کے گرد رسیوں سے ایک حفاظتی حصار کھینچ دیا جاتا اور خدمت خلق کے کارکن وہاں ہمہ وقت ڈیوٹی پر موجود رہتے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شدید سردی میں کھلے آسمان کے نیچے ان خیموں میں قیام ان کے مکینوں کے لیے کس حد تک خوشگوار تجربہ ہو گا لیکن انہیں وہ پرائیویسی ضرور میسر آ جاتی جس سے دوسرے مہمان محروم رہتے تھے۔

پرائیویٹ قیام گاہوں میں ٹھہرنے کے خواہشمندوں کے لیے اُن اہلِ ربوہ سے جو بسہولت اپنے مکان کا کچھ حصہ جلسہ کے مہمانوں کے لیے وقف کر سکتے ایک ایک کمرہ حاصل کر لیا جاتا اور جماعتی نظام کے تحت کچھ مہمان وہاں بھی ٹھہرائے جاتے تاہم مکانات کی طلب اور رسد میں ہمیشہ عدمِ توازن رہا۔ اس توازن کے حصول کے لیے جہاں مقامی احباب سے بار بار تعاون کا مطالبہ کیا جاتا وہیں مہمانوں سے بھی توقع کی جاتی کہ وہ اپنی درخواست پر غیر ضروری اصرار نہیں کریں گے۔ اس حوالے سے افسر جلسہ سالانہ اور ناظم مکانات کی طرف سے مقامی احباب اور مہمانان کی خدمت میں اپیلیں الفضل میں شائع ہوتی رہتی تھیں تاہم میری معلومات کے مطابق طلب اور رسد میں کچھ نہ کچھ فرق ہمیشہ ہی رہتا۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اپنے گھر کی محدود مکانیت کی وجہ سے اس کا کوئی حصہ جماعتی مہمانوں کے لیے تو وقف نہ کر سکتے البتہ ربوہ کے باقی مکینوں کی طرح ہمارے اپنے رشتہ دار اس موقع پر ہمارے گھر پر قیام کرتے جس کی وجہ سے جلسہ کے ایام میں گھر میں خوب چہل پہل رہتی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کچے کوارٹروں میں بے سروسامانی کا عالم کچھ زیادہ ہی تھا اور مہمانوں کے لیے جگہ نہ ہونے کے برابر تھی چنانچہ ایک بار لاہور سے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ اپنے اہل وعیال سمیت جلسہ پر تشریف لائے تو انہوں نے اپنی رہائش کے لیے ہمارے صحن میں ایک چھولداری نصب کی تھی۔ ایک بار لاہور ہی سے میرے پھوپھا، ملک نواب خان اپنی فیملی سمیت ہمارے ہاں ٹھہرے تو انہوں نے بھی صحن میں اپنا خیمہ نصب کیا۔ بعد میں جب ہم پکے کوارٹرز میں منتقل ہو گئے تو صورت حال

قدرے بہتر ہوگئی۔ ہم مہمانوں کے لیے ''بیڈروم'' خالی کر دیتے اور سٹور اور باورچی خانے کو اپنا ٹھکانہ بنا لیتے۔ اگر چہ ہمیں کچھ تنگی تو ہوتی لیکن اکرامِ ضیف کے جذبہ کے تحت یہ سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کرلیا جاتا اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا کہ مہمان ہمارے لئے کسی طرح کا بوجھ ہیں۔

ہمارے گھر میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی تعداد بالعموم چالیس سے پچاس تک ہوتی۔ جماعتی انتظام کے تحت بلا قیمت مہیا کی جانے والی پرالی فرش پر بچھا دی جاتی جس پر یہ مہمان بستر لگا کر اس آرام وسکون سے سوتے گویا وہ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں مقیم ہوں۔ ایک غسل خانہ ان سب کی ضروریات کا بہ آسانی کفیل نہیں ہوسکتا تھا نہ لنگر خانے کا کھانا ہر ذوق کی تسکین فراہم کرسکتا تھا لیکن مہمان یہ سارا وقت حرفِ شکایت زبان پر لائے بغیر گذارتے۔

جلسے کے ایام میں مہمانوں کے لیے کھانا گھروں میں نہیں پکتا تھا بلکہ لنگر خانہ سے لایا جاتا۔ ہمارے گھر سے میرے دو چچازاد یعنی منور جاوید اور منصور وقار وہاں جایا کرتے تھے۔ مہمانوں میں سے کوئی نہ کوئی اور ہمراہ ہو لیتا اور بہ شرطِ فرصت میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا۔ اگر چہ مہمانوں کو ہمارے ہاں اپنے گھر والا آرام مل سکتا تھا نہ ملتا مگر اس کے باوجود وہ ہر بار اس عزم کے ساتھ ربوہ سے واپس جاتے کہ اگلے سال پھر اسی جوش وجذبہ کے ساتھ یہاں حاضر ہونگے۔

ابتدا میں جلسہ کے مہمانوں کا کھانا صرف ایک لنگر خانے میں تیار ہوتا تھا جو محلّہ دارالصدر میں ریلوے سٹیشن کے تقریباً بالمقابل واقع تھا۔ بعد میں محلّہ دارالرحمت میں ایک اور لنگر خانہ قائم ہوگیا اور یوں اوّل الذکر لنگر خانے کو لنگر خانہ نمبر ایک اور موٴخر الذکر لنگر خانے کو لنگر خانہ نمبر دو کہا جانے لگا۔ مہمانوں کی تعداد میں اضافے اور ربوہ کی آبادی میں پھیلاوٴ کے ساتھ آہستہ آہستہ مزید لنگر خانوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی چنانچہ پہلے محلّہ دارالعلوم میں اور بعد میں محلّہ دارالنصر میں ایک ایک اور لنگر خانہ قائم کیا گیا۔ یوں کام کا بوجھ بھی چار حصوں میں بٹ گیا اور ربوہ کے دور دراز محلوں میں قیام کرنے والے مہمانوں کو کھانے کے حصول میں مزید سہولت حاصل ہوگئی۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اپنی جائے رہائش کی مناسبت سے محلّہ دارالصدر والے لنگر خانے سے کھانا حاصل کیا کرتے تھے۔ کھانا لینے والوں کی پہلے سے موجود ایک طویل قطار کے آخر میں کھڑا ہونا کوئی خوشگوار تجربہ ثابت نہیں ہوسکتا لیکن اُس وقت موسم کی شدت کی پرواتھی نہ کوئی اور اہم مصروفیت ہماری منتظر ہوتی لہٰذا ہم یہ وقت ہنسی خوشی گذار دیتے۔ کبھی کبھار بعد میں آنے والا کوئی شخص قطار کے اندر گھسنے کو کوشش کرتا تو تُو تُو میں میں شروع ہوجاتی اور قطار میں کھڑے افراد اسے سمجھا بجھا کر پیچھے کھڑا ہونے پر مجبور کر دیتے۔ بعض اوقات کسی اور وجہ سے دھکم پیل شروع ہو جاتی تو قطار کی شکل پہلے جیسی نہ رہتی لیکن اتنے برسوں میں کم از کم اس بات پر میری کسی سے لڑائی نہیں ہوئی۔

سالن عام طور پر بالٹی یا کسی اور دھاتی برتن میں ڈلوالیا جاتا اور روٹیاں کسی کپڑے میں باندھ لی جاتیں۔ لنگر خانہ سے کھانا اس پرچی پر ملتا جو صدر محلّہ (جسے مصدّق کہا جاتا تھا) کی تصدیق پر دفتر اجرائے پرچی خوراک

جاری کرتا تھا۔ اس پرچی پر مہمانوں کی معین تعداد لکھی ہوتی تھی۔ بسا اوقات غیر متوقع طور پر بہت سے مہمانوں کی آمد کی وجہ سے کھانا کم پڑ جاتا تو نئی پرچی بنوانے کے لیے پھر سے وہی طریق کار اختیار کرنا پڑتا۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کھانا لینے والے لنگر خانے کے باہر قطار میں کھڑے ہیں لیکن سالن اچانک ختم ہو گیا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اس صورت حال میں مسور کی دال چولہوں پر چڑھا دی جاتی جو بہت جلد تیار ہو جاتی۔ مہمانوں کو پتا تو چل جاتا کہ ان کے سامنے پڑی ہوئی دال میں پانی ابھی کچا ہے لیکن وہ صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے اور اسی کو من و سلویٰ سمجھ کر اپنی خوش بختی پر رشک کرتے کہ انہیں حضرت مسیح موعود کو پہچاننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اور وہ ان ہی کے لنگر سے خوشہ چینی کر رہے ہیں۔

بعض اوقات لنگر خانے میں کام کرنے والے غیر از جماعت نانبائی جو ٹھیکے پر کام کیا کرتے تھے انتظامیہ سے ناراض ہو کر ہڑتال کر دیتے۔ اگر تو ان کے مطالبات قابلِ قبول ہوتے تو یہ ہڑتال طول نہ کھینچتی اور وہ جلد ہی دوبارہ کام شروع کر دیتے لیکن مجھے کم از کم ایک دو مواقع ایسے یاد ہیں جب ان کے انکار کی وجہ سے کام بالکل رُک گیا تو آٹا گھروں میں تقسیم کرنا پڑا اور لجنات نے مشنری جذبے کے تحت روٹیاں پکائیں جو بعد میں جماعتی انتظام کے تحت اکٹھی ہو کر تقسیم ہوئیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی طرف سے تحریک کی گئی کہ کوئی مہمان ایک سے زیادہ روٹی نہ کھائے اور یوں اس ہڑتال کے منفی اثرات پر فی الفور قابو پا لیا گیا۔

ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر صدر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کی طرف سے ایسی دیہاتی خواتین کی خدمات بھی طلب کی گئی تھیں جو بڑے تندروں پر روٹی پکا سکیں۔ ان خواتین سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ربوہ پہنچتے ہی لجنہ کے دفتر میں اپنا نام اور پتا لکھوا دیں لیکن عملاً ان خواتین کی خدمات کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ابتدا میں تندروں میں لکڑی جلائی جاتی تھی۔ پھر جب ربوہ کو سوئی گیس کی فراہمی شروع ہو گئی تو یہ تندور سوئی گیس سے چلنے لگے۔ بعد میں روٹی پکانے والی خودساختہ مشینوں کی تنصیب کا کام شروع ہوا جو آزمائش پر پورا اترا چنانچہ تمام لنگر خانوں میں یہ مشینیں نصب کر دی گئیں اور آخری جلسہ سالانہ کے موقع پر روٹی ان ہی مشینوں سے پکائی جاتی رہی۔ ان مشینوں کی وجہ سے نانبائیوں کی ہڑتال کے تکلیف دہ اثرات محدود ہو کر رہ گئے۔

مہمانوں کو صبح کے ناشتے میں تندروی روٹی کے ساتھ چھلکے والی ماش اور چنے کی دال پیش کی جاتی تھی۔ ہمارے بعض مہمان اس روٹی کو پانی کا چھینٹا دینے کے بعد گھی میں تل لیتے تو خاصا کُرکُرا پراٹھا تیار ہو جاتا جو لنگر سے ملنے والی دال اور گھر میں تیار کی گئی چائے کے ساتھ خاص لطف دیتا۔ بعض جدّت طراز رات کے بچے ہوئے سالن میں سے آلو الگ کر لیتے اور انہیں ملیدہ کر کے کٹلس بنا لیتے جنہیں ان پراٹھوں کے ساتھ استعمال کر لیا جاتا۔ کفایت کے خیال سے بسا اوقات یہ پراٹھے بچے کھچے سالن کے اوپر جمے ہوئے بناسپتی گھی سے بھی تیار کر لیے جاتے۔

جلسہ کے ایام میں رات کے وقت آلو گوشت پکتا۔ یہ گوشت گائے کا ہوتا تھا۔ کثرتِ کار کی وجہ سے

آلوؤں کو چھیلا نہیں جاتا تھا۔ بڑے آلو کے تو دو یا چار ٹکڑے کر لیے جاتے لیکن چھوٹا آلو سالم ہی دیگ میں ڈال دیا جاتا۔ بعض مہمان کھانا کھاتے وقت یہ چھلکا اتار لیتے اور کچھ اسے بھی محض تکلف سمجھتے۔

اس زمانے میں بچی کچی روٹیاں ضائع کرنے کا رواج نہ تھا۔ مہمان روٹیاں بلکہ ان کے ٹکڑے بھی بطور تبرک ہمراہ لے جاتے اور خشک کر کے سارا سال کھاتے رہتے۔

باہر سے آنے والے مہمان بعض اوقات بدہضمی یا پیٹ کی کسی اور ایسی تکلیف کا شکار ہو جاتے جس کی وجہ سے ان کے لیے معمول کی غذا کھانا ممکن نہ رہتا۔ ایسے مریضوں کے لیے لنگر خانے سے پرہیزی کھانا حاصل کیا جا سکتا تھا جو بالعموم اُبلے ہوئے چاول اور بکرے کے گوشت کے شوربے پر مشتمل ہوتا۔ کبھی کبھی کچھ مُنہ چلے پرہیزی کھانے کے لالچ میں بیمار بھی بن جاتے لیکن بالعموم یہ کھانا حقیقی بیماروں تک ہی پہنچتا۔

غالباً ۱۹۶۲ء کے جلسہ کی بات ہے۔ الفضل میں ایک اعلان شائع ہوا تھا جس کے مطابق ان مہمانوں کو جو روٹی کی بجائے ڈبل روٹی کھانا پسند کرتے ہوں فوری طور پر افسر جلسہ سالانہ کو مطلع کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس اعلان کے ذریعہ ایسے مہمانوں کو یقین دہانی کرائی گئی تھی وہ لنگر خانہ سے حسب ضرورت ڈبل روٹی حاصل کر سکیں گے تاہم مجھے ذاتی طور پر اس سلسلے میں کوئی تجربہ نہیں ہوا۔

جلسہ سالانہ کے جملہ انتظامات کا ذمہ دار افسرِ جلسہ سالانہ ہوتا جو اپنے بہت سے نائبین کی مدد سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچاتا۔ جلسہ سالانہ سے متعلقہ مختلف امور الگ الگ نظامتوں کے سپرد تھے۔ ان نظامتوں میں نظامت سپلائی وسٹور پختہ سامان، نظامت سٹور و اجناس، نظامت آب رسانی، نظامت طبی امداد، نظامت محنت، نظامت مکانات، نظامت معلومات وفوری امداد، نظامت حاضری ونگرانی معاونین، نظامت پرچی خوراک، نظامت تصدیق پرچی خوراک، نظامت مہمان نوازی اور نظامت مہمان نوازی مستورات شامل تھیں۔ اس موقع پر جامعہ احمدیہ اور ربوہ کے ہائی سکولوں اور کالجوں کے جملہ احمدی طلبہ و طالبات کے علاوہ تمام جماعتی دفاتر کے کارکنان کی ڈیوٹیاں لگ جاتیں۔ مجھے سکول کے زمانہ کا معمول تو یاد نہیں لیکن کالج میں جلسہ سالانہ سے دو تین ماہ پہلے احمدی طلبہ سے ایک فارم پُر کرایا جاتا تھا جس میں طالب علم کے جملہ کوائف درج ہوتے اور اس سوال کا جواب بھی کہ وہ ترجیحاً کہاں ڈیوٹی دینا چاہے گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں ڈیوٹی کے لیے اپنی ترجیح بیان کرنے سے بالعموم احتراز کرتا اور اس کا فیصلہ افسرِ مجاز پر چھوڑ دیتا۔ میرا خیال ہے میرا یہ انداز عام روش سے ذرا ہٹ کر تھا کیوں کہ فرسٹ ایئر میں جب میں نے اپنے ڈیوٹی فارم میں یہ لکھا کہ مجھے افسرِ مجاز اپنی مرضی کی کوئی خدمت سونپ سکتا ہے تو چچا ابراہیم نے جو بحیثیت نائب افسر جلسہ سالانہ جملہ رضا کاروں کی ڈیوٹیوں کا تعین کرتے تھے ابا جی کے سامنے اس بات کو علی الخصوص سراہا۔

اس ڈیوٹی کی بیسیوں شکلیں تھیں۔ کچھ رضا کار مہمانوں کے استقبال و الوداع پر مامور ہوتے تو کچھ اپنے جماعتی قیام گاہوں میں مقیم مہمانوں کی میزبانی پر۔ بعض رضا کار لنگر خانوں میں خدمت کو ترجیح دیتے تو کچھ اپنے ہی محلے میں اجرائے پرچی خوراک کے حوالے سے کام کرنا پسند کرتے۔ خدمتِ خلق ایک وسیع شعبہ تھا جس میں

سکیورٹی، ٹریفک کنٹرول، بازار کا انتظام، سڑکوں پر ہلڑ بازی کی روک تھام اور امن و امان کا قیام اور جلسہ گاہ کی حفاظت شامل تھی۔ گمشدہ سامان کی تلاش اور گرے پڑے سامان کے مالکان سے رابطہ رضا کارانہ خدمت کا ایک الگ شعبہ تھا تو جلسہ گاہ میں موجود سامعین کی گنتی بھی اتنا ہی اہم کام سمجھا جاتا تھا۔ غرض کوئی بھی رضا کار کسی بھی جگہ ڈیوٹی دینے کی خواہش کا اظہار کر سکتا تھا لیکن افسرِ جلسہ سالانہ کو اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی ضرورت کے تحت کسی بھی رضا کار کو کسی بھی جگہ کوئی سی ذمہ داری سونپ دے۔

ڈیوٹی لسٹ تیار ہو جاتی تو افادۂ احباب کے لیے اسے ایک بڑے چارٹ کی صورت میں شائع کر دیا جاتا۔ یہ چارٹ جماعتی قیام گاہوں، لنگر خانوں اور پبلک مقامات پر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح رضا کاروں کو اپنی ڈیوٹی کے بارے میں کوئی اشتباہ نہ رہتا اور وہ کوئی وقت ضائع کیے بغیر مقامِ ڈیوٹی پر پہنچ جاتے۔

ڈیوٹی جلسہ سے تین روز پہلے ۲۳ دسمبر کی صبح شروع ہو جاتی اور جلسہ کے تین دن بعد ۳۱ دسمبر کی شام ختم ہو جاتی۔

مجھے ربوہ میں اپنے قیام کے دوران وقتاً فوقتاً کئی شعبوں میں خدمت بجا لانے کا موقع ملا اور خدا کا شکر ہے مجھے کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا نہ میرے افسران کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ ہاں! ایک بار جب میں بیت مبارک سے ملحق پرانے دارالضیافت میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی خدمت پر مامور تھا ایک صاحب میری کسی نادانستہ حرکت سے بہت سیخ پا ہوئے۔ وہ خود اُن دنوں کراچی کی جماعت کے سیکرٹری ضیافت تھے اور اکرامِ ضیف کے تقاضوں سے بخوبی آشنا تھے۔ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اُتر سکا تھا چنانچہ انہوں نے غصے میں مجھے سخت سست کہا اور یہ دھمکی بھی دی کہ وہ افسرانِ بالا کے پاس میری شکایت کریں گے لیکن میں نے ان سے بحث و تمحیص سے اجتناب کیا بلکہ بار باران سے معذرت طلب کرتا رہا۔ خدا کا شکر ہے جلد ہی ان کی غلط فہمی دور ہوگئی اور وہ عمر میں واضح تفاوت کے باوجود بعد میں میرے اچھے دوست بن گئے اور ان کی وفات تک میری ان سے خط و کتابت رہی۔ یہ ان کا احسان تھا کہ انہوں نے میری بے روزگاری کے دنوں میں تلاشِ معاش میں میری مدد کی کوشش کی اور میرے دل پر ان کی نیکی کا یہ نقش آج تک قائم ہے۔ موصوف اب بہشتی مقبرہ میں دفن ہیں اور مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں ان کی قبر پر رُک کران کی بلندی درجات کے لیے ضرور دعا کرتا ہوں۔

ایک موقع پر جب میری ڈیوٹی لنگر خانہ میں تھی کسی انتظامی دقّت کو فوری طور پر افسر جلسہ سالانہ کے نوٹس میں لانا مقصود تھا۔ اُس زمانے میں فون کی آج والی سہولتیں میسر نہ تھیں چنانچہ میرے انچارج نے مجھے آپ کے پاس حاضر ہو کر رہنمائی حاصل کرنے کی ہدایت کی۔ اُن دنوں افسر جلسہ سالانہ کا دفتر انصار اللہ مرکزیہ کے دفاتر کی عمارت میں تھا اور حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد بطور افسر جلسہ سالانہ اپنے نائبین کے ساتھ کسی میٹنگ میں مصروف تھے۔ آپ مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے تھے چنانچہ میں بے دھڑک اندر چلا گیا اور آپ کو اپنے انچارج کا پیغام پہنچا دیا۔ مجھے اب اس مسئلے کی جزئیات تو یاد نہیں ہیں لیکن آپ کی رائے میں یہ معاملہ افسر جلسہ سالانہ کے پاس لانے کی ضرورت نہ تھی اور اسے مقامی سطح پر ہی حل کر لیا جانا چاہیے تھا۔ جب میں یہ فیصلہ سن کر واپس جانے کے لیے مُڑا تو میرا پاؤں نیفیون

کی فرش پر پڑی ہوئی تار میں اُلجھ گیا۔ اس جھٹکے کی وجہ سے فون جو میز پر آپ کے دائیں ہاتھ آپ کے بہت قریب پڑا تھا اچانک آپ کی جھولی میں آن گرا۔ میں اپنی اس نادانستہ حرکت پر قدرے نادم سا تھا اور آپ بھی چونکے لیکن کسی ناراضی کا اظہار کئے بغیر متبسم چہرے کے ساتھ فرمایا: ''دیکھا غلط راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ۔''

جلسہ سالانہ کا افتتاح خلیفہ وقت کی تقریر یا استثنائی حالات میں آپ کے پیغام کے ساتھ ہوتا۔ دوسرے اور تیسرے دن دوپہر کے بعد کا جملہ وقت بھی آپ ہی کی تقاریر کے لیے مختص ہوتا جب کہ باقی ماندہ وقت میں بزرگانِ سلسلہ دینی اور علمی موضوعات پر اپنی تقاریر کے ذریعے حاضرین کے علم و فضل میں اضافے کا باعث بنتے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا میں اپنے بچپن میں تو صرف حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی تقاریر سنا کرتا تھا لیکن میں نے جوں جوں ہوش سنبھالا میں باقی تقاریر بھی سننے لگ گیا۔ مجھے اپنے شعور کے زمانے میں جو تقاریر سننے کا موقع ملا ان میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث اور حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی مقامِ خلافت پر فائز ہونے سے پہلے اور بعد کی تقاریر سرِ فہرست ہیں۔ دیگر مقررین کی فہرست یوں تو خاصی طویل ہے لیکن فی الوقت مجھے جو نام یاد آ رہے ہیں ان میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد، حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد، چوہدری محمد ظفر اللہ خان، پروفیسر قاضی محمد اسلم، شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ، چوہدری اسد اللہ خان، مولوی محمد صاحب امیر جماعت ہائے احمدیہ مشرقی پاکستان، مولانا جلال الدین شمس، مولانا ابوالعطا جالندھری، قاضی محمد نذیر لائلپوری، ملک سیف الرحمٰن مفتی سلسلہ، شیخ مبارک احمد سابق مربی انچارج مشرقی افریقہ، مولانا عبدالمالک خان، مولانا محمد صادق سماٹری، مولانا محمد جی فاضل، مولانا غلام باری سیف، شیخ عبدالقادر مصنف حیاتِ طیبہ، مولوی سمیع اللہ انچارج بمبئی مشن، مرزا عبدالحق ایڈووکیٹ، شیخ محمد احمد مظہر ایڈووکیٹ، صاحبزادہ مرزا مبارک احمد، صاحبزادہ مرزا رفیع احمد، صاحبزادہ مرزا وسیم احمد، ڈپٹی محمد شریف اور مولانا دوست محمد شاہد کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ایک دفعہ مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث، چوہدری محمد ظفر اللہ خان اور قاضی محمد اسلم کی تقاریر ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کروں چنانچہ میں نے دو یا تین سال یہ التزام رکھا لیکن کسی وجہ سے یہ ٹیپس خراب ہو گئیں۔ بعد میں اس طرف میری توجہ قائم نہ رہ سکی۔

ان جلسوں کی ایک خاص بات ثاقب زیروی اور چوہدری شبیر احمد کی نظمیں تھیں۔ ثاقب زیروی موقع کی مناسبت سے اپنا تازہ کلام پیش کرتے جب کہ چوہدری شبیر احمد بالعموم حضرت مسیح موعود کا منظوم کلام پڑھتے۔ دونوں صاحبان بلا کے خوش گلو تھے اور جب وہ ہزاروں، لاکھوں کے اس مجمع کے سامنے اپنی آواز کا جادو جگاتے تو سامعین پر ایک وجد طاری ہو جاتا۔ ایسی محافل میں ''مکرّر'' کا مطالبہ تو ممکن نہ تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت سے سامعین دل و جان سے چاہتے ہوں گے کہ نظم خوانی کا سلسلہ یوں ہی جاری و ساری رہے۔

اس موقع پر جلسہ گاہ میں ایک بہت بڑا اسٹیج تیار کیا جاتا جہاں صدر انجمن احمدیہ کے ناظران، تحریک جدید کے وکلا، جلسہ سالانہ کے عہدیداران، رفیقان حضرت مسیح موعود، امرائے اضلاع، غیر ممالک سے آئے ہوئے مہمانان اور نظامِ جماعت کے ساتھ تعاون میں نمایاں حیثیت کے حامل افراد تشریف فرما ہوتے۔ خاص

خاص غیراز جماعت مہمانان کے لیے بھی سٹیج پر ہی نشستیں مختص ہوتیں۔ سٹیج ٹکٹ کے لیے جلسہ سالانہ سے کافی پہلے بذریعہ الفضل درخواستیں طلب کی جاتیں جن میں درخواست دہندہ کو اپنے کوائف وجہِ استحقاق اور تصدیق وسفارش امیر یا صدر جماعت کے ہمراہ بھجوانا ہوتے تھے۔

یقیناً ان درخواستوں پر بھی سٹیج ٹکٹ جاری ہوتے ہوں گے لیکن بعض ٹکٹ افسر جلسہ گاہ کی صوابدید پر بھی جاری ہوتے تھے کیوں کہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران جب میں فیصل آباد میں تعینات تھا مجھے کسی مطالبے کے بغیر ہر سال سٹیج کا ٹکٹ موصول ہوتا رہا لیکن اپنے آپ کو اس اعزاز کا اہل نہ پا کر میں کبھی سٹیج پر نہیں بیٹھا۔

خواتین کی جلسہ گاہ مردوں سے الگ ہوتی۔ ہاں! انہیں کچھ تقاریر مردانہ جلسہ گاہ سے سنائی جاتیں لیکن خلیفۂ وقت کم از کم ایک بار ضرور مستورات سے براہ راست خطاب فرماتے۔ مردوں کی طرح خواتین کے جلسہ کا پروگرام الگ سے طبع ہوتا اور اس کی ضروری تشہیر کی جاتی۔ اس دور کی نمایاں مقررات میں سے حضرت نواب مبارکہ بیگم، سیدہ مہر آپا اور سیدہ مریم صدیقہ حرم حضرت خلیفہ المسیح الثانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو تقریباً ہر جلسہ پر تقریر فرماتیں۔ خاندانِ حضرت مسیح موعود سے تعلق رکھنے والی دیگر مقررات میں سے صاحبزادی امۃ القدوس کا نام مجھے ابھی تک یاد ہے۔

میرے اپنے حلقہ احباب میں سے تعلیم الاسلام کالج کے لیکچرر، عبدالشکور اسلم کی اہلیہ، حمامۃ البشریٰ؛ ہمارے پڑوسی مسعود عاطف کی اہلیہ رضیہ درد؛ ایڈیٹر مصباح، امۃ الرشید شوکت؛ حبیب کلاتھ ہاؤس والے حبیب اللہ کی صاحبزادی، سعیدہ حبیب؛ ایم اے سیاسیات میں میری سینئر، صادقہ قمر؛ ان دنوں جماعت احمدیہ ناروے کے امیر، زرتشت منیر احمد کی ہمشیرہ، سیارہ حکمت اور آپی کی ایک ہم جماعت امۃ الباری بھی وقتاً فوقتاً اس جلسہ میں تقاریر کرتی رہی ہیں جب کہ تلاوت اور نظم کا اعزاز بالعموم استانی میمونہ کو حاصل ہوتا رہا۔

مردانہ جلسہ گاہ کی طرح خواتین کے جلسہ گاہ میں بھی سٹیج تیار کیا جاتا جس پر خاندانِ حضرت مسیح موعود کی مستورات؛ حضور کی رفیقات؛ ناظران صدر انجمن احمدیہ، وکلا تحریک جدید انجمن احمدیہ اور امرائے اضلاع کی بیگمات؛ ضلعی اور مستعد لجنات کی صدور اور لجنہ کی پرانی کارکنات بیٹھنے کی مجاز ہوتیں۔

ان جلسہ گاہوں میں سٹیج کے بالکل سامنے ایک خاصا بڑا حلقہ سامعینِ خاص کا ہوا کرتا تھا جہاں کرسیاں لگی ہوتیں۔ اس حلقے کے لیے بھی ٹکٹ جاری ہوتا تھا اور یہاں بعض دیگر لوگوں کے علاوہ بیمار اور معذور افراد بیٹھتے۔

سٹیج اور حلقہ خاص میں تشریف فرما مہمانوں کے علاوہ باقی سبھی مرد و زن زمین پر بیٹھتے۔ ان میں سے کچھ اپنے ہمراہ دریاں، کھیس، چادریں یا جائے نماز لے آتے اور پرالی پر بچھا کر بیٹھ جاتے جب کہ زیادہ تر لوگ اوس میں بھیگی ہوئی پرالی پر ہی بیٹھے رہتے۔ اگرچہ مہمانوں پر جلسہ کی تقریریں سننے کی کوئی پابندی نہ تھی لیکن اکثر لوگ یہ تقاریر پوری دلجمعی کے ساتھ سنتے۔ مہمان اپنے ساتھ مونگ پھلی، چلغوزے اور ریوڑیاں لے جانا نہ بھولتے جب کہ بعض لوگ سنگترہ، مالٹا یا آسانی سے چھل جانے والا کوئی اور پھل ہمراہ رکھ لیتے۔ چونکہ اکثر اجلاس تین سے چار گھنٹے تک جاری رہتے تھے لہٰذا لوگ وقت گذاری کے لیے ان فواکہات کا سہارا لیتے۔ تقریریں بھی سنتے رہتے اور بھوک لگتی تو میوہ جات؛ تازہ پھلوں پر طبع آزمائی کرتے چلے جاتے۔ تھک جاتے یا کوئی اور ضرورت محسوس کرتے تو اٹھ کر باہر نکل جاتے جہاں

یہ لوگ پہلے ہی سے دو روز کے بعد ملنے والے دوستوں اور رشتہ داروں سے خوش گپیوں میں مصروف ہوتے تھے

اُن دنوں ربوہ کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ ملک کے کونے کونے بلکہ دنیا بھر سے آئے ہوئے مختلف رنگ و نسل کے ان مہمانوں کی وجہ سے ربوہ کے چہرے پر ایک خاص رونق آ جاتی اور دیکھنے والی آنکھ حیرت میں ڈوب جاتی کہ مسیح محمدی اور حضرت فضلِ عمر کے یہ پروانے کس طرح اپنی ساری مصروفیات تیاگ کر صرف اور صرف خدا اور اس کے رسول کے نام کی سربلندی کے لئے ربوہ میں جمع ہو گئے ہیں۔ سچ کہا تھا پرویز پرواذی نے:

کہاں کہاں سے چلی لے کے نذرِ جاں پہنچی
درِ حبیب پہ دنیا کشاں کشاں پہنچی
بنامِ ابنِ مسیح محمدی آئی
بفیضِ امرِ مسیحائے دو جہاں پہنچی

حضرت مسیح موعود نے جلسہ سالانہ کا ایک مقصد یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ''جو بھائی اس عرصہ میں اس سرائے فانی سے انتقال کر جائے گا اس جلسہ میں اس کے لیے دعائے مغفرت کی جائے گی۔'' جلسہ سالانہ کے موقع پر اس عرصہ میں وفات پا جانے والے احمدیوں علی الخصوص موصیان کی فہرست پڑھ کر سنائی جاتی اور ان کے لئے اجتماعی دعا کرائی جاتی۔ اسی طرح گذشتہ ایک سال میں فوت ہونے والے معروف بزرگانِ سلسلہ کی تصاویر الفضل کے جلسہ سالانہ نمبر میں ''فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ'' کے عنوان سے شائع کی جاتیں۔ ان تصاویر کے نیچے بالعموم مرحومین کا نام اور تاریخِ وفات درج ہوتی تھی۔ الفضل کے ۱۹۶۴ء کے جلسہ سالانہ نمبر میں شائع ہونے والی ان تصاویر میں ابا جی کی تصویر بھی شامل تھی۔

بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اس جلسے کی ایک اور غرض یہاں آنے والوں کے درمیان رشتہ تودد و تعارف میں ترقی پذیری بیان فرمائی ہے۔ اس کی ایک شکل جلسہ سالانہ کے موقع پر قائم ہونے والے نئے تعلقات کی صورت میں نظر آتی ہے۔ بعض رشتے تو ان ہی دنوں میں طے ہوتے۔ ایسے لوگ اور وہ خاندان جو پہلے سے اپنے درمیان کسی نئے رشتے کے قیام پر متفق ہو چکے ہوتے جلسہ سالانہ کے موقع پر امامِ وقت کے ذریعہ اعلانِ نکاح اپنے لئے سعادت و خوش بختی کی علامت سمجھتے۔ یوں بھی فریقین کے بہت سے عزیز و اقارب اس موقع پر ربوہ میں موجود ہوتے اور وہ بھی دعا میں شامل ہو جاتے۔

آپا اور صادقہ کے نکاحوں کا اعلان ایسے ہی ایک موقع پر دیگر بہت سے نکاحوں کے ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ۲۹ دسمبر ۱۹۵۸ء کو فرمایا تھا۔

غالباً ۱۹۵۸ء کے جلسہ سالانہ سے اس موقع پر غیر ملکی زبانوں میں تقاریر کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس شبینہ اجلاس میں جو نمازِ مغرب و عشاء کے بعد بیت مبارک میں شیخ محمد احمد مظہر ایڈووکیٹ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا تقریباً چالیس زبانوں میں ''تقریریں'' کی گئیں۔ یہ تقاریر حضرت مسیح موعود کی ایک تحریر کے اُن زبانوں کے ترجمہ یا قریب ترین مفہوم پر مشتمل تھیں جو دنیا کے طول و عرض میں بولی جاتی ہیں۔ اجلاس کا افتتاح

چوہدری ظفر اللہ خان کے مختصر خطاب سے ہوا جس کے بعد مختلف مقرر سٹیج پر آتے رہے۔ میں چونکہ ۱۹۵۰ کے اوائل
میں ربوہ آیا تھا لہذا میں بہت سے مقررین کو ذاتی طور پر جانتا یا پہچانتا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے جن
مقررین کے چہرے آ رہے ہیں ان میں مولوی ظہور حسین، سابق مربی بخارا؛ حسن محمد عارف جو اُن دنوں تحریک جدید
میں کام کر رہے تھے اور بعد میں کینیڈا منتقل ہو گئے؛ سید عبدالحیٔ شاہد؛ مہاشہ محمد عمر؛ محمد اسماعیل منیر؛ شیخ مبارک احمد
سابق مربی انچارج مشرقی افریقہ اور ان کے بھائی شیخ نور احمد منیر؛ عثمان چینی؛ قریشی محمد حنیف قمر المعروف
سائیکل سیاح؛ مولوی دین محمد شاہد اور مولوی محمد عمر سندھی شامل تھے۔ باقی مقررین میں ملکوں ملکوں سے آئے
ہوئے جامعہ کے طلبہ اور وہ مربیان شامل تھے جنہیں غیر ممالک میں جماعتی خدمت کی توفیق مل چکی تھی اور اس
عرصے میں انہوں نے وہاں کی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

اگر چہ مجھے ذاتی طور پر اس کے بعد اس طرح کے صرف دو یا تین اجلاسات میں ہی شمولیت کا موقع مل سکا تاہم
میرے مشاہدے کے مطابق ان اجلاسات کی اپنی اہمیت تھی۔ آج سے سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود
کو الہاماً یہ خوشخبری سنائی تھی کہ ''میں تیری......کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا'' اور اس جلسہ میں زمین کے کونے
کونے میں بولی جانے والی زبانوں میں تقاریر اس الہام کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہوتیں۔

۱۹۵۸ء ہی میں جلسہ سالانہ کے موقع پر تحریک جدید انجمن احمدیہ کے زیر اہتمام پہلی بار دینی معلومات اور
اکناف عالم میں جماعتی سرگرمیوں کی ایک تصویری نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں احباب جماعت کے لیے
دلچسپی کا خاصا سامان موجود تھا لہذا یہ نمائش کافی مقبول ہوئی۔ اسے دیکھنے والوں کا ذوق وشوق دیدنی تھا اور وہ اپنی
باری کے لیے طویل انتظار کی زحمت بخوشی برداشت کرنے پر آمادہ تھے۔

اردو نہ سمجھنے والے غیر ملکی مہمانوں کی سال بہ سال بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ان جلسوں میں ہونے والی تقاریر
کے غیر ملکی زبانوں میں رواں ترجمے کا موضوع عرصہ سے زیرِ غور تھا۔ ۱۹۸۳ء کے جلسہ سالانہ میں تقاریر کے انگریزی اور
انڈونیشین زبانوں میں رواں ترجمے کا انتظام ہو گیا۔ ترجمان مقرر کی تقریر کا ترجمہ ساتھ ساتھ کرتا جاتا۔ ترجمے کی آواز
ہیڈ فونز کے ذریعہ متعلقہ مہمانوں تک پہنچتی جس سے وہ بھی بھرپور طریقے سے جلسے کی کارروائی میں شامل ہونے لگے۔

جلسہ سالانہ پر آنے والے مہمانوں کی اکثریت ان افراد کی ہوتی جو پورا سال مرکز سے دور رہے تھے۔
بعض مہمان اس سے بھی طویل تر غیر حاضری کے بعد ربوہ آئے ہوتے تھے لہذا ان کی دلی خواہش ہوتی کہ وہ
اپنے پیارے امام کی زیارت سے فیضیاب ہوئے بغیر واپس نہ جائیں۔ اِن میں سے کئی اپنے مسائل کے حل کے
لئے امامِ وقت سے دعا کی درخواست کرنا چاہتے تو کچھ حضور سے اپنے نجی معاملات میں مشورہ کے طلبگار ہوتے۔
بعض محض ازدیادِ ایمان کے لئے اپنے پیارے امام کی زیارت کرنا چاہتے۔ جلسہ سالانہ ان تمام لوگوں کو اپنی اس
خواہش کی تکمیل کا موقع فراہم کرتا۔ ان ملاقاتوں کے لئے "جماعتی ملاقات" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔
اس مقصد سے جماعتوں کے لیے وقت کی پہلے سے تخصیص کر دی جاتی اور یہ پروگرام عوام الناس کی اطلاع کے
لیے بروقت مشتہر کر دیا جاتا۔ میں خود تو ایسی کسی ملاقات میں شامل نہیں ہوا لیکن میں نے سن رکھا ہے کہ چونکہ

مہمانان کی تعداد زیادہ اور متعلقہ جماعت کے لیے مخصوص وقت محدود ہوتا تھا لہٰذا بالعموم یہ ملاقات مصافحے سے آگے نہ بڑھتی۔ ہاں! موقع پر موجود امیر یا صدر جماعت کسی خاص وجہ سے کسی شخص کا تعارف حضور سے کرانا چاہتے یا حضور خود کسی مہمان سے گفتگو فرمانا چاہتے تو ملاقات مصافحے سے آگے بھی بڑھ جایا کرتی۔

یوں تو ہر احمدی کے لئے حضور کے ساتھ گذرے ہوئے یہ چند لمحے اس کی زندگی کے یادگار لمحات بن جاتے اور وہ ان کی تفصیل اپنے ملنے والوں کو مزے لے لے کر سناتا تاہم دیکھیے اکبر حمیدی نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ساتھ ایسی ہی ایک ملاقات پر اپنے تاثرات کس خوبی سے نظم کئے ہیں:

ربوہ کی فضا، موسمِ سرما کی خنک رات
اُس حسنِ مجسم سے ہوئی میری ملاقات
تھی رُوئے جہاں تاب پہ انوار کی بارش
وہ ذات تھی اک پیکرِ صد کشف و کرامات
وہ جوشِ مسرت وہ مرے شوق کا عالم
تھے کتنے گراں مایہ حضوری کے وہ لمحات
مت پوچھیئے کیا پایا مرے شوق نے اُس وقت
آیا مرے ترسے ہوئے ہاتھوں میں جو وہ ہاتھ
رعنائی صد رنگ میں ڈوبی ہوئی نظریں
انوارِ تبسم میں نہائے ہوئے کلمات
تھا ان کے ہر انداز میں سو حُسنِ بلاغت
باتوں میں اشارات ، نگاہوں میں کنایات
تا عمر نہ بھولے گا وہ اندازِ تلطف
وہ پیار ، وہ شفقت ، وہ تبسم ، وہ مدارات
وہ اور مرے حال پہ یہ حُسنِ توجہ
میں اور مرے حال پہ اس درجہ عنایات

جلسہ سالانہ جہاں احمدیوں کے لیے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا وہیں کئی وسیع الظرف سعید فطرت غیراز جماعت معززین بھی اس موقع سے استفادہ کے لیے یہاں حاضر ہوتے۔ ان معززین کی فہرست خاصی طویل ہے اور ان سب کا ذکر یہاں مقصود بھی نہیں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نیک نیتی کے ساتھ یہاں آنے والے غیراز جماعت احباب خدا کے فضل وکرم سے بہت عمدہ اثر لے کر واپس جاتے رہے ہیں جس کی گواہی سلسلہ کے لٹریچر میں جا بجا ملتی ہے۔ ایسی ہی ایک سعید الفطرت شخصیت رُوحی کنجاہی کے نام سے معروف ہے جو اردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ ہے۔

رعل کہاں میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں جب وہ لائلپور میں تعینات تھے تو ایک احمدی دوست کی تحریک پر ربوہ تشریف لائے اور انہوں نے جلسہ سالانہ میں بھی شمولیت اختیار کی بعد میں انہوں نے اپنے مشاہدات و تاثرات کو نظم کیا۔ یہ نظم اُن ہی دنوں الفضل میں شائع ہوئی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے ان کی یہ نظم:

اے سر زمینِ ربوہ! تجھ پر ہو لاکھ رحمت
دینِ محمدی کی قائم ہے تجھ سے عظمت
تیرے جواں نمازی، تیرے جوان غازی
قرآن پڑھ رہے ہیں، واللہ ہیں نیک فطرت
تیرے سپوت غالب آجائیں گے عدو پر
ہاتھوں میں ان کے دیکھا ہے پرچمِ صداقت
سارے جہان سے ہے تیری فضا نرالی
ہر دم برس رہی ہے تجھ پر خدا کی رحمت
تیری ترقیوں سے مجھ پر عیاں ہوا ہے
ہر گوشۂ جہاں پر چمکے گی احمدیت
عرفان و معرفت کی دراصل کان تُو ہے
پنہاں ہیں تجھ میں لاکھوں دُر ہائے بیش قیمت
کیوں کر نہ ہو مبارک ربوہ کی سیر روحی
روشن ہوئی ہے مجھ پر (......) کی حقیقت

یہ جلسہ جہاں ایک روحانی مائدے کا کام دیتا وہیں یہ موقع معاشرتی تعلقات میں تنوع کا باعث بھی بنتا۔ اس موقع پر کئی اجنبی خاندانوں کا باہمی رابطہ ہوتا۔ بعض دفعہ یہ ملاقاتِ اخوان ان کے درمیان دیرپا تعلقات کی بنیاد بن جاتی اور احمدیوں کے درمیان نئے رشتے قائم ہوتے۔

جلسہ سالانہ کے دنوں میں اعزّہ واقربا کے گھروں میں آنے جانے کا اپنا ہی لطف تھا۔ عرصہ دراز کے بعد ملنے والے رشتہ داروں سے تجدید تعلق کی اپنی اہمیت تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب ان مہمانوں کو رخصت کرنے کا وقت آتا تھا دل غمگین سا ہو جاتا اور جب گارڈ کی وسل اور سبز جھنڈی گاڑی چلنے کا اشارہ دیتی تو جانے والوں کے ساتھ ساتھ پیچھے رہ جانے والوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا جاتیں اور وہ دل میں نہ جانے کیا کیا ارمان لیے دیر تک ہاتھ ہلا ہلا کر ایک دوسرے کو الوادع کرتے رہتے۔

قارئینِ کرام! آپ نے ربوہ میں سال کے سال ہونے والے جماعتی تنظیموں کے اجتماعات اور جلسہ سالانہ کے بارے میں میری یادیں ملاحظہ فرمائیں۔ آیئے! اب ہم انجمن کوارٹرز میں اُن دنوں رہائش پذیر بعض بزرگان کا ذکرِ خیر کریں۔

پوچھو تو بتلا نہ سکیں کیا بات تھی "ان" میں ایسی
چاہیں تو سمجھا نہ سکیں جو رنگ نظر نے پائے

آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ صدر انجمن احمدیہ نے ابتدائی طور پر اپنے کارکنان کے لیے اڑسٹھ جونیئر کوارٹرز، نائب ناظران کے لیے تین کوارٹرز اور ناظران کے لیے چھ کوارٹرز تعمیر کیے تھے۔ بعد میں ان کوارٹرز میں کچھ اضافہ ہوا۔ یہ کوارٹرز صدر انجمن احمدیہ کے کارکنان کی رہائش کے لیے مختص تھے اگر چہ بعض کوارٹرز میں سلسلہ کے بعض قدیمی بزرگ مثلاً حضرت حافظ سید مختار شاہجہانپوری، حضرت ڈاکٹر سید غلام غوث اور حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل بھی مقیم تھے۔ کچھ کوارٹرز قصرِ خلافت کے اندر تھے جو عمومی طور پر دفتر پرائیویٹ سیکرٹری کے کارکنان کی رہائش کے لیے مختص تھے۔ یہ محلہ عُرفِ عام میں "محلہ دارالصدر شرقی" کہلاتا تھا۔

اس محلے کی خوش قسمتی تھی کہ حضرت مسیح موعود کے کئی رفقا، سلسلہ کے بعض جید علماء اور جماعت کے بہت سے نمایاں خدام یہاں رہائش پذیر تھے۔ اِن میں سے بعض احباب میری کم سنی میں وفات پا گئے اور مجھے اُنہیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ کچھ بزرگان کو میں نے قدرے قریب سے دیکھا اور بعض کے ساتھ تعلقات رسمی علیک سلیک سے آگے نہ بڑھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ان میں سے بہتوں کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور آج بھی جب کہ ان کی وفات پر لمبا عرصہ گذر چکا ہے مجھے ان کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔

حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل حضرت مسیح موعود کے ممتاز رفقا میں سے تھے لیکن جماعت میں ان کی اصل شناخت ایک صحافی کی حیثیت سے تھی۔ وہ سالہا سال تک مختلف جماعتی اخبارات و جرائد کے ایڈیٹر رہے۔ وہ زُود گو شاعر بھی تھے اور ان کا کلام سلسلہ کے اخبارات کی بکثرت زینت بنتا رہا لیکن ان کی زندگی میں ان کا مجموعہ کلام شائع نہ ہو سکا۔ یہ کام اُن کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے جنید ہاشمی کے ہاتھوں سرانجام پایا جنھوں نے اس کا نام "نغمۂ اکمل" تجویز کیا۔

ابا جی قاضی صاحب کے معتقدین میں سے تھے اور بکثرت ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ بتایا کرتے تھے کہ وہ قادیان کے زمانہ سے ایسا کر رہے ہیں جہاں ان کا دفتر "قاضی صاحب کا دربار" کے نام سے مشہور تھا۔ قاضی صاحب تخت پوش پر لیٹے لیٹے جملہ دفتری امور سرانجام دیتے۔ ان کے پاس بیٹھنے والوں میں حضرت میر محمد اسحٰق، مولانا جلال الدین شمس، سلیم اٹاوی، علی محمد اجمیری اور صاحبزادہ عبدالمنان عمر شامل تھے۔ "درباریوں" میں سے کچھ اخبارات سے دل بہلاتے، کچھ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے اور کچھ علمی و ادبی لطائف سے لطف اندوز ہوتے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ قاضی صاحب کے دفتری کام میں کسی قسم کی کوئی رُکاوٹ نہ آتی۔ ابا جی قاضی صاحب کے اس حد تک معتقد تھے کہ مرض الموت کے دوران جب ان کی زبان بند ہو چکی

تھی انہوں نے کاغذ قلم مانگا اور مجھے مخاطب ہو کر ہدایت کی کہ میں قاضی صاحب کے پاس جا کر ان کی صحت [illegible]
درخواست کروں۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی لیکن نہ جانے کس طرح وہ میرے دل میں یوں گھر کر [illegible]
کی وفات کے بعد میں نے ان سے کم و بیش ہر روز ملنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک یوں ہی [illegible]
قاضی صاحب سلسلہ کے ایک سچے خادم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب رؤیا و کشوف [illegible]
عرصہ گذر جانے کے باوجود ان کی بعض باتیں میرے ذہن میں آج بھی روز اول کی طرح تازہ ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا میں اباجی کی بیماری کے حوالے سے ان کے پاس حاضر ہوا تھا لیکن آپی [illegible] ہیں کہ
اگلے دن خود قاضی صاحب سے یہ معلوم کرنے کے لیے گئی تھیں کہ کیا انہیں عالم الغیب کی طرف سے اباجی کی صحت
کے حوالے سے کوئی اشارہ تو نہیں ہوا۔ جب قاضی صاحب نے انکشاف کیا تھا کہ وہ اباجی کی صحت کے لیے دعا کر کے
سوئے تھے لیکن خواب میں انہیں ایک کمرہ دکھایا گیا جس کا دروازہ بند ہے اور عبدالرحیم نامی ایک شخص وہاں بطور
دربان کھڑا ہے۔ قاضی صاحب اس کمرے میں داخل ہونا چاہتے ہیں لیکن عبدالرحیم دروازہ کھولنے سے انکار کر دیتا
ہے۔ تب قاضی صاحب خود کلامی کے انداز میں کہتے ہیں: عبدالرحیم بہت ضدی ہے، یہ دروازہ نہیں کھولے گا اور
خواب یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

صاحب رؤیا نے تو اس خواب کی جانے کیا تعبیر کی ہوگی لیکن اسی شام اباجی کی وفات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ
خدائے علیم و خبیر کے علم کے مطابق اباجی کی زندگی ختم ہو چکی تھی اور خواب میں اسی المناک حقیقت کی طرف اشارہ تھا۔

مجھے یہ بات بھی آج تک نہیں بھولی کہ اباجی کی وفات کے بعد جب آپی شدید بیمار ہوگئیں اور مقامی طور پر
میسر طبی سہولیات اس بیماری کے علاج کے لیے بظاہر کافی نہ تھیں تو کسی نے مشورہ دیا کہ انہیں فیصل آباد لے جایا
جائے۔ اس تجویز کو عملی شکل دینے میں بہت سی دشواریاں حائل تھیں اور نتیجہ غیر یقینی تھا لہٰذا قاضی صاحب سے استخارہ
کرایا گیا۔ قاضی صاحب نے استخارے کے بعد اطلاع دی کہ آپی کا لائلپور لے جایا جانا ہر لحاظ سے باعثِ برکت
ہوگا اور حالات و واقعات سے یہ پیش خبری بعد میں سو فیصد درست ثابت ہوئی۔

قاضی صاحب میرے بزرگ تھے اور دوست بھی۔ میں ان سے ہر بات بے تکلفی کے ساتھ کر لیتا اور گھنٹوں
ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا۔ میں ۱۹۶۵ء میں مزید تعلیم کے لیے لاہور چلا گیا لیکن ان سے رابطہ برابر رہا۔ ایک بار
ان کی پوتی فیروزہ جو اُس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے فلاسفی کر رہی تھیں نے ربوہ سے کچھ کتابیں
منگوائیں۔ قاضی صاحب چاہتے تھے کہ میں یہ کتابیں انہیں پہنچا دوں۔ میں نے حامی بھر لی لیکن قاضی صاحب کسی وجہ
سے میری روانگی سے پہلے یہ کتابیں میرے گھر نہ بھجوا پائے۔ میں نے لاہور پہنچ کر انہیں اپنی خیریت کا خط لکھا اور یہ بھی
ذکر کیا کہ اگر مجھے کتابیں بروقت مل جاتیں تو اب تک منزل مقصود پر پہنچ چکی ہوتیں۔ انہوں نے ۴ دسمبر ۱۹۶۵ء کو میرے
اس خط کا جواب شعری زبان میں ارسال کیا۔ دیکھئے تو سہی انہوں نے کس خوبصورت انداز میں اظہار مدعا کیا تھا:

میرے پیارے داؤد طاہر! سلام
محبت بھرا تیرا پہنچا پیام

خدا کا کرم شامل حال ہو
مبارک ہر اک ماہ، ہر سال ہو
کتابیں جو مطلوب فیروزہ تھیں
بہت جستجو کی ملی ہی نہیں
ضرورت نہ سمجھی کہ اطلاع دیں
نتیجہ خموشی سے خود جان لیں
دسمبر کے جلسے پہ آؤ گے آپ
خوش آئند ہوگا یہ باہم ملاپ
دعائیں تو کرتا ہوں میں روز و شب
جو منظور فرمالے ہم سب کا رب
یہ مخمور منظوم ہوتی گئی
طبیعت نے دکھلائی شوخی نئی
رہے آلِ یعقوب خوش خوش تمام
ہوا ختم اکمل کا خط والسلام

اباجی کی ایک ڈائری میں ۱۸ دسمبر ۱۹۶۲ء کا لکھا ہوا ایک نوٹ موجود ہے۔ جس کے مطابق قاضی صاحب نے انہیں بتایا تھا کہ ’’آج کچھ عجیب وغریب اشعار بے ساختہ میری زبان پر آگئے جن میں میرا کوئی دخل نہ تھا۔ صرف ایک مصرعہ سنا دیتا ہوں:

میں بے نصیب رہ گیا پیچھے وہ چل بسے

اللہ تعالیٰ خیر کرے۔ کہتے تھے صرف چار شعر کہے، پھر میں نے کاغذ اٹھا کر رکھ دیا۔‘‘

نوٹ میں یہ ذکر موجود نہیں کہ ان اشعار میں کس اہم شخصیت کی وفات کی طرف اشارہ تھا لیکن ۱۸ دسمبر ۱۹۶۲ء کے بعد اور قاضی صاحب کی اپنی وفات سے پہلے جماعت کی جو اہم ترین شخصیت اللہ کو پیاری ہوئی وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ذاتِ بابرکات تھی۔ اس کے علاوہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے بھی اسی عرصہ میں انتقال فرمایا لہٰذا عین ممکن ہے ان اشعار میں قاضی صاحب کی زندگی میں ان ہی دو بزرگان کی وفات کی طرف اشارہ ہو۔

قاضی صاحب موصی تھے اور انہوں نے تاکید کر رکھی تھی کہ انہیں تابوت کی بجائے لحد میں دفن کیا جائے۔ اگرچہ یہ ایک ذوقی بات تھی لیکن ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر بہشتی مقبرہ کے مدفونین کا جسم اس مٹی میں پیوند نہیں ہوگا تو یہ زمین بہشتی کہلانے کی مستحق کیسے ہوسکتی ہے چنانچہ الفضل میں ان کی وفات کی تفصیلی خبر میں یہ ذکر خاص طور پر موجود ہے کہ ’’حضرت قاضی صاحب کو آپ کی ایک خاص وصیت کے مطابق تابوت کے بغیر لحد میں دفن کیا گیا۔‘‘

انہیں اپنی وفات کا قبل از وقت اشارہ مل چکا تھا چنانچہ انہوں نے خود ہی اپنا قطعہ تاریخ وفات لکھا جو آج بھی ان کے کتبے پر کندہ ہے:

مہاجر إلی اللہ (......) اکمل
مسیح محمدؐ پہ قربان اکمل
برس گذرے چالیس تو قادیاں میں
تو ربوہ میں جاناں کو دی جان اکمل
ہے گولیکی مولد تو مدفن ہے ربوہ
ہے تاریخ تدفین ''غفران اکمل''

قاضی صاحب کی اہلیہ، استانی سکینۃ النساء اُن خواتین میں سے تھیں جنہیں جماعت کے ابتدائی دور میں مستورات کی تعلیم و تدریس کے حوالے سے خاص خدمت کا موقع ملا۔ جب میری قاضی صاحب سے ملاقاتیں شروع ہوئیں تو وہ اپنے صاحبزادے جنید ہاشمی کے پاس مقیم تھیں جو قاضی صاحب سے الگ لیکن ملحقہ کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔ موصوفہ قاضی صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے پاس آتیں اور ضروری بات کر کے واپس چلی جاتیں۔ اس وقت وہ خاصی ضعیف ہو چکی تھیں اور ان کی بات پوری طرح سمجھ نہ آتی تھی۔ ان کا حافظہ بھی کمزور ہو چکا تھا چنانچہ قاضی صاحب کو انہیں میرے بارے میں ہر بار بتانا پڑتا۔ وہ اباجی کا ذکر سن کر خوشی کا اظہار کرتیں لیکن اگلی بار تک انہیں یہ سب کچھ بھول چکا ہوتا۔ قاضی صاحب ان کے اندازِ گفتگو سے بہت محظوظ ہوتے اور ان کی اس کیفیت پر دیر تک لطیف رنگ میں تبصرہ کرتے رہتے۔

استانی سکینۃ النساء کو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی شاگردی کا شرف حاصل تھا اور آپ ہی نے مدرسۃ البنات میں ان کا تقرر کیا تھا۔ انہوں نے صاحبزادہ عبدالوھاب عمر کی فرمائش پر اُس دور کے کچھ حالات قلمبند کیے جو بعد میں ''حیاتِ نور کا ایک ورق'' کے عنوان سے الفضل میں شائع ہوئے۔

موصوفہ مدرسۃ البنات میں اپنے تقرر کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جماعتی اخبارات یعنی بدر اور الحکم میں ان کے مضامین حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی نظر سے گذرتے رہتے تھے اور وہ ان کی اس کاوش کو سراہتے تھے۔ ایک بار آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: ''میں آپ کے علم دوست اور عالم فاضل خاندان سے واقف ہوں۔ تمہارے نانا حضرت مولوی بدرالدین صاحب سے بھی واقف ہوں بلکہ ایک طرح سے ہم جماعت بھی ہوں۔ پھر دوسرے تیسرے دن فرمایا کہ عام درس سے پہلے اگر ایک رکوع بعد از نماز صبح مجھے سنا دیا کرو تو پھر مدرسۃ البنات میں پڑھایا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ دو اُستانیاں تو وہاں ہیں ہی اور میرے خواب و خیال میں نہ تھا کہ مدرسہ میں بھی پڑھانا ہوگا تو فرمایا کہ ایک، استانی الفت تو شام تک ختم ہو جائے گی، وہ بیمار ہے۔ میں خاموش رہی۔ صبح ہی سنا کہ الفت (نومسلم) مر گئی۔ میں درس میں گئی تو حضور نے فرمایا: مدرسے نہیں گئی؟ جاؤ مدرسہ سنبھالو۔ میں نے عرض کیا: اچھا حضور! اور دل میں سوچا کہ میں کسی مدرسے کی طالب علم تھی نہ کسی مدرسہ میں پڑھا ہے۔ حساب

آ جاتیں۔ گھر میں ہی ابا جان نے اردو، عربی اور فارسی تو پڑھادی اور حساب تقسیم مرکب تک سکھایا تھا اور بس۔ بہر حال آپ نے مجھے مدرسہ سپرد کر دیا۔"

استانی سکینۃ النساء بیان کرتی ہیں: "ایک دن مجھے ایک خواب آیا، اس کی تعبیر معلوم نہ تھی۔ خیال آیا کہ حضرت استاذی المکرّم محترم کو سناؤں گی۔ صبح صبح جو درس کو گئی تو السلام علیکم کے بعد عرض کیا کہ حضور! میں نے آج ایک خواب عجیب دیکھا ہے۔ فرمایا: سناؤ۔ عرض کیا کہ ایک بڑی عالیشان پُر فضا جگہ پر نفیس دالان ہے۔ اس میں سے ایسی خوشبو آرہی ہے جیسے کہ ابھی گلاب عطر سے دھویا گیا ہے اور پُر فضا ہوا چل رہی ہے مگر نہ پنکھا لگا ہے اور نہ ہی سورج کی روشنی مگر ٹھنڈی روشنی سے کمرہ روشن ہے۔ اتنے میں دیکھتی ہوں کہ کچھ بزرگوں اور نورانی چہروں والے سفید لباس اور پگڑیاں باندھے ہوئے لوگوں کا حلقہ سا درمیان میں بیٹھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے درس القرآن ہو رہا ہے۔ معاً میری نظر ایک محراب کی طرز کے تخت پر پڑی تو دیکھا کہ اس پر حضرت مسیح موعود، روشن چہرہ اور چمکتی ہوئی ڈاڑھی جو مہندی لگی سرخ ہے، نہایت سفید اور برّاق سی پگڑی پر چادر لیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں نے آپ کو سلام عرض کیا تو حضور نے اپنی ڈاڑھی مبارک سے دو بال نکال کر ہاتھ میں مجھے پکڑا دیئے۔ پھر میری آنکھ کھل گئی اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کی مٹھی بند کی ہوئی ہے اور یہ بابرکت بال قران کریم میں رکھنے کا ارادہ ہے۔ تو حضرت خلیفہ اول جو چادر میں منہ لپیٹے پڑے ہوئے تھے جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: اچھا جی! خدا تعالیٰ آپ کو دو بچے زندہ رہنے والے عنایت کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے انہیں تین بیٹے عنایت فرمائے جن میں سے عبدالرحمٰن جنید ہاشمی اور عبدالرحیم المعروف شبلی بی کام نے طبعی عمر پائی البتہ تیسرا بیٹا جس کا نام عبدالمنان تجویز ہوا تھا عالمِ شیر خوارگی میں فوت ہو گیا اور یوں ان کی یہ خواب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی بیان فرمودہ تعبیر کے عین مطابق بڑی شان سے پوری ہوئی۔

جنید ہاشمی اور شبلی بی کام کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں بعض دیگر مقامات پر موجود ہے۔ یہاں میں صرف اسی قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یوں تو جنید ہاشمی کے سارے ہی بچے ماشاء اللہ لائق و فائق تھے لیکن ان کی صاحبزادی، فیروزہ کی تو بات ہی کچھ اور تھی چنانچہ انہوں نے آٹھویں جماعت سے لے کر ایم اے تک کوئی ایسا امتحان نہیں دیا جس میں انہوں نے نمایاں کامیابی نہ حاصل کی ہو۔ الفضل ۱۹ مئی ۱۹۵۹ء کے مطابق موصوفہ مڈل کے امتحان میں ضلع بھر میں اوّل رہیں۔ اسی طرح حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کی طرف سے ۷ جولائی ۱۹۶۱ء کے الفضل میں یہ اعلان بھی چھپا ہوا موجود ہے کہ وہ میٹرک کے امتحان میں سرگودھا ڈویژن میں اوّل اور بورڈ کی جملہ طالبات میں پانچویں نمبر پر رہیں۔ ایف اے کے امتحان میں تو انہوں نے کمال کر دیا۔ الفضل ۲۸ جولائی ۱۹۶۳ء کے مطابق وہ اس امتحان میں لڑکیوں میں پورے بورڈ میں اوّل رہیں۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے بی اے کے امتحان میں شرکت کی اور نہ صرف پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی جملہ طالبات میں اوّل پوزیشن حاصل کی بلکہ مختلف مضامین میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر یونیورسٹی کی طرف سے کئی تمغوں کی مستحق بھی ٹھہریں۔ بعد میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (فلاسفی) میں داخلہ لیا اور جب نتیجہ آیا تو وہ جملہ طلبہ و طالبات میں تیسرے نمبر پر تھیں۔ مختلف امتحانات

میں مسلسل پوزیشن حاصل کرنے کا اعزاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے، وہ جس پر چاہے کر دے۔

فیروزہ ربوہ کے ماحول میں پلنے والی ایک سنجیدہ اور باوقار طالبہ تھیں۔ وہ اوران کی بڑی بہن، قانتہ آپی کے پاس آتی رہتی تھیں۔ ویسے بھی حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کے ساتھ اباجی اور راقم کے نیازمندانہ تعلقات کے طفیل ہم ایک دوسرے کے حالات سے بہت حد تک باخبر رہتے تھے۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بعض طالبات یونیورسٹی میں پہنچ کر پردے کا وہ اہتمام نہیں کر سکتیں جس کا ہمارا دین تقاضا کرتا ہے لیکن میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ موصوفہ نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں اپنے دو سال حد درجہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ گزارے اور اپنے اندر کوئی جھول پیدا نہیں ہونے دیا۔

عبدالسلام اختر حضرت مسیح موعود کے رفیق اور سلسلہ کے قدیمی خادم، حضرت چوہدری علی محمد بی اے بی ٹی (المعروف بی ٹی صاحب) کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے ناگپور یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کر رکھا تھا۔ کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کی جس کے بعد ۱۹۴۵ء میں زندگی وقف کر کے قادیان چلے آئے اور متنوع حیثیتوں میں سلسلہ کی خدمت کا موقع پایا۔ وہ ربوہ کے بے آب وگیاہ میدان میں آبادکاری کے لیے لاہور سے سب سے پہلے پہنچنے والے قافلہ میں شامل تھے۔ دوسرے الفاظ میں انہیں ربوہ کے اوّلین آبادکاروں میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اس حوالے سے ''ربوہ میں پہلی رات'' کے عنوان سے ان کا الفضل میں چھپا ہوا مضمون خاصے کی چیز ہے۔

جب گھٹیالیاں میں ہائر سیکنڈری سکول کے قیام کا فیصلہ ہوا تو عبدالسلام اختر اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں کئی سال وہاں رہے۔ اُن دنوں گھٹیالیاں ایک دُور افتادہ دیہاتی علاقہ تھا جہاں پہنچنا کارِ دارد تھا اور رہنا اس سے بھی مشکل۔ وہ بھی شہری سہولیات سے عاری اس علاقے میں اپنے تقرر پر خوش نہ تھے اور کہا کرتے تھے:

دوست! ایسے وقت میں گھٹیالیاں جانا پڑا
آئی تھی جب راس ربوہ کی ہوا میرے لیے

یہ ان کا ابتدائی تاثر تھا۔ وہ گھٹیالیاں پہنچ کر اس ماحول میں رچ بس گئے اور مشکلات کے باوجود کالج کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اُن کے زمانے میں طلبہ کی غیر نصابی سرگرمیوں اور اخلاقی تربیت پر زور دیا گیا اور جیسا کہ ان کی طرف سے صدر انجمن احمدیہ کو بھجوائی جانے والی مطبوعہ رپورٹوں سے عیاں ہے کالج کی ترقی کی رفتار تسلی بخش تھی۔ اسی لیے یہ جگہ آہستہ آہستہ ان کے لیے وجہِ اطمینان بن گئی۔ ملاحظہ ہو ان کا یہ شعر:

اختر اک گوشے میں ہوں محوِ سجود و سوز و ساز
وجہِ اطمینان ہے گھٹیالیاں میرے لیے

جب میرا اس کالج میں تقرر ہوا تو وہ ربوہ واپس جا چکے تھے لیکن پرانے اساتذہ اور مقامی لوگ انہیں بہت محبت سے یاد کیا کرتے تھے۔ عبدالسلام اختر خود بھی یہ کہہ اُٹھے تھے کہ

سُن اے دانشور سود و زیاں سُن
کوئی گھاٹا نہیں گھٹیالیاں میں

میں گھٹیالیاں سے ربوہ آتا تو ان سے بالعموم ضرور ملتا۔ ہم دیر تک وہاں کے حالات و واقعات کے حوالے سے باتیں کرتے رہتے۔

گھٹیالیاں میں قیام کے دوران ہی انہیں ذیابیطس کی شکایت ہوئی اور انہوں نے بالآخر اسی بیماری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کے سبب وفات پائی۔

وہ ہمارے قریب رہائش پذیر تھے اور میری ان سے علیک سلیک رہتی تھی۔ ان کی اہلیہ کے توسط سے میرے لیے ایک رشتہ تجویز ہوا تو مرحوم نے اس حوالے سے رازدارانہ طور پر میری بہت دیانتدارانہ رہنمائی کی۔

وہ ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر تھے۔ زندگی بھر نہایت بلند پایہ دینی نظموں کے ذریعہ جماعت کی خدمت بجا لاتے رہے۔ قدرت نے انہیں خوش الحانی کی نعمت سے نوازا تھا چنانچہ وہ محافل میں اپنا کلام ترنم کے ساتھ جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے۔ ان کا کلام سلسلہ کے اخبارات و جرائد میں بکھرا پڑا تھا۔ اگرچہ ''چشمۂ اصفیٰ'' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ شائع ہو چکا تھا لیکن زیادہ تر کلام منتشر تھا۔ ان کے ایک صاحبزادے امتیاز احمد جامی مدتِ دراز کے بعد اچانک فیصل آباد میں ایک شادی پر مل گئے۔ میں نے ان کی توجہ ان کے والدِ مرحوم کے کلام کی اشاعت کی طرف دلائی تو انہوں نے کہا: ''میں تو طباعت کے فن سے بالکل نا آشنا ہوں۔ میں نے ان کا کلام جمع کر رکھا ہے لیکن سمجھ نہیں آ رہی کہ چھپواؤں کیسے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ وہ اصل کام مکمل کر چکے ہیں۔ اگر وہ یہ کلام مجھے بھجوا دیں تو میں اسے کمپوز کروا دوں گا۔ اللہ تعالیٰ اگلے مراحل خود آسان کرتا چلا جائے گا۔''

مجھے چند ہی دنوں کے بعد ان کی طرف سے مسودہ موصول ہو گیا۔ میں نے اسے کمپوز کروایا اور جامی کو بھجوا دیا۔ پھر لمبی خاموشی رہی۔ کبھی بات ہوتی تو پتا چلتا کہ معاملات بڑی سست روی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک دن ان کی طرف سے ایک پارسل موصول ہوا۔ یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ یہ مجموعہ ''نقوشِ جاوداں'' کے نام سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

الحمدللہ میرا اُکسانا کسی کام آیا!

مرحوم کے کلام بلاغت اثر کا ذکر ہو رہا ہے تو کیوں نہ ان کے آخری اشعار کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے۔ مرحوم کے بھائی، شاہد احمد کا بیان ہے کہ عبدالسلام اختر نومبر ۱۹۷۴ء میں شدید بیمار ہو کر فضل عمر ہسپتال میں داخل تھے۔ خود لکھنے کے قابل نہ تھے لیکن ایک دن طبیعت لہرائی تو اپنی ہمشیرہ امۃ القدیر کو بلا کر یہ اشعار لکھوائے:

خاک سے بھی اُبل پڑے تارے
دیکھ کر جن کو چاند شرمایا
بھر گیا باغ، ابر لہرایا
''آؤ بلبل چلیں کہ وقت آیا''

شاہد کا بیان ہے کہ ''جب ان کا جنازہ ربوہ پہنچا تو واقعی موسم ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ یہ کیفیت ان کی تدفین تک جاری رہی۔''

اُن کی وفات پر ان کے والدِ گرامی، چوہدری علی محمد المعروف بی ٹی صاحب کے علاوہ ان کے کئی سنگی ساتھیوں نے انہیں بزبانِ شعر نذرانۂ عقیدت پیش کیا جن میں پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان؛ سلیم شاہجہان پوری؛ عبدالرشید تبسم؛ صدیق امرتسری اور چوہدری شبیر احمد شامل ہیں۔ بی ٹی صاحب کی نظم فارسی میں ہے جب کہ باقی شعراء نے مرحوم کو اردو میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ عبدالرشید تبسم کی یہ نظم تو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

پیوندِ خاک شاعرِ رنگیں بیاں ہوا
اِک شعلہ آگ کا تھا جو بجھ کر جواں ہوا
اُس کی تڑپ بھی خوب تھی لیکن وہ جب تھمی
سیماب بن کے سیم گراں سے گراں ہوا
اختر! تری وفات پہ یہ کیفیت ہوئی
جیسے جہاں پہ آج مسلّط دھواں ہوا
ہنگامِ فکر تیرا تخیل فلک رسا
روحُ القدس کا بارہا تو ہم زباں ہوا
سب عمر تو نے کوچۂ جاناں میں کی بسر
ہر روز دیدِ یار سے تو شادماں ہوا
پیغامِ وصلِ یار پہ تو اٹھ کے چل دیا
محفل کو چھوڑ یار کے پر میں نہاں ہوا
یوں تو ہر اہلِ دل ہے ترے غم میں اشکبار
بکل بہت تبسمِ آشفتہ جاں ہوا

بقیہ نظموں میں سے مجھے پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان کے یہ اشعار بھی بہت پسند ہیں:

بنیں گلزار جن کے عزم سے دنیا کے ویرانے
میسر ہیں زمانے کو وہ دل کتنے؟ جگر کتنے؟
زمینِ ربوہ دامن میں ترے ہے سیم و زر کتنا
چھپا کر رکھ لیے ہیں تو نے اختر سے گہر کتنے

استانی امتہ العزیز عائشہ میاں محمد امیر (جنہیں دورانِ ملازمت فیروز پور، لاہور چھاؤنی، کوئٹہ اور راولپنڈی میں جماعت احمدیہ کی گراں بہا خدمات کی توفیق ملی) کی صاحبزادی تھیں۔ میاں محمد امیر نے اپنی اس بیٹی کو چودہ سال کی عمر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں واقفہ زندگی کے طور پر پیش کر دیا۔ حضور نے یہ وقف قبول فرمانے

ہوئے بیٹی کو انگریزی تعلیم دلانے کی ہدایت فرمائی جس پر پہلے انہوں نے میٹرک اور جے وی کا امتحان پاس کیا۔ان کا چار اپریل ۱۹۳۱ء کو نصرت گرلز سکول قادیان میں پہلی ٹرینڈ ٹیچر کے طور پر تقرر ہوا۔اسی دوران انہوں نے ایف اے کر لیا چنانچہ دو سال بعد وہ ہیڈ مسٹریس مقرر ہو گئیں۔انہوں نے بی اے اور بی ٹی کے امتحانات بعد میں پاس کیے۔

موصوفہ قیامِ پاکستان کے ہنگامہ خیز دنوں میں کوئٹہ منتقل ہو گئیں اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی اجازت سے گورنمنٹ مڈل سکول، سبّی کی ہیڈ مسٹریس شپ قبول کر لی۔بعد میں وہ کوئٹہ تبدیل ہوئیں لیکن ۱۹۵۲ء میں حضور کے حکم پر یہ ملازمت چھوڑ کر ربوہ چلی آئیں۔شروع میں سیکنڈ مسٹریس رہیں مگر ۱۹۵۶ء میں ان کی ترقی بطور ہیڈ مسٹریس ہو گئی اور وہ اگلے چھ سال اسی حیثیت میں کام کرتی رہیں۔

اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے بچیوں کی تعلیم کے حوالے سے معاشرے کے صدیوں پرانے تعصبات ختم کرنے کی کوشش کی اور سبّی اور کوئٹہ جیسے پسماندہ علاقوں میں سینکڑوں بچیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔

ان کے اور ہمارے درمیان صرف ایک گھر کا فاصلہ تھا اور میری دو بہنیں ان کی شاگرد تھیں۔میں بھی عمر کے اس حصے میں تھا جب خواتین سے بے تکلفانہ ملاقات میں کوئی حجاب مانع نہیں ہوتا اس لیے وہ میرے سامنے بھی آ جاتی تھیں۔ان کا ایک بھانجا رفیق جسے محلے میں ''پھیکی'' پکارا جاتا تھا میرے دوستوں میں سے تھا اس لیے میں ان کے گھر کے حالات سے بھی قدرے واقف تھا۔

استانی امتہ العزیز کی بیٹی امتہ السمیع جو اُن دنوں ڈاکٹر بن رہی تھیں ان کی امیدوں کا واحد مرکز تھیں۔ان کی ریٹائرمنٹ اور ڈاکٹر امتہ السمیع کی گریجوایشن تقریباً ایک ساتھ ہوئی۔یہی وجہ تھی کہ جب ڈاکٹر امتہ السمیع کو لیڈی ڈفرن ہسپتال کوئٹہ میں ملازمت مل گئی تو استانی امتہ العزیز بھی کوئٹہ منتقل ہو گئیں۔

اس کے بعد میرا ان دونوں سے کوئی رابطہ نہ رہا۔۲۰۰۰ء میں میری کتاب ''سفر زندگی ہے'' کا ایک تعارفی فنکشن واہ کینٹ کے پی او ایف ہوٹل میں لیفٹیننٹ جنرل عبدالقیوم، چیئرمین پی او ایف کی صدارت میں ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حاضرین میں ڈاکٹر امتہ السمیع بھی موجود ہیں۔مجھے ان سے مل کر خوشگوار حیرت ہوئی۔

''آپ یہاں کیسے؟'' ان سے میرا پہلا سوال یہی تھا۔

''آپ کو شاید علم نہیں کہ ہم لوگ کوئٹہ سے فیصل آباد آ گئے تھے جہاں میں میاں محمد ٹرسٹ ہاسپٹل میں ملازمت کرتی رہی۔وہاں سے میں پی او ایف ہاسپٹل میں آ گئی تھی۔''

''امی کیسی ہیں؟''

''وہ تو اب وفات پا چکی ہیں۔ان کا انتقال ۱۹۸۶ء میں ہوا تھا۔یہیں واہ کینٹ میں۔''

''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن'' میں اس کے علاوہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔میرے دل سے مرحومہ کی بلندی درجات کے لیے دعا نکلی اور ان کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔وہ خاتون جس نے اس زمانے میں جب ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم شجرِ ممنوعہ سمجھی جاتی تھی نہ صرف خود گریجوایشن کی بلکہ ہزاروں بچیوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا اب آسودۂ خاک ہو چکی تھیں۔

''آپ کو ایک بات بتاؤں'' ڈاکٹر امتہ السمیع نے یقیناً اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔'' میرا ای
جہاں رہیں انہوں نے اپنے نمونے سے دوسروں کو متاثر کیا۔ ان کی تعیناتی کے دوران سبی میلے میں قائداعظم
لیاقت علی خاں اور بیگم لیاقت علی خان جیسی ہستیاں تشریف لائیں اور انہوں نے ان کے سکول کی بچیوں کی کارکردگی کو
سراہا۔ کوئٹہ میں وہ اپوا کی فعال رکن تھیں اور مینا بازاروں اور پاکستان ڈے کے جلسوں کو کامیاب بنانے میں اپنا کردار
بھرپور ادا کرتی رہیں۔ اس دوران وہ کوئٹہ لجنہ کی عہدیدار بھی رہیں اور اپنی ہمہ جہت شخصیت کے ذریعے عمدہ
کارکردگی کے انمٹ نقوش چھوڑ گئیں۔''
استانی امتہ العزیز ربوہ کے بہشتی مقبرہ میں دفن ہیں جب کہ ڈاکٹر امتہ السمیع اپنی اکلوتی بیٹی کی سرپرستی کے
لیے خود آسٹریلیا جا چکی ہیں۔ زندگی شاید اسی چیز کا نام ہے۔
کلیان پور کے رہنے والے چوہدری نور محمد صدر انجمن احمدیہ کے نائب مختارِ عام تھے۔ میں نے انتہائی سادہ
بعد عصر السراج سے نور محمد کو یا تو نماز کے لیے بیت یادگار کی طرف جاتے ہوئے دیکھا یا بائیسکل پر گھر کے لیے میٹھا
پانی لاتے ہوئے۔ وہ مٹی کی گاگر کیریئر پر رکھے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے ہوتے تھے۔
بتاتے ہیں وہ قیام پاکستان سے پہلے پٹواری کے طور پر کام کر رہے تھے کہ زندگی وقف کر کے ادھر آ گئے اور
پھر ساری زندگی اسی ماحول میں بتا دی۔
محلہ دارالعلوم میں اپنے مکان کی تعمیر کے بعد وہاں منتقل ہو گئے لیکن افسوس انہیں زیادہ عرصہ اس گھر میں
رہنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اپنی زمین کی فروخت کے سلسلے میں لیہ گئے ہوئے تھے کہ اونٹنی سے گر گئے اور ان کے کولہے کی
ہڈی ٹوٹ گئی۔ اسی تکلیف سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ بات دس اگست ۱۹۸۲ء کی ہے۔

ان کی بیوی کا نام عزیزہ تھا۔ یہ وہی خاتون ہیں جو ایک زمانے میں مستجابُ الدّعوات بزرگ کے طور پر
بہت مشہور ہوئیں۔ اب وفات پا چکی ہیں۔ ربوہ کی بہت سی خواتین ان کے پاس اپنے اپنے مسائل کے لیے دعا
کرانے جایا کرتی تھیں۔ مشہور تھا کہ انہیں اپنی دعا کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً جواب مل جاتا ہے اور خواتین میں
ان کی مقبولیت کی بڑی وجہ ان کا یہی خداداد عطیہ تھا۔

عزیزہ بیگم چوہدری رحمت علی نامی ایک بزرگ کی صاحبزادی تھیں جو ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے اور
اپنے ایک عزیز چوہدری حشمت علی کے ذریعہ ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے دستِ مبارک پر
بیعت کر کے احمدی ہوئے تھے۔ وہ قیام پاکستان کے بعد گوجرہ کے قریب موضع لگّو مَل میں آباد ہو گئے لیکن بالآخر
ربوہ منتقل ہو گئے اور یہیں وفات پائی۔

موصوفہ چوہدری رحمت علی کی بڑی بیٹی تھیں جب کہ چھوٹی بیٹی، حمیدہ بیگم نامور احمدی شاعر عبدالسلام اسلام
کے عقد میں آئیں۔

جہاں تک عزیزہ بیگم کا تعلق ہے وہ محض پرائمری پاس تھیں اور انتہائی خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے
والی تھیں۔ وہ ایک واقفِ زندگی سے بیاہی ہوئی تھیں جن کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی بھی موجود تھی۔ گھر میں مالی

اور طرح طرح کی پریشانیاں تھیں لیکن وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرتیں اور ہر وقت نماز، تلاوتِ کلام پاک اور ذکر اذکار میں مصروف رہتیں۔

۱۹۶۵ء کے لگ بھگ ربوہ میں ان کی شہرت ایک مستجاب الدّعوات خاتون کے طور پر پھیلنے لگی۔ اس حوالے سے پہلا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چوہدری بشیر احمد، اے ایل آر او (جو محلّہ دارالصدر غربی میں مقیم تھے اور جنہوں نے حال ہی میں وفات پائی ہے) کی ہمشیرہ، حمیدہ بیگم مقیم لودھراں ان سے ملاقات کے لیے آئیں اور اُٹھتے ہوئے ان سے اپنے حالات میں بہتری کے لیے دعا کی درخواست کی۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھائے تو ایک غیبی آواز آئی جس کی تفہیم یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا اور ان کے مسائل کا حسبِ منشا حل بھی نکل آئے گا۔

بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ مسائل حسبِ خواہش حل فرما دیئے تو انہوں نے اپنا یہ تجربہ اپنی ملنے جلنے والی خواتین کو بتایا جس سے عزیزہ بیگم کی ایک دعا گو کے طور پر شہرت ربوہ میں پھیلنے لگی۔

حمیدہ جو عزیزہ بیگم کی چھوٹی بہن ہیں بیان کرتی ہیں: ''جیجاں یعنی عزیزہ بیگم کی بڑی بیٹی، عابدہ کا رشتہ اس کی پیدائش کے وقت سے ہی اُس کے ایک پھوپھی زاد سے طے شدہ تھا لیکن ابھی شادی نہ ہوئی تھی کہ اس کا منگیتر جو اُن دنوں ایم اے کر رہا تھا ذہنی طور پر مختل ہو گیا۔ عابدہ کے بعض سرپرستوں کا خیال تھا کہ یہ بیماری وقتی نوعیت کی اور قابلِ علاج ہے لہٰذا اس رشتہ سے انکار کسی طور پر مناسب نہیں لیکن موصوفہ جب بھی دعا کرتیں انہیں اشارہ ہوتا کہ یہ نوجوان ہرگز ٹھیک ہونے والا نہیں ہے لیکن خاندان کے باقی افراد ان کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ بالآخر جب لڑکی نے بھی اس رشتہ سے انکار کر دیا تو بات ختم ہوئی۔ اس واقعہ پر پینتیس چھتیس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے لیکن لڑکے کی کیفیت اسی طرح بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہے۔''

غالباً اگست ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ اس وقت میری شادی نہ ہوئی تھی لیکن ایک جگہ رشتہ تقریباً طے ہو چکا تھا۔ ایک روز مجھے خیال آیا کہ حتمی فیصلے سے پہلے کیوں نہ اس خاتون سے دعا کرالی جائے چنانچہ امی اسی وقت عزیزہ بیگم کے ہاں چلی گئیں اور کچھ ہی دیر میں واپس آ گئیں۔ میں نے سمجھا کہ موصوفہ شاید گھر پر نہ تھیں لیکن امی نے بتایا: نہیں، وہ موجود تھیں۔ انہوں نے بات سننے کے بعد ہاتھ اُٹھا دیئے اور چند لمحے کے بعد دعا ختم کر کے بتایا کہ انہوں نے حضرت خدا بخش مومن جی کی اہلیہ فضل بی بی کو دیکھا ہے جو اُمّی کو دودھ سے بھرا ہوا ایک کپ دیتی ہیں۔ اُمّی نے اوّلاً وہ کپ پکڑ لیا لیکن پھر خود ہی دودھ زمین پر گرا دیا ہے۔ عزیزہ بیگم نے اس کی تعبیر یہ کی کہ یہ رشتہ ہمارے لیے ہے تو اچھا لیکن ہم خود اسے اپنے ہاتھوں سے ضائع کر دیں گے۔ وہی ہوا۔ نکاح کا پروگرام طے ہو جانے کے باوجود ہم نے ایک وسوسے کی بنیاد پر اس رشتے سے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ رشتہ بعد میں طے ہونے والے رشتے سے ہمارے لیے کتنا اور کیسے بہتر تھا لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ انہیں دکھایا جانے والا اشارہ غیبی بعد میں سو فیصد درست ثابت ہوا۔

میرے خسر، چوہدری بشیر احمد، سپرنٹنڈنگ انجینئر، محکمہ لوکل گورنمنٹ اینڈ رورل ڈیویلپمنٹ، حکومتِ پنجاب ان ہی عزیزہ بیگم کے بڑے بھائی تھے۔

موصوف یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو پرجیاں خورد تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں

اور پھر پرجیاں کلاں میں حاصل کی لیکن میٹرک کا امتحان ننگلاں کے ہائی سکول سے پاس کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے انجینئر بننا چاہتے تھے لیکن انہوں نے فوری طور پر اس کا کوئی راستہ نہ پا کر گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ، رسول میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۴۵ء میں یہاں سے اوورسیئری کا امتحان پاس کرلیا۔ انہوں نے بعد میں تعلیم الاسلام کالج، قادیان میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا تاہم اسی دوران پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اور انہیں ادھر آنا پڑا۔ اس کسمپرسی کے دور میں بھی ان پر اعلیٰ تعلیم کا شوق غالب رہا چنانچہ ایک موقع پیدا ہوا تو وہ امریکہ چلے گئے اور ریاست یوٹا کے سالٹ لیک سٹی I کی یونیورسٹی آف یوٹا سے ۱۹۴۹ء میں ایم ایس سی (سول انجینئرنگ) کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ واپسی پر ان کا تقرر محکمہ انہار میں ایس ڈی او کے طور پر ہو گیا لیکن پھر کسی بدخواہ کی طرف سے شکایت پر ان کی تنزلی ہو گئی اور وہ اوورسیئر بنا دیئے گئے۔ شکایت کنندہ کا کہنا تھا کہ موصوف نے بی ایس سی کرنے کے بغیر ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے جس کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔ موصوف اپنا کیریئر خراب نہیں کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے حکومتِ پنجاب کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنے کی بجائے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا اور پشاور یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا لیکن یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

چوہدری بشیر احمد کی صاحبزادی، راشدہ اپنی والدہ مرحومہ کے حوالے سے روایت بیان کرتی ہیں کہ جب یہ مسئلہ درپیش تھا تو انجینئرنگ کالج میں داخلے کا وقت گذر چکا تھا لیکن چوہدری بشیر احمد اپنی اہلیہ کی تحریک پر وہاں گئے اور ان کا داخلہ ہو گیا۔ تاہم یہ سب کچھ کیسے ہوا، اس کی تفصیل سنتے ہیں چوہدری بشیر احمد کے ایک پرانے غیراز جماعت دوست اور محرمِ راز، چوہدری آفتاب احمد، سابق چیف انجینئر، ایل ڈی اے، لاہور (حال مقیم ۱۲۸۔سی، ٹیک ہاؤسنگ سوسائٹی، کینال بنک، لاہور) سے جنہوں نے بی ایس سی (سول انجینئرنگ) کا امتحان پشاور یونیورسٹی سے موصوف کے ساتھ ہی پاس کیا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات کس طرح ہوئی، ملاحظہ فرمایئے اس کا احوال چوہدری آفتاب احمد ہی کی زبانی: ''جب میں نے بی ایس سی میں داخلہ لیا تو ہمارا کورس تین سال کا تھا لیکن جب میں دوسرے سال میں پہنچا تو یونیورسٹی نے کورس کی مدت بڑھا کر چار سال کر دی۔ طلبہ یونیورسٹی کے اس فیصلے پر ناخوش تھے چنانچہ انہوں نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر پرنسپل صاحب سے بات کرنے کے لیے بھجوایا۔ پرنسپل صاحب نے مجھے بتایا کہ ہم اس کالج میں امریکی یونیورسٹیوں کا سلیبس پڑھا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم بین الاقوامی معیار کی یونیورسٹیوں سے کسی طور پر پیچھے نہ رہیں لہٰذا اس کورس کی مدت بڑھانا ضروری ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس کورس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس بات پر بھی زور دیا کہ یہاں بعض امریکی پروفیسر پڑھا رہے ہیں اور بعض ایسے طلبہ بھی یہاں داخلے کے خواہاں ہیں جو امریکہ سے ایم ایس سی کر کے آئے ہوئے ہیں اور اس حوالے سے انہوں نے خاص طور پر چوہدری بشیر احمد کا نام لیا جو اُن دنوں منڈی بہاؤالدین میں محکمہ انہار میں بطور اوورسیئر کام کر رہے تھے۔

جب میں پرنسپل آفس سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ انتیس تیس سال کا ایک نوجوان جس نے سر پر سیاہ ٹوپی پہن رکھی ہے پریشانی کی کیفیت میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پرنسپل صاحب اسی نوجوان کی بات کر رہے تھے چنانچہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ وہی بشیر ہیں جنہوں نے امریکہ سے ایم ایس سی

کرنے کے بعد اس کالج میں داخلے کے لیے درخواست دے رکھی ہے تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ بہرحال میں انہیں ساتھ اپنے کمرے میں لے گیا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک اجنبی ان پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے جس پر میں نے انہیں بتایا کہ یہ سب میرے بزرگان کی تربیت کا فیضان ہے جنہوں نے مجھے بچپن ہی سکھایا ہے کہ ضرورت مند کی بے لوث خدمت کی جائے اور میں یہ سارا کچھ بغیر کسی لالچ کے کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں انہیں میری بات کا یقین آیا یا نہیں تاہم وہ ریلیکس ضرور ہو گئے۔

میں نے ان کی پوری کہانی سنی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے رسول سے اوورسیئری کا امتحان پاس کیا تھا بعد تعلیم الاسلام کالج، قادیان میں ایف ایس سی میں پڑھتے رہے تھے نیز یہ کہ وہ قیام پاکستان کے فوراً بعد امریکہ چلے گئے تھے جہاں یونیورسٹی نے اس بات کے مدنظر کہ انہوں نے رسول میں سول انجینئرنگ کے تمام مضامین اور ایف ایس سی کے جملہ مضامین بھی پڑھ رکھے ہیں انہیں ایم ایس سی میں داخلہ دے دیا اور کورس کی تکمیل پر ایم ایس سی کی سند بھی جاری کر دی۔ پاکستان واپس آئے تو ان کا تقرر محکمہ انہار میں بطور ایس ڈی او ہو گیا تاہم اسی دوران کسی نے ان کے خلاف شکایت کر دی چنانچہ انہیں پھر سے اوورسیئر بنا دیا گیا اور اب وہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے اس کالج میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔

ان دنوں انجینئرنگ کالج میں داخلے کے لیے ایف ایس سی کے تمام مضامین اور ڈرائنگ کا امتحان ہوا کرتا تھا جس کے بعد انٹرویو ہوتا اور تب جا کر امیدواروں کا حتمی انتخاب ہوتا۔ بشیر پریشان تھے کہ وہ امریکہ سے ایم ایس سی کر آئے ہیں لیکن اب انہیں ایف ایس سی کا امتحان دینے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ وہ فکر نہ کریں، میں کچھ ہی دیر میں اپنے ایک امریکی پروفیسر Harold S Carter سے بات کروں گا۔ امید ہے وہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔

بشیر Harold S Carter کا نام سن کر ذرا چونکے اور پھر انہوں نے اپنے بریف کیس میں سے ایک تصویر نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا: تم ان کی بات تو نہیں کر رہے؟ تب مجھے پتا چلا کہ بشیر امریکہ میں پروفیسر موصوف کے شاگرد رہے ہیں چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہم دونوں Dean's Hotel (جہاں موصوف مقیم تھے) جا کر ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ ہماری ملاقات ہوئی تو پروفیسر موصوف نے بشیر کو فوراً پہچان لیا اور پُرمسرت لہجے میں دریافت کیا کہ کیا اُن کا تقرر بھی انجینئرنگ کالج میں بطور استاد ہوا ہے تاہم جب انہیں پتا چلا کہ وہ یہاں داخلے کے خواہاں ہیں تو پروفیسر موصوف سخت حیران ہوئے تاہم انہوں نے ہماری مدد کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کالج میں ان کی حیثیت صرف ایڈوائزری ہے لہٰذا وہ انتظامی معاملات میں ٹانگ نہیں اڑا سکتے۔ بہر حال کچھ ردّ و کد کے بعد انہوں نے وعدہ کر لیا کہ اگر ہماری پرنسپل سے یا وائس چانسلر سے اس موضوع پر بات ہو تو ازراہِ مہربانی وہ بھی تشریف لے آئیں گے اور تصدیق کر دیں گے کہ بشیر امریکہ میں ان کے شاگرد رہے ہیں۔

پرنسپل صاحب نے ہماری بات نہ مانی جس پر میں اور بشیر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، وائس چانسلر سے جا کر ملے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے پیشرو، شیخ تیمور میری والدہ کے عزیزوں میں سے ہیں لہٰذا وہ میرا بھی احترام کرتے تھے۔ انہوں نے ہماری بات پوری توجہ سے سنی اور خاص طور پر یہ درخواست کہ بشیر کو کسی امتحان کے بغیر پہلے

سال کا استثناد ے کر دوسرے سال میں داخلہ دے دیا جائے تاہم انہوں نے ایسے کسی وعدے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میں سنڈ یکیٹ سے اپنی یہ تجویز منظور کرالوں تو یہ دونوں باتیں مانی جاسکتی ہیں۔ اللہ نے مجھے توفیق دی اور میں نے بھاگ دوڑ کر کے سنڈ یکیٹ کے کچھ ممبرز کو اپروچ کر لیا۔ الحمد للہ! سنڈ یکیٹ نے اس تجویز کے ساتھ اتفاق کیا اور یوں بشیر کا داخلہ انجینئرنگ کالج میں ہو گیا اور ایک سال کا استثنا بھی مل گیا۔

بشیر ایک سال ہوسٹل میں میرے کمرے میں ہی رہے۔ پھر انہیں الگ کمرہ مل گیا اور وہ وہاں شفٹ ہو گئے۔ میں نے انہیں انتہائی محنتی اور شریف النفس پایا اور خدا کا شکر ہے ساری زندگی ان کا یہی چلن رہا۔''

چوہدری بشیر احمد نے بی ایس سی کرنے کے بعد حکومتِ پنجاب کی ملازمت اختیار کر لی اور ان کی تعیناتی گوجرانوالہ، فیصل آباد اور لاہور کے میونسپل اداروں میں رہی۔ وہ لاہور میونسپل کارپوریشن میں چیف انجینئر بھی رہے لیکن ۲۸ فروری ۱۹۸۵ء کو ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی تعیناتی حکومتِ پنجاب کے محکمہ لوکل گورنمنٹ اینڈ رورل ڈیویلپمنٹ میں سپرنٹنڈنگ انجینئر کے طور پر تھی۔

وہ ریٹائرمنٹ کے جلد ہی بعد بعارضہ فالج بیمار ہو گئے۔ اس بیماری نے انہیں بے حال کر دیا اور وہ ایک لمبا عرصہ شدید تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد ۸ ستمبر ۲۰۰۲ء کو وفات پا گئے۔ موصی تھے چنانچہ جنازہ ربوہ لے جایا گیا جہاں ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں عمل میں آئی۔

میں نے مرحوم کو ایک لمبا عرصہ قریب سے دیکھا۔ وہ ایک قدرے خاموش، شریف اور صلح کُل قسم کے انسان تھے اور انسانی اقدار پر یقین کامل رکھتے تھے۔ ان کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو اُن کے امریکہ میں پڑھائی کے اخراجات کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ ایسے میں ان کی ایک دُور دراز متموّل غیر احمدی رشتہ دار خاتون جو اپنے حلقہ میں ''بی بی چوہدری'' کے نام سے معروف تھیں ان کی مدد کو آئیں اور انہیں اتنی رقم فراہم کر دی جس سے ان کے امریکہ میں تعلیم کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ چوہدری بشیر احمد نے یہ رقم قرض لی تھی اور امریکہ سے واپسی پر بی بی چوہدری کو لوٹا بھی دی لیکن انہوں نے موصوفہ کا یہ احسان ساری زندگی یاد رکھا۔ بی بی چوہدری خود تو علاقہ بہاولپور میں مقیم تھیں لیکن وقتاً فوقتاً لاہور آتی رہتی تھیں۔ میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ چوہدری صاحب بی بی چوہدری کو بہت عزت واحترام کے ساتھ اپنے گھر رکھتے بلکہ پورے گھر کا نظم ونسق ان کے حوالے کر دیتے۔ بی بی چوہدری بھی اس بات پر خوش رہتیں اور مسلسل کئی کئی ہفتے لاہور گذار کر واپس اپنے گاؤں جاتیں۔

مرحوم کی شادی مبارکہ شوکت بنت میاں اکبر علی، ساکن ۱۶۔ نابھہ روڈ سے ہوئی تھی۔ لاہور کے پرانے احمدی جانتے ہیں کہ میاں اکبر علی ایک مخلص اور مخیر احمدی تھے۔ ان کے گھر میں نماز سنٹر قائم تھا اور تاریخ احمدیت لاہور مرتبہ شیخ عبدالقادر کے مطابق جب دارالذکر، لاہور کے لیے زمین کی خریداری کا مرحلہ درپیش تھا تو ۱۶,۰۰۰ روپیہ کے کل اخراجات میں سے مبلغ ۲,۰۰۰ روپے موصوف نے ادا کئے تھے۔ بہرحال اس شادی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے چوہدری بشیر احمد کو تین بیٹوں اور چھ بیٹیوں سے نوازا۔ بڑے دو بیٹے یعنی ظفر اقبال اور نصیر احمد لاہور ہی میں مقیم ہیں جب کہ سب سے چھوٹے بیٹے محمود احمد نے پچھلے دو تین سال سے جرمنی کو اپنا وطن بنالیا ہے۔

بیٹیوں میں سے راشدہ تسنیم سب سے بڑی ہیں۔ موصوفہ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (ہسٹری) کر رکھا ہے اور نیشنل سکول آف آرٹس میں بھی پڑھتی رہی ہیں۔ وہ ۱۹۷۶ء میں میرے عقد میں آئیں۔ ہمارا نکاح حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے پانچ اپریل ۱۹۷۶ء بروز پیر بعد نماز عصر بیت مبارک ربوہ میں پڑھا تھا۔ ہمارے نکاح کے ساتھ ایک اور نکاح کا بھی اعلان ہوا۔ اس موقع پر حضور نے ایک مختصر لیکن لطیف خطبہ ارشاد فرمایا جو الفضل میں چھپ چکا ہے۔

حضور نے فرمایا: ''اس دنیا میں خوشحالی کے سامان ہمارے اعمال اس صورت میں پیدا کر سکتے ہیں جیسا کہ ہم تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے والے ہوں۔ مثلاً بارش ہے۔ کبھی انسان اپنی غفلتوں کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کے اس فضل سے دُور ہو جاتا ہے لیکن جب انسان خدا تعالیٰ کے حضور جھکتا ہے اور اس سے اپنا تعلق مضبوط کرتا ہے تو اس وقت یہ بارش رحمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح ازدواجی رشتے قائم ہوتے ہیں اور ان میں جو ذمہ داریاں ہیں یہ بھی سب خدا تعالیٰ کے فضل ہی سے نباہی جاتی ہیں اور رحمت بنتی ہیں۔ ہماری یہ دعا ہے کہ جو رشتے آج قائم ہو رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے والے ہوں اور دین و دنیا میں کامیاب ہوں۔

اس وقت میں دو نکاحوں کا اعلان کروں گا۔ ایک نکاح تو ہمارے مرحوم ساتھی مولوی محمد یعقوب صاحب کے بیٹے عزیزم داؤد احمد طاہر صاحب کا ہے جو عزیزہ راشدہ تسنیم صاحبہ بنت مکرم چوہدری بشیر احمد صاحب، ساکن لاہور سے اکیس ہزار روپے حق مہر پر قرار پایا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم بڑے اخلاص اور بڑے ایثار کے ساتھ حضرت مصلح موعود کے ساتھ کام کرتے رہے۔ زُود نویسی وغیرہ بہت سے کاموں میں حصہ لیا۔ ہمارے دل کی گہرائیوں سے اُن کے لیے دعا نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے اس رشتے کو مبارک کرے۔

دوسرا نکاح جس کا میں اعلان کروں گا وہ عزیزہ امۃ النعیم صاحبہ بنت مکرم چوہدری محمد شریف صاحب ساکن یومبالو (سندھ) کا پانچ ہزار حق مہر پر عزیزم مکرم چوہدری مبشر احمد صاحب کاہلوں، مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ سے قرار پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان ہر دو رشتوں کو بہت برکت کرے۔''

ایجاب و قبول کے بعد حضور نے ان رشتوں کے بابرکت ہونے کے لیے حاضرین سمیت دعا کروائی۔

چوہدری بشیر احمد کی دوسری صاحبزادی آنسہ ہیں جو نیشنل سکول آف آرٹس کی سابق طالبہ ہیں۔ اُن کی شادی محلہ دارالفضل، ربوہ کے چوہدری محمد ابراہیم رشید (جنہیں ایک لمبا عرصہ مختلف حیثیتوں میں سلسلے کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی اور اَب بہشتی مقبرہ ربوہ میں آسودۂ خاک ہیں) کے صاحبزادے چوہدری طارق عبداللہ سے ہوئی۔ شادی کے بعد یہ دونوں ابتداءً لاہور میں رہے لیکن اب عرصہ دراز سے جرمنی کے شہر کیل میں مقیم ہیں اور وہیں کی شہریت اختیار کر رکھی ہے۔

تیسری بیٹی روبینہ ہیں جن کی شادی ڈاکٹر منصور احمد کے ساتھ ہوئی ہے۔ ڈاکٹر منصور جنہوں نے کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز، پاکستان سے ماسٹرز اور یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز سے ماسٹر آف ہاسپٹل مینجمنٹ کر رکھا ہے کچھ ہی عرصہ پہلے سروسز ہسپتال، لاہور سے بطور چیف کنسلٹنٹ سرجن ریٹائر ہوئے ہیں اور آج کل پرائیویٹ پریکٹس کر رہے ہیں۔

ان سے چھوٹی عتیقہ ہیں جو جرمنی میں ہیں۔ میں آنسہ اور عتیقہ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا کہ وہ میری

بیٹی، قرۃ العین طاہر اور بیٹے، نبیل احمد طاہر کی شادیوں پر زحمت کر کے شمولیت کے لیے جرمنی سے لاہور آئیں اور ان تقریبات کو رونق بخشی۔ خدا تعالیٰ اُنہیں ان کی اس نیکی کا اجر دے۔

عتیقہ سے چھوٹی ڈاکٹر نبیلہ ہیں جو اِن دنوں انگلستان کے شہر سکن تھروپ کے سکن تھروپ جنرل ہاسپٹل میں کام کر رہی ہیں۔ وہ ایک لائق و فائق، محنتی اور سمجھدار خاتون ہیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر ندیم احمد نے ایڈنبرا سے ایف آر سی ایس کر رکھا ہے اور وہ بھی اسی ہسپتال میں بطور سرجن کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ندیم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ سکن تھروپ کے کسی ہسپتال میں کام حاصل کرنے والے پہلے احمدی ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے اپنے قیامِ سکن تھروپ کے دوران بہت سے احمدی ڈاکٹروں کو وہاں حصولِ ملازمت میں مدد مہیا کی جس کے نتیجہ میں اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہاں ایک بڑی جماعت قائم ہو چکی ہے۔

چوہدری بشیر احمد کی سب سے چھوٹی صاحبزادی انیلہ ہیں جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم کام اور ٹورانٹو بورڈ آف ایجوکیشن سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں دوسالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کر رکھا ہے۔ وہ اس امتحان کے نتیجہ کی بنیاد پر جماعت کی طرف سے ایجوکیشنل ایکسی لینسی ایوارڈ کی حق دار بھی قرار پائیں۔ وہ ڈاکٹر نصیر احمد خان، ڈینٹسٹ سے بیاہی گئیں۔ موصوف اکتوبر ۲۰۱۰ء سے پانچ سالہ وقف کی سکیم پر گیمبیا کے دار الخلافہ Banjul میں احمدیہ...... ڈینٹل سرجری میں بطور ڈینٹسٹ خدمت بجالا رہے ہیں۔

اور اب کچھ ذکر ہمارے باقی محلہ داروں کا!

چوہدری بشیر احمد رائے ونڈی دفتر خزانہ صدر انجمن احمدیہ میں کام کرتے تھے۔ وہ رائے ونڈ کے نواحی گاؤں چھجو والا کے چوہدری نواب دین کے بیٹے تھے اور انہوں نے ۱۹۳۴ء میں احمدیت قبول کی تھی۔ بشیر رائے ونڈی نے میٹرک تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان سے کیا اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ربوہ کو اپنا ٹھکانا بنالیا۔

میں بے روزگار تھا اور مختلف جگہوں پر درخواستیں جمع کرانے کے لیے مجھے اپنے تعلیمی سرٹیفکیٹس کی نقول کی بکثرت ضرورت رہتی تھی۔ اُس وقت تک فوٹو کاپی کی سہولت کم از کم ربوہ میں میسر نہ تھی لہٰذا نقول کے لیے کسی ماہر ٹائپسٹ کی ضرورت پڑتی تھی۔ مجھے نہ جانے کس طرح پتا چل گیا کہ وہ ٹائپ جانتے ہیں۔ میں نے ایک بار ان سے نقول بنانے کی فرمائش کی جو انہوں نے بخوشی پوری کر دی۔ بس پھر کیا تھا، دن ہوتا یا رات میں حسبِ ضرورت ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ مستزاد یہ کہ وہ یہ سارا کام کسی معاوضہ کی توقع کے بغیر سرانجام دیتے تھے۔

ان کے ایک بھائی رشید احمد جاوید جنہوں نے ایم اے اکنامکس کرنے کے بعد کچھ عرصہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں لیکچرر کے طور پر کام کیا اور پھر سٹیٹ بینک میں ملازمت اختیار کر لی تھی اُس زمانے میں ان ہی کے پاس رہا کرتے تھے۔ مجھ سے قدرے سینئر تھے لیکن خدام الاحمدیہ کی سرگرمیوں کے حوالے سے میرا ان کے ساتھ کافی رابطہ رہتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ بشیر رائے ونڈی صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۹۴ء میں وفات پا گئے تھے اور وہ رائے ونڈ میں دفن ہیں۔

منشی رمضان علی جو بعد میں صوفی رمضان علی کہلانے لگے تھے ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ رہتے تھے۔ فی الاصل وہ قادیان کے قریب موضع سیکھواں کے رہنے والے تھے لیکن قبولِ احمدیت کے بعد قادیان اور وہاں سے ربوہ منتقل ہو گئے۔ انہیں احمدیت کی نعمت ۱۹۳۵ء میں اپنے بھائی، منشی سبحان علی کے ذریعہ نصیب ہوئی۔ یہ وہی سبحان علی ہیں جو الفضل میں کاتب ہوا کرتے تھے اور کینسر میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۹۵۰ء کی دہائی میں فوت ہو گئے تھے۔ اباجی ذکر کیا کرتے تھے کہ اس مرض نے ان کے سینہ کو اس بُری طرح جکڑ لیا تھا کہ ان کا دل نظر آنے لگا تھا۔

صوفی رمضان علی ہمیشہ پگڑی اور کوٹ زیبِ تن کرتے تھے۔ قد زیادہ لمبا نہ تھا۔ ہاتھ میں ہر وقت چھڑی رکھتے۔ ادائی نماز میں بہت باقاعدہ تھے اور تمام نمازیں بیت مبارک میں ادا کیا کرتے تاہم جب بیت یادگار تعمیر ہو گئی تو اپنے گھر سے اس کی قربت کی وجہ سے نمازیں یہاں پڑھنے لگے۔

وہ کچھ عرصہ ہمارے محلّہ کے صدر رہے۔ جب میں نے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تو ہوسٹل سے باہر رہنے کے لیے پرنسپل سے اجازت مقصود تھی۔ اس فارم پر صدر محلّہ سے تصدیق کروانا پڑتی تھی چنانچہ میری درخواست پر صوفی صاحب ہی نے بطور صدر محلّہ دارالصدر شرقی دستخط کئے تھے۔

وہ نظارت علیا سے ریٹائر ہوئے جس کے بعد بھی انہیں لمبا عرصہ جماعت کی خدمت کی توفیق ملی۔ انہوں نے دفتر انصار اللہ میں بھی کام کیا لیکن فضل عمر فاؤنڈیشن سے ان کا تعلق تقریباً دو دہائیوں پر محیط رہا۔ انہوں نے ناصر آباد میں اپنا مکان تعمیر کر لیا تھا چنانچہ وہ ۱۹۸۱ء میں انجمن کوارٹرز سے وہاں منتقل ہو گئے۔

انہوں نے ۱۹۹۸ء میں چورانوے سال کی عمر میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ان کی اہلیہ، آمنہ بیگم کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ آخری عمر میں ان کی گنٹھیا کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے ان کی نقل و حرکت بالکل محدود ہوگئی اور وہ اسی کیفیت میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

صوفی رمضان علی کی ایک ہی صاحبزادی ہیں جن کا نام صادقہ ہے۔ وہ میری بہن، صادقہ کی کلاس فیلو تھیں اور انہوں نے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد جامعہ نصرت ربوہ میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ انہیں لمبا عرصہ اس خدمت کی توفیق ملی اور وہ اس کالج سے پرنسپل کے طور پر ریٹائر ہوئیں۔

سید نذیر احمد مشہدی بطور انسپکٹر بیت المال کام کرتے تھے۔ وہ انتہائی نفیس الطبع اور بااخلاق انسان تھے۔ ان کی اہلیہ حمیدہ سرساوی آپا کے سسرال میں سے تھیں اور ان کا ہمارے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔

موصوف کی وفات کے بعد ان کے بیٹے، خلیل احمد نے جو خلافت لائبریری میں کام کرتے ہیں ایک عجیب واقعہ بیان کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کو اپنی وفات کے بارے میں غیب سے اشارہ مل چکا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ بوقتِ وفات ان کا تقرر وکالتِ مال میں تھا جہاں وہ چوہدری شبیر احمد کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ اس دفتر کا معمول تھا کہ وقفہ کے دوران سب کارکنان چائے اکٹھے پیتے۔ وفات والے دن مرحوم کو اپنے درمیان موجود نہ پا کر شبیر صاحب نے کسی کو انہیں تلاش کرنے کے لیے ان کے دفتر بھیجا تو ان کی میز پر ان کی ٹوپی اور ان کے اپنے ہاتھ کی ایک تحریر پڑی تھی جس میں انہوں نے لکھا ہوا تھا:

سید نذیر احمد مجاہد غازی مشہدی
تاریخ وفات ۹ جون ۱۹۸۷ء

یہ چٹ دیکھ کر دفتر میں کھلبلی سی مچ گئی اور ایک آدمی ان کے گھر کی طرف دوڑایا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر پہنچ کر چارپائی پر لیٹتے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

قاضی محمد نذیر فاضل حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت قاضی محمد حسین کے صاحبزادے، ایک نامور عالمِ دین، محقق، مصنف، مفسر اور مقرر تھے جنہیں ۱۹۳۸ء سے لے کر اپنی وفات تک جو ۱۹۸۰ء میں ہوئی مسلسل بیالیس سال تک مختلف حیثیتوں میں سلسلے کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہیں جماعت کے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریس کے علاوہ بطور مربی، ناظر اصلاح وارشاد اور ناظر اشاعت لٹریچر وتصنیف کام کرنے کا موقع ملا اور وہ آخری دم تک مصروفِ کار رہے۔

وہ ایک متبحّر عالم تھے۔ وہ سالہا سال تک قرآن شریف اور حدیث کا درس دیتے رہے۔ وہ ٹھوس علمی شعور رکھتے تھے۔ جماعت کے اختلافی عقائد کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ خوش بیان مقرر تھے اور جلسہ سالانہ یا دیگر مواقع پر ان کی تقاریر بہت شوق کے ساتھ سننے والوں میں راقم بھی شامل تھا۔

حاضر جوابی قاضی محمد نذیر پر ختم تھی۔ اللہ بخش صادق وکیل التعلیم تحریک جدید انجمن احمدیہ جنہیں اُن کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہے راوی ہیں کہ ''ایک بار موضع ڈاور میں مولوی لال حسین اختر کے ساتھ اِن کا مناظرہ ہو رہا تھا۔ اس دوران مولوی لال حسین اختر نے قاضی صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ ''آپ تو مرزا غلام احمد کی تعریفیں کریں گے ہی کیوں کہ آپ کے معاش کا انحصار اسی بات پر ہے۔'' اس پر قاضی صاحب نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مولوی لال حسین اختر نے پوری بات نہیں کی۔ دراصل ہم دونوں کے معاش کا انحصار مرزا صاحب پر ہی ہے۔ میں اُن کی تعریف کر کے اپنا روزگار کما رہا ہوں اور مولوی لال حسین اختر اُن کی تنقیص کر کے۔'' اس پر مجمع کِشتِ زعفران بن گیا۔

ایک اور موقع پر جب قاضی صاحب ڈیرا غازی خان میں کسرِ صلیب پر تقریر کر رہے تھے جوشِ خطابت میں اِن کا ہاتھ ڈائس پر پڑی چائے کی پیالی پر لگ گیا جس سے وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اللہ بخش صادق کہتے ہیں: ''کوئی اور ہوتا تو شرمندگی کے مارے نہ جانے کیا کہتا لیکن قاضی صاحب نے ایک لمحے کے توقّف سے کہا کہ صلیب بالکل اسی طرح ہی ٹوٹ کر پاش پاش ہونے والی ہے جیسے یہ پیالی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔''

مجھے یاد ہے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران جب میرا تقرر فیصل آباد میں تھا میرے ایک غیر از جماعت دوست نے سلسلہ کے بارے میں دلچسپی کا اظہار کیا تو میں انہیں لے کر قاضی محمد نذیر کے پاس گیا اور وہ دونوں کئی گھنٹوں تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ اگرچہ یہ گفتگو میرے اس دوست کے خیالات میں تو کوئی تبدیلی نہ لا سکی لیکن وہ ہمیشہ قاضی صاحب کے علم وفضل اور اندازِ گفتگو کے معترف رہے اور جب بھی ملتے قاضی صاحب کا حال احوال ضرور دریافت کرتے۔

افسوس! ''مجھ'' کو میر سے صحبت نہیں رہی

کے مصداق میری قاضی صاحب سے زیادہ ملاقات تو نہیں رہی لیکن ابا جی کی وجہ سے وہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ ایک ہی محلہ میں رہائش کے سبب ہمارا اکثر ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ وہ ہمیشہ ہی متبسم چہرے کے ساتھ ملتے۔ ان کی وفات پر قیس مینائی نے کہا تھا:

صاحب علم و عمل ، قاسمِ خیرُ الکثیر
ہو گئے خُلد آشیاں ، قاضی محمد نذیر
حق نے کیا تھا انہیں ، زورِ خطابت عطا
ان کی زبان پر تھا حق ، دل بھی تھا روشن ضمیر
ایسے مُناظر تھے آپ ، جن کا ہے مشکل جواب
ایسے مجاہد تھے آپ ، جن کی ہے مشکل نظیر
جوہرِ سیفِ زباں ، برسرِ دجّالیت
جوہر سیفِ قلم، برق وش بے نظیر
برسرِ عیسائیت ، آہنی گرزِ گراں
مذہبِ (......) کا ، ایک فردِ تن فقیر

قاضی عزیز احمد قاضی محمد نذیر کے بڑے صاحبزادے تھے۔ مجھے یہ علم تو نہیں کہ وہ صدر انجمن احمدیہ میں کس حیثیت میں ملازم تھے البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ بیت مبارک میں لاؤڈ سپیکر کو حالتِ کار میں رکھنا ان کی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح جلسہ سالانہ کے موقع پر لاؤڈ سپیکر سے متعلق تمام خدمات بھی وہی سرانجام دیتے تھے۔ چونکہ ابا جی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے خطبات اور تقاریر محفوظ کرنے کے ذمہ دار تھے لہٰذا قاضی عزیز احمد کا ان کے ساتھ بکثرت رابطہ رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے بھی ہمیشہ مسکرا کر ملتے اور مزاج پرسی کے بغیر آگے نہ بڑھتے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ان کا چھوٹا بھائی جس کا نام منیر تھا اور جس نے ضیاء الاسلام پریس، ربوہ میں ملازمت اختیار کر رکھی تھی میٹرک تک میرا کلاس فیلو رہا تھا۔

اب قاضی عزیز احمد وفات پا چکے ہیں اور قاضی منیر احمد کسی دور دیس جا بسے ہیں۔

قاضی محمد نذیر کی دو ہی بیٹیاں تھیں جو نذر احمد پٹھان کی بہوئیں بنیں۔

یاد رہے کہ مولوی نذر احمد پٹھان دفتر امور عامہ میں کام کیا کرتے تھے۔ ان کی شہرت ایک دیانتدار، فرض شناس اور مخلص خادمِ سلسلہ کی تھی۔ مچھلی کا شکار ان کی کمزوری تھا۔ سنتے تھے اکثر و بیشتر دریا پر چلے جاتے اور زیادہ سے زیادہ مچھلی پھنسنے کی آس میں پوری پوری رات وہاں گذار دیتے۔ اپنے اس شوق کی تکمیل میں انہیں بعض اور ساتھیوں کی اعانت بھی حاصل رہی جن میں سے یوسف نام کا ایک نوجوان بھی تھا جسے اپنی آواز میں کسی خلقی نقص کی بنا پر ''یوسف گُنگنا'' کہا جاتا تھا۔ یہ تو ان کے اہل و عیال ہی میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ کتنے کامیاب شکاری تھے لیکن سنتے ہیں مچھلی کے ٹوکرے بھر بھر کر لاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں کثیر نرینہ اولاد سے نوازا تھا۔ مجھے ان کے اکثر بیٹوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں سے محمد ہارون، محمد رشید، محمد قاسم، محمد ہاشم، محمد رافع اور محمد عاقل کے نام مجھے اب تک یاد ہیں۔ محمد رشید جنہیں اہلِ محلّہ پیار سے ''ڈڈو'' کہا کرتے تھے غالباً فیملی پلاننگ کے محکمے میں بھرتی ہو گئے اور بہت پہلے انتقال کر گئے تھے۔ ہارون سکول ٹیچر تھے اور ہاشم نے ایرفورس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ میں اور رافع سکول میں اکٹھے تھے۔ اب ہارون، ہاشم اور رافع بھی وفات پا چکے ہیں۔

میں ایک بار ایک تدفین کے سلسلہ میں ربوہ کے قبرستان گیا تو اچانک میری نگاہ رشید، ہاشم اور رافع کی قبروں پر جا پڑی۔ رشید کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہوا جب کہ رافع نے اس واقعہ کے پندرہ سال بعد وفات پائی اور ہاشم اس کے بھی دو سال بعد اللہ کو پیارے ہوئے لیکن اتفاق سے ان تینوں بھائیوں کی قبریں ایک ہی جگہ پر ایک دوسرے کے بہت قریب واقع ہیں۔

قاسم جنہوں نے صدر انجمن احمدیہ میں ملازمت اختیار کر لی تھی اب کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔ وہ کبڈی کے بہت اچھے کھلاڑی رہے ہیں اور کالج کے زمانہ میں اس کی روئنگ ٹیم میں بھی شامل تھے۔ انہیں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں کے دوران مجاہد فورس میں بھی خدمت کا موقع ملا ہے۔

عاقل جنہیں محلے میں نہ جانے کیوں ''پیتی'' کہا جاتا تھا ترکِ وطن کر کے جرمنی منتقل ہو چکے ہیں۔

نذر احمد پٹھان بعد از وفات بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ فضل عمر ہسپتال کے پیتھالوجسٹ ڈاکٹر محمد عامر نے ایک بار یہ انکشاف کر کے کہ وہ مرحوم کے پوتے ہیں اُن کی یاد تازہ کر دی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چوہدری عبدالمجید سردار عبدالحمید آڈٹ آفیسر ریلوے کے صاحبزادے تھے اور آڈیٹر صدر انجمن احمدیہ کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ سنتے تھے کہ بھلے وقتوں میں ریلوے میں ملازم تھے جہاں انہیں اچھی خاصی سہولتیں حاصل تھیں لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی تحریک پر زندگی وقف کر کے قادیان آ گئے اور پھر بقیہ زندگی سلسلے کی خدمت میں گذار دی۔

دراز قد، قدرے دُبلے پتلے اور نستعلیق سے عبدالمجید عبدالعزیز بھامبڑی کے پڑوسی تھے۔ ان کا بڑا بیٹا، عبدُالعلی پہلی جماعت سے میرا کلاس فیلو تھا اور ان کے چھوٹے بھائی، عبدالباسط المعروف ''باچھی'' میرے دوستوں میں سے تھے۔ یہ دونوں بھائی اب مدت سے کراچی میں ہیں اور ان کے والدِ گرامی نے بھی ان ہی کے پاس وفات پائی تھی۔

میں جن دنوں فنانس سروسز اکیڈمی، لاہور میں تھا کسی نے مجھے بتایا کہ جماعت کا نماز سنٹر یہاں سے دور نہیں۔ ایک جمعہ پر وہاں گیا تو پتا چلا کہ یہ گھر ان ہی عبدالمجید کے بھائی عبدالباری کا ہے۔

عبدالباری کسی وقت نائب ناظر بیت المال ہوا کرتے تھے اور ربوہ کے ابتدائی آبادکاروں میں سے تھے۔ تاریخِ احمدیت میں ناظرِ اعلیٰ کے نام ان کے ایک خط کا خلاصہ درج ہے جس کے مطابق اُن دنوں ربوہ کی کل آبادی پچیس نفوس سے زیادہ نہ تھی اور ان میں سے بھی بیک وقت پانچ چھ افراد بیمار رہتے تھے۔ طبی سہولتوں کا مکمل فقدان تھا جس کی وجہ سے یہ مریض حالات کے رحم و کرم پر وقت گذارنے پر مجبور تھے۔ انہوں نے اس خط میں ربوہ کے موسم کا

نقشہ بایں الفاظ پیش کیا ہے: ''کل یہاں پر شدید آندھی آئی جس نے خیمے چھوڑے اور نہ باقی چیزیں۔'' ان سے ملاقات ہوئی تو ربوہ کے ابتدائی ایام کے متعلق بہت سی یادیں تازہ ہوئیں۔

اب عبدالباری بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے لواحقین کا خود حافظ و ناصر ہو۔

ماسٹر حمید احمد تھے تو پرائمری سکول میں استاد لیکن کہلاتے سنیاسی تھے اور صرف کہلاتے ہی نہ تھے انہوں نے اس فن میں شوقیہ مہارت پیدا کر رکھی تھی چنانچہ گھر میں ہوتے تو دوائیں کھرل کرنے میں لگے رہتے۔ چھوٹی موٹی پریکٹس بھی کرتے تھے۔ ''دواخانہ فیضِ عام'' کے نام سے ایک بورڈ ان کے گھر کے باہر لگا ہوتا تھا۔

وہ محمد اسماعیل نامی ایک بزرگ کے بیٹے تھے جو اُن کے ساتھ ان ہی کے کوارٹر میں مقیم تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہوں نے طویل عمر پائی۔ بتایا جاتا تھا کہ سو سال پورے کر چکے تھے۔

ماسٹر حمید احمد نے ۱۹۲۷ء میں خود احمدیت قبول کی تھی۔ ملازمت کا آغاز چک ۹۹ شمالی ضلع سرگودھا میں استاد کے طور پر کیا لیکن قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے زندگی وقف کر کے قادیان منتقل ہو گئے۔ تقسیم کے بعد بطور مربی بھی کام کیا لیکن بعد میں تعلیم الاسلام پرائمری سکول میں پڑھانے لگے۔

وہ ایک لمبا عرصہ ہمارے مُربی رہے۔ وہ ہمیں ادائی نماز اور دیگر تربیتی امور کی طرف التزام لیکن نرمی کے ساتھ توجہ دلاتے تھے۔ اس حیثیت میں وہ اجلاسات کا باقاعدہ انعقاد بھی یقینی بناتے۔ مجھے ان سے بطور شاگرد تو پڑھنا یاد نہیں لیکن ایک طفل کی حیثیت میں ان کی مؤثر نگرانی اور تربیت کا شاہد ہوں۔

ان کی ایک قابلِ ذکر یادگار ان کی شائع کردہ ''نمازِ مترجم'' ہے جو قاضی محمد نذیر لائلپوری کی رائے میں ''بچوں اور مستورات کی تربیت کے لیے بہت مفید ہے۔''

شیخ محمد دین جو اُن دنوں صدر انجمن احمدیہ کے مختارِ عام تھے سلسلہ کے قدیمی خدام میں سے تھے۔ انہوں نے پٹواری کی سرکاری ملازمت تیاگ کر اپنی خدمات جماعت کو پیش کر دیں اور تادم آخر قدم پیچھے نہ ہٹنے دیا۔ قادیان کے زمانہ میں انہیں لنگر خانے، دفتر Review of Religions، بہشتی مقبرہ اور نظارت امور عامہ میں خدمات بجا لانے کا موقع ملا جب کہ وہ آخر میں ایک لمبی مدت تک مختارِ عام صدر انجمن احمدیہ رہے۔ بتایا جاتا تھا کہ احمد نگر میں احمدی مہاجرین کی آبادکاری اور ربوہ کے قیام میں جن بزرگوں کو نواب محمد دین کے دوش بدوش کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی شیخ محمد دین ان میں سرفہرست تھے۔

میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا لہٰذا ان سے بے تکلفانہ بات چیت کا موقع تو کبھی پیدا نہ ہوا البتہ وہ کہیں نظر آجاتے تو میں رُک کر ان سے شرفِ مصافحہ ضرور حاصل کرتا اور وہ بھی میرے بزرگان کے ساتھ اپنے مراسم کے پیشِ نظر ہمیشہ میری مشفقانہ سرپرستی فرماتے۔ ان کے صاحبزادے شیخ مبارک احمد مشنری انچارج مشرقی افریقہ و امریکہ نے اپنی کتاب ''کیفیاتِ زندگی'' میں ان کی قبولیتِ دعا کے کچھ ایمان افروز واقعات بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر قادیان منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت

میں خط لکھ کر دریافت کیا کہ وہ اپنا سامان کس کے نام بک کرائیں۔ حضور کا جواب موصول ہونے پر جب وہ سامان لے کر رشیدہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سٹیشن ماسٹر نے یہ کہہ کر اسے بک کرنے سے انکار کر دیا کہ کسی وجہ سے آج کل بکنگ بند ہے۔ اس پر شیخ محمد دین بہت گھبرائے۔ وہ بیوی بچوں کو پہلے ہی تلمبہ بھجوا چکے تھے اور گھر ختم کر کے قادیان جانے کی تیاری کیے بیٹھے تھے۔ یہ صورت حال ان کے لیے بہت پریشان کن تھی چنانچہ وہ سٹیشن سے باہر نکل کر اللہ کے حضور سر بسجود ہو گئے اور مشکل کشائی کی درخواست کی۔ شیخ مبارک احمد کے بیان کے مطابق وہ قبولیت دعا کی کوئی ایسی گھڑی تھی کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر سٹیشن ماسٹر نے خود انہیں اپنے پاس بلا کر بتایا کہ افسرانِ بالا کی طرف سے موصول شدہ ایک تار کے مطابق اس سٹیشن سے مال کی بکنگ فوری طور پر کھول دی گئی ہے لہٰذا ان کا سامان بک کر کے رسید انہیں دی جا رہی ہے۔ سامان بک ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد حکام کی طرف سے ایک اور تار موصول ہو گیا جس کے ذریعہ پہلی ہدایت واپس لیتے ہوئے بکنگ دوبارہ بند کر دی گئی تھی۔ سٹیشن ماسٹر کے لیے یہ واقعات بہت حیران کن تھے اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ بالآخر اسے یقین ہو گیا کہ سامان بک کرانے والا اللہ کا کوئی خاص بندہ ہے جس کی مدد کے لیے خدا نے یہ انتظام کیا ہے چنانچہ اس نے شیخ محمد دین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''مجھے تو لگتا ہے بکنگ صرف آپ کے سامان کے لیے کھلی تھی'' اور مزید کہا کہ ''خدا تعالیٰ کی نصرت آپ کے ساتھ معلوم ہوتی ہے''۔

ان کی وفات پر عبدالسّلام اختر نے ان کی ذاتی خوبیاں گنواتے ہوئے کہا تھا:

آہ! وہ مردِ جری عالی مقام
خوش خصال و خوش نہاد و خوش کلام
نیک طینت ، نیک سیرت ، نیک نام
پاک باطن ، پاکباز و پاک دام
بے ریا و بے نمائش ، بے نفس
با حیا ، باتمکنت ، بااحترام
غیرتِ دینِ متیں کا اک ستون
گلشنِ ملت کا آبِ خوش خرام
ثبت ہے اوراقِ دل پر اس کی یاد
تا ابد زندہ رہے گا اس کا نام

شیخ مبارک احمد کے ساتھ میری پہلی ملاقات

شیخ مبارک احمد کے ساتھ میری پہلی ملاقات ان کے والدِ بزرگوار منشی محمد دین کے مکان پر ہوئی جہاں شیخ مبارک احمد کے صاحبزادے، منور مقیم تھے جو کالج میں مجھ سے ایک سال سینئر اور خدا جانے کیوں اپنے ہم عمروں میں مُو وِی کے عُرف سے معروف تھے۔

میں اُن دنوں کالج کا طالب علم تھا اور شیخ مبارک احمد پچاس پچپن کے پیٹے میں لہٰذا ہمارے درمیان کسی علمی موضوع پر گفتگو تو خارج از امکان تھی لیکن وہ اباجی کے مداحوں میں سے تھے اور شاید مجھ پر ان کی شفقت کا پسِ منظر یہی تھا۔

تکمیل تعلیم اور تلاش معاش کے دھندوں میں اُلجھ کر میرا ان سے رابطہ قریباً ختم ہو چکا تھا۔ اگست ۱۹۹۹ء میں مجھے ایک تربیتی کورس پر لاس اینجلس جانا پڑا۔ پروگرام کے مطابق مجھے وہاں پہنچنے سے پہلے دو تین روز واشنگٹن میں رکنا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ شیخ مبارک احمد وہیں تعینات ہیں اور میں چاہتا تھا کہ ان سے بھی شرف ملاقات حاصل ہو۔ میں نے انہیں فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے مشن ہاؤس میری جائے قیام سے واکنگ ڈسٹنس پر تھا چنانچہ میں وہاں ہو تو آیا لیکن اپنے اس مشفق و مہربان سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس رہا۔ لاس اینجلس سے واپسی پر مجھے پھر چند روز کے لیے واشنگٹن ٹھہرنا تھا۔ میری خوش قسمتی، اس وقت تک وہ امریکہ واپس آ چکے تھے چنانچہ میں ان کے پاس حاضر ہوا تو بہت محبت سے پیش آئے اور چوہدری شبیر احمد کے صاحبزادے، ظفر احمد سے جو وہاں بطور مربی تعینات تھے بھی ملاقات کرائی۔ انہوں نے میری جس قدر عزت افزائی فرمائی الفاظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ میرے دل سے ان کی صحت و عافیت اور ان کے نیک عزائم میں کامیابی کی دعا نکلی۔

امریکہ سے واپسی پر میں نے اس سفر کا حال ایک سفرنامے کی شکل میں لکھا تو نسیم سیفی نے از راہ حوصلہ افزائی الفضل میں اس کتاب پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا۔ یہ نوٹ شیخ مبارک احمد کی نظر سے بھی گذرا چنانچہ انہوں نے امریکہ سے مجھے ایک خط کے ذریعہ اس کتاب کی فرمائش کی اور اس امر کا خاص طور پر ذکر کیا کہ ''آپ کے والد بزرگوار سے خاکسار کا ان کی زندگی میں بہت رابطہ رہا۔ سواحیلی ترجمۃ القرآن کا اردو کا دیباچہ حضرت خلیفہ ثانی نے لکھوایا تھا جو محترم آپ کے والد صاحب ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے۔ بعد ازاں خاکسار کو بھجوایا گیا۔''

میرے لیے شیخ مبارک احمد جیسے نامور خادم سلسلہ کی طرف سے اس سفرنامے کی فرمائش ایک بڑا اعزاز تھا چنانچہ میں نے یہ کتاب انہیں فی الفور ائیر میل کے ذریعہ ارسال کر دی۔ ان کا ۲۲ نومبر ۱۹۹۵ء کا لکھا ہوا یہ خط دراصل اس کتاب کی رسید تھا:

''بہت بہت شکریہ۔ آپ کا والہ نامہ بھی ملا اور سفرنامہ بھی۔ ...... اسی وقت سے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ ایسا رواں دواں، عام فہم زبان، تکلفات اور بناوٹی مسجع فقروں سے عاری اور حیرت ہوئی، آپ نے مختصر قیام میں امریکہ کا دورہ کیا، ایسے حالات و کوائف سے آگاہ کیا کہ یہاں بارہ سال سے رہ رہا ہوں کئی باتوں، فیکٹریوں اور دلچسپی کی چیزوں سے آگاہی تک نہ ہوئی۔ سان فرانسسکو کئی بار گیا، سکرامنٹو کئی دفعہ گیا مگر باداموں کی فیکٹری اور چاکلیٹ کی فیکٹری کا دلچسپ نظارہ آپ کے سفرنامہ سے ہوا۔ اسی طرح آپ نے خوب خوب کئی عزیزوں اور دوستوں کا بھی ذکر کیا۔ اگر یہ پہلی کاوش ہے تو نہ معلوم بعد کی کاوشوں کا کیا شاندار نظارہ ہوگا۔ آپ صرف انکم ٹیکس کے کمشنر ہی نہیں اپنے والدِ بزرگوار کی یاد کو اپنی قادر الکلامی سے بھی خوب قائم رکھا بلکہ اسے چار چاند لگائے ہیں۔ اس وقت تک ۱۵۰ صفحات پڑھ چکا ہوں۔ بہت لطف اندوز ہوا، ماشاءاللہ۔ آپ کا ادبی مقام بھی اس سفرنامے سے واضح ہوا۔

خاکسار آج کل ریٹائرڈ ہے اور زیادہ وقت مطالعہ میں گذرتا ہے۔ بالخصوص ایسی کتابوں کا جو معلومات افزا ہوں۔ آپ نے تقریب رونمائی کے سلسلہ میں ذکر کیا کہ سپیکر قومی اسمبلی نے فرمائی۔ آپ کا سفرنامہ اور یہ کاوش اس

قابل تھی کہ کوئی جلیل القدر ہستی ہی اس کی تقریب رونمائی کا فریضہ انجام دیتی۔
آپ ملتان میں ہیں۔ زہے قسمت! خاکسار کے والدِ بزرگوار لمبا عرصہ ملتان رہے۔ خاکسار کی پیدائش شجاع آباد کی ہے، میرے چھوٹے بھائی نذیر احمد شفیع کی ملتان تھی۔ آخری ہماری قیام گاہ ریاض آباد کے قریب ایک قصبہ لوٹھڑ تھا۔ ۱۹۱۸ء کو میرے والد یہاں سے ہجرت کر کے قادیان چلے گئے۔
آپ کے علمی ریکارڈ اور صلاحیتوں کا بھی سفرنامہ سے علم ہوا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ اپنے خاندان کے روشن چراغ ہیں اور ان کے نیک نام کو مزید اُجاگر کرنے والے۔ آپ نے لکھا کہ امریکہ میں بھی آپ کا خاکسار سے ملنا ہوا۔ اے کاش! محض ملنے تک ہی محدود نہ ہوتا بلکہ مزید خدمت کا بھی اپنے محترم بھائی کے فرزند و عزیز کا موقع ملتا۔
اس کاوش پر دلی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مزید اعلیٰ صلاحیتوں سے دینی اور دنیاوی انداز میں نوازے۔"
مہاشہ محمد عمر سلسلے کے پرانے خدمت گذاروں میں سے تھے۔ ان کی پیدائش ایک ہندو گھرانے میں ہوئی تھی، ان کا نام جوگندر پال رکھا گیا تھا، ان کے والد پنڈت دھنّی رام انہیں وِدوان بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہیں ہردوار کے گوکل کانگڑی میں داخل بھی کرا دیا گیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک بار گوکل کانگڑی کے پنڈت دیو جی جوگندر پال اور اپنے بعض دیگر شاگردوں کے ہمراہ قادیان آئے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اس ملاقات میں حضور نے تجویز دی کہ اگر وہ پسند کریں تو اپنے چار بچوں کو جماعت کے خرچ پر عربی زبان پڑھنے کے لیے قادیان بھجوا سکتے ہیں جب کہ جماعت اپنے خرچ پر اپنے چار بچوں کو ان کے پاس سنسکرت کی تعلیم دلائے گی۔ پنڈت دیو جی تو اس بات پر راضی نہ ہوئے لیکن ننھے جوگندر پال کے دل میں یہ بات ایسی نقش ہوگئی کہ کچھ عرصہ بعد وہ از خود قادیان چلے آئے اور حضور کے ساتھ ملاقات میں عربی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ حضور نے فوراً ان کی تعلیم کا انتظام کر دیا اور ایک ہندو باورچی کی خدمات بھی فراہم کر دیں۔ اس بچے نے کچھ عرصے کے بعد برضا و رغبت احمدیت قبول کر لی اور اسی بچے کو مہاشہ محمد عمر کے نام سے جماعت احمدیہ کی انتہائی مقبول خدمت کی توفیق ملی۔ یوں ہی تو نہیں کہا تھا عبدالحمید شوق نے اِن کے بارے میں:

کھینچ لایا تجھ کو ہندو قوم سے
مذہب کا حسن و جمال
تیری جنوں انداز سے
کفر و باطل ہو گئے آشفتہ حال
تیری کوشش سے مسلماں ہو گئے
سینکڑوں ہندو مع اہل و عیال

مہاشہ محمد عمر ایک لمبا عرصہ انجمن کوارٹرز میں رہائش پذیر رہے اور اسی حوالے سے ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے تھے تاہم وہ ابا جی کے ملنے والوں میں سے اور ان کی اہلیہ امیر بیگم امی کی سہیلیوں میں سے تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا، محمد احمد تو نہ جانے کب سے انگلینڈ پدھار چکا تھا اور بیٹی ثریا بھی عرصہ پہلے بیاہ کر وہاں جا چکی تھیں۔ بعد

میں جب ان کے دونوں بیٹے، مہاشہ منیر احمد (جو میرے کلاس فیلو تھے) اور مہاشہ نصیر احمد بھی ترکِ وطن کر گئے تو امیر بیگم کے لیے پاکستان رہنے کا کوئی جواز باقی نہ رہ گیا کہ مہاشہ محمد عمر تو ۱۹۶۸ء میں انتقال کر چکے تھے۔

امیر بیگم ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر انگلینڈ سے تشریف لائیں تو انہوں نے کسی ذریعہ سے میرے ساتھ ملاقات کی خواہش مجھ تک پہنچائی۔ میں محلّہ دارالنصر میں ان کی قیام گاہ پر ان سے جا کر ملا اور پھر دیر ان کے پاس بیٹھ کر اکتسابِ فیض کرتا رہا۔ افسوس! یہ میری ان سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

چوہدری مظفر الدین بنگالی دیوگرام ضلع کومیلا کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کیا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں احمدیت کی نعمت سے سرفراز فرما دیا اور ابھی ایل ایل بی میں تھے کہ زندگی وقف کرنے کی توفیق پائی۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ارشاد پر قادیان پہنچ کر مربیان کلاس میں داخلہ لے لیا اور اپنی عملی زندگی کا آغاز متحدہ بنگال میں مربی کے طور پر کیا۔

قیام پاکستان کے بعد انہیں مشرقی پاکستان میں مربی، حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے پرائیویٹ سیکرٹری، ایڈیٹر Review of Religions اور نائب ناظر بیت المال کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ انہیں قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ وتفسیر میں ملک غلام فرید کی معاونت کا شرف حاصل رہا اور قرآن کریم کے بنگلہ ترجمہ وتفسیر کے حوالے سے بھی قابل قدر خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔

وہ ماسٹر عبدالرحمٰن خان بنگالی مدرّس تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کے ہمزلف تھے اور ان کی اہلیہ، رشیدہ بیگم حضرت سردار کرم داد خاں کی صاحبزادی تھیں۔ اس کتاب میں کسی اور جگہ بھی یہ ذکر موجود ہے کہ سردار صاحب کے والد، حضرت میاں خداداد رسالیدار جوگھوگھیاٹ ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے نے میرے دادا، حضرت مولوی فخر الدین کے ذریعہ احمدیت قبول کی تھی چنانچہ اباجی اور سردار کرم داد خان کے درمیان انتہائی برادرانہ تعلقات تھے۔ اسی ناطے اباجی اور بیگم چوہدری مظفر الدین بنگالی کے درمیان سگے بہن بھائیوں سا احترام کا رشتہ موجود تھا۔ مجھے اباجی کا ملاقات کے لیے ان کے گھر جانا اور بیگم چوہدری مظفر الدین بنگالی کا ہمارے گھر آتے جاتے رہنا آج بھی یاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چوہدری مظفر الدین بنگالی کو چار بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نواز رکھا تھا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے، منصور احمد بنگالی ابتدا سے میرے ہم جماعت تھے تاہم میٹرک میں ہمارا ساتھ چھوٹ گیا۔ ایک بار مجھے تو انہوں نے بتایا کہ وہ لاہور میں کراؤن بس کے اڈے پر ملازمت کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنا کاروبار شروع کیا لیکن کمزوری صحت کی بنا پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ربوہ آ گئے اور فضل عمر فاؤنڈیشن اور صدر انجمن احمدیہ کے مختلف دفاتر میں کام کرتے رہے۔ چند سال پہلے وفات پا چکے ہیں۔

عبدالرحمٰن شاکر نامور احمدی شاعر، چوہدری نعمت اللہ خان گوہر لدھیانوی کے صاحبزادے اور بی بی صاحب کے بھتیجے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں قادیان میں پیدا ہوئے تو ان کا نام عزیز اللہ رکھا گیا تھا لیکن مسلسل بیمار رہتے تھے۔ تب ان کی والدہ ایک بار انہیں حضرت مسیح موعود کے پاس بغرضِ دعا لے گئیں تو حضور نے ان کا نام دریافت فرمایا اور پھر خود ہی اسے بدل کر عبدالرحمٰن رکھ دیا۔

میں نے سن تو رکھا تھا کہ عبدالرحمٰن شاکر ابتدائے ربوہ میں خلافت لائبریری کے انچارج تھے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس لائبریری کے قیام میں انہیں کس قدر محنت سے کام کرنا پڑا۔ یہ تو اللہ بھلا کرے ان کے سب سے بڑے بیٹے سلیم خالد مقیم واہ کینٹ کا جنہوں نے مجھے بتایا: والد صاحب نے ''صادق لائبریری سے خلافت لائبریری تک'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ رکھا ہے جو کسی جگہ شائع نہیں ہو سکا۔ اس کی نقل آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ جیسے چاہیں استعمال کر لیں۔''

یوں تو اس مضمون میں فاضل مضمون نگار کی بعض ذاتی اور ذوقی باتیں بھی موجود ہیں اور تقسیمِ ہندوستان سے پہلے اس لائبریری کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے لیکن اس میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کا اس لائبریری کے علاوہ ربوہ کی تاریخ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ مضمون چھپ کر بہت سے قارئین کی توجہ حاصل کرے گا۔

عبدالرحمٰن شاکر کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی علم دوستی ہے چنانچہ ان کے متعدد معلوماتی و تحقیقی مضامین سلسلہ کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ خدا جزائے خیر دے ان کے بیٹے، کلیم احمد کِم اور ان کی بیٹی، ربقہ زاہدہ کو جنہوں نے ان میں سے بہت سے مضامین یکجا کر کے ''مضامینِ شاکر'' کے نام سے شائع کر دیئے ہیں۔ اکثر مضامین انتہائی فکر انگیز اور دلچسپ ہیں۔

یہ بات میرے علم میں نہ تھی کہ موصوف شاعر بھی تھے۔ سلیم خالد بتاتے ہیں: ''وہ ہجو گوئی کی طرف مائل تھے لیکن ہماری جماعت میں تو شاعری کی اس صنف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ایک بار سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ نے بحیثیت ناظر امورِ عامہ انہیں اس کام سے ٹوک دیا۔ بس پھر کیا تھا وہ ہمیشہ کے لیے اس سے تائب ہو گئے۔''

سلیم خالد اپنے والدِ بزرگوار کو یاد کرتے ہوئے بعض اوقات آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ''وہ شخص بہت ہی بدقسمت ہوگا جسے اپنے والدین سے پیار نہ ہو اور یہ اللہ کا کرم ہے کہ میں ان لوگوں میں شامل نہیں ہوں۔ مجھے ان کی بعض خوبیاں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے بسا اوقات ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور وہ کہتے کہ جن برگزیدہ ہستیوں کی جوتیوں کے صدقے ہم دنیا جہان کی نعمتوں سے سرفراز ہو رہے ہیں وہ خود تو پیٹ پر پتھر باندھ کر یا روٹی کے بچے کھچے ٹکڑوں پر گذارا کیا کرتی تھیں لہٰذا ہمیں سوچتے رہنا چاہئے کہ کیا ہم اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے شکرانے کا حق ادا کر رہے ہیں۔''

وہ مزید بتاتے ہیں ''ہمارا کنبہ خاصا بڑا تھا۔ بعض اوقات گھر میں والدہ محترمہ کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ ہوتا تو وہ گھبرا جاتیں۔ ایسے میں میرے والد بزرگوار ان کی طرف اپنا دستِ تعاون بڑھاتے اور گھریلو کام کاج کو اپنی مردانگی کے خلاف نہ سمجھتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نبیوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم امورِ خانہ داری میں امہات المومنین کا ہاتھ بٹا سکتے تھے تو مجھ ایسے گنہ گار کی کیا اوقات ہے کہ میں آپ کے اسوہ پر عمل نہ کروں۔''

''ہماری بہن ثمینہ وفات پا کر قطعہ شہدا میں دفن ہوئیں'' سلیم خالد مزید بتاتے ہیں ''ابا جی جب کبھی دعا کے لیے قبرستان جاتے تو سب سے پہلے بہشتی مقبرہ کے قطعہ خاص میں حضرت اماں جان، حضرت مصلح موعود اور دیگر بزرگان کی قبور پر دعا کرتے، پھر اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دیتے اور آخر میں ثمینہ کی قبر پر جاتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ حفظِ مراتب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ باوجودیکہ ثمینہ انہیں بہت عزیز تھی انہوں نے اس معاملہ میں ہمیشہ

بزرگان کو فوقیت دی۔''

سلیم خالد کے ایک بھائی، شمیم احمد کرشن ابتدا سے میرے کلاس فیلو تھے لیکن مدت سے ان کا پتہ ہی نہ تھا۔ سلیم خالد نے یہ ذکر کر کے کہ وہ آج کل لاہور ہی میں ہیں ان سے شوقِ ملاقات کو مہمیز لیا۔ ہم نصف صدی کے بعد گفتگو کر رہے تھے لیکن محسوس یوں ہو رہا تھا گویا ہمارا رابطہ کبھی ٹوٹا ہی نہ ہو۔ وہ اپنے بارے میں بتا رہے تھے: ''میں نے پاک سویڈش انسٹی ٹیوٹ سے مکینکل ٹریڈ میں ڈپلومہ لینے کے بعد بی اے کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا اور پوسٹل لائف انشورنس میں ملازم ہو گیا۔ میں یہاں سے بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریٹائر ہوا تاہم بیچ میں کئی سال سعودی عرب میں بھی گزار آیا۔ اب میں علامہ اقبال ٹاؤن میں ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے ہر طرح سے مطمئن ہوں۔''

میں نے جب سے ہوش سنبھالا سادہ اور منکسر المزاج سے مختار ہاشمی کو نظارتِ خدمتِ درویشان ہی میں پایا۔ میرے دل میں ان کے احترام کی کئی وجوہات تھیں: یہ کہ وہ سلسلہ کے ایک مخلص کارکن ہیں اور انتھک محنت ان کا شعار ہے۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ جب ہنگامی نوعیت کا کوئی کام آ جاتا تو پھر مختار ہاشمی دن دیکھتے نہ رات اور دفتر ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے۔ ان کے کئی بچے تھے لیکن میں تو صرف دو ہی کو ڈھنگ سے پہچانتا ہوں۔ دلدار جو سکول میں میرے کلاس فیلو تھے اور گلزار جو دلدار سے چھوٹے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ نمازوں میں اور اطفال و خدام کے اجلاسات میں اکثر ملاقات رہتی تھی۔

مجھے اب یاد نہیں کہ میرا اور دلدار کا ساتھ کب چھوٹا تاہم یہ ضرور یاد ہے کہ بعد میں دلدار نے صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت اختیار کر لی اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ سنا ہے اب انگلینڈ منتقل ہو گئے ہیں۔

مختار ہاشمی کی وفات پر جو ۸ فروری ۱۹۸۷ء کو ہوئی ضمیمہ ماہنامہ انصار اللہ ربوہ میں چھپنے والی خبر سے اندازہ ہوا کہ انہیں جماعت کے جن نامور بزرگان کے ماتحت کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ان میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد، حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، سیّد میر داؤد احمد اور صاحبزادہ مرزا عزیز احمد شامل ہیں۔ ان کے آخری نگران مرزا خورشید احمد تھے جن کا یہ سرٹیفکیٹ مرحوم کے لیے باعثِ صد اعزاز ہے کہ وہ ''نہایت محنتی، ذمہ دار، فرض شناس اور زیرک کارکن تھے۔''

اسی خبر سے پتا چلا کہ انہیں صدر انجمن احمدیہ کے قواعد و ضوابط پر خاص دسترس حاصل تھی اور یہ ان کی ایک منفرد صلاحیت تھی۔

ربوہ میں وقتاً فوقتاً جو لوگ ہمارے پڑوس میں رہے ان میں سے ایک مولوی نصیر احمد ناصر بھی تھے جو مربی سلسلہ تھے اور اپنی ڈیوٹی کے سلسلہ میں بالعموم ربوہ سے باہر رہتے۔ ان کے والد جنہیں گھر کے سب چھوٹے بڑے ''میاں جی'' کہتے تھے مستقل طور پر ان ہی کے پاس مقیم تھے۔ وہ طبِ یونانی سے دلچسپی رکھتے تھے اور ہمہ وقت ہاون دستہ میں بعض مفردات کوٹتے رہتے۔ ہاون دستے کی آواز سے پتا چلتا رہتا کہ وہ گھر میں موجود ہیں اور مصروفِ کار بھی۔

ان کی سب سے بڑی بیٹی سعیدہ تھیں جنہیں گھر میں پیار سے ''بلّی'' کہا جاتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے قدرے چھوٹی تھیں اور ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے دور سے ان کی طرف ایک پتھر پھینکا تو وہ ان کے سر پر جا

لگا۔ضرب کافی شدید تھی۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا اور میرا مقصد انہیں تکلیف پہنچانا ہرگز نہ تھا لہٰذا میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچا۔ اتنی دیر میں وہ درد کے مارے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی اور اٹھا کر کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ان کا سر پھٹ چکا ہے اور خون بہہ رہا ہے لیکن خدا کا شکر ہے زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں سعیدہ کو ان کے گھر پہنچا کر واپس آ گیا۔ اب یاد نہیں کہ ان دنوں مولوی نصیر احمد ربوہ میں موجود تھے یا نہیں لیکن میں سعیدہ کے والدین سے چھپتا پھر رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ابا جی یا امی کے پاس ضرور میری شکایت کریں گے اور ان کی طرف سے میری سخت فہمائش ہوگی لیکن خدا کا شکر ہے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دراصل ربوہ کا وہ ماحول بہت مختلف تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے سے اجتناب کرتے تھے اور بالعموم ایسی کوئی حرکت نہ کرتے جو کسی دوسرے کی دل شکنی کا باعث ہو۔ آج کے حالات میں تو اس قسم کی باتوں پر شدید ترین ردعمل کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن سعیدہ کے والدین نے بہت صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا اور کسی منفی ردعمل کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

بعد میں مولوی نصیر احمد نے ربوہ کی رہائش ترک کر دی۔ پھر وہ جماعت سے بھی دور ہو گئے۔ بہت مدت کے بعد ان سے ایک بار اچانک ملاقات ہوگئی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی اسلام آباد میں مقیم ہیں، سعیدہ نے ایم بی بی ایس کر لیا ہے اور ان کی شادی رحمٰن ملک سے ہوگئی ہے۔ یہ وہی رحمٰن ملک ہیں جو بے نظیر بھٹو کے قریبی اور معتمد ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ بے نظیر حکومت ختم ہونے کے بعد وہ انگلینڈ چلے گئے اور کئی سال تک وہاں مقیم رہے۔ پرویز مشرف کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد پی پی کی حکومت بنی تو رحمٰن ملک پہلے مشیر داخلہ اور بعد میں وزیر داخلہ رہے۔

مجھے حال ہی میں ٹی وی چینل پر چلنے والی دو مختلف پٹیوں سے معلوم ہوا ہے کہ مولوی نصیر احمد ناصر اور ان کی اہلیہ، رضیہ بیگم مختصر وقفے سے یکے بعد دیگرے وفات پا گئے ہیں۔

جب مولوی نصیر احمد انجمن کوارٹرز چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو گئے تو کچھ عرصہ کے لیے سید منیر احمد باہری ہمارے پڑوس میں رہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ان کی پہلی اہلیہ وفات پا چکی تھیں اور اسی زمانے میں ان کی دوسری شادی ہوئی تھی۔ ان کی اہلیہ بشریٰ سید مقصود علی شاہ آف مانسہرہ کی صاحبزادی تھیں اور وہ خود اُن دنوں وقفِ جدید میں ناظم مال کے طور پر کام کر رہے تھے۔

اُس زمانے میں تو ہمارے تعلقات واجبی شناسائی سے آگے نہ بڑھے لیکن بعد میں ہونے والی ملاقاتوں کے دوران پتا چلا کہ وہ پرانے واقفینِ زندگی میں سے تھے اور تحریکِ جدید انجمن احمدیہ اور صدر انجمن احمدیہ کے ماتحت مختلف خدمات انجام دے چکے تھے۔

''آپ اپنے نام کے ساتھ باہری لکھتے ہیں۔ یہ لفظ ہمارے ماحول میں خاصا غیر مانوس سا ہے'' ایک بار میں نے ان سے پوچھا ''اس سے کیا مراد ہے؟''

''میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے سید ہوں'' انہوں نے جواباً کہا ''اور حضرت سید زین العابدین کے صاحبزادے، حضرت عبداللہ الباہر کی نسل میں سے ہوں۔ ان لوگوں نے پہلے مصر میں باہرہ نام کی ایک بستی بسائی لیکن جب عثمانی مصر پر قابض ہو گئے تو یہ لوگ اکبر اعظم کے دور میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے۔ اکبر نے ان کا

جہانگیر کے حفاظتی دستہ میں تقرر کر دیا اور گذارے کے لیے پتھر بنا کر ملا لی: اس کا نام انہوں نے ''باہرہ'' رکھ دیا۔
آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نسباً بھی باہری ہوں اور بہ اعتبار سکونت بھی باہری۔''

''باہرہ ہے کہاں؟''

''میں نے یہ گاؤں خود دیکھا ہے۔ بھٹنڈہ سے دہلی جائیں تو راستے میں سفیدون نامی ایک سٹیشن تھا۔ اب تو حالات شاید بدل گئے ہوں، اس زمانے میں سفیدون سے پکی سڑک باہرہ کو جاتی تھی۔''

منیر باہری نے کچھ عرصہ برما میں بطور مربی سلسلہ بھی کام کیا۔ وہ بتایا کرتے تھے ''اُن دنوں برما کی حکومت کی طرف سے مشنریوں کی آمد پر ایک طرح سے پابندی تھی اور عام حالات میں ویزا ملنا مشکل تھا لیکن حضرت مصلح موعود کی دعاؤں اور چوہدری ظفراللہ خاں کی کوشش سے مجھے تین ماہ کا ویزا جاری ہو گیا جس میں بعد میں وقتاً فوقتاً توسیع ہو جاتی رہی اور یوں مجھے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک قریباً چار سال وہاں خدمت کا موقع ملا۔'' برما میں میری تعیناتی کا قصہ بھی عجیب ہے۔''

وہ اس دور کے کئی ایمان افروز واقعات سناتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا: ''رنگون میں میری اور خواجہ بشیر احمد، جنرل سیکرٹری جماعت احمدیہ رنگون کی رہائش ایک ہی فلیٹ میں تھی۔ اس بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر ایک نئی فیملی آئی تو انہوں نے اپنے گھر میں قرآن کریم کا ختم کرایا جس میں ہم دونوں بھی مدعو تھے۔ اگرچہ ہم ایسی تقریبات سے بالعموم احتراز کرتے تھے لیکن ہم نے یہ سوچ کر ان کی دعوت قبول کر لی کہ اس طرح ہمارا کچھ نئے لوگوں سے رابطہ ہو جائے گا۔ وہاں پہنچے تو جامع مسجد کے امام اپنے ساتھیوں سمیت تشریف فرما تھے۔ انہوں نے قرآنِ پاک کی مختلف آیات کی تلاوت کی اور پندرہ بیس منٹ کے بعد دعا کرا دی۔ وہ بلند آواز میں دعائیں مانگ رہے تھے جن میں سے ایک دعا یہ بھی تھی کہ خداوندا! یہاں جو قرآن ختم کیا گیا ہے اس کا ثواب گھر والوں کو پہنچے۔ سب لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھے لیکن ہم الگ تھلگ بیٹھے رہے۔ بعد میں اہلِ خانہ میں سے کسی نے ہم سے پوچھا کہ ہم دعا میں شامل کیوں نہیں ہوئے تو میں نے اسے بتایا کہ یہاں قرآنِ پاک تو ختم ہوا ہی نہیں جب کہ دعا اس کا ثواب گھر والوں کو پہنچانے کی مانگی جا رہی ہے۔ ہمیں تو یہ بات صریح جھوٹ لگی لہٰذا ہم دعا میں شامل نہیں ہوئے۔

اس بات کا اہلِ خانہ پر اچھا اثر پڑا اور دوسرے دن ان کے تینوں بیٹے میرے پاس آ گئے۔ ان سے جماعت کا تعارف کرایا گیا تو وہ بیعت فارم پُر کرنے پر تیار ہو گئے تاہم ان کا کہنا تھا کہ چونکہ کاروبار ان کے والد کے ہاتھ میں ہے لہٰذا جب تک وہ احمدی نہیں ہوں گے وہ خود بھی احمدیت قبول نہ کر پائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے بڑے داماد کا ان پر بہت اثر ہے اس لیے اگر کسی طرح وہ احمدی ہو جائیں تو ان کے والد کا احمدی ہو جانا تقریباً یقینی امر ہے۔ میں نے تعجب ظاہر کیا کہ ان کے والد بیٹوں کی بات نہیں مانتے تو کیا داماد کی مان لیں گے؟ تب انہوں نے بتایا کہ ان کا بہنوئی بہت نیک اور عبادت گذار ہے اس لیے وہ اس کی بات کبھی رد نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ واقعی نیک ہے تو اسے ہمارے پاس لے آؤ، وہ ضرور احمدی ہو جائے گا چنانچہ وہ اسے میرے پاس لے آئے۔ پہلے دن وفاتِ مسیح پر گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن آیا تو آتے ہی کہنے لگا: اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟

کہنے لگا: رات کو میں نے خواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی میت دیکھی اور جنازہ پڑھا یا۔ یوں وفاتِ مسیح ثابت ہو گئی۔

اس روز نبوت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا: آپ بتائیں کہ آپ جو عبادات بجالاتے ہیں اور چلے کاٹتے ہیں ان کا مقصد کیا ہے؟

کہنے لگا: قربِ الٰہی کا حصول۔

میں نے کہا: مولا کریم آپ کو مقرب بنانا چاہے تو کیا آپ اس کام میں روک پیدا کر سکتے ہیں؟

کہنے لگا: ہرگز نہیں۔

میں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں خدمتِ دین کے لیے مسیح موعود کو مامور فرمایا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کہ اس کا انکار کریں بلکہ ہمیں تو ان کے ساتھ مل کر دین کی خدمت کرنی چاہیے۔

اسے یہ بات پسند آئی چنانچہ اس نے اگلا جمعہ ہمارے ساتھ پڑھا اور بیعت کے لیے اصرار کرنے لگا۔ میں نے کہا اتنی عجلت سے کام نہ لو۔ تم فی الحال اپنے خاندان میں اس ارادہ کا اعلان کرو تو تمہاری مخالفت شروع ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ صورتِ حال کا بنظرِ غائر جائزہ لینے کے بعد تم فیصلہ کرو کہ کیا تم یہ سب کچھ مستقل بنیادوں پر برداشت کر سکتے ہو؟ بہر حال چند دن کے بعد اس نے بیعت کر لی۔

ان نوجوانوں کی والدہ ایک نام نہاد پیر کے پاس جایا کرتی تھی۔ پیر کو کسی نے بتا دیا تھا کہ اس خاتون کے بچے احمدی ہو گئے ہیں اور یہ خود بھی احمدیت کی طرف مائل ہے۔ پیر نے اسے اپنے راستہ پر لگانے کے لیے لالچ دیا کہ وہ اسے ایک پروانہ لکھ دے گا جس سے وہ سیدھی جنت میں چلی جائے گی۔ جب اس نے یہ بات اپنے بیٹوں کے سامنے بیان کی تو وہ اس سے الجھنے لگے کہ وہ ایسے دھوکے باز کے پاس جاتی کیوں ہیں۔ کیا یہ پیر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ کر ہے؟ اگر آپ نے اپنی بیٹی کو ایسا کوئی پروانہ لکھ کر نہیں دیا بلکہ بار بار فرمایا ہے کہ ان کے نیک اعمال ہی انہیں جنت میں لے جا سکتے ہیں تو یہ پیر کس باغ کی مولی ہے جو راہ جاتے لوگوں کو جنت کے پروانے بانٹتا پھرے۔

اُس دن سے ماں نے اس پیر کے پاس جانا چھوڑ دیا اور احمدیت کی طرف راغب ہونے لگی۔

ایک دن لڑکوں کے باپ نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ کوئی معجزہ ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا معجزہ تو آپ کے گھر میں ہو چکا ہے۔ احادیث میں ہے کہ مہدی کے زمانہ میں گونگے باتیں کرنے لگیں گے۔ تم ذرا اپنے بیٹوں کی طرف دیکھو! انہیں کوئی بات کرنا نہیں آتی تھی لیکن اب احمدیت کے صدقے وہ ہر ایک کو لاجواب کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد ان نوجوانوں کی والدہ اور والد دونوں نے احمدیت قبول کر لی۔''

منیر باہری سے میری آخری ملاقات سال سوا سال پہلے ان کے ناصر آباد والے مکان میں ہوئی تھی۔ وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے اور تنہا زندگی گذار رہے تھے۔ ہاں! ان کا ایک بیٹا امریکہ سے آیا ہوا تھا لہٰذا وہ کچھ خوش

نظر آ رہے تھے۔

حال ہی میں کسی نے مجھے ان کی وفات کی اطلاع دی تو میں دل مسوس کر رہ گیا اور بے اختیار میرے ہاتھ ان کی دعائے مغفرت کے لیے اُٹھ گئے۔

مسعود احمد عاطف جو میاں عبدالرحیم مالیر کوٹلوی کے بیٹے اور تعلیم الاسلام کالج میں فزکس کے استاد تھے دس بارہ سال کا طویل عرصہ ہمارے پڑوس یعنی ۳۳ ۔ انجمن کوارٹرز میں مقیم رہے۔ ان کی اہلیہ رضیہ درد جو عبدالرحیم درد کی صاحبزادی اور اُن کی خالہ زاد تھیں جامعہ نصرت میں پڑھاتی تھیں۔ وہ لجنہ اماء اللہ کی سرگرم رُکن اور ایک اچھی مقررہ بھی تھیں۔

یہاں اس امر کا ذکر شاید بے جا نہ ہو کہ مسعود عاطف کے والد مقیم تو کسی اور جگہ پر تھے لیکن گاہے بگاہے ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔ سُنا جاتا تھا کہ وہ حضرت مسیح موعود کی حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں جب کہ ان کی عمر صرف تیرہ یا چودہ برس تھی قادیان گئے اور حضور سے بیعت لینے کی استدعا کی جو اُن کی کم عمری کی وجہ سے قبول نہ ہوئی تاہم وہ حضور کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اسی دوران حضور کا وصال ہو گیا چنانچہ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ نے مسعود عاطف کو ایک بیٹی اور دو بیٹوں سے نواز رکھا تھا لیکن میرے ذہن میں ان کی بیٹی ثمینہ کی تو تصویر گویا نقش ہے۔ یہ خوبصورت سی بچی میرے سامنے پلی بڑھی۔ ایم اے عربی کرنے کے بعد اس کی شادی ماریشس کے ایک نوجوان ڈاکٹر فضل محمود بھنوں سے ہوئی جو ماشاء اللہ واقفِ زندگی ہیں اور ان دنوں برکینا فاسو میں جماعت کے کسی ہسپتال میں کام کر رہے ہیں۔

مسعود عاطف ایک طویل عرصہ ہمارے پڑوس میں رہے تاہم مجھے یاد نہیں کہ ان کے طرزِ عمل سے ہمیں کبھی کسی قسم کی کوئی پریشانی اٹھانا پڑی ہو۔ فی الحقیقت ان کا ساتھ ہمارے لیے باعثِ رحمت ہی رہا۔ میں کس طرح بھول سکتا ہوں کہ میری تینوں بہنوں کی شادیاں انجمن کوارٹرز میں قیام کے دوران ہوئیں اور ان مواقع پر دعائیہ تقریب کے لیے ان ہی کا صحن مستعار لیا جاتا رہا۔ وہ انتہائی خندہ پیشانی سے ہماری یہ ضرورت پوری کرتے رہے۔ اسی طرح ابا جی کے انتقال کے موقع پر بھی ہمیں ان کی طرف سے بھرپور تعاون حاصل رہا۔ خدا انہیں ان کی نیکیوں کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

انہوں نے بعد میں محلّہ دارالعلوم میں اپنا مکان تعمیر کر لیا اور وہاں منتقل ہو گئے لیکن ہمارا رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔ وہ جب تک صحتمند رہے بائیسکل پر ادھر اُدھر آتے جاتے کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتے اور جب ملتے تو اس اپنائیت کے ساتھ کہ بیتے ہوئے وقت کی یاد تازہ ہو جاتی۔

انہیں عرصہ سے ذیابیطس کا مرض لاحق تھا جس نے ان کی آنکھوں کو بُری طرح متاثر کیا اور ان کی بینائی جاتی رہی۔ وہ اسی بیماری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے ۱۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کو وفات پا کر مقبرۂ بہشتی میں دفن ہوئے۔

ان کی وفات کے بعد رضیہ درد نے ایک بار مجھے بتایا: ''جس گھر میں میاں بیوی دونوں ملازمت کرتے ہوں

بچوں کا قدرے نظر انداز ہو جانا قدرتی امر ہے۔ایک بار مجھے چند دنوں کے لیے لاہور جانا پڑا اور میں چھوٹی سی ثمینہ کو اس کے ابو کے پاس چھوڑ گئی۔ پہلے تو میں عام طور پر صبح لاہور جا کر شام کے وقت گھر واپس لوٹ آیا کرتی تھی لیکن اب کے ایک دو روز گھر واپس نہ پہنچی تو ثمینہ ان سے پوچھنے لگی: ابو! امی اتنی دیر سے گھر واپس نہیں آئیں کہیں وہ فوت تو نہیں ہو گئیں؟ ثمینہ کے ابو یہ بات سن کر جذباتی ہو گئے اور اسی وقت ثمینہ کو مجھے ملانے کے لیے لاہور لے آئے۔ یہ موقع نہ صرف ثمینہ بلکہ میرے لیے بھی انتہائی مسرت کا تھا۔

ثمینہ کا یہ بیان مسعود عاطف کی شخصیت کے اُس پہلو کو خوب اُجاگر کرتا ہے جس کا تربیتِ اولاد سے گہرا تعلق ہے۔ ملاحظہ ہو اُن کی وفات کے ایک عرصہ بعد ان کے بارے میں چھپنے والے ثمینہ کے ایک مضمون کا یہ حصہ:

''انہوں نے کبھی ہم بہن بھائیوں کو اونچی آواز میں نہیں ڈانٹا تھا۔ ہمیشہ پیار، تحمل، محبت سے سمجھاتے کہ بات سمجھ میں آ جاتی۔ ہمیشہ کہتے کہ بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ بچوں سے پیار و محبت سے پیش آؤ۔ ان سے دوستی بنا کر رکھو تا کہ وہ بھی تمہارے دوست بن کر تمہارے قریب رہیں۔ اسی اصول پر قائم و دائم رہے۔ بچپن ایک حسین یاد ہے جو بھلائے نہیں بھولتی۔ رات کو ہمیشہ سبق آموز کہانیاں، بہادری اور سچ پر مبنی ضرور سناتے۔ جھوٹ سے شدید نفرت تھی۔ کبھی جھوٹی یا جادوگری وغیرہ کی کہانی نہ سناتے ...... ہمیشہ جائز بات مانتے۔ جو بات اچھی نہ ہو اس طرح سمجھاتے کہ بغیر ضد کے سمجھ آ جاتی۔ ہمیشہ آہستہ نرم لہجے میں بات کرتے ......''

مولوی عبدالعزیز بھامبڑی یوں تو نظارت امورِ عامہ میں محتسب کے عہدے پر فائز تھے اور ان کا نام ربوہ میں خوف و دہشت کی علامت تھا لیکن موصوف نے مجھے ہمیشہ بے پناہ محبت دی۔ ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر میرے ایک جاننے والے اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے کہ کسی نے انہیں مشکوک جان کر دفتر امور عامہ میں پہنچا دیا۔ مجھے اطلاع ہوئی تو میں مولوی صاحب سے جا کر ملا اور شہادت دی کہ ان دونوں کا ایک ساتھ گھومنا کسی قانون، شریعت یا ضابطہ اخلاق کی زد میں نہیں آتا۔ شکر ہے انہوں نے میری شہادت پر اعتماد کرتے ہوئے ان دونوں کے خلاف مزید کارروائی کا خیال ترک کر دیا۔

اللہ نے انہیں خوش الحانی کی نعمت سے نواز رکھا تھا جس کا اظہار بعض جماعتی اجتماعات پر ان کی طرف سے قرآن کریم کی تلاوت یا نظم خوانی کی صورت میں ہوتا رہتا تھا۔

اُن کی وفات پر الفضل نے اُن کی بہت سی خوبیوں اور جماعتی خدمات کا اختصار کے ساتھ احاطہ کرتے ہوئے گویا دریا کوزے میں بند کر دیا تھا: ''آپ کو تین دفعہ اسیرِ راہِ مولیٰ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ پہلی مرتبہ قیامِ پاکستان کے وقت اسیر رہے، دوسری مرتبہ ۱۹۷۴ء میں اور تیسری مرتبہ ۱۹۸۴ء میں ...... اس دوران آپ نے متعدد مشکلات کا خداتعالیٰ کی خاطر صبر و تحمل سے سامنا کیا۔ آپ بہت دلیر اور غیر معمولی فراست کے مالک تھے۔ آپ نے جوانمردی اور اخلاص سے کام لیا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملے کی تہ تک آسانی سے پہنچ جاتے۔ خلافت سے آپ کی وابستگی مثالی تھی۔ فرمانبردار اور سلسلہ کے لیے غیرت رکھنے والے تھے ... آپ ورزشی اور مضبوط جسم کے مالک تھے اور کلائی پکڑنے کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔''

شیخ کظیم الرحمٰن حضرت مسیح موعود کے ایک رفیق کے صاحبزادے اور دوسرے کے داماد تھے جب کہ انہیں خود بھی حضور کی نماز جنازہ میں شمولیت کا اعزاز حاصل تھا۔ ان کا جسم خاصہ فربہ تھا، وہ ہمیشہ اچکن پہنتے اور سر پر رومی ٹوپی رکھتے۔ میرا ان سے تو براہِ راست کبھی واسطہ نہیں پڑا البتہ ان کے چھوٹے بھائی، شیخ خلیل الرحمٰن اور ان کے ایک بھتیجے، شیخ عبدالوہاب سے گہرا تعلق رہا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمام بزرگان سلسلہ کے ایک فدائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

مولوی قمرالدین جنہیں عام طور پر مولوی قمر دین کے نام سے پہچانا جاتا تھا حضرت مسیح موعود کے تین صد تیرہ رفقا میں سے ایک، میاں خیرالدین سیکھوانی کے صاحبزادے اور مولانا جلال الدین شمس کے چچازاد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری وجاہت سے بھی نواز رکھا تھا۔ ان کی رنگت تو ماشاء اللہ صاف تھی ہی وہ ہمیشہ سفید بُراق لباس زیب تن کرتے۔ کم از کم میں نے اس لباس پر کسی قسم کا کوئی داغ نہیں دیکھا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جس طرح ان کا لباس بے داغ ہوتا اسی طرح ان کی شخصیت بھی ہر داغ سے مبرا رہی۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی نے کبھی تفننِ طبع کے طور پر ہی ان کے بارے میں کوئی منفی بات کی ہو۔

جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے مجلس خدام الاحمدیہ کی بنیاد رکھی تو مولوی قمرالدین کو اس کا پہلا صدر مقرر فرمایا۔ یہ حضور کی طرف سے ان کی تنظیمی صلاحیتوں پر اعتماد کا اظہار تھا جس پر وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے پورا اترے۔

میں نے ان کے جن بچوں کو اپنے سامنے پلتا بڑھتا دیکھا ہے ان میں نعیم، صفی اور بشیر شامل ہیں۔ نعیم جنہیں عرفِ عام میں ''نعیم پاگل'' کہا جاتا ہے ان میں سب سے بڑے ہیں اور شیر خواری کے زمانہ میں یرقان اور پھر بخار میں مبتلا ہو کر اپنی بہت سی ذہنی صلاحیتیں کھو بیٹھے لیکن خدا کا شکر ہے وہ دوسروں کی زندگی اجیرن نہیں کرتے۔ وہ اب بھی کسی نہ کسی گلی کی نکڑ پر بیٹھے نظر آ جاتے ہیں لیکن کسی سے کوئی توقع کئے بغیر اپنی ہی دُھن میں مست رہتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر شاید بے جا نہ ہو کہ نعیم اور ان جیسے دوسرے احمدی دوستوں کی کفالت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خلیفہ وقت کی رہنمائی میں نظامِ جماعت خود کر رہا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے معذوروں کی تمام جائز ضرورتیں بطریقِ احسن پوری ہوتی رہیں۔ سید قاسم شاہ راوی ہیں کہ ''ایک بار نعیم نے اپنے وظیفے میں اضافے کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی خدمت میں ایک درخواست لکھ کر لندن بھجوانے کے لیے ربوہ کے پرائیویٹ سیکرٹری آفس میں دی۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے حضور کی سٹینڈنگ انسٹرکشنز کے مطابق صدر انجمن احمدیہ کے متعلقہ شعبہ جات سے رپورٹ حاصل کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نعیم کو ملنے والا وظیفہ اس کی ضروریات کے لیے کافی ہے اور فی الحال اس میں اضافے کی ضرورت نہیں۔ حضور جو نعیم جیسے بے وسیلہ و بے سہارا افراد کے لیے اپنے دل میں خصوصی شفقت رکھتے تھے اس رپورٹ سے کیسے اتفاق کر سکتے تھے چنانچہ آپ نے نعیم کے وظیفہ میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا۔''

اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ نعیم کے چھوٹے بھائی، صفی انسپکٹر بیت المال تھے۔ سنتے ہیں کہ سات سمندر پار کسی ملک کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا ہے جب کہ بشیر وفات پا چکے ہیں۔

کھاریاں سے تعلق رکھنے والے محمد رفیع نظارتِ امور عامہ میں مدد گار کارکن تھے۔ وہ سلطان محمود انور ناظر رشتہ ناطہ صدر انجمن احمدیہ کے ماموں زاد اور رفیض احمد گجراتی، ناظر بیت المال (آمد)، صدر انجمن احمدیہ قادیان کے برادرِ نسبتی تھے۔ کسی وقت فوج میں تھے تاہم وہاں سے فراغت کے بعد ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ربوہ منتقل ہوگئے۔ پہلے محلّہ دارالعلوم میں رہائش پذیر رہے لیکن بعد میں انجمن کوارٹرز میں آ گئے اور تادمِ آخر یہیں رہے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ اُن کے بچے پڑھ لکھ کر معاشرے کے لیے مفید وجود ثابت ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش اس طرح پوری فرمادی کہ ان کی تینوں بیٹیوں یعنی ثمینہ، روبینہ اور روزینہ نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ ثمینہ آج کل نصرت گرلز ہائی سکول ربوہ کی ہیڈ مسٹریس ہیں جب کہ بیٹا، مبارک احمد بدقسمتی سے پڑھ نہ سکا لیکن اس نے ڈرائیوری سیکھ لی اور اب انگلستان منتقل ہو چکا ہے۔

محمد رفیع کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اُن کی صلہ رحمی ہے۔ ان کی بڑی بہن عائشہ جو فیض احمد گجراتی کے عقد میں آئی تھیں اپنی ایک نومولود بیٹی، راشدہ کو پیچھے چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ رفیع نے اس بچی کو اپنی کفالت میں لے لیا اور اسے پال پوس کر جوان کیا تاہم جب اس کی نانی یعنی والدہ محمد رفیع کا بھی انتقال ہو گیا اور ان کے لیے اسے اکیلے سنبھالنا مشکل ہو گیا تو ۱۹۶۳ء میں اسے اس کے والد کے پاس قادیان بھجوادیا۔ راشدہ آج کل امریکہ کے شہر شکاگو میں اپنے بچوں کے ہمراہ مقیم ہیں اور یہ بات انہوں نے خود مجھے بتائی تھی: ''مجھے تو اپنی امی کی شکل بھی یاد نہیں۔ میری نانی نے میری ماں بن کر مجھے پالا اور ماموں رفیع نے مجھے باپ کا پیار دیا۔ انہوں نے میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا اور میری تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ انہوں نے ہی مجھے قرآن کریم پڑھایا اور دین کے بنیادی مسائل سکھائے۔ ماموں مجھے دعاؤں کی کتابیں لا کر دیا کرتے تھے اور میں نے ان ہی کی توجہ سے یہ سب دعائیں یاد کیں۔ ایک بار وہ مجھے خاص طور پر ربوہ کے جلسہ سالانہ پر لے کر گئے۔ اس موقع پر انہوں نے مجھے نئے کپڑے سلوا کر دیئے اور بہت چاؤ کے ساتھ ربوہ دکھایا۔ ان کی آمدنی بہت محدود تھی اس لیے ان کی شادی میں غیر ضروری تاخیر ہوئی تاہم میں سمجھتی ہوں کہ اس کا ایک سبب میری وجہ سے ان پر پڑنے والا مالی بوجھ بھی تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں ان کی آپا کی نشانی ہوں۔ وہ مجھے خوش دیکھ کر خوش ہوتے اور میری ذراسی پریشانی پر رنجیدہ ہو جاتے۔ اگر کبھی میری نانی اماں کی طبیعت ٹھیک نہ ہوتی تو وہ خود میرے لیے ناشتہ بناتے اور اپنے ہاتھ سے مجھے کھانا کھلاتے۔ میں ایک بار ان سے ایسے ہی پوچھ بیٹھی کہ کیا ابھی امرود کا موسم شروع نہیں ہوا۔ انہوں نے میرے اس سوال سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میرا جی امرود کھانے کو چاہ رہا ہے لیکن اپنے منہ سے کچھ نہیں بولے۔ اس کے بعد جب میں تندور پر روٹیاں لگوانے کے لیے گئی تو ماموں امرود کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ میں ابھی تندور پر ہی تھی کہ وہ ایک لفافے میں تھوڑے سے امرود لے کر آ گئے۔ کتنے ہی سال اس بات کو بیت گئے ہیں لیکن مجھے ان کی محبت کی یہ باتیں کبھی نہیں بھولتیں اور میں ان کو یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتی ہوں۔''

ہمارے پڑوسیوں میں سے ایک چوہدری محمد ابراہیم وینس، کارکن نظارت بہشتی مقبرہ بھی تھے لیکن مجھے ان کے نام کے سوا اب کچھ بھی یاد نہیں۔ حال ہی میں ''مضامینِ شاکر'' کا پہلا حصہ میری نظر سے گذرا تو اس میں

ابراہیم ونیس کا بیان کردہ ایک عبرت آموز سچا واقعہ بھی تھا جو صرف موصوف کے ذکرِ خیر کے طور پر یہاں قدرے انتصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے:

جون ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ موضع بھامبڑی کا ایک غیر از جماعت شخص نواب دین جو راوی کے رشتہ داروں میں سے تھا ایک کام کے لیے ان کے گاؤں بھینی بانگر آیا اور ان کے ایک احمدی چچا چوہدری اللہ دین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ بھامبڑی کے لوگ تو مرزا صاحب کو صرف اسی صورت سچا مان سکتے ہیں اگر آج سے تین دن کے اندر میری موت واقع ہو جائے لیکن یہ موت بخار، درد یا قتلِ عمد کے نتیجے میں نہ ہو۔

چوہدری اللہ دین نے یہ بات سن کر کہا: ہاں! اللہ تعالیٰ چاہے تو ایسا ہو بھی سکتا ہے۔

اس گفتگو کے تیسرے دن ایک بارات بھامبڑی سے موضع تلونڈی جھنگلاں جا رہی تھی۔ راوی، اس کے والد چوہدری کرم دین اور مذکورہ نواب دین بھی اس بارات میں شامل تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بارات کا اکثر حصہ تو آگے نکل گیا لیکن یہ تینوں افراد ذرا پیچھے رہ گئے۔ جب یہ افراد قادیان سے گذر کر ناتھ پور پہنچے تو شمال مغرب کی طرف ایک غبار سا فضا میں پھیلنے لگا تاہم انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ جب وہ موضع رسول پور سے ذرا آگے پہنچے تو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ تینوں بیہوش ہو کر گر گئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے اپنے آپ کو زمین پر گرا ہوا پایا۔ اسی دوران راوی کو ایک خوفناک آواز آئی جس سے وہ اُٹھ بیٹھے لیکن انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ان کی آنکھوں کی بینائی ختم ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی آنکھوں کا نور واپس آنے لگا۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے والد زمین پر پڑے ہیں اور ان کی گھوڑی بھی زمین پر گری پڑی ہے۔ جب انہوں نے دوسری طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ نواب دین مذکور اوندھے منہ پڑا ہے، اس کے سینے میں گہرا گھاؤ ہے، زخم میں سے خون بہہ رہا ہے اور اس کے بدن کو آگ لگی ہوئی ہے۔ اور تو اور اس کی گھوڑی بھی آگ میں جل رہی ہے۔ راوی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ معاملہ آخر ہے کیا۔ اب وہ غبار جو شمال مغرب کی طرف دکھائی دے رہا تھا ان کے اوپر آ پہنچا اور چشمِ زدن میں بگولے کی صورت میں ان کے سروں پر سے گذر گیا۔ معاً بعد ژالہ باری شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں ژالہ باری رک گئی اور موسلا دھار بارش ہونے لگی جو متواتر تین گھنٹے تک جاری رہی۔ مغرب سے کچھ پہلے بادل چھٹ گئے اور مطلع صاف ہوگیا۔

اس وقت قریبی گاؤں رسول پور کے بعض سکھ ان کے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ ان تینوں پر آسمانی بجلی گری تھی۔ بجلی سے نواب دین تو اپنی مُنہ مانگی موت مر گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے دونوں احمدیوں کی زندگی معجزانہ طور پر بچالی۔

ابراہیم ونیس کے بعد کوارٹر نمبر ۳۱ جس دوست کو الاٹ ہوا ان کا نام رشید احمد ہے۔ وہ اُن دنوں بھی نظارت امور عامہ میں کام کرتے تھے اور آج بھی وہیں خدمت بجا لا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھی صحت کے ساتھ نواز رکھا ہے۔ پچھلے دنوں ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو خود پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ انجمن کے ساتھ ان کی ملازمت کا اُنسٹھواں سال ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو کم کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ چند سالوں بعد موصوف انجمن کے ایک اور کوارٹر میں منتقل ہو گئے حالانکہ وہ کوارٹر اس سے بھی چھوٹا تھا۔ میں

نے ایک بار وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا: اس کوارٹر میں بہت ہجوم ہو گیا تھا لہٰذا مجھے موقع ملا تو میں نے اپنے لیے ایک اور کوارٹر الاٹ کرالیا اور کوارٹر نمبر ۱۳ میرے ایک بھائی کو الاٹ ہو گیا۔''

آج کل موصوف محلّہ دارالعلوم میں اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہیں اور اپنے حالات پر مطمئن و مسرور ہیں۔

عبدالعزیز وینس مربی سلسلہ بھی ہمارے پڑوسیوں میں سے تھے۔ وہ قادیان کی ایک نواحی بستی، بھینی بانگر کے غلام قادر وینس کے صاحبزادے اور مذکورہ بالا ابراہیم وینس کی برادری میں سے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم قادیان اور قیام پاکستان کے بعد تحصیل میاں چنوں میں ہوئی۔ میٹرک کرنے کے بعد جامعہ احمدیہ میں داخل ہوئے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد ڈیرا اسماعیل خان، میانوالی، پشاور، لاہور، ملتان اور بعض دیگر مقامات پر تعینات رہے۔ انہیں سیرالیون، جزائر فجی اور یوگنڈا میں بھی ایک طویل عرصہ سلسلے کی خدمت کا موقع ملا۔

انہوں نے ۱۹۹۸ء میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے بھائی، ارشد ظفر کے پاس حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کا عبدالعزیز وینس کی اہلیہ کے نام ۸ جولائی ۱۹۹۵ء کا لکھا ہوا وہ خط موجود ہے جس میں حضور رقمطراز ہیں: ''آپ کے میاں کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے اور جنت کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ان کے حق میں دعائیں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری طرف سے غم کے اس موقع پر تمام عزیزوں کو دلی تعزیت کا پیغام پہنچائیں اور راضی برضا رہنے کی تلقین۔

بلانے والا ہے سب سے پیارا
اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

مرحوم جماعت کے دیرینہ خادم تھے اور اپنے کام میں بہت مخلص تھے۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔''

حافظ سلیم احمد اٹاوی سلسلہ کے ایک قدیمی خادم تھے۔ چھوٹی سی عمر میں خود احمدیت قبول کر کے مدرسہ احمدیہ میں داخل ہوئے اور مولوی فاضل کرنے کے بعد خدمتِ سلسلہ پر کمربستہ ہو گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے انہیں تفسیرِ کبیر کا پروف ریڈر مقرر کر دیا۔ سلیم شاہجہانپوری مصنف ''شعرائے احمدیت'' کے الفاظ میں:
''تفسیر کبیر کی پہلی جلد جو سورۃ یونس سے سورۃ کہف کی تفسیر پر مشتمل ہے اس کی تمام و کمال پروف ریڈنگ حافظ صاحب نے کی۔ اس کے بعد دفتر یسرنا القرآن میں پروف ریڈر مقرر رہے اور حضرت پیر منظور محمد صاحب کی معیت میں ...... قرآن شریف اور سیپاروں کی پروف ریڈنگ کرتے رہے اور یہ کام تقسیم برصغیر پاک و ہند تک جاری رہا۔ تقسیم ملک کے بعد آپ بھی ترک وطن کر کے پاکستان چلے آئے اور ربوہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔''

میں نے جس زمانے میں انہیں دیکھا وہ مولانا جلال الدین شمس کے گھر میں رہا کرتے تھے۔ سادہ وضع قطع کے آدمی تھے۔ ان کا قد چھوٹا، جسم دبلا اور رنگ گہرا گندمی تھا۔ وہ سر پر ٹوپی پہنتے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ کرتے کیا تھے لیکن میں نے انہیں بعض دفعہ قاضی محمد ظہور الدین اکمل کے لیے دارالضیافت سے کھانے لاتے دیکھا ہے۔ ایک بار جب وہ کھانا پہنچا کر گئے تو قاضی صاحب نے مجھ سے سوال کیا: ''تم اسے جانتے ہو؟'' مجھے ان کے نام کا تو علم تھا لیکن اس سے زیادہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میرے جواب پر انہوں نے کہا ''ان کے ظاہری حلیے

پرمت جانا، یہ بہت اچھے شاعر ہیں اور زٹلیات میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں۔''

مجھے کسی اور نے بتایا کہ جب گول بازار میں پانی کی ٹنکی تعمیر ہوئی تو انہوں نے اپنی باغ و بہار طبیعت کی رو میں بہہ کر اسی صنف میں کچھ اشعار کہے جو وہ اپنے مخصوص دوستوں کی محفل میں سناتے اور داد پاتے تھے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے سنجیدہ شاعری نہیں کی۔ قادیان کے زمانے کے الفضل میں ان کا کلام بکثرت چھپتا رہا ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

سلیم اٹاوی اباجی کے ملنے جلنے والوں میں سے تھے۔ مجھے اباجی کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں سے سلیم اٹاوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر ملی ہے جو انہوں نے غالباً اباجی کی فرمائش پر لکھ کر دی تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے بارے میں حضرت پیر منظور محمد کی ایک روایت ہے جو انہوں نے سلیم اٹاوی کے سامنے ان کے ایک سوال کے جواب میں بیان کی تھی۔ سلیم اٹاوی لکھتے ہیں:

''ایک دن میں نے پیر منظور محمد موجد قاعدہ یسّرنا القرآن سے پوچھا کہ ترکِ دنیا کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا کہ ترکِ دنیا کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کسی چیز سے دل نہ لگایا جائے، یہ مطلب نہیں کہ دنیا کا کاروبار نہ کیا جائے اور ہاتھ پاؤں توڑ کے انسان جنگل میں جا بیٹھے بلکہ اپنی ہر چیز کی خوب حفاظت و نگہداشت کرے، خواہ وہ چیز معمولی ہو یا قیمتی لیکن جب وہ چیز ہاتھ سے نکل جائے اور ضائع ہو جائے خواہ جاندار ہو یا غیر جاندار تو اس کو دل سے بالکل بُھلا دیا جائے اور اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا کوئی افسوس اور غم نہ کیا جائے جیسے کہ عام طور پر دنیا دار لوگ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پیر صاحب نے فرمایا کہ اس کی مثال حکیم الامت حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ جب آپ جموں اور کشمیر سے قادیان کے لیے روانہ ہوئے تو چلتے وقت آپ نے اماں جی کو دو ہزار روپے نقد جو ایک چھوٹے سے بکس میں تھے دیئے اور فرمایا کہ اس کا خیال رکھنا۔ چونکہ گھر کا سامان بہت زیادہ تھا اماں جی کو اپنے گھریلو سامان کی وجہ سے اس چھوٹے سے بکس کا خیال نہ رہا اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور گاڑی سے اُترتے وقت غالباً گاڑی میں رہ گیا۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل مع سامان کے تانگے پر سوار ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو آہستہ سے اماں جی سے پوچھا کہ وہ بکس جس میں روپے تھے کہاں ہے؟ یہ سنتے ہی اماں جی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور بدحواسی کے عالم میں تانگے والے سے کہا کہ تانگہ ٹھہراؤ، ایک چھوٹا بکس سٹیشن پر رہ گیا ہے۔ چونکہ گاڑی جا چکی تھی اور اس کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل نے اماں جی کو بدحواس دیکھ کر دوسری طرف رُخ کر لیا اور خاموش ہو کر گھر کی طرف چل دیئے۔ اماں جی کی روایت ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل نے مجھ سے مرتے دم تک اس کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی اور نہ کبھی طعنہ دیا۔ گویا حضور نے دو ہزار روپیہ کو دل سے بالکل بُھلا دیا اور کوئی افسوس نہیں کیا۔ اس کا نام ہے ترکِ دنیا۔''

بدقسمتی سے ابھی تک سلیم اٹاوی کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہو سکا۔ ''شعرائے احمدیت'' میں ان کے کلام کا جو نمونہ شائع کیا گیا ہے ذیل کے دو اشعار اسی میں سے ماخوذ ہیں:

چرچا ہے میرا محفل خورشید و ماہ میں
صد شکر بچ گیا ہوں کسی کی نگاہ میں
اے ربِ کعبہ! سن لے میری التجائے شوق
مدت سے نالہ کش ہوں تری بارگاہ میں

پیر خلیل احمد حضرت پیر افتخار احمد کے صاحبزادے، حضرت پیر منظور محمد موجد قاعدہ یسرنا القرآن کے بھتیجے اور حضرت مسیح موعود کے مخلص رفیق حضرت صوفی احمد جان لدھیانوی کے پوتے تھے۔ یہ وہی صوفی احمد جان ہیں جنہوں نے حضرت مسیح موعود کو آپ کے دعویٰ سے پہلے مخاطب کر کے کہا تھا:

ہم مریضوں کی ہے تمہی پہ نظر
تم مسیحا بنو خدا کے لیے

اور جن کے مکان کو حضرت مسیح موعود نے پہلی بیعت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

موصوف صدر انجمن احمدیہ پاکستان کے قدیمی کارکن تھے اور کئی سال تک بطور نائب آڈیٹر خدمات بجا لاتے رہے۔ دُبلے جسم اور دراز قد کے مالک تھے۔ زندگی کے آخری چند ماہ جگر کی خرابی کے باعث شدید علیل رہے اور یہی بیماری ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ مرحوم نے ایک بیٹی اور چار بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹی، امتہ الطیف آپی سے کچھ سینئر تھیں اور ان کی شادی حضرت بھائی عبدالرحیم قادیانی کے پوتے جو ڈاکٹر تھے اور بعد میں فوج سے لیفٹیننٹ کرنل یا شاید کرنل کے طور پر ریٹائر ہوئے سے ہوئی۔ اگرچہ یہ شادی اس وقت ہوئی جب میں چھٹی ساتویں میں تھا لیکن مجھے وہ دن آج بھی بخوبی یاد ہے۔ عرصہ دراز کے بعد راولپنڈی میں اپنے تقرر کے دوران میری ان کرنل صفی الرحمٰن سے بھی ملاقات رہی اور میں نے انہیں بہت با اخلاق پایا۔

پیر خلیل احمد کے ایک بھائی پیر حبیب احمد کی شادی میری امی کی ایک ماموں زاد، سرور بیگم سے ہوئی تھی۔ ہم انہیں گھر میں ''ماسی سرور'' کہا کرتے تھے۔ پیر حبیب احمد ڈاکخانہ کے محکمہ میں ملازم اور ڈومیلی میں رہائش پذیر تھے۔ بڑھاپے کے زیر اثر ان کے جوڑوں میں غیر معمولی سختی آ گئی تھی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ رہائش کے لیے آئے اور انہوں نے ابتدائی چند دن بطور مہمان ہمارے ہاں گذارے تو میں نے پہلی بار انہیں دیکھا۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتے تھے۔ ماسی سرور بتایا کرتی تھیں کہ ڈومیلی میں پیر حبیب کے کسی بدخواہ نے انہیں دودھ میں پارا یا کوئی اور زہریلی چیز ملا کر پلا دی تھی جس کی وجہ سے ان کی ٹانگوں کے جوڑ سوج کر سخت ہو گئے ہیں تاہم میرا اپنا خیال ہے کہ یہ ان کا واہمہ تھا۔ ان کی یہ بیماری بڑھاپے کا شاخسانہ تھی نہ کہ کسی دشمنی کا نتیجہ۔

ان کی کوئی اولاد نہ تھی اور مالی حالات بھی مخدوش سے تھے چنانچہ وہ کچھ عرصہ محلّہ دارالیمن میں غرباء کے لیے مختص کوارٹروں میں بھی مقیم رہے۔ بعد میں انہوں نے فیکٹری ایریا میں مولانا غلام باری سیف کے گھر کے قریب ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا اور ایک تکلیف دہ بیماری کے بعد اسی میں وفات پائی۔ موصی تھے لیکن کسی وجہ سے فوری طور پر ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں نہ ہو سکی۔ ہاں! بعد میں ان کی باقیات وہاں منتقل کر دی گئیں۔

ہمارے ایک اور پڑوسی محمد اسحاق انور تھے جو محمد اسماعیل منیر مربی سلسلہ اور ماریشس [illegible]
عبدالسلام کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ آغاز ربوہ میں ہی صدر انجمن کوارٹرز چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو گئے۔ بات [illegible]
والی تو نہیں لیکن میں انہیں بھول بھی چکا تھا کہ اتفاقاً اُن کے صاحبزادے، ڈاکٹر اسلم ناصر سے رابطہ ہو گیا۔ تب پتا چلا ا[illegible]
اُن کے والد بزرگوار کو صدر انجمن کی طرف سے ۱۹۵۴ء میں سندھ بھجوا دیا گیا تھا جہاں وہ نو سال تک نور نگر فارم، محمد آباد
اسٹیٹ میں خدمت بجالاتے رہے۔ اسی دوران ایک دفعہ گھوڑے سے گر گئے جس سے انہیں سر میں شدید چوٹ آئی۔
علاج تو ہوا مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی چنانچہ حضرت مصلح موعود نے اُنہیں واپس ربوہ بلوا لیا۔ وہ ربوہ اور پھر لاہور
میں بھی کافی دیر تک زیر علاج رہے لیکن خدا تعالیٰ کی تقدیر غالب آئی اور وہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۱ء کو انتقال کر گئے۔

اِن کی وفات کے بعد اسلم ناصر نے الفضل میں ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے اپنے والد بزرگوار کی خلفائے سلسلہ کے ساتھ عقیدت کے کچھ واقعات بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے بھی بہت گہرا اور قریبی تعلق تھا۔ اپنی معذوری کی وجہ سے بیت المبارک کے اندر نہیں جا سکتے تھے مگر جب بھی حضور کی زیارت کی خواہش پیدا ہوتی تو میرے چھوٹے بھائی عزیزم محمد اشرف طاہر سے کہتے کہ مجھے بیت المبارک میں لے چلو اور پھر بیت المبارک کے کونے میں سائیکل کھڑا کروا کر حضور کے آنے کا انتظار کرتے۔ جب حضور نماز کے لیے تشریف لاتے تو والد صاحب کو دیکھ کر فرماتے کہ اسحاق میں نماز کے بعد آ کر آپ سے ملتا ہوں۔ لہٰذا جب حضور نماز کے بعد واپس آتے تو مصافحہ کا شرف بخشتے اور حال احوال معلوم کرتے اور کافی دیر تک دلجوئی فرماتے۔''

وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ''والد صاحب میں امانت دیانت کا وصف بہت نمایاں تھا۔ سندھ سے واپس آنے پر وکالتِ مال اوّل میں خدمت کا موقع ملا۔ خاکسار جب پرائمری سے ہائی سکول گیا تو والد صاحب نے فاؤنٹین پین خرید کر دیا۔ جب پین کی سیاہی ختم ہوگئی تو خاکسار ایک دن ان کے دفتر...... میں گیا اور پین میں سیاہی بھرنے لگا تو والد صاحب نے دیکھ لیا اور فوراً حکم دیا کہ جو سیاہی بھری ہے وہ دوات میں واپس ڈالو اور کہنے لگے کہ یہ سیاہی جماعت کی ہے جو میرے پاس امانت ہے اس لیے کسی قسم کی خیانت نہیں کرنی۔ اسی طرح ان دنوں دفاتر میں استعمال شدہ لفافے کھول کر دوبارہ استعمال میں لائے جاتے تھے تا کہ سٹیشنری کی بچت ہو سکے۔ ایک دفعہ میں نے وہاں سے ایک کاغذ لے لیا جو ایک طرف سے استعمال ہو چکا تھا۔ والد صاحب نے وہ کاغذ بھی میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہا کہ یہ جماعت کا ہے۔''

اسحاق انور کی اہلیہ ماشاء اللہ حیات ہیں اور بالعموم اسلم ناصر کے پاس قیام کرتی ہیں۔ اسلم ناصر بتاتے ہیں کہ ان کی والدہ کو انجمن کوارٹرز میں قیام کے زمانے کی سب باتیں یاد ہیں مثلاً یہ کہ میری ایک خالہ ہمارے ساتھ مقیم تھیں اور میری بہنوں کے کیا کیا نام تھے۔ اُنہیں یہ بھی یاد ہے کہ جب وہ ۱۹۵۳ء میں اسلم ناصر کی ولادت کے بعد بیمار ہوئیں تو ابا جی ان کے گھر جا کر ڈاکٹر مرزا منور احمد کے تجویز کردہ انجیکشن لگایا کرتے تھے اور وہ یہ کام محض خدمت خلق کے جذبہ کے تحت کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر اسلم ناصر جنہوں نے نیوزی لینڈ سے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں۔ وہ

آسٹریلیا، امریکہ، تنزانیہ، نیوزی لینڈ اور نجانے کہاں کہاں کام کر چکے ہیں۔ آج کل آسٹریلیا میں ہوتے ہیں اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمود ناصر کے پاس مقیم ہیں۔ احمدیت کے لیے بہت درد رکھتے ہیں اور انہیں جب اس مضمون پر دلچسپی کی کوئی چیز نظر آتی ہے فوراً اپنے دوستوں کو ای میل کرتے ہیں۔ خدا انہیں ہمیشہ اسی طرح فعال رکھے۔

اور اب کچھ ذکر ملک عبدالرحمٰن نوشہروی کا جو ہمارے پڑوسیوں میں سے تھے اور نظارت بیت المال میں کلرک کے طور پر کام کر رہے تھے۔

طویل القامت ملک عبدالرحمٰن انتہائی شریف النفس، پابندِ صوم وصلوٰۃ اور دعا گو بزرگ تھے جو ۸ فروری ۱۹۶۳ء کو اڑسٹھ سال کی عمر میں وفات پا کر ربوہ ہی میں دفن ہوئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کی ایک بیٹی، نعیمہ میری بہن صادقہ کی ہم جماعت تھیں۔

ملک عبدالرحمٰن کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے معالجِ خصوصی ڈاکٹر حشمت اللہ کے قلم سے الفضل میں ایک مختصر سا نوٹ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے شہادت دی ہے کہ مرحوم اپنی ضعیفی کے باوجود بڑے اہتمام اور التزام کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے بیت الذکر آیا کرتے تھے اور انہیں دعا کے لیے بھی کہتے رہتے تھے۔ اسی نوٹ سے معلوم ہوا کہ موصوف نے ان سے حضرت مسیح موعود کے استعمال شدہ کسی کپڑے کا ایک ٹکڑہ بطور تبرک حاصل کر رکھا تھا۔ ان کا یہ ذوق وشوق حضرت مسیح موعود کے ساتھ ان کی عقیدت کا مظہر تھا۔

امیر جماعت احمدیہ، لاہور طاہر احمد ملک ان ہی ملک عبدالرحمٰن کے بھتیجے اور ان کی اہلیہ، بشریٰ ناہید ملک ان ہی ملک عبدالرحمٰن کی پوتی ہیں۔ طاہر احمد ملک کی روایت کے مطابق: ''ہمارے خاندان میں احمدیت ہمارے تایا، ملک محمد شفیع نوشہروی کے ذریعے آئی تاہم ان کی کوشش کے باوجود بہت دیر تک خاندان کا کوئی اور فرد حلقہ بگوشِ احمدیت نہ ہو سکا۔ یوں تو خاندان کے سبھی افراد ان کی مخالفت میں پیش پیش تھے لیکن ہمارے دادا ملک امیر محمد اور تایا، ملک عبدالرحمٰن تو گویا مخالفین کے سرخیل تھے۔

اسے سوئے اتفاق کہیے یا حسنِ اتفاق کہ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہماری دادی کو اچانک طاعون ہو گئی اور بیماری ایسی صورت اختیار کر گئی کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس موقع پر جب کہ ان کے سارے بچے ان کے پاس جمع تھے ملک محمد شفیع نے تجویز پیش کی کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح موعود کا واسطہ دے کر دعا مانگتے ہیں کہ وہ ہماری والدہ کو اس موذی مرض سے نجات دے دے اور اگر وہ صحت یاب ہو جائیں تو اسے حضور کی صداقت کا نشان سمجھا جائے اور سب لوگ سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہو جائیں۔

اہلِ خاندان نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اپنے اپنے رنگ میں اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری میں لگ گئے۔ جہاں تک ملک محمد شفیع کا تعلق ہے انہوں نے خود کو بیت الذکر میں بند کر لیا اور تضرع کی انتہا کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے ملک محمد شفیع کے کہنے کی لاج رکھ لی اور اگلی ہی صبح ان کی والدہ جو بیماری کی شدت سے بیہوش ہو چکی تھیں غیر متوقع طور پر ہوش میں آ گئیں۔ آہستہ آہستہ ان پر طاعون کے تمام اثرات ختم ہو گئے اور انہوں نے اس بیماری سے مکمل طور پر شفا پائی۔ جب ان کے سامنے ایک روز پہلے والے اس واقعے کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے

کہا: ''مجھ پر تو احمدیت کی صداقت پہلے ہی ایک خواب کے ذریعے منکشف ہو چکی تھی تاہم میری خواہش تھی کہ اس معاملے میں پہل میرے شوہر کی طرف سے ہو لیکن یہ معجزہ دیکھنے کے بعد اب اس معاملے میں مزید تاخیر مناسب نہیں رہی۔'' اس پر ہمارے دادا نے کہا کہ انہیں اب احمدیت کی صداقت کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا چنانچہ ان سب نے اسی وقت سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ملک محمد شفیع نے اس معاملے میں ان کی ضروری رہنمائی کی اور ان سے بیعت کے خطوط لکھوا کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں ارسال کر دیے۔''

احمدیت کی صداقت کا یہ زندہ نشان دیکھنے کے بعد ملک عبدالرحمٰن دم آخر تک ثابت قدم رہے اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ہمارے پڑوسیوں میں سے ایک ڈاکٹر ملک ممتاز احمد تھے۔ یوں تو وہ کچہری بازار، فیصل آباد میں ''ممتاز آپٹیکل سروس'' کے نام سے دندان سازی اور عینکوں کی دکان کرتے تھے تاہم انہوں نے گول بازار میں ایک پلاٹ خرید کر سامنے دکانیں اور پیچھے ایک گھر تعمیر کر رکھا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے ان کے ذہن میں دکانوں اور اس گھر کی تعمیر کے پس پردہ کیا منصوبہ کارفرما تھا لیکن میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنی ایک دکان میں عینکوں اور دندان سازی کا کام شروع کیا۔ وہ ہفتہ میں ایک یا دو دن یہاں بیٹھتے تھے تاہم انہوں نے جلد ہی یہ دکان ختم کر کے اپنی پوری توجہ فیصل آباد والے کاروبار پر مرکوز کر دی۔ ہاں! ان کی بیوی بچے کچھ عرصہ یہاں مقیم رہے۔ مجھے اب تک یاد ہے ان کی بیگم کا نام بلقیس اختر، بڑے بیٹے کا نام وسیم، دوسرے بیٹے کا نام نسیم اور ان کی بیٹی کا نام ریحانہ تھا۔ وسیم سکول میں مجھ سے ایک سال سینئر اور نسیم غالباً ایک سال جونیئر تھے تاہم قریباً ہم عمر ہونے کے باعث ہم سب اکٹھے کھیلتے کودتے تھے۔

ریحانہ ان دنوں گول مٹول سی ایک خوبصورت بچی تھی۔ ایک بار مجھے نہ جانے کیا سوجھی۔ میں نے ایک زیر تعمیر مکان سے اینٹیں لے کر انہیں اس ترتیب سے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا کہ ایک بہت بڑی کرسی بن گئی۔ پھر میں نے ریحانہ کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر اس کرسی پر بٹھایا، اپنے ہاتھوں سے اس کے بال سنوارے، دور سے کھڑے ہو کر اسے دیکھا اور پھر بہت ہی معصومانہ انداز میں کہا: ''تم بالکل ملکہ لگ رہی ہو۔''

بعد میں ڈاکٹر ممتاز نے یہ جائیداد فروخت کر دی اور مستقل طور پر فیصل آباد منتقل ہو گئے۔ وہ جلسہ سالانہ یا کسی اور موقع پر ربوہ آتے تو ان کی بیگم ضرور ہمارے ہاں چکر لگاتیں۔ پھر یہ رابطہ کمزور پڑتا گیا۔

ایک روز پتا چلا کہ وسیم ڈاکٹر بن چکے ہیں اور سرجری میں خصوصی مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ میں ملتان میں تھا کہ ایک بار تشریف لائے۔ معلوم ہوا ان کی پروفیسر کے طور پر ترقی ہوئی ہے اور ان کی پوسٹنگ ملتان میں ہوئی ہے۔ جلد ہی وہ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ہم فون پر ایک دوسرے سے ملاقات کے وعدے وعید تو کرتے رہے لیکن عملاً ہماری ایک ہی ملاقات ہو سکی اور وہ بھی یعقوب کلینک میں جہاں میں راشدہ کے لیے ایک طبی مشورے کے سلسلے میں ان کے پاس گیا تھا۔ وہ بہت محبت سے پیش آئے، ہم سے فیس تک چارج نہ کی اور حسب معمول ہم نے لاہور کے جمخانہ میں اکٹھے ہونے کا وعدہ بھی کیا لیکن کیا معلوم تھا کہ وہ جلد ہی ہمیں داغ مفارقت دے جائیں گے۔ ان کا

جنازہ بیت النور، ماڈل ٹاؤن میں پڑھا گیا جس کے بعد ان کی تدفین جی بلاک کے احمدیہ قبرستان میں عمل میں آئی۔امیر جماعت احمدیہ لاہور چوہدری حمید نصر اللہ نے غالباً اس سے اگلا جمعہ بیت النور میں خود پڑھایا اور خطبے میں چوہدری ظفر اللہ خان کی آخری علالت کے دوران ڈاکٹر وسیم کی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا۔

ڈاکٹر وسیم کے چھوٹے بھائی نسیم اپنی گائنا کالوجسٹ اہلیہ کی مدد سے گلبرگ، فیصل آباد میں ایک نرسنگ ہوم چلا رہے ہیں۔الفضل میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ایک بار اُنہیں خدمتِ خلق کا ایسا نادر موقع مہیا فرمایا جس کی مثال کم ملتی ہے۔وہ جون ۱۹۶۳ء کی ایک دوپہر اومنی بس کے ذریعہ اپنی دکان سے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔جب وہ پیپلز کالونی کے سٹاپ پر اُترے تو انہیں شدید طوفانِ باد و باراں نے آلیا۔سٹاپ پر کھڑے کچھ لوگ طوفانی تھپیڑوں سے محفوظ رہنے کی خاطر ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے لیکن بدقسمتی سے یہ دیوار ان کے اوپر آن گری اور سات افراد ملبہ کے نیچے دب گئے۔نسیم ان کی مدد کے لیے فوراً آگے بڑھے اور تن تنہا ایک مرد، ایک نوجوان لڑکی اور پانچ بچوں کو ملبے سے باہر نکالا۔مرد تو شدید چوٹوں کی تاب نہ لا کر پہلے ہی جان بحق ہو چکا تھا البتہ لڑکی شدید زخمی تھی اور بچے بیہوش تھے۔نسیم نے انہیں ہسپتال پہنچانے میں ہر ممکن مدد کی۔اسی دوران لڑکی بھی وفات پا گئی تاہم نسیم اس وقت تک ہسپتال میں موجود رہے جب تک پانچوں بچے ہوش میں نہیں آ گئے۔

ریحانہ اب بیاہ کر انگلستان جا چکی ہیں۔ان کے میاں، اقبال ڈار ڈاکٹر محمد طفیل ڈار کے صاحبزادے ہیں۔ یوں تو ان کی شخصیت کے کئی پہلو قابلِ بیان ہوں گے لیکن یہاں میں صرف یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ میری شنید کے مطابق مشرقی افریقہ کے ملک تنزانیہ کا نام ان ہی کا تجویز کردہ ہے۔جب میں نے ان سے فون پر اس بات کی تصدیق چاہی تو انہوں نے کہا ''آپ نے ٹھیک سنا ہے۔قصہ دراصل یہ ہے کہ ۱۹۶۴ء میں جب ٹانگانیکا اور زنجبار کا اتحاد ہوا تو اس ملک کا نام ''ریپبلک آف ٹانگانیکا اینڈ زینزیبار'' رکھا گیا تاہم بعد میں محسوس کیا گیا کہ یہ نام بہت طویل ہے چنانچہ حکومت کی طرف سے اس ملک کا نیا نام تجویز کرنے کے لیے ایک مقابلے کا اعلان کیا گیا۔میں اس وقت اے لیول میں پڑھتا تھا۔یہ اعلان ٹانگانیکا سٹینڈرڈ نامی ایک اخبار میں چھپا تو میری نظر سے بھی گذرا۔مجھے خیال آیا کہ میں بھی اس مقابلے میں حصہ لوں چنانچہ میں نے دعا کر کے تنزانیہ نام تجویز کیا جس کے پہلے تین حروف یعنی ٹی اے این ٹانگانیکا سے، زیڈ اے این زنجبار سے، آئی ان کے اپنے نام سے اور اے احمدیت سے ماخوذ ہیں۔ خدا کے فضل سے میرا تجویز کیا ہوا نام منظور کر لیا گیا اور مجھے حسبِ اعلان پچیس پاؤنڈ انعام دیا گیا جو ۱۹۶۴ء میں ایک بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔میں سمجھتا ہوں یہ سب احمدیت کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عزت بخشی۔''

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کوئی تین سال پہلے اقبال ڈار کینیڈا گئے تو جماعتی جریدہ ''نحن انصار اللہ'' میں اُن کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں موصوف نے اس واقعہ کی پوری تفصیل بتائی تھی۔یہ انٹرویو نحن انصار اللہ کے جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے اور اس کا متعلقہ حصہ قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''تنزانیہ کے اخبار ٹانگانیکا اسٹینڈرڈ میں وزارتِ اطلاعات و سیاحت کی طرف سے اعلان مشتہر کیا گیا کہ ملک کا مختصر نام تجویز کرنا مطلوب ہے۔نام تجویز کر کے متعلقہ وزارت کو بھیجے جائیں، اوّل آنے والے تجویز کنندہ کو

انعام سے بھی نوازا جائے گا۔ خاکسار ان دنوں ابھی طالب علم تھا۔ میں نے دعا کے ساتھ مختلف ناموں پر غور کرنا شروع کر دیا تاہم میں نے اپنے گھر میں کسی سے اس بات کا تذکرہ نہیں لیا۔ اس ضمن میں بیشمار نام ذہن میں آئے مگر طبیعت کو جچ نہیں پا رہے تھے۔ پھر ایک دن ذہن میں مندرجہ ذیل نام آئے: (۱) ٹانگانیکا (ٹانگانیکا شہر یا ملک کے طویل نام کا جزو)؛ (۲) زینزیبار (ملک کے طویل نام کا حصہ)؛ (۳) اقبال (خاکسار کا نام)؛ (۴) احمدیہ (جماعت احمدیہ)۔ ان چاروں ناموں سے میں نے مندرجہ ذیل ان کے ابتدائی حروف اخذ کر لئے: ٹانگانیکا سے ٹی اے این: زینزیبار سے زیڈ اے این؛ اقبال سے آئی؛ احمدیہ سے اے۔ ان حروف کو جوڑ کر تنزانیہ نام ترتیب دے ڈالا اور پھر اس نام کے حروف کی وجہِ تسمیہ مذکورہ بالا تفصیل کے ساتھ لکھ کر وزارتِ اطلاعات کو خاموشی سے ارسال کر دی۔

چند ماہ کے بعد حکومت کی طرف سے گھر میں خط آیا جسے والدِ محترم نے پڑھا۔ میں جب سکول سے گھر واپس آیا تو اُس روز خلافِ معمول بیرونی دروازہ والدہ محترمہ کی بجائے ابا جان نے کھولا جس پر مجھے کافی حیرانگی ہوئی تاہم ابا جان نے مجھے گلے لگا کر مبارکباد دی کہ تمہارا تجویز کردہ نام حکومت نے منظور کر لیا ہے نیز بتایا کہ گورنمنٹ کی طرف سے بطور انعام میڈل بھی دیا گیا ہے۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اَن گنت تجویز کنندگان میں سے سکول کے ایک معمولی لڑکے کے نام کی پذیرائی پر خدا تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے خاکسار کو جماعت احمدیہ کے نام کے حرف کو بھی اس ملک کی تاریخ کا جزو بنا دینے کی توفیق عطا فرمائی۔''

اپنے اس انٹرویو میں انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ''حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس میں ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ شنید ہے کہ تنزانیہ ملک کا نام ایک احمدی نے تجویز کیا تھا۔ آپ نے فرمایا: یہ بالکل درست بات ہے۔ یہ احمدی آج کل برمنگھم (یوکے) میں رہتے ہیں اور ان کا نام محمد اقبال ڈار ہے۔''

Mahmood Hamsin Mubiru نے اپنی سواحیلی تصنیف Nani Alibuni Jina Tanzania? میں اُس ٹرافی کی عبارت نقل کی ہے جو اقبال ڈار کو تنزانیہ کا نام تجویز کرنے پر حکومتِ تنزانیہ کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے یہ عبارت:

PRESENTED BY THE
MINISTRY OF INFORMATION & TOURISM, TANZANIA
TO
MOHAMED IQBAL DAR
IN RECOGNITION OF THE ACHIEVEMENT OF CHOOSING THE NEW NAME FOR THE UNITED REPUBLIC OF TANGANYIKA AND ZANZIBAR
NAMELY
"REPUBLIC OF TANZANIA"
DURING THE NATIONAL COMPETITION DAY 19TH NOV 1964
I.A.WAKIL
MINISTER FOR INFORMATION AND TOURISM

ڈاکٹر ممتاز کی چھوٹی بیٹی ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ کے ایک رکن، سہیل احمد سے بیاہی گئیں جو فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے چیئرمین اور سیکرٹری ایسٹیبلشمنٹ بھی رہے ہیں۔

جب ڈاکٹر ممتاز نے اپنے اہل وعیال کو فیصل آباد منتقل کرلیا تو یہ مکان کرائے پر اٹھادیا۔ نئے کرایہ دار بشیر احمد خان تھے۔ ان کا اس مکان میں آنا ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی خوش آئند تھا کہ ان کی اہلیہ، اقبال صدیقہ حضرت ڈاکٹر محمد عبداللہ آف قلعہ صوبھا سنگھ رفیق حضرت مسیح موعود کی صاحبزادی تھیں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ اور دادا جی ایک عرصہ تک نوشہرہ چھاؤنی میں اکٹھے رہے تھے اور ان کے درمیان انتہائی برادرانہ تعلقات تھے۔ یہی محبت ان بزرگوں کی اولاؤں میں منتقل ہوئی چنانچہ ہم بہن بھائی ڈاکٹر محمد عبداللہ کی ان صاحبزادی کو ''پھوپھی اقبال'' کہا کرتے تھے۔ وہ اباجی سے پردہ بھی نہ کرتی تھیں اور بے تکلفانہ ہمارے ہاں آجاتی تھیں جب کہ ہماری طرف سے بھی اسی بے تکلفی کا اظہار ہوتا۔ میں بسا اوقات پھوپھی اقبال کے پاس جا کر بیٹھا رہتا تھا۔ زرتشت منیر احمد ان کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ مجھ سے ایک یا دو سال سینئر تھے لیکن ہمارے تعلقات دوستانہ تھے اور انہوں نے اس تعلق کو ہمیشہ احسن طریقہ سے نباہا۔

مجھے یاد ہے اباجی کی وفات کے موقع پر وہ تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں میں لیکچرر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے الفضل میں ان کے انتقال کی خبر دیکھی تو فوراً مجھے ایک خط لکھا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ دیکھئے تو سہی انہوں نے کس اپنائیت کا اظہار کیا ہے:

''برادرم داؤد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے والد صاحب کی بے وقت اور اچانک وفاتِ پُر ملال کی اطلاع بذریعہ روزنامہ الفضل پاکر سخت صدمہ اور رنج ہوا۔ حضرت مولوی صاحب کے ہمارے خاندان سے بہت گہرے تعلقات تھے چنانچہ ان کی وفات کی خبر ہمارے خاندان کے ہر فرد کے لیے ناقابلِ یقین تھی لیکن بہرحال ہمیں اپنے خالقِ حقیقی کی رضا پر راضی ہونا پڑتا ہے۔

یہ اندوہناک سانحہ آپ کے لیے، سلسلہ کے لیے اور اسی طرح ہمارے لیے بھی ایک گہرے صدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت مولوی صاحب کی نیکی، سادگی اور خوش اخلاقی کبھی بھی ہمارے ذہن سے محو نہیں ہو سکتی۔ خدائے قدوس کے حضور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو، باجی عزیزہ، باجی صالحہ اور باجی صادقہ سب کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ اسی طرح آپ کی والدہ صاحبہ اور دیگر عزیزان کو احسن رنگ میں صبر عطا فرمائے اور سلسلہ عالیہ احمدیہ میں حضرت مولوی صاحب کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے اپنے فضل سے جلد از جلد پُر فرمائے اور آپ سب کو اس سانحہ عظیم پر بے پناہ صبر عنایت فرمائے۔ آمین

والسلام

خاکسار

زرتشت منیر احمد خان''

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران میرا تقرر کیملپور میں انکم ٹیکس آفیسر کے طور پر تھا۔ ان دنوں امی ربوہ میں مقیم تھیں لہٰذا میں شام کو بالعموم گھر لوٹ آتا اور اگلی صبح بس کے ذریعہ کیملپور چلا جاتا۔ اُس زمانے میں زرتشت نیر احمد سوشل سیکیورٹی آفیسر کے طور پر غالباً کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز میں تعینات تھے اور ربوہ سے روزانہ وہاں جایا کرتے تھے۔ ہم اکثر اوقات ایک ہی بس میں سفر کرتے اور اگر ساتھ ساتھ بیٹھنے کا موقع مل جاتا تو پورا راستہ دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے۔ ان کے چار بھائی اور ایک بہن تھیں۔ بھائیوں کے نام داؤد، جواد، فواد اور ندیم تھے جب کہ بہن کا نام سیارہ حکمت تھا۔

جواد نے بعد میں قانون کا امتحان پاس کرلیا۔ ۱۹۸۰ء میں جب وہ نائب قائد مجلس خدام الاحمدیہ ضلع لاہور تھے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی معیت میں لاہور سے ربوہ کے ایک سفر کے دوران پنڈی بھٹیاں کے قریب کار کے ایک حادثہ میں دو دیگر خدام کے ہمراہ وفات پا گئے۔ روزنامہ امروز، لاہور نے ۹ مارچ ۱۹۸۰ء کو اس حادثہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا: ''پنڈی بھٹیاں ۸ مارچ: آج یہاں سے قریباً چھ کلومیٹر دور ایک کار سڑک کے کنارے ایک درخت سے ٹکرا گئی جس کے نتیجہ میں تین افراد جاں بحق اور دو زخمی ہو گئے۔ تفصیلات کے مطابق کار......لاہور سے ربوہ جا رہی تھی۔ جب وہ پنڈی بھٹیاں سے چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر پہنچی تو ڈرائیور نے ایک ٹرک سے آگے نکلنے کی کوشش کی اور کار ایک درخت سے ٹکرا گئی جس کے نتیجہ میں تین افراد ظاہر احمد، خواجہ اعجاز اور جواد رشید موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے خود ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی، جنازوں کو کندھا دیا، تدفین مکمل ہونے تک قطعہ شہدا میں موجود رہے اور بعد از تدفین دعا کرائی۔ جون ۱۹۸۶ء میں زرتشت اوسلو منتقل ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کے باقی ماندہ بھائی اور والدہ بھی وہاں چلے گئے۔

سیارہ جو مجھ سے چھوٹی اور اُن دنوں کھیلنے کودنے کی عمر میں تھیں تکمیلِ تعلیم کے بعد لاہور کالج فار وومن میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئیں لیکن اب اپنے شوہر کے ہمراہ میری لینڈ (امریکہ) جا چکی ہیں۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتی ہیں اور ان کی ایک دو نظمیں امریکہ کے کسی جماعتی رسالہ میں میری نظر سے گذر چکی ہیں۔

چند سال پہلے میں اوسلو گیا تو زرتشت نے نہ صرف گوٹن برگ آنے والی بسوں کے اڈے پر میرے استقبال کا اہتمام کیا بلکہ اوسلو کے جماعتی گیسٹ ہاؤس میں رہائش کا انتظام بھی کر دیا۔ میں بوجوہ اُن کی اس پیشکش سے فائدہ تو نہ اٹھا سکا تاہم ان کی طرف سے اپنی اس عزت افزائی پر اُن کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔

پھوپھی اقبال وہیں تھیں۔ زرتشت کے توسط سے عرصہ دراز کے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ جسمانی کمزوری کے باوجود ذہنی طور پر پوری طرح چوکس تھیں اور بہت دیر تک دادا جی، ابا جی اور پھوپھی ناصرہ کا ذکر کرتی رہیں۔ وہ بار بار ممنونیت کا اظہار کر رہی تھیں کہ میں نے ان سے ملاقات کے لیے وقت نکالا ہے جب کہ میں اس ملاقات کو اپنی خوش بختی پر محمول کر رہا تھا۔ افسوس! اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

ہاں! تو ذکر ہو رہا تھا زرتشت کا۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے انگلستان ہجرت فرمائی تو اس وقت

زرتشت وفاقی وزارتِ محنت کے ایک ذیلی ادارے، اوورسیز ایمپلائمنٹ کارپوریشن، کراچی میں ایڈیشنل ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے جب کہ اُن کے پاس پروٹیکٹر آف امیگرینٹس برائے سندھ و بلوچستان کی اضافی ذمہ داری بھی تھی اور قائد مجلس خدام الاحمدیہ کراچی کا عہدہ ان کے پاس تھا۔ وہ اپنی اس حیثیت میں حضور کے قافلے کے سکھر میں استقبال، سکھر سے کراچی آمد اور وہاں سے لندن روانگی کے جملہ انتظامات میں شریک تھے۔ وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ وہ کراچی کے ان معدودے چند احباب میں شامل تھے جنھوں نے حضور کی کراچی سے روانگی کے انتظامات میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔ ان سے اس واقعہ کی تفصیلات دریافت کی جائیں تو وہ بالعموم خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں تاہم وہ ایمان رکھتے ہیں کہ تائید ایزدی کے بغیر حضور کی ہجرت کا منصوبہ خدانخواستہ دھرے کا دھرا بھی رہ سکتا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ طے شدہ منصوبے کے تحت کراچی ائیر پورٹ پر تعینات ایف آئی اے کے ایک احمدی دوست نے ممکنہ طور پر ڈیوٹی پر موجود ایف آئی اے کے ایک خاص اہلکار سے حضور کے پاسپورٹ پر ''ایگزٹ'' کی مہر لگوانا تھی لیکن اس اہلکار کو عین موقع پر اس کے کسی سینئر نے اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور اس کی جگہ ایک ایسا اہلکار ڈیوٹی پر آ گیا جس نے حضور کا پاسپورٹ دیکھ کر مہر لگانے میں کچھ تذبذب کا اظہار کیا لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص القا کے ذریعہ اسی کے ہاتھوں یہ کام کرا دیا۔

موصوف بتایا کرتے ہیں کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق حضور کو فلائٹ کی روانگی سے صرف چند منٹ پہلے ائیر پورٹ پر پہنچایا جانا تھا، کے ایل ایم کراچی کے منیجر کی گاڑی وی آئی پی لاؤنج کے سامنے آپ کی منتظر ہونا تھی اور اسی نے حضور کو جہاز کے دروازے تک پہنچانا تھا تاہم کسی وجہ سے فلائٹ میں غیر متوقع طور پر تاخیر ہوگئی۔ نتیجتاً حضور اور بیگم صاحبہ وی آئی پی لاؤنج کے سامنے رکنے کی بجائے ازخود لاؤنج کے اندر تشریف لے گئے اور غالب گمان یہ ہے کہ لاؤنج میں رکھے ہوئے سرکاری مُوومنٹ رجسٹر میں حضور کا نام بھی درج کیا گیا۔ انتظام میں اس تبدیلی کی بظاہر یہی حکمت تھی کہ حضور پر ملک سے ''فرار'' ہونے کا الزام نہ لگ سکے اور اس بات کا ریکارڈ موجود رہے کہ حضور کی روانگی سے قبل وی آئی پی لاؤنج کا عملہ حضور کے ارادۂ سفر سے پوری طرح باخبر تھا۔

زرتشت مزید بتاتے ہیں کہ اصل پروگرام کے مطابق حضور کو پگڑی اور اچکن کی بجائے ٹوپی اور شلوار قمیص میں سفر کرنا تھا۔ منتظمین کو اندیشہ تھا کہ حضور کا معمول کا لباس آپ کی ہوائی اڈے پر موجودگی کو سرکاری اہلکاروں اور مسافروں کے سامنے بے نقاب کر دے گی تاہم دقت یہ تھی کہ حضور کو لباس کی تبدیلی کا مشورہ کون دیتا چنانچہ حضور نے اپنے معمول کے لباس میں ہی سفر کو ترجیح دی۔ آپ کا یہ اقدام بھی بعد میں آپ پر لگنے والے اس الزام سے بریت کے لیے کافی تھا کہ حضور ہوائی اڈے کے عملے کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر ملک سے ''فرار'' ہوئے ہیں۔

حضور کی پاکستان سے انگلستان ہجرت کے بارے میں صرف اتنا ہی کچھ، جہاں تک زرتشت کا تعلق ہے؛ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک پاکستان میں رہے لیکن پھر ناروے چلے گئے جہاں وہ پچھلے کئی سالوں سے امیرِ جماعت کے فرائض بھی سرانجام دے رہے ہیں۔

سید عبدالحی شاہد جو ابتداءً جونیئر کوارٹرز میں رہائش پذیر تھے لیکن بعد میں ناظران کے لیے مختص کوارٹروں میں

منتقل ہو گئے بظاہر خاموش طبع سے بزرگ تھے۔ بزرگ تو خیر وہ بعد میں ہوئے میرے بچپن میں تو وہ بالکل جوان تھے۔ اگرچہ ان کی رہائش ہم سے دور نہ تھی اور اکثر ہمارا آمنا سامنا بھی ہو جاتا تھا لیکن شاید یہ عمر کا تفاوت تھا یا کچھ اور کہ ہمارے درمیان بے تکلفی نہ تھی۔ دفاتر صدر انجمن احمدیہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ ان کا دفتر تھا لیکن وہ بھی کتابوں سے اٹا رہتا۔ میں وہاں سے گذرتے ہوئے ان کے کمرے میں ضرور جھانکا کرتا تھا لیکن ملاقات کم کم ہوتی۔

ایک بار میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ذکر کیا کہ میں جلسہ سالانہ قادیان منعقدہ ۱۹۹۱ء میں اپنی شمولیت کے حالات کتابی شکل میں لکھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں قلم کی لغزش کوئی گل ہی نہ کھلا دے۔ ان کے علم میں تھا کہ میرے کئی سفرنامے منصۂ شہود پر آچکے ہیں اور انہیں ملک کے ایک معروف طباعتی ادارے نے شائع کیا ہے اور ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ اس وقت تک شائع ہونے والے میرے تینوں سفرنامے پڑھ بھی چکے تھے چنانچہ انہوں نے مجھے جو جواب دیا وہ مجھے آج تک نہیں بھولا: میں آپ کے والد صاحب کی خدماتِ دینیہ سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ اسی ماحول کے پروردہ ہیں۔ میں نے آپ کی تینوں کتابیں بھی پڑھ رکھی ہیں۔ آپ لکھیں تو سہی، مجھے یقین ہے آپ جو لکھیں گے ان شاء اللہ قابلِ اشاعت ہوگا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی یہ کاوش سلسلہ کے لٹریچر میں ایک عمدہ اضافہ ہوگی۔''

افسوس! میں خواہش کے باوجود اس پراجیکٹ پر کام شروع نہ کرسکا اور تذبذب ہی میں اتنا وقت گذر گیا کہ اس سفر کی یادداشتیں بھی بہت حد تک مدھم پڑ گئیں۔

سید عبدالحیٔ کی وفات پر مجلس عاملہ انصاراللہ مرکزیہ نے جو قرارداد پاس کی اس کے مطابق وہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۲ء کو کوریل ضلع اننت ناگ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں قادیان آکر مدرسہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل رہے۔ انہیں ایک لمبا عرصہ مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ کئی سال تک تشحیذ الاذہان اور خالد کے پبلشر اور ضیاء الاسلام پریس کے مینیجر رہے۔ وہ مجلس افتاء کے ممبر، الشرکۃ الاسلامیہ کے مینیجنگ ڈائریکٹر، فضلِ عمر فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر اور الفضل بورڈ کے صدر رہے۔ ۱۹۸۲ء سے بطور ناظر اشاعت وتصنیف خدمت کی توفیق پائی۔ اسی دوران انہیں کشمیری زبان میں ترجمۃ القرآن پر نظرثانی کی سعادت حاصل ہوئی۔ ''روحانی خزائن'' کے کمپیوٹرائزڈ سیٹ کی طباعت اور اشاعت بھی ان ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے ترجمہ قرآن کی تیاری کے سلسلے میں گراں قدر خدمت سرانجام دی نیز تفسیر کبیر کے مضامین کا انڈیکس تیار کیا۔

مجلس انصاراللہ میں انہیں بطور قائد اشاعت وایڈیٹر ماہنامہ انصاراللہ خدمت بجالانے کی توفیق ملی۔

وہ بہت صائب الرائے، سادہ مزاج، شریفِ النفس، معاملہ فہم، حلیم الطبع، مدبّر اور کم گو تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے ایک خطبہ جمعہ میں ان کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی نظر میں مرحوم شاہ صاحب کا شمار نیک بندوں میں ہوتا تھا جو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہتے ہیں۔ بے غرض، بے نفس اور ایک درویش صفت انسان تھے۔ حلیمی اور چشم پوشی انتہائی تھی۔ عجز وانکسار کے پُتلے تھے۔ فرشتہ سیرت انسان تھے۔ مہمان نوازی

بہت زیادہ تھی۔ میں نے ان کو کامل اطاعت کرنے والا پایا۔ بیعت کی روح کو سمجھنے والے اور اپنی تمام تر طاقتوں سے ساتھ اس کا حق ادا کرنے والے تھے۔''

طاہر محمود احمد نے اپنے ان اشعار میں دراصل مرحوم کی ان ہی خوبیوں کو نظم کا جامہ پہنایا ہے:

فلک نے علم و حکمت کا زمیں پر اک جہاں دیکھا
سمندر کی طرح خاموش بحر بیکراں دیکھا
خلافت کے اشاروں کو بہت خوبی سے سمجھا تھا
خلافت کے تقاضوں کا ہمیشہ پاسباں دیکھا
اطاعت کا مرقع نیز اخلاص و محبت سے
امورِ سلسلہ میں صاحبِ قلبِ تپاں دیکھا
نکالو جو بھی پہلو سادگی کا اس کا مظہر تھے
ہمیشہ خاکساروں کا امیرِ کارواں دیکھا

میں ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد گول بازار میں حمید کشمیری مالک سنیاسی دواخانہ کے پاس علیک سلیک کے لیے رُکا تو گفتگو کے دوران مرحوم کا ذکر بھی آ گیا اور وہ بتانے لگے: میں انڈین آرمی کے ہاتھوں اپنے والد کی شہادت کے بعد ۱۹۷۰ء میں کشمیر سے پاکستان آیا تو میں یہاں بالکل تنہا تھا۔ ان ہی دنوں کسی نے سید عبدالحی شاہد کا ذکر کیا چنانچہ میں کشمیری ہونے کے ناطے ان سے ملا تو وہ اس ہمدردی سے پیش آئے کہ میں ان کا بے دام مرید ہو گیا۔ اس کے بعد میں ہمیشہ ان سے ملتا رہا اور مشورہ طلب امور میں ان سے رہنمائی حاصل کرتا رہا۔ ان کی وفات سے کچھ عرصہ قبل میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو وہ مجھے اداس اور بجھے بجھے نظر آئے۔ میں نے ان سے بے تکلفی سے عرض کیا کہ میں تو آپ کے پاس اپنی اداسی دُور کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا لیکن آپ تو خود اداس بیٹھے ہیں۔ انہوں نے بیساختہ کہا: ''اداس کیوں نہ ہوئیے، ساڈے نال دے چلے گئے تے ساڈی وی تیاری اے۔'' ان کے منہ سے نکلی ہوئی یہ بات کچھ ہی روز کے بعد پوری ہوگئی۔ سید عبدالحی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈاکٹر سید غلام غوث حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھے۔ ہمارے قریب رہائش پذیر تھے لیکن میں چھٹی جماعت میں تھا کہ ان کی وفات ہوگئی لہٰذا میری ان سے براہِ راست ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ ہاں! ان کے بارے میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے ایک نوٹ مطبوعہ الفضل کا کچھ حصہ یہاں نقل کر رہا ہوں تا کہ ان قارئین کے دل میں جو انہیں جانتے نہیں ان کے لیے دعا کی تحریک پیدا ہو۔ میاں صاحب رقمطراز ہیں: ''عبادت کا اتنا شوق تھا کہ ان کا دل گویا ہر وقت (بیت الذکر) میں لٹکا رہتا تھا۔ آخری ایام میں جب کہ ڈاکٹروں نے انہیں چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا وہ پھر بھی دوا لگا کر (بیت الذکر) میں پہنچ جاتے تھے حتیٰ کہ مجھے انہیں اصرار کے ساتھ روکنا پڑا کہ ان پر لنفسک علیک حق کا حکم بھی واجب ہے۔ نہایت تضرع کے ساتھ دعائیں کرنا اور ذکر الٰہی میں مشغول رہنا ان کے دل کی غذا تھی۔ یہ ان ہی اعمال حسنہ کا ثمر تھا کہ ڈاکٹر صاحب خدا کے فضل سے صاحب کشف والہام تھے اور

خدا کا بھی ان پر یہ فضل تھا کہ انہیں اپنی دعاؤں کا جواب مل جاتا تھا۔‘‘

اس حوالہ سے میاں محمد ابراہیم سابق ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول کی خودنوشت سوانح میں بیان کردہ یہ واقعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ ’’جھنگ میں ہر سال ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ ہوا کرتا تھا۔ ہمارے سکول کی ٹیمیں بھی اس میں باقاعدہ حصہ لیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم جھنگ جانے کے لیے ربوہ اسٹیشن پر پہنچے۔ وہاں حضرت ڈاکٹر سید غلام غوث صاحب بھی موجود تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ٹورنامنٹ میں کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہاتھ اُٹھا کر دُعا شروع کر دی۔ ہم سب بھی دُعا میں شامل ہو گئے۔ مختصر سی دُعا کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ دو میں تو کامیابی یقینی ہے تیسری میں کوشش کریں۔ میں نے دعا کی درخواست سے پہلے ڈاکٹر صاحب سے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ ٹورنامنٹ میں ہماری کتنی ٹیمیں شرکت کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات سن کر میں حیران رہ گیا کیوں کہ ہمارا قافلہ تین ٹیموں پر ہی مشتمل تھا۔ ٹورنامنٹ شروع ہوا تو اس دعا کی قبولیت کا عملی ثبوت نظر آیا۔ کرکٹ اور ہاکی میں تو ہم برابر جیتتے چلے گئے۔ بیس پچیس ٹیموں میں سے کسی ایک نے بھی ہمیں شکست نہ دی لیکن فٹ بال کی ٹیم فائنل میں پہنچ کر دو تین دفعہ موقع ملنے کے باوجود گول نہ کر سکی اور ہمیں آخری فیصلہ کے لیے ملتان جا کر قسمت آزمائی کرنا پڑی۔ اس طرح حضرت ڈاکٹر صاحب کو دعا کے نتیجہ میں ملنے والی خوشخبری کہ دو میں تو کامیابی یقینی ہے تیسری میں کوشش کریں لفظاً لفظاً پوری ہوگئی۔‘‘

ڈاکٹر سید غلام غوث کے صاحبزادے سید سید احمد جن کا کوارٹر ڈاکٹر سید غلام غوث کے کوارٹر سے ملحق تھا افسر جلسہ سالانہ کے دفتر میں کام کیا کرتے تھے۔ خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ قادیان میں کھیل کی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ایسے ہی تو نہیں لکھا بی ٹی صاحب نے اپنی کتاب ’’تعلیم الاسلام ہائی سکول اور اس کی کھیلیں‘‘ میں کہ ’’سید سید احمد صاحب .... کھیلوں کی جان اور کھیلیں ان کی جان رہی ہیں۔ ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، کبڈی، والی بال، دوڑیں غرضیکہ کوئی ایسی کھیل نہیں جو سید صاحب نے نہ کھیلی ہو۔ سید صاحب مدرسہ احمدیہ کے طالب علم تھے مگر تعلیم الاسلام ہائی سکول سے بھی ان کے تعلقات بہت مخلصانہ رہے۔ انہوں نے ہمیشہ سکول کے کام میں دلچسپی لی اور اکثر قیمتی مدد دیتے رہے۔ باہر کلبوں میں جا کر بھی کھیلتے رہے۔ کبڈی میں خاص شہرت کے مالک رہے ہیں۔‘‘ تاہم ان باتوں سے قطع نظر سب سے اہم چیز ان کا سلسلہ کے ساتھ فدویانہ تعلق ہے جو ساری زندگی قائم رہا اور آج بھی انہیں اسی حوالے سے یاد کیا جا رہا ہے۔

دراز قد سلیم ان ہی ڈاکٹر غلام غوث کے پوتے اور سید سید احمد کے صاحبزادے تھے جو سکول میں ہم سے ایک سال سینئر تھے اور اسی زمانے میں اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کچھ یاد نہیں کہ ان کی غیر متوقع وفات کا سبب کیا بنا تھا۔

انجمن کوارٹرز کے ایک اور رہائشی مرزا نذیر علی قادیانی حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھے۔ ان کا شمار پرانی وضع کے ان معدودے چند باقی ماندہ احمدیوں میں ہوتا تھا جو اپنے نام کے ساتھ قادیانی لکھتے اور قادیانی کہلوانا پسند کرتے تھے۔ دبلے پتلے مرزا نذیر علی سر پر ہمیشہ رومی ٹوپی پہنتے تھے۔

مرزا نذیر علی خلافت سے وابستگی کی ایک زندہ مثال تھے۔ اباجی ذکر کیا کرتے تھے کہ ۵۵۔۱۹۵۶ء کے فتنۂ منافقین کے دوران مرزا نذیر علی نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں ایک خط لکھ کر حضور کے ساتھ اپنی وفاداری کی تجدید کی تھی اور یہ خط الفضل میں بھی شائع ہوا تھا۔ اتفاق سے یہ خط مطبوعہ الفضل انتیس اگست ۱۹۵۶ء میری نظر سے گزر چکا ہے اور اسے ان کی بلندی درجات کے لیے دعا کی تحریک کی غرض سے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ہم لوگ نہ صرف قادیان کے قدیمی باشندے ہیں بلکہ بفضلہٖ تعالیٰ ہمیں حضرت اقدس مسیح موعود کی قرابت کا بھی فخر حاصل ہے۔ حضور کی زندگی میں اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے سلسلہ اور حضور کی شدید مخالفت اور ان کی ناکامی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ حضرت مسیح موعود کے وصال کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی خلافت اور ان کی وفات کے بعد حضور کی خلافتِ حقہ کی شدید مخالفت اور اس کا انجام بھی مجھے یاد ہے۔

پیارے آقا! مجھے حضور کی قوتِ قدسی کا جو میرے ذاتی مشاہدہ میں آئی اس کا نظارہ آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہے یعنی ایک دن قبلہ تایا مکرم مرزا غلام اللہ صاحب کے ساتھ بچپن میں مجھے بھی حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت ملی۔ حضور اس وقت (بیت) مبارک کی اندرونی سیڑھیوں کے ساتھ جو دروازہ کے اندر سے (بیت الذکر) میں آتا ہے اس دروازہ کے ساتھ (بیت الذکر) میں تشریف فرما تھے اور مکرم پیر افتخار احمد صاحب مرحوم ڈاک دکھا رہے تھے اور مرزا غلام اللہ صاحب سے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ باتوں باتوں میں میرا بھی ذکر آیا۔ حضور نے فرمایا کہ کہاں ہے؟ تایا صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: حضور یہ ہے۔ حضور نے اس پر میری طرف جو دیکھا اور میں نے حضور کی طرف دیکھا۔ پس اس وقت حضور کے چہرہ مبارک پر مجھے نور ہی نور نظر آیا کہ میں اس کی تاب نہ لا سکا اور پھر اوپر دیکھنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ حضور کی نگاہ کیا تھی ایک نور کی بجلی تھی جو میرے قلب و جگر میں سرایت کر گئی اور اس وقت سے میرے ایمان کو مضبوطی عطا کر گئی اور میں آج تک اس ایمان پر خدا کے فضل سے مضبوطی سے قائم ہوں۔ حضور ہی مسیح موعود کے خلیفۂ برحق ہیں اور مصلح موعود ہیں جن کے ساتھ (دین) کی ترقی اس زمانہ میں وابستہ ہے۔ حضور کا سایہ جماعت کے علاوہ خاندان حضرت مسیح موعود اور دیگر سب عزیزوں کے لیے بھی سایہ رحمت ہے اور اس نے ہمیشہ ہی ہماری حفاظت فرمائی ہے۔

سیدی! میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی طرف سے حضور کو صدقِ دل سے وفاداری کا یقین دلاتا ہوں اور اب پھر اس کی تجدید کرتے ہوئے ہم آپ کے ساتھ مدینہ والا معاہدہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں اس عہد پر موت دے اور حضور کے سایہ رحمت کو ہم سب پر لمبا کرے۔ آمین''

جب میں نے انہیں دیکھا غالباً صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ چلتے پھرتے تھے لیکن کچھ اچانک صاحبِ فراش ہو گئے۔ معلوم ہوا ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ میں اس عرصے میں خود بھی ربوہ سے باہر منتقل ہو چکا تھا لہٰذا اس کے بعد انہیں نہیں دیکھا۔ کئی سال بعد الفضل میں ان کے انتقال کی خبر نظر سے گذری تو دل نے گہرائی سے ان کے لیے دعا نکلی۔

حضرت قاضی محمد عبداللہ حضرت مسیح موعود کے ۳۱۳ رفقاء میں سے تھے جنہوں نے حضور کی حیاتِ مبارکہ

ے دوران اکیس سال کی عمر میں اپنی زندگی وقف کرنے کی توفیق پائی۔ انہیں انڈین مشن میں اور ملک ے اند [illegible] کی تحریک کے دوران بے مثال خدمات کی توفیق ملی۔ وہ ایک عرصہ تک تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے ہیڈ ماسٹر اور سلسلہ کے قاضی رہے اور انہیں کشمیر کمیٹی کے حوالے سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔

جب میں نے قاضی صاحب کو دیکھنا شروع کیا وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے لیکن اس کیفیت میں بھی بہت تیز قدموں سے تقریباً بھاگتے ہوئے بیت یادگار کی طرف جا رہے ہوتے تھے۔ کمزوری صحت کے باوجود چال میں اس قدر تیزی میرے لیے حیران کن تھی لیکن مجھے ان کی وفات کے بعد پتا چلا کہ یہ بھی اعصابی کمزوری کی ایک شکل ہے اور جب جسم پر دماغ کا کنٹرول کمزور پڑ جائے تو بعض افراد کی چال غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ میں نے بعد میں امی کو بھی دیکھا جو کمزوری کے باوجود گھر میں چلتے ہوئے تقریباً بھاگنے لگتی تھیں۔ ان کی یہ کیفیت کچھ ہی عرصہ رہی جس کے بعد وہ چار پائی کے ساتھ لگ گئیں۔

میں جماعت میں قاضی صاحب کے مقام سے بخوبی آگاہ تھا لہٰذا وہ جب بھی نظر آتے میں انہیں بہت ہی ادب سے ملتا۔ وہ اب بہت اونچا سننے لگ گئے تھے اور مخاطب کی بات سمجھنے کے لیے بالعموم اپنا دایاں ہاتھ کان کے قریب لے جاتے تھے لیکن مخاطب کی ذرا سی کوشش سے اس کی بات سمجھ لیتے۔ ایک ہی محلہ کے رہائشی ہونے کے ناطے وہ مجھے بخوبی پہچانتے تھے اور جب ملاقات ہوتی انتہائی شفقت سے پیش آتے۔

مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ ۱۹۶۷ء اور پھر ۱۹۶۸ء میں جب میں ایم اے کا امتحان دے رہا تھا میں قاضی صاحب کے پاس خاص طور پر حاضر ہو کر دعا کے لیے درخواست کیا کرتا تھا۔ مجھے بعض دیگر بزرگان کی طرح ان کا اسی وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا تو یاد نہیں البتہ وہ ہمیشہ دعا کا وعدہ کیا کرتے اور میں سمجھتا ہوں کہ میری کامیابی میں ان کی دعاؤں کا بھی دخل تھا۔ وہ حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کے پڑوسیوں میں سے تھے۔ ان کی طرح مجلسی تو نہ تھے مگر لوگ دعا کے لیے ان کے پاس بکثرت حاضر ہوتے رہتے تھے۔

قاضی صاحب کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کا نام کلثوم بانو تھا لیکن وہ ذہنی طور پر مختل تھیں۔ اس اہلیہ سے ان کی ایک ہی بیٹی تھی، امۃ الوہاب۔ وہ پرائیویٹ سیکرٹری آفس کے کارکن، عبداللطیف المعروف ''نھا'' سے بیاہی ہوئی تھیں۔ کسی زمانے میں لطیف نھا بھی انجمن کوارٹرز میں رہائش پذیر تھے اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح متعارف تھے۔ امۃ الوہاب کبھی کبھی ہمارے ہاں آیا کرتی تھیں لیکن قاضی صاحب کی اہلیۂ ثانی، امۃ الرشید تو امی کی گہری سہیلی تھیں اور میں اپنے بچپن سے انہیں اپنے گھر آتا جاتا دیکھتا تھا۔ موصوفہ جب بھی آتیں میرے سر پر ضرور ہاتھ پھیر کر دعاؤں سے نوازتیں۔

حضرت قاضی محمد عبداللہ نے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۲ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ وہ حضرت مسیح موعود کے تین سو تیرہ رفقا میں سب سے آخر میں وفات پانے والے رفیق تھے۔

قاضی صاحب کی وفات پر چالیس سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے اور ان کی اہلیہ بھی اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن سچ پوچھیں تو میں اپنی یاد کے دریچوں سے ان دونوں کو آج بھی اسی طرح چلتا پھرتا دیکھ رہا ہوں۔

خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

حضرت قاضی محمد عبداللہ کا ذکر خیر ختم کرنے سے پہلے میں تحدیث نعمت کے طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بطور ہیڈ ماسٹر، تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کیریکٹر سرٹیفکیٹ جو میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب کو جاری کیا گیا تھا میرے پاس محفوظ ہے اور بطور تبرک اسے یہاں نقل کیا جارہا ہے:

T.I. High School

Qadian

9-6-25

This is to certify that Muhammad Yaqoob S/o Mirza Muhammad Ashraf studied in this school for about 10 years and passed his M.S.H.C. Examination of the Punjab University held in 1924. Bears to the best of my knowledge an excellent moral character. He was very regular in his studies and obedient to his teachers.

I wish him success in his future life.

(Signed)

Qazi Muhammad Abdullah

Head Master

موضع نون ضلع گجرات کے رہنے والے مولوی فضل دین وکیل حضرت بھائی عبدالرحیم قادیانی کے داماد اور میرے تایا، محمد اسحٰق کے ہم زلف تھے لیکن اُس زمانے میں ربوہ کے تمام باسی ایک دوسرے کے ساتھ محبت واحترام کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے چنانچہ ہمیں یوں ہی محسوس ہوتا گویا بظاہر کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود ہمارے درمیان کوئی بہت گہرا رشتہ ہو۔ ان کی بڑی بیٹی، کشور میرے تایا زاد محمد رفیع سے بیاہی گئیں تو اس تعلق میں مزید مضبوطی پیدا ہوگئی۔

انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے زمانہ میں حضرت مولوی غلام نبی مصری کی تحریک پر بیعت کی تھی اور انہیں حضور سے تلمذ کا شرف حاصل رہا۔ یہیں ان کی دوستی شیخ محمد تیمور سے ہوئی جو تاحیات قائم رہی۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے قانون کی تعلیم ان ہی شیخ محمد تیمور کے مشورہ پر حاصل کی تھی۔

مولوی فضل دین کی رہائش ہم سے دُور نہ تھی لہٰذا بیت یادگار میں نمازوں پر ان سے ضرور ملاقات ہوجاتی۔ ان کا قد چھوٹا اور جسم منحنی تھا۔ سر پر ہمیشہ ڈھیلی ڈھالی پگڑی باندھتے اور بہت انکساری کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کی چھوٹی بیٹی، بشریٰ کی شادی پروفیسر محبوب عالم خالد کے صاحبزادے منور شمیم خالد کے ساتھ انجام پائی تھی۔ مولوی صاحب نے ہم سب اہلِ خانہ کو اس موقع پر دعا کے لیے مدعو کر رکھا تھا۔ ہم اس شادی میں شامل بھی ہوئے

چاہتے تھے لیکن عین اسی روز ابا جی پر فالج کے حملہ کی وجہ سے ہمارے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس وقت یہ بات کسی کے
وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ بشریٰ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔
وہ ''پلیڈر'' کہلاتے تھے۔ عبدالرحمٰن شاکر کے الفاظ میں اُن دنوں ''اورینٹل کالج لاہور میں بی او ایل کی
کلاس ہوتی تھی۔ وہ مولوی فاضل اور منشی فاضل کے بین بین کورس ہوتا تھا اور ساتھ قانون بھی پڑھاتے تھے۔
تکمیلِ تعلیم پر یہ لوگ مختارِ عدالت کہلاتے تھے۔ ہمارے مولوی فضل دین صاحب ......اسی قسم کے وکیل تھے۔'' وہ
صدر انجمن احمدیہ کے مشیر قانونی بھی رہے اور انہوں نے جماعت کے خلاف بعض اہم مقدمات کی کامیابی کے ساتھ
پیروی کی۔

محمد احمد مظہر ایڈووکیٹ سابق امیر جماعت احمدیہ فیصل آباد نے اپنے ایک مضمون مشمولہ ''حیاتِ حضرتِ مختار''
مؤلفہ سلیم شاہجہانپوری میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے فضل دین وکیل کی جماعتی خدمات
کا اعتراف بعض ریزولیوشنز کے ذریعہ بھی کیا گیا ہے چنانچہ وہ مقدمۂ بیت شاہجہانپور کے تعلق میں صدر انجمن احمدیہ
کے درجِ ذیل ریزولیوشن کا خاص طور پر حوالہ دیتے ہیں جو حافظ سید مختار شاہجہانپوری کی تحریک پر پاس کیا گیا تھا:
''نقل ریزولیوشن نمبر ۶۳ ۴ مجلس معتمدین صدر انجمن احمدیہ قادیان۔ رپورٹ ناظر اعلیٰ کہ مقدمہ
بیت شاہجہانپور میں مولوی فضل دین صاحب نے مسلسل تین ماہ محنت کی ہے اور اسی طرح محمد احمد صاحب پلیڈر نے
ایک ماہ چند روز اور مولوی غلام احمد صاحب مولوی فاضل نے بھی محنت کی ہے اور چودھری ظفر اللہ خان صاحب نے
مقدمہ میں خوب بحث کی ہے۔
سلسلہ کے وقار کو ان حضرات کی کوششِ جاں کاہ اور محنتِ عظیم سے بہت نفع پہنچا ہے۔ سید مختار احمد صاحب
لکھتے ہیں کہ مولوی فضل دین صاحب اور محمد احمد صاحب نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ دن رات لگا تار
محنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی انہیں جزائے خیر دے سکتا ہے۔ پس میں سمجھتا ہوں کہ مجلس ان چاروں احباب کی محنت
کے اعتراف کا اور شکریہ کا ووٹ پاس کرے۔
پیش ہو کر فیصلہ ہوا کہ واقعی مولوی فضل دین صاحب اور محمد احمد صاحب اور مولوی غلام احمد صاحب نے جس
محنت اور جانفشانی سے اس مقدمہ کی پیروی میں کوشش کی ہے وہ خاص طور پر قابلِ شکریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے
خیر دے اور آئندہ سلسلہ کی پیش از بیش خدمات بجالانے کی توفیق بخشے۔ ناظر اعلیٰ مجلس کی طرف سے ان ہر سہ
احباب کا تحریری شکریہ ادا کریں۔ مولوی فضل دین صاحب نے جس طرح اپنا قیمتی وقت دے کر نہایت قابلیت کے
ساتھ مقدمہ کی بحث کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کی خدمت میں بھی شکریے کا خط لکھا جائے گا اور حضرت امام
(امام جماعت الثانی) کی خدمت میں ان چہار احباب کے لئے دعاؤں کی تحریک کی جائے۔
ذوالفقار علی خان قائم مقام ناظر اعلیٰ۔
۱۵ فروری ۱۹۲۷ء''

موصوف بعد از وفات بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تین بیٹیوں (خورشید بی بی، کشور اور

بشریٰ) اور چار بیٹوں (صلاح الدین، عمادالدین، شاہد احمد اور طاہر احمد جاوید) سے نوازا تھا۔ بیٹیوں میں سے بشریٰ کے علاوہ خورشید بی بی اور بیٹوں میں سے صلاح الدین اور طاہر وفات پا چکے ہیں۔ یاد رہے کہ طاہر جو اپنے ہمجولیوں میں ''طاہری'' کے عرف سے معروف تھے سکول کے زمانے سے ہمارے کلاس فیلو تھے۔ وہ ایک محنتی اور لائق طالب علم تھے اور ہاکی کے ایک اچھے کھلاڑی۔ بعد میں وہ نیوی میں چلے گئے۔ ان کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں کسی اور جگہ موجود ہے۔

مولوی فضل دین بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں ''نعم الوکیل'' ''بہائی مذہب کی حقیقت'' اور ''جماعتِ مبائعین کے عقائدِ صحیحہ'' شامل ہیں۔

شجاعت علی قریشی جن کا تعلق متحدہ ہندوستان کی ریاست جیند سے تھا انسپکٹر بیت المال کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان کے متعلق دو باتیں مشہور تھیں: اول یہ کہ صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت میں آنے سے پہلے انہوں نے بیس سال تک انسپکٹر بیت المال کی حیثیت میں رضا کارانہ طور پر کام کیا تھا اور یہ کہ وہ ہر سال اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔

محمد اصغر قمر جو شجاعت علی قریشی کے داماد ہیں ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک حالیہ ملاقات میں مجھے بتایا کہ ان کے سسر نے پانچ جون ۱۹۷۹ء کو اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مومن جی جن کا اصل نام خدا بخش تھا پٹیالہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور نجاری کے پیشے سے منسلک تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ مومن جی کی پیدائش کے جلد ہی بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا جس پر ان کی ایک پھوپھی نے انہیں گود لے لیا۔ وہ ابھی لڑکپن کی عمر میں تھے کہ ان کی پھوپھی نے انہیں اپنا ایک خواب سنایا جس میں انہوں نے دیکھا تھا کہ امرتسر کی طرف ایک اسلامی مرکز قائم ہوا ہے اور یہ کہ وہ انہیں اپنی جیب سے کچھ رقم دے کر وہاں جانے کی ہدایت دیتی ہیں۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جوں ہی مومن جی کو حضرت مسیح موعود کے دعویٰ کی خبر ملی انہوں نے پٹیالہ کے دیگر دوستوں یعنی حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ اور حضرت شیخ محمد افضل پٹیالوی کے ساتھ ۱۹۰۲ء میں حضور کی تحریری بیعت کر لی اور ۱۹۰۵ء میں خود قادیان جا کر حضور کی زیارت اور دستی بیعت سے مشرف ہوئے۔

وہ بعد میں پٹیالہ کی سکونت ترک کر کے قادیان میں رہائش پذیر ہو گئے اور قیامِ پاکستان کے بعد ربوہ آ گئے۔

جب سے میں انہیں دیکھنا شروع کیا وہ ایسٹرن پرفیومری کمپنی میں کام کرتے تھے۔ وہ کچے کوارٹروں میں ہمارے ساتھ والی گلی میں رہائش پذیر تھے اور جب صدر انجمن احمدیہ کے پختہ کوارٹرز تعمیر ہوئے تو وہاں منتقل ہو گئے۔ انتہائی منکسر المزاج، حلیم الطبع اور عبادت گذار تھے۔ میں نے ان کے علاوہ ان کی اہلیہ فضل بی بی، ان کے چاروں بیٹوں یعنی عبدالشکور اسلم، عبدالوہاب، عبدالسمیع اور شہاب الدین اور تمام بیٹیوں کو قریب سے دیکھا ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک شریف، تعلیم یافتہ اور عزتِ نفس رکھنے والا خاندان تھا جس کے کسی فرد نے

محنت کو عار نہیں سمجھا اور جہدِ مسلسل سے معاشرے میں اپنے لیے ایک قابلِ ستائش مقام حاصل کیا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے تعلیم الاسلام کالج ربوہ اور بعد میں ایچی سن کالج لاہور میں لیکچرر رہے۔ دوسرے بیٹے عبدالوہاب نے پی سی ایس ایگزیکٹو کا امتحان پاس کیا اور اب لاہور میں ریٹائرڈ لائف گذار رہے ہیں۔ تیسرے بیٹے عبدالسمیع جنہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز فضل عمر ہسپتال میں ڈسپنسر کے طور پر کیا تھا لمبا عرصہ لیبیا رہنے کے بعد اب وفات پا چکے ہیں جب کہ شہاب الدین سویڈن میں مقیم ہیں۔

مومن جی کی سب بیٹیاں معلّمی کے پیشہ سے وابستہ رہی ہیں۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ استانی مومنہ نے مجھے پہلی جماعت میں پڑھایا تھا جب کہ ان کی دیگر بہنیں، امتہ الوہاب اور امتہ الرحمٰن بھی نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھاتی رہی ہیں۔ اب یہ تینوں بہنیں وفات پا چکی ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ مومن جی، ان کی اہلیہ اور ان کے بچوں کے بارے میں گفتگو کی غیر ضروری طوالت آپ کے مزاج پر گراں گذر سکتی ہے لہٰذا میں اس بات کو یہیں ختم کر کے اب ذکر کر رہا ہوں چوہدری امیر احمد بسرا کا۔

لمبے تڑنگے اور دیہاتی وضع کے چوہدری امیر احمد بیت المال میں ہوا کرتے تھے۔ وہ انجمن کوارٹرز کے ان معدودے چند مکینوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی ضرورت کے تحت گائے بھینسیں گھر میں پال رکھی تھیں۔ جب بھی سادہ لیکن مخلص سے چوہدری امیر احمد سے آمنا سامنا ہوتا وہ بہت محبت سے ملتے اور یہی خوبی ان کے بچوں میں بھی تھی۔ میں نے ربوہ کی سکونت ترک کر دی اور وہ اس عرصے میں ریٹائر ہونے کے بعد ناصر آباد میں اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے۔ سوئے اتفاق اس سارے عرصہ میں ان سے کبھی رابطہ نہیں ہوا۔

ان کے سب سے بڑے بیٹے، منیر احمد بسرا کالج میں مجھ سے ایک سال سینئر تھے لیکن کسی وجہ سے ان کی پڑھائی میں تسلسل قائم نہ رہ سکا چنانچہ انہوں نے ایم ایس سی کا امتحان مجھ سے ایک سال بعد ۱۹۶۸ء میں پاس کیا۔ وہ چھ سال نصرت جہاں سکیم کے تحت گیمبیا کے احمدیہ سکولز میں خدمات انجام دیتے رہے اور واپسی پر پاکستان میں اپنا کاروبار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی پر ۱۹۹۷ء میں جرمنی چلے گئے۔

منیر بسرا کی شادی میری اہلیہ کی ایک خالہ زاد، صبیحہ کے ساتھ ہوئی جو چوہدری عطاء اللہ بنگوی، سیکرٹری، انسٹیٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس، کراچی کی صاحبزادی ہیں۔ مجھے چوہدری امیر احمد کی وفات کی خبر قدرے تاخیر کے ساتھ ان ہی کے ذریعہ ملی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مجھے اب یاد نہیں کہ چوہدری عزیز احمد سے میری علیک سلیک کس طرح شروع ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ملتے بہت پیار کے ساتھ اور حال احوال پوچھے بغیر کبھی آگے نہ جاتے۔ ان کی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے پروفیسر محمد رفیع انور کے ساتھ جان پہچان بلکہ شاید رشتہ داری تھی۔ ایم اے میں میرے ایک کلاس فیلو انور علی (جو بعد میں پاکستان سنٹرل ایکسائز اینڈ لینڈ کسٹمز میں آئے اور بطور چیئر مین کسٹمز ٹریبونل ریٹائر ہوئے) ان کی برادری میں سے تھے لہٰذا ہمیں ایک اور موضوع ہاتھ آ گیا اور جب ملاقات ہوتی تو ان دونوں کا ذکر ضرور بیچ میں آتا۔ آج میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے خیر خواہ تھے اور انہوں نے میری

بے روزگاری کے زمانہ میں تلاشِ معاش میں ممکن حد تک تعاون کیا۔ انہوں نے میرے لیے ایک رشتہ بھی تجویز کیا تھا جو کسی وجہ سے حتمی شکل اختیار نہ کر سکا۔

چوہدری عزیز احمد سلسلہ کے دیرینہ خادم تھے۔ جالندھر کے رہنے والے تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں احمدیت قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہیں اس پاداش میں گھر سے نکال دیا گیا لیکن وہ پورے استقلال سے اپنے فیصلے پر قائم رہے اور ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صدر انجمن احمدیہ میں بطور ہیڈ کلرک کیا لیکن ریٹائرمنٹ سے پہلے محاسب، ناظر بیت المال (آمد)، ناظر بیت المال (خرچ) اور ناظر صنعت وتجارت بھی رہے۔ چار جنوری ۲۰۰۲ء کو وفات پا کر بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔

مرحوم کا علمی ذوق قابلِ ستائش تھا۔ پرویز پروازی نے ان کی وفات پر کیا خوب لکھا تھا کہ ''کہیں سے کسی اچھی کتاب کی بھنک پڑتی تو وہ فوراً لائبریری کا رُخ کرتے۔ نہ ملتی تو کالج میں ہمارے پاس تشریف لاتے۔ کالج لائبریری میں بھی نہ ملتی تو لاہور میں تلاش کر ڈالتے۔ غرض جب تک وہ کتاب دیکھ پڑھ نہ لیتے۔ انہیں چین نصیب نہ ہوتا۔''

۱۹۹۵ء میں جب میری کتاب ''شوقِ ہمسفر میرا'' شائع ہوئی تو میں نے اس کا ایک نسخہ خالد گورایہ، پرنسپل نصرت جہاں اکیڈمی کو بھی بھجوایا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ چوہدری عزیز احمد کے داماد ہیں اور ان دونوں کی رہائش فیکٹری ایریا میں ایک ہی جگہ پر ہے۔ انہوں نے خالد گورایہ کے پاس یہ کتاب دیکھی تو پڑھے بغیر نہ رہ سکے اور پھر انہوں نے ۲۲ نومبر ۱۹۹۵ء کو تبصرے کے رنگ میں مجھے ایک طویل خط لکھا۔ اس خط کے بعض اقتباسات ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:

''آپ نے نہایت ظالمانہ کتاب لکھی ہے۔ میں نے دو تین دن ہوئے صبح کو پڑھنا شروع کی اور اتنا منہمک ہوا کہ نہا بھی نہ سکا۔ میری صحت کے لیے ہر روز نہانا ضروری ہے۔ رات کو پڑھ نہیں سکتا۔ رات عزیزم خالد گورایہ نے پڑھنا شروع کی۔ جب بھی پیشاب کرنے کو اُٹھتا ان کے کمرہ کی بتی جلتی دکھائی دیتی یعنی وہ کتاب پڑھنے میں مصروف ہوتے۔ میں نے اگلے دن صبح کتاب ختم کر دی۔ کاش! میں کوئی بہت مالدار ناشر ہوتا اور آپ کو اخراجاتِ سفر دے کر کہتا کہ اپنے محکمہ سے سال دو سال کی چھٹی لے کر دنیا کی سیر کرو اور دنیا کے باقی ممالک کے بھی سفر نامے لکھ کر میرے حوالے کر دو تا کہ میں انہیں .... شائع کر سکوں۔ آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ میری یہ خواہش محض خواہش تک ہی محدود رہے گی ورنہ اپنے محکمہ سے چھٹی لینا آپ کے لیے بہت گھاٹے کا سودا ہوتا۔

شہرت یافتہ ادیبوں کے سفرناموں میں زیبِ داستان بہت ہوتی ہے، داستان کم۔ اس کے برعکس آپ نے اپنی کتاب میں صرف حقائق درج کئے ہیں، کشیدہ کاری کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہر ملک کی قابل دید جگہوں اور قدرتی مناظر کی آپ نے خوب سیر کی اور انہیں قلمبند کرنے میں نہایت سلیس زبان استعمال کی اور موثر انداز اپنایا۔

آپ نے اچھا کیا کہ کافی ادویہ ساتھ لے گئے اور اپنے ساتھیوں کو امریکہ کے ڈاکٹروں کی لوٹ کھسوٹ سے بچا لیا۔ آپ کی تائید میں ایک واقعہ لکھتا ہوں۔ واشنگٹن کے ہسپتال میں میرے چچازاد بھائی کی بیٹی کا بہت بڑا

اور نہایت نازک آپریشن ہو رہا تھا۔ میرا بھائی اور اس کی بیوی آپریشن تھیٹر کے باہر نہایت پریشان حال بیٹھے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی اندر سے آپریشن کے بارہ میں اطلاع لا دے۔ اتنے میں ایک پاکستانی ڈاکٹر جو ان کا دوست تھا وہاں آ گیا۔ اسے کہا کہ وہ چونکہ ڈاکٹر کی حیثیت سے اندر جا سکتا ہے اس لیے اندر جا کر مطلوبہ اطلاع فراہم کرے۔ وہ اندر چلا گیا اور چند منٹ بعد باہر آ کر میرے بھائی کو تسلی دی کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ میرے بھائی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ آپریشن کے بل پر اس ڈاکٹر کی سروسز کے چارجز بھی درج ہیں۔

جب آپ لاس اینجلس میں کسی پاکستانی ہوٹل کی تلاش میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے تو مجھے بار بار خیال آیا تھا کہ آپ کو جلال الدین صاحب کے ہوٹل کا علم کیوں نہیں۔ آخر ان کا بھی ذکر آ گیا۔ ان کی جرمن نژاد بیوی ایک مثالی احمدی ہے۔ اگر جلال الدین صاحب سموسوں کو اشتہا انگیز آئٹم کے طور پر پیش کرتے ہیں تو میں انہیں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آخر وہ برادرم چوہدری صلاح الدین کے بھائی اور بہلول پور کے چوہدری جو ہیں۔''

اس خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ چوہدری عزیز احمد دینی امور میں چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھنے والے تھے۔ ملاحظہ ہو ان کے خط کا یہ پیرا گراف:

''آپ نے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اس محاورہ کے استعمال سے اس وجہ سے منع فرمایا ہے کہ یہ قرآن مجید کے ادب و احترام کے منافی ہے۔ ....''

پرویز پروازی نے ہفت روزہ لاہور میں ''بے ریش ولی'' کے عنوان سے ایک مضمون میں بعض دیگر بزرگان کے علاوہ چوہدری عزیز احمد کا بھی ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: ''نحیف سے آدمی تھے۔ پھیپھڑوں کی بیماری نے ایک پھیپھڑا برباد کر دیا، محض ایک کے سہارے جی رہے تھے۔ ...... ہمیں ان کے ساتھ دفتر میں کام کرنے کا موقع ملا۔ افسر کیا تھے خادم تھے۔ لہجے میں اتنی انکساری تھی کہ بیان سے باہر ہے'' اور مجھے ان کی ان ہی خوبیوں نے ان کے ذکر خیر پر مجبور کیا ہے۔

عبدالرحیم خان کاٹھگڑھی سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب وہ بیت یادگار کی تعمیر کے بعد نماز کی ادائی کے لیے باقاعدگی سے یہاں آنے لگے۔ ان کی طبیعت میں سادگی اور عجز تھا جو اُن کی چال ڈھال سے بھی عیاں تھا۔ جانے کس حیثیت میں انجمن میں ملازمت کا آغاز کیا تھا لیکن بطور آڈیٹر ریٹائر ہوئے۔ ایک محلے میں رہائش ہونے کے سبب میرا ان کے اکثر بچوں سے بھی تعارف تھا۔ عبدالسمیع، مبارک، منور اور مظفر، سبھی ان ہی کی طرح سادہ اور دیندار ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں جماعتی خدمت بھی بجالاتے رہے ہیں۔

جب میں مجلس خدام الاحمدیہ میں شامل ہوا تو مبارک ہمارے پہلے سائق تھے۔ مجھے اب بھی وہ شام یاد ہے جب انہوں نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے باہر بلایا۔ وہ مجھے یہ بتانے کے لیے آئے تھے کہ میرا نام مجلس خدام الاحمدیہ کی تجنید میں شامل کر لیا گیا ہے اور یہ کہ مجھے ان کی طرف سے مجلس کی سرگرمیوں کی اطلاع ملتی رہے گی جس میں مجھے حتی المقدور حصہ لینا ہے۔

مجھے ربوہ میں جب کبھی مبارک نظر آتے تو مجھے نصف صدی پرانا یہ واقعہ یاد آ جاتا اور ایسے محسوس ہوتا گویا یہ

کل ہی کی بات ہو۔

محمد حسین موٴذن کو طویل مدت تک بیت مبارک کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کی آواز بہت اچھی تھی اور اس بیت میں ندا بالعموم وہی دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں احمدیوں کی بیوت میں ندا پر کوئی پابندی نہ تھی لہذا بیت مبارک میں پانچوں وقت لاوٴڈ سپیکر پر ندا دی جاتی تھی اور الا ماشاء اللہ یہ ان ہی کی ذمہ داری تھی۔ اب محمد حسین اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن ان کی دی ہوئی ندا کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

ان کے دو بیٹے میرے دوستوں میں سے تھے۔ احمد حسین بڑے تھے اور راشد حسین چھوٹے۔ احمد حسین سکول میں ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر زندگی وقف کر کے جامعہ احمدیہ میں داخل ہو گئے لیکن کسی وجہ سے یہ سلسلہ بیچ میں ہی منقطع ہو گیا۔ محلہ میں اطفال و خدام کے اجلاسات میں اور ادھر اُدھر آتے جاتے ان سے بکثرت ملاقات رہتی۔ میں کبھی ربوہ جاتا اور وہ اتفاقاً مل جاتے تو بہت خوش ہوتے۔ ہم کچھ دیر اپنے سکول کی باتیں کرتے اور پھر اپنی اپنی منزل کی جانب گامزن ہو جاتے۔ اب کئی سال سے انہیں دیکھا نہ تھا۔ حال ہی میں راشد نے بتایا کہ وہ تو ۲۰۰۸ء میں وفات پا گئے تھے۔ سبب وہی تھا: دل کی بیماری!

عبدالحمید خان حضرت مسیح موعود کے ایک رفیق، حضرت محمد یوسف کے صاحبزادے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے نہ صرف خود احمدیت قبول کی بلکہ اپنے خاندان کے بہت سے افراد بشمول حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ کو نورِ احمدیت سے منور کرنے کا موجب ہوئے۔

موصوف نظارت امورِ عامہ میں ملازم تھے۔ ان کی اہلیہ اول وفات پا چکی تھیں اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی ان کی یادگار تھیں۔ بیٹے کا نام رشید احمد مبشر ہے اور وہ ائیر فورس میں تھے جب کہ بیٹی، امتہ الحمید شیخ نصیرالدین مربی سلسلہ کے ساتھ بیاہی گئیں۔

عبدالحمید خان کی دوسری اہلیہ جو قوتِ گویائی سے محروم تھیں اور اپنے خاندان میں ''ماسی گونگی'' کے نام سے پہچانی جاتی تھیں ان دنوں ان کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے عبدالباسط کالج میں مجھ سے سینئر تھے اور ایم اے کرنے کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں استاد کے طور پر کام کرنے لگے تھے۔ پھر وہ افریقہ کے کسی ملک چلے گئے۔ چھوٹا بیٹا عبدالقادر ان دنوں بہت ہی چھوٹا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ عبدالباسط کے ہمراہ بائیسکل کے ڈنڈے پر لگی ہوئی کاٹھی پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اب میں باسط سے رابطہ میں ہوں نہ قادر سے۔

صوبیدار عبدالمنان دہلوی جو افسرِ حفاظت خاص تھے اور قصرِ خلافت کے اندر رہائش پذیر تھے ابا جی کے دوستوں میں سے اور اسی حوالے سے میرے کرمفرماوٴں میں سے تھے۔ جب بھی ملتے اس اپنائیت اور محبت کے ساتھ کہ دل باغ باغ ہو جاتا۔ ابا جی کی وفات کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی، وہ میری اور امی اور بہنوں کی خیریت دریافت کئے بنا آگے نہ بڑھتے۔

موصوف کی خدمات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دنوں میں سکھوں کے ایک حملہ کے دوران سینہ پر گولی کھائی اور اس وجہ سے ایک لمبا عرصہ بسترِ علالت پر گذارا؛ انہوں نے فرقان فورس کے

رضا کاروں کو ابتدائی تربیت مہیا کی؛ محاذِ کشمیر پر فرقان فورس کی نصرت کمپنی کی کمان کی اور انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے سفرِ یورپ ۱۹۶۷ء کے دوران بطور افسرِ حفاظتِ خاص حضور کی ہمرکابی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

۱۹۷۱ء میں وہ عملہ حفاظت کی تربیت کے دوران ایک حادثہ کا شکار ہو گئے اور ان کی ریڑھ کی ہڈی فریکچر ہو گئی جس کی وجہ سے وہ افسر حفاظت خاص کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ۱۹۶۵ء میں ان کی بیٹی، امتہ الرحیم مسرت کے نکاح کا اعلان کرتے ہوئے ان کی خدماتِ سلسلہ کے اعتراف میں فرمایا: ''ان کے جماعت پر بہت حقوق ہیں۔ انہوں نے احمدیت..... کی طویل عرصہ تک خدمت کی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے موقع پر جب قادیان کے قریب واقع گاؤں ستھیالی پر سکھوں نے حملہ کیا تو اس گاؤں کے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے جو احمدی بھیجے گئے ان میں صوبیدار صاحب بھی شامل تھے۔ سکھوں کے ساتھ لڑتے ہوئے ان کے سینہ کے دائیں جانب گولی لگی مگر اللہ تعالیٰ کو ان کی زندگی عزیز تھی اس لیے اس نے انہیں بچا لیا۔ جس وقت یہ ستھیالی سے قادیان آئے تو ان کے سارے کپڑے خون سے سرخ ہوئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک لمبا عرصہ تک حضرت مصلح موعود کی خدمت کرتے رہے اور اب تک خدمت میں مصروف ہیں۔''

قاضی عبدالرحمٰن سیکرٹری مجلس کارپرداز سلسلہ کے اُن پرانے کارکنان میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مختلف عہدوں پر خدمتِ دین کی توفیق بخشی۔ وہ خلافتِ ثانیہ کے اوائل میں قادیان آئے اور ۱۹۶۱ء میں نظارت علیا سے ریٹائر ہوئے جس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے انہیں سیکرٹری مجلس کارپرداز مقرر کیا جہاں وہ کم و بیش دس سال کام کرتے رہے۔ ان ہی کے دور میں بہشتی مقبرہ کی ظاہری آرائش کے لیے درخت اور پھولدار پودے لگانے کا کام شروع ہوا۔

اُنہیں اللہ تعالیٰ نے دو بچوں سے نوازا تھا۔ صادقہ طاہرہ بڑی تھیں اور فضل الرحمٰن طاہر چھوٹے۔

صادقہ طاہرہ کی شادی حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ کے ایک بھتیجے، عبدالحمید خان کے فرزند، رشید مبشر سے ہوئی تھی جو اُن دنوں پاکستان ایئر فورس میں ملازم تھے۔

فضل الرحمٰن طاہر جنہیں ہم عام طور پر طاہری کہتے تھے سکول میں ہم سے ایک یا دو سال سینئر تھے۔ اطفال الاحمدیہ میں ہمارے سائق ہوا کرتے تھے۔ اُس عمر کے بچوں کی طرح کھلنڈرے سے تھے۔ ایک بار جب سیلاب آیا اور پانی بہشتی مقبرے والی پہاڑی کو چھونے لگا تو وہ ربوہ کے بہت سے دیگر لوگوں کی طرح محلّے کے دو لڑکوں کے ہمراہ یہ منظر دیکھنے کے لیے پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ جب وہ اتر رہے تھے تو اچانک ان کی نظر ایک سانپ پر پڑی جو اُن کے پاؤں پر ڈسنے والا تھا۔ وہ گھبرا گئے اور سانپ سے بچنے کے لیے غیر ارادی طور پر دوسری طرف مڑے لیکن اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے اور لڑھکتے ہوئے نیچے آ رہے۔ اسی راستے میں ایک بڑا پتھر تھا جس کے ساتھ وہ ٹکرا کر رُک تو گئے لیکن شدید طور پر زخمی ہو گئے۔ ان کے ہمجولی انہیں اٹھا کر سیدھے فضلِ عمر ہسپتال لے گئے لیکن ان کے زخموں کی نوعیت ایسی تھی کہ ڈاکٹری مشورہ کے تحت انہیں اگلے ہی دن میو ہسپتال میں منتقل کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں سانپ کے ڈسنے سے محفوظ رکھا اور یہ زخم بھی آہستہ آہستہ مندمل ہو گئے۔

طاہری نے میٹرک کرنے کے بعد پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ سے الیکٹریکل میں ڈپلومہ حاصل کیا اور واپڈا میں ملازم ہو گئے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران مختلف مقامات پر تعینات رہے لیکن اب وہ ڈیرا غازی خان میں آباد ہیں۔

مولانا ابوالعطاء جالندھری کے ایک مضمون سے جو قاضی عبدالرحمٰن کی وفات پر الفضل میں شائع ہوا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہائی خوش خط، نفاست پسند، ذہین، ہمدرد، محنتی، مخلص اور قواعد وضوابط کے ماہر تھے۔

میں نے قاضی عبدالرحمٰن کا منظوم کلام سلسلہ کے اخبارات و جرائد میں کبھی نہ دیکھا تھا تاہم ایک بار انہوں نے غیر موصی احباب کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ شعر کہے جن میں انہیں نظامِ وصیت میں شامل ہونے کی تحریک کی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

خدمتِ دیں کا ہے گر شوق سخاوت بھی کریں
کچھ تو اس طور سے قرآن کی خدمت بھی کریں
دینِ (......) کی دنیا میں اشاعت بھی کریں
بیوگاں اور یتامیٰ سے مروّت بھی کریں
مال و املاک کا اِک عُشر خدا کو دے کر
لطف آتا ہے مگر آپ وصیت بھی کریں

جب طاہری سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے کہا: ''یہ درست ہے کہ اباجی کا کلام کہیں شائع نہیں ہوا۔ سچی بات ہے مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ شعر کہتے ہیں لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں سے ایک نوٹ بک ملی جس میں انہوں نے اپنی کچھ نظمیں اور غزلیں درج کر رکھی ہیں۔ مجھے یہیں سے پتا چلا کہ اباجی ''شیدا'' تخلص کرتے تھے۔

قاضی عبدالرحمٰن کی یہ غزل اسی ڈائری میں سے ماخوذ ہے:

تری حسرت بھی ہے اس دل میں تری یاد بھی ہے
یہ عجب دل ہے کہ ویراں بھی ہے، آباد بھی ہے
کٹ گیا دِن تو مرا، رات کی اب خیر نہیں
کُنجِ تنہائی بھی ہے، اک دلِ برباد بھی ہے
دِلربا تم جو نہیں اور کوئی ہے بھی کہاں
زُلفِ خمدار بھی ہے، حسنِ خداداد بھی ہے
شغل کیاہے دلِ مرحوم کا اب اس کے سوا
غم کا پابند بھی ہے، غم سے یہ آزاد بھی ہے
نہ سنو حالِ دلِ زار مری جاں! نہ سنو
قصۂ درد بھی ہے، ہجر کی روداد بھی ہے

وہ گلے ملتے بھی ہیں ملنے سے بیزار بھی ہیں
ہائے قربان محبت بھی ہے بیداد بھی ہے
طائر دل تری پرواز کے صدقے لیکن
دام پر پیچ بھی ہے پنجۂ صیاد بھی ہے
کیا کریں ہم دل ناشاد کا چارہ شیدا؟
خوگر ضبط بھی ہے، مائل فریاد بھی ہے

سید سردار حسین شاہ اوورسیئر جو صدر انجمن کے افسر تعمیرات کے لیے انجمن کی مختص رہائشگاہ میں مقیم تھے ۱۹۱۵ء میں بیعت کر کے سلسلہ احمدیہ میں شامل ہوئے۔ سرکاری ملازمت میں تھے لیکن سب کچھ تیاگ کر قادیان چلے گئے اور لمبا عرصہ افسر تعمیرات کے طور پر کام کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ عارف والا میں آباد ہوئے لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ارشاد پر ربوہ آ گئے اور تادم مرگ سلسلے کی خدمت میں مصروف رہے۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول، تعلیم الاسلام کالج، جامعہ نصرت اور بعض دیگر جماعتی عمارات ان ہی کی نگرانی میں مکمل ہوئیں۔

ان کی ایک صاحبزادی سیّدۃ الزہرا نے اپنے ایک مضمون میں ان کی سیرچشمی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے صاحبزادگان اور صاحبزادیوں کی ذاتی کوٹھیاں اپنی نگرانی میں تعمیر کروائی تھیں۔ کام کی تکمیل پر حضور نے کچھ رقم انہیں بطور انعام دینا چاہی تاہم انہوں نے یہ رقم قبول کرنے سے معذرت کر لی اور اسی وقت حضور کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دی۔ روایت کے مطابق سیدہ مہر آپا نے سید سردار حسین شاہ کو یہ رقم اپنے پاس رکھنے پر بہت اصرار کیا مگر انہوں نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا۔ دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ یہ رقم گھر لے آئیں اور بچوں کی کسی ضرورت کے پیشِ نظر ان کے قدم ڈگمگا جائیں۔

ان کے ایک بیٹے، خالد محمود جن کا شمار ربوہ کے فٹ بال کے اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا اور جو بعد میں ایم اے (سائیکالوجی) کے طالب علم کے طور پر پنجاب یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کے رکن بھی رہے میرے دوستوں میں سے تھے اور اُن کی ایک بیٹی، فریدہ آپی کی کلاس فیلو اور ان کی قریبی سہیلیوں میں سے تھیں۔

خالد محمود جو اپنے دوستوں کے حلقہ میں ''خالدی'' کے نام سے معروف تھے نے ایم اے کرنے کے بعد مسلم کمرشل بنک میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران بھی ایک احمدی کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ میں ایک بار میرپور (آزاد کشمیر) گیا تو ایم اے میں میرے ایک غیر از جماعت کلاس فیلو، محمد حسین وہاں کے الائیڈ بنک میں تعینات تھے۔ انہیں میرے ربوہ سے تعلق کا علم تھا چنانچہ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہیں کے رہنے والے خالد محمود ان کے جاننے والوں میں سے ہیں اور اگر میں پسند کروں تو ہم ان سے بھی مل سکتے ہیں۔ مجھے اس خبر سے ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوا چنانچہ ہم دونوں خالد محمود کے پاس ان کے بنک چلے گئے جہاں انہوں نے دفتری روایت کے مطابق ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ وہ تکمیلِ ملازمت کے بعد ۱۹۹۶ء میں بطور اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ ریٹائر ہوئے اور اس کے جلد ہی بعد وفات پا گئے۔ یہ واقعہ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۸ء کا ہے اور اس کی تفصیل ان کی اہلیہ جو کرنل

ستار بخش کی صاحبزادی ہیں کی زبانی سنئے: ''خالد واک میں بہت باقاعدہ تھے۔ وفات سے ایک روز پہلے وہ حسب معمول واک پر گئے تو انہیں جسم کے اندر کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ ان کے ساتھیوں نے پیشکش کی کہ وہ انہیں گھر یا ہسپتال پہنچا دیتے ہیں لیکن وہ خود ہی پیدل گھر پہنچے۔ ان کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ وہ لیٹ گئے۔ ہمارے قریب ایک احمدی دوست رہتے تھے۔ ان سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے Angised زبان کے نیچے رکھنے کا مشورہ دیا تاہم اس گولی کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی لہٰذا گھر پر موجود نہ تھی۔ وہ آئے۔ خالد نے گولی زبان کے نیچے رکھی۔ انہیں ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے معاینہ کے بعد انہیں داخل کرلیا لیکن وہ ایک ہی رات وہاں رہے اور اگلی صبح وفات پا گئے۔ ان کی تدفین اسلام آباد میں ہوئی۔''

فریدہ واہ آرڈیننس فیکٹریز کے ایک کارکن، مرزا محمد رفیق سے بیاہی ہوئی تھیں اور بستی لالہ رخ میں میرے چچازاد، منور احمد جاوید کے پڑوس میں رہا کرتی تھیں۔ اب وہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔

چوہدری غلام حسین اوورسیئر جو سید سردار حسین شاہ کے بعد کچھ عرصہ صدر انجمن احمدیہ کے افسرِ تعمیرات رہے اور اس حیثیت میں انجمن کوارٹر نمبر ا میں رہائش پذیر تھے سلسلہ کے پرانے خدام میں سے تھے۔ وہ اباجی کے واقف کاروں میں سے تھے اور ان کا بیٹا، سعید انجم میرا ہم جماعت تھا لہٰذا وہ جب بھی ملتے بہت پیار اور اپنائیت کے ساتھ۔ صدر انجمن احمدیہ میں اپنی ملازمت ختم ہونے کے بعد (یا شاید اسی دوران) محلّہ دارالبرکات میں رہائش پذیر ہو گئے۔ عرصے کے بعد ایک بار انجمن کے دفاتر کے پاس مل گئے۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چل رہے تھے اور ان کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ میرے لیے یہ منظر بڑا کربناک تھا۔ پتا چلا کہ ان کی ایڑی میں نمودار ہونے والی بظاہر ایک معمولی سی تکلیف بگڑ کر ایسی شکل اختیار کر گئی تھی کہ ٹانگ کٹوانے کی نوبت آ گئی۔

اس کے بعد میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا جس کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ میں ایم اے کرنے کے لیے لاہور چلا گیا تھا۔ اسی زمانے میں سعید انجم نے ان کی وفات کی خبر سنائی تو مجھے بے حد افسوس ہوا۔ زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ ان کا انتقال ایک لمبی اور تکلیف دہ بیماری کے بعد ہوا تھا۔

ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد چوہدری عبدالواحد، محاسب صدر انجمن احمدیہ کے قلم سے ان کے بارے میں الفضل میں ایک طویل مضمون شائع ہوا جس سے پتا چلتا ہے کہ چوہدری غلام حسین نے فاضل مضمون نگار کے بڑے بھائی چوہدری فضل الٰہی کے ذریعہ ۱۹۲۵ء میں اُس وقت احمدیت قبول کی تھی جب وہ بلّوکی میں محکمہ انہار میں ان کے ماتحت ٹریسر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اُن کے احمدی ہونے سے مخالفین کو ان کے خلاف ہر طرح کی شرارت کا موقع ہاتھ آ گیا لیکن چوہدری فضل الٰہی کی سرپرستی کی وجہ سے انہیں گونہ اطمینان رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ان کے اس مربی و محسن کا تبادلہ منٹگمری ہو گیا تو ان کے مخالفین شیر ہو گئے۔ چوہدری عبدالواحد کے الفاظ میں چوہدری غلام حسین نے: ''ایک دن ان ہی خیالات میں مستغرق ایک کاغذ پر، اللہ میاں کے نام خط، کا عنوان دے کر نیچے لکھا: ''اے میرے پیارے محسن! میرے پیارے خدا!! میرے قادر آقا!!! ان لوگوں نے مجھے سخت تنگ کر رکھا ہے۔ میرے دن رات کے چین کو تباہ کر دیا ہے۔ میں تیرے فضلوں سے تیرے بھیجے ہوئے مامور پر ایمان لایا ہوں مگر اس کا یہ مطلب تو

نہیں کہ مجھے سکون ہی نصیب نہ ہو۔ میرے لیے بہتر سامان پیدا فرما اور اگر میرا یہاں رہنا تیرے علم میں اچھا نہیں تو مجھے منٹگمری کھادڑ ڈویژن میں تبدیل کردے۔''

فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ یہ خط کسی طرح مخالفین کے ہتّھے چڑھ گیا۔ اس وقت چوہدری غلام حسین کی اس خواہش کا پورا ہونا امرِ محال نظر آتا تھا چنانچہ مخالفین نے اِن کا خوب خوب مذاق اُڑایا لیکن خدا کی شان دیکھیے تیسرے ہی دن تار آ گیا کہ ان کا تبادلہ کھادڑ ڈویژن میں کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے میں کچھ شک تھا حیران وششدر ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگے۔

میں سلسلہ احمدیہ کے مخلص فدائی خانصاحب مولوی فرزند علی خان کو بائیسکل رکشا پر دفتر آتے جاتے دیکھا تو کرتا تھا لیکن ان سے کبھی ملاقات کا موقع ملا نہ گفتگو کا۔ بس یہی سنتے تھے کہ نہایت بزرگ شخصیت ہیں۔ ہاں! میں دراز قد سرفراز خان جو اُن کا رکشا کھینچتے تھے اور انجمن ہی کے ملازم تھے کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور ہمارا جہاں آمنا سامنا ہوتا ہم ایک دوسرے سے مسکرا کر ملتے اور حال احوال پوچھے بغیر آگے نہ بڑھتے۔

سرفراز خان کا ایک دلچسپ واقعہ چوہدری عبدالعزیز ڈوگر نے اپنی کتاب ''یادِ حبیب'' میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضور قیامِ پاکستان سے قبل ایک بار ڈلہوزی تشریف فرما تھے۔ صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں ایک کارکن رات کے وقت بھی ٹیلی فون پر ڈیوٹی پر موجود رہتا تھا تا کہ حضور کو مرکز میں فوری نوعیت کا کوئی پیغام یا ہدایت بھجوانے میں دشواری نہ ہو۔ ایک بار حضور نے فون کیا تو ڈیوٹی پر مامور اہلکار کسی کام سے باہر نکلا ہوا تھا لیکن سرفراز خان بطور مددگار کارکن موجود تھے۔ انہوں نے فون اُٹھا لیا اور یہ جانے بغیر کہ دوسری طرف کون بول رہا ہے انہوں نے اپنا تعارف بطور ''نائٹ ناظر'' کرایا تاہم جب حضور نے انہیں جواباً کہا کہ میں نے تو کسی نائٹ ناظر کا تقرر نہیں کیا تو انہیں پتا چلا کہ ان کا مخاطب کون ہے۔ تب انہوں نے گھبرا کر اپنا نام بتایا تو حضور نے ان کی دلداری فرماتے ہوئے اپنا پیغام انہیں نوٹ کرا دیا۔

موصوف غیر شادی شدہ تھے۔ ایک بار انہوں نے بذریعہ الفضل اپنے لیے کسی ''غریب اور شریف الطبع باکرہ یا بیوہ خواہ مشرقی پنجاب سے بازیافتہ ہی ہو'' کے ساتھ رشتہ کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا مگر انہیں کامیابی نہ ہو سکی اور انہوں نے اسی کیفیت میں وفات پائی۔

منشی عزیز احمد کارکن دفتر وصیت صدر انجمن احمدیہ کسی زمانے میں انجمن کوارٹرز میں رہا کرتے تھے۔ وہ محلہ دارالصدر جنوبی میں اپنے زیرِ تعمیر مکان کی نگرانی کے دوران منڈیر سے نیچے گر کر شدید زخمی ہو گئے۔ انہیں بیہوشی کی حالت میں میاں محمد ٹرسٹ ہسپتال فیصل آباد لے جایا گیا جہاں انہوں نے ایک ہفتہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پائی۔ خوش قسمتی سے ان کا جنازہ نمازِ جمعہ کے بعد ہوا۔ میں اُن دنوں لاہور میں زیرِ تعلیم تھا لہٰذا ان کے جنازہ میں تو شامل نہیں ہو سکا تاہم بعد میں معلوم ہوا کہ اس جنازے میں اہلِ ربوہ ہزاروں کی تعداد میں شریک تھے۔

مرحوم نے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کے ایک بیٹے، داؤد احمد کے ساتھ میری خاصی

راہ ورسم رہی۔ داؤد محلہ دارالفضل شرقی، ربوہ میں چار کنال کے ایک پلاٹ میں سے ایک کنال کے مقاطعہ گیر تھے۔ انہوں نے یکم اپریل ۲۰۰۰ء کو ناظم جائیداد، صدر انجمن احمدیہ کو ایک خط کے ذریعہ اپنی اس خواہش سے مطلع کیا کہ وہ یہ پلاٹ جس کے نصف حصے پر پہلے ہی سے بیت الذکر تعمیر شدہ ہے لیکن اس کا انتقال صدر انجمن احمدیہ کے نام نہیں ہو سکا بیت الذکر کی تعمیر کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ اس بیت کا نام ان کے والدِ مرحوم کے نام پر ''بیت العزیز'' رکھنا منظور کر لیا جائے۔ ابھی یہ درخواست ناظم جائیداد کو پہنچی ہی ہوگی کہ داؤد اچانک وفات پا گئے۔ ان کے ورثاء نے مرحوم کی خواہش کے احترام میں ضروری کارروائی کی تکمیل میں ہر طرح معاونت کی جس کے بعد انجمن نے مرحوم کی طرف سے وقف کی یہ درخواست منظور کر لی اور ضروری کارروائی کے بعد دفتر کمیٹی آبادی کے ریکارڈ میں یہ رقبہ صدر انجمن احمدیہ کے نام منتقل ہو گیا۔

داؤد کی اہلیہ، امتہ الحمید مولوی محمد تقی (ساکن محلّہ دارالرحمت وسطی) کی صاحبزادی اور پیشہ کے اعتبار سے نرس ہیں۔ وہ ۱۹۷۲ء میں اپنے خاوند کے ہمراہ لیبیا چلی گئی تھیں۔ لیبیا کے سربراہ کرنل معمّر قذافی کے ہاں پہلے بیٹے یعنی سیف الاسلام کی پیدائش ان ہی امتہ الحمید کی نگرانی میں ہوئی۔

یاد رہے کہ ایک بار قذافی اپنڈیکس کے آپریشن کے سلسلہ میں ہسپتال میں داخل ہوئے تو صفیہ نامی ایک نرس نے اِن کی خوب دیکھ بھال کی۔ قذافی صفیہ کی زلف کے اسیر ہو گئے چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد انہوں نے اُس سے دوسری شادی کر لی۔ اِس پر اُن کی پہلی بیوی نے اُن سے علیحدگی اختیار کر لی اور اُن کا باقی وقت صفیہ کے ساتھ ہی گذرا۔ سیف الاسلام ان ہی صفیہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔

صفیہ اور قذافی کو امتہ الحمید کی جانے کون سی ادا پسند آئی کہ اِن دونوں نے اُنہیں سیف الاسلام کی نگہداشت کے لیے اپنے پاس رکھ لیا اور وہ کئی سال تک ان کے محل میں مقیم رہیں۔

اس زمانے میں موصوفہ کی دونوں بیٹیاں، عُظمیٰ اور مونا ربوہ میں اپنے نانا، مولوی محمد تقی کے پاس رہ رہی تھیں۔ قذافی چاہتے تھے کہ امتہ الحمید اپنی بچیاں طرابلس لے آئیں تا کہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ ان کی خدمت کر سکیں لیکن موصوفہ کو ان کی یہ پیشکش قبول کرنے میں انقباض تھا۔ جب قذافی اسلامی ملکوں کے سربراہان کی کانفرنس منعقدہ لاہور میں شمولیت کے لیے پاکستان آئے تو موصوفہ سے ان بچوں کا رہائشی پتا لیتے آئے۔ انہوں نے یہاں آ کر اپنے سفارت خانے کے ذریعہ مولوی محمد تقی کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنی دونوں نواسیوں کو ہمراہ لے کر اسلام آباد ان کے پاس آ جائیں۔ اس ملاقات میں مولوی محمد تقی کے سب سے بڑے داماد، ڈاکٹر عبدالکریم (جو چند سال پہلے سٹیٹ بینک آف پاکستان سے اکنامک ایڈوائزر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد محلّہ دارالعلوم شرقی میں اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہیں)؛ ڈاکٹر عبدالکریم کے دونوں صاحبزادے، عطاء الکریم اور رضاء الکریم اور یہ دونوں بچیاں موجود تھیں۔ اس موقع پر ان سب کا ایک گروپ فوٹو ہوا جس کی ایک کاپی آج بھی داؤد اور امتہ الحمید کے گھر میں آویزاں ہے۔ اس تصویر میں ڈاکٹر عبدالکریم، مولوی محمد تقی، کرنل قذافی اور مولوی محمد تقی کے ایک رشتہ دار جو دفتر خزانہ صدر انجمن احمدیہ میں اپنی ملازمت کی وجہ سے ''کریم خزانہ'' کے نام سے معروف تھے اور اب امریکہ جا چکے

ہیں ایک قطار میں کھڑے ہیں جب کہ سامنے عظمیٰ اور مونا (جواب ڈاکٹر بننے کے بعد اپنے اپنے گھروں والی ہو چکی ہیں) اور ڈاکٹر عبدالکریم کے چھوٹے بیٹے، رضاء الکریم (جواب امریکہ میں ہیں) کھڑے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم کے پاس اس موقع کی دو اور تصویریں بھی موجود ہیں۔ ایک میں اُن کے دو بچے یعنی عطاء الکریم جو کلینیکل سائیکالوجی میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اب امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں اور اُن کی بیٹی نبیلہ کرنل قذافی کے دائیں اور بائیں کھڑے ہیں۔

دوسری تصویر میں کرنل قذافی کی بیگم نمایاں ہیں۔ ساتھ ڈاکٹر عبدالکریم کی اہلیہ اور اُن کے دو بچے یعنی عطاء الکریم اور نبیلہ کھڑے ہیں۔

یاد رہے کہ وطن واپسی سے پہلے قذافی نے کئی افریقی ملکوں کا دورہ کرنا تھا۔ ان دوروں میں عظمیٰ اور مونا ان کے ساتھ رہیں بلکہ اخبارات میں شائع ہونے والی ان دوروں کی تصاویر کے مطابق قذافی نے بعض مقامات پر گارڈ آف آنر لیتے ہوئے ان بچیوں کو بھی اپنے ہمراہ رکھا۔ چاڈ کے بعد قذافی نے ابھی ایک دو اور ملکوں میں بھی جانا تھا تاہم یہاں پہنچ کر مونا کی طبیعت خراب ہوگئی چنانچہ قذافی نے ان بچیوں کو اپنے ایک معتمد خاص کے ہمراہ خصوصی جہاز میں لیبیا بھجوایا جہاں ان کے والدین ان کے منتظر تھے۔

چوہدری ظہور احمد کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا اور اس حیثیت میں ان کے پاس بہت سا ایسا مواد موجود تھا جو تاریخ آزادیِ کشمیر کا ایک اہم حصہ ہے۔ انہوں نے یہ داستان ہفت روزہ ''لاہور'' میں قسط وار لکھنا شروع کی تو احباب کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے چنانچہ یہی مضامین بعد میں ''کشمیر کی کہانی'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کی اشاعت کا پس منظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''آج کشمیر کا مسئلہ پاک و بھارت دونوں ملکوں میں جس گہری دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہے اُس کی تشریح و توضیح کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہر روز نہیں تو ہر دوسرے یا تیسرے دن اس پر کسی نہ کسی جریدے میں کوئی اداریہ، افتتاحیہ، تبصرہ یا تجزیہ ضرور شائع ہوتا رہتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر اکثر دُکھ ہوتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ، عدم واقفیت کی بنا پر یا سیاسی مصلحت اندیشیوں کے تحت مسلمانانِ کشمیر کی آزادی وفلاح کے لیے اوّلین ہمہ گیر تحریک جو آل انڈیا کشمیر کمیٹی نے شروع کی تھی کے بارے میں اکثر غلط یا غلط فہمی و غلط اندیشی پر مبنی باتیں شائع ہوتی ہیں۔ میں نے مقدور بھر ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش بھی کی۔ بیشتر جرائد کو خطوط بھی لکھے جن میں سے اکثر شائع بھی ہوتے رہے جس کے لیے میں متعلقہ جرائد کے مدیرانِ ادارۂ تحریر کا تہ دل سے ممنون ہوں لیکن یہ سلسلہ ان مراسلوں سے بھی نہ رُکا تو میرے بعض مخلص کرم فرماؤں کی طرف سے یہ اصرار شروع ہوا کہ اب اصلاح و تصحیح کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ تاریخ آزادیِ کشمیر کے ابتدائی حالات کو جو میری آنکھوں نے دیکھے ہیں اور جن کے دستاویزی ثبوت بھی میرے پاس محفوظ ہیں یادداشتوں کے کشکول سے نکال کر کسی موقر جریدہ کے وقیع کالموں میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ ان لوگوں کے آب زر سے لکھے جانے کے لائق کارنامے بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو جائیں جنہیں کسی تعصب یا سیاسی مصلحت اندیشیوں کے باعث مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یقیناً ان سے ایک دیانتدار

مؤرخ کوتحریکِ آزادی کشمیر کا حقیقی پس منظر و پیش منظر ترتیب دینے میں بہت مدد ملے گی۔

میں نے اس مضمون کی ترتیب ۱۹۶۵ء میں شروع کی تھی مگر میری مصروفیات کے باعث یہ سلسلہ تین سال کے طویل عرصہ پر پھیل گیا حتی کہ میری مقدرت و استطاعت کو ایک عظیم محسن کے کریمانہ التفات کا سہارا میسر آ گیا اور میں اسے بالآخر کتابی صورت میں پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔''

یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین نے اسے بالعموم بہت پسند کیا۔ دیکھئے تو سہی عبدالسلام اختر نے اس کتاب پر کس خوبصورت انداز میں تبصرہ کیا ہے:

ہر اک ورق ہے وفا و جذبہ ، خلوص کا دلنشیں فسانہ
کہیں یہ پیغامِ سرفروشی، کہیں یہ پندارِ عاشقانہ
وطن نوازی ، جگر فروشی ، سبک خرامی ، جنوں پناہی
نہیں ہے ہاتھوں میں تیغ لیکن وطن کی خاطر چلا سپاہی
یہ داستاں اہلِ درد کی ہے، اسے شہیدوں کی جان کہیے
اسے ستاروں کی ضَو سمجھئے، اسے گلوں کی زبان کہیے
زمانہ جانے گا ایک دن کس نے اپنے دل کا لہو بہایا
وہ کون سے سرفروش تھے جن سے پھول کلیوں نے رنگ پایا
مجاہدانِ وطن کے خوں سے چمن کے پودے رواں رہیں گے
ہزار ہو خوفِ خشک سالی مگر یہ چشمے رواں رہیں گے

چوہدری ظہور احمد ایک بے نفس و بے غرض انسان تھے۔ حال ہی میں مجلس انصاراللہ، سویڈن کے ترجمان ''الہدیٰ'' کے پندرھویں شمارے میں ان کا بیان کردہ ایک واقعہ جو یوں تو حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد کی سیرت وکردار کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے لیکن اس سے راوی کی نظامِ جماعت سے وابستگی اور بے غرضی کی صفات بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہیں میری نظر سے گذرا ہے۔ چوہدری ظہور احمد حضرت صاحبزادہ مرزا شریف کی طرف سے جنگ عظیم دوم کے دوران فوجی بھرتی کے لیے کی جانے والی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''ایسے وقت میں جب کہ بڑے بڑے لوگ ایک ایک ریکروٹ کی بھرتی کے سرٹیفکیٹ کے لیے سینکڑوں روپے بھی خرچ کرتے تھے ایسے تمام ریکروٹوں کی جو حضرت صاحبزادہ صاحب کے ذاتی اثر سے بھرتی ہوئے بھرتی کے سرٹیفکیٹ مجھے دلاتے رہے چنانچہ غالباً پینسٹھ ریکروٹوں کی بھرتی کے سرٹیفکیٹ مجھے ملے۔

ریکروٹمنٹ کے دفتر گورداسپور اور مرکزی دفتر لاہور میں Honours List کے بورڈ تھے۔ اس میں میرا نمبر تیسرا تھا لیکن حضرت صاحبزادہ صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جب کہ مجھ سے کم بھرتی کروانے والوں کو اراضی ملی میں نے کبھی اس کی خواہش نہ کی۔ ایک دفعہ ایک انگریز ڈپٹی کمشنر بھرتی کے پراپیگنڈہ کے سلسلہ میں قادیان آیا۔ حضرت صاحب نے میرا بھی تعارف کروایا اور فرمایا: انہوں نے اس قدر بھرتی دی ہے، اس کے علاوہ میرے بھرتی

کے دفتر کے انچارج ہیں اور بلا معاوضہ کام کر رہے ہیں۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگا: یہ تو مجھے ایک دفعہ بھی نہیں ملے۔ اگر ملے تو میں ان کے لیے زمین دیئے جانے کی سفارش کرتا۔ اس کے چند دنوں بعد مجھے اس انجمن سے جو پنجاب میں قیامِ امن کی خاطر حکومت نے بنائی ہوئی تھی رکن مقرر کیے جانے کی اطلاع آئی۔ ممکن ہے یہ اس ملاقات کا نتیجہ ہو۔''

ہمارے دیگر محلہ داروں میں چوہدری عبدالواحد بھی شامل تھے۔ چھوٹے قد اور منحنی جسم والے چوہدری عبدالواحد پرانے واقفینِ زندگی میں سے تھے جنہوں نے اپنے تایا چوہدری نظام الدین کے زیرِ اثر احمدیت قبول کی تھی۔ وہ گورداسپور سے ملحق موضع نبی پور کے رہنے والے تھے اور انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور سے ایف اے کرنے کے بعد زندگی وقف کی۔ اس حیثیت میں انہوں نے صدر انجمن احمدیہ کے مختلف دفاتر میں کام کیا۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھاتے رہے، سکول کے بورڈنگ ہاؤس کے ٹیوٹر رہے، جامعہ احمدیہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے، الفضل میں بھی کام کیا اور نائب ناظر بیت المال اور نائب ناظر اصلاح وارشاد رہے۔

اُن کی ایک خاص بات جس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ہندی، سنسکرت اور گورمکھی پر اُن کی دسترس تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ وِدیارتھی کا لاحقہ استعمال کرتے تھے۔

اُن کے اکلوتے صاحبزادے ماجد جو آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں بتایا کرتے ہیں کہ ان کے والدِ بزرگوار نے کلامِ پاک کے پہلے آٹھ پاروں اور ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' کا سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا اور یہ دونوں تراجم قادیان سے شائع ہوئے۔

جب ماجد سے اُن کے والدِ بزرگوار کے بارے میں بات کی جائے تو وہ بعض دلچسپ انکشافات کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: ''اُنہیں نہ صرف کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا بلکہ وہ اپنے فارغ اوقات ان کے مطالعہ میں گذارتے۔ ان کے پاس سلسلہ کی بے شمار کتابوں کے علاوہ ہندی، سنسکرت اور گورمکھی کی بہت سی کتابیں موجود تھیں جن پر لگے ہوئے نشانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ اِن کا کس گہری نظر سے مطالعہ کرتے تھے۔ وہ کتابوں کی بخوبی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ اگر ان کے پاس کسی کتاب کے دو دو نسخے ہوتے اور کوئی اُن سے ایک نسخہ طلب کر لیتا تو وہ اس کی یہ فرمائش کبھی پوری نہ کرتے بلکہ جواب دیتے کہ اگر کسی شخص کے دو بیٹے ہوں تو کیا وہ اپنا ایک بیٹا کسی دوسرے شخص کو دے سکتا ہے۔''

ماجد ہی کی روایت کے مطابق قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی دنوں میں پاک فوج کے ایک کرنل اُن کے پاس تشریف لائے اور بتایا کہ فوج کو ایک ہندی اور سنسکرت سمجھنے والے کی ضرورت ہے لہٰذا اگر وہ فوج میں شمولیت اختیار کر لیں تو اُنہیں میجر کی تنخواہ اور مراعات دی جائیں گی۔ تب انہوں نے اس کرنل کو بتایا کہ وہ واقفِ زندگی ہیں لہٰذا وہ یہ پیشکش قبول نہیں کر سکتے۔ اس کرنل نے وضاحت کی کہ اگر اُن کی تنخواہ میجر سے زیادہ ہے تو وہ یہ تنخواہ بھی ان کو دلا سکتے ہیں مگر آپ نے پھر بھی سلسلہ کی خدمت کو ترجیح دی۔ اسی طرح انہوں نے ایک بار پنجاب یونیورسٹی میں ہندی اور سنسکرت کے لیکچررشپ کی پیش کش بھی ٹھکرا دی۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ چوہدری عبدالواحد جلسہ سالانہ کے موقع پر پچاس زبانوں میں تقاریر والی

مجلس میں سنسکرت میں تقریر بھی کیا کرتے تھے۔
انہوں نے ۱۷دسمبر ۱۹۹۱ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔
مسعود احمد دہلوی جو اُن دنوں روزنامہ الفضل کے نائب ایڈیٹر تھے انجمن کوارٹرز ہی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کا جسم دُبلا، قد قدرے چھوٹا، چہرے پر سیاہ رنگ کی ڈاڑھی اور سر پر جناح کیپ ہوتی تھی۔ بالعموم اچکن ہی ملبوس ہوتے اور آتے جاتے ہمیشہ مسکرا کر ملتے۔ وہ دہلوی ہونے کے ناطے اردو میں بات کرتے اور بہت تحمل سے ہر سوال کا جواب دیتے۔ معلوم نہیں کیوں مجھ سے بہت پیار کرتے اور ابا جی کی وفات کے بعد مجھ سے میری پڑھائی اور تکمیل تعلیم کے بعد ملازمت کے حصول اور اس راہ میں حائل مشکلات کے بارے میں پوچھتے رہتے۔ میں ہمیشہ ان سے دعا کے لیے عرض کرتا اور مجھے یقین ہے وہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد بھی رکھتے ہوں گے۔ ابا جی سے ملنے کے لیے اکثر گھر پر تشریف لایا کرتے تھے۔ یقیناً کوئی علمی مسئلہ ہی گفتگو کا محور ہوتا ہوگا۔

ایک بار انہوں نے مجھ پر اس شفقت کا راز خود ہی کھول دیا اور فرمایا: ''آپ کے ابا جان کا مجھ پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ انہوں نے اس وقت جب میں صحافت کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا مضمون نویسی میں میری ضروری تربیت کی اور مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں الفضل میں اپنی ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن نبھا سکوں۔''

حال ہی میں مسعود دہلوی کی ''خودنوشت سوانح حیات'' نظر سے گذری تو مجھ پر ان کی عنایات کا راز مزید کھلا۔ وہ الفضل میں تقرر کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''چند دن کے بعد ہی محترم خواجہ (غلام نبی۔ ناقل) صاحب نے مجھ سے فرمایا صحافت محض خبریں مرتب کرنے تک محدود نہیں ہے، الفضل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی موضوع پر اسے مضمون لکھنے میں دقت پیش نہ آئے، آپ اپنے اندر مضامین لکھنے کی اہلیت پیدا کریں۔ آپ چھوٹے چھوٹے مضمون لکھنے کی مشق کریں، میں انہیں ٹھیک کر کے شائع کر دیا کروں گا۔ شروع شروع میں آپ کے مضامین معیاری نہ ہوں گے لیکن مشق جاری رکھنے سے چند ماہ میں آپ معیاری مضامین لکھنے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔ میں نے محترم مولوی محمد یعقوب صاحب طاہر انچارج صیغہ زودنویسی کو مضمون نویسی میں اپنا استاد بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ لمبا عرصہ تک الفضل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ وہ میرے تحریر کردہ مضامین کی اصلاح فرما دیا کریں۔ میں نے عرض کیا اگر میرا کوئی مضمون آپ کے نزدیک قابلِ اشاعت ہوگا میں وہ محترم ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا کروں گا۔ انہوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ میری اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ میں مضامین لکھ لکھ کر ان سے اصلاح کروانے کے بعد......... ایڈیٹر الفضل کی خدمت میں پیش کرتا رہا جن میں سے انہوں نے بعض مضامین الفضل میں شائع بھی کئے۔ ایک مضمون میں نے مطالبہ پاکستان کے حق میں بھی تحریر کیا جسے محترم خواجہ صاحب نے الفضل میں خاص اہتمام سے شائع کیا۔ بعد ازاں حکومتِ پاکستان کی طرف سے تحریک پاکستان کے متعلق لکھے جانے والے مضامین کی جو بہلو گرانی ایک ضخیم جلد میں شائع ہوئی اس میں اس مضمون کا ذکر بھی موجود ہے۔''

انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ''پھر مزید خدا کا فضل یہ ہوا کہ میں اس دور کے بعض چید

بزرگوں اور علمائے کرام کی خاص عنایات کا مورد بنتا چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب بزرگ ہستیوں کے دلوں میں مجھ ایسے کندۂ ناتراش کے لیے شفقت و محبت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور وہ سب مجھے آدابِ صحافت سکھانے اور میری صحافتی اہلیت کو سنوارنے میں کوشاں ہیں۔ ان بزرگ ہستیوں میں سے محترم مولوی محمد یعقوب صاحب طاہر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔''

مسعود دہلوی کی ایک صاحبزادی، سلمیٰ معذور تھیں۔ ہم ان کے کوارٹر کے سامنے سے گذر رہے ہوتے تو وہ گلی میں نظر آ جاتیں۔ سچ پوچھیں تو اس وقت مجھے اس بچی کی بیماری کی نوعیت نہ سمجھ آ سکی لیکن ان کی خودنوشت سے پتا چلا کہ معاملہ کیا تھا۔ مسعود دہلوی کے الفاظ میں ''زندگی وقف کرنے سے قبل ہمارے ہاں ایک بیٹی پیدا ہو چکی تھی جس کا نام سلمیٰ رکھا گیا۔ یہ بہت ہی خوبصورت اور پیاری بچی تھی لیکن ...... اسے ایک لاعلاج مرض لاحق ہو گیا اور وہ معذور ہوتی گئی۔'' مسعود دہلوی کی وفات پر الفضل میں چھپنے والے تفصیلی نوٹ سے پتا چلا کہ یہ بچی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اور سلمان نامی وہ بیٹا بھی جسے اس کے سنگی ساتھی پیار سے ''سلّو'' کہا کرتے تھے۔

خدا تعالیٰ مسعود دہلوی، سلمیٰ اور سلّو، تینوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے۔

مسعود دہلوی نے اپنی خود نوشت میں پنجاب یونیورسٹی کی جرنلزم کلاس کے حوالہ سے اپنی یادداشتوں میں ایک واقعہ کا قدرے تفصیلی ذکر کیا ہے جب انہوں نے ایک فی البدیہہ نظم سُنا کر حاضرین کے دل موہ لیے تھے۔ اگرچہ میں مسعود دہلوی کو برسوں سے جانتا تھا مگر میں ان کی اس صلاحیت سے قطعی بے خبر تھا۔ جب میں نے ان کے صاحبزادے، ڈاکٹر عمران کے سامنے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے بتایا: ''نہیں۔ وہ شعر کہتے تھے اگرچہ انہوں نے اپنے اشعار کبھی شائع نہیں کروائے۔ میرے پاس ان کا (اگرچہ بہت تھوڑا) غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔'' میری فرمائش پر انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی کچھ نظمیں مہیا کی ہیں۔ ان میں سے ایک پاکستان کے داخلی خلفشار کے پس منظر میں ۳۰ مئی ۱۹۹۰ء کو کہی گئی تھی۔ اس نظم کا عنوان ہے ''ظلم کی پاداش''۔

یہ نظم بطور تبرک اس کتاب میں شامل کی جا رہی ہے:

خون کا ذخّار دریا بہہ رہا ہے بے تکاں
ظلم کی پاداش اتنی ہو بھیانک، الاماں!
اس میں کیا شک ہے کہ مظلوموں کا ہوتا ہے خدا
اس حقیقت پر ہیں شاہد یہ زمین و آسماں
ظالموں کے واسطے اب کوئی بھی مأمن نہیں
نظم غارت ہوگیا، مفقود ہے امن و اماں
مر رہے ہیں حاکم و محکوم کیڑوں کی طرح
موتا موتی دیکھ کر ہے ہر کوئی ماتم کناں

ہاتھ کھینچیں ظلم سے، توبہ کریں اس کے حضور
رحم کھائے اُن پہ تاکہ وہ خدائے مہرباں
جو خدا کا ہے اہانت اُس کی کرنا چھوڑ دیں
تا نہ ہو اپنے ہی ہاتھوں اپنی جانوں کا زیاں
اے خدا! تُو رحم کر، ان کو ہدایت کر عطا
کھینچ لا حق کی طرف اُن کو ہمارے درمیاں

مسعود دہلوی کی شاعری میں طنز و مزاح کے نشتر بھی ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کی یہ نظم جو انہوں نے ربوہ میں چھبیس اپریل ۱۹۶۴ء کو کہی تھی اور جس کا عنوان ہے ’’قومی نشاں ہمارا‘‘:

کھا کھا کے ڈالڈا ہم کڑیل جواں بنے ہیں
ہے پیڑ ناریل کا قومی نشاں ہمارا
منہ چکنا پیٹ خالی، رُت اپنی ہے نرالی
ہے دیکھنے کے قابل پیر و جواں ہمارا
اہلِ دُکاں سے ہم کو اللہ اماں میں رکھے
خوں چوستے ہیں ظالم یہ بے تکاں ہمارا
شکوہ زباں پر ہم ہرگز نہیں ہیں لاتے
ہم کو نہیں ڈراتا سود و زیاں ہمارا
اللہ کے ہم ہیں بندے ہے آسرا اسی پر
دنیا سے واسطہ کیا ہے آسماں ہمارا
یاں پہ اُٹھا کے کُلفت عقبیٰ میں پاؤ راحت
دیتا ہے یہ دلاسہ ہم کو قرآں ہمارا
(......) کے ہیں خادم خدمت میں ہی مگن ہیں
خادم بنے گا کل کو سارا جہاں ہمارا

صدر انجمن احمدیہ کے کوارٹر نمبر ۲۵ میں حضرت سیٹھ ابوبکر یوسف، رفیق حضرت مسیح موعود مقیم تھے۔ وہ سیّدہ امِ وسیم کے والدِ بزرگوار اور سید کمال یوسف، مربی سلسلہ اور سید جمال یوسف، کارکن دفتر پرائیویٹ سیکرٹری کے دادا تھے۔ ۱۹۵۵ء میں اُن کی وفات کے وقت میری عمر بمشکل دس سال تھی لہٰذا مجھے اُن کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع تو نہیں ملا البتہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ پتا چلا کہ وہ ’’عرب صاحب‘‘ کہلاتے تھے، اپنے وقت میں ہیروں کے تاجر تھے اور ایک پُرتعیش زندگی کے عادی تھے تاہم حالات نے پلٹا کھایا تو وہ دو کمروں کے ایک کوارٹر میں زندگی گذارنے پر مجبور ہو گئے۔ بڑھاپا، طرح طرح کی بیماریاں، وسیع عیال داری اور غربت نے مل کر اُن کی

مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا تھا جسے انہوں نے صبر اور استقلال سے ساتھ برداشت کیا۔

آہستہ آہستہ یہ بھی پتا چلا کہ ان کی پیدائش گجرات کاٹھیاواڑ کی تھی لیکن پچھلی کچھ صدیوں سے ان کے
آباء واجداد کے گھر عرب اور گجرات کاٹھیاواڑ، دونوں جگہوں پر تھے۔ عرب میں ان کی زیادہ تر رہائش جدہ میں رہتی
اور تجارت پیشہ ہونے کے ناطے اُن کا دونوں ملکوں میں آنا جانا لگا رہتا۔
انہوں نے اپنے ایک خواب کی بنیاد پر حضرت مسیح موعود کی زندگی میں بیعت کی۔ قبول احمدیت کے بعد
مخالفت کی وجہ سے اُنہیں جدہ بھی چھوڑنا پڑا اور گجرات کاٹھیاواڑ بھی چنانچہ خلافتِ ثانیہ کے عہد میں وہ ہجرت کر کے
ہمیشہ کے لیے قادیان آ گئے۔

سنتے ہیں قادیان میں ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ غیر منقولہ جائیداد تھی جسے انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا
تاہم ہنگامی ضرورت کے تحت وہ اپنے پاس موجود ہیروں میں سے کوئی ہیرا بیچ دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ جس روز کوئی ہیرا
فروخت ہوتا وہ اہلِ قادیان کی دعوت کرتے اور جہاں جہاں ضیافت بھجواتے وہاں سے برتن واپس نہیں لیتے تھے۔
وہ ایک تہائی کے موصی تھے۔

ان کے صاحبزادے، سیٹھ محمد سعید یوسف میری ہوش میں زندہ تھے اگرچہ عمروں کے تفاوت نے ان سے
بھی کبھی بے تکلفانہ گفتگو کا موقع نہ دیا۔ میں نے جس زمانے میں انہیں دیکھا ان کی باقاعدہ مصروفیت غالباً کوئی نہ تھی
چنانچہ وہ موسمِ سرما میں دن کے وقت اور موسمِ گرما میں شام کے وقت گھر سے باہر نکل کر اُس دیوار پر بیٹھے رہتے جو
انجمن کوارٹرز کو دفاتر صدر انجمن احمدیہ سے الگ کرتی ہے۔ صاحبِ رؤیا تھے۔ ان کے صاحبزادے سید کمال یوسف
سابق مربی سکینڈے نیویا نے میرے سامنے اپنی بھابھی، منیرہ کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ایک روز ان
کی طبیعت سخت خراب ہوئی اور ان پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ منیرہ اور گھر میں موجود باقی لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ
انتقال کر گئے ہیں رونا دھونا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور رونے کی وجہ
دریافت کی۔ جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے جواباً کہا کہ میری وفات فلاں روز صبح سویرے ہوگی تاہم اس کے
بارے میں شیخ بشیر احمد، سابق امیر جماعت احمدیہ، لاہور (جو اُن کے بہنوئی تھے) اور ان کے بھانجے، مرزا وسیم احمد کو
اس وقت تک مطلع نہ کیا جائے جب تک وہ ناشتہ سے یقینی طور پر فارغ نہ ہو چکے ہوں۔ خدا کی شان دیکھئے کہ اُن کی
وفات ان کے کہنے کے مطابق اُسی روز صبح کے وقت ہوئی۔

حضرت سیٹھ ابوبکر یوسف کی اہلیہ اول یعنی والدہ سیدہ امِ وسیم تو معلوم نہیں کب کی وفات پا چکی تھیں البتہ
اُن کی اہلیہ ثانی جو صفہ کے نام سے معروف تھیں اور اپنے چہرے مہرے سے یمنی لگتی تھیں ان کے پاس مقیم تھیں۔
صفہ سے حضرت سیٹھ ابوبکر یوسف کے تین بیٹے تھے: علی یوسف، یوسف بکر اور اسماعیل یوسف۔ علی یوسف میرے
ہم عمر اور میرے کلاس فیلو تھے بلکہ جس روز میں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول کی دوسری جماعت میں داخلہ لیا تھا سکول
کے رجسٹر داخل خارج کے مطابق وہ مجھ سے فوراً پہلے داخل ہوئے تھے۔ ان کا پڑھائی میں دل نہ لگا اور وہ میٹرک
کرنے سے پہلے ہی سکول چھوڑ گئے۔ یہی کیفیت ان کے باقی دونوں بھائیوں کی تھی۔

سیٹھ ابوبکر یوسف کے مالی حالات میں تبدیلی کی وجہ سے ان کی اہلیہ ثانی کی زندگی بہت تکلیف میں گذری۔ وہ اپاہج ہوگئی تھیں اوران کے لیے چلنا پھرنا دوبھر ہو چکا تھا۔

پچھلے دنوں میں قطعہ شہدا کے بعض مدفونین کی قبروں پر دعا کے لیے گیا تو اچانک مجھے مرحومہ کی قبر نظر آ گئی۔ میرے قدم خود بخود اس قبر پر دعا کے لیے رُک گئے۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ وہ خاتون جس نے اس دنیا میں بہت محرومی اور دُکھ کی زندگی گذاری تھی اگلے جہان میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے وافر حصہ پائے۔

علی یوسف اور اسماعیل یوسف شیخ بشیر احمد سابق امیر جماعت احمدیہ لاہور کے صاحبزادے، شیخ نصیر احمد، ایڈووکیٹ کے پاس گلبرگ میں مقیم ہیں۔ علی یوسف نے تو شادی ہی نہیں کی البتہ اسماعیل یوسف کی اہلیہ اور بچے جرمنی میں مقیم ہیں۔ حضرت سیٹھ ابوبکر یوسف کے تیسرے صاحبزادے، سید یوسف بکر جرمنی میں ہیں۔

انجمن کوارٹرز کے باسیوں میں سے ایک ملک گل محمد بھی تھے۔ دُبلے پتلے اور چھوٹے قد کے۔ بتایا جاتا تھا کہ پہلے سرکاری ملازمت میں تھے جہاں سے ریٹائرمنٹ پر زندگی وقف کر دی۔ جب میں نے انہیں دیکھا وہ دارالقضاء میں کام کرتے تھے اوران کے ساتھ ملاقات زیادہ تر بیت یادگار میں ہوا کرتی تھی۔

ڈاکٹر نذیر احمد ریاض جو کسی زمانہ میں جامعہ احمدیہ میں پڑھاتے تھے لیکن ۱۹۵۶ء کے فتنہ منافقین میں نظامِ جماعت سے الگ کر دیئے گئے ان ہی کے صاحبزادے تھے۔ وہ شاعر اور عمدہ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی اباجی کے ساتھ بھی دوستی تھی۔ اللہ نے اچھی شکل وصورت سے نوازا تھا۔ موسم گرما میں ململ کے سفید کُرتے اور لٹھے کی بے داغ شلوار میں ملبوس ہوتے۔ ہمارے گھر آتے تو کبھی بیٹھ بھی جاتے لیکن اکثر اباجی کے ساتھ باہر نکل جاتے۔

موصوف کی کتاب سیرت حضرت مولوی شیر علی حضرت مسیح موعود کے اس بزرگ رفیق کی ایک اچھی سوانح عمری ہے۔

۱۹۷۴ء میں میرا تبادلہ فیصل آباد سے راولپنڈی ہوا۔ ڈاکٹر نذیر احمد ریاض کو کسی طرح اس شہر میں میرے تقرر کا پتا چلا تو وہ میرے پاس تشریف لائے۔ اُن دنوں وہ بھابڑا بازار میں اپنا کلینک کرتے تھے۔ اگر چہ وہ جماعت سے نکالے جا چکے تھے تاہم وہ خود کو اپنے ماضی سے منقطع نہ کر سکے۔ مجھے ان کی یہ بات ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ جماعت سے اخراج کے فیصلے کے باوجود لوگ انہیں ''مرزائی'' سمجھتے ہیں جب کہ احمدی انہیں اپنا حصہ تصور نہیں کرتے۔ انہیں اپنی ایک بیٹی کے رشتے کے حوالے سے بڑی پریشانی تھی۔ کئی سال بعد جب میں پشاور میں تھا تو ایک بار وہ پھر مجھے ملے اور انہوں نے بتایا بمشکل تمام ان کی اس بیٹی کی شادی ایک غیر از جماعت خاندان میں ہوئی ہے تاہم وہ اس فیصلے پر پریشان سے تھے۔

مرزا عبدالحمید انجمن کوارٹرز کے قدیم ترین باسیوں میں سے تھے۔ ان کا تعلق قادیان کے مغل برلاس خاندان سے تھا۔ وہ قادیان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے وہیں تعلیم حاصل کی جس کے بعد ۱۹۱۷ء میں صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت اختیار کر لی۔

انہیں قادیان کے قدیمی رسائل تشحیذ الاذہان، ریویو آف ریلیجنز (اردو)، الفضل اور مصباح کے اوّلین کارکن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جہاں انہوں نے حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کی زیرنگرانی کم وبیش اکیس سال تک کام کیا۔ بعدازاں وہ نظارت بیت المال میں تبدیل ہوئے جہاں تقریباً اٹھائیس سال تک مفوضہ فرائض سرانجام دینے کے بعد وہ ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ یوں انہیں پچاس سال تک سلسلہ کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔

مرزا عبدالحمید کے بیٹے، مرزا عبدالشکور اور مرزا عبدالوحید ان دنوں انگلستان میں تھے چنانچہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں انگلستان چلے گئے۔ انہوں نے وہیں وفات پائی لیکن ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔

عام طور پر سُنا جاتا تھا کہ ان کی صاحبزادی امتہ الرشید کی شادی ربوہ میں ہونے والی پہلی شادی تھی۔ ایک بار میں نے اپنے تجسّس کے تحت تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ شادی ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ہوئی تھی اور الفضل (۲۷ مارچ ۱۹۴۹) کے مطابق ''یہ ربوہ کی سرزمین میں شادی کی' واقعتاً '' پہلی تقریب تھی۔''

یاد رہے کہ یہ شادی مرزا سلطان بیگ ابن مرزا عمر بیگ آف قادیان کے ہمراہ ہوئی تھی۔ مرزا سلطان بیگ اُن دنوں دارالسّلام، مشرقی افریقہ میں مقیم تھے اور ریلوے گارڈ کے طور پر کام کر رہے تھے۔

منظور احمد خان حضرت مسیح موعود کے رفیق حضرت محمد ظہور پٹیالوی کے صاحبزادے ہیں۔ وہ صدر انجمن احمدیہ میں خزانچی ہوا کرتے تھے۔ وہ ۱۹۷۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے تاہم انہوں نے اس کے بعد بھی ایک لمبا عرصہ فعّال زندگی گذاری اور آج کل محلّہ دارالعلوم غربی میں رہائش پذیر ہیں۔

ان سے کبھی گفتگو ہو تو وہ اپنی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات سناتے ہیں: ''جب میں ریٹائر ہوا تو میری پنشن بہت محدود تھی۔ اتفاق دیکھئے میرے ایک بھائی عبدالسمیع نے جو اُن دنوں ایران میں تھے مجھے ویزا بھجوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور مجھے اپنے کرم فرماؤں کی بدولت زاہدان میں ایک ملازمت مل گئی جہاں میری تنخواہ پاکستانی کرنسی میں ۳۵۰۰ روپے ماہوار مقرر ہوئی جو صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت کے دوران مجھے ملنے والی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ میں وہاں دو سال سے زیادہ عرصہ رہا لیکن ایرانی انقلاب کی وجہ سے ہماری کمپنی کو ایران سے اپنا کاروبار سمیٹنا پڑا اور میں واپس آ گیا۔ پھر میں مع اہل وعیال جرمنی چلا گیا اور بارہ سال تک وہاں رہا۔ الحمدللہ دنیاوی ضروریات بھی بطریقِ احسن پوری ہوتی رہیں اور جماعتی خدمت کی بھی توفیق ملتی رہی۔''

منظور احمد خان کو اللہ تعالیٰ نے طویل العمری کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور ان کی صحت بھی اچھی ہے۔ ''میں نے ساری زندگی حضرت مصلح موعود اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی شفقتوں سے وافر حصہ پایا ہے اور باقی خلفاء نے بھی مجھ پر ہر حال میں دستِ شفقت رکھا اور دعاؤں سے نوازا ہے'' ایک بار انہوں نے مجھے بتایا'' اور میں نے ان میں سے کچھ واقعات کی تفصیل الفضل (۲۲ ستمبر ۲۰۱۰) میں اپنے ایک مضمون میں بھی بیان کر دی ہے۔''

انجمن کوارٹرز کے قدیمی رہائشیوں میں ایک سید مبارک احمد سرور بھی تھے جو حضرت سید سرور شاہ کے صاحبزادے ہیں۔ اُن دنوں صدر انجمن احمدیہ میں مددگار کارکن کے طور پر کام کر رہے تھے۔ پھر کسی وقت بیرونِ پاکستان چلے گئے۔ ایک مدت کے بعد میں نے انہیں ۱۹۹۱ء کے جلسہ سالانہ قادیان کے موقع پر دیکھا۔ سفید براق

لباس اور سفید پگڑی میں ملبوس سید مبارک احمد کے ہاتھوں میں ایک مووی کیمرہ تھا اور وہ تینوں دن جلسہ کی کارروائی فلمبند کرتے نظر آئے۔ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جرمنی میں مقیم ہیں اور ہیمبرگ کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔

میں ایک بار یورپ کی سیر کو گیا تو ہمبرگ میں بھی قیام کا پروگرام تھا لیکن کسی وجہ سے میں فرینکفرٹ سے سیدھا اوسلو چلا گیا۔ وہاں سید کمال یوسف مربی سلسلہ سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں موصوف کا ذکرِ خیر بھی آ گیا۔ مجھے اس روز معلوم ہوا کہ سید مبارک احمد کی ایک صاحبزادی ان کے عقد میں ہیں۔

واپسی پر میں نے فون پر ان کے پاس حاضر نہ ہو سکنے پر معذرت کی تو انہوں نے انجمن کوارٹرز کے زمانہ کی باتیں چھیڑ دیں۔ ''آپ کو پتا ہے'' ان کی یہ بات میرے لیے نئی تھی ''آپ کے والد صاحب کی میت کو غسل میں نے دیا تھا۔''

یہ یقیناً ان کی ایک ایسی نیکی ہے جس کا اجر صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

بابو غلام رسول دفتر آڈیٹر صدر انجمن احمدیہ میں کام کرتے تھے۔ وہ ماسٹر فضل دین کے صاحبزادے تھے جو موضع گھوڑے واں ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد سانگلہ ہل کے ایک قریبی گاؤں میں آباد ہو گئے تھے۔

غلام رسول پیدائشی احمدی تھے۔ انہوں نے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء کی دہائی میں صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت اختیار کی اور جماعت کے لیے ان کی خدمات کا سلسلہ نصف صدی تک جاری رہا۔

میری تو ان سے سرسری سی ملاقات تھی تاہم ان کے دیرینہ رفیقِ کار اور قریبی دوست، شریف احمد کلو مقیم کینیڈا کا بیان ہے کہ وہ انتہائی بااخلاق اور باذوق انسان تھے۔ سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ اخبارات کا مطالعہ بہت باریک بینی سے کرتے اور ٹی وی کی خبریں بے حد شوق سے سنتے۔ وہ جہاں بیٹھتے سیاستِ دوراں ہی ان کی گفتگو کا محور ہوتی۔ اسی لیے ان کے بعض دوستوں نے انہیں بی بی سی کا ''خطاب'' دے رکھا تھا۔ انہیں بے شمار لطائف بھی یاد تھے جن کے برموقع استعمال سے وہ محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتے۔

اپنوں اور بیگانوں سے ہمدردی ان کا شیوہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کا انجام بھی نیک کیا چنانچہ بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ان کی اولاد ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے چنانچہ ان کے دو بیٹے جرمنی میں ہیں اور دو لندن میں، جب کہ ایک بیٹی انگلینڈ میں ہے اور دوسری، امتہ الحی کینیڈا میں۔

مولوی نور احمد رفیق حضرت مسیح موعود، حضرت چوہدری سربلند خان کے صاحبزادے اور سلسلہ کے پرانے خدام میں سے تھے جو صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے آڈیٹر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ قدرے چھوٹے قد کے، دبلے پتلے، منکسر المزاج سے مولوی نور احمد ہمیشہ صاف ستھرا لباس زیبِ تن رکھتے اور سر پر سفید پگڑی پہنتے۔ نہایت صلح کل انسان تھے چنانچہ طویل ہمسائیگی کے دوران کسی بھی جانب سے ان کے متعلق کوئی شکایت نہیں سُنی گئی۔

انہوں نے اپنے کوارٹر کے باہر مشکوٰۃ النور یا شاید مشکوٰۃِ نور کا بورڈ آویزاں کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر
کے لیے یہ نام سورۃ نور کی ایک آیت سے استنباط کیا تھا جو اُن کے علمی ذوق کے ساتھ قرآن سے ان کی محبت کی دلیل
بھی تھا۔ انجمن کوارٹرز میں یہ واحد کوارٹر تھا جس کے مکین نے اپنی رہائش گاہ کی پہچان کے لیے یہ جدّت پیدا کی تھی۔
موصوف ایک وسیع کنبے کے واحد کفیل تھے۔ انہوں نے نہ جانے کب اور کہاں سے دو ہنر سیکھ لیے تھے جو
اُن کے لیے اضافی آمدنی کا ذریعہ بن گئے۔ وہ نہ صرف فنِ جلد سازی میں طاق تھے بلکہ کتبہ سازی میں بھی مہارتِ تامہ
رکھتے تھے۔ جلد سازی کا زیادہ کام انہیں صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر سے ملتا تھا۔ اسی طرح بہشتی مقبرہ کی قبور کے لیے
کتبے وہی تیار کرتے تھے۔ یہ کتبے سیمنٹ سے بنائے جاتے تھے اور جب تک سنگِ مرمر کے کتبوں کا رواج عام نہیں
ہوا، بہشتی مقبرہ کی تمام قبروں اور قبرستانِ عام کی بہت سی قبور پر لگے ہوئے کتبے ان ہی کے تیار کئے ہوئے تھے۔
انہوں نے اپنے بچوں کو بھی جلد سازی اور کتبہ سازی کے فن میں تربیت دے رکھی تھی چنانچہ ان کے بھی بچے
اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے جس سے تمام کام مقررہ مدت کے اندر مکمل ہو جاتے اور انہیں کام مہیا کرنے والے
اداروں کے سامنے کسی قسم کی خفت نہ اُٹھانا پڑتی۔

مولوی نور احمد کی پیدائش ملتان کی تھی لیکن انہوں نے قادیان کے مدرسہ احمدیہ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں
سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا لہٰذا انہیں اس مقدس بستی کے ساتھ عشق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں جب موقع ملتا وہ
قادیان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہیں پانچ بار سفرِ قادیان کی سعادت حاصل ہوئی اور یہ
ایک ایسا اعزاز ہے جو بہت کم احمدیوں کو نصیب ہوا ہوگا۔

ان کی بیٹی امۃ المتین مقیم اسلام آباد بتاتی ہیں: ہم لوگ انجمن کوارٹرز سے محلہ دارالبرکات میں منتقل ہو گئے
تھے۔ آخری عمر میں ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اُن دنوں ربوہ میں علاج معالجے کی سہولت میسر نہ تھی
چنانچہ میں انہیں اپنے ہمراہ اسلام آباد لے آئی۔ وہ قریباً چھ ماہ تک ڈائلیسس پر رہے لیکن پھر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا
تصور ہی ان کے اہلِ خانہ کے لیے سوہانِ روح تھا۔ ابا جی گیارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ موصی تھے
چنانچہ ہم اسی رات انہیں ربوہ لے گئے جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس جو اُن دنوں ناظرِ اعلیٰ اور امیر مقامی تھے
نے جنازہ پڑھایا اور تدفین کے بعد دعا کرائی۔ حضور کی شفقت تھی، بعد میں وہ تعزیت کے لیے غریب خانہ پر بھی
تشریف لائے۔''

مجھے کبھی یہ جاننے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ چوہدری مسعود احمد صدر انجمن احمدیہ کی کس نظارت میں کیا
کام کرتے تھے، میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ہمارے ''پیٹی پرا'' ہیں اور ان کے حالات و مسائل بھی ہم جیسے
ہی ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی ملتے سراپا انکسار اور مجسم اخلاق بن کر لیکن ایک دو قدرے تفصیلی ملاقاتوں جن
کے دوران ان کے خاندانی پس منظر اور ذاتی حالات کا بھی کچھ ذکر ہوا کے علاوہ ہماری ملاقات رسمی گفتگو سے آگے نہ
بڑھتی۔ دراصل میں اُس وقت طالب علمی کے دور میں سے گذر رہا تھا اور وہ ریٹائرمنٹ کے نزدیک پہنچ چکے تھے
چنانچہ ان کی یادرہ جانے والی باتوں میں سے ان کا سفید بے داغ لباس، چھوٹی چھوٹی لیکن رنگی ہوئی ڈاڑھی، ان کی

اپنائیت اور ہمدردی واخلاص شامل ہیں۔

چوہدری مسعود احمد ضلع گوجرانوالہ کے موضع سوہادہ ڈھلواں کے رہنے والے تھے لہٰذا سوہاوی کہلانا پسند کرتے تھے اگرچہ عام لوگ یہی سمجھتے کہ ان کا تعلق جی ٹی روڈ والے سوہادہ سے ہے۔ ان کے ننھیال میں بعض لوگوں کو احمدیت کی نعمت نصیب ہو چکی تھی چنانچہ مسعود نے ان ہی کے ذریعہ ۱۹۳۸ء میں جب وہ صرف بارہ سال کے تھے احمدیت قبول کر لی۔ انہوں نے قیامِ پاکستان سے ایک دو سال پہلے صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت اختیار کی اور اوائل جوانی میں نظامِ وصیت میں شامل ہو گئے۔ نیک اور عبادت گذار تھے۔ وہ نہ صرف خود نماز باجماعت کے عادی تھے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی اس کا عادی دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ میرے علم میں ربوہ کے ایک دو دوست ایسے ہیں جنہیں نماز باجماعت کا عادی بنانے میں انہیں خاصی محنت کرنا پڑی۔

میں کبھی ربوہ جاتا اور وہ اتفاقاً نظر آجاتے تو ان سے تازہ حالات کا علم ہو جاتا۔ اب وہ انجمن کوارٹرز چھوڑ کر محلہ دارالبرکات میں اپنے مکان میں منتقل ہو چکے تھے لیکن ان کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

''منصور کیا کر رہا ہے؟'' میں نے ایسی ہی ایک ملاقات میں ان سے پوچھا۔

''وہ تو پچھلے کئی سال سے جرمنی جا چکا ہے'' انہوں نے بتایا ''ہم نے بیٹی کی بھی شادی کر دی ہے۔ وہ کینیڈا جا چکی ہے۔ اب گھر میں صرف میں اور مسعودہ ہی ہوتے ہیں۔''

مسعودہ کے ذکر سے مجھے خالہ مسعودہ یاد آگئیں جو محلے میں تعاونی کمیٹی کی کرتا دھرتا تھیں۔ انجمن کوارٹرز کی بعض خواتین اپنی بچت اس کمیٹی کی ماہانہ قسط کے طور پر ان کے پاس جمع کرایا کرتی تھیں۔ موصوفہ اس کی تحریری رسید دیتیں اور کمیٹی کا انتظام اس خوبی سے چلاتیں کہ کبھی کسی کو ان کے خلاف شکایت کا موقع نہیں ملا۔ امی کے پاس ان کی آمدورفت کا ایک سبب یہ کمیٹی بھی تھی۔

مولوی محمد جمیل جنہیں سال ہا سال تک صدر انجمن احمدیہ کے مختلف دفاتر میں خدمت کی توفیق ملی تھی انتہائی ملنسار اور خوش اخلاق بزرگ تھے۔ ان کا ایک بازو کٹا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجلس خدام الاحمدیہ کی سرگرمیوں علی الخصوص وقارِ عمل میں پورے ذوق شوق سے حصہ لیتے اور اپنی اس معذوری کو کبھی اپنے آپ پر حاوی نہ ہونے دیتے۔

''آپ اس بازو سے محروم کیسے ہوئے؟'' ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔

''میں چھوٹا تھا۔ گیارہ بارہ سال کا ہوں گا کہ میرا بازو چارہ کاٹنے والی مشین میں آ گیا۔ اللہ کو یہی منظور تھا، تکلیف تو بہت ہوئی لیکن آہستہ آہستہ ایک بازو سے گذارا کرنا سیکھ لیا۔''

میں ملتان میں تھا جب مجھے الفضل کے ذریعہ ان کی وفات کی اطلاع ملی۔ مرحوم نے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کی صاحبزادی، بشریٰ کے بیان کے مطابق مولوی محمد جمیل کے والد کا نام محمد دین تھا، وہ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے تھے، پیدائشی احمدی تھے اور مدرسہ احمدیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ ملازمت کے آخری ایام میں محاسب کے دفتر میں تھے۔

جب بشریٰ سے ان کے والدِ بزرگوار کی سیرت کا کوئی خاص پہلو اُجاگر کرنے کو کہا جائے تو وہ جواب دیتی

ہیں: "میرے والد بہت پیار کرنے والے تھے۔ ہم پانچ بہنیں ہیں۔ امی بتاتی ہیں کہ ہر بچی کی پیدائش پر عام رواج کے برعکس افسوس ملنے کی بجائے خوشی کا اظہار کرتے اور اپنے جان پہچان والوں میں شیرینی تقسیم کرکے انہیں بھی اپنی خوشی میں شریک کرتے۔ انہوں نے ہماری مقدور بھر تربیت کی اور یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج میرا ایک بیٹا جامعہ احمدیہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ بیٹیوں کو خدا کی رحمت سمجھتے تھے اور ان کی پیدائش پر ملول ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے اور ان کے آرام و آسائش کا ممکن حد تک خیال رکھتے۔"

مبارک احمد فاروقی انجمن کوارٹرز کے اُن رہائشیوں میں سے تھے جنہیں سلسلہ کی طویل خدمت کی توفیق ملی۔ وہ میاں بدرالدین کے صاحبزادے اور حضرت قریشی محمد اسماعیل معتبر رفیق حضرت مسیح موعود کی اہلیہ کے بھانجے تھے۔ یوں تو انہیں مختلف دفاتر میں کام کرنے کا موقع ملا لیکن ان کی خدمت کا آخری حصہ نظارت بیت المال میں گزرا۔ انہوں نے ۱۴ جولائی ۱۹۸۵ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ان کی ایک خاص بات جو مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے ان کا لباس تھا۔ صدر انجمن احمدیہ کے پرانے کارکن بالعموم شلوار قمیص اور پگڑی استعمال کرتے تھے لیکن میں نے انہیں بالعموم قمیص پینٹ میں ملبوس دیکھا جو اُن حالات میں ایک اچنبھا محسوس ہوتا تھا۔

منور احمد عارف جو بالعموم منور جہلمی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں کم و بیش ۳۳ سال انجمن کوارٹرز میں مقیم رہنے کے بعد آج کل رحمٰن کالونی، ربوہ میں اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد، میاں سلطان بخش کلر کہار کے اولین احمدی تھے۔

موصوف جن کا سارا عرصہ ملازمت نظارت بیت المال میں گذرا کی ایک ٹانگ بچپن میں پولیو کے حملے کی وجہ سے متاثر ہوئی اور یہ معذوری ساری زندگی ان کے ساتھ چلی تاہم انہوں نے اس معذوری کے باوجود حصول رزقِ حلال کو عبادت کا درجہ دیئے رکھا۔

وہ افتتاح ربوہ کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی اقتدا میں کی جانے والی دعاؤں میں شامل ہوئے۔ اس وقت وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں پڑھتے تھے۔ سکول کے ربوہ منتقل ہونے پر وہ یہاں آگئے اور ۱۹۵۴ء میں میٹرک کرتے ہی صدر انجمن کی ملازمت اختیار کرلی۔

منور جہلمی کے ساتھ جب بھی ملاقات ہو، بہت محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ وہ بڑے فخر سے اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتے ہیں: "اللہ کے فضل سے مجھے جماعت کے بہت سے بزرگان کے زیر سایہ کام کرنے کا موقع ملا اور حضرت مسیح موعود کے ایک سو سے زیادہ رفقا کی زیارت نصیب ہو چکی ہے۔"

"اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں" ایک بار میں نے ان سے فرمائش کی۔

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ مجھ سے کس قسم کے واقعہ کی توقع رکھتے ہیں لیکن مجھے فوری طور پر جو بات یاد آرہی ہے اس کا تعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی بچوں پر شفقت سے ہے۔"

"ارشاد!"

''میں جن دنوں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا مجھے نظارت تعلیم کی طرف سے پندرہ روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا جس سے ہوسٹل کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے تھے۔ پھر نہ جانے کیوں نظارت تعلیم نے اسے کم کر کے شاید بارہ روپے ماہوار کر دیا۔ والد صاحب کے مالی وسائل بہت محدود تھے اور اس وظیفے میں تعلیمی اخراجات پورے ہونا مشکل تھے۔

حضرت سیدہ مہر آپا میری والدہ سے خصوصی شفقت فرماتی تھیں چنانچہ وہ مجھے اور میرے بھائی لطیف کو لے کر ان کے پاس چلی گئیں اور درخواست کی کہ ان بچوں کی حضور سے ملاقات کرا دی جائے تا کہ یہ اپنا مسئلہ خود حضور کے سامنے رکھ سکیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے جمعہ کا دن تھا۔ نوکرانی نے حضور کو اطلاع دی تو آپ نے ہمیں اندر بُلا لیا۔ حضور اس وقت جمعہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ ہم بچے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ حضور ہمیں بٹھا کر ہماری بات سنیں گے تاہم حضور نے بھی دیکھتے ہی پوچھا کہ تم کیسے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: ملاقات کے لیے۔ حضور نے فرمایا: وہ تو ہوگئی۔ کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ میں نے پوری بات تفصیل سے بیان کر دی اور یہ بھی عرض کر دیا کہ ان پیسوں میں میرے لیے تعلیم جاری رکھنا مشکل ہوگا۔ حضور نے فرمایا: ٹھیک ہے تم جاؤ چنانچہ ہم چلے آئے۔ مجھے یقین ہے کہ حضور کو ہماری یہ بات سن کر تکلیف پہنچی کیوں کہ اسی جمعہ کے خطبہ میں حضور نے ہمارا نام لیے بغیر یہ واقعہ بیان فرمایا۔''

ملاحظہ ہو حضور کے خطبہ جمعہ فرمودہ اٹھائیس اپریل ۱۹۵۰ء مطبوعہ الفضل ۷ مئی ۱۹۵۰ء کا یہ اقتباس: ''دور کے کام جانے دو، یہاں معمولی کام بھی نہیں ہو رہا۔ ایک چھوٹا لڑکا میرا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور پوچھتا ہے: حضور! میرے وظیفے کا کیا بنا ہے؟ میں اسے سمجھاتا ہوں اور کہتا ہوں بتاؤ روپیہ کہاں جاتا ہے؟ وہ کہتا ہے انجمن میں۔ میں کہتا ہوں پھر انجمن کے پاس جا کر وظیفے کا پتا کرو مگر وہ کہتا ہے میں انجمن کے پاس گیا تھا وہ کہتے ہیں حضور کے پاس جاؤ۔ یعنی وہ اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے اسے میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ اگر وظیفہ نہیں دینا تو اپنے منہ سے کہا کریں کہ ہم نے وظیفہ نہیں دینا، جس بچے کو وظیفہ دینا ہوتا ہے اسے تو کہتے ہیں آؤ بچے اور جس کو نہیں دینا ہوتا اس کو کہتے ہیں خلیفۃ المسیح کے پاس جاؤ۔''

منور جہلمی بتاتے ہیں کہ ''بعد میں حضور کی ہدایت کے تحت نظارت تعلیم نے ہمارا وظیفہ بڑھا کر اٹھارہ روپے ماہوار کر دیا۔''

حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت مصلح موعود کے برادرِ نسبتی اور سلسلہ کے ممتاز عالم حضرت سید زین العابدین ولی اللہ شاہ بھی ہمارے اہل محلہ میں سے تھے۔

ان کا ایک نمایاں کارنامہ صحیح بخاری کا اردو ترجمہ و شرح ہے۔ ان کی زندگی میں اس شرح کے آٹھ جزو شائع ہو سکے تھے۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب آدھی رات کے وقت بیدار ہو جاتے اور نمازِ تہجد سے فراغت کے بعد صبح تک اس شرح پر کام کرنے کے علاوہ اپنے دیگر علمی مشاغل بھی جاری رکھتے ہیں۔

وہ عربی زبان کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہیں قاہرہ اور بیروت میں عربی زبان پڑھنے اور بیت المقدس کے صلاح الدین ایوبیہ کالج میں عربی کی تدریس کا موقع بھی ملا۔

انہیں کشمیر کمیٹی کے تحت پسے ہوئے کشمیریوں کی دادرسی کے لیے بھی نمایاں کام کرنے کا موقع ملا۔
چوہدری شبیر احمد کے یہ اشعار اُن کی ان ہی صفاتِ حسنہ کا احاطہ کرتے ہیں۔

تجھ کو بھلا سکے گی نہ کشمیر کی زمیں
جس کا تو شہسوار تھا اے زین العابدیں
نازاں تری زبان پہ تھی اُمّ الالسنہ
عارف بنا گیا تجھے اک شوقِ بے پناہ
پروانۂ خلافتِ حقّہ رہا مدام
تھے دشمنِ مصطفیٰ کے لیے تیرے صبح و شام

میرے قیام ربوہ کے دوران مجلس خدام الاحمدیہ کی طرف سے محلے کے بیماروں کی عیادت و خدمت کے
لیے خدام کی ڈیوٹیاں لگتی رہتی تھیں۔ ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا چنانچہ مجھے کئی بار ان کی خدمت میں حاضری اور
مٹھی چاپی کی سعادت حاصل ہوئی لیکن میں ان ہی دنوں ایم اے کرنے کے لیے لاہور چلا گیا۔ ان کی وفات
۱۹۶۷ء میں میری ربوہ سے سے عدم موجودگی کے دوران ہوئی۔ جب میں ایم اے کا امتحان دینے کے بعد ربوہ
واپس آیا تو مجھے ان کی وفات کی اطلاع ملی چنانچہ میں خاص طور پر بہشتی مقبرہ میں ان کی قبر پر دعا کے لیے حاضر ہوا۔

ان کی شادی دمشق میں قیام کے دوران سیارہ حکمت نامی ایک مقامی خاتون سے ہوئی تھی۔ موصوفہ کے نانا
نی الااصل ترک تھے جو اُن کی پیدائش سے پہلے ترکی سے شام منتقل ہو گئے تھے اور ان کا پورا خاندان دمشق میں آباد
ہو چکا تھا۔ مجھے بچپن میں انہیں بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ بہت وجیہہ شخصیت کی مالک تھیں اور آپی اور صادقہ کے ساتھ
ساتھ مجھے بھی بہت پیار کرتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو پانچ بیٹیوں سے نواز رکھا تھا۔ ان میں سے دو کی شادی میری ''ہوش'' سے پہلے
ہو چکی تھی۔ سب سے بڑی صاحبزادی جو اپنے خاندان میں ''چھبو'' کے عرف سے پہچانی جاتی تھیں سید منصور احمد ابن
سید میجر حبیب اللہ شاہ سے بیاہی ہوئی تھیں جو پاکستان ایئر فورس میں تھے اور دوسری صاحبزادی، وسیمہ ایف سی کالج
لاہور میں معاشیات کے پروفیسر اور خالدِ احمدیت، عبدالرحمٰن خادم کے بھائی، فیض الرحمٰن فیضی سے شادی شدہ تھیں۔
جیسا کہ اس کتاب میں پہلے بھی ذکر آ چکا ہے طاہرہ آپی کی کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بہت گہری سہیلی
تھیں جب کہ چوتھی بیٹی، آنسہ صادقہ کی ہم جماعت اور سہیلی تھیں۔ ان دونوں بہنوں بلکہ ان کی چھوٹی بہن قدسیہ
المعروف ''قُدّو'' کا بھی ہمارے گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا لہٰذا میں ان کے گھر کے اس وقت کے حالات سے بہت حد
تک واقف تھا۔

ان پانچ بیٹیوں کے علاوہ سید زین العابدین ولی اللہ شاہ کے دو صاحبزادے تھے۔ میں نے ان کے چھوٹے
بیٹے سلیم کو کئی بار دیکھا تھا۔ ان کی ذہنی نشو و نما ایک مقام پر آ کر رُک گئی تھی۔ میں جب کبھی ان کے گھر جاتا، انہیں گھر
کے ایک کونے میں پڑا پاتا۔ ۱۹۶۷ء میں ان کی وفات پر حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد نے جو اُن کے پھوپھی

زاد بھائی بھی تھے ان کے بارے میں الفضل میں اپنے ایک نوٹ میں لکھا: ''مرحوم ۱۳ مارچ ۱۹۴۴ء کو قادیان میں پیدا ہوا تھا اور بہت بچپن کے ایام ہی میں شدید بخار کے باعث ذہن اور اعصاب کو مستقل نقصان پہنچ گیا۔ گو چلنے پھرنے اور کسی حد تک مافی الضمیر ادا کرنے کے قابل ہو گیا لیکن مستقل نگرانی اور دیکھ بھال کا محتاج تھا اور اس کی والدہ یعنی ہماری ممانی جان کو اس کی بیماری کا دُکھ اُٹھانے کے علاوہ لمبے عرصہ تک اس کی دیکھ بھال پر غیر معمولی محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑی۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی اعصاب میں تناؤ بھی بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ آج سے تقریباً دو سال قبل جب کہ مرحوم کی عمر تیس سال تھی تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ مستقلاً صاحب فراش ہو گیا۔ باوجود اس کے کہ ہماری ممانی جان خود بھی بہت بیمار تھیں اور ایک دو مرتبہ آپ کا آپریشن بھی ہو چکا تھا مگر آپ نے نہایت ہی جانفشانی اور ایثار کے ساتھ اِس صاحبِ فراش بچے کی ہر طرح تیمارداری کی۔ بعض اوقات اس کی دردناک چیخوں سے راتوں کو چالیس چالیس مرتبہ اُٹھ کر اُسے سنبھالنا پڑتا لیکن یہ سب تکلیفیں انہوں نے کمال صبر و رضا کے ساتھ برداشت کیں اور کبھی علاج میں کوتاہی نہ ہونے دی۔............ آخر اللہ تعالیٰ کی مشیت پوری ہوئی اور وہ معصوم رُوح اس دنیا کے صعوبت خانہ سے آزاد ہو کر اپنے رب کریم کے حضور حاضر ہو گئی............ عجیب بات ہے کہ آخری بیماری میں بار بار اپنے مرحوم والد کو یاد کرتا تھا اور پوچھنے پر کہتا تھا کہ اُن کے پاس جانا ہے۔''

جماعت احمدیہ کے دیرینہ خادم، متبحر عالم، محقق، دانشور اور مؤرخ احمدیت، مولانا دوست محمد شاہد بھی عرصہ دراز تک ہمارے پڑوس میں رہے۔ مرحوم جامعۃ المبشرین ربوہ سے ۱۹۵۱ء میں کامیاب ہونے والی پہلی شاہد کلاس میں سے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تاریخ احمدیت کی تدوین ہے جس کی بیس جلدیں ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ وہ اس وفد میں شامل تھے جو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی قیادت میں قومی اسمبلی میں جماعت احمدیہ کی نمائندگی کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے جن کا ہاتھ ہمیشہ سامعین کی نبض پر ہوتا۔

مولانا دوستوں کے دوست تھے۔ میری ان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ ابا جی کی علم دوستی اور جماعتی خدمات کا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ذکر کرتے اور ان کے لیے ہمیشہ ''حضرت مولانا یعقوب طاہر'' کے الفاظ استعمال کرتے جو بذاتِ خود یہ الفاظ کہنے والے کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کا اظہار فرماتے اور بالعموم حالات کے مطابق تواضع کے بغیر واپس نہ آنے دیتے۔

میں نے احاطہ قصر خلافت کے اندر لائبریری کی قدیم عمارت میں ادارۃ المصنفین کے دفتر کے اندر ان کا اپنا دفتر بھی دیکھا ہے اور پھر خلافت لائبریری کی جدید عمارت میں ان کا دفتر بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو کتابوں اور اخبارات و رسائل کے فائلوں سے اٹا رہتا اور وہ ریکس اور الماریوں کے درمیان ایک کرسی پر تشریف فرما ہوتے۔ بالعموم مطالعہ و تحقیق و تصنیف میں منہمک رہتے لیکن جب کوئی آ جاتا تو اسے یہ تاثر نہ ہونے دیتے کہ وہ مصروف تھے۔ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس شخص کی دلداری میں لگ جاتے۔ حال احوال پوچھتے، کچھ اس کی سنتے اور کچھ اپنی سناتے۔ ان کی باتیں اتنی دلچسپ لیکن معنی خیز اور اندازِ بیان ایسا پُر کشش ہوتا کہ وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہ چاہتا۔

انجمن کوارٹرز میں منتقل ہونے سے پہلے وہ محلہ دارالنصر میں مقیم تھے۔ ان کے اور ہمارے درمیان صرف ایک کوارٹر حائل تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے کے واقفِ حال تھے اور راز داں بھی۔ ان کی اہلیہ محمد ابراہیم شاد کی صاحبزادی تھیں جو استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ موصوفہ آتے جاتے بالعموم ہمارے ہاں رُک جاتیں اور امی اور میری بہنوں کی خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد آگے چلی جاتیں۔

جب میری پہلی کتاب شائع ہوئی تو میں نے اس کا ایک نسخہ مولانا کی نذر بھی کیا۔ دوسری کتاب آنے پر میں نے اس کا بھی ایک نسخہ انہیں بھجوایا۔ یہ ان کی مجھ عاجز پر شفقت تھی کہ انہوں نے ایک مبتدی کی اس کوشش کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد الفضل انٹرنیشنل (۲۴ مارچ ۲۰۰۰ء) میں ان پر ایک تفصیلی نوٹ "عہدِ حاضر کے ایک احمدی سیاح اور ان کے دو سفرنامے" کے عنوان سے لکھا جو میں تحدیثِ نعمت کے طور پر ذیل میں نقل کر رہا ہوں۔

"آپ نے احمدیت کی دوسری صدی کے پہلے سال اگست سے دسمبر ۱۹۸۹ء تک جدید دنیا (امریکہ، جرمنی، میکسیکو، کینیڈا، انگلستان اور فرانس) کا دورہ کیا اور اپنا سیاحت نامہ "شوق ہمسفر میرا" کے نام سے زیبِ قرطاس کیا اور فیروز سنز لاہور کے زیر اہتمام شایانِ شان رنگ میں طبع ہوا اور اپنے منفرد اسلوب، دلکش اور معیاری ندرتِ بیان اور علمی اور سائنٹفک انداز کے باعث اس درجہ مقبول ہوا کہ پے در پے تین ایڈیشن شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ پاکستان کے اخبارات و رسائل نے اس پر شاندار ریویو لکھے، مضامین اور تقریب رونمائی کی رپورٹیں شائع کیں۔ جمیل الدین عالی، عبدالعزیز خالد، شوکت صدیقی اور دوسرے اعلیٰ پایہ کے نقادانِ سخن نے مبارک بادیں دیں۔ عطاء الحق، قاسمی، مستنصر حسین تارڑ، ضمیر جعفری، ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی اور متعدد چوٹی کے ادیبوں اور شاعروں نے اس پیشکش کو خراجِ تحسین ادا کیا اور پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان نے تبصرے کر کے عوامی حلقوں میں بھی اس کی دھوم مچا دی۔

قبولیتِ عامہ کی اس فضا میں فیروز سنز نے ۱۹۹۸ء میں جناب محمد داؤد طاہر صاحب کا دوسرا سفرنامہ "سفر زندگی ہے" کے حقیقت افروز عنوان سے شائع کیا جو ایران اور ترکی کے چشم دید واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ سفرنامہ بھی اردو اصناف نثر میں قیمتی اضافہ ہے۔ اس کے ابتدائیے جناب جمیل الدین عالی اور جناب مستنصر حسین تارڑ کے سحر طراز قلم کا نمونہ ہیں۔ جناب سید ضمیر جعفری نے اس پُراز معلومات رُوداد پر درج ذیل الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے:

"انہوں نے اردو ادب کے اس سنگلاخ اور پہاڑی سفر میں بڑی چوٹی پر جا کر اپنا کیمپ قائم کیا اور اس کوہ پیمائی میں انہوں نے جو پگڈنڈیاں دریافت کی ہیں وہ پہلے سے بھی اونچی چوٹیوں کی گردن میں اپنی باہیں حمائل کر رہی ہیں۔ داؤد طاہر کا کرشمہ اسلوبِ نگارش اور اندازِ نظر میں ہے۔ تحریر کی مسلسل اور بے ساختہ شگفتگی کے باعث ان کے راستے پر آنے والے "بلوچستان" بھی خیابانوں کی طرح گذر جاتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں طہران اور استنبول کی گلیاں بولتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ واپسی پر ان دونوں ممالک کو وہ اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔"

پاکستان کے مؤقر ماہنامہ، ادبِ لطیف کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۹ء میں جناب مسعود اختر شیخ کے قلم سے "سفر زندگی ہے" کے زیرِ عنوان ایک طویل نوٹ سپردِ اشاعت ہوا ہے۔ اس کا صرف ایک حصہ پیش ہے:

''دوستو! اللہ میاں شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو اور اگر کتابوں کی ہوشربا گرانی اور ڈش کلچر کی ہمہ وقتی دلفریبیاں آپ کی راہ میں حائل نہ ہوں تو پھر کیوں نہ کوئی ایسی عمدہ کتاب پڑھی جائے جو آپ کے کتب بینی کے اُبھرتے ہوئے شوق کے لیے صحیح معنوں میں تازیانے کا کام کرے۔ میرا رُوئے سخن حال ہی میں شائع ہونے والی ایک ایسی کتاب کی طرف سے جسے داؤد طاہر نے لکھا ہے۔ کتاب کا نام ہے ''سفر زندگی ہے''۔ یہ کتاب اردو زبان میں سفرناموں کی فہرست میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

اگر آپ اس سے پہلے داؤد طاہر کے نام سے آشنا نہیں ہیں تو اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہ خود ڈھول ڈھمکے میں یقین نہیں رکھتے ورنہ ان کی پہلی کتاب ''شوق ہمسفر میرا'' ہی انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچانے کے لیے کافی تھی۔ اب جب کہ وہ اپنی دوسری کتاب لکھ کر پاکستان کے سفرنامہ نگاروں کی صفِ اول میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ایک قاری کی حیثیت سے ان سے شناسائی پیدا نہ کریں۔ محض دو کتابیں لکھ کر اپنے نام کو چار چاند لگانا اور پھر مستنصر حسین تارڑ جیسے...... سفرنامہ نگار سے اپنے نام کا لوہا منوانا داؤد طاہر ہی کا کام ہے..........''

مولانا نے اپنے نوٹ کا اختتام حضرت مصلح موعود کے ان اشعار سے کیا:

دستِ کوتاہ کو پھر درازی بخش
خاکساروں کو سرفرازی بخش
ہوں جہاں گرد ہم میں پھر پیدا
سِندباد اور پھر جہازی بخش

''سفر زندگی ہے'' کے بعد ''اک سفر اور سہی'' کے نام سے میرا تیسرا سفرنامہ شائع ہوا تو مولانا نے الفضل انٹرنیشنل (انیس اکتوبر ۲۰۰۱ء) میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''ستمبر ۱۹۹۹ء میں آپ شاہین انٹرنیشنل کی کویت کے لیے افتتاحی پرواز میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کویت تشریف لے گئے۔ اس دوران آپ کی دُوربین نگاہ نے اس سرزمین کو جس تفصیل اور مبصرانہ زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور آپ کی محتاط مگر فولادی قلم نے اسے موجودہ اور اگلی نسلوں کے لیے ریکارڈ کر دیا یہ سفرنامہ اس کا شاندار مرقع ہے جو اِن شاءاللہ مستقبل میں قیمتی ماخذ اور مشعلِ راہ کا کام دے گا کیوں کہ اس کا ایک ایک صفحہ قاری کو بزبانِ حال کہہ رہا ہے:

تیری بنیاد چند لمحوں پر
میری سوچیں محیط صدیوں پر''

یہ مولانا کی مجھ ایسے کم مایہ پر خاص شفقت تھی کہ اپنی بعض تصنیفات مجھے اپنے دستخطوں سے ارسال فرماتے۔ دمِ تحریر میرے سامنے ان کی کتاب ''بیسویں صدی کا علمی شاہکار'' پڑی ہے۔ ان کی منکسر المزاجی اور اس عاجز کے لیے ان کی محبت ملاحظہ ہو، انہوں نے یہ کتاب مجھے اس نوٹ کے ساتھ ارسال کی تھی:

بشرفِ ملاحظہ
بخدمت محترم و معظم جناب محمد داؤد طاہر صاحب
نیم شبی دعاؤں کی عاجزانہ درخواست کے ساتھ
دوست محمد شاہد
۲۴ مارچ ۲۰۰۶/امان ۱۳۸۵ہش

انجمن کوارٹرز میں منتقل ہوتے وقت ان کے ہاں تین بیٹیاں ہی تھیں

مولانا کو انجمن کوارٹرز میں قیام کے دوران مزید دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ بیٹا چار بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا تھا لہٰذا اس کی پیدائش پر والدین طبعاً مسرور تھے۔ بچے کا نام سلطان احمد مبشر تجویز ہوا اور اس کے پیدائش کے لڈو ہم نے بھی کھائے تھے۔ شاہدہ، طاہرہ اور ناصرہ۔ خدا تعالیٰ نے

مولانا نے سلطان مبشر کو اس کی پیدائش کے فوراً بعد خدمتِ دین کے لیے وقف کر دیا تھا اور ہوش سنبھالنے پر اس بچے نے خود بھی وقف کی تجدید کی۔ یہی بچہ اب جماعتی حلقوں میں ''ڈاکٹر سلطان احمد مبشر'' کے نام سے معروف ہے اور فضلِ عمر ہسپتال میں میڈیسن کے شعبہ میں کام کر رہا ہے۔

مولانا کی وفات کے لمبے عرصے بعد ایک بار میں سلطان مبشر سے ملاقات کے لیے ان کے گھر حاضر ہوا تو میں نے بطورِ خاص مولانا کی لائبریری دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو مولانا اپنی حیات میں ایک بار خود بھی مجھے دکھا چکے تھے۔ سلطان مبشر نے میری یہ خواہش اسی وقت پوری کر دی۔ مولانا نے اس مکان میں منتقلی کے وقت سرونٹ کوارٹر کو لائبریری میں تبدیل کر دیا تھا اور اپنے شوق سے جمع کی ہوئی ہزار ہا کتب کو ایک خاص ترتیب سے الماریوں میں سجا رکھا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ سلطان مبشر مولانا کی اس یادگار کی بطریقِ احسن دیکھ بھال کر رہے ہیں اور اس نادر ذخیرۂ کتب میں ہر ممکن اضافے کی کوشش بھی۔

''یہ وہ میز اور کرسی ہے جس پر مولانا نے ساری زندگی بیٹھ کر تحقیق و تصنیف کا کام کیا'' سلطان مبشر نے مجھے بتایا ''اباجی کی وفات کے بعد میں نے انجمن سے درخواست کر کے یہ دونوں چیزیں حاصل کر لی تھیں۔'' یہیں وہ جملہ سٹیشنری آئٹمز پڑے ہیں جو مولانا کے زیرِ استعمال رہے تھے اور وہ رائٹنگ پیڈ بھی جس کے دھاتی کلپ پر مولانا نے اپنے ہاتھ سے یہ دعا لکھ رکھی ہے ''رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَ تَمِّمْ بِالْخَیْرِ''

اسی ملاقات میں سلطان مبشر نے انکشاف کیا کہ اباجی قیامِ پاکستان سے پہلے قادیان منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے ایک چچا عبدالعظیم جن کے ذریعے احمدیت ہمارے خاندان میں آئی پیشہ کے اعتبار سے جلد ساز تھے۔ اباجی نے ان سے جلد سازی کا فن سیکھ لیا اور اپنے اخراجات میں خود کفیل ہو گئے۔ اباجی بتایا کرتے تھے کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں مجلس خدام الاحمدیہ کے کسی اجتماع کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اپنے خطاب کے دوران ارشاد فرمایا کہ جو خدام اپنے پیشے کے علاوہ کوئی ہنر جانتے ہوں کھڑے ہو جائیں۔ اباجی بھی کھڑے ہو گئے۔ حضور نے اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا اور باقی خدام کو ان نوجوانوں سے سبق سیکھنے کا مشورہ دیا۔''

سلطان بشر نے ابھی تک وہ اوزار سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جو مولانا جلد سازی کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ''ابا جی نے اس لائبریری میں موجود بہت سی کتابیں خود اپنے ہاتھ سے جلد کر رکھی ہیں'' انہوں نے بتایا۔

اس لائبریری میں ایسی نادر کتب و جرائد بھی موجود ہیں جو کسی اور جگہ نہیں ملتے۔ جماعتی اخبارات و رسائل کا معتد بہ ریکارڈ اس ذخیرے میں موجود ہے اور میرا خیال ہے ربوہ میں اس نوعیت کا پرائیویٹ ذخیرہ کتب شاید ہی کسی اور کے پاس ہو۔

ہمارے محلہ داروں میں مولانا عبدالرحیم درد کے اہل و عیال بھی شامل تھے۔ مولانا نے اس وقت وفات پائی جب میں پرائمری سکول میں تھا اور ان کی کوئی بات تو درکنار مجھے ان کا چہرہ تک یاد نہیں تاہم میرا تاثر یہ ہے کہ ان کی وفات کا حادثہ بہت غیر متوقع تھا۔ میرے اس تاثر کی تائید الفضل میں چھپنے والی ان کی وفات کی خبر کے علاوہ ہمارے ایک مرحوم پڑوسی، قریشی شجاعت علی کی صاحبزادی، امۃ الرحمٰن (اہلیہ محمد اصغر قمر مقیم انجمن کوارٹرز) کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ ایک روز اپنی کچھ سہیلیوں بشمول رقیہ بنت صوفی مطیع الرحمٰن اور ماجدہ بنت سید احمد کے ساتھ کوارٹروں کے پاس شٹاپو کھیل رہی تھیں۔ مولانا دفتر جاتے ہوئے ان کے قریب سے گذرے اور فرمانے لگے ''ہٹونی کڑیو، ہُن میری واری اے۔'' امۃ الرحمٰن کہتی ہیں کہ بچیاں ایک طرف ہو گئیں تو مولانا نے شٹاپو کے دو چکر لگائے اور ایک خانے میں بوٹ کے ساتھ کراس لگا کر کہنے لگے: ''لو جی میرا خانہ بند ہو گیا''۔ یہ کہہ کر مولانا ہنستے ہوئے دفتر کی طرف چلے گئے تاہم دوپہر یا سہ پہر کو اچانک یہ خبر ملی کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ امۃ الرحمٰن بتاتی ہیں کہ ان کے لیے یہ بہت حیرت کی بات تھی کیونکہ انہوں نے کچھ ہی دیر پہلے مولانا کو ہنستے کھیلتے دیکھا تھا۔

ان کے صاحبزادے نعیم الرحمٰن درد میرے ہم جماعت تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم غالباً لاہور کے کسی سکول میں ہوئی تھی لہٰذا وہ آتے ہی باقی بچوں سے ممتاز ہو گئے۔ اس زمانے میں ہمارے سکول کے بچوں کا عام لباس کھڑا پاجامہ اور قمیص ہوتا تھا۔ ایسے میں نعیم جو بیشک ملیشیا کی ہی سہی، پینٹ پہنتے تھے سب کی نظروں میں آ گئے۔

لائق فائق سے نعیم کلاس ٹیسٹوں میں نمایاں پوزیشن لینے لگے اور اسی وجہ سے بہت جلد مانیٹر بھی بن گئے اگرچہ یہ عہدہ ان کے پاس زیادہ عرصہ نہ رہ سکا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے انہوں نے میٹرک کے امتحان میں نہ صرف سکول بلکہ پورے ضلع میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی اور الفضل نے یہ خبر پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کی تھی۔

نعیم نے ایف ایس سی تعلیم الاسلام کالج سے کیا۔ بعد میں انہیں انجینیرنگ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا۔ انجینیر بننے کے فوراً بعد انہوں نے واپڈا میں اسسٹنٹ انجینیر، ٹرانسمشن کی حیثیت میں ملازمت شروع کر دی اور وہ یہیں سے بطور چیف انجینیر ریٹائر ہوئے۔

خدا نے نعیم کو بہت نوازا اور اب وہ اپنے بچوں کی شادی سے فراغت کے بعد ایک خوشگوار زندگی گذار رہے ہیں۔ کبھی بات ہو تو کئی پرانی باتیں یاد آ جاتی ہیں اور انہیں دہرانے میں ہی بہت سا وقت بیت جاتا ہے۔

ان ہی کے توسط سے ان کے بھائیوں حبیب الرحمٰن درد اور مجیب الرحمٰن درد سے بھی میرے مراسم قائم ہوئے۔ ان کی بہن رضیہ درد تو خیر سے ہماری پڑوسن تھیں، ایک اور بہن خاتم النساء (جو گھر میں ختمی کہلاتی تھیں)

مربی سلسلہ، محمد شفیع اشرف سے بیاہی ہوئی تھیں۔ شفیع اشرف اباجی کے احباب میں سے تھے اور اسی نسبت سے مجھ پر بھی شفقت فرماتے تھے۔

۱۹۵۸ء میں اِن کی ادارت میں راولپنڈی سے ہفت روزہ ''خورشید'' نکلنا شروع ہوا۔ جیسا کہ الفضل میں چھپنے والے اِس اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے، خورشید کا پہلا پرچہ اکیس اپریل ۱۹۵۸ء کو شائع ہوا:

راولپنڈی کا علمی و ادبی باتصویر مجلّہ، نظم و نثر کا حسین و جمیل مرقّع

ہفت روزہ

خورشید

اکیس اپریل کو عیدالفطر کی مبارک تقریب پر

اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ طلوع ہو رہا ہے

مدیر: محمد شفیع اشرف

چند لکھنے والے

عبدالمجید سالک، رئیس امروہوی، اختر ہوشیارپوری، ڈاکٹر وزیر آغا،

شیر افضل جعفری، رفعت سلطان، ڈاکٹر گذن، اختر لنگاہی، عارف سیالکوٹی،

شبنم صدیقی، عبدالسلام اختر، یحیٰ افضلی

اور دوسرے

قیمت فی پرچہ چار آنے: سالانہ دس روپے

اپنے ہاکر سے یا براہِ راست ہم سے طلب فرمائیے

منیجر اشاعت ہفت روز ''خورشید'' چوک بنّی، راولپنڈی

جہاں تک میرا اندازہ ہے یہ پرچہ اباجی کو اعزازی طور پر گھر کے پتے پر موصول ہوتا تھا۔ یہ رسالہ میرے مطالعہ میں بھی رہا بلکہ میں نے اس کی ایک فائل بنائی ہوئی تھی جس میں اس کے تمام شمارے محفوظ کر رکھے تھے تاہم اباجی کی وفات کے بعد میری بے پروائی سے الفضل کے پورے سیٹ کے ساتھ یہ فائل بھی ضائع ہوگئی۔ بدقسمتی سے یہ رسالہ اب خلافت لائبریری میں موجود ہے نہ مجھے کسی اور جگہ سے مل سکا ہے البتہ اشتہارِ مندرجہ بالا سے اس رسالہ کے مزاج اور معیار کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

راولپنڈی میں میری تقرری کے دوران شفیع اشرف بیت نُور میں تعینات تھے اور اس عرصے میں میری ان سے بکثرت ملاقات رہی تاہم بعد میں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پشاور میں میری تقرری ہوئی تو ان کے ایک بھائی، محمد ارشد جو نیشنل بنک میں ملازم تھے جماعت احمدیہ نوشہرہ کے صدر تھے۔ میں ربوہ آتے جاتے کبھی کبھار ان کے پاس رُک جایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت محبت سے پیش آتے اور موقع کے مطابق مقدور بھر تواضع بھی کرتے۔

شفیع اشرف کے صاحبزادوں نے اپنے والدین کے سوانح ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا'' کے عنوان سے کتابی شکل میں

شائع کئے ہیں اور اپنے والد کا منظوم کلام بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی وہ نظم بھی شامل ہے جو انہوں نے انڈونیشیا میں اپنی تقرری کے دوران اپنی اہلیہ کے ایک خط کے جواب میں کہی تھی۔ یہ نظم اس جذبے کی خوبصورت عکاس ہے جو مبشرین جماعت کو سالہا سال تک اپنے اہل و عیال سے دُور غیر ممالک میں مقیم رہ کر اپنا فریضہ ادا کرنے کا حوصلہ بخشتا ہے:

رات کا وقت ہے ، تاریکی ہے ، تنہائی ہے
اور ترا خط ہے کہ سینے سے لگا رکھا ہے
دل جو اس وقت ہے ویران سے مرقد کی طرح
ایک چھوٹا سا دیا اس پہ جلا رکھا ہے

وہ اپنی اہلیہ کے جذبات قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اگلے ہی لمحے کہہ اُٹھتے ہیں:

دُوری و ہجر کی تکلیف بجا ہے لیکن
ایک مقصد ہے مرے سامنے اس سے بھی اہم
خدمتِ دین بہر حال مقدّم ہے ہمیں
تجھ کو بھی اس کا ہے احساس یقیناً ہر دم

اور آخر میں یہ مشورہ:

اب فقط مرضیٔ مولا کو مقدّم کر کے
اپنے ہر قسم کے جذبات کو قرباں کر دو
پھر ذرا دیکھنا کیسے وہ نوازے گا ہمیں
اسوۂ ہاجرہ کو زیست کا عنواں کر دو

اب شفیع اشرف اس دنیا میں موجود ہیں نہ ان کی اہلیہ لیکن ان کی اولاد اپنے اپنے رنگ میں ان کا نام روشن کئے ہوئے ہے۔ شفیع اشرف کے بڑے بیٹے، ڈاکٹر محمد احمد اشرف فضل عمر ہسپتال میں خدمت بجا لا رہے ہیں جب کہ چھوٹے بیٹے، محمود اشرف مربی سلسلہ ہیں اور دمِ تحریر نائب وکیل التعلیم تحریک جدید انجمن احمدیہ ہیں۔ بچیاں مخلص احمدی خاندانوں میں بیاہی گئی ہیں اور وہ خود بھی جماعتی خدمت کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہیں۔ ان کے ایک داماد فہیم الدین ارشد، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تو میرے کرمفرماؤں میں سے ہیں۔

مجھے مولانا جلال الدین شمس کے خطباتِ جمعہ تو یاد ہیں لیکن ان سے براہ راست تعارف کا موقع پیدا نہ ہو سکا۔ مولانا جلال الدین شمس کے صاحبزادگان، فلاح الدین شمس اور منیر الدین شمس کے ساتھ مجلس خدام الاحمدیہ کی سرگرمیوں کے دوران ملاقات رہتی تھی۔ اب شاید کسی دُور دیس جا بسے ہیں۔

ربوہ میں میرے مستقل قیام کے آخری دنوں میں مکینانِ انجمن کوارٹرز میں ایک اور بزرگ کا اضافہ ہوا۔ میرا اشارہ مولانا عبدالمالک خان کی طرف ہے جو علی برادران کے بھتیجے اور حضرت مولانا ذوالفقار علی گوہر کے

صاحبزادے تھے۔ وہ جماعت احمدیہ کے ایک جید عالم، سحر طراز مقرر اور صاحب رؤیا و کشوف بزرگ کے طور پر معروف تھے اور کراچی سے تبدیل ہو کر صدر انجمن احمدیہ میں نائب ناظر اصلاح وارشاد مقرر ہوئے تھے۔ میں نے ان کے بعض خطبات اور تقاریر تو ضرور سنیں اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فنِ خطابت پر ایک خاص قدرت عطا فرما رکھی تھی لیکن بدقسمتی سے ان سے ذاتی مراسم کی کوئی تقریب پیدا نہ ہوئی۔

مولانا کی وفات شیخوپورہ کے قریب کار اور ٹرک کے ایک حادثے کے نتیجے میں ہوئی۔ الفضل نے یہ خبر سیاہ حاشیے میں شائع کی تھی اور اخباری اطلاع کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے اسی روز خطبہ جمعہ میں ان کی گراں قدر خدماتِ دینیہ کا ذکر فرمایا۔

ترکِ سکونتِ ربوہ کے بعد مجھے اُن کے دو دامادوں یعنی ڈاکٹر لطیف احمد قریشی (جن کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں کسی اور جگہ موجود ہے) اور سید حسین احمد مربی سلسلہ متعینہ کرک ہاؤس' لاہور سے تعلقِ خاطر پیدا ہوا۔ اسی طرح ان کی صاحبزادی، ڈاکٹر نصرت جہاں (جو عرصۂ دراز سے فضلِ عمر ہسپتال میں خدمت بجا لا رہی ہیں) کی طرف سے ان کے انکم ٹیکس کے ایک معاملہ کے حوالے سے رابطہ ہوا اور میں نے انہیں خوش اخلاق و وضع دار پایا۔ ایک دفعہ مجھے اپنی ایک عزیزہ کے لیے ان سے مشورے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے پوری توجہ سے یہ مسئلہ سُنا اور صحیح رہنمائی کی۔ خدا تعالیٰ انہیں ان کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

حضرت مسیح موعود کے پوتے اور حضرت مرزا سلطان احمد کے صاحبزادے، حضرت صاحبزادہ مرزا عزیز احمد بھی ہمارے محلہ دار تھے اور ان کا کوارٹر حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد اور سید زین العابدین ولی اللہ شاہ کے مکانات سے ملحق تھا۔ میں نے انہیں بارہا دیکھا تھا لیکن کبھی گفتگو کی نوبت نہ آئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر رہے ہیں۔ ان کی دنیاوی وجاہت اور نظام جماعت میں ان کی مرکزی حیثیت میری ملاقات کی خواہش اور ان کے درمیان ہمیشہ دیوار بنی رہی۔

میری محرومی، راقم کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا لیکن جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے، ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ پرویز پروازی نے جنہیں حضرت صاحبزادہ مرزا عزیز احمد کو کچھ عرصہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ''بے ریش ولی'' کے عنوان سے ہفت روزہ ''لاہور'' کے ۳۰ مارچ ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں ان ہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک بزرگ کو دیکھا کہ سر پر رومی ٹوپی اوڑھے، سفید براق شلوار قمیص پر ہاف کوٹ پہنے، بڑے وقار سے اپنے دفتر کی سب سے اونچی افسر کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے۔ زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں۔ کاغذات دیکھتے اور فیصلے صادر کرتے جاتے ہیں۔ رائے میں اصابت ہے، فیصلے دوٹوک ہیں جیسے گہرے تدبر اور غور خوض کے بعد صادر کیے گئے ہوں۔ بعد کو جب ان سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا کہ ان فیصلوں کے پس پردہ ان کی تیز بصیرت کارفرما تھی۔ معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں انہیں زیادہ بحث و تمحیص میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تیز فہمی کا ہنر دیا تھا مگر وہ فیصلے صادر کرتے وقت زیر لب استغفار پڑھتے رہتے تھے۔ ایک بار ہمارے اپنے افسر اعلیٰ

رخصت پر تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں بعض معاملات میں ہمیں ان سے فیصلہ کروانے کی ضرورت پیش آئی۔ عجیب عقدہ کھلا کہ یہ فیصلہ کرتے وقت استغفار کا دامن نہیں چھوڑتے۔ خدایا! یہ کیسا ڈاڑھی منڈا ولی ہے؟ ان کے حالات پڑھے تو معلوم ہوا کہ اپنے باپ کے تتبع میں سرکاری نوکری کی، انگریزوں کے زمانے میں عدالت کی کرسی پر بیٹھے وہاں بھی یہی عالم رہا کہ فیصلہ کرنا ہوا تو استغفار کا دامن پکڑ لیا کہ اے خدا! تو ہی بندوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور بخشش کرنے والا ہے۔ اگر میرے اس فیصلہ پر کوئی سقم ہے تو اس کی پردہ پوشی فرما اور غلطی ہے تو اس سے درگذر فرما۔ ہم نے ایسا افسر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دنیا میں تو ایسا ہونا انہونی بات سمجھی جاتی ہے مگر ہم نے ایسی انہونی ہوتے دیکھی ہے۔"

ان کے بڑے صاحبزادے مرزا خورشید احمد بی اے میں ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ ایک اچھے استاد اور بہت اچھے انسان ہیں چنانچہ مجھ پر ان کی خوبیاں جوں جوں منکشف ہوئیں میں ان کے اخلاقِ فاضلہ کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ خدا تعالیٰ انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے۔ آج کل وہ صدر انجمن احمدیہ میں ناظر اعلیٰ، صدر صدر انجمن احمدیہ اور امیرِ مقامی ہیں۔ واقفانِ حال جانتے ہیں کہ یہ کتنی نازک اور اہم ذمہ داری ہے جو اُن کی چوبیس گھنٹے مصروفیت کی متقاضی ہے مگر اس کے باوجود ان کے دفتر کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ میں ان سے ملاقات کے لیے کئی بار ان کے دفتر حاضر ہوا ہوں اور مشاہدہ کیا ہے کہ اگر وہ کسی اہم میٹنگ میں مصروف نہ ہوں تو وزیٹرز کو غیر ضروری انتظار کرائے بغیر ان کی دادرسی فرماتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں اپنا کارڈ بھجوانے کے بعد اپنی باری کے لیے لمبا انتظار کیا ہو۔ ان ہی کی ہدایت پر اُن کا دربان کچھ پوچھے سنے بغیر ان کا دروازہ کھول دیتا ہے اور راقم ان کی صحبت سے فیضیاب ہو کر واپس چلا آتا ہے۔

یقیناً انہیں یہ بے نفسی اپنے بے نفس باپ سے ورثہ میں ملی ہے!

صاحبزادہ مرزا عزیز احمد کے چھوٹے فرزند، مرزا غلام احمد سے بھی ہماری یاد اللہ ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ وہ بھی مجھ گنہگار سے محبت فرماتے ہیں۔

صاحبِ رؤیا و کشوف و الہامات اور مستجاب الدّعوات بزرگ حضرت مولانا محمد ابراہیم بقاپوری بھی ہمارے محلہ میں رہائش پذیر تھے۔

روایت کے مطابق اگرچہ آپ کو حضرت مسیح موعود کی زیارت کا شرف تو ۱۸۹۱ء میں حاصل ہو گیا تھا لیکن باقاعدہ بیعت حضور کی وفات سے تین سال پہلے کی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی مسندِ خلافت پر تشریف فرما ہوئے تو آپ نے اپنے آبائی گاؤں سے ہجرت کر کے قادیان میں سکونت اختیار کر لی اور بطور داعی الی اللہ خدمت میں مصروف ہو گئے تاوقتیکہ ۱۹۳۸ء میں صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ اس دوران وہ پنجاب کے متعدد مقامات، بنگال اور سندھ میں نہایت سرگرمی سے فریضۂ رشد و ہدایت ادا کرتے رہے جس کے نتیجہ میں ان علاقوں میں متعدد نئی جماعتیں قائم ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حضرت مسیح موعود کے فیضِ صحبت اور احمدیت کی برکت سے رؤیا و کشوف اور الہامات کی نعمت سے نواز رکھا تھا۔ آپ کی دعائیں اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول تھیں اور اکثر آپ کو دعاؤں کی قبولیت کے متعلق

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رؤیا وکشوف اور الہامات کے ذریعہ اطلاع بھی مل جاتی تھی۔

مجھے ذاتی طور پر تو کبھی مولانا سے درخواستِ دعا کا موقع نہیں ملا البتہ انجمن کوارٹرز کے ایک رہائشی اور مولانا کے پڑوسی محمد اصغر قمر بتاتے ہیں کہ صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت میں آنے سے پہلے وہ مولانا کو موصول ہونے والے خطوط کے جواب لکھا کرتے تھے۔ طریقِ کار یہ تھا کہ سب سے پہلے وصول شدہ خط پڑھا جاتا جس کے بعد مولانا ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے اور دعا ختم کرتے ہی خط کا جواب لکھوا دیتے۔ یہ جواب بڑا واضح ہوتا اور اِس میں یہ ذکر ضرور ہوتا کہ سائل کا کام ہو جائے گا یا خدانخواستہ اس میں رکاوٹ پڑنے کا احتمال ہے اور اُن کا یہ جواب بعد میں بالعموم درست ثابت ہوتا۔

قمر بتاتے ہیں کہ جب انہوں نے ملازمت شروع کی تو اُن کی تقرری نظارتِ علیا میں ہوئی جہاں بسبب مصروفیت اُن سے مولانا کی خدمت میں کوتاہی ہونے لگی۔ تب مولانا نے صاحبزادہ مرزا عزیز احمد، ناظرِ اعلیٰ سے درخواست کی کہ قمر کو کچھ وقت کے لیے اُن کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ خطوط کے جوابات بھجوانے میں تاخیر نہ ہو۔ قمر کا کہنا ہے کہ مرزا عزیز احمد نے اُنہیں تاکید کی کہ اب مولانا کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے اور یوں یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

مولانا کے ایک اور پڑوسی سید نذیر حسین مشہدی کے سب سے بڑے بیٹے، منیر احمد میرے ہم جماعت تھے۔ ایک بار سفر کے دوران سرگودھا میں اُن کا ایک اٹیچی کیس گم ہو گیا۔ منیر ربوہ پہنچ کر گھر جانے کی بجائے اسی پریشانی میں سیدھے مولانا کے پاس چلے گئے جہاں منیر کے چھوٹے بھائی خلیل پہلے سے بیٹھے تھے۔ منیر نے مولانا کو سامان کی گمشدگی کا بتایا اور دعا کی درخواست کر کے گھر چلے گئے۔ خلیل کی روایت ہے کہ منیر کے جانے کے بعد مولانا نے ہاتھ اٹھائے اور دعا ختم کرنے کے بعد اُنہیں کہا کہ باہر سوندھے خان آیا ہے، اسے دیکھو۔ جب خلیل باہر نکلے تو وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اجنبی جو ایک بازو سے محروم ہے کندھے پر اٹیچی کیس اٹھائے ہوئے ان کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔ اسی دوران منیر باہر نکلے تو انہوں نے اُس اٹیچی کیس پر نگاہ پڑتے ہی شور مچا دیا کہ یہ ان ہی کا سامان ہے۔ یہ مولانا کی قبولیتِ دعا کا ایک ایسا نشان تھا جو اتنے سال گذرنے کے بعد بھی خلیل کو پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہے۔

موصوف کے ایک پوتے، محمد یوسف بقاپوری (ابن محمد اسماعیل بقاپوری) جو آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں میرے دوستوں میں سے ہیں۔ کبھی ملاقات ہو تو وہ مولانا کے بعض خارق عادت واقعات سناتے رہتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ: ''اکتوبر ۱۹۵۶ء میں حضرت دادا جان اور حضرت دادی جان قادیان کے جلسہ سالانہ پر گئے۔ واپسی پر دادا جان تو ربوہ آ گئے اور دادی جان ڈیرہ غازی خان چلی گئیں جہاں ہماری پھوپھو، امۃ الحفیظ کے ہاں بچے کی ولادت متوقع تھی۔ میں اور دادا جان صدر انجمن کے کوارٹرز نمبر ۸ میں رہتے تھے۔ دوپہر کا کھانا لنگر سے آتا جو شام تک کے لیے کافی ہوتا تھا۔ ناشتہ کوارٹر نمبر ۹ سے ایک خاتون بھجواتی تھیں۔ صرف ۴ بجے کی چائے دادا جان خود بناتے تھے اور میں کچن میں ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک دن جب چائے بن رہی تھی تو میں نے بتایا کہ چینی بالکل ختم ہے اور ڈبہ خالی ہو چکا ہے۔ دادا جان نے کہا کہ نہیں چینی موجود ہے۔ میں نے پھر چینی کا ڈبہ کھولا تو وہ خالی تھا۔ دادا جان

اٹھے۔ انہوں نے چینی کا وہی ڈبہ اٹھایا اور کھولا تو اس میں چینی موجود تھی۔ میں انگشت بدنداں رہ گیا کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا لیکن آج تک میں یہ گتھی نہیں سلجھا سکا۔''

انہوں نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ''ایک رات ۱۲ بجے کے بعد دروازہ کھٹکا تو معلوم ہوا کہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب آئے ہیں اور دعا کے لیے کہہ رہے ہیں۔ اس وقت حضرت میاں صاحب کی کسی بیٹی کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ کوئی پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی اور حضرت میاں صاحب اسی حوالے سے دادا جان کے پاس دعا کے لیے آئے تھے۔ صبح کے وقت جب میں نماز فجر کے لیے بیت مبارک جانے کی تیاری کر رہا تھا تو دادا جان نے ایک رقعہ دیا کہ واپسی پر میاں صاحب کے گھر دے آنا۔ میاں صاحب کا گھر بیت مبارک کے گیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ میں نے نماز کے بعد ان کے گھر دے دیا۔ حضرت میاں صاحب نے پڑھنے سے پہلے ہی بتا دیا کہ اپنے دادا جان کو کہنا کہ آپ کی دعا قبول ہوگئی ہے اور بچی تولد ہوئی ہے۔ غالباً رقعہ میں بھی یہی بشارت تھی۔''

محمود احمد بھٹی جنہیں ایک لمبا عرصہ لاہور اور پھر اسلام آباد میں جماعتی خدمات کی توفیق ملی بتاتے ہیں کہ وہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں بی اے کے طالب علم تھے اور ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کے پاس دعا کے لیے گئے۔ انہوں نے روشنی دیکھی تو بتایا کہ پاس ہو جاؤ گے۔ دو تین اور طالب علم بھی بعد میں دعا کی غرض سے ان کے پاس گئے تو مولانا نے ان طالب علموں کے سامنے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ جو طالب علم امسال تیرے در پر آئے گا پاس ہو جائے گا۔ بھٹی بتاتے ہیں کہ ان طالب علموں نے ہوسٹل میں جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جس جس نے پاس ہونا ہو وہ مولانا کے پاس جائے اور دعا کرائے چنانچہ بعض کمزور طالب علم جن کے لیے تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا مولانا سے دعا کرانے گئے اور اچھے بھلے نمبروں پر پاس ہو گئے۔

انجمن کوارٹرز میں قیام کے دوران ہمیں حضرت مسیح موعود کے ایک اور قدیمی اور مخلص رفیق اور سلسلہ احمدیہ کے نامور بزرگ حضرت حافظ سید مختار احمد شاہجہانپوری کی ہمسائیگی کا شرف بھی حاصل رہا۔

ایک روایت کی رو سے آپ ۱۸۹۲ء میں حضرت مسیح موعود کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے تھے۔ وہ ایک سعید الفطرت شخص تھے چنانچہ دینی علوم میں شروع ہی سے خاص شغف رکھتے تھے اور زبان و بیان کے مسلم الثبوت استاد اور بلند پایہ، پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اردو کے نامور شاعر امیر مینائی کے تلامذہ میں ایک خاص مقام حاصل تھا اور اس دور کے نامور شعراء اور ادباء شعر و سخن اور ادب کے میدان میں آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے معترف تھے۔

حضرت مسیح موعود کی قوتِ قدسی سے فیض یاب ہونے کے نتیجہ میں آپ کو علم کے ساتھ ساتھ روحانیت میں ترقی کرنے کا انمول موقع میسر آیا اور ایک ممتاز اور نامور خادمِ دین کی حیثیت سے شہرت پائی۔ آپ نے دینی علوم میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے شغف اور زبان و بیان کی جملہ صلاحیتوں کو عمر بھر خدمتِ دین کے لیے وقف رکھا اور آخر

دم تک لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد آپ قادیان سے لاہور میں فروکش ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ارشاد کی تعمیل میں ربوہ تشریف لے آئے۔ یہاں بھی احمدی احباب اور ان کے ہمراہ غیراز جماعت دوست بکثرت آپ کے پاس آتے تھے۔

موصوف کے تفصیلی حالاتِ زندگی جماعتی لٹریچر میں محفوظ ہیں لہٰذا ان کا اعادہ کئے بغیر میں یہاں صرف ایک ہی واقعہ کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ میرے کلاس فیلو، رفیق محمد خان جو حصول تعلیم کے لیے بہاولپور سے ربوہ آئے ہوئے تھے اور فضل عمر ہوسٹل میں مقیم تھے سلسلہ کے ممتاز بزرگان کے پاس بکثرت حاضر ہوتے رہتے تھے۔ وہ بتاتے ہیں: ''ملک لال خاں امیر جماعت احمدیہ کینیڈا جو اُس وقت تک جماعت میں شامل نہ تھے ہوسٹل میں غیراز جماعت بورڈرز کی امامت کرایا کرتے تھے۔ ایک بار وہ میرے ساتھ مختار شاہجہانپوری کے پاس گئے۔ اگلی بار میں مختار شاہجہانپوری کے پاس اکیلا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے اس لڑکے (یعنی ملک لال خان) کے ماتھے پر سعادت مندی کے آثار نظر آتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہ لڑکا احمدیت قبول کرلے گا۔ میں نے یہ بات ان ہی دنوں ملک لال خان کو بتادی۔ اس وقت تک ملک لال خان قبولِ احمدیت کے لیے تیار نہ تھے لیکن کچھ عرصہ بعد جب انہیں مکمل شرحِ صدر ہوگیا اور انہوں نے جماعت احمدیہ میں شمولیت اختیار کرلی تو مختار شاہجہانپوری کی وہ بات پوری ہوگئی۔''

خوش قسمتی سے مجھے بھی وقتاً فوقتاً مختار شاہجہانپوری کی خدمت میں حاضری اور آپ کی طرف سے بعض مکتوبات کے جواب تحریر کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی لیکن یہاں میں آپ کے ان چار خطوط کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے میرے یا میری والدہ کے خطوط کے جواب میں ارسال فرمائے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میرا ایم اے کا امتحان ہونے والا تھا اور میں اس پریشانی میں ہر ایک سے دعا کی درخواست کرتا رہتا تھا۔ آپ کا ایک خط جو قمر نامی ایک شخص کے ہاتھ سے ۲۶ مئی ۱۹۶۷ء کا لکھا ہوا ہے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''امتحان میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسبِ خواہش کامیابی عطا فرمائے اور مناسب مناصب تک پہنچائے۔

سستی کو ہمیشہ کے لیے طلاق دیں۔ ہمیشہ چست و چاق رہا کریں۔''

آپ کا ۱۴ جون ۱۹۶۷ء کا یہ خط بھی میں نے آپ کی یادگار کے طور پر سنبھال رکھا ہے:

''میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں حسبِ خواہش کامیابی عطا فرمائے، اپنی رضا کی راہوں پر چلائے اور فلاحِ دارین سے حصۂ وافر بخشے۔ جو گذر گیا وہ گذر گیا۔ اب آپ لاحول اور استغفار کا چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے وِرد رکھیں۔ ان شاء اللہ یکسوئی حاصل ہو جائے گی۔ گناہوں کا معاملہ اللہ اور بندے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے اسی سے کہنا چاہیئے۔''

آپ کے ۲۸ جون ۱۹۶۷ء کے اس خط میں میرے اس اندیشے کا جواب تھا کہ میرے بہت زیادہ خطوط آپ

کے لیے وجہ پریشانی نہ بن جائیں۔آپ نے تحریر فرمایا: ''آپ بڑی خوشی سے جتنے خطوط چاہیں لکھیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہر خط کا آپ کو جواب ملے گا بحالیکہ میں خود لکھنے سے خرابیٔ اعصاب کے سبب معذور سا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے سامان پیدا کر دیتا ہے۔میری دلی دعا اور تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حسبِ خواہش کامیابی عطا فرمائے اور اس کامیابی کو بہت سی کامیابیوں کا پیش خیمہ بنائے۔''

۹ جولائی ۱۹۶۷ء کا لکھا ہوا یہ خط بھی اس عاجز کے لیے آپ کی محبت کا آئینہ دار ہے:

''الحمد للہ کہ یہ دونوں پرچے پہلے پرچوں کی نسبت اچھے ہو گئے۔اللہ تعالیٰ مفید بنائے اور امتحان میں آپ کو حسبِ خواہش کامیابی عطا فرمائے اور آپ سب کو خوش وخرم رکھے۔آپ کی والدۂ ماجدہ کا خط بھی آیا تھا اور وہ بھی جوابی۔ان کو بھی آج ہی جواب لکھوایا ہے۔میں تو پہلے سے ان کے لیے دعا کرتا ہوں اور یہ بھی کہ آپ نے جو اُن کے لیے دعائیں کی ہیں اللہ تعالیٰ وہ بھی قبول فرمائے۔''

اس عاجز کی والدہ کے نام جس خط کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے میرے پاس پڑا ہے۔اس کی عبارت کچھ اس طرح ہے:

''میں تو عزیزم محمد داؤد صاحب طاہر سلمہٗ اللہ تعالیٰ کی کامیابی کے لیے دعا کر رہا ہوں اور کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحم سے انہیں حسبِ خواہش کامیابی عطا فرمائے اور آپ کی دعائیں اُن کے حق میں قبول ہوں۔وہ اب کے بھی تمغات پائیں اور آپ کی راحت کا موجب ہوں۔

اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ دراز دے اور مناسب مناصب تک پہنچائے اور آپ سب کو خوش وخرم رکھے۔وہ مجھ سے ملے بھی تھے۔ان کے دادا صاحب مرحوم منشی فخر الدین سے میرے بڑے گہرے تعلقات تھے اور مولوی محمد یعقوب صاحب طاہر سے بھی۔اللہ تعالیٰ ان کو نوازے۔اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔''

سلسلہ کے ان خدام کے ذکرِ خیر کے بعد اب اپنے ان دوستوں کا ذکر جو سکول اور کالج میں میرے ساتھی تھے لیکن افسوس! ہمارا یہ ساتھ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

یاد آئی جب اُن کی گھٹا کی طرح، ذکر اُن کا چلا نم ہوا کی طرح

مجھے اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران بے شمار طلبہ کی معیت حاصل رہی۔ ان میں سے کچھ کا سلسلہ تعلیم بوجوہ منقطع ہوگیا، بعض ہم جماعتوں نے سکول یا کالج کی تعلیم کے دوران ربوہ کی سکونت ترک کردی اور کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو جانے والے ہمارے ساتھیوں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ ابھی ہم پانچویں جماعت میں تھے کہ ہمارے ایک کلاس فیلو منور احمد جو یوسف بریلوی کے صاحبزادے تھے کچھ دن بیمار رہ کر وفات پا گئے۔ وہ ربوہ ہی میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر پر سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا کتبہ لگا ہوتا تھا۔ وہ چونکہ میرے دوستوں میں سے تھے لہٰذا میرا جب قبرستان سے گذر ہوتا میں ان کی قبر پر رُک کر ان کی بلندی درجات کے لیے دعا ضرور کرتا۔ خواجہ عبدالسّلام المعروف چھاما جو ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ وہ ٹاؤن کمیٹی ربوہ کے پاس ایک چائے خانہ چلاتے تھے۔ میرا ادھر سے گذر ہوتا اور ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو ضرور آگے بڑھ کر سلام کرتے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ میں ان سے چائے پیئے بغیر نہ جاؤں اور کبھی کبھی وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ مدت تک نظر نہ آئے۔ تب کسی نے بتایا کہ وہ مختصر علالت کے بعد وفات پا چکے ہیں۔ محمد حسین مؤذن کے بڑے بیٹے احمد حسین سکول میں ہمارے ساتھ تھے۔ صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت میں تھے کہ وفات پا کر ربوہ میں دفن ہوئے۔

ہمارے بہت سے مرحوم ہم جماعتوں میں سے ایک راجہ عبدالخالق تھے جو میجر عبدالحمید سابق مجاہد انگلستان، امریکہ و جاپان کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ان کی والدہ سکینہ بیگم جنہیں ہم اپنے گھر میں ''آپا سکینہ'' کہتے تھے یکے از ۳۱۳ رفقائے حضرت مسیح موعود، حضرت میاں محمد دین، واصل باقی نویس کی نواسی اور صوبیدار مظفر خان کی صاحبزادی تھیں۔ چونکہ حضرت میاں محمد دین نے امی کے دادا، حضرت مرزا جلال الدین کے ذریعے احمدیت قبول کی تھی لہٰذا ان کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم تھے جو بعد میں ان کی اولادوں میں بھی منتقل ہوئے۔ اسی ناطے وہ مجھ سے بھی ہمیشہ محبت کا سلوک فرماتیں۔ انہوں نے ہمارے خاندان کی ہر خوشی اور غمی میں شمولیت فرمائی بلکہ میری شادی کے موقع پر اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود ربوہ سے راولپنڈی تشریف لائیں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے مجھے موقع کے مطابق اپنی دعاؤں کے علاوہ قیمتی تحائف سے بھی نوازا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۵۹ء میں جب آپا کی شادی ہونے والی تھی آپا سکینہ کوئٹہ میں مقیم تھیں۔ شنید تھی کہ کوئٹہ میں اعلیٰ معیار کا سمگل شدہ کپڑا پنجاب کی نسبت سستے داموں مل جاتا ہے چنانچہ امی نے ان سے رابطہ کیا اور انہوں نے اس حوالے سے ہماری ہر ممکن معاونت کی۔

خالق نے اپنی تعلیم کا آغاز کوئٹہ سے کیا تھا البتہ انہوں نے میٹرک میرے ساتھ تعلیم الاسلام ہائی سکول سے

پہنچ گیا۔ کالج میں ہمارے مضامین ایک جیسے نہ رہے لیکن ہم نے گریجوایشن ایک ہی سال میں کی۔

اس عرصے میں میجر عبدالحمید ریٹائر ہونے کے بعد اپنی زندگی وقف کر چکے تھے اور ان کی تعیناتی امریکہ میں تھی چنانچہ خالق بھی مستقل طور پر وہیں چلے گئے۔

۱۹۷۱ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔ ایک بار میں اپنے کسی کام کے سلسلہ میں راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے پاس گھوم رہا تھا کہ اچانک خالق نظر آ گئے۔ معلوم ہوا کہ امریکی شہری ہونے کے ناطے انہیں لازمی فوجی سروس کے قواعد کے تحت دو سال کے لیے بطور میٹرولوجیکل آبزرور ویت نام بھجوایا گیا تھا جہاں سے وہ چھٹی پر پاکستان آئے ہوئے ہیں لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باعث پروازوں میں تعطل کی وجہ سے وقت پر ویت نام واپس نہیں پہنچ پائے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اگرچہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب وہ ویت نام واپس پہنچے تو ڈیوٹی سے غیر حاضری کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے تاہم بالآخر رہا ہوئے اور لازمی فوجی سروس کا عرصہ پورا کرنے کے بعد امریکہ واپس گئے۔

''اس واقعہ کی تفصیلات کیا تھیں؟'' ایک بار میں نے ان کے بڑے بھائی سکویڈرن لیڈر (ر) عبدالمالک جو کرنل مرزا داؤد احمد کے داماد اور میجر جنرل (ر) مسعود الحسن نوری کے ہم زلف ہیں سے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے'' انہوں نے مجھے بتایا ''قواعد وضوابط کے مطابق ایک معینہ مدت کی ایکٹو ڈیوٹی کے بعد خالق ایک ہفتے کی رخصت برائے آرام وتفریح کے حقدار تھے جسے صرف بنکاک میں گذارا جاسکتا تھا۔ خالق کی خواہش تھی کہ وہ یہی وقت پاکستان میں اپنے خاندان کے ساتھ گذاریں تاہم متعلقہ حکام نے ان کی یہ درخواست رد کردی۔ خالق جو پاکستان سے امریکہ جانے کے بعد سین ہوزے میں مقیم رہے تھے نے وہاں کے اخبار ''سین ہوزے مرکری'' کے کالم ''ایکشن لائن'' میں اپنی کہانی شائع کرادی۔ اس حلقے کے کانگریس مین نے اس احتجاج کا فوری نوٹس لیا اور خالق کی دادرسی کے لیے متعلقہ حکام کو لکھا جس کے نتیجے میں خالق کے کمانڈنگ آفیسر، کرنل ہاف مین نے انہیں اپنے خرچ پر پاکستان جانے کی اجازت دے دی۔

وہ یہاں پہنچے ہی تھے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور پروازیں بند ہوگئیں۔ چونکہ خالق کی واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور وہ وقت پر واپس سائیگان نہ پہنچ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اسلام آباد سے امریکی سفارت خانے کے ذریعہ اپنے کمانڈنگ آفیسر کو اپنی اس مجبوری سے مطلع کرتے ہوئے چھٹی بڑھانے کی درخواست کردی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب حالات معمول پر آنے لگے اور پاکستان سے پروازیں شروع ہوگئیں، خالق ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو کراچی سے بنکاک کے راستے سائیگان کے لیے روانہ ہوئے تاہم انہیں بنکاک میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ امیگریشن آفیسر کا کہنا یہ تھا کہ وہ گرین کارڈ ہولڈر ہونے کے باوجود تھائی ویزا کے بغیر بنکاک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ معاملہ بڑھا تو امریکی فوج کے پرووسٹ مارشل کو طلب کیا گیا جس کی ہدایت پر ملٹری پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ان پر ڈیوٹی سے غیر حاضری کا الزام لگا۔ خالق نے بہتیری دہائی دی لیکن کسی نے ان کی ایک

نہ سنی اور انہیں ہتھکڑی لگا کر سائیگان بھجوا دیا گیا۔ تحقیقات کے بعد انہیں اس الزام سے بری کر کے ڈیوٹی پر بحال کر دیا گیا چنانچہ وہ اپنی لازمی فوجی خدمت کے دوسال پورے کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں امریکہ واپس گئے۔''

چند سال پہلے آپا سکینہ کی زبانی یہ خبر سن کر دل کو دھچکا سا لگا کہ موصوف اچانک وفات پا گئے ہیں۔

''دراصل ویت نام میں قیام کے دوران انتقالِ خون میں عدم احتیاط کے باعث انہیں ہیپاٹائٹس سی ہو گیا تھا۔ مرض اندر ہی اندر رہا اور ایک بار اتفاقاً اس کی تشخیص ہوئی۔ اس تکلیف نے ان کے جگر کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کا جگر ٹرانسپلانٹ کا پروگرام بن چکا تھا لیکن اسی انتظار میں ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے'' آپا سکینہ نے ہی مجھے بتایا۔

وہ ۱۹۶۶ء میں امریکہ گئے تھے اور سین ہوزے سے بزنس ایڈمنسٹریشن (اکاؤنٹنگ) میں بی ایس کیا۔ بعد میں وہ واشنگٹن ڈی سی منتقل ہو گئے اور بزنس اینڈ پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیا اور بالآخر سرٹیفائیڈ پبلک اکاؤنٹینٹ بن گئے۔ انہوں نے ساری زندگی سرکاری ملازمت کی تاہم انہیں جماعتی خدمات کی بھی توفیق ملی اور وہ نیشنل فنانس سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔

''ان کے بچے، بچیاں؟'' میں نے آپا سکینہ سے پوچھا۔

''سب سے بڑی تو بیٹی ہے، ثمینہ۔ اب ڈاکٹر بن چکی ہے اور نیو جرسی میں کام کر رہی ہے۔ سائیکیاٹرسٹ ہے۔ چھوٹا بیٹا عمر ہے اور کانو والے ڈاکٹر ضیاء الدین کی پوتی سے بیاہا ہوا ہے۔ بہت اچھا بچہ ہے، دبنگ، باپ دادا کی طرح بہادر اور دلیر۔ نادر اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ وکیل ہے، اچھا اور نیک نام۔''

''خالق کی شادی تو صبیحہ سے ہوئی تھی نا؟''

''اچھا! آپ کو یاد ہے۔ جی دھوریا والے کیپٹن عبدالرحمٰن کی بیٹی سے۔ آپ کی تو کیپٹن صاحب سے ملاقات تھی!''

خالق کے ذکرِ خیر کے بعد اب کچھ باتیں عبدالحمید کی جو ماسٹر اللہ بخش زراعتی کے صاحبزادے اور سکول میں ہمارے کلاس فیلو تھے لیکن کسی وجہ سے میٹرک ہمارے ساتھ نہ کر پائے۔ ہاں! غالباً ایک سال بعد وہ کالج پہنچ گئے۔

وہ فٹ بال کے اچھے کھلاڑیوں میں سے تھے اور کالج ٹیم میں شامل تھے۔

ان کی کسی اور غیر نصابی سرگرمی کا تو مجھے علم نہیں البتہ وہ کالج کی عربی سوسائٹی (جسے جمعیہ طلاّب العربیہ کہا جاتا تھا) کے ۶۵-۱۹۶۴ء کے دوران نائب الامین یعنی اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ اس سال میں اس سوسائٹی کا نائب الرئیس منتخب ہوا تھا۔

وہ شروع میں صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں کام کرتے تھے مگر بعد میں پاکستان ایئر فورس میں ٹیکنیشن بھرتی ہو گئے۔ وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کے دوران ڈھاکہ میں تعینات تھے تاہم سقوطِ ڈھاکہ سے ایک دو روز پہلے کسی طرح وہاں سے فرار ہو کر بالآخر پاکستان آنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایئر فورس سے

استعفیٰ دے دیا اور کنسٹرکشن بزنس سے منسلک ہو گئے۔ لمبا عرصہ کراچی میں رہے لیکن اپنی علالت کی وجہ سے ۲۰۰۸ء کے شروع میں لاہور منتقل ہو گئے۔

ان کے بھائی مجید طاہر نے ایک بار ان کا فون نمبر دیا تو طبیعت ان سے بات کرنے کو مچل اُٹھی لیکن یہ جان کر افسوس ہوا کہ وہ سانس کی کسی بیماری کی وجہ سے شیخ زید ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں ان کے پاس پہنچا تو پہچان نہ پایا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے تھے۔ میں نے آخری بار انہیں پچاس سال پہلے دیکھا تھا جب وہ ایئر فورس میں بھرتی ہوئے تھے۔ اس وقت جوانی کا عالم تھا لیکن آج وہ جسمانی کمزوری کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو چکے تھے اور ان کا سانس بار بار اکھڑ رہا تھا۔ میں نے کہا: ''آپ تھک گئے ہوں تو کچھ دیر آرام کر لیں، باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں'' لیکن وہ غالباً میری دلجوئی کے لیے میری بات ماننے کو تیار نہ تھے۔

انہیں دل کا حملہ ہو چکا تھا اور ان کی مرض کی نوعیت خاصی پیچیدہ تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق اب ان کا بائی پاس ہو سکتا تھا نہ انجیو پلاسٹی ممکن تھی۔ کچھ ڈاکٹروں کا یہ بھی خیال تھا کہ انہیں ٹی بی ہے لیکن ٹیسٹوں سے بیماری کی تشخیص میں کوئی مدد نہ مل سکی حالانکہ وزن تھا کہ مسلسل کم ہوتا جا رہا تھا۔

حمید نے انکشاف کیا کہ ان کی ایک بیٹی کینیڈا میں ہوتی ہے اور دوسری انگلینڈ میں جب کہ ان کا اکلوتا بیٹا جرمنی میں ہے۔

''اس کا مطلب ہے آپ اور بھابھی یہاں اکیلے رہ رہے ہیں'' میں نے کہا۔

''نہیں میری بہو ابھی یہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ رہتی ہے'' ادھر سے قدرے اطمینان بخش جواب آیا۔

ان کے پاس ان کا ایک خالہ زاد بھائی بیٹھا ہوا تھا جو بھاگ کر میرے لیے ایک کپ چائے لے آیا۔ وہ بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی لے کر آیا تھا لیکن سچ پوچھیں تو میرا جی چائے پینے کو چاہ رہا تھا نہ بسکٹ کھانے کو۔ صرف ان کا دل رکھنے کی خاطر میں نے چائے کا کپ زہر مار کیا۔

میں ان کے ساتھ مزید ملاقاتوں کے وعدہ پر رخصت ہوا لیکن یہ نوبت ہی نہ آ پائی۔ ایک دن مجید طاہر کے اچانک فون سے پتا چلا وہ لاہور میں ہیں اور اپنے بڑے بھائی، عبدالرشید کے ہاں ڈیفنس میں مقیم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حمید وفات پا گئے ہیں اور وہ اسی سلسلے میں پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اگلی صبح جرمنی واپس چلے جانا تھا لہٰذا میں فوراً ان سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔ ''بس ان کی بیماری ہی کچھ ایسی پیچیدہ تھی کہ آخر تک صحیح تشخیص نہ ہو پائی'' انہوں نے بتایا۔

وہ شخص جو کسی زمانے میں فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا اور جس کی صحت پر دوسرے رشک سے نگاہ کیا کرتے تھے مُشتِ استخوان بن کر منوں مٹی تلے دفن ہو چکا تھا۔

''ان کی تدفین ہانڈو گجر میں ہوئی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''نہیں۔ وہ موصی تو نہ تھے لیکن ربوہ کے پرانے باسی تھے لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ وہ وہیں دفن ہوں۔ بھائی جان رشید نے ان کی اس خواہش کے مدِنظر ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ سے اس امر کی خصوصی اجازت حاصل کر

رکھی تھی چنانچہ اللہ کے فضل سے وہ ربوہ میں دفن ہوئے۔''

عبدالحمید کے بعد اب کچھ ذکر ہمارے اس دوست کا جو وطن فروشوں کی ایک سازش کا شکار ہو کر اپنے گھر سے بہت دور اپنے وطن کے ساتھ محبت کے جرم میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میرا اشارہ عبدالسمیع پرویز کی طرف ہے جو سکول کے زمانہ سے میرے کلاس فیلو تھے اور ہم کالج میں بھی دو سال اکٹھے رہے لیکن اس کے بعد وہ پڑھائی نہ جاری رکھ سکے اور مشرقی پاکستان چلے گئے۔

سمیع چوہدری محمد شریف، سابق مربی بلادِ عربیہ کے بھائی، چوہدری عبدالرحیم کے صاحبزادے، مولانا غلام باری سیف کے برادرِ نسبتی اور ڈاکٹر عبدالخالق، نائب صدر مجلس انصار اللہ مرکزیہ کے ماموں تھے لیکن چونکہ اب قصہ ماضی بن چکے ہیں اس لیے کسی کے پاس حتیٰ کہ ڈاکٹر عبدالخالق کے پاس بھی ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں تاہم خوش قسمتی سے میرے پاس ان کے تین خطوط محفوظ ہیں جو علی الترتیب ۱۴ ستمبر ۱۹۶۴ء، ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء اور اٹھارہ نومبر ۱۹۶۴ء کے لکھے ہوئے ہیں۔

ان خطوط کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپریل ۱۹۶۴ء میں مشرقی پاکستان گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر محمد شفیق سہگل حال نائب وکیل التصنیف، تحریک جدید انجمن احمدیہ کے کارخانہ، بنگال بیلٹنگ کارپوریشن، چٹاگانگ جو بجلی کے تار، ہوز پائپ، مشینوں کے پٹے، جوتے اور بہت سی دیگر اشیاء بناتا تھا میں کیشئر کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: ''تنخواہ بھی معقول پاتا ہوں، رہائش فری ہے، کھانے وغیرہ کا خرچ بھی کمپنی دیتی ہے۔ سال میں آنے جانے کا کرایہ، ایک مہینہ کی رخصت ملے گی۔''

اپنے ایک خط میں انہوں نے اباجی کی وفات پر تعزیت بھی کی اور پھر چٹاگانگ کے موسم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا: ''یہاں تو ابھی سردی کا موسم شروع نہیں ہوا۔ بنگالیوں کے مطابق سردی شروع ہے۔ کوٹ سویٹر پہن کر پھرتے ہیں لیکن ہمارے مطابق بالکل گرمی ہے۔ رات کو پنکھا چلا کر اور چادر اوڑھ کر سوتے ہیں۔'' وہاں کی تازہ خبروں سے مطلع کرتے ہوئے انہوں نے لکھا: ''اتوار کے روز چٹاگانگ کے باہر کسی نہ کسی جھیل پر چلے جاتے ہیں اور خوب وقت گذر جاتا ہے۔ چند روز ہوئے چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب آئے تھے۔''

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کے بعد ہماری خط و کتابت یا کوئی ملاقات نہیں ہوئی اور کئی سال اسی طرح گذر گئے۔ ایک دن خبر ملی کہ سمیع کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ فوجی وردیوں میں ملبوس کچھ لوگ انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے جن کے متعلق بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ مکتی باہنی کے رضا کار تھے۔ ان کے ہاتھوں سمیع کا کیا حشر ہوا ہوگا اس بارے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔

سمیع کے ساتھ مشرقی پاکستان جانے والوں میں دواخانہ طب جدید والے حکیم محمد صدیق کے بیٹے صادق احمد نعیم بھی شامل تھے۔ صادق جو مذکورہ بالا فیکٹری کے ٹائم آفس میں کام کرتے تھے اوائل سکول سے میرے کلاس فیلو تھے۔ خداتعالیٰ نے انہیں مشرقی پاکستان میں پیش آنے والی مشکلات سے محفوظ رکھنا تھا چنانچہ وہ سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے ایک بار ربوہ آئے تو ان کے برادرِ اکبر، ماسٹر طاہر احمد نسیم نے انہیں یہیں روک لیا اور مشورہ دیا کہ وہ پہلے

اپنی پڑھائی مکمل کریں اور پھر ملازمت کے بارے میں سوچیں۔ صادق نے ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے یہیں رہ کر پہلے بی کام کیا اور پھر کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی۔

۱۹۹۳ء میں میرا تبادلہ ملتان ہوا تو صادق اس کارپوریشن میں غالباً ریجنل ہیڈ کے طور پر کام کر رہے تھے اور ان سے جمعہ یا دیگر جماعتی تقریبات میں ملاقات رہتی تھی۔ وہ بالکل صحتمند نظر آتے تھے تاہم اسی عرصے میں انہیں برین ٹیومر ہو گیا اور وہ اس عارضے سے جانبر نہ ہو سکے۔ انہوں نے چھ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو وفات پائی اور ربوہ میں دفن ہوئے۔

صادق کے بعد اب کچھ ذکر بشارت احمد جمیل کا جنہوں نے نامساعد حالات میں اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر امریکہ پہنچ کر اپنوں اور غیروں سے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کا وجود نہ صرف ان کے خاندان کے لیے بلکہ جماعت کے لیے بھی باعثِ صد افتخار تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ بشارت جمیل کب ہماری کلاس میں داخل ہوئے لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ انہوں نے میٹرک کا امتحان میرے ساتھ ہی پاس کیا تھا اور ہم نے کالج میں داخلہ بھی ایک ساتھ لیا تھا۔ انہیں ریاضی کے ساتھ عشق تھا چنانچہ بی اے میں پہنچے تو انہوں نے اپنے اختیاری مضامین کے طور پر میتھ اے اور بی کورسز کا انتخاب کیا۔ ہم نے ۱۹۶۵ء میں اکٹھے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ہم دونوں کے ڈیپارٹمنٹس جدا جدا لیکن قریب قریب تھے اس لیے ہماری ملاقات کم وبیش روزانہ ہو جاتی۔ ان دنوں ان کی رہائش لاہور کینٹ میں کسی جگہ پر تھی اور وہ بائیسکل پر نیو کیمپس آیا کرتے تھے۔ میں ایم اے پولیٹیکل سائنس کرنے کے بعد تلاشِ معاش میں اُلجھ گیا لیکن بشارت جمیل مزید پڑھائی کے لیے امریکہ چلے گئے۔

پردیس جا کر شروع میں پرانے سنگی ساتھی بہت یاد آتے ہیں۔ ان دنوں خط ہی رابطے کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ مجھے بھی ان کے خطوط بکثرت آتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی امریکہ آ جاؤں لیکن میں ان کی اس تجویز پر اپنے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کرتا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید میری تنگ دامنی اس راہ میں رکاوٹ ہے لیکن میں اس بات کا کھلے بندوں اعتراف نہیں کرنا چاہتا۔ تب انہوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ مجھے نہ صرف پاکستان سے امریکہ آنے کا کرایہ بھجوا دیں گے بلکہ وہاں کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلے کا انتظام بھی کر دیں گے، بس وہاں آنے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ تب میں نے انہیں لکھا: ''تم جانتے ہو ابا جی تین سال پہلے وفات پا گئے تھے، میری سب بہنیں اپنے اپنے گھروں والی ہیں اور میں ہی امی کا واحد سہارا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ امریکہ جا کر میرے حالات یکسر بدل سکتے ہیں لیکن کیا میری طرف سے بھجوائے گئے چند سو ڈالر امی کا وہ احساسِ تنہائی ختم کر سکیں گے جس کا سبب پاکستان سے میری غیر موجودگی ہو گی؟'' اس کے بعد بشارت جمیل نے کبھی اپنی بات پر اصرار نہ کیا لیکن میرے ساتھ ان کا اخلاص ہمیشہ قائم رہا۔ وہ پاکستان آتے تو مجھے ضرور ملتے۔ میں نے دو مواقع پر ان سے کچھ رقم بطور اُدھار بھجوانے کی درخواست کی اور انہوں نے دونوں بار خندہ پیشانی کے ساتھ میری یہ فرمائش پوری کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے یہ رقم انہیں وعدے کے مطابق لوٹا دی لیکن فی زمانہ کتنے لوگ ہیں جو کسی کی ضرورت میں اس کے کام آتے ہیں؟

اُن کی شادی پائینیر لیکنزک کمپنی ملتان کے چوہدری عبداللطیف کی بیٹی رضیہ سے ہوئی تھی۔ میں ان کی بارات کے ساتھ ملتان گیا تھا اور ان کے ولیمہ میں بھی شامل ہوا تھا جس کا انتظام محلہ دارالبرکات میں ان کے گھر کے بالکل سامنے ایک خالی پلاٹ میں کیا گیا تھا۔ اس موقع پر صاحبزادہ مرزا رفیع احمد نے دعا کرائی تھی اور دعوت میں شامل معززین کے ہمراہ ایک تصویر بھی اتروائی۔ اس تصویر میں بشارت جمیل کے علاوہ تعلیم الاسلام کالج میں ان کے ریاضی کے تینوں اساتذہ یعنی پروفیسر محمد ابراہیم ناصر، چوہدری حمید اللہ اور عبدالرشید غنی اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔

خدا نے انہیں چار بیٹوں سے نوازا تھا۔ عرفان، سلمان، عثمان اور فرحان۔ جب وہ عرفان کے نکاح کے لیے پاکستان آئے تو میں راولپنڈی میں تھا۔ انہوں نے لاہور سے فون کر کے مجھے اس میں شمولیت کی دعوت دی۔ ان کے سمدھی پاکستان ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس سروس کے یحیٰی خضر میرے جاننے والوں میں سے تھے اور میں اس نکاح میں شامل بھی ہونا چاہتا تھا لیکن میں کسی وجہ سے اس موقع پر حاضر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد سلمان کی سڑک کے ایک حادثہ میں وفات نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ وہ اندر ہی اندر گھلتے رہے اور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

ان کی اہلیہ بتاتی ہیں: ۱۷ نومبر ۲۰۰۶ء کو جمعہ کا دن تھا۔ ہم صبح کے وقت اکٹھے گھر سے نکلے۔ میں نے ایک سٹور پر بعض چیزیں واپس کرنا تھیں۔ وہاں مجھے کچھ دیر لگ گئی تو وہ کہنے لگے: جو کام کرنا ہے جلدی جلدی نمٹا لو، ایسا نہ ہو میرا جمعہ ضائع ہو جائے۔ میں نے اپنے کام سمیٹ لیے تو انہوں نے مجھے گھر چھوڑا اور بتایا کہ انہیں نماز کے بعد کسی سے ملنے جانا ہے، پھر وہ اپنے زیر تعمیر مکان پر جائیں گے لہٰذا انہیں گھر واپس آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ سہ پہر کے قریب یہ سوچ کر وہ فارغ ہو چکے ہوں گے میں نے ان سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا فون بند ملا۔ تعجب تو ہوا لیکن دل میں کوئی ایسا وہم نہیں آیا۔ بس یہی سوچتی رہی کہ اب آ جائیں گے، اب آ جائیں گے! وہ شام تک واپس نہیں لوٹے تو مجھے فکر ہوا۔ اتنی دیر میں عرفان گھر آیا تو میں نے اسے بتایا۔ ہمیں ہزار واہموں نے گھیر لیا۔ عرفان نے پولیس کو فون کیا اور پھر خود ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جب وہ ہمارے زیر تعمیر مکان پر پہنچا تو وہ اپنی گاڑی میں بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان کی روح کو قفسِ عنصری سے پرواز کیے ہوئے کئی گھنٹے گذر چکے تھے۔''

''میں انہیں بُھلا کیسے بھلا سکتی ہوں'' مسز بشارت کی گفتگو جاری تھی ''انہوں نے نامساعد حالات میں اپنی زندگی کا آغاز کیا لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ایک ایسے مقام پر جا پہنچے جو قسمت والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے لیے ایک شاندار گھر تعمیر کرنا شروع کیا جس میں گیارہ بیڈز اور نو غسل خانے تھے۔ نقشے کے مطابق اس چار منزلہ گھر میں لفٹ بھی لگنا تھی۔ ایک بار وہ اپنے ٹھیکیدار کو بتا رہے تھے: شاہجہان نے تو ممتاز محل کی وفات کے بعد اس کے لیے تاج محل تعمیر کیا تھا لیکن میں نے اپنی بیوی کی زندگی میں ہی اس کے لیے تاج محل کھڑا کر دیا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتے تھے وہ۔ انہوں نے واقعی میرے لیے تاج محل بنا دیا تھا۔ وہ میرا اتنا خیال رکھتے تھے جیسے چھوٹے بچے کا رکھا جاتا ہے اور اپنی کامیابیوں میں میرے کردار کو ہمیشہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ مجھے ان سے اپنی

آئی ایم ریلی ۔ آئی ایم پراؤ آف یو کہ ... پر بار بار ... نہ جانے وہ اس بات

آخری ملاقات کبھی نہیں بھولی۔

پراؤڈ آف یو۔'' ... سے امریکی منظر کی ویب سائٹ پر بشارت جمیل کے بھائی

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے ... بشارت جمیل کے امریکہ کے نامور اور بااثر

عبدالہادی ناصر کا ایک مضمون موجود ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ... ممبران کانگریس، دفتر خارجہ اور اقوام متحدہ کے

سیاستدانوں کے ساتھ ذاتی اور دوستانہ تعلقات تھے خاص طور پر ... احمدیت کے لیے بے پناہ جذبہ اور غیرت رکھتے۔ احمدیت کے

حقوق انسانی کے شعبوں میں خصوصی تعلق تھا۔ وہ ... اعلیٰ ترین عہدیداروں سے ملنے اور احمدیت کے لیے ان کی

مفاد کو ہر دم مقدم رکھتے اور اس کے لیے حکومت کے اعلیٰ ترین عہدیداروں سے ملنے اور احمدیت کے لیے ان کی

حمایت حاصل کرنے کے لیے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کام کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے اور جب بھی

اور جس جگہ بھی جماعت کو ضرورت پیش آتی اپنی خدمات پیش کر دیتے تھے۔

بشارت جمیل نے اپنی زندگی انسانیت کی مدد کے لیے پورے عزم اور خلوص کے ساتھ وقف کر رکھی تھی...

جنرل ضیاء الحق نے اپنے دور اقتدار میں احمدیوں پر جو ظلم ڈھائے اُن کے خلاف اور احمدیت کے بارہ میں اُس کے مذموم ارادوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی خاطر ڈاکٹر بشارت جمیل نے اپنے تمام ذرائع اور تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے جنرل ضیاء الحق کی حکومت پر امریکہ کی کانگریس اور حکومت کا دباؤ برقرار رکھا۔

پیٹر ڈبلیو گالبرتھ جو ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۳ء تک امریکی سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سینئر ایڈوائزر رہے، ضیاء الحق کے تاریک ترین دور کے خلاف اپنی کاوشوں کو یاد کرتے ہوئے عرفان جمیل کے نام اپنے تعزیتی خط میں لکھتے ہیں: ''۱۹۸۰ء کے عشرہ میں آپ اُن احمدیوں کے مقدمات میرے پاس لے کر آئے جنہیں پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی آمرانہ حکومت نے موت کی سزا سنائی۔ آپ کی انتھک اور مسلسل کوششوں کی وجہ سے کمیٹی نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا اور اُن کی زندگیاں بچانے میں کامیاب ہوئی......''

بشارت جمیل نے احمدیوں کے لیے امریکہ میں مذہبی بنیاد پر پناہ کے لیے امریکی دفتر خارجہ کی منفی رائے کو مثبت رائے میں تبدیل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس بارے میں بنیادی کام اُنہوں نے انسانی حقوق کی مایہ ناز وکیل کیرن پارکر کے ساتھ مل کر کیا اور امریکہ میں احمدیوں کے پناہ کے مقدمات کی کامیابی کے لیے راستہ ہموار کر دیا......

US Commission of Religious Freedom کے پالیسی انالسٹ اور بشارت جمیل کے قریبی دوست سٹیو سنوا اپنے دوست کی وفات پر اپنے خیالات کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں: ''میری خوش بختی ہے کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں جب کہ امریکی حکومت کے دفتر خارجہ میں شرقِ قریب اور جنوبی ایشیا کے انسانی حقوق کے معاملات میرے سپرد تھے، بشارت جمیل میرے لیے جماعت احمدیہ کے بارہ میں معلومات مہیا کرنے کا نہایت قابل اعتماد ذریعہ رہے۔ آپ پاکستان کی صورت حال اور خصوصاً احمدیوں کے حالات کے متعلق قیمتی، بروقت اور درست معلومات ......فراہم کرنے کا ایک بہت قیمتی ذریعہ تھے۔ انسانی اور مذہبی حقوق کے ساتھ آپ کی والہانہ وابستگی کی مثال آپ کے خاندان اور جماعت کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔''

بشارت جمیل یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف ڈیفنس میں ریاضی دان کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور
جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی تھے۔ ان کا چلے جانا ان کے خاندان اور دوستوں کے علاوہ ایک جماعتی
نقصان بھی ہے۔ سچ ہی تو کہا تھا انہوں نے

تجھے اے بشارتِ
تیرے رب نے کیسا بے نوا
جسے کھو کے ہر کوئی یہ دل دیا
اسے پھر کہیں بھی کہہ اٹھا
نہ پا سکوں

''بشارتِ بے نوا'' کے ذکر نے مجھے اپنے ایک ایسے مرحوم دوست کی یاد دلا دی ہے جس نے اردو افسانہ نگار کے طور پر بہت شہرت کمائی لیکن اپنی وفات کے بعد معاشرے کے ناقابلِ رشک رویّوں کا شکار ہو کر اک عالمِ بے بسی میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

سعید انجم سکول کی ابتدائی جماعتوں سے میرے کلاس فیلو تھے۔ ان کے والد چوہدری غلام حسین صدر انجمن احمدیہ کے افسر تعمیرات تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر کالج میں ایف اے تک اکٹھے رہے۔ ان کا قد قدرے چھوٹا اور ان کی طبیعت میں تیزی و طراری تھی۔ سکول کے زمانے میں تو ان کا ادبی ذوق کھل کر سامنے نہیں آیا لیکن جب وہ کالج پہنچے تو اردو ادب کی بعض معروف کتابیں ان کے ہاتھوں میں نظر آنے لگیں۔ اس زمانے میں ''المنار'' میں ان کے بعض افسانے شائع ہوئے جن میں سے یہ تین افسانے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں: ''زرد پتے سرخ پھول''، ''ساکن ہاتھ'' اور ''کالی پینٹ سفید قمیص، سفید ساڑھی کالا بلاؤز''

ہم نے بی اے ایک ساتھ کیا جس کے بعد ان سے رابطہ کمزور پڑ گیا۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ لاہور میں ملازمت کرتے ہیں لیکن کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ میں فنانس سروسز اکیڈمی جوائن کرنے کے بعد ایک دفعہ اپنے کسی کام سے ہال روڈ سے میو ہسپتال کی طرف جا رہا تھا کہ سعید انجم اچانک مل گئے۔ معلوم ہوا کہ اے جی آفس میں کلرک کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک معمولی سے ٹی سٹال پر بیٹھ گئے اور بہت دیر تک پرانی باتیں کرتے رہے لیکن ان کا ایک انوکھا سوال جو مجھے اب تک یاد ہے یہ تھا کہ کیا حکومت کے تربیتی اداروں میں زیرِ تربیت افسران کی واقعی اس انداز میں برین واشنگ کر دی جاتی ہے کہ وہ خود کو عوام سے الگ، کسی بالاتر طبقے کا فرد سمجھنے لگیں۔ میں ان کے سوال کا پس منظر سمجھ رہا تھا۔ وہ گھریلو حالات کی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے تھے اور بہ امر مجبوری کلرک کی حیثیت میں ملازمت کر رہے تھے۔ انہوں نے کلیریکل سٹاف اور عوام الناس کے ساتھ افسران کا رویہ دیکھا ہوگا اور اس تلخی کو بھی محسوس کیا ہوگا جس کے ساتھ اس ملک میں ایک عام آدمی کی زندگی بھری ہوتی ہے۔

اس کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ کہیں کھو سے گئے۔ پھر کسی دوست نے ذکر کیا کہ وہ ناروے میں مقیم ہیں۔

ان کے بارے میں مجھے آخری خبر اخبار جنگ کے راولپنڈی ایڈیشن سے ملی جس میں ان کی وفات کی اطلاع تھی۔ اخباری اطلاع کے مطابق ان کی تدفین نماز جنازہ کی ادائی کے بغیر ہوئی۔ مجھے تجسس رہا کہ وہ کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے سعید انجم کا جنازہ پڑھے بغیر ہی انہیں دفن کر دیا گیا۔ میں نے حال ہی میں پرویز پروازی سے اس اطلاع کی تصدیق چاہی تو انہوں نے مجھے بتایا: یہ بات درست ہے۔ میں ان دنوں اوسلو میں تھا۔ سعید انجم کی وفات کی خبر سن کر میرے سمیت بہت سے احمدی وہاں پہنچ گئے لیکن ان کی اہلیہ جن کا جماعت سے تعلق نہ تھا مصر تھیں کہ احمدی ان کا جنازہ نہ پڑھیں۔ ان کے ایما پر کچھ غیر از جماعت دوست جمع ہو کر نمازِ جنازہ کے لیے صف بندی کر چکے تھے لیکن عین وقت پر ان کے امام نے اس بنیاد پر نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا کہ مرحوم احمدی تھے۔ اب ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی۔ سعید انجم کی اہلیہ ان کا جنازہ غیر احمدیوں سے پڑھانا چاہتی تھیں لیکن وہ اس بات پر آمادہ نہ تھے۔ اسی دوران سعید انجم کے بڑے بھائی رشید نے کہا کہ اس معاملہ کو طول نہ دیا جائے اور بغیر جنازہ پڑھے ان کی تدفین کر دی جائے۔ پرویز پروازی کہتے ہیں: ''ساری صورت حال ہمارے سامنے تھی لیکن ہمارے لیے اس جھگڑے میں ٹانگ اڑانا ممکن نہ تھا کیوں کہ ایسا کرنے سے صورت حال بگڑ سکتی تھی۔ یہ درست ہے کہ سعید انجم سوشلسٹ خیالات رکھتے تھے لیکن اُن کا ایک مخلص احمدی گھرانے سے تعلق تھا اور وہ خود بھی احمدی تھے چنانچہ بعد میں احمدیہ بیت الذکر میں سعید انجم کی نمازِ جنازہ غائب ادا کر دی گئی۔''

سعید انجم ایک کامیاب افسانہ نگار تھے اور ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں: ''سب اچھا ہوگا'' اور ''سوتے جاگتے خواب۔'' انہوں نے ''نہلے پہ دہلا'' کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا جو لاہور آرٹس کونسل کے سٹیج سے پیش کیا گیا اور لاہوریوں کی ایک بڑی تعداد نے اسے دیکھا۔

انٹرنیٹ پر سعید انجم کے بارے میں موجود معلومات کے مطابق انہوں نے Bak Sju Hav یعنی ''سات سمندر پار'' کے نام سے ایک فیچر فلم کی ہدایتکاری بھی کی تھی۔ یہ فلم جو لاہور اور اوسلو میں فلمائی گئی تھی اسلم نامی ایک بچے کے گرد گھومتی تھی جس کا والد اسے لاہور میں چھوڑ کر سات سمندر پار چلا جاتا ہے۔ بعد میں اسلم اس کے تعاقب میں خود بھی وہاں جا پہنچتا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں اس فلم کو ''بیسٹ نارویجین فیچر فلم'' کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس فلم کو بعد میں بعض اور انعامات بھی ملے چنانچہ اسے یورپین یوتھ فلم فیسٹول، بیلجیم میں پہلا اور سوئٹزر لینڈ کے بچوں کی فلموں کے ایک میلے میں دوسرا انعام ملا۔ اسے ایڈنبرا، شکاگو، ہندوستان، سڈنی اور جاپان میں بچوں کے بعض فلمی میلوں کے لیے بھی منتخب کیا گیا اور کئی یورپی ممالک کے ٹی وی چینلز نے اس کے حقوقِ نمائش خریدے۔

تعلیم الاسلام کالج میں اردو کے سابق پروفیسر، شیخ محبوب عالم خالد کے سب سے بڑے صاحبزادے ناصر احمد خالد کی روایت کے مطابق ''سعید انجم نے ایک ڈاکومینٹری'' بسنت بائی نائٹ'' کے نام سے بھی بنائی جس میں دکھایا گیا تھا کہ اس زمانے میں لاہور میں بسنت کا تہوار کس دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ پتنگ بازی، خصوصی طور پر تیار شدہ پیرہن میں ملبوس مرد و زن کا ڈھول کی تھاپ پر رقص، پتنگ کٹنے پر بوکاٹا کے فلک شگاف نعرے اور کلاشنکوف کی تڑ تڑ تڑ تڑ اور اس موقع پر ہونے والی پرتکلف دعوتیں اور نہ ختم ہونے والا ہلا گلا...... اس فلم میں یہ سب

کچھ دکھایا گیا تھا چنانچہ ناروے اور بعض دیگر یورپی ملکوں میں اسے بے حد پسند کیا گیا۔''

ناصر خالد مزید بتاتے ہیں: ''ایک دفعہ میں چوبرجی سے گذر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سعید انجم کوئی ڈاکیومینٹری بنا رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ پاکستان کے ٹرکوں پر دستاویزی فلم تیار کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس فلم کو بھی بعض غیر ملکی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔''

جہاں تک سعید انجم کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے نقادوں کی متفقہ رائے ہے کہ وہ ایک خوبصورت افسانہ نگار تھے۔ ایک دفعہ پرویز پروازی سے بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا: سعید انجم کو اردو کے ترقی پسند علامتی افسانہ نگاروں میں بڑا بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اس کا افسانہ ''نیک بندوں کا زیور'' تو بہت ہی مشہور ہوا تھا۔

ڈاکٹر سعادت سعید نے اپنے مضمون ''سینہ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب'' میں سعید انجم کے فن کا زیادہ تفصیلی احاطہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''سعید انجم ذات پرستی، داخلیت زدگی، مہمل نویسی اور لفظی بازی گری کے امراض میں مبتلا نہیں ہیں۔ ان کے افسانوں اور مضمونوں کا محتاط مطالعہ یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ انہوں نے اپنے اردگرد سانس لیتے انسانوں کی روحوں میں جھانکا ہے، ماحول کی پیچیدگیوں اور سماجوں کی تہ داریوں پر نظر رکھی ہے، معانی کی معینہ منزلوں کی جانب قدم بڑھائے ہیں اور لفظوں کو اپنے مقاصد کی ترسیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کی تحریر کا ہر لفظ ان کے نقطہ نظر کا گواہ ہے۔ یہی وہ فنی مقام ہے جس پر مکمل گرفت فنکار کی پختگی اور دیانت کی عکاس ہے۔

سعید انجم پختہ نویس بھی ہیں اور دیانتدار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلم کی عصمت پر آنچ نہیں آنے دی۔ لفظوں کی کھلی منڈیوں میں دلاّل کی مرضی کا مال نہیں بیچا۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے اور جہاں کہیں بھی ہیں اظہارِ صداقت ان کے قلم کا وطیرہ رہا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں دو قسم کے موضوعات میسر ہیں۔ اپنے وطن کے شہروں، دیہاتوں اور ان کے باسیوں کی وارداتیں، سفید فام ثقافتوں میں رہ کر تیسری دنیا کے حقیقی مسائل کی وضاحتیں، فی الاصل یہ دونوں موضوعات ایک ہی بڑے موضوع کا حصہ ہیں۔ آزاد، خودمختار اور منصفانہ معاشرے کی تلاش!......

سعید انجم نے تیسری دنیا کے باشندوں کی صورت حال پر جس انداز سے اظہارِ رائے کیا ہے اس سے ان کی تخلیقی اور فنکارانہ صلاحیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ پیش پا افتادہ کتابی مسائل کو اگر روائتی اور غیر جذباتی مبصر کے اسلوب میں بیان کیا جائے تو نہ ہی فنی تخلیق وجود میں آتی ہے اور نہ ہی قاری کے اعصاب کسی تبدیلی کو قبول کرتے ہیں۔ سعید انجم نے اپنے افسانوں میں اس امر کا بطورِ خاص خیال رکھا ہے کہ وہ مسائل جن پر بار بار قلم اُٹھایا جا چکا ہے پوری پوری جذباتی وابستگی، احساساتی شمولیت اور تخیلاتی مہارت سے معرضِ اظہار میں آئیں۔ سعید انجم کے افسانے ہر نوع کے فسطائیت کا پول کھولتے ہیں۔ وہ طبقاتی نظام کو غیر انسانی نظام جانتے ہیں اور اپنے اردگرد کے ماحول میں انسانی رجحانات کے رائج ہونے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ترقی پسندی ان کے تخلیقی جوہر کا حصہ ہے۔ سامراج دشمنی ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ سعید انجم اس منزل کی تلاش میں ہیں جو وسیع تر آبادیوں کے لیے

انسان دوستی، آزادی پسندی اور عوام دوستی سعید انجم کے نظریات کا لب لباب ہے۔ انہوں نے طویل افسانے بھی لکھے ہیں، مختصر افسانے اور افسانچے بھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے کسی ایک اسلوب پر قناعت نہیں کرتے۔ ان کی افسانوی تحریریں علامتی بھی ہیں، بیانیہ بھی اور کرداری بھی۔ وہ اساطیری اشاروں سے بھی کام لیتے ہیں، فوٹوگرافی سے بھی، ان کے ہاں ڈائیلاگ بھی دستیاب ہے اور ڈرامائی سچوایشن بھی، سادہ نویسی بھی ہے اور پُر پیچ اظہار بھی، ان کا مشاہدہ بھرپور ہے اور تجربہ وسیع ...... وہ جس بھی ماحول کا افسانہ لکھتے ہیں اس کو جزئیات سمیت گرفت میں لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ دیہات کے حوالے سے سادہ لوحی، توہم پرستی، معصومیت، انسان سے انسان کا پیار، غربت، بیچارگی، اقتصادی ناہمواری، شہر کے حوالے سے متوسط طبقے کی چالیں، سٹیٹس کی تبدیلی کی طمع، بزدلی، بے معنویت، سرمایہ دارانہ ثقافت، دولت کی ریلے ریس ...... والے مسائل ہیں۔''

اگرچہ سعید انجم کے فن کے بارے میں بہت کچھ کہنے کو باقی ہے لیکن ان کا ذکر موقوف کرتے ہوئے کچھ طاہر احمد عرف طاہری کے بارے میں جو مولوی فضل دین وکیل کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مولوی فضل دین تایا اسحٰق کے ہم زلف تھے لہٰذا طاہری کے ساتھ تعلق کی ایک وجہ یہ رشتہ داری بھی تھی تاہم اصل وجہ یہ تھی کہ ہم احمدیت کے رشتے میں پروئے ہوئے تھے، ہمارے بزرگان ایک دوسرے کے ساتھ مراسمِ محبت رکھتے تھے اور ایک مرحلہ پر ہماری رہائش بھی قریب قریب تھی۔ ان سب سے بڑھ کر طاہری شروع سے میرے کلاس فیلو تھے اور ہم ایک دوسرے کی کمزوریوں اور خوبیوں سے بہت حد تک واقف تھے لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ گہرے مراسم رکھتے تھے۔

ہمارے ایک کلاس فیلو جاوید احمد المعروف گوگا جو بی ٹی صاحب کے صاحبزادے تھے طاہری کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ طاہری اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی پُرخلوص نکلے چنانچہ انہوں نے اپنے دوست کا نام اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ وہ طاہر احمد سے طاہر احمد جاوید بن چکے تھے اگرچہ نہ معلوم کیوں جاوید نے طاہری کے نام کو اپنے نام کا حصہ نہیں بنایا۔

میٹرک کے بعد انہوں نے پری انجینئرنگ گروپ میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایف ایس سی کرتے ہی انہیں نیوی میں کمشن مل گیا اور وہ ۱۹۹۵ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک وہیں رہے۔ اس عرصے میں وہ کیپٹن کے عہدے پر پہنچ چکے تھے۔

ان کی شادی محلہ دارالصدر شمالی کے ایک مکین چوہدری محمد امین (جو تعلیم الاسلام کالج والے چوہدری محفوظ الرحمٰن کے ہم زلف تھے) کی صاحبزادی منصورہ سے ہوئی اور انہوں نے بفضلہٖ تعالیٰ ایک خوشگوار عائلی زندگی بسر کی۔

میں ۱۹۸۹ء کے آخر میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، پشاور میں زیرِ تربیت تھا۔ میرے ساتھ

علاقہ محکموں کے گریڈ ۱۹ کے افسران کی ایک بڑی تعداد بھی ٹریننگ حاصل کر رہی تھی۔ اس دوران ہمیں ایک مطالعاتی دورہ پر کراچی لے جایا گیا۔ یوں تو سرکاری طور پر ہماری مصروفیات طے شدہ تھیں لیکن سب دوستوں کی خواہش تھی کہ ہم اپنے طور پر کوئی آبدوز بھی دیکھیں۔ یہ کام نیوی کے کسی افسر کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے طاہری سے فون پر بات کی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ اس حوالے سے جملہ انتظامات کر لیں گے تاہم ہماری دیگر مصروفیات کی وجہ سے یہ پروگرام حتمی شکل اختیار نہ کر سکا۔ اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں اپنے طور پر کوئی آبدوز پہلی بار تین چار سال بعد دیکھ پاؤں گا اور وہ بھی ایک ایسی آبدوز جسے جرمنی نے دوسری جنگ عظیم کے دوران دشمن کے خلاف استعمال کیا تھا اور اب وہ جرمنی کے شہر کیل میں ایک میوزیم میں محفوظ ہے۔

انہیں نیوی میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر حکومت کی طرف سے اعزاز سے نوازا گیا۔ میری خواہش تھی کہ میں یہاں وہ سائٹیشن نقل کرتا جس میں حکومت کی طرف سے ان کی کارکردگی کا اعتراف کیا گیا تھا لیکن افسوس ان کی اہلیہ کی کوشش باوجود یہ دستاویز دستیاب ہو سکی نہ طاہری کے بعض احمدی رفقا اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

طاہری نے ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کی اور پھر اپنا کاروبار لیکن انہیں یہ کاروبار راس نہ آیا۔

انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل مجھے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے ذکر کیا تھا کہ ان کی ایک خطیر رقم کسی آدمی کے پاس پھنسی ہوئی ہے اور وہ اس میں سے کچھ بھی واپس کرنے کو تیار نہیں۔ یہ آدمی لاہور میں اپنا کاروبار کر رہا تھا اور میری تعیناتی اسی شہر میں محکمہ انکم ٹیکس کے سربراہ کے طور پر تھی۔ طاہری کا خیال تھا کہ میرے ذریعہ ان کی ڈوبی ہوئی یہ رقم بہ آسانی وصول ہو سکتی ہے لیکن افسوس میں ان کی خاطر خواہ مدد نہ کر سکا۔ طاہری کو صرف جزوی وصولی پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

یہی وہ سال تھا جب ان کی اچانک وفات ہو گئی۔ ہارٹ اٹیک تو انہیں ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا لیکن دوبارہ اس کے آثار عین اس موقع پر ظاہر ہوئے جب ان کی بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اور وہ اس کے انتظامات میں مصروف تھے۔ انہوں نے تکلیف کو معمولی سمجھ کر نظرانداز کر دیا مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بیٹی کی شادی کے فوراً بعد انہیں دل کا شدید حملہ ہوا اور وہ طبی امداد ملنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یہ واقعہ ۲۰ دسمبر ۲۰۰۴ء کا ہے، میری ریٹائرمنٹ کے ٹھیک دو دن بعد کا۔ طاہری کو باغ احمد میں دفن کیا گیا۔ جی ہاں! باغ احمد میں کہ کراچی میں احمدیوں کے قبرستان کا یہی نام ہے۔ طاہری کے پسماندگان میں سے ان کی بیوہ منصورہ طاہر، دو بیٹے نعمان طاہر اور حسن طاہر اور دو بیٹیاں مدیحہ اور حنا ہیں۔

طاہری کا ذکر ہو رہا ہو یا کسی اور مرحوم دوست کا، نصرت الٰہی خود بخود میرے ذہن کے کسی بند دریچے میں سے اچانک جھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ سکول کے آخری سالوں میں ہمارے ساتھ آ شامل ہونے والے نصرت الٰہی مربی سلسلہ فضل الٰہی انوری کے چھوٹے بھائی تھے اور محلہ دارالبرکات میں کسی جگہ مقیم تھے۔ چھوٹے قد اور چوڑے چکلے جثے والے نصرت الٰہی کے دیہاتی لہجے میں بھی ایک خاص کھنک تھی۔ غالباً بھیرہ کے اطراف سے ربوہ آئے تھے اور مختلف

طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ ہم انٹرمیڈیٹ تک ایک ساتھ رہے۔ پھر انہوں نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور مکینکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ میں اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور ان دونوں یونیورسٹیوں کے درمیان بُعد المشرقین تھا لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ہماری ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد کچھ عرصہ تو ان سے رابطہ رہا مگر پھر یہ رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

میں سنتا رہتا تھا کہ وہ شاہ تاج شوگر ملز، منڈی بہاؤالدین میں ملازم ہیں اور موٹروے کی تعمیر سے پہلے راولپنڈی سے ربوہ جاتے ہوئے کبھی کبھار وہاں سے میرا گزر ہوتا تھا لیکن قلتِ وقت کے سبب ان سے ملاقات ہمیشہ مؤخر کر دیتا رہا۔ ایک بار میں پروگرام بنا کر ملز کے جنرل منیجر، وحید قریشی کے ہاں تھوڑی دیر کے لیے رکا اور ان کے ذریعہ نصرت الٰہی کا پتا کرایا لیکن وہ اتفاقاً منڈی بہاؤالدین سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پھر بوجوہ یہ راستہ بھی میرے لیے ''آؤٹ آف دی وے'' ہو گیا لیکن ہمیشہ یہی خیال رہا کہ نصرت الٰہی سے ملنا کیا مشکل ہے، کسی روز مل ہی لیں گے۔ بس یہی سوچتے سوچتے ۲۰۱۱ء آ گیا۔ ایک روز میں نے فضل الٰہی انوری سے نصرت الٰہی کا پتا مانگا تو انہوں نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ وہ تو کچھ سال پہلے وفات پا گئے تھے۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ ''لیکن کیسے؟'' میں نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔

''کیا موت کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے؟'' انہوں نے مجھے جواباً کہا ''بس اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔''

''کہاں ہوتے ہیں ان کے بیوی بچے؟''

''واہ کینٹ میں کسی جگہ۔ بڑے بیٹے کا نام ہمایوں ہے اور میں اس کا ٹیلی فون نمبر دے سکتا ہوں۔''

جب میں نے ان کے فراہم کردہ نمبر پر بات کی تو خدا کا شکر ہے ہمایوں سے بات ہو گئی۔ ای میل نے اس رابطے میں مزید سہولت پیدا کر دی۔ معلوم ہوا کہ نصرت الٰہی نے اپنی ملازمت کا آغاز تو ستارہ گھی ملز، فیصل آباد سے کیا تھا اور وہ ایک سال پاکستان چپ بورڈ فیکٹری جہلم میں بھی رہے لیکن ان کی ملازمت کا سب سے طویل دورانیہ جو ربع صدی پر محیط تھا شاہ تاج شوگر ملز میں گذرا۔ وہ اشرف شوگر ملز بہاولپور میں بھی رہے، چشتیاں شوگر ملز میں بھی کام کیا اور آخر میں راجن پور چلے گئے لیکن جہاں بھی رہے انہوں نے اپنی محنت، دیانتداری اور خلوص سے لوگوں کے دل میں گھر کیے رکھا۔

ہمایوں کا بیان ہے کہ نصرت الٰہی کو قرآن پاک کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ انہوں نے تمام زندگی بیت الذکر سے رابطہ رکھا اور اولاد کو بھی اس کا عادی بنایا۔ انہوں نے کبھی کوئی نمازِ جمعہ نہیں چھوڑی نہ اولاد کو اس کی اجازت دی۔ وہ غریبوں کے ہمدرد تھے اور اپنے ماتحتوں کے لیے ایک مُشفق باس۔

''ان کی وفات کے بارے میں کچھ بتائیے!'' میں نے ان سے فرمائش کی۔

''جب وہ چشتیاں شوگر ملز میں تھے تو انہیں پہلی بار دل کا حملہ ہوا لیکن انہوں نے ابھی کچھ اور جینا تھا سو وہ اس تکلیف سے باہر نکل آئے تاہم بحالی صحت کی خاطر یہ ملازمت ہی چھوڑ دی اور پورا ایک سال آرام کرنے کے بعد

راجن پور میں ملازمت شروع کردی۔ وہاں تقریباً نو ماہ رہے۔ ان کے باس ان کی محنت اور فرض شناسی کے باعث ان
سے بہت خوش تھے لیکن اسی دوران انہیں دوبارہ ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں عطیہ
کر رکھی تھیں چنانچہ ان کی وفات کے فوراً بعد نور العین کی ایک ٹیم نے ضروری کارروائی مکمل کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی
اس قربانی کے نتیجہ میں بینائی سے محروم دو افراد کو بصارت کی نعمت سے سرفراز فرمادیا۔

نصرت الٰہی ۸ جولائی ۲۰۰۴ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی تدفین اس سے اگلے روز واہ
کینٹ میں عمل میں آئی۔

خالق، حمید، سمیع، صادق، بشارت جمیل، سعید انجم، طاہری اور نصرت الٰہی، یہ سب تو ہمارے اس زمانے
کے دوست تھے جب ہمیں ناک پونچھنا بھی نہ آتا تھا۔ تعلیم الاسلام کالج میں ہمارے ساتھ داخلہ لینے والوں میں
سے ایک محمد سلیمان تھے جو قصور سے میٹرک کر کے آئے تھے۔ تھے تو پری میڈیکل کے سٹوڈنٹ لیکن ان سے
علیک سلیک رہتی تھی۔ بدقسمتی سے ایف ایس سی کے نتیجہ کی بنیاد پر ان کا میڈیکل کالج میں داخلے کا خواب پورا نہ ہوسکا
تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری چنانچہ بی ایس سی کے بعد انہیں ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں داخلہ مل گیا۔ پھر ان کی
مائیگریشن کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں ہوگئی جہاں سے انہوں نے ۱۹۷۰ء میں گریجوایشن کی۔

اپنے اپنے جھمیلوں میں پڑ کر کئی سال تک ہمارا رابطہ منقطع رہا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب میں فیصل آباد
میں تھا ان سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ وہ تکمیل تعلیم کے بعد دو سال فوج میں رہے اور پھر ایران چلے گئے
جہاں انہوں نے کئی سال گذارے۔ وطن واپس آ کر سوشل سیکیورٹی ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کرلی اور جب
ہماری ملاقات ہوئی وہ فیصل آباد کے پیپلز کالونی میں واقع اسی محکمہ کے ہسپتال میں ماہرِ امراضِ بچگان کے طور پر کام
کررہے تھے۔ یاد رہے انہوں نے یہ تخصیص آسٹریا سے حاصل کی تھی۔

ان کی شادی سفینہ پرنٹ والے شیخ محمد عبداللہ کی صاحبزادی بلقیس اختر سے ہوئی تھی جو پنجاب یونیورسٹی
میں راشدہ کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ یوں ہماری ایک دوسرے کے ساتھ بکثرت ملاقاتیں ہونے لگیں اور جب
میں راولپنڈی چلا گیا تو بھی فون پر ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ برقرار رہا۔

ایک بار مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا۔ ان کا ایک گردہ بیکار ہوگیا تھا چنانچہ راولپنڈی کے ایک پرائیویٹ
ہسپتال ''کڈنی سنٹر'' میں ان کا کڈنی ٹرانسپلانٹ ہوا تاہم ہسپتال کی انتظامیہ اداشدہ فیس کی باضابطہ رسید جاری
کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ڈاکٹر سلیمان اپنے علاج پر اُٹھنے والا خرچ اپنے محکمہ سے وصول کرنا چاہتے تھے اور
باضابطہ رسید کی عدم موجودگی میں انہیں رقم کی واپسی میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں میری مدد کے طلبگار
تھے۔ خدا کا شکر ہے میں نے کسی نہ کسی طرح انتظامیہ کو یہ رسید جاری کرنے پر آمادہ کرلیا۔

چند سال پہلے ان کے ایک ہم زلف شیخ ظفر احمد سے ملاقات میں ڈاکٹر سلیمان کا ذکر خیر بھی آ گیا۔ تب مجھ پر
یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ وہ تو وفات پا چکے ہیں۔

''کب وفات ہوئی ان کی؟'' میں نے مکرر تصدیق چاہی۔

''۳۰ نومبر ۲۰۰۳ء کو اور ان کی تدفین احمدیہ قبرستان، گھوکھووال میں ہوئی'' انہوں نے جواب دیا۔

''ہوا کیا تھا انہیں؟''

''کِڈنی ٹرانسپلانٹ کے وقت انہیں بتادیا گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دس سال تک اس گردے پر انحصار کر سکتے ہیں۔ آپریشن ۱۹۹۴ء میں ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس گردے کا فنکشن کمزور پڑتا گیا۔ مزید ٹرانسپلانٹ طبی وجوہ کی بنا پر ممکن نہ تھا۔ یہی تکلیف ان کی وفات کا سبب بن گئی۔''

ان کے بیٹے احسن سے بات ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے: ''میرے والد بہت عظیم انسان تھے'' احسن کہہ رہے تھے ''بہت نیک اور حد درجہ دیانتدار۔ ان کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے انہیں ہسپتال کے لیے ادویہ کی خریداری کی ذمہ داری سونپی تو انہوں نے اسے بہت ہچکچاتے ہوئے قبول کیا۔ پاکستان میں ادویہ کی خریداری میں گھپلے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ سپلائرز نے انہیں اپنے راستہ پر لگانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن والد صاحب نے ان کے سارے ہتھکنڈے ناکام بنادیئے۔''

ڈاکٹر سلیمان کے بعد اب کچھ ذکر سید شمشاد علی کا جو مربی سلسلہ، سید منیر احمد باہری کے برادرِ نسبتی تھے اور فرسٹ ائیر میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) کے طالب علم تھے لیکن ہمارے انگریزی اور اُردو کے پیریڈ اکٹھے ہوتے تھے لہٰذا آہستہ آہستہ ہماری ان سے بے تکلفی ہوگئی۔ ایف ایس سی میں وہ اتنے نمبر حاصل نہ کر سکے کہ انہیں انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل سکتا لہٰذا وہ آرٹس کی طرف آ گئے اور بی اے میں داخلہ لے لیا۔

شمشاد علی سید پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی رنگت صاف، قد لمبا اور گفتگو میں شستگی تھی۔ وہ بی اے میں اردو ایڈوانس پڑھنے والے معدودے چند طلبہ میں سے ہونے کے ناطے اردو سوسائٹی کے نائب صدر اور بعد میں صدر بھی رہے۔

ہم بی اے کے پہلے سال میں تھے جب اردو سوسائٹی کا افتتاحی اجلاس ان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اُس سال مبارک عابد اس سوسائٹی کے سیکرٹری تھے اور مہمانِ خصوصی زرعی یونیورسٹی، لائلپور کے وائس چانسلر، زیڈ اے ہاشمی۔ اس تقریب میں مہمانِ خصوصی نے تعلیم الاسلام کالج اور جماعت کی طرف سے اردو زبان کی خدمات کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔

۱۹۶۴ء میں کالج کے زیرِ اہتمام پہلی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں مُلک کے بہت سے نامور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اگرچہ اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت مہمان ادیبوں نے کی تھی لیکن شمشاد علی سید مجلس انتظامیہ کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً سٹیج پر نظر آتے رہے۔

بی اے کے امتحان میں ان کی فرسٹ ڈویژن صرف ایک نمبر سے رہ گئی تھی۔ وہ اس بات پر کافی ملول تھے۔ ہم بھی انہیں تسلی دینے والوں میں سے تھے لیکن انہیں اپنی اس مایوسی کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرنا پڑا۔

انہوں نے تکمیلِ تعلیم کے بعد غالباً الائیڈ بنک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس عرصے میں

ان کی تعیناتی جہلم اور لاہور سمیت مختلف جگہوں پر رہی۔ وہ اپنے حالات پر بظاہر مطمئن نظر آتے تھے۔
برسوں پہلے اچانک ان کی وفات کی خبر سنی مگر فوری طور پر اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ دو تین سال پہلے
منیر باہری سے اس واقعہ کی تفصیلات سن کر دُکھ ہوا۔ شمشاد نے جماعت سے باہر شادی کی تھی چنانچہ ان کی بیوہ بعد
تھیں کہ احمدی مرحوم کا جنازہ نہ پڑھیں۔ انہیں بمشکل تمام اس بات پر رضامند کیا گیا جس کے بعد مرحوم کے چند
احمدی رشتہ داروں نے جو اس موقع پر اکٹھے ہو گئے تھے تقریباً چھپ کر ان کا جنازہ پڑھا اور باقی ساری کارروائی ان
کی بیوہ کے رشتہ داروں نے اپنے رواج کے مطابق کی۔
ان کی تدفین لاہور میں ہوئی۔

اب آخر میں کچھ ذکر ایک اور مرحوم دوست، نعیم احمد کا جو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے برادرِ اکبر
حکیم غلام احمد کے پڑپوتے اور ڈاکٹر قریشی محمد عبداللہ کے صاحبزادے تھے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں
ڈاکٹر عبداللہ چنیوٹ میں پریکٹس کیا کرتے تھے لیکن ان کی رہائش فضل عمر ہسپتال کے پیچھے پولیس تھانے کے آس
پاس تھی۔ دھیمے مزاج کے شریف النفس انسان تھے اور ان کی یہی خوبی ان کے فرزند نعیم میں آئی تھی۔

نعیم سنٹرل ماڈل ہائی سکول، لاہور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایف اے کرنے کے بعد
تعلیم الاسلام کالج میں آئے تھے۔ ہم نے بی اے ایک ساتھ کیا بلکہ ہمارے بعض مضامین بھی مشترک تھے۔ بعد میں
انہوں نے بھی میری طرح سیاسیات میں ایم اے کیا لیکن گورنمنٹ کالج لاہور سے۔

ایم اے کرنے کے کچھ عرصہ بعد تک ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن پھر تلاشِ معاش کی اُلجھنوں نے یہ رابطہ
تقریباً منقطع کر دیا۔ ایک بار نہ جانے کس نے ذکر کیا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون! لیکن انہیں ہوا کیا تھا'' میں نے ان کی والدہ سے پہلا سوال یہی کیا۔

''کیا عرض کروں!'' دوسری طرف سے جواب آیا ''اسے دس سال کی عمر میں رئیومیٹک فیور ہوا تھا جس کی
وجہ سے اس کا دل بڑھ چکا تھا۔ اس پر اس تکلیف کا اثر ساری عمر رہا۔ جون ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ ہم لوگ گنری میں
تھے کہ اس کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ اسے حیدر آباد کے ایک ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ہر ممکن علاج ہوا
لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا اور اس کے ساتھ

دیکھا آخر اس دل کی بیماری نے کام تمام کیا

والا معاملہ ہوا۔ ۹ جون ۱۹۷۸ء کو وہ ہم سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر چلا گیا۔''

''کتنی عمر پائی انہوں نے؟''

''صرف بتیس سال۔ وہ اتنی ہی عمر لے کر آیا تھا۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟''

''جی ارشاد! میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''اس کا ابھی بچپن تھا۔ ہماری رہائش سندھ میں تھی۔ ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ ہم نعیم کو لکڑی کی
تھالی میں ڈال کر ربوہ لے جا رہے ہیں۔ میں تو ڈر ہی گئی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ خواب سنایا۔ انہوں نے بھی

اس خواب کو مُنذر سمجھ کر فوری طور پر ایک بکرا صدقہ کر دیا۔ اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے نعیم کو بچالیا لیکن اب یہ خواب من وعن پورا ہو گیا۔ نعیم موصی تھا اور اس کی وفات حیدر آباد میں ہوئی تھی چنانچہ ہم اسے لکڑی کے تابوت میں بند کر کے ربوہ لے گئے۔ الحمد للہ اس کا حساب صاف تھا بلکہ اس کی طرف سے کچھ فاضل ادائی بھی ہو چکی تھی چنانچہ بہشتی مقبرہ میں تدفین کی فوری طور پر اجازت مل گئی۔

مرحوم نے اُس وقت وصیت کی تھی جب وہ فورتھ ایئر میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ اس عمر میں نظامِ وصیت میں شمولیت ان کی نیکی کے علاوہ نظامِ سلسلہ کے ساتھ ان کی پختہ وابستگی کی علامت ہے۔

ان کی وفات پر پینتیس سال گذر چکے ہیں لیکن نعیم کا مسکراتا ہوا چہرہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا تو وہ مبارک باد کے لیے خاص طور پر ہمارے گھر آئے تھے اور ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

ڈاکٹر عبداللہ تو نعیم کی وفات کے چند ہی سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن ان کی والدہ، جمیلہ خانم جو شیخ منیر احمد، سابق امیر جماعت احمدیہ لاہور کی حقیقی ہمشیرہ تھیں لمبا عرصہ بقیدِ حیات رہیں اور انہوں نے حال ہی میں وفات پائی ہے۔ ’’بڑا ہی سعادت مند تھا میرا بیٹا‘‘ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا تھا ’’میری ذرا سی تکلیف پر مضطرب ہو جایا کرتا تھا۔ ربوہ کی بات ہے۔ ایک بار رات کے وقت میرے پیٹ میں اچانک درد اُٹھا۔ وہ بھاگ کر حکیم خورشید احمد کے پاس گیا اور دوا لے کر آیا۔ میں اسے کہتی رہی کہ وہ جا کر آرام کر لے، میں ٹھیک ہو جاؤں گی لیکن وہ اس وقت تک میرے پاس بیٹھا رہا جب تک میں خود اپنی نیند سو نہیں گئی۔ اس کی مخلوقِ خدا سے ہمدردی کے کئی واقعات میرے ذہن میں ہیں۔ بچپن ہی سے صحبتِ صالحین کا شوق رکھتا تھا اور مولانا غلام رسول راجیکی کا تو بے حد عقیدت مند تھا۔‘‘

یہ تو تھا ہمارے ان ہم جماعتوں میں سے بعض کا ذکرِ خیر جو ہمیں راستے میں چھوڑ کر خود راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے لیکن خدا کے فضل سے ہمارے بہت سے ساتھی حیات ہیں اور ماشاء اللہ فعّال زندگی گذار رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پاکستان میں ہیں تو بعض دُور دراز ملکوں میں جا بسے ہیں لیکن سچ پوچھیں تو آج بھی ہم ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب ہیں جتنے سکول یا کالج کے زمانہ میں تھے۔

ان میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر محمد کریم قمر کا۔

آؤ مل بیٹھ لیں ہم گھڑی دو گھڑی، جانے پھر ہم کہاں، تم کہاں دوستو

کریم قمر میرے تایا زاد بھائی ہیں اور عمر میں مجھ سے کچھ بڑے لیکن ہم ایک ہی کلاس میں تھے اور بی اے تک ایک ہی سکول اور کالج میں پڑھتے رہے۔ اس کتاب میں کسی اور جگہ بھی اشارۃً یہ ذکر موجود ہے کریم قمر کو شروع سے ہی تقریر سے دلچسپی تھی چنانچہ وہ سکول کے زمانے میں بھی اس حوالے سے ہونے والے مقابلوں میں انعامات جیتتے رہتے تھے۔ کالج پہنچ کر ان کا یہ جوہر مزید کھل کر سامنے آیا۔ انہوں نے یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا اور بعض دیگر کالجوں میں تعلیم الاسلام کالج کی کامیابی سے نمائندگی کی۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ ۱۹۶۴ء میں کالج یونین کے صدر کے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب بھی ہوئے۔ کالج میں انگریزی ادب کے ساتھ ان کی دلچسپی بڑھی چنانچہ گریجوایشن کے بعد انہوں نے اسلامیہ کالج سِول لائنز میں ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا اور پروفیسر ایرک سِپریئن کے شاگرد ہو گئے۔

ہم دونوں نے اپنی ملازمت کا آغاز گھٹیالیاں سے ایک ساتھ کیا تھا لیکن وہ مجھ سے بھی پہلے وہاں سے لاہور منتقل ہو گئے اور پرائیویٹ کالجوں میں پڑھانے لگے۔ وہ ۱۹۷۰ء میں سیرالیون چلے گئے اور فری ٹاؤن کے کسی غیر جماعتی سکول میں تدریسی فرائض سرانجام دینے لگے۔ بیچ میں لندن بھی رہ آئے جہاں انہوں نے لِنگوسِٹکس میں ڈپلومہ کیا۔ جب سیرالیون میں دانہ پانی ختم ہو گیا تو امریکہ چلے گئے لیکن اوریگون یونیورسٹی سے ''ایجوکیشن اِن سیکنڈری سکولز'' کے مضمون میں ایم اے کرنے کے بعد پاکستان چلے آئے۔ اُن دنوں پنجاب پبلک سروس کمیشن نے گورنمنٹ کالجز میں لیکچررز کی بعض آسامیاں مشتہر کر رکھی تھیں۔ کریم قمر نے درخواست دی اور منتخب ہو گئے اور ماسوا اُن مختصر وقفوں کے جب وہ لاہور کے کسی غیر معروف کالج میں تبدیل ہو گئے یا ڈیپوٹیشن پر صنعا گئے وہ ۱۹۷۶ء سے لے کر ۲۰۰۴ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں تعینات رہے۔

انہیں گھٹیالیاں، سیرالیون اور صنعا، تینوں جگہ قدرے ناموافق ماحول ملا۔ گھٹیالیاں کا تفصیلی ذکر تو اس کتاب میں موجود ہے لیکن باقی جگہیں بھی اس سے پیچھے نہ تھیں۔ صنعا کا ذکر آ جائے تو وہ ہنستے ہوئے بتایا کرتے ہیں کہ باقی جگہوں پر تو شاگرد اپنے اساتذہ کو ڈرا دھمکا کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے لیکن وہاں یہ انوکھا رواج بھی دیکھا کہ شاگرد استادوں کو کلاس روم میں پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ رہی تنخواہ تو اس کی باقاعدہ ادائی کا بھی انتظام نہ تھا، بس ایک تسلی رہتی تھی کہ جلد یا بدیر وصول ہو جائے گی۔ یوں وہ وقت تو مشکل سے گذرا لیکن آنے والے دنوں کے لیے کچھ بچت ہو گئی۔ شاگردوں کے ہاتھوں بار بار پٹنے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید صنعا میں اپنے معاہدے میں توسیع کی کوشش کرتے لہٰذا پہلا کنٹریکٹ ختم ہوا تو جان بچی سو لاکھوں پائے کا وِرد کرتے ہوئے شیخوپورہ واپس آ گئے۔

موصوف نے ریٹائرمنٹ سے پہلے کینیڈین امیگریشن کے لیے درخواست دے رکھی تھی جو منظور ہوئی چنانچہ ادھر وہ ریٹائر ہوئے ادھر جہاز میں بیٹھے یہ جا اور وہ جا۔ ایک بار ان سے رابطے کی ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ وہ ٹورانٹو پہنچ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد پاکستان آئے اور اپنی فیملی کو بھی ساتھ لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں محبت کرنے والی بیوی اور پانچ بیٹیوں سے نواز رکھا ہے۔ وہ تین بیٹیوں کی شادی کے فرض سے تو کینیڈا جانے سے پہلے سبکدوش ہو چکے تھے۔ وہاں پہنچ کر باقی دو بیٹیوں کے عائلی معاملات کو بھی حتمی شکل دے چکے ہیں۔ خوش قسمت ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی زندگی میں جملہ فرائض پورے کرنے کی توفیق دی ہے۔

نصیرالدین عبیداللہ مجاہدِ ماریشس، حافظ بشیرالدین عبیداللہ کے صاحبزادے ہیں۔ حافظ صاحب اباجی کے پرانے اور مخلص دوستوں میں سے تھے لہٰذا اباجی کی ان سے ملاقات رہتی تھی اور مجھے بھی ان کے ہمراہ ایک دو بار تحریک جدید کے کوارٹرز میں ان کے گھر جانے کا موقع ملا۔ نصیرالدین سکول کی ابتدائی جماعتوں سے لے کر ایف اے تک ہمارے کلاس فیلو رہے اگرچہ وہ درمیان میں کئی سال تک ربوہ میں نہیں تھے۔ غالباً یہ وہ دور تھا جب حافظ بشیرالدین عبیداللہ اپنے اہل وعیال سمیت کسی بیرونی ملک میں تھے۔ ربوہ کے طالب علموں کے برعکس جن کی وضع قطع پر سادگی کی ایک مخصوص چھاپ نظر آتی تھی نصیرالدین کہیں خوش لباس اور زیادہ بہتر شخصیت کے مالک نظر آتے تھے۔ ایف اے کے بعد انگلینڈ چلے گئے اور تب سے وہاں مقیم ہیں۔ پہلے تو نہ جانے کیا کرتے ہوں گے لیکن جب سے میں جانتا ہوں وہ اَرل فیلڈ اسٹیٹس کے نام سے جائیداد کی خرید وفروخت اور مکانات کرایہ پر اُٹھانے کا کاروبار کر رہے ہیں۔ نظرِ بد دُور ان کا کام بہت اچھا ہے اور ان کے ملازموں میں بہت سے پاکستانی الاصل کارکنوں کے علاوہ کئی ''گورے'' بھی شامل ہیں۔

میں ۱۹۸۹ء میں امریکہ سے واپسی پر پہلی بار انگلینڈ گیا تو ایک دو راتیں ان کے ہاں قیام کا موقع ملا۔ ان کی والدہ نصیرہ نزہت جو ماہنامہ ''مصباح'' کی مدیرہ رہی ہیں ان دنوں حیات تھیں اور ہمارے پورے خاندان سے واقف تھیں لہٰذا مجھے ان کے ہاں قیام میں غیر ضروری حجاب نہیں ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے گھر سے بڑھ کر آرام ملا۔ اس کے بعد بھی راشدہ کے ہمراہ ایک دو بار ان کے پاس ٹھہرنے کا موقع ملا اور وہ ہر بار مجھ سے بے حد محبت اور احترام سے پیش آئے۔ انہوں نے ہمیں حتی المقدور لندن کے اہم تفریحی مقامات کی سیر کرائی اور اپنی مصروفیات کے باوجود یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہم ان پر کسی قسم کا بوجھ ہیں۔

نصیرالدین کو نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے چنانچہ ان کا ڈرائنگ روم بعض عجیب وغریب اشیاء سے سجا رہتا ہے اور وہ ہر آنے جانے والے کو ان کی تاریخ بتانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ یہ نوادرات کتنے قدیم یا قیمتی ہیں لیکن ان کے ایک ایسے شوق پر دلالت ضرور کرتے ہیں جسے کوئی خوش حال انسان ہی پورا کر سکتا ہے۔

میرے یہ دوست ان مسائل سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو اس ماحول اور عمر کا خاصہ ہو سکتے ہیں۔ جب بچے بڑے ہو جائیں تو خاندان میں نئے شامل ہونے والے افراد بعض دفعہ نئے نئے مسائل لے کر آتے ہیں اور یہی

کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے تاہم وہ کمزوری صحت کے باوجود حالات کا مقابلہ جواں مردی سے کر رہے ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک روز ان پر ضرور قابو پالیں گے۔ ان کی اہلیہ اول ربوہ اور سرگودھا کے درمیان ۳۶ اڈہ کے پاس کسی گاؤں کی رہنے والی تھیں۔ نصیر الدین نے ان کے ساتھ ساتھ ان کے ضعیف والد کو بھی سنبھالا لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر نیکی کا اجر فوری طور پر اچھائی کی صورت میں ہی ملے۔

موصوف کو خدمت خلق کے کاموں سے دلچسپی ہے۔ خدا نے وسائل سے بھی نوازا ہے چنانچہ انہوں نے کئی سال پہلے ٹاؤن شپ لاہور میں ایک فری ڈسپنسری قائم کی تھی۔ میں بھی ان کی دعوت پر اس ڈسپنسری کے افتتاح میں شامل ہوا تھا لیکن ہمارے ملک میں بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کو لُوٹنے کا رواج عام ہے اور ان کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا چنانچہ وہ کام جو نیک نیتی کے ساتھ شروع کیا گیا تھا کچھ ہی عرصہ بعد بند کرنا پڑا کہ وہ ان کی نیک نامی کی بجائے بدنامی کا باعث بننے لگا تھا۔

کیپٹن محمد اسلم کے صاحبزادے محمد اشرف جو محلہ دارالصدر غربی میں رہائش پذیر تھے اور اپنے اُجلے پن کی وجہ سے اپنے باقی ساتھیوں سے ممتاز نظر آتے تھے سکول کے زمانے سے میرے کلاس فیلو تھے۔ ہم ایف اے تک اکٹھے رہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اور وہ کدھر گئے۔ بس اتنا پتا چلا کہ بعد میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے میتھ میں ایم اے کر لیا ہے۔ پھر کسی نے ذکر کیا کہ نائیجیریا ہوتے ہیں لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کسی جماعتی سکول میں پڑھانے پر مامور ہیں یا اپنے طور پر وہاں گئے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ وقت کی دُھول میں گم سے ہو گئے۔

۲۰۰۵ء میں میری ایک کتاب ''منزل نہ کر قبول'' کو پنجاب کی تاریخ اور ثقافت پر چھپنے والی کتابوں میں سے اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا اور اس کی خبر ادھر اُدھر پھیلی تو کینیڈا سے ایک اجنبی نے فون کر کے میری اس کامیابی پر مجھے مبارک باد پیش کی۔ میں فوری طور پر نہ سمجھ پایا کہ میرا یہ مدّاح کون ہے لیکن چند ہی لمحوں بعد میں جان چکا تھا کہ فون کرنے والے یہی اشرف ہیں جنہیں میرے اس اعزاز کی اطلاع نہ جانے کیسے ملی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں انہیں اپنی یہ کتاب ارسال کروں لیکن پاکستان سے کینیڈا کتاب بھجوانا اتنا آسان نہیں۔ میں ان کی یہ فرمائش تو پوری نہ کر سکا البتہ اس رابطے نے کئی بھولی بسری باتیں یاد دلا دیں۔ وہ کہہ رہے تھے: ''آپ کو شاید پتا ہو قاضی مبارک اور صفی اللہ صادق، دونوں سے میری رشتہ داری ہے۔ ہم تینوں کی مائیں آپس میں کزنز تھیں'' اور میں سوچ رہا تھا کہ ربوہ کی اس چھوٹی سی بستی کے مکینوں کو اللہ تعالیٰ نے کیا کیا رنگ لگا دیئے اور دنیا کے ترقی یافتہ ترین ملکوں میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع عطا فرمایا۔ کیا یہ سب خدا کی دین اور اس سلسلے کے سچے ہونے کی علامت نہیں کہ مخالفین کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس کا ہر قدم ترقی ہی کی طرف گامزن ہے؟

وہ دن گیا اور یہ دن آیا، ان سے رابطہ رہتا ہے، کبھی فون پر اور کبھی ای میل کے ذریعہ اور باہمی خیر خیریت کا پتا چلتا رہتا ہے۔ فی زمانہ اس سے زیادہ اور چاہیے بھی کیا؟

ہماری باتیں تو اس بچپن کے گرد گھومتی ہیں جب ہم ربوہ میں اکٹھے تھے، جب ہم ٹاٹ خود جھاڑا کرتے تھے، جب ماسٹر ہماری اصلاح کے لیے تادیب کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، جب ربوہ میں بجلی نہیں

تھی، سڑکیں کچی تھیں اور برسات کے موسم میں یہ بگھیاں چلا کرتی تھیں لیکن کبھی کبھار بعد میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کا حوالہ بھی بیچ میں آجاتا ہے۔

''آپ کو یہ تو پتا ہے میں نے کراچی یونیورسٹی سے میتھ میں ایم اے کیا تھا'' وہ بتاتے ہیں ''میں کئی سال نائیجیریا میں پڑھاتا رہا۔ ادھر آیا تو سوچا کہ جب تک اپنی تعلیمی استعداد میں اضافہ نہیں کروں گا بات بنے گی نہیں چنانچہ میں نے امریکہ کی یونیورسٹی آف کونیکٹیکٹ سے ایکچوریل سائنس میں ایم ایس کرلیا۔ یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ اس کے بعد پڑھاتا بھی رہا ہوں اور امریکہ اور کینیڈا کی بعض پنشن کنسلٹنگ کمپنیز کے ساتھ ایکچوریل اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا رہا ہوں۔ میں نے گرافک ڈیزائننگ کے شعبہ میں بھی کام کیا ہے لیکن اب ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔''

''بہت خوب!'' میں انہیں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں ایک بھرپور زندگی گذارنے کی توفیق بخشی۔ اللہ کے فضل سے اپنے اپنے شعبوں میں ہمیں نمایاں مقام دیا۔ لوگ ہماری عزت کرتے ہیں یہ سب اسی کی عطا ہے'' اشرف کہتے ہیں ''خدا کا شکر ہے کچھ جماعتی خدمت کی توفیق بھی مل رہی ہے۔ میں مجلس انصار اللہ کینیڈا کا نائب قائد اشاعت ہوں لیکن ''احمدیہ گزٹ'' اور ''نحن انصار اللہ'' کی ساری کمپوزنگ میں رضا کارانہ طور پر کرتا ہوں۔''

اشرف دوستوں کی کامیابیوں پر نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ اس خوشی کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ملتان پر میری کتاب آئی انہوں نے اس پر بے حد پسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ کچھ عرصہ خود ملتان میں رہ چکے ہیں لہٰذا وہ اس شہر کے اچھے خاصے واقف ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا ''مجھے تو یوں لگتا ہے گویا آپ نے میرا ماضی مجھے لوٹا دیا ہے۔ میں خود بھی ان راستوں پر چلتا ہوا محسوس کر رہا ہوں جو میرے لیے مدتوں سے اجنبی ہو چکے ہیں۔ بھئی کمال کر دیا ہے آپ نے!'' اس موضوع پر مزید کچھ لکھوں گا تو قاری کو شکایت ہوگی کہ مجھے شاید خودستائشی کا مرض لاحق ہے لہٰذا اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہوئے اب کچھ ذکر یوسف مبشر کا۔

میرے ان ہم جماعتوں میں سے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پاکستان میں رہتے ہوئے غیر معمولی مالی آسودگی سے نوازا ہے یوسف مبشر سرفہرست ہیں۔ ہم ایف اے تک اکٹھے رہے جس کے بعد وہ کہیں غائب سے ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ کراچی چلے گئے ہیں اور اپنے ایک بھائی کے چائے خانہ پر ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ وہ اس واقعہ کا پس منظر خود بتاتے ہیں: ''میں نے ایف اے کے دوران ایک خواب دیکھا تھا کہ میں چارپائی پر بیٹھا ہوا ہوں جب کہ میرے تینوں بھائی میرے سامنے زمین پر خاموش بیٹھے ہیں اور ان کے انداز سے پتا چلتا ہے کہ وہ میری مالی مدد کے طلبگار ہیں۔ میں نے اپنی والدہ کو یہ خواب سنایا تو اس کی بھنک میرے بڑے بھائی کے کان میں پڑ گئی۔ اسے یہ بات پسند نہ آئی اور وہ مجھے نیچا دکھانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ بالآخر اس نے میری والدہ سے کہہ سن کر میری تعلیم منقطع کروادی اور مجھے اپنے ہمراہ کراچی لے جا کر اپنے چائے خانے میں ایک معمولی کام پر لگا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ مبشر اچھی تعلیم حاصل کرے گا نہ باقی بھائیوں پر مالی تفوق حاصل کر سکے گا۔ میں کراچی چلا تو گیا تھا لیکن مجھے

نے بمشکل ایک سال وہاں گزارا اور نئے تعلیمی سال کے آغاز پر ربوہ کالج میں تھرڈ ائیر میں داخلہ لے لیا۔"

یوسف مبشر نے مجھ سے ایک سال بعد معاشیات میں ایم اے کیا اور کچھ عرصہ حکومتِ پنجاب کے پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ کے محکمہ میں ریسرچ ایسوسی ایٹ رہے لیکن ۱۹۷۱ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ منسٹری آف کامرس میں ریسرچ آفیسر منتخب ہو گئے۔ قسمت کے دھنی نکلے۔ کچھ ہی سالوں کے بعد کمیشن کے ذریعہ اسسٹنٹ چیف ہو گئے۔ اسی دوران ان کی زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ وہ خود بتایا کرتے ہیں: "ان ہی دنوں سی ڈی اے جی ۹ مرکز اسلام آباد کے بعض کمرشل پلاٹس نیلام کر رہی تھی۔ میں نے اخبار میں اشتہار دیکھا تو مجھے اس نیلامی میں حصہ لینے کا خیال آیا لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ میں نیلامی میں کامیابی کی صورت میں فوری طور پر کم از کم مطلوبہ رقم جمع کرا سکتا۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے اے جی پی آر کو کار ایڈوانس کے لیے درخواست دی تھی۔ یہ موقع پیدا ہوا تو میں نے بھاگ دوڑ کر کے یہ ایڈوانس ترجیحی بنیادوں پر منظور کرا لیا۔ کچھ پیسے پہلے سے میرے پاس پڑے تھے لیکن پھر بھی مطلوبہ رقم میں سے آٹھ ہزار روپے کم تھے۔ اگر مجھے کسی طرح یہ رقم مل جاتی تو میں ایک پلاٹ کی بولی میں حصہ لے سکتا تھا لیکن اس بظاہر معمولی رقم کا انتظام بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بالآخر مجھے رقم کہیں سے اُدھار مل گئی۔ میں نے بولی میں حصہ لیا اور خدا کے فضل سے کامیاب رہا۔ میں نے وہ پلاٹ آٹھ لاکھ روپیہ میں خریدا تھا۔ جب میں باہر نکلا تو ایک شخص نے جو میرا واقف تھا اور جس نے ایک اور پلاٹ کے لیے بولی بھی دی تھی یہ پلاٹ مجھ سے پچاس ہزار روپے منافع پر خریدنے کی پیشکش کی۔ میں اس کاروبار میں بالکل نیا تھا اور مجھے اس پلاٹ کی مارکیٹ پرائس کا اندازہ نہ تھا۔ میں نے پچاس ہزار روپیہ کو ہی ایک بڑی رقم سمجھتے ہوئے یہ پلاٹ اسے دے دیا۔ اگرچہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میرے ساتھ دھوکہ ہو گیا ہے لیکن اس وقت میں بے حد خوش تھا کہ ہینگ لگی نہ پھٹکڑی اور مجھے بیٹھے بٹھائے پچاس ہزار روپے مل گئے۔ ان دنوں میری تنخواہ بارہ تیرہ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھی اور یہ رقم میری تین چار سال کی تنخواہ کے برابر تھی چنانچہ میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے سی ڈی اے کی نیلامیوں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس طرح میرے پاس کچھ سرمایہ جمع ہو گیا۔ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے میرا دل دفتر سے اُچاٹ رہنے لگا۔ یوں بھی مذہبی بنیادوں پر میری مخالفت جاری تھی لہٰذا اب مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ میں ملازمت جاری رکھوں یا یہ کاروبار کروں۔ میں نے اپنی اہلیہ فرحت افزا سے اس معاملے میں مشورہ طلب کیا تو اس نے بڑے پتے کی بات کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے والد گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس میں منیجر تھے اور ملازمت کے دوران انہیں کئی طرح کی سہولتیں حاصل تھیں لیکن ریٹائر ہونے کے بعد وہ اپنے آبائی گاؤں گوکھووال گئے تو ان کے حالات یکسر بدل گئے اور یہ وقت کافی مشکل سے گذرا۔ اس کا مشورہ تھا کہ اگر میں ملازمت چھوڑ دوں اور پوری توجہ کاروبار پر مرتکز کر دوں تو یہ میرے حق میں زیادہ بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ دن گیا اور یہ دن آیا، میں نے دفتر کا منہ نہیں دیکھا اور اللہ نے مجھے میری سوچ سے بڑھ کر نوازا۔"

فرحت کا ذکر ہوا ہے تو آپ کو بتاتا چلوں کہ ان کا خاندان ہماری ایک عزیزہ کا جاننے والا تھا لہٰذا میں

بہت نیک، ملنسار اور سلجھے ہوئے ادبی ذوق کی مالک تھیں چنانچہ انہوں نے ''گلشنِ مہدیؑ'' نامی ایک کتاب بھی تصنیف کی۔

فرحت سے اس زمانے سے متعارف تھا جب وہ غیر شادی شدہ تھیں اور دارالامان فیصل آباد کی سپرنٹنڈنٹ تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے حکومتِ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں لیکچرر کے طور پر ملازمت اختیار کر لی لیکن ابھی پوسٹ گریجوایٹ کالج فار ویمن، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہی ہوئی تھیں کہ فرشتۂ اجل نے آلیا۔ میں اپریل ۱۹۹۹ء کی وہ شام کبھی نہیں بھول سکتا جب یوسف مبشر کے اچانک فون سے مجھے ان کی غیر متوقع وفات کی اطلاع ملی۔ میں اور راشدہ فوراً ان کے گھر واقع ایف سیون وَن پہنچے تو انہیں غسل دینے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مرحومہ موصیہ تھیں چنانچہ جنازہ اسی رات ربوہ لے جایا گیا جہاں بہشتی مقبرہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحومہ کی قبر ایک روَش کے عین اوپر ہے چنانچہ میں جب بھی وہاں سے گذرتا ہوں ان کی دعائے مغفرت کے لیے ضرور رُکتا ہوں۔

مرحومہ نے دو بیٹے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑی۔ بڑا بیٹا سعید ثاقب حسن ابدال کیڈٹ کالج میں پڑھتا رہا اور اس نے ایف ایس سی کے امتحان میں بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ بعد میں اس نے نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی اور اب مدتِ دراز سے امریکہ میں ہے۔ چھوٹا بیٹا احسن اعجاز بھی امریکہ میں ہے۔ بیٹی جو والدہ کی وفات کے وقت میٹرک کا امتحان دے رہی تھی اب ماشاءاللہ ڈاکٹر بن چکی ہے اور گائناکالوجی کے شعبے میں تخصیص حاصل کرنے کے بعد پیا گھر سدھار چکی ہے۔

یوسف مبشر کو اپنی اہلیہ کے چلے جانے کا غم ہے اور انہوں نے وسائل کے باوجود عقدِ ثانی سے گریز کیا ہے۔ ان کا کاروبار دن بہ دن وسعت پذیر ہے اور ان کے بعض اہم ممالک کے سفارتخانوں کے ساتھ کاروباری بنیادوں پر گہرے تعلقات ہیں۔

چھٹی جماعت میں ہمارے ساتھ ایک لڑکا داخل ہوا جس کا تعلق موضع چھنّی سے تھا۔ اُس کا نام تو محمد اسلم قریشی تھا لیکن لڑکوں نے موضع چھنّی کے ساتھ اس کی نسبت کی وجہ سے اسے اسلم چھنّی کہنا شروع کر دیا۔ اُن دنوں سر پر تیل لگانے کا رواج عام تھا لیکن دیہات میں اس کی جگہ دیسی گھی استعمال ہوتا تھا۔ دیسی گھی کی ایک خاص مہک ہوتی ہے چنانچہ اسلم کلاس میں آتا تو سب لڑکوں کو پتا چلا جاتا اور اگر کبھی وہ غیر حاضر ہوتا تو بھی ہر ایک کو پتا ہوتا۔

اسلم چھنّی کے والد قریشی اللہ بخش نے ربوہ کے قیام سے بہت پہلے شیخ نعمت اللہ برِج انسپکٹر کے ذریعہ احمدیت قبول کی تھی۔ ان کی چھوٹی موٹی زمینداری بھی تھی اس لیے دیہاتی علاقے سے تعلق کے باوجود اسلم چھنّی کا مالی پس منظر اتنا کمزور نہ تھا تاہم بی اے کرتے ہی انہوں نے واپڈا میں بطور سینئر کلرک ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۹۲ء میں وہاں سے ریٹائر ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا کاروبار کریں گے مگر انہیں خسارے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس بات پر بھی عرصہ گذر گیا ہے اور اب وہ ربوہ کے محلہ بشیر آباد میں خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں۔ ان کے بچے پڑھ لکھ کر صاحبِ روزگار ہو چکے ہیں اور بچیاں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ تھوڑی بہت

زمین ہے اور گذارا ٹھیک ہوتا ہے۔ ''مجھے اور کیا چاہیے؟'' اس سوال کا جواب انہیں کیا دیا جا سکتا ہے۔

ان کے ایک بھائی قریشی صفدر صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں کام کرتے تھے۔ وہ سر پر مہندی لگاتے تھے۔ بائیسکل پر ادھر ادھر آتے جاتے ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو لمحے بھر کے لیے ضرور رُکتے اور حال احوال پوچھے بغیر آگے نہ جاتے۔ اسلم سے بات ہو رہی تھی ''یار! اب وہ کبھی نظر نہیں آئے؟'' اسلم کے جواب نے مجھے لمحہ بھر کے لیے افسردہ کر دیا۔ یقیناً ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

محکمہ انہار، بہاولپور کے ایڈمنسٹریٹو آفیسر عزیز محمد خان کے بیٹے رفیق محمد خان اور ان کے چھوٹے بھائی لئیق محمد خان یوں تو انٹرمیڈیٹ کے صرف دو سال میرے ہمراہ رہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں انہیں ہمیشہ سے جانتا ہوں۔ بہت مخلص، دیندار اور سادہ مزاج رفیق محمد خان آج کل انڈس ویلی کنسٹرکشن کمپنی میں کام کرتے ہیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے۔ اس بات پر حیران مت ہوئیے کہ انہوں نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد سکھر جا کر پھر آئی کام میں داخلہ لے لیا اور اس کے بعد ہیلے کالج میں چار سال گذار کر بی کام کیا۔ یوں ان کے دو سال تو ضائع ہو گئے لیکن وہ اکاؤنٹس میں طاق ہو گئے اور ساری عمر اس ہُنر کی کمائی کھاتے رہے۔ شیزان انٹرنیشنل لمیٹڈ سے اپنے کیرئیر کا آغاز کرنے والے رفیق بعد میں میکاس ایسوسی ایٹس میں چلے گئے۔ پھر ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو صدام حسین کے عراق کی خوش حالی میں سے اپنا حصہ وصول کرنے دھڑا دھڑ وہاں پہنچ رہے تھے رفیق بھی ۱۹۸۲ء میں بغداد چلے گئے۔ چار سال وہاں رہے اور واپسی پر انڈس ویلی کنسٹرکشن کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ ان کا دل میجر شاہد عطاء اللہ کے ساتھ ایسا لگا کہ وہ آج بھی وہیں ہیں۔

شیخ محمود الحسن آئی سی ایس جو مدتوں حکومتِ پاکستان کے اہم عہدوں پر سرفراز رہے ان کے سگے ماموں تھے مگر رفیق یا لئیق نے ان کے ذریعے کبھی کوئی منفعت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس بات کا سارا کریڈٹ ان دونوں بھائیوں کو جاتا ہے۔

وہ انتہائی مخلص احمدیوں میں سے ہیں اور جماعتی خدمت پوری زندگی ان کی سب سے اہم ترجیح رہی ہے۔ آج کل وہ جماعت احمدیہ لاہور کے آڈیٹر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ انہیں جماعت کے دائمی مرکز، قادیان سے عشق ہے۔ میں قادیان کے جلسہ سالانہ ۱۹۹۱ء پر گیا تو رفیق مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ وہ اس کے بعد بھی متعدّد بار وہاں سے ہو آئے ہیں لیکن ان کا دل اگلی بار پھر قادیان جانے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔

چک منگلا کے عزیز الرحمٰن منگلا کے ذریعہ احمدیت قبول کرنے والے گھرانوں میں سے دو کے چشم و چراغ میرے کلاس فیلو رہے۔ عبدالعزیز منگلا اور محمد اسلم منگلا۔ وہ دونوں ایک برادری سے تو منسلک تھے ہی، بعد میں ان کی شادیاں بھی ایک ہی گھرانے میں ہوئیں تاہم دونوں کے مزاج اپنے اپنے تھے۔

عبدالعزیز منگلا نے بی اے کے بعد لائبریری سائنس میں ڈپلومہ حاصل کر کے پوری زندگی پنجاب یونیورسٹی کے پبلک ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں لائبریرین کے طور پر گذار دی۔ اس عرصہ میں انہوں نے نہ صرف

لائبریری سائنس بلکہ معاشیات اور پبلک ایڈمنسٹریشن میں بھی ایم اے کرلیا۔ کسر رہ گئی تو صرف پی ایچ ڈی کی لیکن میری ذاتی رائے میں وہ کئی ڈاکٹریٹ ہولڈرز سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ وہ شعر و ادب کے دلدادہ ہیں۔ خود بھی شعر کہتے ہیں اور ان کی گفتگو اساتذہ کے خوبصورت اشعار سے مرصع ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ان سے ایک جگہ ملاقات ہوئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ بیمار رہے تھے۔ میں نے حال پوچھا تو انہوں نے برجستہ عدم کا یہ خوبصورت شعر سنا کر کئی اور سوالوں کا راستہ ہی بند کردیا:

او میرا حال پوچھنے والے!
میری صورت سے کیا نہیں ہے عیاں؟

ان کے اپنے اشعار بھی پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں:

وہ ۲۰۰۵ء کے جلسہ سالانہ پر قادیان گئے تو اپنے تاثرات یوں بیان کیے:

جوق در جوق لوگ آئے تھے
خاک پر پڑ گئے نشاں ، دیکھا
کتنے رنگوں کا ، کتنی نسلوں کا
بن گیا تھا یہ کارواں ، دیکھا
ایسی دیکھی فضائے روحانی
جیسے نورِ خدا عیاں دیکھا

ان کی نظم ''شکوہ'' علامہ اقبال کے ''شکوہ'' کی طرح مشہور تو نہ ہو پائی لیکن ہے خوب:

کیا جاری رہے گی یوں ہی بے مہریٔ ایام
کیا اپنا مقدر ہے ستم کیشی و دُشنام
کیا ہم پہ مسلط ہی رہیں گے یہ اندھیرے
کیا ہم نہیں دیکھیں گے وہ پُر نُور سویرے
کب تک یوں ستم اہلِ وفا کرتے رہیں گے؟
کب تک یوں ہی مردانِ صفا مرتے رہیں گے؟

اس کے باوجود وہ رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ یوں ہی تو نہیں کہتے وہ:

شکست ان کا مقدر ہے اور ہم ہر روز
کرشمے اپنے خدا کے فضل کے دیکھتے ہیں

وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ وہ مقالہ نویسی کے متعدد جماعتی مقابلوں میں حصہ لیتے اور انعام پاتے رہے ہیں۔

اسلم منگلا نے جو آج کل حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے ربوہ میں پرائیویٹ سیکرٹری ہیں عربی میں

ایم اے کیا اور ان ہی دنوں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں لیکچرر لگ گئے۔ چودہ سال پڑھانے کے بعد انہیں زندگی وقف کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ توجہ کیا ہوئی زندگی وقف کر ڈالی۔ یہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کا دور تھا۔ انہوں نے موصوف کو اپنا اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کر دیا لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے ساتھ وہ پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ ان سے بات ہو تو وہ فخر سے بتاتے ہیں: ''میں کالج میں باسکٹ بال کا انچارج تھا اور سٹاف سیکرٹری بھی۔ میں خدام الاحمدیہ مرکزیہ میں ایڈیٹر خالد، مہتمم مقامی اور مہتمم تربیت رہا اور انصار اللہ میں تو کوئی قیادت ہی ہوگی میں نے جس میں کام نہ کیا ہو۔''

مجھے ان کے متعلق مدتوں بدگمانی رہی کہ وہ مجھ ایسے گنہ گاروں سے زیادہ راہ و رسم پسند نہیں کرتے لیکن حال ہی میں انہوں نے میری یہ غلط فہمی دور کر دی۔ میں نے بھی سوچا ''ڈلیاں بیراں دا کجھ نہیں گیا'' اور اپنے اندر ان سے بات کرنے کی ہمت پیدا کر لی۔ میں نے اپنی کتاب ''ارمغانِ ملتان'' حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کو بھجوانے کے لیے درخواست کی تو انہوں نے بسروچشم یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ کچھ ہی روز بعد مجھے حضور کا خط ملا تو تصدیق ہوگئی کہ اسلم منگلا نے مجھے طفل تسلی نہ دی تھی۔ آپ پڑھنا چاہیں گے حضور انور کا یہ خط محررہ ۴ ستمبر ۲۰۱۱ء:

مکرمی محمد داؤد طاہر صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط محررہ ۲۴ مئی مع کتاب ''ارمغانِ ملتان'' موصول ہوا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و فضل میں برکت دے اور اپنے فضلوں سے نوازے۔ آمین

آپ نے اپنے خاندان کے حوالے سے کتاب لکھنے کا جو ارادہ کیا ہے اس کو ضرور پورا کریں۔ آپ کے خاندان میں بہت سے سلسلہ کے خدمت گار ہیں۔ ان کا جماعتی تعارف ضروری ہے۔

اللہ آپ کے جملہ مسائل بھی حل فرمائے۔

والسّلام

خاکسار

مرزا مسرور احمد

خلیفۃ المسیح الخامس

آٹھویں جماعت میں ہماری کلاس میں ایک نیا طالب علم داخل ہوا۔ اس کا نام حبیب اللہ اور تخلص صادق تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے والد سراج الدین قادیان کی بیت اقصیٰ میں مؤذن تھے اور اسی وجہ سے عوام الناس میں ''بابا بانگیا'' کے نام سے معروف ہیں۔

حبیب جو ساتویں جماعت تک قادیان میں پڑھے تھے جلد ہی میرے دوست بن گئے اور یہ دوستی اتنی مستحکم ہوگئی کہ جب وہ میٹرک کرنے کے بعد ربوہ سے چلے گئے تو برسوں ان کے ساتھ میری خط و کتابت رہی۔ وہ مشہور مربی سلسلہ، عطاء اللہ کلیم کے چھوٹے بھائی ہیں اور انہوں نے میٹرک کے بعد کی تمام تعلیم اپنے ایک اور

بھائی، ناصر کے پاس رہ کر مکمل کی تھی جو صوبہ سرحد کے محکمہ تعلیم میں بطور لیکچرر ملازم تھے۔ حبیب نے پشاور یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا اور پھر کراچی میں پی سی ایس آئی آر میں ریسرچ فیلو کے طور پر ملازم ہو گئے۔ کئی سال پہلے ان کے ساتھ میرا رابطہ اچانک منقطع ہو گیا۔ کسی نے ذکر کیا کہ انہیں امریکہ میں دیکھا گیا ہے لیکن مجھے کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میری اپنے ایک مرحوم دوست کی بیوہ مقیم امریکہ کے ساتھ بات ہوئی تو وہ بھی ان کی واقف نکل آئیں۔ ان سے مجھے حبیب کا نمبر ملا۔

میری ان کے ساتھ بیس بائیس سال کے بعد بات ہو رہی تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ہمارے تعلقات میں ایک دن کا بھی رخنہ نہیں پڑا۔ باتیں کرتے وقت میں چشمِ تصور سے فیکٹری ایریا ربوہ کے چار دیواری کے بغیر ایک کمرے پر مشتمل اس سادہ سے مکان میں پہنچ گیا جہاں حبیب کے ضعیف العمر والد المعروف ''بابا بانگیا'' صحن میں چارپائی پر آنکھیں موندے آرام کر رہے ہوتے تھے۔ مجھے وہ شام بھی یاد آ گئی جب حبیب نے چناب ایکسپریس کے ذریعہ ربوہ سے پشاور کے لیے روانہ ہونا تھا جہاں انہیں کالج میں داخلہ لینا تھا۔ مجھے ان کی شادی کا دن بھی یاد آ گیا۔ ان کا سسرال محلہ دارالعلوم غربی میں تھا اور بارات فیکٹری ایریا سے تانگوں پر گئی تھی۔

حبیب جب سے امریکہ گئے ہیں صرف ایک بار پاکستان آئے ہیں اور وہ بھی عطاء اللہ کلیم کی وفات پر۔ ''میں یہاں آ کر کروں بھی کیا؟ پاکستان میں کوئی اٹریکشن باقی نہیں رہی۔ بھائی کوثر مدتوں پہلے فوت ہو گئے تھے۔ اب عطاء اللہ کلیم بھی فوت ہو چکے ہیں، ناصر بھی وفات پا گئے اور بھائی سمیع بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں وہاں جاؤں تو کس کے پاس؟''

پاکستان میں ان کا سارا تجربہ آلودگی پر کنٹرول کے حوالے سے تھا۔ انہوں نے مانچسٹر یونیورسٹی سے ایم فِل بھی اسی موضوع پر کی تھی چنانچہ یہ تجربہ اُن کے کام آ گیا اور وہ آج کل میری لینڈ ڈپارٹمنٹ آف انوائرنمنٹ میں اینوائرنمنٹل سپیشلسٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

حبیب شعر کہتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ان کا پہلا شعری مجموعہ ''میزانِ شناسائی'' کے نام سے چھپا ہے اور دوسرا چھپنے کو تیار ہے۔ یہی نہیں انہوں نے ''سرگزشتِ کلیم'' کے نام سے اپنے بھائی عطاء اللہ کلیم کی سوانح عمری بھی مرتب کی ہے اور یہ دونوں کتابیں قادیان سے شائع کرائی ہیں۔

ان کے یہ اشعار ٹیگور کی نظم "Happy Independent Day" سے ماخوذ ہیں:

منائیں کیسے محبت سے یومِ آزادی
خوشحال ہوگا وطن تو ہے جشنِ آزادی
وطن وہ ہے جہاں انسانیت کی ہوں قدریں
وقار و عزت و حُرمت سے سب اُٹھیں نظریں
نہ فکر و سوچ کی پرواز پر لگے قدغن
اناؤں، مکروں، ریاکاریوں کا ہو مدفن

حصولِ علم و ہنر تک جہاں رسائی ہو
زمانے بھر کی بلاؤں سے بھی رہائی ہو
تعصبات، گروہ بندیوں سے ہو آزاد
نہ نفرتوں کی عفونت کی ہو کوئی اُفتاد
نہ راہزن ہی نہ خوف و خطر ستاتے ہوں
محبتیں ہوں نچھاور، سکون پاتے ہوں
دلوں سے پھوٹتی سچائیوں کی ہو تعظیم
حصولِ مقصدِ انسانیت کی ہو تکریم
میں ایسی صبحِ وطن کو سلام کہتا ہوں
ہو مثلِ جنتِ ارضی مُدام کہتا ہوں

میں چھٹی جماعت میں تھا جب ایک نیا طالب علم ہماری کلاس میں داخل ہوا۔ چھوٹے سے اس معصوم بچے کا نام الطاف تھا۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ اس کے والد محکمہ تعلیم سے طویل وابستگی کے بعد ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے طور پر ریٹائر ہو کر ربوہ رہنے کے لیے آئے ہیں اور صدر انجمن احمدیہ میں ان کی تقرری بطور نائب ناظر تعلیم ہوئی ہے۔ یہ بچہ خاصا محنتی، سلجھا ہوا اور حاضر جواب تھا۔ نویں جماعت میں تھے کہ الطاف یکا یک سکول سے غائب ہو گیا۔ ہمیں تشویش سی ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہوا باز بننے کی خواہش دل میں لیے پی اے ایف پبلک سکول لوئر ٹوپہ چلا گیا ہے۔ سنتے تھے کہ لوئر ٹوپہ میں تکمیل تعلیم کے بعد اسے ایئر فورس میں جی ڈی پائلٹ کے طور پر لے لیا جائے گا۔ بات آئی گئی ہو گئی اور ہم اسے آہستہ آہستہ تقریباً بھول چلے تھے کہ ایک روز وہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں نظر آ گیا۔ اس وقت ہم ایف اے کر چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی وجہ سے ایئر فورس نہیں جا سکا لہٰذا اس نے اپنے کیریئر کا نئے سرے سے آغاز کیا ہے۔ اس کے دو سال تو ضائع ہو گئے اور یقیناً کچھ حسرتیں بھی ناتمام رہ گئیں لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ فضل عمر ہسپتال کے لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر الطاف الرحمٰن جو مریضوں میں ایک ماہر فزیشن کے طور پر پہچانے جاتے یہی الطاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پیشہ میں نیک نامی کے علاوہ خدمتِ سلسلہ کی بھی توفیق عطا فرمائی ہے چنانچہ وہ لمبا عرصہ امیر جماعت احمدیہ جہلم رہے اور اب بطور واقفِ زندگی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ مرنجاں مرنج سے الطاف الرحمٰن سے بے تکلفانہ گفتگو کا اپنا ہی مزا ہے اور اس وقت قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ آپ ایک ایسے شخص سے مخاطب ہیں جو اعلیٰ دنیاوی رتبوں پر فائز رہنے کے علاوہ جماعتی خدمات میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

میں تیسری جماعت میں تھا جب زکریا ہماری کلاس میں داخل ہوئے۔ وہ پروفیسر محمد ابراہیم ناصر کا بیٹا ہونے کے ناطے میرے چچا زاد تو ضرور تھے لیکن ان کی ابتدائی پرورش کوئٹہ میں ان کے ننھیال میں ہوئی تھی اور اب وہ ربوہ شفٹ ہوئے تھے لہٰذا میری اس وقت تک ان سے دوستی یا بے تکلفی نہ تھی۔ ان کا پورا نام محمد زکریا داؤد تھا

لیکن گھر میں انہیں ''زکی'' کہا جاتا تھا لہٰذا وہ کلاس میں بھی اسی عرفیت سے پہچانے جانے لگے۔

زکریا نے بچپن ہی سے کرکٹ میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ دارالصدر غربی (جہاں ان کی رہائش تھی) کے جو دیگر لڑکے ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے تھے ان میں ہمارے اپنے ہم جماعت، رفیق قمر اور ڈاکٹر خیر الدین بٹ کے صاحبزادے، حنیف شامل تھے۔ جامعہ نصرت کی پرنسپل مسز شاہ کے بھتیجے، مبشر المعروف بچھی جو سکول میں ہم سے ایک سال سینئر تھے (اور اب امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں) بھی یہیں کھیلا کرتے تھے اور ان سب کی آپس میں گہری دوستی تھی۔

جب ہم نویں جماعت میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ زکریا نے پی اے ایف پبلک سکول، لوئر ٹوپہ میں داخلے کے لیے درخواست دے رکھی تھی جو منظور ہو چکی ہے اور وہ عنقریب وہاں چلے جائیں گے۔ پتا چلا کہ اگر تمام معاملات ٹھیک چلتے رہے تو زکریا کو بالآخر پاکستان ائیر فورس میں جی ڈی پائلٹ کے طور پر کمیشن مل جائے گا اور یوں ایک برائٹ کیریئر ان کا منتظر ہو گا۔ اگرچہ زکریا کے ربوہ سے چلے جانے سے کم از کم میں ایک اچھے دوست سے محروم ہو رہا تھا لیکن مجھے خوشی تھی کہ میں بہت جلد انہیں کھلی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوا دیکھوں گا۔ وہ جنرل ڈیوٹی پائلٹ کے طور پر منتخب ہو بھی گئے لیکن جلد ہی ائیر فورس حکام کو اندازہ ہو گیا کہ ان میں flying aptitude کی کمی ہے چنانچہ انہیں موقع دیا گیا کہ وہ چاہیں تو گراؤنڈ کیے جانے کا فیصلہ قبول کر لیں یا ائیر فورس کو خیر باد کہہ کر اپنی مرضی کا کوئی اور کیریئر منتخب کر لیں۔ انہوں نے پہلے آپشن کو اپنے لیے بہتر سمجھا اور ریڈار کے شعبہ میں اپنی ملازمت مکمل کرنے کے بعد بطور ونگ کمانڈر ریٹائر ہو گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنا کاروبار شروع کیا جو چل نہ سکا۔ اسی دوران ان کی بیگم، شمع کا انتقال ہو گیا لیکن جلد ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ ان کی اہلیہ ثانی، صالحہ صدیقہ لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی میں فارمیسی کے شعبہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ملائیشیا گئی ہوئی تھیں۔ زکریا ان کے ساتھ تھے لیکن اب وہ مستقل طور پر کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔

پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ جب میں تیسری جماعت میں تھا پھوپھی نے تربیتی اغراض کے تحت اپنے بیٹے مسعود کو پڑھنے کے لیے لاہور سے ربوہ بھجوا دیا۔ مسعود جو سکول میں مجھ سے ایک سال سینئر تھے چچا ابراہیم کے گھر رہنے لگے۔ وہ یہاں پر تیسری یا چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور انہوں نے ربوہ میں رہ کر ۱۹۶۰ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کر لیا۔ وہ شام کے وقت میری طرف آ جاتے یا میں ان کی طرف جا نکلتا۔ یوں مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے یاد ہے وہ گڑ بہت شوق سے کھاتے تھے۔ شاید انہیں میٹھا بہت پسند تھا اور اُن حالات میں سب سے زیادہ آسانی سے میسر آنے والا میٹھا گڑ ہی ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس ایک دو پیسے بھی ہوتے وہ بازار سے گُڑ کی ایک یا دو چھوٹی چھوٹی ڈلیاں لے لیتے، خود بھی کھاتے اور مجھے بھی کھلاتے۔

میٹرک کے بعد مسعود اپنے والدین کے پاس لاہور منتقل ہو گئے اور انہوں نے اسلامیہ کالج سول لائنز سے بی اے کر لیا۔ پھر انہوں نے شارٹ ہینڈ اور ٹائپ سیکھنا شروع کر دی۔ جب میں بی اے پاس کرنے کے بعد لاہور میں یونیورسٹی میں داخلے کی کوشش میں تھا تو میرا قیام ان ہی کے گھر پر ہوتا۔ مسعود ان دنوں شارٹ ہینڈ

کی پریکٹس کر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پٹ مین کی شارٹ ہینڈ کی کتاب میرے ہاتھ میں پکڑا دیتے اور ڈکٹیشن لینے بیٹھ جاتے۔ انہوں نے اس کام میں کافی مہارت پیدا کر لی۔ پھر وہ شیزان انٹرنیشنل کے اُس وقت کے جنرل منیجر، ریٹائرڈ ونگ کمانڈر سیّد محمد احمد کے پرسنل سٹاف میں شامل ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد ان کی شادی ہو گئی۔ وہ کرشن نگر میں رہا کرتے تھے۔ ایک بار میں ان کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ سکوٹر خرید لیا ہے۔ یہ سکوٹر چیکوسلواکیا کا بنا ہوا تھا اور اپنی طرز کا منفرد سکوٹر تھا جو انہوں نے صرف پانچ سو روپے میں خریدا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں بہت کم لوگوں کے پاس اس طرح کا سکوٹر ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ سکوٹر بہت فخر کے ساتھ دکھایا۔ مجھے یاد ہے وہ یہ سکوٹر پا کر اتنا خوش تھے گویا انہیں دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو اور ایسا ہوتا بھی کیوں نہ، اس سے پہلے وہ اس عیاشی کا صرف تصور ہی کر سکتے تھے۔ وہ اس سکوٹر پر اپنی دلہن کو بٹھا کر سیر کے لیے باہر لے جاتے تو وہ بھی خوشی سے پھولے نہ سماتی۔

غالباً ۱۹۷۲ء میں جب میں راولپنڈی میں مقیم تھا ایک شام مسعود اپنے ایک دوست، امجد کے ہمراہ اچانک میرے پاس آ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ بائی روڈ لیبیا جا رہے ہیں اور وہ وہاں پہنچ بھی گئے۔ انہوں نے لیبیئن عرب فارن بینک میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ کئی سال وہاں رہے۔ اسی زمانے میں لیبیئن عرب فارن بینک کے چیئر مین نے بحرین میں عرب ممالک کے سب سے بڑے بینک یعنی عرب بینکنگ کارپوریشن کی بنیاد رکھی تو مسعود کے تجربہ اور اس شعبہ میں اُن کی مہارت کے مدّ نظر انہیں بحرین ٹرانسفر کر دیا گیا۔ وہاں لمبا عرصہ ملازمت کے بعد وہ بطور وائس پریذیڈنٹ ریٹائر ہوئے۔ اب کچھ مدت سے بمع اہل و عیال کینیڈا شفٹ ہو چکے ہیں لیکن عرب بینکنگ کارپوریشن والے اب بھی گاہے بگاہے اُن کی خدمات سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

نصیر احمد شاہ جنہیں ہم سب اچھی کہتے تھے بی اے تک ہمارے ساتھ رہے جس کے بعد انہوں نے کسی بنک میں ملازمت اختیار کر لی۔ ربوہ یا اس کے نواح میں اپنی پوسٹنگ کے زمانے میں کبھی کبھار نظر آ جایا کرتے تھے لیکن پھر تو ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ مدتوں بعد معلوم ہوا کہ وہ امریکہ سیٹل ہو چکے ہیں لیکن کہاں، میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔

محمد اسحٰق ساقی ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر، میاں محمد ابراہیم کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ ہم بی اے تک اکٹھے رہے جس کے بعد انہیں فوری طور پر حبیب بنک میں ملازمت مل گئی۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں جس سفر کا آغاز کیا تھا ۲۰۰۵ء میں ان کی ریٹائرمنٹ پر اختتام پذیر ہوا۔ جب وہ ریٹائر ہوئے تو اسی بنک میں سینئر وائس پریذیڈنٹ تھے۔ آج کل لاہور کے علاقہ ڈیفنس میں رہائش پذیر ہیں۔

رفیق احمد قمر جو چوہدری غلام مرتضیٰ، وکیل القانون تحریک جدید انجمن احمدیہ کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیں بی اے تک میرے کلاس فیلو رہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے چوہدری غلام مرتضیٰ کے والد بزرگوار، امی کے دادا کے ذریعہ احمدی ہوئے تھے اور ان سے گہرے مراسم رکھتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان قائم ہونے والا یہ تعلقِ اخوت ان کی نسلوں میں بھی قائم رہا اور یہی وجہ تھی کہ امی کا چوہدری غلام مرتضیٰ اور ان کی اہلیہ، ہاجرہ بیگم

ے ساری زندگی کافی میں جول رہا۔ بعد کراچی چلے گئے اور انہوں نے
وہ شروع ہی سے بہت محنتی اور لائق تھے۔ بی اے کرنے کے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تاہم
ٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن سے ایم بی اے کرلیا چنانچہ امریکن لائف انشورنس کمپنی نے اختیار کر لی۔ جوائنٹ ڈائریکٹر
کی وجہ سے وہاں ان کا دل نہ لگا اور انہوں نے سٹیٹ بنک آف پاکستان میں شمولیت نوازا اور اب وہ کراچی میں
تھے کہ ملازمت ترک کر کے ٹیکسٹائل کا کام شروع کر دیا۔ اللہ نے انہیں کامیابی سے
ایک خوش حال زندگی گذار رہے ہیں۔

محمد احمد گردیزی جنہیں ہم اپنے زمانۂ تعلیم میں محمد احمد شاہ کے نام سے پہچانتے تھے سید محمد محسن نامی ایک بزرگ جو دفتر وقفِ جدید انجمن احمدیہ میں کام کرتے تھے کے صاحبزادے ہیں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ وہ سکول کی کس کلاس میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ وہ حبیب اللہ صادق اور عبدالسمیع پرویز سمیت ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ ایف اے تک ہمارا ساتھ رہا بلکہ اختیاری مضامین میں سے کم از کم ایک یعنی منطق ہمارا مشترکہ مضمون تھا اور ہم چودھری محمد علی اور مرزا انس احمد کے شاگرد رہے۔ مجھے علم نہیں کہ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیسے کیا لیکن ملیریا اِریڈیکیشن ڈپارٹمنٹ میں اُن کی ملازمت کا دور اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ نہ جانے کس وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جرمنی چلے گئے اور فرینکفرٹ میں مقیم ہیں۔
موصوف کبھی پاکستان آئیں تو مجھے ضرور یاد کرتے ہیں اور مجھے جرمنی میں کم از کم ایک بار ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود پورا ایک دن میرے ساتھ گذارا اور از راہِ محبت مجھے بادنوہائم لے گئے جو اپنے صحت بخش قدرتی چشموں کے لیے معروف ہے لیکن افسوس ہم وہاں اس وقت پہنچے جب چشموں میں داخلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ بہر حال ہم نے کچھ کھایا پیا اور اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد واپس آ گئے۔

انہیں اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے حادثات سے سابقہ پڑا ہوگا لیکن چند سال پہلے ان کی ایک جواں سال بیٹی، شہلا جو سکول ٹیچر تھیں کی وفات ان کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا تاہم وہ خدا کی رضا پر راضی ہیں اور جماعت کی خدمت میں ہمہ تن مصروف۔

آپ نے میرے ان ساتھیوں میں سے بعض کا ذکرِ خیر ملاحظہ فرمایا جن کے ساتھ میرے بچپن اور اوائل جوانی کا کچھ زمانہ گذرا تھا۔ اس دور کی خوشگوار یادیں میرے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہیں گی۔ خدا ان سب دوستوں کو عمرِ خضر عطا فرمائے اور ان کا حامی و ناصر ہو۔

اب میں دو ایسے احمدی احباب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کے نام کا ڈنکا دنیائے علم و ادب میں کئی سال تک بجتا رہا۔ انہوں نے صحافت، شعر گوئی، ناول نویسی، سفر نگاری اور معاشی ادب میں کام کر کے شہرتِ جاوداں پائی۔ میری مراد قمر اجنالوی اور شبلی بی کام سے ہے۔ یہ دونوں بزرگان ربوہ میں دفن ہیں اور ان کی قبروں پر لگے ہوئے کتبوں سے ان کی عظمت کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔
ان میں سے پہلے کچھ باتیں قمر اجنالوی کی۔

دنیائے علم وادب وصحافت کے شہسوار

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ابا جی ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اور ان کے پاس کتبِ سلسلہ کے علاوہ تاریخِ اسلام، ہندومت، عیسائیت، اردو ادب، طبِ یونانی اور ہومیوپیتھی پر کتابوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کی میز اور تکیے پر ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب پڑی رہتی تھی۔ شاید اسی ماحول کا اثر تھا کہ مجھے بھی کتاب سے اُنس پیدا ہو گیا جو خدا کے فضل سے آج تک قائم ہے۔

ان کتب میں سے ایک قمر اجنالوی کی چھوٹی سی کتاب ''محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم'' بھی تھی۔ ابا جی نے عادتاً اس کے ماتھے پر دستخط کر رکھے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ کتاب غالباً زمانہ قادیان میں خریدی تھی۔ اس وقت تک میں جماعت کے معروف مصنفین کے ناموں سے واقف ہو چکا تھا لیکن قمر اجنالوی کا نام میرے لیے نیا تھا۔ تب ابا جی نے بتایا کہ وہ ایک مخلص احمدی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تاہم انہوں نے صحافت کا پیشہ اپنا لیا اور اسی ماحول میں رچ بس گئے لہٰذا جماعتی حلقوں میں ان کا نام زیادہ معروف نہیں ہو سکا۔

اسی پس منظر میں جب میں نے الفضل میں ان کی وفات اور ربوہ میں ان کی تدفین کی خبر پڑھی تو مجھے افسوس ہوا۔ اگرچہ میری مرحوم سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی اور میں نے ''محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے علاوہ ان کی کسی کتاب کا نام بھی نہیں سنا تھا لیکن ان کی وفات کی خبر سے مجھ پر ان کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر ہوئے چنانچہ میں نے اپنی اوّلیں فرصت میں ربوہ جا کر ان کی قبر پر حاضری دی اور ان کی بلندی درجات کے لیے دعا مانگی۔

وقت کے ساتھ ساتھ میرا یہ احساس شدید تر ہوتا گیا کہ میں اتنے بڑے صحافی، ادیب اور شاعر کی صحبت سے کیوں محروم رہا چنانچہ مجھے ان کے تفصیلی حالات سے دلچسپی پیدا ہوگئی لیکن یہ تشنگی دور ہونے کے اسباب پیدا ہوئے تو نظر نہ آتے تھے۔ چند سال پہلے کسی نے مجھے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اُن پر ایم فل کا ایک مقالہ موجود ہے چنانچہ میں اس شعبہ کے صدر، ڈاکٹر تحسین فراقی سے وقت طے کر کے لائبریری پہنچا اور پورا ایک دن وہاں گذار کر اس مقالے کی ورق گردانی کی۔ میں نے اس مقالہ میں سے ضروری نوٹس بھی اخذ کئے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ نوٹس گم ہو گئے۔ دوبارہ تلاش پر لائبریری سے یہ مقالہ مل نہیں پایا تاہم میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ اس مقالہ کو قمر اجنالوی کی سوانح عمری کا درجہ دینا کسی طور پر مناسب نہیں تاہم اس کے ذریعہ قمر اجنالوی کی شخصیت کے کئی گوشے وا ہوتے ہیں۔

قمر اجنالوی حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت میاں دین محمد کے صاحبزادے اور میاں غلام محمد اختر

ناظرِ اعلیٰ ثانی صدر انجمن احمدیہ کے بھتیجے تھے۔شروع سے ادبی ذوق رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے قیامِ قادیان کے دوران شبلی بی کام، سلمان عرفانی اور نسیم سیفی کے ساتھ مل کر ''المبشر'' نامی ایک رسالہ جاری کیا۔احمدیہ پاکٹ بک مؤلفہ ملک خادم حسین میں شیعیت والا حصہ ان ہی کا تحریر فرمودہ ہے۔

موصوف پچپن سال تک زبان وادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ان کی زندگی کے آخری ایام جرمنی میں بسر ہوئے جہاں وہ روس کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد یورپ کی سیاسی صورتِ حال پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ابھی وہ یہ کام مکمل نہ کر پائے تھے کہ ۳۰ مئی ۱۹۹۳ء کو فرینکفرٹ میں ۷۲ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ان کی نمازِ جنازہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے پڑھائی جس کے بعد ان کا جسدِ خاکی تدفین کے لیے ربوہ لایا گیا اور وہ قطعہ شہدا میں دفن ہوئے۔

ان کی قبر پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

''برصغیر کے منفرد اور ممتاز شاعر،

صاحبِ طرز اور نامور ادیب، ناول نگار اور بلند پایہ صحافی

جناب عبدالستار المعروف قمر اجنالوی

ابن میاں دین محمد صاحب مرحوم

ولادت جولائی ۱۹۱۹ء بمقام اجنالہ: وفات ۳۰ مئی ۱۹۹۳ء جرمنی

مرحوم نے صاحبِ اسلوب قلمکار کے طور پر نصف صدی سے زائد عرصہ علم وادب کی تخلیق میں گذارا، تیس سے زائد ضخیم اور معرکۃ الارا ناول تخلیق کیے اور تاریخی ناول نگاری میں ممتاز مقام پایا۔شہرۂ آفاق کتب میں ''چاہِ بابل'' ''مقدس مُورتی'' ''پرتھال'' ''دھرتی کا سفر'' ''سلطان'' ''جنگِ مقدس'' اور ''ولی عہد'' شامل ہیں۔متعدد کتب پر ایوارڈ ملے۔روزنامہ مسلم، روزنامہ ملت، روزنامہ مغربی پاکستان اور ہفت روزہ صدائے وطن کے ایڈیٹر رہے۔نوائے وقت سے بھی ایک لمبے عرصہ تک منسلک رہے۔۱۹۸۰ء میں ان کے نعتیہ قصیدے ''بنامِ خیرَ الانام'' نے شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔

بقول قتیل شفائی:

ہے لائقِ جزا قمر اجنالوی قتیل
اِس شخص نے کہا ہے قصیدہ رسول کا

جولائی ۱۹۹۰ء میں جرمنی چلے گئے اور حلقہ اربابِ ذوق کی بنیاد رکھی۔وہیں وفات پائی۔حضرت امام جماعت احمدیہ الرابع نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔متعدد جماعتی خدمات کا موقع ملا۔۶ جون ۱۹۹۳ء کو ربوہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ان کی وفات پر حکومت پاکستان کے اکابر مقتدر سیاسی شخصیات کے علاوہ معروف ادبی حلقوں نے اظہارِ تعزیت کیا اور وفات کو عظیم نقصان قرار دیا۔

افسانہ اُن کے ظلم و ستم کا رقم کیا
باطل کے سامنے نہ کبھی سر کو خم کیا

جس پہ ہمیں ضمیر نے آواز دی قمر
ہم نے وہی حوالۂ لوح و قلم کیا''

قمراجنالوی اقلیم شعروادب کے بے تاج بادشاہ تھے۔ان کی وفات پر ملک کے سکّہ بند ادیبوں نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا لیکن یہاں مسعود دہلوی کے اس مضمون کے کچھ اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں جو انہوں نے ''قمراجنالوی کا ادبی مرتبہ و مقام'' کے عنوان سے ماہنامہ خالد (دسمبر ۱۹۹۹ء) میں لکھا تھا۔ فاضل مضمون نگار کے الفاظ میں ''قمراجنالوی اردو کے نثری اور شعری ادب سے متعلق جملہ علوم وفنون میں پوری دسترس رکھنے والے ایک بہت بڑے نثرنگار اور غزل گو شاعرِ باکمال تھے۔وہ اپنی بیش بہا نثری و شعری تخلیقات کے ذریعہ مضامینِ نو کے انبار لگا کر اردو ادب کو نکھارنے اور اپنی جدّت طرازیوں سے اس میں گرانقدر اضافے کرنے کا موجب بنے۔

وہ ایک بہت کثیر المطالعہ ادیب تھے۔انہوں نے لائبریریوں کی بے شمار کتابوں کے گھونٹ نہیں لگائے تھے البتہ وہ ان کتابوں میں پوشیدہ علوم وفنون کو گھونٹ کر ضرور پی گئے تھے۔اسی لیے ان کی جملہ تخلیقات میں وہ افسانے ہوں یا ناول، مضامین ہوں یا اداریے اور سیاسی کالم، نظمیں ہوں یا غزلیں، قصائد ہوں یا نعتیں، قطعات ہوں یا رباعیات، ان میں ان کے مطالعہ کی گہرائی و گیرائی کی جھلک ضرور موجود ہوتی تھی۔ پھر بطور خاص جہاں تک نثری تخلیقات کے ضمن میں زبان و بیان پر قدرت اور اسلوبِ تحریر کی ندرت کا تعلق ہے یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انہیں جذبات واحساسات اور نئے نئے افکار وخیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے اور پھر ان الفاظ کو دلکش و دلآویز تحریر کے قالب میں ڈھالنے کا فن خوب آتا تھا اور قلم کے جوہر دکھانے کے ڈھنگ سے بھی خوب آگاہ تھے۔وہ بلاشبہ بہت جاذب و پُرکشش اسلوبِ تحریر کے مالک ہونے کے باعث صاحبِ طرز ادیب اور بلند پایہ انشا پرداز تھے۔

بالخصوص تاریخی ناول لکھنے میں تو قمراجنالوی نے ایک ایسا منفرد انداز اختیار کیا کہ جس نے انہیں تاریخی ناول لکھنے والے تمام متقدمین ومتاخرین سے ممیز وممتاز کر دکھایا۔سب سے نمایاں اور دوسروں سے یکسر سوا وجدا بات یہ ہے کہ انہوں نے از منہ قدیم کے بعض ایسے واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جو تاریخ کے گمنام گوشوں سے تعلق رکھتے تھے اور تشنہ تحقیق چلے آرہے تھے۔اس کے لیے انہیں واقعات کی چھان پھٹک میں کمال درجہ تحقیق وتدقیق کا حق ادا کرنا پڑا۔ پھر اصل حقائق دریافت کرنے کے بعد انہوں نے ان حقائق کو ایک نہایت ہی دلچسپ سچی کہانی کے پہلو بہ پہلو اس پُرکشش انداز میں تحریر کیا کہ کہانی کے آگے بڑھنے اور دلچسپی میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے نامعلوم تاریخی حقائق بھی نکھر کر سامنے آتے اور ذہن نشین ہوتے چلے گئے۔اس کی سب سے واضح اور نمایاں مثال ان کا مشہور ومعروف ضخیم ناول ''چاہِ بابل'' ہے۔ بڑے سائز کے آٹھ سو صفحات پر پھیلے ہوئے اس ناول نے ۱۹۸۵ء میں پہلی بار منصۂ شہود پر آکر ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا......

''چاہِ بابل'' نامی یہ ناول دجلہ وفرات کے دوآبہ عراق کے آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے کے قدیم زمانے کی ایک لذت آفرین اور عشق انگیز کہانی ہے جس کی جملہ تفصیلات معلوم کرنے کے لیے قمراجنالوی کو ایک

تحقیق و تدقیق کی گھاٹیوں میں سے گذرنا پڑا اور پھر اس مورخ نے سچے اور حقیقی مؤرخ کا روپ دھار کر پہلے تحقیق و تدقیق کی گھاٹیوں میں سے ... دریافت کردہ تاریخی حقائق کو اس قدر دلچسپ اور دلکش ایک کہانی نویس اور داستان گو کے روپ میں واپس آ کر دریافت کردہ تاریخی حقائق کو اس قدر دلچسپ اور دلنشیں انداز میں تحریر کیا کہ اس زمانہ کے شائقین علم و ادب کو پہلی بار زمانہ قدیم کی ایک ایسی سچی تاریخی کہانی پڑھنے کو ملی جوانہوں نے پہلے کبھی سنی پڑھی نہ تھی......اس ناول کے زیور طباعت سے آراستہ ہونے پر علمی و ادبی حلقوں میں جو تہلکہ مچا اس کا اندازہ جناب احمد ندیم قاسمی جیسے بلند پایہ ادیب کے اس تبصرہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اسے پڑھ کر سپردِ قلم کیا......

قمر اجنالوی بہت بلند پایہ نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت پختہ کار اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ نثر کی طرح انہیں شعری ادب میں بھی منفرد مقام حاصل تھا۔ وہ غزل، نظم اور جملہ شعری اصناف میں پوری دسترس رکھتے تھے۔......ان کے ہم عصر اہلِ ادب ان کی تعریف میں کیوں رطب اللسان نہ ہوتے جب کہ ان کا ہر شعر ہی ادبی حسن کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا تھا اور اس بنا پر ہر شعر ہی

وہ بات ، بات ہے جو تمہارے سخن میں ہے

کا مصداق ہوتا تھا۔

وہ یوں تو شروع ہی سے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھے لیکن جب انہوں نے اپنے آقا و مولیٰ حضرت اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک معرکۃ الاراطویل ''قصیدہ بنام خیر الانام'' کے نام سے لکھا جو اپنی طوالت کی وجہ سے ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں بہت اہتمام سے شائع ہوا اس قصیدہ نے ایک شاعرِ باکمال کی حیثیت سے انہیں شہرت کی اُن بلندیوں تک جا پہنچایا جہاں تک بہت کم اصحابِ فن کی رسائی ہوتی ہے۔ اس قصیدہ نے انہیں چوٹی کے اساتذۂ فن کی صفِ اول میں لا بٹھایا اور اس طرح وہ نعتِ رسول کے طفیل شہرتِ عام اور بقائے دوام کے سزاوار ٹھہرے۔ ان کے اس قصیدے کو ملک بھر کے ادبی حلقوں میں مولانا حالی کی مسدس اور علامہ اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ کے بعد اردو شاعری میں منفرد مقام کا حامل قرار دیا گیا......''

مجھے پرویز پروازی نے قمر اجنالوی کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں بتائی ہیں جو افادۂ احباب کے لیے ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ موصوف لکھتے ہیں: ''پچاس کی دہائی میں لاہور سے ایک روزنامہ ملت نکلا کرتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر شبلی بی کام تھے۔ قمر اجنالوی کسی قلمی نام سے اس میں فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے ''ذکر و فکر''۔ ایک کالم چھپا۔ اس کا موضوع تھا کیا ولدُ الزّنا جنت میں داخل ہو سکتا ہے؟ قمر صاحب نے پہلے تو کچھ ادھر ادھر کی دلیلیں لکھیں اور کالم کے اواخر میں جلی قلم سے لکھ دیا کہ اگر اس معاملہ میں مزید معلومات درکار ہوں تو مولانا لال حسین اختر سے رجوع کریں۔ اس فقرہ سے احراری حلقوں میں کھلبلی پڑ گئی کہ لال حسین اختر کے بارے میں ثابت تھا کہ وہ اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔ قبلہ مولانا عبدالمجید سالک اس کالم سے اتنے خوش ہوئے کہ آپ نے اپنے کالم کا عنوان ''افکار و حوادث'' قمر اجنالوی کو بخش دیا اور بعد کے سارے کالم اسی عنوان سے چھپتے رہے۔

دوسری بات۔ قمر اجنالوی جرمنی میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع سے ملے۔ جب اپنا نام بتایا تو

حضرت صاحب نے کہا: اچھا تو آپ وہی قمر اجنالوی ہیں جنہوں نے حضرت مصلح موعود۔۔۔ پر نظم سنائی تھی اور یہ
تو اس نظم کے اشعار سنا دیجئے۔ مجھے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

میرے محبوب! میں نذرِ جوانی لے کے آیا ہوں
جوانی کیا میں ساری زندگانی لے کے آیا ہوں
سنا ہے آگ اور پانی کبھی یک جا نہیں ہوتے
میں دل میں آگ اور آنکھوں میں پانی لے کے آیا ہوں

اخلاق احمد دہلوی نے اپنی کتاب ''اور پھر بیاں اپنا'' میں قمر اجنالوی کی ناول نویسی پر کئی صفحات کا مضمون شامل کیا ہے۔''

قمر اجنالوی کے علاوہ ایک اور اہم شخصیت جس کا ذکر یہاں مقصود ہے صحافتی اور ادبی حلقوں میں شبلی بی کام کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

شبلی بی کام حضرت مسیح موعود کے ممتاز رفیق اور مشہور احمدی صحافی حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کے چھوٹے صاحبزادے تھے جو ۲۵ جولائی ۱۹۱۴ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور کئی سال تک اپنوں اور غیروں سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے بعد ۵ فروری ۱۹۸۱ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

ان کی وفات پر روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' نے تفصیلی خبر شائع کی جس کے مطابق موصوف جو پاکستان ٹائمز کے کامرس ایڈیٹر تھے جمعرات کے روز چھیاسٹھ سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان دونوں خبروں کے مشمولات بہت حد تک ملتے جلتے ہیں لہٰذا یہاں پر صرف روزنامہ ''امروز'' (۶ فروری ۱۹۸۱ء) کی اس خبر پر اکتفا کیا جا رہا ہے:

''لاہور پانچ فروری: پاکستان کے ممتاز صحافی، صاحبِ طرز انشا پرداز اور بے لاگ نقاد جناب عبدالرحیم شبلی جمعرات کی صبح لاہور میں وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر تقریباً ۶۷ برس تھی .... شبلی صاحب گذشتہ ماہ سے علیل تھے۔ ڈاکٹروں نے کمی خون کا مرض تشخیص کیا تھا۔ ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد وہ چند روز قبل صحافی کالونی، علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع اپنے مکان میں واپس آ گئے لیکن ان کی بتدریج گرتی ہوئی صحت کو سنبھالا نہ ملا۔ آج ان کی حالت زیادہ خراب ہوگئی اور نو بجے کے قریب وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ شبلی صاحب نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ ان کے بعض قریبی عزیزوں نے ہی ان کی دیکھ بھال کی اور کفن دفن کا انتظام کیا۔

عبدالرحیم شبلی جو ادب وصحافت میں شبلی بی کام کے نام سے مشہور تھے جولائی ۱۹۱۴ء...... میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف اے کیا اور معاشیات کے مضمون میں صوبہ بھر میں اول آئے۔ معاشیات سے گہری دلچسپی انہیں نیشنل کالج آف کامرس میں لے گئی جہاں انہوں نے اول پوزیشن میں بی کام کا امتحان پاس

پاس کیا لیکن لوگ انہیں شبلی بی کام ہی کہتے رہے۔
کیا۔ بعد میں انہوں نے ایم کام کا امتحان
پڑھنے لکھنے کا شغف زمانہ طالب علمی سے تھا لہذا شملہ میں وائسرائے کے دفتر کی ملازمت راس نہ
آئی اور انہوں نے ادب وصحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس زمانے کے مشہور ماہنامہ "عالمگیر" اور ہفت
روزہ "خیام" کی ادارت سنبھالی۔ ان جریدوں میں ان کے کالم "حرف وحکایت"، "فکر ونظر" اور "ذکر وفکر"
بے پناہ مقبول ہوئے اور وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز، ذہین طنز نگار اور بے لاگ نقاد کی حیثیت سے
پہچانے گئے۔

ان جریدوں کے ذریعے انہوں نے تحریک پاکستان کی مؤثر خدمت .... کی جس کا اعتراف ایک
موقع پر حضرت قائداعظم نے بھی کیا تھا۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل مولانا ظفرعلی خاں جیسے بلند پایۂ صحافی، ادیب اور شاعر ان کی صلاحیتوں
سے متاثر ہو کر انہیں روزنامہ "زمیندار" میں لے گئے۔ آزادی کے بعد شبلی نے روزنامہ "آفاق" ..... اور "ملت"
میں کام کیا۔ ۱۹۶۰ء میں پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو گئے اور بالآخر یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

کچھ عرصہ کے لیے انہوں نے صوبائی محکمہ تعلقات عامہ میں بھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام
کیا تھا اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں لیکچر دیئے۔

شبلی صاحب ادب وصحافت کے علاوہ نجوم اور دست شناسی کا علم بھی رکھتے تھے۔ اردو اور انگریزی
کے علاوہ انہیں عربی پر بھی حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ ان کی مشہور تصنیفات میں ان کے کالموں کے مجموعے
"حرف وحکایت"، "فکرونظر" ...... "مشاہیر کے رومان"، "قلوپطرہ کی ایک رات" ...... "پاکستان کے دیہہ خدا"
اور "بائیس خانوادے" شامل ہیں۔ آخری دو تصنیفات پاکستان کی زرعی معیشت اور صنعت وتجارت پر تحقیق
...... میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں جنہوں نے ملکی معیشت کے متعلق اہل الرائے کو بیش قیمت معلومات مہیا کیں
اور نئی راہوں کے تعین میں ان کی رہنمائی کی۔ "پاکستان کے دیہہ خدا" پر آدم جی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ ان کی آخری
تصنیف "ربِ کعبہ کے حضور" تھی جو انہوں نے کچھ عرصہ قبل حج سے واپسی کے بعد لکھی تھی۔

انہیں جنون کی حد تک شوقِ مطالعہ تھا۔ اگر زندگی میں انہیں شادی کرنے کا مشورہ دیا گیا تو یہ کہہ کر ٹال
گئے: "میری شادی تو کتابوں کے ساتھ ہو چکی ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالمجید سالک کا کہنا تھا کہ انہوں نے شبلی جیسا وسیع المطالعہ شخص
شاید ہی دیکھا ہو چنانچہ ان کے اقبال ٹاؤن والے مکان میں سوائے کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے انباروں
کے آسائش اور ثروت کا کوئی سامان دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے اقربا کا کہنا ہے کہ مرض الموت کے بے بس کرنے
سے قبل وہ سولہ سولہ گھنٹے روزانہ مطالعہ کرتے تھے۔"

جیسا کہ "امروز" کی مندرجہ بالا خبر میں بھی ذکر ہے، مرحوم علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں رہائش پذیر تھے
اور انہوں نے یہیں وفات پائی تاہم ان کی تدفین ربوہ کے قطعہ شہدا میں ہوئی۔ مرحوم کی قبر پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

ممتاز صحافی، سحر طراز ادیب
پچیس سے زائد کتب کے مصنف
حضرت الحاج عبدالرحیم شبلی ایم کام
خلف الرشید
قاضی محمد ظہور الدین اکمل
آف گولیکی
پیدائشی احمدی، تاریخ پیدائش: ۲۵ جولائی ۱۹۱۴ء
تاریخ وفات: ۵ فروری ۱۹۸۱ء

اس کتاب میں کسی اور جگہ تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے کہ میں حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کے نیازمندوں میں سے تھا، میں ان کی اہلیہ محترمہ سے متعارف تھا، ان کے بڑے صاحبزادے جنید ہاشمی سے میری اچھی خاصی یاداللہ تھی اور میں ان کے بچوں کے حالات سے بھی باخبر تھا لیکن شبلی بی کام سے میری کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ دراصل وہ لاہور رہتے تھے اور ربوہ میں ان کی آمدرفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہاں! ایک بار جب میں قاضی صاحب کے پاس ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو وہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا لیکن اس ملاقات میں نہ مجھے ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہوئی نہ وہ کُھلے۔ کچھ یاد نہیں کہ وہ کس حوالے سے ربوہ آئے ہوئے تھے۔

شبلی بی کام سے براہ راست متعارف نہ ہونے کے باوجود مجھے علم تھا کہ وہ ایک ممتاز صحافی اور ادیب ہیں۔ اسی پس منظر میں جب مجھے ان کی وفات اور ربوہ میں ان کی تدفین کا علم ہوا تو میں خاص طور پر ان کی قبر پر دعا کے لیے حاضر ہوا۔

مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں قارئین کی خدمت میں ان کی تصنیفات کا مختصر سا تعارف ہی پیش کر دیتا تاہم مجھے اس معاملہ میں اپنی ناکامی کا اعتراف کئے بنا کوئی چارہ نہیں۔

امروز کی مندرجہ بالاخبر میں شبلی بی کام کے کالموں کے دو مجموعوں: ''حرف و حکایت'' اور ''فکر ونظر'' کے علاوہ ان کی پانچ کتب کا حوالہ موجود ہے۔ ماسٹر ببلیو گرافی آف احمدیہ لٹریچر پراجیکٹ میں ان کی چار دیگر کتب یعنی ''آبادی کا مسئلہ'' ''پاکستان اور بھارت کے دوطرفہ تعلقات اور کشمیر'' ''خوراک کا مسئلہ'' اور ''روٹی کپڑا مکان'' بھی شامل ہیں۔ انٹرنیٹ پر ان کی اردو فکشن کی ایک کتاب کا بھی ذکر موجود ہے جس کا نام ہے ''خوشبوئیں''۔ یہ کُل بارہ کتابیں بنتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں باقی تیرہ کتب کے کوائف اکٹھے نہیں کر پایا۔

''پاکستان کے دیہہ خدا'' ان کی معروف ترین کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب دراصل ملک کے ان چیدہ چیدہ خاندانوں کے ذکر پر مشتمل ہے جنہیں انگریز کی کاسہ لیسی نے وسیع وعریض جاگیروں کا مالک بنا دیا اور جو قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک پاکستانی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان میں شاہ پور کے ٹوانے، بہاولپور

کے نواب، ملتان کے دولتانے، گیلانی مخدوم زادے، گکھڑ راجے، گوجرانوالہ کے چٹھے، جھنگ کے سیال، نمک سار کے جنجوعے، پنڈ دادنخان کے کھوکھر، گجرات کے چب راجے، ڈیرہ غازی خان کے بلوچ، اٹک کے جاگیردار، بلوچستان کے سردار اور کتنے ہی ایسے دوسرے خاندانوں اور افراد کا ذکر ہے جو ایوب خان اور بھٹو کی زرعی اصلاحات کو ناکام بنا کر اپنی جاگیروں کو تحفظ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ کتاب میں ان سرکاری افسران اور دیگر بااثر افراد کا ذکر بھی موجود ہے جنہوں نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکومت سے وسیع زرعی رقبہ جات ہتھیا لیے تھے۔

یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے صرف ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے تاہم موضوعِ زیرِ بحث کے بارے میں بعض چشم کشا حقائق بیان کرتی ہے۔

شبلی بی کام کی ایک اور مشہور تصنیف ''بائیس خاندان'' دراصل ان خاندانوں کی کہانی ہے جنہوں نے ایوب خان کے دور میں ملک کی صنعت وتجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ یہ کتاب کن حالات میں منصۂ شہود پر آئی اور ملک کے معاشیاتی ادب میں اس کی کیا حیثیت ہے اس کا حال احمد بشیر نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے جس کا کچھ حصہ قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: ''امروز کے استقلال نمبر میں اے آر شبلی کے لکھے ہوئے مضمون (''تیس خانوادے پاکستان کی کھربوں روپے کی قومی دولت کے مالک ہیں'') نے ایسا دھما کہ کیا ہے کہ بڑے بڑے ایوان لرز گئے ہیں اور ٹیلیفون پر ٹیلیفون آ رہے ہیں کہ کیا واقعی ایسا ہے کہ پاکستان کا کُل صنعتی سرمایہ پچیس ارب ہے۔ اس میں سے بیس ارب صرف تیس خاندانوں کے قبضے میں ہے۔ یہ کیونکر ہوا، کس نے کیا اور یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان کو اپنے بینکوں میں جمع کرا رکھا ہے۔ کوئی آٹھ برس پہلے حکومت کے ایک اونچے افسر نے بائیس خاندانوں کی خبر دی تھی۔ پھر یہ افسر متعلقہ وزارت سے غائب ہو گئے۔ ان کے بیان کے حوالے باقی رہ گئے۔ تفصیلات کسی کو معلوم نہ تھیں۔ بعض لوگ یہ شبہ کرنے لگ گئے تھے کہ اتنی بڑی دھاندلی ممکن نہیں ہے۔ کسی نے بات اڑائی ہو گی مگر اے آر شبلی صاحب ان کے پیچھے لگ گئے اور مکمل تصویر پیش کر دی اور اسباب بھی بیان کر دیے جو اس دھاندلی کا موجب ہیں۔ بینک ان کے، انشورنس کمپنیاں ان کی، ملیں ان کی، پرمٹیں اور لائسنس، اجارے ان کے۔ بس آنکھیں میری باقی ان کا۔ یہ معجزہ صدر ایوب کے دورِ حکومت میں ہوا......

اے آر شبلی صاحب بھی بڑے ستم ظریف ہیں۔ ایک تو اشراف کے نام پتے درج کر دیے۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ اتنی بڑی دولت کمانے کے لیے ان امرا کو کسی قابلیت کی ضرورت نہ تھی لیکن قانون ہی ایسے تھے کہ ایک دفعہ حلقہ یاراں میں شامل ہو جائیے، اپنے آپ جھولے پر چڑھ جائیں گے۔ پھر ان کا حلقہ اقتدار ایسا تھا کہ حکومت سے اپنی مرضی کی پالیسیاں بنواتے تھے۔ ان میں ہم نے بعض ایسے نام بھی دیکھے ہیں جن کو پڑھ کر اچنبھا ہوا کہ کل تک ہمارے ساتھ گھاس چھیلتے تھے اب اربوں پتی ہیں۔ پھر بعض ریٹائرڈ سی ایس پی افسران کے نام بھی محلِ نظر ہیں۔ ان کی تنخواہیں ریٹائرمنٹ کے قریب تین ساڑھے تین ہزار ہوتی ہیں۔ اخراجات بھی ایسے ہی

ہوتے ہیں مگر ادھر ریٹائر ہوئے ادھر کروڑ پتی بن گئے۔ کیسے بن گئے، کیوں کر بن گئے، اس پر غور کرنا چاہیے۔

اے آر شبلی نے تمام اعداد و شمار ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔ ان کے محاسبے سے عوام کی حکومت میں اعتماد کو تقویت پہنچے گی۔ یہ بھی پتا چلے گا کہ پبلک سیکٹر کیا ہے۔''

میری ناقص رائے میں کتابِ ہٰذا کے قارئین کے لیے شبلی بی کام کی ذات مزید تعارف کی محتاج ہے اور اس حوالے سے اُن کے بارے میں اخبارات و رسائل میں چھپنے والے بعض مضامین کا خاص طور پر حوالہ دیا جا سکتا ہے تاہم طوالت کے خوف سے صرف دو مضامین کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر عبدالرشید تبسم کے بھائی عبدالقدیر رشک کا لکھا ہوا ہے جب کہ دوسرا مضمون مرزا ادیب کا تحریر کردہ ہے۔ مرزا ادیب کا مضمون جو شبلی بی کام کی ذات کے مختلف پہلوؤں کا زیادہ تفصیلی احاطہ کرتا ہے پیشِ خدمت کیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ یہ مضمون شبلی بی کام کی وفات کے فوراً بعد شائع ہوا تھا:

''اے آر شبلی دنیا سے چلا گیا مگر سوال یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھا ہی کب؟

سالہا سال گذر گئے مگر وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا میں نہیں تھا۔ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتا تھا تو اس طرح قدم اٹھاتا تھا جیسے اس کے اردگرد کچھ نہیں ہے۔ آس پاس انسانوں کے چہروں پر اسے کسی قسم کی شناسائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ یہ کیسی مردم بیزاری تھی جس نے اس کے چاروں طرف غیر مرئی دیواریں کھڑی کر دی تھیں؟ ہم جو اس کے بہت پرانے دوست تھے کیوں اپنی دلی خواہش کے باوجود اس کے قریب جانے سے ہچکچاتے تھے؟ ہمارے اور اس کے درمیان اجنبیت کی کیسی فصیل کھڑی ہوگئی تھی؟

لاہور میں میں اس کا سب سے پرانا دوست تھا۔ میں اسے کئی کئی ماہ بعد کسی بازار میں، کسی سٹریٹ میں اتفاقاً جاتے ہوئے دیکھتا تھا تو ایک جذبۂ بے اختیار کے زیر اثر اس کی طرف لپکتا تھا لیکن اس کے قریب جاتے جاتے اچانک رک جاتا تھا کیوں کہ جانتا تھا وہ صرف ایک لمحہ ٹھہر کر کہے گا ''مرزا صاحب! کیا حال ہے؟'' اور مصافحے کے لیے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو صرف چھو کر آگے چلا جائے گا!

اس کا پرانا دوست سید احسان علی شاہ جو صحافتی دنیا میں ''احسان بی اے'' کے نام سے معروف ہے اس کی بے اعتنائی کی شکایت کیا کرتا تھا۔ مرحوم ظہور الحسن ڈار جس کی شبلی سے دوستی کی عمر پینتیس چھتیس برس سے کم نہیں تھی اس کو بھی شبلی سے شکایت رہتی تھی اور وہ اس شکایت کا برملا اظہار کیا کرتا تھا۔

شبلی ایسا تو نہیں تھا اور میں یہ الفاظ اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اُس شبلی کو دیکھا تھا جو پہلے پہل لاہور میں آیا تھا اور مجھ سے ملنے کے لیے ادبِ لطیف کے دفتر میں بھی چلا آیا تھا۔

وہ شبلی نوجوان رعنا تھا۔ گہرے گہرے نقش، ہر وقت مسکراتی ہوئی آنکھیں، سڈول جسم اور پیشانی ذہانت کی بے پناہ روشنی سے چمکتی ہوئی۔

میری اس سے خط و کتابت تھی۔ وہ ادبِ لطیف کے لیے افسانوں کے تراجم یا اقتصادی موضوعات پر مضامین بھیجا کرتا تھا۔ اس کا لفافہ آتا تھا تو میں ایک لمحہ تامّل کیے بغیر پہچان لیتا تھا کہ یہ مضمون شبلی بی کام کا ہے۔

ایسا خوشخط ادیب اختر شیرانی مرحوم کے علاوہ میں نے اور کوئی نہیں پایا۔

اُس زمانے میں وہ ہر جگہ شبلی بی کام کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ میری جو شامت آئی تو اُسے جو خط لکھا اس کے لفافے پر لکھ دیا ''شبلی بی، اے کام''۔ مجھے آج بھی اپنی اس جہالت پر ہنسی آتی ہے کہ میں بی کام کا مطلب ہی نہیں جانتا تھا۔ دل یہ کہتا تھا بی اے تو ہوا، یہ بی کام کیا ہوا۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب شبلی کا غالباً دوسرا خط آیا تھا۔ ہوسکتا ہے میں نے لفافے کی بجائے پرچے میں اس کے مضمون کے اوپر بی اے کام لکھ دیا ہو۔

فوراً شبلی کا جواب آیا جس میں میرا خوب خوب مذاق اڑایا گیا تھا۔

تو میں نے اس شبلی کو دیکھا تھا جو پہلے پہل لاہور آیا تھا۔ اصل میں حافظ محمد عالم نے اسے ''عالمگیر'' کی ادارت کے لیے بلوایا تھا۔ اس سے پہلی ملاقات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

اُس روز میں خلافِ معمول کافی تاخیر سے دفتر میں پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ادبِ لطیف کے مالک قہقہے لگا رہے ہیں اور ایک شخص طبلے پر بے تحاشا ہاتھ مار کر گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنی بے سُری آواز میں گا رہا ہے اور گا بھی رہا ہے کوئی بیہودہ پنجابی گیت۔

میں نے یہ تماشا اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چودھری صاحب بڑے ہنس مکھ آدمی تھے مگر اس حالت میں اس سے پہلے وہ بھی کبھی نہیں پائے گئے تھے۔

میں حیران و پریشان اندر پہنچا۔ چودھری صاحب نے مجھے دیکھا تو اُن کی ہنسی کا دورہ تھم گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے ''ان سے ملئے یہ ہیں......''

اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہیں طبلچی نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھا دیا ''میں ہوں شبلی بی کام، میرزا صاحب!''

میں یہ تو بھول ہی گیا کہ شبلی نے میری جہالت کا ایک بار پھر مذاق اڑایا ہے۔ مجھے تو اس کی حرکت نے اس طرح سراسیمہ کر دیا تھا کہ کچھ سُوجھتا ہی نہ تھا۔ وہ شبلی زندہ شبلی تھا، قہقہے پر قہقہے لگانے والا، کسی کو بھی خاطر میں نہ لانے والا، معمولی سے معمولی بات کا مذاق اڑا دینے والا۔ فلک شگاف قہقہوں کی جو زبردست روایت سید امجد الطاف اور قیوم نظر کے حصے میں آئی ہے اس کا ایک علمبردار شبلی بی کام بھی تھا۔

شبلی جانِ محفل تھا۔ کبھی محفل میں ہوتا تھا تو فضا میں اس کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ اپنی بھونڈی آواز میں کبھی استادی گانا گاتا تھا، کبھی تنہا یا احسان شاہ کے ساتھ قوالی شروع کر دیتا تھا اور کبھی کوئی غزل چھیڑ دیتا تھا۔

ہماری محفل لوہاری دروازے کے باہر محمد حنیف کی دوکان، اردو اکیڈمی میں یا احسان شاہ کے گھر میں لگتی تھی اور گھنٹوں لگی رہتی تھی۔

وہ میرا شبلی تھا، میرا زندہ شبلی!

میرے زندہ شبلی نے اپنی حقیقی زندگی کا بھرپور ثبوت اس انتھک جدوجہد اور مستقل تگ و دو کے ذریعے دیا تھا جو اس کی ذات کا حصہ بن گئی تھی بلکہ جو بذاتِ خود اس کی ذات تھی۔ اسے کسی تفریح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کسی

کھیل، تماشے، مشغلے سے اس کا ربط قائم نہیں تھا۔ میں اور احسان فلموں کا ذکر کرتے، سیر و تفریح کا پروگرام بناتے،
کسی دوست کی شادی میں شریک ہونے کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کرتے، شبلی ہماری باتیں اس انداز سے سنتا جیسے
سخت بور ہو رہا ہو، کہیں بھاگ جانا چاہتا ہو، گفتگو کا یہ سلسلہ بند کر دینا چاہتا ہو۔ میں تاش کا رسیا ہوں، شبلی کو تاش کا
پتہ دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ احسان اور ذار فلم بینی کے شائق تھے۔ شبلی اس معاملے میں کبھی ان کا ساتھ
نہیں دیتا تھا۔ اتوار کے روز ہم کہیں دریا، شالامار جانے کا پروگرام بناتے۔ شبلی کو اصرار کر کے منا لیتے کہ وہ بھی
ہمارے ہمراہ جائے گا۔ عین اس موقع پر جب ہم تیار ہو کر اس کے ہاں پہنچتے تو وہ معذرت کرنے لگتا۔ مجھے یاد نہیں
پڑتا کہ اس نے کبھی ہمارے ساتھ سیر و تفریح کے کسی پروگرام میں شرکت کی ہو۔

ایک بار طے ہوا کہ اتوار کی صبح کو پوریاں لے کر دریا پر جائیں گے، وہیں ناشتہ کریں گے۔ صبح سویرے
اس کے ہاں جا پہنچے۔ بڑی بیزاری کے عالم میں اس نے دروازہ کھولا، ہم بیٹھ گئے۔ وہ نیچے اترا۔ ننکو شاہ حلوائی کی
دکان سے ایک روپے کی پوریاں خرید لایا۔ ہم دل میں خوش تھے کہ آج اس کو شیشے میں اتار لیا۔ پوریوں کی ٹوکری
لا کر اس نے اپنی وحدۃ لاشریک چارپائی پر رکھ دی اور بولا ''کھاؤ''۔

''کھاؤ! کیا مطلب؟ دریا پر نہیں جانا؟'' میں نے پوچھا۔

''دریا...... ہی ہی ہی۔ میرزا صاحب! نیچے دریا بہہ رہا ہے اور ہم بارہ دری میں بیٹھے ہیں۔''

بہت اصرار کیا مگر وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے روزمرہ کے معمولات مختصر تھے۔ صبح آٹھ،
ساڑھے آٹھ بجے، منہ پر پانی کے تین چار چھینٹے مار کر اور دو بار کلی کر کے نیچے اترنا۔ خیال رہے کہ اس کا گھر قیام
پاکستان سے قبل جب وہ ''عالمگیر'' کا ایڈیٹر تھا بازار سید مٹھا میں لاہور کے اُس دور کے مشہور حلوائی ننکو شاہ کی
دکان کے قریب واقع تھا۔ دو منزلہ مکان تھا۔ درمیانی منزل میں اس کی رہائش تھی اور اس منزل کی موجودات تھیں
ایک چارپائی، ایک دیواری الماری، کتابوں اور رسالوں سے بھری ہوئی دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے شبلی کے دو
کوٹ، ایک ٹرنک جس میں اس کے باقی کپڑے پڑے رہتے تھے۔ ملحقہ بہت چھوٹے سے کمرے میں ایک مٹی
جس میں صبح سویرے ایک ماشکی آ کر پانی ڈال دیتا تھا۔ چارپائی کے نیچے بوٹوں کا ایک جوڑا۔ جب وہ دفتر جاتا تھا
تو اس کی جگہ ایک چپل لے لیتی تھی کیوں کہ یہی بوٹ پہن کر وہ باہر نکلتا تھا۔
نیچے اتر کر وہ پان والے کی دکان پر رک کر سگریٹ کی دو ڈبیاں اور پان الگ الگ بندھوا کر انہیں کوٹ کی
جیب میں ڈال لیتا۔ ہر روز قیمت ادا نہیں کرتا تھا، مہینہ گذرنے پر بل ادا کرتا تھا۔ وہ تحصیل بازار کی طرف جہاں
عالمگیر کا دفتر تھا، نہیں مڑتا تھا، سیدھا جاتا تھا، ننکو شا کی دکان کے سامنے سے۔ ہیرا منڈی پہنچ کر ایک ریستوران
میں جس کا اس زمانے میں نام تھا ''بسم اللہ ہوٹل'' بیٹھ جاتا تھا۔ وہاں ناشتے میں ایک مکھن لگا بند اور چائے کی دو
پیالیاں پیتا تھا۔ دوسری پیالی پی کر جیب سے پان کی ایک پڑیا نکال لیتا تھا۔ پڑیا کھول کر پان منہ میں ڈال کر
سگریٹ سلگا لیتا تھا اور بڑے اطمینان سے کش لیتا تھا۔ یہ اس کے بہترین لمحے ہوتے تھے۔
سگریٹ پھینک کر دفتر چلا جاتا۔ عالمگیر کا دفتر اس جگہ واقع تھا جو تحصیل بازار میں بنگالیوں کا محلہ کہلاتا

اسے خرید یا اور اس کے اندر اپنا پریس لگوا دیا جو عالمگیر
تھ۔ یہاں ایک زمانے میں فلور مز تھی۔ حافظ محمد عالم نے
پریس کہلاتا تھ۔ اس پریس میں داخل ہوں تو دائیں جانب ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آئے گا۔ اس کمرے
بیٹھتے اور خدا بخش اظہر بھی۔
میں عالمگیر کا دفتر تھا۔ یہیں حافظ محمد عالم بھی
کے لیے کافی بلند آواز میں بولنا پڑتا تھا۔ اسی شور
یہاں پریس کا اس قدر شور ہوتا تھا کہ اپنی بات سمجھانے
میں شبلی کا اپنا کام ہوتا تھا۔ بارہ، ساڑھے بارہ بجے تک وہ بری طرح مصروف رہتا تھا۔ پھر واپس گھر آتا تھا۔ گھر
کے نیچے تھوڑے سے فاصلے پر ایک تنور تھا۔ تنور کے سامنے کھڑے ہو کر تنور والی کو اپنی شکل دکھا کر اوپر اپنے کمرے
میں چلا جاتا تھا۔ چند منٹ بعد تنور والی کا لڑکا ایک چنگیر میں دو روٹیاں، ایک پیالی میں دال اور دوسری میں تھوڑا سا
بھنا ہوا گوشت یا کوئی سبزی اور ایک خالی ٹین کا گلاس لے کر آ جاتا تھا۔

سوا یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ روٹی کھا کر وہ اپنی مٹی میں سے گلاس بھرتا، کلی کرتا تھا، پانی پیتا تھا اور
خالی برتن چارپائی کے نیچے رکھ کر چارپائی پر اس طرح دراز ہوتا تھا کہ ٹانگیں چارپائی سے باہر اور سر الماری
سے جا لگتا تھا۔

جیب سے دوسرا پان نکالتا تھا اور سگریٹ کی ڈبیا بھی۔ آدھ پون گھنٹہ آرام کرتا اور پھر دفتر کی طرف روانہ
ہو جاتا تھا جہاں گہری شام تک مصروف رہتا تھا اور اس طرح مصروف رہتا تھا کہ شاذ و نادر ہی اپنے سامنے پھیلے
ہوئے کاغذوں سے نظریں ہٹاتا تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو، زلزلہ آ جائے مگر کیا مجال جو شبلی پر کچھ اثر ہو۔

حافظ صاحب نے ایک ہفت روزہ پرچے ''خیام'' کا اجرا بھی کر دیا تھا۔ شبلی جو پہلے عالمگیر کا سارا کام کرتا
تھا خیام کا سارا کام بھی اس کے سپرد ہو گیا تھا۔ صرف خیام کا اداریہ خدا بخش اظہر لکھتے تھے، باقی سارا کام تن تنہا
شبلی کرتا تھا۔

کام کرنے کے معاملے میں شبلی ایک روایتی دیو تھا۔ کام کرتے ہوئے تھکتا ہی نہیں تھا۔ سر میں درد ہوتا تو
دو تین لمبے اپنا ہاتھ سر پر، پیشانی پر پھیرتا، سگریٹ کے چند کش لگاتا، حافظ جی پر کوئی فقرہ چست کر کے ایک قہقہہ لگا
کر پھر کاغذوں پر جھک پڑتا۔ کہنیوں پر اس کی قمیص پھٹی رہتی۔ یہ صورت گرمیوں میں ہوتی۔ سردیوں میں یہی
حال کوٹ کا ہوتا۔ میں کہتا شبلی کوٹ پھٹ گیا ہے۔ بڑی بے اعتنائی سے جواب دیتا: ''پھٹ جائے۔ مجھے کیا''۔
احسان پوچھتا ''شبلی! کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔'' جواب ملتا ''یار لانڈری پر گیا ہی نہیں۔''
کام اس کی زندگی تھی۔ سارا دن دفتر میں مشینوں کے بے پناہ شور میں کام کرنے کے بعد گھر واپس آتا
تھا تو اپنا اصل کام شروع کر دیتا تھا۔ اقتصادی مضامین، رومانی تحریروں کے تراجم، عالمگیر کا اداریہ، ترجمہ کرنے
میں اسے کمال مہارت حاصل تھی۔ خالدہ ادیب خانم کے ایک اچھے ضخیم ناول کا ترجمہ اس نے صرف چند راتوں
میں کر دیا تھا۔ اس زمانے میں قمر اجنالوی جو آج کل روزنامہ مغربی پاکستان کے ایڈیٹر ہیں شبلی کے ہاں رہتے
تھے۔ شبلی خود لکھتے لکھتے جب یہ محسوس کرتا کہ اس کی انگلیوں کی گرفت قلم پر بہت ہلکی پڑ گئی ہے تو قمر اجنالوی کے
ہاتھ میں تھما دیتا۔

یہ ناول ربیعہ کے نام سے چھپ چکا تھا۔

خیام میں اس نے مختلف اوقات میں فکری مضامین کے کئی سلسلے شروع کئے تھے۔ بڑے آدمیوں کا عشق، حالی اور پیروی مغرب، ترقی پسند ادب کی تحریک وغیرہ وغیرہ۔ حالی اور پیروی مغرب کے باب میں اس نے بڑے بڑے جغادری ادیبوں سے مضامین حاصل کر کے شائع کئے تھے۔ یہ بحث نہایت دلچسپ رہی تھی۔ خیام اپنے دور کا مقبول ترین ہفت روزہ تھا اور یہ شبلی کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ تھا۔ شبلی کی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک جو مجلسی تھا۔ اس کی مجلس کے ارکان میں میں تھا۔ احسان بی اے تھا۔ ظہور الحسن ڈار تھا۔ قمر تسکین تھا۔ مجلس میں شبلی بے اختیار چہکتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک پر پھبتیاں کستا تھا۔ بار بار قہقہے لگاتا تھا۔ یہ مجلس لوہاری دروازے کے باہر محمد حنیف کی دوکان، اردو اکیڈمی میں ہوا کرتی۔ احسان بی اے کے پرانے گھر جو لوہاری منڈی میں تھا وہاں برپا ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ ہمارے اور بھی تین چار اڈے تھے: دفتر ادبِ لطیف، پیسہ اخبار کا ایک ہوٹل اور قمر تسکین کا موہنی روڈ والا مکان۔ ان مجلسوں میں شبلی کام کرنے والے دیوتا شبلی سے بہت مختلف ہوتا تھا۔ اس کی زندگی کا دوسرا دائرہ دفتر عالمگیر اور اس کے مکان کے رہائشی کمرے تک محدود تھا جہاں وہ ہوتا تھا، اس کا مسلسل رواں رہنے والا قلم ہوتا تھا اور کاغذوں کے انبار تھے۔

حافظ محمد عالم سارا مہینہ عالمگیر پریس میں نہیں گذارتے تھے۔ سارے منی آرڈروں کی رقم بنک میں جمع کروا کر گاؤں میں اپنی دوسری بیوی کے ہاں چلے جاتے تھے۔ وہ وہاں ان روپوں سے اپنی بیوی کا پیار اور اراضی خریدنے میں مگن رہتے تھے۔ اچھے تن و توش کے آدمی تھے۔ دفتر میں بیٹھ کر بھی وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے اعصاب متاثر ہو گئے تھے مگر شبلی تو لوہے اور پتھر کا بنا ہوا تھا۔ مشینوں کا اعصاب شکن شور اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ شبلی کو جنسِ مخالف سے بہت کم دلچسپی تھی۔ محبت اور عورت کے ذکر پر وہ بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے ایک بار بتایا تھا کہ میں...... ایک لڑکی کو اکنامکس پڑھایا کرتا تھا۔ لڑکی پردہ کے پیچھے بیٹھتی تھی۔ میں صرف اس کی آواز ہی سن سکتا تھا۔ یہ آواز بڑی میٹھی ہوتی تھی۔ بڑی ہی پیاری، مترنم، ایک دفعہ آندھی کے جھونکے سے پردہ ہٹ گیا اور میں نے اسے دیکھا۔ آواز کی طرح بہت خوبصورت تھی۔''

''پھر؟''

''پھر کیا ہوتا ہے؟''

شبلی نے موضوع بدل دیا مگر میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کرب کے گہرے اثرات پھیل گئے ہیں۔

ایک اور مرتبہ میں نے دیکھا کہ شبلی اپنے کمرے کو انتہائی دلچسپی سے سجا رہا ہے۔ یا اللہ! آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ چارپائی کا بستر کیوں بدل دیا گیا ہے۔ یہ رنگا رنگ پردے لہرانے لگے ہیں۔ یہ ٹیبل لیمپ کس خوشی میں لگایا

گیا ہے۔ شبلی سے پوچھا تو اس نے بتایا: ''مہمان آ رہے ہیں''۔

مہمان آئے۔ ایک بوڑھا شخص اور ایک لڑکی، سروقد۔

مہمان کی آمد پر ہمارا شبلی کے گھر جانا ممنوع تھا۔ تین چار دن بعد مہمان چلے گئے اور شبلی کا وہ ذوق وشوق، وہ ولولہ وسرمستی اور گھر سجانے کی دلچسپی سب ختم ہو گیا۔

ہوسکتا ہے یہ وہی لڑکی ہو، جس نے اسے اپنی ایک جھلک دکھائی تھی۔ شبلی نے کبھی اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی تھی، جوانی میں اپنے مرکزِ محبت سے محرومی کے کارن اور جوانی کی گوناگوں ذمہ داریوں کی وجہ سے۔ قمر تسکین نے بتایا چند سال پہلے وہ شادی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ غالباً تنہائی کے زہر آلود احساس سے بچنے کی خاطر مگر اس کی تنہائیوں میں کبھی کسی عورت کی آواز نہ گونج سکی۔ کبھی کسی خاتون کا جلوہ نہ بکھر سکا۔ وہ محروم ہی رہا۔ ازلی اور ابدی محرومی اس کے حصے میں آئی تھی۔

مدت ہوئی ہماری محفل ختم ہو گئی تھی۔ احسان علی شاہ تین چار سال سے کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ قمر تسکین ناجانے کہاں کھو گیا تھا اور ظہور الحسن ڈار تو دنیا ہی چھوڑ گیا ہے مگر میرے دل میں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میرا شبلی زندہ ہے۔ جو کبھی ہماری محفل کی جان تھا، جو کبھی سراپا زندگی تھا اب بھی یہیں کہیں موجود ہے۔ میں اسے کبھی کبھی دیکھا کرتا تھا انارکلی میں سے گذرتا ہوا، پاکستان ٹائمز کے دفتر کے نیچے یا نقوش پریس کے آس پاس۔

دور مجھے سایہ سا دکھائی دے جاتا تھا۔ جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ میں اسے آواز دیتا تھا ''شبلی!'' وہ رک جاتا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہتا تھا ''میرزا صاحب'' اور چل پڑتا تھا۔ اسی وقت ایک سوال میرے ذہن میں پھوٹ پڑتا ''کیا یہ میرا وہی زندہ شبلی ہے؟''

یقیناً یہ وہی شبلی تھا مگر زندہ شبلی نہیں۔ زندگی کی تابناک راہوں پر چلنے والا شبلی تو مدت ہوئی ایک ویران، گرد آلود، نیم تاریک راستے پر قدم اٹھا رہا ہے۔ زندہ شبلی کو اس محرومیوں نے نگل لیا۔ اب وہ سایہ بھی نظر نہیں آئے گا، کہیں بھی نہیں۔''

قمر اجنالوی اور شبلی بی کام کے بعد اب میں تین ایسی احمدی شخصیات کا ذکر کرنا چاہوں گا جن میں سے ہر ایک کی شہرت کے الگ الگ اسباب تھے۔ ان میں سے ایک حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین تھے۔

وہی ہے اعلیٰ صفات والا خدا تعالیٰ، خدا تعالیٰ

حضرت سیٹھ عبداللہ الہ دین ساکن حیدرآباد دکن خاندانی طور پر اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو احمدیت کی طرف راغب ہوئے اور ساری زندگی اپنے مخصوص رنگ میں احمدیت کی اشاعت میں بسر کر ڈالی۔ خدا نے مالی کشائش دی تھی چنانچہ وہ ساری زندگی جماعت کے حق میں لٹریچر شائع کر کے مفت تقسیم کرتے رہے۔ وہ جب تک بقیدِ حیات رہے الفضل میں ان کی طرف سے ان کتب اور ٹریکٹس کے اشتہارات بکثرت شائع ہوتے رہتے تھے۔ اگر کسی وقت ان اشتہارات میں معمول سے لمبا فاصلہ آ جاتا تو تشویش ہونے لگتی۔ مجھے یقین ہے کہ احمدی اور بعض غیر احمدی احباب نے سیٹھ عبداللہ الہ دین کی طرف سے شائع کردہ اس لٹریچر سے پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔

موصوف سلسلے کے ان بزرگان میں سے تھے کہ ملاقات تو درکنار، مجھے ان کی زیارت بھی نصیب نہیں ہوئی لیکن مجھے محسوس یوں ہوتا ہے گویا میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کی وجہ ان کی دین حق کی اشاعت کے لیے وہ تڑپ ہے جس کا اظہار ان کی طرف سے شائع شدہ لٹریچر سے ہوتا ہے۔ الفضل میں آئے دن ان کی مطبوعات کے اشتہارات اس وضاحت کے ساتھ شائع ہوتے رہتے تھے کہ یہ مطبوعات ''کارڈ آنے پر'' یعنی مطالبہ پر مفت فراہم کی جائیں گی۔ میں نے ان میں سے بعض مطبوعات اپنے طور پر منگوائیں اور ان سے مستفید ہوا تاہم ان کی جن مطبوعات کے اشتہار میری نظر سے گذرتے رہے ہیں ان میں سے سب سے کثرت سے شائع ہونے والا اشتہار ''قبر کے عذاب سے بچو'' نامی ایک کتابچے کا تھا۔ دیگر مطبوعات میں ''اس زمانہ میں خدا تعالیٰ کا متواتر غضب کیوں ہو رہا ہے'' ''اہلِ (......) کس طرح ترقی کر سکتے ہیں'' ''پیغام احمدیت'' ''اِس زمانے کا ربانی مصلح'' ''تمام جہان کے لیے آسمانی پیغام'' ''سرورِ انبیاءؐ کا نہایت ہی سخت تاکیدی فرمان'' ''صداقتِ احمدیت کے متعلق تمام جہان کو چیلنج'' ''مقصدِ زندگی واحکامِ ربانی'' ''ہر انسان کے لیے ایک ضروری پیغام'' ''خدا تعالیٰ کی طرف سے (......) پر اشاعتِ (......) کی فرضیت'' ''(......) میں فرقہ ناجیہ کون سا ہے؟'' ''(......) کس عظیم الشان کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں'' اور ''احمدیت کے خلاف پانچ اعتراضات کے جواب'' شامل ہیں۔

یہ سارا لٹریچر اردو میں ہے البتہ ایک کتاب جس کا اشتہار ''(......) احمدیت اور دوسرے مذاہب کے متعلق سوال و جواب'' کے عنوان سے آتا رہا انگریزی زبان میں تھی۔ اسی طرح انہوں نے نماز کا انگریزی ترجمہ مع عربی متن و تصاویر کے شائع کیا اور بعض کتب گجراتی زبان میں شائع کیں۔

سیٹھ عبداللہ الہ دین نے ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔ اس موقع پر حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے الفضل میں

اپنے نوٹ میں لکھا تھا: ''حضرت سیٹھ صاحب مرحوم کا نام نامی جماعت میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے غالباً خلافت ثانیہ کے ابتدا میں اسمعیلیہ فرقہ سے نکل کر احمدیت کو قبول کیا تھا اور پھر ایمان و اخلاص میں ایک جد جد ترقی کی اور قربانی اور خدمتِ دین کا ایسا اعلیٰ نمونہ قائم کیا کہ بہت سے پہلے آنے والے لوگوں سے آگے نکل گئے۔''

جیسا کہ ماہنامہ خالد نے اپریل ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں سیٹھ عبداللہ الہ دین کی وفات پر لکھا: ''حضرت سیٹھ صاحب نے سلسلہ کی تائید میں اردو، انگریزی اور گجراتی زبانوں میں اتنا وسیع لٹریچر شائع کر کے مفت تقسیم کیا ہے کہ حیرت آتی ہے چنانچہ آپ نے ۱۹۳۹ء میں اپنی سوانح میں خدا تعالیٰ کے الٰہی افضال کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا: مجھے احمدی ہوکر ۲۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں خاکسار نے ساڑھے تین لاکھ روپیہ سکۂ عثمانیہ جس کے انگریزی تین لاکھ ہوتے ہیں وہ تمام خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ میرا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ نے خاکسار کو اس قدر روپیہ محض اپنے دین کی خدمت کے لیے عطا فرمایا اس لیے میرا فرض تھا کہ میں اس کی امانت اُس کی راہ میں خرچ کروں۔ وہ میں کرتا رہا اور انشاء اللہ کرتا رہوں گا۔ یہ احمدیت کی صداقت کا آفتاب کی مانند روشن نشان ہے۔''

سیٹھ عبداللہ الہ دین کے بعد ایک اور بزرگ جن کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں لاہور کے میاں سراج دین تھے جنہیں یہ جنون تھا کہ لوگ خدا کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ساتھ تعالیٰ کا لفظ ضرور استعمال کریں۔ انہوں نے اسی بات کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا تھا اور وہ اٹھتے بیٹھتے لوگوں کو تحریک کرتے رہتے تھے کہ خدا کی شان اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ساتھ تعالیٰ کا لفظ ضرور استعمال کیا جائے گا۔

ربوہ کے پرانے باسی جانتے ہیں کہ شروع میں اس بستی کے تقریباً ہر محلے میں کم از کم ایک ایسا مکان ضرور موجود تھا جس کے ماتھے پر جلی حروف میں ''خدا تعالیٰ کہنے میں بڑی برکات ہیں'' لکھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک مکان تو وہ تھا جسے بعد میں حکومت پنجاب نے کرایہ پر لے کر اس میں پولیس چوکی قائم کر دی۔ ایک مکان اس کے تقریباً عقب میں ہوا کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک مکان محلّہ دارالرحمت غربی میں بیت ناصر کے عقب میں تھا۔ ایک مکان محلّہ دارالصدر غربی میں ''شاہنواز دی کوٹھی'' کے قریب تھا اور خلیل منزل کہلاتا تھا۔ اسی طرح محلّہ دارالنصر وسطی اور محلّہ دارالیمن وسطی میں بھی دو دو دو کانوں کے ایک ایک یونٹ پر یہ فقرہ لکھا ہوتا تھا۔ بسا اوقات تو یہ تحریر ایک کراؤن کی شکل میں ہوتی اور بعض دفعہ مستطیل کی شکل میں۔ اب یہ تمام کراؤن ختم ہو چکے ہیں ماسوا خلیل منزل کے جس کے اوپر اب بھی یہ الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں:

اللہ اکبر

خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

خدا تعالیٰ کہنے میں بڑی برکات ہیں

اُس زمانے میں الفضل اور بعض جماعتی رسائل میں ایک اشتہار بکثرت شائع ہوا کرتا تھا جس کے ذریعہ احبابِ جماعت کو توجہ دلائی جاتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر صرف ''اللہ'' یا ''خدا'' کے طور پر کرنا خدائے عزّ وجل کی بے ادبی ہے لہٰذا اللہ اور خدا کے ساتھ تعالیٰ کا لفظ ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمانا چاہیں گے اس

قسم کا ایک اشتہار جو ۲۸ فروری ۱۹۵۱ء کے الفضل میں شائع ہوا تھا:

''خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

ادب کے لحاظ سے خدا تعالیٰ ہی کہنا چاہئیے

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے وقت محض ''خدا'' یا ''اللہ'' کہنا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ احباب کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتے وقت ''اللہ تعالیٰ'' یا ''خدا تعالیٰ'' کہا کریں۔ کیوں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کی غرض الٰہی صفات اور عظمت کو قائم کرنا ہے اس لیے زبان پر بھی اللہ تعالیٰ کے نام آتے وقت اس کی بلندی شان کا اظہار ہونا چاہیے......''

وہ اپنی اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے طرح طرح کی تجاویز سوچتے رہتے تھے۔ انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۵۱ء کے الفضل میں ایک اشتہار دیا کہ ''پاکستان میں جو روزانہ (اردو) اخبار اس بات کی متواتر پابندی کرے گا کہ خدا تعالیٰ کی عظمت کا جہاں بھی اس کا نام لکھے ضرور اظہار تحریری کرے یعنی خدا تعالیٰ یا اللہ تعالیٰ لکھے اور کسی جگہ بھی خالی خدا یا اللہ نہ لکھے اس کو میں دوصد روپیہ اس پابندی کرنے پر پیش کروں گا۔ جو اخبار اس بات کا عہد کرے وہ اس عرصہ کے لیے اپنا روزنامہ مجھے ہر ماہ وی پی کر دیا کرے تا کہ اخبار کی قیمت بھی میں ادا کر دیا کروں۔ چھ ماہ تک میں خود اس پابندی کا التزام دیکھ کر دوصد روپیہ پیش کردوں گا تاکہ آئندہ اس اخبار کو یہ عادت پڑ جائے۔''

۱۹۵۴ء کے جلسہ سالانہ سے پہلے انہوں نے اعلان کیا کہ ''جو شخص ایک ایسی اچھی نظم لکھ کر ارسال کرے گا جس میں اللہ تعالیٰ اور خدا تعالیٰ کے الفاظ استعمال ہوں اور جس میں خدا تعالیٰ کی عزت اور عظمت کا اظہار کیا گیا ہو اسے پچیس روپے نقد انعام دیا جائے گا۔'' بعد میں انہوں نے ایسی نظموں کے لیے اول انعام پچیس روپے کا، دوسرا انعام پندرہ روپے کا اور تیسرا انعام دس روپے کا مقرر کیا۔ اس مقابلے میں میر اللہ بخش تسنیم کی نظم اوّل قرار پائی۔ یہ نظم آٹھ مارچ ۱۹۵۵ء کے الفضل میں چھپ چکی ہے۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

کریم بھی وہ، رحیم بھی وہ، وہی ہے کافی خدا تعالیٰ
حلیم بھی وہ، علیم بھی وہ، وہی ہے شافی خدا تعالیٰ
وہی ہے اعلیٰ صفات والا
خدا تعالیٰ، خدا تعالیٰ

میاں سراج الدین نے ربوہ کے اُن کاتبوں کے لیے پچیس روپے فی کس کے آٹھ انعامات کا اعلان کیا ''جو اپنے حلفیہ بیان ناظر صاحب اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ کو بھیجیں گے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عظمت کے پیشِ نظر اپنی ہر تحریر میں رب العالمین کے حق میں خدا تعالیٰ، اللہ تعالیٰ اور ربُّ العزّت لکھا کریں گے اور اس پر زندگی بھر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔''

۱۹۶۴ء میں انہوں نے اعلان کیا کہ ''جو دوست اپنے کسی اسمبلی ممبر کی وساطت سے اس تحریک کو بل کی صورت میں پیش کروائیں گے ان کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ نذرانہ شکریہ کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔''

اسی سال ان کی طرف سے یہ پیشکش بصورتِ اشتہار الفضل میں شائع ہوئی کہ ''جو صاحب قومی اسمبلی
پاکستان سے .... یہ قانون پاس کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ آئندہ جو کتاب یا اشتہار یا اخبار پاکستان
میں چھپے اس میں بھی جس جگہ خالقِ حقیقی کا ذکر آجائے تو کسی نہ کسی صفت کے ساتھ ضرور ذکر کیا جائے ....
مثلاً خدا تعالیٰ، اللہ تعالیٰ، ربُّ العزت یا مولا کریم یعنی نام خالی نہ ہو ساتھ صفت ضرور ہو اور اگر کسی عربی کتاب کا
ترجمہ اردو وغیرہ زبان میں کیا جائے تو اس کے ترجمہ میں بھی اس کا التزام رکھا جائے اس صاحب کو خاکسار اپنا
مکان واقع محلہ دار الصدر ربوہ جو اس وقت گورنمنٹ کے پاس کرایہ پر ہے جس میں پولیس چوکی ہے دینے کا اقرار
کرتا ہوں جس کی مالیت اندازاً بیس ہزار روپے ہے۔ میں نے صدر انجمن احمدیہ ربوہ .... کو اس بات کا مختار
بنا دیا ہے کہ اس صاحب سے پورا ثبوت لے کر کہ وہ اس قانون کے بنوانے میں کامیاب ہو گئے وہ مکان بجنسہٖ
اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت اس صاحب کو دے دیں۔'' ان کی یہ تحریک اللہ تعالیٰ کی عظمت میں ان کے
غیر متزلزل ایمان کی مظہر ہے۔

مجھے یہ تو یقین تھا کہ مشتہر ہی محولہ بالا چاروں مکانات اور چاروں دکانوں کے مالک ہیں لیکن انہیں
دیکھنے یا ان سے ملاقات کا کبھی موقع نہ ملا اور وہ اسی عرصے میں وفات پا گئے۔

میاں سراج الدین فی الاصل شاہدرہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ۱۸۹۷ء میں اس علاقے کے ایک
زمیندار، میاں خیر الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۱۴ء میں قادیان جا کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے
دستِ مبارک پر بیعت کی۔

اُن کے بیٹے، میاں خلیل احمد مالک بے بی ہاؤس، مال روڈ لاہور کے بیان کے مطابق ''میاں سراج الدین
نے ۱۹۱۴ء میں نیلا گنبد والی مسجد کی ایک دکان کرایہ پر لے کر ''برٹش موٹر ورکس'' کے نام سے سائیکلوں کا کام شروع کیا
تاہم کچھ عرصہ بعد انہیں یہ دکان خالی کرنا پڑی چنانچہ وہ لاہور کینٹ میں گلوب سینما کے پاس منتقل ہو گئے اور رینٹ اے
کار اور گاڑیوں کی مرمت کا کام شروع کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو انہیں کسی وجہ سے لاہور چھوڑ کر ڈیرا ڈون
منتقل ہونا پڑا جہاں وہ قیامِ پاکستان تک رہے۔ انہوں نے وہاں پر بھی پہلے تو سائیکلوں اور موٹر پارٹس کا کام کیا تاہم
۱۹۴۴ء میں یہ کام چھوڑ کر جائیداد کی خرید و فروخت کا کاروبار شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کام میں بہت برکت
دی اور وہ خاصی متموّل زندگی گذارنے لگے۔ اُس وقت ڈیرا ڈون کی جماعت چھوٹی تھی اور اس کے وسائل اپنی بیت کی
تعمیر کے اخراجات کے متحمل نہ تھے۔ والد صاحب نے ڈیرا ڈون کے امیر جماعت، خواجہ غلام نبی کو پیشکش کی کہ اگر
جماعت اپنے بیت کی تعمیر کے لیے کوئی پلاٹ خریدنے کا فیصلہ کرے تو وہ اس کا نصف خرچ برداشت کرنے کو تیار ہیں
چنانچہ وائسرائے روڈ پر بیت الذکر کے لیے پلاٹ خریدا گیا جس کا آدھا خرچ حسبِ وعدہ انہوں نے برداشت کیا۔''

''قیامِ پاکستان کے بعد وہ کیا کرتے رہے؟''

''ہم ستمبر ۱۹۴۷ء میں یہاں آ گئے تھے۔ اباجی نے وائی ایم سی اے بلڈنگ میں ایک دکان کرائے پر لے
لی اور برٹش موٹر ورکس کے نام سے اپنا سابقہ کاروبار شروع کر دیا تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ہمارے کاروبار کی

نوعیت کچھ بدل گئی چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں میرے مشورے سے دکان کا نام بدل کر ''بے بی ہاؤس'' رکھ دیا تھا۔ ہم یہ دکان آج بھی چلا رہے ہیں۔''

''اُن کے دل میں یہ خیال کیسے سمایا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف اللہ کہنا اس کی بے ادبی ہے؟''

''ابا جی بہت مخلص اور جوشیلے احمدی تھے۔ آپ کو شاید اب کوئی یہ بات بتانے والا نہ ملے کہ ۱۹۵۰ء میں لاہور کی کسی اور بیت کا کوئی وجود نہ تھا۔ ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ لاہور تشریف لائے تو دلی دروازے والی بیت میں جمعہ پڑھایا۔ اس وقت دارالذکر یا بیت کے اندر تِل دھرنے کی جگہ نہ رہی اور گلی میں صفیں بچھانا پڑیں۔ چونکہ حضور کی آمد کی وجہ سے لاہور کے اکثر احمدی وہاں اکٹھے ہو گئے تھے لہٰذا تب حضور نے جماعت کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے لیے ایک وسیع تربیت الذکر کا انتظام کریں۔ ابا جی بھی اس جمعہ میں موجود تھے چنانچہ انہوں نے فوری طور پر اس مد میں پانچ ہزار روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا بلکہ یہ پیشکش بھی کہ اگر جماعت چاہے تو وہ یہ رقم نقد بھی ادا کر سکتے ہیں۔''

موصوف نے ستائیس مارچ ۱۹۷۵ء کو اٹھہتر سال کی عمر میں وفات پائی اور ان کی تدفین امانتاً عام قبرستان میں ہوئی۔

میاں سراج الدین کے علاوہ ایک اور شخصیت جن کا ذکر میں اس جگہ کرنا چاہتا ہوں حضرت میاں محمد یامین کی ہے جو قادیان کے پرانے پبلشرز میں سے تھے اور جنہوں نے جماعتی لٹریچر کی وسیع پیمانے پر اشاعت میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ ماسٹر ببلیوگرافی آف احمدیہ لٹریچر پراجیکٹ میں میاں محمد یامین کی طرف سے شائع کردہ کتب کی ایک نامکمل سی فہرست موجود ہے جس کے مطابق انہوں نے کم از کم ۵۴ کتابیں شائع کیں۔

مجھے اب بھی یاد ہے کہ سکول کے زمانے میں ہمیں ادعیۃ القرآن اور ادعیۃ الرسول پر مشتمل جو کتابچے پڑھائے جاتے تھے وہ اِن ہی میاں محمد یامین کے شائع شدہ کردہ تھے۔

حضرت میاں محمد یامین رفیق حضرت مسیح موعود ربوہ کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھیں۔ وہ محلہ دارالرحمت وسطی میں رہائش پذیر تھے۔ جب میں نے انہیں دیکھا وہ عمر کے اس حصے میں تھے جب انسان زیادہ فعال نہیں رہتا مگر اس کے باوجود وہ احمدیہ جنتری باقاعدگی سے شائع کرتے تھے۔ یاد رہے کہ پہلی جنتری ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی جس کے بعد یہ جنتری مسلسل انچاس سال تک شائع ہوتی رہی۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا چنانچہ ۱۹۶۵ء کے آخر میں شائع ہونے والی ۱۹۶۶ء کی جنتری اُن کی زندگی میں چھپنے والی آخری جنتری ثابت ہوئی۔

عام جنتریوں کے برعکس اس جنتری میں نہ تو میلوں ٹھیلوں اور عرسوں کے بارے میں معلومات ہوتی تھیں نہ قسمت کا حال معلوم کرنے کے طریقے، مختلف معاملاتِ زندگی کے لیے تعویذ گنڈے ہوتے نہ زائچہ کھینچنے کی ترکیبات بلکہ یہ تربیتی رہنما کا درجہ رکھتی تھی اور اس میں سلسلہ اور سلسلے کے بزرگان کے حوالے سے بعض انتہائی مفید معلومات درج ہوتی تھیں۔

مجھے پہلی جنتری جو خلافت لائبریری میں موجود ہے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اس میں بعض انتہائی دلچسپ تاریخی معلومات ملتی ہیں۔ اس جنتری سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں بٹالہ سے روزانہ تین ریل گاڑیاں قادیان

آتی تھیں جو گیارہ بجے قبل دوپہر، دو بجے دوپہر اور گیارہ بجے رات پہنچتیں۔ ان گاڑیوں کی بٹالہ کے لیے روانگی چھ بجے صبح، ایک بجے بعد دوپہر اور گیارہ بجے رات ہوتی۔

جنتری سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں بٹالہ ریلوے سٹیشن پر مسافروں کے آرام کے لیے دو سرائیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ منشی عبدالکریم نامی ایک احمدی سٹیشن کے قریب رہائش پذیر تھے اور اسسٹنٹ سیکرٹری انجمن ہائے سلسلہ عالیہ احمدیہ تھے۔ جنتری میں بتایا گیا تھا کہ ضرورت مندان کے پاس ٹھہر سکتے ہیں کیوں کہ ”یہ مخلص دوست نہایت مہربانی اور خلوص سے پیش آتے ہیں اور مہمان کو آرام پہنچاتے ہیں۔“

بٹالہ سے قادیان کے لیے یکہ اور ٹم ٹم بھی مل جاتا تھا جس کا کرایہ آٹھ سے دس آنے وصول کیا جاتا تھا لیکن چونکہ یہ سڑک کچی تھی برسات میں یہی کرایہ بڑھ کر بارہ سے چودہ آنے ہو جاتا تھا۔

اس جنتری کے آخری ایڈیشن تک اس کے پبلشر نے جنتری کے مشمولات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کی۔

حضرت میاں محمد یامین کا تعلق سہارنپور سے تھا۔ اُنہیں اپنی زندگی میں جن حادثات سے واسطہ پڑا ان میں ان کے ایک صاحبزادے، محمد صالح نور اور ایک داماد، قریشی عبدالوحید کی نظام جماعت احمدیہ سے علیحدگی قابلِ ذکر ہیں۔ ظاہر ہے ان حادثات نے ان کی طبیعت پر انتہائی برا اثر ڈالا اور وہ دمِ آخر تک ان دونوں کی جماعت میں واپسی کے لیے کوشاں رہے۔ ان کے صاحبزادے مبین الحق کے ایک مضمون سے جو اُن کی وفات کے کچھ عرصہ بعد الفضل میں شائع ہوا پتا چلتا ہے کہ ”وفات سے ایک دو روز قبل محترم مولوی ابوالعطا صاحب عیادت کے لئے تشریف لائے۔ ان کی موجودگی میں میرے برادرِ خورد یعنی محمد صالح نور کو جو اہل پیغام سے تعلق رکھتا ہے بہت سمجھایا کہ پیغامیوں کے پاس کچھ نہیں رکھا۔ وہ صحیح رستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ وہ ندامت کے ساتھ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ تم فوراً اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور حضرت صاحب کی خدمت میں جا کر معافی مانگو اور بیعت کر کے آؤ اور اس قدر رقت آمیز طریقہ سے سمجھایا کہ خود بھی رو پڑے۔ محترم مولوی صاحب نے والد صاحب کو فرمایا کہ آپ نے اپنا حق ادا کر دیا ہے اور اب آپ خدا تعالیٰ کے نزدیک بالکل بری الذمہ ہیں۔“

اس مضمون سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی وفات سے ایک روز قبل جمعرات کے دن اپنے صاحبزادے کو بتایا تھا کہ ”بعد نماز جمعہ میرا جنازہ ہوگا“ اور یہ کہ ”میرے جنازے کے ساتھ ایک دوسرا جنازہ بھی ہوگا۔“ خدا کی شان دیکھیے، وہ اگلی صبح وفات پا گئے اور ان کے جنازے کے ساتھ ہی رفیق حضرت مسیح موعود حضرت چوہدری سربلند خان کا جنازہ بھی پڑھایا گیا۔ یوں ان کی یہ بات بڑی شان سے پوری ہوئی۔

ان کی وفات پر الفضل نے ان کی جماعتی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا: ”مرحوم نے نصف صدی تک سلسلہ کی بعض کتب لاکھوں کی تعداد میں شائع فرمائیں اور احباب کو فرداً فرداً ان کے گھروں تک پہنچانے کی کوشش فرماتے رہے۔“

سلسلہ کے ان تین بزرگوں کے ذکرِ خیر کے بعد میں ربوہ میں باسکٹ بال، والی بال اور ہاکی کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں ضابطۂ تحریر میں لانا چاہتا ہوں جو شاید بہت سے قارئین کے لیے نئی ہوں گی۔

آپ یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ ربوہ میں باسکٹ بال کی کھیل کا آغاز کب اور کس طرح ہوا تھا۔

اس زمیں پر ضو فشاں ہے زندگی کا آفتاب

۱۹۵۸ء میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی سرپرستی اور تعلیم الاسلام کالج میں فزکس کے پروفیسر نصیر احمد خان کی رہنمائی میں ربوہ میں باسکٹ بال کا کھیل متعارف ہوا اور اس کے لئے تعلیم الاسلام کالج کی چاردیواری کے باہر اُس میدان میں جسے آج کل عرفِ عام میں ''گھوڑ دوڑ کا میدان'' کہا جاتا ہے ایک باسکٹ بال کورٹ تعمیر کی گئی جو شروع میں کچی تھی لیکن بعد میں اسے انٹرنیشنل سٹینڈرڈز کے مطابق پختہ کر دیا گیا۔ اس کھیل کے لئے کھلاڑی تعلیم الاسلام کالج سے لئے گئے اور پہلا آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ جنوری ۱۹۵۹ء کے آخر میں منعقد ہوا جس میں ملک کے طول وعرض سے باسکٹ بال کی بہت سی مشہور ٹیموں نے شرکت کی۔ چونکہ اہالیانِ ربوہ کے لئے یہ ایک نیا کھیل تھا اور کھیل بھی ایسا جس میں بڑی تیزی ہوتی ہے لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے اِسے عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ربوہ میں تفریح کے مواقع یوں بھی کم ہوا کرتے تھے لہٰذا اس ٹورنامنٹ میں عوامی دلچسپی قابلِ دید تھی۔ اس ٹورنامنٹ کا افتتاح حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے کیا جب کہ اختتامی تقریب میں چوہدری محمد ظفر اللہ خان مہمانِ خصوصی تھے۔

یہ ٹورنامنٹ نہایت باقاعدگی کے ساتھ ۱۹۸۳ء تک جاری رہا مگر ۱۹۷۲ء میں تعلیم الاسلام کالج کی نیشنلائزیشن کے بعد اس میں وہ جان باقی نہ رہی جو ۱۹۷۲ء تک اس کا خاصہ تھی۔

ان سالانہ ٹورنامنٹس کے علاوہ ربوہ میں باسکٹ بال کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں انڈین وائی ایم سی اے کی باسکٹ بال ٹیم کی ربوہ آمد اور مقامی ٹیم کے ساتھ ایک نمائشی میچ تھا۔ اس موقع پر اہلِ ربوہ کا جوش وخروش دیدنی تھا اور وہ بہت بے تابی کے ساتھ اس میچ کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ میچ دیکھنے کے لیے کئی ہزار تماشائی جمع تھے جو اس توقع کے ساتھ وہاں آئے تھے کہ انہیں نہ صرف بہت اچھا کھیل دیکھنے کو ملے گا بلکہ ربوہ کی ٹیم بالآخر فتحیاب ہوگی اور اس کے لیے گھر گھر دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

انڈین وائی ایم سی اے کی ٹیم کہنہ مشق کھلاڑیوں پر مشتمل تھی اور اس کے تین کھلاڑی تو انڈیا کی قومی ٹیم کے رُکن تھے۔ اس کے مقابلہ پر ربوہ کی ٹیم تعلیم الاسلام کالج کے نوآموز کھلاڑیوں پر مشتمل تھی جن میں سے کسی کو اُس وقت تک ملکی حتّٰی کہ صوبائی سطح پر بھی کھیلنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس ٹیم کے کپتان لطیف حشمت تھے جو چوہدری غلام مرتضےٰ، وکیل القانون تحریک جدید انجمن احمدیہ کے منجھلے صاحبزادے ہیں اور آج کل اسی دفتر میں وکیل المال ثالث کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ باقی احمدی کھلاڑیوں میں سعید احمد ابن چوہدری محمد بوٹا آف سیالکوٹ ہاؤس، غلہ منڈی، ربوہ؛ سراج الحق قریشی ابن فضل حق قریشی، ربوہ اور ضلع سیالکوٹ کے ظہور احمد شاہ

تھے۔ سعید نے بعد میں فوج میں کمیشن حاصل کر لیا اور میجر کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد واقفِ زندگی کے طور پر ربوہ کے مرکزی دفاتر میں خدمت بجالاتے رہے ہیں۔ ظہور احمد ضلع سیالکوٹ کے رہائشی تھے اور وہیں کہیں مقیم ہیں۔ دیگر کھلاڑیوں میں سے ایک خالد احمد تاج تھے جو ربوہ پوسٹ آفس کے سپرنٹنڈنٹ، تاج محمد کے صاحبزادے تھے اور ایک اطلاع کے مطابق آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔ دوسرے کھلاڑی طارق باجوہ تھے۔

یوں تو ربوہ نے باسکٹ بال کے کئی اور نامور کھلاڑی بھی پیدا کئے مگر مندرجہ بالا کھلاڑیوں میں سے لطیف جھمٹ، سعید اور سراج الحق میرے دوستوں میں سے ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً ربوہ میں باسکٹ بال اور علی الخصوص اس میچ کے حوالہ سے بعض دلچسپ واقعات سناتے رہتے ہیں۔

''ہم اپنے آپ کو جسمانی طور پر فٹ رکھنے کے لیے اپنے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کیا کرتے تھے'' سعید نے ایک بار مجھے بتایا ''یہ ہمارا روز کا معمول تھا لیکن جب ہمیں کوئی اہم مقابلہ درپیش ہوتا تو ہم اس معاملہ میں کسی قسم کی سُستی نہ کرتے اور بھلے کوئی اور کھلاڑی مالش کرے یا نہ کرے، میں اور سراج ضرور ایک دوسرے کی مالش کرتے تھے۔ انڈین وائی ایم سی اے کی باسکٹ بال ٹیم کے دورۂ ربوہ کے موقع پر زراعتی کالج کے دو کھلاڑی بھی ربوہ آئے ہوئے تھے۔ ہم میچ والی صبح دارالضیافت میں اکٹھے تھے۔ جب ہم نے ایک دوسرے کی مالش شروع کی تو انہوں نے قدرے تعجب کا اظہار کیا۔ تب ہم نے انہیں بتایا کہ ہم ہر اہم میچ سے پہلے یہ اہتمام ضرور کرتے ہیں اور مالش کے بعد چادر لے کر کچھ دیر کے لیے خاموشی کے ساتھ لیٹ جاتے ہیں تا کہ اپنی انرجی میچ کے لیے مجتمع کر سکیں۔ ہم میچ سے دو گھنٹے پہلے اُٹھ کر تازہ پانی سے غسل کرتے ہیں تا کہ جسم کھل جائے اور پھر پیدل کورٹ جاتے ہیں تا کہ میچ سے پہلے وارم اَپ ہو جائیں۔ اس پر ان لڑکوں نے بتایا کہ مارکیٹ میں ایک تیل ملتا ہے جس کی مالش زیادہ مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔ انہوں نے ہمیں اس کا نام لکھوا دیا چنانچہ ہم نے اسی وقت ایک آدمی کو بازار بھجوایا اور وہ ایکمسٹس سے اس تیل کی ایک شیشی لے آیا۔ ان لڑکوں نے بتایا کہ یہ تیل ذرا ''سخت'' ہے لہٰذا اس میں سرسوں کا تیل ملا کر مالش کی جائے۔ ہم نے ان کے کہنے کے مطابق اس تیل سے مالش کر لی لیکن میں نے گراؤنڈ پہنچ کر محسوس کیا کہ میرے جسم میں ایک خاص قسم کی اکڑاہٹ پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے اس کیفیت کو کوئی غیر معمولی اہمیت نہ دی۔ ہم میچ سے پہلے پنتیس چالیس منٹ تک وارم اَپ ہوئے۔ اس کے باوجود بھی میرا جسم نہ کھلا جس پر مجھے فکر ہوئی لیکن اُس وقت میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔''

''یہ میچ ربوہ کی تاریخ میں ایک بہت بڑا ایونٹ تھا جسے دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ پہنچے ہوئے تھے'' سعید کی باتیں جاری تھیں ''کالج کی طرف سے سنٹرل باسکٹ بال ایسوسی ایشن اور پاکستان باسکٹ بال فیڈریشن کے عہدیداروں کو بھی ربوہ مدعو کیا گیا تھا۔ وہ سب بھی موجود تھے لہٰذا ہمیں اپنی کارکردگی کی بہت فکر تھی۔ بہر حال میچ شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے انڈین وائی ایم سی اے کی ٹیم کھیل پر چھا گئی۔ اس کے کھلاڑی دائیں سے آتے اور سکور کر کے چلے جاتے، پھر وہ بائیں سے آتے اور سکور کر کے چلے جاتے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہماری ٹیم ان کے کسی حملے کے خلاف کامیاب دفاع نہ کر سکی۔ ہم پریشان تھے کہ ان کا سکور اٹھارہ ہو چکا ہے اور ہم صفر پر

پھنسے ہوئے ہیں۔ اُس وقت میں نے مایوسی کے عالم میں کافی دور سے بال کو پتھر کی طرح بورڈ پر پھینکا لیکن وہ تختہ سے لگ کر واپس آنے کی بجائے رِنگ میں سے گذر کر نیچے گر گیا۔ یہ ہمارا پہلا پوائنٹ تھا جس پر مجمع میں ایک ہیجان پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اس وقت میرا جسم یکدم کھلا اور پھر ہمارے پوائنٹس بننے لگے لیکن انڈین ٹیم شروع میں جو لیڈ لے گئی تھی ہم اسے آخر تک برابر نہ کر سکے اور اس نے یہ میچ واضح برتری کے ساتھ جیت لیا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ ان کے ۴۷ پوائنٹس کے مقابلہ میں ہمارے صرف ۴۳ پوائنٹس تھے۔ اس میں سے سب سے زیادہ سکور خالد تاج کا تھا۔''

''اچھا یہ بتائیں کہ آپ کے جسم میں اکڑاہٹ کا سبب کہیں یہ تیل تو نہ تھا؟''

''جی جیسا کہ ہمیں بعد میں پتا چلا یہی تیل میرے جسم میں اکڑاہٹ کا سبب بنا تھا۔ دراصل یہ تیل گھوڑوں کی مالش کے لیے تھا اور ہم اس میں سرسوں کا تیل مطلوبہ مقدار میں نہ ملا سکے تھے جس کی وجہ سے میرا جسم اکڑ گیا تھا۔''

''کیا اسے ان لڑکوں کی ''سازش'' سے تعبیر تو نہیں کیا جا سکتا؟''

''نہیں وہ لڑکے باسکٹ بال کے کھلاڑی تھے، ربوہ آتے جاتے رہتے تھے اور حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور نصیر خان صاحب کی شفقتوں کے مورد رہتے تھے لہٰذا ہم ان کی نیّت پر شبہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک غیر ارادی غلطی تھی جس کا ہمیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔''

''انڈین وائی ایم سی اے ٹیم کی ربوہ وِزٹ کے حوالے سے کوئی اور یاد؟''

''یوں تو ربوہ کی ٹاؤن کمیٹی نے بھی انڈین ٹیم کو استقبالیہ دیا تھا لیکن میچ کے بعد اس ٹیم کے لیے ربوہ میں جو تقریبات منعقد ہوئیں ان میں سے ایک عصرانہ تھا جو تعلیم الاسلام ہائی سکول کی طرف سے دیا گیا اور ایک عشائیہ تھا جو تعلیم الاسلام کالج کی طرف سے پیش کیا گیا۔ سکول کے عصرانے کی ایک خاص بات جو مجھے اب بھی یاد ہے مبارک عابد کی نظم تھی جو بہت پسند کی گئی۔''

سعید کو تو اس نظم کا کوئی شعر یاد نہ تھا البتہ بعد میں مبارک عابد نے بتایا: ''یہ ایک طویل نظم تھی جس میں ہندوستانی ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کے نام استعمال کئے گئے تھے۔ وہ نظم کہیں شائع نہیں ہو سکی نہ اب میرے پاس موجود ہے لیکن اس کے دو شعر میرے حافظے میں ابھی تک محفوظ ہیں جو کچھ اس طرح تھے:

آئے ہیں وہ کھیلنے کو میچ مسٹر رام ناتھ
آنجایا ، جان و ولیم بھی ہیں ان کے ساتھ ساتھ
کامیابی ہر جگہ پر اُن کو اب بھگوان دے
دے وہ ان کو کامیابی اور عظیم الشان دے''

اس نظم نے سعید کو یاد دلایا کہ اس میچ میں انڈیا کی طرف سے سب سے زیادہ سکور ولیم لک نے ہی کیا تھا۔

''اس میچ کی کوئی اور یاد؟''

''رات کے وقت تعلیم الاسلام کالج میں کھانا تھا۔ اس سے پہلے دونوں ٹیموں کے کپتانوں نے اس میچ کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کرنا تھا۔ ہماری ٹیم کے کپتان لطیف جھمٹ تھے۔ وہ ایک اچھے کھلاڑی تو ضرور تھے لیکن انہیں فنِ تقریر پر دسترس حاصل نہ تھی۔ بات بھی انگریزی میں کرنا تھی جس کا اُس وقت تک انہیں کوئی تجربہ نہ تھا لہٰذا وہ کچھ گھبرا سے گئے۔ بہرحال وہ کھڑے ہوئے اور ایک دو فقرے بول کر بیٹھ گئے۔ ان کی تقریر کی خوبصورتی یہ تھی کہ ان کے اتنا قریب ہونے کے باوجود ہم بھی انہیں سمجھ نہ پائے۔''

لطیف سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے کہا: ''سعید نے آپ کو بالکل صحیح بتایا ہے میں نے زندگی میں کبھی تقریر نہ کی تھی اس لیے میرا گھبرا جانا قدرتی امر تھا۔ اُوپر سے انگریزی بولنی ہم میں سے کتنوں کو آتی تھی۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سب کا شکریہ ادا کیا اور جان چھڑا کر سٹیج سے نیچے اُتر آیا۔''

سعید کے پاس باسکٹ بال کے حوالے سے اور بھی کئی خوبصورت یادیں ہیں جنہیں وہ اپنے دوستوں کے سامنے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ''ایک بار ہم انٹر یونیورسٹی ٹورنامنٹ کھیلنے کے لیے پشاور گئے ہوئے تھے'' وہ بتاتے ہیں'' ہماری ٹیم میں سید محمود اللہ شاہ سابق ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کے صاحبزادے مشہود المعروف چھودی بھی شامل تھے۔ ہم اس ٹورنامنٹ کے فائنل میں پہنچ گئے اور ہمارا میچ پشاور یونیورسٹی سے تھا۔ جب ہم اس میچ کی تیاری کر رہے تھے تو میں نے اچانک محسوس کیا کہ مشہود گراؤنڈ میں موجود نہیں ہیں۔ میں نے انہیں تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا چنانچہ میں نے انہیں آواز دی تو وہ آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ پریکٹس کیوں نہیں کر رہے تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک دو زوردار شاٹس لگائیں تو پشاور یونیورسٹی کے کسی نوجوان نے انہیں کمانی دار چاقو دکھا کر دھمکی دی کہ اگر وہ یہ میچ کھیلیں گے تو وہ اس چاقو سے ان کا پیٹ پھاڑ دے گا لہٰذا وہ یہ میچ کھیلنے کو تیار نہیں۔ میں نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ یہ محض گیدڑ بھبکی ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن وہ ہماری بات سننے کو تیار نہ تھے۔ یوں ہمیں یہ میچ ان کے بغیر ہی کھیلنا پڑا۔''

وہ مزید بتاتے ہیں: ''اُن ہی دنوں مجھے شدید بخار ہو گیا۔ ہم خیبر میل کے ذریعہ لاہور اور وہاں سے ربوہ پہنچے تو میری طبیعت بدستور خراب تھی۔ اس سے اگلے دن ہمارا آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ شروع ہونے والا تھا چنانچہ ہم نے سیدھے نصیر خاں صاحب کو رپورٹ کی۔ اس وقت ہماری فرسٹ فائیو میں سے تین کھلاڑی ''پھٹڑ'' تھے۔ مجید ربوہ میں پریکٹس کے دوران ٹھوڑی پر چوٹ کی وجہ سے زخمی تھے، لطیف ایک میچ کے دوران بال کو غلط طریقے سے ہینڈل کرنے کی وجہ سے اپنے انگوٹھے پر چوٹ لگوا بیٹھے تھے اور میرا جسم بخار سے پُھنک رہا تھا۔ اسی دوران حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد گراؤنڈ میں آئے تو نصیر خاں صاحب نے آپ کو ہماری کیفیت سے آگاہ کیا۔ اس پر آپ نے مسکرا کر فرمایا: فکر کی کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ان کے لیے ابھی دوا بھجواتا ہوں۔

ہم جانتے تھے کہ میاں صاحب ہمیں کوئی ہومیو پیتھک دوا بھجوائیں گے جسے ہم مذاق میں ''سانپ کے

انڈے'' کہا کرتے تھے اور ہوا بھی ایسے ہی لیکن اس دوا نے فوری اثر دکھایا اور کم از کم میرا بخار اُتر گیا۔

اگلے روز ٹورنامنٹ شروع ہوا۔ افتتاحی میچ دیکھنے کے لیے سٹیج پر حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، حضرت مولوی محمد دین، سید میر داؤد احمد، مولانا ابوالعطا جالندھری، مولوی احمد خاں نسیم اور دیگر کئی بزرگان تشریف فرما تھے۔ میں ایک طرف کھڑا میچ دیکھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک لڑکے نے مجھے آ کر پیغام دیا کہ میاں صاحب مجھے بلا رہے ہیں۔ میں گیا تو آپ نے فرمایا: وہ گھڑا دیکھ رہے ہو نا؟ جاؤ اور گلاس اچھی طرح دھو کر اس میں سے پانی بھر لاؤ۔ میں نے تعمیل کی اور پانی لے کر گیا تو میاں صاحب نے اپنی اچکن کی جیب میں سے ایک ڈبیہ نکال کر اس کے اندر سے ایک شیشی نکالی۔ اس شیشی میں کوئی پاؤڈر تھا جس کا ایک چمچہ انہوں نے اس گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا: اسے پی جاؤ۔

میری طرف سے ذرا تامل ہوا تو آپ نے فرمایا: اب پی بھی لو۔ میں نے وہ شربت پی لیا جو کسی پھل کا جوس معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے مجھ سے پوچھا: کیسا لگا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا: بہت اچھا۔ تب آپ نے فرمایا: جاؤ! گلاس دھو کر اور پانی لاؤ۔ میں نے تعمیل کی۔ میاں صاحب نے اس میں وہی پاؤڈر ملایا۔ میں نے سمجھا کہ یہ گلاس بھی میرے لیے ہے لیکن میاں صاحب نے وہ گلاس اپنے منہ سے لگا لیا اور فرمایا: ''یہ شربت میرے لیے ہے۔''

سعید اور لطیف جھمٹ کے علاوہ ربوہ کے اُس زمانے کے باسکٹ بال کے دو اور مشہور کھلاڑی مجید چوہدری اور نصیر بُندہ تھے۔

مجید چوہدری غلام حسین اوورسیئر سابق افسر تعمیرات، صدر انجمن احمدیہ کے بیٹے تھے۔ وہ سکول میں مجھ سے ایک یا دو سال سینئر تھے اور اس لحاظ سے میرے ہمعصر۔ میری ان سے دوستی نہ سہی، جان پہچان ضرور تھی۔ اُس زمانے میں ربوہ میں باسکٹ بال کا کھیل عروج پر تھا چنانچہ تعلیم الاسلام کالج نے جو اچھے کھلاڑی پیدا کئے ان میں مجید بھی شامل تھے۔ انہیں مختلف ٹورنامنٹس میں پنجاب کی نمائندگی کرنے کا موقع ملتا رہا تاہم بدقسمتی سے ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی اور وہ عملی زندگی میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے پہلے ''برقیات'' کے نام سے اور پھر ''احمد بردرز'' کے نام سے ریلوے روڈ پر بجلی کے سامان کا کاروبار کیا جو میرے علم کے مطابق زیادہ نہ چل سکا۔ انہیں شوگر ہو گئی تھی جس سے ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ اگست ۱۹۸۸ء میں وفات پا گئے۔

کم و بیش یہی کیفیت نصیر بُندہ کی تھی۔ انہیں بھی پنجاب کی سطح پر کھیلنے کا موقع تو مل گیا لیکن وہ پڑھائی میں پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے ''البرق'' کے نام سے بجلی کے سامان کی دکان شروع کی۔ یہ دکان مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے دفاتر کے بالمقابل ہوا کرتی تھی لیکن میرے اندازے کے مطابق مجید کی طرح انہیں بھی کاروبار میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو پائی۔

نصیر بُندہ مجھ سے ہمیشہ بہت تپاک سے ملا کرتے تھے لیکن جب وہ لمبا عرصہ تک نظر نہ آئے تو مجھے فکر ہوئی۔ ایک مقامی دوست سے ان کا پتا کرنے کی درخواست کی تو معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا نقل مکانی کر گئے تھے،

ایک بار ربوہ آئے تو اچانک وفات پا گئے اور جدید بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ وہ اس مقبرے کے اوّلین
مدفونین میں سے ہیں۔

وہ نصیر احمد سے نصیر بُندہ کس طرح بنے، اس کا پس منظر سعید کی زبانی سنیئے۔ وہ بتاتے ہیں: ''میں نے تو
کالج پہنچ کر باسکٹ بال کھیلنا شروع کیا لیکن کچھ ایسے طلبہ بھی تھے جنھیں سکول کے زمانے سے باسکٹ بال کھیلنے کا
موقع مل رہا تھا۔ ان میں سے ایک نصیر احمد بھی تھے جنہوں نے ۱۹۶۰ء میں میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا
تھا۔ ان کا قد چھوٹا اور جسم قدرے بھاری تھا لیکن تھا بے حد پھرتیلا۔ وہ رائٹ سائیڈ پر فارورڈ کی پوزیشن پر کھیلا
کرتے تھے۔ شاٹ لگانے کا ان کا اپنا مخصوص انداز تھا اور وہ بڑے ''پُٹھے'' سے ہاتھ کے ساتھ sneak کرتے
ہوئے شاٹ لگاتے اور بالعموم سکور حاصل کرنے میں کامیاب رہتے۔''

''میں نے بھی محسوس کیا کہ اس کا جسم قدرے فربہ تھا۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکی کہ باسکٹ بال کھیلنے
کے باوجود ان کا جسم بھاری کیوں تھا؟''

''میرے علم کے مطابق انہیں ایک بار ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا اور ان کا موٹاپا اسی بیماری کا شاخسانہ تھا۔ میں
انہیں کہا کرتا تھا کہ وہ ایکسر سائز کبھی نہ چھوڑیں کیوں کہ اگر کبھی ایسا ہوا تو موٹاپے کے ساتھ ساتھ انہیں کئی طرح
کے دیگر عوارض گھیر لیں گے۔''

''ان کا نام بُندہ کیسے پڑا؟''

''جس زمانے میں وہ کالج میں داخل ہوئے روم اولمپکس میں ہاکی کے فائنل میچ میں پاکستان کے
نصیر بُندہ نے ڈرامائی انداز میں ایک گول کر کے پاکستان کو فتح سے ہمکنار کر دیا تھا اور اس کا بہت چرچا تھا۔ ایک
دفعہ جب نصیر نے کسی میچ میں زوردار شاٹ لگائی تو کسی تماشائی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ''اوئے بُندے! کی
شاٹ لائی اے۔'' بس اس دن سے وہ نصیر بُندہ کے نام سے پہچانے جانے لگے۔''

''ان کا کوئی خاص واقعہ؟''

''بہت سے واقعات ہیں۔ ایک بار جب ہم اسلامیہ کالج لاہور کے ساتھ زراعتی کالج فیصل آباد میں
فائنل میچ کھیل رہے تھے نصیر بُندہ ان کے ایک کھلاڑی، نصر بدرالدِّین کے ہاتھ سے بال چھیننے میں کامیاب ہو
گیا۔ نصر بدرالدِّین بہت اونچا کھلاڑی تھا جو اُس وقت بھی پاکستان ٹیم میں شامل تھا۔ بُندے کی اس کامیابی پر
انہیں تماشائیوں سے بے پناہ داد ملی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ پورا میدان خالی پڑا ہے اور بُندہ بہ آسانی سکور کر
سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں وہ شوخی میں آ گئے۔ انہوں نے ایک پاؤں زمین پر مارا، پھر دوسرا پاؤں مارا اور شاٹ
لگانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ان کی یہ مُوو کامیاب ہونے والی نہیں۔ ہم انہیں خبردار کرنا
چاہتے تھے لیکن نصیر خاں صاحب تو رہ نہ سکے اور کھیل کے قواعد کے خلاف کورٹ کے اندر گھس گئے۔ وہ زوردار
آواز میں کہہ رہے تھے۔ ''اوئے بُندے بدمعاش!'' نصیر خان صاحب کا کورٹ کے اندر گھسنا ٹیکنیکل فاؤل کے
مترادف تھا لہٰذا ان کے اسسٹنٹ اسلم قریشی ان کے کپڑے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ خیر بُندے نے

شاٹ لگائی لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بُندہ یہ سکور تو نہ کر سکے لیکن ہم نے میچ جیت لیا۔
یہ ہمارے کالج کو باسکٹ بال میں حاصل ہونے والی پہلی ٹرافی تھی چنانچہ ہم واپس پہنچ کر سیدھے پرنسپل
صاحب کے پاس حاضر ہوئے تاکہ ان کو یہ ٹرافی پیش کی جا سکے۔ نصیر خاں صاحب ہم سے پہلے وہاں پہنچ کر
پرنسپل صاحب کو ساری کہانی سنا چکے تھے۔ پرنسپل صاحب کے دفتر میں کچھ کھلاڑی میرے دائیں کھڑے ہو گئے
اور کچھ بائیں۔ میں نے ان کا تعارف پرنسپل سے کرایا۔ نصیر کی باری آئی تو حضرت میاں صاحب نے فرمایا: اچھا
یہ ہے بُندہ بدمعاش!"

اب ایک اور واقعہ سن لیجئے۔ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ ہمارے کالج کا میچ مرے کالج سیالکوٹ کی ٹیم سے
تھا۔ میں اور لطیف جھمٹ اُس وقت کالج چھوڑ چکے تھے لیکن یہ میچ دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہم مرے کالج
کی ٹیم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ ایک کمزور ٹیم تھی لیکن اُس روز سکور پر سکور کئے جا رہی تھی۔ مجھے یاد ہے ان کا
سکور ۲۰ یا ۲۲ پر پہنچ چکا تھا جب کہ ہم ابھی صفر پر رُکے ہوئے تھے۔

یہ ایک تشویشناک صورتِ حال تھی چنانچہ ہم نے ریفری سے ٹائم آؤٹ لیا۔ اُس وقت باسکٹ بال کے
انچارج چوہدری محمد علی تھے۔ انہوں نے اپنے انداز میں کھلاڑیوں کو سمجھایا۔ خدا کا شکر ہے ہماری ٹیم نے بہتر کھیل
کا مظاہرہ کیا۔ اس میچ میں نصیر بُندہ کا ذاتی سکور اڑتالیس تھا جب کہ اُس وقت پاکستان کے کسی بھی کھلاڑی کا
سب سے زیادہ انفرادی سکور بیالیس تھا۔ نصیر بُندہ نے انفرادی سکور کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

یہ میچ ہم نے جیت لیا اور بڑی شان سے جیتا۔ ہمارا سکور نوّے سے اوپر تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ریفری نے
یہ میچ دو تین منٹ پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ہماری ٹیم نے سو یا اس سے زیادہ سکور بنا لیا تو یہ بھی ایک
ریکارڈ ہوگا جو اسے کسی صورت قابلِ قبول نہ تھا۔

یہ تھے نصیر بُندہ!"

باسکٹ بال کے ان چنیدہ کھلاڑیوں کے بعد اب کچھ ذکر سراج الحق قریشی کا جنہیں خدا تعالیٰ نے کھیل کے
میدان میں بعض قابلِ رشک کامیابیوں سے نوازا ہے چنانچہ وہ ایک اچھے ایتھلیٹ ہونے کے علاوہ فٹ بال اور
کبڈی بھی کھیلتے رہے ہیں تاہم ان کے اصل جوہر باسکٹ بال میں کھلے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے وہ
انڈین وائی ایم سی اے باسکٹ بال ٹیم کے خلاف کھیلنے والی ربوہ کی باسکٹ بال ٹیم کے رکن تھے۔ وہ بعض اور اہم
میچوں میں بھی تعلیم الاسلام کالج کی طرف سے کھیلتے رہے ہیں۔

موصوف کے متعلق قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے تکمیلِ تعلیم کے بعد بھی باسکٹ بال کے ساتھ اپنی
وابستگی قائم رکھی جو آج تک قائم ہے چنانچہ انہوں نے کئی سال تک نیشنل باسکٹ بال چیمپئن شپ میں سنٹرل زون
پنجاب، لاہور ڈویژن، سرگودھا ڈویژن اور ملتان ڈویژن کی نمائندگی کی۔ انہوں نے ۱۹۷۵ء میں باسکٹ بال
ریفری کا امتحان اے گریڈ میں پاس کیا اور کئی سال تک نیشنل باسکٹ بال چیمپئن شپ میں ریفری کے فرائض ادا
کئے ہیں۔ انہیں ۱۹۸۹ء میں ایران میں منعقد ہونے والے انٹرنیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں بطور ریفری

۱۹۹۲ء میں بنگ کاک میں منعقد ہونے والے باسکٹ بال ریفریز انسٹرکٹرز کورس میں پاکستان کی نمائندگی اور ۲۰۰۸ء میں مسرور انٹرنیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ، لندن میں ریفری کے فرائض انجام دینے کا موقع مل چکا ہے۔ وہ برسوں پاکستان باسکٹ بال ریفریز بورڈ کے ممبر اور سیکرٹری؛ پنجاب باسکٹ بال ریفریز بورڈ کے سیکرٹری اور راولپنڈی ڈویژن باسکٹ بال ایسوسی ایشن کے چیئرمین کی ذمہ داریاں بھی ادا کر چکے ہیں۔ محکمہ تعلیم کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ۲۰۰۱ء میں اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ انہیں نائب ناظر ضیافت اور نائب افسر جلسہ سالانہ مقرر کیا گیا اور وہ تب سے اس حیثیت میں جماعت کی خدمت میں مصروف ہیں۔

''جب میں کالج میں داخل ہوا تو میں فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے بھائی، ضیاء الحق قریشی کالج فٹ بال ٹیم کے کیپٹن تھے لیکن اس کا اصل سبب یہ تھا کہ اُس وقت تک تعلیم الاسلام کالج میں باسکٹ بال کے کھیل کا اجرا نہیں ہوا تھا'' سراج نے ایک بار مجھے بتایا۔

''آپ باسکٹ بال کی طرف کب آئے؟'' میں نے اُن سے سوال کیا ''مجھے یاد پڑتا ہے کہ ربوہ کی جس ٹیم نے انڈین وائی ایم سی اے کی باسکٹ بال ٹیم کے خلاف میچ کھیلا تھا اُس میں آپ بھی شامل تھے۔''

''جب کالج میں باسکٹ بال شروع ہوا اور آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹس کی وجہ سے کالج کے طلبہ میں اس کھیل کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تو میری توجہ بھی اس طرف ہونے لگی اور میں باسکٹ بال کورٹ کے پاس سے گذرتے ہوئے کبھی کبھی رُک کر کچھ دیر کھیل لیتا تھا۔ اللہ نے کرم کیا۔ آہستہ آہستہ مجھے اس کھیل میں خاصی شُد بُد ہوگئی اور یوں مجھے انڈین وائی ایم سی اے باسکٹ بال ٹیم کے خلاف کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس میچ کے حوالے سے مجھے اب بھی بعض باتیں واضح طور پر یاد ہیں۔ نصیر خان صاحب نے اس اہم انٹرنیشنل سطح کے مقابلہ کے لیے سب سے پہلے ربوہ کی باسکٹ بال کورٹ کو انٹرنیشنل معیار کے مطابق تیار کروایا اور اس کے بعد ربوہ، لائل پور، سرگودھا اور سیالکوٹ کے کھلاڑیوں کو تربیتی کیمپ میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ پہلے مرحلہ میں تقریباً چالیس کھلاڑی تربیت کے لیے منتخب کئے گئے۔ دوسرے مرحلہ میں ان میں سے چوبیس کھلاڑی چُنے گئے۔ اس کے بعد تیسرے مرحلہ میں ان میں سے چھ کھلاڑی ڈراپ کر دیئے گئے اور بالآخر چوتھے اور آخری مرحلہ میں ٹیم کے بارہ کھلاڑی منتخب کئے گئے۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے میں بھی ان بارہ منتخب کھلاڑیوں میں شامل تھا۔''

''تعلیم الاسلام کالج میں باسکٹ بال کے حوالے سے کوئی قابلِ بیان واقعہ؟''

''۱۹۶۲ء میں کالج کی باسکٹ بال ٹیم نے چوہدری محمد علی کی زیرِنگرانی پنجاب یونیورسٹی باسکٹ بال چیمپیئن شپ میں شرکت کی اور سیمی فائنل میں پہنچ گئی۔ یہ میچ مرے کالج سیالکوٹ کے ساتھ ہونا تھا۔ میچ والی رات جب چوہدری صاحب میچ کے حوالے سے اپنی حکمتِ عملی طے کر رہے تھے تو انہیں مشورہ دیا گیا کہ چونکہ مرے کالج کی ٹیم میں قومی سطح کے دو دراز قد، تیز رفتار اور تجربہ کار کھلاڑی شامل ہیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ انہیں روکنے کے لیے ربوہ سے سراج الحق قریشی کو منگوایا جائے۔ چوہدری محمد علی ان ہی دنوں کالج باسکٹ بال ٹیم کے انچارج

مقرر ہوئے تھے اور وہ مجھے پوری طرح نہیں جانتے تھے تاہم ٹیم کے بعض اراکین کے اصرار پر انہوں
نے اسی وقت حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے نام ایک مراسلہ لکھ کر ایک کھلاڑی، رشید احمد کے ذریعہ
ربوہ بھجوادیا جس میں مجھے فوری طور پر لاہور بھجوانے کی درخواست کی گئی تھی۔
اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس میچ میں میری کارکردگی بہت نمایاں رہی اور میں مرے کالج کی ٹیم جو گزشتہ
سال کی یونیورسٹی چیمپئن تھی کے دو اہم کھلاڑیوں، ڈینیل اور سیموئیل کا دفاع کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ میچ ہماری ٹیم
نے چھتیس کے مقابلے میں انتالیس سکور سے جیت لیا اور میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس جیت میں اللہ تعالیٰ کے فضل
کے بعد میرا بڑا رول تھا۔''

''آپ ٹی آئی کالج کی باسکٹ بال ٹیم کے باقاعدہ رکن یا کیپٹن تو نہیں رہے نا؟''

''میں ٹیم کا رکن رہا بھی ہوں اور نہیں بھی رہا۔ کیپٹن رہا بھی ہوں اور نہیں بھی رہا لیکن یہ ایک لمبی داستان
ہے جو میں کسی فارغ وقت میں آپ کو سناؤں گا۔ فی الحال تو مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ باسکٹ بال کا ایک
اچھا کھلاڑی ہونے اور ۱۹۶۱ء میں وائی ایم سی اے انڈیا کے خلاف ربوہ کی ٹیم کا رکن ہونے کے باوجود میں بورڈ یا
یونیورسٹی کی ٹیم میں شامل نہیں رہا تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور باسکٹ بال کی پریکٹس جاری رکھی۔ تکمیل تعلیم
کے بعد جب میں میاں چنوں کالج میں بطور لیکچرر تدریسی فرائض سرانجام دے رہا تھا میں پنجاب کی باسکٹ بال
ٹیم میں منتخب ہونے کے لیے ٹرائلز میں شامل ہوا۔ خدا کا فضل سمجھئے مجھے اس ٹیم کے لیے منتخب کرلیا گیا اور پھر میں
مسلسل تین سال تک پنجاب کے منتخب کھلاڑی کی حیثیت سے نیشنل باسکٹ بال چیمپئن شپس اور پاکستان اولمپکس
میں حصہ لیتا رہا۔ ۱۹۶۹ء میں پاکستان باسکٹ بال فیڈریشن اور پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے فیصلہ کے
مطابق نیشنل باسکٹ بال چیمپئن شپ میں صوبائی ٹیموں کی بجائے ڈویژنل ٹیموں کو شرکت کی اجازت دی گئی
چنانچہ اس کے بعد میں ۱۹۷۶ء تک ملتان، لاہور اور سرگودھا ڈویژن کی باسکٹ بال ٹیموں کے رکن کی حیثیت
سے نیشنل باسکٹ بال چیمپئن شپس میں شرکت کرتا رہا۔''

''آپ اے گریڈ نیشنل اور انٹرنیشنل ریفری بھی تو ہیں؟''

''جی ہاں! میں نے ۱۹۷۵ء میں پاکستان باسکٹ بال فیڈریشن نیشنل ریفری کے امتحان میں کامیابی
حاصل کر کے نیشنل اے گریڈ ریفری کا اعزاز حاصل کیا اور ۱۹۷۷ء میں مجھے سرگودھا میں نیشنل باسکٹ بال
چیمپئن شپ کے موقع پر پہلی مرتبہ ریفری کے فرائض ادا کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۳ء
تک مسلسل سات سال سیکنڈری بورڈز، پنجاب یونیورسٹی، انٹر یونیورسٹیز، بین الصوبائی اور نیشنل چیمپئن شپس،
پاکستان اولمپکس اور بعض انٹرنیشنل باسکٹ بال مقابلہ جات میں بطور ریفری اور آفیشل کام کرنے کا موقع
ملا۔ یہی نہیں خدا تعالیٰ نے مجھ پر مزید فضل کیا اور مجھے پاکستان باسکٹ بال فیڈریشن کے انتخابات میں
پاکستان باسکٹ بال ریفریز بورڈ کا ممبر منتخب کرلیا گیا اور میں کئی سال تک اس کا سیکرٹری بھی رہا۔''

''ماشاء اللہ! کیا آپ کو اس حیثیت میں ملک سے باہر جانے کا موقع بھی ملا؟''

''۱۹۸۹ء میں اسلامی جمہوریہ ایران میں اسلامی انقلاب کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ایران میں ایک انٹرنیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد ہوا تو مجھے پاکستان کی قومی باسکٹ بال کے ہمراہ بطور ریفری وہاں جانے کا موقع ملا۔ اس ٹورنامنٹ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اس وقت کے ورلڈ باسکٹ بال چیمپیئن روس، ایشیائی باسکٹ بال چیمپیئن چین اور ساؤتھ ایشین باسکٹ بال چیمپیئن بھارت کی ٹیموں کے علاوہ سری لنکا، پاکستان اور بعض دیگر اہم علاقائی ٹیمیں بھی شامل تھیں۔ اس ٹورنامنٹ کے بعض میچوں بالخصوص کوارٹر فائنل اور سیمی فائنل میچوں میں ریفری کے فرائض ادا کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی جو الحمدللہ میں نے پوری پیشہ ورانہ دیانتداری سے ادا کی۔''

''اس ٹورنامنٹ کا کوئی یادگار واقعہ؟''

''ایک میچ کو سپروائز کرنے کے لیے دو ایرانی ریفریز مقرر تھے جب کہ میں ایک تیسرے ایرانی ریفری کے ہمراہ یہ میچ دیکھنے کے لیے سٹیڈیم میں بیٹھا ہوا تھا۔ دوران میچ دونوں ریفریز نے بعض غلط فیصلے دیئے۔ ہماری پچھلی نشستوں پر جناب ڈووے ڈوف، چیئرمین یورپین باسکٹ بال ریفریز بورڈ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہم دونوں کو ان ریفریز کی غلطیوں پر گفتگو کرتے ہوئے سن لیا اور محسوس کیا کہ ہمارا نقطۂ نگاہ درست تھا۔ ہاف ٹائم کے وقت ہم دونوں (یعنی میں اور ایرانی ریفری) ان دونوں ریفری صاحبان کے پاس گئے اور انہیں ان کے غلط فیصلوں سے آگاہ کیا تو وہ ناراض ہو گئے اور انہوں نے اپنے ایرانی ساتھی سے کہا کہ کون کہتا ہے کہ ہمارے یہ فیصلے غلط تھے؟ تب اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ بیشک آپ اس پاکستانی ریفری سے بھی پوچھ لیں۔ اس پر میں نے کہا کہ واقعی آپ کے فیصلے قوانین کے مطابق نہ تھے اور انہیں آفیشل باسکٹ بال رُول بُک نکال کر متعلقہ قواعد سے آگاہ کیا۔ اسی اثناء میں ڈووے ڈوف بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا اور رائے دی کہ پاکستانی ریفری ٹھیک کہتا ہے، آپ کے فیصلے غلط تھے تاہم وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ تب میں نے تجویز پیش کی کہ اگر اس ٹورنامنٹ میں شرکت کرنے والے ریفریز اور آفیشلز کی ایک میٹنگ منعقد کر لی جائے اور اس میں متنازعہ فیصلہ جات پر بحث کر لی جائے تو مناسب ہوگا۔ میری اس تجویز سے اتفاق کر لیا گیا اور اسی رات ایک ہوٹل میں ریفریز اور آفیشلز کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈووے ڈوف نے کی۔ اس میٹنگ میں مجھے باسکٹ بال کے بعض اہم قوانین پر اپنا نکتہ نظر بیان کرنے کی دعوت دی گئی جس کے بعد میں نے ان قوانین سے متعلقہ سوالات کے بھی جواب دیئے۔

اس میٹنگ کے نتیجہ میں ڈووے ڈوف کی خواہش پر مجھے چین اور بھارت کے درمیان ہونے والا ایک سیمی فائنل میچ ان کے ساتھ سپروائز کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس میچ کے اختتام پر ڈووے ڈوف نے میری کارکردگی کو سراہا اور آرگنائزنگ کمیٹی کے سامنے مجھے کلماتِ تحسین سے نوازا۔''

''بات ختم کرنے سے پہلے کچھ مسرور انٹرنیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ کے بارے میں بتاتے جایئے۔''

''۲۰۰۸ء میں لندن میں مجلس صحت، یوکے نے ''مسرور انٹرنیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ'' کا انعقاد کیا جس

میں امریکہ، کینیڈا، جرمنی، فلسطین، پاکستان اور برطانیہ کے احمدی کھلاڑیوں پر مشتمل باسکٹ بال ٹیموں نے شرکت
کی۔ خاکسار کو اس انٹرنیشنل باسکٹ بال چیمپیئن شپ میں بطور ممبر آرگنائزنگ کمیٹی اور چیئرمین ریفریز بورڈ کے
علاوہ افتتاحی اور فائنل میچ میں ریفری کے فرائض ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس موقع پر مجھے پاکستان
اور تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائے کی ٹیموں کی طرف سے اس ٹورنامنٹ میں بطور کھلاڑی نمائندگی کا شرف
بھی حاصل ہوا۔''

باسکٹ بال کے بعض کھلاڑیوں کے قدرے طولانی ذکر کے بعد اب کچھ باتیں ربوہ میں والی بال کے
حوالے سے۔

میرے قیام ربوہ کے زمانے میں اس شہر کے کچھ دوست شام کے وقت غلہ منڈی اور ریلوے لائن کے
درمیان والی بال کھیلا کرتے تھے۔ ان میں کچھ نوجوان اور قدرے نوآموز کھلاڑی تھے لیکن زیادہ تر کھلاڑی جہاں
دیدہ اور خوب منجھے ہوئے تھے تاہم وہ اپنے جوش و جذبہ میں نوجوان کھلاڑیوں پر بھی فوقیت رکھتے تھے۔ نوجوانوں
میں سے عبدالجلیل صادق (حال نائب ناظر ترتیب ریکارڈ، صدر انجمن احمدیہ پاکستان) اور میرے سکول کے ایک
کلاس فیلو، محمد ارشد (جنہوں نے بعد میں صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت اختیار کر لی لیکن اب عرصہ دراز سے جرمنی
میں مقیم ہیں) اور زمرۂ ثانی میں سے احمد حسین کاتب الفضل اور چوہدری محفوظ الرحمٰن ڈی پی ای، تعلیم الاسلام کالج
کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

عام طور پر وہاں تماشائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی البتہ وہاں سے گذرنے والے کچھ دوست
سانس لینے کے بہانے وہاں رُک جاتے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق کچھ دیر ان کھلاڑیوں کو داد دے کر آگے
نکل جاتے۔ مجھے ان بزرگوں میں سے شیخ محبوب عالم خالد اور حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کے اسمائے گرامی
اب تک یاد ہیں۔

قارئین کرام بخوبی جانتے ہیں کہ شیخ محبوب عالم خالد تعلیم الاسلام کالج میں اردو کے پروفیسر تھے اور ان
کی رہائش محلہ دارالرحمت وسطی میں تھی۔ وہ عصر کے وقت چھڑی ہاتھ میں لئے اپنے گھر سے سیر کے لیے نکلتے اور
کچھ دیر یہاں گذارنے کے بعد اپنی منزل کی جانب گامزن ہو جاتے۔

جہاں تک حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کا تعلق ہے موصوف اُن دِنوں ناظم وقفِ جدید تھے۔ آپ کی کچھ
زرعی زمین ربوہ کے مضافات میں تھی اور وہ اُدھر جاتے ہوئے بشرطِ سہولت وفرصت یہاں بھی رُک جاتے تھے۔

آپ مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ قصہ دراصل یہ ہے جن دنوں آپ اپنی کتاب ''مذہب کے نام پر
خون'' تصنیف فرما رہے تھے تو آپ مشورہ کے لیے ابا جی کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ آپ دروازہ
کھٹکھٹاتے تو بالعموم میں ہی اسے کھولتا جس کی وجہ سے آپ مجھے بائی فیس پہچاننے لگے تھے۔ حالات اجازت
دیتے تو ابا جی آپ کو بیٹھک میں بٹھالیا کرتے ورنہ عام طور پر آپ دونوں باہر اقصیٰ روڈ پر موجودہ لاری اڈے اور
یونائیڈ بنک لمٹیڈ کے درمیان چہل قدمی کے دوران ضروری گفتگو کر لیتے۔ آپ وہیں سے واپس تشریف لے

جاتے اور ابا جی گھر آ جاتے۔

ایسا ایک یا دو بار نہیں، کئی بار ہوا تھا۔ بعد میں جب آپ کی کتاب چھپ کر آئی تو آپ خاص طور پر اس کا ایک نسخہ ابا جی کو عطا کرنے کے لیے ہمارے گھر تشریف لائے۔ آپ نے ابا جی کو یہ کتاب اپنے دستخطوں سے عنایت فرمائی تھی اور ابا جی کی وفات کے بعد کئی سالوں تک میرے پاس محفوظ رہی۔ گجرات سے تعلق رکھنے والے میرے ایک مرحوم غیر از جماعت شاعر دوست، خاقان خاور نے کسی سے اس کتاب کی تعریف سن رکھی تھی۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں یہ کتاب انہیں مہیا کر سکتا ہوں۔ میں نے بازار سے خرید کر دینے کی بجائے انہیں یہی نسخہ اس اُمید پر دے دیا کہ وہ اسے پڑھنے کے بعد مجھے لوٹا دیں گے لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے یہ کتاب ضائع ہو گئی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کا والی بال کی کھیل دیکھنے کے لیے رُکنے کا۔ اس بہانے میری آپ سے علیک سلیک بھی ہو جاتی۔

میں والی بال کے رموز سے نا آشنا تھا اور موقع ملنے پر تفریحاً وہاں چند لمحے رُک جایا کرتا تھا لیکن جیسا کہ جلیل صادق نے جو تعلیم الاسلام کالج میں بی اے (آنرز) کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی والی بال ٹیم میں بھی کھیلتے رہے ہیں بتایا: ''حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی فرماتے بلکہ بعض اوقات کھیل کے بارے میں انتہائی مفید ٹپس بھی دے جاتے۔ چونکہ میں spiker تھا آپ نے مجھے پتے کی ایک یہ بات سمجھائی کہ placing idea کرتے وقت اگر بال blocker کے ہاتھوں کے اُوپر گرایا جائے تو وہ لازماً پوائنٹ لائے گا اور اس کا اٹھایا جانا یا اسے ریٹرن کرنا دوسری ٹیم کے لیے تقریباً ناممکن ہوگا۔ میں نے آپ کی یہ نصیحت پلّے باندھ لی اور ہمیشہ اسے مفید پایا۔''

جلیل صادق والی بال کے شیدائیوں میں سے ہیں لہٰذا اگر ان سے ربوہ میں اس کھیل کی تاریخ کے حوالہ سے بات شروع ہو تو گویا دبستان کھل جاتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں ''جن کھلاڑیوں نے والی بال کو ربوہ میں فروغ دیا اُن میں سید اختر، سردار محمد، عبدالمالک مربی سلسلہ، احمد حسین کاتب اور محفوظ الرحمٰن کے نام خاص پور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں کھلاڑیوں نے تو مختلف ٹورنامنٹس میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ پچاس کی دہائی میں یہ کھیل جامعہ احمدیہ میں بڑا مقبول رہا۔ اس دوران جامعہ نے مولوی نور الحق تنویر، منیر عارف، ناصر اختر بلوچ، اقبال غضنفر اور بشیر شمس جیسے اچھے کھلاڑی پیدا کئے۔ اب بشیر شمس کے علاوہ سب دوست اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ان کی خوبصورت یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔''

وہ مزید بتاتے ہیں: ''میں نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اس کھیل میں قدم رکھا، ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھا اور پھر ۶۲۔۱۹۶۱ء کے سیشن میں پنجاب یونیورسٹی ٹیم میں منتخب ہو کر انٹر یونیورسٹی چیمپیئن شپ جیتی۔ اسی دوران یہ کھیل جامعہ احمدیہ سے فضل عمر کلب ربوہ کی ٹیم میں منتقل ہوا اور ایک لمبے عرصہ تک یعنی ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک ربوہ کی ایک مرکزی ٹیم کے ذریعہ جاری رہا۔ اس عرصے میں بہت سے کھلاڑی میدان میں آتے

رہے۔ اُن میں حمید اللہ، محمد ارشد عرف بھیّا ، رمضان ظفر، عبدالرفیق آصف، نعمت اللہ، عزیز احمد، سہیل خان،
پروفیسر ادریس، نصیر حیدری، ملک مشرّف، طارق ورک، نصرت الٰہی، لطف الٰہی، مقبول الٰہی، بشیر اعوان، عیسیٰ ظفر،
ہارون خان اور جلال پلّو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔"

جلیل صادق کو بھارت میں بھی والی بال کا ایک نمائشی میچ کھیلنے کا بھی موقع مل چکا ہے۔ ان کے اپنے
الفاظ میں "۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ میرے ایک پھوپھا، ہدایت اللہ قادیان میں درویش تھے۔ ان کی اہلیہ یعنی میری
پھوپھی، رضیہ خانم وہیں سکول میں پڑھاتی تھیں۔ میں ان سے بڑی مدت سے مل نہ پایا تھا۔ ایک دفعہ میں نے اور
میرے کزن قریشی سراج الحق نے پروگرام بنایا کہ ہم اکٹھے انڈیا چلتے ہیں، قادیان کی زیارت بھی ہو جائے گی اور
اپنے عزیزوں سے ملاقات بھی۔ ان دنوں نظارتِ خدمتِ درویشان میں ایک صاحب اقبال جالندھری ہوا کرتے
تھے۔ وہ کچھ معاوضہ لے کر ضرورت مندوں کے پاسپورٹ بنوا دیا کرتے تھے۔ ہم نے ان کی خدمات حاصل
کیں۔ جلد ہی ہمارے پاسپورٹ بن گئے اور ہم دونوں واہگہ کے راستے انڈیا پہنچ گئے۔ ہم غالباً دو ہفتے وہاں
رہے۔ اسی دوران بھارت کا یومِ آزادی آ گیا۔ اس موقع پر قادیان کی والی بال ٹیم ایک نمائشی میچ کھیلنے کے لیے
بٹالہ جا رہی تھی۔ قادیان کی آبادی محدود سی تھی اور ان کے پاس اچھے کھلاڑیوں کی کمی تھی چنانچہ انہوں نے اپنی ٹیم
میں ایک دو سکھوں کو بھی شامل کر رکھا تھا۔ جب جماعت کو پتا چلا کہ مجھے بھی اس کھیل کی شُد بُد ہے تو انہوں نے
انتظامیہ کی اجازت سے مجھے بھی اپنی ٹیم میں شامل کر لیا اور یوں میں ان کے ہمراہ بٹالہ جا پہنچا۔

جب میچ شروع ہو گیا تو اچانک کسی نے مجھے احساس دلایا کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی والی بال ٹیم والی
بنیان پہن رکھی ہے۔ میری یہ بے پروائی قادیان کی ٹیم کے لیے مشکلات پیدا کر سکتی تھی لہٰذا میں یہ بنیان فوری طور
پر تبدیل کرنا چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس اور کوئی بنیان موجود نہ تھی۔ ہمارے منتظمین فوری طور پر کہیں
سے ایک بنیان ڈھونڈ لائے جو میں نے جلدی میں اپنی بنیان کے اوپر ہی پہن لی۔ الحمدللہ یہ بات کسی مخالف کی
نظر میں نہیں آئی ورنہ مجھے نہ جانے کس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔"

جلیل صادق کے پاس ربوہ میں والی بال کے حوالے سے بعض اور دلچسپ یادیں بھی موجود ہیں لیکن ان
کا ذکر پھر کبھی سہی۔

باسکٹ بال اور والی بال کے علاوہ ربوہ میں جو کھیلیں بہت شوق سے کھیلی جاتی رہی ہیں ان میں ہاکی بھی شامل
ہے۔ اس کھیل نے جو بہت سے اچھے کھلاڑی پیدا کیے ان میں سے ایک لطیف غزنوی ہیں جو الحاج نیک محمد خان غزنوی
کے صاحبزادے ہیں۔ نیک محمد غزنوی سردار میر احمد خان غزنوی، گورنر صوبہ غزنی، افغانستان کے صاحبزادے تھے
جنہوں نے ۱۹۰۶ء میں جب اُن کی عمر صرف گیارہ سال تھی بذریعہ خط حضرت مسیح موعود کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ وہ
تین سال بعد اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے قادیان آ گئے اور پھر کبھی واپس نہیں گئے۔

ان ہی نیک محمد خان غزنوی کے ایک صاحبزادے عبدالحمید خان غزنوی پاکستان ایئر فورس میں فلائنگ افسر
تھے۔ وہ بارہ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مہترِ چترال کو چترال لے جاتے ہوئے ایک فضائی حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ چوہدری علی محمد

"تعلیم الاسلام ہائی سکول اور اس کی کھیلیں" میں ذکر کیا ہے کہ عبدالحمید غزنوی
المعروف بی ٹی صاحب نے اپنی کتاب
ہاکی کے ایک اچھے کھلاڑی تھے اور اسی وجہ سے وہ پاکستان ایئرفورس کی ہاکی ٹیم کے کپتان بھی رہے۔
لطیف غزنوی بھی شروع ہی سے اعلیٰ پائے کے ایتھلیٹ اور ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے۔ اگرچہ وہ پاکستان کی نیشنل ٹیم کے لیے تو منتخب نہ ہو پائے تاہم وہ انٹرنیشنل ہاکی ایمپائر گریڈ وَن مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں شاندار خدمات سرانجام دیں۔

موصوف محلّہ دارالرحمت وسطی میں مقیم ہیں۔ میں اُنہیں پہلے بھی جانتا تھا لیکن جب میں نے اس کتاب پر کام شروع کیا تو اُن سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُن دنوں ان کی طبیعت علیل تھی اور وہ اس قابل نہ تھے کہ ملاقات کر سکتے۔ اُن سے ملاقات نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ربوہ میں مقیم ہیں اور میں لاہور میں تھا۔ میں جب بھی مختصر وقت کے لیے ربوہ جاتا اُن کی علالت کے پیشِ نظر ملاقات مؤخر کر کے واپس آ جاتا۔ بالآخر ایک سہ پہر ایک چائے خانے پر یہ ملاقات ہوگئی لیکن اتنی مختصر کہ میں مطلوبہ معلومات حاصل نہ کر سکا۔ انہوں نے ذکر کیا کہ ان کے ایک نیازمند، شاہد باجوہ تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں اور ہاکی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ لطیف غزنوی کی سہولت کے مطابق اُن سے "ربوہ میں ہاکی" کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل کر لیں لیکن پھر بھی کوئی قابلِ ذکر پیش رفت ہو سکی اور لطیف غزنوی نے کاغذات کا ایک پلندہ اُن کے حوالے کر دیا جس میں بقول ان کے مطلوبہ معلومات موجود تھیں۔ میں نے یہ پلندہ اچھی طرح کھنگالا ہے اور اس کے بعد لطیف غزنوی سے کم از کم دو تفصیلی ملاقاتیں کی ہیں جس دوران یہ انکشاف ہوا کہ وہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو قادیان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے میٹرک کا امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ سے ۱۹۵۳ء میں پاس کیا۔

جب لطیف غزنوی سے ربوہ میں ہاکی کی تاریخ کے حوالے سے بات ہوئی تو انہوں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد بتایا: "ایک دفعہ جب حضرت مصلح موعود جماعتی عہدیداروں اور اہلکاروں کو شرفِ ملاقات بخش رہے تھے تو آپ نے اچانک دریافت فرمایا کہ مولوی عبدالکریم کہاں ہیں۔ یاد رہے کہ مولوی عبدالکریم مولانا محمد احمد جلیل، استاد جامعہ احمدیہ کے بھائی تھے اور رائل انڈین ایئرفورس کی ہاکی ٹیم میں سنٹر ہاف بیک تھے لیکن بعد میں سیرالیون میں مربی سلسلہ کے طور پر خدمت بجالانے لگے۔ جب مولوی عبدالکریم نے عرض کی کہ وہ حاضر ہیں تو حضور نے فرمایا کہ ہاکی کی ٹیم بناؤ۔ اُس وقت جب ربوہ کی باقاعدہ آبادکاری کا کام بھی شروع نہیں ہوا تھا اور یہاں کی کُل آبادی ٹینٹوں میں مقیم چند جماعتی عہدیداروں اور اہلکاروں پر مشتمل تھی حضور کی یہ ہدایت اس امر کی غماز تھی کہ آپ ہاکی کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ حضور کے ارشاد کے مطابق تعلیم الاسلام ہائی سکول، چنیوٹ اور جامعہ احمدیہ، احمد نگر کے طلبہ پر مشتمل ایک ٹیم بنائی گئی جس کے لیے مولوی عبدالکریم نے احمد نگر کے لاری اڈہ کے سامنے ایک کھیت کو ہموار کروا کے معیاری ہاکی گراؤنڈ تیار کروائی۔ مجھے یاد ہے سید محمود اللہ شاہ ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ سے سکول کے لڑکوں کو ہاکی کھیلنے کے لیے روزانہ احمد نگر بھجوایا کرتے تھے۔
بعدۂ قصرِ خلافت سے ملحقہ میدان اور اس کے بعد دفاتر صدر انجمن احمدیہ کے احاطہ کے اندر جہاں اب

فضل عمر فاؤنڈیشن وغیرہ دفاتر ہیں ہاکی کی گراؤنڈ بنائی گئی۔ ملک کی ہاکی کی نامور ٹیمیں جو اُس وقت کے شہرۂ آفاق
کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتیں ربوہ میں آ کر اس گراؤنڈ پر میچز کھیلا کرتی تھیں اور حضور کے ارشاد کے مطابق ان کی
مہمان نوازی دارالضیافت میں ہوا کرتی تھی ۔ جب بھی ہماری ٹیم کو کسی بیرونِ شہر ٹورنامنٹ میں شرکت کے لئے
جانا ہوتا تو خاکسار بے تکلفی سے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے لاجسٹک پرابلمز اور مالی
اعانت کی درخواست کرتا تو حضور اپنی کاریں ہمیں فراہم کردیتے تاکہ کھلاڑی بسہولت سفر کرسکیں۔ حضور متعلقہ
امیر جماعت کو ہماری ٹیم کی بورڈنگ اور لاجنگ کا خاطر خواہ بندوبست کرنے کی ہدایت بھی فرما دیتے تھے۔
حضور کھیل دیکھنے اور کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی فرمانے اور انعامات سے نوازنے کے لئے کئی بار گراؤنڈ
میں بھی تشریف لے آتے۔

اُن دنوں ہاکی کی دنیا میں ربوہ کی اہمیت اس قدر مسلّم ہوچکی تھی کہ جب پاکستان کی قومی ہاکی ٹیم کو ایشین ہاکی
چیمپیئن شپ یا اولمپک گیمز میں شرکت کے لیے جانا ہوتا تو جانے سے پہلے ربوہ کی ہاکی ٹیم سے سرگودھا پولیس ٹریننگ سنٹر
کی گراؤنڈ جو لپائی کر کے تیار کی جاتی تھی یعنی Clayground پر ایک پریکٹس میچ ضرور کھیلا کرتی تھی۔ یہ امر خاص طور پر
قابل ذکر ہے کہ ہماری ٹیم قومی ہاکی ٹیم کو ہمیشہ ٹف ٹائم دیتی اور بسا اوقات یہ میچ جیت بھی لیا کرتی تھی۔"

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے لطیف غزنوی کو بچپن سے ہی سپورٹس کے ساتھ لگاؤ رہا ہے۔ ابھی وہ
تعلیم الاسلام ہائی سکول کے طالب علم تھے کہ کھیلوں کے ساتھ ان کے فطری لگاؤ کا اظہار ہونے لگا۔ انہوں نے
تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ۱۹۵۵ء کی سالانہ سپورٹس میں ۱۰۰ میٹرز، ۲۰۰ میٹرز، ۴۰۰ میٹرز اور ۱۵۰۰ میٹرز کی
دوڑوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ وہ کالج ہاکی ٹیم کے کپتان رہے اور کبڈی بھی کھیلتے رہے جس پر انہیں
رول آف آنر سے نوازا گیا۔ وہ بعدۂ ایم اے او کالج، لاہور منتقل ہوگئے اور وہاں بھی بہترین کھلاڑی کا اعزاز
حاصل کیا۔ انہوں نے ایم اے او کالج کی سالانہ سپورٹس میں ۱۰۰ میٹرز، ۲۰۰ میٹرز، ۴۰۰ میٹرز اور ۱۵۰۰ میٹرز کی
دوڑوں اور لانگ جمپ میں اوّل پوزیشن حاصل کی جب کہ پنجاب یونیورسٹی انٹر کالجیٹ اتھلیٹکس مقابلوں میں ۲۰۰
میٹرز کی ریس میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ان کی آخری کامیابی کا ذکر تاریخ احمدیت جلد ۱۹ میں بھی موجود ہے۔
وہ ڈسٹرکٹ ہاکی ایسوسی ایشن جھنگ کے سیکرٹری اور صدر، پنجاب ہاکی ایسوسی ایشن کے رکن اور سلیکٹر
اور سرگودھا بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن اور پنجاب سپورٹس بورڈ کے سلیکٹر رہے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں صاحبزادہ مرزا منیر احمد جو کمبائنڈ پنجاب ہاکی ٹیم کے منتخب کھلاڑی تھے کی سرپرستی میں
پاکستان ہاکی ٹیم کے پہلے کپتان اور بین الاقوامی ہاکی فیڈریشن کے تادمِ آخر نائب صدر، کرنل (ر) علی اقتدار شاہ
دارا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ربوہ میں ''دارا ہاکی کلب'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے پہلے صدر
لطیف غزنوی چُنے گئے جب کہ سیکرٹری اعزازنوید تھے۔

بعدۂ ربوہ میں ''ربوہ ٹائیگرز ہاکی کلب'' کا بھی قیام عمل میں آیا جس کے صدر چوہدری محمد شریف خالد
ایڈووکیٹ اور نائب صدر عبداللطیف خان عرف تھا تھے۔ اس دور میں ربوہ اور احمد نگر کے مندرجہ ذیل کھلاڑی ہاکی

کھیلتے رہے ہیں:

عبدالشکور عتی، انس احمد ضرار روزی، وقار حسین، مسعود نیازی، طاہر بیگ، ناصر بیگ، سیف بیگ، نعیم احمد ملایا، خواجہ عبدالسلام، عبدالرؤف بھٹی، ناصر احمد، بشیر احمد المعروف بھنگی، ضیاء الحق، تنویر احمد، شمیم غزنوی، وحید احمد، اعجاز رسول، اظہار محمود، منیر الدین سیال، ناصر الدین، شاہد احمد سعدی، محمد منیر برمی، محمد انور، محمد اشرف، خالد محمود، منور لاہوری، منور احمد فاروقی، عبدالسمیع، محمود عباسی، طاہر احمد (ابن مولوی فضل دین وکیل)، عبدالکریم نثار، چوہدری عبدالحئی، مختار احمد، مبرور احمد بنگالی، ابرار حسین اور وسیم احمد شاکر۔

ان دونوں کلبوں کے کھلاڑیوں میں نظم وضبط اور سپورٹس مین سپرٹ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی اور معمولی سی بے ضابطگی پر بھی تادیبی کارروائی کی جاتی۔ لطیف غزنوی نے اپنا کا ایک خط محررہ دس اپریل ۱۹۶۳ء دکھایا جس میں انہوں نے ربوہ ٹائیگرز ہاکی کلب کے وائس پریذیڈنٹ کو یہ اطلاع دی تھی کہ ''مورخہ نو اپریل ۱۹۶۳ء کو ہماری ٹیم جب کریسنٹ کلب سرگودھا کے خلاف کھیل رہی تھی تو جاوید احمد نے ہاف ٹائم کے بعد بلا اجازت گراؤنڈ میں داخل ہو کر اپنے بھائی حامد احمد کے ساتھ چینج کر لیا اور حامد احمد باہر نکل گیا۔ میں نے اس کو خلاف تنظیم خیال کرتے ہوئے حامد کو واپس گراؤنڈ میں آنے کو کہا اور جاوید کو گراؤنڈ چھوڑنے کے لیے مگر دونوں بھائی نہایت باغیانہ رویہ دکھا کر گراؤنڈ سے چلے گئے نیز جاوید نے میرے متعلق نہایت تذلیل آمیز الفاظ استعمال کئے جس سے...... کھلاڑیوں کو سخت غصہ آیا۔ تمام کھلاڑی یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہر دونوں بھائیوں کو آئندہ کے لیے کلب ہذا میں نہ کھلایا جائے۔ اطلاعاً رپورٹ عرض ہے۔ آگے جو آپ مناسب خیال کریں کارروائی فرمائیں تاکہ آئندہ بدمزگی نہ ہو۔''

وائس پریذیڈنٹ نے اس شکایت کا سنجیدگی سے نوٹس لیا اور یہ خط درجِ ذیل نوٹ کے ساتھ واپس کر دیا: ''میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ (یہ) دونوں (بھائی) ہمیشہ تنظیم کے خلاف کام کرتے ہیں۔ کھیل میں جیتنا ہارنا نہیں ہوتا بلکہ سب سے اوّل غرض ہماری تو تعلقات پیدا کرنا ہے اور ان حالات میں تنظیم کے خلاف کام کرنا درست نہیں۔ آپ ان کو آئندہ نہ کھلایا کریں۔''

ہاکی جب لطیف غزنوی کا اوڑھنا بچھونا بنی اور وہ تعلیمی ادارہ جات کے بعد ڈسٹرکٹ اور ڈویژن لیول سے بڑھ کر نیشنل ٹیم میں شمولیت کے اہل ہوئے تو قسمت کی ستم ظریفی راہ میں حائل ہوگئی اور وہ بس کے ایک حادثہ کی وجہ سے پاکستان کی قومی ہاکی ٹیم میں شامل ہونے سے رہ گئے۔

تفصیلات کے مطابق لطیف غزنوی بس کے ذریعہ فیصل آباد سے ربوہ آرہے تھے اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور بڑی بے پروائی سے بس چلا رہا تھا۔ ایک جگہ سڑک پر موجود کسی رکاوٹ کے باوجود اُس نے بس کی رفتار کم نہ کی جس کے نتیجہ میں لطیف غزنوی ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نشست سے نیچے گر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی جان تو محفوظ رکھی مگر ان کی ریڑھ کی ہڈی کے دو مہرے دب گئے جس کی وجہ سے انہیں مستقل جسمانی اذیت کے علاوہ ہاکی کے میدان میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اب وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ ہاکی

کھیل سکیں حالانکہ یہی موقع تھا جب ہاکی کی قومی ٹیم میں اِن کی شمولیت سے ان کے جوہر کھلتے اور اِنہیں ملک وقوم کی خدمت کے علاوہ اپنے ارمان پورے کرنے اور ربوہ کا نام روشن کرنے کا بھی موقع ملتا۔

وہ قومی ٹیم میں تو نہ شامل ہو سکے مگر ہاکی کے لیے ان کا جذبہ جو جنون میں ڈھل چکا تھا انہیں ایمپائرنگ کی طرف لے گیا اور انہوں نے ۱۹۶۲ء میں ایمپائرنگ کا بنیادی امتحان پاس کیا۔اب وہ نیشنل بی گریڈ ایمپائر بن چکے تھے۔ بعد میں انہوں نے نیشنل اے گریڈ، پھر انٹرنیشنل بی گریڈ اور آخر میں انٹرنیشنل گریڈ وَن ایمپائر کا امتحان پاس کرلیا۔

اپنی جسمانی تکالیف کے باوجود وہ ورلڈ الیون کی طرف سے پرتھ (آسٹریلیا)، ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) اور کراچی میں کھیل چکے ہیں اور پاکستانی ٹیم کے کئی سال تک کوچ رہے ہیں۔

ایمپائرنگ کے امتحان میں کامیابی سے ان پر کامیابیوں کے کئی اور دروازے کھلتے چلے گئے اور وہ بین الاقوامی سطح پر ایک باوقار اور بااصول ہاکی ایمپائر کے طور پر پہچانے جانے لگے۔انہیں ہالینڈ، جرمنی، آسٹریلیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، ملائشیا اور نیروبی میں ہاکی کے بین الاقوامی میچز میں ایمپائر کے فرائض انجام دینے کا موقع ملا۔ بین الاقوامی مقابلہ جات کے حوالہ سے ان کا شمار پانچ بہترین ایمپائرز میں کیا گیا اور وہ ۱۹۸۲ء میں سنگاپور میں ہونے والے ایشیا کپ کے بہترین ایمپائر قرار پائے۔وہ ملکی سطح پر بھی قابل پذیرائی ٹھہرے اور قائداعظم گولڈ میڈل اور موسیٰ خان گولڈ میڈل کے حقدار ہوئے۔

انہیں ایشیا کا نمبرون ایمپائر قرار پانے پر گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔

لطیف غزنوی نے قومی ہاکی ٹیموں کی کوچنگ کے علاوہ پنجاب ہاکی ایسوسی ایشن، بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، سرگودھا کی ہاکی ٹیم، فیصل آباد ڈویژنل ہاکی ایسوسی ایشن اور سرگودھا ڈویژنل ہاکی ایسوسی ایشن کی کوچنگ کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔

اب ایک اور میدان جو شاید ان کی ڈھلتی ہوئی عمر کے شایان شان بھی تھا ان کا منتظر تھا اور وہ تھا بطور تجزیہ نگار اخبارات میں اپنے تجربے اور بصیرت کی بدولت شجرِ ہاکی کی آبیاری۔ لطیف غزنوی نے اردو اور انگلش ہردو زبانوں میں لکھا اور خوب لکھا ہے۔ انہوں نے جس ایمانداری سے ہاکی کھیلی، کھلائی اور سکھائی اسی ایمانداری سے ہاکی کے بارہ میں لکھا بھی۔ انہوں نے ہار جیت پر بے لاگ تبصرے لکھے، ٹیم سیلیکشن پر اپنی مخلصانہ رائے کا اظہار کیا اور پاکستان میں ہاکی کے زوال پر نوحے بھی لکھے۔

اگرچہ لطیف غزنوی خرابی صحت کی بنا پر اپنے تمام مضامین اور کالم محفوظ نہیں رکھ سکے تاہم میرے سامنے ان کے چار مضامین کے تراشے موجود ہیں جو انگریزی روزنامہ ''دی نیوز'' میں شائع ہوئے۔ ان میں سے پہلا مضمون ۱۳ نومبر ۲۰۰۹ء کو "Pakistan can hope to regain lost glory" کے عنوان سے چھپا۔ اسی سال ۲۲ دسمبر کو اُن کا ایک مضمون "How to regain glory in hockey" کے عنوان سے شائع ہوا۔ وہ پاکستان میں ہاکی کے زوال پر آزردہ رہتے ہیں اور اس میں بہتری کے لیے متعلقہ حکام کو حتیٰ المقدور مشورے دیتے رہتے ہیں۔ ان کا ایسا ہی ایک مضمون ۲۳ مارچ ۲۰۱۰ء کو شائع ہوا جس کا عنوان تھا "Four-time

World Cup Winners bite the dust"۔ اسی طرح انہوں نے ۲۵ مئی کو "What happened to Pakistan hockey" کے عنوان سے بھی ایک مضمون لکھا۔

ان کے پاس روزنامہ جنگ لاہور (۱۷ اپریل ۲۰۱۰ء) میں چھپنے والے ان کے ایک مضمون کا تراشہ بھی موجود ہے جس کا عنوان ہے ''ورلڈ کپ ہاکی ٹورنامنٹ میں بارہویں پوزیشن: ایڈہاک کمیٹی کے ذریعہ ہی صفائی کی جا سکتی ہے۔''

لطیف غزنوی اپنی زندگی کے بعض واقعات بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اُنہیں ۱۹۵۵ء میں تعلیم الاسلام کالج کا بہترین ایتھلیٹ قرار دیا گیا تھا۔ دراصل انہوں نے تمام فیلڈ ایونٹس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی چنانچہ وہ ایسی انعامات کے مستحق قرار پائے جس کی بنا پر اُنہیں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے دستخط سے رول آف آنر جاری ہوا۔ یہ رول آف آنر اُنہیں اُس سال کی کانووکیشن کے مہمانِ خصوصی سردار عبدالحمید دستی کے ہاتھوں وصول ہوا۔

انہیں یہ بھی فخر ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے ارشاد پر تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں ہاکی ٹیم کی کوچنگ شروع کی اور بفضلہٖ تعالیٰ اس سکول نے ۱۹۸۱ء تک جھنگ ڈسٹرکٹ انٹر سکولز ہاکی ٹورنامنٹ میں مسلسل فتح حاصل کرنے کا ایک منفرد ریکارڈ قائم کیا۔

لطیف غزنوی نے گورنمنٹ تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کی گراؤنڈ پر کرنل (ر) اے آئی ایس دارا ہاکی اکیڈمی بھی بنائی جس کے لیے انہوں نے چالیس ہزار روپے مالیت کی ہاکیاں، بال اور گراؤنڈ اکوپمنٹ مہیا کیا۔ انہوں نے طلبہ کی کوچنگ کا سلسلہ شروع کیا جو تین سال قبل تک جاری رہا۔ بعض ذمہ داران کی عدم دلچسپی اور تاہلی سے بددل ہوکر مجبوراً اب یہ سلسلہ بند کیا جا چکا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ نے ربوہ میں نوجوان کے لیے سپورٹس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سپورٹس کے فروغ وارتقا کے لیے مجلس صحت کا دستورِ اساسی بنوانے کے لیے لطیف غزنوی کو شرف خدمت بخشا چنانچہ انہیں یہ منشور تیار کر کے حضور کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

سنگاپور کے معروف روزنامہ ''سٹریٹ ٹائمز'' نے پہلے ایشیا کپ ہاکی ٹورنامنٹ منعقدہ سنگاپور کے موقع پر لطیف غزنوی کے بارے میں کیا خوب لکھا تھا کہ "Ghaznavi's life is hockey, wife is hockey, every thing is hockey" گویا ہاکی ہی لطیف غزنوی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

ربوہ کے ان منتخب کھلاڑیوں کے بعد میں آپ کو اپنے خاندان کے ان افراد سے متعارف کرانا چاہتا ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے نمایاں خدماتِ سلسلہ کی توفیق ملی۔ ان میں اباجی کے علاوہ بہت سے بزرگان شامل ہیں جنہوں نے تادمِ زیست جماعت کے ساتھ عہدِ وفاداری کو نباہا اور تاریخِ احمدیت پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

زمانے میں ہیں گہرے اُن کے نقشِ جاوداں اب بھی

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمارے خاندان کے جن افراد کو نمایاں خدمتِ دین کی توفیق بخشی ان میں اُمی کے دادا اور میرے اپنے دادا، نانا اور والدِ بزرگوار کے علاوہ اُن کے خالو حافظ نور الٰہی؛ میرے چچا، پروفیسر محمد ابراہیم ناصر؛ میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب؛ میرے خالو، قریشی محمد حنیف قمر؛ میرے بہنوئی قریشی سعید احمد اظہر اور نامور خادم سلسلہ کرم الٰہی ظفر شامل ہیں۔ ان بزرگان نے اوائل جوانی میں اپنے لیے جو راستہ منتخب کیا تھا وہ پوری ثابت قدمی سے اس پر زندگی بھر قائم رہے اور صدق و وفا کی تابندہ مثال قائم کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے یقین ہے تاریخ احمدیت میں ان کا نام ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

جہاں تک حافظ نور الٰہی کا تعلق ہے، وہ کوٹ مومن ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام حافظ محمد عارف اور سنِ پیدائش ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء تھا۔ انہوں نے اپنے ایک خواب کی بنا پر ۱۹۳۴ء میں احمدیت قبول کی اور پھر اخلاص و وفا اور زہد و اِتقا کی ایک مثال بن کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے آخری ایام میں جب وہ بہاولنگر میں محکمہ انہار میں بطور ہیڈ کلرک کام کر رہے تھے اور مقامی جماعت کے امیر تھے انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تحریک پر قادیان کی درویشی قبول کر لی اور اپنے محکمہ سے رخصت لے کر ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو وہاں پہنچ گئے۔ چوہدری بدرالدین عامل ﷺ نے اپنی کتاب ''وہ پھول جو مُرجھا گئے'' میں ان کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''یہاں آ کر ان کے چہرہ سے بشاشت اور طمانیت کے آثار ان کی دلی کیفیات کی ترجمانی کر رہے تھے اور ان کا ذہن اخلاص وعقیدت کی فراوانی سے اس احساس کی دولت سے مالا مال تھا کہ وہ اپنے آقا کے ارشاد کی تعمیل میں دنیا کی دلفریبیوں کو خیر باد کہہ کر ایک درویش کی حیثیت سے دیارِ محبوب حاضر ہوئے ہیں۔ قادیان آ کر آپ نے اخلاص اور ایمان کا اعلیٰ نمونہ دکھایا۔ حافظ صاحب...... نے یہاں آ کر ایک ماہ تک متواتر روزے رکھے، وقت کا بیشتر حصہ دعاؤں اور عبادتوں میں گذارا، درسوں میں باقاعدہ حاضر ہوتے رہے اور قرآن مجید کی قرأت کا دور کرتے رہے......

قرآن مجید پڑھتے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ انہیں قرآن مجید سے عشق ہے۔ بیماری کے دوران...... اپنے تیمارداروں سے اصرار کر کے قرآن مجید سنا کرتے تھے اور اُن کے تلفظ اور قرأت کی درستی فرماتے رہے۔ حافظ صاحب روزانہ تہجد کے لیے اُٹھتے اور باجماعت تہجد کی نماز کے وقت سے کافی عرصہ پہلے عبادت اور دعاؤں کے لیے شب بیدار رہتے۔ آپ ہر روز شام کو بہشتی مقبرہ اور عام قبرستان میں بھی جاتے اور...... اہلِ قبور کے حق میں دعا کرتے۔''

فاضل مصنف مزید لکھتے ہیں: ''قادیان میں قیام کے مختصر عرصہ میں آپ نے جملہ درویشوں میں اپنے حسنِ اخلاق کی وجہ سے کافی ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ جملہ امور میں نیکی، تقویٰ اور خشیت اللہ کے ساتھ آپ جماعتی مفاد کو ہر وقت پیشِ نظر رکھتے تھے۔ آپ کی ہر بات میں انتہائی عاجزی اور انکساری کا وصف نمایاں نظر آتا تھا۔''

وہ فروری ۱۹۴۸ء میں اچانک شدید بیمار ہو گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کی یہ بیماری اعصابی کمزوری، ذہنی دباؤ اور غیر معمولی شب بیداری کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو اسی حالت میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ وہ قادیان میں وفات پانے والے پہلے درویش تھے۔

حافظ نور الٰہی کی پہلی شادی حسین بی بی نامی ایک خاتون سے ہوئی تھی مگر وہ سِل کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں خود اصرار کر کے مرحوم کی شادی حاکم بی بی نامی ایک بے اولاد بیوہ سے کرادی جو اباجی کی سگی خالہ تھیں۔

شوہر کی وفات کے بعد حاکم بی بی اپنے گاؤں موضع گڑھی کالا منتقل ہو گئیں لیکن ربوہ آتی رہتی تھیں۔ ان کا تعلق علاقے کے ایک پیر خاندان سے تھا لہٰذا قبولِ احمدیت کے باوجود ان پر سابقہ رنگ غالب رہا اور وہ ضرورت مندوں کو تعویذ دیا کرتی تھیں۔ اپنی آخری بیماری کے دوران وہ ربوہ میں مقیم رہیں اور ان کا زیادہ وقت ہمارے گھر میں گزرا۔ انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کے بھانجے کے مالی حالات بس ایسے ہی ہیں چنانچہ انہوں نے کئی بار امی سے کہا کہ اگر وہ پسند کریں تو وہ مرغی کے انڈے کے خول پر ایک تعویذ لکھ دیں گی اور جتنا عرصہ یہ خول کسی محفوظ جگہ پڑا رہے گا مالی تنگی اس گھر کا رُخ نہیں کر سکتی۔ امی کی تربیت احمدیت کے ماحول میں ہوئی تھی اور وہ تعویذ گنڈے پر یقین نہیں رکھتی تھیں لہٰذا انہوں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا۔

حاکم بی بی جنہیں اباجی کی دیکھا دیکھی ہم بھی ماسی جی کہنے لگے تھے پنجاب کی دیہاتی خواتین کی طرح دھوتی پہنتیں اور برقع کے بغیر رہتیں۔ وہ ایک ہنس مکھ خاتون تھیں لیکن آخری عمر میں دمہ نے انہیں بے حال کر دیا اور وہ رات بھر سو نہ سکتی تھیں۔ لیٹتیں تو کھانسی کا شدید حملہ ہو جاتا لہٰذا انہوں نے سردیوں کے وہ چند مہینے رات رات بھر بیٹھ کر گذارے۔ انہیں بلغم بکثرت آتی تھی لیکن جگہ کی تنگی کے باعث ہم سب اسی کمرہ میں سونے پر مجبور تھے۔ اپنی وفات سے کچھ دن پہلے وہ چچا ابراہیم کے گھر منتقل ہو گئیں۔ آپی بتاتی ہیں: ماسی جی ہمیشہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مدینہ شریف میں موت دے۔ وہ مدینے تو نہ پہنچ سکیں البتہ ان کی زندگی کے آخری کچھ مہینے ربوہ میں گزرے اور وہ دفن بھی یہیں ہوئیں۔

ان کی وفات کی اطلاع گاؤں پہنچی تو ان کی بعض عقیدت مند خواتین تعزیت کے لیے ربوہ آنے لگیں۔ اباجی نے ایک بار مجھے ایسی دو یا تین خواتین کے ساتھ ماسی جی کی قبر پر بھجوایا تھا۔ وہ اپنے ہمراہ کچھ گندم لائی ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے یہ گندم قبر پر پھیلائی تو مجھے تعجب ہوا کہ میں نے اس سے پہلے یہ کام ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خواتین نے شاید میری حیرت کو محسوس کر لیا تھا چنانچہ انہوں نے کہا: ''پُتر۔ چڑیاں اے کنک چگن گیاں تے اوس دا ثواب ماسی نُوں پہنچسی۔''

حافظ نورالٰہی کی ماسی جی سے تو کوئی اولاد نہ تھی البتہ ان کی پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا موجود تھا۔ ان کے نام علی الترتیب ممتاز، ریاض اور خالد تھے۔ حافظ نورالٰہی کی وفات پر یہ بچے لاہور آ گئے اور انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ حافظ نورالٰہی قادیان میں وفات پانے والے پہلے درویش تھے اور انہوں نے حضور کے ساتھ عقیدت کا بے مثال نمونہ پیش کیا تھا چنانچہ حضور نے خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۸ مئی ۱۹۴۸ء میں جہاں حافظ نورالٰہی کا ذکرِ خیر کیا وہیں ان کی سب سے بڑی صاحبزادی کا بھی تعریفی رنگ میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''میں دیکھتا ہوں کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جو قربانی سے گریز کرتے اور بھاگتے ہیں اور ایک وہ لوگ ہیں جو قربانی میں ہی لذّت محسوس کرتے ہیں۔ حافظ نورالٰہی صاحب کا ایک ہی بچہ ہے اور وہ بھی ابھی چھوٹا اور نابالغ ہے۔ کوئی جائیداد بھی ایسی نہیں جو گذارا کے لیے کافی ہو۔ صرف تنخواہ پر انحصار تھا جو اُن کی وفات کی وجہ سے جاتی رہی۔ لڑکیاں بھی بے شادی کے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال کی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئی۔ حافظ صاحب کی بہن بھی ساتھ تھیں۔ اِس نظارے کا مجھ پر اب تک اثر ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اُن کے حالات ایسے نہیں جو گذارا کے لحاظ سے اچھے سمجھے جا سکتے ہوں۔ اس کا میری طبیعت پر اثر ہوا اور دل میں کچھ سوز پیدا ہوا۔ میں نے سمجھا کہ مجھے اس لڑکی کو اور اس کے دوسرے رشتہ داروں کو تسلی دینی چاہئے لیکن اس لڑکی نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی کہا: دیکھیں جی ہمارے اباجی کا کیسا اچھا انجام ہوا کہ وہ خدا کی راہ میں فوت ہو گئے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہوتا ہے کہ انسان کو ایسی موت نصیب ہو۔ یہ ہمارے لئے کتنی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے اُن کا کیسا اچھا انجام کیا۔ میری طبیعت پر اس بچی کی بات کا بڑا ہی گہرا اثر پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آواز میں کسی قسم کا ارتعاش نہیں تھا، کسی قسم کا اضطراب نہیں تھا۔ جتنی دیر وہ میرے پاس رہی اطمینان سے بیٹھی رہی۔ غم کا اُس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اُس کی پھوپھی بھی ساتھ تھی۔ پھوپھی تو شاید غیر احمدی تھی۔ اس پر اپنے بھائی کی وفات کی وجہ سے آثارِ غم تھے لیکن لڑکی برابر اسی رنگ میں گفتگو کرتی رہی اور گھر جا کر اس نے جو چٹھی لکھی اُس میں بھی یہی لکھا کہ ہماری یہ کتنی خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ کو قادیان میں جان دینے کی توفیق دی ہے۔ یہ نمونہ ہے اُن لوگوں کے لیے جو قادیان جانے سے گھبراتے ہیں۔''

حضور کا یہ خطبہ سن کر چوہدری فقیر محمد ڈی ایس پی کو تحریک پیدا ہوئی کہ وہ کیوں نہ حافظ نورالٰہی کی اس بیٹی کا رشتہ اپنے لئے مانگ لیں۔ ان کی خواہش کے مطابق یہ شادی ان ہی دنوں ہوگئی۔ وہ اس شادی پر بہت خوش تھے چنانچہ انہوں نے الفضل (۱۲ جنوری ۱۹۴۹ء) میں ''میرے اللہ کا ایک تازہ احسان'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھا: ''حضور کے خطبہ نے جو رشک حافظ صاحب مرحوم کی متقیانہ زندگی اور وفات کے متعلق پیدا کر دیا اس سے عملی راہ نکالنے اور اس مخلص خاندان سے رابطہ قائم کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوگئی۔ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ حضرت مصلح موعود نے میری درخواست پر خود تحریک فرما کر ۲۷ دسمبر کو عزیزہ ممتاز بیگم سے میرے نکاح کا اعلان فرمایا۔ عزیزہ ممتاز بیگم پر بھی ان کے والدِ مرحوم و مغفور کی طرح اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت صاحب کی نظرِ رحم و شفقت ہے اور اب نکاح کے بعد حضور نے علاوہ دعاؤں کے جیبِ خاص سے ایک گرانقدر رقم جہیز وغیرہ کے لیے عطا فرمائی۔''

یہ چوہدری فقیر محمد کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی موجود تھیں۔ آپی بتاتی ہیں: ''شادی کے بعد ہم سب لوگ اُن کے گھر گئے۔ ان کی پہلی بیوی چولہے کے آگے بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ہمیں دیسی گھی سے چُپڑی ہوئی روٹی اور چائے سے ناشتہ کرایا۔ امی ان کے اس حسنِ سلوک پر بہت حیران تھیں کہ اپنی سوتن کے رشتہ داروں کے ساتھ اس درجہ احترام سے پیش آنے کا جگرا صرف ایک نیک خاتون ہی کا ہوسکتا ہے۔''

میرا خیال ہے چوہدری فقیر محمد کا آخری تقرر چنیوٹ میں تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار ہم ان کے گھر گئے تھے۔ میں بہت چھوٹا بچہ تھا مگر ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر مرعوب ہوا تھا۔

چوہدری فقیر محمد جلد ہی ریٹائر ہوگئے۔ انہوں نے اپنی زندگی خدمتِ سلسلہ کے لیے وقف کردی اور ان کا تقرر بطور وکیل الدیوان ہوا تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا اور وہ اس شادی کے قریباً دو سال بعد ۳ نومبر ۱۹۵۱ء کو وفات پا گئے۔

ان کی وفات کے بعد ممتاز، ان کی بہن ریاض اور بھائی خالد، تینوں ربوہ ہی میں مقیم رہے۔ ممتاز بیوگی کے ایام گذار رہی تھیں، ریاض کالج میں پڑھتی تھیں اور خالد صدر انجمن احمدیہ کے ملازم تھے۔ بعد میں ممتاز کی کسی اور جگہ شادی ہوگئی۔ ایک بار وہ اپنے میاں کے ساتھ ربوہ آئیں اور ایک رات ہمارے ہاں قیام کیا۔ خالد بعد میں ربوہ کی سکونت ترک کر گئے۔ سنا ہے انہوں نے الیکشن کمیشن آف پاکستان میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ ریاض بھی ان ہی کے ساتھ ربوہ سے چلی گئی تھیں۔ کچھ پتا نہیں کہ اب یہ تینوں بہن بھائی کہاں اور کس حال میں ہیں۔

حافظ نور الٰہی کے بعد اب کچھ ذکرِ خیر چچا ابراہیم کا جو اپنے بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔

ان کے سب سے بڑے بھائی محمد اسحٰق تھے جنہوں نے بی ایس سی کرنے کے بعد اپنا تمام عرصۂ ملازمت ریاست بہاولپور میں استاد اور بعد ازاں ہیڈ ماسٹر کے طور پر گذارا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ منتقل ہو گئے تھے اور ۹ جولائی ۱۹۹۷ء کو تقریباً ترانوے سال کی عمر میں وفات پا کر یہیں دفن ہوئے۔ مرحوم انتہائی ہنس مکھ اور مرنجاں مرنج شخصیت تھے جو جہاں بیٹھتے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتے۔

انہیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ حضرت مسیح موعود نے انہیں عہدِ طفولیت میں ایک بار دیکھا تھا اور حضور کی توجہ سے وہ نہ صرف طاعون کے حملے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ و مامون ہو گئے بلکہ معجزانہ طور پر انہوں نے اپنے تمام بہن بھائیوں سے طویل زندگی پائی۔ ملاحظہ ہو اباجی کے ایک مضمون مطبوعہ الحکم کا یہ حصہ جس میں انہوں نے دادی جی (رفیقہ حضرت مسیح موعود) کی بعض روایات بیان کی ہیں۔ دادی جی بتاتی ہیں: ''جتنے دن میں قادیان میں رہی میرا یہ معمول تھا کہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں حضرت مسیح موعود کے گھر چلی جاتی اور گرمیوں کے ایام میں حضور کو کئی کئی گھنٹے پنکھا کرتی رہتی۔ محمد اسحٰق جو میرا بیٹا ہے اس کی عمر غالباً ڈیڑھ برس کے قریب ہوگی کہ وہ مرض طاعون میں مبتلا ہوگیا اور دو گلٹیاں نکل آئیں جن میں سے ایک گلٹی بغل میں نکلی اور دوسری بُنِ ران میں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل ہوا اور عزیزم محمد اسحٰق چند دنوں کے بعد تندرست ہوگیا۔ اس کے چند ماہ بعد میں قادیان آئی۔ ایک روز عصر کے بعد میں الدّار میں حضرت مسیح موعود کے قریب بیٹھ کر حضور کو پنکھا کر رہی تھی، بچہ میری گود میں تھا اور حضور اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے...... میں نے عرض کیا: ''حضور میرے اس چھوٹے بچے کو طاعون

کی دوگلٹیاں نکلی تھیں۔" میں نے یہ بات حضرت مسیح موعود ...
سے دو تین دفعہ فرمایا: "اس چھوٹے بچے ... گلٹیاں نکلی تھیں۔" میں نے عرض ... نیچے ... ت ... تب
ایک بن ران میں" حضور کی اس توجہ کا یہ اثر ہے کہ آج تک بھی ان مقامات پر ... ایک بغل میں اور
وبائی ایام میں اور نہ دوسرے دنوں میں۔" ... شکایت نہیں ہوئی۔

تایا اسحٰق کی شادی حضرت بھائی عبدالرحیم قادیانی جو حضرت مسیح موعود کے زمانے میں سکھ مذہب ترک کر کے جماعت میں شامل ہوئے تھے اور حضور کے رفقاء میں سے تھے کی صاحبزادی آمنہ بیگم سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس شادی کے نتیجہ میں مرحوم کو نو بیٹوں (محمد امین، محمد رفیع، محمد ہادی، محمد سلیم، محمد نعیم، محمد کریم، محمد جمیل، محمد شفیق اور محمد اقبال) اور تین بیٹیوں (نسیم اختر، رقیہ اور ثریا) سے نوازا۔ ان میں سے محمد سلیم اور محمد نعیم وفات پا چکے ہیں جب کہ باقی اولاد کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے اور ماشاءاللہ پوتوں اور نواسوں والی ہے۔

ان سے چھوٹے اباجی تھے جب کہ اباجی سے چھوٹے محمد اسماعیل فوق تھے جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ملازم تھے۔ ان کا آخری تقرر نارووال جنکشن پر بطور اسٹیشن ماسٹر تھا۔ اسی دوران ان پر فالج کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے کئی سال بہت تکلیف میں گذارے اور وہ اسی حالت میں ۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنے بیٹے منور احمد جاوید، چارج مین پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ کینٹ کے پاس مقیم رہے اور وفات پانے کے بعد وہیں دفن ہوئے۔

چچا ابراہیم سے چھوٹی دو بہنیں تھیں اور ایک بھائی۔ بہنوں کے نام رضیہ بیگم اور ناصرہ بیگم تھے جب کہ بھائی کا نام محمد یوسف تھا۔

رضیہ بیگم غیر شادی شدہ تھیں۔ وہ تئیس سال کی عمر میں ستائیس مئی ۱۹۳۸ء کو وفات پا گئی تھیں۔ اباجی کی ایک تحریر کے مطابق عمومی طور پر اُن کی صحت بہت اچھی تھی لیکن فروری ۱۹۳۷ء میں ان پر بیماری کا پہلا خطرناک حملہ ہوا۔ انہیں شدید بخار اور اسہال کی شکایت ہوگئی۔ مرض کی تشخیص بطور "تپ محرقہ اسہالی" کی گئی۔ کم و بیش تین مہینے کے بعد اس مرض کی علامات ختم ہوگئیں لیکن کچھ عرصہ بعد دوبارہ عود کر آئیں۔ اطباء کی رائے میں یہ سنگرہنی (یعنی پرانی پیچش) کا مرض تھا جو اس وجہ سے لاحق ہوگیا تھا کہ انتڑیاں تپ محرقہ اسہالی کی شدت کے سبب تقریباً ماؤف ہوگئی تھیں۔ بعض اطباء کی رائے تھی کہ یہ مرض سل الامعاء (یعنی انتڑیوں کی ٹی بی) کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ان کی نماز جنازہ حضرت سید سرور شاہ صاحب نے پڑھائی اور وہ قادیان کے عام قبرستان میں دفن ہوئیں۔

ناصرہ بیگم ملک نواب خان سے بیاہی ہوئی تھیں جو جنڈ ضلع اٹک کے ایک غیر احمدی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے اُن کے والدین اُن کی صغر سنی میں داغِ مفارقت دے گئے چنانچہ ان کی پرورش ان کے ایک تایازاد بھائی، ملک محبوب عالم نے کی جو محمودہ شریف میں کسی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

ملک نواب خان نے ان کی سرپرستی میں محمودہ شریف کے سکول میں داخلہ لے لیا لیکن جلد ہی محبوب عالم کی تبدیلی گورداسپور میں ہوگئی۔ اسی دوران محبوب عالم موصوف کو قادیان میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی زیارت

اور بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ اب انہوں نے ملک نواب خان کو بھی قادیان کے سکول میں داخل کرا دیا تاہم ان کی تعلیم کسی وجہ سے ادھوری رہ گئی اور وہ قادیان میں ہی حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد کے کارخانے میں کام کرنے لگے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ ساہیوال میں محبوب آرمز کمپنی کے نام سے اسلحے کا کام کیا لیکن دوبارہ لاہور منتقل ہو گئے اور باقی زندگی یہیں گذار دی۔ وہ ایک مختصر علالت کے بعد ۲۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کو وفات پا کر ربوہ میں دفن ہوئے۔

پھوپھی ناصرہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد کم و بیش انیس سال زندہ رہیں۔ انہوں نے یہ وقت انتہائی صبر و شکر کے ساتھ گذارا۔ وہ بے حد مہمان نواز اور اپنے بھتیجے بھتیجیوں سے بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے ۲۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو وفات پائی۔ وہ انتہائی مخلص احمدی اور موصیہ تھیں چنانچہ ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔

ان کے پسماندگان میں مسعود احمد، داؤد احمد، محمود احمد، محبوب احمد، گوہر احمد اور مظفر احمد نامی چھ صاحبزادے ہیں۔ داؤد اور محمود وفات پا چکے ہیں جب کہ باقی چاروں بیٹے کینیڈا میں ہیں۔ یہ تمام بچے بھی خوش خلقی اور مہمان نوازی میں اپنے والدین پر گئے ہیں۔

رہے چچا یوسف تو انہوں نے فوج سے فراغت کے بعد پرائیویٹ سیکٹر میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ بہت شفیق اور فراخ دل انسان تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور چچا یوسف انارکلی، لاہور میں بشیر اینڈ کمپنی میں کام کرتے تھے میں ان کے پاس جاتا رہتا تھا۔ وہ میری کچھ نہ کچھ خاطر مدارت ضرور کرتے اور اٹھنے لگتا تو ان کی جیب میں جتنے پیسے ہوتے نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیتے کہ اور کچھ نہیں تو آنے جانے کا کرایہ ہی سہی۔ بعد میں انہوں نے گدّو بیراج پر ملازمت اختیار کر لی اور کچھ کاروبار بھی کیا۔ انہوں نے چند روزہ علالت کے بعد انیس اکتوبر ۱۹۷۹ء کو وفات پائی اور ربوہ میں دفن ہوئے۔

ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ، حفیظہ بیگم کے علاوہ چار صاحبزادے (محمد امین، محمد انور، محمد اسلم اور محمد اشرف) اور تین بیٹیاں (امینہ، سلمیٰ اور فوزیہ) شامل ہیں۔ محمد امین کے علاوہ تینوں بیٹے اور امینہ جرمنی میں ہیں جب کہ باقی بچے پاکستان میں ہیں۔ یوں تو یہ سارے بچے ماشاء اللہ بہت ملنسار ہیں لیکن میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انور تو بہت ہی محبت کرنے والے انسان ہیں۔ مجھے چار بار ان کے پاس جرمنی میں مختصر قیام کا موقع مل چکا ہے اور میں بڑی خوشی کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ انہوں نے میری عزت افزائی میں کوئی کسر روا نہیں رکھی اور مجھے ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کی۔

جب میں نے ہوش سنبھالا چچا ابراہیم تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں پڑھاتے تھے تاہم بعد میں ان کی خدمات تعلیم الاسلام کالج کو منتقل کر دی گئیں۔ مجھے ایک لمبا عرصہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ انتہائی بے نفس انسان تھے۔

چچا ابراہیم دو اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اپنے آبائی گاؤں موضع گھوگھیاٹ ضلع شاہ پور (حال سرگودھا) میں پیدا

ہوئے۔ انہوں نے میٹرک تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان سے، ایف اے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے اور بی اے دیال سنگھ کالج لاہور سے پاس کیا۔

بتایا جاتا ہے کہ دادی جی نے چچا ابراہیم کی پیدائش سے پہلے خواب میں حضرت اماں جان کو ایک مکان کی لپائی کرتے ہوئے دیکھا جس پر انہوں نے تعجب سے دریافت کیا کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔ تب اماں جان نے فرمایا: ''یہ مکان تمہارے اس بیٹے کے لیے بنا رہی ہوں جو اَب پیدا ہوگا۔'' مئی ۱۹۳۳ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی لاہور تشریف لے گئے اور احمدیہ ہوسٹل میں قیام فرمایا۔ ان دنوں چچا ابراہیم بھی وہیں مقیم تھے۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ خواب حضور کی خدمت میں برائے تعبیر لکھ بھیجا جس پر حضور نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا: ''لپائی صفائی کے لیے کی جاتی ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے پاک زندگی بسر کرنے کے سامان پیدا کئے اور ایسی طاقتیں دی ہیں کہ چاہیں تو نیک زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا قدم مکین کا ہوتا ہے جو کبھی اسے ناپاک کر دیتا ہے۔ یہ امر آپ سے تعلق رکھتا ہے۔''

جلد ہی اللہ تعالیٰ نے یہ خواب پورا ہونے کے اسباب پیدا فرما دیئے چنانچہ انہوں نے بی اے کا امتحان دینے کے بعد حضرت مصلح موعود کی خدمت میں اپنا وقف پیش کر دیا جسے آپ نے بکمال شفقت قبول فرماتے ہوئے انہیں تحریک جدید کے منتخب شدہ واقفین میں شامل کر کے امریکہ بھجوانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اور صوفی مطیع الرحمٰن سترہ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو قادیان سے رخصت ہو کر لندن پہنچے اور ایک ہفتہ قیام کے بعد امریکہ کے لئے روانہ ہوئے مگر چچا ابراہیم کو کسی وجہ سے امریکہ میں داخلے کی اجازت نہ مل سکی چنانچہ انہیں بوڈاپسٹ بھجوا دیا گیا۔ اسی دوران پورے یورپ پر جنگ عظیم دوم کے بادل منڈلانے لگے چنانچہ کم و بیش تین سال کے بعد انہیں قادیان واپس بلا لیا گیا۔

یہاں آ کر انہوں نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ٹی کا امتحان پاس کیا اور ان کا تقرر تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں بطور استاد ہوگیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تحریک پر پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں پنجاب یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے کر لیا اور جب تعلیم الاسلام کالج لاہور سے ربوہ شفٹ ہوا تو ان کی خدمات بحیثیت لیکچرر کالج کو منتقل کر دی گئیں جہاں وہ تا حیات تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ وہ صدر شعبہ ہونے کے علاوہ کنٹرولر امتحانات بھی تھے اور انہیں کچھ عرصہ جامعہ نصرت میں بھی پڑھانے کا موقع ملا۔

ان کی شادی ڈاکٹر سید رشید احمد کی بڑی صاحبزادی، نظیر فاطمہ کے ساتھ قرار پائی جن کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹوں اور چار بیٹیوں سے نوازا۔ بیٹوں میں سے بڑے وِنگ کمانڈر (ر) محمد زکریا داؤد ہیں جب کہ باقی بیٹوں کے نام محمد ادریس، محمد داؤد اور محمد الیاس ہیں۔ بیٹیوں میں سے بڑی رضیہ ہیں جنہوں نے ایم اے ریاضی کر رکھا ہے اور مدتِ دراز سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ صالحہ اپنے پھوپھی زاد، ملک مسعود احمد سے بیاہی ہوئی ہیں اور لمبا عرصہ بحرین گذارنے کے بعد اب کینیڈا میں ہیں۔ دو چھوٹی بہنیں، شاہدہ اور قدسیہ پاکستان میں

مقیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے چچا ابراہیم کی ساری اولاد اب تو بھی صاحب اولاد ہے۔
چچا ابراہیم کو تربیت اولاد کی ہر دم فکر رہتی تھی۔ وہ جہاں بچوں کو اس دنیا میں کامیاب و کامران دیکھنا
چاہتے تھے وہیں وہ ان کی اُخروی زندگی میں فلاح کے بھی خواہشمند تھے چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو
حافظ کلاس میں داخل کروایا۔ ان کے بیٹے زکریا داؤد کا بیان ہے: ''ابا جان سونے سے پہلے ہم بچوں کو میتھ،
انگلش اور عربی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر وہ اپنا اگلے دن کا لیکچر تیار کرتے اور تھوڑی دیر ستانے کے بعد تہجد کے
لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ میں اس وقت چھوٹا تھا اور حیران ہوا کرتا تھا کہ وہ آخر سوتے کب ہیں!''

وہ ۶ جولائی ۱۹۶۸ء کو مغرب کے وقت اچانک وفات پا گئے۔ میں ربوہ سے باہر تھا لہٰذا ان کے جنازہ
میں شامل نہ ہو سکا جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا لیکن تنہا میں ہی اس محرومی پر افسوس کرنے والا نہیں ہوں۔ ان
کے شاگرد، رفیقِ کار اور محبِ خاص، چوہدری حمید احمد کہتے ہیں: ''میں ناصر صاحب کی شخصیت سے بے حد متاثر
ہوں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں سکول میں ان سے پڑھتا بھی رہا ہوں۔ میں نے انہیں بے حد محنتی، مخلص
اور مونس و ہمدرد پایا۔ کالج کے بعض اساتذہ اور کچھ دیگر افراد جمعہ کے جمعہ ان کے گھر جمع ہوتے تھے۔ ہم نے
اسے جمعہ پارٹی کا نام دے رکھا تھا۔ اس پارٹی میں باقاعدگی سے شامل ہونے والوں میں بعض دیگر دوستوں کے
علاوہ صاحبزادہ مرزا رفیع احمد، رفیق ثاقب، شریف خالد اور محفوظ الرحمان شامل تھے۔ وہاں دنیا جہان کی باتیں
ہوتیں۔ جماعتی موضوعات کے علاوہ لطیفہ بازی اس محفل کا خاصہ تھا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد بالعموم وہاں
تو نہ آتے لیکن وہاں جمع ہونے والوں کو کبھی کبھار اپنے گھر کھانے پر بلا لیا کرتے تھے۔ پروفیسر ابراہیم ناصر اس
حدیثِ مبارکہ سے واقف تھے جس کے مطابق نماز جمعہ ادا کرنے والے کو اسی روز ایک نکاح اور ایک جنازے میں
شمولیت کا موقع مل جائے اور وہ کسی بیمار کی عیادت بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کے پچھلے سارے گناہ
معاف فرماتے ہوئے اپنی مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لیتا ہے۔ اُس زمانے میں جمعہ کے بعد کسی نہ کسی نکاح کا
ضرور اعلان ہوتا تھا اور اکثر اوقات کوئی نہ کوئی میت بھی ربوہ پہنچ جاتی چنانچہ ناصر صاحب نے معمول بنا رکھا تھا کہ
نکاح اور جنازہ میں شمولیت کے بعد وہ حضرت حافظ سید مختار شاہجہانپوری کی عیادت کے بعد اپنے گھر پہنچتے۔''

''جب وہ فوت ہوئے'' چوہدری حمید احمد مزید بتاتے ہیں ''تو میں طلبہ کا ایک گروپ لے کر ہائیکنگ کے
لیے گیا ہوا تھا اس لیے ان کے جنازے میں شامل نہ ہو سکا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ان کی وفات کی خبر سن کر
بلک بلک کر روتا رہا۔ ان کے جانے کا مجھے بہت دکھ ہے اور میں انہیں آج تک بھلا نہیں پایا۔''

میرے ساتھ ان کا رشتہ بزرگی کا تھا لہٰذا میں ان سے بے تکلف تو نہ تھا لیکن میں انہیں اپنے بچپن سے
دیکھتا چلا آیا تھا۔ میں شہادت دے سکتا ہوں کہ مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند اور دعا گو انسان تھے۔ وہ اپنی صحت کی
کمزوری کے باوجود کم از کم ایک نماز ضرور بیت مبارک میں ادا کرتے تھے۔ ہاں! جب صحت زیادہ خراب رہنے لگی
تو انہیں مجبوراً یہ سلسلہ بند کرنا پڑا تاہم وہ آخری دم تک بیت الانوار میں نماز ادا کرتے رہے۔

مرحوم کی ایک اور خوبی جس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ان کی صلہ رحمی ہے۔ جب میرے پھوپھا، ملک نواب خان

پر پریشانی کا دور آیا تو مرحوم نے ان کے سب سے بڑے بیٹے، مسعود کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول کر لی اور انہیں کئی سال تک اپنے گھر پر رکھ کر تعلیم دلائی۔ مرحوم نے دادی جی کی بہت خدمت کی اور اپنی ساس کی آخری علالت کے دوران لمبا عرصہ ان کی بھی دیکھ بھال کی۔ محترمہ نے ان ہی کے گھر وفات پائی اور یہیں سے ان کا جنازہ اُٹھا۔

انہیں ہومیو پیتھی سے طبعی اور فطری لگاؤ تھا اور اس طریق علاج میں کافی مہارت حاصل تھی مگر انہوں نے اسے ذریعہ معاش نہیں بنایا بلکہ اس کے ذریعہ مخلوق خدا کی بے لوث خدمت کو اپنا وتیرہ رکھا۔ خدا تعالیٰ نے مرحوم کے ہاتھ میں شفا رکھی ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کے ہاں وقت بے وقت مریضان آتے رہتے اور وہ پیشانی پر بل لائے بغیر ہر حاجتمند کی حاجت روائی اپنا فرض سمجھتے۔

مرحوم نے کئی سال تک نائب افسر جلسہ سالانہ کے طور پر کام کیا اور اس حوالے سے کارکنان جلسہ سالانہ کے ڈیوٹی چارٹ کی تیاری ان ہی کی ذمہ داری ہوتی۔

وہ محلہ دارالصدر غربی (جسے اب دارالصدر شمالی کہا جانے لگا ہے) کے اوّلین آبادکاروں میں سے تھے۔ دراصل یہ گھر ان کے خسر کی ملکیت تھا مگر ان کی ربوہ میں قیام کی خواہش پوری نہ ہو پائی۔ ان کی اچانک وفات کے بعد چچا ابراہیم تعلیم الاسلام ہائی سکول کے کوارٹروں سے مستقل طور پر اسی گھر میں منتقل ہو گئے۔

یہ مکان دو کنال رقبہ پر محیط تھا لیکن نامکمل ہونے کی وجہ سے اس کا صحن بہت وسیع تھا۔ چچا ابراہیم کی خواہش تھی کہ یہ صحن جنت نظیر باغیچے میں تبدیل ہو جائے لیکن مطلوبہ وسائل موجود نہ تھے۔ دُور کیا جانا اس کام کے لیے پورا پانی بھی مہیا نہ تھا۔ دراصل پانی کا واحد ذریعہ صحن کے ایک کونے میں لگا ہوا ایک نلکا ہی تھا جس سے بالٹیاں بھر بھر کر پودوں تک پہنچانا آسان کام نہ تھا۔ اُن حالات میں مالیوں کے ناز نخرے برداشت کرنا بھی دوبھر تھا۔ نتیجتاً درخت ٹُنڈ مُنڈ ہو گئے، کیاریوں کے پھول بن کھلے مرجھا گئے اور گھاس سوکھ گئی تو انہیں اپنا یہ مشغلہ مجبوراً ترک کرنا پڑا۔

اُن دنوں اس محلّہ میں کوئی بیت موجود نہ تھی چنانچہ انہوں نے اپنے بیرونی صحن میں ایک تھڑا نما بیت بنوا دی جس پر اہلِ محلّہ پنجوقتہ نماز ادا کرنے لگے۔ مرحوم نے بیت الانوار کی تعمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا چنانچہ یہاں نصب ایک یادگاری تختی کے مطابق اس بیت کی تعمیر ''چوہدری اللہ بخش کاہلوں صدر محلّہ اور محترم پروفیسر محمد ابرہیم ناصر صاحب مرحوم کی کوششوں سے......ہوئی۔''

اس دعا کے بعد کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے اب کچھ ذکر مرزا محمد یعقوب کا جو اپنے نام کے ساتھ ''واقفِ زندگی نمبر ا'' ضرور لکھا کرتے تھے۔ وہ حضرت مرزا محمد اشرف رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے، حضرت مرزا جلال الدین میر منشی کے پوتے اور میرے سگے ماموں تھے۔ ان کے بزرگان کا تعلق موضع بُلانی ضلع گجرات سے تھا لیکن ان کی اپنی تمام زندگی قادیان اور پھر ربوہ میں گذری اور انہوں نے یہیں وفات پائی۔

وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان سے اور ایف اے

اسلامیہ کالج، لاہور سے پاس کیا۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول میں انہیں جن اساتذہ سے براہِ راست اکتسابِ فیض کی سعادت حاصل ہوئی ان میں حضرت مولانا شیر علی بھی شامل ہیں جنہوں نے اس سکول کے سابق منیجر کی حیثیت میں ۹ مئی ۱۹۲۵ء کو اپنے دستِ مبارک سے انہیں ایک سرٹیفیکیٹ جاری کیا۔ یہ سرٹیفیکیٹ انگریزی میں ہے اور بطور تبرک ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

"I taught him English for two years in the high classes and found him very obedient and painstaking. I found very few students posessing such good character as he does and I believe that whosoever will come in contact with him will find out that he posesses a good moral character."

ماموں کی تمام زندگی خدمتِ دین میں گزری۔ ان کی طرف سے دفتر تحریک جدید کو ۲۶ جون ۱۹۵۳ء کو جو ذاتی کوائف فراہم کیے گئے اس میں درج یہ نوٹ سلسلے کے لیے ان کی خدمات کی کسی حد تک عکاسی کرتا ہے:

''چونکہ خدا تعالیٰ نے سیدنا حضرت مسیح موعود کی دعا کی برکت سے خاکسار کو زندگی عطا فرمائی اس لیے ہوش سنبھالتے ہی سلسلہ کا کام حسبِ توفیق کرنا شروع کیا اور پھر...... وقف میں آنے کے بعد پڑھائی اور دوسرے ضروری حوائج کے علاوہ سلسلہ کے مختلف کام دلی شوق کے ساتھ دن اور رات کی تمیز نہ کرتے ہوئے آنریری طور پر سرانجام دیتا رہا۔'' یوں انہیں محاسب، پرائیویٹ سیکرٹری، امورِ عامہ، نظامتِ جائیداد، پراویڈنٹ فنڈ اور ترجمۃ القرآن کے دفاتر میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ وہ اراضی سندھ اور سٹار ہوزری کے معاملات سے بھی متعلق رہے اور چودہ سال کا طویل عرصہ قادیان کے حلقہ بیت مبارک کے جنرل سیکرٹری، نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہیں کئی سال تک قادیان کی لوکل کمیٹی کے اجلاسوں کی کارروائی لکھنے کا موقع بھی ملا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، ماموں اپنے نام کے ساتھ ''واقفِ زندگی نمبر ۱'' ضرور لکھا کرتے تھے تاہم میں ان کے اس اعزاز کے پس منظر سے واقف نہ تھا۔ حال ہی میں مجھے دفتر تحریک جدید میں موجود اِن کی پرسنل فائل دیکھنے کا موقع ملا تو اس میں وکیل الدیوان کے نام ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک چٹھی محررہ ۴ جنوری ۱۹۶۶ء مل گئی جس سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں جب کہ وہ زیرِ تعلیم تھے خود کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں وقف کے لیے پیش کیا تاہم انہیں تعلیم جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ فائل سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ تحریک جدید کے اوّلین کارکن تھے اور ابتدا میں تنہا انہوں نے ہی یہ دفتر سنبھالا ہوا تھا۔ فائل میں اُن کی عمدہ کارکردگی پر حضور کے کلماتِ تحسین کا حوالہ بھی ملتا ہے چنانچہ وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں نظر آتے ہیں کہ ان کے ایک خط کے جواب میں حضور نے لکھا: ''آپ جو کام دفتر میں کر رہے ہیں بہت مبارک ہے اور حقیقی وقف عملی نمونہ سے ہی ثابت ہو سکتا ہے۔''

۹ نومبر ۱۹۳۴ء کو حضور نے وقفِ سہ سالہ کی تحریک فرمائی تو ماموں نے اپنے والد بزرگوار کے ذریعہ پھر وقف کی درخواست پیش کی جس پر حضور نے تحریر فرمایا: ''جزاکم اللہ۔ اللہ تعالیٰ اس نذر کو قبول فرمائے۔'' ماموں نے تحدیثِ نعمت کے طور پر حضور کے ۲۷ جنوری ۱۹۳۵ء کے ایک ارشاد کا بھی حوالہ دیا ہے جس

میں حضور نے پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت دی تھی کہ ''وقف کنندگان سے کہیں کہ وقف کے صحیح معنوں کے مطابق انہیں دفتر میں آج کل کام کرنا چاہیے کہ آج کل کام بڑھا ہوا ہے۔'' نیز یہ بھی فرمایا تھا کہ ''مرزا محمد یعقوب صاحب تو پہلے ہی کام کرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی چاہئے۔''

موصوف نے اپنی ذمہ داری کس محنت اور دیانتداری سے نبھائی اس کا کچھ اندازہ حضور کے نام انچارج، تحریک جدید کے خط محررہ چار اپریل ۱۹۴۶ء سے بھی ہوتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں: ''مرزا محمد یعقوب صاحب تحریک جدید کے سب سے پہلے کارکن ہیں اور جہاں تک خاکسار کو ان کے متعلق علم ہے وہ اس وقت تک نہایت جانفشانی سے اپنے کام کو ادا کرتے رہے ہیں۔ باوجودیکہ ان کی صحت کافی عرصہ سے خراب تھی جملہ کارکنان سے زیادہ ذوق شوق سے کام کرتے رہے..........''

انہوں نے خدمت کا یہ سلسلہ اسی جوش و جذبہ سے جاری رکھا تاوقتیکہ وہ ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہو گئے۔

وہ تحریک جدید کے اولیں کارکن تھے لہٰذا مربیان یا سلسلہ کے بعض دیگر افراد کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف سے دی جانے والی ہدایات ان کی نظر سے گزرتی رہتی تھیں چنانچہ انہوں نے ایک کتابچے کے آخر میں کچھ سفید صفحات لگا کر ان پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ایسی بعض ہدایات اور ارشادات اپنے ہاتھ سے نقل کر رکھے ہیں۔ یہ کتابچہ ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں سے دستیاب ہوا تھا اور فی الوقت میرے پاس محفوظ ہے۔ حضور کی یہ تحریرات ایک جماعتی امانت سمجھتے ہوئے ذیل میں نقل کی جا رہی ہیں:

موصوف کی ایک تحریر کے مطابق مندرجہ ذیل عبارت حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کو ''شیخ احمد اللہ صاحب مہاجر احمدی'' کو لکھ کر دی تھی:

''خدمتِ (دین) کا جذبہ بیشک اچھا جذبہ ہے لیکن شیطان ہر نیک راہ سے بھی گمراہی کی تعلیم دیا کرتا ہے اس لئے مومن کو نیک سے نیک کام میں بھی دعا اور محاسبہ نفس سے کام لیتے رہنا چاہئے۔

ایک غلط خیال ہم لوگوں میں پیدا ہوا ہے کہ جب ہم نے محنت کر دی ہے تو ہمارا فرض ادا ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس صداقت پر ایک جھوٹ کی انسان بنیاد رکھتا ہے یعنی وہ صحیح محنت سے کام نہیں لیتا اور اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ میں نے کام کر دیا، نتیجہ میرے اختیار میں نہیں حالانکہ کام تو فضول چیز ہے۔ وہ کام قابلِ قبول ہوتا ہے جس کا نتیجہ نکلے اور یہ ممکن نہیں کہ انسان محنت کرے اور صحیح محنت کرے اور اللہ تعالیٰ اسے اچھے انجام سے محروم رکھے۔ پس انسان کو اپنی ذمہ داری کام تک محدود نہیں سمجھنی چاہئے بلکہ بارآور اور نتیجہ خیز کام کرنا اس کا مقصود ہونا چاہئے اور اس کے بغیر اسے کسی صورت پر تسلی نہیں پکڑنی چاہئے۔ باقی صحتِ نیت بھی اور قوتِ عمل بھی اور نتیجہ سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس سے التجا اور اس سے دعا کرتے رہنا چاہئے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ایک اور تحریر جو آپ نے سید شاہ محمد کی درخواست پر ان کی کاپی پر مؤرخہ اٹھارہ اپریل ۱۹۳۶ء کو تحریر فرمائی کچھ اس طرح ہے۔ یاد رہے کہ سید شاہ محمد وہی بزرگ ہیں جنہوں نے

ایک طویل عرصہ انڈونیشیا میں شجرِ احمدیت کی آبیاری میں گذار...

''اللہ تعالیٰ آپ کا یہ جانا مبارک کرے۔ آپ دین کی خدمت کے لیے جاتے ہیں اور یہ عہد ایک بہت بڑا عہد ہے۔ اس کا پورا کرنا معمولی کام نہیں۔ رات دن نفس کا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے اور ہر روز رات کو سونے سے پہلے اپنے نفس سے پوچھنا چاہئے کہ کیا آج اس نے اس عہد کے پورا کرنے کے لیے کوئی کام کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے زبانی کہا تھا آپ کو چاہئے کہ جو کام دنیوی کریں وہ بھی اس طرح کریں کہ اس کام میں بھی آپ کا اور مرکز کا تعلق مضبوط ہو یعنی ایسی تجارت نکالیں جس میں آپ تحریک جدید سے مل کر کام کر سکتے ہوں اور دونوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اس طرح آپ کا تعلق مرکز سے مضبوط رہے گا اور آپ زیادہ سہولت سے کام کر سکیں گے۔

تقویٰ، دعا اور نیک نمونہ کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں کہ نیک نمونہ جو فائدہ پہنچا سکتا ہے باتیں اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ زبان جلد سیکھنے کی کوشش کریں۔ رپورٹ کو کام کا اعلیٰ حصہ سمجھیں اور ہرگز ناغہ نہ ہونے دیں۔ ہمت کو بلند رکھیں اور حوصلہ کو وسیع کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار ہو۔''

حضور نے مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۳۷ء کو یہ تحریر محمد اسحاق سیالکوٹی کو ان کی کاپی پر لکھ دی:

''اللہ تعالیٰ کی محبت سب اصول سے بڑا اصل ہے۔ اس میں برکت اور سب خیر جمع ہے۔ جو سچی محبت اللہ تعالیٰ کی پیدا کرے وہ کبھی ناکام نہیں رہتا اور کبھی ٹھوکر نہیں کھاتا۔ نمازوں کو دل لگا کر پڑھنا اور باقاعدگی سے پڑھنا، ذکرِ الٰہی، روزہ، مراقبہ یعنی اپنے نفس کی حالت کا مطالعہ کرتا رہنا، سونا کم، کھانا کم، دین کے معاملات میں نہیں نہ کرنا نہ سننا، مخلوقِ خدا کی خدمت، نظام کا ادب احترام اور اس سے ایسی وابستگی کہ جان جائے اس میں کمی نہ آئے (..) کے اعلیٰ اصول ہیں۔

قرآن کریم کا غور سے مطالعہ علم کو بڑھاتا ہے اور دل کو پاک کرتا ہے اور دماغ کو نور بخشتا ہے۔ سلسلہ کی کتب اور اخبارات کا مطالعہ ضروری ہے۔ خدا کے رسول اور مسیح موعود، اس کے خادم کی محبت خدا تعالیٰ کی محبت کا ہی جزو ہے۔ نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی نبی گزرا ہے، نہ مسیح موعود جیسا نائب..... تقویٰ اللہ ایک اہم شے ہے مگر بہت سے لوگ اس کے مضمون کو نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ سلسلہ کے وقار کو ہر دم سامنے رکھنا، بلند نظر رکھنا، مغلوبیت سے انکار اور غلبہ (......) کے لیے کوشش ہماری زندگی کا نصب العین ہونے چاہئیں۔''

مرزا محمد یعقوب تحریک جدید کے پختہ کوارٹرز کی تعمیر پر پہلے جونیئر کوارٹرز اور بعد میں میڈیم کوارٹرز میں رہائش پذیر رہے۔ یہ چار ایک طرز کے کوارٹرز تھے۔ یہاں حضرت محمد اسماعیل معتبر رفیق حضرت مسیح موعود، چوہدری شبیر احمد اور حسن محمد عارف ان کے پڑوسی تھے۔ بعد میں انہوں نے فیکٹری ایریا میں دس مرلے پر تعمیر شدہ ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا اور وہاں منتقل ہو گئے تاہم تحریک کے کوارٹرز کے مقابلے میں یہ ایک ڈربہ تھا جس میں انہوں نے باقی زندگی گذار دی۔

ان کی ملازمت کے آخری سالوں میں ان کی ایک آنکھ کی بینائی کالے موتیا کی وجہ سے ضائع ہو گئی اور دوسری آنکھ بھی سفید موتیا کی وجہ سے متاثر ہوئی۔ ان کی اہلیہ سکینہ بیگم (جو حضرت مسیح موعود کے رفیق،

حضرت مرزا محمد افضل کی صاحبزادی تھیں) بہت عرصے سے بیمار چلی آ رہی تھیں اور جب تکلیف حد سے بڑھ گئی تو کینسر تشخیص ہوا۔ وہ آخری دنوں میں فضل عمر ہسپتال میں داخل رہیں اور انہوں نے اسی کیفیت میں وفات پائی۔ موصوف کی ایک بیٹی اور ایک ہی بیٹا تھا لیکن ان دونوں کی شادیوں میں غیر ضروری تاخیر ہوگئی تھی۔ ان پریشانیوں نے ان کی صحت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور وہ ۲۶ فروری ۱۹۷۱ء کو انتقال کر گئے۔ مرحوم موصی تھے چنانچہ بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

روزنامہ الفضل نے اِن کی وفات کی خبر دیتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے ''تحریک جدید کے ماتحت سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی...... کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے خدمتِ دین کے لیے سب سے پہلے زندگی وقف کرنے کی سعادت پائی تھی۔''

مرحوم امی کے بڑے بھائی تھے۔ انتہائی سادہ، خاموش طبع، اپنے کام سے کام رکھنے والے اور دعا گو۔ انہیں کتب جمع کرنے کا بے حد شوق تھا چنانچہ ان کے پاس سلسلہ کی بے شمار کتابیں اور بعض پرانے رسائل کی مکمل فائلیں موجود تھیں۔ وہ اپنے فارغ اوقات ان کتب کے مطالعہ اور دیکھ بھال میں گذارتے۔ انہوں نے جلد بندی سیکھ رکھی تھی چنانچہ وہ اپنے شوق سے کتابوں کی جلدیں بنایا کرتے تھے اور یوں ان کے پاس ایک خاصی بڑی لائبریری موجود تھی تاہم ان کی وفات کے بعد یہ قیمتی سرمایہ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں اور کچھ دیمک کے ہاتھوں تلف ہو گیا۔

میں جب کبھی ان کے ہاں جاتا تو ممانی کو ان کے لیے لئی تیار کرتے پاتا۔ گھر میں میدہ موجود نہ ہوتا تو وہ آٹا کپڑ چھان کر کے میدہ نکالتیں اور اس میں نیلا تھوتھا ملا کر لئی بناتیں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ وہ لئی میں نیلا تھوتھا کیوں ملاتی ہیں تو انہوں نے جواباً کہا: ''تمہارے ماموں کہیں سے سن آئے ہیں کہ نیلا تھوتھا ڈال دیا جائے تو چوہے کتابوں کے پاس نہیں پھٹکتے۔''

جلد بندی کے جملہ لوازمات یعنی آر، ہتھوڑی، کٹر اور کھنڈوئی اور خاکی کاغذ، کپڑے، مضبوط دھاگے اور اَبری کا استعمال ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی سیکھ لیا اور پھر میں بھی اپنی کتابیں خود جلد کرنے لگا۔ اگر کچھ نہیں سیکھا تو وہ جُزو بندی ہے۔ جب مجھے اس فن پر کچھ عبور حاصل ہو گیا تو میں نے اپنی سکول کی کتابوں کے علاوہ اباجی کی بہت سی غیر مجلّد کتابیں بھی جلد کر ڈالیں۔ مرحوم کے پاس لوہے کا شکنجہ موجود تھا چنانچہ وہ دو چار کتابیں جلد کر لیتے تو انہیں شکنجے میں کس دیتے۔ میں نے کبھی شکنجہ خریدنے کے بارے میں نہیں سوچا چنانچہ کچھ کتابیں جلد ہو جاتیں تو انہیں اینٹوں کے نیچے دبا دیتا۔ کتابیں رات بھر اسی طرح پڑی رہتیں۔ اگلے دن اینٹیں ہٹا کر کتابیں نکالتا تو وہ بالعموم خشک ہو چکی ہوتی تھیں۔

مرزا محمد یعقوب کے صاحبزادے، مرزا محمد اسماعیل عمر میں مجھ سے سوا دو سال بڑے تھے اور سکول میں اسی نسبت سے مجھ سے سینئر تھے لیکن ان کا بہت سا وقت ضائع ہو گیا اور انہوں نے میٹرک میرے بعد پاس کیا۔ بدقسمتی سے وہ آگے پڑھائی جاری نہ رکھ سکے اور جون ۱۹۶۴ء میں تحریک جدید کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ سلیم الطبع تھے چنانچہ انہوں نے اپنی پہلی تنخواہ تعمیر بیوت الذکر فنڈ میں ادا کر دی جس کا اعلان چوہدری شبیر احمد،

کا ن		الفضل میں بہ ایں الفاظ کیا گیا ’’ مکرم مرزا محمد اسماعیل صاحب
وکیل المال تحریک جدید کی طرف سے		نے پہلی وصول شدہ رقم تینتیس روپے
میں ملازم ہوئے ہیں		وکالتِ دیوان تحریک جدید ربوہ جو امسال جون
ستاسی پیسے سالم کی سالم تعمیر (		) ممالک بیرون کے لیے ادا کر دی ہے۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء۔ ان کا یہ اخلاص
متقاضی ہے کہ جملہ قارئینِ کرام ان کے مستقبل کے روشن اور بابرکت ہونے کے لیے دعا فرمائیں اور ملازمین
حضرات اس نیک مثال سے فائدہ اُٹھائیں۔‘‘

ان کی شادی گوجرہ کے نواحی گاؤں، بھگتو پورہ کے مرزا یعقوب بیگ کی صاحبزادی الفت النساء سے ہوئی۔
مرحوم کی صحت کمزور تھی۔ ان کا نظامِ انہضام خراب رہتا تھا۔ آخری چند سالوں میں بلڈ پریشر بھی رہنے لگا۔ وہ اپنے عوارض کے لیے فضلِ عمر ہسپتال سے دوالیا کرتے تھے اور پرائیویٹ ڈاکٹروں اور حکیموں کے چکر بھی لگاتے رہتے تھے۔ شاید بلڈ پریشر نے ان کے دل کو بھی متاثر کر رکھا تھا لیکن وہ اس سے لاعلم تھے۔

ستمبر ۱۹۸۶ء میں امی شدید علیل تھیں۔ وہ فیصل آباد کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل تھیں اور مقدور بھر علاج معالجہ کے باوجود ان کی طبیعت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہ خبر سن کر اسماعیل بھی فیصل آباد آئے۔ وہ دوپہر کے وقت ہمارے گھر پہنچے اور میں انہیں لے کر ہسپتال گیا۔ مغرب سے ذرا پہلے انہوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس چل رہی تھی چنانچہ میں انہیں مائی دی جھگی میں جی ٹی ایس کے اڈے پر چھوڑنے گیا اور جب تک بس نہیں چلی ان سے گپ شپ میں مصروف رہا۔

عشاء کے بعد کسی وقت ربوہ سے اچانک ایک فون سے مجھے ان کی وفات کی اطلاع ملی۔ معلوم ہوا کہ وہ ربوہ پہنچ کر سیدھے اپنے گھر گئے اور پھر سائیکل پر صادقہ کے گھر جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ سٹیشن کے قریب انہیں گھبراہٹ شروع ہوئی جو صادقہ کے گھر پہنچتے تک خاصی بڑھ گئی۔ انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور وہ سینہ کے علاوہ کمر میں بھی درد محسوس کر رہے تھے۔ اُف رے حالات کا جبر! میرا بھانجا عمران اظہر انہیں سائیکل پر بٹھا کر ہسپتال لے گیا جہاں ایمرجنسی میں انہیں کچھ طبی امداد پہنچائی تو گئی لیکن آکسیجن فوری طور پر فراہم نہ ہو سکی۔ اسی دوران انہیں وارڈ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاہم عمران کے الفاظ میں ’’وارڈ پہنچتے تک ان کی گھبراہٹ بظاہر ختم اور جسم بے جان ہو چکا تھا۔ وارڈ میں ان کے دل کو دوبارہ متحرک کرنے کی کوشش کی گئی تاہم اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔‘‘

مجھے ان کی وفات کی خبر پر پہلے تو یقین ہی نہ آیا۔ ’’اسماعیل بیچارہ فوت ہو گیا!‘‘ میرے منہ سے نکلا ’’یہ کیسے ممکن ہے۔ دو تین گھنٹے پہلے تک وہ بالکل ٹھیک تھا اور سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے‘‘ تاہم موت ایک ایسی حقیقت ہے جس پر نہ چاہتے ہوئے بھی یقین کیے بنا کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا چنانچہ میں نے فوراً ربوہ جانے کی تیاری شروع کر دی اور اسی رات ربوہ پہنچ گیا۔ اس وقت تک میرے پھوپھی زاد، گوہر لاہور سے ربوہ پہنچ کر میت کو غسل دلا چکے تھے۔ اگلی صبح ان کا جنازہ ہوا جس میں ان کے دوست احباب کی ایک بڑی تعداد شامل ہوئی۔ مرحوم کی تدفین ربوہ میں عمل میں آئی۔

اسماعیل نے اپنے پیچھے بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کی وفات کے وقت یہ بچے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا ادریس تھا جس کی عمر اُس وقت بمشکل پندرہ سال تھی۔ ان کا بظاہر کوئی معقول ذریعہ آمدنی بھی نہ رہا تھا لیکن جیسے تیسے وقت گزر گیا۔ اب بیٹا ماشاءاللہ برسرِ روزگار ہے اور تینوں بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔

مرزا محمد اسماعیل جنہیں میں عام گفتگو میں اسماعیل کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا میرے اچھے دوستوں میں سے تھے اور میں ربوہ میں ہوتا تو ان سے ملاقات میں شاید ہی کوئی ناغہ پڑتا۔ وہ بھی بکثرت ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔ وہ ہمارے ہر دُکھ سُکھ میں برابر کے شریک تھے اور ممکن حد تک ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کرتے۔

مرحوم کے دوستوں میں سے دفتر تحریک جدید میں ان کے ساتھی عبداللطیف، محمد اجمل، حبیب الرحمٰن، مرزا امتیاز احمد، سعید احمد اور بعض دوسرے لوگ شامل تھے۔ لطیف کئی سال پہلے کینیڈا چلے گئے تھے جب کہ اجمل اور حبیب وفات پا چکے ہیں۔ ہاں! مرزا امتیاز اور سعید ابھی تک دفتر تحریک جدید میں کام کر رہے ہیں۔

اسماعیل کی ایک ہی ہمشیرہ تھیں، امتہ الحفیظ۔ وہ عمر میں مجھ سے قریباً دس سال بڑی تھیں اور مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھیں اور ان کی لاڈلی بھی لیکن ان کے والد انہیں ایک روایتی مشرقی لڑکی کے رُوپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپا حفیظہ کو شعر کہنے کی صلاحیت دے رکھی تھی لیکن ان کے والدِ بزرگوار کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ جب کبھی ان کی شاعری کی وجہ سے آزردہ ہوتے تو کہا کرتے تھے: ''امتہ الحفیظ! (وہ ہمیشہ ان کا پورا نام لیتے تھے) اگر تم میری بیٹی ہو تو شعر کہنا چھوڑ دو۔'' ان کی بعض نظمیں مصباح میں چھپتیں اور لوگ تعریف کرتے تو ان کے والد بے حد پریشان ہو جاتے اور گھر آ کر اپنی بیٹی سے پھر وہی تکرار شروع کر دیتے۔

آپا حفیظہ نے میٹرک کا امتحان نصرت گرلز ہائی سکول ربوہ سے پاس کیا تھا۔ اگرچہ وہ جامعہ نصرت میں بھی پڑھتی رہیں تاہم بعد میں انہوں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کو ترجیح دی۔

اُن کی شادی شیخ بشیر احمد سابق امیر جماعت احمدیہ، لاہور کے ایک عزیز، شیخ احسان الٰہی سے ہوئی۔ ان کی رہائش سلطان پورہ میں تھی اور ان کی دکان جسے پان سگریٹ کا کھوکھا کہنا زیادہ مناسب ہوگا اسی مکان کے ایک حصے میں تھی۔ اس دکان سے ان کی آمدن نہ ہونے کے برابر تھی لہٰذا آپا حفیظہ کا یہ وقت بے حد تنگی میں گزرا۔

بظاہر ایک بڑے سے گھر میں ان میاں بیوی کے پاس صرف ایک کمرہ تھا۔ وہ اسی کمرہ میں کھانا بناتے اور اسی کمرے کے ایک کونے کو بطور غسل خانہ استعمال کرتے۔ اسی تنگ و تاریک کمرے میں ان کی زندگی کے کئی برس گزر گئے۔ اس گھٹن نے ان کی صحت پر بہت ناخوشگوار اثر ڈالا اور وہ پندرہ اپریل ۱۹۹۴ء کو وفات پا گئیں۔ مجھے اطلاع ملی تو میں ملتان سے ان کے جنازہ میں شمولیت کے لیے آیا۔ جنازہ بیت النور میں پڑھا گیا جس کے بعد ان کی تدفین احمدیہ قبرستان، ماڈل ٹاؤن میں ہوئی۔

آپا حفیظہ کی یادگار صرف ایک بیٹی ہے، فرحانہ جو بعد میں اصغر میر نامی ایک نوجوان سے بیاہی گئیں اور

آج کل علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں۔

فرحانہ کے پاس ایک نوٹ بک موجود ہے جس میں آپا حفیظہ نے اپنی بہت سی (اور ممکن ہے تمام) نظمیں جمع کر رکھی ہیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں جماعتی رسائل علی الخصوص مصباح میں چھپ چکی ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی ایک غیر مطبوعہ نظم بعنوان ''ربوہ'' صرف ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے شاملِ کتاب کی جا رہی ہے:

ربوہ کے ذرّہ ذرّہ سے ہے مجھ کو پیار کیوں؟
پڑھتا دل اس کا کلمہ ہے بے اختیار کیوں؟
کیا بات ہے کہ پیاری ہے اس کی گلی گلی
مائل اسی سمت ہے دلِ بے قرار کیوں؟
کس کی دعائے نیم شبی رنگ لائی ہے
ہے اس کے ذّرہ ذّرہ پہ چھائی بہار کیوں؟
بے آب و بے گیاہ وہ بنجر سی سرزمین
ہے آج اس پہ ہو رہا عالم نثار کیوں؟
دنیا میں حسن بکھرا ہے ہر سمت، سچ بتا
دل کھینچتے ہیں آخر ترے سبزہ زار کیوں؟
جو ایک بار آیا یہاں پھر نہ جا سکا
چھینا کسی کا تو نے ہے صبر و قرار کیوں؟
جو تجھ سے دور ہیں وہ تڑپتے ہیں ہجر میں
رہتے ہیں تیری یاد میں سینہ فگار کیوں؟
جو آج تک نہ تیری زیارت کو آ سکے
رہتی ہے ان کی آنکھ بتا اشکبار کیوں؟
ہے تیرا لوحِ قلب پہ نقشہ کھچا ہوا
مجھ کو ہے تجھ سے اور تجھے مجھ سے پیار کیوں؟

مرزا محمد یعقوب اور ان کی اولاد کے بعد اب کچھ باتیں اپنے خالو، قریشی محمد حنیف قمر المعروف ''سائیکل سیاح'' کے بارے میں جنہوں نے اپنی ساری زندگی اپنے مخصوص رنگ میں احمدیت کی اشاعت میں بسر کر ڈالی۔

قریشی محمد حنیف قمر کے والدِ گرامی کا نام حکیم کمال الدین تھا اور وہ موضع کنڈور، آزاد کشمیر میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک استاد، حضرت ماسٹر خلیل الرحمٰن رفیق حضرت مسیح موعود کے ذریعہ حضور کی بعثت کی خبر سنی تو فوراً کنڈور سے قادیان پہنچ گئے اور ۱۹۱۹ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ پھر وہ نظارتِ تعلیم و تربیت میں ملازم ہو گئے لیکن اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کی خبر سن کر یہ ملازمت چھوڑ دی اور گاؤں واپس چلے گئے۔

تین سال بعد وہ مستقل طور پر قادیان منتقل ہو گئے اور جب ملکانہ شُدھی کی لپیٹ میں آیا تو وہ اس تحریک کے مقابلہ کے لیے کی جانے والی کوششوں میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے آگرہ چلے گئے۔ انہوں نے یہیں سائیکل چلانا سیکھی اور اس پر اپنے طویل سفروں کا آغاز کیا۔ پھر وہ ڈھائی سال تک موضع سانڈھن میں مدرّس رہے۔ اسی زمانے میں ان کی شادی میری خالہ عزیز بیگم سے ہوئی۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے مگر بقضائے الٰہی دونوں بچپن ہی میں فوت ہو گئے اور ۱۹۲۷ء میں میری خالہ بھی وفات پا گئیں۔

اسی سال انہیں مرکز کی طرف سے موضع کیرنگ (اڑیسہ) میں مدرّس بنا کر بھیجا گیا مگر کچھ ہی عرصہ بعد بجٹ میں تخفیف کی وجہ سے انہیں اس ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اب انہوں نے اپنے طور پر کیرنگ، کندراپاڑا اور سونگھڑا میں دینِ حق کی اشاعت شروع کر دی اور کندراپاڑا کو مرکز بنا کر آٹھ سال تک علاقے میں تبلیغی دورے کرتے رہے۔

۱۹۳۵ء میں وہ کندراپاڑا سے برہمن بڑیہ چلے گئے اور متحدہ بنگال کے چوبیس اضلاع میں سائیکل پر ہزاروں میل سفر کر کے حضرت مسیح موعود کی بعثت کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے بنگال میں پانچ سال کام کیا اور ان کے ذریعہ درجنوں افراد سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد قادیان سے ہجرت کر کے پہلے لاہور میں، پھر گوجرانوالہ اور اس کے بعد شیخوپورہ میں رہے۔ ۱۹۵۳ء میں فیصل آباد کی جماعت میں تعلیم و تربیت کا موقع ملا۔ انہوں نے جولائی ۱۹۵۸ء میں لاہور سے سائیکل پر راولپنڈی، مری، اٹک، پشاور، چارسدہ، مردان، ٹوپی، ہری پور، ایبٹ آباد، مانسہرہ، بالاکوٹ، گڑھی حبیب اللہ، مظفر آباد اور کوہالہ کا طویل سفر کیا اور بے شمار لوگوں تک پیغامِ حق پہنچایا۔

اس تمام عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں درجنوں بار موت کے منہ سے بچایا اور قریباً تیس بار سخت خطرات سے نجات دلائی۔ ان کی اپنی روایت کے مطابق وہ بنگال، آزاد کشمیر اور راولپنڈی میں سات بار جاسوسی کے شبہ میں پکڑے گئے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے تفتیش پر ہر بار بے گناہ پائے گئے۔

قریشی محمد حنیف قمر نے ہندوستان اور پاکستان کے دُور دراز علاقوں میں سائیکل پر مجموعی طور پر پچپن ہزار میل سے زیادہ سفر کر کے لاتعداد لوگوں تک پیغامِ حق پہنچایا۔ ان کی سائیکل دیکھ کر بچے، بوڑھے سب متوجہ ہو جاتے اور دیکھتے دیکھتے ایک اچھا خاصا مجمع خود بخود لگ جاتا۔ آپ خوش الحان تھے یعنی نعتیں اور نظمیں سناتے، وعظ و نصیحت کرتے اور سوالوں کے جواب بھی دیتے۔ اکثر لوگ آپ کی باتیں حیرت سے سنتے اگرچہ بعض افراد شرارت سے بھی نہ چُوکتے۔

جن لوگوں نے یہ سائیکل دیکھ رکھی ہے وہ اسے دنیا کا آٹھواں اعجوبہ قرار دینے میں حق بجانب ہیں اور خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس پر اتنا ساز و سامان لاد کر میلوں سفر کرنا تو درکنار، اسے چلانا بھی کتنا مشکل ہو سکتا ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جنہیں یہ سائیکل دیکھنے کا موقع نہیں ملا میں روزنامہ تعمیر، راولپنڈی (۷ جون ۱۹۶۳ء) کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں اس سائیکل کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ یہ سائیکل جو بارہ فٹ لمبی اور نو فٹ اونچی ہے قریشی محمد حنیف قمر کے استعمال میں رہنے والی چوتھی سائیکل ہے جس پر وہ قریباً پندرہ ہزار میل سفر کر چکے

ہیں۔ اخبار کے مطابق اس سائیکل پر لادے ہوئے سامان کا وزن قریباً ڈیڑھ من ہے۔ اس سامان میں تین صندوقچے، دو بالٹیاں، ایک چھتری، تین مختلف سائز کے بورڈ، سائیکل مرمت کا سامان، بستر، کپڑے، ضروری کتب، تعارفی چارٹ، انگیٹھی، کچھ کوئلہ، کھانا پکانے کے برتن اور محدود مقدار میں خشک راشن شامل ہے۔

روزنامہ نوائے وقت نے ۱۸ جنوری ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں قریشی محمد حنیف قمر کی تصویر کے ساتھ یہ نوٹ شائع کیا:

''ضلع میر پور (آزاد کشمیر) کے موضع کنڈور کا ابولطیف قریشی محمد حنیف قمر اب تک سائیکل پر ۳۳ ہزار میل کا سفر کر چکا ہے۔ محمد حنیف قمر کو خاتم الانبیاء نبی آخر الزّمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت ہے اور وہ جہاں کہیں جاتا ہے رسولِ مقبول کی شان میں نعتیں پڑھتا رہتا ہے...... وہ عربی، فارسی، اردو، بنگالی اور دیگر زبانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیں سنا کر حاضرین کے اندر ایک دینی جوش اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ اب اس کی عمر پینسٹھ سال ہے۔ عربی، اردو، انگریزی کا خوشنویس اور پینٹر بھی ہے اور پنجابی کا شاعر بھی۔ اسی ذریعہ سے وہ اپنی روزی کماتا ہے۔ اسلامی کیلنڈر، دعائیں، نماز مترجم اور نعتوں کے چارٹ چھپوا کر فروخت کرتا ہے۔ مساجد پر کلمہ طیبہ اور آیات قرآنی و احادیث بھی لکھتا ہے۔ خوش الحانی سے جب وہ عمدہ عمدہ نظمیں اور نغمے سناتا ہے تو سینکڑوں لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ حنیف قمر اسلام کے فضائل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے پاکیزہ خصائل پر سکولوں میں لیکچر بھی دیتا ہے۔...... جنگلوں اور پہاڑوں کے سفر میں اپنا کھانا خود پکاتا ہے، ضروری برتن، انگیٹھی، کوئلہ اور راشن سب ساتھ ہے۔ ایسے صوفی اور مجاہد قرونِ اولیٰ میں ہی نظر آتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اس کی مثال شاذ ہی ملتی ہے۔''

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے میری خالہ ۱۹۲۷ء میں وفات پا گئی تھیں اور ان کی اولاد زندہ نہ تھی۔ اس کے بعد قریشی صاحب نے دو مزید شادیاں کیں جن سے اولاد بھی موجود تھی مگر انہوں نے ہمارے خاندان کے ساتھ روابط بدستور برقرار رکھے بلکہ اپنی اولاد کو بھی صلہ رحمی کی تاکید کرتے رہے۔ وہ ربوہ آتے تو سب عزیزوں سے ملاقات کرتے۔ جب ربوہ سے باہر ہوتے تو بھی بذریعہ ڈاک رابطہ رکھتے اور خاندان میں خوشی یا غم کے ہر موقع پر شمولیت کی کوشش کرتے۔ اگر کسی وجہ سے حاضر نہ ہو سکتے تو مبارکباد یا افسوس کا خط ضرور لکھتے اور موقع پاتے ہی ملاقات کر کے اپنے اخلاص و محبت کا گرویدہ بنا لیتے۔

قریشی صاحب شاعر تھے۔ ۱۹۶۳ء میں اللہ تعالیٰ نے آپا اور صادقہ کو بیٹوں سے نوازا۔ اُنہیں اطلاع ہوئی تو انہوں نے اباجی کے نام ایک منظوم خط کے ذریعہ ہدیۂ تبریک ارسال کیا۔ یہ منظوم خط اُن کے ذکرِ خیر کے طور پر ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

خدا کے تو احسان ہیں بے شمار
وہ کرتا ہے بندوں سے اپنے پیار
ہر اک مُضطرب کی ہے سُنتا دعا
وہ دیتا ہے بندوں کو اپنے شفا
اب ایسے ہی احسان اس نے کئے
کہ رحمت سے فرزند اس نے دیئے
مری بچیوں کے کِھلے پُھول ہیں
ہوئے پیدا گوہر یہ انمول ہیں

بہت عاجزانہ دعاؤں کے بعد
ترے فضل کی یہ بشارت ملی
انہیں تو خدایا نمازی بنا
کریں خدمتِ دین ہر رنگ میں
منور تو کر دین کے علم سے
پھر اخلاقِ نبوی کا وارث بنا
کروں ختم خط کو اب آخر جناب
خدا ہی کے آگے ہے عجز و نیاز

تمناؤں اور التجاؤں کے بعد
خدایا تو کر ان کو اپنا ولی
جہادوں کے میداں کا غازی بنا
فتح دے خدا ان کو ہر جنگ میں
محبت، مروّت سے اور حلم سے
خوشی باپ ماں کو تو ان کی دکھا
دعا ہے کہ پائیں خدا سے خطاب
خدایا تو بخش ان کو عمریں دراز

قریشی سعید احمد اظہر مربی سلسلہ جو قریشی محمد علی اظہر، رفیق حضرت مسیح موعود اور سابق استاد، تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے صاحبزادے تھے ۳۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ وہ آٹھویں جماعت کے بعد مدرسہ احمدیہ میں داخل ہوئے اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے علاوہ جامعہ احمدیہ سے شاہد کی ڈگری حاصل کی۔

اُن کا نکاح ۲۹ دسمبر ۱۹۵۸ء کو میری سب سے چھوٹی ہمشیرہ، صادقہ سے ہوا اور رخصتی کی تقریب ۱۳ فروری ۱۹۶۱ء کو عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق کے نتیجے میں انہیں دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔

انہوں نے ایک نہایت فعّال زندگی گذارنے کے بعد ۶ جون ۲۰۰۵ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

بھائی سعید کی شادی کے وقت میں نویں جماعت میں تھا اور جون ۲۰۰۵ء میں جب ان کی وفات ہوئی تو میں تکمیلِ ملازمت کے بعد ریٹائر ہو چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں جو کم وبیش پینتالیس سالوں پر محیط ہے ان کا واحد ذریعہ آمدنی وہ الاؤنس تھا جو انہیں صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے بطور مربی ملتا یا پھر وہ پنشن جس کے وہ بعد از ریٹائرمنٹ حقدار قرار پائے۔ یہ آمدنی بہت محدود تھی۔ وسائل کی کمی گھروں میں بالعموم ناچاقی کا موجب بنتی ہے لیکن آفرین ہے ان پر، ان پینتالیس سالوں میں ان کے کسی خانگی جھگڑے کی کوئی اطلاع کم از کم مجھ تک نہیں پہنچی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے صادقہ کا کردار بھی قابلِ ستائش ہے جس نے ہر طرح کی تنگی ترشی کمال خندہ پیشانی سے برداشت کی لیکن کسی کے سامنے اپنی زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ یہی نہیں، انہوں نے اپنے کسی فعل سے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ان کے ذرائع آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی ہمت سے بڑھ کر مہمان نوازی کرتے اور کبھی کسی مہمان کو یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ اُس کی آمد اُن کے لیے کسی پریشانی کا باعث بنی ہے۔

انہوں نے اپنی ملازمت کا زیادہ عرصہ شیخوپورہ اور فیصل آباد میں گذارا۔ الحمدللہ وہ جہاں بھی رہے احبابِ جماعت کے دل میں گھر کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخوپورہ کے امیر جماعت چوہدری انور حسین اور فیصل آباد کے امیرِ جماعت، شیخ محمد احمد مظہر ان کے مداحوں میں سے تھے اور جب بھی ان کی تبدیلی صدر انجمن احمدیہ کے زیرِ غور آتی، وہ اسے کسی نہ کسی طرح رُکوا لیتے۔

۱۹۷۵ء کے آخر میں انہیں نائیجیریا بطور مربی بھجوایا گیا جہاں وہ تین سال مقیم رہے۔

جون ۱۹۸۱ء میں ان کی تعیناتی کینیڈا کے شہر کیلگری میں ہوئی لیکن چند ہی مہینوں کے اندر اندر انہیں مرکز واپس بلا لیا گیا۔ ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ ان کی فی الفور وطن واپسی کی کیا وجوہات ہیں لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی نے ان کے خلاف کوئی ایسی شکایت کی ہے جس کا خلیفہ وقت نے سختی سے نوٹس لیا ہے اور واقعی بات تھی بھی یہی۔ ان کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر دی گئی تھی جو بالکل خلافِ واقعہ تھی لیکن اسے نظام سلسلہ سے رُوگردانی کے مترادف قرار دیا جا رہا تھا۔

بھائی سعید کی ساری زندگی میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ ان کی خلافت سے وابستگی ہمیشہ شک وشبہ سے بالاتر رہی تھی اور کم از کم میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نکلی ہوگی۔ بہرحال انجمن نے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے اس سارے معاملے کا بغور جائزہ لیا۔ کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کے خلاف یہ شکایت بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ ان کے لیے بہت آزمائش کا زمانہ تھا۔ ۱۹۵۳ء (جب وہ جامعہ احمدیہ سے شاہد کرنے کے بعد شیخوپورہ میں مربی تعینات ہوئے تھے) سے لے کر اُس وقت تک کا سارا عرصہ انہوں نے نظامِ جماعت کی مکمل پاسداری میں گذارا تھا اور ان میں کسی قسم کی کوئی کجی نہ دیکھی گئی تھی۔ پھر یکا یک ان پر اتنے بڑے الزام کا لگ جانا ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا مگر انہوں نے اس موقع پر صبر واستقامت کا بے نظیر نمونہ پیش کیا۔

جب وہ کینیڈا سے واپس آئے تو ان کا ویزا دوبارہ وہاں جانے کے لیے استعمال ہو سکتا تھا۔ ان کے کئی ''ہمدردوں'' نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس انکوائری کا سامنا کرنے کی بجائے وہیں واپس چلے جائیں اور اگر اس وجہ سے ان کی وقف سے فراغت بھی ہوتی ہے تو انہیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس مشورے نے انہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ مجھے یاد ہے میں ان دنوں پشاور میں تعینات تھا۔ وہ وہاں تشریف لائے اور اس موضوع پر بھی بات ہوئی لیکن خدا کا شکر ہے ان کے قدم ڈگمگائے نہیں۔ بالآخر حالات وواقعات نے ثابت کر دکھایا کہ ان کی طرف منسوب کی گئی باتیں غلط تھیں چنانچہ انہیں عزت کے ساتھ اپنے مقام پر بحال کر دیا گیا۔

اُنہیں جولائی ۱۹۸۶ء میں یوگنڈا بھجوایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں اپنے فرائض منصبی بہت احسن پیرایہ میں ادا کرنے کی توفیق ملی جس کی سب سے بڑی شہادت حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے بعض خطوط سے ملتی ہے۔ اس سلسلے میں حضور کا خط محررہ ۵ جولائی ۱۹۹۰ء پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حضور فرماتے ہیں:

''آپ کی رپورٹ کارگزاری ماہ مئی موصول ہوئی۔ ایک سو گیارہ بیعتوں سے بے حد خوشی ہوئی۔ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ وَبَارِکْ وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَھُمْ ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیوں سے نوازے اور آپ کی طرف سے ہمیشہ خوشیوں کی خبریں ملیں۔ اللہ کے فضل سے آپ کا کام نمبر ایک جا رہا ہے اور آپ کے شیخوپورہ کے دنوں کی یاد آ جاتی ہے جہاں آپ نے اللہ کے فضل سے تاریخی خدمت کی سعادت پائی تھی۔ اپنے بال بچوں کو جلدی بلوائیں اور یہیں اپنے گھر بنالیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اہل وعیال کی طرف سے ہمیشہ آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کرے۔''

حضور اُن کے کام سے ہمیشہ خوش رہے اور جب مئی ۱۹۹۲ء میں وہ واپس آ گئے تو یوگنڈا میں ان کی کمی محسوس کی جانے لگی۔ اس امر کا ثبوت حضور کا ۷ نومبر ۱۹۹۳ء کا لکھا ہوا وہ خط ہے جس میں انہیں ''پیارے عزیزم سعید احمد صاحب اظہر'' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ حضور لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ نے یوگنڈا میں اچھا کام کیا ہے۔ شیخوپورہ میں بھی آپ کو باثمر کام کی توفیق ملی تھی۔ ہر حالت میں کامل وفا اور اطاعت اور حکمت کے ساتھ خدماتِ دینیہ بجالائے ہیں۔

افریقہ میں آپ نے مزاجاً مقامی لوگوں کے دل جیتے ہوئے ہیں۔ اس وقت یوگنڈا میں ہمیں اچھے، مناسب، تجربہ کار، دل موہ لینے والے نیک مگر ڈسپلن میں مضبوط امیر کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کو یوگنڈا کی امارت کی ذمہ داری سپرد کرنے کا پروگرام ہے۔

آپ مطلع فرمائیں کہ کب تک فارغ ہو کر جا سکیں گے۔ وہاں کی مقامی پریشانیاں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے اور جماعت یوگنڈا کا حامی و ناصر ہو۔''

مرحوم کی ایک بہت بڑی خوبی جس کا تذکرہ پہلے بھی بالوضاحت ہو چکا ہے۔ ان کی نظام سلسلہ کے ساتھ وابستگی ہے۔ عیدین کے موقع پر ربوہ میں موجود ہم جملہ رشتہ داران دوپہر یا رات کے کھانے پر ان کے ہاں ضرور اکٹھے ہوتے۔ خاصا بڑا مجمع ہو جاتا۔ ہر شخص بھانت بھانت کی بولیاں بول رہا ہوتا۔ اس مجمع میں مرحوم اپنی عمر اور علمی مرتبے کی وجہ سے سب سے نمایاں ہوتے اور ناپختہ ذہنوں میں اُٹھنے والے ہر سوال کے جواب کے لیے خیال ان ہی کی طرف جاتا۔ وہ ہر شخص کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے اور کبھی مذاق میں بھی ایسی کوئی بات نہ کہتے جس سے نظام کے خلاف بغاوت کی بُو آتی ہو۔

مغربی تہذیب سے کوسوں دُور ہونے کے باوجود انہوں نے بالعموم پینٹ اور بوشرٹ پہنی۔ سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپی ہوتی اور پاؤں میں سیاہ رنگ کے بوٹ چمک رہے ہوتے۔ وہ اپنے کپڑوں پر استری اور بوٹ پر پالش خود کرتے۔ گھر کے کام کاج میں اپنی اہلیہ کی مدد ان کا ہمیشہ شیوہ رہا۔ بسا اوقات چائے خود بنا لیتے اور مہمانوں کو بھی پیش کرتے۔ انہیں گفتگو کا ملکہ حاصل تھا۔ اپنی زندگی میں پیش آنے والے دلچسپ واقعات سناتے رہتے۔ اس حوالے سے مربی سلسلہ گیانی واحد حسین کی باتیں اکثر دہراتے۔ افریقہ میں دعوت الی اللہ کے دوران انہیں بعض خوفناک واقعات بھی پیش آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر آن حفاظت فرمائی۔ ایک واقعہ جو میں نے خود ان کی زبانی سنا تھا اور جسے ان کے صاحبزادے، اسامہ اظہر نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۲۳ جولائی ۲۰۰۵ء) میں بھی بیان کیا ہے کچھ اس طرح ہے:

ایک بار جب وہ مقامی دوستوں کے ہمراہ دورے پر کسی دوسرے شہر جانے کے لیے ایک جنگل میں سے گذر رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ دور ایک جگہ آگ جل رہی ہے اور اس پر ایک کڑاہ پڑا ہے۔ قریب ہی ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر خاتون جس کی آنکھیں سرخ ہیں بیٹھی ہے اور اس آگ کے گرد بڑی تعداد میں وحشی حبشی ناچ گا رہے ہیں۔ جب عورت کی نظر ان پر پڑی تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان کو پکڑ کر اس کے پاس لایا

انہیں اپنے ٹھکانے کی طرف دھکیلنا شروع
جائے چنانچہ حبشیوں نے آ کر ان کے گرد گھیرا ڈال لیا اور ناچنے گانے لگے۔ اس خاتون کے سامنے پیش ہوئے
کر دیا۔ وہ شروع میں تو گھبرائے مگر چند ہی لمحوں میں اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بھائی سعید کے ساتھی مقامی زبان سمجھتے
تو وہ غصے سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ ہم تجھے ذبح کریں گے، تیری بوٹیاں
تھے۔ انہوں نے بتایا: یہ خاتون کہہ رہی ہے کہ اے اجنبی! تو کدھر آ نکلا ہے۔
بنائیں گے اور اس کڑاہ میں تل کر کھائیں گے۔"

خاتون کے اس اعلان پر اس کے ساتھیوں نے پھر خوشی سے ناچنا گانا شروع کر دیا لیکن بھائی سعید نے اس عورت کے سر پر ہاتھ رکھا اور ترجمان کے ذریعہ اسے جواب دیتے ہوئے کہا: "ماں! ہم تو تیرے پاس اللہ کا پیغام پہنچانے آئے ہیں۔ اگر تو ہمیں ذبح کرنا چاہتی ہے تو تیری مرضی مگر ہم تو اتنی دور سے چل کر تیرے پاس صرف اس کا پیغام پہنچانے آئے ہیں جو تیرا بھی رب ہے اور میرا بھی رب ہے۔"

جب اس عورت نے ان کے منہ سے اپنے لیے ماں کا لفظ سنا تو اس کا سارا جوش کافور ہو گیا اور اس نے انہیں اپنے پاس بٹھا کر حال احوال پوچھا اور یہ بھی کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں۔ موقع پا کر انہوں نے خاتون کو دعوت الی اللہ شروع کر دی۔ خاتون یہ باتیں سن کر بے حد متاثر ہوئی اور اس نے اپنے ساتھیوں سمیت اسی وقت دینِ حق قبول کر لیا۔

مرحوم کی عمومی صحت بہت اچھی تھی۔ میں نے انہیں کبھی بیمار پڑتے نہ دیکھا تھا۔ اپنے دفتری فرائض کی بجا آوری میں انہیں بکثرت سفر کرنا پڑتا تھا اور سفر بھی ایسا جو کسی لحاظ سے آرام دہ نہ تھا۔ دور دراز دیہاتی جماعتوں میں جہاں ذرائع آمد و رفت بھی اتنے ترقی یافتہ نہ تھے ہنسی خوشی چلے جاتے اور کبھی شکوہ کا ایک لفظ بھی زبان پر نہ لاتے۔

وفات سے چند سال پہلے انہیں پراسٹیٹ کی تکلیف ہو گئی جس کی وجہ سے ان کا فضل عمر ہسپتال میں آپریشن ہوا۔ اس آپریشن کے مضمرات دیر تک چلتے رہے۔ ایک بار جب وہ اپنی بیٹی عزیزہ روحی نصیر کے پاس ملتان گئے ہوئے تھے انہیں شدید تکلیف نے آ لیا۔ ڈاکٹروں کی ابتدائی رائے یہ تھی کہ انہیں دل کا عارضہ لاحق ہے لیکن جب ان کی طبیعت ذرا سنبھلی اور وہ راولپنڈی میرے پاس تشریف لائے تو ٹیسٹوں سے پتا چلا کہ انہیں مثانے کا کینسر ہے۔ کئی بار ہسپتال میں داخل ہوئے لیکن ان کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی گئی جو بالآخر ان کی وفات پر منتج ہوئی۔

الفضل (۸ جون ۲۰۰۵ء) نے ان کی وفات اور تدفین کی خبر بایں الفاظ شائع کی: "سلسلہ کے قدیمی خادم مکرم قریشی سعید احمد اظہر مربی سلسلہ مورخہ ۶ جون ۲۰۰۵ء کو صبح دو بجے بعمر ۷۵ سال وفات پا گئے۔ آپ دو سال سے زیادہ عرصہ سے کینسر اور فالج کی وجہ سے صاحبِ فراش تھے۔ صبر کے ساتھ بیماری کا مقابلہ کرتے رہے۔ آپ کی نمازِ جنازہ ۶ جون ۲۰۰۵ء کو بعد نمازِ عصر مکرم راجہ نصیر احمد صاحب ناظر اصلاح و ارشاد مرکزیہ نے بیت مبارک میں پڑھائی۔ آپ خدا تعالیٰ کے فضل سے موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ میں تدفین کے بعد مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب وکیل اعلیٰ تحریک جدید نے دعا کرائی............"

ان کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے ان کے بڑے صاحبزادے کے نام اپنے خط مرقومہ
۹ جون ۲۰۰۵ء میں لکھا:

''پیارے عزیزم اسامہ اظہر صاحب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ۔ آپ کے ابا کی وفات کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا ہے۔ اناللہ وانا الیہ
راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان سے مغفرت کا سلوک فرمائے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو
صبر جمیل کی توفیق دے اور اُن کے بعد خود آپ سب کا نگہبان ہو۔
مرحوم خاموشی کے تحت مخلصانہ خدمت کرنے والے واقفِ زندگی تھے۔ ہر قسم کے ابتلا میں بڑی دعا کے
ساتھ اپنے عہدِ وقف کو نبھاتے رہے۔ جانے والوں کی جدائی بڑی شاق گذرتی ہے لیکن اللہ کی رضا کو ہمیں
بہرحال مقدم رکھنا ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والی ہستی صرف اُسی کی ہے۔
میری طرف سے اپنے سب عزیزوں کو دِلی تعزیت اور دعاؤں کا پیغام پہنچادیں۔
اللہ آپ کے ساتھ ہو۔

والسلام
خاکسار
مرزا مسرور احمد''

نامور خادمِ سلسلہ، کرم الٰہی ظفر اُن خوش قسمت افراد میں سے تھے جن کی زندگی کا ایک ایک پَل
حضرت مسیح موعود کے پیغام کی اشاعت میں گذرا اور جنہیں سپین میں دینِ حق کی نشأۃِ ثانیہ کی علمبرداری کا شرف
حاصل ہوا۔ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ارشاد پر ۱۹۴۶ء میں بطور داعی اِلی اللہ سپین گئے اور تمام تر مشکلات
کے باوجود تادم آخر وہیں مقیم رہ کر اپنا کام پورے جوش و جذبہ سے جاری رکھا۔
کرم الٰہی ظفر جو ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو موضع بنگہ پوسی ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے چوہدری اللہ بخش نامی
ایک بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان سے میٹرک کرنے کے بعد اپنی
زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے انہیں سپین کے لیے منتخب فرمایا تاہم ان کے
وہاں پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد جماعت نے مالی مشکلات کے باعث یہ مشن بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ تب اس
مردِ مجاہد نے ٹھان لی کہ حالات خواہ کچھ بھی ہو جائیں وہ یہیں اپنا کام جاری رکھیں گے اور اپنے لیے ذرائع معاش
بھی خود تلاش کرلیں گے۔ ان کے اپنے الفاظ میں: ''ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ برصغیر کی تقسیم ہوگئی اور
جماعتِ احمدیہ کا مرکز قادیان سے منتقل کرکے لاہور اور پھر ربوہ لایا گیا۔ یہ ایام جماعت کے لئے نہایت مشکل اور
مالی تنگی کے تھے اس لئے جماعت نے بامرِ مجبوری بعض مشنوں کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں فرانس اور سپین کے
مشن بھی شامل تھے۔ مجھے مرکز کی طرف سے ہدایت ملی کہ سپین کے مشن کو بند کر دیا جائے اور میں لندن چلا
جاؤں۔ یہ لمحہ میرے لیے بڑا مشکل تھا۔ میں نے کئی روز دعائیں کیں اور اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی۔ میرا دل نہیں
چاہتا تھا

چاہتا تھا کہ اس سرزمین کو چھوڑ دوں جہاں (.....) کا پودا بالکل ہی نازک اور کمزور تھا۔..... مرکز میرا خرچ اٹھانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ ایسے وقت میں سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا میں اپنا خرچہ یہاں خود اٹھا سکوں گا اور اس کے ساتھ ساتھ ( ) کا کام بھی کر سکوں گا۔ کئی روز سوچنے کے بعد آخر اس عاجز نے بتوکل علی اللہ دل کو مضبوط کیا اور حضرت مصلح موعود کی خدمت میں لکھا کہ یہ مشن بند نہ کیا جائے۔ مرکز خرچ بھجوائے یا نہ بھجوائے خاکسار کوئی کام کر کے آمد پیدا کر لے گا۔..... حضورِ اقدس نے از راہِ شفقت اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔''

حضرت مصلح موعود کی طرف سے سپین میں قیام کی اجازت ملنے کے بعد کرم الٰہی ظفر نے عطر سازی میں مہارت پیدا کی اور اس کام کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ اسی دوران انہوں نے اپنی جیب سے ایک خطیر رقم خرچ کر کے آپ کی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کا مقامی زبان میں ترجمہ شائع کیا جسے حکومت نے ضبط کر لیا لیکن موصوف نے ہمت نہ ہاری اور کسی طرح اس کا ایک نسخہ سپین کے حکمران، جنرل فرانکو تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ خدائی تصرف کے تحت جنرل فرانکو نے ایک خط کے ذریعہ اس کتاب پر پسندیدگی کا اظہار کیا تو کرم الٰہی ظفر کے لیے اس کتاب کی اشاعت کے راستے کھلنے لگے اور جب بھی حکومتی مشینری کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی مشکل پیدا کی جاتی تو کرم الٰہی ظفر جنرل فرانکو کا یہ خط دکھا کر متعلقہ حکام کا منہ بند کر دیتے۔

سپین میں قریباً سات سال قیام کے بعد کرم الٰہی ظفر ۱۹۵۲ء میں پاکستان آئے اور ان کی شادی میرے تایا، محمد اسحاق کی صاحبزادی رقیہ بشریٰ (جنہیں ہم اپنے گھر میں ''باجی رقیہ'' کہتے ہیں) سے ہوئی۔ میں ان دنوں تیسری جماعت میں تھا جب کہ وہ جامعہ نصرت میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھیں۔ ظاہری سی بات ہے ہماری عمروں میں تفاوت کی وجہ سے میری ان سے بے تکلفی تو نہ ہو سکتی تھی لیکن ان کا چچازاد ہونے کے ناطے میں اس گھر کے حالات سے بہت حد تک باخبر تھا۔

باجی رقیہ حضرت بھائی عبدالرحیم قادیانی رفیق حضرت مسیح موعود کی نواسی ہیں۔ بھائی عبدالرحیم انتہائی نیک، مستجاب الدعوات اور صاحب رؤیا و کشوف بزرگ تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ قادیان میں درویشی کی زندگی گذاری جس کے بعد وہ یہاں تشریف لے آئے۔

ابا جی بھائی عبدالرحیم کے معتقدین میں سے تھے اور جب بھی موقع ملتا نمازِ عصر کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بہت دفعہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا اور یوں مجھے بھی بھائی جی کی باتیں سننے کا موقع ملتا رہا۔ بھائی جی تنہا زندگی گذار رہے تھے اور مبشر احمد نامی ایک نوجوان ان کی خدمت پر مامور تھے۔ گرمیوں کے دنوں میں عصر کے بعد بھائی جی کی چارپائی صحن میں ڈال کر ان کے بستر پر سفید چادر بچھا دی جاتی۔ جب ہم وہاں پہنچتے تو بھائی جی صاف ستھرے سفید لباس میں اس چارپائی پر لیٹے ہوتے۔ پاس ایک دو موڑھے پڑے ہوتے اور ہم ان موڑھوں پر بیٹھ جاتے۔

جب کرم الٰہی ظفر کے لیے رشتے کی تلاش شروع ہوئی تو ربوہ کی ایک معتبر خاتون نے جو باجی رقیہ کو اچھی طرح جانتی تھیں اور حسنِ صورت کے ساتھ ان کی حسنِ سیرت سے بھی آگاہ تھیں کہہ سن کر ان کا رشتہ کرم الٰہی ظفر

سے کرا دیا۔ ان کے نکاح کا اعلان ۲۵ جنوری ۱۹۵۴ء کو ہوا۔ نکاح کا اعلان خود حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے بھائی عبدالرحیم کے گھر جا کر کیا۔ خوش قسمتی سے میں بھی اس نکاح میں شامل تھا۔ اس موقع پر حضور نے جو خطبہ ارشاد فرمایا شائع ہو چکا ہے۔ خطبہ میں حضور نے مسرت کا اظہار فرمایا کہ اس نکاح میں ''ایک (مربی) سے تعلق پیدا کرنے کی خواہش نمایاں پائی جاتی ہے'' جو ''ایک نیکی کی بات ہے۔''

نکاح کے چند ہی روز بعد ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ حضور پُرنور نے رخصتی کے موقع پر خود تایا جی کے گھر جا کر دعا فرمائی اور اگلے روز کرم الٰہی ظفر کی دعوتِ ولیمہ میں بھی شامل ہوئے۔

یہ نوبیاہتا جوڑا شادی کے کچھ ہی دنوں بعد سپین روانہ ہوگیا۔ وہ ربوہ سے چناب ایکسپریس کے ذریعہ کراچی روانہ ہوئے جہاں سے انہوں نے ہوائی جہاز کے ذریعہ سپین پہنچنا تھا۔ میں اس وقت تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ اگرچہ میں ان دونوں کو ریلوے سٹیشن پر الوداع کہنے والوں میں تو شامل نہ تھا لیکن ان کی روانگی کا منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

دراصل اس زمانے میں ہمارا سکول ایک ایسی عمارت میں تھا جو ریلوے لائن سے زیادہ دور نہ تھی۔ ہم چھوٹے تھے چنانچہ جب بھی کوئی ٹرین گذرنے والی ہوتی ہم پڑھائی چھوڑ کر ریلوے لائن کے پاس جا کھڑے ہوتے اور ٹرین گذرنے کے بعد واپس آتے۔ میں نے اس روز دیکھا کہ چناب ایکسپریس کے ایک ڈبے میں باجی رقیہ برقع پہنے کھڑی ہیں۔ اس زمانے میں جماعت کے مالی حالات مخدوش تھے اور سفر کی جدید سہولتیں اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ کرم الٰہی ظفر اور باجی رقیہ نے غالباً عام مسافروں کی طرح ٹرین کے سب سے نچلے درجہ میں سفر کیا تھا جہاں انہیں بیٹھنے کے لیے جگہ بھی نہ مل پائی تھی۔

اپنی صغرسنی کی وجہ سے مجھے زمانے کے رسوم ورواج کا پوری طرح علم نہ تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ باجی رقیہ سپین جارہی ہیں جو کسی دور دراز ملک کا نام ہے تاہم مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ پیا دیس سدھارنے والی یہ کومل سی لڑکی تیرہ سال کے بعد واپس آئے گی۔

اس تمام عرصے میں کرم الٰہی ظفر نے اس تعلق کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا جو باجی رقیہ کے ساتھ ان کی شادی کے نتیجے میں اس خاندان کے ساتھ قائم ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے انہوں نے اپنے پہلے بچے کی پیدائش پر ہمیں بھی اس کی تصاویر بھجوائیں اور ابا جی سے خط وکتابت بھی رکھی۔ دادی جی کے انتقال کے موقع پر ان کی طرف سے ملنے والا خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ انہوں نے اس خط محررہ ۸ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا: ''دادی جان محترمہ کی وفات کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون...... ان کا وجود واقعی افرادِ خاندان کے لیے باعث برکت ورحمت تھا خصوصاً سیدنا حضرت مسیح موعود کی رفیقہ کا شرف حاصل ہونے کی وجہ سے ان کا وجود مبارک تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت اور درجات بلند کرے۔ آمین۔ ہماری طرف سے اس صدمہ اور غم میں اظہارِ ہمدردی سب رشتہ داروں تک پہنچا دیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔''

۱۹۶۴ء میں ابا جی کی وفات کے موقع پر مجھے ان کا تعزیتی مکتوب موصول ہوا جس کے بعد میری ان سے

کچھ عرصہ خط و کتابت رہی۔ وہ انتہائی نیک، ہمدرد اور مخلص احمدی تھے جو ہر احمدی میں وہی خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل سے انہیں بدرجۂ اتم عطا کر رکھی تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات میں دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کے اصول پر عمل پیرا تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے۔

میرے نام ان کا ایک اور خط محررہ ۹ دسمبر ۱۹۶۴ء کا یہ حصہ جو اُن کے خصوصی مزاج کا عکاس ہے صرف اس لیے نقل کیا جا رہا ہے کہ قارئین کو اس بے نفس انسان کی بلندی درجات کے لیے دعا کی تحریک ہو سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ آپ کو بھی آپ کی تعلیم میں اعلیٰ کامیابی عطا فرمائے اور ایم اے کی تعلیم اعلیٰ طور پر مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اللّٰھم آمین۔ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارغ وقت حصولِ تعلیم دین اور خدمتِ دین میں لگانا چاہئے کیوں کہ انسانی زندگی کا اصل مقصد تو حصولِ رضائے الٰہی ہی ہے۔

حضرت صاحب کی صحت کے بارے میں لکھیں۔ اگر ممکن ہو تو آپ بھی حضرت اقدس سے ملاقات کر کے دعا کے لیے عرض کر دیں۔ حضور اقدس اپنے خادموں کا بہت ہی خیال رکھتے ہیں۔ برادرم طاہر صاحب مرحوم کو تو حضور کے قریب رہنے کا بہت موقع ملتا تھا۔ اسی طرح میاں ناصر احمد صاحب، میاں رفیع احمد صاحب سے مل کر دعا کے لیے عرض کرتے رہنا چاہئے۔ افسوس! نہایت ہی ممتاز اور بزرگ ہستیاں (رفقائے سیدنا حضرت مسیح موعود) آہستہ آہستہ ہم سے جدا ہو کر اپنے معبودِ حقیقی سے جاملیں اور جماعت ان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے سے محروم ہوگئی۔''

ابا جی کی وفات کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے آپی کو پہلی بیٹی سے نوازا۔ ان کے شوہر جو کرم الٰہی ظفر کے برادرِ نسبتی ہیں کی خواہش تھی کہ نومولودہ کا نام ہُما رکھا جائے۔ کرم الٰہی ظفر کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے میرے نام اپنے خط میں بچی کی پیدائش پر مبارکباد کے بعد لکھا: ''ربوہ میں رہتے ہوئے ہمیں احمدیت کے ماحول سے ہی متاثر ہونا چاہئے اور دینی روایات کو ہی مدنظر رکھنا چاہئے۔ بچی کا نام امتہ الحفیظ بیگم یا مبارکہ بیگم رکھ لیں۔ ہادی صاحب والا نام بطور تخلص کے رہنے دیں۔ اللہ تعالیٰ بچی کو نیک اور صالحہ بنائے اور عمر دراز کرے۔ آمین۔ اللّٰھم آمین...... آپ سلسلہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہا کریں۔ اصل چیز تو خدمتِ دین ہی ہے۔''

کرم الٰہی ظفر شادی کے تیرہ سال بعد اپنی اہلیہ کے ہمراہ پہلی بار مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ربوہ واپس آئے۔ میں اس وقت ایم اے فائنل ایئر میں تھا۔ انہوں نے لاہور تک بذریعہ ہوائی جہاز سفر کیا تھا لیکن وہاں سے وہ بذریعہ بس ربوہ پہنچے۔ میرا خیال ہے محلہ جات میں ان کی آمد کے پروگرام کا اعلان ہو چکا تھا چنانچہ اہلِ ربوہ کثیر تعداد میں وہاں پہنچ کر نعرہ ہائے تکبیر اور احمدیت زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کے بیچ ان کا استقبال کیا۔ اس موقع پر صاحبزادہ مرزا مبارک احمد وکیل التبشیر تحریک جدید انجمن احمدیہ کے بعض وکلا اور صدر انجمن احمدیہ کے کچھ ناظران تو استقبالیہ لائن میں کھڑے تھے لیکن میں اُس جمِ غفیر میں شامل تھا جو کرم الٰہی ظفر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار تھا۔ اِن دونوں کے ساتھ میری ملاقات اگلے روز ان کے گھر پر ہوئی۔

یہ عالمِ شعور میں میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت میں اخلاص ٹوٹ ٹوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ان کی ہر ہر بات سے عمائدینِ سلسلہ اور جماعت کے ساتھ ان کا عشق عیاں ہے۔ میں اپنی تعلیمی مصروفیات

ی وجہ سے ان سے بکثرت ملاقات سے تو محروم رہا البتہ میں ان سے جب بھی ملا، بہت خوشگوار یادیں لے کر لوٹا۔

میں اور راشدہ ۱۹۹۳ء کے جلسہ سالانہ پر انگلستان گئے۔ جانے سے پہلے ہم نے بعض دیگر ممالک کے علاوہ سپین کا ویزہ بھی حاصل کر لیا تھا تاکہ جلسہ کے بعد کچھ وقت اس خاندان کے ساتھ گزارا جا سکے تاہم کسی وجہ ے ہمیں سپین جائے بغیر ہی واپس آنا پڑا۔ افسوس! کرم الٰہی ظفر کے ساتھ ملاقات کی حسرت دل ہی میں رہ گئی یوں کہ وہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد بارہ اگست ۱۹۹۶ء کو وفات پا گئے اور پیدروآباد میں دفن ہوئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے مرحوم کی نماز جنازہ غائب پڑھاتے ہوئے دعوت الی اللہ کے لیے مرحوم ے جنون کا توصیفی رنگ میں ذکر کیا۔ حضور کے اپنے الفاظ میں ”کبھی میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں آیا جو اس رح دعوت الی اللہ کے جنون میں مبتلا ہو چکا ہو۔“

حضور نے ذکر کیا کہ کرم الٰہی ظفر اپنے اس شوق میں بسا اوقات حکمت کے تقاضوں کو بھی فراموش کر دیتے تاہم آپ کے توجہ دلانے پر انہوں نے دعوت الی اللہ کے انداز میں بعض مثبت تبدیلیاں پیدا کیں اور بہ الفاظ حضور: ”جب میں نے ان کو پیار سے یہ باتیں سمجھائیں تو سمجھ گئے اور اس کے بعد پھر انہوں نے اپنے (کام کرنے کے انداز) میں کچھ تبدیلی کی جو مناسبِ حال تھی۔“

دعوت الی اللہ کے لیے کرم الٰہی ظفر کے جنون کا اندازہ حضور کے بیان فرمودہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات سے چند منٹ پہلے جب ان کا سرجن انہیں آخری بار دیکھنے کے لیے آیا تو انہوں نے اُس کیفیت میں بھی اپنی اہلیہ سے کہا کہ سرجن کو اسلامی اصول کی فلاسفی کا نسخہ پیش کیا جائے۔ حضور نے بتایا کہ: ”ان کی بیگم سے جب میں نے تعزیت کا فون کیا تو انہوں نے کہا: سرجن مجھے کہتا تھا کہ یہ کیا شخص ہے، زندگی آخری دموں تک جا پہنچی ہے، جان لبوں پر آ گئی ہے اور میں اس کی طبیعت پوچھنے آ رہا ہوں، یہ مجھے کہتا ہے فلاں کتاب پڑھو۔“

اسی حوالے سے حضور نے یہ واقعہ بھی بیان فرمایا کہ ان کی ایک بیٹی نے ان کی مرض الموت کے دوران امریکہ سے مزاج پُرسی کے لیے فون کیا تو مرحوم نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ احمدیت کی اشاعت کے لیے اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہے اور اگر اس معاملے میں اُس سے کوئی غفلت ہو رہی ہو تو وہ اس کا ازالہ کرے۔

آخر میں حضور نے کرم الٰہی ظفر کی خدمات جلیلہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا: ”بہت لمبا عرصہ تک، بہت شاندار، عظیم الشان خدمت کی توفیق پائی۔ کامل وفا کا نمونہ تھے، کامل اطاعت کا نمونہ تھے۔ کبھی اطاعت سے سرِ مُو بھی فرق نہیں کیا اور اپنی اولاد کی بہت اچھی تربیت کی۔ ساری اولاد خدا کے فضل سے خدمت دین پر مامور رہی ہے۔ جس حالت میں بھی ہے لیکن وہ اطاعت شعار ہے اور دین سے محبت کرنے والی ہے۔“

مجھے کرم الٰہی ظفر کی وفات کے کئی سال بعد ایک بار سپین جانے کا موقع ملا۔ باجی رقیہ ان دنوں ویلنشیا میں مقیم تھیں۔ میرا قیام قرطبہ میں تھا اور میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ باجی رقیہ سے جا کر مل سکتا۔ اسی اثنا میں کسی نے ذکر کیا کہ پیدروآباد جہاں سپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد جماعت احمدیہ کو پہلی بیت الذکر کی تعمیر کی سعادت حاصل ہوئی ہے یہاں سے دور نہیں اور یہ کہ کرم الٰہی ظفر بھی اسی جگہ مدفون ہیں۔ میں یہ تاریخی

بیت الذکر بھی دیکھنا چاہتا تھا اور کرم الٰہی ظفر کی قبر پر دعا کی بھی خواہش تھی چنانچہ اپنے میزبان کی مہربانی سے میں اسی شام پیدروآباد جا پہنچا جہاں عبدالرزاق، حال صدر جماعت احمدیہ پیدروآباد نے ہمارا استقبال کیا۔

رزاق حضرت صوفی غلام محمد رفیق حضرت مسیح موعود کے نواسے ہیں اور ان کی اہلیہ، فوزیہ میجر عبدالحمید سابق مربی انگلستان و امریکہ و جاپان کی صاحبزادی ہیں۔ خدا کے فضل سے ہمارا ان دونوں خاندانوں سے دیرینہ تعلق ہے چنانچہ یہ دونوں بے حد محبت سے پیش آئے اور رات کا کھانا ہم نے ان ہی کے ہاں کھایا۔

پیدروآباد کاؤس سے میڈرڈ جانے والی شاہراہ پر قرطبہ سے پینتیس کلومیٹر دُور ایک چھوٹی سی آبادی کا نام ہے جس کی بنیاد تیرھویں صدی عیسوی میں رکھی گئی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ شاہ فرنینڈ وسوم نے ۱۲۳۵ء میں اس علاقے کی فتح کے بعد کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور اپنے زخمیوں کے علاج معالجہ کے لیے ایک ہسپتال قائم کیا۔ ایک پادری جس کا نام پیدرو تھا اس ہسپتال کے مریضوں کے روحانی علاج پر مامور تھا۔ روایت کے مطابق اس کے پاس ایک طلسماتی صلیب تھی جس کا لمس لاعلاج مریضوں کو نئی زندگی عطا کر دیتا تھا۔ بعد میں یہی جگہ Hermitage of the Holy Christ of the Unpreviliged کہلانے لگی اور اس قصبہ کو اس پادری کے نام پر پیدروآباد کہا جانے لگا۔

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پر پہلے پہل مُردوں کو عام رواج کے مطابق زمین میں دفن کیا جاتا تھا لیکن پھر (غالباً جگہ کی تنگی کے باعث) ان کی تدفین کئی منزلہ قبروں میں کی جانے لگی۔ کرم الٰہی ظفر کا جسمِ خاکی بھی ایک ایسی ہی قبر میں محفوظ ہے۔ یہ پینسٹھ قبروں کا ایک بلاک ہے۔ اس بلاک کی ہر قطار میں دائیں سے بائیں تیرہ قبریں ہیں جب کہ نیچے سے اوپر ہر قطار میں قبروں کی تعداد پانچ ہے۔ کرم الٰہی ظفر نیچے سے تیسری قطار میں دائیں طرف سے پانچویں قبر میں دفن ہیں اور اس پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

D KARAM ILAHI ZAFAR

MISIONERO DEL ISLAM ESPANA

31.12.1919

12. 8. 1996

کرم الٰہی ظفر ماشاءاللہ موصی تھے۔ ایسے میں ان کی پیدروآباد میں تدفین میرے ذہن میں کئی سوالات کو جنم دے رہی تھی تاہم باجی رقیہ نے مجھے بتایا: ''ان کی سپین میں تدفین ہماری اپنی خواہش پر ہوئی۔ دراصل ہمارا خیال تھا کہ مرحوم کی پاکستان میں تدفین کی صورت میں ہمارے لیے ان کی قبر پر حاضری مشکل ہو جائے گی۔ اندریں حالات حضور نے ہدایت فرمائی کہ ان کی تدفین احمدیہ بیت الذکر میں ہو تاہم میونسپل انتظامیہ کی طرف سے اس کی اجازت نہ ملنے پر انہیں مجبوراً اس قبرستان میں دفن کرنا پڑا۔''

خدا تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

ان خادمانِ سلسلہ کے ذکرِ خیر کے بعد اب کچھ باتیں ان بزرگان کے بارے میں جنہیں ربوہ کی آبادکاری میں اوّلین اہمیت حاصل ہے۔

زہے ربوہ جہاں ہر رہنے والا نیک نیت ہے

ربوہ پاکستان کا واحد شہر ہے جس کی بنیاد براہیمی دعاؤں، صدقات اور نوافل کے ساتھ صرف اس مقصد سے رکھی گئی تھی کہ خدائے واحد و یگانہ کے نام لیواؤں کی اس چھوٹی سی جماعت کو ایک ایسا مرکز مل جائے جہاں سے وہ اکنافِ عالم میں پیغام حق پہنچا سکے۔ اس شہر میں جس کا آغاز ایک خیمہ بستی سے ہوا تھا ابتداءً جماعتی کارکنان کے لیے دفاتر اور رہائش گاہیں تعمیر ہوئیں لیکن جلد ہی یہاں صاحبِ استطاعت احمدیوں نے اپنے اپنے گھروں کی تعمیر شروع کر دی۔ ان نیک نیت احمدیوں کی فہرست یوں تو خاصی طویل ہے تاہم یہاں صرف اس قدر ذکر مناسب ہوگا کہ ربوہ میں سب سے پہلے تعمیر ہونے والا مکان نواب محمد احمد خان ابن حضرت نواب محمد علی خان کا تھا جو محلہ ص (محلہ دارالصدر) میں تعمیر ہوا۔ الفضل ۱۲ جولائی ۱۹۵۰ء کے مطابق یہ ''کوٹھی مکمل ہو چکی ہے''۔ یہ کوٹھی حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی کوٹھی البشریٰ سے ملحق ہے اور اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

اس کے بعد تعمیر ہونے والا مکان ٹھیکیدار نور احمد کا تھا جو محلہ الف یعنی محلہ دارالیمن میں تعمیر ہوا۔ ۸ ستمبر ۱۹۵۰ء کے الفضل میں شائع شدہ ''کوائفِ ربوہ'' کے مطابق محلہ الف میں ٹھیکیدار نور احمد کا مکان مکمل ہو چکا ہے اورانہوں نے اس میں رہائش اختیار کر لی ہے۔''

جہاں تک نواب محمد احمد خان کا تعلق ہے اُن کی ذات جماعت میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ حضرت مسیح موعود کے نواسے اور حضرت نواب مبارکہ بیگم کے صاحبزادے تھے۔ ان کی زیادہ تر رہائش لاہور اور ربوہ میں رہی اور وہ بعداز وفات بہشتی مقبرہ کے قطعہ خاص میں دفن ہوئے۔

ٹھیکیدار نور احمد جو فی الاصل وِیرووال کے رہنے والے اور میاں رحمت اللہ نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے تھے محکمہ نہر کے ٹھیکیدار تھے اور قیامِ پاکستان کے وقت نُور پور ضلع منٹگمری میں تعینات تھے۔ جب ربوہ کی بنیاد رکھی گئی اور حضرت مصلح موعود نے احمدیوں کو اس شہر کی آبادکاری کی طرف توجہ دلائی تو موصوف اپنا وہ کام چھوڑ کر ربوہ منتقل ہو گئے اور انہوں نے محلہ دارالیمن کے موجودہ حلقہ حمد میں پلاٹ نمبر ۱۹ بلاک نمبر ۲ پر ایک مکان تعمیر کیا جو اس محلے میں تعمیر ہونے والا پہلا مکان تھا۔

ربوہ آنے کے بعد ٹھیکیدار نور احمد نے اپنے تجربہ سے فائدہ اٹھایا اور ربوہ کی بہت سی ابتدائی عمارات تعمیر کرائیں بلکہ فضل عمر ہسپتال کی تعمیر کے بعد وہ عمارت جس میں نور ہسپتال قائم تھا خود خرید لی اور یہ لمبا عرصہ ان ہی کی ملکیت رہی۔ ان کے بیٹے منیر احمد حال مقیم جرمنی کی روایت کے مطابق جب ان کے محلہ میں گنبدوں والی

بیت الذکر زیرِ تعمیر تھی تو گنبدوں کی تعمیر میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس موقع پر ان کے والدِ بزرگوار کا عمر بھر کا تجربہ بہت کام آیا اور یوں یہ بیت الذکر پایہ تکمیل کو پہنچی۔

منیر احمد بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ان کے والد حضرت خلیفۃ المسیح الرابع سے ملے تو آپ نے پاکستان کے مخصوص حالات اور اس امر کے پیش نظر کہ ان کی ساری اولاد پاکستان کو خیر باد کہہ کر غیر ممالک میں آباد ہو چکی تھی انہیں جرمنی منتقل ہونے کا مشورہ دیا جس پر وہ منیر کے پاس فرینکفرٹ چلے گئے۔ وہ وہاں کئی سال مقیم رہے لیکن اپنی آخری بیماری کے دوران وہ بار بار اس خواہش کا اظہار کرتے تھے کہ ان کی وفات کی صورت میں انہیں ربوہ دفن کیا جائے۔ اگرچہ کسی وجہ سے ان کی وصیت قائم نہ رہ سکی تھی مگر اس کے باوجود اُن کی میت ربوہ لائی گئی اور وہ یہاں دفن ہوئے۔

ان کی قبر پر لگے ہوئے کتبے کے مطابق وہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۸ء کو وفات پائی اور وہ ''ربوہ کے ابتدائی لوگوں میں سے تھے'' اور ''آغازِ ربوہ میں ابتدائی تقریباً تمام تعمیراتی کام انہوں نے کروایا۔''

''ربوہ: دارالہجرت'' کے مصنف عبدالرشید آرکیٹیکٹ کے بیان کے مطابق محلہ ''باب الابواب اور دارالفضل میں آبادی کی داغ بیل ڈالنے کی سعادت چوہدری عبداللطیف صاحب اور کیپٹن نواب دین صاحب کو حاصل ہوئی۔''

یاد رہے کہ چوہدری عبداللطیف سے مراد ''چوہدری عبداللطیف اوورسیئر'' ہیں جو آغازِ ربوہ سے سیکرٹری آبادی کمیٹی، صدر انجمن احمدیہ کے ساتھ منسلک تھے۔ اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے، عزیز طاہر کی روایت کے مطابق ان کے والدِ بزرگوار کو آبادی کمیٹی کی طرف سے محلہ باب الابواب میں دس مرلے کا ایک پلاٹ عطیتاً ملا تھا جس پر انہوں نے دو تین کچے کمرے تعمیر کئے تھے۔ یہ مکان محلہ باب الابواب کا پہلا مکان ضرور تھا مگر انہوں نے اس میں رہائش کبھی نہیں رکھی۔ عزیز طاہر بتاتے ہیں ''کہ اس مکان میں ہمارے ایک تایا جو پیشہ کے اعتبار سے ٹھیکیدار تھے اور جنہوں نے ربوہ کی بہت سی عمارات تعمیر کی تھیں رہا کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں یہ مکان بک گیا۔''

کیپٹن نواب دین جو خان صاحب مولوی فرزند علی کے چچازاد بھائی تھے جماعت کے پرانے خدمت گذاروں میں سے تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۹ء میں سولہ سال کی عمر میں خان صاحب مولوی فرزند علی کی مدد سے قلعہ فیروز پور میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور دس ہی روز بعد بیعت کر کے سلسلۂ احمدیہ میں داخل ہو گئے۔ وہ ملازمت کے دوران جہاں جہاں رہے اپنی فرض شناسی سے خدمت کا شاندار ریکارڈ قائم کرتے رہے۔ اُن کے بیٹے عبدالباری قیوم (جو میرے دوستوں میں سے ہیں) کی روایت کے مطابق بمبئی میں تعیناتی کے دوران اُنہیں ایک وسیع مکان ملا ہوا تھا جس میں انہوں نے جماعت کا نماز سنٹر قائم کیا اور قادیان سے بیرونی ممالک کو جانے اور واپس آنے والے مربیان اور کئی بزرگ ہستیوں کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ موصوف ۱۹۴۲ـ۱۹۴۴ء کے

دوران جماعت احمدیہ، بمبئی کے امیر رہے۔ اپنے قیامِ شملہ، ڈلہوزی اور کراچی کے دوران اُنہیں حضرت مصلح موعود اور خاندانِ حضرت اقدس کی کئی بزرگ ہستیوں کی میزبانی کا موقع ملا۔ ڈرگ روڈ کراچی میں احمدیہ بیت الذکر کے لیے ہزار مخالفتوں کے باوجود ایک قطعہ اراضی حاصل کر کے اُس پر ایک عارضی بیت الذکر بنوائی جو بعد میں متقی محمد حسین کی کوششوں سے ایک عالی شان وسیع و عریض مرکز کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

کیپٹن نواب دین نے قیامِ ربوہ کے ابتدائی سالوں میں لکڑی کا ایک ٹال بھی شروع کیا تھا اور اُنہیں بہت سی جماعتی خدمات کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ انہوں نے ۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو اوکاڑہ میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ربوہ میں سب سے پہلا رہائشی مکان جس کا باضابطہ افتتاح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی دعاؤں کے ساتھ ہوا ملک صاحب خان نون، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کا تھا جو لطیف احمد جھمٹ، سیکرٹری آبادی کمیٹی کی تحقیق کے مطابق پلاٹ نمبر ۱۴، بلاک نمبر ۱۳، محلہ دارالصدر جنوبی پر تعمیر ہوا تھا چنانچہ الفضل ۲۵ دسمبر ۱۹۵۱ء میں سید زین العابدین ولی اللہ شاہ کے قلم سے ''ربوہ میں رہائشی مکان کا پہلا افتتاح'' کے عنوان سے یہ نوٹ شائع شدہ موجود ہے:

''مکرم صاحب خان نون، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر نے اپنے مکان کے افتتاح کی تقریب پر حضرت...... خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز اور دیگر احباب کو مدعو کیا۔ دعوت عصرانہ کا انتظام بھی کیا گیا۔ حضور ایدہ اللہ نے مع احباب دعا فرمائی۔ ربوہ میں اس قسم کی یہ پہلی تقریب ہے۔''

آپ کو بتاتے چلیں کہ خان بہادر ملک صاحب خان نون فتح آباد نون متصل بھلوال ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ تاریخ احمدیت جلد ۲۳ کے مطابق وہ ''سلسلہ احمدیہ کے ایک نہایت مخلص اور مخیّر بزرگ'' تھے ''جن کی مالی خدمات اور فیاضیوں کا دامن ۱۹۱۱ء سے تادمِ زیست پوری شان اور جذبہ ایمان سے جاری رہا۔''

وہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے زمانہ خلافت کے چوتھے سال سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ اُن کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جسے دنیاوی وجاہت حاصل تھی چنانچہ ملک فیروز خان نون سابق وزیراعظم پاکستان اُن کے قریبی عزیزوں میں سے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے احمدیت کے ساتھ اپنے تعلق کو ہمیشہ ہر چیز پر مقدم رکھا۔

تاریخ احمدیت ہی کے الفاظ میں ''ملک صاحب سخاوت کے دریا تھے۔ مرکز سے کبھی کوئی مالی تحریک نہ آئی جس میں حصہ نہ لیا ہو۔ ۱۹۲۲ء میں حضرت مسیح موعود کے مزار کے گرد کچی چاردیواری گرا کر آپ نے پختہ بنوائی۔ ربوہ میں کوارٹرز تحریک جدید کے سامنے ایک خوبصورت (......) بنوائی جو (......) محمود کہلاتی ہے۔ محلہ دارالیمن کے وسط میں بھی ایک پختہ (......) بنوائی۔ ملک صاحب خفیہ طور پر روپیہ دیا کرتے تھے۔ آپ سے بہت لوگ فیض یاب ہوئے۔''

ملک صاحب خان نون نے ۱۷ جولائی ۱۹۶۶ء کو وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی ہدایت کے مطابق مولانا ابوالعطا جالندھری اور حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد نے

اس موقع پر حضور کی نمائندگی کی۔

مناسب ہوگا یہاں پر اُن تین مکانات کا بھی ذکر کر دیا جائے جہاں حضرت مسیح موعود کے تین قریبی رفقاء نے اپنی زندگی کے کئی سال گذارے اور جہاں سے اُن کا جنازہ اُٹھا۔

حضرت مفتی محمد صادق کی رہائش مکان نمبر ٦ بلاک نمبر ۴ محلہ دارالصدر غربی (قمر) میں تھی اور انہوں نے یہیں وفات پائی۔ اُن کی وفات کے بعد یہ مکان اُن کی اولاد کے درمیان وجہِ نزاع بنا رہا اور دارالقضا کے ایک حالیہ فیصلے کے ماتحت یہ مکان اُن کے صاحبزادے مفتی احمد صادق کے نام منتقل ہوا۔ اب انہوں نے یہ مکان آگے فروخت کر دیا۔

مولانا غلام رسول راجیکی کی رہائش راجیکی منزل، محلہ دارالرحمت غربی میں مکان نمبر ٦ بلاک نمبر ١٣ میں تھی اور انہوں نے اسی گھر میں وفات پائی۔ یہ مکان ابھی تک اُن کی اولاد کے پاس ہے اور جیسا کہ اس کتاب میں کسی اور جگہ بھی ذکر ہے یہیں وہ زمین دوز کمرہ ہے جو مولانا کو ربوہ کی شدید گرمی سے آرام کے چند لمحے مہیا کرتا تھا۔

حضرت مولوی محمد دین ان خوش قسمت افراد میں شامل تھے جنہیں حضرت مسیح موعود کی بابرکت صحبت نصیب ہوئی اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک خدمتِ دین بجالاتے رہے۔ وفات کے وقت مرحوم جماعت میں ذمہ داری کے اعلیٰ ترین عہدے یعنی صدر، صدر انجمن احمدیہ پر متمکن تھے۔ مولوی صاحب کو ١٩٠٧ء سے لے کر تادمِ آخر یعنی چھہتر سال تک دین کی بھرپور خدمت کی توفیق ملی۔

آپ کو ١٩٠١ء میں حضرت مسیح موعود کی بیعت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ستمبر ١٩٠٧ء میں جب حضرت مسیح موعود نے احبابِ جماعت کو خدمتِ دین کے لیے زندگیاں وقف کرنے کی تحریک فرمائی تو جماعت کے جن تیرہ افراد نے اس تحریک پر لبیک کہا ان میں ایک خوش نصیب آپ بھی تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ اس وقت علی گڑھ کالج میں بی اے کے طالب علم تھے۔ تاریخِ احمدیت میں آپ کا نام اوّلین واقفین کی فہرست میں قیامت تک کے لیے محفوظ رہے گا۔

حضرت مسیح موعود نے حضرت مولوی محمد دین کی درخواست برائے وقف پر اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا: ''نتیجہ کے بعد اس خدمت پر لگ جائیں۔''

مولوی صاحب سات سال تک تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے ہیڈ ماسٹر اور بعد میں دو سال تک امریکہ میں مربی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد مرحوم طویل عرصہ تک تعلیم الاسلام ہائی سکول اور نصرت گرلز ہائی سکول قادیان میں کام کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک لمبی مدت تک آپ کے سپرد نظارت تعلیم کی ذمہ داری بھی رہی۔ آپ کی ایک اور اہم خدمت اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والے رسالے Review of Religions کی ایڈیٹر شپ ہے۔

١٩٦٥ء میں جب حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو حضرت مولوی صاحب صدر، صدر انجمن احمدیہ مقرر ہوئے۔

اگر چہ مجھے حضرت مولوی محمد دین سے کسی خاص کام سے ملنا تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ میں ان کے ناظرِ تعلیم ہونے کے زمانہ میں صرف ملاقات کے لیے ان کے پاس حاضر ہوتا رہا۔ جب وہ صدر، صدر انجمن احمدیہ مقرر ہوئے تو بڑھاپے کے زیر اثر یا سہولتوں کی کمی کے باعث دفتر میں بیٹھنے سے گھبراتے تھے چنانچہ ان کے لیے دفتر کے باہر برآمدے میں ایک تخت پوش بچھا دیا گیا تھا جہاں وہ حسبِ ضرورت بیٹھ جاتے۔ انہوں نے باریک سفید ململ کا کُرتہ، سفید شلوار اور کپڑے کی سفید ٹوپی پہنی ہوتی تھی اور وہ ہاتھ کے پنکھے سے خود کو ہوا دے رہے ہوتے تھے۔

حضرت مولوی محمد دین محلہ دارالرحمت وسطی میں شیخ محبوب عالم خالد کے گھر کے سامنے اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر تھے جو اُن کی وفات کے بعد سے کسمپرسی کی حالت میں پڑا ہے۔ اس مکان کے بیرونی دروازے پر انگریزی زبان میں سنگِ مرمر کی ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ بیرونی دیوار گرنے کو ہے، نہ جانے کس وقت منہدم ہو جائے اور اس تختی کا نام و نشان بھی مٹ جائے لہٰذا اسے برائے ریکارڈ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

ریذیڈنس آف حضرت مولوی محمد دین صاحب (لیٹ)
کمپینین آف حضرتِ اقدس مسیح موعود، ایکس مشنری یو ایس اے
ایکس ناظرِ تعلیم اینڈ صدر، صدر انجمن احمدیہ پاکستان
ہاؤس نمبر ۱۷/۳۸ دارالرحمت وسطی ربوہ

اسی حوالے سے ایک اور مکان کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مکان کیپٹن خادم حسین ناظر امور عامہ نے فیکٹری ایریا میں تعمیر کیا تھا۔ انہوں نے اس مکان کی تعمیر کے وقت حضرت اماں جان کی ربوہ کی رہائشگاہ میں نصب ایک کھڑکی حاصل کر کے تبرکاً لگوائی۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ، حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد، حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد اور حضرت صاحبزادہ مرزا عزیز احمد کے اس مکان کے بارے میں دعائیہ ارشادات بھی ایک پتھر پر کندہ کرا کے مکان پر نصب کر دیئے تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں جو اُن کی کتاب ''ربوہ'' میں سے لئے گئے ہیں: ''خاکسار نے محلہ دارالصدر غربی میں دو کنال کے رقبہ میں ایک کوٹھی دسمبر ۱۹۵۳ء کو تعمیر کرائی تھی جو بعد میں فروخت کر دی۔ اس کے معاً بعد ساڑھے پندرہ مرلہ اراضی پر ایک مکان متصل بیت فیکٹری ایریا قطعہ ۱۴/۳۷ میں تعمیر کرایا۔ اس میں ایک کھڑی تبرکاً لگائی گئی ہے جو حضرت اماں جان کے اس ذاتی کچے کمرے کی تھی جس میں آپ نے وفات پائی۔

چند دعائیہ کلمات حضرت مسیح موعود کے خاندان کے بعض بزرگوں نے جو از راہِ خادم نوازی تحریر فرمائے وہ پتھر پر کندہ کرا کر مکان میں لگا دیئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

''اللہ تعالیٰ اس مکان کو آپ کے لیے بابرکت کرے اور اس کی نحوستیں دور کرے۔
مرزا محمود احمد
(خلیفۃ المسیح الثانی)''

''اللہ تعالیٰ اس مکان کو آپ کے لیے ہر جہت سے مبارک اور مثمرِ ثمراتِ حسنہ کرے۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد''

''خدا تعالیٰ اس مکان کو آپ کے لیے بابرکت بنائے۔ مرزا شریف احمد''

''اللہ تعالیٰ یہ مکان آپ کو مبارک کرے۔ مرزا عزیز احمد (ابن حضرت مرزا سلطان صاحب)''

میں کیپٹن خادم حسین سے خود بھی ملا ہوں۔ میں نے ان کا یہ گھر اور اس پر نصب یہ تختی خود دیکھی ہے اور ایک بار اُن سے درخواست کر کے وہ کھڑکی بھی دیکھی تھی جو اصلاً حضرت اماں جان کی رہائشگاہ میں نصب تھی۔ جب میں نے اس کتاب پر کام شروع کیا تو مجھے اس کھڑکی کا دوبارہ خیال آیا۔ تب مجھے میرے ماموں زاد، مرزا محمد اسماعیل کے صاحبزادے، محمد ادریس ساکن فیکٹری ایریا کے ذریعہ معلوم ہوا کہ کیپٹن خادم حسین کی وفات اور ان کے بچوں کی بیرونِ ملک منتقلی کے بعد یہ مکان کسی اور شخص نے خرید لیا تھا۔ اُن دنوں یہ مکان منہدم ہو چکا تھا اور اس کی کھڑکیاں اور دروازے ربوہ کے ایک کباڑی کے پاس فروخت ہو چکے تھے۔ میں نے ادریس کے ذریعہ اس کھڑکی کی تعین کی کوشش کی لیکن افسوس اس حوالے سے کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور یوں یہ قیمتی یادگار زمانے کی دست بُرد کا شکار ہو گئی۔

اس موضوع پر اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں ربوہ کے دو اہم ترین تاریخی مقامات کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا جن میں سے ایک تو بیت یادگار ہے جو فضلِ عمر ہسپتال کے احاطہ میں واقع ہے اور اُس مقام پر تعمیر ہوئی ہے جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے افتتاحِ ربوہ کے موقع پر سب سے پہلی نماز پڑھائی تھی۔ اس جگہ کے نشانات اُسی وقت محفوظ کر لیے گئے تھے اور جب فضلِ عمر ہسپتال تعمیر ہوا تو اس بیت کا سنگِ بنیاد بھی رکھ دیا گیا۔

دوسری اہم یادگار حضرت اماں جان کی وہ رہائش گاہ ہے جہاں آپ ربوہ منتقل ہونے کے بعد تاحیات مقیم رہیں۔ یہ رہائش گاہ اب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں ہے تاہم اس کی بنیادوں کے نشانات محفوظ کر لئے گئے ہیں اور محلہ دارالصدر جنوبی میں کوارٹرز تحریک جدید، دارالضیافت اور سرائے مسرور کے درمیان دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان نشانات والی جگہ اَب ''یادگار چوک'' کہلاتی ہے۔

ربوہ کے بعض ''تاریخی مقامات'' کا ذکر ہو رہا ہے تو کیوں نہ آپ کو دریائے چناب پر بھی لے چلیں جہاں جنگِ ستمبر کے بعض شہدا کی یادگار کے علاوہ دریائے چناب کا ایک نقشہ اور پرانے وقتوں کا ایک ہندو مندر بھی ہوا کرتا تھا۔ اب نہ یہ یادگار اپنی اصل شکل میں موجود رہی ہے نہ اس نقشے یا منظر کا کوئی نشان باقی ہے۔ ہاں! حالیہ برسوں میں یہاں حضرت بو علی قلندر کی ایک چلّہ گاہ تعمیر ہوئی ہے جہاں چنیوٹ اور گردونواح کے زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

کہیں اونچی نیچی چٹانوں کے قدموں کو چھوتا چنابِ رواں کا کنارہ

ربوہ کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ دریائے چناب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ دریا کا ایک پاٹ ربوہ کے محلہ دارالیمن اور دارالنصر کو چھو کر گذرتا ہے تو دوسرا پاٹ وادیٔ عزیز کے اُس پار سے اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ان دونوں پاٹوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں سے کچھ آہستہ آہستہ بالکل صاف کر دی گئی ہیں اور ان کی جگہ بعض عمارات تعمیر ہو چکی ہیں۔ ربوہ سے چنیوٹ جاتے ہوئے ریلوے کے پہلے پُل پر ایک یادگار ہوا کرتی تھی جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران اس پُل پر ڈیوٹی دینے والے ایک مجاہد کی یہاں سے گذرنے والی کسی ٹرین کے ساتھ ٹکر کے نتیجے میں ہونے والی شہادت کے حوالے سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس یادگار پر دشمن کے اس جہاز کا ایک ٹکڑا نصب تھا جو پاکستان ایئر فورس نے یہیں کہیں مار گرایا تھا۔ اس یادگار کے پینڈے پر لگی ہوئی دو تختیاں ابھی تک موجود ہیں جن میں سے ایک پر ''مجاہد ۲۲ بٹالین'' اور دوسری پر ''رانا اصغر علی پلاٹون کمانڈر، ذوالفقار کمپنی، رجوعہ'' کے الفاظ کندہ ہیں تاہم قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد میں اس یادگار کی جگہ ایک اور یادگار تعمیر کر دی گئی جس کے اوپر ایک بم نصب ہے۔

اس یادگار کی ایک جانب مجاہد فورس کے ان سات شہدا کے نام درج ہیں جنہوں نے چنیوٹ، چشتیاں، بہاولپور، سکیسر اور سرگودھا میں اپنے فرائض کی ادائی کے دوران ملک کے دفاع کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ دوسری تختی پر ۲۲ مجاہد بٹالین کے ان جوانوں کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے جنہوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ملکی دفاع میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ اس فہرست میں ''قاسم کمپنی، موضع ربوہ۔ جھنگ'' کے مجاہدین بھی شامل ہیں۔ تیسری تختی پر اس یادگار کا سنگِ بنیاد رکھنے اور افتتاح کرنے والے افسران کے نام کندہ ہیں۔ یادگار کا سنگِ بنیاد چوہدری امتیاز احمد ساہی، اسسٹنٹ کمشنر چنیوٹ نے رکھا اور اس کا افتتاح غلام مرتضے پراچہ، ڈپٹی کمشنر جھنگ کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ اس تختی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس یادگار کے مصارف ''بشکریہ اہلیانِ تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ و ۲۲ مجاہد بٹالین اور ہندوستانی ہوائی جہاز کا ڈھانچہ جو پاکستان کی سرزمین پر گرایا گیا'' پورے کیے گئے۔ اس تحریر کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اس یادگار کے مصارف پورا کرنے کے لیے عطایا کے علاوہ ہندوستانی ہوائی جہاز کے ڈھانچے کی کباڑیوں کو فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی استعمال ہوئی۔

اس یادگار کے قریب ایک ٹیلے پر دریائے چناب کا نقشہ بنا ہوا تھا جو غالباً پُل کی تعمیر کے وقت بنایا گیا ہوگا۔ اس نقشے میں دریا کا پورا رُوٹ دکھایا گیا تھا اور اُس مقام کو جہاں ریلوے پُل تعمیر ہوا خاص طور پر ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ یقیناً نقشے میں دریا کے بارے میں کچھ اور ضروری معلومات بھی ہوں گی۔ یہ نقشہ کئی سال تک جوں کا

توں رہا لیکن جب ملک میں ہر قدیم چیز کی توڑ پھوڑ کا چلن عام ہوا تو یہ نقشہ بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اس کے مٹانے والے کو کیا ملا؟ اس سوال کا جواب تو شاید اب کسی کے پاس نہیں ہوگا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک اچھی بھلی تاریخی چیز کا نام ونشان معدوم ہو گیا۔

دریائے چناب کا پہلا پل عبور کرنے کے بعد سڑک کے بائیں ہاتھ چلّہ گاہ حضرت بُوعلی قلندر اور دائیں ہاتھ وادیٔ عزیز شریف ہے۔ وادیٔ عزیز شریف کا کچھ ذکر اس کتاب میں کسی اور جگہ موجود ہے لیکن جہاں تک چلّہ گاہ حضرت بُوعلی قلندر کا تعلق ہے، ربوہ کے ابتدائی دنوں میں یہاں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ پھر سنا کہ کسی فقیر نے یہاں آ دھونی رمائی ہے چنانچہ ایک بار میں اور میرے ایک ہم جماعت، یوسف مبشر جو محلّہ دارالیمن کے رہائشی تھے پھرتے پھراتے اسے دیکھنے چلے گئے۔ ایک معذور سا آدمی ایک کٹیا کے اندر پڑا ہوا تھا اور چنیوٹ کے کچھ مرد وزن اس کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے فقیر استغراق کی کیفیت میں تھا اور لوگ اپنے اپنے مسائل کے حل کے لیے اُس کی توجہ کے طالب تھے تاہم حاجتمندوں کی وہ آمدورفت نہ تھی جو اَب ہے۔

سچ پوچھیں تو اب یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا ہے اور اس مقام پر جہاں روایت کے مطابق حضرت بُوعلی قلندر چلّہ کشی فرماتے رہے ایک عالیشان کمرہ تعمیر کر کے اسے چلّہ گاہ کا نام دے دیا گیا ہے۔ اس کمرے کی چاروں دیواروں میں سنگ مرمر کی باریک جالیاں نصب ہیں، چھت پر قیمتی فانوس لٹکا ہے اور زائرین کی سہولت کے لیے فرش پر جائے نماز بچھا رہتا ہے۔

آپ یقیناً جاننا چاہتے ہوں گے کہ حضرت بُوعلی قلندر تھے کون؟

اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مطابق آپ کی سوانح حیات کے بارے میں معتبر اطلاعات کی اتنی کمی ہے کہ آپ کے عہد کی اُن تصنیفات میں جو اَب تک سلامت ہیں، آپ کا نام تک مذکور نہیں۔ ہاں! سترہویں صدی عیسوی میں آپ کی زندگی کے جو حالات قلمبند ہوئے ان میں بتایا گیا ہے کہ آپ پانی پت کے رہنے والے تھے جہاں آپ کے والد ماجد، سالار فخرالدین عراق سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ ابتدا میں آپ کی تعلیم و تربیت بطور ایک عالمِ دین ہوئی لیکن بعد میں آپ نے اہلِ مدرسہ کو خیر باد کہا، اپنی کتابیں دریا میں پھینک دیں اور قلندر بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے عشقِ الٰہی میں احکامِ الٰہیہ اور سنتِ نبوی کی پابندی بھی چھوڑ دی تاہم بڑی سخت ریاضتیں اور انتہائی نفس کشی کرتے رہے۔ آپ کا شمار حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے روحانی شاگردوں میں ہوتا ہے لیکن یہ امر کہ وہ صوفیا کے کسی منظم سلسلے سے تعلق رکھتے تھے بہت مشتبہ ہے۔ آپ کی زندگی، کرامات اور وفات کے بارے میں بے شمار روایتیں مشہور ہیں حتیٰ کہ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ پانی پت یا کرنال میں آپ کی طرف منسوب مزار فی الواقع آپ ہی کا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنی تصنیف ''نئی منزلیں ہیں پکارتی'' میں ذکر کیا ہے ''چلّہ گاہ پر نصب ایک کتبے کے مطابق بوعلی قلندر مفتی دہلی کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے کہ ایک درویش کی صدا پر مسندِ درس وصدارت چھوڑ کر مست الست ہو گئے اور کئی جگہوں کے علاوہ دریائے چناب کے اس مقام پر بارہ سال تک چلّہ کشی کی......''

چلہ گاہ میں آپ کی تصانیف کی ایک طویل فہرست درج ہے۔ یہ فہرست کس حد تک درست ہے، اس کا فیصلہ تو کوئی صاحبِ علم ہی کر سکتا ہے البتہ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مطابق آپ کی مستند تصنیفات صرف تین ہیں یعنی عشقِ الٰہی کے موضوع پر آپ کے مکتوبات جو اختیار الدین کو لکھے گئے اور دو مثنویاں جو کلامِ قلندر اور مثنوی بوعلی قلندر کے نام سے ملتی ہیں۔

یہاں حضرت بوعلی قلندر کے کچھ فارسی اشعار اور بعض اشعار کا پنجابی ترجمہ بھی لکھا ہوا ہے۔ چلہ گاہ کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد ہے جو جامع مسجد قائم کہلاتی ہے۔ روایت کے مطابق منتظمینِ چلہ گاہ کے مرشد، قائم سائیں (مدفون بہ فیصل آباد) قادری سلسلہ کے ایک پہنچے ہوئے بزرگ تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس چلہ گاہ کی نشاندہی حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ کے ذریعے کرائی تھی چنانچہ وہ ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ یہاں آئے اور غیبی اشارے کے مطابق چلہ گاہ کا تعین فرمایا۔ قائم سائیں کی خواہش تھی کہ یہاں اس مقام کے شایانِ شان عمارات تعمیر ہوں۔ وہ خود تو کچھ عرصہ بعد دنیا سے پردہ فرما گئے لیکن ان کے مریدوں نے ان کی خواہش کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور یہ ساری عمارات انہوں نے ہی تعمیر کرائی ہیں۔

دریائے چناب کا دوسرا پل عبور کرنے کے بعد سڑک کے بائیں ہاتھ، پہاڑی پر ایک مندر ہوا کرتا تھا۔ اس مندر کا طرزِ تعمیر پاکستان کے طول و عرض میں موجود ہندو مندروں سے مشابہ تھا۔ پہاڑی پر واقع اس مندر تک پہنچنے کے لیے کئی سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا تھا جو خاص اس مقصد کے لیے تعمیر ہوئی تھیں۔

جب میں نے پہلی بار یہ مندر دیکھا تو قیامِ پاکستان اور ہندوؤں کے ترکِ وطن پر کئی سال بیت چکے تھے۔ مندر بالکل ویران پڑا تھا اور اس کے اندر کوئی بُت موجود نہ تھا لیکن عمومی طور پر مندر کی حالت ٹھیک تھی۔ اس کی چھتوں اور دیواروں پر ہندو دیو مالائی کہانیوں کی خوبصورت تصاویر پوری آب و تاب سے قائم تھیں۔ میں ان کہانیوں سے ناواقف تھا اس لیے ان تصاویر کو سمجھ تو نہ سکا لیکن محسوس ہوتا تھا کہ یہ تصویریں کسی ماہر نقاش کے مُوئے قلم کا شاہکار ہیں۔

کئی سال تک یہ مندر اسی طرح قائم رہا لیکن پھر نہ جانے کیوں (بابری مسجد کے سانحے سے بہت پہلے) اسے منہدم کر دیا گیا۔ اب پل سے تو اس کے آثار بھی نظر نہیں آتے لیکن قریب جائیں تو پتا چلتا ہے کہ اس مندر کو جانے والی سیڑھیاں ٹوٹی پھوٹی شکل میں باقی ہیں اور کمروں کی اِکا دُکا دیواریں بھی کھڑی ہیں۔ ہاں! اس کی لکڑی کی چھتوں، دروازوں اور کھڑکیوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

میرے پاس اس مندر کی ایک تصویر اب تک موجود ہے جس میں میرے ساتھ میرے ماموں زاد مرزا محمد اسماعیل اور رشتہ میں میرے ایک بھانجے، قاضی مبارک احمد کھڑے ہیں۔ اسماعیل اور مبارک اب دونوں وفات پا چکے ہیں اور یوں اب وہ مندر باقی ہے نہ میرے یہ دونوں ساتھی۔ یہ تصویر ایک ادنیٰ سے کیمرے پر بنی ہوئی ہے اور اس کی کوالٹی بس ایسی ہی ہے لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد میں نے ایک یومِ فضائیہ کے موقع پر سرگودھا ائیر بیس پر نمائش میں اس مندر کی ایک نہایت خوبصورت اور صاف تصویر دیکھی تھی جو فضا سے کھینچی گئی تھی۔

اس مندر کی سیڑھیوں پر سنگِ مرمر کی ایک بڑی تختی نصب تھی جس پر مندر کا نام، سنِ تعمیر اور مندر بنوانے والے کا نام درج تھا لیکن اب یہ تختی یہاں موجود نہیں ہے۔ میرا خیال تھا کہ چنیوٹ کے کسی صاحب ذوق کے پاس اس تختی کی تصویر ضرور موجود ہوگی۔ اس حوالے سے چنیوٹ کے میرے دو دوستوں یعنی یو بی ایل کے محمد اسرائیل اور ملتان میں مقیم محکمہ انکم ٹیکس کے ریٹائرڈ ایڈمنسٹریٹو افسر، رشید اقبال نے مقدور بھر کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔

مندر کے قریب پہاڑی میں دو تین کمرہ نما غاریں تھیں جن میں سے ایک دو سڑک سے بھی نظر آتی تھیں۔ کہتے ہیں ہندو سادھو اِن کے اندر تپسیا کیا کرتے تھے۔ اب تو بجری کے ٹھیکیداروں نے ان پہاڑوں کا ستیاناس کر دیا ہے اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کوئی غار باقی بچی ہوگی لیکن میں نے یہ غاریں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اُن دنوں یہ غاریں خالی پڑی تھیں لیکن قریشی سمیع اللہ جو قیامِ ربوہ کے ابتدائی سالوں میں ایک بار اپنے والدین کے ساتھ یہاں سیر کے لیے آئے تھے نے ایسی ہی کسی غار میں سنگِ مرمر کا ایک بُت خود دیکھا تھا۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب ''بیتے لمحوں کی چاپ'' سے یہ اقتباس: ''یہ بُت بہت ہی خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ اس کا بازوَ غائب تھا۔ ساتھ ہی ایک کھڑکی کھلتی تھی جہاں سے دریا کا پانی بہت گہرائی میں اس چٹان سے ٹکراتا ہوا آگے پُل کی طرف جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیسا ایمانی جوش ابا جی کے دل میں تلاطم پیدا کرنے لگا۔ کہنے لگے: ہمارے پاک وطن میں اب بتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آوَ مل کر اسے اُٹھائیں اور دریا میں پھینک دیں۔ میں بھی ان دنوں نسیم حجازی کے...... اسلامی تاریخی ناول پڑھ کر جہادی جذبوں سے سرشار رہتا تھا فوراً ہی اس نیک کام کے لیے تیار ہوگیا۔ پوری آواز سے ابا جی نے نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر کہہ کر دونوں بازوؤں میں بُت اٹھا لیا۔ بُت وزنی تھا۔ کچھ ہمت میں نے بھی دکھائی اور کھڑکی کی راہ سے اسے دھڑام سے دریا میں پھینک دیا۔''

دریائے چناب پر موجود عوامی دلچسپی کے بعض مقامات کے بعد اب ذکر ربوہ کے کچھ تجارت پیشہ احباب کا۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق اس زمانے سے ہے جب ربوہ آبادکاری کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو اہلِ ربوہ کی روزمرّہ کی ضروریات پوری کرتے تھے۔

ان میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر داوَد جنرل سٹور کا۔

وہ مری آنکھوں سے اوجھل ''ہیں'' نہ میرے دل سے دُور

پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ داؤد جنرل سٹور ربوہ کی اُن دکانوں میں سے تھا جو آغازِ ربوہ میں کچے بازار میں ہوا کرتی تھیں۔ اس کے مالک ایک خوب رُو احمدی نوجوان، چوہدری داؤد احمد تھے۔ جب گول بازار کی تعمیر شروع ہوئی تو یہ دکان وہاں منتقل ہونے والی ابتدائی دکانوں میں سے تھی۔ اپنے سائز اور شاید کاروباری حجم کے لحاظ سے بھی اپنے زمانہ میں یہ ربوہ کی سب سے بڑی دکان تھی۔

یہ دکان داؤد اپنے بھائی بشارت احمد کی معاونت سے چلا رہے تھے۔ ضرورت کی ہر چیز یہاں سے مل جاتی تھی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں داؤد اچانک یہ دکان فروخت کر کے ربوہ سے نقلِ مکانی کر گئے۔ انہوں نے راولپنڈی کے بوہڑ بازار میں کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا جس میں سنتے ہیں اللہ نے بہت برکت ڈالی۔ پھر وہ اسلام آباد میں جائیداد کی خرید وفروخت کا کام کرنے لگے۔ اُن دنوں یہ شہر نیا نیا آباد ہو رہا تھا لہٰذا ترقی کے وسیع مواقع موجود تھے۔ انہوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا، ایکسچینج سنٹر کے نام سے کام کیا اور خوب شہرت پائی۔

میرا بچپن سے داؤد جنرل سٹور پر آنا جانا رہا اور مجھے یاد ہے کہ داؤد بہت خندہ پیشانی سے میری مطلوبہ اشیاء مجھے مہیا کرتے۔ گول بازار میں ان کی دکان کی ایک خاص بات پنسل تراشنے والی وہ دستی مشین تھی جو انہوں نے ایک کاؤنٹر پر مستقل طور پر نصب کر رکھی تھی۔ آپ کوئی چیز خریدیں یا نہ خریدیں اس مشین پر اپنی پنسل تراش سکتے تھے اور یہ بات مجھ ایسے بچوں (کہ اُس وقت میں بچہ ہی تھا) کے دل کو بہت بھاتی تھی۔

موصوف حضرت مسیح موعود کی رفیقہ، محترمہ مریم بی بی کے بیٹے اور مولوی نذیر احمد مبشّر کے بھانجے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ ان کی والدہ اور دادی جی کا انتقال ایک ہی روز یعنی ۲۷ جولائی ۱۹۵۹ء کو ہوا، دونوں کو حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل تھا، دونوں کا جنازہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے پڑھایا اور دونوں موصیہ ہونے کے سبب بہشتی مقبرہ کے ایک ہی قطعہ میں دفن ہوئیں۔

داؤد کے ربوہ سے منتقل ہونے کے بعد میری ان سے زیادہ ملاقات تو نہیں رہی لیکن وہ جب بھی ملے بہت پیار کے ساتھ۔ ۱۹۸۹ء میں میرے ٹورانٹو سے آٹوا کے سفر کے دوران میری میزبان، ذکیہ پرتھ کے مقام پر کالونیئل ہاؤس موٹر اِن میں آرام کے لیے رکیں تو مجھ پر یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ یہ اِن ہی داؤد اور ان کے چھوٹے بھائی بشارت کی ملکیت ہے۔ داؤد سے یوں اچانک ملاقات میرے لیے باعثِ مسرت تھی۔ انہوں نے عمدہ کافی سے ہماری تواضع کی تو تھکے ہارے جسموں کو گویا سکون مل گیا لیکن اصل خوشی ان کے ساتھ غیر متوقع ملاقات کی تھی۔

اس کے بعد ربع صدی گذر گئی۔ میں حال ہی میں ایک بار اسلام آباد گیا تو میرے میزبان نے بتایا کہ داوٗد آج کل کینیڈا سے آئے ہوئے ہیں اور قریب ہی مقیم ہیں۔ میرا دل مچل اٹھا کہ ان سے ملاقات کی جائے۔ فون کیا تو وہ گھر پر مل گئے مگر چونکہ ایک طویل مدت کے بعد ان سے بات ہو رہی تھی لہٰذا ایک لمحے کے لیے وہ مجھے پہچان نہ پائے لیکن پھر خود ہی کہنے لگے کہ ''کیا آپ داوٗد طاہر کمشنر انکم ٹیکس ہیں؟'' میری تصدیق پر وہ بے انتہا خوش ہوئے اور گھر آنے کی دعوت دی۔ ہم تو پہلے سے تیار بیٹھے تھے چنانچہ میں اپنے میزبان کے ہمراہ اسی وقت ان کے گھر جا پہنچا۔

داوٗد ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور اس اعتبار سے اس وقت ان کی عمر ۸۴ سال ہے۔ یہ خدا کا خاص فضل ہے کہ اس عمر میں بھی ان کی صحت بہت اچھی ہے اور ثقلِ سماعت کے علاوہ انہیں کوئی خاص عارضہ لاحق نہیں۔ وہ دبلے پتلے جسم کے مالک ہیں اور باقاعدہ واک کرتے ہیں۔ دل سے دعا نکلی کہ خدا انہیں ہمیشہ صحت و عافیت کے ساتھ رکھے۔

ان کے بھائی بشارت بھی ان ہی کے ساتھ مقیم ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان جو اتفاق آج سے ساٹھ سال پہلے تھا وہی اتفاق ان میں آج بھی موجود ہے۔ ان دونوں کا کاروبار ہمیشہ مشترکہ رہا اور لین دین کے کسی معاملے پر جھگڑا نہیں ہوا۔ ان کی رہائش بھی ہمیشہ اکٹھی رہی۔ فی زمانہ یہ ایک ایسی خوبی ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

فضلِ عمر ہسپتال ربوہ میں کام کرنے والی رضیہ نرس ان کی ہمشیرہ تھیں۔ رضیہ اب وفات پا چکی ہیں اور ان کا بیٹا طاہر بھی جو سکول میں میرا کلاس فیلو تھا اور لڑکے اسے ''طاہری'' کہا کرتے تھے۔ داوٗد کے ساتھ اس ملاقات میں ان دونوں مرحومین کا بھی تفصیلی ذکر آیا۔

داوٗد ہی نے بتایا کہ ان کی دکان شیخ محمد اکرام نے خریدی تھی جنہوں نے اس کا نام بدل کر ''نوید جنرل سٹور'' رکھ دیا۔

احمد یہ ماڈرن سٹور ربوہٗ قدیم کی ایک اور مشہور دکان تھی جہاں سٹیشنری، ہوزری، کراکری، کٹلری اور مردانہ و زنانہ جوتوں سمیت ہر چیز مل جایا کرتی تھی۔ مشہور تھا کہ یہ دکان محمد اسحٰق ارشد اور محمد احمد نظام نامی دو افراد کی ملکیت ہے جو آپس میں ہم زُلف ہیں۔ ماڈرن سٹور کے پاس باٹا کی ڈیلر شپ بھی تھی اور میں آج بھی چشمِ تصور سے اس دکان پر جلی حروف میں ''باٹا'' کا بورڈ لگا ہوا دیکھ سکتا ہوں۔ ہم اس دکان سے بھی ضرورت کی چیزیں خریدتے رہتے تھے چنانچہ ابا جی کی ڈائری کے ایک اندراج کے مطابق مجھے ۱۸ دسمبر ۱۹۵۳ء کو یہاں سے باٹا کے نئے بوٹ خرید کر دیئے گئے۔ بوٹوں کے اس جوڑے کی قیمت مبلغ نو روپے پندرہ آنے تھی۔

یہ کاروباری شراکت زیادہ دیر نہ چل سکی چنانچہ جلد ہی دونوں حصہ داران الگ ہو گئے۔

جہاں تک احمد یہ ماڈرن سٹور کا تعلق ہے بعد میں یہ دکان بھی گول بازار میں منتقل ہو گئی البتہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ محمد اسحاق نے کاروبار کی نوعیت تبدیل کر دی۔ انہوں نے جنرل سٹور کا کام چھوڑ کر گھڑیوں اور ریڈیو

ٹی وی کی مرمت کے علاوہ الیکٹرانکس کا کام شروع کر دیا البتہ دکان کا نام ان ہی کی ملکیت رہا۔ اب اسحاق وفات پا چکے ہیں اور یہ دکان بند پڑی ہے۔

علیحدگی کے بعد محمد احمد نے احمدیہ فیورٹ جنرل سٹور کے نام سے اپنی الگ دکان کر لی۔ گول بازار میں ان کی دکان کے پیچھے ان کا گھر تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو محمد احمد نظام کا یہ کاروبار رُو بہ زوال تھا اور ان کی دکان کی الماریاں اور شوکیس خالی خالی سے رہنے لگے تھے۔ اسی دوران انہوں نے اپنے سٹور سے ملحق ایک کمرے میں نظام سٹوڈیو کے نام سے فوٹو گرافی کا کام شروع کر دیا۔ پہلے تو وہ دکان اور سٹوڈیو خود ہی دیکھتے تھے مگر بعد میں ان کا بڑا بیٹا اطہر سٹور پر بیٹھنے لگا اور محمد احمد خود سٹوڈیو ہی کے ہو گئے۔

میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ایک روز گول بازار میں سے گذر رہا تھا کہ مجھے ایک اجنبی لڑکا مل گیا جو سیالکوٹ سے آیا تھا اور تعلیم الاسلام کالج میں داخلے کا خواہشمند تھا۔ اسے داخلہ فارم پر لگانے کے لیے تصویر کی ضرورت تھی جو اس کے پاس موجود نہ تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے یہ تصویر کہاں سے بنوانی چاہیے۔ میں محمد احمد کو ذاتی طور پر جانتا تھا چنانچہ میں اس لڑکے کو ان کے پاس لے گیا، ان سے اس کا تعارف کرایا اور اس کی تصویر کھینچنے کو کہا۔ انہوں نے فوراً اس کی تصویر اتار لی اور وعدہ کیا کہ اگلے روز شام کے وقت دے دیں گے۔

اگلی شام وہ لڑکا مجھے پھر اسی جگہ مل گیا۔ وہ اُس وقت تک اپنی تصویر لے چکا تھا اور اس کے معیار سے مطمئن نہ تھا۔ مجھے بھی اس رائے سے اختلاف کی ایسی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے محمد احمد سے واقفیت پر بڑا مان تھا چنانچہ میں لڑکے کو لے کر ان کے پاس چلا گیا اور تصویر کے معیار کے بارے میں شکوہ کیا۔ وہ چند لمحے کبھی لڑکے کی طرف اور کبھی تصویر کو دیکھتے رہے اور پھر بے ساختہ کہنے لگے: ''جیہو جئی شکل سی تصویر اوہو جئی ای آنڑی سی نا''۔ ان کے اس جواب کے بعد ہمارے پاس کہنے کو کچھ رہ نہیں گیا تھا۔

محمد احمد حضرت مسیح موعود کے رفیق، حضرت مستری نظام الدین آف سیالکوٹ کے صاحبزادے تھے۔ مستری نظام الدین حضور کی دعا سے ایک خطرناک مقدمے سے باعزت طور پر بری ہوئے تھے اور حضور نے اس امر کا ذکر 'حقیقۃ الوحی' میں ایک خدائی نشان کے طور پر فرمایا ہے۔

بیڈمنٹن محمد احمد کا ایک منفرد شوق تھا۔ عصر کی نماز کے بعد ان کے زیر تعمیر مکان کے پیچھے بڑے اہتمام کے ساتھ بیڈمنٹن کا نیٹ لگایا جاتا اور پھر گیم جمتی۔ یہاں کھیلنے والوں میں سے جو نام مجھے یاد ہیں ان میں عبدالحفیظ، لطف الرحمٰن لطفی اور محمود عبداللہ الشبوطی شامل تھے۔ اول الذکر دونوں صاحبان فضل عمر ہسپتال میں کام کرتے تھے جب کہ محمود عبداللہ الشبوطی یمن سے آئے ہوئے ایک طالب علم تھے جو جامعہ احمدیہ میں پڑھ رہے تھے۔

یاد رہے کہ محمود عبداللہ الشبوطی ایک مخلص نو احمدی یمنی عرب عبداللہ محمد الشبوطی کے صاحبزادے تھے جنہوں نے مئی ۱۹۵۲ء میں جامعہ احمدیہ میں داخلہ لیا اور مولوی فاضل کرنے کے بعد ۴ فروری ۱۹۶۰ء کو اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ان کا وقف قبول کر لیا اور ساتھ ہی ان کے اپنے وطن عدن میں مربی لگائے جانے کی منظوری دے دی چنانچہ وہ حضور کے حکم پر اگست ۱۹۶۰ء میں وطن واپس چلے

گئے۔انہوں نے وہاں سے ''الاسلام'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور علمی حلقوں میں احمدیت کی آواز بلند کرنے کے علاوہ جماعتی تربیت وتنظیم کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔

ربوہ میں قیام کے دوران ان کی شادی سید بشیر احمد شاہ، منیجر دواخانہ خدمت خلق کی صاحبزادی، شاہ رخ نسرین سے ہوئی تھی۔

یہ تو تھا ان اصحاب کا ذکر جو یہاں پر باقاعدگی سے بیڈمنٹن کھیلنے آیا کرتے تھے لیکن بعض دیگر افراد بھی کبھی کبھار یہاں کھیلتے نظر آتے۔

حال ہی میں جب اس موضوع پر میری بات محمد احمد کے بڑے بیٹے اطہر سے ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ یہاں پر کبھی کبھی آنے والوں میں صاحبزادہ مرزا طاہر احمد جو بعد میں خلافتِ رابعہ کے مقامِ عالیشان پر فائز ہوئے بھی شامل تھے۔

محمد احمد اور ان کے فیورٹ سٹوڈیو کا ذکر ہو رہا ہے تو شاید یہ ذکر بھی مناسب ہو کہ ان کی اہلیہ، صفیہ بیگم نے بھی فوٹو گرافی سیکھ رکھی تھی اور فوٹو بنوانے کی آرزومند خواتین کی تصویر بنا دیتی تھیں۔ میرے علم کے مطابق ابتدائے ربوہ میں ان محترمہ کے علاوہ کوئی اور خاتون فوٹو گرافر موجود نہ تھی۔ ہاں! قریشی محمد حنیف قمر المعروف سائیکل سیاح کی بیٹی، ذکیہ خاتون کی شادی جڑانوالہ کے ایک نوجوان، عزیز احمد سے ہوئی جو پیشہ ور فوٹو گرافر تھے۔ذکیہ نے ان سے تھوڑی بہت فوٹو گرافی سیکھی اور جب ان کے شوہر اچانک مفلوج ہو کر چارپائی سے لگ گئے تو ذکیہ ربوہ منتقل ہو گئیں۔خواتین کی فوٹو گرافی کے حوالے سے ان کا ذکر بھی سنا جاتا تھا۔

ربوہ کے اس زمانے کے فوٹو گرافروں میں سے دو نام جو فوری طور پر میرے ذہن میں آ رہے ہیں اسماعیل اختر اور احمد زمان تنویر کے ہیں۔ان کے سٹوڈیوز علی الترتیب اختر سٹوڈیو اور تنویر سٹوڈیو کے ناموں سے معروف تھے۔

اسماعیل اختر سری لنکا کے رہنے والے تھے۔ان کے والد مولوی اے پی ابراہیم سلسلہ کے مربّیوں میں سے تھے جو سری لنکا میں متعین رہے۔انہوں نے اپنے کاروبار کا آغاز ۱۹۵۰ء کی دہائی میں غلہ منڈی سے کیا اور اپنی دکان کا نام ''اختر سٹوڈیو'' رکھا۔وہ بعد میں گول بازار میں موجودہ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کے پاس منتقل ہو گئے۔اب انہوں نے سٹوڈیو کا نام تبدیل کر کے ''اختر میموریل فوٹو سروس'' رکھ دیا تھا۔کچھ عرصہ بعد انہوں نے یہ سٹوڈیو ایوانِ محمود کے بالمقابل شفٹ کر لیا۔

میری معلومات کے مطابق بعد میں اسماعیل اختر فیصل آباد چلے گئے اور اپنی اہلیہ کے نام پر ''ممتاز سٹوڈیو'' کے نام سے کاروبار شروع کر دیا۔

سنتے ہیں اب اسماعیل اختر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

تنویر سٹوڈیو نامور خادمِ سلسلہ حافظ محمد رمضان کے بڑے بیٹے، احمد زمان تنویر نے ۱۹۶۸ء کے شروع میں اقصیٰ روڈ پر میونسپل کمیٹی کے دفتر کے قریب قائم کیا تھا۔تنویر نے اس میدان میں خوب نام پیدا کیا اور ویڈیو فلمز

(جوعوام الناس میں اسی دور میں متعارف ومقبول ہوئیں) بنانے میں خاص شہرت پائی۔ اس زمانے میں خواتین کی تقریبات کی مرد مُووی میکرز کے ہاتھوں کوریج کی ایسی حوصلہ شکنی نہ کی جاتی تھی چنانچہ ربوہ میں ہونے والی اکثر شادیوں پر فلم بنانے کا چلن عام ہو رہا تھا اور اس رواج کو دوام دینے میں تنویر سٹوڈیو کا بہت حصہ ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی ربوہ کے قدیم دکانداروں کی لیکن بیچ میں ان فوٹوگرافروں کا ذکر بھی آ گیا جو بہت بعد میں یہاں آئے۔ جہاں تک ربوہ کے پرانے تجار کا تعلق ہے ''افضل برادرز'' ربوہ کی قدیم ترین دکانوں میں سے ہے جو قریشی محمد افضل مربی سلسلہ کے چھوٹے بھائی، قریشی محمد اکمل کی ملکیت تھی۔ سنتے ہیں اس دکان کا آغاز قادیان میں ہوا تھا۔ اس کے مالک قریشی محمد افضل تھے جن کے پاس قریشی محمد اکمل کام کیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں قریشی محمد افضل بطور واقف زندگی افریقہ چلے گئے تو انہوں نے یہ دکان قریشی محمد اکمل کے سپرد کر دی۔ یہ قریشی محمد اکمل کی وضعداری تھی کہ انہوں نے اس دکان کا نام تبدیل نہیں کیا بلکہ ربوہ آ کر بھی اسی نام سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا حالانکہ قریشی محمد افضل کا اب اس کاروبار سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ ہاں! وہ جائیداد جس میں یہ دکان تھی دونوں بھائیوں کی مشترکہ تھی اور ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اپنے قیام ربوہ کے زمانہ میں ان دونوں شریف النفس بھائیوں سے ملاقات کے مواقع ملتے رہے ہیں۔ قریشی محمد افضل کا زیادہ وقت تو خدمتِ دین کے سلسلہ میں بیرون ملک گذرتا رہا لیکن وہ جب کبھی پاکستان میں ہوتے ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ بظاہر نحیف ونزار لیکن جواں ہمت قریشی محمد افضل کو اللہ تعالیٰ نے لمبی خدمت دین کی توفیق عطا فرمائی اور اس پر ان کی نسلیں بجا طور پر فخر کرتی رہیں گی۔

قریشی شاہد احمد ان کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے مائیکروبائیالوجی میں ایم ایس سی کیا تھا اور چاہتے تو اپنے لیے کوئی اور راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کے نقشِ قدم پر اپنی زندگی خدمتِ سلسلہ کے لیے وقف کر دی۔ وہ تیس سال سے زیادہ عرصہ غانا اور نائیجیریا کے جماعتی سکولوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دینے کے بعد ۱۹۹۵ء میں پاکستان واپس آ گئے اور تب سے نصرت جہاں اکیڈمی میں پڑھا رہے ہیں۔ راقم سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں اور جب ملتے ہیں اس چاہت کا اظہار کرتے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

اِن کے ایک بہنوئی، قریشی محمد ارشد جو اَب ربوہ میں مقیم ہیں بھی مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اس وقت ہوئی جب میں راولپنڈی میں تعینات تھا اور وہ نیشنل بنک آف پاکستان، مظفر آباد میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے کسی کام سے میرے پاس تشریف لائے تھے لیکن وہ دن گیا اور آج کا دن آیا، ان سے رابطے میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ ان کا اخلاص روزِ اول کی طرح قائم ہے اور میں ان سے ملے بغیر ان کے گھر کے سامنے سے نہیں گذرتا۔ ان کی چھوٹی بہن رشیدہ اختر آپی کی ہم جماعت تھیں اور بڑی بہن، سعیدہ احسن قدرے سینئر۔ اب رشیدہ اختر وفات پا چکی ہیں لیکن سعیدہ احسن اپنی کمزوری کے باوجود تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہتی ہیں۔

میں نے قریشی محمد اکمل کو بھی انتہائی دھیمے مزاج کا منکسر المزاج انسان پایا جو اپنے کاروبار سے زیادہ اپنے گاہکوں کا مفاد زیادہ عزیز رکھتا اور اپنا مال بیچتے وقت انہیں اس کے بارے میں کسی دھوکے میں نہ رکھتا۔ قریشی محمد اکمل اب وفات پا چکے ہیں۔ ان کی یادان کے چار بچوں کی شکل میں قائم ہے۔ محمد انور تو ماشاء اللہ واقفِ زندگی ہیں، اطہر محمود ناروے میں ہیں جب کہ آصف محمود اور قیصر محمود نے یہ دکان چلانے کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ افضل مارکیٹ کی پرانی عمارت منہدم کر کے اسے بڑے شہروں کی جدید عمارات کی طرز پر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے اور اسے دیکھ کر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ قدیم عمارت کی شکل وصورت کیا ہوگی۔

قریشی فضلِ حق اور ان کے چھوٹے بھائی، قریشی عبدالغنی جنہوں نے ربوہ میں زیرِ زمین پانی کی تلاش کے حوالے سے انتھک محنت کی تھی ابتدا ہی میں تجارت کی طرف راغب ہو گئے اور کچے بازار میں ایک جنرل سٹور قائم کر لیا۔ گول بازار کی تعمیر کے بعد وہ غالباً ''قریشی جنرل سٹور'' کے نام سے کاروبار کرنے لگے۔ قریشی فضلِ حق ایک زمانے میں بیت المہدی میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ مدت گذری دونوں بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

ان بزرگان کی تربیت کی چھاپ ان کی اولادوں پر بھی دیکھی جا سکتی ہے جو اپنے اپنے رنگ میں خدمتِ سلسلہ میں مصروف ہیں۔ قریشی فضلِ حق کے صاحبزادے، سراج الحق جو پنجاب کے مختلف سرکاری کالجوں میں پڑھاتے رہے ہیں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے اور آج کل نائب افسر جلسہ سالانہ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ قریشی عبدالغنی کے صاحبزادے، جلیل صادق تعلیم الاسلام کالج میں مجھ سے سینئر تھے چنانچہ میں نے ابھی بی اے بھی نہ کیا تھا کہ وہ یہاں لیکچرر آ لگے۔ انہوں نے ساری زندگی اسی ادارے کی خدمت میں بتا دی اور اب بھی کئی طرح سے جماعتی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان کے ایک بھائی عبدالحلیم بھی واقف زندگی ہیں۔ ان سب کے بچے ماشاء اللہ جدید تعلیم سے آراستہ ہیں اور حسبِ توفیق اپنے بزرگان کے نام روشن کر رہے ہیں۔

''بشیر جنرل سٹور'' جس کا پرانا نام بشیر کراکری اینڈ جنرل سٹور تھا گول بازار کی ایک مشہور دکان تھی جو ۱۹۵۰ء کی دہائی میں کھلی اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بند ہوگئی۔ اس کے مالک چوہدری بشیر احمد تھے جو کسی وجہ سے یہ کاروبار ختم کر کے ربوہ سے چلے گئے۔

سنتے رہتے تھے کہ ربوہ چھوڑنے کے بعد انہوں نے ملتان میں پٹرول پمپ خرید لیا ہے لیکن ان سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ۱۹۹۳ء میں جب میرا تقرر کمشنر انکم ٹیکس، ملتان کے طور پر ہوا تو ابتدا میں جماعت کے جن دوستوں سے ملاقات ہوئی ان میں چوہدری بشیر احمد بھی شامل تھے۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ربوہ چھوڑنے کے بعد سے ملتان ہی میں مقیم ہیں اور ان چھ یا سات سالوں کے علاوہ جب وہ بسلسلہ کاروبار بہاولپور منتقل ہو گئے تھے وہ ملتان ہی میں رہے ہیں۔ ان دنوں وہ آئل کیرج کنٹریکٹر کے طور پر کام کر رہے تھے اور ایک سے زیادہ پٹرول پمپ ان کی ملکیت میں تھے۔

موصوف انتہائی خلیق اور وضعدار انسان ہیں۔ چنانچہ وہ ملتان کینٹ کے جدید ترین علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مالی کشائش سے بھی نواز رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں جماعتی خدمت کی توفیق بھی بخشی ہے چنانچہ وہ تین سال امیر جماعت احمدیہ بہاولپور رہے اور لمبے عرصے سے جماعت احمدیہ ملتان کے نائب امیر ہیں۔

یہاں پر پیر مبارک احمد کے ''مون لائٹ جنرل سٹور'' کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو پیر مظہر الحق کے بیٹے، حضرت پیر افتخار احمد کے پوتے اور قدیم بزرگ حضرت صوفی احمد جان کے پڑپوتے تھے۔ پہلے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے احاطہ میں ہوسٹل کے قریب جہاں ٹک شاپ بھی تھی دکان کرتے تھے۔ ہوسٹل میں مقیم طلبہ اپنی ضرورت کی اکثر چیزیں یہیں سے خریدتے تھے لہٰذا ان کی دکان پر رونق لگی رہتی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا انہوں نے گول بازار میں دکان کھول لی۔ ان کا یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔ بہت اچھے اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کی وفات احمد نگر کے قریب سڑک کے ایک جان لیوا حادثے میں ہوئی۔

ایک روز قطعہ شہدا میں کسی اور کی قبر تلاش کرتے ہوئے میری نگاہ اچانک ان کی قبر پر پڑ گئی تو مجھے اپنے سکول کا زمانہ یاد آ گیا جب ''آدھی چھٹی'' کے دوران میں اپنی چھوٹی موٹی ضروریات کی خریداری ان ہی کی دکان سے کیا کرتا تھا جو اُن دنوں ''پیر جنرل سٹور'' کے نام سے معروف تھی۔

''ملک جی برادرز'' سے کتبِ سلسلہ، ٹیکسٹ بکس، سٹیشنری، منیاری اور کراکری سمیت بہت کچھ مل جاتا تھا۔ بعد میں انہوں نے اخبارات بھی رکھ لیے تھے اور ربوہ سے باہر رہنے والوں کی سہولت کے لیے معاوضہ پر ان کے کام کرانے شروع کر دیئے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے یہ دکان دو بھائی مل کر چلا رہے تھے جن میں سے ایک کا نام سعادت احمد تھا اور دوسرے کا بشارت احمد۔

تحصیل جڑانوالہ سے تعلق رکھنے والے نبی احمد باجوہ نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں باجوہ ''جنرل سٹور'' کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ پھر نہ جانے کیوں یہ دکان ختم کر کے اسی جگہ ''باجوہ کلاتھ سٹور'' کے نام سے کپڑے کا پرچون کام کرنے لگے۔ اگرچہ ربوہ کی آبادی محدود اور یہاں پر موجود دکانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی لیکن خدا نے ان کے کام میں خوب برکت ڈالی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع کوٹھی انہوں نے محلہ دارالصدر غربی میں اپنی رہائش کے لیے تعمیر کر لی۔

ربوہ کے قدیم باسی ہونے کے ناطے میری ان سے اچھی راہ و رسم تھی اور وہ ہمیشہ احترام سے ملتے تھے۔ کبھی ان کی دکان سے خریداری کی ضرورت پیش آتی تو کچھ نہ کچھ رعایت ضرور کرتے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ان کی ایک صاحبزادی، فاخرہ نثار کا ناخن ٹوٹ گیا۔ اُس نے ایلفی کو نیل پالش کی طرح اپنے اس ناخن پر لگا لیا جس سے اس جواں سال بچی کو ٹیٹنس ہو گیا اور وہ کچھ دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گئی۔

اس بچی کی حادثاتی موت نبی احمد باجوہ کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھی جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تاہم انہوں نے

راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو

کے مصداق صبر و رضا کا انتہائی اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

میں نے ۱۹۸۸ء میں ان کی وفات کی خبر بہت دُکھ کے ساتھ سُنی۔ ان کے بیٹے اعجاز باجوہ نے بتایا:

''اباجی وفات سے چند گھنٹے پہلے تک بالکل ٹھیک تھے۔ انہیں شکار کا شوق تھا اور وہ اس رات بھی اپنے ہم مزاج دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بناتے رہے لیکن تقدیر پاس کھڑی ان پر مسکرا رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر انہیں دل کا حملہ ہوا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ انہیں ہسپتال لے جانے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

مرحوم نے نظامِ وصیت میں شمولیت اختیار کر رکھی تھی چنانچہ ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔ ان کی قائم کردہ دکان اسی نام سے اب تک چل رہی ہے اگرچہ بدلے ہوئے حالات کے تحت اعجاز باجوہ نے کاروبار کی نوعیت میں کسی قدر تبدیلی کر دی ہے۔

گول بازار میں کپڑے کی پرانی دکانوں میں سے ایک ''حبیب کلاتھ ہاؤس'' بھی تھا۔ یہ دکان شروع میں اُس جگہ تھی جہاں آج کل ''الیکٹرانکس'' نامی دکان ہے۔ اس کے مالک حبیب اللہ نامی ایک متشرع بزرگ تھے۔ ماسوا اس کے کہ وہ مجھے پہچانتے تھے اور ادھر اُدھر آتے جاتے ہم ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ لیتے تھے میری ان کے ساتھ کبھی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہاں! ان کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ آج تک نہیں بھولا۔

اُس جگہ جہاں اب بیت المہدی تعمیر ہو چکی ہے ایک زمانے میں خالی میدان ہوا کرتا تھا۔ ایک بار ایک بازی گر نے جو نہ جانے کہاں سے گھومتا پھرتا ربوہ آ نکلا تھا اس میدان میں آ تماشا لگایا۔ جیسا کہ اس قسم کے مواقع پر ہوتا ہے بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت و استعجاب سے اس کی رٹی رٹائی تقریر سننے لگے۔ تماشائیوں میں میرے علاوہ حبیب اللہ بھی شامل تھے۔

بازی گر نے کسی درخت کی ایک ٹہنی زمین میں گاڑی۔ پھر اس کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیا اور تماشائیوں کو بتایا کہ جب وہ کپڑا اٹھائے گا تو ٹہنی پر سنگترے لگ چکے ہوں گے۔ اس نے چند لمحوں کے لیے کپڑے سے ڈھکی ہوئی اس ٹہنی پر کچھ پڑھا اور جب کپڑا اٹھایا تو اس پر بہت سے سنگترے لگے ہوئے تھے۔

شعبدہ باز نے ایک لڑکے کو زمین پر لٹا کر اس کے گلے، ناف، گھٹنوں اور ٹخنوں پر لکڑی کی چھوٹی چھوٹی چھڑیاں رکھ دیں اور اس کے اوپر ایک بہت بڑی چادر ڈال دی۔ پھر شعبدہ باز نے کوئی منتر پڑھا جس کے بعد لڑکے کا جسم زمین سے آہستہ آہستہ اُٹھنا شروع ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بلند ہو گیا کہ چادر کے کنارے زمین کو چھونے لگے۔ اگر اس میں مبالغہ نہ سمجھا جائے تو وہ زمین سے کم و بیش چار یا پانچ فٹ اوپر اُٹھا ہوا تھا۔ اس نے اسی کیفیت میں جملہ تماشائیوں کے سامنے جو شعبدہ باز کے گرد ایک دائرے کی شکل میں کھڑے تھے چکر لگایا اور پھر شعبدہ باز کے پاس جا کر زمین پر اُتر گیا۔

اُس زمانے میں روپے کا چاندی والا سکہ ابھی رائج تھا۔ بازی گر کی فرمائش پر حبیب اللہ نے اپنی جیب سے ایسا ہی ایک سکہ نکالا۔ بازی گر نے اِس سکے کو کپڑے کے ایک ٹکڑے میں باندھ کر سب تماشائیوں کو دکھایا اور

پھر موصوف سے ان کی دکان کا محل وقوع دریافت کیا۔ اُن دنوں یہ دکان تقریباً اس جگہ پر تھی جہاں اب شلو بھائی چشمہ والوں کی دکان ہے۔ تب بازی گر نے یہ بتا کر سب کو حیران کر دیا کہ اب یہ روپیہ اس دکان کے اندر پڑے ہوئے گلّے میں جا کر گرے گا۔

سب لوگ سوچ رہے تھے کہ یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے لیکن بازی گر نے اس روپے کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر کوئی منتر پڑھا۔ جب اس نے ہتھیلیاں علیحدہ کیں تو روپیہ موجود نہ تھا لیکن اسی وقت یوں آواز آئی گویا وہ روپیہ لوہے کے کسی برتن میں جا گرا ہو۔ حبیب اللہ سے کہا گیا کہ وہ جا کر اپنی دکان کھولیں اور گلّہ دیکھیں تو یہ روپیہ اس کے اندر پڑا ہوا ملے گا۔ وہ وہاں پہنچے تو روپیہ واقعی ان کے گلّے میں پڑا ہوا تھا۔

انہوں نے جنوری ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔ ان کے ایک صاحبزادے، نذیر احمد سیالکوٹی کے الفضل میں شائع شدہ ایک مضمون سے پتا چلتا ہے کہ مرحوم کا اصل وطن موضع چندر کے جٹاں تھا جو ضلع سیالکوٹ میں واقع ہے، وہ خلافتِ ثانیہ کے ابتدائی دور میں جماعتِ احمدیہ میں داخل ہوئے، بچوں کی دینی تربیت کی خاطر ۱۹۳۰ء میں قادیان منتقل ہوئے، قیامِ پاکستان کے بعد ربوہ آ گئے اور یہیں وفات پا کر بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

فاضل مضمون نگار کے الفاظ میں ''مرحوم کا یہ وصف بہت نمایاں تھا کہ وہ نہایت صاف گو، وعدے کے پکے اور معاملہ کے صاف تھے اور ان کی یہ دلی خواہش ہوتی تھی کہ ان سے معاملہ کرنے والے بھی ایسے ہی ہوں۔ اگر ایسا شخص تجربہ میں آتا جو اُن کے معیار پر پورا نہ اُترتا ہو تو بہت بُرا مناتے اور فرماتے کہ احمدیوں کو تو ہر بات میں نمونہ ہونا چاہیئے۔''

ان کی وفات کے بعد (یا ممکن ہے ان کی زندگی میں ہی) یہ کاروبار ان کے بیٹے بشیر احمد سیالکوٹی نے سنبھال لیا۔

یاد رہے کہ بشیر نے جو مدرسہ احمدیہ، قادیان کے فارغ التحصیل اور مولوی فاضل تھے ۱۹۴۱ء میں دفتر بہشتی مقبرہ میں بطور محرر اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں مسلسل تیرہ سال تک حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کی خدمت کا موقع ملا تاہم انہیں یہ کاروبار سنبھالنے کے لیے صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے فراغت حاصل کرنا پڑی۔

جب میں فیصل آباد میں انکم ٹیکس آفیسر کے طور پر تعینات تھا ایک روز بشیر سخت پریشانی کے عالم میں میرے پاس تشریف لائے۔ ان کے بیان کے مطابق محکمہ نے ان کی سالانہ آمدنی کی تشخیص کرتے ہوئے ان کے کاروبار کا مبالغانہ اندازہ لگایا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس پہلے دن سے لے کر اُس روز تک کا دکان کی بکری کا مکمل ریکارڈ موجود ہے اور یہ کہ میں اگر چاہوں تو اسے دیکھ کر اپنی تسلی کر سکتا ہوں۔ ان رجسٹروں کے مطابق اس دکان کا افتتاح چودہ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ہوا تھا اور اس کی پہلے دن کی بکری صرف تینتیس روپے تیرہ آنے تھی۔ اس کے بعد بھی کئی سال تک ان کی روزانہ بکری کم و بیش یہی رہی چنانچہ دکان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اس کی بکری چھتیس روپے دو آنے اور دوسری سالگرہ پر اس کی بکری چالیس روپے پچاس پیسے تھی۔

ربوہ کے پرانے خیاطوں کی بات کریں تو میرے ذہن میں سب سے پہلے حضرت مرزا مہتاب بیگ کی تصویر ابھرتی ہے جو ایمپسٹس والی گلی میں دکان کرتے تھے۔ دُبلے پتلے، دراز قد مرزا مہتاب بیگ پگڑی پہنتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنی پہلی پینٹ اور بوشرٹ ان ہی سے اس زمانے میں سلوائی تھی جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُس وقت اِس جوڑے کی سلائی ڈھائی روپیہ ادا کی گئی تھی۔

مرزا مہتاب بیگ کی رہائش محلّہ دارالیمن میں تھی۔ درہ پار کرکے دریا کی طرف جائیں تو بالکل شروع میں سڑک کے بائیں ہاتھ ان کا مکان تھا جو اس محلّہ کے بالکل ابتدائی چند مکانوں میں سے تھا اور میرے خیال کے مطابق اچھا خاصا بنا ہوا تھا۔

مجھے ان کی وفات کے بعد پتا چلا کہ وہ حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھے اور قیامِ پاکستان سے قبل قادیان میں صدر انجمن احمدیہ کے صنعتی سکول (جسے عرفِ عام میں درزی خانہ کہا جاتا تھا) کے انچارج تھے۔ قادیان سے ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ پیرانہ سالی کے باوجود اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر وہاں تشریف لے گئے لیکن بیمار ہو کر لمبا عرصہ صاحبِ فراش رہے۔ اسی بیماری کی حالت میں پاکستان واپس آئے اور چند ہی روز بعد وفات پا گئے۔

ان کی وفات پر عبدالرحمٰن دہلوی کے قلم سے الفضل میں ایک مضمون شائع ہوا جس کے مطابق بشیر آرچرڈ کے قبول احمدیت میں دیگر امور کے علاوہ مرزا مہتاب بیگ کے حسنِ اخلاق کا بھی کچھ دخل تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل بشیر آرچرڈ ہی کی زبانی سُنیئے: ''قادیان میں ایک درزی خانہ ہے، میں وہاں پر گیا۔ ایک کپڑا پسند کیا اور قیمت پوچھی تو......مرزا مہتاب بیگ نے ایک روپیہ دو آنے گز بتائی۔ میں حیران تھا کہ ہندوستان میں......دکاندار اوّل تو انگریز کو دیکھ کر اصل قیمت سے کئی گنا زیادہ قیمت بتاتے ہیں اور پھر فوجی کو دیکھ کر تو قیمت بہت ہی زیادہ بیان کرتے ہیں مگر انہوں نے قیمت بالکل مناسب بتائی۔..........پھر میں نے دو قمیصوں کا کپڑا خریدا اور دریافت کیا کہ قمیصیں کب دیں گے جس پر انہوں نے کوئی وقت بتایا۔ جب میں وقتِ مقرر پر پہنچا تو قمیصیں بالکل تیار تھیں۔ یہ امر بھی ہندوستان کے باشندوں کی عام ذہنیت کے خلاف تھا کیوں کہ عام طور پر ہندوستان میں درزی کئی پھیرے کرانے کے بعد کپڑا سی کر دیتے ہیں۔ ان دونوں باتوں نے میرے دل پر گہرا اثر چھوڑا ہے کہ ہندوستان کے بازاروں میں جہاں اتنا جھوٹ، وعدہ خلافی اور بے ایمانی ہوتی ہے یہ لوگ اتنے سچے اور دیانتدار ہیں۔ اگر یہ دنیاداری کے معاملہ میں اتنے سچے ہیں تو دوسرے معاملوں میں کیوں نہ ارفع و اعلیٰ کردار کے مالک ہوں گے؟''

میں اسے اپنی خوش بختی کے علاوہ کس چیز پر محمول کروں کہ مجھے ان کے سیئے ہوئے کپڑے پہننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس شہر کے قدیم درزیوں میں سے ایک اور مہر دین تھے جو نوید جنرل سٹور کے قریب کسی دکان کے برآمدے میں بیٹھا کرتے تھے اور چمن عباس کے بالمقابل محلّہ دارالرحمت غربی میں رہائش پذیر تھے۔

میں ان کے دونوں بیٹوں، اسماعیل جعفر مرحوم اور محمد ابراہیم سے ملا ہوں۔ اسماعیل جعفر ماسٹر سعد اللہ خان کے داماد تھے، اے جی آفس میں کام کرتے تھے اور دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑ کر عین جوانی کے عالم میں وفات پا گئے

تھے۔ ان کی اہلیہ، کلثوم اور چھوٹے بیٹے، جمیل کا بیان ہے کہ مرحوم سیف الدین سیف کے بہت قریب تھے اور یہ کہ انہوں نے بعض فلموں کی کہانیاں اور گیت بھی لکھے ہیں۔ اس حوالے سے وہ دو تین فلموں کے نام بھی لیتے ہیں تاہم کسی اور ذریعہ سے اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ ابراہیم صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں کام کرتے تھے لیکن موقع ملا تو سب کچھ چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔ ان سے ایک دو بار فون پر بات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ ماشاء اللہ خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں۔

عبدالسلام بھی ربوہ کے قدیم ترین درزیوں میں سے تھے۔ انہیں شیروانی کی سلائی میں مہارت حاصل تھی اگرچہ ان کی زندگی کے آخری دور میں انہوں نے برقع کی سلائی میں تخصیص حاصل کر لی تھی۔ میں جب بھی ان کی دکان کے سامنے سے گذرتا اور وہ مجھے دیکھ لیتے تو آواز دے کر روک لیتے۔ میں بھی بے تکلفانہ ان کے پاس بڑے سٹول پر بیٹھ جاتا اور ادھر ادھر کی کچھ باتیں کر کے اجازت طلب کرتا۔ ان کے صاحبزادے، مالک سکول میں میرے کلاس فیلو رہے تھے۔ وہ ہوتے تو ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

مالک کا ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ ہم چھٹی جماعت میں تھے۔ عربی کا پیریڈ تھا۔ استادِ محترم کسی لڑکے کو سزا دینا چاہتے تھے لیکن چھڑی نہ جانے کہاں بھول آئے تھے چنانچہ انہوں نے مانیٹر کو حکم دیا کہ وہ بھاگ کر جائے اور کہیں سے چھڑی پکڑ لائے۔ وہ بے چارہ باہر گیا اور ایک بظاہر مضبوط سرکنڈہ اُٹھا لایا۔ استادِ محترم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سرکنڈے کے ساتھ اپنے شاگردِ عزیز کی مرمت شروع کر دی۔ سرکنڈہ ان کے ایک دو وار تو سہہ گیا لیکن پھر آناً فاناً اس کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر تیر کی طرح قریب بیٹھے ہوئے مالک کی آنکھ میں جا لگا۔ جب مالک نے درد کی شدت سے چیخنا شروع کیا تو استادِ محترم کو احساس ہوا کہ معاملہ گربڑ ہو گیا ہے چنانچہ وہ مار پیٹ بھول کر مالک کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ بمشکل تمام مالک خاموش ہوئے لیکن فوری طور پر پتا نہ چل سکا کہ ان کے زخم کی نوعیت کیا ہے۔ سکول میں فرسٹ ایڈ کا کوئی انتظام نہ تھا اور شاید مقامی ہسپتال میں بھی اس طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کا کوئی سامان نہ تھا چنانچہ مالک روتے پیٹتے گھر چلے گئے۔

اس کے بعد مالک نے سکول آنا چھوڑ دیا۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے اس حادثے کے ردِعمل کے طور پر پڑھائی ترک کر دی ہے تاہم کئی سالوں بعد معلوم ہوا کہ عبدالسلام ٹیلر اپنی کسی کاروباری مصلحت کے پیشِ نظر لاہور منتقل ہو گئے تھے، مالک نے وہیں داخلہ لے لیا تھا اور بالآخر لاہور صدر کے مسلم ہائی سکول سے میٹرک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ ۱۹۶۷ء میں اپنے والدِ بزرگوار کے ہمراہ دوبارہ ربوہ آ گئے۔

مدت کے بعد مالک سے ملاقات ہوئی تو مجھے یہ سارا واقعہ یاد آ گیا۔ ''کیا ہوا تھا آپ کی آنکھ کا۔ نظر تو بچ گئی تھی نا؟''

''خدا نے بہت فضل کیا'' مالک نے جواباً کہا: ''چوٹ آنکھ کی پُتلی پر لگی تھی۔ گھر پہنچا تو خواجہ عبدالحیٔ کریانہ فروش کی اہلیہ آ گئیں۔ انہوں نے مجھے پُلٹس سی بنا کر دی۔ میں یہی پُلٹس آنکھ پر باندھتا رہا اور اسی سے میری تکلیف ختم ہو گئی۔ میں تو اسے معجزہ کہوں گا۔''

بے۔ عبدالسلام جو پرویز پروازی کی روایت کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی شیروانیاں بھی سیتے وفات پا چکے ہیں لیکن مالک اب بھی گول بازار میں ٹیلرنگ کا کام کر رہے ہیں۔ وہ محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ مجھے دیکھ لیں تو ضرور آواز دے کر روک لیتے ہیں اور حال احوال پوچھے بنا آگے نہیں جانے دیتے لیکن یہ سب کچھ بغیر کسی غرض اور لالچ کے ہوتا ہے۔

عبدالقادر ان ہی عبدالسلام کے بھانجے تھے اور گول بازار میں مردانہ کپڑوں کی سلائی کا کام کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے اپنی دکان پر نیا کپڑا بھی رکھا ہوا تھا۔ اگر کوئی چاہتا تو ان سے کپڑا خرید کر ان ہی کو سلائی کے لیے دے دیتا۔ ان کی دکان (فضل عمر ہسپتال کی طرف سے آئیں تو) گول بازار کی پہلی آٹھ دس دکانوں میں تھی۔

میں ان سے کپڑا تو کبھی کبھار سلاتا تھا لیکن ان کے پاس بیٹھتا بکثرت تھا۔ ان سے بے تکلفی اتنی بڑھ گئی کہ جب وہ ربوہ چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور ایک احمدی خاتون کے انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے لگے تو میں گلبرگ کی مین مارکیٹ میں ایک پلازے کی بالائی منزل پر واقع ان کی ورکشاپ میں ان سے ملاقات کے لیے جایا کرتا تھا۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ عبدالسلام اور عبدالقادر دونوں کب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

نامور احمدی شاعر اور ادیب، ڈاکٹر عبدالکریم خالد ان ہی عبدالقادر کے صاحبزادے اور ان کے چھوٹے بھائی، عبدالستار ٹیلر کے داماد ہیں جو پہلے لیکمسٹس والی گلی میں دکان کرتے تھے لیکن آخری عمر میں افضل مارکیٹ میں بیٹھنے لگے تھے۔

ان ہی عبدالقادر کے دوسرے صاحبزادے اور ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے ایک بھائی، عبدالرحیم طارق ایک زمانے میں پاکستان باسکٹ بال ٹیم کے کیپٹن تھے۔ بعد میں انہوں نے کسی بنک کی ملازمت اختیار کر لی لیکن پچھلے چند ماہ سے آسٹریلیا منتقل ہو چکے ہیں۔ مجھے ان سے ملاقات کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن ان کے آسٹریلیا جانے کے بعد ایک ضرورت کے تحت ان سے فون پر بات ہوئی جس دوران میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی باسکٹ بال کی یادداشتیں مرتب کریں۔ انہوں نے وعدہ تو کیا ہے لیکن دیکھنے والی بات یہ ہے کہ وہ اسے عملی جامہ کب پہناتے ہیں۔ فی الحال وہ اسی بات پر مطمئن ہیں کہ ایم ٹی اے ان کا ایک تفصیلی انٹرویو کرنا چاہتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی یادداشتوں کا معتد بہ حصہ اس انٹرویو کے ذریعہ اپنے ناظرین تک پہنچا سکتے ہیں۔

ایک ٹیلر عبدالمنان خان بھی تھے۔ بھاری بھر کم عبدالمنان کی دکان احمدیہ ماڈرن سٹور کے ساتھ تھی۔

ماسٹر عبدالکریم نامی ایک ٹیلر ماسٹر بھی گول بازار میں کسی کے برآمدے میں لکڑی کے ایک تختے پر اپنا ٹھیا لگاتے تھے۔ دُبلے پتلے اور چھوٹے قد کے عبدالکریم پگڑی پہنتے تھے۔ ابا جی وہاں سے گذرتے ہوئے ان کے پاس ہیلو ہائے کے لیے رک جایا کرتے تھے اور اسی ناطے وہ مجھے بھی پہچانتے تھے۔ ابا جی نے ایک بار ذکر کیا کہ ماسٹر عبدالکریم خوش گلو تھے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اس امر سے واقف تھے۔ آپ نے اپنی آخری بیماری کے دوران ایک بار انہیں بلایا اور کوئی نظم سنانے کی فرمائش کی۔ ماسٹر عبدالکریم صاحب کے الفاظ میں ”حضور یہ نظم سن

کر بہت خوش ہوئے اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے دس روپے کا ایک نوٹ عنایت کرتے ہوئے فرمایا
''عبدالکریم! یہ لو اپنا انعام''۔ ماسٹر عبدالکریم اپنے اس اعزاز پر ہمیشہ نازاں رہے۔

مرزا خلیل احمد قمر جنہیں ایک لمبا عرصہ دفتر وقف جدید انجمن احمدیہ میں خدمت کا موقع ملا بیان کرتے ہیں
کہ ماسٹر عبدالکریم کا بچپن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے خاندان کی خدمت میں گذرا تھا۔ وہی مروی ہیں کہ
حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کو بھی ماسٹر عبدالکریم کی آواز بہت پسند تھی اور وہ انہیں وقتاً فوقتاً اپنے پاس بلا کر ان
سے نظمیں سنا کرتے تھے۔

مجھے ان کی اس برآمدے میں عدم موجودگی سے احساس ہوا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔

پرانے خیاطوں میں سے ایک نذیر بھی تھے جن کا پورا نام مرزا نذیر احمد تھا۔ انہوں نے حج کر رکھا تھا لہٰذا
بعض دوست ان کا ذکر حاجی نذیر کے طور پر بھی کیا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے ''نذیر کلاتھ ہاؤس'' کے نام
سے کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا۔ یہ دکان موجودہ احمدیہ ماڈرن سٹور سے ملحق تھی۔

وہ محلہ دارالیمن کے رہائشی تھے۔ نیکی کے کاموں میں پیش پیش رہتے چنانچہ اخباری اطلاع کے مطابق
مولانا جلال الدین شمس کی نعش کو انہوں نے ہی غسل دیا تھا۔

گول بازار کی ہسپتال والی طرف محمد حیات نامی ایک بزرگ ''حیات ٹیلرز'' کے نام سے کام کیا کرتے تھے۔
منکسر المزاج سے محمد حیات پرانی وضع کے انسان تھے جو ہر ایک سے بے حد خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ پھر نہ جانے
ان کے دل میں کیا سمایا کہ انہوں نے یہ کام چھوڑ کر ''حیات سنز ٹینٹ سروس'' کے نام سے تنبو قنات کا کام شروع کر دیا
لیکن اب ''حیات ٹیلرز'' کا وجود ہے نہ ''حیات سنز ٹینٹ سروس'' کا نام ونشان باقی ہے۔ سنتے ہیں کہ محمد حیات بعد میں
اپنے کسی بیٹے کے پاس امریکہ چلے گئے تھے اور ۱۹۹۸ء میں وفات پا کر وہیں دفن ہوئے۔ مجھے ان کے باقی بچوں کا تو
کچھ پتا نہیں البتہ منور نصیر ربوہ میں مقیم ہیں اور لائف انشورنس کا کام کر رہے ہیں۔

جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دیتا ہے گول بازار میں سلائی مشینوں کی مرمت کی صرف ایک ہی دکان تھی
جس کے مالک غلام حیدر بھٹی تھے۔ انہوں نے زیادہ وقت نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ملازمت میں گذارا تھا اور
سے بطور فورمین ریٹائر ہو کر ربوہ آ گئے تھے۔ ان کی رہائش فضل عمر ہسپتال کے عقب میں پہاڑی کے
کندیاں
دامن میں تھی۔

اُن کے پاس بعض دیگر کمپنیوں کے علاوہ نفیس سلائی مشین کی ایجنسی بھی تھی۔ مجھے یاد ہے آپا ایک نئی
مشین خریدنا چاہتی تھیں چنانچہ اباجی نے انہیں یہ مشین اسی دکان سے خرید کر دی تھی۔ یہ مشین آج کل خریدار کی
دوسری نسل کے استعمال میں ہے۔

یہ دکان جو غالباً ۱۹۶۳ء میں کھلی تھی زیادہ دیر نہ چلی اور اگلے ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر بند ہو گئی۔
غلام حیدر بھٹی کے بہت سے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ان کے ایک بیٹے یعنی عبدالشکور بھٹی حال مقیم
فرینکفرٹ میرے دوستوں میں سے ہیں۔ میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا جب وہ ہماری کلاس میں داخل

ہوئے۔ ایف اے تک ان کا ساتھ رہا۔ ان دنوں پاکستان کے بڑے بڑے تجارتی اداروں میں کمپیوٹر آ رہے تھے
چنانچہ وہ تھرڈ ائیر میں پڑھائی چھوڑ کر کراچی چلے گئے اور کچھ ٹریننگ کے بعد یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ میں پروگرامر کے
طور پر ملازمت کرنے لگے۔ قسمت کے دھنی تھے۔ جدّہ الیکٹرک کمپنی کو اس شعبہ کے ماہرین کی ضرورت پڑی تو
وہ سعودی عرب چلے گئے۔ وہاں دبی دبی سی مخالفت ہوئی تو یورپ جا نکلے۔ جرمنی پہنچے تو ان کے اپنے الفاظ میں
''اس وقت تک وہاں احمدی نہ ہونے کے برابر تھے چنانچہ فرینکفرٹ مشن کے انچارج، مسعود احمد جہلمی نے مجھے
اپنے پاس روک لیا۔ چار پانچ سال تو ایسے تیسے گذر گئے۔ پھر جب سیاسی پناہ کا چلن شروع ہوا تو میں یہیں کا ہو
کر رہ گیا۔''

عبدالشکور بھٹی یوں تو فرینکفرٹ میں کسی امریکی فوجی اڈے پر کام کرتے تھے لیکن اسی دوران انہوں نے
ایک سٹور بھی قائم کر لیا جسے وہ اور ان کی بیگم مل کر چلاتی ہیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اب وہ پوری توجہ
کاروبار کی طرف دے رہے ہیں۔

موصوف ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ جب ملتان میں میری کتاب ''شوق ہمسفر میرا'' کی تقریب رونمائی سپیکر
قومی اسمبلی، سید یوسف رضا گیلانی کی صدارت میں ہوئی اور اخبارِ جہاں میں اس فنکشن کی خبر ان کی نظر سے
گذری تو انہوں نے میرا پتا تلاش کر کے مجھے مبارک باد کا خط بھیجا۔ اسی طرح میرا ایران اور ترکی کا سفرنامہ ان
تک پہنچا تو وہ باڈ اورَب نامی بحالی صحت کے کسی مرکز میں آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے نام اپنے خط
میں لکھا کہ انہوں نے یہ کتاب اس مرکز کے صحن میں نصب ایک بنچ پر بیٹھ کر بڑے مزے لے لے کر پڑھی ہے اور
ان کی دلی خواہش ہے کہ اگر میں کبھی جرمنی آسکوں تو وہ مجھے بحالی صحت کا یہ مرکز دکھائیں جو ایک انتہائی پُر فضا
مقام پر واقع ہے اور اسے ایک بہت عمدہ سیر گاہ کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ مجھے اور راشدہ کو کچھ
ہی عرصہ بعد جرمنی جانے کا موقع مل گیا۔ انہیں اطلاع ہوئی تو وہ ہمیں خاص طور پر وہاں لے کر گئے۔ میں آج بھی
وہ چند گھنٹے نہیں بھلا سکتا جو ہم نے اس خوبصورت مقام پر گذارے تھے۔ کاش! ہمارے ملک میں بھی مریضوں
کے علاج معالجے کے لیے ایسی سہولتیں عام ہو جائیں۔

غلام حیدر بھٹی کی ایک صاحبزادی، مبشرہ محمد رشید ہاشمی کی اہلیہ ثانی ہیں۔ رشید ہاشمی ریٹائرڈ سرکاری ملازم
تھے اور آفیسرز کالونی، لاہور میں رہائش پذیر۔ ان سے میری پہلی ملاقات عبدالشکور بھٹی ہی کے توسط سے ہوئی جو
بعد میں کئی اور ملاقاتوں پر منتج ہوئی۔ میں نے انہیں ہمیشہ شریف الطبع اور وضعدار پایا۔

یاد رہے یہ وہی رشید ہاشمی ہیں جو لمبا عرصہ حلقہ شالی چھاؤنی کے صدر رہے اور ۲۸ مئی ۲۰۱۰ء کو دارالذکر،
لاہور میں دہشت گردی کی کارروائی کے دوران راہِ مولا میں قربان ہو گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اپنے
خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۸ جون ۲۰۱۰ء میں خاصی تفصیل کے ساتھ مرحوم کی صفاتِ حسنہ کا ذکر کیا ہے۔ حضور کے الفاظ
میں: ''مرحوم بہت ہی پیار کرنے والے تھے۔ جماعت کا درد رکھنے والے تھے۔ خدمتِ دین کا شوق رہتا تھا اور
بیوی بچوں کو بھی یہ تلقین کرتے تھے۔''

پرانے کریانہ فروشوں کی بات ہو تو میرے ذہن میں سب سے پہلے صوفی کریم بخش زیروی کا نام آتا ہے جن کی دکان گول بازار میں طاہر ہارٹ سنٹر والے کونے پر تھی۔ ہماری رہائش اس دکان کے عقب میں تھی لہٰذا ہم ان سے سودا لینے لگے۔ ہم ان کے مستقل گاہکوں میں سے تھے لہٰذا وہ بھی ہمیشہ بہت عزت سے پیش آتے۔ اگر کبھی دکان بند ہوتی تو ہم ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر مطلوبہ چیزیں حاصل کر لیتے اور اس کا حساب بعد میں ہوتا رہتا۔

میری معلومات کے مطابق یہ دکان اور اس سے ملحق مکان صوفی کریم بخش اور ان کے دو بھائیوں، صوفی خدا بخش عبدز یروی اور صوفی رحیم بخش زیروی کی ملکیت تھا۔

ان تینوں بھائیوں میں سے صوفی خدا بخش سب سے بڑے تھے اور کچے کوارٹروں میں ہم ایک ہی گلی میں رہائش پذیر تھے تاہم ان سے ذاتی طور پر میرا تعارف اس وقت ہوا جب وہ دفتر وقفِ جدید میں کام کر رہے تھے۔ وہ میرے مہربانوں میں سے تھے اور جہاں دیکھ لیتے بہت تپاک سے ملتے۔

''صوفی'' کا لفظ ان کے نام کا سابقہ تھا لیکن کبھی اس بات پر غور کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ انہوں نے صوفی کیسے کہلانا شروع کیا۔ ثاقب زیروی کے الفاظ میں ''ابتدا سے وہ بڑے نستعلیق اور صوفی منش تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے ہاتھ میں چھڑی رکھنی شروع کر دی تھی اور ہم جو پانچویں چھٹی کے طالب علم تھے انہیں ''صوفی صاحب'' کہہ کر پکارتے تھے جس پر ان کی برہمی دیدنی ہوتی تھی۔ نوبت بایں جا رسید کہ انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کے والدین سے جا کر شکوہ کیا اور انہوں نے ہمیں منع کیا کہ جب وہ پسند نہیں کرتے تو تم انہیں صوفی کیوں کہتے ہو۔ اس پر ہم نے طرزِ تخاطب میں کچھ تبدیلی کر لی یعنی پہلے ''صوفی صاحب'' ہی کہتے مگر فوراً بعد معذرت کر لیتے۔''

یہ تو ہے ایک روایت۔ پروفیسر شیخ محبوب عالم خالد کے صاحبزادے، ناصر خالد کا بیان ہے کہ صوفی خدا بخش حضرت خان صاحب مولوی فرزند علی کے بہنوئی، صوفی علی محمد سے بہت متاثر تھے اور یہ کہ انہوں نے اپنے نام سے پہلے صوفی کا لفظ ان کے ساتھ تعلق کی بنا پر لکھنا شروع کیا تھا۔ ناصر خالد کے بیان کے مطابق انہوں نے یہ بات صوفی خدا بخش سے براہِ راست سنی تھی۔

انہوں نے خود احمدیت قبول کی تھی، پھر والدین کو احمدی کیا اور اس کے بعد بھائیوں کو۔ انہوں نے ایک واقف زندگی کے طور پر تحریک جدید، صدر انجمن احمدیہ اور وقف جدید، تینوں اداروں میں کام کیا اور احکاماتِ دین پر عمل کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رؤیاءِ صادقہ کی نعمت سے نواز رکھا تھا۔ ان کی وفات پر الفضل میں چھپنے والے ایک مضمون سے پتا چلتا ہے کہ موصوف نے اپنے ایک خواب کے عین مطابق موعودہ عمر پوری کرنے کے بعد ۱۹۹۸ء میں وفات پائی۔

صوفی خدا بخش کی اہلیہ، امۃ الکریم جو بابو عبدالغنی انبالوی کی صاحبزادی تھیں ۱۹۵۵ء میں صرف ۳۷ برس کی عمر میں وفات پا گئی تھیں۔ اُن کی وفات لودھراں میں ہوئی جہاں وہ اپنے والدین سے ملاقات کے لیے گئی

ہوئی تھیں۔ اُن کی وفات کا زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ صوفی خدا بخش کو اس حادثہ کی بروقت اطلاع نہ ہو سکی اور مرحومہ کی تدفین ان کی عدم موجودگی میں ہوگئی۔

موصوف کے سب سے بڑے صاحبزادے، ڈاکٹر کریم اللہ زِیروی نے فارما کالوجی میں ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے۔ انہوں نے پاکستان میں پی سی ایس آئی آر میں اور شیراز کی پہلوی یونیورسٹی میں بھی کام کیا ہے لیکن ۱۹۷۸ء سے امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں اور مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف حیثیتوں میں کام کا لمبا تجربہ رکھتے ہیں۔ اُنہیں کئی جماعتی خدمات کی بھی توفیق ملی ہے چنانچہ وہ سات سال تک مجلس انصار اللہ امریکہ کے صدر؛ کم و بیش نو سال تک جماعت احمدیہ امریکہ کے نیشنل ایجوکیشن سیکرٹری اور گیارہ سال تک احمدیہ گزٹ، امریکہ کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ وہ ایک ممتاز ریسرچر ہیں اور اُن کے پینسٹھ سے زیادہ ریسرچ پیپرز مشہور سائنسی جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے بھی مصنف ہیں اور آج کل نیوجرسی میں فیئر لان میں مقیم ہیں۔

ان کے چھوٹے بھائی حبیب الرحمٰن زِیروی خدا کے فضل سے واقفِ زندگی ہیں۔ انہوں نے لائبریری سائنس میں ایم اے کر رکھا ہے۔ وہ لمبا عرصہ خلافت لائبریری کے انچارج اور کچھ عرصہ نائب ناظر اشاعت بھی رہے لیکن آج کل طاہر فاؤنڈیشن میں خدمت بجا لا رہے ہیں۔ اُنہیں مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ اور مجلس انصار اللہ مرکزیہ میں بھی مختلف ذمہ داریاں ادا کرنے کا موقع ملا ہے۔

حبیب الرحمٰن سے چھوٹے بشارت الرحمٰن ہیں جنہوں نے شماریات میں ایم ایس سی کر رکھا ہے۔ وہ کچھ عرصہ گیمبیا کے کسی جماعتی سکول میں بھی پڑھاتے رہے ہیں تاہم آج کل انگلستان میں ہیں۔

ڈاکٹر کریم اللہ کی تین بہنوں میں سے ایک محمد اعظم اکسیر، مربی سلسلہ سے؛ دوسری حافظ مظفر احمد، ایڈیشنل ناظر اصلاح وارشاد (مقامی) سے اور تیسری مربی سلسلہ، انوار احمد انوار سے بیاہی ہوئی ہیں۔

صوفی خدا بخش میرے ماموں مرزا محمد یعقوب کے گہرے دوستوں میں سے تھے اور یہ دونوں اپنے بعض دیگر دوستوں بشمول شیخ رحمت اللہ آف لنڈا بازار لاہور، صوفی عطاء الرحمٰن (والدِ بزرگوار صوفی بشارت الرحمٰن)، میاں حبیب اللہ لدھیانوی (والدِ بزرگوار پروفیسر سعید اللہ خان)، سید محمد محسن شاہ (والدِ بزرگوار محمد احمد گردیزی حال مقیم جرمنی) اور میاں محمد بوٹا (مقیم محلہ دارالصدر غربی) کے ساتھ بیٹھ کر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ ربوہ کے بعض لوگ اِن بزرگان کے لیے طنزاً ''دعائیہ پارٹی'' کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے جس کے اجتماعات باری باری ان اصحاب کے گھروں پر ہوتے تھے۔

یہ تو تھا ایک نقطۂ نگاہ لیکن سید حسن خان اپنی کتاب ''ربوہ کی چند پرانی یادیں'' میں صوفی عطاء الرحمٰن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ گرمیوں کے دنوں میں ساری ساری رات گھر سے باہر گراؤنڈ میں کپڑے بچھا کر عبادت کیا کرتے تھے۔ میری اور (میرے دوست۔ ناقل) بابر کی یہ ڈیوٹی تھی کہ اُن کے لیے رات سے پہلے پہلے زمین کو صاف کر کے پانی...... کا چھڑکاؤ کر کے...... زمین کو ٹھنڈا کر دیا جائے تاکہ وہ آسانی سے ساری رات عبادت کر سکیں۔ ان کے بارہ میں اُن کے بیٹے مبشر احمد...... حال انگلستان نے مجھے بتایا

کہ ایک دفعہ وہ ایسے ہی اپنے دوستوں کے ساتھ دعائیں کر رہے تھے تو اُن کے ہاتھ میں شہد آ گیا تھا جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معجزہ تھا۔"

یاد رہے کہ مبشر احمد نے خود میرے سامنے بھی فون پر اس بات کی تصدیق کی ہے۔

ہاں! تو ذکر ہو رہا تھا صوفی خدا بخش کا۔ میں نے انہیں ہمیشہ شیروانی اور پگڑی میں ملبوس دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی اور لباس بہت اُجلا ہوتا تھا اور اس لباس میں اُن کی شخصیت نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ ان کی اس وضع قطع سے تنہا میں ہی متاثر ہونے والا نہ تھا، بعض انگریزوں کو بھی یہ لباس بہت بھاتا۔ ان کے بیٹے حبیب الرحمٰن زیروی کا بیان ہے کہ وہ ایک بار لندن کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لیے گئے تو انہیں کسی گھر کی کھڑکی میں سے اچکن اور پگڑی میں ملبوس کسی شخص کی ہاتھ سے بنی ہوئی ایک تصویر لٹکتی نظر آئی۔ وہ اس بات پر حیران ہوئے کہ ایک ناواقف شخص کے گھر میں اُن کے والدِ بزرگوار کی تصویر کیوں کر لٹک رہی ہے چنانچہ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹا کر گھر کی مالکہ سے سوال کیا کہ اس نے یہ تصویر کہاں سے حاصل کی تھی۔ تب خاتون نے بتایا کہ وہ خود مصوّرہ ہے۔ ایک بار اس نے راہ چلتے صاحبِ تصویر کو دیکھا تو ان کی شخصیت سے متاثر ہوئی اور ان سے درخواست کر کے ان کی یہ تصویر بنالی۔

اس خاتون کا نام Elizabeth R Meek ہے اور وہ اپنے حلقۂ احباب میں پورٹریٹ آرٹسٹ کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ انہوں نے حبیب کو بتایا کہ وہ یہ تصویر مختلف نمائشوں میں رکھ کر لوگوں سے خاصی داد وصول کر چکی ہیں اور وعدہ کیا کہ وہ اگلی نمائش میں اُنہیں ضرور مدعو کریں گی۔ حبیب کے پاس میک کا پندرہ اکتوبر ۱۹۹۲ء کا لکھا ہوا ایک خط پڑا ہے جس میں اُنہیں دعوت دی گئی تھی کہ وہ اِن کی تصاویر کی اگلی نمائش جو لندن کے ویسٹ منسٹر سنٹرل ہال میں تیرہ سے اٹھائیس نومبر ۱۹۹۲ء تک ہونے والی تھی ضرور تشریف لائیں۔

صوفی خدا بخش کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے حبیب الرحمٰن زیروی کے نام اپنے خط میں انہیں بہت "مخلص دعا گو بزرگ" قرار دیا۔

میرا خیال ہے صوفی خدا بخش ہی کی وجہ سے ان کے باقی بھائی بھی صوفی مشہور ہو گئے۔ مجھے ان بھائیوں میں سے صوفی رحیم بخش سے ملاقات کا موقع تو نہیں ملا البتہ صوفی کریم بخش، ان کی اہلیہ اور بچوں، عزیز اللہ اور نعیم اللہ سے گہرا میل جول رہا اور میں ان کی اہلیہ کو بھی جانتا تھا۔

اِن کا نام حمیدہ بیگم تھا۔ بہت ملنسار تھیں اور چونکہ میں ان کے سامنے پلا بڑھا تھا لہٰذا وہ میرے سامنے آجاتیں اور براہِ راست گفتگو بھی کر لیتیں۔ ان کی شہرت ایک مستجاب الدّعوات خاتون کی تھی چنانچہ محلے کی بعض عورتیں اپنے اپنے مسائل کے لیے انہیں دعا کی درخواست کرتی رہتی تھیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے اپنے خطبہ جمعہ فرمودہ پچیس اگست ۱۹۶۷ء میں جو آپ نے یورپ کے کامیاب دورے سے واپسی پر ارشاد فرمایا تھا ان ہی حمیدہ بیگم کے ایک خواب کا ذکر فرمایا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضور نے اپنے اس سفر کے باثمر ہونے کے بارے میں جو خواب دیکھا تھا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے ملتی جلتی مبشر خوابیں بہت سے احمدیوں کو بھی دکھائی گئیں۔حضور نے اس خطبہ جمعہ میں ان میں سے دو خوابیں بیان فرمائیں۔حضور کے الفاظ میں موصوفہ نے ’’پندرہ اور سولہ جولائی کی درمیانی شب بوقت چار بجے صبح خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا وسیع میدان ہے جو ایک بڑے شہر جتنی جگہ میں سمایا ہوا ہے اور سبزہ زار ہے۔اس میدان کے درمیان ایک گلدستہ پڑا ہوا ہے جس میں نہایت ہی خوبصورت پھول لگے ہوئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ گلدستہ ایک درخت کی شکل میں تبدیل ہوجانا شروع ہوجاتا ہے اور بالآخر ایک تناور درخت بن کر اس تمام میدان میں سایہ فگن ہوجاتا ہے۔اتنے میں ایک بزرگ رونما ہوتے ہیں جو سفید لباس میں ملبوس ہیں اور ان کا حلیہ حضرت مسیح موعود سے ملتا ہے۔وہ بزرگ فرمارہے ہیں کہ جو شخص اس تناور درخت کے نیچے پناہ نہیں لے گا وہ تباہ ہوجائے گا۔اس پر حمیدہ بیگم.......... نے پوچھا کہ یا حضرت! کون سے درخت کے نیچے؟ جس پر اس بزرگ نے فرمایا: حضرتِ ناصر کے درخت کے نیچے۔گویا وہ گلدستہ جس نے ایک تناور درخت کی صورت اختیار کی وہ جس شخص کا ہے اس سے مراد اس خاکسار کا وجود ہی ہے۔پھر اس کے بعد دیکھا کہ اس میدان کے ایک کونہ میں ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام ہورہا ہے جس میں بہت عمدہ عمدہ کھانے بہت بڑی تعداد میں لگے ہوئے ہیں اور جس میں شمولیت کے لیے جماعت کے دوست جمع ہورہے ہیں۔اس میں دہی کے کونڈے بھی ہیں اور دو سیاہی مائل کتے ان دہی کے کونڈوں کی طرف لپکتے ہیں جس پر حمیدہ بیگم نے شی شی کر کے ان کتوں کو ڈرانے کی کوشش کی تو ان بزرگ صاحب نے فرمایا: نہ! آپ ان کو رہنے دیں، یہ خود بخود ہٹ جائیں گے۔اس پر آنکھ کھل گئی۔‘‘

یہ خواب بیان کرنے کے بعد حضور نے فرمایا: ’’یہ خواب بھی میری رؤیا سے ملتی جلتی ہے۔‘‘

ہاں! تو ذکر ہو رہا تھا صوفی کریم بخش کا۔ جب حکومتی فیصلے کے تحت ربوہ ’’کھلا شہر‘‘ قرار پایا اور یہاں مختلف بنکوں کی شاخیں قائم ہونے لگیں تو یو بی ایل کو زیرہ ہاؤس نامی عمارت پسند آ گئی چنانچہ صوفی کریم بخش کی زندگی میں ہی دکان ختم کر کے یہ جگہ بنک کو دے دی گئی۔

’’فضل شاپ‘‘ والے چوہدری فضل احمد کی کریانے کی دکان پہلے تو دفتر مجلس انصار اللہ مرکزیہ کے بالمقابل تھی لیکن بعد میں وہ گول بازار میں اس گلی کے اندر منتقل ہو گئے جہاں کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد کا کلینک ہوا کرتا تھا۔اس زمانے میں دفتر جلسہ سالانہ تعمیر نہ ہوا تھا لہٰذا تحریک جدید کے کوارٹرز اور گول بازار، دونوں اطراف سے وہاں پہنچا جا سکتا تھا۔

مجھے اپنی شادی کے بعد معلوم ہوا کہ میری اہلیہ کی ایک خالہ ان ہی فضل احمد کے ایک بیٹے منور سے بیاہی ہوئی ہیں۔منور ان دنوں کراچی میں تھے۔وہ بعد میں جرمنی چلے گئے اور وہاں سے امریکہ۔ میں ۱۹۸۹ء میں امریکہ گیا تو منور نے بطور خاص مجھے مدعو کیا اور نہ صرف مدعو کیا بلکہ طویل فاصلہ طے کر کے مجھے اس مقام سے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا لینے کے لیے آئے، اپنے گھر لے گئے اور پھر ائیر پورٹ پر پہنچایا کہ مجھے اسی شام نیویارک سے لندن جانا تھا۔

منور ان دنوں ایک فارمیسی چلا رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ باقی لوگوں کے علاوہ دو امریکی الاصل باشندے بھی ان کی ملازمت میں ہیں۔

فضل احمد نے دو شادیاں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کثیر اولاد سے نوازا چنانچہ پہلی بیوی سے سات بچے اور دوسری سے آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ پہلی بیوی سے زیادہ اولاد امریکہ میں ہے۔ اب فضل احمد بھی وفات پا چکے ہیں اور منور بھی۔

گول بازار کے ایک کریانہ فروش خواجہ عبدالحیی تھے۔ سرخ وسفید اور گٹھے ہوئے جسم کے خواجہ عبدالحیی حضرت مسیح موعود کے رفیق حضرت عبدالرحیم عرف پولا کے صاحبزادے تھے جو تھے تو کشمیری الاصل لیکن کسی وجہ سے وطن مالوف سے ہجرت کر کے قادیان کی نواحی بستی ننگل میں مقیم ہو گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ سکھوں کا گاؤں تھا لیکن وہ ان کی شدید مخالفت کے باوجود وہاں ایک بیت الذکر کی تعمیر میں کامیاب ہو گئے اور جب سکھوں نے ردعمل کے طور پر ان کا پانی بند کر دیا تو انہوں نے ہمت کر کے اپنا علیحدہ کنؤاں کھودلیا۔ اس گاؤں میں ان ہی کے ذریعہ جماعت قائم ہوئی لیکن بعد میں وہ قادیان اور پھر ربوہ آ گئے۔

خواجہ عبدالحیی کے سب سے بڑے بیٹے، خواجہ عبدالمومن سکول میں میرے ہم جماعت تھے لیکن وہ کسی وجہ سے پڑھائی جاری نہ رکھ سکے مگر کاروبار سے دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ گول بازار میں ''مومن کلاتھ ہاؤس'' کے نام سے دکان کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کاروبار میں خوب برکت دی اور یہ دکان اپنے وقت میں ربوہ میں کپڑے کی بڑی دکانوں میں شمار ہونے لگی تاہم انہوں نے شہرت مجلس خدام الاحمدیہ کے ایک فعّال رکن کے طور پر پائی۔ نہ جانے کب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ناروے چلے گئے۔ میں ایک بار اوسلو گیا تو ان کے ساتھ ملاقات میرے پروگرام میں شامل تھی لیکن بوجوہ معاملہ فون پر بات چیت سے آگے نہ بڑھ سکا۔

۲۰۱۳ء کے اوائل میں ان کے ایک جواں سال بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ مجھے الفضل کے ذریعہ سے اس حادثہ کی خبر ملی تو میں محلہ دارالرحمت شرقی میں ان کے مکان پر حاضر ہوا۔ اتنے بڑے حادثہ کے باوجود وہ میرے سامنے صبر وشکر کی ایک زندہ مثال بن کر بیٹھے رہے۔

پچھلے سال کے آغاز میں مجھے برین ہیمرج ہو گیا۔ یہ ایک پریشان کن صورتِ حال تھی جس میں سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے خاص فضل سے نکالا اور صحتِ کاملہ سے نوازا۔ اس موقع پر میرے جن دوستوں نے میری تیمارداری کی اُن میں خواجہ عبدالمومن بھی شامل تھے جو اُن دنوں اتفاقاً پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اُنہیں میری بیماری کا علم ہوا تو ایک سے زیادہ بار فون کر کے میری خیریت دریافت کی اور ناروے پہنچ کر بھی میرا حال احوال پوچھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اِن کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

خواجہ عبدالمومن شعر کہتے ہیں۔ کئی سال ہوئے ان کی پہلی کتاب ''جذباتِ مومن'' میری نظر سے گذری تھی۔ حالیہ ملاقات میں انہوں نے مجھے اپنی دوسری کتاب ''سب کچھ تری عطا ہے'' جو اُن ہی دنوں شائع ہوئی تھی اپنے دستخط سے عنایت کی۔

جو لوگ یہ دونوں کتابیں دیکھ چکے ہیں میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ حمد و نعت، حضرت مسیح موعود اور آپ کے خلفاء سے محبت و عقیدت کا اظہار، برکاتِ خلافت، غیر ممالک میں احمدیت کی اشاعت کے لیے جماعتی کوششیں، ارضِ ربوہ کی یاد اور راہِ مولا کے جانثاروں اور وفات یافتہ بزرگان کا تذکرہ خواجہ عبدالمومن کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کے نام حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے بعض شائع شدہ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں حضور کی اشیر باد بھی حاصل ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے سچ کہا ہے کہ ان کی شاعری ''جس در پر جا کر قبول ہوئی وہاں قبولیت کا شرف حاصل کرنا نصیبوں کی بات ہے۔''

مندرجہ ذیل قطعہ اُن کے اِسی مجموعے سے لیا گیا ہے:

اے اسیرِ راہِ مولیٰ تیری عظمت کو سلام
تیرے اخلاص و وفا اور تیری جرأت کو سلام
کر رہا ہے تو رقم تاریخ اپنے ہاتھ سے
آج تیرے حوصلے اور استقامت کو سلام

غلہ منڈی میں ''داؤد کریانہ سٹور'' کے نام سے ایک دکان ہوا کرتی تھی۔ بعد میں اس دکان کا نام ظفر کریانہ سٹور رکھ دیا گیا۔ اس دکان پر مختار احمد قمر نامی ایک نوجوان بیٹھا کرتے تھے جو مالکِ دکان کے سگے بھائی تھے۔ وہ سکول میں تو مجھ سے سینئر تھے لیکن کالج میں ہم ایک ساتھ رہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ انہوں نے بی اے کی بجائے بی ایس سی کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کر لیا لیکن پاکستان میں مناسب روزگار کے حصول میں ناکامی کے بعد افریقہ چلے گئے۔

طویل عرصے کے بعد ایک عید کے موقع پر ان سے لاہور کے بیت النور میں اچانک ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے سیرالیون اور نائیجیریا کے غیر جماعتی سکولوں میں تقریباً سولہ سال ملازمت کی۔ ان کے اپنے الفاظ میں: ''میں وہاں پر مطمئن زندگی گذار رہا تھا لیکن میری والدہ پاکستان میں بیمار رہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں واپس آ جاؤں سو میں ۱۹۸۶ء میں واپس آ گیا۔ پریشان تھا کہ اب کیا ہو گا لیکن اچانک کریسنٹ ماڈل ہائر سیکنڈری سکول میں کیمسٹری کے استاد کی جگہ مشتہر ہوئی۔ میں نے وہاں درخواست دے دی۔ اس پوسٹ کے لیے امیدواروں کی ایک لمبی قطار تھی لیکن خدا کا شکر ہے میں منتخب ہو گیا۔ میں نے وہاں بائیس سال تک پڑھایا جس کے بعد اب میں گھر پر ہی ہوں اور ٹیوشنز پڑھا کر وقت گذار رہا ہوں۔''

''آپ نے ایم ایس سی کرنے کے بعد پاکستان میں ملازمت کی کوشش نہیں کی؟'' سالہا سال کے بعد ملنے والے کسی دوست سے میرا یہ سوال قطعاً بے موقع نہ تھا۔

''کی تھی لیکن آپ کو تو یاد ہو گا اس زمانے میں بھی مقابلہ بہت سخت تھا اور مذہبی تعصبات بھی کم نہ تھے۔ آپ سے کیا پردہ، ان دنوں پاکستان کے کسی نیم سرکاری کالج میں کیمسٹری کے لیکچرر کی جگہ مشتہر ہوئی تو میں نے بھی

درخواست بھجوادی۔ انٹرویو کے لیے بلایا گیا لیکن اُس روز کالج کی گورننگ باڈی کے چیئرمین کسی اور مصروفیت کی وجہ سے موجود نہ تھے لہٰذا انٹرویوز ملتوی ہو گئے۔ ہاں! پرنسپل نے ہمیں چائے کے لیے روک لیا۔ وہ ہر امیدوار سے تعارف حاصل کر رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں نے بتایا کہ میں گجرات سے آیا ہوں اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہ تھا کہ میں گجرات ہی سے پاکپتن پہنچا تھا۔ جب وہ سارے امیدواروں سے بات چیت کر چکے تو کہنے لگے: ہمارے پاس ربوہ سے بھی ایک درخواست موصول ہوئی تھی لیکن اس اُمیدوار نے یہ نہیں سوچا کہ پاکپتن کی مقدس بستی میں ربوہ والوں کا کیا کام ہوسکتا ہے۔ میں نے یہ بات سُنی تو سمجھ گیا کہ میری درخواست کا کیا حشر ہونے والا ہے چنانچہ میں انٹرویو کی نئی تاریخ پر وہاں گیا ہی نہیں۔''

''آپ نے کسی اور جگہ درخواست نہیں دی؟''

''دی لیکن میں نے ہر جگہ اسی رویّے کا مشاہدہ کیا۔ اُن دو سالوں میں جب میں یہاں رہا مجھے صرف تین ماہ شاہ تاج شوگر ملز منڈی بہاؤالدین میں کام کرنے کا موقع ملا اور بس۔ اب آپ بتائیے میرا افریقہ جانے کا فیصلہ درست تھا یا غلط۔''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

حافظ آباد سے تعلق رکھنے والے خان محمد گوندل نے ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ گول بازار میں ''گوندل کریانہ سٹور'' کے نام سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا لیکن کچھ عرصہ بعد محدود پیمانے پر دعوتی سامان کرائے پر اٹھانے لگے۔ جب یہ کام چل نکلا تو پوری توجہ اسی کی طرف مرتکز کر دی۔ اب وہ غالباً کراکری فروخت بھی کرنے لگے تھے چنانچہ دکان کا نام بدل کر ''گوندل کراکری سٹور'' رکھ دیا گیا۔

خان محمد گوندل نے ۱۹۹۳ء میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں پانچ بیٹوں سے نوازا تھا۔ سنتے ہیں چار بیٹے بیرونِ ملک جا بسے ہیں۔ صرف مقبول گوندل یہاں ہیں جو اپنے والدِ بزرگوار کے قائم کردہ کاروبار کو گوندل کیٹرنگ سروسز کے نام سے قدرے جدید رنگ میں چلا رہے ہیں۔

ربوہ کے ابتدائی دور میں تعمیراتی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ان دنوں نہ صرف جماعتی عمارات تعمیر ہو رہی تھیں بلکہ احمدی اپنے ذاتی مکانات بھی بکثرت بنوا رہے تھے لہٰذا شہر میں تعمیراتی سامان کی طلب بہت تھی۔ یہ طلب پوری کرنے کے لیے کئی لوگ میدان میں آئے لیکن یہاں صرف ''مجید آئرن سٹور'' کا ذکر مطلوب ہے جس کے مالک عبدالمجید نامی ایک بزرگ تھے۔ یہ وہی عبدالمجید ہیں جن کے ایک بھائی عبدالرب تھے۔ اس دکان پر مکانات کی تعمیر میں استعمال ہونے والا لوہے کا جملہ ساز و سامان بشمول گرڈر، سریا، کیل قبضہ اور رنگ و روغن سب کچھ ملتا تھا۔ بعد میں انہوں نے پتیل اور سلور کے برتن بھی فروخت کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس زمانے میں ربوہ میں اپنی نوعیت کی یہ واحد دکان تھی جہاں سے گاہک کو اس کی تمام مطلوبہ اشیاء مل جاتی تھیں۔

روشن دین ضیاء الدین احمد ربوہ کے قدیم ترین زرگروں میں سے تھے اور ان کی دکان گول بازار میں تھی۔ دیگر زیورات کے علاوہ ان کی بنائی ہوئی چاندی کی انگوٹھیاں عوام الناس میں بہت مقبول تھیں اور وہ وقتاً فوقتاً اس کا

اشتہار بھی دیتے رہتے تھے۔ مجھے ان کا یہ منظوم اشتہار ابھی تک یاد ہے:

خدا کی راہ میں دریا صفت بہتے چلے جاؤ
ہر اِک رنج و الم جور و جفا سہتے چلے جاؤ
کناروں تک زمیں کے گر تمہیں کرنی ہے
اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ کہتے چلے جاؤ

کریم احمد طاہر جو تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج کے سابق طالب علم اور ویسٹ پاکستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور کے گریجوایٹ ہیں ان ہی حضرت روشن دین زرگر، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے ہیں۔ موصوف جنہیں تکمیل تعلیم کے بعد آزاد کشمیر، لیبیا اور کینیڈا میں مختلف حیثیتوں میں کام کرنے کا موقع ملا ہے جماعتی خدمت کا انتھک جذبہ رکھتے ہیں چنانچہ وہ احمدیہ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن، لاہور کے جنرل سیکرٹری؛ قائد علاقہ، مجلس خدام الاحمدیہ، آزاد کشمیر؛ امیر جماعت احمدیہ، لیبیا اور سیکرٹری پراپرٹیز، کینیڈا بھی رہے ہیں اور ان ہی کے دورِ امارت میں جماعت احمدیہ لیبیا کو قرآن پاک کے سپینش زبان میں ترجمے اور مختصر تفسیری نوٹس کی اشاعت کے جملہ اخراجات برداشت کرنے کی توفیق ملی۔

وہ ۱۹۸۷ء سے کینیڈا میں ہیں اور ان کی خدمات کی وجہ سے انہیں حکومت کی طرف سے Going Green Award سے نوازا گیا ہے۔

اور اب ربوہ کی تین پرانی دکانوں کا تذکرہ جن کی اپنے زمانے میں بہت شہرت تھی لیکن اب عرصۂ دراز سے بند ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ''ایسٹرن پرفیومری کمپنی'' حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ملکیت تھی۔ کچے کوارٹروں کے زمانہ میں اس کا ''دفتر'' ہمارے ساتھ والی گلی میں تھا اور حضرت خدا بخش مومن جی اس کے کرتا دھرتا تھے۔ بعد میں یہ کمپنی گول بازار میں منتقل ہو گئی اور شارع صدر کے ایک کونے پر اس کا شوروم بنا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایم این سنڈیکیٹ والے شیخ نورالحق کے برادرِ خورد شیخ شمس الحق اس کے منیجر مقرر ہو گئے لیکن ۱۹۶۰ء کی دہائی میں یہ کمپنی ختم ہو گئی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کی بندش کے اسباب وعِلل کیا تھے۔ غالباً دساور سے ایک سے ایک بڑھیا خوشبو کی سمگلنگ اور تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے لائف سٹائل نے اس کاروبار کو نفع بخش نہیں رہنے دیا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں مکینانِ ربوہ بالعموم عطر کی عیاشی کے متحمل نہ ہو سکتے تھے مگر مجھے نہ جانے کس طرح ایسٹرن پرفیومری کمپنی کے تیار کردہ دو عطروں ''شامِ شیراز'' اور ''باغ و بہار'' کے نام یاد رہ گئے ہیں۔

''دلکشا پرفیومری'' جس نے اپنے کاروبار کا آغاز قادیان میں کیا تھا قیامِ پاکستان کے بعد سیمنٹ بلڈنگ لاہور میں اس کے مالک، عبدالواحد خان کی رہائش گاہ پر منتقل ہو گئی۔ سنا کرتے تھے کہ قادیان میں اس پرفیومری کا کام اچھا تھا۔ معلوم نہیں لاہور میں ان کا کام کیسا تھا لیکن جلسہ سالانہ کے موقع پر مجھے ان کا سٹال لگانا یاد ہے۔ میں نے عبدالواحد خان کو تو نہیں دیکھا لیکن ان کے صاحبزادے جمیل احمد خان سے میری یاد اللہ ہے۔ ان کے الفاظ میں: ''ہمارے بنائے ہوئے دلکشا ہیئر آئل کی دھوم دُور دُور تک تھی بلکہ اسے ایک بار مہاراجہ پٹیالہ کی طرف

سے انعام کا مستحق بھی قرار دیا گیا تھا۔ ہمارے ابا اپنی مصنوعات کے ظاہری حسن کا بھی بہت خیال رکھتے تھے چنانچہ ہیئر آئل کی بوتلیں جرمنی سے بنواتے اور اس کے لیبل بھی وہیں سے چھپواتے۔ وہ یہ سارا کام Cremp and Kamp نامی ایک کمپنی کے ذریعہ کرایا کرتے تھے۔''

اس پرفیومری کے بند ہو جانے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے جمیل احمد خان بتاتے ہیں: ''ہمارے ابا عمر کے اس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں کاروبار چلانا آسان نہیں رہتا۔ میں نے کچھ عرصہ ان کا ساتھ دیا اور میں انارکلی کے مختلف دکانداروں اور ربوہ میں افضل بردرز کو اپنے عطریات پہنچایا کرتا تھا لیکن پھر مجھے اٹامک انرجی کمیشن میں ملازمت مل گئی اور میرے لیے بھی اس کام کو جاری رکھنا دشوار ہو گیا۔ یوں لوگ آہستہ آہستہ دلکشا پرفیومری جس کا ایک زمانے میں بڑا نام تھا کو بالکل بھول گئے۔''

''قریشی فرنیچر ہاؤس'' نامی دکان محمد یامین تاجرِ کتب و ناشر ''احمدی جنتری'' کے داماد قریشی عبدالوحید کی ملکیت تھی۔ یہ دکان اپنے زمانے میں گول بازار کی سب سے بلند و بالا عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع تھی۔ بعد میں قریشی عبدالوحید کا نظامِ جماعت سے کوئی تعلق نہ رہا اور وہ ربوہ کی رہائش ترک کر گئے۔ ان کے ربوہ سے چلے جانے کے ساتھ ہی یہ دکان بھی بند ہو گئی۔

سیّد اسلام رحمت بازار میں بڑے گوشت کا کام کرتے تھے۔ میں نے انہیں گائے بھینس ذبح کرتے تو نہیں دیکھا لیکن وہ جس انداز میں ذبح شدہ جانور کی تکہ بوٹی کرتے تھے اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ انہیں اپنے فن پر کس قدر عبور حاصل ہے تاہم ان کی صاحبزادی، بشریٰ جان کا بیان ہے کہ ''وہ خاندانی قصاب نہ تھے۔ ان کے والدِ بزرگوار، میر اسلام خان جو جلال آباد (افغانستان) میں ٹھیکیداری کرتے تھے ۱۹۰۱ء کے لگ بھگ ہجرت کر کے پشاور اور بعد میں قادیان منتقل ہو گئے۔ سید اسلام فوج میں رہے اور وہاں سے فراغت پا کر دوستوں کے مشورہ پر یہ کام شروع کر دیا''۔ اگرچہ انہیں وفات پائے عرصۂ دراز بیت چکا ہے مگر میں اب بھی چشمِ تصور سے دراز قد اور صاف رنگت والے سیّد اسلام کو واسکٹ اور کپڑے کی ٹوپی میں ملبوس سائیکل پر ادھر اُدھر آتے جاتے دیکھ سکتا ہوں۔ ان کے ایک بیٹے نور اسلام سکول میں میرے ہم جماعت تھے۔ پہلے تو کبھی کبھار ربوہ میں نظر آ جاتے تھے لیکن اب طویل عرصے سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ حال ہی میں کسی نے بتایا کہ وہ مانسہرہ میں رہتے ہیں۔ اب مجھے ان سے تجدیدِ تعلق کا انتظار ہے۔ دیکھیں کب اس کی نوبت آتی ہے۔

جرمنی میں مقیم مبشر خاں فضل عمر ہسپتال کے سابق ریڈیوگرافر محمد اسلم کے صاحبزادے اور ان ہی سیّد اسلام کے نواسے ہیں۔ اسلم اور میرے بہنوئی قریشی سعید احمد اظہر انجمن کوارٹرز میں پڑوسی تھے اور اسی نسبت سے مبشر کی میرے بھانجے عمران اظہر سے گہری دوستی ہے۔ اسی پس منظر میں مبشر مجھے نہ صرف ماموں کہتے بلکہ سمجھتے بھی ہیں۔ میں چند سال پہلے جرمنی گیا تو ان سے ایک سے زیادہ ملاقاتیں ہوئیں۔ مبشر اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصوّر اور خوبصورت شاعر بھی ہیں۔ میں نے ان کے قیامِ ربوہ کے زمانہ میں شیشے پر ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی فیض احمد فیض کی ایک تصویر دیکھی تو مجھے ان کے فن کے

بارے میں کچھ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں وقتاً فوقتاً ان سے کچھ نہ کچھ پوچھتا رہتا تھا۔ پھر وہ جرمنی چلے گئے تو ملاقات کا سلسلہ ختم ہو گیا البتہ فرینکفرٹ سے نیورمبرگ کے سفر کے دوران ہمارے پاس کچھ اور کرنے کو نہیں تھا چنانچہ اسی موضوع پر باتیں شروع ہو گئیں۔ انہوں نے بتایا: ''یوں سمجھ لیں کہ مجھے یہ فن وراثت میں ملا ہے۔ میں اپنے بچپن میں اپنی والدہ کو پینٹ کرتے دیکھتا تھا تو میرا جی بھی چاہتا تھا کہ میں یہی کام کروں۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد جب میں نتیجے کا انتظار کر رہا تھا مجھے پنسل سکیچ بنانے کا شوق پیدا ہوا اور اس کے چند ماہ بعد میں نے آئل پینٹنگ شروع کر دی۔ دیکھنے والے میری تصاویر کی تعریف کرتے تو مجھے اچھا لگتا لیکن میں نے چونکہ یہ فن باقاعدہ طور پر نہ سیکھا تھا لہٰذا میں اپنے کام کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف تھا نہ یہ جانتا تھا کہ نقاد اسے کس نظر سے دیکھیں گے۔''

''اس زمانے میں آپ کو کسی نمائش میں حصہ لینے کا موقع ملا؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''میں نے اپنے قیامِ ربوہ کے زمانے میں بعض دوستوں کے مشورہ پر مجلس خدام الاحمدیہ کے زیراہتمام منعقد ہونے والی ایک آل پاکستان صنعتی نمائش میں حصہ لیا۔ یہ پہلی نمائش تھی جس میں میرے فن پارے رکھے گئے تھے۔ الحمدللہ مجھے اس نمائش میں تیسرا انعام ملا جس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میرے لئے فن مصوری پہلے سے زیادہ اہم ہو گیا۔''

''آپ بتا رہے تھے کہ جرمنی میں آپ نے آرٹ کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی ہے؟''

''۱۹۹۹ء میں جرمنی آنے کے بعد میں پورا ایک سال فارغ رہا چنانچہ میں نے ایک آرٹ سکول سے چھوٹے چھوٹے ایک دو کورسز کر لیے۔ میری ٹیچر نے مجھ میں یہ احساس پیدا کیا کہ مجھے دوسروں کی نقل کرنے کی بجائے تخلیقی کام کرنا چاہئے۔ وہ ہمیشہ نصیحت کرتی تھیں کہ اچھا مصوّر وہی ہوتا ہے جو اپنی سوچ کو پوری طرح کینوس پر منتقل کر سکے۔ ان کورسوں کی ایک اور اہم بات ایکریلک کلرز کا استعمال تھا۔ پہلے میں آئل پینٹنگز بناتا تھا جو سوکھنے میں بہت وقت لیتیں اور آئل کی بُو سارے گھر میں پھیلی رہتی لہٰذا ایکریلک کلرز کا استعمال میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا جو مجھے بہت اچھا لگا۔''

''آپ کسی آرٹ کلب کے بھی ممبر بنے؟''

''آرٹ کورسز کے دوران میری ملاقات ایک جرمن دوست سے ہوئی جس نے مجھے ایک آرٹ کلب سے متعارف کرایا اور اس کی ممبر شپ بھی دلوائی۔ میں پچھلے بارہ سالوں سے اس کلب کا ممبر ہوں۔ جرمنی آنے کے بعد میں نے متعدد نمائشوں میں حصہ لیا اور میری کچھ پینٹنگز فروخت بھی ہوئیں اور میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد اس کی ایک خاص وجہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میری استاد نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جرمنی میں اپنا کلچر متعارف کراؤں۔ یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا چنانچہ میری وہ تصاویر جن میں پاکستان کا کلچر پیش کیا گیا تھا زیادہ پسند کی گئیں اور وہی فروخت بھی ہوئیں۔ مجھے فخر

ہے کہ میں جرمنی میں پاکستانی سفیر کا کردار ادا کر رہا ہوں۔''

''آپ کون سے پاکستانی مصوروں سے متاثر ہیں؟''

''میرے پسندیدہ مصوروں میں اقبال مہدی، جمیل نقش اور زوّار حسین شامل ہیں۔''

''باقیوں کو تو میں نہیں جانتا البتہ ملتان میں اپنے قیام کے دوران میری زوّار حسین سے بہت ملاقاتیں رہیں۔ اب وہ وفات پا چکے ہیں مگر ان کی بنائی ہوئی ایک تصویر ان کی یادگار کے طور پر میرے پاس اب بھی پڑی ہے۔''

''میں کبھی پاکستان آیا تو اُن کی بنائی ہوئی یہ تصویر دیکھنا چاہوں گا۔''

''سو بسم اللہ! ایک بات بتائیں۔ عمران کہہ رہا تھا کہ جرمن پریس میں بھی آپ کی تصاویر کا بہت شہرہ ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

''یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ یہاں کے بعض اخبارات میرے اور میری تصاویر کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ یہ سبھی اخبارات جرمن زبان میں چھپتے ہیں لہٰذا آپ پڑھ نہ پائیں گے ورنہ گھر واپس پہنچ کر میں ان تراشوں کا البم آپ کو پیش کر سکتا ہوں۔''

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مبشر شعر بھی کہتے ہیں اور محیط تخلص کرتے ہیں۔ ان سے فرینکفرٹ کی ایک محدودسی شعری نشست میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے بہت سے اشعار سنائے جن میں سے مجھے کسی غزل کے یہ دو اشعار ہی یاد رہ گئے ہیں:

پھولوں میں کس طرح سے لبِ مُشکبو کا رنگ
ہے دل پہ نقش اب بھی تری گفتگو کا رنگ
صحرا نوردیاں، کبھی آوارہ گردیاں
ہر نوکِ خار پر ہے مری جستجو کا رنگ

مبشر کے ذکر کے بعد اب کچھ باتیں ربوہ کے انگریزی دوا فروشوں کے بارے میں!

انگریزی ادویہ کی کچھ دکانیں ربوہ میں پہلے سے بھی موجود ہوں گی لیکن میں اپنے ہوش میں کھلنے والی دکانوں میں سے ''ایمسٹس'' کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ سنتے تھے کہ اس دکان کا ہیڈ آفس ٹمپل روڈ لاہور پر ہے۔ یہ دکان قریشی محمد شفیع نام کے ایک بزرگ چلا رہے تھے جو محلّہ دارالرحمت میں بیت اقصیٰ کے قرب میں رہائش پذیر تھے۔ میں گاہک کے طور پر ان کی دکان پر جاتا رہتا تھا لیکن ان سے دوستی یا بے تکلفی نہ تھی۔ کئی سال بعد جب میری تقرری انکم ٹیکس افسر فیصل آباد کے طور پر ہوئی تو یہی محمد شفیع ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور روحانی آواز میں محکمے کی چیرہ دستیوں کی داستان سنانے لگے۔ میں نے ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش تو کی لیکن اب یاد نہیں کہ انہیں بالآخر شفا کس دوا سے ہوئی۔

ایمسٹس کے ساتھ ایک دکان ''بٹ میڈیکل سٹور'' کے نام سے ہوا کرتی تھے جس کے مالک

ڈاکٹر خیرالدین بٹ تھے۔ اُن کا خاندان فی الاصل مقبوضہ کشمیر کے قصبہ گوش کا رہنے والا تھا تاہم وہ بعد میں موضع چک سدے ضلع سیالکوٹ میں آباد ہوگیا جہاں ان کی پیدائش ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے وٹرنری ڈاکٹر تھے اور ۱۹۵۶ء میں سرکاری ملازمت سے بطور ڈپٹی ڈائریکٹر اینیمل ہسبینڈری ریٹائر ہونے کے بعد محلہ دارالصدر غربی میں آباد ہوئے تھے اور یہ دکان انہوں نے اپنی گذراوقات کے لیے بنائی تھی۔

گورے چٹے، دراز قد ڈاکٹر خیرالدین بٹ بہت خوش اخلاق اور وضعدار انسان تھے۔ اباجی اپنی ضرورت کی انگریزی ادویہ بالعموم یہیں سے خریدا کرتے تھے۔ اگر وہ خود نہ آسکتے تو میرے ہاتھ چٹ لکھ بھیجتے۔ اگر کسی وقت نقد ادائی مشکل ہوتی تو وہ یہ چٹ اپنے پاس رکھ کر مجھے دوا دے دیتے۔ میں کئی سال تک ان کی دکان پر آتا جاتا رہا اور وہ ہمیشہ ہی مجھ سے محبت سے پیش آتے رہے۔

ڈاکٹر خیردین بٹ کے ایک صاحبزادے جن کا نام غالباً امتیاز تھا میڈیکل سٹور چلانے میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ ربوہ سے منتقل ہونے کے بعد جب میرا ان کی دکان پر آنا جانا کم ہوا تو ان دونوں سے ملاقاتیں بھی کم ہوتی چلی گئیں۔ پھر خیرالدین بٹ نے نہ جانے کب یہ دکان بند کردی۔ ایک روز پتا چلا کہ وہ وفات پاکر بہشتی مقبرہ میں آسودۂ خاک ہو چکے ہیں۔

ان کی قبر اسی قطعے میں ہے جہاں میری ایک چچی، نظیر فاطمہ اہلیہ پروفیسر محمد ابرہیم ناصر دفن ہیں لہٰذا مجھے جب کبھی ان کی قبر پر حاضری کا موقع ملتا ہے تو میں ڈاکٹر خیرالدین بٹ کی قبر پر بھی ضرور دعا کرتا ہوں۔

مجھے ان کی صاحبزادی، رشیدہ تسنیم خان (اہلیہ ڈاکٹر محمد شریف خان سابق پروفیسر تعلیم الاسلام کالج) کے قلم سے الفضل میں چھپنے والے ایک حالیہ مضمون سے پتا چلا ہے کہ ڈاکٹر خیردین بٹ کو اباجی کے ایک تایازاد، حکیم محمد صدیق کے ذریعہ قبول احمدیت کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔

ربوہ کے سب سے قدیم معروف چائے خانے ''سیلون ریستوران'' کا ذکر اس کتاب میں پہلے کسی جگہ ہو چکا ہے۔ دیگر چائے فروشوں میں سے ایک فیاض کرمانی تھے۔ پرویز پروازی نے ان دونوں ریستورانوں کا فرق کس خوبی سے واضح کر دیا ہے جب وہ لکھتے ہیں کہ ''ان کی چائے سیلونی کے مقابلہ میں کم چلتی تھی مگر جو لوگ سیلونی کے ہاں نہیں جاتے تھے وہ ان کی خاموش گفتگو سننے کے لیے ان کے ہاں چلے آتے تھے۔''

رحمت بازار میں دودھ دہی کی دکان کرنے والے دراز قد خان میر خان جو کسی وقت حضرت مصلح موعود کے باڈی گارڈ بھی رہے تھے انتہائی دیانت دار دکانداروں میں سے تھے۔

''مہند ہوٹل'' اُن غریب نواز ہوٹلوں میں سے تھا جہاں ایک آنے کی روٹی خریدنے پر دال مفت ملا کرتی تھی۔ میں نے یہ ہوٹل صرف دیکھا ہی نہیں ہوٹلنگ کی لذت سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے مہند ہوٹل کی اس پیشکش سے ایک دوبار فائدہ بھی اُٹھایا ہے۔ مہند لکھے کے چچا یا تایا تھے اور ان کے ایک بیٹے جن کا نام احمد دین تھا تحریک جدید کے دفتر میں کام کرتے تھے۔

خواجہ محمد عبداللہ لمبا عرصہ گول بازار میں ''خواجہ ریستوران'' کے نام سے کاروبار کرتے رہے۔ ۵۵

حضرت مسیح موعود کے رفیق، خواجہ عبدالرحمٰن میر کے صاحبزادے تھے جو کشمیر کے محکمہ جنگلات میں رینج آفیسر ہوا کرتے تھے۔ وہ انتہائی متقی اور باخدا انسان تھے۔ محمد اسد اللہ قریشی نے اپنی کتاب ''تاریخ احمدیت کشمیر'' میں بیان کیا ہے کہ ایک بار جب کنزرویٹر آف فارسٹس، پنڈت دیوی سرن خواجہ عبدالرحمٰن میر کے علاقے کا دورہ کر رہے تھے تو وہ انہیں بتائے بغیر نماز ادا کرنے کے لیے چلے گئے۔ پنڈت جی کو ایک ماتحت افسر کی یہ دیدہ دلیری بہت کھٹکی چنانچہ اس نے انہیں نوکری سے معطل کرتے ہوئے کہا کہ وہ رینج افسری کے اہل نہیں، انہیں تو اللہ اللہ سے ہی فرصت نہیں ہے۔ خواجہ صاحب معطلی کا حکمنامہ ملتے ہی اپنے گاؤں آسنور چلے گئے اور دعا میں لگ گئے۔ خدا کی شان دیکھیے، ابھی چند ہی روز گذرے تھے کہ اسی پنڈت دیوی سرن نے کسی خارجی تحریک کے بغیر ان کی معطلی کا حکم منسوخ کر کے خود ہی انہیں نوکری پر بحال کر دیا۔

حضرت خواجہ عبدالرحمٰن میر نے اپنے اس بیٹے کو پڑھائی کے لیے قادیان بھجوایا جہاں انہوں نے حضرت مولوی شیر علی کی براہِ راست نگرانی میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کی شادی سیٹھ محمد صدیق آف چنیوٹ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ سیٹھ محمد صدیق کی وفات کے بعد ان کی بیگم نے ان کے ایصالِ ثواب کے لیے گول بازار میں ایک کنواں لگوایا تھا۔ اس کنوئیں کی کھدائی کا افتتاح صاحبزادہ مرزا عزیز احمد کے ہاتھوں ہوا اور کنوئیں کے جملہ امور کی نگرانی خواجہ محمد عبداللہ کے حصے آئی۔

اپنے زمانے میں خواجہ ریستوران ربوہ کا سب سے بڑا ریستوران تھا جہاں چائے اور مٹھائیوں کے علاوہ کھانا بھی ملتا تھا۔ عام حالات میں بھی یہ ریستوران ٹھیک ہی چلتا تھا لیکن جلسہ سالانہ اور دیگر جماعتی اجتماعات کے موقع پر تو یہاں گاہکوں کا وہ ازدحام ہوتا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی۔ سنتے تھے کہ شروع میں یہاں مسافروں کی رہائش کا انتظام بھی کیا گیا تھا لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ چل نہ سکا۔

۱۹۷۴ء کے بعد ایک بار میں راولپنڈی کی بیت نور میں نماز جمعہ کی ادائی کے لیے گیا تو خواجہ محمد عبداللہ وہاں نظر آئے۔ علیک سلیک ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ ربوہ میں اپنا کاروبار ختم کر کے راولپنڈی منتقل ہو چکے ہیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نئی انتظامیہ بھی خواجگان پر ہی مشتمل ہے لہٰذا خواجہ ریستوران کا نام تبدیل نہیں کیا گیا۔

خواجہ محمد عبداللہ اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور بہشتی مقبرہ میں مدفون ہیں۔ ایک بار اچانک ان کی قبر نظر آئی تو یہ ساری باتیں یاد آ گئیں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

''کیفے فردوس'' ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں ربوہ میں قائم ہونے والا ایک ''جدید'' ریستوران تھا جو خواجہ عبدالکریم کی ملکیت تھا۔ الفضل میں اس کا اشتہار وقتاً فوقتاً آتا رہتا تھا جس میں سے ایک کا عنوان تھا: ''یک لقمہ صباحی بہتر از مرغ و ماہی۔'' یہ اشتہار عوام الناس کو یہ بتانے کے لیے شائع کیا جاتا تھا کہ اس ریستوران میں صبح کے ناشتے کا انتظام موجود ہے۔ یہ کیفے زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔

گول بازار کی ہسپتال والی سائڈ پر بشیر نامی ایک صاحب ''بشیر ہوٹل'' کے نام سے ایک چائے خانہ چلاتے تھے جس میں چائے کے علاوہ مٹھائی مل جاتی تھی۔ ایک ہی کمرے پر مشتمل یہ چائے خانہ بے حد سادہ تھا

اور اس میں گاہکوں کے بیٹھنے کی گنجائش بہت کم تھی چنانچہ وہ اردگرد کے دکانداروں کو چائے سپلائی کر کے اپنی گذر اوقات کرتے تھے۔

سید ولایت حسین شاہ کانپور کے رہنے والے تھے اور ربوہ میں دودھ، دہی اور مٹھائی کی دکان کیا کرتے تھے۔ غالباً سرمائے کی کمی کی وجہ سے ان کا کاروبار ایسا وسیع تو نہ تھا لیکن ان کی مٹھائیوں میں سے گلاب جامن کو خاص شہرت حاصل تھی۔ ان کی اہلیہ سیّدہ امتہ العزیز امی کی قادیان کے زمانے سے سہیلی تھیں اور مجھے ان کا اوائل ربوہ کے زمانے سے اپنے گھر آنا جانا یاد ہے۔ ان کے بہت سے بچے عہد طفولیت میں وفات پا گئے تھے اور پے در پے صدمات نے ان کی شخصیت کو بے حد متاثر کیا تھا۔ مہاشہ فضل حسین کی اہلیہ، صدیقہ بیگم ان کی ہمشیرہ تھیں۔ مہاشہ صاحب کا مکان فیصل آباد، سرگودھا روڈ کے اُس پار محلہ دارالفضل میں تھا۔ امتہ العزیز ان کے ہاں جاتے ہوئے یا ان کے گھر سے واپسی پر ہمارے ہاں ضرور رکتیں اور بعض اوقات تادیر قیام کرتیں۔ یہ تو میرے علم میں تھا کہ ان کے بڑے بیٹے کرامت اللہ وکالتِ قانون، تحریک جدید انجمن احمدیہ میں ملازم ہیں اور دوسرے بیٹے، ہدایت اللہ ہادی سکول میں مجھ سے ایک سال جونیئر ہیں لیکن نہ تو میں سید ولایت حسین شاہ سے ذاتی طور پر متعارف تھا نہ ان کے دونوں بچوں میں سے کسی کے ساتھ میرے براہِ راست مراسم تھے۔

اسی زمانے میں میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب فیکٹری ایریا میں ایک تعمیر شدہ مکان خرید کر وہاں منتقل ہو گئے۔ میں ان کے بیٹے مرزا محمد اسماعیل کے پاس اکثر جاتا رہتا تھا۔ حبیب اللہ صادق، محمد احمد گردیزی، عبدالسمیع پرویز اور میرے بعض دیگر کلاس فیلوز بھی اسی محلے میں مقیم تھے۔ اسماعیل کے ہاں جاتا تو ان سب کے ساتھ بھی ملاقات ہو جاتی۔ ان ہی دنوں میرا تعارف ہدایت سے ہوا۔ وہ ہمیشہ عجز و انکسار کے ساتھ ملتے۔ ان کی بات چیت اور چال ڈھال سے اخلاص بہت نمایاں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں فیکٹری ایریا آتے جاتے ان کے مکان پر ضرور رُکتا۔

یہ مکان جو منڈی کے عقب میں موجودہ سِومنگ پُول کے تقریباً بالمقابل واقع تھا غالباً ایک سیمی کمرشل پلاٹ پر تعمیر ہوا تھا جس کے سامنے دو دکانیں اور عقب میں رہائشی حصہ تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ ٹاؤن پلاننگ کے مطابق یہ پوری لائن دکانوں ہی کے لیے مختص تھی لیکن جب کوئی بھی شخص یہاں اپنا کاروبار قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو آہستہ آہستہ یہ علاقہ رہائشی علاقے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

ولایت حسین شاہ سے میرا تعارف ہدایت ہی کے ذریعہ ہوا اور میں نے انہیں بھی انتہائی منکسر المزاج اور سادہ پایا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ عزت و احترام سے پیش آتے لیکن اس احترام میں پیار کی چاشنی نمایاں ہوتی۔

ایک بار جب میں ولایت حسین شاہ کے پاس بیٹھا ہدایت کی گھر واپسی کا انتظار کر رہا تھا تو انہوں نے مجھے اپنے قبولِ احمدیت اور اس راہ میں پیش آمدہ مشکلات کی کسی قدر داستان سنائی۔

ان کا بیان کردہ یہ واقعہ مجھے آج تک یاد ہے کہ ۱۹۵۳ء کے پُر آشوب ایام میں جب گرد و نواح کے بہت سے لوگوں نے ربوہ کو دودھ کی سپلائی بند کر دی اور ان کا کاروبار بھی متاثر ہونے لگا تو وہ صورتِ حال کے جائزہ کے لیے خود اپنے گوالے کے گاؤں میں جا پہنچے۔ جلد ہی لوگوں پر ان کا احمدی ہونا کھل گیا چنانچہ امام مسجد

نے انہیں پکڑ کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور سارے گاؤں کو اکٹھا کر کے انہیں موقع دیا کہ وہ احمدیت سے تائب ہو جائیں اور اگر یہ ممکن نہیں تو گردن زدنی کے لیے تیار ہو جائیں۔ ولایت حسین شاہ نے اس موقع پر بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا اور مجمع کو مخاطب کر کے کہا کہ انہیں جس موت سے ڈرایا جا رہا ہے وہ تو انہوں نے نصف صدی پہلے اپنے اوپر خود وارد کر لی تھی لہٰذا اگر انہیں ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا جائے تو وہ اپنا دین نہیں چھوڑ سکتے۔ لوگ شاہ صاحب کی اس بات سے بے حد متاثر ہوئے اور وہ امام مسجد سے بیک زبان مطالبہ کرنے لگے کہ اس ''اللہ لوگ'' کو قتل کرنا ظلم ہوگا لہٰذا اسے چھوڑ دیا جائے مبادا اس ظلم کے نتیجے میں ہمارے اپنے گاؤں پر کوئی عذاب نازل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اُن کی زندگی کی حفاظت مقصود تھی سو امام مسجد انہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور وہ بخیر و عافیت اپنے گھر واپس پہنچ گئے۔

جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے انہوں نے میرے ایک سال بعد تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا۔ ادبی ذوق رکھتے تھے اور میرے بھی اِکا دُکا مضامین المنار میں شائع ہوتے رہتے تھے لہٰذا ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ میرے کالج چھوڑنے کے بعد وہ المنار کے مدیر بھی ہو گئے اور انہوں نے بڑی چاہت کے ساتھ میرے ایک دو مضامین اس رسالہ میں شائع کیے۔

ہدایت ان مخلص دوستوں میں سے ہیں جنہوں نے مجھ سے ہمیشہ تعلق قائم رکھا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء کے دوران جب میں پنجاب یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا ہدایت کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت رہی اور جب وہ کراچی چلے گئے تو بھی ان کے ساتھ رابطہ نہیں ٹوٹا لیکن سچ پوچھیں تو اس میں مجھ سے زیادہ ان کا دخل ہے۔ ان کے بہت سے خطوط کچھ عرصہ پہلے تک میرے پاس محفوظ رہے اور یوں میں ان کی اس دور کی جملہ توقعات اور مایوسیوں اور کامیابیوں اور ناکامیوں سے واقف ہوں۔

موصوف کے کراچی منتقل ہونے سے ان کے والدِ بزرگوار ربوہ میں تنہا رہ گئے تھے لہٰذا وہ ۱۹۶۸ء میں انہیں اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ ربوہ میں اپنے گھر کا سامان وائنڈ اَپ کرتے ہوئے ہدایت اپنی بہت سی کتابیں میرے پاس بطور امانت رکھوا گئے تھے لیکن بعد میں انہیں یہ کتابیں واپس لینے کا موقع نہیں ملا۔ مجھے یاد ہے میں ولایت حسین شاہ کو الوداع کہنے کے لیے ربوہ ریلوے سٹیشن پر گیا تو وہ بجھے بجھے دل کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوئے۔ ان کی یہ کیفیت بلا سبب نہیں تھی۔ وہ اس بستی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہے تھے جس کا پیار ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔

کراچی جانے کے بعد بھی وہ ہدایت سے میرے بارے میں پوچھتے رہتے اور اکثر و بیشتر سلام بھجواتے۔ جب سی ایس ایس کے امتحان میں میری کامیابی کی خبر ان تک پہنچی تو انہوں نے اس پر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور مجھے خاص طور پر مبارک باد بھجوائی۔ کراچی منتقل ہو جانے کے بعد میری ان سے کبھی براہ راست بات نہیں ہوئی تاہم مجھے علم ہوتا رہتا تھا کہ وہ ہدایت کی تعلیم، ملازمت اور ان کی شادی پر بہت خوش ہیں۔ اس کے باوجود عمر کے تقاضے کے تحت ان کی صحت کمزور ہوتی چلی گئی اور وہ ۱۵ نومبر ۱۹۷۳ء کو انتقال کر گئے۔

ولایت حسین شاہ کے تفصیلی حالات سلیم شاہجہانپوری نے ''تاریخِ احمدیت یوپی'' کے لیے مرتب کئے تھے اوران کا یہ مضمون روزنامہ الفضل (۳ مارچ ۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا۔ یہی مضمون بعد میں احمدیہ گزٹ کینیڈا بابت ماہ جولائی ۱۹۹۶ء میں ''کانپور سے ربوہ تک'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

پرویز پروازی نے اپنے مضمون ''خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر'' مطبوعہ الفضل انٹرنیشنل (۱۰ جون تا ۱۶ جون ۱۹۹۴ء) میں بھی ولایت حسین شاہ کی تیار کردہ مٹھائی کی لذت اور نماز کے لیے اُن کی رغبت کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ خورشید احمد، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل ربوہ نے مجلسِ انصاراللہ، کینیڈا کے ایک سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک مضمون ''قادیان کے گمنام بزرگ'' کے عنوان سے پڑھا تھا جو کہیں شائع نہیں ہو سکا مگر ہدایت کی روایت کے مطابق ''انہوں نے میرے ابا جان کی سادگی، شرافت، نفاست، وضع داری، رکھ رکھاؤ، توکل، کم گوئی، خلافت سے وابستگی اور دعا گو بزرگ ہونے کے علاوہ ان کے کچھ گھریلو حالات کا بھی تذکرہ کیا تھا۔''

ہدایت جنہوں نے کراچی میں قیام کے دوران لائبریری سائنس، تقابلی ادیان اور قانون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی تھی بعد میں نائیجیریا چلے گئے اور کئی سال تک احمدو بیلو یونیورسٹی میں رہے۔ اسی دوران انہوں نے علاقے کے اپنے وقت کے ایک عظیم مذہبی رہنما حضرت شیخ عثمان بن فوزی کے بارے میں مستند معلومات جمع کیں اور سکوٹو یونیورسٹی سے حضرت شیخ عثمان کے مخطوطات اور تحریروں سے مسیح موعود کی آمد کے متعلق پیشگوئیاں حاصل کیں اور ایک مضمون کی شکل میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی خدمت میں ارسال کیں۔ ہدایت کو مولانا دوست محمد شاہد کی طرف سے ملنے والے ایک خط سے اندازہ ہوا کہ حضور نے یہ مضمون انہیں ارسال فرما دیا تھا اور جماعتی ریکارڈ کا حصہ بن چکا ہے۔

اگست ۱۹۸۸ء میں ہدایت کینیڈا منتقل ہو گئے اور یارک یونیورسٹی، ٹورانٹو میں ملازمت کرنے لگے۔ اب وہ تکمیل ملازمت کے بعد ریٹائر ہو چکے ہیں اور ہمہ وقت جماعتی خدمت میں مصروف ہیں۔ حسنات احمد سیّد نے ہفت روزہ ''نیو کینیڈا'' میں ہدایت پر ایک خوبصورت مضمون لکھا ہے جس میں اُن کی جماعتی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے احمدیہ گزٹ، کینیڈا کے ساتھ ان کی وابستگی کا خصوصی حوالہ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ان کا یہ بیان: ''ہادی کی مادری زبان اردو ہے۔ انہیں اردو زبان سے بے حد محبت ہے۔ کینیڈا آتے ہی محترم نسیم مہدی صاحب نے ہادی کو جماعت احمدیہ کینیڈا کے مجلّہ ماہانہ احمدیہ گزٹ، کینیڈا کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ آپ ۱۹۸۸ء سے اس رسالہ کی مجلسِ ادارت سے وابستہ ہیں۔

اس رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے علمی، تحقیقی، ادبی، مذہبی، تربیتی، معلوماتی اور دلچسپ مضامین کا انتخاب بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ احمدیہ گزٹ میں شائع ہونے والے مضامین کی نوک پلک درست کرنے، زبان کی چاشنی وحلاوت، سلاست وروانی، سادگی، ندرت وجدّت، اسلوبِ بیان میں نکھار، محاورات کا

برمحل استعمال، بلند پایہ منظوم کلام، جماعت احمدیہ کے مختلف حلقوں کی کارگزاری، ہم وغم اور خوشی ومسرت کی خبریں جمع کرنے میں مگن رہتے ہیں اور گئی رات تک گزٹ آفس میں کام کرتے ہیں۔ نقدونظر میں ہادی کا منفرد اسلوب ہے۔ حوالہ جات کی مستند اسناد اور اس کے معیار کو برقرار رکھنا ان کی جان اور پہچان ہے۔''

موصوف دوستوں کے دوست ہیں اور اس تعلق کو نباہنا خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے میری اکثر کتابوں پر نہ صرف تبصرے لکھے بلکہ بڑی محبت سے احمدیہ گزٹ میں شائع کئے۔ ان کا یہ احسان آسانی سے بھلایا جانے والا نہیں۔

ہدایت اچھے شعری ذوق کے مالک ہیں اور خود بھی شعر کہتے ہیں۔ ذیل کے تین اشعار ان ہی کی ایک غزل سے ماخوذ ہیں:

صد ہزاراں داغ ہیں اس سینۂ صد چاک میں
جن سے روشن ہیں ستارے دیدۂ نمناک میں
سُوکھ کر کانٹا ہوا ہوں ان کی خاطر دوستو
جن کی خاطر مبتلا ہوں گردشِ افلاک میں
زُلفِ سائے کی طرح یوں رُخ پہ بل کھاتی رہی
جیسے بادل چھا رہے ہوں وسعتِ افلاک میں

میں ۱۹۸۹ء میں جب چند روز کے لیے کینیڈا گیا تو میرے جن دوستوں نے میری بے حد عزت وتکریم کی ان میں ہدایت بھی شامل تھے۔ اگرچہ وہ خود بھی اس ملک میں نئے تھے اور کئی طرح کے مسائل سے دوچار لیکن انہوں نے مجھے بہت سی جگہوں کی سیر کرائی اور اپنے گھر بھی لے گئے۔ ان کی اہلیہ اور بچوں سے میری پہلی اور ابھی تک آخری ملاقات اسی موقع پر ہوئی تھی۔

ہدایت کی رضا کارانہ خدمات کی وجہ سے انہیں کینیڈا کے ایک سو چھبیسویں یوم تاسیس پر حکومت کی طرف سے ''کینیڈا ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ وہ ایک مطمئن ومسرور زندگی گذار رہے ہیں۔ اُن کے دونوں بیٹوں اور دونوں بیٹیوں نے وہیں تعلیم حاصل کی ہے لیکن اس کے باوجود اِس خاندان پر مشرقی رنگ غالب ہے جس پر ہدایت بجاطور پر فخر کر سکتے ہیں۔

خلیل حلوائی ربوہ کے ایک اور حلوائی تھے۔ فضلِ عمر ہسپتال کی طرف سے جائیں تو گول بازار میں چوتھی یا پانچویں دکان ان کی تھی۔ وہ رفیق حضرت مسیح موعود، حضرت حکیم اللہ بخش کے نواسے اور محمد اسماعیل نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ محمد اسماعیل غیر احمدی تھے لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں احمدیت قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور وہ موصی کے طور پر بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ان کے تین بیٹے تھے: نصیر، حمید اور عزیز۔ نصیر سکول میں مجھ سے ایک سال آگے اور حمید غالباً ایک سال پیچھے تھے۔ گھروں میں دودھ تو نواح کی جانگلیا نڑیاں پہنچا جاتی تھیں لیکن ہنگامی ضرورت کے تحت ہم دودھ یا دہی اور مٹھائی بالعموم اسی دکان سے خریدا کرتے تھے۔ خلیل کی وفات کے بعد یہ دکان بند ہوگئی۔ اب ان کا بڑا بیٹا بھی

وفات پا چکا ہے اور باقی دونوں بیٹے ربوہ سے باہر ہوتے ہیں۔
مولوی محمد صدیق گورداسپوری سابق مربی افریقہ وامریکہ ان ہی ''خلیل حلوائی'' کے داماد ہیں۔
خلیل حلوائی کے ذکر نے مجھے عبدالکریم حلوائی کی یاد دلا دی ہے اور میں چشم تصور سے کچے بازار میں ان کی دکان دیکھ رہا ہوں۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے جس روز میں ایک جوہڑ میں ڈوبتے ڈوبتے بچا اور بعد میں میری دلجوئی کی خاطر ابا جی نے مجھے ایک آنہ دیا میں نے اس ایک آنے کی برفی اسی دکان سے خریدی تھی۔ میرا احساس ہے کہ آہستہ آہستہ کاروباری لحاظ سے ان پر زوال آ گیا حتیٰ کہ ایک مرحلے پر وہ صرف برفی بنانے لگے۔ آخر میں ان کی دکان افضل برادرز مارکیٹ میں تھی۔ مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ ان دنوں انہوں نے چھوٹے پیمانے پر آئرن سٹور کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کے سر کے بال تو سفید تھے ہی، بھویں بھی سفید ہو گئی تھیں۔ زندگی کے ساتھ کندھا رگڑتے ہوئے وہ ایک روز اسی کیفیت میں راہی ملکِ عدم ہو گئے۔
جن لوگوں نے انہیں زیادہ قریب سے دیکھا ہے شاہد ہیں کہ مرحوم نمازِ باجماعت کے بے حد پابند تھے۔ بعض اوقات اپنے گاہک چھوڑ کر بھی نماز کے لیے چلے جاتے۔
ان کے ایک بیٹے، عبدالمجیب کو خدا تعالیٰ نے زندگی وقف کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور انہیں پنجاب کے مختلف اضلاع میں بطور مربی خدمت کا موقع ملا۔ انہوں نے ہی بتایا کہ ان کے والدِ بزرگوار نے اکتوبر ۲۰۰۸ء میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ انہوں نے چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔
''خلیل حلوائی بھی آپ کے رشتہ داروں میں سے تھے؟'' میں نے ان سے پوچھا۔
''جی۔ وہ میرے ماموں تھے۔''
''جمال بیکری'' ربوہ کی پہلی معروف بیکری تھی جو گول بازار کے افضل برادرز والے کونے کے قریب کھلی تھی۔ اس کے مالک خدا بخش نامی ایک صاحب تھے۔ یہ بیکری ۱۹۶۰ء کی دہائی کے شروع میں قائم ہوئی اور اپنی مصنوعات کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے عوام الناس میں کافی مقبول تھی۔
ربوہ کے پرانے دکانداروں میں سے ایک مولانا غلام احمد بدو ملہوی کے صاحبزادے رشید احمد تھے جو ''رشید بوٹ ہاؤس'' کے نام سے گول بازار میں دکان چلا رہے تھے۔ اِن کی سوتیلی والدہ رابعہ بیگم امی کے عزیزوں میں سے تھیں لہٰذا رشید مجھ سے بھی احترام سے ملتے اور اگر کبھی جوتا خریدنے کی ضرورت پیش آتی تو کچھ نہ کچھ رعایت ضرور کرتے۔
جوتوں کے کاروبار کے علاوہ ان کے پاس پورے ربوہ کے لیے الفضل کی گھر گھر تقسیم کا کام بھی تھا۔ ربوہ میں دیگر اخبارات کی ایجنسی بھی ان ہی کے پاس تھی۔ اس کام میں ان کے سب سے بڑے مددگار عبدالسنان تھے۔
پرانے وقتوں میں بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات کا تفصیلی نتیجہ اخبارات میں شائع ہوا کرتا تھا۔ ان امتحانات میں شامل بھی اُمیدوار بہت بے تابی سے نتیجہ کے منتظر ہوتے تھے اور ان میں سے کچھ (جن میں راقم بھی شامل تھا) صبح سویرے لاری اڈے پر پہنچ کر لاہور سے اخبارات لانے والی بس کا انتظار شروع کر دیتے۔ جوں ہی اخبارات

کے بنڈل پہنچتے طلبہ منان کے گرد جمگھٹا کر کے کھڑے ہو جاتے اور پاکستان ٹائمز یا سول اینڈ ملٹری گزٹ کا بنڈل کھلوا کر اپنا اپنا اخبار خرید لیتے۔ اس وقت منظر دیدنی ہوتا۔ امیدوار اپنا اپنا اخبار کھولے اپنا نتیجہ ڈھونڈ رہے ہوتے تھے۔ کچھ امیدوار جو بوجوہ اپنا اخبار نہ خرید سکتے اپنے کسی دوست کے ساتھ نتھی ہو جاتے۔ اچھے نمبر حاصل کرنے والے امیدوار خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹتے اور ناکام ہونے والے امیدواروں کے چہرے لٹک جاتے۔

عبدالرحمٰن نام کے ایک صاحب نے پہلے بار برداری کے جانور پال رکھے تھے۔ پھر انہوں نے تانگہ بنالیا اور آخر میں کریانے کی دکان کرنے لگے۔ عبدالمنان ان ہی عبدالرحمٰن کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے رشید بوٹ ہاؤس سے علیحدگی کے بعد اس دکان کے قریب ہی آئس کریم اور شامی کباب لگانے شروع کر دیئے اور اس حوالے سے خوب شہرت پائی۔

عبدالمنان کے ایک بھائی عبدالمجید تھے جو سکول میں میرے کلاس فیلو تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے تیسری جماعت میں ہماری کلاس میں اس نام کے دو لڑکے تھے اور کلاس انچارج، ماسٹر غلام احمد کو اپنے مخاطب کی توجہ حاصل کرنے میں دشواری ہوتی تھی لہٰذا انہوں نے دونوں میں امتیاز کی خاطر ان کے نام کے ساتھ ان کے والد کے پیشہ کی مناسبت سے ''تاجر'' کا لفظ لگا دیا چنانچہ وہ عبدالمجید کی بجائے ''عبدالمجید تاجر'' کہلانے لگے۔ انہوں نے میٹرک سے پہلے ہی پڑھائی کو خیر باد کہہ کر چھوٹے موٹے کام شروع کر دیئے اور وہ کچھ عرصہ گول بازار میں برف بھی فروخت کرتے رہے۔

منان کے کبابوں نے یاد دلا دیا کہ بہت پہلے گول بازار میں ایک اور صاحب بھی کبابوں کی ریڑھی لگایا کرتے تھے اور اس دور میں ان کے چٹ پٹے سیخ کباب خاصے مشہور تھے۔ وہ اپنی ریڑھی بالعموم احمدیہ ماڈرن سٹور اور دواخانہ خدمتِ خلق کے سامنے کھڑی کرتے تھے۔ ان کا نام محمد یوسف تھا اور وہ نسلاً پٹھان تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے، نصر اللہ سکول کے ہمارے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ گورے چٹے اور خوبصورت سے نصر اللہ چند سال ہمارے ساتھ رہے۔ اسی دوران ایک بار سائیکل چلاتے ہوئے زیر تعمیر لاہور سرگودھا روڈ پر ایک روڈ رولر کے نیچے آ کر ان کی ایک ٹانگ کا بری طرح فریکچر ہو گیا جس کی وجہ سے وہ لمبا عرصہ سکول سے غیر حاضر رہے۔ ان کا علاج معالجہ چنیوٹ کے سول ہسپتال میں ہوا۔ مجھے یاد ہے ہم ان کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا کرتے تھے۔ ان کی ٹانگ تو جڑ گئی تھی لیکن اس کی جلد بے حد کٹی پھٹی نظر آتی تھی۔

مجھے ذاتی طور پر تو یوسف پٹھان سے اُن کے قبولِ احمدیت کا یہ واقعہ سننے کا موقع نہیں ملا تاہم چوہدری عبدالعزیز ڈوگر نے اپنی کتاب ''یادِ حبیب'' میں بیان کیا ہے کہ احمدیت قبول کرنے سے پہلے یوسف پٹھان ''بجلی'' نامی ایک ہندو بھتہ خور کے کارندے تھے۔ وہ شراب کے رسیا تھے اور بھتے کی وصولی میں ظلم و تعدّی کے خُوگر۔ علاقے میں ان کی بہت دہشت تھی۔

خلافت ثانیہ کے ابتدائی دور میں جب وہ لاہور میں رہا کرتے تھے ایک بار حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کا کسی غیر از جماعت عالم سے مناظرہ ہوا۔ یوسف پٹھان تین دن یہ مناظرہ سنتے رہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ

ایک طرف یکا وتنہا احمدیوں کے عالم ہیں تو دوسری طرف بڑے بڑے مولوی نظر آتے ہیں جن کے ساتھ کافی تعداد میں لوگ ہوتے ہیں۔ احمدی عالم کے پاس ایک چھوٹی سی کتاب ہوتی ہے جسے وہ ہاتھ میں لے کر پڑھتا ہے اور فریق مخالف کے سوالوں کا جواب دیتا ہے جب کہ فریق مخالف نے کتابوں کے ڈھیر لگا رکھے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں بَن پڑتا۔ تیسرے دن انہوں نے مولانا غلام رسول راجیکی اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ یوسف پٹھان کہتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ زیادتی ہوتے دیکھی تو وہ مولانا کے دفاع کو پہنچ گئے اور دوسرے لوگوں کو میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ پھر انہوں نے مولوی غلام رسول راجیکی کو ایک تانگے بٹھا کر بحفاظت ٹمپل روڈ پہنچا دیا۔ اس پر حضرت مولوی صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا اگر کبھی ضرورت پڑے تو بے دھڑک میرے پاس چلے آیا کرو۔ بقول یوسف پٹھان ایک رات وہ پناہ کی تلاش میں مولوی صاحب کے کمرہ میں چلے گئے اور رات وہاں گذاری۔ وہ بعد میں بھی کئی باران کے بِن بلائے مہمان بن کران کے پاس چلے جاتے۔ مولوی صاحب ساری رات عبادت میں مصروف رہتے اور یوسف پٹھان یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتے رہتے۔ اگرچہ انہوں نے مولوی صاحب کے سامنے اعتراف تو نہیں کیا مگر ان کی شخصیت کا یوسف پٹھان پر اثر ہوتا جا رہا تھا۔

ایک بار انہوں نے یوسف پٹھان سے پوچھا: ''میلہ پر چلو گے؟'' اس پر یوسف پٹھان نے ان کے ساتھ میلہ دیکھنے کے لیے تیاری کر لی۔ یوسف پٹھان اب ایسی حالت میں تھے کہ وہ مولانا کی کسی بات کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ میلہ قادیان کا جلسہ سالانہ تھا۔

یوسف پٹھان اس جلسہ کا حال سناتے ہوئے بتاتے ہیں: ایک تقریر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے یہ دعویٰ کیا کہ انہیں خدا نے وہ طاقت دی ہے کہ بڑے سے بڑے معترض کو بھی مسکت جواب دے سکتے ہیں کیوں کہ خدا نے انہیں قرآن کا علم دیا ہے اور کوئی نہیں جو اُن کے مقابلے پر آئے اور شکست نہ کھائے۔ بقول یوسف پٹھان: مجھے اس بات پر طیش آ گیا۔ میں ساری رات ڈھاب کے کنارے گھومتا رہا اور ارادہ کر لیا کہ میں اس شخص کو جو اتنا بڑا دعویٰ کرتا ہے اور کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا قتل کر کے چھوڑوں گا۔ حضور کے ساتھ ملاقات کا وقت ہوا تو یوسف پٹھان بھی لائن میں لگ گئے۔ انہوں نے اپنے پاس ایک چھرا چھپا رکھا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئے اور حضور نے ان پر ایک نظر ڈالی تو ان کی کایا پلٹ گئی اور وہ ایک بے جان بت کی طرح دھڑام سے فرش پر گر گئے۔ لوگ انہیں اُٹھانے لگے تو وہ چھرا بھی برآمد ہو گیا جو انہوں نے چھپا رکھا تھا۔ مولانا کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے یوسف پٹھان کو سخت ملامت کی اور اُٹھایا۔ تب انہوں نے عرض کی کہ انہیں معاف کر دیا جائے، وہ بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ یوسف پٹھان کہتے ہیں: ہوا دراصل یہ کہ میں جس آدمی کو قتل کرنا چاہتا تھا اس نے مجھے اپنی نظر سے قتل کر دیا تھا۔ انہوں نے اس دن سے دنیا کی غلاظتوں سے منہ پھیر لیا اور غلامِ محمود بن کر آستانہ مسیح موعود پر زندگی گذارنے لگے۔ چوہدری عبدالعزیز ڈوگر کے الفاظ میں یوسف پٹھان نے بہت غریبانہ زندگی بسر کی۔ وہ نہ صرف نمازِ باجماعت کے پابند بلکہ تہجد گذار بھی تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۵ء میں پچاسی سال کی عمر میں

وفات پائی اور بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

فیض اللہ جلد ساز کی دکان دفتر مجلس انصار اللہ مرکزیہ کے تقریباً سامنے ہوا کرتی تھی۔ فیض اللہ حضرت مسیح موعود کے رفیق، میاں محمد عبداللہ جلد ساز کے بیٹے تھے۔ مجھے میاں محمد عبداللہ سے کسی کتاب کی جلد بنوانے کا موقع تو نہیں ملا لیکن ان کے تینوں صاحبزادوں یعنی فیض اللہ، نعمت اللہ اور ہدایت اللہ سے کام کرانے کا موقع ملتا رہا ہے۔

میرے اندازے کے مطابق فیض اللہ ان میں سب سے بڑے تھے۔ اُن کی کمر قدرے خمیدہ اور ڈاڑھی سفید تھی اور وہ سر پر رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ وہ اور ہدایت اللہ تو اسی پیشے سے منسلک رہے لیکن نعمت اللہ جو اچھے جلد ساز تھے غلط لوگوں کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے بعض ایسے مقدمات جن پر فوجداری دفعات کا اطلاق ہوتا تھا میں ماخوذ ہو کر منظر سے غائب ہو گئے۔

ربوہ کے دیگر پرانے جلد سازوں میں سے ایک صادق ندیم ہیں جنہوں نے ۱۹۶۲ء میں آزاد بک بائینڈز کے نام سے گول بازار میں اپنے کاروبار کا آغاز کیا لیکن بعد میں ندیم بک ڈپو کے نام سے کام کرنے لگے۔ ابتدا میں ان کی دکان افضل مارکیٹ میں تھی لیکن پھر وہ اقصیٰ روڈ پر منتقل ہو گئے۔ انہیں اسیر راہِ مولا ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور وہ اس پر بجا طور پر نازاں ہیں۔

''یہ ایک طویل داستان ہے جو سترہ سالوں پر محیط ہے'' انہوں نے ایک بار مجھے بتایا ''۱۹۹۰ء میں جب میری دکان افضل مارکیٹ میں تھی میرے پاس ایک شخص آیا اور استفسار کیا کہ کیا میرے پاس حضرت مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کی لکھی ہوئی کتاب ''سیرت حضرت مسیح موعود'' موجود ہے۔ کتاب میرے پاس تھی سو میں نے اسے دے دی لیکن اس کے واپس جاتے ہی مجھے احساس ہوا کہ شاید میرے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ دراصل اس آدمی کا جماعت سے تعلق نہ تھا اور جیسا کہ مجھے بعد میں احساس ہوا اسے مولوی اللہ یار ارشد، خطیب جامع مسجد احرار، ربوہ نے میرے پاس بھجوایا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنے ایک پڑوسی دکاندار کو اس کے پیچھے دوڑایا مگر اتنی دیر میں وہ یہ کتاب لے جا کر مولوی صاحب کو دے چکا تھا جو میری دکان کے سامنے تحصیل کی کینٹین کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ اللہ یار ارشد یہ کتاب لے کر ڈی ایس پی کے پاس چلے گئے اور میرے خلاف زیرِ دفعہ ۲۹۸ (بی)، تعزیراتِ پاکستان ایف آئی آر درج کرا دی۔''

''آپ کے پاس اس ایف آئی آر کی نقل تو موجود ہوگی'' میں نے سوال کیا۔

''میرے پاس تو موجود نہیں ہے البتہ ناظرِ اشاعت صدر انجمن احمدیہ پاکستان کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''ایف آئی آر'' کے صفحات ۲۰۲ اور ۲۰۳ پر چھپی ہوئی ہے۔''

اس ایف آئی آر میں الزام لگایا گیا تھا کہ ''مالک ندیم بک ڈپو جو کہ قادیانی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اپنے بک ڈپو سے کتاب سیرت مسیح موعود عوام میں تقسیم کر رہا ہے جو کہ کتاب کی تحریرات دفعہ ۲۹۸ (بی) کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱، ۳، ۸، ۴۸ اور دیگر مقام پر مرزا قادیانی کے لیے علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی

اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔صفحہ نمبر ۶ پر آیات جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات کے لیے نازل کی گئی ہیں کو مرزا قادیانی کے لیے استعمال کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی ناپاک جسارت کی گئی ہے اور اس کی غلط تشریحات کر کے قرآن مجید کی توہین کی گئی ہے۔اس کتاب کے ذریعہ ہم مسلمانوں کے جذبات مجروح کئے گئے ہیں۔ ندیم بک ڈپو پر بھاری تعداد میں یہ کتاب موجود ہے لہٰذا کتاب کا نسخہ پیش کرتا ہوں۔ملزم کے خلاف پرچہ درج فرما کر باقی کتب کو ندیم بک ڈپو سے برآمد کر کے ملزم کو گرفتار کیا جائے۔اس کتاب کو مولانا خدا بخش اور قاری شبیر احمد عثمانی نے بھی پڑھا ہے۔''

صادق ندیم کی گفتگو جاری تھی: ''اگلے روز صبح ہی صبح ربوہ پولیس چوکی کا انچارج میرے پاس آیا۔اس کے پیچھے لیکن ذرا دُور اللہ یار ارشد کھڑے تھے۔چوکی انچارج نے یہی کتاب ایک اخباری کاغذ میں لپیٹی ہوئی تھی۔اس نے مجھے یہ کتاب دکھاتے ہوئے بتایا کہ مولوی اللہ یار ارشد نے میرے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے لہٰذا وہ مجھے گرفتار کر رہے ہیں۔میں نے ایک رات حوالات میں گذاری جس کے بعد صبح کے وقت میرے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگا کر مجھے آر ایم کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔آر ایم نے مجھے چنیوٹ سب جیل بھجوا دیا۔میں وہاں دس دن رہا جس کے بعد میں ضمانت پر رہا ہو کر گھر آ گیا لیکن یہ مقدمہ سترہ سال تک چلا۔''

میری معلومات درست ہیں تو اُس زمانے میں ربوہ میں ایک ہی پولٹری فارم تھا جس کے مالک تعلیم الاسلام کالج میں شماریات کے استاد سعید اللہ خان تھے۔اس کا نام خلیل پولٹری فارم تھا اور الفضل میں اس کا اشتہار ''کھول کے دیکھو دوستو اِک مرغی خانہ'' کے عنوان سے آیا کرتا تھا۔مجھے تو مرغبانی کا شوق نہیں رہا لہٰذا کبھی یک روزہ چوزے پالنے کا خیال آیا نہ ان سے خریداری کا کوئی موقع پیدا ہوا۔

اُسی زمانے میں یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ مولوی محمد تقی ساکن محلہ دارالرحمت وسطی کے مرغ لاہور نیشنل ہارس اینڈ کیٹل شو میں اوّل انعام کے مستحق قرار پائے ہیں۔پھر ہم یہ بھی سنتے رہے کہ وہ غیر ملکی مرغ فروخت کرتے ہیں لیکن عملاً اس کا تجربہ کبھی نہ ہوا۔

آرائشِ گیسُو پر عورتوں کا حق تو صدیوں سے مسلّمہ ہے لیکن اب مرد بھی ان سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے تاہم میں اس صورتِ حال پر ماتم کی بجائے اس وقت بات کرنا چاہتا ہوں ربوہ کے ہیئر کٹنگ سیلونز اور گرم حماموں میں سے بعض کی۔

پرانے وقتوں میں اس پیشے سے منسلک افراد ''نائی'' یا ''حجام'' کہلاتے تھے اور وہ اپنے نام سے پہلے ''راجہ'' کا لفظ لگانا پسند کرتے تھے تاہم ان کے کاروبار کا انداز بھی ان کے مالی وسائل کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف ہوتا۔وہ حجام جن کے وسائل باقاعدہ دکان کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اپنے اوزاروں کی پوٹلی یا صندوقچی اپنے ساتھ اُٹھائے پھرتے اور بوقتِ ضرورت پُر ہجوم مقامات پر اپنی موجودگی کا اعلان بہ آواز بلند کرتے جاتے۔ اگر کوئی شخص بال بنوانا چاہتا تو وہ اسے وہیں بٹھا کر اس کا سر مونڈ دیتے اور پھر نئے ''شکار'' کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ان حجام کی اجرت باقی حجاموں کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی۔

اگلا درجہ ان حجاموں کا تھا جن کی اپنی دکان تو نہ تھی لیکن وہ کسی مخصوص جگہ پر صبح ہی صبح ٹھیا جما لیتے۔ باری کے منتظر گاہک یا وقت گذاری کے لیے وہاں آنے والے احباب پاس رکھے گئے کسی بنچ یا تخت پوش پر بیٹھ جاتے اور مقامی خبروں سے لے کر ملکی سیاست تک ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو کا سلسلہ صبح سے شام تک چلتا رہتا۔

کچھ حجاموں نے باقاعدہ دکانیں بنا رکھی تھیں جنہیں ہیر کٹنگ سیلون کہا جاتا تھا۔ ایسی دکانوں میں اگر غسل کی سہولت بھی موجود ہوتی تو ہیر کٹنگ سیلون کے بعد ''اینڈ گرم حمام'' کے الفاظ بھی استعمال کئے جاتے۔

فی الوقت مجھے اس پیشے سے منسلک جن افراد کے نام یاد آ رہے ہیں ان میں سے راجہ محمد عبداللہ عمر کے لحاظ سے سب سے سینئر تھے۔ آغازِ ربوہ میں تو ان کی دکان نہ جانے کہاں تھی لیکن گول بازار بننے کے بعد ان کی دکان خواجہ ہوٹل کے ساتھ اس عمارت میں ہوا کرتی تھی جو فی الاصل حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے صاحبزادے، میاں عبدالمنان عمر کی ملکیت تھی۔

راجہ محمد عبداللہ کو مدتوں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے بال تراشنے کا اعزاز حاصل رہا اور غالباً قصر خلافت میں ان کی آمد و رفت کی وجہ سے ہی ابا جی سے بھی ان کی گونہ بے تکلفی تھی۔ مجھے ابا جی کا اِن کی دکان پر جانا اور بسا اوقات مجھے بھی ساتھ لے جانا آج تک یاد ہے۔ میرے مشاہدے کے مطابق ابا جی بعض دفعہ محض گپ شپ کے لیے بھی راجہ محمد عبداللہ کے پاس رُک جایا کرتے تھے۔

میں یہاں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ راجہ محمد عبداللہ نے ابا جی کی فرمائش پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ریشِ مبارک کے کچھ بال بطور تبرک انہیں عنایت فرمائے تھے جو انہوں نے کاغذ کی ایک پڑیا میں سنبھال کر رکھے ہوئے تھے اور اس پڑیا پر بطور یادداشت یہ عبارت لکھ رکھی تھی:

''محمد عبداللہ بار بر ۲-۴-۶۲''

مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا یہ تبرک ابا جی کی وفات کے بعد ان کے ذاتی صندوق میں سے دستیاب ہوا تھا۔

اللہ تعالےٰ نے راجہ محمد عبداللہ کو طویل العمری کے ساتھ اچھی صحت سے بھی نواز رکھا تھا چنانچہ ان کے بیٹے، عبدالشکور بتاتے ہیں: ''میرے والد چوراسی سال زندہ رہے۔ الحمد للہ وہ آخری دن بلکہ آخری وقت تک اپنے کام کاج میں مصروف رہے اور کسی کے محتاج نہیں ہوئے۔ ۴ مارچ ۱۹۸۸ء کو دکان پر کام کرتے کرتے دل کے حملہ سے وفات پائی اور ربوہ کی مقدس سرزمین میں پیوندِ خاک ہوئے۔''

عبدالشکور کے بیان کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تقریر مورخہ ستائیس اکتوبر ۱۹۵۶ء بر موقع اجتماع مجلس انصاراللہ مرکزیہ میں بیان فرمودہ یہ واقعہ ان ہی راجہ محمد عبداللہ کا ہے:

''آج ہی مجھے میرے نائی نے سنایا۔ اس نے بتایا کہ میں میاں عبدالمنان صاحب کی حجامت بنانے گیا تو انہوں نے کہا: کیا تم ڈر گئے تھے کہ حجامت بنانے نہ آئے یا تمہیں کسی نے روکا تھا؟ میں نے کہا: مجھے تو کوئی ڈر نہیں اور نہ کسی نے مجھے روکا ہے۔ حجامت بنانا تو انسانی حق ہے۔ اس سے مجھے کوئی نہیں روکتا اس لیے میں آ گیا

ہوں۔ پھر میں نے کہا: میاں صاحب! میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں کہ پشاور سے ایک احمدی قادیان میں آیا اور وہ میاں شریف احمد صاحب سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر گیا۔ اتفاقاً میں بھی اسی وقت حجامت بنانے کے لیے ان کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ میاں صاحب اس وقت سو رہے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میں تو حجامت بنانے کے لیے آیا ہوں، انہیں اطلاع دے دی جائے لیکن وہ دوست مجھے بڑے اصرار سے کہنے لگے کہ ان کی نیند خراب نہ کریں لیکن میں نہ مانا اور میاں صاحب کو اطلاع بھجوا دی جس پر انہوں نے مجھے بھی اور اس دوست کو بھی اندر بلا لیا۔ وہاں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ اس پر بیٹھ جایئے۔ کہنے لگے میں نہیں بیٹھتا۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہ چارپائی پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے اس لیے میں ان کے لیے کرسی اُٹھا لایا لیکن وہ کرسی پر بھی نہ بیٹھے اور دروازہ کے سامنے جہاں جوتیاں رکھی جاتی ہیں وہاں پائیدان پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا، میں نے چارپائی دی لیکن آپ نہ بیٹھے، پھر کرسی دی تب بھی آپ نہ بیٹھے اور ایک ایسی جگہ جا کر بیٹھ گئے جہاں بوٹ وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ کہنے لگے: میں تمہیں ایک قصہ سناؤں؟ حضرت مسیح موعود کا رفیق ہوں۔ میں ایک دفعہ حضرت مسیح موعود کو ملنے کے لیے آیا۔ آپ (......) مبارک میں بیٹھے تھے اور دروازہ کے پاس جوتیاں پڑی تھیں۔ ایک آدمی سیدھے سادھے کپڑوں والا آ گیا اور آ کر جوتیوں میں بیٹھ گیا۔ میں نے سمجھا یہ کوئی جوتی چور ہے چنانچہ میں نے اپنی جوتیوں کی نگرانی شروع کر دی کہ کہیں وہ لے کر بھاگ نہ جائے۔ کہنے لگے: اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت مسیح موعود فوت ہو گئے اور میں نے سنا کہ آپ کی جگہ کوئی اور شخص خلیفہ بن گیا ہے۔ اس پر میں بیعت کرنے کے لیے آیا۔ جب میں نے بیعت کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص تھا جس کو میں نے اپنی بیوقوفی سے جوتی چور سمجھا تھا یعنی حضرت خلیفہ اول اور میں اپنے دل میں سخت شرمندہ ہوا۔ آپ کی عادت تھی کہ آپ جوتیوں میں آ کر بیٹھ جاتے۔ حضرت مسیح موعود آواز دیتے تو آپ ذرا آگے آ جاتے۔ پھر جب کہتے: مولوی نور الدین صاحب نہیں آئے تو پھر کچھ اور آگے آ جاتے۔ اسی طرح بار بار کہنے کے بعد کہیں وہ آگے جاتے تھے۔ یہ قصہ سنا کر میں نے انہیں کہا: میاں! آپ کے باپ نے جوتیوں میں بیٹھ بیٹھ کے خلافت لی تھی لیکن تم زور سے لینا چاہتے ہو، اس طرح کام نہیں بنے گا۔ تم اپنے باپ کی طرح جوتیوں میں بیٹھو اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو۔ اس پر وہ چپ کر گیا اور میری اس بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔"

ان ہی محمد عبداللہ کے ایک چچازاد، محمد دین تھے جن کی دکان اقصیٰ روڈ پر ریلوے پھاٹک کے اُس پار سڑک کے بائیں ہاتھ ہوا کرتی تھی۔ میں اِن کے پاس خود بال کٹوانے جاتا رہا ہوں۔ ان کی دکان پر مختلف النوع گاہکوں کا ہجوم ہوتا جو بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہوتے۔ یہ باتیں اتنی دلچسپ ہوتیں کہ اخبار پڑھنے کا وقت ملتا نہ باری کا طویل انتظار باعثِ زحمت بنتا۔ وہ میری بہت عزت کرتے تھے اور جہاں ملتے ان سے ضرور سلام دعا ہوتی۔

گول بازار ہی میں ایک حجام محمد طفیل ہوا کرتے تھے جن کے پاس ابا جی اور میں اس زمانے سے جایا کرتے تھے جب حجام ایک حجامت کے دو آنے لیا کرتے تھا۔ مدتوں یہی ریٹ مروّج رہا لیکن جب بڑھنے پر آیا

تو یک دم چار آنے طے پایا۔ اس زمانے میں یہ اضافہ بھی چبھتا تھا لیکن کیا پتا تھا کہ میری زندگی میں ہی ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب بڑے شہروں کے فیشن ایبل بیوٹی سیلونز یا پارلرز میں اسی کام کے سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے طلب کئے جانے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کیا جائے گا۔

اس زمانے میں دادی جی ضعیف العمر اور ضعفِ بصارت کا شکار ہو چکی تھیں اور ان کے لیے اپنے ناخن خود تراشنا ممکن نہ رہا تھا۔ ابا جی محمد عبداللہ یا محمد طفیل حجام کو گھر بلا لاتے اور وہ منٹوں میں یہ کام مکمل کر دیتے۔

ایک اور حجام میں جن کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا محمد رمضان خادم تھے جو ''نیو سٹار ہیئر کٹنگ سیلون'' کے نام سے دکان کیا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ دکان منڈی میں تھی اور ہم اپنی زیادہ تر ضروریات گول بازار سے ہی پوری کرلیا کرتے تھے مگر مجھے کبھی کبھار ان سے اپنے بال کٹوانا بھی یاد ہے۔ مجلسی آدمی تھے اور اپنے پاس بیٹھنے والوں کو اپنی لچھے دار گفتگو سے بہلائے رکھتے۔ اس زمانے کے باقی اکثر حجاموں کی طرح کھانا پکانا بھی جانتے تھے اور اس معاملے میں حضرت مولا بخش نامی ایک احمدی طباخ کے شاگرد تھے۔ انہیں جلسہ سالانہ پر نظارتِ ضیافت کی اعانت کے لیے جماعتی طور پر کئی بار قادیان بھی بجھوایا گیا۔

وہ فرقان فورس میں رہے تھے اور اس زمانے کے دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے۔

عیالدار اور مالی کشائش سے محروم تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایک یتیم بھتیجے کی پرورش کی ذمہ داری قبول کیے رکھی اور اسے احسن طریقے سے نبھایا۔

اُن دنوں حجاموں نے اپنی دکانوں کے باہر ایک رسی پر رنگ برنگے گیلے تولیے خشک ہونے کے لیے پھیلا رکھے ہوتے تھے۔ دکان کے باہر ان تولیوں کی موجودگی دکان کے کھلے ہونے کی نشانی سمجھی جاتی تھی اور گاہک دور سے ہی اندازہ کر لیتا تھا کہ حجام موجود ہے اور حمام گرم ہے۔

حمام کا ذکر آیا ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ ہر حجام نے اپنے پاس موجود جگہ کے مطابق دکان کے اندر دو، تین یا چار غسل خانے تعمیر کر رکھے ہوتے تھے جہاں سردیوں میں گرم پانی تیار ملتا۔ لوگ اپنی اپنی وجوہات کی بنا پر ان غسل خانوں میں غسل لیتے تھے۔ حجام اس بات پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ کوئی گاہک پانی غیر ضروری طور پر ضائع نہ کرے اور ایک معیّن وقت سے زیادہ غسل خانہ استعمال نہ کرسکے۔ گاہک کی طرف سے ان اصولوں کی خلاف ورزی پر حجام دروازہ کھٹکھٹا کر اسے اپنی غلطی کا احساس دلا دیتا اور فوری طور پر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوتے تو حجام علی الاعلان اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

گاہک حمام کی طرف سے مہیا کردہ تولیہ بے دھڑک استعمال کر لیتا اور اس بات کی ذرہ برابر پروا نہ کرتا کہ یہی تولیہ پہلے کئی بار استعمال ہو چکا ہے۔

حجام سے ناخن کٹوانے کا رواج بھی عام تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کر اب قدرے معیوب نظر آنے والی بات بغلیں صاف کرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ اچھے بھلے معززین بال کٹوانے کے بعد سب لوگوں کے سامنے اپنی قمیص اُڑس کر ایک بازو اوپر اُٹھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حجام فوراً سمجھ جاتا کہ اسے کیا کرنا

ہے چنانچہ وہ ایک مخصوص استرا ہاتھ میں پکڑ کر ''فوراً سے پہلے'' بغل صاف کر دیتا۔ اگلے ہی لمحے دوسرا بازو اوپر اُٹھ جاتا اور اس کے ساتھ بھی وہی عمل دہرایا جاتا۔ اس کے بعد گاہک اپنی قمیص نیچے کرتا اور نہایت اطمینان کے ساتھ خراماں خراماں دکان سے باہر نکل جاتا۔

غسل کے خواہشمند بعض گاہک آنکھوں ہی آنکھوں میں حجام سے استرے کا مطالبہ کرتے۔ میرے خیال کے مطابق حجاموں نے یہ مطالبہ پورا کرنے کے لیے ایک مخصوص استرا رکھا ہوتا تھا۔ وہ اسے وٹّی پر رگڑ کر اطمینان کر لیتا کہ اس کی دھار تسلی بخش ہے۔ گاہک یہ استرا لے کر غسل خانے کے اندر داخل ہو جاتا اور باہر نکل کر شکریے کے ساتھ واپس کر جاتا۔

ہیر کٹنگ سیلونز کے اندر نوجوان گاہکوں کے لیے مختلف ہیر سٹائلز کی تصویریں لگی ہوتی تھیں جن میں سے ایک دلیپ کٹ تھا۔ دلیپ کمار اس زمانے کا مقبول ترین فلمی ہیرو تھا اور بعض نوجوان ہیئر کٹ کے معاملہ میں اس کی پیروی باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

ان سب باتوں کے علاوہ حجام بعض دیگر خدمات بھی بجالاتے تھے جن میں سے ایک نومولود بچوں کی جھنڈ اتروائی تھی تو دوسری لڑکوں کے ختنے۔ اس موقع پر بچوں کے والدین اپنے اپنے حالات کے مطابق ان حضرات کی دل کھول کر خدمت کرتے۔ بعض حجام پھوڑے پھنسی اور کچھ جلدی امراض از قسم داد وچنبل کے علاج میں بھی شہرت رکھتے تھے اور وہ کام جو آج کل بعض فزیشین یا سرجن اچھی خاصی فیس وصول کرنے کے بعد سرانجام دیتے ہیں حجام چند روپوں میں کر دیتے۔ ایسے حجام خود کو جراح کہلواتے۔ خدا نے ان میں سے بعض کے ہاتھ میں خاص شفا رکھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹری خدمات یوں بھی آسانی سے میسر نہ تھیں لہٰذا ان جراحوں کا کام بھی زوروں پر رہا لیکن حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ کردار بالکل ختم ہو گیا۔

رفیق حضرت مسیح موعود حضرت مستری علی گوہر ربوہ کے قدیم آبادکاروں میں سے تھے۔ وہ اور ان کے بیٹے محمد علی، احمد علی اور سعادت علی ''علی گوہر اینڈ سنز'' کے نام سے کام کیا کرتے تھے۔ گول بازار میں ان کی دکان افضل برادرز کے قریب تھی اور اس پر سیمنٹ کے بڑے بڑے حروف میں دکان کا نام لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے یہاں نہ صرف اپنی دکان تعمیر کی بلکہ پوری مارکیٹ بنا کر دکانیں کرایہ پر اٹھادیں اور اوپر اپنے لیے رہائش تعمیر کر لی۔

وہ نلکے کا سامان، گیس لیمپ، سٹوو، عمارتی سامان، چونے اور نئے سائیکلوں کی فروخت کے علاوہ نلکا لگانے کا کام کرتے اور سائیکل کرایہ پر بھی دیتے۔ ایک بار ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے ان کی دکان سے ایک سائیکل کرائے پر لیا جو چوری ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے امی کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کیا چنانچہ امی نے میری سائیکل جو میرے لاہور چلے جانے کے بعد سٹور میں تقریباً بیکار پڑی ہوئی تھی انہیں دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ سائیکل ان صاحبان کو دے کر اپنا حساب بے باق کیا۔

احمد علی کے پاس کچھ عرصہ چینی کا راشن ڈپو بھی رہا۔ ایک حادثے میں ان کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی مگر اس کے باوجود وہ خاصے چاق و چوبند تھے اور ہر کام پھرتی سے کر لیتے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ان کے پاس

پاکستان ٹوبیکو کمپنی کی ڈیلرشپ بھی تھی۔

ربوہ میں نلکے بہت کثرت سے خراب ہوا کرتے تھے چنانچہ نلکا سازی میں روزگار کے وسیع مواقع موجود تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ محمد علی آہستہ آہستہ نلکا سازی کے ساتھ مختص ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے، حسن جو اَب فوت ہو چکے ہیں اس کاروبار میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے محمد احمد جو مدت سے ترکِ وطن کر چکے ہیں آغازِ سکول سے میرے ہم جماعت تھے تاہم میں نے انہیں اس کام میں اپنے والدِ بزرگوار کا ہاتھ بٹاتے نہیں دیکھا۔

اُس دور کے ربوہ کے ایک اور نلکا ساز عبدالکریم فضل عمر ہسپتال کے پیچھے رہا کرتے تھے۔ جب ہمارے گھر کا نلکا خراب ہوتا یا دوبارہ بور کی ضرورت محسوس ہوتی تو بالعموم مستری محمد علی کو یا انہیں زحمت دی جاتی۔ بھاری بھرکم سے عبدالکریم ایک ریڑھی پر ضروری سامان لاد کر خود اسے کھینچتے ہوئے پہنچ جاتے اور نلکا ''گیڑتے'' ہی اس کے مرض کی تشخیص کر لیتے۔ نلکے کے معمولی نقائص میں سے ایک بوکی کا اتر جانا تھا جس کا علاج بہت مہنگا نہ تھا لیکن صاحبِ خانہ زیادہ پریشان اس وقت ہوتے جب انہیں بتایا جاتا کہ نلکے کے پائپ میں زنگ کی وجہ سے سوراخ ہو چکا ہے یا فلٹر بدلنے والا ہے۔ ایسی صورت میں نلکا اکھاڑا جاتا، ویلڈنگ سے پائپ کا سوراخ بند کیا جاتا اور فلٹر کی جالی تبدیل کی جاتی جس کے بعد اسی بور میں یا نئی جگہ بور کر کے نئے سرے سے نلکا لگایا جاتا۔ یہ خاصا مہنگا نسخہ ہوتا جو بسا اوقات صاحبِ خانہ کے کئی مہینوں کا بجٹ اَپ سیٹ کر دیتا لیکن اس کے بغیر بھی تو کوئی چارہ نہ ہوتا۔

ان ''مہمات'' کے دوران ان کے تینوں بیٹوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ان کے ہمراہ ہوتا۔ ان کے نام عبدالعزیز، مجید احمد اور بشیر احمد تھے۔ اب عبدالکریم اور ان کے دونوں بڑے بیٹے وفات پا چکے ہیں البتہ بشیر احمد جو سکول میں میرے ہم جماعت رہے خدا کے فضل سے حیات ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ دوبئی میں گذارا لیکن آج کل وہ ربوہ ہی میں مقیم ہیں۔

بہت پرانی بات ہے۔ ربوہ میں ایک بار شدید طوفانِ باد و باراں آیا جس میں رعد و برق کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ بجلی کڑکتی تو یوں محسوس ہوتا گویا ہمارے آس پاس ہی گری ہو۔ اگلے دن پتا چلا کہ پچھلی رات عبدالکریم نلکا ساز کے گھر کے صحن میں بجلی گری تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو جانی اور مالی نقصان سے محفوظ رکھا۔ مجھے یاد ہے میں بھی صورتِ حال کے ''جائزے'' کے لیے وہاں گیا تھا۔ بیرونی دروازے کے پاس زمین کے ایک حصہ کا رنگ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہاں پر گرد و نواح کے بعض اور لوگ بھی آ رہے تھے اور ''توبہ استغفار'' کے ساتھ ساتھ اس بات پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے جس نے سب کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا تھا۔

عبدالکریم نلکا ساز کے بیٹے، عبدالعزیز نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں افضل مارکیٹ میں ''عزیز لانڈری'' کے نام سے ڈرائی کلیننگ کا کام شروع کیا تھا۔ ربوہ میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی دکان تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس میں اونی کپڑوں کی ڈرائی کلیننگ کے لیے کوئی جدید مشینری تو نصب نہ تھی لیکن اہلِ ربوہ کے لیے یہ ''لانڈری''

بھی غنیمت تھی چنانچہ ان کا کام چل نکلا۔ مجھے ذاتی طور پر بھی اس دکان سے بعض کپڑوں کا دُھلوانا یاد ہے۔ اب عبدالعزیز وفات پا چکے ہیں اور یہ دکان کسی اور جگہ منتقل ہو چکی ہے۔

میرے دوست عبدالماجد جو ٹھیکیدار غلام حسین کے صاحبزادے ہیں یوں تو کوٹلی آزاد کشمیر میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا خاندان تقسیم سے پہلے قادیان میں اور بعد میں لاہور سے چنیوٹ اور پھر احمد نگر ہوتا ہوا ربوہ منتقل ہوا۔ وہ تیسری جماعت میں ہمارے سکول میں داخل ہوئے اور میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ انہوں نے لاہور، فیصل آباد، سرگودھا اور راولپنڈی میں رہ کر ریڈیو اور ٹی وی کا کام سیکھا۔ کچھ عرصہ فیصل آباد میں ملازمت بھی کی لیکن جلد ہی غلہ منڈی میں ''ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن'' کے نام سے ایک دکان کھول لی۔ ہم نے سکول میں سات سال اکٹھے گذارے تھے اور ہماری آپس میں کافی دوستی تھی چنانچہ میں جب ربوہ جاتا اور وہاں سے گذرتا تو بیشک چند لمحوں کے لیے ہی سہی ان کے پاس ضرور رُکتا۔ ایک بار ربوہ پولیس چوکی کا ایک سپاہی چوکی انچارج کا ریڈیو ان کے پاس مرمت کے لیے لایا اور انہیں بتایا کہ یہ ''شاہ جی'' کا ریڈیو ہے لہٰذا اسے بڑی احتیاط سے مرمت کیا جائے۔ ماجد بتاتے ہیں: میں نے ریڈیو کو اچھی طرح دیکھا۔ اس کے کچھ پرزے بدلنے والے تھے جو میرے پاس موجود نہ تھے۔ میں فیصل آباد جا کر پرزے لایا اور ریڈیو ٹھیک کر دیا۔ دو چار دنوں کے بعد وہی سپاہی ریڈیو واپس لینے کے لیے آیا۔ میں نے اسے ریڈیو دیا تو وہ میری اجرت ادا کئے بغیر ہی چل پڑا۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے ریڈیو اس سے بزور چھین کر اپنے پاس رکھ لیا اور بتایا کہ جب تک مجھے پیسے نہیں ملیں گے میں ریڈیو واپس نہیں کروں گا۔ سپاہی مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا اس وقت تو واپس چلا گیا لیکن کوئی دو گھنٹے کے بعد آ کر میری دکان کے سامنے منڈلانے لگا۔ اُس وقت میرے پاس چمن عباس کا جمعہ خان نامی ایک غیر از جماعت شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پولیس کا ٹاؤٹ تھا۔ اس نے سپاہی کو وہاں دیکھا تو حیران ہوا اور جب میں نے اسے سارا ماجرا سُنایا تو وہ کہنے لگا: چھڈ و جی۔ تُسی تھوڑے جئے پیسیاں لئی پولیس نال کیوں متھا لاندے پئے او۔ اس کا مشورہ تھا کہ مجھے یہ ریڈیو فوراً اسے لوٹا دینا چاہیے۔ میں نے بھی ساری صورت حال کا ازسرِ نو جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں واقعی پولیس سے دشمنی مول نہیں لے سکتا چنانچہ میں نے خود سپاہی کو آواز دے کر ریڈیو اس کے حوالے کر دیا۔ جب وہ رخصت ہو گیا تو جمعہ خاں مجھ سے کہنے لگا: آپ چوکی انچارج کو نہیں جانتے۔ وہ انتہائی کمینہ اور ظالم انسان ہے۔ ممکن ہے ریڈیو واپس مل جانے کے باوجود وہ آپ کو سبق سکھانے پر تُلا رہے لہٰذا آپ ایک دو دن دکان بند کر کے ادھر اُدھر ہو جائیں۔ میں یہ بات سن کر گھبرا گیا۔ میں نے پولیس تشدد کے بہت سے واقعات سن رکھے تھے لہٰذا میں نے اسی وقت دکان کو تالا لگایا اور فیصل آباد چلا گیا۔ ایک دو روز کے بعد واپس آیا اور ساتھ والے دکاندار سے ملا تو اس نے بتایا کہ چوکی انچارج وہاں آیا تھا اور اس کے ارادے ٹھیک نظر نہ آ رہے تھے۔

میں ایک بے وسیلہ لیکن عزت دار شخص ہوں لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ جس ملک میں انسان کی عزتِ نفس تک محفوظ نہ ہو وہاں سے ہجرت کر جانا ہی بہتر ہے سو میں نے دکان ختم کر دی اور ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جلد ہی اسباب پیدا فرما دیے اور میں ۱۹۷۳ء میں بائی روڈ پاکستان سے فرانس پہنچ گیا۔ بظاہر اس

چھوٹے سے واقعے نے میری کایا پلٹ دی۔ ممکن ہے میں پاکستان میں رہتا تو ابھی تک اسی دکان میں بیٹھا ریڈیو اور ٹی وی ٹھیک کر رہا ہوتا لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر طرح کی نعمتوں سے نواز رکھا ہے اور یہ اسی کا کرم ہے۔''

میں ماجد کے اس دعوے کا چشم دید گواہ ہوں۔ مجھے دو بار پیرس میں ان کے گھر ٹھہرنے کا موقع ملا ہے۔ پہلی بار ۱۹۸۹ء میں اور دوسری بار ۱۹۹۳ء میں۔ ان دونوں مواقع پر ماجد، بھابی اور ان کے بچوں نے دل و جان سے میری خدمت کی اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ خدا انہیں اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

وہ ایک سادہ لیکن نفیس انسان ہیں۔ غیر ممالک میں جا آباد ہونے والے دیگر پاکستانیوں کی طرح انہیں بھی کئی طرح کے مسائل کا سامنا تو ہے لیکن وہ مجموعی طور پر مطمئن زندگی گذار رہے ہیں۔ انہیں فرانس میں جماعتی خدمات کی بھی توفیق عطا ہوئی چنانچہ وہ کچھ عرصہ تک جماعت احمدیہ فرانس کے امیر رہے ہیں اور ان ہی کے دورِ امارت میں پیرس میں مشن ہاؤس کی عمارت خریدی گئی اور اس کی ضروری تزئین و آرائش ہوئی۔

ماجد سے کہا جائے کہ وہ اپنے دورِ امارت کا کوئی خاص واقعہ سنائیں تو وہ بتاتے ہیں: باتیں تو اور بھی ہیں کرنے والی لیکن یہ کیا کم ہے کہ پیرس میں مشن ہاؤس اسی دور میں مکمل ہوا اور اس کا افتتاح بھی اسی دور میں ہوا۔ یہ جماعت احمدیہ فرانس کے لیے خوشی کا ایک یادگار موقع تھا جس کے لیے ماجد کی سربراہی میں جماعت نے شایانِ شان انتظامات کر رکھے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے ان انتظامات پر بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ ملاحظہ ہو حضور کا یکم نومبر ۱۹۸۵ء کا لکھا ہوا یہ خط:

''پیارے عزیزم مکرم عبدالماجد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل سے مکرم ہدایت اللہ صاحب بنگوی سے ان کے قیام کے دوران بھرپور تعاون کی توفیق عطا فرمائی اور آپ نے احمدی مشن ہاؤس فرانس کی افتتاحی تقریب کے موقع پر پورے خلوص، محنت اور لگن سے مفوضہ امور سرانجام دیئے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں برکت ڈالے اور آپ مشن ہاؤس کی رونق کو دوبالا کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو احمدیت کی ترقی اور سربلندی کے لیے بیش از بیش خدمات کی توفیق دے اور اپنے انعامات کا وارث بنائے۔

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع''

ماجد نے بعد میں بیت السلام یعنی مشن ہاؤس، پیرس کی تصویر حضور کو ارسال کی تو آپ نے اسے بے حد پسند کیا اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مشن ہاؤس کے چہرے پر زیادہ سے زیادہ رونق پیدا ہو۔ اس حوالے

سے حضور کا یہ خط محررہ ۴ دسمبر ۱۹۸۵ء پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''پیارے عزیزم مکرم عبد ماجد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پُرخلوص خط مع بیت السلام کی تصویر موصول ہوا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اللہ تعالیٰ آپ کے خلوص میں برکت دے اور مشن کے چہرہ پر پہلے سے زیادہ رونق پیدا ہو جائے، احباب داعی الی اللہ بن جائیں اور شوق سے حضرت مسیح موعود (.....) کے آسمانی پیغام کو سعید روحوں تک پہنچانے والے ہوں۔

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع''

حضور ایک بار فرانس کے دورے پر تشریف لائے تو مقامی جماعت نے حضور کی عزت و تکریم کے لیے مقدور بھر کوشش کی۔ حضور جماعت کے اخلاص سے بے حد متاثر ہوئے چنانچہ آپ نے لندن پہنچ کر ماجد کے نام اپنے ۱۲ مئی ۱۹۹۵ء کے خط میں لکھا:

''پیارے عزیزم عبدالماجد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ

میرے فرانس میں قیام کے دوران آپ اور احبابِ جماعت نے جس خلوص، محبت، پیار سے میرا اور میرے قافلہ کا خیال رکھا اور مہمان نوازی کی اس پر میں آپ سب کا تہِ دل سے شکرگذار ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو محبت، پیار اور مسابقت کی روح و جذبہ عطا فرمائے اور احمدیت کا نام روشن کرنے والے ہوں۔

تمام احباب اور لجنات کو محبت بھرا سلام اور عید مبارک۔

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع''

ماجد کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں اور چار بیٹیوں سے نوازا ہے۔ یہ سارے بچے ماشاء اللہ پڑھ لکھ کر اپنے اپنے شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ یہ بچے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جماعت کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں اور حضور کو وقتاً فوقتاً دعائیہ خطوط لکھتے رہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو حضور کا ۲۹ جولائی ۱۹۸۵ء کا یہ خط:

”پیارے عزیزم عبدالماجد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ اور آپ کے بچوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اخلاص میں برکت دے اور بچوں کو علم کے زیور سے آراستہ فرمائے اور دین کا خادم بنائے۔ انہیں میری طرف سے پیار دیں۔

آپ کی بچی کلاس میں آئی ہوئی ہے۔ آپ جب ملاقات کے لیے آنا چاہیں تو بڑے شوق سے آئیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری سے وقت لے لیں۔

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع“

ماجد کی ایک بیٹی، شائستہ ماجد جو ایک مرحلے پر حضرت خلیفۃ المسیح کے خطبات کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا کرتی تھیں چند سال پہلے انگلستان میں کار کے ایک حادثہ میں وفات پا گئیں۔ اُن کی وفات کا حادثہ ماجد کے لیے بہت بڑے صدمے کا باعث بنا ہے اور اس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کی بیگم کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

محمد ابراہیم قلعی گر ربوہ کے پرانے اہلِ حرفہ میں سے تھے۔ اس زمانے میں تانبے کے برتنوں خصوصاً دیگچوں، پراتوں اور جگ گلاسوں کا عام رواج تھا لہٰذا قلعی گروں کے لیے روزی کمانے کے کافی مواقع موجود تھے۔ وہ شروع میں سائیکل پر اپنا ساز و سامان رکھ کر گلی محلوں میں ”پانڈے قلعی کرالو“ کی صدائیں لگاتے تھے لیکن پھر تقریباً اس جگہ جہاں اب ٹاؤن کمیٹی کا دفتر بن چکا ہے انہوں نے ایک چھپّر کے نیچے بیٹھنا شروع کر دیا۔ اب وہ محض قلعی گر نہ رہے تھے بلکہ ٹین ساز بھی ہو گئے تھے چنانچہ وہ ٹوٹی پھوٹی بالٹیوں کے پیندے بدلتے اور پانی والے مگ اور گھروں میں جلائے جانے والے دیئے تیار کر کے بیچتے۔ بعد میں انہوں نے تحریک جدید انجمن احمدیہ میں بطور انسپکٹر ملازمت اختیار کر لی۔

مستری حسن دین ترکھان تھے یعنی لکڑی کا کام کرتے تھے۔ وہ رفیق حضرت مسیح موعود، حضرت مولا بخش درویش کے داماد اور عبدالقدیر شاہد مربی سلسلہ کے بہنوئی تھے۔ ان کی دکان آر ایم ربوہ کی عدالت والی جگہ پر رہی اور محمود ہال کے بالمقابل بھی۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کاریگر کس پایہ کے تھے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور سرِ راہ بھی مل جاتے تو تفصیلی مزاج پرسی کے بغیر نہ رہتے۔ اس کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ ان کی اہلیہ بشیرہ بیگم قادیان کے زمانہ سے امی کی ملنے والی تھیں؛ ان کی منجھلی بیٹی، حمیدہ خانم آپی کی کلاس فیلو اور سب سے چھوٹی بیٹی، طاہرہ صادقہ کی ہم جماعت تھیں۔ ان کی سب سے بڑی صاحبزادی، صفیہ نے نرسنگ کا کورس کر رکھا تھا اور

شادی کے بعد دبئی منتقل ہو گئی تھیں۔ ایک زمانہ میں ان کا گھر مجلس انصار اللہ مرکزیہ کے دفتر کے سامنے ہوا کرتا تھا لیکن مدت سے میرا ان میں سے کسی کے ساتھ رابطہ نہیں ہے۔

میں یہ کیسے بھلا سکتا ہوں کہ آپا کی شادی کے موقع پر خالہ بشیرہ نے مستری حسن دین کے ہاتھوں کا بنا ہوا ایک خوبصورت سنگھار بکس تحفتاً پیش کیا تھا۔ اس سنگھار بکس کو کچھ اس طرح ڈیزائن کیا گیا تھا کہ کھولنے پر اس کے اندر لگا ہوا آئینہ کھل کر سامنے آجاتا تھا۔ اس شادی پر چون سال گذر چکے ہیں لیکن آج بھی یہ سنگھار بکس پہلے دن کی طرح مضبوط نظر آتا ہے۔

محمد شفیع ایک فریم میکر تھے جن کی دکان گول بازار میں افضل مارکیٹ میں ہوا کرتی تھی۔ وہ بطور پینٹر بھی شہرت رکھتے تھے جس سے مراد ہے یہ کہ وہ جستی صندوقوں (جن کا اس زمانے میں بہت رواج تھا) پر پینٹ بھی کر لیتے ہیں، رنگوں کی مدد سے بیل بوٹے بھی بنا لیتے ہیں اور خطاط بھی ہیں۔ ایک بار میں نے ان سے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا طغریٰ بنوایا تھا جسے انہوں نے شیشے کے ایک مستطیل ٹکڑے پر تیار کیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں عمدہ فریم سمیت اس طغرے کے صرف تیرہ یا چودہ روپے وصول کئے تھے۔ یہ طغریٰ کئی سال تک ہماری بیٹھک کی زینت بنا رہا۔

اور اب کچھ ذکر ایک گھڑی ساز کا جو اسی مارکیٹ میں بیٹھا کرتے تھے! ان کا نام ناصر احمد تھا اور وہ محلہ دارالیمن کے رہائشی تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کی کل کائنات لکڑی کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ نما شوکیس تھا جسے وہ ایک سٹینڈ پر رکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس شوکیس میں کچھ پرانی گھڑیاں، بعض پرزہ جات اور گھڑیوں کی مرمت کا معمولی سا سامان رکھا ہوتا تھا۔ وہ آنکھ پر آئی گلاس لگا کر بیٹھ جاتے اور گھڑیوں کی چھوٹی موٹی مرمت کر کے اپنا گذارا کر لیتے۔ ایک دو بار میں نے ان سے اپنی گھڑی ٹھیک کرائی تو پتا چلا کہ وہ کئی کئی روز تک دکان پر نہیں بیٹھتے۔ اگرچہ ان کی عمر تو زیادہ نہ تھی لیکن بیمار رہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

چوہدری عبداللطیف اوورسیئر کے بیٹے محمود احمد سکول میں میرے کلاس فیلو تھے۔ طبیعت ذرا کھلنڈری تھی اور سکول کا ڈسپلن اپنے لیے بوجھ محسوس کرتے تھے۔ انہیں اپنے جیسے ایک دو اور لڑکے مل گئے۔ یہ سب گھر سے سکول کے وقت نکلتے اور بروقت واپس گھر بھی پہنچ جاتے لیکن درمیانی وقت سکول کی بجائے کسی اور جگہ گذارتے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ میٹرک میں ہمارا ساتھ چھوٹ گیا۔

بعد میں انہوں نے میٹرک تو کر لیا لیکن کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر لیب ٹیکنیشن کا کورس کرنے کے لیے کراچی چلے گئے۔ کورس کر لیا تو چوآسیدن شاہ کے کسی ہسپتال میں تعینات ہوئے لیکن گھر سے دوری برداشت نہ کر سکے اور فضل عمر ہسپتال میں آ گئے۔ کچھ عرصہ یہاں کام کیا لیکن ملازمت میں ان کا دل نہ لگا چنانچہ کسی کے ساتھ مل کر ''شمع سینیٹری'' کے نام سے پہلے ریلوے روڈ پر اور بعد میں راجیکی روڈ پر سینیٹری اور گھروں میں سوئی گیس کی تنصیب کا کام کرنے لگے۔ ان دنوں ربوہ کے دور دراز محلوں کو سوئی گیس کے کنکشن مل رہے تھے اس لیے ان کا کاروبار خوب چلا اور وہ روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ناصر آباد میں اپنا مکان تعمیر کرنے

میں کامیاب ہو گئے۔

کچھ عرصہ پہلے جب استاذی المکرّم عزیز طاہر نے فون پر یہ افسوسناک خبر سنائی کہ محمود وفات پا گئے ہیں تو دل سے دعا نکلی کہ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے۔

''انہیں ہوا کیا تھا؟'' میں نے عزیز طاہر سے پوچھا۔

''وہ بعض کاروباری اور گھریلو معاملات کی وجہ سے پریشان تو چلے آ رہے تھے لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ اچانک ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں گے'' انہوں نے جواب دیا'' کچھ عرصہ پہلے راولپنڈی گئے۔ وہاں سے سینے میں انفیکشن لے کر واپس آئے۔ علاج معالجہ شروع ہوا تو طبیعت سنبھلنے کی بجائے مزید خراب ہو گئی اور ان کا جسم مفلوج ہو گیا۔ انہیں فیصل آباد لے جایا گیا لیکن وہاں بھی صحیح تشخیص نہ ہو پائی اور وہ ربوہ واپس آ گئے۔ وفات سے پہلے انہیں خون کی ضرورت پیش آئی لیکن خون دیا گیا تو بدقسمتی سے انہیں ری ایکشن ہو گیا۔ یوں سمجھ لیں وہ اسی کھینچا تانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

''یہ حادثہ ہوا کب؟''

''۱۶ ستمبر ۲۰۱۱ء کو۔ بس انہوں نے جانا ہی تھا ورنہ مرض میں اتنی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں نہ علاج میں ایسی فاش غلطیاں سرزد ہوتیں۔''

کھارا کے رہنے والے جان محمد نے گول بازار والے ریلوے کراسنگ کے پار گنّے کا ایک بیلنا لگا رکھا تھا اور وہ گنّے کا رس بیچا کرتے تھے۔ یہ بیلنا سال کے کم و بیش بارہ مہینے چلتا تھا جب کہ گنّا ایک خاص موسم میں ہی ہوتا ہے۔ تب مجھے بتایا گیا کہ وہ گنّے کی فصل پر سارے سال کی ضرورت کے مطابق گنّا محفوظ کر لیتے ہیں اور اس کی تازگی قائم رکھنے کے لیے اس پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے رہتے ہیں۔ تقسیم کے بعد اِن کا کچھ وقت شیخوپورہ میں گذرا لیکن ربوہ کے پہلے جلسہ سالانہ میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے پہلے چنیوٹ اور پھر ربوہ کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ وہ اب وفات پا چکے ہیں۔

اُن دنوں اقصیٰ روڈ کی یہ شکل نہ تھی اور یہاں کوئی بیت الذکر موجود نہ تھی چنانچہ انہوں نے ٹھیکیدار عبدالحق کے ساتھ مل کر یہاں ایک تھڑا بنایا جو اَب ایک چھوٹی سی خوبصورت بیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہی بیت اب جو ''بیت الحق'' کہلاتی ہے۔

ان کے بچوں میں سے ایک جن کا نام نذیر احمد ہے ربوہ میں جوتے بنایا کرتے تھے۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ جان محمد بھی اکثر ان کی دکان پر بیٹھے ہیں۔ ایک بار نذیر نے مجھے بتایا:

''ہم خاندانی طور پر اس پیشے سے منسلک نہیں ہیں۔ ہوا دراصل یہ کہ جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے جوتے پھٹے ہوئے ہیں۔ میں نے بے تکلفی سے پوچھ لیا کہ حضور نئے جوتے کیوں نہیں خریدتے۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ ان کے یہ جوتے چوہدری ظفر اللہ خان باہر سے تحفے کے طور پر لائے تھے لیکن اس جیسا آرام دہ جوتا یہاں ملتا نہیں۔

تب میں نے کہا کہ میں آپ کو تین ماہ کے اندر اندر اپنے ہاتھ سے ایک ایسا ہی آرام دہ جوتا بنا کر پیش کروں گا۔ کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی تھی لیکن میں تو جوتے بنانے کے فن سے کلّی طور پر ناآشنا تھا۔ تب میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں نے پڑھائی چھوڑ دی، کوئٹہ چلا گیا اور تین ماہ کی دن رات کی محنت کے بعد جوتا بنانا سیکھ لیا۔ میں دن کے وقت ایک پٹھان کے پاس کام کرتا تھا اور رات بیت احمدیہ میں گذارتا تھا۔ میں نے اس پٹھان کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ میں جلد از جلد کام سیکھنا چاہتا ہوں، مجھے مزدوری سے کچھ غرض نہیں۔ اس نے بھی خوب محنت سے مجھے کام سکھایا۔ نتیجتاً میں تین ماہ کے اندر اپنے فن میں طاق ہو گیا۔ میں نے ربوہ واپس پہنچ کر حضور کے پاؤں کا ناپ لیا اور اپنے ہاتھوں سے ایک جوتا تیار کر کے پیش کر دیا۔ میں نے یہ جوتا بہت عمدہ غیر ملکی کروم سے تیار کیا تھا اور اسے کھولنے یا بند کرنے کے لیے تسموں کی بجائے زِپ لگائی گئی تھی۔ الحمدللہ حضور نے اسے پسند کیا اور مجھ سے دریافت فرمانے لگے کہ اس پر کیا لاگت آئی ہے۔ میں نے انتہائی عاجزی سے جواب دیا کہ میں نے یہ جوتا بہت عقیدت سے تیار کیا ہے لہٰذا میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ ہاں! اگر حضور مجھے نوازنا ہی چاہیں تو اپنا استعمال شدہ جوتا مجھے بطور تبرک عنایت فرما دیں۔ حضور نے اپنا پرانا جوتا مجھے بھجوا دیا جو میری دکان پر پڑا رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی چنانچہ مجھ سے تبرک کا مطالبہ ہونے لگا۔ میں اس وقت چھوٹا تھا اور اس تبرک کی اہمیت پوری طرح نہ سمجھتا تھا چنانچہ میں نے یہ جوتا کاٹ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ آخر میں میرے پاس اس کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا باقی رہ گیا جو میں نے اپنے گھر کے اندر رضائیوں والی پیٹی میں چھپا کر رکھ دیا۔ ایک جلسے کے موقع پر میری بیوی نے مہمانوں کے لیے رضائیاں نکالیں تو یہ ٹکڑہ بھی باہر نکل آیا۔ ہماری ایک رشتہ دار خاتون نے اسے دیکھ لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چمڑے کا یہ ٹکڑا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے جوتے کا حصہ ہے چنانچہ اس نے واپس جانے سے پہلے اسے چوری کر لیا اور گھر پہنچ کر ہمیں خط لکھ دیا کہ یہ ٹکڑا اب اس کے پاس ہے لہٰذا ہمیں اس کی تلاش میں بلاوجہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

ان سے پوچھا جائے کہ کیا انہوں نے بعد میں بھی حضور کے لیے کوئی جوتا بنایا تو وہ جواب دیتے ہیں:

''جی نہیں۔ میری دانست میں یہ جوتا اتنا مضبوط تھا کہ حضور کو لمبا عرصہ نئے جوتے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔ ہاں! میں نے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد کے لیے دو بار اور حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد کے لیے کئی بار جوتے بنائے۔ مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے لیے بھی جوتے بنانے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔''

''حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے حوالے سے کوئی اور واقعہ؟''

''بہت پرانی بات ہے۔ ربوہ کے ایک حجام کے ہاتھوں کسی شخص کے پیٹ میں قینچی لگ گئی اور کافی گہرا زخم ہو گیا۔ ہم اسے اُٹھا کر ہسپتال لے گئے تو ڈاکٹر مرزا منور احمد نے بتایا کہ یہاں اس کا علاج ممکن نہیں اور مضروب کو فوری طور پر لائلپور لے جانے کا مشورہ دیا۔ اس کیفیت میں مریض کو وہاں لے جانا مشکل تھا۔ اُن دنوں ربوہ میں صرف حضرت مصلح موعود کے پاس گاڑی ہوا کرتی تھی۔ میں بھاگ کر قصرِ خلافت پہنچا اور کسی طرح

حضرت صاحب کو اطلاع پہنچائی کہ میں ان سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔ حضور کی شفقت دیکھئے، انہوں نے مجھے فوراً بلا لیا۔ میں نے پوری بات بتا کر ان سے گاڑی کی فرمائش کر ڈالی۔ میں حضور کے ڈرائیور مرزا مہتاب بیگ کو پہلے ہی ساتھ لے گیا تھا۔ حضور نے گاڑی لے جانے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ خدا کا شکر ہے ہم بروقت لائلپور پہنچ گئے اور مضروب کی جان بچ گئی۔''

نذیر اب رحمت بازار میں پرنس گالاس کے نام سے کام کر رہے ہیں اور بتاتے ہیں: ''ابتدا میں میری دکان کچے بازار میں تھی۔ وہاں سے نکل کر میں اس جگہ منتقل ہوا جہاں اب شکور بھائی کی دکان ہے۔ پھر میں صوفی کریم بخش زیروی کی دکانوں میں چلا گیا اور آخر میں ایک بار پھر میں گول بازار میں تقریباً اسی جگہ بیٹھتا رہا جہاں میں پہلے بیٹھا کرتا تھا۔''

''لیکن آپ نے یہ کام چھوڑ کیوں دیا؟'' میں نے ایک بار ان سے پوچھا۔

''حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی وفات کے بعد میرے دل میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ میں نے جس شخص کے لیے یہ کام سیکھا تھا وہی نہیں رہا تو اب اس کام کے کرنے کا کیا فائدہ۔ بس یہی سوچ کر میں نے یہ کام چھوڑ دیا اور اب آپ کے سامنے ہوں۔''

وہ زمانہ غربت اور سادگی کا تھا۔ جوتا پھٹ جاتا تو اُسی کی مرمت کرانے کو ترجیح دی جاتی۔ جوتے کے تلوے بدلوانے کا رواج بھی عام تھا اور یہ کام موچی کیا کرتے تھے جو گول بازار اور منڈی میں جا بجا بیٹھتے تھے۔ گول بازار میں اپنا ٹھیا لگانے والوں میں سے دو نام جو مجھے اتفاقاً یاد رہ گئے ہیں بشیر اور صدیق کے ہیں۔ یہ دونوں آپس میں سگے بھائی تھے۔ اپنا کام بہت صفائی سے کرتے اور گاہکوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بھی بہلائے رکھتے۔ صدیق نے بعد میں اپنا پیشہ بدل لیا اور اقصیٰ روڈ پر ریلوے پھاٹک کے قریب پھل کی دکان کر لی۔

ربوہ کی ٹاؤن پلاننگ کرتے وقت یہاں پر ایک صنعتی علاقے کی گنجائش بھی رکھی گئی اور اسے ''فیکٹری ایریا'' کا نام دیا گیا تھا۔ حضرت مصلح موعود کی خواہش تھی کہ احمدی صنعتکار یہاں پر اپنے کارخانے لگائیں تاکہ اہلِ ربوہ کے لیے روزگار کے مواقع بھی پیدا ہوں اور ملکی ترقی میں اپنا کردار بھی ادا کیا جا سکے۔ حضور کی اس خواہش کے مدنظر دوستوں نے یہاں پر کچھ کارخانے قائم بھی کیے تاہم مختلف وجوہ کی بنا پر اِنہیں نفع بخش بنیادوں پر نہ چلایا جا سکا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اِنہیں بند کرنا پڑا۔ ہاں! یہاں لگنے والی ایک بے نام سی آٹا چکی روزِ اول کی طرح آج بھی قائم ہے۔ اس کے مالک ٹھیکیدار بدر دین تھے اور منیجر ان کے صاحبزادے، عبدالستار۔ یہ وہی عبدالستار ہیں جن کے ایک بھائی، عبدالسلام مبشر نے بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور ڈپٹی الیکشن کمشنر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

میں جب اپنے ماموں زاد اسماعیل سے ملنے فیکٹری ایریا جاتا تو یہ چکی راستے میں پڑتی تھی۔ یوں میری ستار سے اچھی خاصی علیک سلیک ہو گئی اور میں بعض دفعہ محض دفع الوقتی کے لیے بھی ان کے پاس بیٹھنے لگا۔ یہ مشین ہمارے گھر سے بہت دور تھی لہٰذا ہم نے یہاں سے آٹا تو کبھی نہیں پسوایا البتہ جب ربوہ میں بورے والی

انگھیٹیاں متعارف ہوئی تو ہم اپنے گھر کی ضرورت کے لیے بورا انہیں سے خرید نے لگے۔

ستار ہو آج کل محلہ دارالصدر میں مقیم ہیں بتایا کرتے تھے کہ وہ ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد بے کار تھے چنانچہ ان کے والد کو ان کے روزگار کی فکر ہوئی۔ صدر انجمن احمدیہ چاہتی تھی کہ احمدی احباب فیکٹری ایریا میں صنعتیں قائم کریں لیکن اس حوالے سے کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے والد نے کوشش کر کے دو کنال پر مشتمل یہ قطعہ اپنے نام الاٹ کرالیا اور یہاں آٹا چکی لگادی۔ یہ ربوہ میں بجلی سے چلنے والی پہلی دو آٹا چکیوں میں سے ایک تھی جس نے ۱۹۵۴ء میں کام شروع کیا تھا۔ اس میں آرا مشین کا اضافہ بعد میں ہوا۔

ایک بار ستار نے مجھے بتایا ''جب میرے والد صاحب نے اس پلاٹ کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست دی تو اس کی قیمت تین ہزار روپیہ فی کنال تجویز کی گئی تھی لیکن جب معاملہ حضرت مصلح موعود کی منظوری کے لیے آپ کے پاس گیا تو آپ نے اس کی قیمت کم کر کے دو ہزار روپیہ فی کنال مقرر کر دی اور ہدایت جاری فرمادی کہ یہ قیمت اقساط میں وصول کی جائے۔ حضور کے اس فیصلے سے ہمیں بہت سہولت ہوگئی اور ہم pay as you earn کے اصول کے تحت اسی مشین کی کمائی میں سے زمین کی اقساط اتارتے رہے۔''

اس چکی کے لگنے کے بعد فیکٹری ایریا کے ایک اور صاحب، علی محمد جن کا ٹال تھا نے ایک آرا مشین اور آٹا چکی نصب کر لی۔ ان کے ایک بیٹے، احمد اللہ اس کام میں ان کی معاونت کرتے تھے۔ دوسرے بیٹے سعید اللہ جو سکول میں مجھ سے ایک یا شاید دو سال سینئر تھے فارغ اوقات میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ بعد میں وہ کسی سرکاری محکمہ میں ملازم ہو گئے اور ان سے میری آخری ملاقات آج سے کئی سال پہلے راولپنڈی میں ہوئی تھی۔

خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ علی محمد اور احمد اللہ کی وفات کے بعد اس چکی کا کیا ہوا۔

ربوہ کے اُن کارخانوں میں سے جن کا ذکر اس کتاب میں کسی اور حوالے سے موجود نہیں ہے سب سے پہلے کچھ ذکر ''پاکستان سلیٹ فیکٹری'' کا جو فیکٹری ایریا میں قائم ہوئی تھی۔ ہم کبھی اس کے پاس سے گذرتے تو پتھر کے بچے کھچے تراشیدہ ٹکڑے سڑک پر پڑے ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس فیکٹری کی بنی ہوئی سلیٹیں ہم نے بھی استعمال کی ہوں لیکن اسی زمانے میں پتھر کی سلیٹوں کی جگہ ٹین کی سلیٹیوں نے لے لی۔ ممکن ہے اس کارخانے کی ناکامی کی کچھ دیگر وجوہات بھی ہوں لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ اس شعبہ میں پتھر کی جگہ ٹین کے استعمال نے اس کارخانے کو بند ہونے پر مجبور کر دیا۔

محلہ دارالنصر میں عبدالغنی قریشی نامی ایک صاحب نے ''کوثر کا میج انڈسٹریز'' کے نام سے سکولوں اور کالجوں میں استعمال ہونے والے چونے کے چاک اور سلیٹ پنسل تیار کرنا شروع کی لیکن ان کا یہ تجربہ بھی ناکامی سے دوچار ہوا۔

کسی صاحب نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ''پاک ٹائیلٹ فیکٹری'' کے نام سے ربوہ میں صابن سازی کا کام شروع کیا تھا لیکن کچھ یاد نہیں کہ ان کا کاروبار کس حد تک کامیاب رہا۔

آپ نے ربوہ کے کچھ تجارت پیشہ احباب کا ذکر خیر تو سُنا، آیئے اب آپ کی ملاقات ربوہ کی بعض منفرد شخصیات سے کراتے ہیں۔

جگر کی آگ نے خود میری ہستی کو جلا ڈالا

میں چشمِ تصور سے اُس زمانے کے ربوہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے بعض ایسی شخصیات آج بھی اس کے گلی محلوں میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی انفرادیت کی حامل تھی۔ ان میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر حضرت مستری غلام قادر کا جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا اور جنہیں حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل رہ چکا تھا۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے دن بھر ربوہ میں گھومتے اور حضور کے اشعار بہ آوازِ بلند پڑھتے رہتے۔

ان کے ایک جواں سال بیٹے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں قادیان میں خواتین کی حفاظت کے دوران اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے الفاظ میں بہادری و جوانمردی کا یہ بے مثال واقعہ ''قرونِ اولیٰ کی قربانیوں کی یاد'' دلا دیتا ہے۔ حضور نے اپنے مضمون ''قادیان کی خونریز جنگ'' میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوتے تحریر فرمایا ہے کہ ''جب حملہ کرتے ہوئے پولیس اور سکھ شہر کے اندر گھس آئے اور شہر کے مغربی حصہ کے لوگوں کو مار پیٹ کر خالی کرانا چاہا اور وہ لوگ مشرقی حصہ میں منتقل ہو گئے تو معلوم ہوا کہ گلی کے پار ایک گھر میں چالیس عورتیں جمع تھیں وہ وہیں رہ گئی ہیں۔ بعض افسراُن کو نکلوانے کے لیے گلی کے سرے پر جو مکان تھا وہاں پہنچے اور ان کو نکالنے کے لیے دو نوجوانوں کو بھیجا۔ یہ نوجوان جس وقت گلی پار کرنے لگے تو سامنے کی چھتوں سے پولیس نے ان پر بے تحاشہ گولیاں چلانی شروع کیں اور وہ لوگ واپس گھر میں آنے پر مجبور ہو گئے۔ تب لکڑی کے تختے منگوا کر گلی کے مشرقی اور مغربی مکانوں کی دیواروں پر رکھ کر عورتوں کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ جو نوجوان اس کام کے لیے گئے ان میں ایک غلام محمد صاحب ولد مستری غلام قادر صاحب سیالکوٹ تھے اور دوسرے عبدالحق نام قادیان کے تھے جو احمدیت کی طرف مائل تو تھے مگر ابھی جماعت میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ یہ دونوں نوجوان برستی ہوئی گولیوں میں سے تختے پر سے کودتے ہوئے اس مکان میں چلے گئے جہاں چالیس عورتیں محصور تھیں۔ انہوں نے ایک ایک عورت کو کندھے پر اُٹھا کر تختے پر ڈالنا شروع کیا اور مشرقی مکان والوں نے انہیں کھینچ کھینچ کر اپنی طرف لانا شروع کیا۔ جب وہ اپنے خیال میں سب عورتوں کو نکال چکے اور خود واپس آ گئے تو معلوم ہوا کہ انتالیس عورتیں آئی ہیں اور ایک بڑھیا عورت جو گولیوں کے ڈر کے مارے ایک ...نے میں چھپی ہوئی تھی رہ گئی ہے۔ اب اردگرد کی چھتوں پر پولیس جتھوں کا ہجوم زیادہ ہو چکا تھا۔ گولیاں بارش کی طرح گر رہی تھیں اور بظاہر اس مکان میں واپس جانا ناممکن تھا مگر میاں غلام محمد صاحب نے کہا جس طرح بھی ہو میں واپس جاؤں گا اور اس عورت کو بچا کر لاؤں گا اور وہ برستی ہوئی گولیوں میں کود کر اس تختے

پر چڑھ گئے   جب وہ دوسرے مکان میں کود رہے تھے تو رائفل کی گولی ان کے پیٹ میں لگی اور وہ مکان کے اندر گر پڑے مگر اس حالت میں بھی اس بہادر نوجوان نے اپنی تکلیف کی پروانہ کی اور اس بڑھیا کو تلاش کر کے تختے پر چڑھانے کی کوشش کی لیکن شدید زخموں کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور دو تین کوششوں کے بعد نڈھال ہو کر گر گیا۔ اس پر میاں عبدالحق نے کہا کہ میں جا کر ان دونوں کو بچانے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ کود کر اس تختہ پر چڑھ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی ایک پولیس مین دوڑا ہوا آیا اور.........صرف چند فٹ کے فاصلہ پر سے اُن کی کمر میں گولی ماردی اور وہ وہیں فوت ہو گئے۔ جب حملہ آور بگل بجنے پر دوڑ گئے تو زخمی غلام محمد صاحب اور اس بڑھیا کو اس مکان سے نکالا گیا۔..... غلام محمد صاحب شدید زخمی تھے..........اور چند گھنٹوں میں فوت ہو گئے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے ایک دوست کو بلایا اور اسے یہ باتیں لکھوائیں کہ ’’مجھے (.....) احمدیت پر پکا یقین ہے۔ میں اپنے ایمان پر قائم جان دیتا ہوں۔ میں اپنے گھر سے اسی لیے نکلا تھا کہ میں (دین) کے لیے جان دوں گا۔ آپ لوگ گواہ رہیں کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور جس مقصد کے لیے جان دینے کے لیے آیا تھا میں نے اس مقصد کے لیے دے دی۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو میری ماں نے نصیحت کی تھی کہ بیٹا دیکھنا، پیٹھ نہ دکھانا۔ میری ماں سے کہہ دینا کہ تمہارے بیٹے نے تمہاری وصیت پوری کر دی اور پیٹھ نہیں دکھائی اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔‘‘

حضرت مستری غلام قادر نے اپنے اس بیٹے کی شہادت کا گہرا اثر قبول کیا اور وہ اپنی طرز کی زندگی گذارنے لگے۔ ان کی کمر بڑھاپے کے زیر اثر خمیدہ ہو چکی تھی اور وہ بیساکھیوں کے بغیر ایک قدم بھی چل نہ سکتے تھے لیکن اپنی اس معذوری کے باوجود لوگوں کو صبح کی نماز کے لیے جگایا کرتے۔ میرا خیال ہے کہ وہ انیس سو پچاس کی دہائی میں ربوہ آئے اور لمبا عرصہ اس کارِثواب میں مشغول رہے۔

ان کا لوگوں کو جگانے کا انداز بالکل منفرد تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے وہ اپنے گھر سے کس وقت نکلتے اور ربوہ کے کن کن محلوں اور گلیوں کا چکر لگاتے لیکن وہ فجر سے کچھ پہلے انجمن کوارٹرز کے سامنے سے گذرتے تھے۔ چلتے ہوئے وہ اُونچی آواز میں بعض شعر پڑھا کرتے تھے جن میں سے ایک شعر یہ تھا:

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سونا پڑے گا قبر کے سائے تلے

نماز کے لئے لوگوں کو جگانے کا یہ انداز بہت معنی خیز تھا۔ میرا خیال ہے اُن کی اس تحریک سے کئی لوگوں کو نماز کی طرف توجہ ہوتی تھی۔ دن کے وقت بھی گول بازار میں یا ربوہ کے کسی گلی محلے میں اپنی بیساکھیوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نظر آجاتے۔ جب بچے ازراہِ تفنن انہیں چھیڑنے کی کوشش کرتے تو وہ ایک لمحے کے لیے اپنی کمر سیدھی کرتے، اپنی دونوں بیساکھیاں زمین سے اٹھا کر ان کا رخ بندوق کی نالی کی طرح بچوں کی طرف پھیر دیتے اور منہ سے ایک ناقابل فہم لیکن ڈراؤنی سی آواز نکالتے جس سے بچے تو بچے، بڑے بھی تتر بتر ہو جاتے۔

ایک بار جب وہ صبح کے وقت جگانے کے لیے نہ آسکے تو اہل محلہ کو ان کی غیر حاضری محسوس ہوئی اور

جب یہ غیر حاضری کئی دن پر پھیل گئی تو کچھ لوگوں کو ان کے بارے میں تشویش ہوئی۔ فروری ۱۹۶۵ء میں ان کی اچانک وفات کا پتا چلا تو طبیعت بہت افسردہ ہوئی اور ان کی بلندیٔ درجات کے لئے دل سے دعا نکلی۔

ایک اور صاحب جن کا میں یہاں پر ذکر کرنا چاہتا ہوں عزیز راجیکی تھے جو حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کے فرزند تھے اور جن کی رہائش مولانا کے ساتھ ہی محلہ دارالرحمت وسطی میں تھی۔ شام کے وقت وہ غلہ منڈی کے نواح میں اپنے نیاز مندوں کے ساتھ چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ وہ ہمیشہ سفید براق کرتے، سفید دھوتی اور سفید رنگ کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں ملبوس ہوتے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں ان جیسا بے داغ لباس ربوہ میں کسی اور کا نہیں تھا۔ ان کا قد دراز، شانے چوڑے، اعضا متناسب اور جسم مضبوط تھا۔ سفید رنگ کا لباس ان کے جسم پر خوب پھبتا اور وہ پنجاب کے روایتی گھبرو جوانوں کی ایک چلتی پھرتی تصویر نظر آتے۔ ان کا گندمی رنگ، چوڑا چکلا سینہ، موٹی موٹی چمکدار آنکھیں، گہری بھنویں، سلیقے سے ترشی ہوئی ڈاڑھی، بڑی بڑی مونچھیں اور چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ انہیں ہزاروں لوگوں میں ممتاز کرتی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ اپنے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کا عقیق پہنا کرتے تھے۔

میں شام کے وقت جب کبھی غلہ منڈی سے گذرتا تو وہ وہیں کہیں چہل قدمی کرتے مل جاتے۔ ان کے نیاز مندوں میں سے سید محمود اللہ شاہ، سابق ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کے صاحبزادے، سید مشہور احمد المعروف چھودی؛ سلیم صدیقی (جو بعد میں کینیڈا چلے گئے اور اب وفات پا چکے ہیں)، اسد ملک (جو کسی ریٹائرڈ پولیس آفیسر کے صاحبزادے تھے)، ضیاپدّی؛ چوہدری علی محمد بی اے بی ٹی کے صاحبزادے، طارق پرویز اور بعض دوسرے نوجوان شامل تھے جو چہل قدمی کے دوران بالعموم ان کے ساتھ ہوتے۔ رات کے وقت ریلوے سٹیشن کے پاس سے گذر ہوتا تو عزیز راجیکی اور ان کے یہ دوست پلیٹ فارم کے کسی بنچ پر بیٹھے نظر آ جاتے۔

عزیز راجیکی تجرد کی زندگی گذار رہے تھے۔ مجھے چند ایک بار ان کی محفل میں بیٹھنے کا موقع بھی ملا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت زیرک، دانا اور ہمدرد انسان ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا اور وہ مذہب، فلسفہ، تاریخ، نفسیات اور فلکیات وغیرہ متنوع موضوعات پر بے تکان گفتگو کر سکتے تھے۔

ایک دو واقعات سے جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں مجھے اندازہ ہوا کہ عزیز راجیکی بلا کے مردم شناس تھے۔ اگر کوئی چھچھورا شخص ان کی محفل میں آ بیٹھتا تو وہ طوعاً و کرہاً کچھ دیر تک اسے برداشت کر لیتے لیکن اگر وہ اپنی موجودگی کو غیر ضروری طول دینا چاہتا تو وہ خود اس مجلس سے اُٹھ کر چلے جاتے۔

مولانا غلام رسول راجیکی نے اپنے گھر کے صحن میں ایک زمین دوز حجرہ تعمیر کر رکھا تھا جو ان کی وفات کے بعد عزیز راجیکی کے استعمال میں رہنے لگا تاہم وہ اپنے نیاز مندوں کو وہاں لے جانے سے بالعموم احتراز کرتے۔ طارق پرویز بتاتے ہیں کہ جب وہ پی اے ایف میں پائیلٹ آفیسر منتخب ہو کر ربوہ سے جانے والے تھے عزیز راجیکی نے اپنے گھر پر اس حجرے کے اندر ان کی دعوت کی جس میں ان کے باقی نیاز مندان بھی مدعو تھے۔ انہوں نے مذاقاً کہا کہ ان کے نیاز مندوں کو طارق پرویز کا شکر گذار ہونا چاہیے جن کی وجہ سے انہیں آج اس

حجرے میں بیٹھنے کا موقع مل رہا ہے جس پر کئی بیعت نے ہی مجھ سے شکوہ کیا۔ عزیز راجیکی نے اپنے حلقہ نیاز مندان میں نئے شامل ہونے والے ایک بیعت کو پرانے نیاز مندان پر ترجیح دے کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ موصوف ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے اور پھر فرمانے لگے: ذرا سوچو بھی تو سہی کہ ایسا آخر ہوا کیوں۔ تم سب سفید اینٹ ہو لیکن طارق پرویز سرخ اینٹ ہے اور اسی وجہ سے تم میں سب سے زیادہ عزت و تکریم اور پیار کا مستحق ہے۔"

عزیز راجیکی کی وفات کے لمبے عرصے بعد مجھے ان کے ایک بھتیجے کی معرفت یہ حجرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ حجرہ ربوہ کی شدید گرمی میں ایئر کنڈیشننگ کے بغیر آرام و سکون کا ماحول مہیا کرتا ہے۔ یوں بھی یہ حجرہ گھر کے شور شرابے سے الگ تھلگ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور گیان دھیان کے لیے ایک مثالی ماحول مہیا کر سکتا ہے چنانچہ مولانا کی وفات کے بعد یہ عزیز راجیکی کے استعمال میں رہا۔

ان کے متعلق بعض ایسی باتیں مشہور تھیں جو ربوہ کے ماحول سے میل نہ کھاتی تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے بیت مبارک کے کنوئیں میں چلہ معکوس کرنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ ویرانوں میں چلہ کشی کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ویرانہ دریائے چناب کے دونوں پاٹوں کے درمیان اونچے نیچے پہاڑی ٹیلوں کے پار کھجور کے بلند و بالا درختوں کے درمیان بظاہر ایک پُر اسراری جگہ تھی لیکن چنیوٹ برج کی تعمیر کے دوران ان ٹیلوں کو کاٹ کر تقریباً ہموار کر دینے سے یہ وادی کھل کر سامنے آ گئی ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ ابتدائے ربوہ میں عزیز راجیکی اپنے گھر سے کھانے پینے کی اشیاء ہمراہ لے جاتے اور کئی کئی دنوں تک اس جنگل میں مقیم رہ کر ریاضت و عبادت میں مگن رہتے۔ ان کے اسی بھتیجے کے مطابق "ایک بار ایک مشہور دربار کے سجادہ نشین نے جو عزیز راجیکی کے تعلق داروں میں سے تھے صوفی محمد علی نامی ایک شخص جنہیں بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہنا پڑا تھا ان کے پاس بھجوایا۔ عزیز راجیکی نے انہیں اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ صوفی محمد علی نے یہاں پر ذکر بالجہر کی محافل شروع کریں۔ رفتہ رفتہ بہت سے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے گئے تاہم انہوں نے عزیز راجیکی کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھا اور اس جگہ کو ان ہی سے منسوب کر کے اسے وادی عزیز شریف کا نام دے دیا۔"

عزیز راجیکی اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن میں جب بھی غلہ منڈی اور اس کے ملحقہ علاقے میں سے گذرتا ہوں تو مجھے ان کا سراپا یاد آ جاتا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی میرے سامنے آ جائیں گے اور میں ادب کے ساتھ انہیں سلام کروں گا تو وہ کہیں گے "کیا حال ہے، داؤد صاحب؟ کہاں رہتے ہیں آپ؟ بہت دنوں کے بعد آپ کو دیکھا ہے۔"

نعیم قدسی حضرت صاحبزادہ سید عبداللطیف ساکن کابل کے پوتے اور صاحبزادہ سید ابوالحسن قدسی کے سب سے بڑے فرزند ہیں۔ وہ سکول میں مجھ سے دو یا شاید تین سال سینئر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی فہیم احمد میرے ہم جماعت تھے اور نعیم قدسی اور ان کے والدِ محترم سے میری جان پہچان کا حوالہ بھی یہی تھا۔

میں نعیم قدسی کے ساتھ دوستی کا دعویٰ تو نہیں کرتا البتہ ہماری آپس میں خوب جان پہچان تھی اور ہم جب

بھی ملتے، بہت محبت کے ساتھ ملتے۔ غالباً سکول ہی کے دنوں میں انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیئے تھے اور یہ شعر الفضل اور بعض جماعتی جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ میں تو سی ایس ایس کرنے کے بعد ربوہ کے ماحول سے تقریباً کٹ کر رہ گیا۔ اب اہلِ ربوہ کے بارے میں میری معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ الفضل تھا یا اتفاقاً میرے علم میں آ جانے والی کوئی بات لیکن سچ پوچھیں تو مجھے نعیم قدسی کے بارے میں کبھی کوئی اطلاع نہ ملی۔ ایک دو سال پہلے معروف احمدی شاعر عبدالکریم قدسی سے گفتگو کے دوران اتفاقاً نعیم قدسی کا ذکر بھی آ گیا۔ انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ موصوف اب کہاں اور کس حال میں ہیں۔ تب فہیم نے بتایا کہ وہ پہلے اپنی والدہ کے پاس ربوہ میں مقیم تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد وہ اپنے ایک بھائی کے پاس کراچی میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے ہی بتایا کہ وہ کیفیتِ جذب میں ہیں اور ان کے ساتھ رابطہ ممکن نہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ پرویز پروازی نے اپنی کتاب ''احمدیہ کلچر اور بعض دوسرے مضامین'' میں ان کا ذکر کرتے ہوئے کیوں لکھا تھا کہ ''نعیم قدسی بھی نہایت اعلیٰ شعر کہنے والے تھے مگر ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر اپنی ہی آگ کا خس و خاشاک ہو گئے۔''

اگر نعیم قدسی نہایت اعلیٰ شعر کہنے والے تھے تو کیا ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا؟ تحقیق پر پتا چلا کہ اس کی اشاعت تو دُور کی بات ہے، بدقسمتی سے یہ کلام ابھی تک جمع بھی نہیں ہو پایا۔

سلیم شاہجہانپوری نے اپنی کتاب ''شعرائے احمدیت'' میں نعیم قدسی کے حالاتِ زندگی دیئے بغیر ''ربوہ'' ''زخمی یاد'' اور ''مورت'' کے عنوان سے ان کی تین نظمیں یا ان نظموں کے کچھ شعر شائع کئے ہیں۔ ناجی سبزواری نے اپنی کتاب ''روح القدس کے موسیقار'' میں ان تین نظموں کے علاوہ ''خدا!! اے خدا!! میری دنیا میں آ'' کے عنوان سے ایک اور نظم بھی شامل کی ہے۔ پرویز پروازی نے اپنی کتاب ''سورج کے ساتھ ساتھ'' میں نعیم قدسی کی نظم ''مُورت'' جو اوپر والے دونوں مجموعوں میں شامل ہے کے کچھ مصرعے درج کئے ہیں۔ لجنہ اماء اللہ کراچی کی طرف سے شائع شدہ ربوہ کے بارے میں احمدی شعراء کے منتخب کلام میں نعیم قدسی کی ربوہ والی نظم اپنی مکمل ترین شکل میں موجود ہے اگرچہ ماہنامہ مصباح (دسمبر ۱۹۶۰ء) سے نقل کرتے ہوئے اس میں کتابت کی کچھ غلطیاں دَر آئی ہیں۔

میں چاہتا تھا کہ نعیم قدسی کی شخصیت کے حوالے سے کچھ مواد اس کتاب میں یکجا کر دیا جائے لیکن جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو میں نے پرویز پروازی سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بھی کچھ باتیں بتائیں تاہم مشورہ دیا کہ مجھے ادریس شاہین سے رابطہ کرنا چاہیے جو ربوہ کے پرانے باسیوں میں سے ہیں۔ پرویز پروازی کے الفاظ میں ''وہ نعیم قدسی کے عاشق اور ان کے کلام کے حافظ ہیں لہٰذا جو معلومات ان سے مل سکتی ہیں کسی اور جگہ سے نہ مل پائیں گی۔'' پرویز پروازی نے ان کا فون نمبر فراہم کر دیا اور یوں ایک دن میرا ان سے رابطہ ہو گیا۔

ادریس شاہین چوہدری محمد اسلم کے صاحبزادے اور چوہدری شاہنواز آف شاہنواز لمیٹڈ کے بھتیجے ہیں۔ قیامِ ربوہ کے دوران محلہ دار الصدر غربی میں رہائش پذیر تھے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے لہٰذا نعیم قدسی سے میل جول بڑھا جو آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ شاہین بتاتے ہیں: ''نعیم قدسی نے میری ایک نوٹ

بک میں اپنی سات آٹھ نظمیں اپنے ہاتھ سے لکھ رکھی تھیں اور میں اس نوٹ بک کو اپنی جان سے بھی عزیز رکھتا تھا لیکن ربوہ سے کراچی، لاہور، چٹاگانگ اور وینکوور اور وینکوور میں ایک سے دوسرے مکان کی تبدیلی کے دوران یہ نوٹ بک ضائع ہوگئی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔''

''تو گویا آپ کی طرف سے جواب ہی سمجھوں'' میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔

''نہیں مجھے نعیم قدسی کی ایک آزاد نظم تقریباً پوری یاد ہے۔ شاید ایک آدھ بند بھول گیا ہوں۔ وہ میں آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ چاہیں تو نوٹ فرمالیں۔ مجھے یقین ہے یہ نظم کسی جگہ شائع نہیں ہوئی۔ اس کا عنوان ہے ''نوحۂ اِنسان'':

میں جو رویا تو مری آنکھوں سے بہتا ہوا سیلابِ غمِ اشک
آہن و سنگ کی دیواروں کو پانی میں بدل ڈالے گا
زندگی چیخ اُٹھے گی کہ میں شرمندہ احساں نہ ہوئی
وقت بھی لوٹ کے کچھ دیر مجھے دیکھے گا
چاندنی رات کا بہتا ہوا سیمیں مرمر
کتنی موہوم سی یاددوں کو کچو کے دے گا
پھول کے گال پر ڈھلکا ہوا شبنم کا غلاف
تاسحر رویا ہے کوئی یہ گواہی دے گا
میری آہیں، میرے نالے، میری چیخیں، میری آنسو
تیرے آفاق کی چوکھٹ سے بھی ٹکرا جائیں گے لیکن!
میرے معبود خدایا!
مجھے اک بات بتا
میری آہیں، میرے نالے، میری چیخیں، میرے آنسو
ترے انسان کو انسان بنا دیں گے تو روؤں
تنگ دل، تنگ نظر، آج کے انساں، یارب!
غیر کے درد کو احساس کے کانٹے پہ پرکھ کر
غیر کے درد کو سینے سے لگالیں گے تو روؤں
میرے معبود خدایا!
مجھے اک بات بتا۔

میں نے یہ نظم نوٹ کرنے کے بعد دوبارہ ادریس شاہین کو سنائی۔

''اس کے علاوہ بھی آپ کو نعیم قدسی کی کوئی نظم یاد ہے؟'' میں نے ایک لمحے کے توقف سے ان سے پوچھا۔

''ہاں'' اُدھر سے جواب آیا ''ایک غزل کے صرف چار شعر یاد ہیں۔ پیشِ خدمت کر رہا ہوں۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں!''

شاہین نے جو اشعار مجھے سنائے وہ کچھ اس طرح سے تھے:

جگر کی آگ نے خود میری ہستی کو جلا ڈالا
لگی ہے آگ اِس گھر کو اسی گھر کے چراغاں سے
نہ مرتا ہوں، نہ جیتا ہوں، ہوا ہوں بارہا ضائع
کبھی تیغِ زمانہ سے، کبھی ابروئے جاناں سے
مجھے اب ختم کر ڈالو مسیحاؤ مرے ورنہ
منگا دو مجھ کو میری زندگی جاناں کے داماں سے
فسانہ میری بربادی کا اہلِ دل اگر لکھو
تو لکھنا داستاں میری غمِ ہستی کے عنوان سے

''نعیم قدسی کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ؟'' میں نے فرمائش کی۔

''چھوٹی چھوٹی دو باتیں سنا دیتا ہوں۔ دیکھا جائے تو مختلف حوالوں سے دونوں باتیں بے حد اہم ہیں۔''

''فرمایئے!''

''نعیم قدسی سکول میں مجھ سے جونیئر تھا۔ اسے غالباً ۱۹۵۹ء میں میٹرک کا امتحان دینا چاہیے تھا لیکن وہ کمرہ امتحان کے باہر سے ہی واپس آ جاتا تھا۔ اگلے سال میں نے کلیم اللہ کرشن (ابن پروفیسر حبیب اللہ خان) اور سعید بٹ مرحوم کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا کہ اسے امتحان ضرور دلانا ہے۔ ہم اسے کمرہ امتحان میں بھجوا کر باہر بیٹھ جاتے۔ ہم نے اسے بتا رکھا تھا کہ اگر وہ وقت ختم ہونے سے پہلے باہر آ گیا تو ہم مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیں گے۔ اتفاق سے ہماری یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور نعیم قدسی نے میٹرک کر لیا۔''

''بہت خوب! اور دوسرا واقعہ؟''

''ایک بار کالج میں مشاعرا ہوا جس کی صدارت مولانا صلاح الدین احمد کر رہے تھے نعیم قدسی نے اپنی ایک نظم سنائی تو مولانا نے اس کی بہت تعریف کی اور بہ آوازِ بلند کہا کہ یہ بچہ وقت آنے پر ن م راشد کے پایہ کا شاعر ثابت ہوگا۔''

جب مجھے کسی نے بتایا کہ مبارک عابد تعلیم الاسلام کالج میں نعیم قدسی کے کلاس فیلو رہے ہیں تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ان سے نعیم قدسی کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کی درخواست کی جائے۔ ان کی طرف سے موصول ہونے والی یہ تحریر اس اُمید پر قارئین کی نذر کی جا رہی ہے کہ وہ نعیم قدسی کے بارے میں ممکن حد تک جان سکیں:

''کشادہ پیشانی، ذہین آنکھیں، دُبلا مگر متناسب بدن، سرخ و سفید رنگ، کم گو لیکن جب بولے تول

کے بولے، باتوں میں مٹھاس اور علمی چاشنی، لہجہ دھیما، ٹھہر ٹھہر کے، سوچ کر گفتگو کرنا اور ادبی محفل میں ہوتو دانش و ادب کے موتی بکھیرنا...... یہ سب اوصاف اُس وقت بھی نعیم قدسی میں تھے جب وہ ایک نوخیز نوجوان تھا۔ ''تھا'' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ تقریباً بیالیس سال قبل جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا تب وہ ایسا تھا جیسا کہ میں نے اس کا قلمی نقشہ پیش کیا ہے۔

وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا لیکن مطالعہ اور ادبی شغف میں ہم جو اس وقت سطحی باتوں اور روایتی علم تک محدود تھے وہ بہت بڑا تھا کیوں کہ وہ اس وقت بھی شیکسپیئر، چیخوف، موپساں، ٹالسٹائی، ایلیٹ، منٹو، بیدی، غالب اور میر کی باتیں کرتا تھا جب ہمیں ان کے نام بھی نہیں معلوم تھے۔

نعیم قدسی بے حد ذہین و فطین اور بہت مطالعہ کرنے والا تھا۔ وہ کتابوں، رسالوں، اخباروں میں غرق رہتا اور ان کے مطالعہ سے وہ کچھ اخذ کرتا جو اس کی عبقریت یا ذہانت کے معیار پر پورا اُترتا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنا حاصلِ مطالعہ، تجزیہ ہمارے سامنے پیش کرتا تھا۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا وہ عالمِ استغراق میں ہوتا۔ ہم اسے اس عالمِ استغراق سے باہر نکالنے کے لیے سگریٹ دیتے۔ عام سگریٹ کے دو تین کش اس کی گویائی بحال کر دیتے۔ وہ عالی نسب، عالی ظرف تھا۔ صاحبزادہ مرزا رفیع احمد اور نعیم قدسی کا ننھیال ایک ہی تھا۔ اس کے والد صاحبزادہ ابوالحسن قدسی صاحب فارسی دان، استادِ جامعہ، ادبی ذوق رکھنے والے اور صاحبِ علم انسان تھے۔ والدہ اردو تہذیب و زبان میں آنکھ کھولنے والی۔ گویا نعیم قدسی کی ''مادری'' زبان اردو تھی۔

وہ میٹرک کرنے کے کئی سال بعد انٹرمیڈیٹ میں میرے ساتھ کالج میں اردو کے پیریڈ میں ہم سبق تھا۔ ہم دونوں ہی انٹر میں اردو ایڈوانس بطور مضمون شیخ محبوب عالم خالد اور ڈاکٹر پرویز پروازی سے پڑھتے تھے۔ اس کی ذہنی اُپج اُس نصاب سے کہیں بلند تھی جو اس وقت پڑھایا جا رہا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد جیسے ادیب نے نعیم قدسی کو داد و تحسین کے پھول عطا کئے لیکن افسوس کہ نعیم قدسی کو اس کی حساسیت نگل گئی۔ اس کے احساس نے اسے دیوانگی پہنا دی اور وہ ہمارے سامنے نوجوانی میں ہی سوچ کے دائروں میں بہت دُور نکل گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی''

یہ تو تھیں ادریس شاہین اور مبارک عابد کی نعیم قدسی کے بارے میں باتیں!

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے نعیم قدسی کی نظم ''نذرِ ربوہ'' مطبوعہ ماہنامہ مصباح (دسمبر ۱۹۶۰ء) کے یہ اشعار بہت پسند ہیں:

ٹھیک ہے وقت کے تیزی سے گذرتے لمحات
عہدِ رفتہ کا ہر اک نقش مٹا دیتے ہیں
پھر بھی لیکن مرے گذرے ہوئے سجدوں کے نقوش
تیرے چہرے کے تقدس کو ضیا دیتے ہیں

میں نے راہوں پہ تیری گیت جو گائے تھے کبھی
آج بھی وہ انہی راہوں پہ صدا دیتے ہیں

ربوہ کا ایک جیتا جاگتا کردار مولوی بشیر احمد قادیانی کی صورت میں نظر آتا تھا۔لوگ انہیں ''بشیر قادیانی'' کے مختصر نام سے یاد کرتے تھے۔ان کے والد امام الدین علیانہ یوں تو سیّد والا ضلع شیخوپورہ کے رہنے والے تھے لیکن تقسیم سے پہلے قادیان چلے گئے تھے۔قیامِ پاکستان کے بعد احمد نگر میں آباد ہوئے اور یہیں وفات پائی۔

بشیر قادیانی جامعہ احمدیہ میں پڑھتے رہے تھے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی تعلیم ہی مکمل نہ کر پائے یا انہیں بعد میں کسی وجہ سے وقف سے فارغ کر دیا گیا۔

جب سے میں نے انہیں دیکھنا شروع کیا ان کا مستقل ذریعہ معاش کوئی نہ تھا۔وہ تجرّد کی زندگی گذار رہے تھے اور دارالضیافت ان کا مستقل ٹھکانہ تھا۔

وہ ہمیشہ شلوار قمیص اور سر پر ڈھیلی ڈھالی پگڑی پہنتے تھے۔انہوں نے عین جوانی میں ہی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور چال میں ایک خاص تیزی تھی۔وہ ہاتھ میں چھڑی پکڑے اس تیزی سے چل رہے ہوتے گویا ''لام'' پر جا رہے ہوں۔

بشیر قادیانی بہت مخلص احمدی تھے اور مجلس خدام الاحمدیہ کے انتہائی جوشیلے کارکن۔وہ کچھ عرصہ محلّہ دارالصدر شرقی کے زعیم بھی رہے۔انہوں نے اپنے دور میں مجلس میں زندگی کی نئی روح پھونک دی لیکن وہ خدام کو اپنے طرزِ عمل سے بسا اوقات ناراض کر بیٹھتے جس کی وجہ سے بعض اوقات بدمزگی ہو جاتی اور خدام میں بددلی پھیلتی تاہم وہ کسی نہ کسی طرح صورتِ حال کو سنبھالا دینے میں کامیاب ہو جاتے۔

میرے ایک کلاس فیلو منظور صادق جو اُن دنوں خود بھی دارالضیافت میں رہائش پذیر تھے روزانہ شیو کے عادی تھے۔بشیر قادیانی کو ان کی یہ عادت ایک آنکھ نہ بھاتی اور وہ انہیں ڈاڑھی کی اہمیت کا احساس دلاتے رہتے تاہم وہ اپنے بچپنے میں بشیر قادیانی کے اس مشورے کو خاطر میں نہ لاتے۔ایک بار جب وہ شیو کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ ان کی سیفٹی غائب ہے۔جب تلاش بسیار کے باوجود سیفٹی نہ مل سکی تو وہ شیو کے بغیر ہی کالج چلے گئے۔ انہوں نے واپسی پر ایک اور سیفٹی خریدی لیکن بشیر قادیانی نے جلد ہی اُسے بھی غائب کر دیا۔بشیر موصوف نے یہی عمل دو چار بار دہرایا تو منظور نے تنگ آ کر شیو بنانا چھوڑ دی۔وہ دن گیا اور آج کا دن آیا، منظور نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے اور وہ اس کا کچھ کریڈٹ بشیر قادیانی کو بھی دیتے ہیں۔

مدتِ دراز سے بشیر قادیانی کو نہیں دیکھا تھا۔میں چند سال پہلے ایک بار شام کے دھندلکے میں فضل عمر ہسپتال کے گیٹ پر کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک بزرگ نظر آئے۔مجھے یوں لگا کہ بشیر قادیانی ہیں۔ میں ان کے پاس گیا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ان کی چال ڈھال سے کمزوری عیاں تھی۔معلوم ہوا بیمار رہتے ہیں۔وہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد وفات پا گئے۔بہشتی مقبرہ میں ان کی قبر پر نصب کتبے سے پتا چلتا ہے کہ وہ پیدائشی احمدی تھے اور انہوں نے ۷۷ سال کی عمر میں ۱۰ نومبر ۲۰۰۴ کو وفات پائی۔

ڈاکٹر مرزا منور احمد کے ایک بیٹے مرزا مظہر احمد جو ''سپیشل چائلڈ'' تھے ہمیشہ اپنی ذات میں مگن رہتے اور سردی گرمی کی پروا کئے بغیر گھر سے باہر ادھر اُدھر بیٹھ کر وقت گذار لیتے۔ ان کے ہاتھ میں بالعموم ایک تھیلا ہوتا جس میں اخبارات رکھی ہوتیں۔ وہ ایک مخلص احمدی تھے اور انہوں نے وصیت کر رکھی تھی چنانچہ وہ ۱۲ مارچ ۲۰۱۰ء کو ۶۴ سال کی عمر میں وفات پا کر بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات پر بشیر الدین کمال کے قلم سے الفضل میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کی بعض خوبیوں علی الخصوص نماز میں باقاعدگی اور صلہ رحمی کا تفصیلی ذکر ہے۔

ایک اور صاحب نواب دین تھے جو اپنے کندھے پر وہنگی لٹکا کر سردیوں میں ظہر کے بعد اور گرمیوں میں عصر کے قریب کوارٹرز کے سامنے سے گذرتے تھے۔ یہ بزرگ محلہ دارالصدر غربی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے پاس بچوں کے کھانے پینے کا کچھ سامان یعنی چاول سے بنی ہوئی پھلیاں، دال چنے، بیسن کی سویاں، مونگ پھلی اور مچھیاں ہوتیں۔ وہ دن کے وقت گرلز ہائی سکول کے گیٹ پر ٹھیا لگاتے اور شام کے وقت ربوہ کی گلیوں، محلوں کا چکر لگاتے۔ وہ اپنی مخصوص لے میں ''دال، سیویاں، پھلیاں ....'' کی صدا لگاتے تو محلے کے بچوں کو ان کی آمد کی اطلاع ہو جاتی اور وہ اپنی جمع پونجی مٹھی میں دبا کر ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ یوں تو ربوہ کے اکثر مکینوں کے مالی حالات مخدوش تھے لیکن موصوف کی حالت دیکھ کر مجھ جیسے شخص کے دل میں بھی جذبہ ترحّم بیدار ہو جاتا۔ میں نے ان کو ہمیشہ ایک ہی کیفیت میں پایا اور ان کے کاروبار میں کوئی ترقی نہ دیکھی لیکن سنتے ہیں خدا تعالیٰ نے ان کے بچوں پر بہت فضل کیا ہے اور وہ ماشاء اللہ خوش حال زندگی گذار رہے ہیں۔

مرزا اعظم بیگ عرف عجو حضرت مسیح موعود کے مورثِ اعلیٰ مرزا ہادی بیگ کے فرزند مرزا محمد الدین کی نسل میں سے مرزا محمد بیگ کے صاحبزادے تھے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے اپنی کتاب سیرت المہدی کے حصہ اوّل میں حضرت مسیح موعود کے شجرۂ نسب میں مرزا اعظم بیگ کے نام کے نیچے یہ نوٹ دے رکھا ہے: ''یہ شاخ قادیان میں موجود ہے مگر حصہ سے محروم الارث ہے۔''

قیام پاکستان کے بعد مرزا اعظم بیگ ربوہ آ گئے۔ وہ کثیر العیال تھے اور ان کے مالی وسائل انتہائی محدود لہٰذا ان کی زندگی سخت تنگی میں گزری۔ ابتدائے ربوہ میں ان کی رہائش ریذیڈنٹ مجسٹریٹ ربوہ کی موجودہ سرکاری رہائش گاہ کے پیچھے ایک کچی آبادی میں تھی۔ یاد رہے اس کچی آبادی سے میری مراد وہ کچے مکانات ہیں جو لوگوں نے متعلقہ ادارہ جات کی منظوری کے بغیر وہاں تعمیر کر لیے تھے لیکن بعد میں ان میں سے اکثر گرا دیئے گئے۔

ان کا ایک بیٹا مرزا آصف بیگ سکول میں مجھ سے ایک سال سینئر تھا یعنی جب میں تعلیم الاسلام پرائمری سکول کی دوسری جماعت میں داخل ہوا آصف بیگ نے تیسری جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ کلاسیں الگ ہونے کے باوجود ہماری آپس میں جان پہچان تھی لیکن جلد ہی اس نے سکول چھوڑ دیا۔ بعد میں وہ کئی سال تک ربوہ میں نظر آتا رہا لیکن پھر تلاشِ معاش میں غالباً باہر چلا گیا۔

۱۹۶۱ء میں مرزا اعظم بیگ ایک بیٹا جس کا نام مرزا افضل بیگ تھا اپنے گھر کے قریب ریلوے پھاٹک

سے چند گز کے فاصلے پر ریل گاڑی کے نیچے آ کر وفات پا گیا۔ بظاہر تو یہ ایک حادثہ تھا لیکن عوام الناس کے نزدیک یہ خودکشی تھی۔ میرا خیال ہے اس حادثے نے مرزا اعظم بیگ کی کمرِ ہمت توڑ ڈالی اور ان کے دماغ پر اثر ہو گیا اور وہ گیروی رنگ کے کپڑے زیبِ تن کر کے ربوہ کی سڑکوں بالخصوص شارع صدر اور گول بازار میں سردی گرمی کی پروا کئے بغیر گھنٹوں گھومتے رہتے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے رہتے تھے لیکن بعض اوقات اونچی آواز میں خودکلامی شروع کر دیتے۔ مجھے کبھی قریب سے ان کی بات سُننے کا موقع ملا نہ میں نے کبھی یہ باتیں سمجھنے کی کوشش کی۔ اہل ربوہ ان کی باتیں دیوانے کی بڑ سمجھ کر کنّی کتراجاتے تھے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا ذریعہ معاش کیا تھا تاہم میرا خیال ہے کہ وہ محنت مزدوری سے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ سنتے ہیں آغازِ ربوہ میں لکڑی کا کام کرتے تھے لیکن میں نے ایک زمانے میں انہیں اس درّے کے پاس جو ربوہ سے چنیوٹ جاتے ہوئے محلّہ دارالیمن اور محلّہ باب الابواب کے آغاز میں واقع تھا خود روڑی کوٹتے دیکھا ہے۔

واقفانِ حال بتاتے ہیں کہ مرزا اعظم بیگ پچھلے کچھ سالوں سے مفقود الخبر ہیں۔

ربوہ کے ایک اور نوجوان ابوالظفر محمود (جو قادیان کے مشہور ناشر، مولوی ابوالفضل محمود کے صاحبزادے تھے) بھی ذہنی طور پر معذور تھے اور جنون کی کیفیت میں ربوہ کی گلیوں میں پھرتے رہتے تھے۔ کبھی خاموش ہوتے اور کبھی خوش الحانی سے حضرت مسیح موعود کے اشعار پڑھنے لگتے۔ ایک شعر جو میں نے خود انہیں ترنّم سے پڑھتے سنا ہے اور اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے یہ ہے:

اک نہ اک دن پیش ہو گا تو خدا کے سامنے
چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے

میں نے انہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا البتہ اگر کوئی خود ان کی کچھ خدمت کرنا چاہتا تو وہ اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہ کرتے۔ بعد میں جب ان کی بیماری نے شدت اختیار کر لی تو ان کے گھر سے نکلنے پر قدغن لگا دی گئی اور وہ اسی کیفیت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ایک اور صاحب جو فضل عمر ہسپتال کے سٹور کیپر، قادر بخش کے ساتھ اپنی قرابت داری کی وجہ سے اکثر انجمن کوارٹرز اور ان کے نواح میں نظر آتے تھے محمد بخش المعروف بخشی تھے۔ ان کا تعلق ڈیرا غازی خان کی بستی سہرانی سے تھا اور وہ حضرت مسیح موعود کے رفیق حضرت عظیم احمد بلوچ کے نواسے تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ بخشی کی بینائی پیدائشی طور پر بہت کمزور تھی۔ کسی ڈاکٹر نے علاج کے نام پر ان کی آنکھ بچپن ہی میں نکال دی اور دوسری آنکھ جس سے وہ بہت معمولی دیکھ سکتے تھے بس کے ایک حادثہ کی نظر ہو گئی۔ انہوں نے بچپن میں قرآن پاک کا کچھ حصہ حفظ کیا تھا اور کراچی میں نابیناؤں کے کسی سکول سے کرسیاں بُننے کا فن بھی سیکھا تھا لیکن طبیعت سیلانی تھی لہٰذا ایک جگہ جم کر بیٹھ نہ سکے۔ احمدی خاندان سے تعلق تھا اور خود بھی جماعت کے ساتھ بہت اخلاص رکھتے تھے لیکن غالباً بینائی سے محرومی، کسی مستقل روزگار کی عدم دستیابی اور سیماب صِفتی کی وجہ سے

ایک جگہ ٹِک کر نہ بیٹھتے اور کسی جماعتی دارالذکر یا کسی وضعدار، مہمان نواز احمدی کے گھر کو اپنا ٹھکانہ بنا لیتے اور جیسے تیسے وقت گزار لیتے۔

ان کی بیٹی رفیعہ نے جو آج کل طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں کام کر رہی ہیں مجھے بتایا: سیاحت کے لیے نکلتے تو پیچھے کا کچھ یاد نہ رہتا۔ ایک بار میرے دادا کے پیٹ میں شدید درد اُٹھا تو وہ یہ کہہ کر ربوہ کے لیے روانہ ہو گئے کہ میں مرزا منور احمد سے دوا لاتا ہوں۔ وہ آٹھ دن ربوہ میں ہی رُکے رہے اور جب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں دوا کی ایک بوتل اور چند گولیاں تھیں تاہم اس سارے واقعے کا المناک پہلو یہ تھا کہ دادا ان کی آمد سے کئی روز پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔

بخشی کی اصل پہچان ان کے اشعار یا وہ بے وزن اور باوزن کلمات تھے جو وہ کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ بولنا شروع کرتے تو کہیں نہ رُکتے۔ ان کے بعض اشعار و کلمات ذوقِ سلیم پر گراں بھی گزرتے لیکن بعض لوگ انہیں بہت شوق کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ''خبریں'' بھی سنایا کرتے تھے۔ وہ ریڈیو پاکستان کے نیوز ریڈرز کی اس خوبی سے نقل اُتارتے کہ بعض دفعہ حقیقت کا گمان ہوتا لیکن غور کرنے پر پتا چلتا کہ ان کی ساری خبریں خودساختہ ہیں اور ان کا مقصد وہاں جمع ہو جانے والے دوستوں کی تفریحِ طبع کے علاوہ کچھ نہیں۔

مدتِ دراز سے بخشی کو ربوہ میں نہیں دیکھا گیا۔ رفیعہ کا بیان ہے: چودہ سال ہو گئے وہ گھر نہیں لوٹے۔ سیلانی الطّبع تو وہ تھے ہی، شاید کسی ایسے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔ اگر رفیعہ کا یہ اندازہ ٹھیک ہے تو آیئے ہم سب مل کر ان کی مغفرت اور بلندی درجات کے لیے دعا مانگیں لیکن کتنا لطف آئے اگر وہ ایک روز اچانک کہیں سے نمودار ہو کر اپنے گھر کی کنڈی کھٹکھٹا دیں۔

میں بابا غلام محمد کے ماضی سے تو واقف نہیں نہ یہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے اور بیت مہدی کی خدمت قبول کرنے سے پہلے وہ کیا کرتے تھے مگر میں نے انہیں ہمیشہ سبز چوغہ پہنے ہوئے دیکھا جو ربوہ کے ماحول میں ایک غیر معمولی بات نظر آتی تھی۔ وہ بیت الذکر کو صاف ستھرا رکھتے اور اسے مقررہ اوقات میں نمازیوں کے لیے کھولتے۔ میری ان سے ذاتی طور پر بھی گفتگو نہیں ہوئی لیکن چوہدری عبدالعزیز سابق مہتمم مقامی، مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ نے مجھے بتایا: ''ایک بار میں نے بابا غلام محمد سے یوں ہی کہہ دیا کہ جنتیوں کا لباس سبز رنگ کا ہوگا۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے سبز رنگ کا چوغہ پہننا شروع کر دیا اور پھر اسے کبھی نہیں اُتارا۔ وہ نیک اور عبادت گزار شخص تھے لیکن میرے ربوہ سے لاہور منتقل ہونے کے بعد وہ بعض شکایات کی بنا پر زیرِ عتاب بھی رہے۔''

اب بابا غلام محمد اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن میں انہیں سبز چوغے میں ملبوس اب بھی گول بازار میں چلتا پھرتا دیکھ سکتا ہوں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے!

ایک اور شخصیت جن کا ذکر اس حوالے سے ضروری سمجھتا ہوں رحمت اللہ نامی ایک بزرگ تھے جو عوام الناس میں ''ثنا اللہ'' کے نام سے معروف تھے۔ وہ ٹھیکیدار عبداللطیف بھٹہ اونر کے بڑے بھائی تھے۔ ٹھیکیدار عبداللطیف کے بیٹے عبدالکریم مقیم مالمو، سویڈن راوی ہیں کہ ثنا اللہ اپنے قیامِ فیصل آباد کے دوران ایک بار

[illegible] تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی لکھی ہوئی تھی لیکن اس حادثہ نے انہیں [illegible] معذور [illegible] کمانے سے بھی جاتے رہے۔

[illegible] کا قد چھوٹا تھا اور جب میں نے ان کو دیکھنا شروع کیا ان کے سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ ان [illegible] بینائی بھی متاثر تھی۔ اگرچہ ان کی رہائش اپنے بھائی کے پاس تھی اور وہی ان کی ضروریات کی کفالت بھی کرتے تھے لیکن کسی بھی طرف سے مالی معاونت کی پیشکش کو رد نہ کرتے۔ میں نے انہیں گول بازار اور دفاتر صدر انجمن احمدیہ کے صحن میں سے گذرتے ہوئے بے شمار دفعہ دیکھا لیکن کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ وہ کہاں جاتے اور کس کے پاس بیٹھتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں وفات پائی تھی۔

اور اب کچھ ذکر ''یوسف گنگنا'' کا جو محلّہ دارالنصر میں رہتے تھے۔ ان کی تعلیم بالکل واجبی سی تھی اور ذہنی صلاحیتیں بھی عام انسانوں سے قدرے کم تھیں۔ ناک میں بولتے تھے لہٰذا یار لوگوں نے ان کا نام یوسف گنگنا رکھ چھوڑا تھا۔ انہوں نے کچھ عرصہ تحریک جدید انجمن احمدیہ میں بطور مددگار کارکن کام کیا لیکن پھر کسی وجہ سے فارغ کر دیئے گئے۔ وہ آڈیٹر کے دفتر میں بھی رہے جہاں میرے ماموں زاد، مرزا محمد اسماعیل بھی کام کرتے تھے۔ یوں مجھے یوسف گنگنا کو قدرے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے یاد ہے اپنے دفتری ساتھیوں کے ساتھ ان کی نوک جھونک دن بھر جاری رہتی۔ وہ بعد میں مختلف چائے خانوں پر کام کرنے لگے اور موقع ملتا تو سفیدی اور پینٹ کا کام بھی کر لیتے تھے۔ ایک بار میں نے ان سے اپنے مکان میں سفیدی کرانے کا معاہدہ کر لیا لیکن جب انہوں نے دیواروں پر اوپر سے نیچے کی بجائے نیچے سے اوپر کی طرف سفیدی کرنا شروع کی تو مجھے اپنی عقل اور ان کی مہارت پر شبہ ہونے لگا۔ میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ ان کا یہ طریق درست نہیں ہے لیکن انہوں نے مجھے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا: ''کام کو میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں یا آپ؟'' ان کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا لہٰذا میں نے خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں یہاں ان احمدی احباب کے علاوہ چنیوٹ کے دو غیر از جماعت احباب کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ ان میں سے ایک بھکاری تھا جو صبح نو بجے کے لگ بھگ فیصل آباد کی طرف سے آنے والی پینجر ٹرین کے ذریعہ چنیوٹ سے ربوہ آتا تھا۔ اس لمبے تڑنگے غیر از جماعت فقیر کے ہاتھ میں اکتارا ہوتا جسے وہ ہر دروازے پر کھڑا ہو کر بجایا کرتا تھا۔ وہ اکتارے کے ساتھ بالعموم نعتیہ اشعار یا اسلامی تاریخ پر مبنی کوئی قصہ گا کر سناتا تھا۔ مجھے اس کا گایا ہوا یہ شعر ہمیشہ یاد رہا:

جے لکھ واری عطر گلابوں دھویئے نت زباناں
نام اوہناں دے لائق ناہیں، کیہ قلمے دا کاناں

مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شعر میاں محمد بخش کے عارفانہ کلام ''سیف الملوک'' میں شامل ہے اور ''نعت سیدالمرسلین رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم'' کے ابتدائی تین اشعار میں ہے جو یہ ہیں:

واہ کریم امت دا والی، مہر شفاعت کردا
جبرائیل جیہے جس دے چاکر، نبیاں دا سر کردا

پ یتیم ، یتیماں تائیں ہتھ سرے تے دھرد

بے نکھ واری عطر گلابوں دھوئیے نت زباناں

نام اوہناں دے لائق ناہیں کیہ قلمے دا کاناں

اس زمانے میں مانگنے والے بالعموم منھی بھر آٹا اور اگر کھانے کا وقت ہوتا تو ایک روٹی لے کر خوش ہو جایا کرتے تھے لیکن چونکہ وہ ہمارے کوارٹر کے سامنے سے دن کے دس ساڑھے دس بجے گذرتا لہٰذا ہم اسے ایک پلیٹ آٹے کی بھر کر دے دیتے۔ جب بھی گھر کا کوئی فرد یہ پلیٹ اس کی طرف بڑھاتا تو وہ دروازے کے قریب آ کر اپنے جھولنے کا منہ کھول دیتا اور آٹا ڈلوانے کے بعد دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو جاتا۔ وہ ربوہ کے باقی محلوں کا چکر لگانے کے بعد عصر کے لگ بھگ فیصل آباد جانے والی گاڑی سے واپس چنیوٹ چلا جاتا۔ اس نے کئی سال تک اپنا یہ معمول جاری رکھا جس کے بعد یہ سلسلہ اچانک منقطع ہو گیا۔

چنیوٹ کے ایک بھکاری کا ذکر ہو رہا ہے تو کیوں نہ اسی شہر کے ایک گُل فروش کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

اُن دنوں ربوہ چنیوٹ روڈ پر چنیوٹ شہر سے ذرا پہلے سڑک کے بائیں ہاتھ تقریباً اُس جگہ جہاں آج کل ایک پٹرول پمپ ہے ''مسعود نرسری'' ہوا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے آپا کی شادی کے موقع پر استقبالِ بارات کے لئے ہار اسی نرسری سے خریدے تھے۔

نرسری کا مالک شام کے وقت ربوہ میں موتیا کے ہار فروخت کیا کرتا تھا۔ یقیناً اس کی توجہ کا مرکز بازار اور دوسری پُر ہجوم جگہیں ہوتی ہوں گی لیکن وہ گلیوں محلوں کا چکر بھی لگایا کرتا تھا اور اپنی مخصوص لے میں ''موتیا ہار!'' کی صدا لگاتا جاتا۔ اُس نے یہ ہار ایک چھڑی پر لٹکائے ہوتے تھے اور وہ جدھر جاتا یہی صدا لگاتا۔ اس زمانے میں ایک ہار کی قیمت ایک آنہ تھی۔

یہ تو تھیں ربوہ کے بعض ایسے افراد کی یادیں جو بعض منفرد خصوصیات کے حامل تھے۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، پچھلے کسی باب میں ذکر ہو چکا ہے کہ میں ایم اے کا دوبارہ امتحان دے چکا تھا اور امید کر رہا تھا کہ میرا ڈویژن والا مسئلہ بطریقِ احسن حل ہو جائے گا اور میں بفضلہ تعالیٰ یہ امتحان اچھے نمبروں پر پاس کر لوں گا۔

میرے گھر کے حالات اس بات کے متحمل نہ تھے کہ میں زیادہ عرصہ کسی ملازمت کے بغیر گذار سکوں لہٰذا اس زمانے کے ہر پڑھے لکھے بے روزگار نوجوان کی طرح اب میری بھی یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد مجھے مناسب ملازمت مل جائے لیکن میں اپنے حالات پر غور کرتا تو چاروں طرف اندھیرا نظر آتا اگرچہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوا تھا اور مجھے امی کی دعائیں بھی حاصل تھیں لیکن ایک کمزور انسان ہونے کے ناطے میں سوچتا رہتا تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی تو کیسے۔

دل کو راحت کا خوگر کروں کس لیے، رنج و غم سے بھلا میں ڈروں کس لیے؟

اگست ۱۹۶۸ء کا مہینہ اس لحاظ سے بہت اُمید افزا ثابت ہوا کہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ، اسلامیہ کالج لائلپور، اسلامیہ کالج ساہیوال، اسلامیہ کالج فار بوائز لاہور کینٹ اور لاہور کے ایک دو دیگر پرائیویٹ کالجوں کی طرف سے پولیٹکل سائنس کے لیکچرر کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ میں نے ان تمام جگہوں پر درخواست بھجوا دی لیکن یہ نہ سوچا کہ بی اے تک میری تمام تعلیمی اسناد پر اس بات کا ذکر موجود ہے کہ میں ربوہ میں پڑھتا رہا ہوں اور میرے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ سے عیاں ہے کہ میری مستقل رہائش بھی اسی شہر کی ہے۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے سو میں بہت دنوں تک ان کالجوں کی طرف سے کسی مثبت ردِعمل کا منتظر رہا لیکن ان میں سے کسی نے درخواست کی رسید تک سے مطلع نہ کیا۔

ستمبر ۱۹۶۸ء میں سٹیٹ بنک آف پاکستان نے کلاس وَن آفیسرز کی براہِ راست بھرتی کے لیے ایک سکیم کا اعلان کیا جب کہ اگلے ماہ میونسپل ڈگری کالج بھلوال نے پولیٹیکل سائنس کے لیکچرر کی اسامی مشتہر کی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دونوں جگہوں پر درخواست بھجوا دی مگر مجھے فوری طور پر سٹیٹ بنک کی طرف سے جواب موصول ہوا نہ بھلوال کالج سے کوئی اطلاع ملی۔

اُن ہی دنوں تعلیم الاسلام انٹرمیڈیٹ کالج گھٹیالیاں ضلع سیالکوٹ کے منیجر کی طرف سے روزنامہ الفضل میں کالج کے لیے عارضی لیکچررز کی بعض اسامیاں مشتہر ہوئیں۔ یہ اسامیاں ان لوگوں کے لیے مختص کی گئی تھیں ''جنھوں نے ایم اے پاس کیا ہو اور وہ کسی مقابلہ کے امتحان کی تیاری کر رہے ہوں۔'' ایسے امیدواران کے لیے صدر انجمن احمدیہ کے منظور شدہ سکیل کے برعکس صرف دو صد روپیہ ماہانہ الاؤنس مشتہر کیا گیا تھا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ گھٹیالیاں ایک دُور افتادہ گاؤں ہے جہاں زندگی کی عام آسائشیں بھی میسر نہیں ہیں لیکن میرے پاس اس بارے میں حتمی معلومات نہ تھیں۔ عبدالسلام اختر جو ایک لمبا عرصہ اس کالج کے پرنسپل رہنے کے بعد ان دنوں ربوہ واپس آ چکے تھے اور ہمارے گھر کے قریب ہی مقیم تھے اس سلسلے میں صحیح مشورہ دے سکتے تھے لیکن وہ اِدھر اُدھر تھے لہٰذا ان سے بات نہ ہو پائی۔

ان دنوں محمد عثمان صدیقی اس کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ پرانے واقفینِ زندگی میں سے تھے جنھیں چھ سال سے زیادہ عرصہ اٹلی اور سیرالیون میں دعوت اِلی اللہ کا موقع مل چکا تھا۔ مولوی فاضل ہونے کے ساتھ انہوں نے اسلامیات اور عربی میں ایم اے بھی کر رکھا تھا چنانچہ وطن واپسی پر انہیں بعض دیگر جماعتی خدمات کے علاوہ جامعہ نصرت میں تدریس کا موقع بھی ملا۔ اس کالج کے قیام پر ان کا تقرر لیکچرر کے طور پر ہوا تاہم عبدالسلام اختر

کی ربوہ واپسی کے بعد انہیں وہاں پرنسپل بنا دیا گیا۔
میں عثمان صدیقی سے ذاتی طور پر متعارف تو نہ تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ ان کے والد بزرگوار،
حکیم محمد صدیق ابا جی کے چچازاد ہیں چنانچہ میں نے ایک خط ان کی خدمت میں تحریر کیا جس میں گھٹیالیاں میں
ملازمت کے حوالے سے ان سے مشورہ طلب کیا گیا تھا۔ موصوف بہت بھلے آدمی ثابت ہوئے۔ انہوں نے میرا خط
ملتے ہی مجھے جواب لکھ بھیجا۔ وہ پچھلے کچھ سالوں سے گھٹیالیاں میں تھے اور وہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔
انہیں انتظامیہ اور طلبہ کے رویّے سے جو شکایات تھیں سو تھیں، وہ اُن سہولتوں کے فقدان پر بھی بجا طور پر شاکی تھے جو
ربوہ میں ہرکس وناکس کو حاصل تھیں۔ ملاحظہ فرمائیے اُن کی طرف سے موصول ہونے والے جواب کا یہ حصہ:

''رہائش کے لیے ایک ہوسٹل ہے مگر اسی ہوسٹل کے کمروں میں ساتھ ہی ساتھ دیہاتی، اکھڑ، بے تہذیب طلبہ رہائش رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر کوئی پروفیسر اس ہوسٹل میں کلیجہ تھام کر رہائش رکھے تو تبھی گذارہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی اپنا بندوبست رہائش کا کرنا چاہے تو اس میں بھی بہت سی قباحتیں ہیں۔ گاؤں گھٹیالیاں میں تو رہائش ایسی ہے جیسے تپتے صحرا میں کسی کو ڈال دیا جائے۔ اکیلے آدمی کے کھانے کی صورت یہ ہے کہ یا تو سٹوو پر کمرے کے اندر خود ہی دال، دلیا، چاول وغیرہ تیار کر لے مگر یہ طریقہ بڑے دکھ والا ہے۔ دوسری صورت باعزت یہ ہے کہ اپنا علیحدہ باورچی رکھا جائے۔ اسے کھانے کے علاوہ تنخواہ بھی دینا پڑتی ہے۔ غرضیکہ یہ سارے اخراجات ملا کر ساٹھ ستر روپے تک ہو جاتے ہیں۔ اگر دو استاد مل جائیں تو اس میں یہ نقص ہے کہ مزاجوں اور طبائع کے اختلاف کے باعث گذارہ مشکل ہو جاتا ہے۔ دیگر اخراجات صابن، تیل، کپڑے دھلائی، حجامت، لکڑی وغیرہ سب اس کے علاوہ ہیں اور شہروں کے بھاؤ ہر شے ملتی ہے۔

طلبہ دونوں کلاسوں میں ستر پچھتر تک ہو جاتے ہیں۔ طلبہ اس قدر شوخ، ناشائستہ اور غیر تربیت یافتہ قسم کے ہوتے ہیں کہ الامان۔ یہ ایک مستقل سردردی ہوتی ہے۔ نہایت ڈھیٹ اور سخت بے وفا قسم کے یعنی اکثریت کا یہی حال ہے۔ عام طور پر چار پیریڈ تو لازمی ہیں۔ بعض حالات میں پانچ بھی لینے پڑتے ہیں۔ آج کل سکول کے حصہ میں پڑھانے کی زحمت سے خلاصی ہے ورنہ شروع میں ادھر بھی گھنٹیاں لگا دی جاتی تھیں۔ ایم اے پاس آٹھویں، نہم، دہم کو پڑھانے جاتے تھے۔ اس سکول کا ساتھ ہونا بھی درحقیقت کالج کے لیے ایک امتحان ہے۔ اساتذہ کے درمیان پچھلے سارے سال شدید قسم کا پارٹی بازی رہی ہے اور کالج کمیٹی اس بات کا ذرہ بھر علاج نہیں کر سکی۔ ایک فتنہ پرور انگریزی کا استاد استعفیٰ دے کر چلا گیا ہے لہٰذا آج کل قدرے آرام ہے۔ بعض استاد نہایت منافق اور پرلے درجے کے خود غرض ہیں۔

ربوہ سے یہاں پہنچنے کا رستہ: ربوہ تا لاہور اور لاہور سے نارووال جانے والی کسی ٹرین پر بیٹھ کر مہتہ سوجا کے سٹیشن پر اتر کر وہاں سے قلعہ صوبہ سنگھ کے رستہ گھٹیالیاں جانے والے تانگہ پر بیٹھ جائیں۔ تین گھنٹے کے تکلیف دہ اور انتہائی دکھ والے سفر کے بعد گھٹیالیاں پہنچا جا سکتا ہے۔

گھٹیالیاں ایک عام گاؤں ہے۔ نہایت گندا اور غیر ترقی یافتہ۔ بعض دفعہ اس جگہ پیاز تک نہیں ملتا۔ آج

کل سارا سٹاف احمدی ہے لیکن بعض افراد غیر احمدیوں سے گئے گزرے ہیں۔

یہ جگہ کسی کو سزا دینے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ کسی کی خدمات کی کوئی قدر اور حوصلہ افزائی نہیں۔ بس ہر انگلی اعتراض کرنے کے لیے اٹھتی ہے اور ہر مونہہ عیب چینی کے لیے کھلا ہے۔''

منظور شاکر جو تعلیم الاسلام ہائی سکول میں میرے استاد رہے تھے اور بعد میں ایم اے کر کے گھٹیالیاں میں لیکچرر کے طور پر کام کر رہے تھے کے ساتھ بھی میرے مراسم تھے چنانچہ میں نے عثمان صدیقی کے علاوہ ایک خط اُنہیں بھی لکھ دیا۔ انہوں نے کرم فرمائی کی اور فوراً میرے خط کا جواب بھیج دیا۔ وہ بھی گھٹیالیاں کے حالات سے مطمئن نہ تھے اور انہیں وہاں پر ہزار طرح کی دِقتیں تھیں چنانچہ ان کا مشورہ تھا کہ مجھے گھٹیالیاں میں ملازمت کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ انہوں نے لکھا تھا:

''آج کل فرسٹ ایئر کا داخلہ شروع ہے۔ ابھی تک فرسٹ ایئر میں کل بیس طالب علم داخل ہوئے ہیں اور سیکنڈ ایئر میں پینتیس۔ طلبہ نہایت غیر مہذب اور واہیات قسم کے ہیں۔ ہم لوگ ان سے بہت ہی تنگ ہیں۔ ہر لیکچرر کو چار پیریڈ لینا پڑتے ہیں۔ سکول سیکشن میں کوئی پیریڈ نہیں دیا جاتا۔

یہاں سب سے بڑی دِقت جس کا ہمیں ہر وقت سامنا رہتا ہے کنوینس کا مسئلہ ہے۔ یہاں سے ہر سٹیشن بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسٹیشن تک پہنچنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ بارہ میل سائیکل چلا کر ستیاناس ہو جاتا ہے۔ یہاں سے لاہور ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں جو تنخواہ آپ کو ملے گی ان میں سے آپ ایک پائی بھی نہیں بچا سکیں گے اور دقتیں اس کے علاوہ ہوں گے۔ سب سے بڑی پریشانی یہاں یہ ہے کہ یہاں اساتذہ کی قدر نہیں۔ میں خود سرگودھا میں تلاشِ روزگار کر رہا ہوں اس لیے میرا ذاتی مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنی عمر کو گھٹیالیاں آ کر تباہ نہ کریں جہاں کی بادشاہت سے ربوہ کی گدا بہتر ہے۔ میں یہ بالکل حقیقت بتا رہا ہوں۔ اس کالج کا مستقبل بہت ہی تاریک ہے۔''

مجھے عثمان صدیقی اور منظور شاکر کے خطوط درخواست جمع کرانے کی آخری تاریخ سے پہلے مل گئے تھے لیکن تذبذب میں تھا کہ یہاں درخواست بھیجوں یا نہ بھیجوں۔

جب میں خود کوئی فیصلہ نہ کر پایا تو ایک روز میں نے پورا ماجرا امی کے سامنے بیان کر دیا۔ میں پچھلے کئی ماہ سے بے روزگار تھا اور میں نے جہاں بھی درخواست بھجوائی مجھے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں خود کو اس جگہ درخواست بھجوانے پر آمادہ نہ پاتا تھا۔ مجھے دیہی زندگی سے ایک انجانا سا خوف تھا اور میں ربوہ کا ''عیش و آرام'' تیاگ کر اس ''جنگل'' میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ امی نے یہ ساری رام کہانی بہت تحمل کے ساتھ سنی۔ وہ میری اس بات سے متفق تھیں کہ گھٹیالیاں ایک پسماندہ علاقہ ہے لیکن وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھیں کہ مجھ ایسے باہمت آدمی کو اس آسانی کے ساتھ ہار مان لینی چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ گھر میں فارغ بیٹھے رہنے سے یہ بات بدرجہا بہتر ہے کہ انسان مشکلات کے مقابلے کا ارادہ کر لے کہ یہی مردانگی کا تقاضا بھی ہے۔

انہوں نے مجھے عبدالسلام اختر کی مثال دی جنہوں نے ضعیف العمری کے باوجود کئی سال اس ماحول

میں گذارے تھے۔ انہوں نے عثمان صدیقی کی مثال بھی میرے سامنے رکھی جو سالہا سال سے گھٹیالیاں میں کام کر رہے تھے۔ امی کا کہنا تھا کہ چونکہ میں عمر کے اعتبار سے اپنے اندر سختیاں جھیلنے کی زیادہ ہمت رکھتا ہوں لہٰذا مجھے یہ موقع ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہئے اور اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوا تو میں نہ صرف اس ملازمت کے لیے منتخب ہو جاؤں گا بلکہ وہ خود ہی اس راہ میں حائل مشکلات بھی دور فرما دے گا۔

امی کی باتوں نے مجھے بہت ڈھارس دی اور ناگاہ میری توجہ اس آیت قرآنی کی طرف چلی گئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو بظاہر اچھی نظر آنے والی چیز بسا اوقات اس کے لیے بہت بری ثابت ہوسکتی ہے جب کہ بہت بری محسوس ہونے والی چیز بالآخر اس کے لیے بہت اچھی ثابت ہوسکتی ہے۔ بس یہی سوچ کر میں نے یہاں درخواست بھیجنے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔

حُسنِ اتفاق دیکھئے، اگلے ہی روز اچانک میری ملاقات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ سے ہوگئی جو اپنے گھر سے گول بازار کی طرف آ رہے تھے جب کہ میں اپنے کسی کام سے محلّہ دارالصدر غربی کی طرف جا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو علم تھا کہ میں روزگار کی تلاش میں ہوں چنانچہ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا یہ اشتہار میری نظر سے گذرا ہے اور کیا میں نے یہاں اپنی درخواست بھجوائی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اشتہار دیکھ چکا ہوں اور ایک آدھ دن میں درخواست بھی بھیج دوں گا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ یہ کالج جماعتی انتظام کے تحت چل رہا ہے اور زیادہ تر احمدی امیدواروں کی طرف سے ہی درخواستیں آنے کی توقع ہے لہٰذا یہاں مقابلہ کم ہوگا اور میرے عمدہ تعلیمی کیریئر کے پیشِ نظر میرے لیکچرر منتخب ہو جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کالج کے منیجر، میجر عبداللہ مہار اُن کے جاننے والوں میں سے ہیں لہٰذا اگر میں چاہوں تو وہ مجھے ان سے فوری طور پر مِلوا بھی سکتے ہیں۔

عبداللہ مہار اُن دنوں فیروز پور روڈ لاہور پر واقع ماڈرن موٹرز کے منیجر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کا تعلق موضع چندر کے منگولے سے تھا اور وہ کالج کی انتظامی کمیٹی کے سربراہ تھے۔ جب مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے تعلق کا پتا چلا تو مجھے اپنی منزل قریب نظر آنے لگی اور یوں میں اور ڈاکٹر صاحب اگلے ہی دن ربوہ سے اُس ریل کار کے ذریعہ جو سرگودھا سے لاہور جاتی تھی اور عرفِ عام میں ''ڈبہ'' کہلاتی تھی لاہور جا کر عبداللہ مہار سے ملاقات کے لیے ان کے دفتر جا پہنچے۔

موصوف بہت محبت کے ساتھ پیش آئے۔ انہوں نے میری درخواست جس میں میرے خاندان کی جماعتی خدمات کے علاوہ اس بات کا خصوصی طور پر ذکر تھا کہ میں نے بی اے تک ہر امتحان ہائی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے اور یہ کہ پنجاب یونیورسٹی نے بی اے کے امتحان میں میری کارکردگی کی بنا پر مجھے دو طلائی تمغوں کا مستحق قرار دیا ہے اپنے پاس رکھ لی اور اطمینان دلایا کہ مجھے انٹرویو کے لیے ضرور طلب کیا جائے گا لیکن مجھے ملازمت پر لیے جانے کا فیصلہ امیدواروں کے تقابلی جائزے کے بعد ہی ہو سکے گا اور وہ اس سلسلہ میں کوئی یقین دہانی کرانے سے معذور ہیں۔

ایک دو روز بعد مجھے ان کی طرف سے انٹرویو کال موصول ہوگئی جس کے مطابق مجھے ستائیس اکتوبر

۱۹۶۸ء کو گھٹیالیاں میں انٹرویو بورڈ کے سامنے پیش ہونا تھا۔

گھٹیالیاں جانے کا وقت قریب آیا تو معلوم ہوا کہ میرے ایک تایا زاد، کریم قمر نے اسی کالج میں انگریزی کی لیکچر رشپ کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ کریم قمر میرے ہم عمر ہونے کے علاوہ میرے کلاس فیلو بھی تھے۔ انہوں نے ایم اے انگریزی کا امتحان دے رکھا تھا اور میری طرح ملازمت کے متلاشی تھے چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم گھٹیالیاں تک کا سفر اکٹھے کریں گے۔ ادھر اُدھر سے جمع کردہ معلومات کی بنا پر طے یہ پایا کہ ہم انٹرویو سے ایک دن پہلے صبح ہی صبح اپنے سفر کا آغاز کر دیں گے تاکہ شام تک گھٹیالیاں پہنچ جائیں اور اگلی صبح تازہ دم ہو کر انٹرویو بورڈ کا سامنا کر سکیں۔

پروگرام کے مطابق ہم صبح ربوہ سے ''ڈبے'' پر لاہور کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں سے نارووال جانے والی ٹرین پر سوار ہو کر دوپہر تک مہتہ سوجا ریلوے سٹیشن پر جا اُترے۔ یہ سفر تو طے ہو ہی گیا لیکن مہتہ سوجا سے گھٹیالیاں تک کا سفر جو محض چند کلو میٹرز پر مشتمل تھا مشکل ترین ثابت ہوا۔ ہم نے وہاں سے تانگہ لیا۔ جلد ہی یہ تانگہ کسی نہر کی کچی پٹری پر رینگنے لگا۔ پٹری بہت خراب حالت میں تھی اور تانگے کا ایک ایک جوڑ ہلا ہوا تھا۔ ہم راستے میں آنے والی ہر نئی آبادی کو گھٹیالیاں سمجھ کر خوش ہو جاتے لیکن جب کوچوان بتاتا کہ ابھی ہماری منزل دُور ہے تو ہماری امیدوں پر اوس پڑ جاتی۔ بالآخر جب قلعہ صوبا سنگھ پہنچے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم گھٹیالیاں پہنچ گئے ہیں لیکن کوچوان ہنوز دلّی دُور اَست کی رَٹ لگائے ہوئے تھا۔ آخر کار ہم مغرب سے کچھ پہلے گھٹیالیاں پہنچ گئے مگر اس حال میں کہ ہمارے جسم کا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔

عثمان صدیقی ہمارے لیے چشم بہ راہ تھے۔ انہوں نے بہت خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں احترام کے ساتھ اندر بٹھایا۔ کچھ ہی دیر میں چائے آ گئی جو اُس زمانے کے عام رواج کے مطابق مٹی کے روغنی پیالوں میں پیش کی گئی تھی۔ ساتھ میں ہم دونوں کے لیے ایک ایک رَس تھا۔ دن بھر کے سفر نے ہمیں شدید تھکا دیا تھا اور بھوک نے ہماری مَت مار رکھی تھی لہٰذا یہ چائے ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ عثمان صدیقی نے جلد ہی یہ بتا کر ہمیں مزید مطمئن کر دیا کہ وہ رات کا کھانا سرِ شام کھانے کے عادی ہیں لہٰذا ہم ذرا ''ایزی'' ہو جائیں تو کھانا چُن دیا جائے گا۔

''کھانا چُننے'' کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم ان کی اس بات سے کسی پُرتعیش ڈائننگ روم کے اندر کسی بڑے سے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر چودہ کورسز والے کسی ڈنر سے لطف اندوز ہونے کا سوچنے لگے تھے کیوں کہ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ کالج حدود میں واقع یہ ''پرنسپل ہاؤس'' صدر انجمن احمدیہ کے جونیئر کوارٹرز سے کسی طور پر بہتر نہیں ہے۔ بہر حال کچھ ہی دیر میں بیٹھک میں پڑی اسی میز پر کھانا چُن دیا گیا۔ خدا تعالےٰ عثمان صدیقی کو جزائے خیر دے، انہوں نے اپنے حالات کے مطابق اس کھانے میں مقدور بھر تکلف سے کام لیا تھا۔

کھانا کھا چکے تو عثمان صدیقی نے بتایا کہ وہ ہمیں اپنے ہاں ٹھہرانے میں خوشی محسوس کرتے لیکن ان کا گھر اس قدر مختصر ہے کہ اس میں دو مہمانوں کے لیے گنجائش پیدا کرنا دوبھر ہے۔ ان کی یہ بات سن کر ہمیں پریشانی ہوئی

لیکن انہوں نے فوراً ہمیں یہ بتا کر مطمئن کر دیا کہ ہماری رہائش کا انتظام ہوسٹل میں کیا گیا ہے جو وہاں سے دُور نہیں۔ ہوسٹل کے لفظ سے ہمیں یہ گمان پیدا ہوا کہ ہم کسی ایسی عمارت میں یہ رات گذاریں گے جہاں طلبہ کی خوب چہل پہل ہوگی اور ناشتے اور کھانے کی کوئی دِقت نہیں ہوگی چنانچہ ہم عثمان صدیقی کی معیّت میں خوشی خوشی ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم نے محسوس کیا کہ عثمان صدیقی نے گھر سے باہر نکلتے وقت خنکی سے بچاؤ کے لیے ایک ''لوئی'' یعنی گرم چادر جسم پر لپیٹ لی ہے، سر مفلر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا ہے اور ایک ہاتھ میں ہاکی اور دوسرے میں لالٹین پکڑ لی ہے۔ ہم ان کے ساتھ چلتے جا رہے تھے اور وہ ہمیں ان احتیاطی تدابیر کی حکمت سے آگاہ کرتے جا رہے تھے: ''میں رات کے وقت ہاکی تو اس لیے ہاتھ میں رکھتا ہوں کہ علاقے میں آوارہ کتوں کی بہتات ہے بلکہ کبھی کبھار اِکا دُکا سؤر سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ ہاتھ میں ہاکی ہو تو اطمینان سا رہتا ہے کہ ان جانوروں کے حملہ سے خود کو بچایا جا سکتا ہے۔''

''اور لالٹین؟'' میں نے پوچھا۔

''دیہاتی علاقہ ہے۔ کھیت قریب ہیں۔ کسی وقت اچانک کوئی سانپ سنپولیا نکل سکتا ہے۔ لالٹین ہاتھ میں ہو تو انسان اسی طرح کی مصیبت سے بچ سکتا ہے۔''

کچھ ہی دیر میں دردنصیبوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایک ویران سی عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ معلوم ہوا یہی وہ ہوسٹل ہے جہاں ہمیں آج کی رات قیام کرنا ہے۔

اس آسیب زدہ عمارت کے ایک وسیع و عریض کمرے میں دو چارپائیاں رکھی تھیں۔ عثمان صدیقی نے ہمیں ایک لالٹین اور ایک ہاکی فراہم کر دی۔ ہم نے لالٹین کمرے کے ایک کونے میں لٹکا دی اور ہاکی سرہانے رکھ لی تاکہ کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے میں آسانی رہے۔ ہمیں ڈر تھا کہ اس ویرانے میں نیند نہیں آئے گی اور ہم رات بھر کبابِ سیخ کی طرح پہلو بدلتے رہیں گے لیکن بھلا ہو ربوہ سے گھٹیالیاں کے اس سفر سے ہونے والی تھکن کا کہ بستر پر دراز ہوتے ہی خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئے۔

انٹرویو کے لیے اگلی صبح دس بجے کا وقت مقرر تھا۔ ہم کالج پہنچے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ مہار اپنی فوکس ویگن پر وہاں پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے یہ گاڑی پرنسپل آفس کے سامنے کھڑی کر رکھی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی بارہا اس گاڑی پر یہاں آ چکے ہوں گے اور علاقہ کے لوگوں کے لیے یہ چیز بالکل نئی نہ ہوگی لیکن اس کے باوجود اس دُور افتادہ دیہاتی علاقہ کے لوگوں کے لیے یہ گاڑی کسی اعجوبے سے کم نہ تھی۔ گاڑی کے گرد بچے اور بڑے کثیر تعداد میں جمع تھے۔ کوئی گاڑی کو چھو کر دیکھ رہا تھا تو کوئی شیشے میں سے اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے گھٹیالیاں اور اس کے نواح میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہوگا جس نے اس گاڑی کو غیر معمولی اہمیت نہ دی ہو اور اس میں سفر کرنے والوں کی قسمت پر رشک نہ کیا ہو۔

میں اور کریم قمر کچھ ایسے جہاندیدہ تو نہ تھے لیکن خدا کے فضل سے ہماری زندگی ایک ایسے ماحول میں گذری تھی جہاں ریلوے سٹیشن موجود تھا اور سڑک کے راستے اِدھر اُدھر آنا جانا مشکل نہ تھا، جہاں بجلی تھی، ٹیلیفون

اور ڈاکخانہ تھا اور جہاں ہماری پرانی دوستیاں اور محلے داریاں تھیں۔ آمدورفت کے بعض جدید اور پُر آسائش ذرائع ہماری دسترس سے باہر ضرور تھے لیکن یہ ساری چیزیں ہماری دیکھی بھالی تھیں لہٰذا یہاں پہنچنے کے بعد ہمارا پہلا تاثر بددلی کا تھا لیکن ہم جوں جوں اپنے حالات پر غور کرتے اسی نتیجے پر پہنچتے کہ اگر ہم اس انٹرویو میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں یہ ملازمت بہرحال قبول کر لینی چاہیئے۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہمارے ایک اور کلاس فیلو انٹرویو کے لیے آ پہنچے۔ یہ فہیم تھے جو ایم اے انگریزی کا امتحان دینے کے بعد اُن دنوں بے کار تھے۔

اب دیکھنا صرف یہ تھا کہ ہم تینوں میں سے کون اس کالج میں ملازمت کے لیے منتخب ہوتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں انٹرویوز شروع ہو گئے۔ انٹرویو بورڈ عبداللہ مہار اور عثمان صدیقی پر مشتمل تھا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو اس بورڈ میں عثمان صدیقی کی حیثیت ثانوی تھی اور امیدواروں کا انتخاب عبداللہ مہار ہی نے کرنا تھا۔ چونکہ عارضی لیکچرر کے لیے اور کوئی امیدوار موجود نہ تھا اور میرا تعلیمی ریکارڈ خاصا عمدہ تھا لہٰذا اس انٹرویو میں چند رسمی سی باتیں ہوئیں اور مجھے بتا دیا گیا کہ اگر مجھے حتمی طور پر منتخب کر لیا گیا تو مجھے سوکس کے علاوہ انگریزی کے بھی بعض پیریڈز لینا ہوں گے اور لائبریرین کی اضافی ڈیوٹی بھی ادا کرنا ہوگی۔

اگرچہ انگریزی کبھی بھی میرا اختیاری مضمون نہ رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اس اضافی ڈیوٹی کی ادائی میں کوئی دشواری نظر نہیں آ رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں اس کالج کے طلبہ کو احسن طریقے سے انگریزی پڑھا سکوں گا۔ لائبریرین کی اضافی ڈیوٹی سے بھی مجھے کوئی خاص پریشانی نہ تھی۔ دراصل مجھے بتا دیا گیا تھا کہ کالج کی لائبریری انتہائی مختصر ہے اور طلبہ کی اس کے ساتھ دلچسپی بہت محدود ہے۔ یوں بھی میں اپنی بے روزگاری سے تنگ آیا ہوا تھا لہٰذا بورڈ کی ہر شرط قبول کرتا گیا۔

انٹرویوز مکمل ہو گئے تو ہمیں انتظار کرنے کو کہا گیا جس دوران مجھے عارضی لیکچرر اور کریم قمر کو انگریزی کے لیکچرر کے طور پر منتخب کر لیا گیا اور اسی وقت تقرر کے خطوط بھی جاری کر دیئے گئے۔ ہمیں ۱۰ نومبر سے پہلے پہلے اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ہم نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہم فوری طور پر ربوہ واپس چلے جائیں اور دس نومبر کا انتظار کرنے کی بجائے یکم نومبر ہی کو کالج جوائن کر لیں تاہم فوری مسئلہ یہ تھا کہ ہم ربوہ واپس کیسے جائیں گے۔ اُس مسبب الاسباب نے یہ مسئلہ بھی بہت احسن طریقے سے حل کر دیا۔

عبداللہ مہار نے پیشکش کی کہ اگر ہم چاہیں تو شاہدرہ تک ان کے ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ ہم ربوہ سے گھٹیالیاں گرتے پڑتے پہنچے تھے اس لیے یہ پیشکش قبول کرنے میں ہم نے ذرہ بھر تامل نہ کیا۔ ہم کسی نہر کی پٹڑی پر سفر کرتے ہوئے شاہدرہ پہنچے جس کے بعد انہوں نے ہمیں ایک ایسی جگہ اُتار دیا جہاں سے سرگودھا کی بس بہ آسانی مل سکتی تھی۔ زندگی کے ان سفروں میں جن میں مجھے اپنی توقع سے بڑھ کر آرام ملا، گھٹیالیاں سے شاہدرہ تک کا یہ سفر بھی شامل ہے۔

ایک روز پہلے جہاں سوچ سے گھٹیالیوں کے سفر نے ہمیں جس قدر آزردہ کیا تھا اس کے بعد گھٹیالیوں سے شاہدرہ کا یہ سفر ہمیں بہت آرام دہ محسوس ہوا اور ہم کسی دقت کے بغیر واپس ربوہ پہنچ گئے۔

ہم نے تین دن ربوہ میں گذارے۔ ہم اپنی جگہ خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری بیکاری کا زمانہ ختم کر دیا ہے اور ہم برسرِ روزگار ہوگئے ہیں۔ اُمّی کو اگرچہ میری پریشانیوں کا اندازہ تھا لیکن وہ بھی خوش تھیں کہ اس ملازمت کے نتیجے میں گھریلو مسائل پر غلبہ پانے میں کچھ مدد مل جائے گی۔ مجھے یاد ہے میں نے انٹرویو میں اپنی کامیابی کا ذکر عبدالسلام اختر سے خاص طور پر کیا۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دی اگرچہ ساتھ ساتھ محتاط رہنے کا اور بہتر ملازمت کے حصول کے لیے کوشش جاری رکھنے کا مشورہ بھی دیا۔

اس دوران ہم نے گھٹیالیاں میں قیام کے لیے ضروری تیاری کر لی تھی۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمیں وہاں پر کھانا خود تیار کرنا ہوگا لہٰذا ہم اپنی کتابوں اور بستر کے علاوہ ضروری برتن بھی ہمراہ لے گئے تھے۔ اس بار ہم نے ایک نئے راستے سے سفر کا فیصلہ کیا جو گوجرانوالہ سے پسرور اور وہاں سے کلاس والا ہوتے ہوئے گھٹیالیاں جاتا تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ ہم نے ربوہ سے گوجرانوالہ کا سفر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس پر کیا تھا اور وہاں سے کلاس والا پرائیویٹ بس سے پہنچے تھے۔

کلاس والا اُن دنوں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں سے گھٹیالیاں پختہ سڑک نہیں جاتی تھی۔ ہاں ! تانگے چلتے تھے۔ ان تانگوں کی کیفیت اُن تانگوں سے بالکل مختلف نہ تھی جو مہتہ سُو جا گھٹیالیاں روڈ پر چلتے تھے لیکن یہ سفر تو ہم نے کرنا ہی تھا چنانچہ ہم فجر کی ندا کے ساتھ ربوہ سے چل کر سورج غروب ہونے کے بعد گھٹیالیاں پہنچ گئے۔ عثمان صدیقی کی ہدایت پر ہم نے ہوسٹل کے اُسی کمرے میں ڈیرا ڈال لیا جہاں ہم پہلے ایک رات گذار چکے تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے اگلا ایک سال یہیں گذارنا ہے۔

نہ ضبطِ سخن ہے، نہ تابِ بیاں ہے یہ گھٹیالیاں ہے، یہ گھٹیالیاں ہے

ہوسٹل کی عمارت ایک ہی سائز کے پانچ کمروں پر مشتمل تھی۔ اس عمارت میں تین کمرے ایک قطار میں تھے جب کہ دو کمرے کونوں پر مخالف رُخ میں تعمیر کیے گئے تھے۔ پانچوں کمروں کے دروازے ایک برآمدے میں کھلتے تھے۔ کونے کا ایک کمرہ چوہدری محمد اشرف کے استعمال میں تھا جو کالج میں معاشیات پڑھاتے تھے جب کہ سامنے والے کمرے میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ایک استاد، ماسٹر حمید احمد مقیم تھے۔

اس عمارت کی بنیاد ۱۹۶۲ء میں رکھی گئی تھی جس کا اندازہ میرے کمرہ کے باہر نصب سنگِ مرمر کی اس تختی سے ہوتا تھا جس پر لکھا ہوا تھا: ''تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں کے ہوسٹل کی اس عمارت کا سنگِ بنیاد جناب سید حسنات احمد صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع سیالکوٹ نے بروز جمعۃ المبارک بتاریخ ۳۰ نومبر ۱۹۶۲ء نصب فرمایا۔''

ہوسٹل کی عمارت غالباً اس مفروضے پر تعمیر کی گئی تھی کہ دور ونزدیک سے طلبہ اس کالج میں پڑھنے کے لیے آیا کریں گے لیکن بدقسمتی سے کئی سال گذرنے کے باوجود یہ کالج اپنے بانیوں کی توقعات پر پورا نہ اُتر سکا تھا اور گھٹیالیاں اور گردونواح کے چند طلبہ کے علاوہ کسی اور نے اس کالج میں دلچسپی نہ لی۔ یہی وجہ تھی کہ ہوسٹل تقریباً خالی پڑا تھا اور باورچی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

عثمان صدیقی سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ اگر ہم ہنڈیا خود تیار کر سکتے ہوں تو گھٹیالیاں کی ایک خاتون دن میں تین وقت ہمارے لیے روٹی پکا کر بھجوا سکتی ہے بشرطیکہ ہم اسے دس روپے فی کس ماہانہ ادا کرنے کا وعدہ کریں اور مطلوبہ مقدار میں آٹا اور گھی مہیا کرتے رہا کریں۔ ہمیں ہنڈیا تیار کرنے کا تجربہ تو نہ تھا لیکن ان حالات میں ہمیں یہ تجویز بے حد پسند آئی چنانچہ پہلے ہی دن سے اس نیک دل خاتون کا ایک بیٹا جو ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور ''فخرو'' کہلاتا تھا دوپہر اور شام کے وقت ہمیں تازہ روٹی پہنچانے لگا اور صبح سکول آتے ہوئے گرما گرم پراٹھے بنوالاتا۔ ہم جب تک گھٹیالیاں میں رہے یہی انتظام چلتا رہا۔

زمانہ کافی سستا تھا۔ دیسی انڈے ڈھائی روپے درجن تھے، دودھ دس آنے سیر مل جاتا تھا اور دیسی گھی سات روپے کلو تھا لیکن عام لوگ غریب تھے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ فخرو کی والدہ آٹا گوندھتی ہے اور دن میں تین بار ہمارے لیے اپنا ایندھن خرچ کر کے روٹی پکا کر بھجواتی ہے۔ اس کام کے لیے اس کے بیٹے کو ایک وقت میں دو تین میل فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے ہر ماہ صرف بیس روپے ملتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس انتظام پر خوش تھی جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار جب اس کا شوہر جو لاہور میں مزدوری کرتا تھا گھٹیالیاں آیا تو وہ ہمارے ساتھ ملاقات کے لیے خاص طور پر ہوسٹل آیا۔ اس

کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ یا وہ ہمیں بہت ''بڑے آدمی'' سمجھ رہا ہے اور ہم دونوں اس کی بیوی کو ماہوار تین روپیہ اجرت ادا کر کے اس پر بہت بڑا احسان کر رہے ہیں۔

قصہ مختصر، اس طرف سے بے فکری ہوئی تو کالج کے معاملات میں دلچسپی شروع ہوئی۔ پرنسپل سے رسمی ملاقات کے بعد میں نے اس عمارت کا تفصیلی جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سنگ بنیاد صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے ۱۹۶۳ء میں اپنے دستِ مبارک سے رکھا تھا۔ اس موقع پر جو یادگاری تختی نصب کی گئی وہ میرے وہاں جانے تک تک حالت میں موجود تھی اور اس پر لکھا تھا: ''تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں کا سنگِ بنیاد حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب صدر، صدر انجمن احمدیہ ربوہ نے مؤرخہ تیرہ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو نصب فرمایا اور انجمنِ احمدیہ کی طرف سے علاوہ سالانہ گرانٹ کے مبلغ بیس ہزار روپیہ عطیہ عطا فرمایا۔''

کالج کی عمارت مخیّر حضرات کے عطایا سے تعمیر ہوئی چنانچہ اس عمارت کے مختلف کمروں پر یادگاری تختیاں نصب تھیں جن پر ان کمروں کی تعمیر کا خرچ اُٹھانے والے بزرگان کے نام درج تھے۔ ایک تختی پر لکھا تھا: ''یہ کمرہ جناب چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب جج عالمی عدالت (ہالینڈ) نے اپنی والدہ محترمہ حسین بی بی صاحبہ مرحومہ ...... کی یادگار میں مبلغ چھ ہزار روپیہ میں بغرضِ ایصالِ ثواب تعمیر کروایا......''

ایک کمرے کے اخراجات ماڈرن موٹرز لمیٹڈ کے مالک، چوہدری نبی احمد نے ادا کئے تھے۔ ایسے ہی تو نہیں لکھا تھا یہاں پر کہ ''یہ کمرہ جناب چوہدری نبی احمد صاحب مالک ماڈرن موٹرز لمیٹڈ، کراچی نے اپنے والد چوہدری محمد خان صاحب مرحوم ساکن چھور چک ۱۱۷ مغلیاں کی طرف سے مبلغ چھ ہزار روپے میں بطور یادگار و ایصالِ ثواب تعمیر کروایا۔''

تیسرے کمرے پر نصب تختی کے مطابق ''یہ کمرہ جناب چوہدری محمد علی صاحب باجوہ ساکن دانہ زید کا حال رئیس باندھی (ضلع نواب شاہ) نے اپنے والدین کی یادگار میں مبلغ چھ ہزار میں بغرضِ ایصالِ ثواب تعمیر کروایا......''

اس حوالے سے سب سے بڑا عطیہ شاہ نواز لمیٹڈ کے چوہدری شاہ نواز کی طرف سے موصول ہوا جو دس ہزار روپے تھا۔ اُس سستے زمانے میں اس رقم سے ایک پورا بلاک تعمیر ہو گیا تھا۔ خود پڑھ لیجئے یہ تختی: ''اس بلاک کی تعمیر چوہدری شاہ نواز صاحب مالک شاہ نواز لمیٹڈ لاہور نے اپنی والدہ محترمہ حسین بی بی صاحبہ مرحومہ کی یادگار میں مبلغ دس ہزار کا عطیہ بغرضِ ایصالِ ثواب مرحمت فرمایا... ''

یاد رہے کہ اس کالج کے اصل محرک حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد تھے جنہوں نے تعلیمی شعبے میں حکومتی اصلاحات کے مدنظر ۱۹۵۹ء میں گھٹیالیاں میں پہلے سے موجود ہائی سکول کو ہائر سیکنڈری سکول کا درجہ دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ بعد میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے بھی اس تجویز کی حمایت میں ایک سے زیادہ بار الفضل میں لکھا۔ بابو قاسم دین، امیر جماعت ہائے احمدیہ ضلع سیالکوٹ اس کالج کے پہلے مینجر مقرر ہوئے۔ انہوں نے کالج کے لیے عطیات جمع کرنے کی مہم چلائی۔ یوں جماعت کے مخیر احباب کے عطایا سے کالج کے قیام کا مشکل مرحلہ کامیابی سے ممکن ہوا۔

کالج کا قیام انیس اگست ۱۹۶۱ء کو عمل میں آیا اور عبدالسلام اختر اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اب ان کی جگہ عثمان صدیقی پرنسپل کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ وائس پرنسپل قاضی محمد بشیر تھے۔ وہ نامور عالم سلسلہ، قاضی محمد نذیر لائلپوری کے بھائی ہیں اور اردو پڑھاتے تھے۔ یہ وہی قاضی محمد بشیر ہیں جن کے متعلق تاریخ احمدیت جلد ۲۰ میں ان کے بھتیجے قاضی مبشر احمد کا بیان کردہ یہ واقعہ چھپ چکا ہے کہ وہ زمانہ طالب علمی میں ایک رات سمبڑیال سے گوروال پیدل آ رہے تھے کہ دو ڈاکوؤں نے راستے میں روک لیا۔ موصوف نے انہیں بتایا کہ ان کے پاس صرف میڈیکل کی چند کتابیں ہیں جو ڈاکوؤں کے کسی کام کی نہیں البتہ ایک نشتر ہے جسے وہ لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ انہیں آمادہ پاکر قاضی محمد بشیر نے اپنی جیب سے نشتر نکالا اور موقع پاتے ہی ایک ڈاکو کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا ساتھی فرار ہوگیا اور قاضی محمد بشیر گھر بھاگ آئے۔ اگلی صبح اس ڈاکو کے رشتہ دار اسے اٹھا کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ اب تو قاضی محمد بشیر بہت گھبرائے تاہم جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ ڈاکو کے رشتہ دار اصل واقعہ سے بے خبر ہیں۔ اُن کی کہانی کے مطابق مریض کو رات کے وقت کسی ڈاکو نے زخمی کردیا تھا اور وہ اسے قاضی محمد بشیر کے والدِ بزرگوار حضرت حکیم محمد حسین رفیق حضرت مسیح موعود المعروف "میاں جی" کے پاس علاج کے لیے لائے ہیں۔ یہ سن کر سب کی جان میں جان آئی اور یوں یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے دب گیا۔

اُن دنوں کالج کیمپس میں صرف دو کوارٹر ہی تھے جن میں سے ایک عثمان صدیقی کے پاس اور دوسرا قاضی محمد بشیر کے پاس تھا۔ عثمان صدیقی تو مع اہل وعیال وہاں مقیم تھے البتہ قاضی محمد بشیر کی فیملی لاہور میں تھی اور وہ یہاں تنہا زندگی گذار رہے تھے۔ ہاں! کبھی کبھار ان کی بیٹی شاہینہ اور ایک بیٹا پپّو یہاں آجاتے تھے۔

عثمان صدیقی اور قاضی محمد بشیر کے علاوہ کالج میں صرف دو ہی اور لیکچرر تھے: ایک چوہدری محمد اشرف جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور دوسرے منظور احمد شاکر جو ہسٹری پڑھاتے تھے۔ میرا اوّل الذکر سے پہلے کوئی تعارف نہ تھا البتہ میں منظور شاکر کو اس زمانے سے جانتا تھا جب وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں استاد کی کسی خالی اسامی پر کام کر رہے تھے۔ اس وقت میں نویں جماعت میں تھا اور وہ ہمیں اردو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ جلد ہی سکول چھوڑ گئے لیکن ان سے رابطہ برابر رہا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کالج میں کلیریکل سٹاف کوئی نہیں تھا۔ فیس اور کالج کے دیگر واجبات عثمان صدیقی خود وصول کیا کرتے تھے اور وہی اس کا ریکارڈ رکھتے تھے۔

ابتداءً مجھے تین پیریڈز دیئے گئے جن میں سے ایک گیارہویں جماعت کی انگریزی کا تھا تو دو پیریڈ ہوم اکنامکس کے تھے: ایک گیارہویں جماعت کا اور دوسرا بارھویں جماعت کا۔ طلبہ کی تعداد بہت کم تھی۔ میرا خیال ہے ہر کلاس میں بیس سے پچیس لڑکے ہوں گے۔ ان لڑکوں کا تعلق گھٹیالیاں اور اردگرد کے بعض دیہات سے تھا اور وہ پیدل یا بائیسکلوں پر آیا کرتے تھے۔ ان کا تعلیمی پس منظر بس ایسا ہی تھا اور تعلیم میں ان کی دلچسپی بھی واجبی سی تھی۔

جب میں وہاں گیا تو نومبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور سردی اپنا زور دکھانے لگی تھی لہٰذا پرنسپل کی اجازت سے کلاسیں بالعموم کھلے میدان میں ہوتی تھیں۔ طلبہ کے لیے کوئی یونیفارم مقرر نہ تھا اور طلبہ عام طور پر شلوار قمیص میں کالج آیا کرتے تھے جب کہ دھوتی میں کالج آنے کی مثالیں بھی موجود تھیں۔ ہاں! احمد توقیر پورے کالج میں

واحد لڑکا تھا جو موسم گرما میں پینٹ قمیص اور سردیوں میں گرم سوٹ پہنتا۔ غالباً اس کے بچپن کا کچھ حصہ کسی شہر میں گذرا تھا یا اس کے والدین تعلیم یافتہ اور متمول تھے لہٰذا وہ باقی لڑکوں سے قدرے سمارٹ نظر آتا تھا۔

کالج بند ہونے کے بعد ہمارے لیے کوئی قابلِ ذکر مصروفیت نہ رہ جاتی تھی چنانچہ یہ وقت برتنوں کی صفائی، سالن کی تیاری، کپڑوں کی دھلائی، کیمپس پر رہائش پذیر اپنے رفقائے کار کے ساتھ گپ شپ اور مطالعے میں گذر جاتا۔ کبھی کبھار خط پوسٹ کرنے یا نمازِ جمعہ کی ادائی کے لیے گھٹیالیاں بھی چلے جاتے۔

قلعہ صوبا سنگھ ہمارے کالج سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پیدل مسافت پر تھا۔ گھٹیالیاں کی نسبت یہ ایک بڑی آبادی تھی جہاں ضرورت کی تقریباً ہر چیز مل جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم جمعہ یا دیگر تعطیلات کے روز وہاں جا کر ہفتے بھر کی ضروریات خرید لاتے۔ منظور شاکر کی رہائش وہیں تھی۔ قلعے جاتے تو ان سے ضرور ملتے۔ چونکہ ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس بھی تھے اور وہ بھی ہماری طرح حالات کے جبر کا شکار تھے لہٰذا ان کے پاس بیٹھ جاتے تو اُٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ وہ بہت مہمان نواز تھے چنانچہ خوب آؤ بھگت کرتے اور اپنی دلچسپ باتوں سے ہمارا دل بہلائے رکھتے۔

اگرچہ کالج سٹاف محدود سا تھا اور وہ بظاہر آپس میں شیر و شکر بھی تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کے کچھ اراکین دل میں دوسروں کے لیے بُغض رکھتے تھے اور اپنے بعض ہم خیال طلبہ کے ذریعے انہیں پریشان کرنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب سوچتے رہتے تھے۔ ہمیں بھی کئی بار ایسے ہی تلخ تجربوں سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک دفعہ کسی نے آدھی رات کے وقت اچانک ہمارے دروازے پر مکّوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دی۔ باہر بہت سے آدمی کھڑے تھے جو انتہائی بدتمیزی کے ساتھ ہم سے دروازہ کھولنے کا مطالبہ کر رہے تھے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے غیر متوقع تھا لہٰذا ہم گھبرا گئے اور سوچنے لگے کہ خود دروازہ کھول کر فوری طور پر موت کو گلے لگا لیں یا اسے جتنی دیر تک مؤخر کر سکتے ہیں کرتے رہیں۔

کالج میں بابا اسماعیل نام کا ایک ضعیف العمر چوکیدار موجود تھا اور وہ رات کے وقت ایک دو پھیرے ہوسٹل کی طرف بھی لگاتا تھا لیکن عمومی طور پر وہاں ایک پُراسرار سناٹا چھایا رہتا اور ہوا کی سائیں سائیں سے بھی دل لرزنے لگتا۔ انتظامیہ نے ہمیں اپنے تحفظ کے لیے ایک ایک ہاکی فراہم کر رکھی تھی جسے ہم ہمیشہ اپنے قریب رکھتے تھے۔ ہم سرِ شام دروازہ بند کر لیتے اور اس وقت تک نہ کھولتے جب تک ہمیں یقین نہ ہو جاتا کہ باہر کھڑا شخص ہماری جان پہچان والا ہے۔ اُس رات ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کمرے میں موجود سب سے قیمتی چیز بیٹری سے چلنے والا ایک بینڈ کا ایک چھوٹا سا ٹرانزسسٹر تھا جو کریم قمر کی ملکیت تھا۔ ہم اس ٹرانزسسٹر پر خبریں سنا کرتے تھے اور یہی اس ویرانے میں ہماری تفریح کا واحد ذریعہ تھا چنانچہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورے کے بعد کریم قمر نے اسے فوری طور پر بستر کے اندر چھپا دیا۔ ہم نے اپنی اپنی ہاکیاں پکڑیں اور دروازے کے ساتھ اس طرح لگ کر کھڑے ہو گئے کہ اگر مُفسد دروازہ توڑ بھی ڈالیں تو آسانی سے اندر داخل نہ ہو سکیں۔ یہ کیفیت چند منٹ رہی ہو گی جس کے بعد مُفسد شور و غوغا کرتے

ہوئے واپس چلے گئے۔

بعد میں جب بابا اسماعیل ادھر آیا تو ہم نے اس سے صورتِ حال جاننے کی کوشش کی لیکن اس نے اس واقعہ سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی طرزِ عمل کا مظاہرہ باقی لوگوں نے کیا اور کچھ پتا نہ چل سکا کہ یہ مفسد کون تھے۔ اگلے دن کالج میں ہونے والی چہ میگوئیوں سے اندازہ ہوا کہ یہ شرارت ہمارے بعض شاگردوں کی تھی جو ہمارے بعض رفقائے کار کے کہنے پر ہماری ''بہادری'' کا امتحان لینے آئے تھے۔

میں اور کریم قمر اکٹھے گھٹیالیاں آئے تھے اور ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کا بہت سہارا تھا۔ ایم اے کا نتیجہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے نمایاں کامیابی سے نوازا اور میں پنجاب یونیورسٹی میں پانچویں نمبر پر رہا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو جب میں نے اس کامیابی سے مطلع کیا تو آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری، چوہدری ظہور احمد باجوہ کے دستخط سے حضور کی طرف سے مجھے مبارکباد کا خط محررہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۹ء موصول ہوا جسے تبرکاً ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''آپ کا خط مورخہ ۶۹-۱-۱۰ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خدمت میں موصول ہوا۔ بعد ملاحظہ حضور نے فرمایا: بہت مبارک ہو۔

اللہ تعالیٰ آپ کی اس کامیابی کو ہر لحاظ سے مبارک کرے۔ دین و دنیا کے فضلوں سے نوازے۔ آمین''

بدقسمتی سے اسی دوران کریم قمر یہاں سے رخصت ہو گئے۔ کریم قمر اور میں فرسٹ کزنز ہونے کے ساتھ سکول کے زمانہ سے ہم جماعت اور ایک دوسرے کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے لہٰذا ان کے ساتھ ایک گونہ بے تکلفی تھی۔ اس جنگل میں وہی میرے ساتھی تھے اور وہی میرے دوست۔ ہم ہر بات ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرتے اور اکٹھے ہی شاپنگ اور سیر و تفریح کے لیے جایا کرتے تھے لہٰذا ان کے جانے سے کمرے میں اُداسی چھا گئی اور تنہائی مجھے ڈسنے لگی۔ اس کے باوجود میں لگے ہوئے روزگار کو لات مارنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لہٰذا کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی کھینچتا رہا۔

کریم قمر کے جانے کے بعد کالج کو فوری طور پر انگریزی کا کوئی لیکچرر نہ مل سکا۔ اس سلسلے میں انتظامیہ کی طرف سے تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے بھی رابطہ کیا گیا مگر وہاں سے کوئی لیکچرر گھٹیالیاں آنے کو تیار نہ تھا۔ فہیم (جن کی درخواست ایک بار رد کی جا چکی تھی) اب بہتر تنخواہ کی پیشکش کے باوجود گھٹیالیاں آنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر اعجاز سلیانہ نام کے ایک صاحب یہاں آ گئے۔ جھنگ کے رہنے والے اعجاز سلیانہ کا جماعت سے تعلق نہیں تھا لیکن مجبوراً یہاں آ گئے تھے اور کچھ ہی عرصہ بعد چلے بھی گئے۔ انہیں انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں ملازمت مل گئی تھی۔

کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے عثمان صدیقی سے اختلافات چل رہے تھے اور وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کمیٹی کو پرنسپل کے عہدہ کے لیے کوئی موزوں امیدوار میسر نہ تھا۔ ایک روز پتا چلا کہ ہزارہ کے رہنے والے مولوی احمد حسن بطور پرنسپل یہاں تشریف لا رہے ہیں۔

مولوی احمد حسن کسی زمانے میں پشاور یونیورسٹی میں لائبریرین ہوا کرتے تھے لیکن بعد میں

کنٹرولر آف ایگزامیشنز رہے اور بطور رجسٹرار ریٹائر ہوئے۔ وہ تنہا گھٹیالیاں منتقل ہوئے تھے لہٰذا انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ اگر میں چند روز ان کے گھر پر ان کے ہمراہ گذار سکوں تو وہ اسے میرا احسان سمجھیں گے۔ کریم قمر کے چلے جانے کے بعد میں خود بھی اُداس رہتا تھا چنانچہ میں عارضی طور پر اُن کے ہاں شفٹ ہو گیا۔ جلد ہی ان کا ایک عزیز، یونس ان کے پاس رہنے کے لیے آ گیا اور میں اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔

جب میں اس کالج میں آیا تو صدر ایوب کی آمریت کے خلاف ذوالفقار علی بھٹو کی تحریک زوروں پر تھی اور طلبہ کے ہنگامے جاری تھے۔ اگرچہ یہ کالج شہری مراکز سے دُور تھا لیکن طلبہ ہر بات کی خبر رکھتے اور جب جی چاہتا شرارت پر آمادہ ہو جاتے۔ میری موجودگی میں کالج یونین کے انتخابات ہوئے، طلبہ کو چھوٹے چھوٹے تفریحی اور مطالعاتی دوروں پر بھجوایا گیا اور کھیلوں کے مقابلے بھی ہوئے لیکن ہر بات کی تان بدمزگی پر ہی ٹوٹتی اور یہی چیز انتظامیہ کے لیے پریشانی اور انتظامیہ اور پرنسپل کے درمیان رنجش کا باعث تھی۔ عثمان صدیقی کے تبادلہ کے پیچھے بھی یہی رنجش کارفرما تھی تاہم ان کے جانشین کو اپنے علم وفضل کے باوجود اپنے پیشرو کے مقابلہ میں نظم ونسق کی بہتری میں خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

ان ہی دنوں میں ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث سے ملا تو حضور نے مجھ سے گھٹیالیاں کالج کے حالات خاص طور پر دریافت فرمائے۔ میں نے اپنا نقطہ نگاہ تفصیل سے حضور کے گوش گذار کر دیا اور اس سوال کے جواب میں کہ نئے پرنسپل کے آنے کے بعد صورتِ حال میں کیا تبدیلی آئی ہے میں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر بگڑ سی گئی ہے اور بدنظمی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا: ''ہاں میں جانتا ہوں۔ اس اَن فارچونیٹ پلیس میں پورا ڈسپلن کبھی بھی نہیں رہا۔''

گھٹیالیاں میں میرے قیام کے دوران محکمہ تعلیم کی طرف سے دو الگ الگ ٹیمیں کالج کے معاینہ کے لیے آئیں۔ ان دنوں حکومتِ پنجاب نے پرائیویٹ کالجوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جو اپنے نمائندوں کے ذریعہ ان کالجوں کے حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔ ۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو اس کمیٹی کی طرف سے ڈپٹی ڈائریکٹر (کالجز)، لاہور ریجن کالج کے معاینہ کے لیے آئے۔ اگرچہ انہوں نے کالج سٹاف کے ساتھ ایک مختصر سی میٹنگ تو کی لیکن ان کا زیادہ وقت عبداللہ مہار اور مولوی احمد حسن کے ساتھ گذرا اور وہی انہیں کالج کے بارے میں ضروری اعداد وشمار فراہم کرتے رہے۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں اطلاع موصول ہوئی کہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور کے ساتھ الحاق کی تجدید کے حوالے سے بورڈ کی ایک ٹیم کالج کے معاینہ کے لیے آ رہی ہے اور یہ کہ اس ٹیم میں دو مشہور ماہرینِ تعلیم یعنی پروفیسر ڈاکٹر سیّد نذیر احمد اور ڈاکٹر ایل ایم چاولہ شامل ہوں گے۔

ڈاکٹر نذیر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے تھے اور طلبہ میں مقبولیت کی شہرت رکھتے تھے۔ ان ہی کے دور میں اس کالج کی سو سالہ تقریبات منعقد ہوئی تھیں۔ اقبالیات، تعلیم وتدریس اور سپورٹس سے انہیں غیر معمولی شغف تھا، کلاسیکی موسیقی سے دلچسپی تھی اور وہ پنجابی زبان وادب کے محقق تھے۔ وہ باصلاحیت نوجوانوں

ان کی تحقیقی صلاحیتوں کے قدر دان کے طور پر بھی پہچانے جاتے تھے۔

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل، ڈاکٹر چاولہ ملک کے مشہور حساب دان تھے۔ میں نے ان دونوں کی شہرت سن رکھی تھی اور ہمیشہ افسوس کیا کرتا تھا کہ ایم اے کے لیے لاہور میں دو سالہ قیام کے دوران بھی میں ان سے ملاقات نہ کر پایا تھا۔ میں خوش تھا کہ مجھے ان دونوں شخصیات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا لہٰذا میں بڑی بے چینی سے ان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

بالآخر وہ روزِ سعد آن پہنچا۔ ۴ مئی ۱۹۶۹ء کو یہ ٹیم کالج آئی لیکن ان حضرات سے تفصیلی ملاقات کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ انہوں نے اسی روز لاہور واپس جانا تھا اور ان ہی چند گھنٹوں میں اپنا کام مکمل کرنا تھا لہٰذا ان سے انفرادی تفصیلی ملاقات کی توقع بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ بہر حال انہوں نے کالج بلڈنگ، ہوسٹل، سٹاف کے رہائشی کوارٹروں، لائبریری اور پلے گراؤنڈز کا معاینہ کیا اور یقیناً انتظامیہ کی کئی خامیوں اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر کیا۔

اپنی اس وزٹ کے دوران انہوں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول کا بھی دورہ کیا اور نویں جماعت کے بچوں کو لفظ ''صحیح'' لکھ کر دکھانے کو کہا تاہم پوری کلاس میں سے صرف ایک ہی طالب علم اس لفظ کو ڈھنگ سے لکھ پایا۔

یہ ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے ان سب باتوں کے باوصف کار پردازانِ کالج کی مساعی کو سراہا۔

دونوں صاحبان نے طلبہ سے خطاب بھی کیا۔ ڈاکٹر نذیر نے کہا کہ اس کالج کے طلبہ شہری سہولتوں سے ضرور محروم ہیں لیکن انہیں کھلی فضا، اچھی صحت اور اعلیٰ تعلیمی ماحول میسر ہے اور یوں انہیں شہری طلبہ پر ایک طرح سے فضیلت حاصل ہے لہٰذا انہیں محض اس وجہ سے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ پسماندہ علاقے کے باسی ہیں۔ انہوں نے طلبہ پر مطالعے کی اہمیت اُجاگر کی اور مشورہ دیا کہ وہ جتنا وقت کالج میں گذارتے ہیں اگر اس سے آدھا وقت گھر پر درسی کتب اور اخبارات و جرائد کے مطالعے پر صرف کرنے کی عادت ڈال لیں تو بہت جلد ان کی علمی استعداد کئی گنا بڑھ سکتی ہے۔

ڈاکٹر چاولہ نے کہا کہ اگر اس ماحول کے نقصانات ہیں تو اس کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شہروں کے رہنے والے اکثر کمی وقت کے شاکی رہتے ہیں جب کہ یہاں یہ نعمت وافر مقدار میں میسر ہے لہٰذا اگر اس کا صحیح استعمال سیکھ لیا جائے تو یہاں کے طلبہ بھی وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں جو بالعموم صرف شہری طلبہ کا مقدر سمجھا جاتا ہے۔

انہوں نے لیکچررز سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ محض لیکچر دے کر اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ انہیں یہ امر یقینی بنانا ہوگا کہ طلبہ ان کا لیکچر دلچسپی کے ساتھ سنیں، اس کے نوٹس لیں اور ان نوٹس کی روشنی میں تدریسی کتب کا مطالعہ کریں۔

ٹیم نے دوپہر کا کھانا کالج کے منیجر، پرنسپل اور اساتذہ کے ہمراہ کھایا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ ٹیم ان سارے انتظامات سے مطمئن ہے اور ہمارا یہ اندازہ درست ہی نکلا کیوں کہ ان کی سفارش پر جلد ہی کالج کے لاہور بورڈ کے ساتھ الحاق کی تجدید ہوگئی۔

اس موقع پر بورڈ کی بعض شرائط پوری کرنے کے لیے تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے ۱۰۰ طالبعلموں کو یہاں بھجوایا گیا تھا۔ ان میں سے ایک محمد احمد حیدر آبادی تھے تو دوسرے محمد شریف خالد۔

محمد احمد حیدر آبادی تعلیم الاسلام کالج میں ڈائریکٹر فزیکل ایجوکیشن ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائی کے ساتھ ساتھ حسبِ ضرورت حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کے ساتھ ڈرائیور کے طور پر بھی خدمات بجا لاتے تھے۔ وہ ایف اے کے دوران ہمارا فزیکل ایجوکیشن کا پیریڈ لیا کرتے تھے۔ یوں بھی وہ انجمن کوارٹرز میں ہمارے قریب مقیم تھے اور خدام الاحمدیہ کی سرگرمیوں کے دوران ان سے ملاقات رہتی تھی لہٰذا میری ان سے اچھی خاصی جان پہچان تھی۔

انہیں علم تھا کہ گھٹیالیاں دیہاتی علاقہ ہے اور یہاں پرندوں کا شکار بہ آسانی مل سکتا ہے چنانچہ وہ یہاں آتے وقت اپنی بندوق ساتھ لے آئے۔ وہ جتنے دن یہاں رہے کالج بند ہوتے ہی وہ مجھے اور شریف خالد کو ساتھ لے کر پرندوں کے شکار پر نکل جاتے۔ ان کا نشانہ بہت اچھا تھا اس لیے شاذ ہی کوئی فاختہ ان کی گولی سے بچ پاتی۔ وہ نشانہ لگاتے اور میں بھاگ کر پھڑ پھڑاتی ہوئی فاختائیں جمع کرتا جب کہ شریف خالد انہیں ذبح کرتے جاتے۔ شام کے وقت ہمارے ہاتھ میں بالعموم فاختاؤں سے بھرا ہوا ایک تھیلا ہوتا۔ گھر جا کر ان کی صفائی اور پھر انہیں خود پکا کر کھانے میں بہت لطف آتا۔

شریف خالد پرانے واقفینِ زندگی میں سے تھے۔ انہیں اس سے پہلے دفتر تحریکِ جدید انجمن احمدیہ اور بعض دیگر جماعتی اداروں میں خدمت کا موقع مل چکا تھا۔ اُن کی طبیعت میں بذلہ سنجی تھی چنانچہ وہ اپنی زندگی کے واقعات بہت دلچسپ انداز میں سنایا کرتے تھے۔ وہ شکار کی صفائی اور پکائی میں پوری مدد کرتے اور کھانے کے دوران طرح طرح کے لطائف سے محظوظ کرتے۔

اُن دنوں گرمی اپنے جوبَن پر تھی۔ برقی پنکھوں کی سہولت تو سرے سے تھی ہی نہیں لہٰذا اگر کسی وقت موسم ابر آلود ہو جاتا یا ہوا چل پڑتی تو جان میں جان آنے لگتی ورنہ زیادہ وقت ہائے وائے میں گذرتا۔ عبدالسّلام اختر بھی گھٹیالیاں میں قیام کے دوران یقیناً اسی قسم کے حالات سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ یوں ہی تو وہ فریاد کناں نہیں ہیں کہ:

وہ گرمی ہے خورشید سر دُھن رہا ہے
کوئی جیسے چنگاریاں بُن رہا ہے
نہیں، دھوپ سے کوئلے چُن رہا ہے
زمیں جل رہی ہے فلک بھُن رہا ہے
فرد جاں بلب ہے جنُوں خوں فشاں ہے
یہ گھٹیالیاں ہے، یہ گھٹیالیاں ہے

۱۵ جون ۱۹۶۹ء کو کالج کا جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا جس کی صدارت میاں اصغر علی، ڈپٹی کمشنر

ضلع سیالکوٹ نے کی۔ وہ خواجہ محمد سرفراز ایڈووکیٹ اور چوہدری نذیر احمد ایڈووکیٹ کے ہمراہ سیالکوٹ سے گھٹیالیاں پہنچے تھے اور ڈیڑھ دو گھنٹے یہاں موجود رہے۔

ڈپٹی کمشنر کو پیش کیا جانے والا ایڈریس مولوی احمد حسن نے میری مشاورت سے تیار کیا تھا اور اس میں کالج کی زمین کے فوری استعمال، بدوملہی قلعہ صوبا سنگھ روڈ کی پختگی اور علاقے میں سرکاری ہسپتال کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس پسماندہ علاقے میں تعلیم کی اشاعت میں کالج کے کردار کو سراہا اور حسبِ رواج ان مطالبات پر غور اور انہیں متعلقہ حکومتی اداروں تک پہنچانے کا وعدہ کر کے اپنی بات ختم کر دی اور یوں یہ جلسہ ہنسی خوشی اختتام پذیر ہوا۔

ایک روز پتا چلا کہ ربوہ میں پانچواں آل پاکستان طاہر کبڈی ٹورنامنٹ منعقد ہو رہا ہے۔ پرنسپل چاہتے تھے کہ ٹورنامنٹ میں ہمارے کالج کی بھی نمائندگی ہو لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ٹیم میں اچھے کھلاڑیوں کی کمی تھی۔ اندریں حالات سٹاف کا خیال تھا کہ اس ٹورنامنٹ میں حصہ نہ لیا جائے لیکن پرنسپل نے یہ مشورہ درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور وہ کانگڑی پہلوانوں پر مشتمل ایک ٹیم کے ساتھ ربوہ جا پہنچے۔ واپس آئے تو سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ پہلے ہی روز اس ٹیم کا میچ اسلامیہ کالج لائلپور کے ساتھ ہوا جو مخالف ٹیم نے واضح برتری کے ساتھ جیت لیا۔ جب ''بوہنی'' ہی ٹھیک نہ ہوئی تو آگے کسی کامیابی کی کیا توقع کی جا سکتی تھی چنانچہ ٹیم اپنا سا منہ لے کر اسی روز ربوہ سے واپس روانہ ہو گئی۔

گھٹیالیاں میں میرے قیام کے دوران اسلامیہ کالج وہاڑی نے پولیٹیکل سائنس کے لیکچرر کی ایک اسامی مشتہر کی۔ میں نے حسبِ معمول وہاں بھی درخواست بھجوا دی۔ اس درخواست میں میرے عمدہ تعلیمی ریکارڈ کا بالوضاحت ذکر تھا چنانچہ چند ہی روز بعد جب مجھے کالج کی طرف سے ایک رجسٹرڈ خط ملا تو میں اسے انٹرویو کال سمجھ کر بہت خوش ہوا لیکن جب لفافہ کھولا تو ایک انتہائی دلچسپ تحریر پڑھنے کو ملی۔ پرنسپل نے لکھا تھا: ''آپ انٹرویو کے لیے تشریف نہ لائیں۔ اس سلسلہ میں جو زحمت آپ کو ہوئی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

میں سمجھ تو نہ پایا کہ میرے کوائف میں کون سی ایسی منفی بات شامل تھی جس کی وجہ سے اسلامیہ کالج وہاڑی کی انتظامیہ نے اِنیشیَل سکرُوٹِنی میں ہی مجھے ''آؤٹ'' کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن میں نے بددل ہونے کی بجائے بہتر مستقل کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

اسی حوالے سے چار اگست ۱۹۶۹ء کو میری ملاقات آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل، میجر جنرل محمد اکبر سے ہوئی۔ وہ میرے ایک خالہ زاد بھائی، قاضی منظور احمد کے شاگرد تھے۔ قاضی منظور احمد بہت ہمدرد انسان تھے۔ انہوں نے ایک بار تلاشِ روزگار کے حوالے سے میری پریشانی کے مدِنظر یہ پیشکش کی تھی کہ اگر میں چاہوں تو وہ موصوف سے میری ملاقات کرا سکتے ہیں، عین ممکن ہے وہ مجھے کوئی بہتر مشورہ دے سکیں۔ مجھے اس تجویز سے بھلا کیا اختلاف ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے ان سے اسی وقت جنرل اکبر کے نام تعارفی خط لے لیا اور کاب لائنز، راولپنڈی میں ان کے گھر جا پہنچا۔ اس روز وہ راولپنڈی سے باہر گئے ہوئے تھے لہٰذا میں اگلی صبح ان کے دفتر واقع اسلام آباد چلا گیا۔

آج تو صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے اور کسی عام آدمی کے لیے آئی ایس آئی ہیڈ کوارٹرز تک رسائی ناممکنات میں سے ہے لیکن اُن دنوں حالات بالکل مختلف تھے۔ میں گراؤنڈ فلور پر واقع ان کے استقبالیہ پر گیا اور اپنا تعارف کرایا تو جنرل اکبر نے مجھے فی الفور اپنے دفتر میں بلا لیا۔ جب میں نے ان کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا: ''میں نے آپ کا تعلیمی ریکارڈ دیکھا ہے۔ میرے نزدیک آپ کو کسی چھوٹی موٹی ملازمت کے پیچھے بھاگنے کی بجائے سی ایس ایس کا امتحان دینا چاہیئے اور اگر آپ آئی ایس آئی میں آنا چاہتے ہوں تو، سویلین انٹیلی جنس آفیسرز کی اسامیاں مشتہر ہوتی رہتی ہیں۔ آپ ان کے لیے امتحان دیں۔ یہ اسامیاں چند ماہ تک آنے والی ہیں۔''

جب میں نے عرض کی کہ میں کسی نہ کسی طرح گھٹیالیاں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں اور اس حوالے سے ان کی مدد کا طلبگار ہوں تو انہوں نے کہا: ''اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کا مسئلہ فوراً حل کر سکتا ہوں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ آج سے آپ ہماری ملازمت میں ہیں۔''

''لیکن میرے فرائض کیا ہوں گے؟'' میں نے وضاحت چاہی ''اور تنخواہ کتنی ملے گی؟''

انہوں نے میرے سوال کا قدرے تفصیلی جواب دیا جسے سن کر میں شش و پنج میں پڑ گیا اور میں نے ان سے گذارش کی کہ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا جائے۔

''آپ بیشک ایک دو روز کے بعد بتا دیں'' انہوں نے خوشدلی سے کہا۔

میں اگلے روز دوبارہ ان کے پاس حاضر ہوا۔ ''مجھے تو یہ کام کافی مشکل لگتا ہے'' میں نے ان سے عرض کی ''اگر میں نے کسی جگہ ملازمت کی درخواست دی تو میں آپ کے گوش گذار کر دوں گا۔ ہو سکے تو آپ میری مدد کر دیجئے گا۔''

جنرل اکبر کی طرف سے مدد کے وعدے کے باوجود مجھے نہ جانے کیوں یقین ہو گیا تھا کہ فی الحال میرا رزق گھٹیالیاں ہی سے وابستہ ہے جہاں مجھے ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا تجربہ ضرور ہوتا جسے یاد کر کے آج بھی بیساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔

ایک روز میں صبح کے وقت نلکے پر ہاتھ منہ دھو رہا تھا کہ دُور سے کسی شخص نے مجھے ''ماسٹر صاحب! ماسٹر صاحب!!'' کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ جب میں نے اُدھر دیکھا تو ایک شخص ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے بلا رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہ ہو پایا کہ اس شخص کا مسئلہ کیا ہے لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سخت پریشانی میں ہے اور اسے میری فوری مدد کی ضرورت ہے۔ میں لوٹا وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور کم و بیش دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے چارے کا ایک بہت بڑا گٹھڑ باندھ رکھا تھا۔ وہ یہ گٹھڑ اپنے سر پر رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کا حجم اور وزن اتنا زیادہ تھا کہ وہ اکیلا اسے اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ ماسٹر فارغ پھر رہا ہے، کیوں نہ اس سے مدد لی جائے چنانچہ میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے کہا کہ اگر میں یہ گٹھڑ اُٹھا کر اس کے سر پر رکھوا دوں تو وہ اسے میری مہربانی سمجھے گا۔ اگرچہ اُس ماحول میں اس کی مجھ سے یہ توقع کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن سچ پوچھئے تو مجھے اس پر بہت غصہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہی کام قریب سے گذرنے والے کسی اور شخص سے بھی لے سکتا تھا لیکن اس نے اپنے

معمولی سے فائدے کے لیے مجھے اتنی دور سے بلا لیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے کسی ردِعمل کا اظہار کیئے بغیر گٹھڑ اُٹھانے میں اس کی مدد کی۔ اس نے گٹھڑ اپنے سر پر رکھا اور خوشی خوشی اپنی منزل کی جانب گامزن ہوگیا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ ہر روز صبح اسی وقت چارہ کاٹنے کے لیے یہاں آتا ہے۔ اس بات کا علم مجھے اگلی صبح اس وقت ہوا جب مجھے نلکے پر ہاتھ منہ دھوتا دیکھ کر اس نے اسی انداز میں واویلا شروع کر دیا۔ ایک روز پہلے اس کی چیخ و پکار پر میرا ردِعمل کچھ اور تھا لیکن آج میرا ردِعمل بالکل مختلف تھا۔ میں نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور اپنا کام مکمل کر کے سیدھا کمرے میں واپس آ گیا۔

وہ آدمی بھی بہت سمجھدار نکلا۔ اس نے پھر کبھی مجھے آواز نہیں دی۔

میں چشم تصوّر سے خود کو گھٹیالیاں میں پاتا ہوں تو ایک اور واقعہ یاد آجاتا ہے۔

کالج کا ایک سابق طالب علم اعجاز احمد بسرا جو کسی سنگین فوجداری مقدمہ میں ماخوذ تھا ان دنوں ضمانت پر رہا ہو کر گاؤں آیا ہوا تھا۔ وہ ایک روز غیر متوقع طور پر مجھے ملنے کے لیے چلا آیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ جتنی دیر میرے پاس بیٹھا رہا میں سہما سہما سا ہی رہا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک روز ایک نوجوان جو سفید گھوڑی پر سوار تھا ہوسٹل کے سامنے آ کر رُکا اور اس نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں باہر نکلا تو وہ مجھے بہت تپاک سے ملا۔ اس نے گھوڑی برآمدے میں باندھ دی اور خود میرے کمرے میں چلا آیا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ اعجاز بسرا اپنے زمانہ طالب علمی میں بعض اساتذہ کے آلہ کار کے طور پر بعض دیگر اساتذہ کے لیے پریشان کن صورتِ حال پیدا کر دیتا تھا۔ اس حوالے سے عثمان صدیقی کا نام خاص طور پر لیا جاتا تھا جو انگریزی کے ایک لیکچرر کو اس کی توقع کے مطابق پورا گریڈ یا شاید ایڈوانس انکریمنٹ نہ دلوا سکے تھے جس پر اعجاز بسرا نے ان کی سرِ عام تذلیل کی کوشش کی تھی اور اگر موقع پر موجود بعض دیگر لیکچررز اکٹھے ہو کر عثمان صدیقی کا ساتھ نہ دیتے تو نہ جانے وہاں کیا سے کیا ہو جاتا۔ اعجاز بسرا کے بارے میں سنی سنائی یہی باتیں میری پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔ میں اس کی آمد کے مقصد سے بھی بے خبر تھا لیکن میں نے اپنے حواس مجتمع رکھے، اسے بیٹھنے کے لیے چارپائی پیش کی، چولہے پر چائے رکھی اور پھر اطمینان کے ساتھ اس سے باتیں کرنے لگا۔ اگرچہ اعجاز بسرا کے ساتھ میری یہ پہلی ملاقات تھی لیکن شاید وہ میری طرف سے اپنے پُرتپاک استقبال سے متاثر ہوا تھا چنانچہ وہ جلد ہی مجھ سے کھل گیا اور اپنی سابقہ زندگی کے واقعات مزے لے لے کر سنانے لگا۔

مجھے یوں بھی آپ بیتیوں سے دلچسپی ہے لہٰذا جب اس نے میرے سامنے کالج کی انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ کے بارے میں اپنے مشاہدات و تجربات بیان کرنا شروع کیئے تو مجھے یوں لگا کہ میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا ہوں جس کا باوا آدم ہی نرالا ہو۔ فُلاں کا فلاں سے کیا جھگڑا تھا اور فُلاں کیوں فلاں پر حد درجہ اعتماد کرتا تھا، اعجاز بسرا نے مختصر وقت میں مجھے گھٹیالیاں کے بارے میں وہ تمام معلومات فراہم کر دیں جو میں کئی سال یہاں رہ کر بھی شاید حاصل نہ کر پاتا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں ایک اچھا سامع ہوں چنانچہ اس کی باتیں بلا تکان جاری رہیں۔ اس نے

جرم و سزا کے اپنے بعض واقعات سنائے اور اٹھنے سے پہلے اظہارِ ممنونیت کرتے ہوئے کہا ''بتایا گیا ہے کہ آپ گھٹیالیاں نئے آئے ہیں اور بعض لوگ آپ کو پریشان کر رہے ہیں۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے مجھے صرف تنگ کرنے والے کا نام بتانا ہے۔ پھر میں جانوں اور وہ نامراد''

''بہت شکریہ لیکن میں تو یہاں بہت مطمئن زندگی گذار رہا ہوں۔ میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں نہ کوئی مجھے تنگ کر رہا ہے لیکن اگر کبھی ایسی کوئی بات ہوئی تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔''

کئی سال بعد یہی اعجاز بسرا اپنے ایک جوان بیٹے کے ہمراہ گھٹیالیاں میں دن دہاڑے قتل ہو گیا۔ عین اس جگہ جہاں یہ واقعہ ہوا بعد میں ایک یادگاری تختی لگا دی گئی۔ اس تختی کے مطابق جو چوہدری مشتاق احمد بسرا کی طرف سے نصب کی گئی ہے اعجاز بسرا اپنے بیٹے شاہجہاں عرف پنوں کے ساتھ انیس اکتوبر ۲۰۰۱ء بروز جمعہ صبح نو بجے کے قریب یہاں سے گذر رہا تھا کہ دو نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے ان پر اچانک فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں وہ دونوں موقع پر ہی دم توڑ گئے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے میں نے اس کالج میں دو سو روپے ماہوار پر ملازمت شروع کی تھی۔ اُن دنوں صدر انجمن احمدیہ کا لیکچررز کا سکیل دو صد اسّی روپیہ ماہوار سے شروع ہوتا تھا۔ جب میرا ایم اے کا نتیجہ آ گیا اور خدا کے فضل سے میری ڈویژن بہتر ہو گئی تو میں نے گریڈ کا مطالبہ شروع کر دیا لیکن عبداللہ مہار ہمیشہ یہی کہتے کہ جب تک میں اس کالج میں کم از کم پانچ سال ملازمت کا عندیہ تحریراً نہیں دیتا، مجھے انجمن کا گریڈ نہیں دیا جائے گا۔ مجھے ان کے اس فیصلے سے اتفاق نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر میں نے یہ پانچ سال یہاں گذار دیئے تو پھر میں کسی اور جگہ ملازمت کے قابل نہیں رہوں گا لیکن وہ میری ایک نہ سنتے اور مجھے قائل کرنے کے لیے علیگڑھ کی مثال دینے لگتے جو سرسید کی کوششوں سے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا مرکز بن گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کالج بھی اسی طرح ترقی کرے گا اور ایک وقت آئے گا کہ اس ادارے کے ساتھ نسبت باعثِ افتخار سمجھی جائے گی۔ مجھے ان کی نیک نیتی پر تو شبہ نہیں تھا تاہم میرے اندازے کے مطابق اس کالج کا مستقبل ایسا درخشاں نہ تھا چنانچہ میں دن رات کسی بہتر ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔

اسی عرصے میں سی ڈی اے اسلام آباد میں پروٹوکول اسسٹنٹ کی ایک اسامی مشتہر ہوئی تو میں نے بھی درخواست ارسال کر دی۔ اگرچہ مجھے وہاں سے کوئی کال تو موصول نہ ہوئی البتہ اسی بہانے مجھے ادیبِ شہیر سید ضمیر جعفری کے ساتھ ملاقات کا موقع مل گیا۔

یاد رہے کہ پروٹوکول اسسٹنٹ کی یہ اسامی سی ڈی اے کے اسٹیبلشمنٹ آفیسر شیخ عبدالوحید کی طرف سے مشتہر ہوئی تھی۔ یہی شیخ عبدالوحید کسی وقت پریذیڈنٹ ہاؤس اسلام آباد میں ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر تعینات تھے اور میں شورش کاشمیری کے ہفت روزہ چٹان میں کلیدی اسامیوں پر تعینات احمدی افسران کی وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی فہرستوں میں سے ان کا نام پڑھ چکا تھا چنانچہ میں ربوہ کے ایک دوست سے ان کے نام تعارفی خط لے کر ان کے پاس حاضر ہو گیا۔ بہت محبت سے پیش آئے اور میری ہر ممکن مدد کا وعدہ بھی فرمایا لیکن وضاحت کر دی کہ یہ پوسٹ

سی ڈی اے کے محکمہ تعلقاتِ عامہ میں ہے جس کے انچارج ضمیہ جعفری ہیں لہٰذا وہ میری ان سے ملاقات کرا دیتے ہیں۔شیخ عبدالوحید نے اسی وقت انٹرکام پر ان سے بات کر لی اور انہوں نے مجھے ملاقات کے لیے فوراً بلا لیا۔

اُس وقت تک میں نے ضمیر جعفری کو ایسا پڑھا تو نہ تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ ایک بڑے مزاح نگار ہیں۔انہوں نے میری بات پوری ہمدردی سے سُنی لیکن بتایا کہ اس پوسٹ کے لیے انٹرویو ایک بورڈ لے گا جس میں وہ خود بھی تشریف فرما ہوں گے اور یہ کہ وہ میرے تعلیمی ریکارڈ کے پیشِ نظر میری سیلیکشن میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تاہم مجھے کال کا انتظار کرنا ہوگا۔

مجھے اس ملاقات کی دوہری خوشی تھی۔ایک تو مجھے یہ ملازمت ملنے کی آس لگ گئی اور پھر ایک ایسے شخص کے ساتھ چند لمحے مل بیٹھنے کا موقع مل گیا جس کا ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام تھا۔میں اس وقت سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ مجھے بھی ایک ایسے مقام پر پہنچا دے گا جہاں ضمیر جعفری میری پہلی کتاب کے حوالے سے ایک اخباری کالم لکھیں گے، میری دوسری کتاب کا فلیپ لکھیں گے، میری عدم موجودگی میں بہت سی ادبی محافل میں ان کتابوں کی خوبیاں بیان کریں گے، ان سے میری راہ و رسم اتنی بڑھ جائے گی کہ امریکہ میں ان کی وفات کے بعد میں چکلالہ ائیر پورٹ پر ان کا تابوت وصول کرنے والے ان کے محض چند احباب میں سے ایک ہوں گا اور مجھے ان کی تدفین میں شمولیت کی سعادت بھی حاصل ہوگی۔

گھٹیالیاں سے اسلام آباد یا لاہور جانا اور پھر وہاں سے گھٹیالیاں واپس پہنچنا اس قدر تکلیف دہ امر تھا کہ اس کا اندازہ یہاں بیٹھ کر نہیں لگایا جا سکتا لیکن اس بار تو حد ہی ہوگئی۔جب میں ضمیر جعفری کے ساتھ ملاقات کے بعد بدوملہی پہنچا تو مغرب ہونے کو تھی۔اس روز موسم بہت خوشگوار تھا اور آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔میرے پاس ایک اٹیچی کیس تھا۔اب تو میرے لیے اس طرح کے سامان کو ایک سے دوسری جگہ اُٹھا کر رکھنا بھی محال ہے لیکن وہ زمانہ اور تھا، میں نے اٹیچی کیس ہاتھ میں پکڑا اور اس کا فرادا موسم سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنی ترنگ میں بدوملہی سے پیدل گھٹیالیاں کے لیے روانہ ہوگیا۔

ابھی میں راستے میں تھا کہ بوندا باندی شروع ہوگئی جو دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کرگئی اور ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ میں بدوملہی واپس جانا بھی چاہوں تو نہ جا سکوں۔راستے میں ایک دو گاؤں تو پڑتے تھے لیکن میں وہاں کسی کو جانتا نہیں تھا لہٰذا میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہاں رک جاتا۔بارش کی وجہ سے کئی جگہوں پر پانی کھڑا ہوگیا تھا لیکن کچھ اندازہ نہیں رہا تھا کہ کس جگہ کتنا پانی ہے۔ایک تو رات کی تاریکی اور اوپر سے موسلا دھار بارش، وہ راستہ جسے میں دیکھا بھالا سمجھتا تھا بالکل اجنبی محسوس ہونے لگا۔کہیں پانی ٹخنوں تک ہوتا تو بعض جگہ گھٹنے بھی پانی میں ڈوبنے لگتے۔پریشانی کی اس کیفیت میں مجھے ضمیر جعفری تو بھول گئے لیکن عبدالسّلام اختر بہت یاد آئے جنہوں نے گھٹیالیاں کے بارے میں اپنی ایک طویل نظم میں کہا تھا:

وہ آئی ہے برسات کی راجدھانی
سمندر نے خشکی پہ پائی روانی

ہے راہوں میں، گلیوں میں، دریچوں میں پانی
ہر اک پوچھتا ہے یہ دردِ نہانی
یہ رستہ جو پہلے یہاں تھا، کہاں ہے؟
یہ گھٹیالیاں ہے، یہ گھٹیالیاں ہے

یہ شعر گنگنا ہی رہا تھا کہ اچانک پانی کی سطح بلند ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی میرے کندھوں تک پہنچ گیا۔ اب میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا کہ میں اٹیچی کیس اپنے سر پر رکھ لوں اور شڑپ شڑپ کرتا اللہ توکل چلتا رہوں۔ خدا کا شکر ہے مجھے اس سے زیادہ گہرے پانی میں سے نہیں گذرنا پڑا۔

میری داستانِ غم یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جس طرح امتحاناتِ عشق اور اس حوالے سے پیش آنے والے مقاماتِ آہ وفغاں کی کوئی انتہا نہیں ہے اسی طرح میرا باقی سفر بھی کم تکلیف دہ نہ تھا۔ ایک جگہ پاؤں پھسلا تو زمین پر منہ کے بل کچھ ایسے گرا کہ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت ہوگیا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ رات کا وقت تھا اور میری ہیئت کذائی پر تالیاں پیٹنے والا کوئی نہ تھا ورنہ میں نہ جانے کتنا شرمندہ اور آزردہ ہوتا۔ اس رات احساس ہوا کہ عبدالسلام اختر نے یوں ہی نہیں کہا تھا:

ہے گلیوں میں کیچڑ تو راہوں میں کیچڑ
مقابر میں اور خانقاہوں میں کیچڑ
ہے اشکوں میں داخل تو آہوں میں کیچڑ
امنگوں میں پھسلن، نگاہوں میں کیچڑ
ہر اک راستے پر عدم کا گماں ہے
یہ گھٹیالیاں ہے، یہ گھٹیالیاں ہے

خدا معلوم یہ سفر رات کس وقت ختم ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ اپنے کمرے میں پہنچا تو میرے جسم کا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ اس سفر کا زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ بعد میں پروٹوکول اسسٹنٹ کی اس اسامی کے بارے میں کبھی سُنا نہیں گیا۔

میں بدو ملہی سے گھٹیالیاں کے اس سفر کی داستان میں الجھ کر آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اسی عرصے میں لوکل کونسلز سروس کی ایڈمنسٹریٹو برانچ میں افسران کی بھرتی کے لیے بھی امتحان ہوا۔ یہ امتحان دو پرچوں پر مشتمل تھا جس میں ایک انگریزی اور جنرل نالج کا تھا جب کہ دوسرا لوکل گورنمنٹ کا۔ میں بوجوہ اس امتحان میں اپنی کارکردگی کے بارے میں کافی پُر امید تھا لیکن پہلے پرچے نے ہی یہ اُمید ختم کر دی۔ آپ حیران ہوں گے کہ اردو سے انگریزی میں ترجمے کے لیے اردو کے کسی روائتی نثری پیرے کے برعکس فیض کے یہ اشعار دیئے گئے تھے

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں! بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا

مجھے فیض کے ان اشعار کو انگریزی میں ڈھالتے ہوئے اپنی علمی بے بضاعتی کا شدید احساس ہوا اور میں اس امتحان کے نتیجے کے بارے میں اُسی وقت مایوس ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ پرچہ مصطفیٰ زیدی، سیکرٹری لوکل گورنمنٹ نے بنایا تھا جو خود بھی بطور شاعر ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔

یہی حشر سٹیٹ بنک آف پاکستان کے امتحان کا ہوا۔ لاہور پہنچے تو پنڈال لگے ہوئے تھے اور ہزاروں امیدوار امتحان کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیا ہوا کہ پہلے پرچے کے بعد یہ امتحان کینسل کر دیا گیا۔ کئی ماہ بعد ہمیں دوبارہ بلایا گیا۔ وہی جانے پہچانے پریشانِ حال چہرے نظر آئے۔ امتحان تو ضرور ہوا لیکن اس کے نتیجے سے بے خبری ہی رہی۔

مجھے لاہور سے واپسی کا یہ سفر اس لحاظ سے بھی یاد ہے کہ جب میں بدوملہی کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی احمد حسن بھی پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ دراصل وہ بھی اسی گاڑی سے اترے تھے اور گھٹیالیاں جا رہے تھے۔ وہ گھٹیالیاں سے اپنی سرکاری بائیسکل پر یہاں پہنچے تھے اور انہوں نے اسی بائیسکل پر واپس جانا تھا۔ انہوں نے بکمالِ مہربانی پیشکش کی کہ اگر میں ان کے ہمراہ چلنا چاہوں تو انہیں خوشی ہوگی تاہم شرط یہ ہوگی کہ بائیسکل میں چلاؤں گا اور وہ سارا راستہ بائیسکل کے ''ڈنڈے'' پر تشریف فرما رہیں گے۔ میں نے یہ سوچ کر ان کی پیشکش قبول کر لی کہ میں پیدل چلنے کی اذیت سے محفوظ رہوں گا اور یہ سفر قدرے آرام سے گذر جائے گا۔ میں نے جلدی جلدی سامان کیریئر پر باندھا، پرنسپل صاحب کو آگے بٹھا کر خود کاٹھی پر بیٹھ گیا اور خراماں خراماں گھٹیالیاں کی جانب روانہ ہو گیا تاہم مجھے کیا پتا تھا کہ کون کون سے مقامات آہ و فغاں میرے منتظر ہیں۔

راستے میں ایک راجباہ آتا تھا اور سفر کا کچھ حصہ اس کے کنارے طے ہونا تھا۔ یہ کنارہ نہر کی پٹڑی کی طرح اتنا چوڑا نہ تھا کہ آمنے سامنے سے آنے والی سواریاں بہ آسانی گذر سکیں۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ سامنے سے اچانک ایک گدھا گاڑی جس پر ایندھن لدا ہوا تھا نمودار ہوئی۔ یہ ایندھن کسی درخت کی خشک خاردار ٹہنیوں پر مشتمل تھا۔ جب گدھا گاڑی قریب پہنچی تو میں بائیسکل کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کوئی ٹہنی کیریئر پر رکھے ہوئے سامان کے ساتھ اُلجھ گئی۔ بس پھر کیا تھا! بائیسکل بے قابو ہو گئی اور ہم دونوں پانچ چھ فٹ گہری کھائی میں جا گرے۔

حادثے کے صدمے سے سنبھلتے ہی مجھے سب سے پہلے مولوی احمد حسن کی فکر ہوئی مبادا وہ اس بدگمانی میں

مبتلا ہو جائیں کہ یہ ’’حرکت‘‘ انہیں تکلیف پہنچانے کے لیے جان بوجھ کر کی گئی ہے۔ یوں بھی وہ عمر رسیدہ اور منحنی جسم کے مالک تھے چنانچہ میں نے سب سے پہلے انہیں اُٹھایا اور کھڑا کر کے یہ تسلی کر لی کہ وہ ہر طرح سے خیریت کے ساتھ ہیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ چند معمولی خراشوں کے علاوہ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے اپنی طرف دھیان کیا تو پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی ہر تکلیف سے محفوظ رکھا ہے لیکن بائیسکل کا پچھلا پہیہ ٹوٹ کر فریم سے الگ ہو چکا ہے۔

اب ایک اور امتحان ہمارا منتظر تھا کیوں کہ ہمیں نہ صرف اپنا سامان بلکہ دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی یہ بائیسکل بھی ہمراہ لے جانی تھی۔ بہر حال اپنے اٹیچی کیس کے علاوہ بائیسکل کا اگلا حصہ میں نے پکڑ لیا اور پچھلا حصہ پرنسپل صاحب نے اور یوں ہم ہانپتے کانپتے منزلِ مقصود پر پہنچے۔

ایسے ہی ایک سفر کے دوران مجھے لاہور سے بدوملہی پہنچتے شام ہو گئی۔ اس وقت گھٹیالیاں جانے کے لیے کوئی سواری میسر نہ تھی اور اگر میں پیدل جانا چاہتا تو شاید آدھی رات کے وقت وہاں پہنچتا۔ اس زمانے میں امن عامہ کے حالات اس قدر مخدوش تو نہ تھے لیکن رات کی تاریکی میں یہ طویل سفر کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی چنانچہ کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے وہ رات ایک مقامی بیت میں گذارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری وہ رات کیسی گذری، آپ اس کی تفصیل نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ پھر بھی تجسس ہے تو حسن رہتاسی کی وہ مشہور نظم پڑھ لیجئے جو انہوں نے گوجرانوالہ کی بیت احمدیہ میں ایک رات گذارنے کے بعد لکھی تھی اور جس میں انہوں نے گویا میری وارداتِ قلبی ہی بیان کی ہے:

کچھ رات کے جبری روزے میں ، کچھ یادِ خدا میں شب گذری
کچھ گریہ میں ، کچھ زاری میں ، کچھ آہوں میں ، کچھ نالوں میں

ربوہ کی تاریخ کے حوالے سے اس دور کا ایک اہم واقعہ لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک کا ترکی میں ایک حادثہ میں انتقال اور ربوہ میں اُن کی تدفین ہے۔ میں اُن دنوں غالباً کالج میں موسمِ گرما کی تعطیلات کی وجہ سے ربوہ آیا ہوا تھا لہٰذا مجھے نہ صرف اُن کے جنازے میں شمولیت کا موقع مل گیا بلکہ اِن کی تدفین میں شامل ہونے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ جنرل اختر ملک کا نام آپ کے لیے نیا نہیں ہو گا۔

صد حیف کس جگہ پہ گرا تیرا خونِ گرم

لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک پاکستان کے ان نامور سپوتوں میں سے تھے جنہوں نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ سے پہلے کشمیر کے محاذ پر بعض ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ ان دنوں یہ بات عام طور پر کہی جا رہی تھی کہ اگر کشمیر کے محاذ پر کمان ان کے ہاتھ سے جنرل یحییٰ خان کو منتقل نہ کر دی جاتی تو جنگ کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا اور کشمیر پاکستان کا حصہ بن چکا ہوتا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی اشتعال انگیزیوں کا مسکت جواب دینے کے لیے پاک افواج نے یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنرل اختر ملک کی قیادت میں چھمب میں حیرت انگیز کارروائی کرتے ہوئے کسی مقابلہ کے بغیر دریائے توی عبور کر لیا تھا جس کے بعد پاک افواج جوڑیاں کی طرف بڑھنے لگیں۔ چھمب سیکٹر میں پاک فوج کے اس حملہ کو آپریشن گرینڈ سلیم کا نام دیا جاتا ہے اور یہ حملہ ہندوستانی فوج کے لیے بے حد تباہ کن ثابت ہوا۔

چھمب بھارت کی ایک مضبوط فوجی چھاؤنی تھی لیکن پاکستان کی جواں ہمت افواج نے ایک ہی ہلّے میں دشمن کے قدم اکھاڑ دیئے اور ان کے لیے راہِ فرار اختیار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ رہا۔ ڈاکٹر محمود الحسن ایمن آبادی کے الفاظ میں:

دشمنوں کی سپاہ سے پوچھو
کس بلا کا دلیر تھا اختر
کس کی طاقت تھی سامنے آئے
آدمی تھا کہ شیر تھا اختر

پاکستانی افواج کا اصل ہدف اکھنور تھا اور اگر اکھنور پر قبضہ ہو جاتا تو ہندوستان کو سخت ہزیمت برداشت کرنا پڑتی۔ اس صورت میں وہ نہ تو سیالکوٹ پر یلغار کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنا سکتا نہ کشمیر پر اپنا غاصبانہ تسلط برقرار رکھ سکتا تاہم پاکستانی قیادت نے اپنی نااہلی سے یہ موقع خود اپنے ہاتھ سے گنوا دیا۔ ہوا یوں کہ جب جنرل اختر ملک کامیابی سے پیش قدمی کر رہے تھے انہیں کمان سے ہٹا دیا گیا۔ عام حالات میں کمان کی تبدیلی کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی لیکن ایک ایسے ملٹری آپریشن کے دوران جو طے شدہ منصوبے کے مطابق کامیابی سے ہمکنار ہو رہا ہو کمان کی تبدیلی انتہائی احمقانہ فعل سمجھا جاتا ہے جس کے بے حد منفی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ جنرل اختر ملک کی جگہ جنرل یحییٰ خان آئے لیکن کمان کی تبدیلی کی وجہ سے آپریشن میں تین دن کی تاخیر ہو گئی جس

دوران ہندوستانی افواج کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ بظاہر حاصل شدہ فتح کو اپنے ہاتھوں سے شکست میں تبدیل کر دیا گیا اور جنرل یحییٰ خان بھی اکھنور نہ پہنچ سکے۔

لیفٹیننٹ جنرل سرفراز خان نے اپنے مضمون ''جنگ ستمبر ۶۵ء: چند سربستہ حقائق'' مطبوعہ روزنامہ جنگ (۶ ستمبر ۱۹۸۴ء) میں بھی اس بات کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ جنرل اختر ملک نے چھمب جوڑیاں محاذ پر جس جرأت مندانہ انداز میں پیشقدمی کر کے مطلوبہ اہداف کے حصول کی بنیاد رکھ دی تھی اسے کمانڈ کی بے موقع تبدیلی نے ناکام بنا دیا۔ ان کی رائے میں کمانڈ کی تبدیلی کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ اس محاذ پر کامیابی کا سہرا ایوب خان کے چہیتے یحییٰ خان کے سر باندھا جا سکے لیکن ایسا کرتے ہوئے کسی نے یہ نہ سوچا کہ کیا ایسا ممکن بھی ہے۔ جنرل سرفراز خان کے الفاظ میں: ''جس ہنرمندی سے اختر ملک نے چھمب پر اٹیک کیا اسے شاندار فتح کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ آگے بڑھ کر جوڑیاں پر قبضہ کر لیں کیوں کہ چھمب کے بعد دشمن کے قدم اُکھڑ چکے تھے اور وہ جوڑیاں خالی کرنے کے لیے فقط پاکستانی فوج کے آگے بڑھنے کے انتظار میں تھے مگر ایسے نہیں ہونے دیا گیا کیوں کہ پکی پکائی پر یحییٰ خان کو بٹھانے اور کامیابی کا سہرا ان کے سر باندھنے کا پلان بن چکا تھا لیکن نقصان کس کا ہوا؟ بھارت کو مکمل شکست دینے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔''

الطاف گوہر نے اپنی کتاب ''ایوب خان: پاکستانز فرسٹ ملٹری رُولر'' میں ''کشمیر میں پاکستان کی مہم جُوئی'' کے عنوان سے ان واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن کا تعلق رَن آف کچھ کی لڑائی، آپریشن جبرالٹر اور آپریشن گرینڈسلیم سے ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے جنرل اختر ملک کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

جنرل اختر ملک کی آپریشن گرینڈسلیم کی کمان سے علیحدگی کے فیصلے پر بہت قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ اُس وقت جی ایچ کیو میں عام تاثر یہ تھا کہ ایوب خان کمزور اعصاب کا مالک ہے اور جب پاکستانی افواج اکھنور پر قبضہ کر کے بھارت کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کرنے والی تھیں ایوب خان نے یہ آپریشن ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ بھارت کو پاکستان پر کھلم کھلا جنگ مسلط کرنے کا بہانہ نہ مل سکے۔ بھٹو بھی تبدیلی کمان کے فیصلے کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ سچ پوچھیئے تو کمان کی تبدیلی نے جنرل اختر ملک کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا کیوں کہ ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان کے منصوبے کو کس طرح ناکام بنا دیا گیا ہے۔ ۴ ستمبر کو سیکرٹری اطلاعات سے گفتگو کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کہہ رہے تھے: میں ابھی تک طے نہیں کر پایا کہ میں اپنے بچوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکے۔ انہوں نے کسی کے خلاف ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا۔ میرے نزدیک جی ایچ کیو اور ہماری وزارتِ خارجہ نے یہ فیصلہ اپنی نااہلیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا تھا اور اس کے ذمہ دار جنرل موسیٰ اور بھٹو دونوں تھے۔

کرنل رفیع الدین جو راولپنڈی جیل میں بھٹو کی سیکیورٹی کے انچارج تھے اپنی کتاب ''بھٹو کے آخر ۳۲۳

دن'' میں بھٹو کے ساتھ اپنی گفتگو کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایک دن پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء کا ذکر چھڑا۔ میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ جناب! آپ اس زمانے میں وزیر خارجہ تھے۔ ہمارے فارن آفس نے اس جنگ سے پہلے یہ کیوں نہ سوچا کہ ہندوستان ہماری سرحدوں پر حملہ کردے گا۔ کہنے لگے کہ دفتر خارجہ نے تو اس کا اندازہ لگا لیا تھا لیکن فیلڈ مارشل ایوب خان نے ایک جائنٹ میٹنگ میں اس امکان کو رد کر دیا تھا۔ اسی دوران وہ کہنے لگے کہ جنرل ہیڈ کوارٹر نے بھی تو اسی غلطی کا اعادہ کیا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ جنرل اختر ملک کو کشمیر کے چھمب جوڑیاں محاذ پر نہ روک دیا جاتا تو وہ کشمیر میں ہندوستانی افواج کو تہس نہس کر دیتے مگر ایوب خان تو اپنے چہیتے جنرل یحییٰ خان کو ہیرو بنانا چاہتے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے اس تذکرے کے دوران بھٹو صاحب نے جنرل اختر ملک کی بے حد تعریف کی۔ کہنے لگے اختر ملک ایک باکمال جنرل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا سالار تھا۔ وہ بڑا بہادر اور دل گردے کا مالک تھا اور فنِ سپاہ گری کو خوب سمجھتا تھا۔ اس جیسا جنرل پاکستان فوج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے، باقی سب تو جنرل رانی ہیں۔''

اس نازک موقع پر جنرل اختر ملک کی کمان سے سبکدوشی کی اصل وجوہات کیا تھیں، اس بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق جنرل ایوب، جنرل موسیٰ یا جنرل یحییٰ نے انہیں کبھی اس تبدیلی کی وجوہات سے آگاہ نہیں کیا لہٰذا اس موضوع پر کسی قیاس آرائی کی حیثیت صرف قیاس آرائی ہی کی ہوگی تاہم جیسا کہ جنرل سرفراز خان، الطاف گوہر اور بھٹو نے تسلیم کیا ہے جنرل اختر ملک کی کمان سے علیحدگی کی وجہ سے پاک فوج کے مقبوضہ کشمیر پر کنٹرول حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

کچھ عرصہ بعد ان کی تعیناتی سینٹو میں پاکستان کے فوجی نمائندے کے طور پر انقرہ میں ہوئی۔ اِسی دوران وہ اِزمیر سے انقرہ کے ایک سفر کے دوران ۲۲ اگست ۱۹۶۹ء کو کار کے ایک حادثہ میں وفات پا گئے۔ حادثہ اس قدر شدید تھا کہ ان کی اہلیہ سعیدہ بیگم جو اِس سفر میں ان کے ہمراہ تھیں بھی موقع پر دَم توڑ گئیں۔

صد حَیف کس جگہ پہ گرا تیرا خونِ گرم
اپنے وطن سے دُور تجھے جس کا درد تھا

جنرل اختر ملک جن اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے اُن کا اعتراف وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مختلف فوجی مبصرین کر رہے ہیں۔ روزنامہ الفضل (تیرہ اگست ۲۰۱۲ء) میں راجہ نصر اللہ خان نے اپنے ایک مضمون میں ڈیلی ٹائمز، لاہور کے چار اکتوبر ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں بریگیڈیئر (ر) شوکت قادر کے قلم سے چھپنے والے ایک مضمون کے بعض اقتباسات کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خداتعالیٰ نے جنرل اختر ملک کو کن صفاتِ حسنہ سے متصف کر رکھا تھا۔ بریگیڈیئر (ر) شوکت قادر کے الفاظ میں:

''میں نے اپنے گزشتہ ہفتے کے مضمون میں میجر جنرل اختر ملک کے متعلق چند کلمات تو کہے تھے لیکن وہ کافی نہیں تھے۔ وہ ایک دلیر اور جری کمانڈر تھے جو دباؤ میں بھی گھبراتے نہیں تھے اور پُرسکون رہتے تھے اور اپنے

جوانوں میں اعتماد کی جوت جگا دیتے تھے، نہ صرف افسروں میں بلکہ سپاہیوں میں بھی جس سے ان لوگوں کے حوصلے کہیں بلند ہو جاتے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں ''آپریشن گرینڈ سلیم یکم ستمبر کو صبح سویرے پانچ بجے شروع ہونا تھا۔ یہ منصوبہ بندی کے مطابق شروع ہوا۔ چھمب مقررہ وقت کے اندر سرنگوں ہو گیا اور پہلی روشنی کے جلد بعد صبح سات بجے کے قریب ہماری افواج نے دریائے توی کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ آگے کی جنگی کارروائی تیزی سے جاری رہی اور بعد دوپہر ایک بجے تک افواج نے اپنی نفری اور پوزیشن مستحکم کر لی اور اب وہ اپنے مربوط خطوں میں داخل ہونے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ یہاں سے روشنی ختم ہونے سے کافی وقت پہلے قریباً ۳ بجے سہ پہر اکھنور پر حملے کا آغاز کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال اکھنور تک پہنچنا ہماری قسمت میں نہ تھا۔''

اگرچہ میں مرحوم سے ذاتی طور پر متعارف نہ تھا لیکن پاکستان کے لیے ان کی ناقابلِ فراموش خدمات کی وجہ سے ان کی وفات کی خبر سے مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ مرحوم کی تدفین ان کے آبائی گاؤں پنڈوری میں کئے جانے کا پروگرام تھا لیکن جب اسے تبدیل کر کے انہیں ربوہ میں سپردِ خاک کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ اس طرح میں بھی پاکستان کے اس بطلِ جلیل کی نمازِ جنازہ اور ان کے لیے دعائے مغفرت میں شامل ہو سکتا تھا۔

روزنامہ الفضل تیئس احسان ۱۳۴۹ھش میں محمد اکرم منہاس کے قلم سے شائع ہونے والے ایک مضمون میں اس فیصلے کی تبدیلی کی وجوہات اس طرح بیان کی گئی ہیں:

''اختر صاحب مرحوم کا ربوہ کے قبرستانِ شہیداں میں دفن ہونے کا واقعہ بھی ایسا ہے کہ اس میں صاف الٰہی تصرّف کام کرتا نظر آتا ہے۔ مرحوم کے والدِ ماجد ملک غلام نبی صاحب اپنی وصیت کے مطابق ربوہ کے بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ جنرل صاحب جب ترکی سے آئے تو میرے ساتھ ربوہ گئے۔ ملک صاحب مرحوم کی قبر پر دعا کرنے کے بعد انہوں نے ایک خاص تڑپ کے ساتھ یہ الفاظ کہے Who would not like to be buried here یعنی کون یہاں دفن ہونا پسند نہ کرے گا؟

جنرل صاحب کی وفات پر ان کے تابوت پاکستان پہنچنے کے پروگرام کا اعلان ہوا تو ان کے بعض اعزہ کی خواہش کے مطابق ان کے دفن کا انتظام ان کے آبائی گاؤں پنڈوری میں کیا گیا لیکن بعد میں جب ان کے تابوت کے آنے میں تین دن التوا ہو گیا تو اس سے مجھے اور دیگر عزیزوں کو سوچنے کا موقع ملا۔ مرحوم کی خواہش کے مطابق ان کو اور ان کی اہلیہ محترمہ کے تابوت کو ربوہ قبرستانِ شہیداں میں پہلو بہ پہلو دفن ہونے کا فیصلہ ہو گیا۔ الحمدللہ۔ ہزارہا احباب ربوہ آتے ہیں۔ وہ خاص طور پر قبرستانِ شہیداں جا کر دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ میرا دل روحانی خوشی محسوس کرتا ہے۔''

تاہم اس مضمون سے وہ وجوہات واضح نہیں ہوتیں جو بالآخر اس فیصلے میں تبدیلی پر منتج ہوئیں چنانچہ میں نے اس واقعہ کے مدتوں بعد ایک بار مرحوم کے داماد، نواز منہاس سے پوچھا: ''اس فیصلے میں تبدیلی کے اصل

اسباب کیا تھے؟''

''جنرل اختر ملک کی پنڈوری میں تدفین کا فیصلہ بنیادی طور پر ان کے بہنوئی ملک محمد جعفر کا تھا جنہوں نے ان کے بھائی جنرل عبدالعلی ملک کو بھی اس معاملے میں اپنا ہمنوا بنالیا تھا'' نواز منہاس نے بتایا'' لیکن بعد میں خاندان کے بعض افراد جن میں میرے والد بھی شامل تھے یہ فیصلہ بدلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ فیصلے میں تبدیلی کی ایک وجہ بیگم جنرل اختر ملک کی یہ خواہش بھی تھی کہ انہیں اپنے شوہر کے پہلو میں دفن کیا جائے جب کہ وہ خود موصیہ تھیں اور جنرل اختر ملک غیر موصی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی اجازت سے اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ ان دونوں کی تدفین قطعہ شہدا میں کر دی جائے۔''

پروگرام کے مطابق ان کا جنازہ ۲۶ اگست ۱۹۶۹ء کو ربوہ پہنچنا تھا اور اسی نسبت سے صبح سے ہی اس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ایک ہیلی کاپٹر ربوہ کی فضا میں منڈلانے لگا۔ بہت سے لوگوں نے ہیلی کاپٹر کے رُخ کے مطابق اس کے اُترنے کی جگہ کا اندازہ لگا کر اس طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ میں بھی ان افراد میں شامل تھا لیکن یہ ہیلی کاپٹر کسی کُھلے میدان کی بجائے قصرِ خلافت کی چار دیواری کے اندر اُتر گیا۔ یوں میں ہیلی کاپٹر کے پاس نہ پہنچ سکا جس کا مجھے مدتوں افسوس رہا۔ شاید اس افسوس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ کسی ہیلی کاپٹر کو قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع ہوتا جو ضائع ہو گیا تاہم میں نالائق سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب میں ملک کی ایک مقتدر شخصیت کے ساتھ خود ایک سے زیادہ بار ہیلی کاپٹر میں سفر کروں گا۔

مرحومین کی نمازِ جنازہ مولانا ابو العطا جالندھری نے پڑھائی جس کے بعد دونوں جنازے ایک جلوس کی صورت تدفین کے لیے قطعہ شہدا لائے گئے۔ ماتمی جلوس کی قیادت پاک فوج کا ایک دستہ کر رہا تھا جس کی سربراہی لیفٹیننٹ خلیل احمد کر رہے تھے۔ خلیل سے میں ذاتی طور پر متعارف تھا۔ وہ ڈاکٹر نذیر احمد کے فرزند اور محلہ دارالصدر غربی کے رہائشی تھے۔ وہ کالج میں مجھ سے ایک سال سینئر تھے اور اپنے دوستوں کے حلقہ میں خلیل پاوا کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ جنگ ستمبر کے بعد فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔

انہیں اس فوجی دستہ کی قیادت کرتا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور ہمیشہ خیال رہا کہ ان سے معلوم کیا جائے کہ اس فوجی دستہ کی قیادت کے لیے ان کا چناؤ محض اتفاق تھا یا اس کا کوئی خاص سبب تھا تاہم وقت گذرتا گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ جب میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کی تو میں نے ان سے انگلینڈ میں رابطہ کیا اور جب جنرل اختر ملک کی آخری رسومات کا ذکر ہوا تو انہوں نے بتایا: ''فوجی روایات کے مطابق کسی مرحوم افسر کو سلامی دینے کی ذمہ داری بنیادی طور پر اس کی اپنی رجمنٹ کی ہوتی ہے۔ جنرل اختر ملک کا تعلق ۱۹ پنجاب رجمنٹ سے تھا جو اُن دنوں آزاد کشمیر میں بھمبر کے مقام پر متعین تھی۔ میں بھی اسی رجمنٹ میں تھا اور ربوہ سے میرے تعلق کا علم سب کو تھا چنانچہ ہمارے کمانڈنگ افسر نے اس کام کے لیے میرا انتخاب کیا جس پر مجھے آج بھی فخر ہے۔''

''آپ یہ دستہ لے کر ربوہ کب پہنچے تھے؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''میں اپنے دستے کے ساتھ تدفین سے ایک دن پہلے ربوہ پہنچ گیا تھا۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ ہر فوجی

دستہ اپنی رہائش اور کھانے پینے کی ضرورت کا جملہ سامان ہمراہ لے کر چلتا ہے چنانچہ ہمارے پاس بھی یہ تمام چیزیں موجود تھیں۔ ربوہ میں ہمارا استقبال عبداللطیف نھانے جو غالبا دارالضیافت کے انچارج تھے کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ ہمیں پڑاؤ کی جگہ دے دیں، باقی سارا انتظام ہمارا اپنا ہوگا تو انہوں نے بتایا کہ انجمن کی طرف سے اس دستہ کی رہائش اور کھانے پینے کے جملہ انتظامات کئے جا چکے ہیں اور اس سلسلہ میں ہمیں فکرمند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ وہ ہمیں جامعہ احمدیہ میں لے گئے جہاں ہماری رہائش کا انتظام تھا۔ کھانا دارالضیافت سے آجاتا تھا چنانچہ ہم اپنا سامان جس طرح لے کر گئے تھے اسی طرح واپس لے آئے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہمارے فوجیوں پر اس میزبانی کا بہت اچھا اثر ہوا۔''

''کچھ سلامی کے بارے میں بتایئے۔''

''اگلے روز صبح ہی صبح ہم نے سلامی کی ریہرسل کی اور قصرِ خلافت پہنچ گئے جہاں ہیلی کا پٹر اتارے جانے کا پروگرام تھا۔ وہاں پر حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد، حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد اور بعض دیگر احباب موجود تھے۔ اسی دوران ہم نے جنرل اختر ملک کو ملنے والے میڈلز حسبِ ضابطہ ایک فریم میں آویزاں کر لیے تھے اور یہ فریم ایک نائب صوبیدار کے سپرد کر دیا تھا جسے اس کو اُٹھا کر جنازے کے آگے آگے چلنا تھا۔''

''اس حوالے سے کوئی خاص بات؟''

''یہ اللہ کا فضل ہے کہ مجھے ماتمی جلوس کو لیڈ کرنے کا موقع ملا اور ہم نے مرحوم کو سَیون گن فائر سیلیوٹ کے ساتھ سفرِ آخرت پر روانہ کیا۔ خدا تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔''

یہ تو تھا لیفٹیننٹ اور اب میجر (ر) خلیل احمد کا بیان اس سَیون گن فائر سیلیوٹ کے بارے۔ جہاں تک مردِ مجاہد کو الوداع کہنے کے لیے ماتمی جلوس کے راستے میں جمع ہونے والے مردوں اور عورتوں کے انبوہِ کثیر کا تعلق ہے، میری دانست میں یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مرحوم کا صرف نام ہی سنا تھا، ان کے محیّر العقول کارناموں کے بارے میں پڑھا تھا یا ان کی تصویر دیکھی تھی لیکن کبھی ان سے ملے نہ تھے۔ انہیں جنرل اختر ملک کی عقیدت یہاں کھینچ لائی تھی اور ان ہی عقیدتمندوں میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔

ضمیر جعفری نے اسی موقع کے لیے کہا تھا:

ہر طرف لوگ ہیں
ایک مغموم انبوہِ پیر و جواں
مرد و زن، ہم وطن!
دل فگار آئے ہیں
شہر و قصبات سے
دور نیلے اُفق کی لکیروں کے پیچھے جہاں آسماں
خاکِ پاکِ وطن کی جبیں چومتا ہے

فلک جھک کے لوحِ زمیں چومتا ہے
دھندلکے میں بکھرے ہوئے، ملگجے، نیم بیدار، معصوم دیہات سے
لوگ آئے ہیں اور سوگوار آئے ہیں
بے قرار آئے ہیں۔
ان میں کتنے ہی وہ لوگ ہیں جو تجھے فرد کے طور پر جانتے بھی نہیں
تیری صورت کو پہچانتے بھی نہیں
تیرا ایثار و کردار پرکھا تو تھا، اور سراہا بھی تھا
تجھ کو چاہا تو تھا، تجھ کو دیکھا نہ تھا
لیکن اک رشتہ روح و جاں میں بندھے
درد کے قافلے، اشکبار آ گئے
قلبِ خوں گشتہ و چشمِ تر لائے ہیں
اپنی روحوں کا غم، اپنی نمناک آنکھوں میں بھر لائے ہیں

جب میتوں کو سپردِ خاک کیا جا رہا تھا، فوجی بینڈ نے فضا میں ماتمی دھنیں بکھیرنا شروع کر دیں۔ کم از کم میں نے اس سے پہلے ربوہ میں یہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ تدفین کے بعد مرحومین کی بلندی درجات کے لیے اجتماعی دعا کی گئی۔

جنرل اختر ملک کی قبر پر نصب کتبے سے پتا چلتا ہے کہ مرحوم کی پیدائش یکم اگست ۱۹۱۷ء کی تھی اور انہیں ان کے مختلف کارہائے نمایاں کی وجہ سے ستارہ قائداعظم اور ہلال جرأت کے اعزازات سے نوازا گیا تھا۔

مرحوم کی اہلیہ کا نام سعیدہ بیگم تھا اور وہ مراڑہ ضلع سیالکوٹ کے چوہدری عبدالغفور کی صاحبزادی تھیں۔ وہ عمر میں اپنے شوہر سے نو برس چھوٹی تھیں۔ مرحومہ موصیہ تھیں اور اپنے حسنِ اخلاق کی وجہ سے ایک وسیع حلقہ احباب میں بے حد مقبول تھیں۔

جنرل اختر ملک کے کتبے پر بعض دیگر تفصیلات کے علاوہ حافظ اور اقبال کے یہ دو اشعار بھی بطور خراجِ تحسین درج ہیں:

ہرگز نمیرد آں کہ دِلش زندہ شُد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

چہ باید مرد را؟ طبعِ بلندے مشربے نالے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان اشعار میں وہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو جنرل اختر ملک میں

گوٹ گوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے کہ موت عاشقِ صادق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیوں کہ اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود اُسے فراموش نہیں جا سکتا۔ علامہ اقبال کے نزدیک مرد کہلانے کے لیے جن خصوصیات کا حامل ہونا ضرور ہے ان میں بلند ہمتی، جذبۂ بے پناہ، پاکیزگی نگاہ اور جاںنثاری شامل ہیں اور آپ خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ کیا جنرل اختر ملک میں یہ تمام خوبیاں موجود نہ تھیں؟

اختر حسین ملک کے بھائی، جنرل عبدالعلی ملک نے ان کی دردناک وفات پر کیا خوب کہا تھا:

ہائے خاموش ہوگیا اختر
دائمی نیند سو گیا اختر
کن خیالوں میں کھو گیا اختر
دل میں کیا غم سمو گیا اختر
جا کے ڈوبا دیارِ غربت میں
ہم سے مایوس ہو گیا اختر
تھا حوادث سے برسرِ پیکار
لڑتے لڑتے ہی سو گیا اختر
تیرے شیدائیوں کا جمِ غفیر
غم سے بے حال ہوگیا اختر
کر کے روشن چراغ یادوں کے
آپ رُوپوش ہو گیا اختر
صبحِ امید تو نہیں آئی
جاں افق میں سمو گیا اختر

تو یہ تھا جنرل اختر ملک کا ذکرِ خیر!

اب میں اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے گھڑیالیاں میں پیش آمدہ مشکلات کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور قاضی محمد اسلم کی شکل میں ایک فرشتہ میری مدد کے لیے کھڑا کر دیا۔ خدا تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میں چاہوں بھی تو ان کی نیکیوں کا بدلہ نہیں اُتار سکتا۔ ہاں! ان کی بلندی درجات کے لیے دعا ضرور کر سکتا ہوں اور سچی بات ہے میں اس کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔

اس کی چشمِ نیم وا کے میں بھی سرشاروں میں ہوں

مجھے حصولِ ملازمت کے سلسلے میں جب بھی کسی سفارش کی ضرورت پیش آتی، میں قاضی محمد اسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور اگر کوئی مجبوری سفر میں مانع ہوتی تو خط کے ذریعہ اپنا مدعا بیان کر دیتا۔ اگر وہ متعلقہ شخص کو جانتے تو بلا تامل اس کے نام تعارفی خط دے دیتے۔ ان کی ہمدردی اور خلوص شک وشبہ سے بالاتر تھا۔

میں نے سُن رکھا تھا کہ سی ایس ایس کے امتحان کے لیے درخواست کے ہمراہ اُس کالج کے پرنسپل کی طرف سے جاری کردہ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی فراہم کرنا ہوتا ہے جہاں امیدوار نے تعلیم حاصل کی ہو۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ امتحان کب ہوگا لیکن چاہتا تھا کہ یہ سرٹیفکیٹ بنوا رکھوں تاکہ ضرورت پڑنے پر کوئی پریشانی نہ ہو تاہم مسئلہ یہ تھا کہ قاضی صاحب ان دنوں کولہے کے فریکچر کی وجہ سے لاہور میں اپنے گھر میں آرام کر رہے تھے جب کہ ان کی مہر ربوہ میں ان کے دفتر میں پڑی تھی۔ میں مارچ ۱۹۶۹ء کی ایک دوپہر ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کام کو مؤخر کرنے کی نہ جانے کتنی وجوہ تلاش کر لیتا اور وہ شاید صحیح بھی ہوتیں لیکن آفرین ہے قاضی صاحب پر۔ میں کبھی ان کا باقاعدہ سٹوڈنٹ بھی نہ رہا تھا لیکن انہوں نے فوراً کاغذ قلم سنبھالا اور اپنے ہاتھ سے سرٹیفکیٹ لکھ کر میرے حوالے کر دیا جس میں میرے ضروری کوائف درج کرنے کے بعد انہوں نے لکھا تھا:

"Daud Tahir has been in close touch with me and I came to have a great respect for his scholarship and character. I have also seen and read with interest some of his articles. He writes with great care and seems to specialize in biographical sketches. He speaks at public meetings with success. Tahir is a young man who reads and thinks. He might to do well in life."

قاضی صاحب کے ساتھ ملاقات میرے لیے ہمیشہ ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوئی۔ وہ میری ہر گذارش بہت توجہ کے ساتھ سنتے اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے جس کی وجہ سے میں ان کے ساتھ گونہ بے تکلفی سے بات کر لیتا تھا۔ اس روز انہوں نے ذکر کیا کہ انہیں رات کو ویلیئم لیے بغیر نیند نہیں آتی۔ میں نے اپنی نادانی میں ویلیئم اور اس طرح کے دیگر مسکّن ادویہ کے بارے میں سنی سنائی یہ بات کہہ دی کہ اگر ان کی عادت پڑ جائے تو پھر ان کے بغیر گذارہ نہیں ہوتا۔ قاضی صاحب میری بات سن کر ہلکا سا مسکرائے اور فرمانے لگے: ''اب مجھے کیا عادت پڑنی ہے۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں آرام سے گذر جائیں تو اچھا نہیں؟''

مجھے یاد ہے میں نے ان سے اسی ملاقات کے دوران یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا انہوں نے کبھی بطور

سائیکالوجسٹ پریکٹس کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ شروع میں پریکٹس کیا کرتے تھے لیکن بوجوہ یہ سلسلہ تادیر جاری نہ رہ سکا۔ تفصیل کے مطابق جن دنوں وہ داتا دربار کے سامنے کسی گھر کی بالائی منزل پر رہا کرتے تھے ایک دفعہ رات گئے کسی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہوں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک آدمی سر پر بستر اٹھائے کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ان کا ایک مریض ہے جو اُن دنوں اُن کے زیرِ علاج تھا۔ وہ چلا رہا تھا کہ اسے اپنے ڈاکٹر کے بغیر نیند نہیں آ رہی لہٰذا وہ بستر لے کر آ گیا ہے اور اب وہ ان کے ساتھ، ان ہی کے گھر میں رہے گا۔ قاضی صاحب نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ان کے لیے ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس سے بچ نکلنے کا انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرح کے ایک دو اور واقعات کے بعد ان کی بیگم مریضوں کی طرف سے ان کی پرائیویٹ لائف میں مداخلت پر سراپا احتجاج بن گئیں اور گھر میں ہر وقت چپقلش رہنے لگی چنانچہ انہیں یہ کام چھوڑنا پڑا۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے قاضی محمد اسلم کی وفات کے بعد ان کے سب سے بڑے صاحبزادے، قاضی منصور احمد، سابق سفیر پاکستان اور اُن کی صاحبزادی، شاہدہ اہلیہ پروفیسر ڈاکٹر محمد شمیم سے بھی ملاقات کا موقع ملتا رہا جس دوران قاضی محمد اسلم کے بارے میں مجھے بعض حیران کن باتوں کا پتا چلا اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ قاضی محمد اسلم صرف مجھ ہی پر مہربان نہ تھے، وہ ہر ضرورت مند کی اسی جوش و جذبہ سے مدد کرتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شمیم کے پاس قاضی محمد اسلم کے نام نوبل انعام یافتہ احمدی سائنس دان، ڈاکٹر عبدالسلام کا ایک خط موجود ہے جو انہوں نے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے پیڈ پر لکھا ہوا ہے اور ذیل میں تبرکاً شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے:

DIRECTOR
ABDUS SALAM

12 February 1980

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

Dear Qazi Aslam السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

I deeply appreciate your letter and will keep an eye open for Dr. Nisar Ahmad. He is a highly talented man. It is a pity that he spoiled his chances at the Ministry where he would have been ideal.

With kindest regards,

Yours sincerely,
عبدالسلام
Abdus Salam

Mr. Q.M. Aslam,
14-S Gulberg 2.
Lahore 2. Pakistan

اس ٹائپ شدہ خط کی معافی چاہتا ہوں۔

یاد رہے کہ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کے استاد تھے اور انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں بھی پڑھایا ہے۔

شاہدہ کا بیان ہے کہ ان کے والد بزرگوار ایک چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے اور ان کی پڑھائی کے زمانے میں وہی ان کی اتالیق بھی تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی رہنمائی کے لیے ہر وقت تیار رہتے جس کے نتیجے میں باقی طلبہ کے مقابلے میں ان کی کارکردگی ہمیشہ بہت بہتر رہتی چنانچہ ان کے ساتھی طلبہ نے یہ کہہ کر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ ان کا مقابلہ شاہدہ کے ساتھ نہیں بلکہ قاضی محمد اسلم کے ساتھ ہے۔

قاضی محمد اسلم بلا کے مردم شناس تھے۔ شاہدہ بتاتی ہیں کہ ایک بار گورنمنٹ کالج لاہور کا ایک ذہین و فطین طالب علم جو آکسفورڈ سے بھی فارغ التحصیل تھا کسی امتحان میں ان کے ساتھ Co-examiner بن گیا۔ اسی دوران اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا جس کی وجہ سے قاضی محمد اسلم نے اس تاثر کا اظہار فرمایا کہ یہ نوجوان ایک بددیانت افسر ثابت ہوگا۔ اتفاق دیکھئے اس نوجوان نے سنٹرل سپیرئیر سروسز آف پاکستان کا امتحان دے رکھا تھا اور نتیجے کا منتظر تھا۔ نتیجہ آیا تو وہ سول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہوگیا لیکن بہت تھوڑے عرصے کے بعد بددیانتی کے الزامات کے تحت ملازمت سے برخواست کر دیا گیا۔

مجھے بتایا گیا کہ جب قاضی محمد اسلم کیمبرج میں پڑھتے تھے تو یونیورسٹی کی روایات کے مطابق ایسے لیکچرز بھی بکثرت سنا کرتے تھے جن کا ان کے اپنے مضمون کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی دوران خوش قسمتی سے انہیں مشہور مستشرق، پروفیسر نکلسن اور مترجم قرآن، پروفیسر آربری سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ انہیں خط وکتابت کا شوق تھا چنانچہ ان کی گاندھی، برٹرینڈ رسل اور پروفیسر آرچر سے بھی خط وکتابت رہی۔ بدقسمتی سے ان زعماء کے خطوط زمانے کی دست برد کا شکار ہو چکے ہیں۔

یہ بات تو میرے ذاتی تجربے میں بھی تھی کہ قاضی صاحب خط وکتابت میں بہت باقاعدہ تھے لیکن یہ انکشاف میرے لیے حیرت انگیز تھا کہ جب انہوں گلبرگ میں اپنی کوٹھی تعمیر کی تو محکمہ ڈاک کے کسی افسر سے کہہ سن کر اس کے بالکل سامنے ایک لیٹر بکس لگوایا۔ وہ جوں ہی کوئی خط مکمل کر لیتے اسے لفافے میں ڈالتے، اس پر مکتوب الیہ کا پتا لکھتے اور پھر اسے لیٹر بکس میں ڈال کر دم لیتے۔ اس طرح انہیں بسا اوقات دن میں کئی کئی بار گھر سے باہر جا کر خطوط لیٹر بکس میں ڈالنا پڑتے لیکن وہ اس سے نہ گھبراتے۔ ان کی یہ عادت دراصل ان کی اس خواہش کی غماز تھی کہ ان کا خط مکتوب الیہ تک بغیر کسی تاخیر کے پہنچ جائے۔

ایک بار میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر وہ لاہور ریجن کے ڈائریکٹر ایجوکیشن کو ذاتی طور پر جانتے ہوں تو ان کے نام ایک تعارفی چٹھی لکھ دیں تا کہ اگر ان کے ہاں لیکچرر کی کوئی اسامی موجود ہو تو وہ میرے تقرر پر غور کر سکیں۔ ان دنوں سیّد غلام مصطفےٰ شاہ ڈائریکٹر تھے۔ قاضی صاحب نے فی الفور ان کے نام ایک چھٹی لکھ کر میرے حوالے کر دی۔

یاد رہے یہ وہی غلام مصطفےٰ شاہ ہیں جو بعد میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ''سندھ کوارٹرلی'' نامی ایک معیاری تحقیقی جریدے کے ایڈیٹر، سندھ مدرسہ بورڈ کے صدر، پاکستان سکاؤٹس ایسوسی ایشن کے نیشنل کمشنر، نیشنل

اسمبلی کے ممبر اور مرکزی وزیر تعلیم بھی رہے۔ ان کا تعلق سندھ سے تھا اور وہ بہت وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں جو ان کے دبدبے میں اضافہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے قاضی صاحب کا خط پڑھا اور مزید کارروائی کے لیے مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز، پروفیسر افتخار الدین سے ملاقات کی ہدایت کی۔ پروفیسر افتخار الدین نے مجھے مقررہ فارم پر درخواست جمع کرانے کو کہا۔ میں نے اسی وقت درخواست مکمل کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ درخواست کے ساتھ میرا ڈومیسائل سرٹیفکیٹ بھی منسلک تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ میں ربوہ کا رہنے والا ہوں۔ یہ ان کا تجاہلِ عارفانہ تھا یا انہیں واقعی پتا نہ تھا کہ ربوہ کہاں واقع ہے اور اس کی وجہ شہرت کیا ہے۔ تب ان کے پی اے نے جو اُن کے پاس ہی کھڑا تھا انہیں بتایا کہ ربوہ ''مرزائیوں کا شہر'' ہے۔ اس پر انہوں نے قاضی محمد اسلم کے بارے میں طنزاً کہا: ''پھر تو یہ بھی وہی ہوں گے۔'' اس کے بعد انہوں نے نقشے پر ربوہ کا محل وقوع دیکھنے کے بعد مجھے بتایا کہ چونکہ ضلع جھنگ محکمانہ طور پر راولپنڈی ریجن کی حدود میں واقع ہے لہٰذا مجھے لاہور ریجن میں ملازمت کی توقع نہیں رکھنی چاہیے اور درخواست اُدھر بھیجنی چاہیے۔

اُن دنوں مظہر حسین کاظمی راولپنڈی ریجن کے ڈائریکٹر تھے۔ میں نے قاضی صاحب سے اپنی مدد کے لیے درخواست کی تو انہوں نے فوراً مظہر حسین کاظمی کے نام خط مجھے بھجوا دیا لیکن ساتھ ہی تاکید کی کہ مجھے سول سروس کے امتحان کی تیاری میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ ملاحظہ ہو ان کا لاہور سے لکھا ہوا یہ خط:

''کاظمی صاحب کے نام چھٹی حاضر ہے۔ غائبانہ میرا اور کاظمی صاحب کا آپس میں تعارف ہے۔ سُنا ہے اچھے شریف انسان ہیں۔ پنڈی کے دفتر میں اور صاحب بھی ہیں جو ہمارے ساتھ اچھا تعلق رکھتے ہیں۔ پنڈی میں کسی دوست کو لکھ رکھیں آپ کی درخواست کا خیال رکھیں۔

میں خدا کے فضل سے اور بہتر ہوں۔ نیا ایکس رے ہو چکا ہے۔ دیکھا تو نہیں، اُمید ہے بڑا اچھا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں مددگار ہو۔

سول سروس کا امتحان ضرور دینا ہے اور خوب تیاری کر کے اور انگریزی میں خوب پریکٹس کر کے۔''

قاضی صاحب نے سید غلام مصطفیٰ شاہ اور مظہر حسین کاظمی کے نام اپنے سفارشی خطوط میں میرے بارے میں بے پناہ حسنِ ظن کا اظہار کیا۔ طوالت کے خوف سے ان چھٹیوں کی نقول یہاں درج نہیں کی جا رہیں البتہ قاضی صاحب کے یہ الفاظ جو میرے لیے ایک سرٹیفکیٹ کا درجہ رکھتے ہیں برائے ریکارڈ نقل کئے جاتے ہیں:

انہوں نے سید غلام مصطفیٰ شاہ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

"I have a high opinion of his ability and character. Quiet and mature."

مظہر حسین کاظمی کے نام خط میں انہوں نے میرے بارے میں جس حسنِ ظن کا اظہار فرمایا وہ بھی میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ انہوں نے لکھا تھا:

"Daud Tahir is one of the old students, a perfect gentleman and devoted scholar. I got to know him well and learnt to respect him."

ایک بار میں نے قاضی صاحب سے پراونشل سول سروس کے بارے میں رائے طلب کی تو انہوں نے مجھے تفصیلی رہنمائی سے نوازا۔ اس وقت قاضی صاحب اپنی علالت کے سبب کالج سے رخصت پر تھے اور لاہور اپنے گھر میں آرام کر رہے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے فوری طور پر جواب سے سرفراز فرمایا۔ وہ اپنے خط مرقومہ ۹ جون ۱۹۶۹ء میں رقمطراز ہیں:

''پراونشل سول سروس میں بیٹھنا بھی اچھا ہے اور آپ کو اچھا مشورہ دیا گیا ہے۔ ایک دفعہ ذکر آیا تھا۔ سول سروس ہو یا کوئی سروس اس میں ڈاکٹری شرائط کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ آپ نے شاید اس پر اطمینان دلایا تھا۔ ایک تو یہ۔ دوسری یہ کہ کالج سے جو فارمل کیریکٹر سرٹیفکیٹ ملتا ہے وہ ضرور لیں۔ اس پر صوفی بشارت الرحمٰن کے دستخط ہوں گے۔ قانوناً ان ہی کے دستخط ہونے چاہئیں۔ تیسری بات مشورہ کی ہے اور وہ یہ کہ جیسی نکھری ہوئی اردو آپ لکھتے ہیں ویسی ہی نکھری ہوئی انگریزی بھی لکھنے کی مشق کریں۔ آپ کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ جنرل نالج کے لیے ویکلی اخبار اکانومسٹ یا اس قسم کا کوئی اور۔

پراونشل سول سروس کے معیار اور امتحان کی نوعیت کا اب مجھے علم نہیں لیکن قیاساً مشورہ دے رہا ہوں۔ ایسے (بمعنی مضمون۔ ناقل) کی مشق کیسے ہوگی؟ آپ خود ہی کوئی طریقہ ایجاد کریں۔ ہمارے کالج کے اعجاز الحق قریشی پراونشل اور سنٹرل، دونوں امتحانوں میں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان سے مشورہ مفید ہوگا۔

میں ابھی لاہور میں ہوں۔ خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب تو میری صحتیابی کی رفتار سے مطمئن ہیں۔ میں بھی مطمئن ہوں۔ روز قدم صحت کی طرف ہوتا ہے، بفضلہٖ تعالیٰ لیکن ابھی ربوہ جانے کے قابل نہیں۔''

اگرچہ میں نے صدر انجمن احمدیہ کے سکیل سے کم تنخواہ پر برضا و رغبت کام شروع کیا تھا لیکن مجھے ہر دم احساس رہتا تھا کہ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے لہٰذا میں اس کوشش میں رہتا تھا کہ کسی اور بہتر جگہ پر ملازمت اختیار کرلوں۔ اس حوالے سے میں نے ڈسٹرکٹ فیملی پلاننگ بورڈ، ساہیوال کو فیملی پلاننگ آفیسر کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ اُن دنوں مظفر قادر وہاں ڈپٹی کمشنر تھے جو شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی کے سربراہ، سی اے قادر کے صاحبزادے تھے۔ میں نے قاضی صاحب سے ان کے نام خط لکھنے کی فرمائش کی۔ قاضی صاحب کے ۸ جولائی ۱۹۶۹ء کے لاہور سے لکھے ہوئے خط میں میرے تقریباً تمام سوالات کا جواب موجود تھا:

''آپ کا خط (ملا)۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حالات میں سہولت فرمائے۔ گھٹیالیاں جیسا بھی ہے اس وقت اس سے بہتر جگہ آپ کے لیے نہیں سوائے اس کے کہ ربوہ کالج میں جگہ ہو۔ ربوہ میں جگہ ہو تو اب تھرڈ ڈویژن والا اعتراض بھی نہ ہوگا۔ کالج کی ملازمت میں (دوسری جگہ کی نسبت) مقابلہ کے امتحان کی تیاری میں پھر بھی فائدہ رہتا ہے۔ مضمون کی سمجھ زیادہ سے زیادہ اچھی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن آپ کو ۲۰۰ کس وجہ سے ملے۔ جو گریڈ مقرر ہے وہ کیوں نہیں ملا۔ آپ ایک کاغذ پر مختصر طور پر لکھ بھیجیں تو میں اس کے متعلق رپورٹ منگواؤں۔ ۲۰۰ کے قریب قریب تو اب کراچی میں مزدوروں کی تنخواہ ہونے والی ہے۔ کئی مزدور یہ تنخواہ لے رہے ہوں گے۔ کالج لیکچرر کا گریڈ جو ہے اس کی تنخواہ ملنی چاہیے۔ میری ذاتی رائے تو یہی ہے۔ باقی رپورٹ آنے پر، عارضی اور مستقل دونوں

کا گریڈ تو وہی ایک ہوگا۔

فیملی پلاننگ والی پوسٹ کی تنخواہ کیا بہت اچھی ہے؟ ویسے تو اس میں دورے کرنے ہوں گے اور وقت ضائع ہوگا۔ اس میں سفارش کی ضرورت ہوگی تو مظفر قادر کو میں خود لکھ دونگا۔ پہلے ایک دو کام ان کو کہے گئے تو خاص توجہ انہوں نے نہ دی۔ ویسے آپ کے اپنے کوائف اچھے خاصے ہیں۔

ہاں! ربوہ کالج میں کوئی پوسٹ ہے؟ اس کا پتا لگا کر لکھیں۔

میں پہلے سے اور بہتر ہوں۔''

پی ایس: ہاں! ڈاکٹری میں صرف آنکھوں کا قصہ ہی نہیں ہوتا باقی جنرل چیک اَپ بھی کروا چھوڑیں۔''

ان دنوں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں پولیٹیکل سائنس کے لیکچرر کی ایک پوسٹ خالی تھی۔ میں نے بھی اس پوسٹ کے لیے درخواست تو نہ دی تھی تاہم مجھے آف دی ریکارڈ یہ تاثر دیا جا تا رہا کہ چونکہ ایم اے کے امتحان میں میری تھرڈ ڈویژن ہے اس لیے یہاں پر میرا تقرّر ممکن نہیں۔ میں نے دوبارہ امتحان دے کر ڈویژن بہتر بنالی تھی لہٰذا میں سمجھتا تھا کہ اب میرے تقرّر میں کوئی روک نہیں ہونی چاہیے۔ جب میں نے اپنے خط میں دوبارہ یہ موضوع چھیڑا تو قاضی صاحب نے ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء کو لاہور سے مجھے ایک خط لکھا۔ خلافِ معمول یہ خط پوسٹ کارڈ پر لکھا گیا تھا اور ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

''میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اچھا ہوں۔

پولیٹیکل سائنس والی پوسٹ کے متعلق صوفی صاحب کا نظریہ ہوسکتا ہے کچھ اور ہو اس لیے آپ ان سے فوراً ملیں اور کھل کر بات کریں اور کہہ دیں کہ آپ کا سیکنڈ کلاس ہوگیا ہے اور اس لیے یہ معاملہ از سرِ نو اُٹھایا جارہا ہے۔

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سب کام استوار فرمائے۔''

خدا کی شان دیکھئے اس نے آہستہ آہستہ میرے سارے ہی کام استوار فرما دیئے۔

وقت مسرت نہیں یہ ہمت و کوشش کا ہے وقت

میں اسی دوران ربوہ گیا تو کسی اخبار میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن (جو اُن دنوں سنٹرل پبلک سروس کمیشن کہلاتا تھا) کی طرف سے ایک اشتہار میری نظر سے گذرا جس کے مطابق سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان کا امتحان برائے ۱۹۶۹ء اگلے چند ماہ میں متوقع تھا۔ اُس زمانے میں فون کی سہولت آج کی طرح عام نہ تھی چنانچہ میں نے راولپنڈی میں مقیم اپنے دوست منظور صادق کو خط لکھا کہ وہ کمیشن کے دفتر سے اس امتحان کا درخواست فارم حاصل کر کے فوری طور پر مجھے بھجوا دیں۔ انہوں نے یہ فارم اگلے ہی روز مجھے ارسال کر دیا۔

یہ فارم سولہ صفحات پر مشتمل تھا اور اسے پُر کرنے کے لیے ہدایات اُنیس صفحات پر پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ فارم پڑھنا اور سمجھنا کارِ دارد تھا لیکن جب اسے پڑھا تو گونہ اطمینان ہوا کہ اس فارم کے کسی حصہ کی تصدیق ڈپٹی کمشنر یا کسی اور سرکاری عہدیدار سے نہیں کرانا پڑے گی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چند ماہ قبل پنجاب پبلک سروس کمیشن نے پولیٹیکل سائنس کے لیکچررز کی بعض اسامیاں مشتہر کی تھیں۔ میں نے فارم منگوایا تو معلوم ہوا کہ وہ امیدوار جو پہلے سے سرکاری ملازمت میں نہیں ہیں ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے سرٹیفکیٹ آف پرمننٹ ڈومیسائل اور سٹیزن شپ سرٹیفکیٹ بنوا کر درخواست کے ساتھ ارسال کریں گے۔ اس کسمپرسی کے زمانے میں جب میرے جیسے بے وسیلہ آدمی کے لیے ڈپٹی کمشنر تک رسائی امرِ محال تھی یہ تصدیق کرانا دوبھر ہو گیا۔ بالآخر میرے ایک خیر خواہ نے سیالکوٹ کے خواجہ سرفراز احمد، ایڈووکیٹ سے بات کی اور میں ان کے بھروسے پر گھٹیالیاں سے بمشکل تمام وہاں پہنچا لیکن موصوف کی سفارش کے باوجود سارا دن انتظار کے بعد بھی مجھے سرٹیفکیٹ نہ مل سکے۔ انہوں نے مجھے اگلے دن کام ہونے کی تسلی دلائی لیکن میرے لیے سیالکوٹ میں رات قیام کرنا یا اگلے روز پھر چھٹی لے کر وہاں جانا آسان نہ تھا لہٰذا میں واپس آ گیا۔ اگلے روز میں نے اپنے ایک شاگرد کو جسے سیالکوٹ میں قیام کی سہولت حاصل تھی اپنی جیب سے کرایہ دے کر وہاں بھجوایا لیکن اس نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا اور وہ وہیں جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے یاد ہے میں روزانہ اس کے گاؤں جا کر اس کا پتا کرتا تھا لیکن اس نے واپس آنا تھا نہ آیا۔ میں گھبرا رہا تھا کہ اسی انتظار میں درخواست جمع کرانے کی آخری تاریخ ہی نہ گذر جائے لیکن خدا کا شکر ہے وہ چار پانچ دنوں کے بعد واپس آ گیا۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، سیالکوٹ نے دونوں سرٹیفکیٹوں پر دستخط کر دیئے تھے۔ میں خوش تھا کہ مجھے اس تکلیف دہ مرحلے سے دوبارہ نہیں گذرنا پڑے گا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ اس بار کچھ اور پریشانیاں میری منتظر ہیں۔

میں ہوسٹل کی عمارت کے سامنے ایک گھنے درخت کے سائے تلے چارپائی پر بیٹھا اس فارم کا مطالعہ

کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ میرا ایک سال ایم۔اے کی ڈویژن بہتر بنانے میں گذر گیا اور ایک سال اس دیہی علاقے میں ملازمت میں ضائع ہو گیا جب کہ میرے بعض کلاس فیلوز نے اسی عرصے میں کسی دوسرے مضمون میں ایم اے یا قانون کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ انہیں مجھ جیسے لوگوں کے مقابلہ میں اختیاری مضامین کے لیے وسیع تر انتخاب کی سہولت حاصل ہو گئی تھی لیکن خیراب کیا ہو سکتا تھا، مجھے چھ سو نمبروں کے اختیاری مضامین کا انتخاب تو بہرطور کرنا تھا۔ میں نے اس موضوع پر کچھ سوچا اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے پولیٹیکل سائنس کے ساتھ انٹرنیشنل ریلیشنز اور کنسٹیٹیوشنل لا کا انتخاب کر لیا۔ میں نے یہ سارے مضامین کسی نہ کسی شکل میں ایم۔اے میں پڑھ رکھے تھے۔ اوّل الذکر مضمون کے دو پرچے ہونا تھے جب کہ آخری دونوں مضامین کا ایک ایک پرچہ تھا۔ میں یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ باقی دو سو نمبروں کے لیے کون سے مضامین رکھے جائیں۔ کسی نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ تاریخِ امریکہ کی تیاری قدرے آسان ہوتی ہے اور میں نے ایف اے تک اردو پڑھ رکھی تھی چنانچہ طوعاً و کرہاً یہ دونوں مضامین بھی رکھ لیے۔

فارم مکمل کرنے کے بعد جب ضروری دستاویزات منسلک کرنے کا وقت آیا تو پتا چلا کہ میرے پاس مطلوبہ تعداد میں اپنی تصاویر موجود نہیں ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا گھٹیالیاں سے بائیسکل پر قلعہ صوبا سنگھ اور وہاں سے تانگے پر پسرور پہنچا اور جو فوٹو گرافر مل سکا اس سے تصویر اُتر والی۔ فوٹو گرافر نے خود ہی پہلے سے ناٹ لگی ہوئی ایک بوسیدہ سی ٹائی فراہم کر دی۔ میں نے یہی ٹائی لگا کر تصویر بنوائی۔ اُس زمانے میں انسٹنٹ فوٹو گرافی رائج نہ ہوئی تھی نہ جدید لیبارٹریز معرضِ وجود میں آئی تھیں لیکن اس کے باوجود میری منت سماجت پر فوٹو گرافر نے میری تصویریں اسی روز دے دیں اور یوں میں اپنی درخواست مقررہ تاریخ سے پہلے کمیشن کو بھجوانے کے قابل ہو گیا۔

آج اس بات پر نصف صدی ہونے کو ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملازمت کی کامیاب تکمیل کے بعد ریٹائر بھی ہو چکا ہوں لیکن مجھے پنجاب کے دیہی علاقے میں گذرا ہوا یہ وقت کبھی نہیں بھولا۔ شاید یہی تجربہ میرے اس یقین کی بنیاد بن گیا ہے کہ ہمارے دیہی علاقوں کا بہت سا ٹیلنٹ ضائع ہو رہا ہے لہٰذا اربابِ اختیار کا فرض ہے کہ وہ ان علاقوں سے تعلق رکھنے والے ملازمت کے خواہشمندوں کو کسی اسامی کے لیے غیر موزوں قرار دینے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیں کہ بدقسمتی سے انہیں وہ ماحول میسر نہیں آیا جو حُسنِ اتفاق سے شہر والوں کا مقدر رہے۔

لیکن یہ کیا، میں اس فلسفیانہ بحث میں اُلجھ کر آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ اگرچہ میں نے اس امتحان میں شمولیت کے بارہ میں سوچ تو بہت عرصہ پہلے سے رکھا تھا لیکن اس کے لیے کوئی تیاری نہ کر پایا تھا۔ مستزاد یہ کہ گھٹیالیاں میں پڑھائی کا ماحول بالکل مفقود تھا۔ میں یہاں تنہا زندگی گذار رہا تھا اور کہنے کو تو ہوسٹل میں مقیم تھا لیکن فی الحقیقت یہ ایک بے آبادی بلڈنگ تھی جس میں الّا ماشاء اللہ کوئی طالب علم مقیم نہ تھا۔ اگرچہ میرے ساتھ والے کمرے میں میرے ایک رفیق کار مقیم تھے جب کہ دوسرے کمرے میں سکول کے ایک استاد رہا کرتے تھے لیکن دونوں نے اپنی الگ دنیا بسا رکھی تھی اور وہ دن رات اسی میں مست رہتے۔ کالج اور ہوسٹل آبادی سے دُور واقع تھے لہٰذا کالج بند ہوتے ہی یہاں اُلو بولنے لگتے اور رات تو عجیب سے خوف میں گذرتی۔

گھٹیالیاں میں موجود شہری سہولتوں کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں حوائج ضروریہ سے فراغت کا بھی کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ ہم صبح ہی صبح کھیتوں میں نکل جاتے اور رفع حاجت کے لیے کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھتے۔ دور کیا جانا، یہاں نہانے کے لیے غسل خانہ تک موجود نہ تھا اور نلکے کے نیچے بیٹھ کر ہی نہانا پڑتا تھا۔ ہاں! کبھی جی چاہتا تو پانی کی بالٹی بھر کے کمرے میں لے آتے اور ایک کونے میں بیٹھ کر غسل کر لیتے۔ یہاں بجلی تھی نہ کوئی اور شہری سہولت۔ ان ساری دقتوں کے باوجود مجھے جتنا وقت ملا اور جس حد تک ممکن ہوا میں نے سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔

امتحان کا زمانہ سر پر آیا تو میں گھٹیالیاں میں تقریباً ایک سال گذار چکا تھا۔ یہ امتحان کم و بیش ایک ماہ تک چلنا تھا چنانچہ میں نے بارہ اکتوبر سے گیارہ نومبر ۱۹۶۹ء تک رخصت کی درخواست دے دی۔ ایک زبانی حکم کے تحت میری یہ رخصت اس شرط کے ساتھ منظور کر لی گئی کہ مجھے اس عرصے کی تنخواہ نہیں ملے گی۔

میں نے اپنا امتحانی سنٹر لاہور تجویز کیا اور کمیشن نے میری اس تجویز کے ساتھ اتفاق کر لیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ لاہور میں رہائش کا کیا انتظام ہو۔ اگرچہ میرے کچھ رشتہ دار وہاں موجود تھے لیکن ان کے ہاں امتحان کی تیاری کا ماحول عنقا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں ''احمدیہ ہوسٹل'' کے نام سے لڑکوں کا ایک ہوسٹل موجود تھا۔ ایک سال پہلے میں نے ایم۔اے کا امتحان یہیں رہ کر دیا تھا چنانچہ ذرا سی بھاگ دوڑ سے مجھے اس ہوسٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں احمدیہ ہوسٹل میری دیکھی بھالی جگہ تھی۔ ہاں! اس عرصے میں چوہدری رحمت خان فوت ہو چکے تھے اور اب ان کے بھائی، چوہدری غلام رسول سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے یہاں تعینات ہو چکے تھے۔ موصوف تعلیم الاسلام ہائی سکول میں میرے استاد رہے تھے اور وہ میرے پورے خاندان سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے بلا تامل مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی البتہ اس بار مجھے ایک ایسے کمرے میں جگہ ملی جو قبل ازیں کسی طالب علم کے استعمال میں نہ تھا اور غالباً میرے لیے ہی خالی کرایا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے اکثر شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور دن کا بیشتر حصہ اس کے اندر دھوپ رہتی۔ اس کمرے میں چھپکلیاں بکثرت تھیں اور زرد اور سیاہ رنگ کے زہریلے بھڑ آزادانہ دندناتے پھرتے تھے۔ مجھے پہلی رات کا وہ منظر ابھی تک نہیں بھولا جب ایک بھڑ نے دیوار پر تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک چھپکلی کی پشت پر بیٹھ کر اپنا سارا زہر اس کے جسم میں منتقل کر دیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے چھپکلی کا جسم سُوج گیا اور وہ کسی جائے پناہ کی تلاش میں منظر سے غائب ہو گئی۔ اس کے بعد تو میرا زیادہ وقت بھڑوں کے خلاف اپنے دفاع میں گذرنے لگا۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے یہ بات تسلیم کیے بنا کوئی چارہ نہیں کہ اُن حالات میں مجھے پڑھائی کے لیے احمدیہ ہوسٹل سے بہتر کسی اور جگہ کا ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

امتحان تیس اکتوبر ۱۹۶۹ء کو شروع ہوا۔ میرا سنٹر سنٹرل ماڈل ہائی سکول طے پایا۔ پہلے روز دو پرچے تھے یعنی انگلش (پریسی اور کمپوزیشن) اور جنرل نالج (ایوری ڈے سائنس)۔ دوسرے روز جنرل نالج (کرنٹ افیئرز) کا پرچہ

ہوا۔ میرے یہ تینوں پرچے ٹھیک ہو گئے تھے اور میں دل ہی دل میں خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کے گیت گاتا خوشی خوشی گھر پہنچا تو تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں کے پرنسپل کی طرف سے ایک رجسٹرڈ خط میرا منتظر تھا۔ اس خط سے مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ کالج کو میری خدمات کی مزید ضرورت نہیں رہی لہٰذا میں ۱۲ نومبر ۱۹۶۹ء سے خود کو اس ملازمت سے فارغ سمجھوں۔ غالباً میرے اطمینان کے لیے اس خط کے آخر میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ کالج انتظامیہ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن اس کا کیا کیجیے، کالج کے مخدوش مالی حالات نے اسے یہ تکلیف دہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

مجھے اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ یہ فیصلہ کالج کے مخدوش مالی حالات کی وجہ سے کیا گیا ہے یا اس کا حقیقی سبب کچھ اور ہے، میرے لیے تکلیف دہ امر یہ تھا کہ مجھے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے۔

اگرچہ مجھے ملنے والی تنخواہ معمولی تھی اور مجھے طرح طرح کے مسائل کا بھی سامنا رہتا تھا لیکن یہ تسلی تو تھی کہ میں بیکار نہیں ہوں۔ ویسے بھی اس بظاہر معمولی تنخواہ سے میری اپنی ضروریات پوری ہو رہی تھیں اور گھر کے بنیادی اخراجات بھی چل رہے تھے چنانچہ ملازمت سے برخواست کیے جانے کی اطلاع پا کر مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ بہرحال میں نے صبر و شکر سے کام لیا اور امتحان سے فراغت کے بعد فوری طور پر گھٹیالیاں جا کر اپنا سامان اُٹھا لیا۔

بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس کالج سے میری علیحدگی میرے لیے بہت بہتر ثابت ہوئی اور میرے لیے ترقی کے دروازے کھل گئے لیکن ان تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے یہاں میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُس زمانے میں میری جماعت کے کئی بزرگان سے خط و کتابت تھی اور میں وقتاً فوقتاً انہیں دعا یا ملازمت کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے خطوط لکھتا رہتا تھا۔ میں نے چوہدری عبدالحق ورک، امیر جماعت احمدیہ اسلام آباد کے نام اپنے ایک ایسے ہی خط میں گھٹیالیاں کے بارے میں کچھ منفی الفاظ لکھ دیئے تو انہوں نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے بجا طور پر لکھا تھا: ''گھٹیالیاں میں آپ کو سلسلہ کی خدمت کی توفیق ملی جس کے نتیجے میں آپ اس مقام پر پہنچے۔ بلندی پر چڑھنے کے بعد جن سیڑھیوں کی مدد لی گئی ہو انہیں حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔''

میں نے صاحبزادہ مرزا رفیع احمد کے نام بھی اپنے ایک خط میں اس ماحول سے نجات ملنے پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔ موصوف نے یہ خط ملنے پر میری باقاعدہ سرزنش کی اور تحریر فرمایا کہ ''مجھے اس سے تکلیف ہوئی۔ میں اس ماحول کو اور اس کے حسن و قبح کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ برائیوں کے باوجود وہ لوگ (   ) احمدیت کے لیے جان قربان کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ دوسرے یہ کہ غلاظت دور کرنے کے لیے تو آپ گئے تھے، پیسہ کمانے تو نہیں گئے۔ وہ ہمارے بھائی ہیں۔ بھائیوں کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے دل دکھنا چاہیے۔''

خدا کی شان دیکھئے اس بندۂ خدا کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کس طرح پورے ہوئے۔

اکتوبر ۲۰۰۰ء کے آخر میں بعض نامعلوم نقاب پوشوں نے گھٹیالیاں کی احمدیہ بیت الذکر میں نماز فجر کے لیے جمع ہونے والے افراد پر اچانک فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں پانچ افراد راہ مولا میں قربان ہو گئے۔ یہ ایک عظیم الشان قربانی تھی جس پر پوری جماعت رہتی دنیا تک فخر کرتی رہے گی۔

مجھے یقین ہے کہ یہ اندوہناک واقعہ آپ کے علم میں ہے لیکن کیا آپ اس واقعہ کی جزئیات سے بھی واقف ہیں؟

خونِ شہیدانِ امت کا اے کم نظر! رائیگاں کب گیا تھا کہ اب جائے گا

روز نامہ الفضل (یکم نومبر ۲۰۰۰ء) میں دی گئی تفصیلات کے مطابق ''صبح نمازِ فجر کی ادائی کے بعد درسِ قرآنِ کریم ہوا۔ درس ختم ہونے کے بعد ایک نوجوان باہر نکلا تو ایک نقاب پوش نے جو صحن میں موجود تھا اسے بندوق کا بٹ مارا اور اسے بیت الذکر کے اندر دھکا دے دیا جس سے وہ گر گیا۔ باقی نمازیوں نے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر دہشت گردوں نے بیت الذکر کے اندر ہی روک کر کلاشنکوف کا برسٹ مارا جس کے بعد اسی نقاب پوش نے اپنے ساتھی سے کلاشنکوف لے کر دوسرا برسٹ مارا۔ اس کے نتیجے میں دو احمدی دوست موقع پر راہِ مولیٰ میں قربان ہو گئے جب کہ باقی تین احباب ہسپتال جاتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ زخمیوں کو پہلے نارووال لے جایا گیا، وہاں سے لاہور منتقل کیا گیا۔ حملہ آور کار میں پسرور کی طرف فرار ہو گئے۔ حملہ آوروں کی تعداد چار تھی۔ دو کار میں بیٹھے رہے اور دو نے فائرنگ کی۔''

الفضل میں مطبوعہ تفصیلی رپورٹ کے مطابق گھٹیالیاں میں ''دو احمدیہ بیوت الذکر ہیں، ایک شمال میں اور دوسری شرقی سمت میں ہے۔ شرقی سمت کی بیت الذکر ...... کے قریب ہی پسرور جانے والی سڑک گذرتی ہے۔ مؤرخہ تیس اکتوبر ۲۰۰۰ء کی صبح نمازِ فجر پانچ بج کر پچیس منٹ پر ادا کی گئی۔ امام الصلوٰۃ کے فرائض مکرم مشتاق احمد صاحب انجام دیتے ہیں جو اس مجلس کے زعیم انصار اللہ اور اس جماعت کے سیکرٹری امورِ عامہ بھی ہیں۔ نماز کے بعد انہوں نے تفسیر صغیر سے سورہ فاتحہ کا درس دیا اور نوٹس بھی پڑھے جس کی وجہ سے درس معمول سے قدرے طویل ہو گیا۔ درس ختم ہونے کے بعد ایک نوجوان خادم محمد اسلم نے ان سے قرآن کریم لے لیا اور ان کے دائیں ہاتھ بیٹھ کر تلاوت کرنے ہی لگا تھا کہ بیت الذکر میں قیامت برپا ہو گئی۔

پسرور کو جانے والی سڑک پر ایک سلیٹی رنگ کی کار آ کر رُکی جس میں دو افراد بیٹھے رہے اور باقی دو جنہوں نے چادریں لپیٹی ہوئی تھیں اور منہ پر نقاب ڈالے ہوئے تھے بیت الذکر میں داخل ہوئے۔ ادھر درس ختم ہونے کے بعد تین افراد باہر نکلے۔ سب سے آگے عباس علی صاحب تھے۔ کلاشنکوفوں سے مسلح دو افراد نے جو بیت الذکر کے صحن سے آگے آ کر دروازے تک پہنچ چکے تھے، اندر سے نکلنے والے تین افراد کو واپس بیت الذکر میں جانے کو کہا۔ عباس علی صاحب بڑی حیرت و دلیری سے آگے والے شخص سے اُلجھ پڑے اور اس کی گن پر ہاتھ ڈال دیا اور ڈپٹ کر کہا تم کون ہو؟ تم باہر نکلو۔ اسی لمحے دوسرے مسلح شخص نے کلاشنکوف عباس علی صاحب کے جسم سے لگا کر پورا برسٹ ان کے پیٹ میں اُتار دیا اور اندر سے آنے والے دوسرے نوجوان کو بٹ مار کر اندر گرا دیا اور تیسرے نوجوان تسنیم عرف مٹھو کو بھی اندر دھکیل دیا۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی اور ایک

دروازے کی کنڈی لگا دی مگر دوسرا دروازہ بند نہ کر سکا۔ بیت الذکر کے اندر بعض لوگ ابھی بیٹھے تھے اور بعض کھڑے تھے۔ مشتاق صاحب نے جو محراب میں بیٹھے تھے جب ایک نوجوان کو اندر کی طرف گرتے دیکھا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے ساتھ ہی مسلح شخص کی کلاشنکوف سے گولیاں چلنے لگیں۔ اس نے نیم دائرہ بنا کر بیت الذکر کے اندر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ گولیوں سے نکلنے والا دھوا ں اور جسموں سے نکلنے والا لہو ہر طرف پھیل گیا تھا۔ دونوں مسلح افراد نے چند لمحوں میں اپنی کارروائی ختم کی اور باہر نکل گئے۔ باہر نکل کر انہوں نے ہوائی فائر کیا تاکہ کوئی ان کے پیچھے نہ آ سکے۔ پھر وہ بھاگ کر گاڑی میں جا بیٹھے اور سلیٹی رنگ کی کار پسرور کی طرف فرار ہو گئی۔

بیت الذکر کے اندر لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑے تھے۔ جن کو زیادہ گولیاں لگی تھیں وہ جان کنی کی کیفیت میں تھے۔ مشتاق صاحب حملہ آوروں کے جانے کے بعد کھڑے ہوئے تو ان کو احساس ہوا کہ وہ زندہ ہیں اور ان کا جسم بھی سلامت ہے۔ دراصل حملہ آور کے سامنے بیت الذکر کا ستون تھا اور ستون کے عین سامنے محراب تھی جس میں مشتاق صاحب کھڑے تھے۔ جب ان کو احساس ہوا کہ وہ زندہ سلامت ہیں مگر بہت سے احباب شدید زخمی ہیں تو ان کے سینے سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جو لوگ زندہ بچ گئے تھے انہوں نے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔''

روزنامہ الفضل میں دی گئی تفصیلات کے مطابق زخمیوں میں سب سے پہلے افتخار احمد نے وفات پائی جس کے بعد سولہ سالہ شہزاد احمد نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ ان کے بعد علی الترتیب چوہدری عطاء اللہ، عباس احمد اور چوہدری غلام محمد نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ ان میں سے صرف شہزاد احمد کو ایک گولی لگی تھی جب کہ راہِ مولیٰ میں اپنی جان قربان کرنے والے باقی تمام افراد کو ایک سے زیادہ گولیاں لگیں بلکہ افتخار احمد کا جسم تو گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔

الفضل (۲ نومبر ۲۰۰۰ء) کے مطابق ''سانحہ گھٹیالیاں کے پانچ مرحومین کی نمازِ جنازہ مؤرخہ اکتیس اکتوبر ۲۰۰۰ء کو گورنمنٹ ٹی آئی ہائی سکول، گھٹیالیاں کی گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ محترم صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب امیر مقامی و ناظرِ اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ نے جنازہ پڑھایا۔ احمدی احباب ...... نے جن کی تعداد تین ہزار سے متجاوز تھی نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ اطراف کے اضلاع سیالکوٹ، نارووال، لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور گجرات وغیرہ سے احباب جماعت کے وفود نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ نمازِ جنازہ کے بعد پانچوں راہِ خدا میں جان قربان کرنے والوں کو گھٹیالیاں کے احمدیہ قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ تدفین کے بعد محترم صاحبزادہ صاحب موصوف نے ہی دعا کرائی۔''

اس سانحہ کی خبر نشر کرتے ہوئے بی بی سی نے اپنے تیس اکتوبر ۲۰۰۰ء کے نشریہ میں بتایا کہ: ''پاکستان کے صوبہ پنجاب میں نامعلوم مسلح افراد نے پانچ افراد کو ہلاک کر دیا ہے جن کا تعلق احمدی فرقہ سے بتایا گیا ہے۔

تفصیلات کے مطابق پاکستان کے صوبہ پنجاب میں اقلیتی احمدی فرقہ کے لوگوں پر صبح فجر کے وقت

عبادت گاہ سے نکلتے ہوئے نامعلوم مسلح افراد نے فائرنگ کر کے پانچ افراد ہلاک اور دیگر سات زخمی ہوگئے۔ پولیس نے بتایا ہے کہ یہ حملہ سیالکوٹ کے نزدیک ایک گاؤں میں کیا گیا جب چار نامعلوم افراد نے اس وقت اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جب احمدیہ فرقہ کے لوگ فجر کے بعد اپنی عبادت گاہ سے باہر نکل رہے تھے۔ اس حملہ کا مقصد ابھی معلوم نہیں ہو سکا۔ پاکستان میں انسانی حقوق کی تنظیموں نے پاکستان میں احمدیوں پر ہونے والی مبینہ زیادتیوں کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے جہاں ۱۹۷۴ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے اس فرقہ کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود احمدی فرقہ خود کو اسلام کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔''

بی بی سی نے اپنے پروگرام ''سیربین'' میں اس خبر پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ایک گاؤں میں پانچ افراد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے جن کا تعلق احمدی فرقہ سے بتایا گیا ہے۔ نامعلوم مسلح افراد نے پیر کے روز علی الصبح اس وقت حملہ کر دیا جب لوگ فجر کی نماز کے بعد عبادت گاہ سے باہر نکل رہے تھے۔

لاہور سے شاہد ملک کی رپورٹ: ہلاکت کا یہ واقعہ پنجاب کے ایک دیہات میں پیش آیا جو سیالکوٹ شہر سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ابتدائی اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ نامعلوم افراد نے احمدی فرقہ کی عبادت گاہ پر اس وقت فائرنگ کر دی جب لوگ نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے۔ جماعت احمدیہ کے ترجمان نے پانچ افراد کے ہلاک اور دیگر سات افراد کے زخمی ہونے کی تصدیق کی ہے۔ ترجمان نے کہا کہ یہ حملہ شدت پسندی کی اس مہم کا حصہ ہے جس کا ہدف ترجمان کے الفاظ میں آج کل مذہبی اقلیتیں ہیں۔ واضح رہے کہ ۱۹۷۴ء میں اس وقت کی منتخبہ پارلیمنٹ نے اس فرقہ کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کے بعد بارہا ان کی طرف سے مذہبی بدسلوکی کی شکایت کی جاتی رہی ہے۔ اس سال کے اوائل میں فیصل آباد میں ایک معروف احمدی سرجن کو گولی مار دی گئی تھی۔ ترجمان نے بتایا کہ ماضی قریب میں یہ پہلا واقعہ ہے جس میں اتنے بڑے پیمانے پر ہلاکتیں ہوئی ہیں۔''

اس حادثہ پر ملکی اردو اخبارات میں دبا دبا سا احتجاج ہوا چنانچہ روزنامہ جنگ نے یکم نومبر ۲۰۰۰ء کو اپنے اداریہ میں لکھا: ''اس واقعہ کو مذہبی دہشت گردی یا ذاتی عداوت کا نتیجہ قرار دینا فی الحال قبل از وقت ہے کیوں کہ مکمل اور غیر جانبدار تحقیقات کے بعد ہی اصل صورتِ حال سامنے آ سکتی ہے...... ایک مہذب معاشرے میں ہر فرقہ اور عقیدہ کے حامل افراد کو جان و مال کا تحفظ فراہم کرنا حکومت کی اہم اور بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں گزشتہ کئی سالوں سے دہشت گردی کا عمل جاری ہے جسے روکنے اور اس پر قابو پانے میں کوئی بھی حکومت مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکی۔ موجودہ حکومت میں بیٹھے ہوئے بعض وزیر اور مشیر بھی مذہبی دہشت گردی پر قابو پانے کے دعوے کرتے ہیں لیکن جلد ہی ان دعووں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ موقع واردات سے ملزموں کا فرار پولیس کی ناکامی اور نااہلی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے جرائم پیشہ افراد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ گورنر پنجاب اور اعلیٰ پولیس حکام کا یہ فرض ہے کہ وہ اس واردات کا سراغ لگانے اور اس کی مکمل تحقیقات میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہونے دیں اور پولیس حکام اصل ملزموں تک پہنچنے کی ٹھوس کوشش کریں۔ ایسے واقعات امن و امان میں خلل ڈالنے اور ملک کو عدمِ استحکام سے دوچار کرنے کی سازش کے زمرے میں آتے ہیں۔''

روزنامہ پاکستان نے بھی اسی روز اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا ''دوسری اقلیتوں کی طرح قادیانی فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت حکومت اور ہر مسلمان کا فریضہ ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے قادیانی عبادت گاہ پر جس نوعیت کا حملہ کیا گیا ہے، ایسے پُراسرار حملے کچھ عرصے سے مساجد اور امام بارگاہوں پر بھی ہوتے رہے ہیں۔ ان حملوں میں انتہا پسند جنونیوں کے ملوث ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس بات کا امکان بھی پوری طرح موجود ہے کہ اس میں پاکستان کے بیرونی دشمنوں کا ہاتھ ہو جو پاکستان میں افراتفری اور انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیقاتی ایجنسیوں کو اس واقعہ کے ذمہ داروں کا سراغ لگانے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ اگر بدقسمتی سے اس واقعے میں مذہب کے نام پر جنونیوں کے کسی گروہ کا تعلق ہے تو انہیں بھی پوری سزا ملنی چاہئے تاکہ ایسے افسوسناک واقعات کا سدباب کیا جا سکے جو پاکستان اور مسلم معاشرے کی بدنامی کا باعث بن سکتے ہیں۔''

اس موقع پر روزنامہ نوائے وقت نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں جس پر یکطرفہ رنگ غالب ہے لکھا: ''نارووال کے قریب قادیانیوں کی عبادت گاہ میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے پانچ ہلاک اور سولہ زخمی ہو گئے۔ چیف ایگزیکٹو نے ملزموں کی فوری گرفتاری کا حکم دے دیا ہے۔ یہ افسوسناک واقعہ ایسے حالات میں منظر عام پر آیا ہے جب کہ قادیانیوں کو کافر قرار دینے کی آئینی ترامیم ختم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں، دینی مدارس اور جہاد کے خاتمے کا ذکر ہو رہا ہے۔ گویا یہ خدشہ ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ بعض عناصر قادیانیوں کو مظلوم و مقہور ثابت کرنے کے درپے ہیں اور وہ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کے مغربی الزام کو سچ ثابت کرنے کے لیے شواہد پیدا کرنا چاہتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں اقلیتوں کو پورا تحفظ حاصل ہے اور مسلمان عوام الناس کسی طور پر بھی غیر مسلموں کے ساتھ ناروا سلوک کے روادار نہیں لیکن کچھ عرصے سے وطن عزیز میں ایسا کچھ سامنے لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں جس سے اسلام کا چہرہ داغدار ہو اور وطن عزیز کی مسلم اکثریت کو مذہبی تشدد پسندی کا الزام دیا جا سکے۔ پولیس نے ذاتی دشمنی کا خدشہ ظاہر کیا ہے جب کہ شرارت بھی ہو سکتی ہے۔ بہرصورت اس کا سبب کچھ بھی ہو، حکومت اور قوم کو چوکنا رہنا چاہئے کیونکہ آج پاکستان دشمن قوتیں جس قدر متحرک ہیں ایسی کبھی نہ تھیں۔ قادیانی اگرچہ خود کو اقلیت تسلیم نہیں کرتے بلکہ مسلم اکثریت کو اپنے تئیں اقلیت گردانتے ہیں لیکن اس کے باوجود پاکستان میں وہ بحیثیت غیر مسلم اقلیت محفوظ و مامون ہیں اور حالیہ المناک واقعہ قادیانیوں کو غیر محفوظ ثابت کرنے کی سازش ہے۔ چونکہ اس قصبہ میں قتل کا ایک واقعہ پیش آ چکا ہے جس کا الزام قادیانی عقیدے سے تعلق رکھنے والے بعض افراد پر تھا اس لیے ممکن ہے کہ کسی تیسرے فریق نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔

حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس واقعے کی پوری تحقیقات کرائے، اس کے اسباب کا پتا چلائے کیونکہ یہ اپنی حیثیت میں پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش ہے جسے ہر صورت میں ناکام بنانا ضروری ہے۔ حکومت قادیانی عبادت گاہوں، مدرسوں یا دیگر مراکز پر خصوصی توجہ دے اور ان کی حفاظت کے انتظامات سخت کرے۔''

اردو پریس کے علاوہ بعض انگریزی اخبارات نے بھی اس مذہبی دہشت گردی کا نوٹس لیا۔ ان اخبارات

میں روزنامہ [illegible] ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں "Simply Unpardonable" یعنی "ناقابل معافی" کے عنوان سے اپنے [illegible] میں اس واقعہ پر شدید [illegible]

"This is not the first instance when the Ahmadis have been subjected to inhuman treatment by a majority which thinks that, for whatever reasons it considers are plausible, the Ahmadis are outside the pale of Islam and that they must, therefore, be put to the sword.

The Ahmadis were anyhow declared a non-Muslim minority by a constitutional amendment under the late Zulfikar Ali Bhutto in the seventies. He claimed privately that he had taken this step to `save' the Ahmadis from being massacred enmasse. How has this helped? Nearly 25 years have passed and intolerance against the minorities has gone on with unabated malevolence.

......We find no words strong enough to condemn the unpardonable crime that has been committed against the helpless Ahmadis in a remote village in Sialkot district. It is time the Government woke up to protect and preserve the constitutionally guaranteed rights of the minorities to profess their faiths in whatever manner they deem fit. The right to religious freedom is not negotiable in any civilized society. Nor can it be abridged in any manner whatsoever. It is now for the government to stand up and be counted among the defenders of basic rights guaranteed by Islam and also by the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan."

فرنٹیئر پوسٹ نے بھی اس المناک واقعہ پر احتجاج کیا تاہم بعد میں رُونما ہونے والے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ یہ احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا اور صورتِ حال سنگین سے سنگین تر ہوتی چلی گئی۔ اس حوالے سے مئی ۲۰۱۰ء میں لاہور کی دو احمدیہ بیوت الذکر میں نماز جمعہ کے اجتماع میں نہتے احمدیوں پر دہشت گردوں کی اندھا دھند فائرنگ ایک ناقابلِ فراموش دلدوز واقعہ ہے۔

گھٹیالیاں میں اپنی ملازمت ختم ہونے کے کم و بیش چھتیس سال بعد میں جب دوبارہ وہاں گیا تو جماعت احمدیہ گھٹیالیاں کے صدر ماسٹر حمید احمد اور سیالکوٹ کے ایک احمدی چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ، ناصر احمد میرے لیے چشم براہ تھے۔ میرے گھٹیالیاں جانے کا ایک مقصد راہِ مولیٰ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے ان افراد کی قبور

پر حاضری بھی تھا چنانچہ وہاں پہنچتے ہی ہمارے قدم خود بخود احمدیہ قبرستان کی طرف اٹھنے لگے۔

یہ سارے افراد اس قبرستان میں پہلو بہ پہلو دفن ہیں اور ان کی قبروں پر ایک ہی طرز کے کتبے لگے ہوئے ہیں۔ کتبوں کے مطابق راہِ مولا میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے یہ افراد عباس احمد ولد فیض احمد گورایہ؛ چوہدری غلام محمد ولد چوہدری علی محمد؛ چوہدری عطاء اللہ ولد چوہدری مولا بخش؛ افتخار احمد ولد چوہدری محمد صادق اور شہزاد احمد ولد چوہدری بشیر احمد تھے اور ان کی عمریں سترہ سال سے ساٹھ سال کے درمیان تھیں۔ کتبوں پر مدفون کے نام، ولدیت اور عمر کے علاوہ حضرت مسیح موعود کا یہ شعر بھی کندہ ہے:

بلانے والا ہے سب سے پیارا
اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

میں اللہ تعالیٰ کے حضور ان مرحومین کی بلندیٔ درجات کے لیے دست بدعا تھا اور میرے ذہن میں عبدالسلام اسلام کی اس نظم کے اشعار گونج رہے تھے جو انہوں نے ان جانثاروں کو مخاطب کر کے کہی تھی:

گھٹیالیاں میں قرباں جو ہوئے ہے جذبۂ ابنِ خلیل ان میں
گو مرنے کو تو مر وہ گئے پر ہستی کی ہے دلیل ان میں
جُوں جُوں یہ زمانہ گذرے گا تابندہ تر ہو جائیں گے
اِک طور سے اب بھی زندہ ہیں پھر زندہ تر ہو جائیں گے
رحمت کی بُوندا باندی ہو اِن مرنے والوں پر یا رب!
اور نُور فشانی ہر دم ہو اِن تیرے جیالوں پر یا رب!
جو آبِ حیات ہیں پی بیٹھے میں مردہ ان کو کیسے کہوں؟
جو مسلے گئے گُل پھر بھی کِھلے افسردہ میں اُن کو کیسے کہوں؟
تاریخ گواہی دیتی ہے مِٹ جاتے ہیں آخر جابر ہی
بالا سے دوبالا ہوتے ہیں اللہ کے بندے صابر ہی
غازی جو دینِ حق کے ہیں بے تیغ و سِپر بھی لڑتے ہیں
قدموں کے نشانوں سے اپنے وہ چاند ستارے جڑتے ہیں
گھٹیالیاں کی بستی تجھ پر رحمت کی گھٹا برسے گی سدا
وہ رحمت جس کو دشمن کی پُرحرص نگہ ترسے گی سدا
یہ دشمنِ ناداں سن لے گا آواز ضمیر اپنے کی کبھی
تعبیر یہ خود بن جائے گا تعبیر میرے سپنے کی کبھی

ہم راہِ مولا کے ان جانثاروں کے لیے دعائے مغفرت سے فارغ ہوتے ہی کالج پہنچ گئے جو وہاں سے چند منٹوں کی مسافت پر تھا۔

چھلک رہا ہے مرے غم کا آج پیمانہ

اس وقت میری کیفیت عجیب تھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مجھے وہ تمام بزرگان ایک ایک کر کے یاد آنے لگے جن کے ساتھ مجھے یہاں کام کرنے کا موقع ملا تھا لیکن آج وہ اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ ان میں عبداللہ مہار، عثمان صدیقی، مولوی احمد حسن، منظور شاکر اور شریف خالد شامل تھے۔ مجھے ان کے ساتھ گذرا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا اور عالمِ بے اختیاری میں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

عبداللہ مہار اس کالج کی انتظامی کمیٹی کے سربراہ تھے۔ انہیں بابو قاسم دین، سابق امیر جماعت احمدیہ ضلع سیالکوٹ کے بعد یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ آفیسرز کالونی، لاہور میں مقیم تھے اور ماڈرن موٹرز میں کام کر رہے تھے۔ وہ یہ کام اعزازی طور پر سرانجام دے رہے تھے اور حسبِ ضرورت گھٹیالیاں جا کر کالج کے معاملات کی نگرانی کرتے تھے۔ مجھے عبداللہ مہار کے ساتھ ماڈرن موٹرز میں اپنی پہلی ملاقات، کالج میں انٹرویو والا دن، ان کے ہاتھوں لیکچرر کے طور پر اپنا تقرر اور ان کی فوکس ویگن میں گھٹیالیاں سے شاہدرہ تک کا سفر، سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ اگرچہ مجھے کالج کی طرف سے لیکچررز کے لیے انجمن کا منظور شدہ گریڈ نہ دیئے جانے پر میری ان کے ساتھ بہت دفعہ بحث و تمحیص ہوئی تھی اور میں ان کی رائے بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن میرے نزدیک ان کے اس فیصلے میں ذاتی انا کی بجائے کالج کا مفاد ہی مقدم تھا۔ وہ دیانتداری کے ساتھ محسوس کرتے تھے کہ یہ کالج ترقی کرے گا اور ایک روز اسے ہمارے تعلیمی حلقوں میں وہی مقام و مرتبہ حاصل ہو گا جو مسلم انڈیا میں علی گڑھ کو حاصل تھا اور اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ لائق اور محنتی اساتذہ اس کالج کے ساتھ اپنی وابستگی کو تا دیر قائم رکھیں۔ اگرچہ ان کا یہ اندازہ درست ثابت نہیں ہو سکا اور چند سال بعد حکومت کی طرف سے اس کالج کو قومیائے جانے کے بعد تو رہی سہی کسر بھی نکل گئی تاہم اس کالج کی تاریخ کے حوالے سے عبداللہ مہار کا خلوصِ نیت ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہے گا۔

تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں سے فراغت کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تاہم وہ ایک مخلص اور سرگرم احمدی تھے اور میں ان کا ذکر مختلف حلقوں میں سنتا رہتا تھا۔ وہ لمبا عرصہ جماعت احمدیہ شمالی چھاؤنی لاہور کے صدر رہے اور دلجمعی سے یہ فریضہ ادا کرتے رہے۔ میں نے ۱۹۹۱ء کی کسی تاریخ کے الفضل میں ان کی وفات کی خبر افسوس کے ساتھ پڑھی تھی۔ وہ موصی تھے لہٰذا ان کی تدفین ربوہ میں عمل میں آئی۔

یہ اور بہت سی دیگر باتیں میرے ذہن سے فلم کی سی تیزی سے گذر گئیں اور مجھے ان کے پوتے، بریگیڈیئر طارق مہار کے بیٹے اور میرے چھوٹے بیٹے، نبیل کے لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے ہوسٹل میں رُوم میٹ، علی عبداللہ کے ساتھ پہلی ملاقات یاد آ گئی جس دوران عبداللہ مہار اور موصوف کے ساتھ گھٹیالیاں سے

شاہدرہ تک کے سفر کا ذکر آ گیا تو انہوں نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا کہ ’’انکل! آپ جس گاڑی کا ذکر کر رہے ہیں وہ اب بھی ٹھیک حالت میں میرے پاس موجود ہے۔‘‘

منظر بدلا اور میری آنکھوں کے سامنے عثمان صدیقی کا چہرہ آ گیا۔ وہ انتہائی نیک دل، خاموش طبع اور صلح جُو تھے۔ انہوں نے کچھ وقت مربی سلسلہ کے طور پر اٹلی میں گزارا۔ بعد میں وہ کئی سال تک سیرالیون میں خدمت بجالاتے رہے اور قیامِ ربوہ کے ابتدائی برسوں میں پاکستان واپس آئے۔ شروع میں ان کا قیام تحریک جدید کے کوارٹرز میں تھا لیکن انہوں نے جلد ہی محلّہ دارالرحمت وسطی میں اپنا مکان تعمیر کر لیا۔ ان کے پڑوسیوں میں حضرت مولوی محمد دین صدر، صدر انجمن احمدیہ؛ شیخ محبوب عالم خالد اور سلسلہ کے بعض نامور مربّیان یعنی نسیم سیفی، مولوی احمد خاں نسیم، قریشی محمد افضل اور رشید احمد چغتائی شامل تھے۔ گویا وہ اس کہکشاں کا ایک چمکتا ہوا ستارہ تھے جس نے اپنی تمام زندگی خدمتِ سلسلہ میں گزار دی تھی اور جن کا جینا اور مرنا صرف اور صرف احمدیت کے لیے تھا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے عثمان صدیقی کا خود سنایا ہوا یہ واقعہ یاد آ گیا کہ ان کے اٹلی جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد جنگِ عظیم دوم شروع ہو گئی۔ اٹلی اس جنگ میں ایک فریق تھا لہٰذا یہاں کے لوگوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا اُن کا صرف تصوّر ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان سے اٹلی میں تعیّنات کسی مربی کے لیے رقوم بھجوانا آسان نہ تھا۔ ایسے میں عثمان صدیقی کے لیے مشکلات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترسنے لگے۔ وہ بتاتے تھے کہ ایک بار وہ خالی پیٹ کسی باغ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے کہ ایک خاتون ان کے پاس آ بیٹھی۔ عثمان صدیقی ایک نیک دل نوجوان تھے جن کی تربیت قادیان کے پاکیزہ ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ گھبرا گئے اور اس اندیشے کے تحت کہ خدا جانے عورت کی نیت کیا ہے وہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے بنچ پر جا بیٹھے۔ خاتون نے ان کا پیچھا کیا اور دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ جب عثمان صدیقی نے وہاں سے بھی اٹھنا چاہا تو خاتون نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ گھبرائیں نہیں، وہ صرف یہ جاننا چاہتی ہے کہ ان کی پریشانی کا سبب کیا ہے اور کیا وہ ان کی کوئی مدد کر سکتی ہے۔ عثمان صدیقی نے بتایا کہ وہ جماعت احمدیہ کے مربی ہیں لیکن مرکز سے رابطہ قائم نہ رہ سکنے کی وجہ سے انہیں اس قدر مالی پریشانی کا سامنا ہے کہ وہ پچھلے کچھ وقت سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھا سکے۔ خاتون نے پیشکش کی کہ اگر وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تو وہ انہیں کھانا کھلا سکتی ہے۔ عثمان صدیقی بتاتے تھے کہ انہوں نے یہ پیشکش ڈرتے ڈرتے قبول تو کر لی لیکن جب تک کھانا کھا کر خاتون کے گھر سے واپس نہیں آ گئے توبہ استغفار ہی کرتے رہے۔

مجھے ان کی یہ بات بھی یاد آنے لگی کہ کسی باقاعدہ ذریعہ معاش کی عدم موجودگی میں وہ کچھ ایسی تصاویر بنانے لگے جو معمولی قیمت پر بازار میں فروخت ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ وہ اچھے مصور تو نہ تھے تاہم ان کی بنائی ہوئی تصاویر سے راہگیروں کو اندازہ ہو جاتا کہ یہ شخص ضرورت مند ہے اور اس قابل کہ اس کی مدد کی جائے چنانچہ وہ ازراہِ سرپرستی اُن کی یہ تصاویر خرید لیتے جس سے وقتی طور پر ان کی دال روٹی چل جاتی۔

ان کی طبیعت میں بے حد سادگی تھی۔ میں نے گھٹیالیاں میں قیام کے دوران اپنے لیے ’’سائی‘‘ پر ایک

جوتا بنوایا جس پر پندرہ روپے لاگت آئی تھی۔ جب عثمان صدیقی کو پتا چلا تو انہیں میری یہ فضول خرچی ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ کہنے لگے ''اس بار تو آپ نے اتنا مہنگا جوتا بنوالیا ہے لیکن اگر آپ آئندہ کبھی ضرورت محسوس کریں تو میں لاہور میں آپ کو ایسی جگہ لے جا سکتا ہوں جہاں ایک روپے میں نہایت عمدہ جوتا مل جاتا ہے۔'' میں یہ سن کر قدرے حیران ہوا اور ان سے گزارش کی کہ اگلی بار لاہور جائیں تو مجھے ضرور ہمراہ لیتے جائیں۔ جلد ہی ان کا لاہور جانے کا پروگرام بن گیا۔ ہم ریلوے اسٹیشن پر اترے اور نولکھا کی طرف چل پڑے۔ بالآخر وہ مجھے ایک ایسے بازار میں لے گئے جہاں مردانہ اور زنانہ جوتوں سے لدی ہوئی بیسیوں ریڑھیاں کھڑی تھیں۔ ان میں فوجی بوٹ بھی تھے جن کے ایک جوڑے کی زیادہ سے زیادہ قیمت سوا روپیہ تھی۔ ظاہر ہے یہ بوٹ سیکنڈ ہینڈ تھے اور اس وقت ہم لنڈا بازار میں کھڑے تھے۔ یہ بوٹ واقعی عمدہ حالت میں تھے اور اس لائق کہ برسوں استعمال ہوسکیں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ عثمان صدیقی نے اس بازار سے کچھ خریدا یا نہیں تاہم میں بلاضرورت کوئی خریداری نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا وہاں سے خالی ہاتھ واپس آ گیا۔

عثمان صدیقی شاعر تھے اور عربی زبان میں شعر گوئی پر خصوصی دسترس رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ عربی کلام جس پر جماعتی رنگ غالب ہے ماہنامہ الفرقان کی زینت بنتا رہا ہے جو بجائے خود اس کے بلند پایہ ہونے کی دلیل ہے۔

ان کے پسندیدہ موضوعات حمد باری تعالیٰ، نعت، شانِ انبیاء، شانِ قرآن، نماز اور اہمیتِ خلافت ہیں۔ مجھے ان کی ایک حمد یہ نظم کے ابتدائی چند اشعار یاد آ گئے جو اردو قارئین کے لیے بھی قابلِ فہم ہیں۔

لِبَـيَان حَمْدِ اللّٰهِ مَالِيْ طَاقَةٌ
قَطُّ وَ مَالِيْ هِمَّةَ اَوْقُوَةٌ
اَللّٰهُ جَـلَّ جَلَالُـهٗ وَ لَهٗ فَقَط
مِنْ كُلِّ شَيْئٍ فِي الْوَرَىٰ تَسْبِيْحَةٌ
وَبِـذِكْـرِهٖ مِـنْـهُ لَـهٗ تَـحْـمِيْـدَةٌ
وَبِشُكْرِ نِعْمَتِهٖ لَهٗ تَكْبِيْرَةٌ
مَازَرَّةٌ اَوْحَبَّةٌ اَوْ قَطْرَةٌ
اِلَّا بِحُسْنِ اللّٰهِ فِيْهَا جَلْوَةٌ

عثمان صدیقی کی اہلیہ، ہاجرہ بیگم ایک نیک دل، مہمان نواز خاتون تھیں جنہوں نے چند ماہ پہلے وفات پائی ہے۔ ان دونوں کو خدا تعالیٰ نے ایک بیٹی اور دو بیٹوں سے نواز رکھا ہے۔ نعیمہ، کریم اور خلیل، تینوں اُن دنوں سکول میں پڑھتے تھے۔ دونوں بیٹے اکثر دوپہر کے بعد میرے پاس ہوسٹل میں آجاتے اور میری ان سے طویل گپ شپ رہتی۔ کریم بعد میں سویڈن چلے گئے لیکن اب پاکستان واپس آ چکے ہیں۔

رہے خلیل تو انہوں نے جرمنی کو اپنا مستقل مسکن بنا رکھا ہے۔ میں ۱۹۸۹ء میں پہلی بار جرمنی گیا تو فرینکفرٹ پہنچ کر انہیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ وہاں سے کوئی دو سو میل دور رہائش پذیر تھے۔ اس کے باوجود وہ

اگلے دن میرے پاس آ گئے اور مجھے ہمراہ لے گئے۔ ان کی ان ہی دنوں شادی ہوئی تھی اور ان کا گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا چنانچہ انہوں نے مجھے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور اگلے روز تریز اور سار برُوکن کی سیر کروائی۔ میں دوسری بار جرمنی گیا تو راشدہ اور ایک اور عزیزہ میرے ہمراہ تھی۔ خلیل ہائیڈل برگ سے ہمیں اپنے گھر لے گئے اور دو یا تین دن شرفِ میزبانی بخشا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں نے تو ان پر کبھی کوئی ایسا احسان نہیں کیا جس کا وہ بدلہ اتار رہے ہوں۔ یقیناً یہ ان کی سعید الفطرتی ہے جس پر یہ وہ بجا طور پر تعریف کے مستحق ہیں۔

خلیل جب بھی جرمنی سے پاکستان آتے ہیں مجھے اپنی آمد کی اطلاع دیتے ہیں اور ہو سکے تو ملاقات بھی کر کے جاتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ پاکستان آئے۔ میں اُن دنوں علیل تھا لہٰذا ان کی والدہ کے جنازہ میں شامل نہ ہو سکا۔ انہیں پتا چلا تو خاص طور پر لاہور آئے اور میری مزاج پرسی کے بعد جرمنی واپس گئے۔

میرے تجربے کے مطابق خلیل ایک انتہائی وضعدار انسان ہیں۔ اب آپ سے کیا پردہ، بہت سال پہلے جب میں اسلام آباد میں اپنے گھر کی تعمیر کا ارادہ کر رہا تھا لیکن فنڈز کی کمی کا شکار تھا تو میں نے خلیل سے درخواست کی کہ وہ مجھے دو لاکھ روپیہ بطور قرض بھجوا دیں اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ میں انہیں یہ رقم پانچ سال سے پہلے واپس نہ کر سکوں گا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید کنی کترا جاتا لیکن خلیل نے یہ خط ملتے ہی مجھے فون کیا اور بتایا کہ انہیں میری یہ ضرورت پوری کر کے خوشی ہوگی اور اگلے چند روز میں یہ رقم میرے بنک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے وعدے کے مطابق ریٹائرمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر ملنے والی رقم میں سے سب سے پہلے خلیل ہی کا قرض واپس کیا لیکن خلیل کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس سارے عرصہ میں مجھے ایک بار بھی نہیں جتلایا کہ میں ان کا مقروض ہوں۔

ان کے بارے میں سوچتے ہوئے میری توجہ ان کی ایک حالیہ تکلیف کی طرف مبذول ہوگئی اور وہ ہے انتہا درجے کی ضعفِ بصارت۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ایک روز ان کی دائیں آنکھ کی بینائی آناً فاناً تقریباً ختم ہوگئی۔ جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک میں علاج معالجہ کی کوئی کمی نہیں اور انہوں نے اس میں کوئی کسر بھی روا نہیں رکھی لیکن ان کی تکلیف میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ڈاکٹروں نے ان کے کئی آپریشن کئے اور جدید ترین دواؤں سے ان کا علاج کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ابھی تک اللہ تعالیٰ کے فضل کے متمنی ہیں اور آس لگائے بیٹھے ہیں کہ ایک نہ ایک روز کوئی معجزہ رونما ہوگا اور وہ اس آنکھ سے پہلے کی طرح دیکھنا شروع کر دیں گے اور دوسری آنکھ کی کمزور ہوتی بینائی بھی ان شاء اللہ درست ہو جائے گی۔

مولوی احمد حسن چھوٹے قد اور منحنی بدن لیکن مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ انہوں نے کالج کے حالات بہتر بنانے کے لیے اپنی طرف سے پوری کوشش کی اگرچہ مقامی حالات کے زیر اثر اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے پیدا ہوئے جو ڈاکٹر بنے۔ انہوں نے دوسری

شادی حضرت مولوی محمد جی ہزاروی کی صاحبزادی، خالدہ خانم سے کی۔ یاد رہے کہ مولوی محمد جی ہزاروی کو حضرت مسیح موعود کی رفاقت اور حضرت خلیفۃ المسیح الاول کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ اس شادی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مولوی صاحب کو دو بیٹوں سے نوازا جن کے ساتھ میری بھی یاد اللہ ہے۔ انیق بڑا ہے اور نبیل چھوٹا۔ نبیل تو اب امریکہ منتقل ہو گیا ہے لیکن انیق یہیں ہے۔

مولوی احمد حسن کی ایک ہمشیرہ نسبتی، مس اریبہ جو کسی وقت جامعہ نصرت میں انگریزی کی لیکچرر تھیں نے ایک بار مجھے بتایا کہ: ''میں نے اور میرے ایک بھائی نے مولوی صاحب مرحوم کے گھر پشاور میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور یہ ہم پر ان کا اتنا بڑا احسان ہے جو کبھی چکایا نہیں جا سکتا۔'' انہوں نے مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا: ''محبت کرنے والے اور بیحد دیانت دار شخص تھے۔ جب وہ پشاور یونیورسٹی کے کنٹرولر امتحانات مقرر ہوئے تو وہ ہر بنڈل میں ڈالے جانے والے امتحانی پرچوں کی گنتی خود کیا کرتے تھے۔ جب ان کے رفقائے کار اور ان کا سٹاف انہیں اس عرق ریزی سے منع کرتا تو وہ جواب دیتے: یہ میری ذمہ داری ہے۔ اگر میں احتیاط نہیں برتوں گا تو لوگ مجھے بیچ کر کھا جائیں گے۔''

منظور شاکر کی رہائش قلعہ صوبا سنگھ میں تھی۔ وہاں اب قلعہ یا اس کا کوئی نشان باقی نہ تھا لیکن جیسا کہ اس آبادی کے نام سے ظاہر ہے سکھوں کے زمانے میں صوبا سنگھ نامی کوئی جنگجو یہاں کا حکمران تھا اور اسی نے یہاں کوئی قلعہ تعمیر کرایا ہوگا۔

یہ ایک قدیم آبادی تھی۔ سڑک پر چند دکانیں تھیں اور پھر پُر پیچ گلیوں کے بیچوں بیچ بہت سا چلنے کے بعد منظور شاکر کا گھر آتا تھا۔ یہ چھوٹا سا گھر انہوں نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ منظور شاکر مجھ سے بطور شاگرد اور بطور رفیقِ کار بہت پیار کرتے تھے لیکن گھٹیالیاں سے واپسی پر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

وہ سکول میں میرے استاد تھے، پھر رفیق کار رہے اور آہستہ آہستہ دوست بن گئے۔ مجھے ان کی سادہ طبعی، محبت، اخلاص، مہمان نوازی جیسی کئی خوبیاں یاد آنے لگیں لیکن یہ بات تو خاص طور پر کہ ہم جب کبھی ایک ساتھ چہل قدمی کر رہے ہوتے اور وہ کسی بات پر میری توجہ چاہتے یا مجھے اپنی بات سمجھانا چاہتے تو اپنے ہاتھ کی انگلیاں ایک پنجے کی شکل میں اچانک میرے پیٹ میں چبھو دیتے۔ ظاہر ہے ان کی اس عادت کا اظہار صرف مجھ ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ساتھ چلنے والے ہر آدمی کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی اس مشفقانہ حرکت سے غیر حاضر دماغ بھی متحضر ہو جاتا اور ان کی بات فوراً سمجھ آ جاتی۔

منظور شاکر سے میری آخری ملاقات ۱۹۹۱ء میں قادیان کے جلسہ سالانہ پر ہوئی جہاں وہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ ملاقات ایک طویل وقفے کے بعد ہوئی تھی اور اس عرصے میں اُن کے حالات بہت بدل چکے تھے۔ گھٹیالیاں جہاں کا ماحول اُنہیں راس نہ تھا اب قصۂ پارینہ بن چکا تھا اور اُن دنوں اُن کی تقرری کامونکی کے کسی سرکاری سکول میں تھی۔ انہوں نے مجھے اس کا پتا لکھ کر دیا اور یہ بھی سمجھایا کہ یہ سکول جی ٹی روڈ پر واقع ہے

لہٰذا اسے ڈھونڈنے میں کسی دِقت کا احتمال نہیں۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنی اوّلین فرصت میں ان کے پاس حاضر ہوں گا اور دو چار بار اس سکول کے سامنے سے گذرا بھی لیکن مصروفیات کی وجہ سے اُن کے ساتھ ملاقات کو آج سے کل پر مؤخر کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز میں وہاں جا پہنچا لیکن یہ جان کر آزردہ ہوا کہ منظور شاکر کچھ عرصہ پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ان کا ایک ہی بیٹا ہے اور یہ ماں بیٹا بھی اُس وقت تک وہاں سے کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے لہٰذا میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اُن کی وفات کی تعزیت کروں تو کس سے؟

شریف خالد گولیکی کے رہنے والے تھے جنہوں نے تکمیل تعلیم کے بعد تقریباً چار سال تک فوج میں خدمات سرانجام دیں اور اس عرصہ میں کئی ماہ تک سنگاپور میں مقیم رہے۔ جنگ عظیم دوم ختم ہوئی تو انہوں نے اپنی زندگی خدمتِ سلسلہ کے لیے وقف کر دی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے انہیں نائب وکیل الدیوان، تحریک جدید انجمن احمدیہ مقرر کیا اور وہ ۱۹۵۱ء تک اس حیثیت میں کام کرتے رہے۔

انہوں نے اگلے پانچ سال لاہور میں گزارے اور اس عرصے میں بی ٹی، ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کر لیے۔ لاہور سے واپسی پر وہ شروع میں تعلیم الاسلام ہائی سکول اور پھر تعلیم الاسلام کالج میں رہے۔

وہ کالج میں ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے محبت تو پہلے بھی کرتے تھے لیکن گھٹیالیاں میں ان کے چندروزہ قیام کے بعد میرے ساتھ ان کا پیار کئی گنا بڑھ گیا۔ اس کے بعد وہ جب بھی ملتے بہ اصرار کسی چائے خانے میں لے جا کر موسم کے مطابق تواضع ضرور کرتے۔

پھر میرا دھیان تعلیم الاسلام ہائی سکول گھٹیالیاں کی طرف چلا گیا جو کالج حدود ہی میں واقع تھا۔ اگرچہ انتظامی لحاظ سے کالج اور سکول دو الگ الگ خودمختار ادارے تھے لیکن آتے جاتے ہماری ملاقات سکول کے ہیڈ ماسٹر، چوہدری غلام حیدر اور ماسٹر بشیر احمد زاہد سے ہو جایا کرتی تھی۔

غلام حیدر پرانے گریجوایٹ تھے اور تعلیم الاسلام ہائی سکول گھٹیالیاں میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ہمارا جب سکول کی طرف سے گذر ہوتا وہ کوئی نہ کوئی کلاس لے رہے ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود مزاج پرسی کے بغیر آگے نہ جانے دیتے۔ دبلے پتلے اور دراز قد ماسٹر غلام حیدر میرے گھٹیالیاں سے چلے آنے کے بعد کسی وقت ریٹائر ہوئے۔ جون ۱۹۸۱ء میں ان کی وفات پر الفضل میں شائع ہونے والی خبر سے پتا چلا کہ وہ ۱۹۳۲ء میں مدرسہ احمدیہ میں مدرس مقرر ہوئے اور تقسیم ملک تک تدریس کے فرائض ادا کرتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب مدرسہ احمدیہ احمد نگر متصل ربوہ میں منتقل ہوا تو آپ وہاں بھی تدریس کے فرائض ادا کرتے رہے۔ اکثر مربیان سلسلہ آپ کے شاگرد ہیں۔ بعد میں حضرت مصلح موعود کے ارشاد کے مطابق گھٹیالیاں میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب یہ سکول بڑے ہی نازک دور میں سے گذر رہا تھا۔ آپ نے ریٹائرمنٹ تک اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ آپ کی ہیڈ ماسٹری کے دور میں سکول پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور ترقی کے منازل طے کرنے لگا۔''

اسی اخبار سے پتا چلا کہ وہ'' قادیان میں اور پھر احمد نگر میں ایک لمبے عرصے تک سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ

مدرسہ احمدیہ کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ آپ بڑے منتظم تھے۔ قادیان میں نئی سال جلسہ سالانہ کے موقعہ
پر لنگر خانہ اندرون شہر کے ناظم کے فرائض ادا کرتے رہے۔ ضلع سیالکوٹ میں آپ اپنے علاقہ میں ۱۰۰۰ تک
بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے غیر از جماعت احباب بھی آپ سے اپنے اہم معاملات میں مشورہ لیتے۔

بشیر زاہد جو بھاگووال ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے سکول میں اورئینٹل ٹیچر کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان کے والد مخلص احمدی تھے چنانچہ انہوں نے اپنے اس بیٹے کو مدرسہ احمدیہ، قادیان میں داخل کرا دیا تاہم وہ کسی وجہ سے پڑھائی مکمل نہ کر سکے۔ انہوں نے مولوی فاضل کا امتحان قیامِ پاکستان کے بعد پاس کیا اور جب تلاشِ معاش کا مرحلہ درپیش ہوا تو ان کی نظرِ انتخاب اس سکول پر پڑی۔ جب تک یہ سکول سرکاری تحویل میں نہیں چلا گیا وہ یہیں رہے تاہم بعد میں وہ سیالکوٹ اور کلاس والہ کے سکولوں میں بھی پڑھاتے رہے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے بیٹے شاہد تسنیم کے پاس راولپنڈی منتقل ہو گئے لیکن جب انہیں ملازمت کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا تو بشیر زاہد ربوہ آ گئے۔ انہوں نے اسی دوران ۲۴ جون ۲۰۰۳ء کو وفات پائی اور ربوہ میں دفن ہوئے۔

یہ بزرگ بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے انشا پرداز اور شاعر تھے اور ان کی گفتگو میں علمی اور ادبی رنگ جھلکتا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں سے بے انتہا محبت کرتے اور ان کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے۔ ۱۹۷۶ء میں میری تعیناتی بطور انکم ٹیکس آفیسر گوجرانوالہ ہوئی تو ان کے ایک شاگرد محمد صدیق کھوکھر میرے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ انہیں کسی طرح علم ہو گیا کہ میں اور بشیر زاہد ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں چنانچہ انہوں نے بشیر زاہد سے درخواست کی کہ وہ میرے پاس ان کی سفارش کر دیں۔ سفارش کیا تھی، بس یہی کہ صدیق پر نظرِ شفقت رکھی جائے۔ بشیر زاہد نے مجھے اس حوالے سے ایک طویل خط لکھا جس میں صدیق کی سفارش کم اور گھٹیالیاں میں گذرے ہوئے وقت کی یادوں کا اعادہ زیادہ تھا۔

وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ابتدائی دنوں میں اس کے ایک سرگرم رکن رہے۔ وہ قلعہ کالروالا میں پی پی پی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ان کے بیٹے شاہد کی روایت کے مطابق ۱۹۷۴ء کی متنازعہ آئینی ترمیم سے پہلے تک بشیر زاہد کے مولانا کوثر نیازی کے ساتھ گہرے ذاتی مراسم تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے مولانا کو ایک بار خاص طور پر گھٹیالیاں مدعو کیا اور ان کے اعزاز میں ایک شاندار جلسے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے اس موقع پر ایک استقبالیہ نظم بھی کہی تھی جو شاہد نے خود اس جلسے میں ترنم سے سنائی تھی:

للّٰہ الحمد کہ وہ قافلہ سالار آیا
حبّذا دینِ محمد کا علمدار آیا

کوثر نیازی اس نظم سے تو جس قدر متاثر ہوئے سو ہوئے، وہ شاہد کے ترنم کی بھی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔ انہوں نے یوں ہی تو اسے یہ دعا نہیں دی تھی کہ ''اللہ تعالیٰ عزیزم شاہد تسنیم کو صاحبِ کوثر و تسنیم کا سچا عاشق بنائے۔''

بشیر زاہد پیپلز پارٹی کے عام جیالوں کے برعکس انتہائی خود دار تھے۔ شاہد بتاتے ہیں کہ ایک بار وہ راشن کارڈ پر چینی لینے کے لیے ڈپو پہنچے تو وہاں لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ شاہد اس قطار کے آخر میں

کھڑے ہو گئے لیکن جب ان کی باری آئی تو ڈپو ہولڈر نے یہ کہہ کر ڈپو بند کر دیا کہ چینی ختم ہو گئی ہے۔ باقی لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے تو اس نے شاہد سے تعجب کے ساتھ کہا کہ وہ تھوڑی سی چینی کی خاطر اتنی دیر سے کیوں قطار میں لگے ہوئے تھے اور انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ گھر چلے جائیں، ڈپو ہولڈر چینی خود ان کے گھر پہنچا دے گا۔ شاہد گھر واپس چلے گئے۔ ابھی کچھ ہی دیر گذری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈپو ہولڈر نے کسی مزدور کے سر پر چینی کا ایک تھیلا اُٹھوایا ہوا تھا اور وہ بشیر زاہد سے ملنے کا متمنّی تھا۔ شاہد بتاتے ہیں کہ بشیر زاہد یہ دیکھ کر سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے ڈپو ہولڈر کو متنبّہ کیا کہ اگر وہ چینی لیں گے تو صرف اپنے حصے کی اور وہ بھی باقی لوگوں کی طرح اپنی باری پر اور یہ کہ اگر ڈپو ہولڈر نے آئندہ اس طرح کی کوئی حرکت کی تو وہ اس کا ڈپو کینسل کرا کے دم لیں گے۔

میں ماضی کے ان ہی دریچوں میں جھانک رہا تھا کہ ماسٹر حمید احمد نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا: آپ کن خیالوں میں کھو گئے؟ دیکھیں تو سہی کالج جس میں آپ پڑھاتے رہے ہیں اور ہوسٹل جس میں آپ کی رہائش تھی اب کس حال میں ہیں؟

میں نے ایک نظر کالج اور ہوسٹل کی عمارات پر ڈالی جو اَب تقریباً کھنڈر بن چکی ہیں اور کسی قابلِ ذکر استعمال میں نہیں۔ وہ کالج جس کی بنیاد صرف اور صرف اس نیت سے رکھی گئی تھی کہ اس پسماندہ علاقے کے غریب لیکن ذہین بچے جو وسائل کی کمی کی وجہ سے بڑے شہروں میں جا کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتے محض غربت کی وجہ سے زیورِ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں آج تباہی و بربادی کی منہ بولتی تصویر بنا ہوا تھا۔ علاقے کے لوگوں نے اس عمارت میں بھینسیں باندھ رکھی تھیں اور اس کے فرش گوبر سے اٹے پڑے تھے۔ ہوسٹل دیکھنے کی تو نوبت ہی نہ آ سکی کیوں کہ اس کی عمارت پر تالا پڑا ہوا تھا اور چوکیدار حسبِ توقع غائب تھا تاہم بتایا گیا کہ اس کے بعض کمروں کی چھتیں زمیں بوس ہو چکی ہیں اور دیواریں گرنے کو ہیں۔

صورتِ حال کا ماتم کر چکے تو مجھے خیال آیا کہ حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان کا ننھیالی گاؤں، داتا زید کا یہاں سے دور نہیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ موصوف کے نانا چوہدری الٰہی بخش کے گھر کا وہ کمرہ جس میں چوہدری ظفر اللہ خان کی پیدائش ہوئی تھی اسی شکل میں محفوظ ہے لیکن گھٹیالیاں میں اپنے طویل قیام کے باوجود وہاں جا نہ سکا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ کمرہ بھی دیکھ لیا جائے۔

عالمِ تکوین میں تیرا وجودِ باصفا   اک کرامت، ایک الہامِ جلی، اک معجزہ

ماسٹر حمید احمد کو میری اس خواہش کا علم ہوا تو انہوں نے کہا: ''میں ابھی چوہدری مبارک احمد باجوہ سے بات کر لیتا ہوں۔ چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے نانا ان کے پردادا تھے اور یہ گھر آج کل ان ہی کی ملکیت ہے۔'' فون کرنے پر معلوم ہوا کہ مبارک باجوہ اپنے کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ اس خبر سے میرے چہرے پر پیدا ہونے والے مایوسی کے آثار دیکھ کر ماسٹر حمید احمد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا: ''وہ یہاں نہیں تو کیا ہوا۔ گھر دیکھنے کا انتظام بہر حال ہو جائے گا۔''

وہ کچھ کوشش کے بعد دو تین ایسے احباب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے چنانچہ مغرب سے کچھ پہلے راقم؛ خلیل احمد، صدر جماعت احمدیہ چوک داتا زید کا؛ عبدالحمید چیمہ، سیکرٹری مال جماعت احمدیہ داتا زید کا اور ماسٹر حمید احمد پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ مبارک باجوہ کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔

ان سارے انتظامات میں میرے اندازے سے کچھ زیادہ وقت لگ گیا تھا اور میرے پیش نظر واپسی کا سفر بھی تھا اس لیے میں غیر ارادی طور پر بار بار اپنی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حمید نے میری پریشانی بھانپ لی اور تسلی آمیز لہجے میں کہا: ''ہم جو گھر دیکھنا چاہتے ہیں چند منٹوں کے فاصلے پر ہے۔ میں نے پیغام بھجوا دیا ہے۔ بس ابھی چلتے ہیں۔''

کچھ ہی دیر میں حمید ہمیں ساتھ لے کر مبارک باجوہ کے مکان پر پہنچ گئے جہاں مشتاق احمد نامی ایک نوجوان نے ہمارا استقبال کیا۔

''میں مبارک باجوہ کا بھتیجا ہوں۔ اپنی وین چلاتا ہوں'' مشتاق نے اپنا تعارف کرایا۔

''تو یوں کہیں کہ آپ ٹرانسپورٹر ہیں' میں نے بات آگے بڑھائی۔

وہ زیرِ لب مسکرا دیے۔ ''میں تو معمولی آدمی ہوں۔ ٹرانسپورٹر تو بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ انہوں نے اس کمرے کا تالا کھول دیا جس میں سے گذر کر ہی چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے کمرہ پیدائش میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔

اس کمرے کی ایک دیوار پر کسی خاتون کی غیر فریم شدہ تصویر لگی ہوئی تھی۔ مشتاق احمد نے بتایا کہ یہی چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی والدہ ہیں۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس عظیم خاتون کی تصویر اپنے پاس محفوظ کر لوں لیکن میں تذبذب میں تھا کہ اس تصویر کی تصویر بنانے کی اجازت طلب کروں یا دل مسوس کر رہ جاؤں۔ بالآخر ہمت کر ہی ڈالی: ''بے شک بنا لیں'' مشتاق نے کہا ''یہ آپ کی بھی تو ماں ہیں اور ماں کی تصویر پاس رکھنا تو کوئی گناہ نہیں۔'' میں نے موبائل فون پر یہ تصویر بنائی اور پھر پوچھا ''پڑچھتیوں پر لگے برتنوں کی تصویر بھی بنا لوں؟''

''سو بسم اللہ'' مشتاق نے پھر میری حوصلہ افزائی کی۔

''یہ برتن ہیں کس زمانے کے؟'' میں نے پوچھا۔

''برتن پرانے ضرور ہیں لیکن اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا تعلق بھی چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی والدہ کے دور سے ہے۔''

اب ہم اس کمرے میں داخل ہو چکے تھے جہاں ۶ فروری ۱۸۹۳ء کو یہ نابغۂ روزگار پیدا ہوا تھا۔ یہ ساڑھے اکتیس فٹ لمبا اور سوا دس فٹ چوڑا ایک پختہ کمرہ ہے جس پر لکڑی کی کڑیوں اور ٹائلوں کی چھت ہے۔ اس کمرے میں داخلے کا صرف ایک ہی دروازہ ہے جو دیوار کے وسط میں ہے۔ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں ہے۔

اس کمرے میں پہنچتے ہی مجھے چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی کتاب ''میری والدہ'' کا وہ حصہ یاد آ گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موصوفہ کو خدا تعالیٰ کے مالکِ کُل ہونے کا کس قدر پختہ یقین تھا اور وہ اس راہ میں حائل ہونے والی ہر مشکل خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔

روایت کے مطابق داتا زید کا میں ایک ہندو بیوہ رہا کرتی تھی جس کا نام تو جے دیوی تھا لیکن عرفِ عام میں وہ چڑیل یا ڈائن کہلاتی تھی۔ جب چوہدری محمد ظفر اللہ خان کا سب سے بڑا بھائی جس کا نام ظفر رکھا گیا تھا پیدا ہوا تو جے دیوی اُس کی والدہ کے پاس آئی اور ان سے کچھ پارچات اور بعض دیگر اشیاء اس انداز میں طلب کیں گویا یہ چیزیں نہ دی گئیں تو ظفر کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی والدہ نے اپنے اس پختہ یقین کی بنیاد پر کہ موت وحیات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے جے دیوی کی فرمائش پوری کرنے سے معذرت کر لی اور اس کے اصرار کے باوجود انکار پر قائم رہیں۔

ایک روز جب ظفر کی والدہ اُسے غسل دے رہی تھیں جے دیوی نے آ کر پھر اپنا مطالبہ دہرایا اور اُن کے انکار پر دھمکی دی کہ اگر وہ بچے کو زندہ لے کر گھر لوٹ سکیں تو وہ سمجھ لیں کہ جے دیوی محض گیدڑ بھبکیاں دے رہی تھی۔

جے دیوی مکان کی ڈیوڑھی تک بھی نہ پہنچی ہو گی کہ ظفر کو خون کی قے اور اجابت ہوئی اور وہ چند گھنٹوں کے اندر اندر فوت ہو گیا۔ اس پر اُس کی والدہ نے خدا تعالیٰ کے حضور عرض کی کہ یا اللہ! یہ بچہ تو نے ہی دیا تھا اور تو نے ہی لے لیا، میں تیری رضا پر راضی ہوں اور خالی گود سسرال واپس چلی گئیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں ایک اور بچہ پیدا ہوا جس کا نام رفیق رکھا گیا۔ پچھلے تجربہ کے مدِ نظر اُن کے سسر نے دو سال تک انہیں داتا زید کا نہ جانے دیا حتی کہ نومولود نے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ اسی عرصہ میں چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے ننہیال میں کوئی وفات ہو گئی جس پر انہیں مجبوراً داتا زید کا جانا پڑا۔ جب جے دیوی کو ان کی آمد کا پتا چلا تو وہ ان کے پاس آئی اور اپنا پرانا مطالبہ دہرایا۔ اب چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے نانا بھی جے دیوی کی فرمائش پوری کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے مگر وہ اپنی بات پر قائم رہیں کہ یہ چند روپوں کا نہیں بلکہ ان کے ایمان کا معاملہ ہے اور اگر خدا نومولود کو زندگی عطا نہیں کرنا چاہتا تو کوئی اور ہستی اسے زندہ رکھ ہی نہیں سکتی۔

دو چار روز گذرے تھے کہ جے دیوی نے انہیں خواب میں آ کر کہا کہ اب کی بار بھی بچے کو زندہ واپس

لگیں تو مجھے کھتری کی بیٹی نہ کہنا، چوہڑے کی بیٹی کہنا۔ ان کی آنکھ دہشت سے کھل گئی اور انہوں نے گھبرا کر اپنی والدہ کو آواز دی۔ انہوں نے چراغ جلایا تو کیا دیکھتی ہیں کہ رفیق نے خون کی قے اور اجابت کی ہے اور نیم مردہ سا پڑا ہے۔ اس خیال سے کہ رفیق کے دادا تو اسے ڈسکہ سے آنے ہی نہیں دے رہے تھے اور اگر یہ بچہ فوت ہو گیا تو سسرال میں ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا وہ گھبرا گئیں اور اسی وقت واپس سسرال جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سارا راستہ اللہ تعالےٰ سے بچے کی زندگی میں صرف دس دن کی مہلت مانگتی رہیں تا کہ اس کے دادا ایک بار اسے ہنستا کھیلتا دیکھ لیں۔ انہوں نے اللہ تعالےٰ کے حضور عرض کی کہ اس کے بعد تو بیشک اسے اپنے پاس بلا لینا، میں اُف تک نہیں کروں گی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمالی اور بچہ تندرست ہو گیا لیکن دس دن کے بعد اس کی حالت وہی ہو گئی جو داتا زید کا میں ہوئی تھی۔ اسے اسی طرح خون آیا اور وہ چند گھنٹوں میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی والدہ کی گود ایک بار پھر خالی ہو گئی لیکن انہوں نے اس واقعہ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش سمجھ کر بخوشی قبول کر لیا۔

چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی ولادت سے ایک رات پہلے جے دیوی پھر موصوفہ کی خواب میں آئی۔ اس نے بتایا کہ فلاں وقت لڑکا پیدا ہو گا لیکن ساتھ ہی کہا کہ بعض احتیاطیں ضروری ہیں۔ اوّل یہ کہ پیدا ہوتے ہی لڑکے کی ناک چھید دینا اور اونٹ کا بال چھید میں ڈال دینا اور دوم یہ کہ کل رات آٹے، گھی اور ہلدی کا ایک چراغ جلا کر اپنے مکان کی سب سے اونچی جگہ جہاں چیل بیٹھا کرتی ہے رکھ دینا۔

انہوں نے یہ خواب اپنے والدِ بزرگوار کو سنا دی۔ عین اسی وقت جو خواب میں بتایا گیا تھا چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی پیدائش ہوئی۔ وہ کیا دیکھتی ہیں کہ ان کی ایک نند نے ایک چھوٹی سی پیالی میں ایک سُوئی تیار کر کے رکھی ہوئی ہے جس میں دھاگے کی بجائے ایک بال ڈالا ہوا ہے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا چیز ہے تو نند نے جواب دیا کہ اونٹ کا بال منگوایا گیا ہے تا کہ اس سے بچے کی ناک چھید دی جائے۔ وہ سمجھ گئیں کہ یہ حرکتیں جے دیوی کو خوش کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں چنانچہ وہ ان کے ارادوں میں مزاحم ہو گئیں۔ تب ان کی نند نے بتایا کہ یہ سب کچھ ان کے شوہر کی رضامندی سے کیا جا رہا ہے اور آٹے، گھی اور ہلدی کا ایک چراغ بھی بنا لیا گیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: یہ سب مشرکانہ باتیں ہیں، میں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے بچے کے لیے زندگی مقدر کر رکھی ہے تو وہ یہ سب کچھ کرنے کے بغیر بھی زندہ رہے گا اور اگر موت اس کا مقدر ہے تو یہ باتیں اسے بچا نہیں سکتیں۔ میں اس بچے کے لیے اپنا ایمان ضائع نہیں کروں گی۔

خدا کی شان دیکھئے! اُس نے اس بچے کو نہ صرف لمبی عمر سے نوازا بلکہ شہرت کی ان بلندیوں تک پہنچا دیا جہاں پہنچنا کسی کسی کا مقدر ہوتا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا عبدالرشید تبسم نے:

عالم تکوین میں تیرا وجودِ باصفا
اک کرامت، ایک الہام جلی، اک معجزہ

گرمیٔ فیضِ دمِ عیسیٰ تری گفتار میں
کلکِ سلطانُ القلم سے ہے قلم تیرا بنا
تو عجم کی آبرو ، تو دورِ حاضر کا وقار
تیرے دَم سے مرتبہ اقوامِ عالم کا بڑھا
عارفانِ رہ کا منزل کو چلا جب کارواں
سارے سالاروں سے نکلا تو نہایت تیز پا

جب ہم مبارک باجوہ کی بیٹھک میں ٹھنڈے مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو ایک نو وارد بھی شریکِ گفتگو ہو گیا۔ ''میرا نام محمد انور ہے'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا ''ہم پچھلی کئی پشتوں سے اس خاندان کے خدمت گذار ہیں۔ میرے نانا کا نام مہتاب دین تھا۔ چوہدری محمد ظفر اللہ خان نے ''میری والدہ'' میں اپنے ایک بھائی، رفیق کی شدید علالت کا ذکر کیا ہے۔ جب اس کی جان کے لالے پڑ گئے اور ان کی والدہ نے فوری طور پر داتا زید کا سے ڈسکہ جانے کا فیصلہ کیا تو میرے نانا ہی گھوڑی پر انہیں ڈسکہ چھوڑ کر آئے تھے۔''

یہ کمرہ دیکھنے کے بعد مجھے بار بار تحریک ہو رہی تھی کہ مجھے اس کمرے، اس تصویر اور ان برتنوں کے بارے میں ''فرام ہارسز ماؤتھ'' بھی کچھ سننا چاہیئے چنانچہ میں نے لاہور پہنچ کر فون کیا تو مبارک باجوہ سے بات ہوگئی۔ پہلے تو وہ معذرت کرنے لگے کہ وہ داتا زید کا میں ہماری آمد کے وقت وہاں موجود نہ تھے لیکن میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ ان کے کارندوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی تھی لہٰذا انہیں اس بارے میں چنداں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوئی تو ان کا کہنا تھا: ''یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ چوہدری صاحب کی پیدائش والا کمرہ اب بھی اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے لیکن میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ اگر کسی وقت اس کی دیواریں یا چھت تبدیل کرنے کی نوبت آئی بھی ہو تو کمرے کی اصل ہیئت تبدیل نہیں ہونے دی گئی اور اس کی دیواریں پرانی بنیادوں پر ہی اُٹھائی گئی ہیں۔ رہے وہ برتن جو آپ نے دیکھے ہیں پرانے ضرور ہیں اور میں نے انہیں ہمیشہ ایسے ہی دیکھا ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ لازمی طور پر ان کا تعلق چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے نانا کے دور سے ہے۔ جہاں تک تصویر کا تعلق ہے یہ واقعی چوہدری صاحب کی والدہ کی ہے۔''

''یہ کمرہ دیکھنے کے لیے کون کون سے معتبرین یہاں تشریف لا چکے ہیں؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''جماعت کے بہت سے بزرگان یہاں آ چکے ہیں۔ ان میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع شامل ہیں لیکن دونوں خلافت سے پہلے تشریف لائے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے تو یہاں پر ایک رات قیام فرمایا تھا اور میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا۔''

''ان کے علاوہ؟''

''حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد، حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد، چھوٹی آپا اور مرزا خورشید احمد بھی یہاں قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔ اسی طرح غیر ممالک میں جا آباد ہونے والے بعض احمدی بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔''

''چوہدری محمد ظفر اللہ خان خود آخری بار کب یہاں آئے تھے؟''

''ایک مدت تک تو چوہدری صاحب سال کے سال یہاں آتے رہے۔ آخری بار ۱۹۰۰ء میں تشریف لائے تھے۔ دراصل وہ تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں کی دعوت پر آئے تھے اور انہوں نے کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ انتظامی کمیٹی کے اراکین، علاقے کے معززین اور دُور ونزدیک سے خود بخود جمع ہو جانے والے ایک جم غفیر سے خطاب کیا تھا۔ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ میں بھی اس تقریب میں موجود تھا۔''

مبارک باجوہ کو تو چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی تقریر کا خلاصہ یاد نہ تھا تاہم نذیر احمد خادم، سابق طالب علم تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں حال مقیم محلّہ دارالعلوم، ربوہ (جو اِس جلسہ میں موجود تھے) کے الفاظ میں چوہدری محمد ظفر اللہ خان نے اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''حضرت مسیح موعود کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ دینِ حق کی حقیقی تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دنیا میں ازسرِنو قائم کیا جائے اور اُن کی جماعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے رنگ میں رنگین ہو کر اپنی زندگی دینِ حق کے نور کو دنیا میں پھیلانے کے لیے وقف کردے۔ اس کے بعد آپ نے مشرق کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ جو سامنے گاؤں ہے میاں والی خاناں والی یہاں حضرت مسیح موعود کے ایک رفیق تھے، حضرت چوہدری اللہ دتہ۔ وہ زمیندار تھے اور اُن میں حضرت مسیح موعود کے پیغام کی اشاعت کا جنون تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے لئی بناتے، بغل میں حضرت مسیح موعود کے اشتہارات دابتے اور سر پر لئی کا برتن رکھ کر گاؤں گاؤں، گلی گلی پھر کر اشتہارات دیواروں پر چسپاں کرتے۔ لوگوں سے بُرا بھلا سنتے مگر اپنی دُھن سے باز نہ آتے۔ اسی طرح نماز باجماعت کی عادت ان میں اس قدر راسخ تھی کہ وہ اپنے احمدی اور غیر احمدی مزارعین میں سے ہر ایک سے اس کی پابندی کراتے۔ جب نماز فجر سے پہلے حضرت چوہدری اللہ دتہ کے مزارعین کھیتوں میں ہل چلا رہے ہوتے تو آپ چادریں اور کھیس لے کر کھیتوں میں پہنچ جاتے اور ہل روک کر احمدی مزارعین کو خود باجماعت نماز پڑھاتے اور غیر از جماعت مزارعین کو ہدایت فرماتے کہ وہ اپنی نماز الگ ادا کریں۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے چوہدری محمد ظفر اللہ خان نے بتایا: حضرت چوہدری اللہ دتہ کے ایک بیٹے سے قتل ہوگیا۔ مقتول کے ورثاء نے گواہان میں ان کا نام بھی لکھوا دیا۔ جب جج نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ قتل آپ کے بیٹے نے کیا ہے تو چودھری اللہ دتہ نے فرمایا: جی ہاں! یہ قتل میرے بیٹے نے ہی کیا ہے۔ ان کے اس جواب سے جج حیران وششدر رہ گیا اور اس کے دل پر باپ کی اپنے بیٹے کے خلاف سچی گواہی کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے مدعی سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارا مقتول بیٹا تو اب زندہ نہیں ہوسکتا لیکن میں سفارش کرتا ہوں کہ خدا سے محبت اور خوف رکھنے والے اس باپ کے بیٹے کو معاف کردو۔ جج کی یہ بات سنتے ہی مدعی نے بہ آواز بلند کہا: جج صاحب میں چوہدری اللہ دتہ کے بیٹے کو اپنے بیٹے کا قتل معاف کرتا ہوں چنانچہ عدالت نے حضرت چودھری اللہ دتہ کے بیٹے کو بری کر دیا۔

یہ واقعات بیان کرنے کے بعد چوہدری صاحب نے فرمایا: پس یہ ہے وہ نورِ ایمان جو

حضرت مسیح موعود ہمارے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے۔''

کیا خوب کہا ہے طاہر عارف نے:

زبان شیریں، بیاں خوب، خوب تر چہرہ
حسیں خیال، لباسِ بشر میں سجتا تھا
خدائے پاک کا کلمہ تھا ایک ظفر اللہ
فنائے عشقِ الٰہی، وفا کا پُتلا تھا
یہ اک جھلک تھی، وہ نورِ مہہ چہار دہم
وہ اپنے دور کا موسیٰ بہ دست بیضا تھا
لہر لہر ہے سمندر کی بے کراں لیکن
مثالِ بوند صدف میں وہ دُرِ یکتا تھا
عظیم تھا وہ زمانے نے یک زبان کہا
عظیم تر تھی وہ ماں جس کا ایسا بیٹا تھا

لیکن یہ کیا، میں گھٹیالیاں کے راہِ مولیٰ میں اپنی جانیں نچھاور کرنے والے احباب، چوہدری محمد ظفر اللہ خان کی جنم بھومی اور تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں میں اُن کے خطاب کے ذکر میں محو ہو کر آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ صاحبزادہ مرزا رفیع احمد اور چوہدری عبدالحق ورک کے اُن خطوط سے جن میں مجھے گھٹیالیاں میں گذرے ہوئے وقت پر کفِ افسوس ملنے کی بجائے یہاں خدمت کا موقع ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی تلقین کی گئی تھی مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا اور میں نے بہت استغفار کیا۔ بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ انسانی زندگی میں آنے والے سخت مقامات اس کی تربیت اور آئندہ ترقی کے لیے کتنے اہم ہوتے ہیں۔ یوں اس کے دل میں زندگی کی آسائشوں کی قدر پیدا ہوتی ہے اور شہری سہولتوں سے عاری علاقوں کے باسیوں کی مشکلات کا احساس پیدا ہوتا ہے اور یہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔

اے میرے ربِ محسن! کیوں کر ہو شکرِ احساں

میں اپنی ملازمت ختم ہونے کی پریشانی میں تھا کہ ایک روز سرِ راہے قریشی سعید احمد کارکن جامعہ احمدیہ سے ملاقات ہو گئی۔ ان کے والد قریشی محمد حنیف قمر المعروف سائیکل سیاح میرے حقیقی خالو تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اگرچہ میری خالہ ۱۹۲۷ء میں وفات پا گئی تھیں اور ان سے کوئی اولاد بھی نہ تھی لیکن قریشی محمد حنیف قمر نے ہمارے خاندان کے ساتھ ہمیشہ تعلق قائم رکھا۔ وہ اور ان کی اہلیہ، زہرہ خاتون ہمارے ہاں آتے رہتے اور ان کے دونوں بچے یعنی ذکیہ خاتون اور قریشی سعید بھی ہم سے مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اب یہ چاروں خواتین وحضرات وفات پا چکے ہیں لیکن مجھے ان کی محبت کا ایک ایک واقعہ یاد ہے۔

قریشی سعید رحمٰن کالونی میں اپنے ذاتی مکان کی تعمیر سے پہلے تحریک جدید کوارٹرز میں رہائش پذیر تھے۔ اسی زمانے کی بات ہے آپ کے ہاں پہلی بیٹی کی ولادت ہوئی لیکن کمزوری صحت کی بنا پر ان کے لیے بیٹی کو اپنا دودھ پلانا ممکن نہ تھا۔ دونوں خاندانوں کے خصوصی تعلقات کے پیشِ نظر قریشی سعید کی اہلیہ نے یہ ذمہ داری قبول کر کے آپ کی ایک بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔

مجھے یاد ہے قریشی سعید بالعموم سائیکل پر ادھر اُدھر آتے جاتے تھے۔ اُن کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو دُور سے ہی مسکرا کر ہاتھ ہلانے لگ جاتے اور اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ سائیکل سے اتر کر مصافحہ ومعانقہ کرتے اور مزاج پُرسی کے بعد اجازت لیتے۔ انہیں میری ملازمت ختم ہونے کا پتا چلا تو انہوں نے ذکر کیا کہ جامعہ احمدیہ میں ان ہی دنوں انگریزی پڑھانے پر مامور ہونے والے شیخ خادم حسین کسی اعلیٰ سرکاری عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں اور بہت ہمدرد انسان ہیں۔ قریشی سعید کا خیال تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے ایک دو روز میں ان سے میری ملاقات کرا دیں گے۔ میری درخواست پر انہوں نے شیخ خادم حسین کے ساتھ فوری طور پر مل کر اسی شام کا وقت لے لیا۔

اُن دنوں شیخ خادم حسین فیکٹری ایریا میں رہائش پذیر تھے۔ وہ شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ سابق جج لاہور ہائیکورٹ کے چچا زاد تھے۔ وہ طہران کے پاکستانی سفارت خانے میں تھرڈ سیکرٹری کے طور پر ریٹائر ہوئے تھے اور کچھ ہی عرصہ پہلے ربوہ منتقل ہوئے تھے۔ انہوں نے میری داستانِ غم بہت توجہ کے ساتھ سنی اور پھر مجھے شیخ عبدالوہاب، اسسٹنٹ ریجنل الیکشن کمشنر برائے مغربی پاکستان لاہور کے نام ایک تعارفی چٹھی دیتے ہوئے تاکید کی کہ میں ان سے اپنی اولیں فرصت میں مل لوں۔

میں اگلے ہی دن لاہور چلا گیا۔ شیخ عبدالوہاب ان دنوں راج گڑھ میں مقیم تھے اور میں ان کے گھر کے

محل وقوع سے ناواقف تھا۔ بہرحال میں بادامی باغ سے نہ جانے کتنی سواریاں تبدیل کر کے نمازِ عصر کے بعد ان کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ان کا ملازم باہر نکلا۔ وہ میری بات سن کر اندر چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد واپس آ کر بتایا کہ وہ اس وقت تلاوتِ کلام پاک میں مصروف ہیں لہٰذا ان کا ارشاد ہے کہ اگر میں چاہوں تو میں اگلی صبح دفتر میں ان سے ملاقات کر سکتا ہوں۔

میں جس مشکل سے ربوہ سے لاہور اور بادامی باغ سے راج گڑھ پہنچا تھا اس کے بعد میں اُن سے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ یہ رمضان کے دن تھے اور روزہ سے نہ ہونے کے باوجود میری جسمانی کیفیت روزہ داروں جیسی ہی تھی۔ ایسے میں شیخ صاحب کے جواب سے میں بے حد رنجیدہ خاطر ہوا اور انہیں کوستا ہوا واپس چلا آیا۔

یہ تو تھا شیخ عبدالوہاب کے بارے میں میرا پہلا تاثر لیکن بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ انتہائی نیک اور ہمدرد انسان تھے چنانچہ میں جب اگلے روز ان کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ اتفاقاً ان کے دفتر میں اسسٹنٹ کی دو پوسٹیں خالی ہیں جنہیں اشتہار دیئے بغیر پُر کیا جانا مقصود ہے اور یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک اسسٹنٹ ریجنل الیکشن کمشنر برائے مغربی پاکستان خود اپنی صوابدید پر رکھیں گے جب کہ دوسرا اسسٹنٹ مجھے اپنی صوابدید سے بھرتی کرنا ہے لیکن یہ دونوں آسامیاں ایسے امیدواروں کے ذریعہ پُر کی جائیں گی جو مطلوبہ اہلیت رکھتے ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ ریجنل الیکشن کمشنر کی نظر میں ایک آدمی پہلے سے موجود ہے جب کہ انہیں میں اس پوسٹ کا اہل نظر آ رہا ہوں تاہم ایک دو روز بعد ہمارا انگریزی کا امتحان اور انٹرویو ہوگا۔ اگر ہم نے یہ امتحان پاس کر لیا تو ہماری نوکری پکی ورنہ وہ کسی اور مناسب شخص کو تلاش کر لیں گے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ ریجنل الیکشن کمشنر کا نام محمود احمد ہے، ان کا تعلق پراونشل سول سروس سے ہے اور وہ حکیم اجمل خان کے داماد اور حکیم احمد نبی خان جمال سویدا کے بہنوئی ہیں۔ ان کی اطلاع کے مطابق حکیم احمد نبی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو دیکھنے کے لیے ربوہ جاتے رہتے تھے لہٰذا ان کا مشورہ تھا کہ اگر ڈاکٹر مرزا منور احمد میرے بارے میں ان سے بات کر لیں تو میرا کام مزید آسان ہو جائے گا۔ مجھے مان تھا کہ اباجی نے اپنی ساری زندگی خدمتِ سلسلہ میں گذاری تھی اور مرزا منور احمد انہیں بخوبی جانتے تھے لہٰذا میں نے اس کام کو بہت آسان سمجھتے ہوئے شیخ عبدالوہاب کو یقین دلا دیا کہ میں ان شاء اللہ مرزا منور احمد سے حکیم احمد نبی کے نام سفارشی خط حاصل کر لوں گا تاہم انہوں نے یہ انکشاف کر کے مجھے مایوس کر دیا کہ ان کی حکیم احمد نبی سے ملاقات تو ضرور ہے لیکن ان سے ایسے تعلقات نہیں کہ وہ ان سے کوئی ذاتی کام کہہ سکیں لہٰذا اگر میں مرزا مبارک احمد سے مل لوں تو مناسب ہوگا کیوں کہ حکیم صاحب کے ساتھ ان کے تعلقات زیادہ گہرے ہیں۔ میں نے مرزا مبارک احمد کے درِدولت پر حاضری دی تو معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے وہ بھی حکیم احمد نبی کو تعارفی خط دینا مناسب خیال نہیں فرماتے۔ ان کا مشورہ تھا کہ سیّدہ چھوٹی آپا ان سے علاج کراتی رہی ہیں لہٰذا مجھے ان سے ملنا چاہیے۔ ان دونوں حضرات کے ساتھ ملاقات میں ہی میرا بہت سا وقت صرف ہو گیا تھا اور مجھے بہرحال اسی شام لاہور پہنچنا تھا لہٰذا میں نے

سفارشی خط کے حصول کے بغیر ہی لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

قدرت کا نظام بہت عجیب ہے۔ اس واقعہ پر دو تین سال گذرے تھے اور میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد فیصل آباد میں تعینات تھا کہ اجمل دواخانہ، امین پور بازار کے مالک حکیم محمد نبی خاں اپنے کسی کام سے خود میرے پاس آ گئے۔ وہ حکیم اجمل خان کے صاحبزادے اور حکیم احمد نبی خان جمال سویدا کے سگے بھائی تھے۔ دبلے پتلے حکیم محمد نبی خان اچکن اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس تھے۔ میں نے برسبیلِ تذکرہ حکیم احمد نبی کا پوچھا تو انہوں نے واپس جا کر ان سے ذکر کر دیا اور اگلے ہی روز مجھے ان کا فون آ گیا۔ انہوں نے مجھے اپنا پتا لکھواتے ہوئے دعوت دی کہ اگر میں اپنی سہولت کے مطابق انہیں کسی مناسب وقت پر ملاقات کا موقع دوں تو وہ اسے اپنی عزت افزائی سمجھیں گے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد میں اور حکیم محمد نبی لاہور گئے اور ان سے ملاقات کے لیے ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے۔ وہ گلبرگ، لاہور کی مین مارکیٹ کے قریب ایک وسیع وعریض کوٹھی میں مقیم تھے اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو وہ مطب بھی وہیں کرتے تھے۔ ان کا ڈرائنگ روم دلی کی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھا اور اس میں مغربی رواج کے برعکس چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی اسی تہذیب کا چلتا پھرتا شاہکار تھے۔ ان کے لہجے میں ایک ایسی مٹھاس تھی جو یہاں کسی کے نصیب میں نہیں۔ یہ تو تھی ان کے ساتھ میری پہلی ملاقات۔ میں ان کے حسنِ اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ جب بھی لاہور جاتا ان سے ملاقات کے بغیر واپس نہ آتا۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ وہ میری آمد کی اطلاع پا کر اپنی مصروفیات ملتوی کر دیتے اور میں جتنی دیر چاہتا ان کے پاس بیٹھ سکتا تھا۔

آج جب کہ اس واقعہ پر چالیس سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے، میں نے یہ سب باتیں صرف تحدیثِ نعمت کے طور پر بیان کی ہیں لیکن اُس وقت تو میں حکیم احمد نبی کے نام خط نہ ملنے پر سخت ملول تھا اور اگلی صبح اسی کیفیت میں ریجنل الیکشن کمشنر کے دفتر میں پہنچ گیا۔

وہاں پہنچتے ہی میری ملاقات فیصل آباد کے محمد حنیف سے ہو گئی جو ایم اے میں میرے کلاس فیلو اور میرے اچھے دوست تھے۔ وہ ان دنوں اے جی آفس میں یو ڈی سی کے طور پر کام کر رہے تھے اور اس دفتر میں اسسٹنٹ کی پوسٹ کے امیدوار تھے۔

کچھ ہی دیر میں ہمارا ٹیسٹ شروع ہو گیا اور ہمیں اُن ہی دنوں منعقد ہونے والی رباط کانفرنس کے حوالے سے کسی انگریزی اخبار کے ایڈیٹوریل کی تلخیص کرنے کو کہا گیا۔ ہمارے بیٹھے بیٹھے دونوں پرچوں کی مارکنگ ہو گئی اور ہمیں انٹرویو کے لیے روک لیا گیا۔

یہ انٹرویو ریجنل الیکشن کمشنر نے لیا۔ پہلے تو وہ میری اسناد دیکھتے رہے اور پھر گھنٹیاں لیاں اور اسے چھوڑنے کی وجوہات پر بات ہوتی رہی۔ مجھ سے جو سوالات پوچھے گئے ان کا تعلق ایم اے سیاسیات میں پڑھے جانے والے مضامین سے تھا لہٰذا خدا کے فضل سے میں ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب دیتا چلا گیا۔ سوالات کا موضوع تھا:

انتخابات کا بنیادی مقصد، مختلف نظام ہائے حکومت، موجودہ حالات میں اسلامی نظام حکومت سے قابل عمل ہونے کے بارے میں میری رائے، ویسٹرن تھیوری آف پاور، اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصور اور اسلام سے ابتدائی دور میں حکومتی مشینری کی شکل۔

الحمد للہ مجھے اس ملازمت کے لیے منتخب کر لیا گیا تاہم جوائن کرنے سے پہلے مجھے سروسز ہسپتال سے اپنا میڈیکل چیک اپ کرانا تھا۔ یہ ملازمت اس بات سے بھی مشروط تھی کہ پولیس اور انٹیلی جنس میرے اچھے چال چلن کی تصدیق کر دے۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے میڈیکل ٹیسٹ تو ایک دو دنوں میں کرا لیا لیکن پولیس رپورٹ میرے اختیار سے باہر تھی۔ اللہ نے یہ مرحلہ بھی آسان کر دیا۔ جوں ہی متعلقہ تھانہ کو دفتر کی طرف سے اس امر پر مشتمل درخواست موصول ہوئی تھانے کا ایک آدمی میری جائے قیام پر آ کر یہ پیغام دے گیا کہ اگر میں مثبت رپورٹ چاہتا ہوں تو اسی شام پچاس روپے لے کر تھانے میں حاضر ہو جاؤں۔ میں ربوہ کے ماحول سے تازہ تازہ باہر نکلا تھا لہٰذا میں نے بہتیری منت کی کہ مجھ پر یہ ''جرمانہ'' عائد کئے بغیر ہی مہربانی کر دی جائے لیکن اہلکار بضد رہا کہ یہ رقم رشوت کے طور پر نہیں بلکہ چائے پانی کے لیے وصول کی جا رہی ہے لہٰذا اس کی ادائی کے بغیر میں اس کام کی توقع نہ رکھوں۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں نے مجبوراً حامی بھر لی۔ تھانے دار نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا اور اُسی وقت میرے اچھے چال چلن کی تصدیق کر کے کاغذات متعلقہ حکام کو ارسال کر دیئے۔

میں نے چار دسمبر کو ریجنل الیکشن کمشنر کے دفتر میں بحیثیت اسسٹنٹ جائن کر لیا۔

اس موقع پر میرا دل خدا کی حمد سے لبریز تھا۔ گھٹیالیاں سے غیر متوقع فراغت کی وجہ سے میں ناقابلِ بیان حد تک پریشان تھا لیکن الحمد للہ جلد ہی بے روزگاری کا یہ دور ختم ہوا اور آج میں پہلے سے کہیں بہتر ماحول میں ملازمت کرنے لگا تھا۔ گھٹیالیاں کی نسبت یہاں تنخواہ بھی کچھ زیادہ تھی لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس شہر میں روزگار کے بہت سے مواقع موجود تھے جن سے زیادہ بہتر طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ عاجز پر اتنا بڑا احسان تھا جس کا شکر ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس نے میری دستگیری فرمائی تھی اور ایک ایسے وقت میں جب کہ میں بے روزگار ہو جانے کی وجہ سے سخت مضطرب تھا اس نے غیب سے میری مدد فرمائی۔ جب میں شیخ عبدالوہاب سے ملا تو اتفاقاً ان کے دفتر میں اسسٹنٹ کی ایک اسامی خالی تھی جسے بھرنے کا اختیار ان کے محکمہ کی طرف سے انہیں حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالوہاب کے دل میں میرے لیے ہمدردی پیدا کی اور مجھے ان کے معیار پر پورا اُترنے کی توفیق عطا فرمائی۔

اب جب کہ میری تقرری لاہور میں ہو چکی تھی میرا فوری مسئلہ رہائش کا تھا۔ تایا جی اُن دنوں راوی روڈ پر کریم پارک میں رہا کرتے تھے۔ ان کا گھر ایسا وسیع و عریض تو نہ تھا اور وہ کثیر العیال بھی تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے مجھے اپنے ہاں قیام کی اجازت دے دی۔ ۳۰ جون ۱۹۷۰ء تک یعنی جب تک میرا تبادلہ پشاور نہیں ہو گیا میرا قیام ان ہی کے گھر رہا اور میں بصدقِ دل اعتراف کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے آرام کا ہر ممکن خیال رکھا۔ خدا انہیں ان کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ اپنے گھر میں مجھے ہر ممکن

آسائش بہم پہنچانے میں تایا جی کے ساتھ ساتھ بہت سا دخل تائی آمنہ کا بھی تھا جو حضرت بھائی عبدالرحیم قادیانی کی صاحبزادی تھیں۔ اب تایا جی اور تائی جی دونوں وفات پا چکے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند سے بلند تر فرماتا چلا جائے۔

میرا دفتر ۱۰۔کورٹ سٹریٹ پر ایک پرانی سی کوٹھی میں تھا جو متروکہ املاک میں شامل ہونے کے بعد الیکشن کمیشن نے اپنے نام منتقل کرا رکھی تھی۔ اس کے کمرے وسیع و عریض، دیواریں موٹی، چھتیں اونچی اور اطراف میں برآمدے تھے۔ اگرچہ یہ کوٹھی خاصی بوسیدہ ہو چکی تھی لیکن اس دفتر کے انچارج، ریجنل الیکشن کمشنر اور اسسٹنٹ ریجنل الیکشن کمشنر کے دفاتر اُس زمانے کے معیار کے مطابق خاصے آراستہ تھے۔ ایک دن اچانک یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ دفتر کا چوکیدار ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات یہ کمرے خواہشمندوں کو کرائے پر اٹھا دیتا ہے جو انہیں حسبِ منشا استعمال کرنے کے بعد صبح ہوتے ہی نہا دھو کر یہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس اچانک انکشاف پر دفتر میں کئی دن تک بہت دلچسپ تبصرے ہوتے رہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اس دفتر کے انچارج ریجنل الیکشن کمشنر تھے۔ ان کے نیچے ایک اسسٹنٹ الیکشن کمشنر تھے۔ ان کے نیچے ایک سپرنٹنڈنٹ تھا اور پانچ اسسٹنٹ۔ باقی سٹاف ان کے علاوہ تھا۔

ہم سے پہلے وہاں تین اسسٹنٹ کام کر رہے تھے یعنی جعفر حسین، عبداللطیف اختر اور ملک محمد حسین۔ ان میں سے جعفر اپنی عمر اور تجربہ کے اعتبار سے سب سے سینئر اسسٹنٹ تھے اور محکمہ ڈاک و تار سے اس محکمے میں ڈیپوٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ دراز قد، وجیہ اور خوبصورت گفتگو کرنے والے جعفر کی وجہ سے اس دفتر میں بہت رونق تھی۔ وہ بات سے بات نکالنے کا گُر جانتے تھے، لطیفہ بازی کے فن سے بھی آشنا تھے اور حاضر جوابی ان پر ختم تھی۔ وہ لٹن روڈ پر ایک گلی کے اندر دوسری منزل پر رہا کرتے تھے جہاں مجھے ایک دو بار ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی مل چکا ہے۔

لطیف اختر کا تعلق ملتان کے ایک مذہبی خانوادے سے ہے لیکن وہ خود مذہبی تعصبات سے بہت بالا اور آزاد منش ہیں۔ بعد میں انہوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور ملتان واپس چلے گئے۔ ۱۹۹۳ء میں میری وہاں پر تقرری ہوئی تو ان سے رابطہ بھی بحال ہو گیا جو اللہ کے فضل سے آج تک قائم ہے۔

انہوں نے ملتان جا کر صحافت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا اور وہ لمبا عرصہ نوائے وقت کے ایڈیٹوریل سٹاف پر رہے۔ اب وہ پبلیکیشن کا کام کر رہے ہیں اور خود بھی بعض کتابیں لکھ چکے ہیں۔

وہ اپنے حال میں مست رہنے والے انسان ہیں جن کے منہ سے دوسروں کی شکایات بہت کم سننے کو ملتی ہیں۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کر رکھا ہے جہاں وہ ممتاز کالم نگار عطاء الحق قاسمی اور ایک احمدی نوجوان، نثار کنجاہی کے کلاس فیلو تھے۔ وہ ان دونوں سے انتہائی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔

عطاء الحق قاسمی کی ذات تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے لیکن جہاں تک نثار کنجاہی کا تعلق ہے وہ گنگارام ہسپتال کے ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، کیپٹن (ر) ڈاکٹر مختار احمد کے صاحبزادے تھے اور اُن دنوں کوئنز روڈ پر

اپنے والد بزرگوار کو ہسپتال کی طرف سے فراہم کردہ سرکاری رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات اسی گھر میں ہوئی تھی۔

تکمیل تعلیم کے بعد نثار کنجاہی نے سٹینڈرڈ بنک میں ملازمت اختیار کی تھی لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر حبیب بنک جوائن کر لیا۔ قریباً ربع صدی تک اس بنک سے منسلک رہے اور پھر گولڈن ہینڈ شیک لے لیا۔

ایک بار لمبا عرصہ نثار کنجاہی سے ملاقات نہ ہو پائی تو ہمارے مشترک دوست، روحی کنجاہی نے بتایا کہ ان پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے اور وہ معذوری کی زندگی گذار رہے ہیں۔ میرے لیے یہ خبر کسی بم شیل سے کم نہ تھی۔ جب میں آخری بار ان سے ملا تو وہ پوری طرح صحتمند تھے۔ ان کی عمر بھی ایسی زیادہ نہ تھی کہ فالج جیسا موذی مرض ان پر غالب آ جاتا لیکن تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ میں نے وہ دن بہت پریشانی میں گذارا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا سدا مسکراتا ہوا چہرہ میری نظروں کے سامنے آ جاتا۔ میں نے اسی وقت فون پر ان سے رابطہ کیا اور وقت طے کر کے ان کے گھر پہنچا تو وہ بہت مشکل سے خود دروازہ کھولنے کے لیے آئے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر دل سے ان کی صحت کے لیے دعا نکلی تاہم وہ اس بیماری سے سنبھل نہ پائے اور ۴ دسمبر ۲۰۰۹ء کو وفات پا کر ماڈل ٹاؤن، لاہور کے احمدیہ قبرستان میں دفن ہوئے۔

روحی کنجاہی نے اپنے ان اشعار میں ان کی بہت سی خوبیوں کو گویا سمو دیا ہے:

کنجاہ کا نثار بڑا جانثار تھا
یارانہ اُس کا باعثِ صد افتخار تھا
وہ اہلِ علم ، اہلِ نظر ، اہلِ ذوق و شوق
دھیمے مزاج میں بھی بڑا باوقار تھا
صبر آزما طویل علالت کے باوجود
باحوصلہ تھا اور بڑا بُردبار تھا
رُوحی میں اس کی خوبیوں کا ذکر کیا کروں
اخلاص کیش اور محبت شعار تھا

فیصل آباد کے رہنے والے محمد حسین لاگر یجوایٹ ہیں۔ وہ فیصل آباد میونسپل کارپوریشن کے ایک سابق میئر، ملک محمد اشرف کے چچا اور ایک کاروباری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ملازمت میں آ گئے۔ کرشن نگر میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ وجیہ شخصیت کے مالک ہیں۔ میرے الیکشن کمیشن سے چلے آنے کے بعد وہ الیکشن افسر ہو گئے لیکن پھر کسی وجہ سے ملازمت سے بددل ہو گئے اور انہوں نے کئی سال کی نوکری چھوڑ کر فیصل آباد میں ڈجکوٹ روڈ پر ایک ہوزری مینوفیکچرنگ یونٹ لگا لیا۔ اللہ نے انہیں اس کاروبار میں خوب برکت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک خوشحال زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کے باوجود ان کا اخلاص اور محبت پہلے دن کی طرح ہمیشہ قائم رہا۔ ان سے اکثر رابطہ رہتا ہے۔ جب بھی ملتے ہیں اسی اپنائیت کے ساتھ اور بچ

پوچھیں تو میں کئی بار ان کے گھر پر شبینہ قیام اور پُرخلوص میزبانی سے متمتع ہو چکا ہوں۔

یہ تینوں دوست جانے کب سے اکٹھے تھے اس لیے ایک دوسرے کے مزاج شناس تھے۔ ان کے درمیان سارا دن فقرے بازی اور ہر طرح کے مذاق کا سلسلہ جاری رہتا۔ میں اور حنیف نو وارد تھے لیکن انہوں نے ہمیں بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ سوائے جعفر کے سب چھڑے چھانٹ تھے لہٰذا کسی کو بھی گھر جانے کی جلدی نہ ہوتی۔ کام کے ساتھ ساتھ دن بھر چائے چلتی اور ہنسی مذاق کا لامتناہی سلسلہ بھی جاری رہتا۔

ہمارے سپرنٹنڈنٹ محمد یوسف نام کے ایک بے ریش بزرگ تھے۔ وہ ہمیشہ کوٹ پینٹ میں ملبوس ہوتے۔ ان کا قد قدرے چھوٹا اور جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ ہمیشہ مسکرا کر ملتے۔ ہم پانچوں اسسٹنٹ اِن کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے لہٰذا پرانے اسسٹنٹوں کی ان کے ساتھ خاصی بے تکلفی تھی لیکن جب اچانک فوری نوعیت کا کوئی کام آ جاتا یا افسرانِ بالا کا دباؤ بڑھتا تو وہ آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے تاہم آدمی سمجھدار تھے، کبھی ذرا دھمکا کر اور کبھی منت سماجت سے اپنا کام نکال ہی لیتے۔

وہ عمر کے اس حصے میں تھے جب نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو طرح طرح کی بیماریاں آ لیتی ہیں۔ انہیں بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق تھا۔ نہ معلوم کیا علاج معالجہ کرتے تھے لیکن ہم دیکھتے تھے کہ ان پر کام کا اچانک بوجھ پڑتا تو پریشان ہو جاتے اور ان کی نکسیر پھوٹ پڑتی۔ آہستہ آہستہ ہم سب کو پتا چل گیا کہ جب انہوں نے اپنی ناک پر رومال رکھ کر اسے زور سے پکڑا ہو تو اس کا مطلب کیا ہے چنانچہ سب لوگ مذاق بھول کر ان کی دلجوئی میں لگ جاتے۔ وہ غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھوتے اور بسا اوقات سر پر ٹھنڈا پانی ڈالتے۔ کچھ دیر کے بعد ان کی طبیعت سنبھل جاتی اور دفتری ماحول بحال ہو جاتا۔

الیکشن کمیشن کی ملازمت چھوڑنے کے بعد ابتدائی تین چار سالوں کے دوران جب تک میرا اُس دفتر میں آنا جانا رہا میری ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی لیکن پھر اس میں ایک لمبا وقفہ آ گیا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں جب میری تقرری سنٹرل بورڈ آف ریونیو میں سیکرٹری (ٹیکس پالیسی) کے طور پر تھی ایک روز نائب قاصد نے اچانک مجھے ان کا کارڈ لا کر دیا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں چنانچہ میں نے دفتر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کر لی ہے اور یہ کہ وہ اسی کمپنی کے کسی کام سے وہاں آئے ہیں۔ ان کے کام کا مجھ سے براہِ راست تعلق نہ تھا البتہ میں نے ان کے مسئلہ کے حل میں ہر ممکن مدد کی۔

اس کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی باتیں اب بھی یاد آتی ہیں۔ کبھی یوں ہوتا کہ ہم اپنی دانست میں اپنا کام مکمل کر کے چھٹی کر رہے ہوتے تو وہ ہمیں کسی فوری نوعیت کی اہم فائل کا ''واسطہ'' دے کر روک لیتے۔ اس پر ہم تلملاتے اور ان پر کسی نہ کسی شکل میں اپنی ناراضی کا اظہار بھی کر دیتے لیکن نو کر کیہہ تے نخرہ کیہہ کے مطابق بالآخر ہتھیار ڈال دیتے۔ یوں بھی الیکشن ہونے والے تھے اور دفتر میں کام بہت تھا لہٰذا

ہمیں بالعموم رات گئے تک دفتر میں بیٹھنا پڑتا۔ کبھی تو آدھی رات بھی وہیں ہو جاتی جس کے بعد میں سائیکل پر کریم پارک اپنی رہائش گاہ پر پہنچتا۔

اگرچہ مجھے تایا جی کے ہاں ہر طرح کا آرام تھا اور وقت بے وقت آنے جانے پر کوئی قدغن نہ تھی لیکن پھر بھی جب میں آدھی رات کے وقت ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو مجھے سخت شرمندگی ہوتی۔ اس وقت تک سب گھر والے سو چکے ہوتے چنانچہ ان کی نیند خراب ہوتی۔ تائی جی نے میرے لیے کھانا سنبھال کر رکھا ہوتا تھا۔ برتنوں کی کھڑ کھڑ سے باقی لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوتے۔

میں اس صورتِ حال کا تدارک چاہتا تھا چنانچہ طے یہ پایا کہ میں لیٹ ہونے کی صورت میں کھانا بہر طور باہر سے کھا کر آیا کروں گا اور دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہو جایا کروں گا، اندر سے دروازہ کھول کر سائیکل صحن میں کھڑا کروں گا اور دروازہ بند کر کے آہستگی سے چارپائی پر دراز ہو جایا کروں گا۔ اگرچہ یہ کام مشکل نظر آتا تھا اور اس میں شور شرابے کا بھی امکان رہتا تھا لیکن تھوڑی سی پریکٹس سے میں یہ سب کچھ اس ماہرانہ انداز میں کرنے لگا کہ میرے آنے کی کسی کو کانوں کان تک خبر نہ ہوتی۔

اس دفتر کی دو اور شخصیات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے ایک تو محمد حسن تھے جو ریجنل الیکشن کمشنر کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور جن کا قدرے تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔ دوسرے اشرف ندیم تھے جو مولانا کوثر نیازی کے پروردہ تھے۔ دفتر کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر اُس زمانے میں تو میری ان سے کوئی بے تکلفی نہ ہو سکی لیکن بعد میں بھٹو کے زمانے میں وہ لیٹرل انٹری میں ڈپٹی سیکرٹری بن کر آ گئے اور ان کی تعیناتی سی بی آر میں بطور سیکرٹری ایڈمنسٹریشن ہوئی۔ میں اس وقت گریڈ اٹھارہ میں پہنچ چکا تھا سو اُن سے گپ شپ شروع ہو گئی۔ وہ سینئر جوائنٹ سیکرٹری بن کر ریٹائر ہوئے۔ ادبی ذوق رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے ضمیر جعفری کی سرپرستی میں ''اردو پنچ'' کے ایک دو شمارے بھی نکالے۔ ان کا چین کا ایک سفرنامہ ''محبتوں کے درمیاں'' بھی چھپ چکا ہے۔ وہ کچھ عرصہ سیکرٹری، مقتدرہ قومی زبان بھی رہے اور غالباً اسی دوران اچانک وفات پا کر اسلام آباد کے آئی ۸ قبرستان میں دفن ہوئے۔

ناسپاسی ہو گی اگر میں یہاں پر اپنے ''باس'' شیخ عبدالوہاب کا قدرے تفصیلی ذکر نہ کروں۔ موصوف ایک مخلص احمدی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ حضرت منشی حبیب الرحمٰن، رفیق حضرت مسیح موعود کے پوتے، شیخ عبدالرحمٰن کپورتھلوی کے صاحبزادے اور خود بھی مخلص احمدی تھے۔ وہ اپنے ماتحتوں میں ایک سخت گیر افسر کے طور پر پہچانے جاتے تھے لیکن ان سے ہمارا براہِ راست واسطہ کم ہی پڑتا۔ ان کے پاس فائلیں آفس سپرنٹنڈنٹ کی معرفت جاتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر وہی بلائے جاتے تھے تاہم اگر دفتر کے کسی کارکن کا نام لے کر اسے طلب کرتے تو وہ گھبرا سا جاتا اور جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو کا وِرد کرتا ہوا اندر جاتا۔ اس کے ساتھی اسے ہمدردی بلکہ رحم کی نظر سے دیکھتے اور اس کی بخیریت واپسی کے لیے بیک زبان دعائیں مانگتے۔

یہ تو تھا ان کے ماتحتوں کا ان کے بارے میں عمومی تاثر۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے وہ مجھ پر بہت

مہربان تھے اور مجھے ایک مخلص احمدی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔

ابھی میری ملازمت پر تین ہفتے بھی نہ گذرے تھے کہ جلسہ سالانہ آ گیا۔ شیخ صاحب نے مجھے خود طلب کر کے مجھ سے جلسے کا پروگرام دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو ابھی اس ملازمت میں آئے ہوئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا لہٰذا تین روز کی رخصت طلب کرنا شاید مناسب نہ ہو۔ میری اس بات پر انہوں نے قدرے خفگی کا اظہار کیا اور فرمایا: ''آپ اس نوکری کے لیے جلسہ چھوڑ دیں گے؟'' میں نے انہیں بتایا کہ میں نے قیامِ پاکستان کے بعد سے ربوہ کا کوئی جلسہ سالانہ مِس نہیں کیا لیکن اب میرے حالات ایسے ہیں کہ یہ جلسہ چھوٹتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس پر شیخ صاحب نے جلسہ سالانہ کی اہمیت پر مجھے ایک لمبا لیکچر دیا جس پر میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ان کی طرف سے سرپرستی کے وعدے پر میں وہاں جا سکتا ہوں اور ان شاء اللہ ضرور جاؤں گا۔ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ میں ہر صورت میں جلسے میں شامل ہوں چنانچہ انہوں نے تجویز کیا کہ میں ۲۵ دسمبر کو گھر سے رخصت کی درخواست بھجوا دوں اور خود جلسہ پر چلا جاؤں۔ انہوں نے راج گڑھ سے ربوہ کے لیے جماعتی انتظام کے تحت چلنے والی بس میں میرے لیے بھی نشست مختص کرا دی اور میں ان کے ساتھ ہی ربوہ گیا۔ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے اس جلسہ میں شمولیت کی توفیق عطا فرمائی لیکن اس نیکی کا زیادہ ثواب اُنہیں ہی جاتا ہے۔

جب مجھے پہلی تنخواہ ملی تو شیخ عبدالوہاب نے مجھے خاص طور پر اپنے دفتر میں طلب کیا اور تفصیل سے سمجھایا کہ لازمی چندہ جات کون کون سے ہیں اور کس شرح سے قابلِ ادا ہیں۔ میری پچھلی ساری زندگی ربوہ میں گذری تھی اور پچھلا سال گھٹیالیاں میں گذرا تھا جہاں تنخواہ کی ادائی کے وقت لازمی چندہ جات کاٹ لئے جاتے تھے لہٰذا اس حوالے سے میری معلومات میں کوئی خامی نہ تھی چنانچہ انہوں نے استفسار کیا کہ میں اپنے ذمہ واجب الادا چندہ جات کی ادائی کہاں کیا کروں گا۔ اس وقت تک مجھے یہ علم نہ تھا کہ چندہ اسی حلقے میں ادا کرنا چاہئے جہاں کسی احمدی کی رہائش ہو اور میں سمجھتا تھا کہ اس کی مرکز میں ادائی زیادہ مستحسن ہے چنانچہ میں نے انہیں بتایا کہ میں ربوہ میں چندہ ادا کیا کروں گا۔ تب انہوں نے واضح کیا کہ یہ طریق کار درست نہیں اور مجھے اپنا جماعتی حلقہ معلوم کر کے چندہ یہیں ادا کرنا چاہئے۔

شیخ عبدالوہاب نظامِ خلافت سے بے انتہا عقیدت رکھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود بھی حضور کو باقاعدگی سے دعا کے لیے خط لکھتے ہوں گے چنانچہ ان کی خواہش تھی کہ میں بھی حضور کو دعا کے لیے خط لکھتا رہوں۔ انہوں نے اپنا ذاتی تجربہ بتایا کہ بعض اوقات ابھی حضور کو خط پہنچا بھی نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ خلافت کی برکت سے وہ دعا قبول فرما لیتا ہے اور وہ پریشانی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب موقع ملتا شیخ صاحب مجھ سے ضرور دریافت کرتے کہ کیا میں اس معاملے میں غفلت تو نہیں برت رہا۔ یہ خلافت ثالثہ کا دور تھا اور میرے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ساتھ ذاتی مراسم تھے۔ میں حضور سے ملتا بھی رہتا تھا، ان سے اپنے ذاتی مسائل پر مشورہ بھی کر لیتا تھا اور خط بھی لکھتا رہتا تھا۔ جب شیخ صاحب کے علم میں یہ بات آئی تو وہ بے حد مسرور ہوئے اور میری اس سعادت پر مجھے مبارکباد کا مستحق ٹھہراتے رہے۔

میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میری طرف سے ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچے۔

جب میں نے یہ ملازمت اختیار کی تو جسٹس عبدالستار پاکستان کے چیف الیکشن کمشنر تھے۔ اُن کا تعلق سابقہ مشرقی پاکستان سے تھا۔ میری اس دفتر میں تقرری کے دوران وہ ایک بار دورہ پر لاہور تشریف لائے اور کچھ وقت ریجنل الیکشن کمشنر کے ساتھ گذارا۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ''افسرانِ بالا'' کی اس میٹنگ میں کیا کیا معاملات زیرِغور آئے تاہم ہمارا مفروضہ یہی تھا کہ یہ میٹنگ پیش آمدہ ملکی انتخابات کے انتظامات کے حوالے سے ہے۔ اس قسم کی میٹنگز کے دوران ماتحت عملہ سہما سہما سا رہتا ہے کہ نا معلوم کس وقت اسے طلب کر کے آناً فاناً کوئی ایسا سوال پوچھ لیا جائے جس کا جواب اسے نہ آتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس میٹنگ کے اختتام کا اعلان ہوا تو سب کی جان میں جان آئی۔

میٹنگ کے بعد ایک گروپ فوٹو ہوا جس سے پہلے چیف الیکشن کمشنر نے سٹاف کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ان کی مزاج پرسی کی۔ ہم سب اتنی سی بات پر ہی خوش تھے کہ انہوں نے ہم سے کوئی سوال پوچھ کر ہمیں کسی امتحان میں نہیں ڈالا۔ دوسری خوشی اس بات کی تھی کہ ہمیں ان کے ساتھ تصویر بنوانے کا موقع ملا ہے اور ہم بہت دنوں اپنی اس خوش بختی پر ناز کرتے رہے۔

اس دفتر میں گذرا ہوا وقت میرے لیے اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ مجھے بہتر روزگار کے لیے کئی جگہ قسمت آزمائی کا موقع مل گیا۔ میں نے اسی زمانے میں پی سی ایس (ایگزیکٹو) کا امتحان دیا، اس عرصے میں سیاسیات کے مضمون میں لیکچرر شپ کے لیے ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن میں میرا انٹرویو ہوا، اسی دوران سی ایس ایس کے تحریری امتحان کا نتیجہ آیا اور ان ہی دنوں میرا سی ایس ایس کا انٹرویو ہوا۔

اگرچہ یہ ایک مشکل دور تھا اور سر پر ہر وقت کسی نہ کسی امتحان یا انٹرویو کا خوف سوار رہتا تھا لیکن اس خوف میں بھی آگے بڑھنے کی لگن پوشیدہ تھی۔ ان دنوں ذہن پر ہر وقت ایک ہی خیال غالب رہتا تھا کہ اپنے مستقبل کو کس طرح سنوارا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اس تگ و دو میں بھی ایک خاص لذت تھی۔

ہر قدم پر ہے امتحاں سا ایک

میں اب ماشاءاللہ برسرِ روزگار ہو تو چکا تھا لیکن کلیریکل کیڈر میں کام کر رہا تھا لہٰذا میری دلی تمنا تھی کہ مجھے جلد از جلد کوئی بہتر ملازمت مل جائے۔ قاضی محمد اسلم سے بات ہوئی تو انہوں نے اپنے ایک شاگرد، اسلم اقبال کا ذکر کیا جو سول سروس آف پاکستان کے رکن تھے اور حکومتِ مغربی پاکستان میں بطور رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز تعینات تھے۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ اگر میں ان سے مل لوں تو وہ اس معاملہ میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق میں نے جھٹ قاضی صاحب سے ان کے نام سفارشی خط کی فرمائش کر ڈالی۔ قاضی صاحب نے اسی وقت کاغذ قلم سنبھالا اور خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ یہ خط جو انگریزی میں تھا ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

"I have been here ----- back at work after my leg injury ----- now for about three weeks.

I have had your affectionate message. Can you accomodate this young man in your Department? You will not be disappointed if you do. Very capable, methodical, neat and hard working, and of excellent moral character.

He had to repeat his MA (Pol. Sc.) for a division. Circumstances were to blame. But his earlier record was first class throughout. I wish I could come to introduce him. He is not related to me but he is one of my TI boys. Besides, I have ----- for the months ----- come to like him especially.

Affectionate regards."

اس خط کا آزاد اردو ترجمہ کچھ یوں کیا جا سکتا ہے: ''میں اپنی ٹانگ کے فریکچر کے بعد اب قدرے آرام سے ہوں اور پچھلے تین ہفتے سے اپنی ڈیوٹی پر واپس آ چکا ہوں۔ مجھے اس خط کے ذریعہ آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا آپ ملازمت کے حصول میں حاملِ رقعہ ہٰذا کی کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ کے اپنے محکمہ میں بھی اس کے لیے گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو کیا ہی اچھا ہو جائے۔ یہ نوجوان بہت محنتی، قابل، حد درجہ میتھاڈیکل، پاکیزہ صفت اور بے داغ کردار کا مالک ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسے اپنے محکمے میں کوئی جگہ دے کر آپ کو اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہ ہوگا۔

اسے ایم اے میں اپنی ڈویژن بہتر بنانے کے لیے پچھلے سال دوبارہ امتحان دینا پڑا تھا تاہم اس کا پچھلا تعلیمی ریکارڈ فرسٹ کلاس کا ہے۔ میری صحت اجازت دیتی تو میں خود اسے آپ کے پاس لے کر آتا۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے مجھے یہ وضاحت کرنے کی اجازت دیں کہ میرا اس لڑکے سے اور کوئی تعلق نہیں ماسوا اس کے یہ تعلیم الاسلام کالج کا اولڈ سٹوڈنٹ ہے تاہم میں یہ ضرور کہوں گا کہ پچھلے کچھ عرصہ سے مجھے اس سے محبت سی ہوگئی ہے۔''

قاضی محمد اسلم نے تو مجھ پر حسبِ معمول بے پناہ شفقت فرمائی تھی لیکن اسلم اقبال نے اس خط کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی تفصیل میں نہ جانا ہی شاید بہتر ہو۔

میں یہ خط لے کر موصوف سے لٹن روڈ پر واقع ان کے دفتر میں ملا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے محکمے میں باقی پوسٹیں تو پبلک سروس کمیشن کے نامزد امیدواروں سے ہی پُر کی جاتی ہیں تاہم اگر میں پسند کروں تو وہ مجھے فوری طور پر کسی کوآپریٹو سوسائٹی میں سیکرٹری رکھوا سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے خود ہی وضاحت کی مجھے یہ ملازمت خوب سوچ سمجھ کر قبول کرنی چاہیے کیوں کہ اس میں ترقی کے امکانات بالکل معدوم ہیں اور سیکرٹری کے طور پر بھرتی ہونے والا شخص سیکرٹری ہی ریٹائر ہو جاتا ہے۔ میں اپنے حالات سے اس قدر بددل ہو چکا تھا کہ میں نے اس وضاحت کے باوجود یہاں درخواست دینے کا ارادہ کرلیا اور اگلے روز پھر ان کے دفتر جا پہنچا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا اسلم اقبال کا تعلق سول سروس آف پاکستان سے تھا جو پاکستان میں انڈین سول سروس کی جانشین سمجھی جاتی تھی جب کہ یہ عاجز نوکری کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا لہٰذا انہوں نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جس کا میں ان حالات میں مستحق تھا۔ انہوں نے مجھ ایسے کمزور اور بے بس سائل کو بنظرِ شفقت دیکھنے کی بجائے مجھے سارا دن باہر بٹھائے رکھا۔ اس روز ان کے پاس ملاقاتیوں کا ہجوم تھا نہ دفتر میں کارندوں کی کوئی غیر معمولی نقل و حرکت نظر آ رہی تھی جس سے مجھے ان کی بے پناہ مصروفیت کا یقین آ جاتا۔ میں ان کے پرسنل اسسٹنٹ کو بار بار اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تاہم وہ بے چارہ بھی ''صاحب'' کی مرضی کے آگے بے بس نظر آ رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور سارا دن ملاقات کے انتظار میں گذار دیا۔ غالباً انہوں نے بھی مجھے اپنی بے وقعتی کا احساس دلانے کا تہیہ کر رکھا تھا چنانچہ دوپہر دو بجے کے قریب (یعنی دفتری اوقاتِ کار سے کم وبیش ایک گھنٹہ پہلے) جب ان کا ایک نوعمر بیٹا سکول سے چھٹی کرنے کے بعد واپس ان کے پاس پہنچ گیا تو وہ خاموشی سے پچھلے دروازے سے نکل کر گھر چلے گئے۔ مجھے خود پر بہت شدید غصہ آیا لیکن قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق خاموشی سے سب کچھ برداشت کرلیا اور اگلے روز صبح ہی صبح پھر ان کے دفتر میں جا موجود ہوا۔ تین گھنٹے انتظار کے بعد ان سے تین منٹ کی ملاقات ہوئی جس دوران میں نے اپنی درخواست انہیں پیش کر دی۔ مجھے اس درخواست کے جواب کا آج تک انتظار ہے۔

اسی دوران میں نے دو دیگر جگہوں پر درخواستیں بھجوائیں۔ اوّل الذکر درخواست حبیب بنک لمیٹڈ میں پروبیشنری آفیسر کے لیے تھی اور حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کے مشورے پر بھجوائی گئی تھی۔ بعد میں مجھے انٹرویو

کے لیے بھی بلایا گیا لیکن میں بوجوہ اس کے لیے پیش نہیں ہوا۔ دوسری درخواست انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں لیکچررشپ کے لیے تھی تاہم وہاں سے انٹرویو کے لیے کوئی کال ہی موصول نہیں ہوئی۔

ان حالات میں جب میں نے اپنے بعض دوستوں سے یہ افواہ سنی کہ جلد ہی پراونشل سول سروس (ایگزیکٹو) کا امتحان ہونے والا ہے تو میں نے ذہنی طور پر اس میں شمولیت کا فیصلہ کرلیا۔ میں اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ ہمارے ماحول میں بعض پرانے پی سی ایس افسران کا نام کس عزت وتکریم سے لیا جاتا ہے اورعوام الناس کی نظروں میں ان کی کیا قدر ومنزلت ہے۔ اس وقت سی ایس ایس کے امتحان میں میری کامیابی غیر یقینی تھی لہٰذا میں ترقی کا یہ موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

اُن ہی دنوں ربوہ کے دو نوجوان پی سی ایس (ایگزیکٹو) کا امتحان پاس کرنے کے بعد بطور مجسٹریٹ مفوّضہ فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو محلّہ دارالیمن کے رہائشی، اعجاز الحق قریشی تھے جو بعد میں ملٹری لینڈز اینڈ کینٹونمنٹس سروس میں چلے گئے۔ دوسرے عبدالرشید شریف تھے جو مولانا محمد شریف سابق مربی، بلادِ عربیہ کے صاحبزادے تھے اور بعد میں قتل ہو گئے۔ یہ دونوں صاحبان تعلیم الاسلام کالج میں مجھ سے کچھ سینئر تھے اور میں انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اعجاز الحق قریشی تو نہ جانے کہاں تعینات تھے لیکن عبدالرشید شریف چنیوٹ میں ہوا کرتے تھے اور رات ربوہ اپنے گھر میں گذارتے تھے۔ میں ایک بار خاص طور پر ربوہ جا کر ان سے ملا اور اس امتحان کے بارے میں رہنمائی حاصل کی۔

میں نے اس امر کا بنظرِ غائر جائزہ لیا تھا کہ اہالیانِ ربوہ پی سی ایس کے امتحان میں ان کی کامیابی کو کس قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ قاضی محمد اسلم کا مشورہ بھی یہی تھا کہ مجھے اس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ۱۹ دسمبر ۱۹۶۹ء کے اخبارات میں ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کی طرف سے پی سی ایس (ایگزیکٹو) اور صوبائی حکومت کے ماتحت بعض دیگر کلاس وَن اسامیوں کے لیے مقابلے کے امتحان کا اشتہار شائع ہوا تو میں نے اسی وقت قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا اور اگلے ہی روز پبلک سروس کمیشن کے دفتر واقع ڈیوس روڈ جا کر اپنے لیے درخواست فارم لے آیا۔

اس فارم کے ساتھ منسلک ہدایات کے مطالعہ سے پتا چلا کہ سی ایس ایس کے برعکس یہ امتحان صرف چار پرچوں پر مشتمل ہے۔ یہ پرچہ جات انگریزی؛ اردو یا پنجابی یا پشتو یا سندھی یا بلوچی اور جنرل نالج بشمول ایوری ڈے سائنس پر مشتمل تھے۔ ہر پرچہ سو نمبروں کا تھا جب کہ انگریزی میں مضمون کے لیے الگ سے پچاس نمبر مخصوص تھے۔ قواعد کے مطابق اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں کو ۱۵۰ نمبروں کے ایک انٹرویو کے لیے بلایا جانا تھا۔ اب چونکہ میں سرکاری ملازمت میں آ چکا تھا اس لیے اس امتحان میں شمولیت کے لیے محکمانہ اجازت کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر فارم پُر کیا اور اس درخواست کے ساتھ اپنے دفتر میں جمع کرادیا کہ اسے پبلک سروس کمیشن کو بھجوا دیا جائے۔ بعض دفاتر میں ماتحت اہلکاروں کی بہتر ملازمتوں کے لیے درخواستیں محض اس بنا پر روک لی جاتی ہیں کہ انہیں اس دفتر میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہوتا یا اس سے

فوراً پہلے ان کی کوئی درخواست فارورڈ کی جا چکی ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان ہے مجھے اس قسم کی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آفس سپرنٹنڈنٹ کو اسسٹنٹ ریجنل الیکشن کمشنر کے ساتھ میرے تعلقات کا علم تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ پر بے پناہ شفقت فرماتے تھے چنانچہ اِدھر میں نے یہ درخواست دفتر میں جمع کرائی، اُدھر یہ اوپر بھجوا دی گئی۔ الحمدللہ میری درخواست مقررہ تاریخ سے پہلے کمیشن کو مل گئی۔

جلد ہی مجھے تحریری امتحان کی ڈیٹ شیٹ موصول ہوگئی۔ یہ امتحان ۱۰ فروری ۱۹۷۰ء کو شروع ہونا تھا اور روزانہ ایک پرچے کی بنیاد پر ۱۳ فروری کو ختم ہو جانا تھا۔ اتفاق دیکھئے اس بار بھی میرا سنٹر اینیمل ہسبنڈری کالج آڈیٹوریم مقرر ہوا۔ بدقسمتی سے اس سنٹر کے ساتھ میری ایک انتہائی تلخ یاد وابستہ تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ اس دفعہ پھر میرے ساتھ کوئی ہاتھ نہ ہو جائے اور ہاتھ ہو ہی گیا لیکن اس بار اس کی نوعیت ذرا مختلف تھی۔

پہلے روز انگریزی مضمون نویسی کا پرچہ تھا۔ ہمیں نو مختلف موضوعات دیئے گئے تھے جن میں سے مَیں نے ٹیلی رینڈ کے اس مقولہ کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ "Peace can only exist with the balance of power" یعنی امن صرف اسی صورت برقرار رہ سکتا ہے جب فریقین کے درمیان طاقت کا توازن ہوگا۔ اگر ایک فریق غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جائیگا تو وہ اپنے مخالف کا جینا حرام کر دے گا۔ ایم اے کے دوران نظر سے گذری ہوئیں چیزیں میرے کام آ گئیں اور میں اپنی دانست میں ایک مدلّل مضمون لکھنے میں کامیاب ہو گیا لیکن باہر نکلتے ہی میں نے کچھ امیدواروں کو یہ سرگوشیاں کرتے ہوئے سنا کہ پرچہ وقت سے پہلے آؤٹ ہو گیا تھا اور بہت سے امیدوار اس کے مشمولات سے پہلے سے واقف تھے۔ یہ افواہ میرے لیے کسی حد تک ناقابلِ یقین تھی لیکن اگلی صبح اخبار سے معلوم ہوا کہ یہ افواہ نہیں بلکہ خبر تھی۔ پرچہ واقعی آؤٹ ہو چکا تھا۔

اگلے دو دِنوں میں ڈیٹ شیٹ کے مطابق انگریزی اور جنرل نالج کے پرچے ہو گئے۔ میں جب پرچہ دے کر کمرہ امتحان سے باہر نکلتا تو وہی افواہ سننے کو ملتی جو پہلے پرچے کے بارے میں سنی تھی۔ میں اس افواہ کو خاطر میں لائے بغیر پوری دلجمعی سے امتحان دیتا رہا مگر اخبارات میں چھپنے والی خبروں سے بڑی دل شکنی ہوتی کیوں کہ ہر پرچے کے بعد اگلے روز اخبار سے اس افواہ کی تصدیق ہو جاتی۔

امتحان کے آخری روز اردو کا پرچہ تھا۔ میرے پہلے تین پرچوں کی طرح یہ پرچہ بھی اچھا ہو گیا تھا۔ اس پرچے میں جن اشعار کی تشریح کرنے کو کہا گیا تھا ان میں سے یہ دو شعر مجھے اتفاقاً یاد رہ گئے ہیں:

یارو! وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا
آنکھوں میں سو طرح کی حکایات ہوگئیں

برق کو ابر کے دامن میں چھپا رکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہمیں انگریزی کا جو پیرا اردو ترجمہ کے لیے دیا گیا تھا اس میں مشرقی پاکستان کے

قدرتی نظاروں کی منظر کشی کی گئی تھی ۔ میری ساری زندگی مغربی پاکستان میں گذری تھی اور مشرقی پاکستان کے بارے میں میرا کُل علم کتابوں میں درج معلومات تک محدود تھا۔ مجھے اس کے دریا اور ان پر چلنے والی کشتیاں، سُندربَن کے جنگلات، چٹا گانگ ہِل ٹریکٹ اور اس میں آباد چکمہ ٹرائب، غرض بہت سی باتیں فیسینیٹ کرتی تھیں لیکن کوئی ایسا موقع ہی نہ پیدا ہو سکا کہ میں وہاں جا سکتا۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ سی ایس ایس کرنے کے بعد یک سالہ ٹریننگ کے دوران مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران کو دو ماہ مشرقی پاکستان کی سیاحت میں گذارنے تھے جب کہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران کو یہی وقت مغربی پاکستان میں گذارنا تھا تاہم جب یہ موقع آیا تو مشرقی پاکستان میں عام بغاوت ہو چکی تھی اور صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے فوجی ایکشن شروع ہو چکا تھا چنانچہ ہماری یہ وِزِٹ پہلے ملتوی اور بالآخر کینسل ہوگئی۔

میں خوش تھا کہ میرا آخری پرچہ بھی بہت اچھا ہو گیا ہے لیکن ایک دوسرے سنٹر میں امیدواروں نے یہ پرچہ دینے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ ہوا دراصل یوں کہ گورنمنٹ پالی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ، لاہور سنٹر کے کچھ طلبہ امتحان شروع ہونے سے پہلے اپنے سپروائزر کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے اور اس میں فلاں فلاں سوال پوچھے جا رہے ہیں۔ جب پرچہ کھلا تو سپروائزر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ تمام سوالات پرچے میں شامل تھے۔ اس پر امیدوار کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سپروائزر سے مطالبہ کیا کہ وہ تحریراً اس بات کی تصدیق کرے کہ یہ پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے۔ اس نے امیدواروں کے دباؤ میں آ کر یہ تحریر دے دی۔ اس پر امیدواروں نے پرچہ دینے سے انکار کر دیا اور سنٹر میں توڑ پھوڑ کرنے کے بعد باہر نکل گئے۔ جب انتظامیہ کو اس لاقانونیت کی اطلاع ملی تو پولیس کی بھاری جمعیت موقع پر پہنچ گئی۔ اس عرصے میں امیدوار سنٹر سے نکل کر گورنر ہاؤس جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے تاہم انہیں راستے میں ہی روک لیا گیا۔ اسی اثناء میں پبلک سروس کمیشن نے ایک مضحکہ خیز فیصلہ کیا اور امیدواروں کو اجازت دے دی کہ اگر وہ کمرہ امتحان میں جا کر بیٹھ جائیں تو انہیں یہی پرچہ حل کرنے کا دوبارہ موقع دیا جا سکتا ہے۔ اس اعلان پر کچھ امیدوار دوبارہ کمرہ امتحان میں چلے گئے اور کچھ نے اس پرچے سے غیر حاضر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ غرض جب اس امتحان پر طرح طرح کی انگلیاں اُٹھنے لگیں تو کمیشن نے باقاعدہ انکوائری کرانے کے بعد یہ امتحان منسوخ کر دیا تاہم امیدواروں کا تقریباً ایک سال امید وبیم میں گذر گیا اور بالآخر امیدواروں کی طرف سے اس امتحان کے لیے جمع کرائی گئی فیس بھی انہیں واپس کر دی گئی۔

مجھے یاد ہے یہ مارچ ۱۹۷۰ء کی کوئی تاریخ تھی۔ دفتر سے چھٹی کے بعد میں گھر جانے کی بجائے اپنے دوست رفیق محمد خان کے گھر چلا گیا جو اُن دنوں اسلامیہ پارک میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے بھائی لئیق محمد خان بھی گھر پر موجود تھے اور اتفاق سے ایک دو اور احمدی دوست بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے ذکر کیا کہ آج سی ایس ایس کے تحریری امتحان کا نتیجہ آ گیا ہے۔ اگرچہ میرا سارا دن دفتر میں گذرا تھا لیکن نہ تو مجھے خود اخبار دیکھنے کا موقع ملا تھا نہ کسی دوست نے اس امر کی نشاندہی کی۔ نتیجہ آنے کی اطلاع پا کر میرا وہاں بیٹھے رہنا ممکن نہ تھا چنانچہ میں فوری طور پر اٹھ کر بازار گیا اور اُس روز کا پاکستان ٹائمز خرید لایا۔ رفیق محمد خان کے گھر

میں بیٹھ کر میں نے یہ اخبار دیکھا اور سجدۂ شکر بجالایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس نالائق کو اس امتحان میں کامیابی سے نوازا تھا۔

واقفانِ حال جانتے ہیں کہ تحریری امتحان کے نتیجہ میں امیدواروں کے حاصل کردہ نمبر نہیں بتائے جاتے نہ یہ اندازہ ہو پاتا ہے کہ کسی امیدوار کی اس امتحان میں پوزیشن کیا ہے۔ تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو میڈیکل ٹیسٹ، نفسیاتی ٹیسٹ اور انٹرویو کے مراحل میں سے گذرنے کے بعد ہی حتمی نتیجے سے مطلع کیا جاتا ہے لہٰذا اس امتحان میں کامیابی پر غیر ضروری شادیانے بجانے کا تو کوئی موقع نہ تھا لیکن مبارک باد وصول کرنا میرا حق تھا اور وہ سب دوستوں نے دل کھول کر دی۔

اب میڈیکل ٹیسٹ کا مرحلہ درپیش تھا جس دوران معمول کے بعض ٹیسٹوں (مثلاً سینہ کے ایکسرے اور نظر، خون اور پیشاب کے معاینہ) کے علاوہ ہمیں بعض ایسے مراحل میں سے بھی گذرنا پڑا جن کے بارے میں کم از کم میں نے اس سے پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے اور باقی امیدواروں کو ٹھوک بجا کر دیکھا اور جب ان کی تسلی ہوگئی کہ ہم اپنے کسی طبی نقص کی بنا پر حکومتِ پاکستان کی خدمت میں پیچھے رہنے والے نہیں تو انہوں نے سنٹرل پبلک سروس کمیشن کو فوری طور پر ہماری میڈیکل فٹنیس کی اطلاع بھیج دی۔ اس بات کی تصدیق اس خط سے ہوئی جس کے ذریعہ مجھے چند روز بعد سائیکولاجیکل ٹیسٹس اور انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔

ان دنوں لاہور میں سنٹرل پبلک سروس کمیشن کا دفتر ۳۔ سندر داس روڈ پر واقع تھا اور یہ تمام ٹیسٹ اور حتمی انٹرویو یہیں ہونا تھا۔ میری رہائش راوی روڈ پر کریم پارک میں تھی اور ان دونوں جگہوں کے درمیان کئی میل کا فاصلہ حائل تھا لیکن میں صبح سویرے گھر سے بائیسکل پر چلتا اور وقت مقررہ سے پہلے سندر داس روڈ پر پہنچ جاتا۔ اس سفر سے جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا، گرد وغبار سے کپڑے میلے ہو جاتے اور بال بکھر جاتے۔ وہاں پہنچتا تو صاف و شفاف کپڑوں میں ملبوس بہت سے سمارٹ نوجوان اپنی گاڑیوں میں پہنچے ہوتے۔ انہیں دیکھ کر اپنی کامیابی کے بارے میں فکرمند تو ہوتا لیکن خدا کا شکر ہے اس نے میری مدد کی اور میں بالآخر اس امتحان میں کامیاب ٹھہرا۔

نفسیاتی ٹیسٹ دو یا شاید تین دن جاری رہے۔ مجھے اس قسم کے ٹیسٹوں کا پہلے کوئی تجربہ نہ تھا کہ میں نہ تو کبھی آئی ایس ایس بی کے سامنے پیش ہوا تھا نہ کسی اور جگہ اس طرح کے ٹیسٹوں سے سابقہ پڑا تھا۔ یوں بھی ان ٹیسٹوں میں جواب دینے کے لیے سوچنے کا وقت نہ ہونے کے برابر تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ میں نے کن سوالات کا صحیح جواب دیا اور کن کا غلط نہ اس وقت مجھے یہ اندازہ ہو پایا کہ ان ٹیسٹوں میں میری کارکردگی کو کس نظر سے جانچا جارہا ہے۔ یہ تو بعد میں اندازہ ہوا کہ اللہ کے فضل سے میرے ٹیسٹ اطمینان بخش ہوگئے تھے ورنہ میں اس امتحان میں کامیاب نہ ہو پاتا۔

جہاں تک انٹرویو کا تعلق ہے میرا سنٹرل پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہونے کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے میں کچھ گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ میں اس کے چیئرمین یا ممبروں میں سے کسی کے نام سے واقف تھا نہ چہرہ پہچانتا تھا لیکن بعد میں پتا چلا کہ انٹرویو بورڈ کمیشن کے چیئرمین اور پانچ ممبروں پر مشتمل تھا۔ گفتگو کا آغاز چیئرمین نے یہ

جن کے سامنے میری درخواست اور تمام منسلک دستاویزات پڑی تھیں۔ ابھی تک احمدیوں کو دستوری طور پر غیر مسلم قرار دیا گیا تھا نہ ان پر اپنا مذہب اسلام ظاہر کرنے پر کوئی پابندی تھی لیکن درخواست فارم کے اندراجات اور میری تعلیمی اسناد سے عیاں تھا کہ میرا تعلق ربوہ سے ہے چنانچہ ابتدائی دعا سلام اور ربوہ کے بارے میں کچھ متجسسانہ سوالات کے بعد مجھ سے پہلی بات ہی یہ پوچھی گئی کہ کیا میں احمدی ہوں اور میرے اقرار پر ایک ممبر نے وفاتِ مسیح کا مسئلہ چھیڑ دیا۔

میں نے میٹرک تک تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور بی اے تعلیم الاسلام کالج سے کیا تھا۔ دونوں جگہوں پر دینیات لازمی پرچہ کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ ہمیں اس مضمون میں قرآن شریف اور حدیث کے علاوہ احمدیت کے بنیادی مسائل سے بھی روشناس کرایا جاتا تھا۔ وفاتِ مسیح اُن بنیادی مسائل میں سے تھا جس کے متعلق ہمیں ہر سطح پر کچھ نہ کچھ پڑھنے اور سننے کا موقع ملتا رہا تھا اور ہمیں فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ سے لے کر بہت سے دیگر دلائل سے روشناس کرایا جاتا رہا تھا۔ یوں میں اس مسئلے کی اکثر باریکیوں سے واقف تھا اور حیاتِ مسیح کے خلاف میرے پاس دلائل کا ایک انبار تھا لیکن اس موضوع پر میرا تمام مطالعہ اردو لٹریچر تک محدود تھا لہٰذا اگر کمی تھی تو صرف انگریزی زبان پر دسترس کی جس کی وجہ سے اس موضوع پر روانی کے ساتھ بات چیت مشکل محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کے مصداق مجھ سے جو جواب بن پڑا میں نے بورڈ کے گوش گذار کر دیا جس کے بعد موضوع بدل گیا۔

میں ان دنوں الیکشن کمیشن آف پاکستان میں کام کر رہا تھا۔ چند روز بعد وَن یونٹ ٹوٹنے والا تھا اور اگلے انتخابات سر پر تھے۔ یہ ایک اہم موضوع تھا جس میں بورڈ ممبران کی دلچسپی واضح تھی چنانچہ مجھ سے پیش آمدہ انتخابات میں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی متوقع کامیابیوں کے حوالے سے بھی کچھ سوالات کئے گئے۔

وہ زمانہ سرد جنگ کا تھا۔ اگرچہ جنگ عظیم دوم ختم ہوئے ربع صدی بیت چکی تھی لیکن دنیا دو بلاکوں میں بٹی ہوئی تھی جن میں سے ایک کی سربراہی امریکہ کے پاس تھی تو دوسرے کی روس کے پاس۔ دونوں طاقتیں ایک دوسرے سے زیادہ مضبوط اور بااثر ہونے کی دعوے دار تھیں اور بات بے بات پر ایک دوسرے کو آنکھیں دکھاتی رہتی تھیں۔ مجھے بائی پولر اور یونی پولر ورلڈ کے تقابل کے لیے کہا گیا اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی۔

ایک ممبر نے راولپنڈی سازش کیس کے حوالے سے سوالات پوچھنا شروع کئے تو کسی اور ممبر نے پوچھا کہ کیا میں اس سازش میں ملوث اپنی کمیونٹی کے کسی آدمی کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔ میں اتفاق سے میجر جنرل نذیر احمد کے نام سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ جملہ ملزمان میں سے وہی واحد فوجی افسر تھے جنہیں عدالت نے صرف تابرخواستِ عدالت قید کی سزا سنائی تھی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں تو جنرل نذیر کے جنازے اور تدفین میں بھی شامل تھا تو وہ قدرے حیران ہوئے کیوں کہ غالباً انہیں علم نہ تھا کہ موصوف کا انتقال ہو چکا ہے

اور وہ ربوہ میں دفن ہیں۔

میرا یہ انٹرویو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا جس میں مندرجہ بالا موضوعات سے علاوہ کچھ دیگر باتیں بھی ہوئیں جن کی تفصیل اب مجھے یاد نہیں۔

میں ممبرز کے ہاتھوں اپنی ''کھینچا تانی'' کی وجہ سے گھبرایا ہوا تھا چنانچہ جب میں باہر نکلنے لگا تو دروازے کا ہینڈل اپنی مخصوص ساخت کی وجہ سے کھولنے میں دِقت محسوس کرنے لگا۔ یہ خوف بھی میرے دامن گیر تھا کہ کہیں میری یہ حرکت میرے حاصل کردہ نمبروں میں تخفیف کا باعث نہ بن جائے۔ بہر حال جب ایک ممبر نے محسوس کیا کہ مجھ سے یہ دروازہ ازخود نہیں کھلے گا تو اس نے بآوازِ بلند مجھے یہ دروازہ کھولنے کا طریقہ بتایا اور یوں میں بمشکل تمام باہر نکلا۔

باہر نکل کر مجھے اپنی خامیوں کا ایک بار پھر شدید احساس ہوا۔ مجھے افسوس تھا کہ میں اس امتحان کے لیے خاطرخواہ تیاری نہ کر پایا تھا اور نہ مجھے دورانِ تعلیم کوئی ایسا استاد ملا تھا جو اس حوالے سے میری کمزوریوں کی نشاندہی کرتا اور انہیں دور کرنے کے لیے قابلِ عمل مشوروں سے نوازتا۔ یہ درست ہے کہ چوہدری محمد علی نے وقتاً فوقتاً مجھے یہ امتحان دینے کی ترغیب دلائی تھی لیکن عملاً اس امتحان کی تیاری کے لیے اُن کی طرف سے یا کالج کی طرف سے کوئی خصوصی اہتمام نہ ہوا تھا۔ قاضی محمد اسلم میرے مشفق و مہربان تھے اور ان کی شدید خواہش تھی کہ میں اس امتحان میں اچھے نمبر لے سکوں لیکن مجھے عملاً جس مدد کی ضرورت تھی وہ کہیں سے حاصل نہ ہو سکی۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں نے اپنا وقت صحیح طریقے سے استعمال نہ کیا تھا اور سی ایس ایس کے کئی چانس ضائع کر دیئے تھے لیکن اب کفِ افسوس ملنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس حوالے سے مجھے زیادہ بہتر رہنمائی حاصل رہی ہوتی اور میرے حالات کار بہتر ہوتے تو میں شاید کہیں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ اگرچہ میں اس انٹرویو میں کسی غیر معمولی کامیابی کی توقع نہ کر سکتا تھا تاہم نہ جانے مجھے کیوں یقین سا تھا کہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود بورڈ مجھے اس انٹرویو میں فیل نہیں کر سکتا۔

میرے قیامِ گھٹیالیاں کے دوران ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مختلف مضامین کے لیکچررز کے لیے درخواستیں طلب کی تھیں۔ میں نے سیاسیات کی لیکچررشپ کے لیے درخواست دی تاہم پندرہ مہینے گذر جانے کے باوجود اُدھر سے کوئی کال موصول نہ ہوئی تھی۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید کسی وجہ سے حکومت نے لیکچررز کی بھرتی کا معاملہ غیر معینہ مدت کے لیے مؤخر کر دیا ہے تاہم چھبیس اپریل ۱۹۷۰ء کو یکا یک کمیشن کی طرف سے مجھے ایک خط موصول ہوا جس کے مطابق مجھے سولہ اپریل کو کمیشن کے رُوبرو انٹرویو کے لیے پیش ہونے کو کہا گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ خط مجھے انٹرویو کی تاریخ گذر جانے کے بعد ملا تھا اور ایسا صرف اس لیے ہوا تھا کہ کمیشن نے میری درخواست برائے تبدیلی پتا اپنی فائل پر نہ لگائی تھی۔ اندریں حالات میں نے کمیشن سے انٹرویو کے لیے نئی تاریخ مقرر کرنے کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی اور مجھے ۲۹ جون کو طلب کر لیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور مجھے اس انٹرویو کے لیے کچھ تیاری کا موقع مل گیا۔ اگرچہ ہمارے دفتری

اوقاتِ کار مجھے پڑھائی کا موقع نہیں دیتے تھے مگر اس کے باوجود میں نے ان رات اگا ر ویسٹرن پولیٹیکل تھاٹ، مسلم پولیٹیکل تھاٹ، پاکستان موومنٹ اور تقابلی آئین کے ورنرز پر اچٹتی سی نگاہ ڈال لی۔ اس دوران وہ نوٹس میرے بے حد کام آئے جو میں نے ایم اے کا دوسری بار امتحان دیتے ہوئے خود تیار کئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے کون سی چیز اہم ہے اور کون سی قدرے غیر اہم یا اس مضمون کے کس حصے پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس کا کون سا حصہ ایسا ہے جسے نہ بھی پڑھا جائے تو کام چل جائے گا۔ غرض اس ایک ہفتے میں جو میرے پاس تھا میں نے ایم اے کا تقریباً سارا کورس دوہرا لیا اور مقررہ تاریخ کو کمیشن کے سامنے جا پیش ہوا۔

مجھے اس وقت تک پراونشل پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہونے کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا لہٰذا میں گھبرایا ہوا تھا اور رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ بِیَدِکَ الْخَیْر کا ورد کرتا ہوا پبلک سروس کمیشن پہنچ گیا۔ اُس روز کم و بیش نو دیگر امیدواروں کو بھی انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ ان میں سے دو پنجاب یونیورسٹی میں میرے اپنے کلاس فیلو تھے۔ پبلک سروس کمیشن نے انتظام کچھ یوں کر رکھا تھا کہ انٹرویو دے کر باہر آنے والا امیدوار باقی امیدواروں سے نہ مل پائے لہٰذا یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بورڈ کس قسم کے سوالات پوچھ رہا ہے۔ ہاں ہم سارا وقت اندازے لگاتے رہے اور ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے رہے۔ بالآخر میری باری آ گئی۔ مجھے علم نہیں ہے کہ اس بورڈ کے اراکین کون کون تھے لیکن مجھے یہ ضرور علم ہے کہ میں نے خدا کے فضل سے انٹرویو بورڈ کے تقریباً سبھی سوالات کے تسلی بخش جواب دیئے۔ اس وقت میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اسی عمارت میں جہاں میں نے یہ انٹرویو دیا ہے میں کسی وقت ممبر، پنجاب پبلک سروس کمیشن کے طور پر خود امیدواروں کا انٹرویو کیا کروں گا۔ بہرحال اللہ نے وہ دن بھی دکھایا اور خدا کے کرم سے مجھے ہزاروں امیدواروں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع ملا اور میں یہ بات فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہ تمام فیصلے صرف اور صرف میرٹ پر کئے۔

اس انٹرویو کے بعد میں روزمرہ کے معاملات میں اُلجھ گیا۔ اخبارات میں وَن یونٹ توڑے جانے کے حکومتی فیصلے کے حُسن و قبح کے بارے میں بحث جاری تھی لیکن ہمیں فکر تھا تو صرف یہ کہ اس فیصلے کے ہم پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ جلد ہی واضح ہو گیا کہ ہمارا دفتر ۳۰ جون ۱۹۷۰ء کو تحلیل ہو جائے گا اور اس کی جگہ کراچی، کوئٹہ، لاہور اور پشاور (یعنی چاروں صوبائی دارالحکومتوں) میں پراونشل الیکشن کمشنرز کے نئے دفاتر قائم ہوں گے۔ اگلا مرحلہ ان دفاتر کو سٹاف کی فراہمی کا تھا اور یہی مسئلہ ہماری پریشانی کا سبب تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم میں سے کون کراچی، کوئٹہ اور پشاور کے لیے قربانی کا بکرا بنے گا۔

ان ہی دنوں کسی نے بتایا کہ سٹاف کے تبادلے کے وقت ان کی سینیارٹی مدنظر رکھی جائے گی یعنی سینئر سٹاف کو ان کی مرضی کا سٹیشن دیا جائے گا جب کہ جونیئر سٹاف کو حسبِ ضرورت جہاں مناسب ہو گا بھجوا دیا جائے گا۔ میں اس دفتر کے جونیئر ترین اسسٹنٹوں میں سے تھا لہٰذا مجھے لاہور میں رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ میں ذہنی طور پر کراچی، کوئٹہ اور پشاور میں سے کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس پس منظر میں جب بتایا گیا کہ مجھے ممکنہ طور پر کوئٹہ جانا ہو گا تو مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی تاہم اسی اثناء میں پشاور میں اسسٹنٹ کی

ایک مزید آسانی پیدا ہو گئی چنانچہ مجھے کوئٹہ کی بجائے پشاور بھجوانے کا فیصلہ ہو گیا اور اس حوالے سے ۲ جون ۱۹۷۰ء باضابطہ آفس آرڈر بھی جاری کر دیا گیا۔

ان دنوں امی بقیدِ حیات اور ربوہ میں مقیم تھیں لہٰذا یہی شہر میری دلچسپی کا مرکز و محور تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کسی مقام کی قربت یا دوری کا پیمانہ ربوہ سے اس کا فاصلہ تھا۔ اس اعتبار سے کوئٹہ کے مقابلے میں پشاور مجھے زیادہ نزدیک محسوس ہو رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مجھے اس تبادلے سے گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ اگرچہ میں لاہور کی نسبت ربوہ سے دُور چلا گیا تھا لیکن اگر میں کوئٹہ چلا جاتا تو میرے لیے ربوہ آنا جانا اور زیادہ مشکل ہو جاتا۔ اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پشاور میں میرے ایک دُور کے چچا موجود تھے اور مجھے پوری توقع تھی کہ وہ میری کچھ نہ کچھ مدد ضرور کریں گے۔ وہ ابا جی کے تایا زاد تھے اور ان کا نام مبارک احمد تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ کسی سرکاری ہسپتال میں ڈسپنسر تھے لیکن ملازمت سے فراغت کے بعد ڈاکٹر کہلانے لگے اور ہشت نگری گیٹ کے باہر پریکٹس کرنے لگے۔ اُس وقت تک میں ان سے ملا نہیں تھا اور نہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ میری کسی درخواست پر ان کا ردعمل کیا ہو گا لیکن اللہ توکل میں نے انہیں ایک خط لکھ ڈالا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد پشاور میں اپنی متوقع آمد کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ میں اس سے پہلے کبھی پشاور نہیں آیا اور نہ ہی میرے لیے وہاں پر سرکاری طور پر رہائش کا کوئی انتظام ہے لہٰذا اگر وہ میری کچھ مدد اور رہنمائی کر سکیں تو میں ان کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ میری توقع کے خلاف مجھے اس خط کا جواب بہت جلد مل گیا۔ جواب بہت حوصلہ افزا تھا۔ چچا مبارک نے لکھا تھا کہ اگر میں انہیں پشاور میں اپنی آمد کے حتمی پروگرام سے پیشگی مطلع کر دوں تو وہ پشاور سٹی ریلوے سٹیشن پر خود میرے استقبال کے لیے موجود ہوں گے اور اگر میں بغیر پیشگی اطلاع کے پشاور آ ؤں تو میں سٹی ریلوے سٹیشن سے تانگہ لے کر ان کے گھر پہنچ سکتا ہوں جو ہشت نگری گیٹ کے باہر محلہ جگن ناتھ پورہ میں واقع ہے۔ انہوں نے میری آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اطمینان دلایا تھا کہ میں جتنا عرصہ چاہوں ان کے ہاں قیام کر سکتا ہوں اور یہ کہ مجھے اس حوالے سے ان شاء اللہ کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ خط پڑھ کر مجھے گونہ اطمینان ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا میرے سارے مسائل حل ہو گئے ہوں اور سارے خوف دُور ہو گئے ہوں۔ میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ وہ حل ہو گیا تو میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں نے خوشی خوشی پشاور جانے کی تیاری شروع کر دی۔

میرے ساتھ بہت سے اور لڑکوں (ہاں! اس زمانے میں میرے سمیت سبھی لڑکے ہی تھے) کی پشاور تبدیلی ہوئی تھی اور ہمیں یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو پراونشل الیکشن کمشنر کے دفتر جس کے لیے پشاور کے علاقہ شعبہ میں ناصر مینشن نامی ایک کئی منزلہ عمارت میں جگہ حاصل کی گئی تھی میں رپورٹ کرنا تھی۔ ابتداءً ہمارا خیال تھا کہ ہم بس کے ذریعے پشاور چلے جائیں لیکن ہمارے پاس سامان زیادہ تھا لہٰذا ہمیں بس کی نسبت ٹرین کا سفر زیادہ موزوں نظر آیا۔ پروگرام یہ ٹھہرا کہ ہم ۳۰ جون کی شام خیبر میل سے روانہ ہو کر اگلی صبح پشاور پہنچ جائیں گے۔

ظہورِ عون ونصرت دَم بہ دَم ہے

یہ سفر خاصہ دلچسپ رہا۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس روزمرہ کی ضروریات کے علاوہ ایک ایک چار پائی اور اپنا اپنا بائیسکل تھا۔ لاہور سے روانگی کے وقت ہمیں بہت سا سرکاری سامان بھی تھما دیا گیا تھا جو ہمیں اپنے نئے دفتر پہنچانا تھا۔ ہم نے یہ سامان بُک کرادیا اور خود اپنی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔

ہم سب جوان تھے اور ملازمت ہماری ضرورت تھی لہٰذا ہم نے اس سفر کو پکنک کے طور پر لیا اور کبھی سوتے اور کبھی جاگتے ہوئے نوشہرہ جا پہنچے جہاں ہماری ٹرین کافی دیر رُکی رہی۔

اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا اور ہم وہاں کی ہر چیز کو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ سٹیشن پر اور چیزوں کے علاوہ آلو بخارا بکثرت مل رہا تھا۔ سستا زمانہ تھا اور صرف دو روپے میں اس پھل کی پوری ٹوکری مل رہی تھی۔ ہم نے آلو بخارے کی ایک ٹوکری خرید لی اور جب اسے ختم کیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں ناشتے کی ضرورت نہیں رہی۔

نوشہرہ سے پشاور کے سفر کے دوران ہمیں لوگوں کے رہن سہن میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ ہم نے بچپن سے پٹھانوں کو دیکھ رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے گلیوں محلوں میں چاقو چھریاں تیز کرنے کا کام بالعموم پٹھان ہی کیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں ہینگ مصالحہ اور کپڑا بیچتے یا بڑے شہروں میں جوتے پالش کرتے دیکھ رکھا تھا۔ پٹھان اپنی وضع قطع اور لب و لہجہ کی وجہ سے پنجابیوں سے مختلف تو تھے ہی لیکن ان کی طرف منسوب بعض قصے کہانیوں کی وجہ سے انہیں دیکھ کر ایک انجانے سے خوف کا احساس بھی ہوتا۔ آج ہم اسی علاقے میں رہنے کے لیے جا رہے تھے لہٰذا کچھ ڈرے ڈرے سے تو ضرور تھے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ سے دل کو ایک خاص قسم کی تقویت بھی حاصل ہو رہی تھی اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم پر کوئی مشکل آن پڑی تو سب مل جل کر اس کا مقابلہ کر لیں گے۔

ٹرین پشاور شہر میں داخل ہوئی تو ریلوے لائن کے دونوں طرف بہت چہل پہل نظر آئی۔ خوانچہ فروشوں اور خریداروں کا ایک ہجوم تھا۔ وہاں فروخت ہونے والی اشیاء میں سے بعض نے خاص طور پر اپنی جانب متوجہ کیا۔ ہم نے پنجاب میں بھی اُبلے ہوئے انڈے فروخت ہوتے دیکھ رکھے تھے لیکن یہاں تو ان کی شان ہی نرالی تھی۔ انہیں گہرے سرخ یا سبز رنگ میں رنگ دیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا لیکن جلد ہی ہم سمجھ چکے تھے کہ یہ اُبلے ہوئے انڈے ہیں جن میں کشش پیدا کرنے کے لیے یہ جدّت طرازی کی گئی ہے۔

ہم نے پنجاب میں بھی بعض جگہوں پر پنیر فروخت ہوتا دیکھ تو رکھا تھا لیکن یہاں پنیر کی وہ کثرت دیکھی جو میرے فہم و ادراک سے بالاتر تھی۔ جا بجا ریڑھیوں پر پنیر کے بلاک پڑے تھے اور گاہک تھے کہ ان پر

نوٹے پڑتے تھے۔

تیسری چیز اُبلے ہوئے لوبیے کا ناشتہ تھا۔ جس طرح ہمارے ہاں اُبلے یا پکے ہوئے چنے شوق سے کھائے جاتے ہیں وہی اشتیاق وہاں لوبیے کے لیے نظر آرہا تھا۔

ہم پروگرام کے مطابق یکم جولائی کی صبح پشاور پہنچ کر کینٹ ریلوے سٹیشن پر اُتر گئے۔ ہم تین سالم تانگے کرا کے سیدھے ناصر مینشن پہنچے جو اُن دنوں ایک قدرے سنسان جگہ پر واقع تھی۔ دفتر میں ایک نائب قاصد یا چوکیدار کے علاوہ کوئی ذمہ دار شخص موجود نہ تھا کہ سارے ذمہ داران تو خود لاہور سے آرہے تھے۔ ہم نے دفتر کا سامان اس کے سپرد کر کے اپنے سامنے ایک کمرے میں بند کرایا، اپنا سامان بھی وہیں رکھا اور بمشکل تمام منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوئے۔ مجھے اپنے دفتر کے اس کارکن کا نام تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اس نے ہمارے لیے پشاوری قہوہ منگوایا تھا۔ پشاور میں پشاوری قہوہ پینے کا ہمارا یہ پہلا موقع تھا چنانچہ قہوے کے اس پیالے کی لذت مجھے آج بھی نہیں بھولی۔

یہ شہر ہمارے لیے اجنبی تھا اور ہم اس کے لیے نووارد لیکن چونکہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار تھے اس لیے بےفکری سے جدھر سینگ سمائے، اسی طرف چل دیئے۔ ہماری پہلی ترجیح دوپہر کا کھانا تھا چنانچہ جو ہوٹل سامنے آیا اس میں گھس گئے اور جو ملا کھالیا۔

اگرچہ مجھے چچا مبارک کی طرف سے اپنے ہاں قیام کی فراخدلانہ پیشکش موصول ہو چکی تھی لیکن سچ پوچھیں تو میں انہیں تکلیف دینے کی بجائے باقی لڑکوں کے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح میری وجہ سے انہیں بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی اور میں بھی اپنی مرضی سے زندگی گذار سکوں گا۔ یہی سوچ کر میں نے پشاور پہنچنے کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور باقی لڑکوں کے ساتھ مل کر مکان تلاش کر رہا تھا۔ ہم نے ایک دو پراپرٹی ڈیلروں سے ملاقات کی اور انہیں اپنی ضرورت سے آگاہ کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی غیر شادی شدہ نوجوانوں کو مکان دینے پر آمادہ نہ تھا۔ شام تک ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ فوری طور پر رہائش کا انتظام ناممکنات میں سے ہے چنانچہ ہم نے فیصلہ کرلیا کہ یہ رات کسی سرائے میں بسر کریں گے اور مجبوری ہوئی تو کسی مناسب مکان کے مہیا ہونے تک اسی سرائے میں ڈیرا لگائے رکھیں گے۔ یوں ہم ایک سرائے میں جا پہنچے۔

قصہ خوانی بازار میں واقع یہ سرائے بھی غالباً اسی دور سے تعلق رکھتی تھی جب اِدھر اُدھر سے یہاں آنے والے تجارتی قافلے ایک دوسرے کو اپنے اپنے علاقوں اور سفر کے محیرالعقول حالات و واقعات سناتے تو سننے والوں کو گمان ہوتا گویا وہ کوئی قصہ سن رہے ہیں۔ فرق اگر تھا تو صرف یہ کہ اب یہاں وہ قصہ خوان موجود نہ تھے۔ ایک تنگ سے دروازے کے باہر ایک آدمی ایک چھوٹی سی میز پر رجسٹر رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہمارا نام، پتا اور پشاور میں آمد کا مقصد اس رجسٹر میں درج کیا اور ہمارے دستخط کرانے کے بعد بتایا کہ کمروں کے اندر کوئی چارپائی خالی نہیں لہٰذا ہمیں چھت پر سونا پڑے گا۔ ہمارا خیال تھا کہ چھت پر ہمارا قیام زیادہ آرام دہ رہے گا لہٰذا ہم خوشی خوشی چھت پر چلے گئے جہاں بےشمار چارپائیاں لگی ہوئی تھیں اور ان پر میلے کچیلے بستر بچھے ہوئے تھے۔ اس

چارپائی کا ایک رات کا کرایہ ایک روپیہ تھا۔

یہ گرمی کے دن تھے اور ہم کھلی ہوا میں رات گذارنے کے تصور سے خاصے خوش تھے لیکن افسوس یہ ہماری خام خیالی ثابت ہوئی۔ سچ پوچھیں تو یہ رات ہماری زندگی کی انتہائی پریشان کن اور تکلیف دہ راتوں میں سے ایک تھی۔ ایک تو چارپائی اور بستر بھی بس ایسا ہی تھا لیکن رہی سہی کسر شدید گرمی، مچھروں کی یلغار اور قریبی بیت الخلا سے اٹھنے والے بدبو کے بھبھوکوں نے پوری کر دی۔ مستزاد یہ کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی مسافر اٹھتا اور فلش سسٹم کی سہولت سے عاری اس بیت الخلا میں چلا جاتا۔ غرض یہ رات تقریباً جاگتے ہوئے گذری۔ صبح ہونے تک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا کہ مجھے چچا مبارک کی دعوت کل ہی قبول کر لینی چاہیے تھی۔

ہم اگلے روز دوپہر تک دفتر میں مصروف رہے جس کے بعد میں جی ٹی ایس کے اڈے کے بالمقابل رائل ہوٹل کے پیچھے چچا مبارک کے کلینک پر جا پہنچا۔ مجھے اُن سے مل کر کسی اجنبیت کا احساس نہ ہوا البتہ اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کی قوتِ سماعت بالکل ختم ہو چکی ہے چنانچہ وہ اندازہ لگاتے کہ ان کا مخاطب کیا کہہ رہا ہے اور پھر انکل پچّو سے اس کا جواب دے دیتے۔ یہ اندازہ بسا اوقات غلط بھی نکلتا چنانچہ ان کا جواب مخاطب کے لیے عجیب سی صورتِ حال پیدا کر دیتا۔ اس کمزوری سے قطع نظر وہ بہت رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ انہوں نے میری خوب خاطر تواضع کی، باقیماندہ مریضوں کو فارغ کیا اور پھر خود مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

ان کا گھر دو منزلہ اور قدرے پرانی وضع کا اور متروکہ املاک میں سے تھا۔ میں دوسری منزل کے نقشہ سے تو پوری طرح واقف نہیں ہو سکا البتہ نیچے ایک ہی سائز کے دو کمرے تھے جن کے دروازے باہر گلی میں بھی کھلتے تھے۔ ایک کمرے میں ان کے داماد، مبشر احمد جنہیں میں بھائی جان مبشر کہا کرتا تھا اور دوسرے میں ان کے ایک بیٹے، محمد اقبال رہا کرتے تھے۔

چچی کا نام ہاجرہ تھا اور وہ ڈنگہ کے ایک مخلص احمدی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ رفیق حضرت مسیح موعود، حضرت حافظ احمد دین کی صاحبزادی اور سرگودھا والے بھائی محمود کی بھتیجی تھیں۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی، بشریٰ نے بہاولپور کے میڈیکل سکول سے ایل ایس ایم ایف کر رکھا تھا اور وہ اپنے تایازاد، مبشر احمد سے بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے، ڈاکٹر بشارت احمد ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد انگلینڈ میں آباد ہو چکے تھے اور اُن دنوں ڈیوس بری میں جنرل پریکٹیشنر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اُن کے چھوٹے بیٹے گلزار کلینک میں چچا مبارک کا ہاتھ بٹاتے تھے، بیٹی ذکیہ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ میں پڑھ رہی تھیں اور اقبال بی ایس سی کر رہے تھے۔ اس خاندان کے ذرائع آمدنی معقول تھے جس کا اندازہ ان کے رہن سہن سے ہوتا تھا۔

مبشر جو کیپٹن محمد سعید کے صاحبزادے تھے پاکستان میڈیکل سٹور کے نام سے ایلوپیتھک ادویہ کی دکان اور ہومیوپیتھک پریکٹس کر رہے تھے۔ یہ دکان چچا مبارک کے کلینک سے قریباً ملحق تھی۔ شام کو گھر جانے سے پہلے میں ان کی دکان پر جا بیٹھتا۔ وہ ہمیشہ بہت محبت کے ساتھ پیش آتے۔ ان کے دیگر ملنے جلنے والوں کی آمدورفت

بھی جاری رہتی۔ چائے کا دور ہمہ وقت جاری رہتا اور کبھی کبھار ہم کھانا بھی وہیں کھا لیتے۔ اس طرح غریب الوطنی کا احساس مٹ جاتا اور وقت اچھا گذر جاتا۔

کچھ ہی عرصہ بعد مبشر جرمنی چلے گئے مگر جلد ہی وطن کی یاد انہیں پاکستان واپس کھینچ لائی۔ وہ اپنے حالات سے غیر مطمئن تھے چنانچہ پھر وہ سپین چلے گئے۔ وہ کبھی کبھی مجھے خط لکھا کرتے تھے مگر ایک روز پتا چلا کہ وہ پاکستان واپس آگئے ہیں۔ انہیں بلڈ پریشر تو عرصہ سے تھا لیکن فالج کے اچانک حملہ نے انہیں بالکل بے بس کر کے رکھ دیا اور وہ اسی کیفیت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مبشر کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا جن کے نام علی الترتیب خالد، فرحت اور طارق ہیں۔ خالد (جو اُس زمانے میں طفلِ مکتب تھا) کی اور میری عمروں میں بہت فرق تھا لیکن ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے میرا اس بچے کے ساتھ محبت کا تعلق قائم ہو گیا جو خدا کے فضل سے آج بھی قائم ہے۔

یہ بچہ جسے گھر میں لاڈ سے خالدی کہا جاتا تھا انجینئر بننا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ ایف ایس سی کے امتحان میں اتنے نمبر حاصل نہ کر پایا کہ اسے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا۔ تب اُسے کسی نے بتایا کہ اگر وہ پولی ٹیکنیک میں داخلہ لے لے اور اس کے فائنل امتحان میں بورڈ کی سطح پر اول پوزیشن حاصل کر لے تو اسے اسی ٹریڈ میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلے کا استحقاق حاصل ہو جائے گا۔ خالدی نے یہ بات پلّے باندھ لی اور دن رات محنت کرنے لگا۔ احمدیت کی برکت سے وہ دعا کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھا چنانچہ وہ اپنے ہر ملنے جلنے والے سے دعا کی درخواست کرتا رہتا۔ اللہ نے اُس پر فضل کیا اور اسے بالآخر پشاور کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔

خالدی رشتے میں میرا بھانجا ہونے کے ساتھ ساتھ میرا اچھا دوست بھی ثابت ہوا چنانچہ جب میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ سیر و سیاحت کے لیے ادھر اُدھر جاتا تو اُسے بھی اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ ۱۹۹۱ء کے جلسہ سالانہ قادیان کے موقع پر ہم نے اکٹھے درخواست دی اور دونوں کا ویزا بھی لگ گیا۔ ہم یہ سفر تو اکٹھے نہ کر سکے لیکن قادیان میں ہمارا خوب ساتھ رہا۔ ہم نے نہ صرف جلسہ سالانہ کی تقاریر اکٹھے بیٹھ کر سنیں بلکہ قادیان کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت بھی اکٹھے ہی کرتے رہے۔

اس نوجوان کی پیدائش تو قیامِ پاکستان کے بہت بعد پشاور کی ہے لیکن مبشر قادیان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والد کیپٹن محمد سعید نے محلہ دارالفضل میں اپنا مکان تعمیر کیا تھا۔ قادیان جاتے ہوئے مبشر نے خالدی کو تاکید کی تھی کہ وہ ان کا آبائی مکان جو سعید منزل کہلاتا تھا ضرور دیکھ کر آئے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جب یہ مکان زیرِ تعمیر تھا تو مبشر نے اس کے ایک پرنالے کے نیچے سیمنٹ پر سرکنڈے سے اپنا نام لکھا تھا اور یہ کہ ہم یہ پرنالہ ضرور دیکھ کر آئیں۔

یاد رہے کہ کیپٹن محمد سعید ابا جی کے تایازاد بھائی تھے اور انہوں نے جنگِ عظیم دوم کے زمانہ میں برطانوی فوج میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ انہوں نے اُس زمانے کے لحاظ سے ایک خوبصورت اور وسیع مکان تعمیر کیا تھا مگر بدقسمتی سے اُنہیں اس میں زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہ ملا اور تقسیمِ ہند کے نتیجے میں اُنہیں قادیان سے ہجرت

کرنا پڑی۔ وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ منتقل ہو گئے اور شروع شروع میں ''افسر بازار'' کے طور پر خدمت بجالاتے رہے۔ وہ لمبا عرصہ محلّہ دارالرحمت غربی کے صدر بھی رہے۔

مبشر ان کی پہلی بیوی، اقبال بیگم کی اولاد تھے جب کہ تین بیٹیاں، سعیدہ، امۃ السلام اور امۃ الرشید بھی اُن ہی کی یادگار ہیں۔ دوسری اہلیہ، حمیدہ بیگم سے بھی اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ایک بیٹے اور تین بیٹیوں سے نوازا۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا اُن کے قادیان والے گھر کا جو ہم ذرا سی کوشش سے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس گھر کے مکین ہندو تھے لیکن انہوں نے بڑی محبت سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں پورے گھر میں گھومنے کی فراخ دلانہ اجازت دی۔ اس گھر کی تعمیر کے وقت انگیٹھیوں پر اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ اور بعض دیگر آیاتِ قرآنی نقش کی گئیں تھیں جو اپنی اصل شکل میں محفوظ تھیں اگر چہ اب اُنہیں سمجھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ مبشر کے وہ دستخط جو انہوں نے قیامِ پاکستان سے نہ جانے کتنے سال پہلے پرنالے کے گیلے سیمنٹ پر کئے تھے بھی موجود تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دستخط آج بھی اُسی شکل میں موجود ہوں گے اگر چہ مبشر کو خود پشاور کے احمدیہ قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں۔

ایک بار بیٹھے بیٹھے میرا اور خالدی کا پروگرام بنا کہ کیوں نہ ہم سڑک کے راستے ایران اور ترکی کی سیاحت کریں۔ بس پھر کیا تھا ہم نے اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا اور قادیان سے واپسی کے بعد وسط ۱۹۹۲ء میں ہم دونوں اس سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہم نے ارادہ کر رکھا تھا کہ ہم یہ سفر کم سے کم اخراجات میں کریں گے چنانچہ ہم نے ٹرین اور بس کے ذریعے سفر کیا اور اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی بجائے معمولی مسافر خانوں میں قیام کیا۔ اس سفر کے دوران ہم زاہدان، مشہد، طُوس، نیشاپور، تہران، رے، قُم، بازرگان، استنبول، قونیہ، انقرہ، اصفہان، شیراز اور تختِ جمشید گئے۔ اگر چہ خالدی کو اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے یہ سفر ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا لیکن ہم جب تک اکٹھے رہے اس سفر سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

۱۹۹۶ء میں خالدی امیگریشن پر کینیڈا چلا گیا۔ مجھے اس کے جانے کا اس لحاظ سے دکھ تھا کہ میں ایک اچھے دوست کی رفاقت سے محروم ہو رہا تھا لیکن زندگی میں اس طرح کے مقامات آتے ہی رہتے ہیں۔ خالدی کچھ عرصہ کینیڈا گذارنے کے بعد امریکہ چلا گیا جہاں اب وہ ایک سٹور چلا رہا ہے اور اپنے حالات پر مطمئن ہے۔ خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔

آج جب میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں مبشر کے علاوہ چچا مبارک، چچی حاجرہ اور ذکیہ، تینوں وفات پا چکے ہیں۔ بشریٰ اپنے بیٹے طارق کے پاس کینیڈا جا چکی ہیں، اقبال نے امریکہ کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور خالدی، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، امریکہ میں ہے۔

یہ تو خیر ساری بعد کی باتیں ہیں، قیامِ پشاور کے دوران چچا مبارک نے میری چار پائی اقبال کے کمرے میں لگا دی۔ مجھے صبح کا ناشتہ ملنے لگا اور رات کے کھانے کی فکر نہ رہی تو اس پہلو سے اطمینان ہو گیا۔ افسوس یہ تھا کہ میرے رفقائے کار کی پریشانی ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ وہ جہاں جاتے دھتکار دیئے جاتے اور کوئی شخص

انہیں کرایہ پر مکان دینے پر آمادہ نہ ہوتا۔ انہوں نے ایک دو راتیں ناصر مینشن میں اپنے دفتر میں گذاریں اور پھر قدرے دُور دراز نوتھیہ جدید نام کی ایک گندی سی آبادی میں ایک الگ تھلگ سے بے ڈھنگے مکان میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ آبادی پشاور صدر کے اُس پار تھی۔ یہاں چپلی کباب کی دو دکانیں بہت مشہور تھیں۔ ایک کا مالک کریمو کہلاتا تھا اور دوسرا فرید۔ فرید نے کریمو سے ہی یہ فن سیکھا تھا اور بعد میں اپنی الگ دکان بنالی۔

میرا خیال ہے کریمو کا اصل نام کریم خان ہوگا۔ اس کی دکان نوتھیہ کی مین روڈ پر تھی۔ اس کے اردگرد بڑے گوشت کی بہت سی دکانیں تھیں جن پر سارا دن مکھیاں بھنبھناتی رہتیں لیکن کریمو کی دکان پر فروخت ہونے والے کبابوں کا تو قیمہ ہی جدا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس نے سڑک کے اوپر ایک تخت پوش پر تیار قیمے کا ایک پہاڑ نما ڈھیر لگا رکھا ہوتا تھا اور اس پر اتنی مکھی ہوتی کہ قیمہ نظر ہی نہ آتا۔ کریمو اسی ڈھیر میں سے قیمہ لے کر کباب تیار کرتا اور گاہک تھے کہ اس پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ہم نے بھی ایک دو بار وہاں کھانا کھایا لیکن خدا گواہ ہے ہماری بدذوقی آڑے آجاتی رہی اور ہم ان کبابوں کے لیے اپنے دل میں وہ محبت نہ پیدا کر سکے جو عوام الناس میں پائی جاتی تھی۔

مشہور تھا کہ کریمو کے کباب کی دور دور تک حتیٰ کہ ممالک غیر میں بھی مانگ ہے چنانچہ لوگ باہر جاتے ہوئے یہ کباب خاص طور پر بنوا کر ہمراہ لے جاتے۔ معلوم نہیں کریمو کے پاس خود بیرون ملک کبابوں کی ترسیل کا کوئی انتظام تھا یا نہیں لیکن باہر جانے والے بعض لوگ یہ سوغات ضرور ہمراہ لے جاتے۔ بعض ستم ظریف یہ بھی کہتے کہ کریمو کے کباب تو ملکہ الزبتھ بھی منگواتی ہے۔

کریمو کا نام ایک اور حوالے سے بھی اہم تھا۔ وہ عصر کے قریب اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر گلی میں چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں یا اُترے ہوئے جوڑوں والے افراد جمع ہو جاتے اور وہ بغیر سرجری کے محض مالش وغیرہ سے ان کا علاج کرتا۔ کئی سال بعد جب میری تقرری بطور انسپکٹنگ اسسٹنٹ کمشنر آف انکم ٹیکس پشاور ہوئی تو میرے ایک رفیق کار، قیصر اقبال نے بتایا کہ بچپن میں بائیسکل سے گر کر ان کے ہاتھ کی ایک انگلی اُتر گئی تھی۔ ان کے والد انہیں کریمو کے پاس لے گئے۔ کریمو نے ہلدی ملے سرسوں کے تیل سے اس انگلی پر مالش کے بعد پٹی باندھی جس کے نتیجے میں چند دن کے بعد ان کی انگلی بالکل ٹھیک ہو گئی۔

وہ ہر روز درجنوں مریضوں کو دیکھتا۔ خدا نے اس کے ہاتھ میں شفا رکھی ہوئی تھی چنانچہ اکثر مریض آپریشن کی زحمت سے بچ جاتے اور صحت یاب ہو کر کریمو کو دعائیں دیتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ سنتے ہیں کہ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کی بعض عاداتِ بد میں مبتلا ہو کر کاروبار سے توجہ ہٹ گئی اور کریمو فوت ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہمارا دفتر ناصر مینشن میں تھا لیکن یہ بلڈنگ اچھے دفاتر کے لیے موزوں نہ تھی چنانچہ اعلیٰ حکام نے جلد ہی دفتر کے لیے پشاور کینٹ میں ایک کوٹھی تلاش کر لی۔ یہ کوٹھی سٹیڈیم سے ذرا آگے رفیق لین میں تھی اور اپنے خوبصورت محل وقوع کی وجہ سے سب کو بہت پسند آئی۔ یہاں سے صدر بازار دور نہ تھا جو شہر کا بڑا تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ سیرگاہ کا درجہ بھی رکھتا تھا چنانچہ ہم لوگ فارغ ہوتے تو

یہاں آوارہ گردی کرنے نکل جاتے۔ ونڈو شاپنگ کرنا چاہتے تو اس پر کوئی پابندی نہ تھی اور اگر کوئی فلم بینی کا
شوق پورا کرنا چاہتا تو ''فلک سیر'' اور ''کیپٹل'' نامی دو اچھے سینما ہاؤسز کی موجودگی میں اسے کوئی دقت نہ ہوتی۔
چند ماہ بعد ملک میں عام انتخابات ہونے والے تھے اور دفتر میں کام زوروں پر تھا لہٰذا ہمارا دن بہت
مصروف گذرتا اور بسا اوقات رات گئے تک بھی کام نہ سمٹتا۔ دوپہر کے وقت ہم مختصر سا وقفہ کرتے اور کھانا کھانے
صدر چلے جاتے۔ ہم بالعموم ایک ہی ریستوران میں کھانا کھاتے تھے کہ اس کا بل ہمارے وسائل کے لحاظ سے
مناسب اور کھانا بہت اچھا تھا تاہم ایک روز ہم پر انکشاف ہوا کہ اس کا کچن انتہائی گندہ ہے اور آوارہ بلیاں ہر
وقت برتنوں میں منہ مارتی پھرتی ہیں۔ ہماری طبیعت بہت مکدّر ہوئی اور ہم نے وہاں کھانا چھوڑ کر ایک اور ہوٹل
تلاش کر لیا تاہم احتیاطاً اب ہم نے کچن میں جھانکنا چھوڑ دیا تھا۔

اس دفتر میں قاضی طاہر احمد کے علاوہ جو ربوہ کے رہنے والے تھے اور وَن یونٹ ٹوٹنے سے پہلے جہلم میں
الیکشن افسر کے دفتر میں یو ڈی سی کے طور پر کام کر رہے تھے باقی سارا سٹاف لاہور سے تبدیل ہو کر آیا تھا۔
قاضی طاہر سے میری پرانی یاد اللہ تھی۔ ایک ساتھ کام کرنے سے یہ تعلق اور مضبوط ہو گیا اور وہ بعد میں جہاں ملتے بے حد
محبت و احترام کے ساتھ۔ وہ حال ہی میں دل کے ایک شدید حملہ کے نتیجہ میں وفات پا کر ہانڈو گجر کے احمدیہ قبرستان
میں دفن ہوئے ہیں۔

قاضی طاہر ملک کے مشہور آرکیٹیکٹ، قاضی محمد رفیق کے صاحبزادے تھے جو قاضی فیملی کے ایک بزرگ
رکن ڈاکٹر محبوب عالم آف جے پور کے صاحبزادے تھے۔ وہ پیشہ ورانہ طور پر ملک میں کس اعلیٰ مقام پر فائز تھے،
اس کا کچھ اندازہ پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان کے اس نوٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو اُن کی وفات پر الفضل میں شائع
ہوا۔ اس نوٹ کے مطابق ''مرکز ربوہ کی مختلف عمارات قاضی صاحب مرحوم کی یادگار ہیں جن میں تعلیم الاسلام کالج
(نئی و پرانی ہر دو عمارات)، فضل عمر ہسپتال، وقفِ جدید اور فضل عمر فاؤنڈیشن کے دفاتر ....اور دیگر متعدد
رہائشی مکانات شامل ہیں۔ اسی طرح لاہور کی الفلاح بلڈنگ، ملتان کا نشتر میڈیکل کالج، اسلام آباد کا نیشنل بنک،
کراچی کا کلثوم بائی ہسپتال سب آپ کی تخلیق ہیں۔...... آپ آخری دم تک مصروفِ کار رہے۔ نیشنل کالج آف آرٹس
لاہور میں جہاں آپ نے ۱۹۵۲ء میں تدریس کی ابتدا کی تھی جب کہ وہ میؤ سکول آف آرٹس کہلاتا تھا ریٹائرمنٹ کے بعد
دوبارہ رکھ لیے گئے اور باوجود نحیف و نزار ہونے کے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے تک...... کام پر آتے رہے۔ وفات سے قبل
اپنا ڈرائنگ کا تختہ اور دیگر سامان اپنے چہیتے شاگرد اور لاہور کے مشہور و معروف آرکیٹیکٹ نیّر علی دادا کو مرحمت فرمایا۔''

اپنے اس مرحوم دوست کے ذکرِ خیر میں محو ہو کر میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں حالانکہ بات ہو رہی تھی
پشاور کی۔ اُن دنوں پشاور سے کابل جانا بہت آسان تھا۔ افغانستان میں داخلہ کے لیے روائتی ویزے کی ضرورت
نہ تھی۔ اس کی بجائے پشاور میں افغان قونصل ''ریڈ پاس'' جاری کرتا تھا۔ اس کا طریقہ کار بہت سادہ تھا اور کسی
درخواست دہندہ کو انکار نہ ہوتا تھا۔ افغانستان میں حالات پُر امن تھے اور پشاور سے بہت سی پرائیویٹ بسوں کے
علاوہ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کی بس بھی چند گھنٹوں میں کابل پہنچا دیتی تھی لیکن میں بوجوہ اس سہولت سے فائدہ

نہ اُٹھا سکا جس کا مجھے آج بھی افسوس ہے۔ ہاں اس ٹرین کے ذریعے جو پشاور چھاؤنی اور لنڈی خانہ سٹیشنوں کے درمیان ہفتہ میں ایک بار چلا کرتی تھی مجھے سفر کا ضرور موقع ملا۔

یاد رہے کہ برطانوی حکومت کو درہ خیبر میں ریلوے لائن کی ضرورت کا احساس تو پہلی اور دوسری افغان جنگ کے دوران ہی ہو گیا تھا لیکن اس منصوبے کو اس وقت تک عملی جامہ پہنانا ممکن نہ تھا جب تک اٹک کے مقام پر دریائے سندھ پر ریلوے پُل تعمیر نہ ہو جائے۔ اس پُل کی تعمیر کے ساتھ ہی والٹر بیلے نامی ایک برطانوی انجینئر نے اس ریلوے لائن کا منصوبہ تیار کیا تاہم اس پر عملدرآمد میں کئی سال لگ گئے چنانچہ جمرود تک ریلوے لائن ۱۹۰۵ء میں پہنچی، ۱۹۲۵ء میں اسے لنڈی کوتل تک وسعت دی گئی اور اس سے اگلے سال اسے لنڈی خانہ پہنچایا گیا۔

پشاور سے لنڈی خانہ زیادہ دور نہیں ہے لیکن راستہ بہت دشوار گذار ہے۔ یہ سارا علاقہ پہاڑی ہے چنانچہ اس علاقے میں ریل کی پٹری بچھانے کے لیے انگریز حکومت کو چونتیس سرنگیں، بانوے پُل اور پُلیاں اور دس ریلوے سٹیشن تعمیر کرنا پڑے۔ بعض جگہوں پر اتنی چڑھائی ہے کہ تنہا ایک انجن گاڑی کھینچ نہیں سکتا لہٰذا اس گاڑی کے پیچھے بھی ایک انجن لگتا تھا۔ اگلا انجن گاڑی کو کھینچتا تو پچھلا انجن اسے آگے کی طرف دھکیلتا اور یوں یہ گاڑی تقریباً رینگتی ہوئی اپنی منزل پر پہنچتی۔ تھی تو یہ احمقانہ سی بات لیکن اس گاڑی کی سست رفتاری کے مدِنظر ہماری طرح کے بعض مسافر چلتی گاڑی سے نیچے اُتر جاتے، ساتھ ساتھ چلتے رہتے اور تھک جاتے تو دوبارہ گاڑی میں سوار ہو جاتے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ سفر تھا جس دوران یہ گاڑی ہر سٹیشن پر رُکتی۔

یہ ریلوے لائن انجینئرنگ کا ایک کمال ہے اور غیر معمولی نشیب و فراز والے دشوار گذار راستے سے گذرتی ہے۔ اس اعتبار سے اسے دنیا کا آٹھواں اعجوبہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس ریلوے لائن کو یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ یہ پشاور ایئرپورٹ کے رن وے میں سے ہو کر گذرتی ہے اور اس سے پہلے اِسے ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور سے باضابطہ اجازت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ یہ خصوصیت دنیا کے معدودے چند ہوائی اڈوں میں ہے جن میں سے ایک نیوزی لینڈ میں ہے اور دو آسٹریلیا میں۔

چونکہ گاڑی ہفتے کے بعد آتی تھی اس لیے مقامی لوگ اس کی آمد کے منتظر رہتے اور انڈے، مرغیاں اور لسی فروخت کے لیے لے آتے۔ مجھے اب بھی یاد ہے انڈے بہت سستے تھے، شاید پچھتر پیسے میں ایک درجن دیسی انڈے مل رہے تھے جب کہ مرغی کی قیمت ڈیڑھ دو روپے سے زیادہ نہ تھی۔

اگرچہ یہ پہاڑ بنجر تھے لیکن اس کے باوجود لینڈ سکیپ بہت خوبصورت تھا اور دل کو خوب بھاتا۔

لنڈی کوتل جانے والی سڑک لنڈی خانہ ریلوے سٹیشن سے زیادہ دور نہ تھی چنانچہ ہم وہاں سے بس لے کر لنڈی کوتل پہنچ گئے جو اُن دنوں سمگل شدہ اشیاء کی بڑی مارکیٹ تھی۔ باڑہ اور پورے پاکستان میں باڑہ مارکیٹیں تو بہت بعد کی پیداوار ہیں، اس زمانے میں سمگل شدہ اشیاء کے خریداروں کو وہیں جانا پڑتا تھا۔

ہم نے دن کا باقی وقت لنڈی کوتل میں گذارا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو میں نے زندگی میں پہلی بار پائی گوشت اسی روز کھایا تھا۔ میں نے اپنے لیے ایک چھتری خریدی تھی جو غالباً چار روپے میں آئی تھی۔ جب ہم

بس کے ذریعہ واپس آ رہے تھے تو اسلامیہ کالج چیک پوسٹ پر کسٹمز والوں نے روک لیا۔ اس زمانے میں بس کے سفر کے دوران میں اکثر متلانے لگتا تھا چنانچہ میں ایک پولیتھین بیگ احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ میں نے یہ بیگ اپنے پاؤں میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کسٹمز کا سپاہی ضد کرنے لگا کہ میں اسے وہ لفافہ ضرور دکھاؤں۔ بالآخر مجھے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے تو اس نے پشتو میں ایک فقرہ کہا جس کا مفہوم یہ تھا کہ لوگ لنڈی کوتل سے کیا لاتے ہیں اور تم کیا لے کر آئے ہو۔

اب تو یہ ٹرین مدت سے بند ہو چکی ہے لیکن کئی سال پہلے ایک بار پاکستان میں مقیم غیر ملکی سفارتی نمائندگان کے لیے اسے چلایا گیا تھا۔ میں ان دنوں راولپنڈی میں تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے پشاور میں مقیم اپنے ایک رفیق کار سے اس گاڑی میں دو تین سیٹیں حاصل کرنے کی درخواست کی مگر معلوم ہوا کہ اس کا ٹکٹ آٹھ ہزار روپیہ فی کس مقرر کیا گیا ہے جب کہ ہم نے یہی سفر دو یا ڈھائی روپیہ میں کیا تھا لہٰذا اس پر سفر کی ہمت نہ پڑی تاہم بعد میں اس سفر کے حوالے سے چھپنے والی تفصیلات مختلف رسائل میں پڑھیں تو اپنی اس محرومی کا افسوس ہوا۔ سلمان رشید نے اس سفر کی رُوداد "Steaming up the Khyber" کے عنوان سے رسالہ Bonjour کے جنوری سے مارچ ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں لکھی جب کہ فرحت جمال نے اس سفر کی جزئیات اپنے انداز میں "Khyber Steam Safari: A Journey through the land of the Bold, the Barren and the Beautiful" کے عنوان سے پی آئی اے کے رسالہ ''ہمسفر'' کے شمارہ مارچ تا اپریل ۱۹۹۸ء میں بیان کیں۔ اسی حوالے سے جولائی اگست ۱۹۹۹ء کے ''ہمسفر'' میں ایس اے جعفری کے قلم سے ایک مضمون "Steaming up the Khyber Pass" کے عنوان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

اُن دنوں پشاور میں ہپّی بکثرت آتے تھے اور قصہ خوانی بازار میں پاکستان ہوٹل ان کا ایک اہم ٹھکانہ تھا۔ وہ یہاں کئی کئی دن رہتے اور چرس کے مرغولے چھوڑتے رہتے۔ بہت سے لوگ صرف ان ہپیوں کی قربت سے مستفید ہونے کے بہانے یہاں چلے آتے تھے۔ مجھے اس اعتراف میں باک نہیں کہ ہم بھی کبھی کبھار شام کے وقت وہاں جا بیٹھتے اور ہپیوں سے گپ شپ ہو جاتی۔ چند سال پہلے اسی پاکستان ہوٹل میں ایک بم بلاسٹ ہوا جس کے نتیجے میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔

پشاور کے ساتھ میری کئی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں جن کے تفصیلی ذکر کا یہ موقع نہیں۔ مجھے اس شہر کو اور مقامی کلچر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نمازِ جمعہ کی ادائی کے لیے سول کوارٹرز کی بیت الذکر میں جایا کرتا تھا۔ الحمدللہ اس ناطے میرا بعض احمدی دوستوں سے بھی رابطہ ہوا جو بعد میں دوستی میں بدل گیا۔

اس حوالے سے سب سے اہم نام میاں محمود احمد امیر جماعت احمدیہ پشاور کا تھا جو حضرت محمد آسان دہلوی، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے اور مسعود دہلوی، اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل کے برادر اکبر تھے۔ بتایا جاتا تھا کہ وہ اس سے پہلے راولپنڈی کے امیر جماعت بھی رہے تھے۔

میاں محمود احمد پاکستان ایئر فورس میں کام کرتے تھے۔ انتہائی سادہ طبیعت پائی تھی، منکسر المزاجی میں

خاص شہرت رکھتے تھے اور اخلاص و وفا اور فدائیت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اباجی کے جاننے والوں میں سے تھے لہٰذا مجھ سے بھی بے حد محبت کا اظہار فرماتے۔ پشاور میں میرا قیام مختصر رہا لہٰذا ان سے اکتسابِ فیض کا زیادہ موقع تو نہ ملا لیکن جب بھی ملتے بہت پیار کے ساتھ۔

وہ میرے پشاور سے چلے آنے کے بعد کچھ ہی سال زندہ رہے۔ الفضل میں ان کی وفات کی خبر سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو منکشف ہوئے مثلاً یہ کہ ''پنجگانہ نمازوں اور دعاؤں کے خصوصی التزام کے علاوہ جوانی میں ہی خاص تعہد سے تہجد ادا کرنا آپ کا ایک نمایاں وصف تھا۔ آخر عمر تک اس معمول میں فرق نہ آنے دیا۔''

پشاور نے مجھے جو بہت اچھے دوست عطا کئے ان میں سے ایک اور اہم نام مرزا منظور احمد کا تھا جو مرزا مقصود احمد (بعد میں امیر جماعت احمدیہ پشاور) کے بھائی اور شیخ منیر احمد امیر جماعت احمدیہ لاہور (جنہوں نے ۲۸ مئی کے المناک واقعہ میں دارالذکر لاہور میں راہِ مولا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا) کے ہم زلف تھے۔ اُن دنوں کسی سرکاری کالج میں پڑھاتے تھے اور بہت خلیق اور مجلسی آدمی تھے۔ وہ شام کے وقت اکثر بھائی جان مبشر کے پاس آیا کرتے تھے چنانچہ میں وہاں جاتا تو ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

۱۹۸۱ء میں جب میری تقرری پشاور میں بطور انسپیکٹنگ اسسٹنٹ کمشنر ہوئی تو مرزا منظور احمد سے بکثرت ملاقات رہنے لگی اور ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا شروع ہو گیا لیکن اسی عرصے میں انہیں کینیڈین امیگریشن مل گئی اور وہ بمع اہل و عیال وہاں چلے گئے۔

کینیڈا سے ان کے خطوط آتے تو اندازہ ہوتا کہ وہ نقلِ مکانی کے اس فیصلے پر بہت خوش ہیں۔ کبھی پاکستان آتے تو راقم سے ضرور ملتے لیکن پھر ان کی صحت کی کمزوری کی وجہ سے یہ رابطہ کمزور پڑتا گیا۔ اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن میرے دل میں ان کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی۔

ایک اور دوست جو میرے قیامِ پشاور کے دوران میرے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے حضرت قریشی محمد اسماعیل معتبر کے صاحبزادے، شجاع ہیں۔ اسماعیل معتبر میرے بہنوئی قریشی سعید احمد اظہر کے چچا تھے اور میں ان کے سبھی صاحبزادوں سے پہلے سے متعارف تھا لیکن سچ پوچھیں تو شجاع سے تفصیلی ملاقاتیں پشاور جا کر ہی شروع ہوئیں۔ وہ کثیر العیال تھے اور واپڈا سے ملنے والی تنخواہ ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ تھی چنانچہ وہ پارٹ ٹائم منیاری کی دکان کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہیں تربیتِ اولاد کا خاص خیال رہا اور وہ سب بچوں کو نمازِ جمعہ کی ادائی کے لیے رکشا پر بیت الذکر لے جاتے تھے۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ ان کی بیگم خوش اخلاقی کی دولت سے مالا مال ہیں چنانچہ وہاں جا کر بہت لطف آتا۔

افسوس! وہ مجلسیں اب خواب و خیال ہو گئی ہیں۔

یہی وہ شہر ہے جہاں قیام کے دوران اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بہتر مستقبل کے دروازے کھولے۔ آپ یقیناً سمجھ چکے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔

یہ روز کر مبارک سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ

پشاور پہنچے ابھی چند دن ہی گذرے تھے کہ میرا سی ایس ایس کا نتیجہ آ گیا۔ مجھے اب تک یاد ہے یہ جولائی ۱۹۷۰ء کی بارہ تاریخ تھی اور اتوار کا روز۔ اگرچہ یہ تعطیل کا دن تھا لیکن ہمارا دفتر کسی ہنگامی نوعیت کی ضرورت کے تحت کھلا ہوا تھا چنانچہ میں حسبِ معمول دفتر پہنچا اور اپنے ساتھیوں سے سلام و دعا کے بعد اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ اچانک میرے ایک رفیق کار نے جو پاکستان ٹائمز پڑھ رہا تھا شور مچا دیا کہ سی ایس ایس کا ریزلٹ آ گیا ہے اور یہ کہ میں اس میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں اس خبر پر کیسے یقین کر سکتا تھا تاوقتیکہ میں یہ خبر خود نہ پڑھ لیتا چنانچہ میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے اُچک لیا اور نتیجہ دیکھنے لگ گیا۔ مجھے یاد ہے میرے کچھ رفقا کرسی کے پیچھے کھڑے دُور سے یہ خبر پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے چنانچہ میں نے جوں ہی اپنے نام پر اُنگلی رکھ کر خبر کی تصدیق کی تو انہوں نے مبارک سلامت کا شور برپا کر دیا۔ وہ سب مجھ سے باری باری بغلگیر ہو رہے تھے اور میری اس کامیابی پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

ان دوستوں میں سے ایک بھی میرا قرابت دار تھا نہ ایک کے سوا کسی کا جماعت سے تعلق تھا لہٰذا ان کی خوشی کی وجوہات ذرا مختلف تھیں۔

میں نے لاہور میں ان کے ساتھ کئی ماہ گذارے تھے اور اب ہم کچھ عرصے سے پشاور میں اکٹھے تھے۔ ہم سب ایک سے حالات میں لاہور سے پشاور ٹرانسفر ہوئے تھے۔ ہم نے لاہور سے پشاور تک ایک ہی ٹرین میں سفر کیا تھا، ہماری پہلی رات ایک ہی سرائے میں گذری تھی اور ہمارے دفتری ''دوست'' اور ''دشمن'' بھی ایک ہی تھے۔ ہم دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے اور سیر و تفریح اور شاپنگ کے لیے شہر میں اکٹھے گھومتے۔ ہمارے مالی اور معاشرتی حالات ایک دوسرے سے مختلف نہ تھے اور ہمارے مسائل کی نوعیت بھی ایک سی تھی۔ میں ان ہی میں سے تھا اور ہمارے درمیان کبھی شکر رنجی نہیں ہوئی تھی لہٰذا ہم ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے تھے۔ اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس اعزاز سے نوازا تھا وہ خوش تھے کہ ان کا ایک ساتھی ''کلاس وَن افسر'' بن کر جا رہا ہے اور یہ ایک ایسی کامیابی تھی جس کا انہوں نے اپنے لیے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا۔ مجھے کبھی ان کے حسد کا شائبہ تک نہیں ہوا۔

میرے اس زمانے کے باس حسن محمد اسسٹنٹ الیکشن کمشنر بہت متوازن شخصیت کے مالک تھے اور عام حالات میں بھی مجھ سے شفقت کا برتاؤ کرتے تھے لیکن میری اس کامیابی نے ان کے دل میں میرے لیے مزید نرم گوشہ پیدا کر دیا۔ وہ اپنے دفتر سے اٹھ کر خود میری نشست تک آئے اور مجھے مبارکباد دی۔ ڈپٹی الیکشن کمشنر اور

پراونشل ایکشن کمشنر بھی اس معاملہ میں پیچھے نہ رہے اور انہوں نے مجھے بلا کر مبارک باد دی۔ اللہ تعالیٰ میرے ان سب مہربانوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اُس سال کل تین صد سڑسٹھ امیدوار کامیاب قرار پائے تھے جن میں میرا ۵۴واں نمبر تھا۔ میں یہ خبر سنتے ہی اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوگیا جس نے امی اور میرے دیگر بزرگان کی متضرعانہ دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے مجھے ایک ایسے راستے پر گامزن کر دیا تھا جو بظاہر میری کامیابیوں کا ضامن تھا۔ میں جوں جوں اپنے حالات پر غور کرتا مجھے اپنی خوش بختی پر رشک آنے لگتا۔ میں نے یہ امتحان بہت مشکل حالات میں دیا تھا۔ چند سال پہلے اباجی اچانک وفات پا گئے تھے۔ اس کے فوراً بعد آپی شدید بیمار ہوگئیں اور یہ علالت دنوں سے مہینوں اور مہینوں سے سالوں تک پھیلتی چلی گئی۔ انہوں نے یہ عرصہ ہمارے ساتھ گذارا اور میرا بہت سا وقت ان کی تیمارداری پر صرف ہو جاتا رہا۔ بی اے کرنے کے بعد میں پنجاب یونیورسٹی میں داخل تو ہوگیا اور جیسے تیسے میرے تعلیمی اخراجات بھی پورے ہوتے گئے لیکن میں بعض وجوہ کی بنا پر اس پورے عرصے میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہا۔ ایم اے کرنے کے بعد میرا بہت سا وقت بیکاری میں گذرا اور جب ملازمت ملی تو گھٹیالیاں میں جہاں کا ماحول پڑھائی کے لیے ہرگز سازگار نہ تھا۔ میں نے یہ امتحان پہلی بار دیا تھا اور میرے پاس اس میں دوبارہ شمولیت کا چانس نہیں تھا جب کہ اس امتحان میں شامل ہونے والے کئی امیدواروں کی یہ دوسری، تیسری اور بعض استثنائی صورتوں میں چوتھی کوشش تھی۔ میرا مقابلہ ایسے امیدواروں سے بھی تھا جن کا تعلیمی پس منظر مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ اُس زمانے میں مشرقی پاکستان ساتھ تھا اور وہاں سے بھی کثیر التعداد اُمیدوار اس امتحان میں شامل ہوئے تھے لہٰذا مقابلہ بہت سخت تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہی تھا جس کے نتیجے میں مجھ ایسے نالائق و بے ہنر کو یہ کامیابی حاصل ہوئی۔

دوستوں کی فرمائش پر اسی وقت مٹھائی منگوا کر ان کا منہ میٹھا کرایا گیا البتہ ان کی طرف سے کھانے کے مطالبے پر عمل سروس ایلوکیشن تک مؤخر کر دیا گیا۔

ان امور سے فارغ ہوتے ہی دفتری ماحول معمول پر آ گیا چنانچہ میں اُٹھ کر خاموشی سے ڈاکخانے چلا گیا اور امی کو بذریعہ تار اپنی کامیابی کی اطلاع دی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ملازمت کے سلسلے میں میری قدم قدم پر رہنمائی فرمائی تھی۔ میرے گھٹیالیاں جانے سے پہلے حضور نے مجھے نصرت جہاں سکیم کے تحت کسی افریقی ملک میں ملازمت کی پیشکش کی تھی لیکن میں امی کو پاکستان میں تنہا چھوڑ کر باہر نہیں جانا چاہتا تھا چنانچہ میں نے حضور سے معذرت کر لی۔ آپ نے ایک بینک میں میری تقرّری کے لیے بھی کوشش فرمائی لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ میں گھٹیالیاں اور بعد میں لاہور میں تقرّری کے دوران حضور سے وقتاً فوقتاً ملتا رہا اور کسی بہتر ملازمت کے حصول کے لیے اپنی مساعی کی تفصیلات آپ کے گوش گذار کرتا رہا۔ آپ نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مجھے دعاؤں سے نوازا۔ یہی وجہ تھی کہ امی کو تار دینے کے بعد میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور حضور کو اپنی اس کامیابی کی اطلاع دی اور ذہنی طور

پر یہ فیصلہ کیا کہ میں پشاور میں یہ اطلاع سب سے پہلے چچا مبارک کو دوں گا لیکن اس کے لیے مجھے بہر طور شام تک انتظار کرنا تھا۔

میں چچا مبارک کے ہاں جاتے ہوئے دو کلو مٹھائی خرید کر ہمراہ لے گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے موصوف قوتِ سماعت سے یکسر محروم ہو چکے تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ دیکھا تو مجھ سے کوئی سوال پوچھے بغیر مجھے سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ ان کی ناراضی کا سبب ان کا یہ مفروضہ تھا کہ میں یہ مٹھائی ان کی مہمان نوازی کا حساب بیباق کرنے کے لیے لایا ہوں جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بہر حال انہوں نے مجھے تقریباً حکم دیتے ہوئے کہا کہ میں فوراً اُٹھوں، مٹھائی دکاندار کو واپس کروں اور یہی رقم امی کو بھجوا دوں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کے اس طرزِ عمل کے پیچھے ان کا یہ احساس کارفرما ہے کہ میں اپنی والدہ کا واحد سہارا ہوں اور یہ کہ اگر میں یہی رقم مٹھائی پر ضائع کرنے کی بجائے انہیں بھجوا دیتا تو ان کی کوئی چھوٹی موٹی ضرورت پوری ہو سکتی تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں نے یہ مٹھائی واپس نہ کی تو وہ خود دکاندار کے پاس جا کر اسے لوٹا دیں گے مجھے ایک تدبیر سوجھی۔ میں نے ایک کاغذ پر سی ایس ایس کے امتحان میں اپنی کامیابی کی خبر لکھ کر ان کے سامنے رکھ دی اور واضح کیا کہ میں یہ مٹھائی اسی خوشی میں لایا ہوں۔ موصوف یہ چٹ پڑھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ کر میرے چہرے پر چٹاخ پٹاخ پیار کرنے لگے۔ نظر آ رہا تھا کہ وہ میری اس کامیابی پر بہت خوش ہیں۔ انہوں نے دیر تک مجھے اپنے سینے سے چمٹائے رکھا اور دعاؤں سے نوازتے رہے۔

اس امتحان میں کامیابی سے جہاں مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے لیے ایک بہتر دور کا آغاز ہونے والا ہے وہیں یہ تسلی بھی ہو گئی کہ اب پشاور میں میرا قیام زیادہ نہیں ہو گا لہٰذا مجھے اپنے لیے الگ رہائشگاہ تلاش کرنے یا کسی رفیق کار کے ساتھ شِفٹ ہونے کی ضرورت نہیں۔ چچا مبارک نے تو یوں بھی یقین دلا رکھا تھا کہ میں جتنا عرصہ چاہوں ان کے ہاں قیام کر سکتا ہوں لیکن اب تو یہ قیام کسی صورت دو تین ماہ سے متجاوز ہونے کا امکان نہ تھا لہٰذا میں ایک مطمئن و مسرور زندگی گذارنے لگا۔

اُس زمانے میں فون عام نہ تھا کہ منٹوں میں سب کو اس کامیابی کی اطلاع دے سکتا تاہم یہ خبر جلد ہی سب دوستوں اور احباب میں پھیل گئی۔ ان میں سے بعض کو میں نے یہ اطلاع خود دی تھی جب کہ دوسروں کو یہ خبر اخبار کے ذریعے ملی۔ ان میں سے بہتوں کے مبارک باد کے تار اور خطوط مجھے موصول ہوئے۔ اس طویل فہرست میں امی، میرے کئی بزرگان اور اقارب، ریجنل الیکشن کمشنر برائے مغربی پاکستان کے دفتر میں میرے ساتھی اور کچھ کلاس فیلوز شامل تھے۔ میں نے ان کی طرف سے موصول ہونے والے خطوط آج بھی بطور یادگار اپنے پاس سنبھال رکھے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میری طرف سے امی کو بھجوایا جانے والا ٹیلیگرام انہیں بہت تاخیر سے اس وقت ملا جب انہیں میری کامیابی کی اطلاع کسی اور ذریعہ سے مل چکی تھی۔ انہوں نے اپنے خط مرقومہ ۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء میں لکھا تھا:

''کل دس بجے آپ کے نام ایک تار آیا جس میں مبارکباد تھی۔ وہ بوریوالہ سے ممتاز نیازی نے دیا تھا۔ ہم حیران تھے کہ مبارکباد کس چیز کی ہے۔ پھر اچانک خیال آیا نتیجہ نکلنے والا ہے، شاید وہی نکلا ہو۔ کل تو نہیں سے پتا نہ کروا سکے لیکن آج عزیزم منظور احمد سے کہہ کر پتا کروایا تو ہمارا خیال ٹھیک نکلا یعنی نتیجہ نکل آیا۔ آپ خدا کے فضل و کرم سے ۸۰۷ نمبر لے کامیاب ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ کامیابی مزید کامیابیوں کا پیش خیمہ بنائے۔ ہم سب نہایت خوشی کے ساتھ مبارکباد کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ .... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز کرے اور صحت اور تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے اپنے دستخط سے موصول ہونے والا ۳۱ جولائی ۱۹۷۰ء کا لکھا ہوا یہ خط میرے لیے سرمایۂ صد افتخار ہے:

''آپ کا خط ملا۔ خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سی ایس ایس کے امتحان میں نمایاں کامیابی سے نوازا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس کامیابی کو نہ صرف آپ کے لیے بلکہ آپ کے پورے خاندان اور جماعت کے لیے مبارک کرے۔

اپنی والدہ کو بھی میری طرف سے مبارک باد پہنچا دیں۔''

میرے دیرینہ کرمفرما، قاضی محمد اسلم نے لاہور سے اپنے ۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا:

''آپ کا خط ملا۔ واقعی اس خبر سے بہت خوشی ہوئی کہ آپ سی ایس ایس میں اچھی خاصی پوزیشن لے گئے ہیں۔ میرا اُکسانا کسی کام آیا! اللہ تعالےٰ آپ کو کامیاب کرے اور دین و دنیا میں سرخرُو۔

میں اب اچھا ہوں لیکن کمر درد چل رہی ہے۔ اکتوبر سے مئی (شروع مئی) تک ربوہ رہ آیا ہوں۔ درمیان میں ایک دو دن کے لیے پھر ہو آیا ہوں اور شاید کچھ وقت کے لیے پھر جاؤں۔ کالج تو چھٹیوں کے لیے بند ہو رہا ہے لیکن میرے پاس نظارت بھی تو ہے۔ معلوم ہوتا ہے ربوہ سے میری فراغت، ایک کارکن کی حیثیت سے، قدم بقدم ہوگی۔

اُمید ہے آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

کیا پشاور جانے سے آپ پشاوری تو نہیں ہو جائیں گے۔ وَن یونٹ ٹوٹنے سے آپ کو لاہور میں یا اس کے قریب جگہ ملنی چاہیے تھی۔

طاہر قاضی کا سن کر خوشی ہوئی۔ آپ کے ساتھ تو ہے۔ معلوم ہوتا ہے الیکشن کا کام اسے خوب پسند آیا ہے۔ میرا اسلام اور پیار پہنچا دیں۔

آپ کی سروس کا مسئلہ طے ہو تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ مجھے اس کی ٹوہ رہے گی۔

اور کیا لکھوں؟ خدا تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے اور دین و دنیا میں کامیاب بنائے۔''

میرے محسن اور بزرگ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے محلّہ دارالصدر غربی سے سات اگست ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''مبارک ہو...... مبارک ہو...... مبارک۔ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل و کرم سے امتحان

میں کامیاب فرمایا ہے۔ آپ کے لیے اور آپ کے خاندان اور جماعت کے لیے یہ کامیابی خیر و برکت کا موجب ہو۔ آمین

غمی کا ایک دن اور چار شادی

فسبحان الذی اخزی الاعادی

صادقہ نے اپنے خط محررہ ۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء میں مجھے لکھا: ''سی ایس ایس پی کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی کا پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ میری طرف سے اور اسامہ کے ابو کی طرف سے آپ بہت بہت مبارک باد قبول کریں۔ میری تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اگر آج ابا جان زندہ ہوتے تو انہیں کس قدر خوشی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد فضل ہے کہ اس نے آپ کو نمایاں کامیابی عطا فرمائی۔''

میری بہنوئی، قریشی سعید احمد اظہر، مربی سلسلہ نے اپنے ۱۶ جولائی ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''آپ کا خط ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ میں کل ربوہ گیا تھا۔ وہاں سے بھی آپ کی کامیابی کا علم ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کامیابی کو مبارک کرے اور آپ کے لیے بہتر سامان پیدا فرمائے اور مزید ترقیوں سے نوازے۔''

تایا اسحٰق نے لاہور سے اپنے دس اگست ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''پاکستان ٹائمز میں آپ کی تقرری کے اعلان سے دلی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ اگر آج آپ کے والدِ محترم زندہ ہوتے تو ان کی خوشی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ سب ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اِن شاء اللہ آئندہ بھی خدا کا فضل آپ کے شاملِ حال رہے گا اور آپ ترقی کرتے چلے جائیں گے۔''

میرے خالہ زاد بھائی، قاضی منظور احمد نے لکھا: ''پاکستان ٹائمز میں سی ایس ایس پی کے امتحان کا نتیجہ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے........۵۴ ویں پوزیشن حاصل کی ہے۔ الحمدللہ۔ ثم الحمدللہ۔ یہ کامیابی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ زیب النساء بیگم اور سب بچے السلام علیکم کے بعد مبارک باد کہتے ہیں۔''

میرے ماموں زاد، مرزا محمد اسماعیل کارکن دفتر تحریک جدید انجمن احمدیہ نے اپنے ۱۸ جولائی ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''یہ خبر پڑھ کر کہ خدا تعالیٰ نے تمہاری اور ہم سب لوگوں کی خواہشات اور تمناؤں کو پورا کرتے ہوئے تمہیں سی ایس ایس پی کے امتحان میں کامیاب فرمایا ہے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اب مزید خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمہاری اس کامیابی کو خاص طور پر تمہارے لیے اور عموماً ہم سب کے لیے بہتر کرے۔''

میرے تایا زاد، میرے کلاس فیلو اور گھٹیالیاں میں میرے رفیقِ کار، کریم قمر نے جو اُن دنوں سیرالیون کے دارالحکومت فری ٹاؤن کے کسی سکول میں پڑھا رہے تھے مجھے دس اگست ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''میری طرف سے اس کامیابی پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں خدا یہ ملازمت مبارک کرے۔

سی ایس ایس میرے لیے ایک خواب تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ آپ کی پوزیشن بہت اچھی ہے اور امید ہے پولیس کے بعد کسی اچھی ملازمت میں آپ کا نمبر آ جائے گا۔''

اپنے عزیزوں کی طرف سے موصول ہونے والے خطوط کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں اپنے بھانجے زبیر خالد (جس کی عمر اُس وقت بمشکل چھ سال تھی) کا یہ معصومانہ خط نقل کرنا چاہتا ہوں جس میں اس نے مجھے ''پیارے ماموں جان'' کہہ کر مخاطب کیا تھا اور تسلیمات کے بعد لکھا تھا کہ ''میں اور باجی اور فوزی مبارک باد عرض کرتے ہیں اور آپ سے مٹھائی مانگتے ہیں۔''

میرے بزرگان میں سے سید میر داؤد احمد نے جو اُن دنوں جامعہ احمدیہ کے پرنسپل تھے میری طرف سے اس امتحان میں کامیابی کی اطلاع پا کر اپنے بائیس اگست ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''آپ کا خط ملا جو میرے لیے از حد مسرت کا باعث ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا واقعی بیحد احسان ہے کہ آپ اس سروس میں منتخب ہوئے۔ جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ خدا کرے آپ کی آئندہ زندگی خدا اور رسول کے احکام کے نیچے دیانت اور امانت سے بسر ہو۔ یہ میرے لیے اس سے بھی زیادہ خوشی کا باعث ہوگا۔

ایک بات ہمدردی کے طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس کے شکرانے میں عہد کریں آپ ہمیشہ غریب آدمی کے ساتھ عزت اور محبت سے پیش آئیں گے اور کبھی اس کی دل شکنی کا باعث نہ بنیں گے۔ اگر اس بات کی آپ پابندی کریں گے تو ان شاء اللہ بڑی برکتوں سے نوازے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے۔''

صاحبزادہ مرزا رفیع احمد نے اپنے خط میں لکھا: ''آپ کا خط ملا۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کو ٹیکسیشن کے بعد اکاؤنٹس میں جگہ بھی مل گئی ہے۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ ابھی تک صرف ایک مرحلہ طے ہوا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور سارے مراحل اپنے فضل سے طے کرا دے اور آپ کے ساتھ ہو۔''

چوہدری عبدالحق ورک، امیر جماعت احمدیہ اسلام آباد نے اپنے خط محررہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۰ء میں لکھا: ''سی ایس ایس میں نمایاں کامیابی اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک فرمائے۔ آمین۔ خدمتِ دین کو اپنا مقصدِ حیات بنائے رکھیں۔ چندے باشرح ادا فرمایا کریں۔ نمازِ باجماعت اور جماعت کے کاموں میں سستی نہ ہو۔''

شیخ خادم حسین، ریٹائرڈ سیکشن آفیسر، وزارتِ خارجہ، حکومتِ پاکستان نے ۳۱ جولائی ۱۹۷۰ء کو مجھے بزبانِ انگریزی ایک خط لکھا جس کا آزاد اردو ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے: ''براہِ کرم اپنی نمایاں کامیابی پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ خدا تعالیٰ آپ پر اس سے بھی بڑھ کر فضل فرمائے اور مزید کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازے۔''

چوہدری محمد علیم الدین جو اُن دنوں وزارتِ خزانہ میں جوائنٹ سیکرٹری تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد امیر جماعتِ احمدیہ، اسلام آباد رہے اپنے ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''گزشتہ ماہ آپ کا خط مل گیا تھا۔ میں چونکہ سابقہ جگہ سے ٹرانسفر ہو کر بجٹ سیکشن میں آ گیا تھا اس لیے انتہائی مصروفیت کے باعث آپ کو جواب نہ لکھ سکا۔ پرسوں آپ کی طرف سے ٹیلیفون آنے پر یاد دہانی ہوئی۔ مجھے ذاتی طور پر آپ کی سی ایس ایس میں کامیابی کی خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی تھی۔...... میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں بھی عطا فرمائے۔''

کراچی سے شیخ خلیل الرحمان (جو رفیق حضرت مسیح موعود، حضرت شیخ نظیم الرحمن، کارکن صدر انجمن احمدیہ کے بھائی اور جماعت احمدیہ کراچی کے سیکرٹری ضیافت تھے) نے اپنے ۲۷ جولائی ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا:
''آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سی ایس ایس پی میں کامیاب کیا۔ بہت خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ نے سب کی دعائیں قبول فرمائیں۔ ان شاء اللہ وہ آپ کو ناامید نہیں رکھے گا۔ بہت کامیابیاں درپیش ہیں۔''

شیخ عبدالوہاب جو اُن دنوں لاہور میں ڈپٹی الیکشن کمشنر تھے اور بعد از ریٹائرمنٹ امیر جماعت احمدیہ، اسلام آباد رہے نے اپنے خط میں لکھا: ''آپ کو اپنی اعلیٰ کامیابی مبارک ہو۔ اللہ نے فضل کیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ یہاں بھی سب کو میں نے بتلایا۔ آپ کا خط آنے سے پہلے اخبار میں بھی دیکھ لیا تھا۔''

ضیاء الحق بنگالی نے جو اُن دنوں سنٹرل بورڈ آف ریونیو میں سیکنڈ سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے تین اکتوبر ۱۹۷۰ء کو مجھے انگریزی زبان میں خط لکھا جس کا آزاد اردو ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا: ''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جس نے آپ کو سی ایس ایس کے امتحان میں شمولیت کی توفیق دی اور پھر نمایاں کامیابی سے نوازا۔''

ملک صلاح الدین (جنہیں حضرت مسیح موعود کے بہت سے رفقاء کے حالات جمع کرنے کا اعزاز حاصل ہے) نے قادیان سے ۳ دسمبر ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''بے حد خوشی ہوئی کہ میرے نہایت پیارے دوست کے بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی دکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت برکات سے نوازے اور دینی و دینوی ترقیات سے ہمیشہ نوازتا رہے۔

ایم اے میں میرے کلاس فیلو اور ایک بہت اچھے غیر از جماعت دوست ممتاز منور نیازی نے جو بعد میں سول جج منتخب ہوئے اور سیشن جج کے عہدے تک ترقی پانے کے بعد اب ریٹائر ہو چکے ہیں مجھے ۱۳ جولائی ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''کل پاکستان ٹائمز میں سی ایس ایس کی میرٹ لسٹ دیکھی اور اس میں تمہارا نام بھی کامیاب امیدواروں کی فہرست کی ابتدا میں دیکھا تو کیا بتاؤں دل کو کس قدر مسرت ہوئی کہ ہمارا بھی ایک دوست ایسی شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس پر میری دلی مبارک باد تمہیں، تمہارے والدین اور احباب کو قبول ہو۔ تم نے تو اپنے اپیئر ہونے کے متعلق بھی نہیں بتایا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح پتا چل گیا۔

یار داؤد! تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔''

ریجنل الیکشن کمشنر برائے مغربی پاکستان کے دفتر میں میرے علاوہ چار اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک میرے ہمراہ تبدیل ہو کر پشاور چلے آئے تھے۔ باقی دوستوں میں سے محمد حسین اور لطیف اختر کی طرف سے بذریعہ ڈاک مبارکباد وصول ہوئی۔ اسی طرح جعفر حسین نے اپنے خط میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ میری ''محنت ٹھکانے لگی'' اور دعا کی کہ میں آئندہ ملنے والی ذمہ داریوں سے ''بخوبی عہدہ برآ'' ہو سکوں۔

میرے دوست اور کلاس فیلو، عبدالسمیع قریشی جو اُن دنوں منسٹری آف فارن افیئرز کے چیف اکاؤنٹنٹ کے دفتر میں ملازم تھے اپنے ۲۳ جولائی ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا: ''یہ پڑھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ خدا تعالیٰ نے تم

کو اپنے فضلوں، برکتوں اور رحمتوں سے نوازا اور تمہیں اپنے مقصد میں شاندار کامیابی عطا فرمائی ہے۔ میری طرف سے اور بھائی جان کی طرف سے بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمہیں مزید دنیوی اور دینی ترقیات سے نوازے اور ہمیشہ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔ آمین۔

محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمہاری پوزیشن بہت اچھی آئی ہے اس لیے ان شاء اللہ تمہیں بہتر سے بہتر ملازمت ملے گی۔''

ہدایت اللہ ہادی جو آج کل احمدیہ گزٹ، کینیڈا کے ایڈیٹر ہیں نے کراچی سے اپنے خط میں لکھا: ''آپ کا خط ملا۔ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی اور جتنی خوشی میرے ابا جان کو آپ کی نمایاں کامیابی پر ہوئی ہے اس کا آپ شاید اندازہ نہ لگا سکیں۔ ابا جان کہہ رہے تھے کہ میں تو ربوہ میں ہی داؤد صاحب کو کہا کرتا تھا: آپ بہت بڑے افسر بننے والے ہیں۔''

ان کے علاوہ بھی مجھے بہت سے دوستوں اور بہی خواہوں کے خطوط موصول ہوئے ان میں امریکہ سے ڈاکٹر بشارت احمد جمیل، لاہور سے عبدالعزیز منگلہ اور راولپنڈی سے منظور صادق شامل تھے۔ یاد رہے منظور صادق ہی نے مجھے سنٹرل پبلک سروس کمیشن سے سی ایس ایس کا داخلہ فارم بھجوایا تھا لہٰذا میری اس کامیابی پر ان کی خوشی دیدنی تھی۔

اگرچہ میں سی ایس ایس کے امتحان میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ مجھے کون سی سروس ملے گی۔ واقفانِ حال تو اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں گے لیکن اُن قارئین کے لیے جنہیں اس سلسلے میں پوری معلومات نہیں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ اس امتحان میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو سول سروس آف پاکستان، فارن سروس آف پاکستان، پولیس سروس آف پاکستان، پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس، پاکستان ملٹری اکاؤنٹس سروس، پاکستان ٹیکسیشن سروس، پاکستان کسٹمز اینڈ سنٹرل ایکسائز سروس، سنٹرل انفرمیشن سروس، پاکستان پوسٹل سروس اور پاکستان ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس سروس میں متعین کیا جاتا تھا یا بطور اسسٹنٹ کنٹرولر امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس تقرر کیا جاتا۔ یہ ساری سروسز کلاس وَن تھیں یعنی ان کے لیے منتخب ہونے والا امیدوار پہلے دن سے ہی کلاس وَن افسر شمار ہوتا تھا۔ جو امیدوار سی ایس ایس کے امتحان میں اپنی کمتر پوزیشن کی وجہ سے ان میں سے کسی سروس کے لیے منتخب نہ ہو سکتے وہ میرٹ لسٹ میں اپنی اپنی پوزیشن کے مطابق پاکستان پوسٹل سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ انکم ٹیکس آفیسر یا ایگزیکٹو آفیسر امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس کے طور پر ملازمت میں لیے جا سکتے تھے تاہم یہ تینوں پوسٹیں کلاس ٹو میں تھیں۔

ان سروسز میں ایلوکیشن کے وقت بہت سے اہم پہلوؤں کا خیال رکھا جاتا تھا جن میں سے ایک کا تعلق صوبائی کوٹے سے تھا۔ اس اصول کی پاسداری بعض دفعہ انتہائی مضحکہ خیز صورت پیدا کر دیتی چنانچہ اس بات کا قوی امکان رہتا تھا کہ بلوچستان کا ڈومیسائل رکھنے والا کوئی اُمیدوار تو سول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہو جائے مگر میرٹ لسٹ میں اس سے بہت بہتر پوزیشن لینے والا پنجاب کا کوئی اُمیدوار کسی بہت ہی نچلی سروس مثلاً

سنٹرل انفرمیشن سروس میں آئے۔ اندریں حالات اندازہ تو لگایا جا سکتا تھا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مجھے کون سی سروس ایلوکیٹ ہوگی۔

اس کے لیے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور چند ہی دنوں بعد حکومت کی طرف سے جاری کردہ فہرست شائع ہوگئی۔ سات اگست ۱۹۷۰ء کے اخبارات میں چھپنے والی اس فہرست کے مطابق صرف ایک سو اڑتالیس امیدواروں کو ملازمتیں پیش کی جارہی تھیں جب کہ باقی دوصد انیس امیدواروں کو یہ امتحان پاس کرنے کے باوجود کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ الحمدللہ! مجھے پاکستان ٹیکسیشن سروس کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ میرے اور میرے خاندان کے لیے خوشی کا ایک اور موقع تھا۔ جو لوگ محکمہ انکم ٹیکس کے فرائض اور اختیارات سے آگاہ تھے میرے اس تقرر پر بالخصوص بہت خوش ہوئے۔

ان ہی دنوں حضور ایبٹ آباد تشریف لائے تو ہماری جماعت بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوئی۔ حضور کے ساتھ ہماری یہ ملاقات سولہ اگست ۱۹۷۰ء کو ہوئی۔ جب میری باری آئی اور میں نے اس پیش رفت کا ذکر کیا تو حضور نے اپنی نشست سے اُٹھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ حضور نے تاکید فرمائی کہ میں امی کو بھی آپ کی طرف سے مبارکباد کا تحفہ پہنچا دوں۔

اس موقع پر بھی مجھے بہت سے دوستوں کے خطوط موصول ہوئے لیکن یہاں پر صرف ایک خط نقل کیا جا رہا ہے جو مجھے قاضی محمد اسلم کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ آپ نے اپنے خط مرقومہ انیس اگست ۱۹۷۰ء میں لکھا:

''آپ کی طرف سے پھر ایک عمدہ خبر آئی۔ ٹیکسیشن سروس نہایت ہی عمدہ سروس ہے۔ دیانتداری اور محنت سے کام کرنے والوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے اور ایک پروفیشن میں ٹریننگ اور عمر بھر کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد ریٹائرمنٹ کا زمانہ گذارنے کے لیے ایک اچھا مشغلہ ہاتھ آتا ہے، دلچسپ بھی اور نفع مند بھی۔ آپ کہیں گے ابھی سے آپ کو ریٹائر کر رہا ہوں لیکن بات ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اب آپ عہد کریں اور سروس میں جاتے ہی اس کی کوشش کریں اور میرے جیسے ناچیز آپ کے لیے دعا کریں گے کہ آپ کا سروس کا زمانہ خوشیوں سے بھرپور ہو اور آپ کو ملک کی خدمت کرنے کی پوری توفیق ملے اور آپ ہر طرح سے سرخرُو ہوں اور اپنے عزیزوں، بزرگوں اور دوستوں کے لیے ایک قابلِ فخر وجود ثابت ہوں۔

مطالعہ کی عادت جاری رکھیں، اپنے پروفیشن کے متعلق بھی معلومات بڑھاتے رہیں اور اپنی معلومات بھی اور تالیف وتصنیف کی طرف بھی خیال رکھیں۔

طبیعت کو خوب بشاش رکھیں۔ آپ نے کیسی عمدہ بات لکھی کہ آپ نے ایبٹ آباد میں حضرت ایدہ اللہ کو دیکھا، خوب ہشاش بشاش تھے۔ بس اسی نمونہ پر آپ بھی رہیں۔

دو طاہروں کا ساتھ خوب رہا یعنی داؤد طاہر اور قاضی طاہر۔ اللہ تعالیٰ آپ کا اور ہم سب کا نگہبان ہو اور ہم سب کو اپنے فضلوں سے نوازتا رہے۔''

قاضی صاحب نے یہ خط مکمل کرنے کے بعد بطور پوسٹ سکرپٹ لکھا کہ: کیا آپ لاہور کی

فنانس اکیڈمی میں کچھ وقت گذاریں گے؟ اس کے ڈائریکٹر آفتاب احمد خاں میرے بڑے مخلص دوست ہیں۔''

اس بحث سے قطع نظر کہ میں فنانس سروسز اکیڈمی پہنچا تو اس کے ڈائریکٹر آفتاب احمد خان تھے یا کوئی اور میں فی الوقت صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں فنانس سروسز اکیڈمی جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا مجھے اچانک خوشی کی ایک اور خبر موصول ہوگئی۔

میں نے گھٹیالیاں میں قیام کے دوران ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کی طرف سے پولیٹیکل سائنس کے لیکچررز کی آسامیاں مشتہر ہونے پر اپنی درخواست بھجوائی تھی اور انٹرویو بھی دے چکا تھا۔ ستمبر ۱۹۷۰ء کے آخری دنوں میں مجھے سیکشن آفیسر (کالج اسٹیبلیشمنٹ) ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، حکومت پنجاب، لاہور کے ایک خط کی نقل موصول ہوئی جو دراصل ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن، راولپنڈی ریجن کے نام لکھا گیا تھا۔ اس خط میں انہیں ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ لیکچرر کے طور پر میرے انتخاب کی اطلاع دیتے ہوئے مزید کارروائی کی ہدایت کی گئی تھی۔

مجھے یہ اطلاع پا کر اس لیے بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ پچھلے دو تین سالوں میں بہت سے پرائیویٹ کالجوں نے میرے بہت اچھے تعلیمی ریکارڈ کے باوجود لیکچررشپ کے لیے میری درخواستیں ردی کی ٹوکری کی نذر کر دی تھیں۔ ان میں سے بہتوں نے تو میری درخواست کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور ایک کالج کی طرف سے بہت توہین آمیز جواب ملا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ سنٹرل پبلک سروس کمیشن نے مجھے سی ایس ایس کے امتحان میں کامیاب قرار دیا تھا اور ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مجھے سرکاری کالجوں میں پولیٹیکل سائنس پڑھانے کے لیے موزوں سمجھا۔

اب انتظار تھا تو صرف اس بات کا کہ مجھے کب فنانس سروسز اکیڈمی میں رپورٹ کرنا ہے۔ بالآخر یہ اطلاع موصول ہوگئی۔ سنٹرل بورڈ آف ریونیو کی طرف سے آمدہ اطلاع کے مطابق میری ٹریننگ ۲ نومبر ۱۹۷۰ء سے شروع ہونا تھی اور اس کے لیے مجھے کم از کم ایک روز پہلے اکیڈمی پہنچنا تھا۔ جب اس حوالے سے اپنے باس محمد حسن سے میری بات ہوئی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ چونکہ یہ ایک ملازمت چھوڑ کر دوسری ملازمت جوائن کرنے کا مسئلہ ہے لہٰذا حکومتی قواعد کے مطابق مجھے جوائننگ ٹائم نہیں مل سکتا اور اگر میں ایسا کرتا ہوں تو میری پچھلی ایک سالہ ملازمت ضائع ہونے کا احتمال ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں جوائننگ ٹائم نہیں لیتا اور الیکشن کے محکمہ سے اس طرح ریلیو ہوتا ہوں کہ کوئی وقت ضائع کیے بغیر فنانس سروسز اکیڈمی رپورٹ کرسکوں تو مجھے زندگی کے کسی مرحلے پر اس ایک سالہ ملازمت کا کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ اس زمانے میں خدا تعالیٰ نے ہمت دے رکھی تھی چنانچہ میں اکتیس اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پشاور سے فارغ ہو کر اسی رات لاہور پہنچ گیا۔ اگلے روز اتوار تھی۔ میں نے وہ دن آرام میں گذارا اور یکم نومبر ۱۹۷۰ء کی شام فنانس سروسز اکیڈمی پہنچ گیا۔

اب ایک نئی دنیا میری منتظر تھی۔